

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

مُعَاذُ اللَّهِ

الذُّكْرَانِ

الْأَعْيُنِ

الْإِيمَانِ

الْحَمِيمِ

الْمَلِكِ

الْقَادِرِ

السَّلَامِ

الْمُؤْمِنِ

الْمُهَيَّبِ

الْعَزِيزِ

الْبَيْتِ

الْمَشْبُورِ

الْبَقِيَّةِ

الْبَارِئِ

الْمَصُونِ

الْغَفَرِ

الْقَهْرِ

الْوَهْبِ

الزَّرَقِ

الْفِكْرِ

الْعَلِيمِ

الْبُصْرِ

الْبَاطِ

الْفَضْلِ

الذَّرْعِ

الْمَكِينِ

الْحَكِيمِ

الْبَصِيرِ

السَّمِيِّ

الْمَلِكِ

الْعَالِمِ

الطَّيِّبِ

الْخَبِيرِ

الْعَلِيمِ

الْعَظِيمِ

الْغَفُورِ

الشَّكُورِ

الْعَلِيِّ

الْكَبِيرِ

الْحَفِيفِ

الْمُقْتَدِرِ

الْحَيِّبِ

الْمَلِكِ

الْكَبِيرِ

الْقَرِيبِ

الْمُجِيبِ

الْوَالِدِ

الْحَكِيمِ

الْقَادِرِ

الْمُجِيبِ

الْعَبْتِ

الشَّهِيدِ

الْإِيمَانِ

الْمُكِينِ

الْقَوِيِّ

الْمُهَيْتِ

الْمُحِي

الْحَمِيدِ

الْوَالِي

الْمُتَيْنِ

الْمُحَلِّدِ

الْوَالِدِ

الْقَيُّومِ

الْحَكِيمِ

الْمُقْتَدِرِ

الْمَلِكِ

الْصَلَامِ

الْأَحَدِ

الْوَلَدِ

الْإِخْرَاجِ

الْأَوَّلِ

الْمُؤَخَّرِ

الْمُقْتَدِرِ

الْمُتَعَلِّقِ

الْعَالِمِ

الْبَاطِنِ

الظَّاهِرِ

التَّوَّابِ

الْعَالِمِ

الْمُبِينِ

العَفْوِ

مَالِكِ

الْمُنْتَقِمِ

الرَّؤُوفِ

الْغَنِيِّ

الْجَامِعِ

الْمُقْسِطِ

الْمُجَلِّدِ

النَّبِيِّ

الضَّالِّ

الْمُنَانِعِ

الْمُعْتَمِدِ

الْعَاشِرِ

الْبَاقِي

الْبَدِيعِ

الْمُهَلِّدِ

النُّورِ

مَالِكِ

الْمُعِينِ

الصَّبُورِ

الشَّدِيدِ

الْمُجِيدِ

الْقَبِيلِ

اللَّهُ
جَلَّ جَلَالُهُ

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

ترجمہ و تفسیر قرآن مجید
اور سب سے پہلے اس کتاب کو نازل کیا جو ہم پر بھیجا گیا اور وہ قرآن ہے

تبیان القرآن

علامہ غلام رسول سعیدی
شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ کراچی - ۳۸

فریدی کا سٹال

۳۸ - اردو بازار لاہور

ابن کثیر علیہ السلام کتاب تفسیر القرآن
اور یہ ہے آپ پر اس کتاب کو نازل کیا ہے جو ہر چیز کا روشن بیان ہے

تفسیر القرآن

کتابت

جلد چہارم

الاعراف • الأنفال

علامہ غلام رسول سعیدی

شیخ الحدیث دارالعلوم نعیمیہ کراچی - ۳۸

ناشر

فریدی بک ٹرال ۳۸ - اردو بازار، لاہور - ۲

Copyright ©

All Rights reserved

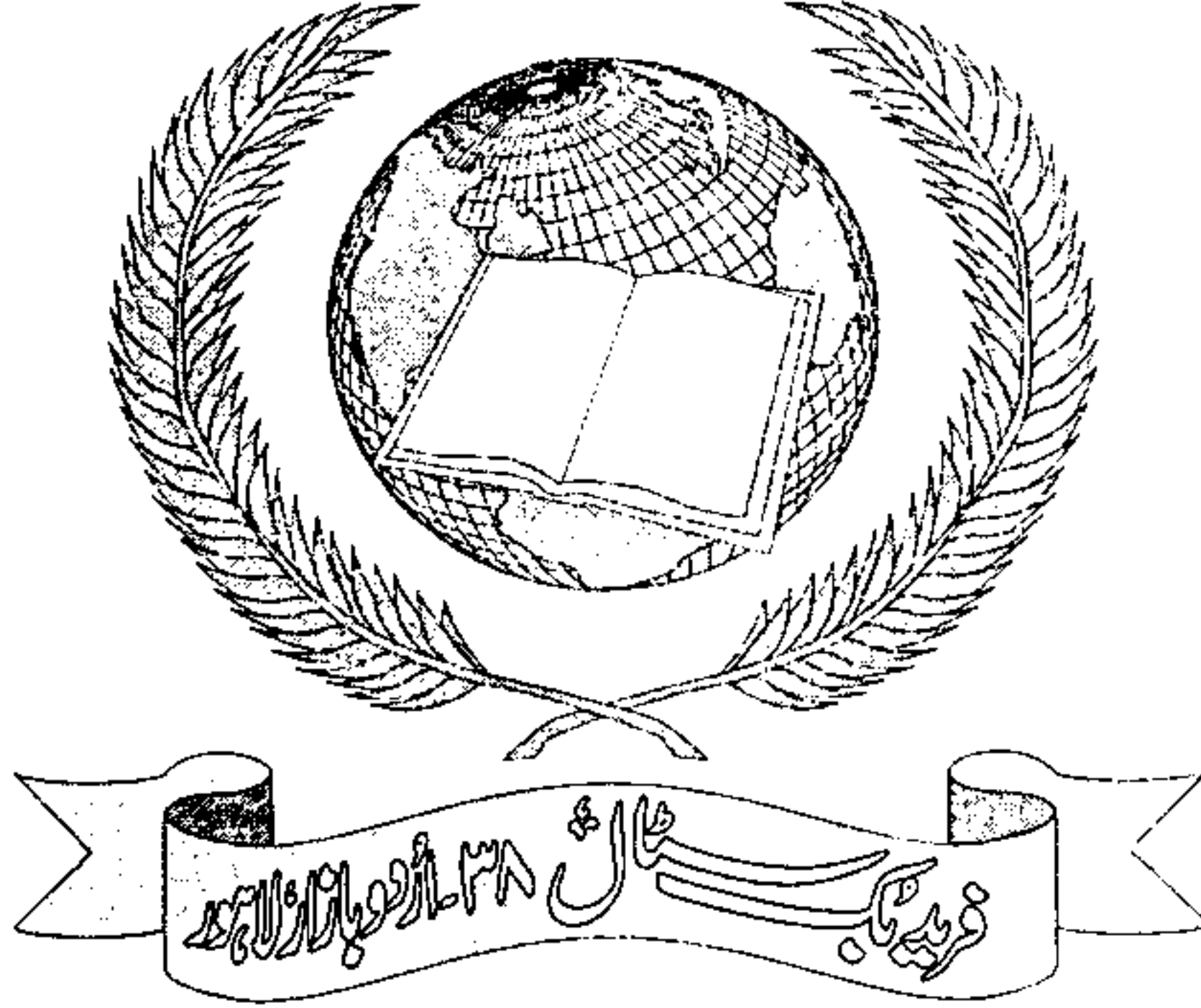
This book is registered under the copyright act. Reproduction of any part, line, paragraph or material from it is a crime under the above act.

جملہ حقوق محفوظ ہیں

یہ کتاب کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہے، جس کا کوئی جملہ، پیرا، لائن یا کسی قسم کے مواد کی نقل یا کاپی کرنا قانونی طور پر جرم ہے۔



ISBN 969-563-013-8



تصحیح : حافظ محمد ابراہیم فیضی، قاری ظہور احمد فیضی
مطبع : رومی پبلی کیشنز اینڈ پرنٹرز لاہور
الطبع الاول : شوال 1420ھ / فروری 2000ء
الطبع عشر : ربیع ثانی 1434ھ / مئی 2013ء

Farid Book Stall

Phone No: 092-42-37312173-37123435

Fax No. 092-42-37224899

Email: info@faridbookstall.com

Visit us at: www.faridbookstall.com

فرید بک اسٹال ۳۸ اردو بازار لاہور

فون نمبر ۰۹۲-۴۲-۳۷۳۱۲۱۷۳-۳۷۱۲۳۴۳۵

فیکس نمبر ۰۹۲-۴۲-۳۷۲۲۴۸۹۹

ای-میل: info@faridbookstall.com

ویب سائٹ: www.faridbookstall.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست مضامین

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۴۲	ایک اشکال کا جواب	۱۳			
۴۳	نزول عذاب کے وقت معذبین کا اعتراف جرم	۱۴			
	قیامت کے دن رسولوں اور ان کی امتوں سے	۱۵			
۴۳	سوالات		۲۷	سورت کا نام	۱
	قیامت کے دن مجرموں سے سوال کرنے اور نہ	۱۶	۲۸	الاعراف کا معنی اور مصداق	۲
۴۵	کرنے کے محال			سورة الاعراف کی آیتوں کی تعداد اور ان کی	۳
	مشکل الفاظ کے معانی اور آیات سابقہ سے	۱۷	۳۰	صفات	
۴۶	مناسبت		۳۱	سورة الاعراف کا زمانہ نزول	۴
۴۶	اعمال کے وزن کے متعلق مذاہب علماء	۱۸	۳۱	سورة الاعراف کے مضامین اور مقاصد	۵
۴۷	قرآن مجید سے میزان کے ثبوت پر دلائل	۱۹	۳۲	سورة الانعام اور سورة الاعراف کی باہمی مناسبت	۶
۴۷	احادیث اور آثار سے میزان کے ثبوت پر دلائل	۲۰	۳۳	المص ○ کتب انزل الیک (۱-۱۰)	۷
	آیا میزان میں صرف مسلمانوں کا وزن ہو گیا	۲۱	۳۵	المص کی تحقیق	۸
۵۰	کافروں کا بھی وزن ہو گا؟			قرآن مجید کی تبلیغ میں نبی ﷺ کے حرج یا	۹
	ان مسلمانوں کی مغفرت کی صورتیں جن کی	۲۲	۳۶	شک کی تحقیق	
۵۰	نیکیاں گناہوں کے برابر یا گناہوں سے کم ہونگی			قرآن مجید سے ڈرانے اور نصیحت کرنے کے	۱۰
	مشکل الفاظ کے معانی اور آیات سابقہ سے	۲۳	۳۸	الک الک محل	
۵۲	مناسبت			احادیث کے حجت ہونے کے دلائل اور ان کی	۱۱
۵۲	معایش کی تفصیل	۲۴	۳۸	حجت کی وضاحت	
۵۳	شکر کا لغوی اور اصطلاحی معانی	۲۵	۴۲	مشکل الفاظ کے معانی اور آیات سابقہ سے مناسبت	۱۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۲۶	شکر کے متعلق قرآن مجید کی آیات	۵۳	۴۷	حضرت آدم کا چاروں غلتوں کی وجہ سے ابلیس سے افضل ہونا	۶۹
۲۷	شکر ادا کرنے کے طریقوں کے متعلق احادیث	۵۳	۴۸	ابلیس کے باطل قیاس کی بناء پر منکرین قیاس کے دلائل اور ان کا تجزیہ	۷۰
۲۸	شکر کی فضیلت کے متعلق احادیث	۵۶	۴۹	مجوزین قیاس کا احادیث سے استدلال	۷۱
۲۹	ولقد خلقناکم ثم صورناکم (۱۱-۱۸)	۵۶	۵۰	مجوزین قیاس کا آثار صحابہ اور اقوال علماء سے استدلال	۷۲
۳۰	آیات سابقہ سے مناسبت	۵۸	۵۱	شیطان کے ساتھ طویل مکالمہ اس کی فضیلت کا موجب نہیں	۷۳
۳۱	ایک اشکال کا جواب	۵۸	۵۲	ابلیس کو جنت سے اترنے کا حکم دیا گیا تھا یا آسمان سے!	۷۴
۳۲	حضرت آدم علیہ السلام کی سوانح کے بعض اہم واقعات	۵۸	۵۳	تواضع کرنے والے کے لیے سر بلندی اور تکبر کرنے والے کے لیے ذلت اور پستی	۷۵
۳۳	حضرت آدم علیہ السلام کی مرحلہ وار تخلیق	۵۹	۵۴	اس بات کی تحقیق کہ ابلیس لعین کو کتنی زندگی کی مہلت دی ہے	۷۶
۳۴	حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد کا مشاہدہ کرانا	۵۹	۵۵	اغواء کا معنی	۷۷
۳۵	حضرت آدم علیہ السلام کی آزمائش	۶۰	۵۶	ابلیس لعین کا جبر اور قدر میں حیران ہونا اور جبر اور قدر میں صحیح مذہب	۷۸
۳۶	حضرت آدم علیہ السلام کا سیدنا محمد ﷺ کے وسیلہ سے دعا کرنا اور اس حدیث کی تحقیق	۶۱	۵۷	ابلیس لعین کا صراط مستقیم سے ہٹانے کی سعی کرنا	۷۸
۳۷	حضرت آدم کے سکون کے لیے حضرت حوا کو پیدا کرنا	۶۲	۵۸	ابلیس لعین کا چار جہات سے حملہ آور ہونا اور اس سے تدارک کی دعا	۷۹
۳۸	حضرت آدم علیہ السلام کا دنیا میں تشریف لانا	۶۳	۵۹	ابلیس لعین کے اس دعویٰ کا سبب کہ اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوں گے	۸۰
۳۹	حضرت آدم علیہ السلام کی وفات	۶۳	۶۰	کیا تمام اہل بدعت اور گمراہ فرقے دوزخی ہیں	۸۱
۴۰	حضرت آدم علیہ السلام کا برزخ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مباحثہ	۶۳	۶۱	یاد ماسکن انت وزوجک الجنہ (۱۹-۲۵)	۸۱
۴۱	سجدہ کا لغوی اور شرعی معنی	۶۵	۶۲	ابلیس کی وسوسہ اندازی، حضرت آدم کا زمین پر	۸۱
۴۲	قرآن مجید میں سجدہ کے اطلاقات	۶۵	۶۳	حضرت آدم سے افضل ہونے پر ابلیس کا یہ استدلال کہ آگ مٹی سے افضل ہے	۸۱
۴۳	ابلیس جن تھا یا فرشتہ؟	۶۶	۶۴	آگ سے مٹی کے افضل ہونے کی دس وجوہات	۸۱
۴۴	امر کا وجوب کے لیے ہونا	۶۶			
۴۵	حضرت آدم سے افضل ہونے پر ابلیس کا یہ استدلال کہ آگ مٹی سے افضل ہے	۶۶			
۴۶	آگ سے مٹی کے افضل ہونے کی دس وجوہات	۶۷			

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	آنا اور توبہ کرنا	۸۳	۷۹	اخلاص ہونے پر فائدہ اور اخلاص نہ ہونے کے	
۶۳	حضرت آدم کے فرشتہ اور دائمی بننے کی طمع پر اعتراضات اور ان کے جوابات	۸۵	۸۰	نقصان کے متعلق ایک اسرائیلی روایت	۹۸
۶۴	آیا شجر ممنوع سے کھانا گناہ تھا؟ اگر گناہ نہیں تھا تو سزا کیوں ملی؟ اور آدم و ابلیس کے معرکہ میں کون کامیاب رہا؟	۸۶	۸۱	اخلاص سے کیا ہوا کم عمل بغیر اخلاص کے زیادہ اعمال سے افضل ہے	۹۹
۶۵	یسنی ادم قد انزلنا علیکم لباسا (۳۱-۲۶)	۸۸	۸۲	انسانوں کے حشر کی کیفیت	۱۰۰
۶۶	مشکل اور اہم الفاظ کے معانی	۸۸	۸۳	ابتداء فطرت میں ہر انسان کا ہدایت یافتہ ہونا	۱۰۰
۶۷	آیات سابقہ سے مناسبت	۸۹	۸۴	برہنہ طواف کی ممانعت کا شان نزول اور لوگوں کے سامنے برہنہ ہونے کی ممانعت	۱۰۱
۶۸	لباس کی نعمت پر شکر ادا کرنا	۹۱	۸۵	تعمیر کعبہ کے وقت تہ بند اتار کر کندھے پر رکھنے کی روایت پر بحث و نظر	۱۰۲
۶۹	مرد اور عورت کی شرم گاہوں کے مصادیق میں مذہب فقہاء	۹۳	۸۶	کھانے پینے میں وسعت کی گنجائش اور اعتدال کا حکم اور بسیار خوری کا اسراف ہونا	۱۰۵
۷۰	حضرت آدم کے جنت سے باہر آنے کا سبب ان کا خلیفہ بننا تھا یا شجر ممنوع سے کھانا	۹۳	۸۷	بسیار خوری کی مذمت میں احادیث پر ہیز کی اہمیت کے متعلق احادیث	۱۰۵
۷۱	جنت کے انسانوں کو دیکھنے اور انسانوں کے جنت کو نہ دیکھنے کی تحقیق	۹۵	۸۸	کھانے پینے کے آداب کے متعلق احادیث	۱۰۶
۷۲	جنت کے انسانوں پر تصرف کرنے کا بطلان	۹۵	۸۹	کھانے پینے کے متعلق احادیث	۱۰۷
۷۳	فاحشہ کا معنی اور مراد اور کفار کے اس قول کا رد کہ اللہ نے فاحشہ کا حکم دیا ہے	۹۳	۹۰	کھڑے ہو کر کھانے پینے کی ممانعت کے متعلق احادیث	۱۰۸
۷۴	قسط اور عدل کے معانی	۹۴	۹۱	کھڑے ہو کر پانی پینے کے جواز کے متعلق احادیث	۱۰۸
۷۵	اخلاص کا معنی	۹۵	۹۲	کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت اور جواز کے متعلق فقہاء اسلام کی آراء	۱۱۰
۷۶	قرآن مجید میں اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم	۹۵	۹۳	وضو کے بچے ہوئے پانی اور زم زم کے پانی کو کھڑے ہو کر پینے کا استحباب	۱۱۲
۷۷	عمل میں اخلاص کے فوائد اور ثواب کے متعلق احادیث	۹۵	۹۴	قل من حرم زینۃ اللہ الٰہی اخرج لعبادہ والطیبۃ من الرزق (۳۹-۳۲)	۱۱۴
۷۸	عمل میں اخلاص نہ ہونے سے نقصان اور عذاب کے متعلق احادیث	۹۷	۹۴	لباس پہننے وقت دعا کرنے اور شکر ادا کرنے کے متعلق احادیث	۱۱۶

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۹۵	لباس کی انواع اور اقسام کے متعلق احادیث	۱۱۶	۱۱۶	کفار کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولنے کے متعدد محال	۱۱۶
۹۶	لباس کے رنگوں کے متعلق احادیث	۱۱۷	۱۱۷	کافروں کے لیے آسمان کا دروازہ نہ کھولنے کے متعلق حدیث	۱۱۷
۹۷	اجلے صاف اور عمدہ لباس پہننے کے متعلق احادیث	۱۱۸	۱۱۸	اہل جنت کے دلوں سے دنیا کی رنجشوں اور شکایتوں کا محو ہو جانا	۱۱۸
۹۸	قیمتی اور معمولی لباس پہننے کی احادیث میں تطبیق	۱۱۹	۱۱۹	کفار کی جنتوں کا مسلمانوں کو وراثت میں ملنا	۱۱۹
۹۹	لباس پہننے کے شرعی اور فقہی احکام	۱۲۱	۱۲۱	جنت میں دخول کا حقیقی سبب اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے نہ کہ نیک اعمال	۱۲۱
۱۰۰	زینت اور تجمل کے متعلق مفسرین مذاہب اربعہ کی تحقیق	۱۲۱	۱۲۱	دخول جنت کے لیے اعمال کو سبب قرار دینے کے محال	۱۲۱
۱۰۱	اشیاء میں اباحت کے اصل ہونے کی تحقیق	۱۲۵	۱۲۵	حشر کے دن کفار کی توبہ کارگر نہیں ہوگی	۱۲۲
۱۰۲	معمولات اہل سنت کا جواز اور استحسان	۱۲۷	۱۲۷	الاعراف کا معنی اور مصداق	۱۲۳
۱۰۳	ان گناہوں کا بیان جو تمام گناہوں کی اصل ہیں	۱۲۸	۱۲۸	ونادی اصحاب الاعراف رجالا	۱۲۳
۱۰۴	ربط آیات	۱۲۹	۱۲۹	(۲۸-۵۳)	۱۲۳
۱۰۵	رسول کا ان لوگوں کی جنس سے ہونا جن کی طرف اس کو مبعوث کیا گیا	۱۲۹	۱۲۹	اصحاب الاعراف کو دخول جنت کا اذن	۱۲۵
۱۰۶	مختار کل کی وضاحت	۱۳۱	۱۳۱	کافروں کو دوزخ میں کھانے پینے سے محروم رکھنے کی سزا دینا	۱۲۶
۱۰۷	نیک مسلمان حشر کے دن آیا گھبراہٹ میں مبتلا ہوں گے یا نہیں	۱۳۲	۱۳۲	اللہ کی راہ میں پانی خرچ کرنے کی اہمیت اور اجر و ثواب	۱۲۷
۱۰۸	گناہ گار مسلمانوں کے لیے دائمی عذاب کا نہ ہونا	۱۳۲	۱۳۲	قرآن مجید کی خصوصیات	۱۲۸
۱۰۹	اللہ پر بہتان باندھنے اور اس کی آیتوں کو جھٹلانے کی تفصیل	۱۳۳	۱۳۳	کفار کے اخروی خسارہ کا بیان	۱۲۹
۱۱۰	کتاب یا لوح محفوظ میں اللہ پر بہتان باندھنے والوں کی سزا	۱۳۳	۱۳۳	ان ربکم اللہ الذی خلق السموت والارض فی ستۃ ایام	۱۳۰
۱۱۱	کتاب کی تفسیر میں دیگر اقوال	۱۳۳	۱۳۳	(۵۳-۵۸)	۱۳۰
۱۱۲	دوزخ میں کفار کے احوال	۱۳۵	۱۳۵	اہم اور مشکل الفاظ کے معانی	۱۳۱
۱۱۳	ضعف کا معنی	۱۳۵	۱۳۵	اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلیل	۱۳۲
۱۱۴	دو گئے عذاب پر ایک سوال کا جواب	۱۳۵	۱۳۵	زمینوں اور آسمانوں کو چھ دنوں میں بنانے کی	۱۳۳
۱۱۵	ان الذین کذبوا بآیتنا واستکبروا عنہا (۴۷-۴۰)	۱۳۵	۱۳۵		۱۳۳

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۱۸۳	ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے متعلق حرف آخر	۱۵۰	۱۵۵	حکمت	
	چالیس حدیثوں کی تبلیغ کرنے والے کے متعلق	۱۵۱		۱۳۴ چھ دنوں کی تفصیل میں احادیث کا اضطراب اور معتبر حدیث کی تحسین	
۱۸۳	نوید اور بشارت	۱۵۵		۱۳۵ عرش پر استواء اور اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کے متعلق شیخ ابن تیمیہ کا موقف	
	چالیس حدیثوں کی تبلیغ پر بشارت کی احادیث کی فنی حیثیت	۱۵۲	۱۵۸	۱۳۶ استواء اور صفات کے مسئلہ میں شیخ ابن تیمیہ کے مخالفین	
۱۸۵	حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے قواعد اور شرائط	۱۵۳		۱۳۷ استواء اور صفات کے مسئلے میں شیخ ابن تیمیہ کے موافقین	
۱۸۶	دعا میں حد سے بڑھنے کا ممنوع ہونا	۱۵۴	۱۵۹	۱۳۸ استواء اور صفات کے مسئلہ میں متقدمین احناف کا موقف	
۱۸۷	محسنین کا معنی	۱۵۵		۱۳۹ استواء اور صفات کے مسئلہ میں متقدمین شافعیہ کا موقف	
	اس کائنات میں حشر کے دن مردوں کو زندہ کرنے کی نشانی	۱۵۶	۱۶۰	۱۴۰ استواء اور صفات کے مسئلہ میں متقدمین مالکیہ کا موقف	
۱۸۷	اچھی اور خراب زمینوں میں مسلمانوں اور کافروں کی مثال	۱۵۷		۱۴۱ استواء اور دیگر صفات کے مسئلہ میں متقدمین	
	لقد ارسلنا نوحا والی قومہ فقال یقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ (۶۳-۵۹)	۱۵۸	۱۶۲	۱۴۲ استواء اور دیگر صفات کے مسئلہ میں متاخرین کی آراء	
۱۸۹	حضرت نوح کا نام و نسب اور ان کی تاریخ ولادت	۱۵۹		۱۴۳ مانعین دعا کے دلائل	
۱۹۰	بت پرستی کی ابتداء کیسے ہوئی؟	۱۶۰	۱۶۵	۱۴۴ مانعین دعا کے دلائل کے جوابات	
	حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت اور ان کا اول رسل ہونا	۱۶۱		۱۴۵ دعا قبول نہ ہونے کے فوائد	
۱۹۱	حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کا بیان	۱۶۲	۱۶۹	۱۴۶ دعا کی ترغیب اور فضیلت میں احادیث	
	حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر طوفان کا عذاب	۱۶۳		۱۴۷ آہستہ دعا کرنے کے فوائد اور نکات	
۱۹۳	طوفان نوح اور کشتی کی بعض تفصیلات	۱۶۴	۱۷۰	۱۴۸ خارج نماز دعا کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانے کے متعلق مذاہب فقہاء	
	حضرت نوح علیہ السلام کی عمر	۱۶۵	۱۷۱	۱۴۹ خارج نماز دعا کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانے کے متعلق احادیث	
۱۹۵	قصہ نوح نازل کرنے کے فوائد	۱۶۶	۱۷۳		
	اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے پر دلیل	۱۶۷			
۱۹۶	اہم اور مشکل الفاظ کے معانی	۱۶۸			
	حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت پر قوم نوح کے استبعاد اور تعجب کی وجوہات	۱۶۹	۱۷۷		
۱۹۶					

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۲۱۲	قوم ثمود کے قصہ کے متعلق احادیث اور آثار	۱۸۸	۱۹۷	قوم نوح کے استبعاد اور نوح کا ازالہ	۱۷۰
	ولو طاء اذ قال لقومه اتاتون	۱۸۹	۱۹۸	والی عاد اخواہم ہود (۷۲-۶۵)	۱۷۱
	الفاحشة ما سبقکم یہا من		۱۹۹	حضرت ہود علیہ السلام کا شجرہ نسب	۱۷۲
۲۱۳	احد من العلمین (۸۳-۸۰)		۲۰۰	حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد کی طرف بعثت	۱۷۳
۲۱۳	حضرت لوط علیہ السلام کا شجرہ نسب	۱۹۰		عاد کی قوت اور سطوت اور ان پر عذاب نازل	۱۷۴
۲۱۳	حضرت لوط علیہ السلام کا مقام بعثت	۱۹۱	۲۰۰	ہونے کے متعلق قرآن مجید کی آیات	
	حضرت لوط علیہ السلام کے ہاں فرشتوں کا حسین	۱۹۲	۲۰۲	قوم عاد کے وطن کی تاریخی حیثیت	۱۷۵
۲۱۵	اور نوخیز لڑکوں کی شکل میں مہمان ہونا		۲۰۳	صالحین کے عرس کی تحقیق	۱۷۶
۲۱۵	قوم لوط میں ہم جنس پرستی کی ابتداء	۱۹۳		حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ اور حضرت نوح	۱۷۷
	حضرت لوط کی بیوی کی خیانت اور قوم لوط کی بری	۱۹۳	۲۰۳	علیہ السلام کے قصہ کے مابین فرق	
۲۱۶	عاد تیں			حضرت نوح اور حضرت ہود علیہما السلام کے	۱۷۸
۲۱۶	عمل قوم لوط کی عقلی قباحتیں	۱۹۵		مقابلہ میں سیدنا محمد ﷺ کی زیادہ عزت اور	
۲۱۷	قرآن مجید میں عمل قوم لوط کی مذمت	۱۹۶	۲۰۵	وجاہت	
	احادیث میں عمل قوم لوط کی مذمت اور سزا کا	۱۹۷	۲۰۶	اللہ تعالیٰ توحید اور استحقاق عبادت پر دلیل	۱۷۹
۲۱۷	بیان			والی ثمود اخواہم صالحا	۱۸۰
۲۱۹	عمل قوم لوط کی سزائیں مذاہب فقہاء	۱۹۸	۲۰۷	(۷۳-۷۹)	
۲۱۹	قوم لوط پر عذاب کی کیفیت	۱۹۹	۲۰۹	قوم ثمود کی اجمالی تاریخ	۱۸۱
	والی مدین اخواہم شعیبا	۲۰۰		حضرت صالح علیہ السلام کا نسب اور قوم ثمود کی	۱۸۲
۲۲۰	(۸۵-۸۷)		۲۰۹	طرف ان کی بعثت	
۲۲۱	حضرت شعیب کا نام اور نسب	۲۰۱		قوم ثمود کا حضرت صالح علیہ السلام سے معجزہ	۱۸۳
۲۲۱	مدین اور اصحاب الایکھ ایک قوم ہیں یا الگ الگ	۲۰۲		طلب کرنا اور معجزہ دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لانا	
۲۲۲	حضرت شعیب کا مقام بعثت	۲۰۳	۲۰۹	اور ان پر عذاب کا نازل ہونا	
۲۲۲	حضرت شعیب کی قوم پر عذاب کا نزول	۲۰۴		قوم ثمود کی سرکشی اور ان پر عذاب نازل کرنے	۱۸۴
۲۲۳	حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر	۲۰۵	۲۱۰	کے متعلق قرآن مجید کی آیات	
۲۲۴	ڈراوہم کا کرنا جائز رقم بٹورنے والے	۲۰۶	۲۱۱	اونٹنی کا قاتل ایک شخص تھا یا پوری قوم ثمود	۱۸۵
۲۲۵	قوم شعیب کو ترغیب و ترہیب	۲۰۷	۲۱۲	اونٹنی کے معجزہ ہونے کی وجوہات	۱۸۶
	قال الملا الذین استکبروا من	۲۰۸		قوم ثمود کے عذاب کی مختلف تعبیریں اور ان	۱۸۷
۲۲۵	قومہ (۹۳-۸۸)		۲۱۲	میں وجہ تطبیق	

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۲۰۹	حضرت شعیب علیہ السلام کے کفر میں لوٹنے کے اعتراض کے جوابات	۲۲۶	۲۲۸	معجزات سے امتیاز	۲۳۷
۲۱۰	توکل کا لغوی اور اصطلاحی معنی	۲۲۷	۲۲۹	معجزہ کی تعریفات	۲۳۸
۲۱۱	لوہے سے داغنے اور دم کرانے پر توکل سے بری ہونے کا اشکال	۲۲۷	۲۳۰	معجزہ کی شرائط	۲۳۸
۲۱۲	دوا کرنے اور علاج کرانے کے متعلق احادیث	۲۲۸	۲۳۱	افعال غیر عادیہ کی دیگر اقسام	۲۳۹
۲۱۳	دوا اور دم سے نبی ﷺ کا علاج کرانا	۲۲۸	۲۳۱	معجزات انبیاء کے اختیار میں ہونے پر محدثین	۲۳۹
۲۱۴	اشکال مذکور کا جواب	۲۲۹	۲۳۲	فقہاء اور متکلمین کے دلائل	۲۳۹
۲۱۵	توکل کی تعریف پر ایک اور اشکال کا جواب	۲۲۹	۲۳۲	معجزات پر انبیاء کے اختیار کے ثبوت میں	۲۳۹
۲۱۶	نزول عذاب سے حضرت شعیب علیہ السلام کی نبوت کی صداقت	۲۳۰	۲۳۳	احادیث	۲۴۱
۲۱۷	وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اهلہا (۹۹-۹۴)	۲۳۱	۲۳۳	انبیاء کے اختیار میں معجزات ہونے پر ایک اشکال کا جواب	۲۴۳
۲۱۸	مشکل الفاظ کے معانی	۲۳۲	۲۳۴	معجزات کے صدور میں علماء دیوبند کا موقف	۲۴۳
۲۱۹	رنج اور راحت کے نزول میں کافروں اور مسلمانوں کے احوال اور افعال کا فرق	۲۳۲	۲۳۵	معجزات کے صدور میں علماء اہل سنت کا موقف	۲۴۳
۲۲۰	نیک اعمال نزول رحمت کا سبب ہیں اور بد اعمال نزول عذاب کا باعث ہیں	۲۳۳	۲۳۶	پہلے تکذیب کرنے کی وجہ سے بعد میں ایمان نہ لانے کی توجیہات	۲۴۶
۲۲۱	اولم ینہد للذین یرثون الارض من بعد اهلہا (۱۰۸-۱۰۰)	۲۳۴	۲۳۷	دعاؤں سے مصیبت ٹلنے کے بعد اللہ کو فراموش کر دینا	۲۴۶
۲۲۲	کفار مکہ پر عذاب نہ بھیجنے کی وجہ	۲۳۵	۲۳۸	حضرت آدم سے حضرت موسیٰ اور حضرت موسیٰ سے ہمارے نبی ﷺ تک کا زمانہ	۲۴۷
۲۲۳	کفار مکہ کے دلوں پر مہر لگانے کی توجیہ	۲۳۶	۲۳۹	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش پرورش	۲۴۷
۲۲۴	سابقہ امتوں کے عذاب سے کفار مکہ کا سبق حاصل نہ کرنا	۲۳۶	۲۴۰	نکاح نبوت اور فرعون کو تبلیغ	۲۴۸
۲۲۵	سیدنا محمد ﷺ کا علم غیب اور آپ کی رسالت پر دلیل	۲۳۶	۲۴۱	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات	۲۵۱
۲۲۶	تمام نبی حاصل معجزہ ہیں	۲۳۷	۲۴۱	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر	۲۵۲
۲۲۷	نبی ﷺ کے معجزہ کا دیگر انبیاء علیہم السلام کے	۲۳۷	۲۴۲	فرعون کے دعویٰ خدائی کا رد	۲۵۳
			۲۴۳	قبلیوں کا بنو اسرائیل کو غلام بنانا	۲۵۳
			۲۴۴	قال الملا من قوم فرعون ان هذا لسحر علیہم (۱۲۶-۱۰۹)	۲۵۵
			۲۴۵	ہر نبی کا معجزہ اس چیز کی جنس سے ہوتا ہے جس چیز کا اس زمانہ میں چرچا ہو	۲۵۷

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۲۷۸	بدشگونئی کے سلسلے میں خلاصہ بحث	۲۶۸	۲۵۷	سحر کی تعریف اور سحر اور معجزہ میں فرق	۲۳۶
۲۷۹	قوم فرعون پر طوفان اور نڈی دل وغیرہ بھیجنے کا عذاب	۲۶۹	۲۵۹	سحر اور ساحر کا شرعی حکم	۲۳۷
۲۸۰	ستر ہزار فرعونوں کا طاعون میں مبتلا ہونا	۲۷۰	۲۵۹	سحر کے سیکھنے اور سکھانے کا حکم	۲۳۸
۲۸۱	عقائد میں تقلید کا مذموم ہونا اور فروع میں تقلید کا ناگزیر ہونا	۲۷۱	۲۶۰	حضرت موسیٰ اور فرعون کے جادو گروں کا مقابلہ	۲۳۹
۲۸۲	بنو اسرائیل کو شام پر قابض کرنا	۲۷۲	۲۶۲	جادو گروں کے ایمان لانے میں علم کی فضیلت	۲۵۰
۲۸۳	سرزمین شام کی زمین کی فضیلت کے متعلق احادیث	۲۷۳	۲۶۲	رب موسیٰ و ہارون کہنے کی وجہ	۲۵۱
۲۸۴	مشکل اور اہم الفاظ کے معانی	۲۷۴	۲۶۳	فرعون کا عوام کو شبہات میں ڈالنا	۲۵۲
۲۸۵	مناسبت اور ربط آیات	۲۷۵	۲۶۳	آیا فرعون اپنی دھمکی پر عمل کر سکیا نہیں؟	۲۵۳
۲۸۶	بنو اسرائیل نے کون سا سمندر پار کیا تھا اور کس جگہ کسی قوم کو بتوں کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا تھا؟	۲۷۶	۲۶۳	راہ حق میں قربانی دینے کے لیے تیار رہنا	۲۵۴
۲۸۷	شُرک کے فعل کا جہالت اور حماقت ہونا	۲۷۷	۲۶۳	وقال الملا من قوم فرعون اتذر موسیٰ (۱۲۹-۱۲۷)	۲۵۵
۲۸۸	بنو اسرائیل کی ناشکری اور احسان فراموشی	۲۷۸	۲۶۵	فرعون کے معبود کی تفسیر میں اقوال	۲۵۶
۲۸۹	کسی مسلمان موجد کو شرک قرار دینے کا بطلان	۲۷۹	۲۶۶	اللہ پر ایمان کامل کی وجہ سے مصائب کا آسان ہو جانا	۲۵۷
۲۹۰	وعدنا موسیٰ ثلاثین لیلة (۱۳۲-۱۳۷)	۲۸۰	۲۶۶	کسی بات کو سمجھنے کے لیے سوال کرنے کا جواز	۲۵۸
۲۹۱	ربط آیات، مناسبت اور موضوع	۲۸۱	۲۶۶	ولقد اخذنا ل فرعون	۲۵۹
۲۹۲	حضرت موسیٰ کے لیے پہلے تیس راتیں اور پھر دس راتیں مزید مقرر کرنے کی حکمت	۲۸۲	۲۶۷	بالسنین (۱۳۱-۱۳۰)	۲۶۰
۲۹۳	میقات کا معنی اور کسی کام کی مدت مقرر کرنے کی اصل	۲۸۳	۲۶۷	مشکل اور اہم الفاظ کے معانی	۲۶۱
۲۹۴	بندوں کے اعذار کی آخری مدت ساٹھ سال ہے	۲۸۴	۲۶۷	قوم فرعون پر پے در پے بلائیں اور آفتیں نازل کرنے کی حکمت	۲۶۲
۲۹۵	شمسی اور قمری تاریخ مقرر کرنے کا ضابطہ	۲۸۵	۲۶۷	فال اور شگون نکالنے کی تحقیق	۲۶۳
۲۹۶	حضرت ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنانا اور ان کو نصیحت فرمانان کی شان میں کمی کا موجب نہیں	۲۸۶	۲۶۷	بدشگونئی کی ممانعت کا سبب	۲۶۴
۲۹۷		۲۸۷	۲۶۷	نیک فال کے جواز کا سبب اور بد فال کو شرک قرار دینے کی توجیہ	۲۶۵
			۲۶۷	عورت، مکان اور گھوڑے میں بدشگونئی کی توجیہ	۲۶۶
			۲۶۷	بدشگونئی لینا کفار کا طریقہ ہے	۲۶۷
			۲۶۷	کسی چیز سے بدشگونئی لینے یا کسی دن کو منحوس قرار دینے کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات	۲۶۷

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۳۰۶	گیارہویں جواب کے ضمن میں نبی ﷺ کی شان میں غلو کرنے کی ممانعت	۳۰۴	۲۹۳	حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ کے لیے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) بمنزلہ ہارون ہیں	۲۸۷
۳۱۰	صعقہ کا معنی	۳۰۵	۲۹۵	حدیث مذکورہ سے روافض کا حضرت علی کی خلافت بلا فصل پر استدلال	۲۸۸
۳۱۱	انبیاء علیہم السلام کی حیات پر دلائل	۳۰۶	۲۹۵	روافض کے استدلال مذکور کا جواب	۲۸۹
۳۱۲	دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبی ﷺ پر فضیلت جزی کی تحقیق	۳۰۷	۲۹۵	حضرت ابن ام مکتوم کو تمام مغازی میں خلیفہ بنانا	۲۹۰
۳۱۳	دیدار نہ کرانے کی تلافی میں کلام سے مشرف فرمانا	۳۰۸	۲۹۶	حضرت ابن ام مکتوم کی خلافت سے حضرت علی کے متعلق مزعوم خلافت بلا فصل پر معارضہ	۲۹۱
۳۱۳	تورات کی تختیوں کا مادہ تعداد اور نزول کی تاریخ	۳۰۹	۲۹۷	اللہ تعالیٰ کے کلام کے متعلق مذاہب اسلام	۲۹۲
۳۱۴	تورات میں ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل مذکور ہونے کی توجیہ	۳۱۰	۲۹۷	اللہ تعالیٰ کے کلام کی کیفیت کے متعلق احادیث اور آثار	۲۹۳
۳۱۵	تورات کے احکام کا درجہ بہ درجہ ہونا	۳۱۱	۲۹۸	اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی بعض تفصیلات	۲۹۴
۳۱۶	الواح تورات میں نبی ﷺ اور آپ کی امت کی خصوصیات	۳۱۲	۲۹۹	اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کے متعلق اہل قبلہ کے مذاہب	۲۹۵
۳۱۸	اللہ کی آیات سے کفار کے دلوں کو پھیرنے کی توجیہ	۳۱۳	۳۰۰	مکرمین رویت کے دلائل اور ان کے جوابات	۲۹۶
۳۱۸	تکبر کا لغوی اور شرعی معنی	۳۱۴	۳۰۱	اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے پر اہل سنت کے قرآن مجید سے دلائل	۲۹۷
۳۱۹	تکبر کی مذمت اور اس پر وعید کے متعلق قرآن مجید کی آیات	۳۱۵	۳۰۲	اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کے متعلق احادیث	۲۹۸
۳۲۰	تکبر کی مذمت اور اس پر وعید کے متعلق احادیث	۳۱۶	۳۰۲	اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے پر قرآن مجید سے ایک اور دلیل	۲۹۹
۳۲۱	تکبر کی وجہ سے نخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے کا مکروہ تحریمی ہونا اور تکبر کے بغیر مکروہ تحریمی نہ ہونا	۳۱۷	۳۰۳	مکرمین رویت کے ایک اور اعتراض کا جواب	۳۰۰
۳۲۲	تکبر کے بغیر نخنوں سے نیچے لباس لٹکانے کے متعلق فقہاء احناف کی تصریحات	۳۱۸	۳۰۴	انبیاء علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دینے کے متعلق حدیث	۳۰۱
۳۲۳	تکبر کے بغیر نخنوں سے نیچے لباس رکھنے کے جواز پر شافعی، مالکی اور حنبلی فقہاء کی تصریحات	۳۱۹	۳۰۴	”مجھے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت مت دو“ اس حدیث کے جوابات	۳۰۲
۳۲۴	نخنوں سے نیچے پانچ لٹکانے میں علماء دیوبند کا موقف	۳۲۰	۳۰۵	دوسرے جواب کے ضمن میں تمام انبیاء پر نبی ﷺ کی فضیلت کے متعلق احادیث	۳۰۳

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۳۲۳	حالت غضب میں طلاق دینے کا شرعی حکم	۳۳۹	۳۲۵	مطلق کو مقید پر محمول کرنے یا نہ کرنے کے قواعد	۳۲۱
۳۲۵	شہادت کا معنی اور اس کا شرعی حکم	۳۴۰	۳۲۶	شیخ تھانوی کے دلائل پر بحث و نظر	۳۲۲
۳۲۵	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء مغفرت کی توجیہ	۳۴۱	۳۲۸	شیخ کشمیری اور شیخ میرٹھی کے دلائل	۳۲۳
	ان الذین اتخذوا العجل	۳۴۲		شیخ کشمیری، شیخ میرٹھی اور جسٹس عثمانی کے	۳۲۴
۳۲۶	سینا لہم (۱۵۲-۱۵۷)		۳۲۹	دلائل پر بحث و نظر	
	توبہ قبول کرنے کے باوجود بنو اسرائیل پر عذاب	۳۴۳		ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانے کے متعلق مصنف	۳۲۵
۳۲۸	کی و عید کی توجیہ	۳۴۰		کی تحقیق	
۳۲۸	بدعت سینہ کی تعریف	۳۴۳	۳۳۱	ٹخنوں سے نیچے لباس رکھنے کے متعلق حرف آخر	۳۲۶
	توبہ کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا عموم	۳۴۵	۳۳۲	کفار کی نیکیوں کا ضائع ہو جانا	۳۲۷
۳۲۹	اور شمول	۳۴۳		فرائض اور واجبات کے ترک پر مواخذہ کی دلیل	۳۲۸
۳۵۰	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے غصہ کی تلافی کرنا	۳۴۶		واتخذ قوم موسیٰ من بعدہ	۳۲۹
۳۵۱	تورات کی تختیاں ٹوٹی تھیں یا نہیں	۳۴۷	۳۳۳	(۱۴۸، ۱۵۱)	
	ستر اسرائیلیوں کے انتخاب کے سلسلہ میں	۳۴۸		بنو اسرائیل کے پھڑا بنانے اور اس کی پرستش	۳۳۰
۳۵۱	مختلف روایات	۳۴۳		کرنے کے متعلق روایات	
	سورۃ البقرہ میں الصاعقہ اور سورۃ الاعراف میں	۳۴۹		کلام کرنے اور ہدایت دینے پر مدار الوہیت کی	۳۳۱
۳۵۳	الرجفہ فرمانے کی توجیہ	۳۳۶		توجیہ	
	کیا موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ	۳۵۰	۳۳۷	لماسقط فی ایدیہم کا معنی	۳۳۲
	گمان تھا کہ وہ ستر اسرائیلیوں کی وجہ سے ان کو			قوم کی گمراہی پر حضرت موسیٰ آیا طور سے واپسی	۳۳۳
۳۵۳	ہلاکت میں مبتلا کرے گا؟	۳۳۸		پر مطلع ہوئے یا پہلے	
	اللہ کے معاف کرنے اور مخلوق کے معاف کرنے	۳۵۱		غضب کا معنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے	۳۳۴
۳۵۳	میں فرق	۳۳۸		غضب کا تعین	
	حضرت موسیٰ نے دنیا اور آخرت کی جس بھلائی کا	۳۵۲		غیظ و غضب کو ضبط کرنے اور بدلہ نہ لینے کے	۳۳۵
۳۵۳	سوال کیا تھا وہ کیا چیز تھی؟	۳۴۹		متعلق قرآن مجید کی آیات	
۳۵۱	نبی اور رسول کے معنی	۳۵۳		غیظ و غضب کو ضبط کرنے اور بدلہ نہ لینے کے	۳۳۶
۳۵۱	قرآن اور سنت میں نبی ﷺ پر ای کا اطلاق	۳۵۳	۳۳۹	متعلق احادیث	
۳۵۷	امی کا لغوی معنی	۳۵۵	۳۴۱	تورات کی تختیوں کو زمین پر ڈالنے کی توجیہ	۳۳۷
	رسول اللہ ﷺ کے لکھنے اور پڑھنے پر قرآن	۳۵۶		حضرت ہارون علیہ السلام کو سر کے بالوں سے پکڑ	۳۳۸
۳۵۹	مجید سے دلائل		۳۴۲	کر کھینچنے کی توجیہ اور دیگر فوائد	

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۳۵۷	رسول اللہ ﷺ کے لکھنے پر سید مودودی کے اعتراضات اور ان کے جوابات	۳۷۰	۳۷۰	رسول اللہ ﷺ کے لکھنے کے ثبوت میں احادیث	۳۸۹
۳۵۸	رسول اللہ ﷺ کے لکھنے کے ثبوت میں احادیث	۳۷۰	۳۷۰	رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا ادب اور احترام	۳۸۹
۳۵۹	نبی ﷺ کے لکھنے کے متعلق محدثین کی تحقیق	۳۷۰	۳۷۰	رسول اللہ ﷺ کا ادب قرآن مجید کے عمل پر مقدم ہے	۳۹۰
۳۶۰	تورات اور انجیل میں نبی ﷺ کی بشارتوں کے متعلق احادیث	۳۷۳	۳۷۳	سیدنا محمد ﷺ کی رسالت کے عموم اور شمول پر قرآن مجید کی آیات	۳۹۳
۳۶۱	موجودہ تورات کے متن میں نبی ﷺ کے متعلق بشارتیں	۳۷۸	۳۷۸	سیدنا محمد ﷺ کی رسالت کے عموم اور شمول پر احادیث	۳۹۳
۳۶۲	موجودہ انجیل کے متن میں نبی ﷺ کے متعلق بشارتیں	۳۷۸	۳۷۸	وہ معجزات جو سیدنا محمد ﷺ کی ذات مبارکہ میں ہیں اور جو آپ سے صادر ہوئے	۳۹۵
۳۶۳	امرا المعروف اور نبی عن المنکر میں نبی ﷺ کی خصوصیات	۳۷۹	۳۷۹	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کے نیک لوگوں کا مصداق	۳۹۶
۳۶۴	اشیاء کو حلال اور حرام کرنا نبی ﷺ کا منصب ہے	۳۷۹	۳۸۰	اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مقابلہ میں بنو اسرائیل کی نافرمانیاں	۳۹۷
۳۶۵	الطیبات اور الخبائث کی تفسیر میں مذاہب اربعہ	۳۷۹	۳۸۱	وسئلہم عن القریة (۱۷۱-۱۷۳)	۳۹۹
۳۶۶	بنو اسرائیل کے بوجھ اور ان کے طوق کا اتارنا	۳۷۹	۳۸۲	نافرمانی پر اصرار کرنے والے اسرائیلیوں کو بندر بنانے کی تفصیل	۴۰۰
۳۶۷	نبی ﷺ کی تعظیم و توقیر کے متعلق قرآن مجید کی آیات	۳۷۹	۳۸۳	تبلیغ کافر فرض کفایہ ہونا	۴۰۲
۳۶۸	رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کے لیے شرعی حکم کی تحقیق	۳۷۹	۳۸۴	بعض احکام کا استنباط	۴۰۳
۳۶۹	احادیث اور آثار میں غیر مسلم گستاخ رسول کو قتل کرنے کی تصریحات	۳۷۹	۳۸۵	فلسطین میں اسرائیل کا قیام قرآن مجید کے خلاف نہیں ہے	۴۰۴
۳۷۰	غیر مسلم گستاخ رسول کو قتل کرنے کے متعلق فقہاء مذاہب اربعہ کی تصریحات	۳۷۹	۳۸۶	یہودیوں میں نیکو کار اور بدکار	۴۰۵
۳۷۱	نبی ﷺ کی تعظیم و توقیر میں صحابہ کرام کا عمل	۳۷۹	۳۸۷	خلف اور خلف کا معنوی فرق	۴۰۶
۳۷۲	وفات کے بعد بھی نبی ﷺ کی تعظیم و تکریم	۳۷۹	۳۸۸	گناہوں پر اصرار کے ساتھ اجر و ثواب کی طمع کی مذمت	۴۰۶
			۳۸۹	واذا اخذ ربک من بنی آدم (۱۸۱-۱۷۲)	۴۰۸
			۳۹۰	بنو آدم سے میثاق لینے کے متعلق احادیث	۴۱۰

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۴۲۶	اللہ تعالیٰ کے اسماء کے تو فیضی ہونے کی تحقیق	۴۱۲	۴۱۱	میشاق لینے کا مقام	۳۹۱
۴۲۸	اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) اسماء کی تفصیل	۴۱۳		میشاق حضرت آدم کی پشت سے ذریت نکال کر لیا	۳۹۲
۴۲۹	اسم اعظم کی تحقیق	۴۱۴	۴۱۱	گیا تھا یا بنو آدم کی پشتوں سے	
۴۳۰	الحاد کا معنی	۴۱۵	۴۱۲	میشاق کے حجت ہونے پر ایک اور اشکال کا جواب	۳۹۳
۴۳۰	اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد کی تفصیل	۴۱۶	۴۱۲	کیا یہ میشاق کسی کو یاد ہے؟	۳۹۴
	اللہ تعالیٰ کے اسماء تو فیضی ہونے پر مذہب اربعہ	۴۱۷	۴۱۲	نبی ﷺ کا اصل کائنات ہونا	۳۹۵
۴۳۱	کے مفسرین کی تصریحات			واتل علیہم نبا الذی کے شان	۳۹۶
	اس امت میں بھی حق کی ہدایت دینے والے اور	۴۱۸	۴۱۳	نزول میں مختلف روایات	
۴۳۲	حق کے ساتھ عدل کرنے والے ہیں		۴۱۵	بد عمل اور رشوت خور عالم کی مذمت	۳۹۷
۴۳۲	اجماع کے حجت ہونے پر احادیث	۴۱۹		بد عمل اور رشوت خور عالم کی کتے کے ساتھ	۳۹۸
۴۳۳	والذین کذبوا بآیتنا (۱۸۲-۱۸۸)	۴۲۰	۴۱۶	مماثلت کا بیان	
۴۳۵	مشکل الفاظ کے معانی	۴۲۱		ہانپنے والے کتے کی مثال کا تمام گمراہوں اور	۳۹۹
۴۳۶	تفکر کا معنی	۴۲۲	۴۱۷	کافروں کو شامل ہونا	
	جاہل کفار نبی ﷺ کو کیوں مجنون کہتے تھے اور	۴۲۳	۴۱۷	آیات مذکورہ سے مستنبط شدہ احکام شرعیہ	۴۰۰
۴۳۷	اس کا جواب			ہدایت اور گمراہی کا اللہ کی جانب سے ہونے کا	۴۰۱
۴۳۷	اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت پر دلائل	۴۲۴	۴۱۸	معنی	
۴۳۹	آیا بغیر دلیل کے ایمان لانا صحیح ہے یا نہیں؟	۴۲۵		بست سے جنات اور انسانوں کو دوزخ کے لیے	۴۰۲
۴۴۰	کافروں کو گمراہی پر پیدا کرنے کا معنی	۴۲۶	۴۱۹	پیدا کرنے کی توجیہ	
۴۴۰	آیات سابقہ سے ارتباط	۴۲۷	۴۲۰	عقل کا محل دل ہے یا دماغ؟	۴۰۳
۴۴۱	مشکل الفاظ کے معانی	۴۲۸	۴۲۱	دماغ کے محل عقل ہونے پر دلائل	۴۰۴
۴۴۱	وقت وقوع قیامت کو مخفی رکھنے کی حکمت	۴۲۹		قرآن اور حدیث میں دل کی طرف عقل اور	۴۰۵
	علم قیامت کے متعلق لوگوں کے سوالات اور نبی	۴۳۰	۴۲۱	ادراک کی نسبت کرنے کی توجیہ	
۴۴۲	ﷺ کے جوابات		۴۲۲	عقل کی تعریف میں علماء کے اقوال	۴۰۶
۴۴۳	نبی ﷺ کا علامات قیامت کی خبر دینا	۴۳۱	۴۲۳	محل عقل کے بارے میں ائمہ مذہب کے اقوال	۴۰۷
	رسول اللہ ﷺ کو علوم خمسہ اور علم روح	۴۳۲	۴۲۴	کفار کا جانوروں سے زیادہ گمراہ ہونا	۴۰۸
	وغیرہ دیے جانے کے متعلق علماء اسلام کے		۴۲۴	آیت سابقہ سے ارتباط	۴۰۹
۴۴۷	نظریات		۴۲۴	اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کا معنی	۴۱۰
	رسول اللہ ﷺ کو علوم خمسہ اور علم روح	۴۳۳	۴۲۵	اسم مسیٰ کا معنی ہے یا غیر	۴۱۱

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	و غیرہ دیے جانے کے متعلق جمہور علماء اسلام کی تصریحات	۴۴۸	۴۴۹	رسول اللہ ﷺ کے علم غیب کے متعلق احادیث	۴۴۴
۴۳۴	اللہ تعالیٰ کی ذات میں علوم خمسہ کی انحصار کی خصوصیت کا باعث	۴۵۱	۴۵۰	رسول اللہ ﷺ سے یہ کہلوانے کی توجیہ کہ اگر میں غیب کو جانتا تو خیر کثیر جمع کر لیتا	۴۸۴
۴۳۵	اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کے علم میں فرق کے متعلق اعلیٰ حضرت کا نظریہ	۴۵۲	۴۵۱	رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب کہنے اور آپ کی طرف علم غیب کی نسبت کرنے میں علماء دیوبند کا نظریہ	۴۸۵
۴۳۶	علم کی ذاتی اور عطائی کی تقسیم کے متعلق علماء اسلام کی تصریحات	۴۵۳	۴۵۲	رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب کہنے اور آپ کی طرف علم غیب کی نسبت کرنے میں اعلیٰ حضرت کا نظریہ	۴۸۶
۴۳۷	قرآن اور سنت میں نبی ﷺ کے علم کے عموم اور علم ماکان و مایکون کی تصریحات	۴۵۷	۴۵۳	ہو الذی خلقکم من نفس واحدۃ (۱۸۹-۱۹۵)	۴۸۸
۴۳۸	نبی ﷺ کے علم کے عموم اور علم ماکان و مایکون کے متعلق علماء اسلام کی تصریحات	۴۶۱	۴۵۴	ان روایات کی تحقیق جن میں مذکور ہے کہ حضرت آدم اور حوا نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث رکھا	۴۸۹
۴۳۹	شیخ اسماعیل دہلوی کا رسول اللہ ﷺ کی آخرت میں نفع رسائی پر انکار	۴۶۲	۴۵۵	جعل لہ شرکاء (انہوں نے اللہ کے شریک بنا لیے) کی توجیہات	۴۹۰
۴۴۰	شیخ اسماعیل دہلوی کی تقریر کا رد اور ابطال	۴۶۳	۴۵۶	غلط طریقہ سے نام لینے اور نام بگاڑنے کی مذمت	۴۹۲
۴۴۱	اہل بیت اور دیگر قرابت داروں کو رسول اللہ ﷺ کا آخرت میں نفع پہنچانا	۴۶۴	۴۵۷	بچوں کا نام رکھنے کی تحقیق	۴۹۲
۴۴۲	نفع رسائی کی بظاہر نفی کی روایات کی توجیہ	۴۶۶	۴۵۸	پسندیدہ اور ناپسندیدہ ناموں کے متعلق احادیث	۴۹۲
۴۴۳	اس پر دلیل کہ رسول اللہ ﷺ سے نفع اور ضرر کی نفی ذاتی نفع اور ضرر پر محمول ہے	۴۶۶	۴۵۹	عبدالنبی نام رکھنے کا شرعی حکم	۴۹۳
۴۴۴	رسول اللہ ﷺ کی نفع رسائی میں افراط، تفریط اور اعتدال پر مبنی نظریات	۴۶۸	۴۶۰	قیامت کے دن انسان کو اس کے باپ کے نام کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا یا ماں کے نام کی طرف؟	۴۹۵
۴۴۵	علم غیب کی تحقیق	۴۶۹	۴۶۱	بچوں کا نام محمد رکھنے کی فضیلت	۴۹۷
۴۴۶	غیب کا لغوی معنی	۴۶۹	۴۶۲	بتوں کی بے مائیگی اور بے چارگی	۴۹۹
۴۴۷	غیب کا اصطلاحی معنی	۴۷۰	۴۶۳	ان ولی اللہ الذی (۱۹۶-۲۰۶)	۵۰۰
۴۴۸	رسول اللہ ﷺ کو علم غیب دیے جانے کے متعلق قرآن مجید کی آیات	۴۷۱	۴۶۴	اللہ تعالیٰ اور رسول کے مقرب نیک لوگ ہیں	۵۰۲

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۵۱۹	فقہاء احناف کے نزدیک نماز سری ہو یا جبری امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے	۵۰۳	آیات سابقہ سے ارتباط	۳۶۵
۵۱۹	امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے کے متعلق احادیث	۵۰۳	اعراض کرنے کے الگ الگ محال	۳۶۶
۵۲۰	ذکر خفی کی فضیلت	۳۸۶	عفو اور درگزر کرنے کے متعلق قرآن مجید کی آیات	۳۶۷
۵۲۱	معتدل آواز کے ساتھ جہرا لہجہ ممنوع نہیں ہے	۳۸۷	عفو اور درگزر کرنے کے متعلق احادیث	۳۶۸
۵۲۱	ذکر کے لیے صبح اور شام کے اوقات کی تخصیص کی حکمت	۳۸۸	رسول اللہ ﷺ کے درگزر کرنے کے متعلق احادیث	۳۶۹
۵۲۱	فرشتوں کی کثرت عبادت سے انسان کو عبادت پر ابھارنا	۳۸۹	نزع شیطان کا معنی	۳۷۰
۵۲۱	فرشتوں کی کثرت عبادت ان کی افضلیت کو مستلزم نہیں	۳۹۰	وسوسہ شیطان سے نجات کا طریقہ	۳۷۱
۵۲۲	حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے ولہ	۳۹۱	وسوسہ شیطان کی وجہ سے عصمت انبیاء پر اعتراض اور اس کے جوابات	۳۷۲
۵۲۲	یسجدون کا تعارض اور اس کا جواب	۳۹۲	طائف من الشیطان کا معنی	۳۷۳
۵۲۳	سجدہ تلاوت کی تحقیق	۳۹۳	انسان کس طرح غور و فکر کر کے انتقام لینے کو ترک کرے	۳۷۴
۵۲۳	سجدہ تلاوت کے حکم میں مذاہب فقہاء	۳۹۳	انسان کس طرح غور و فکر کر کے گناہوں کو ترک کرے	۳۷۵
۵۲۳	سجدہ تلاوت کی تعداد میں مذاہب فقہاء	۳۹۳	خوف خدا سے مرنے والے نوجوان کو دو جنتیں عطا فرماتا	۳۷۶
۵۲۶	حرف آخر	۳۹۵	کفار کے فرمائشی معجزات نہ دکھانے کی توجیہ	۳۷۷
سورۃ الانفال			۵۱۰	قرآن مجید پڑھنے کے آداب
۵۳۱	انفال کا معنی	۱	۵۱۳	قرآن مجید سننے کا حکم آیا نماز کے ساتھ مخصوص ہے یا خارج از نماز کو بھی شامل ہے
۵۳۲	سورۃ الانفال کی وجہ تسمیہ	۲	۵۱۴	آیا قرآن مجید سننا فرض عین ہے یا فرض کفایہ
۵۳۲	سورۃ الانفال کا زمانہ نزول	۳	۵۱۵	قرآن مجید سننے کے حکم میں مذاہب فقہاء
۵۳۳	ترتیب نزول کے لحاظ سے سورۃ الانفال کا مقام	۴	۵۱۶	امام کے پیچھے قرآن سننے میں مذاہب اربعہ
۵۳۳	اس کی آیتوں کی تعداد اور سبب نزول	۵	۵۱۸	فقہاء حنبلیہ کے اس مسئلہ میں مختلف اور متضاد اقوال ہیں
۵۳۳	غزوہ بدر کا خلاصہ	۵		
۵۳۳	غزوہ بدر کے متعلق احادیث	۶		
۵۳۸	سورۃ الانفال کے مضامین کا خلاصہ	۷	۵۱۸	

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۸	سورۃ الانفال کے مقاصد	۵۳۹	۲۸	جنگ بدر میں قتال ملائکہ کے متعلق احادیث اور آثار	۵۳۹
۹	یسئلونک عن الانفال (۱-۱۰)	۵۴۰		آثار	۵۵۸
۱۰	انفال کا معنی اور اس کے مصداق میں مفسرین کے نظریات	۵۴۲	۲۹	جنگ بدر میں قتال ملائکہ کے متعلق مفسرین اسلام کی آراء	۵۶۱
۱۱	مال غنیمت کے استحقاق میں صحابہ کرام کا اختلاف	۵۴۳	۳۰	غزوہ بدر میں فرشتوں کے قتال کے متعلق امام رازی کا تبدیل شدہ نظریہ	۵۶۷
۱۲	تفیل (کسی نمایاں کارنامہ پر مجاہدوں کو غنیمت سے زائد انعام دینے) میں فقہاء مالکیہ کا نظریہ	۵۴۴	۳۱	غزوہ بدر میں فرشتوں کے قتال کے متعلق مصنف کی تحقیق	۵۶۹
۱۳	تفیل میں فقہاء شافعیہ کا نظریہ	۵۴۵	۳۲	اذیغشیکم الناس امنہ مندو	۵۷۰
۱۴	تفیل میں فقہاء حنبلیہ کا نظریہ	۵۴۵		ینزل علیکم (۱۱-۱۹)	۵۷۰
۱۵	تفیل میں فقہاء احناف کا نظریہ	۵۴۶	۳۳	غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ کی امداد کی چھ انواع	۵۷۲
۱۶	وجل کا معنی	۵۴۷	۳۴	جس دن کی صبح جنگ ہوئی تھی اس رات مسلمانوں پر نیند کا طاری ہونا	۵۷۹
۱۷	اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف کے متعلق قرآن مجید کی آیات	۵۴۷		مسلمانوں پر اس رات غنودگی طاری کرنے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں	۵۷۳
۱۸	اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف کے متعلق احادیث اور آثار	۵۴۸	۳۵	بدر میں رسول اللہ ﷺ کی قیام گاہ اور بارش کا نزول	۵۷۳
۱۹	ایمان میں کمی اور زیادتی کی تحقیق	۵۵۰	۳۶	بدر کے دن بارش کے نزول میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں	۵۷۳
۲۰	مال حرام سے نجات کے طریقے	۵۵۱	۳۷	بقیہ چار نعمتوں کی تفصیل	۵۷۳
۲۱	میں یقیناً مومن ہوں یا میں انشاء اللہ مومن ہوں	۵۵۱	۳۸	رسول اللہ ﷺ کا مقتولین بدر سے خطاب فرمانا اور سماع موتی کی بحث	۵۷۶
۲۲	کہنے میں فقہاء اور متکلمین کا اختلاف	۵۵۱	۳۹	سماع موتی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے انکار کی توجیہ	۵۷۷
۲۳	مبحث مذکور میں فریقین کے درمیان محاکمہ	۵۵۲	۴۰	سماع موتی کے ثبوت میں بعض دیگر احادیث اور آثار	۵۸۴
۲۴	”میں یقیناً مومن ہوں“ کہنے کے دلائل	۵۵۳	۴۱	زحف کا معنی	۵۸۹
۲۵	”میں انشاء اللہ مومن ہوں“ کہنے کے دلائل کا تجزیہ	۵۵۳	۴۲	میدان جنگ سے پسپائی کی دو جائز صورتیں	۵۸۹
۲۶	بعض صحابہ کے نزدیک لشکر کفار سے مقابلہ کا ناگوار ہونا اس کا پس منظر اور پیش منظر	۵۵۳	۴۳		۵۸۹
۲۷	ابوسفیان کے قافلہ تجارت پر حملہ کو بعض صحابہ کے ترجیح دینے کا بیان	۵۵۶			
۲۸	غزوہ بدر کے دن نبی ﷺ کا گڑگڑا کر دعا کرنا	۵۵۷			

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۴۴	اگر دشمن کی تعداد مسلمانوں سے دگنی یا اس سے کم ہو تو پھر مسلمانوں کا میدان سے بھاگنا جائز نہیں	۵۹۰	۶۱	ظالموں پر عذاب کے نزول میں صالحین کا شمول	۶۰۶
۴۵	میدان جنگ سے بھاگنے کی ممانعت قیامت تک کیلئے عام ہے یا یوم بدر کے ساتھ مخصوص ہے	۵۹۱	۶۲	بدکاروں کے گناہوں کی وجہ سے نیکو کاروں کو عذاب کیوں ہوگا؟	۶۰۸
۴۶	مسلمانوں سے کفار بدر کے قتل کی نفی کے محال	۵۹۲	۶۳	اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اس کی اطاعت اور شکر گزاری کرے	۶۰۹
۴۷	ومارمیت اذرمیت کے شان نزول میں مختلف اقوال	۵۹۳	۶۴	اللہ اور رسول سے خیانت کی ممانعت کے شان نزول میں متعدد روایات	۶۱۰
۴۸	نبی ﷺ سے خاک کی مٹھی پھینکنے کی نفی اور اثبات کے محال	۵۹۴	۶۵	حضرت ابولبابہ انصاری کی توبہ	۶۱۱
۴۹	معجزات کا مقدور ہونا	۵۹۵	۶۶	اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت کے محال	۶۱۲
۵۰	اجہمی آزمائش کا معنی	۵۹۵	۶۷	امانت ادا کرنے اور خیانت نہ کرنے کے متعلق قرآن مجید کی آیات	۶۱۳
۵۱	اللہ نیک مسلمانوں کی نصرت اور حمایت فرماتا ہے بدکاروں کی نہیں	۵۹۶	۶۸	امانت ادا کرنے اور خیانت نہ کرنے کے متعلق احادیث اور آثار	۶۱۳
۵۲	یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ ورسولہ (۲۸-۳۰)	۵۹۶	۶۹	مال اور اولاد کے فتنہ ہونے کا معنی	۶۱۷
۵۳	رسول اللہ کے حکم پر عمل کا واجب ہونا	۵۹۸	۷۰	مال اور اولاد کے فتنہ ہونے کے متعلق قرآن مجید کی آیات	۶۱۷
۵۴	اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا واحد ہونا	۵۹۸	۷۱	مال اور اولاد کے فتنہ ہونے کے متعلق احادیث	۶۱۷
۵۵	اللہ تعالیٰ کی معلومات و اتعیه اور اس کی معلومات فرضیہ	۶۰۰	۷۲	یا ایہا الذین امنوا ان تتقوا اللہ	۶۱۸
۵۶	فرض نماز میں بھی رسول اللہ ﷺ کے بلانے پر حاضر ہونا واجب ہے اور نفل نماز میں ماں کے بلانے پر	۶۰۱	۷۳	یجعل لکم (۲۹-۳۷)	۶۱۸
۵۷	مسلمانوں کے حق میں کیا چیز حیات آفریں ہے	۶۰۲	۷۴	کبیرہ گناہوں کے اجتناب سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں	۶۲۰
۵۸	انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ تعالیٰ کے حامل ہونے کے محال	۶۰۳	۷۵	مومنوں اور کافروں کا دنیا اور آخرت میں فرق	۶۲۰
۵۹	بنو آدم کے دلوں کو الٹ پلٹ کرنے کا معنی	۶۰۴	۷۶	جب نبی ﷺ نے دنیا میں گناہگاروں کے لیے شفاعت کر دی ہے تو آخرت میں شفاعت کیوں ہوگی؟	۶۲۱
۶۰	رحمان کے دو انگلیوں سے کیا مراد ہے	۶۰۵	۷۷	اللہ تعالیٰ کا فضل	۶۲۱
			۷۷	کفار قریش کا نبی ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کرنا	۶۲۲

نمبر شمار	عنوان	صفحہ	نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۷۸	اللہ تعالیٰ کا کفار کی سازش کو ناکام کر کے آپ کو ان کے نرغہ سے نکال لانا	۶۲۳	۹۶	واعلموا انما غنمتم من شئی	۶۳۸
۷۹	نصرین الحارث کے جھوٹے دعوے	۶۲۴	۹۷	ربط مضمون	۶۳۸
۸۰	کسی قوم میں جب اس کا نبی موجود ہو تو اس قوم پر عذاب نہیں آتا	۶۲۶	۹۸	نفل، تنفیل اور سلب کی مختصر تشریح	۶۳۸
۸۱	کفار کے استغفار کی متعدد تفاسیر	۶۲۶	۹۹	فتنے کا معنی	۶۳۸
۸۲	مشکل اور اہم الفاظ کے معانی	۶۲۷	۱۰۰	مال غنیمت کی تعریف	۶۳۹
۸۳	جاہل صوفیاء کے رقص و سرود پر علامہ قرطبی کا تبصرہ	۶۲۷	۱۰۱	خمس کی تقسیم میں فقہاء شافعیہ کا موقف	۶۳۹
۸۴	قل للذین کفروا (۳۸-۴۰)	۶۲۹	۱۰۲	خمس کی تقسیم میں فقہاء حنبلیہ کا موقف	۶۴۰
۸۵	سابقہ آیات سے ارتباط اور شان نزول	۶۲۹	۱۰۳	خمس کی تقسیم میں فقہاء مالکیہ کا موقف	۶۴۱
۸۶	ایمان لانے سے سابقہ گناہوں کے معاف ہونے کے متعلق قرآن اور سنت سے دلائل	۶۳۰	۱۰۴	خمس کی تقسیم میں فقہاء احناف کا موقف	۶۴۱
۸۷	کافر کے سابقہ گناہوں کے بخشے میں اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم	۶۳۰	۱۰۵	مشکل اور اہم الفاظ کے معانی	۶۴۳
۸۸	زندیق کی توبہ مقبول ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق	۶۳۲	۱۰۶	فتح بدر میں سیدنا محمد ﷺ کی دلیل نبوت	۶۴۴
۸۹	زندیق کا معنی اور مفہوم	۶۳۳	۱۰۷	کفار کی تعداد کم دکھانے کی حکمت	۶۴۴
۹۰	زندیق، منافق، دہری اور طرد کی تعریفوں کا باہمی فرق	۶۳۳	۱۰۸	مسلمانوں کی تعداد کم دکھانے کی حکمت	۶۴۵
۹۱	زندیق کی توبہ اور اس کو قتل کرنے کے شرعی احکام	۶۳۳	۱۰۹	یا ایہا الذین امنوا اذ القیتم	۶۴۵
۹۲	زندیق کی توبہ مقبول ہونے یا نہ ہونے کے الگ الگ محمل	۶۳۳	۱۱۰	فئۃ (۳۸-۴۵)	۶۴۵
۹۳	زندیق کی توبہ قبول ہونے پر امام رازی کے دلائل اور تحقیق مقام	۶۳۳	۱۱۱	آیات سابقہ سے ارتباط	۶۴۶
۹۴	فتنہ کا معنی	۶۳۶	۱۱۲	دشمن سے مقابلہ کی تمنا کی ممانعت کے متعلق احادیث	۶۴۶
۹۵	صرف جزیرہ عرب سے کفر کا غلبہ ختم کرنا مقصود ہے یا پوری دنیا سے	۶۳۶	۱۱۳	دشمن اسلام کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے کی فضیلت اور اجر و ثواب	۶۴۷
			۱۱۴	دوران قتال اللہ تعالیٰ کے ذکر کے متعلق احادیث	۶۴۷
			۱۱۵	دوران قتال ذکر کے متعلق علماء کے اقوال	۶۴۸
			۱۱۶	اختلاف رائے کی بناء پر مخالفت نہ کی جائے	۶۴۹
			۱۱۷	مسلمانوں کے زوال کا سبب وحدت ملی کو پارہ پارہ کرنا ہے	۶۵۰
			۱۱۸	مشکل الفاظ کے معانی	۶۵۱
			۱۱۹	نخر اور ریا کی مذمت	۶۵۱

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۶۶۵	ہے	۱۳۹	۶۵۲	ابلیس کا سراقہ کی شکل میں آکر کفار کو بہکانا	۱۱۹
	جہاد کے لیے بندھے ہوئے گھوڑوں کی فضیلت			ابلیس کو سراقہ کی شکل میں متشکل ہونے کی	۱۲۰
۶۶۷	اور اس دور میں ان کا مصداق		۶۵۲	قدرت دینے کی حکمت	
۶۶۸	نامعلوم دشمنوں کا مصداق	۱۴۰	۶۵۳	اذ یقول المنفقون (۵۸-۴۹)	۱۲۱
	دشمنان اسلام کو ڈرانے اور مرعوب کرنے کی	۱۴۱	۶۵۵	مقتولین بدر کی بوقت موت کیفیت	۱۲۲
۶۶۹	حکمت		۶۵۶	عذاب کے مستحق کو عذاب نہ دینا بھی جائز ہے	۱۲۳
۶۷۰	جہاد کی فضیلت کے متعلق قرآن مجید کی آیات	۱۴۲	۶۵۶	اللہ کسی بندہ پر کوئی ظلم نہیں کرتا	۱۲۴
۶۷۱	جہاد کی فضیلت کے متعلق احادیث	۱۴۳	۶۵۷	کفار بدر کا متبعین فرعون کے مماثل ہونا	۱۲۵
	جہاد کی حکمت اور اس سوال کا جواب کہ کافروں کو	۱۴۴		اہل مکہ پر اللہ کی ان نعمتوں کا بیان جن کی انہوں	۱۲۶
۶۷۳	قتل کرنا اللہ اور رسول کی رحمت کے منافی ہے		۶۵۷	نے ناشکری کی	
۶۷۴	جہاد کے فرض عین ہونے کی صورتیں	۱۴۵		جو قوم خود کو کسی نعمت کا نااہل ثابت کرتی ہے اللہ	۱۲۷
۶۷۵	جہاد کے فرض کفایہ ہونے کی صورتیں	۱۴۶	۶۵۸	اس نعمت کو عذاب سے بدل دیتا ہے	
۶۷۶	جہاد کے مباح ہونے کی شرائط	۱۴۷	۶۵۹	اس آیت کا پہلی آیت کی تفصیل ہونا	۱۲۸
۶۷۷	جہاد کے وجوب کی شرائط	۱۴۸	۶۵۹	بنو قریظہ کی عمد شکنی	۱۲۹
	مال غنیمت کی تقسیم کی تفصیل اور جنگی قیدیوں کو	۱۴۹	۶۶۰	مشکل الفاظ کے معانی	۱۳۰
	فدیہ کے بدلہ میں آزاد کرنے کے متعلق مذاہب			فریق ثانی کی عمد شکنی کی وجہ سے معاہدہ ختم	۱۳۱
۶۷۸	فقہاء		۶۶۰	کرنے کی صورتیں	
	جنگی قیدیوں کو فدیہ کے بدلہ میں آزاد کرنے کے	۱۵۰		مسلمانوں کے سربراہ کی عمد شکنی زیادہ مذموم اور	۱۳۲
۶۷۹	متعلق احادیث		۶۶۱	زیادہ بڑا گناہ ہے	
	جنگی قیدیوں کے فدیہ کے بدلہ میں آزاد کرنے پر	۱۵۱		ولایحسبن الذین کفروا	۱۳۳
۶۸۲	صاحب ہدایہ کے اعتراض کا جواب		۶۶۲	سبقوا (۶۳-۵۹)	
	کیا موجودہ دور میں بھی جنگی قیدیوں کو لونڈی اور	۱۵۲	۶۶۲	ربط آیات اور شان نزول	۱۳۴
۶۸۲	غلام بنانا جائز ہے؟		۶۶۳	ربط آیات	۱۳۵
۶۸۳	دشمن سے صلح کرنے کا حکم آیا منسوخ ہے یا نہیں	۱۵۳	۶۶۳	تیر اندازی کے فضائل	۱۳۶
	دشمن سے صلح کرنے یا صلح نہ کرنے کے الگ	۱۵۴		اس دور میں تیر اندازی کے مصداق ایٹمی	۱۳۷
۶۸۵	الگ محل		۶۶۳	میزائل ہیں	
۶۸۶	دشمن کی نیت فاسد ہونے کے باوجود صلح کا جواز	۱۵۵		ایٹمی ہتھیار بنانے کے لیے تفکر کرنا اور اس کے	۱۳۸
	اسلام کی نعمت سے عرب کے مخالف دھڑوں کا	۱۵۶		لیے سائنسی علوم حاصل کرنا افضل ترین عبادت	

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
۷۰۲	سے متاثر ہو کر حضرت عباس کا مسلمان ہونا	۱۷۲	۶۸۶	باہم شہر و شکر ہو جانا	۱۵۷
۷۰۳	بدر کے قیدیوں سے جو مال غنیمت لیا گیا تھا	۱۷۳	۶۸۷	عیاضی اور فانی محبت اور دائمی اور باقی محبت کے	۱۵۸
۷۰۴	مسلمان ہونے کے بعد ان کو اس سے زیادہ مال	۱۷۴	۶۸۸	مباری اور اسباب	۱۵۹
۷۰۵	مل جانا	۱۷۵	۶۸۹	صحابہ کرام کی باہمی محبت کا سبب	۱۶۰
۷۰۶	اللہ تعالیٰ کا علم ماضی، حال اور مستقبل تمام زمانوں	۱۷۶	۶۹۰	حضرت عمر جب اسلام لائے تو مسلمانوں کی کتنی	۱۶۱
۷۰۷	کو محیط ہے	۱۷۷	۶۹۱	تعداد تھی؟	۱۶۲
۷۰۸	اللہ تعالیٰ سے اور رسول اللہ ﷺ سے کفار کی	۱۷۸	۶۹۲	یابہا النبی حرض المؤمنین	۱۶۳
۷۰۹	خیانت کا بیان	۱۷۹	۶۹۳	علی القتال (۶۵-۶۹)	۱۶۴
۷۱۰	عہد رسالت میں مومنین کی چار قسمیں	۱۸۰	۶۹۴	مسلمانوں پر تخفیف کر کے مشکل حکم کو منسوخ	۱۶۵
۷۱۱	مہاجرین اولین کی دیگر مہاجرین اور انصار پر	۱۸۱	۶۹۵	کرتا	۱۶۶
۷۱۲	افضیلت	۱۸۲	۶۹۶	کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کامیابی کی	۱۶۷
۷۱۳	مہاجرین اور انصار کے درمیان پہلے وراثت کا	۱۸۳	۶۹۷	وجوہات	۱۶۸
۷۱۴	مشروع پھر منسوخ ہونا	۱۸۴	۶۹۸	مشکل الفاظ کے معانی	۱۶۹
۷۱۵	ولایت کا معنی	۱۸۵	۶۹۹	بدر کے قیدیوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا	۱۷۰
۷۱۶	کفار سے معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے	۱۸۶	۷۰۰	صحابہ کرام سے مشورہ کرنا	۱۷۱
۷۱۷	دار الحرب کے مسلمانوں کی مدد نہ کرنا	۱۸۷	۷۰۱	مال دنیا کی طمع کی وجہ سے بعض صحابہ پر عتاب	۱۷۲
۷۱۸	دو مختلف ملتوں کے ماننے والوں کے مابین دوستی	۱۸۸	۷۰۲	نازل ہوانہ کہ رسول اللہ ﷺ پر فدیہ کو ترجیح	۱۷۳
۷۱۹	اور وراثت جائز نہیں	۱۸۹	۷۰۳	دینے کی وجہ سے	۱۷۴
۷۲۰	مہاجرین اور انصار کی تعریف و توصیف	۱۹۰	۷۰۴	عتاب کی دوسری وجہ بلا اجازت مال غنیمت لینا	۱۷۵
۷۲۱	ہجرت کی تعریف اور ہجرت کے متعلق مختلف	۱۹۱	۷۰۵	ہے	۱۷۶
۷۲۲	النوع احادیث	۱۹۲	۷۰۶	بدر کے قیدیوں کو آزاد کرنے کے جوہات	۱۷۷
۷۲۳	ہجرت کے مختلف معانی	۱۹۳	۷۰۷	مشرکین کو قتل کرنے کے عمومی حکم سے جنگی	۱۷۸
۷۲۴	ہجرت کے مختلف النوع احادیث میں تطبیق	۱۹۴	۷۰۸	قیدیوں کو مستثنیٰ کرنے پر دلائل	۱۷۹
۷۲۵	فتح مکہ کے بعد ہجرت کے منسوخ ہونے کی	۱۹۵	۷۰۹	بدر میں بلا اذن مال غنیمت لینے کے باوجود عذاب	۱۸۰
۷۲۶	وجوہات	۱۹۶	۷۱۰	نہ آنے کا سبب کیا تھا؟	۱۸۱
۷۲۷	دار الکفر میں مسلمانوں کی سکونت کا حکم	۱۹۷	۷۱۱	یابہا النبی قل لمن فی	۱۸۲
۷۲۸	ہجرت کی اقسام	۱۹۸	۷۱۲	ایدیکم من الاسری (۷۵-۷۰)	۱۸۳
۷۲۹	ہجرت الی اللہ کی توضیح	۱۹۹	۷۱۳	بدر میں رسول اللہ ﷺ کے غیب کی خبر دینے	۱۸۴

صفحہ	عنوان	نمبر شمار	صفحہ	عنوان	نمبر شمار
				زوالا رحام کی تعریف ان کے مصادیق اور ان کی وراثت کے ثبوت میں احادیث	۱۸۹
			۷۱۸	اختتامی کلمات اور دعا	۱۹۰
			۷۱۸	مآخذ و مراجع	۱۹۱
			۷۲۱		

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله رب العالمين الذي استغنى في حمله عن الحاسدين وانزل القرآن تبليانا لكل شئ عند العارفين والصاوة والسلام على سيدنا محمد الذي استغنى بصلوة الله عن صلوة المصلين واختص بارضاء رب العالمين الذي بلغ اليه ما انزل عليه من القرآن وبين لنا ما نزل عليه بتبيان وكان خلقه القرآن وتحدي بالفرقان وعجز عن معارضته الانس والجان وهو خليل الله حبيب الرحمن لواءه فوق كل لواء يوم الدين قائد الانبياء والمرسلين امام الاولين والآخرين شفيع الصالحين والمذنبين واختص بتنصيب المغفرة له في كتاب مبين وعلى اله الطيبين الطاهرين وعلى اصحابه الكاملين الراشدين وازواجه الطاهرات امهات المؤمنين وعلى سائر اولياء امته وعلماء ملتة اجمعين - اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان سيدنا ومولانا محمد عبده ورسوله - اعوذ بالله من شرور نفسي ومن سيئات اعمالى من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل الله فلا هادي له اللهم ارني الحق حقا وارزقنى اتباعه اللهم ارني الباطل باطلا وارزقنى اجتنابه اللهم اجعلنى في تبليان القرآن على صراط مستقيم وثبتنى فيه على منهج قويم واعصمى عن الخطأ والزلل في تحريره واحفظنى من شر الحاسدين وزيف المعاندين في تقرير اللهم الق في قلبى اسرار القرآن وشرح صدرى لمعانى الفرقان ومتعنى بفيوض القرآن ونورنى بانوار الفرقان واسعدنى لتبليان القرآن، رب زدنى علما رب ادخلنى مدخل صدق واخرجنى مخرج صدق واجعل لى من لدنك سلطانا نصيرا - اللهم اجعله خالصا لوجهك ومقبولا عندك وعند رسوك واجعله شائعا ومستفيضاً ومفيضا ومرغوبا في اطراف العالمين الى يوم الدين واجعله لى ذرية للمغفرة ووسيلة للنجاة وصدقة جارية الى يوم القيامة وارزقنى زيارة النبي صلى الله عليه وسلم في الدنيا وشفاعته في الاخرة واحينى على الاسلام بالسلامة وامتنى على الايمان بالكرامة اللهم انت ربى لا اله الا انت خلقتنى وانا عبدك وانا على عهدك ووعدك ما استطعت اعوذ بك من شر ما صنعت ابوء لك بنعمتك على وابوء لك بذنبي فاغفر لى فانه لا يغفر الذنوب الا انت امين يا رب العالمين -

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کے لیے مخصوص ہیں جو ہر تعریف کرنے والے کی تعریف سے مستغنی ہے۔ جس نے قرآن مجید نازل کیا جو عارفین کے نزدیک ہر چیز کا روشن بیان ہے اور صلوٰۃ و سلام کا سیدنا محمد پر نزول ہو جو خود اللہ تعالیٰ کے صلوٰۃ نازل کرنے کی وجہ سے ہر صلوٰۃ بھیجنے والے کی صلوٰۃ سے مستغنی ہیں۔ جن کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ رب العالمین ان کو راضی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر جو قرآن نازل کیا اس کو انہوں نے ہم تک پہنچایا اور جو کچھ ان پر نازل ہوا اس کا روشن بیان انہوں نے ہمیں سمجھایا، ان کے اوصاف سراپا قرآن ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کی مثال لانے کا چیلنج کیا اور تمام جن اور انسان اس کی مثال لانے سے عاجز رہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے خلیل اور محبوب ہیں۔ قیامت کے دن ان کا جھنڈا ہر جھنڈے سے بلند ہو گا۔ وہ نبیوں اور رسولوں کے قائد ہیں، اولین اور آخرین کے امام ہیں، تمام نیکو کاروں اور گنہ گاروں کی شفاعت کرنے والے ہیں، یہ ان کی خصوصیت ہے کہ قرآن مجید میں صرف ان کی مغفرت کے اعلان کی تصریح کی گئی ہے، اور ان کی پاکیزہ آل، ان کے کال اور ہادی اصحاب اور ان کی ازواج مطہرات امہات المؤمنین اور ان کی امت کے تمام علماء اور اولیاء پر بھی صلوٰۃ و سلام کا نزول ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ وہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ سیدنا محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں اپنے نفس کے شر اور بد اعمالیوں سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں۔ جس کو اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا، اور جس کو وہ گمراہی پر چھوڑ دے، اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ اے اللہ مجھ پر حق واضح کر اور مجھے اس کی اتباع عطا فرما، اور مجھ پر باطل کو واضح کر اور مجھے اس سے اجتناب عطا فرما۔ اے اللہ مجھے ”تبیان القرآن“ کی تصنیف میں صراط مستقیم پر برقرار رکھ اور مجھے اس میں معتدل مسلک پر ثابت قدم رکھ۔ مجھے اس کی تحریر میں غلطیوں اور لغزشوں سے بچا اور مجھے اس کی تشریح میں حاسدین کے شر اور معاندین کی تحریف سے محفوظ رکھ۔ اے اللہ! میرے دل میں قرآن کے اسرار کا القا کر اور میرے سینہ کو قرآن کے معانی کے لیے کھول دے۔ مجھے قرآن مجید کے فیوض سے بہرہ مند فرما۔ قرآن مجید کے انوار سے میرے قلب کی تاریکیوں کو منور فرما۔ مجھے ”تبیان القرآن“ کی تصنیف کی سعادت عطا فرما۔ اے میرے رب میرے علم کو زیادہ کر۔ اے میرے رب تو مجھے (جہاں بھی داخل فرمائے) پسندیدہ طریقہ سے داخل فرما اور مجھے (جہاں سے بھی باہر لائے) پسندیدہ طریقہ سے باہر لا، اور مجھے اپنی طرف سے وہ غلبہ عطا فرما جو (میرے لیے) مددگار ہو۔ اے اللہ اس تصنیف کو صرف اپنی رضا کے لیے مقدر کر دے اور اس کو اپنی اور اپنے رسول کی بارگاہ میں مقبول کر دے۔ اس کو قیامت تک کے لیے تمام دنیا میں مشہور، مقبول، محبوب اور اثر آفرین بنا دے۔ اس کو میری مغفرت کا ذریعہ، اور نجات کا وسیلہ بنا اور قیامت تک کے لیے اس کو صدقہ جاریہ کر دے۔ مجھے دنیا میں نبی ﷺ کی زیارت اور قیامت میں آپ کی شفاعت سے بہرہ مند کر۔ مجھے سلامتی کے ساتھ اسلام پر زندہ رکھ اور عزت کی موت عطا فرما۔ اے اللہ تو میرا رب ہے تیرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ تو نے مجھے پیدا کیا ہے اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں تجھ سے کیے ہوئے وعدہ اور عہد پر اپنی طاعت کے مطابق قائم ہوں۔ میں اپنی بد اعمالیوں کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ تیرے مجھ پر جو انعامات ہیں، میں ان کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ مجھے معاف فرما، کیونکہ تیرے سوا اور کوئی گناہوں کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ آمین یا رب العالمین!

سُورَةُ الْأَعْرَافِ

(۷)

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سورة الاعراف

سورت کا نام

زیادہ مشہور اور محقق یہ ہے کہ اس سورت کا نام ”الاعراف“ ہے۔ علامہ سید محمد حسینی زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ نے لکھا ہے کہ یہ لفظ عرف سے بنا ہے اس کا معنی بلندی ہے اور اس کا معنی جاننا اور پہچانا بھی ہے۔ الاعراف جنت اور دوزخ کی درمیانی سرحد کا نام ہے۔ اصحاب الاعراف کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں، وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے دوزخ کے مستوجب نہ ہوں اور برائیوں کی وجہ سے جنت کے مستحق نہ ہوں، پس وہ جنت اور دوزخ کے درمیان حجاب میں ہوں گے اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اہل جنت اور اہل نار کو پہچاننے والے ہوں گے، ایک قول یہ ہے کہ اصحاب الاعراف انبیاء ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ اصحاب الاعراف ملائکہ ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَنَادَىٰ اصْحَابُ الْأَعْرَافِ (الاعراف: ۴۸) اصحاب الاعراف نے ندا کی۔

(تاج العروس، ج ۶، ص ۱۹۳، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ)

اس سورت کا نام الاعراف اس لیے ہے کہ اس سورت میں الاعراف کا ذکر ہے:

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ يُوعَىٰ الْأَعْرَافِ رِجَالٌ
يَعْرِفُونَ كَلِمَاتٍ بِيْسِيْمِهِمْ وَنَادُوا اصْحَابَ
الْجَنَّةِ اَنْ سَلِّمْ عَلَيْكُمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ
يَظْمَعُوْنَ ۝ (الاعراف: ۴۶)

اور جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک حجاب ہے اور
الاعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو جنتیوں اور دوزخیوں میں سے
ہر ایک کو ان کی علامت سے پہچان لیں گے اور وہ جنتیوں کو پکار
کر کہیں گے تم پر سلامتی ہو، وہ (اصحاب الاعراف) جنت میں
داخل نہیں ہوں گے اور وہ اس کے امیدوار ہوں گے۔

حدیث میں بھی اس سورت کو سورت الاعراف سے تعبیر فرمایا۔ ہے۔

مروان بن الحکم بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: کہ کیا وجہ ہے کہ تم مغرب کی نماز میں قصار
منفصل (سورہ الینہ: ۹۸) سے لے کر آخر قرآن تک چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھتے ہو! حالانکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو مغرب کی

نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ مروان نے کہا: میں نے پوچھا بڑی بڑی سورتیں کون سی ہیں؟ حضرت زید نے کہا: الاعراف اور دوسری الانعام ہے۔ حدیث کے راوی ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں میں نے ان سے خود پوچھا تو انہوں نے فرمایا: المائدہ اور الاعراف۔

(سنن ابوداؤد، ج ۱، رقم الحدیث: ۸۱۲، صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۶۳، سنن النسائی، ج ۲، رقم الحدیث: ۹۸۹) سورہ فاتحہ کے بعد پہلی سات سورتیں جن میں ایک سو یا اس سے زیادہ آیتیں ہیں، ان کو السبع الطوال کہا جاتا ہے، وہ یہ ہیں: البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور الانفال، اور جن سورتوں میں ایک سو آیتیں ہوں، ان کو ذوات المسین کہتے ہیں اور جن میں اس سے کم آیات ہوں ان کو مثانی کہتے ہیں اور ان کے بعد مفصل ہیں۔ سورہ الحجرات سے البروج تک طوال مفصل ہیں اور البروج سے الینہ تک اوساط مفصل ہیں اور الینہ سے آخر قرآن تک قصار مفصل ہیں۔

(در مختار دردمختار، ج ۱، ص ۳۶۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

بعض علماء نے کہا ہے کہ اس سورت کا نام المص ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے: عروہ بن الزبیر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے سنا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مروان سے فرمایا: اے عبد الملک کیا تم (ہمیشہ) مغرب میں قل هو اللہ احد اور انا اعطینک الکوثر پڑھتے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے قسم کھا کر فرمایا: بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ کو مغرب کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ المص۔

(سنن النسائی، ج ۲، رقم الحدیث: ۹۸۸، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت)

لیکن مشہور اور محقق قول یہی ہے کہ اس سورت کا نام الاعراف ہی ہے اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مغرب کی نماز میں رسول اللہ ﷺ نے سورہ الاعراف کو پڑھا اور اس کو دو رکتوں میں تقسیم کیا۔ (سنن النسائی، ج ۲، رقم الحدیث: ۹۹۰، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۱۲ھ)

الاعراف کا معنی اور مصداق

علامہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے کہ الاعراف العرف کی جمع ہے اور اس کا معنی بلند جگہ ہے۔ البتہ یحییٰ بن آدم نے کہا: کہ میں نے کسائی سے اس کے واحد کے متعلق پوچھا تو وہ خاموش رہے۔

(الجامع لاحکام القرآن، ج ۸، ص ۱۹۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: عامر بیان کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اصحاب الاعراف وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں بھی ہوں اور گناہ بھی ہوں۔ ان کے گناہ ان کو جنت سے روک دیں اور ان کی نیکیاں ان کو دوزخ سے روک لیں۔ وہ اسی حالت میں رہیں گے حتیٰ کہ اللہ اپنی مخلوق کے درمیان فیصلہ فرمادے گا۔ پھر ان کے درمیان اپنا حکم جاری فرمائے گا۔

شعبی بیان کرتے ہیں کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اصحاب الاعراف وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں۔ اللہ فرمائے گا: میرے فضل اور میری بخشش سے جنت میں داخل ہو جاؤ تم پر آج نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ تم مغموم ہو گے۔

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جس شخص کا ایک گناہ بھی نیکیوں سے زیادہ ہو وہ دوزخ میں داخل ہو جائے گا اور جس شخص کی ایک نیکی بھی اس کے گناہوں سے زیادہ ہوئی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ پھر حضرت ابن مسعود نے یہ آیت تلاوت کی:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ
فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ
مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ
بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۝ (الاعراف: ۸-۷)

اور اس دن اعمال کا وزن کرنا برحق ہے پس جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں ۝ اور جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے تو یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا کیونکہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے۔

پھر فرمایا: ایک رائی کے دانہ کے برابر وزن سے بھی میزان کا پلڑا جھک جاتا ہے اور فرمایا: جس شخص کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں وہ اصحاب الاعراف میں سے ہوگا، ان کو پل صراط پر ٹھہرا دیا جائے گا، پھر وہ اہل جنت اور اہل دوزخ کو پہچان لیں گے۔ جب وہ اہل جنت کی طرف دیکھیں گے تو کہیں گے سلام علیکم اور جب ان کی نظریا میں جانب کی طرف پھیری جائے گی تو وہ اہل دوزخ کو دیکھیں گے اور کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ نہ کرنا اور دوزخیوں کے ٹھکانوں سے اللہ کی پناہ چاہیں گے اور جو نیکیوں والے ہوں گے ان کو ان کی نیکیوں کا نور دیا جائے گا وہ اس نور کی روشنی میں اپنے سامنے اور اپنے آگے چلیں گے، اس دن ہر بندے اور ہر بندی کو نور دیا جائے گا اور جب وہ پل صراط پر پہنچیں گے تو اللہ ہر منافق اور ہر منافقہ کا نور سلب فرما لے گا اور جب اہل جنت منافقوں کا حال دیکھیں گے تو کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمارا نور مکمل کر دے۔ اور رہے اصحاب الاعراف تو ان کا نور بھی ان کے سامنے ہوگا اور ان سے چھینا نہیں جائے گا، اور اس موقع کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قول نقل فرمایا ہے: وہ (اصحاب الاعراف) جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ اس کے امیدوار ہیں۔ (الاعراف: ۴۶) حضرت ابن سعد نے فرمایا: جب بندہ ایک نیکی کرتا ہے تو اس کی دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جب وہ ایک برائی کرتا ہے تو اس کی صرف ایک برائی لکھی جاتی ہے پھر فرمایا: جس کی دس نیکیوں پر ایک گناہ غالب آگیا وہ ہلاک ہو گیا (یعنی جس کی نیکیوں کو دس سے ضرب دینے کے باوجود اس کے گناہ زیادہ ہوئے) عبد اللہ بن حارث بیان کرتے ہیں کہ الاعراف جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہے اور اصحاب الاعراف اس جگہ ہوں گے حتیٰ کہ جب اللہ ان کو عافیت میں لینا چاہے گا تو ان کو ایک دریاگی طرف لے جائے گا جس کو حیات کہا جاتا ہے، اس کے دونوں کنارے سونے کے سرکنڈے ہیں جن میں موتی جڑے ہوئے ہیں اور ان کی مٹی مشک ہے ان کو اس دریا میں ڈالا جائے گا، حتیٰ کہ ان کا رنگ سفید چمک دار ہو جائے گا، پھر اللہ ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمائے گا: تم جو چاہو تمنا کرو، پھر وہ تمنا کریں گے اور جب ان کی تمنائیں ختم ہو جائیں گی تو اللہ ان سے فرمائے گا: تم نے جو تمنائیں کی ہیں، تم کو وہ بھی ملیں گی اور ان کا ستر گنا اضافہ بھی ملے گا۔ وہ جنت میں داخل ہوں گے در آنحالیکہ ان کے سینوں پر سفید تل ہوں گے جن سے وہ پہچانے جائیں گے اور ان کو کہا جائے گا یہ جنت کے مساکین ہیں۔

(جامع البیان، ج: ۸، ص ۲۵۱-۲۴۹، ملقطاً، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

علامہ قرطبی متوفی ۶۷۸ھ نے لکھا ہے کہ ثعلبی نے ذکر کیا ہے: الاعراف پل صراط پر ایک بلند جگہ ہے۔ اس پر حضرت عباس، حضرت حمزہ، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت جعفر زوالجناحین رضی اللہ عنہم ہوں گے۔ وہ اپنے محبت کرنے والوں کو پہچان لیں گے جن کے چہرے سفید ہوں گے اور ان سے بغض رکھنے والوں کو بھی پہچان لیں گے ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، اور زہراوی نے بیان کیا ہے کہ یہ ہر امت کے نیک لوگ ہوں گے جو لوگوں کے اعمال پر گواہ ہوں گے۔ نحاس نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ یہ لوگ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار پر ہوں گے، زجاج نے کہا یہ انبیاء ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے صغیرہ گناہوں کا دنیا میں تکلیفوں اور مصیبتوں سے کفارہ ادا نہیں ہوا اور ان کے کبیرہ گناہ نہیں ہوں گے۔ ان کو جنت

میں جانے سے روک لیا جائے گا تاکہ ان کو غم ہو جو ان کے صغار کے مقابلہ میں ہو۔ حضرت ابو حذیفہ کے غلام حضرت سالم رضی اللہ عنہما نے یہ تمنا کی تھی کہ وہ اصحاب الاعراف میں سے ہوں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ ملائکہ ہیں جو لوگوں کو جنت اور دوزخ میں داخل کرنے سے پہلے مومنوں اور کافروں کو ممتاز کریں گے یہ ابو جحز کا قول ہے۔ ان پر اعتراض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب الاعراف کو رجال کہا ہے اور فرشتوں کو رجال نہیں کہا جاتا۔ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ فرشتے مذکر ہیں مونث نہیں ہیں اس لیے ان پر رجال کا اطلاق بعید نہیں ہے۔ علامہ قرطبی مالکی نے اور بھی کئی اقوال لکھے ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن، جز ۸، ص ۱۹۱-۱۹۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

سورۃ الاعراف کی آیتوں کی تعداد اور ان کی صفات

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور اس کی دو سو چھ آیتیں ہیں۔ امام رازی، علامہ قرطبی اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کی آٹھ آیتیں مدنی ہیں۔ آیت ۱۶۳ سے لے کر آیت ۱۷۰ تک جو وسئلہم عن القریۃ سے شروع ہوتی ہیں، نیز امام رازی نے لکھا ہے یہ سورت، سورت ص کے بعد نازل ہوئی ہے۔

حضرت جابر بن زید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے نزدیک یہ سورت ترتیب نزول کے اعتبار سے انتالیسویں سورت ہے۔ اور سورہ ص کے بعد اور سورہ جن سے پہلے نازل ہوئی ہے۔

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ متعدد رجال نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور اس سے کوئی آیت مستثنیٰ نہیں ہے۔ (روح المعانی، جز ۸، ص ۸۲)

اس سورت کی تمام آیات محکم ہیں۔ البتہ ابن زید کے نزدیک اس سورت کی حسب ذیل دو آیتیں منسوخ ہیں:

وَأْمَلَىٰ لَهُمْ إِنْ كَيْدِي مَتَّيَسَّرٌ (الاعراف: ۱۸۳) اور میں انہیں مہلت دیتا ہوں، بے شک میری خفیہ تدبیر بہت چکی ہے۔

اس آیت کو منسوخ قرار دینا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس آیت میں خبر ہے اور نسخ انشاء (احکام) میں ہوتا ہے۔ خبر کو منسوخ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے غلط خبر دی تھی اور اب صحیح خبر دی ہے۔ (العیاذ باللہ) اور احکام میں نسخ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک آیت میں ایک حکم مطلق بیان فرمایا تھا اور اب دوسری آیت میں اس حکم کی مدت یا استثناء کو بیان فرمادیا اور نسخ کا معنی اس حکم کی مدت یا استثناء کا بیان ہے۔ اس لیے احکام میں نسخ جائز ہے۔

دوسری آیت یہ ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (الاعراف: ۱۹۹)

معاف کرنا اختیار کیجئے اور نیکی کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے منہ پھیر لیجئے۔

اس آیت کے متعلق سدی اور ابن زید نے یہ کہا ہے: کہ یہ آیت، آیت جہاد سے منسوخ ہے۔ لیکن یہ قول بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں کفار سے قتال کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ اس آیت میں نبی ﷺ کو مکارم اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ نبی ﷺ کفار اور مشرکین اور دیگر فساق اور فجار کی باطل باتوں اور قبیح حرکتوں سے ملول خاطر نہ ہوں۔ آپ ان کی سختیوں کے باوجود ان کے ساتھ نرم سلوک کرتے تھے۔ ان کی بدی کا جواب نیکی سے اور ان کی برائیوں کا جواب اچھائیوں سے دیتے تھے اور اسی پاکیزہ سیرت پر برقرار رہنے کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے صحیح یہی ہے کہ سورۃ الاعراف کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔

الاعراف، الانعام سے زیادہ طویل ہے کیونکہ الانعام ایک پارہ کی ہے اس میں ۲۰ رکوع اور ۱۲۵ آیتیں ہیں۔ اور الاعراف سو پارہ کی ہے اس میں چوبیس رکوع اور ۲۰۶ آیتیں ہیں۔

سورۃ الاعراف کا زمانہ نزول

علامہ ابن عاشور نے لکھا ہے کہ میں اس پر مطلع نہیں ہو سکا کہ سورۃ الاعراف کے نزول کی صحیح تاریخ کیا ہے۔ جابر بن زید سے مروی ہے کہ یہ سورت سورۃ جن سے پہلے اور سورۃ ص کے بعد نازل ہوئی ہے اور صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سورۃ جن ابتداء اسلام میں نازل ہوئی ہے، جب سیدنا محمد ﷺ کی دعوت کا ظہور ہوا تھا اور یہ ایام حج کا موقع تھا اور رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ عکاظ کے بازار کی طرف جا رہے تھے اور یہ غالباً بعثت کا دوسرا سال تھا۔ اور میں یہ گمان نہیں کرتا کہ سورۃ اعراف اس مدت میں نازل ہوئی تھی کیونکہ سات طویل سورتیں بعثت کے ابتدائی دور میں نازل نہیں ہوئیں۔ (التحریر والتنوير، ج ۸، ص ۶۰۷)

اس سورت کے مضامین پر غور کرنے سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اسی زمانہ میں نازل ہوئی ہے جس زمانہ میں سورۃ الانعام نازل ہوئی تھی۔ اس لیے ہم اب سورت کے مضامین اور مقاصد کو بیان کر رہے ہیں جن پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سورت مکی دور کے وسط میں نازل ہوئی ہے۔

سورۃ الاعراف کے مضامین اور مقاصد

مکی سورتوں میں سورۃ الاعراف سب سے لمبی سورت ہے۔ اس سورت میں اسلام کے بنیادی عقائد بیان کیے گئے ہیں اور اس میں تنبیہ اور تمہید کا رنگ نمایاں ہے۔ اس کے مضامین اور مقاصد کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱- قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس سورت کو اس عنوان سے شروع کیا گیا ہے کتب انزل الیک (آیہ) یہ عظیم کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے۔ لہذا آپ کے دل میں اس سے تکلیف نہ ہو تاکہ آپ اس کے ساتھ ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لیے نصیحت ہے۔ (الاعراف: ۲) یہ رسول اللہ ﷺ کا دائمی معجزہ ہے اور قیامت تک کے لیے آپ کی نبوت پر دلیل ہے۔ کیونکہ چیلنج کے باوجود کوئی شخص اس کی کسی سورت یا آیت کی نظیر نہیں لاسکا۔ سو پہلے آپ کی رسالت پر دلیل کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد پیغام رسالت کا ذکر فرمایا اور توحید اور دین اسلام کو قبول کرنے کی دعوت دی۔

۲- اس سورت کی آیت ۱۱ سے آیت ۲۷ تک حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ بیان فرمایا ہے۔ اس میں حضرت آدم کی پیدائش کا ذکر ہے اور فرشتوں کے حضرت آدم کو سجدہ کرنے کا ذکر ہے اور شیطان کے تکبر کرنے اور حضرت آدم کے ساتھ اس کی دشمنی اور اس کے رائدہ درگاہ ہونے کا بیان ہے۔ حضرت آدم کی جنت سے ہجرت اور ان کا زمین پر نزول ذکر فرمایا ہے۔

۳- اس سورت کی آیت ۳۵ میں وحی رسالت کا بیان ہے۔ اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں اور تم سے میری آیتوں کا بیان کریں تو جس نے تقویٰ اور نیکی کو اختیار کیا تو ان لوگوں پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۴- اس سورت کی آیت ۳۶ سے آیت ۴۱ تک مشرکین اور مکذبین کے اخروی انجام کا ذکر فرمایا۔ کفار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایمان نہ لانے کے جو باطل عذر بیان کریں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا جو جواب دیا جائے گا اس کا ذکر فرمایا ہے اور ان کے عذاب کا بیان فرمایا ہے۔

۵- اس سورت کی آیت ۴۲ سے آیت ۴۵ تک آخرت میں خصوصاً حشر کے دن مومنین کے حالات اور ان کا اہل دوزخ سے مکالمہ بیان فرمایا ہے اور آیت ۴۶ سے آیت ۴۹ تک اہل اعراف کا ان سے مکالمہ بیان فرمایا ہے اور آیت ۵۰ سے آیت ۵۲ تک

اہل دوزخ کی گفتگو بیان فرمائی ہے۔

۶۔ اس سورت کی آیت ۵۳ سے آیت ۵۸ تک اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود اور اپنی وحدانیت پر دلائل قائم فرمائے ہیں اور اس ضمن میں اپنی عطا کردہ نعمتوں سے استدلال فرمایا ہے۔ مثلاً آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمانا اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے سورج، چاند اور ستاروں کا مسخر ہونا اور زمین سے پھلوں کو پیدا فرمانا اور اللہ تعالیٰ نے زمین میں جو نعمتیں پیدا فرمائی ہیں اور انسانوں کو اس کائنات سے فوائد حاصل کرنے کا جو اختیار عطا فرمایا ہے اور اس کو دیگر مخلوقات پر جو فضیلت عطا فرمائی ہے، یہ تمام نعمتیں انسانوں کو یاد دلائی ہیں۔

۷۔ اس سورت کی آیت ۵۹ سے آیت ۱۱۱ تک انبیاء سابقین علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ آیت ۵۹ سے آیت ۶۳ تک حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے۔ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کا پیغام دیا، ان کی قوم نے اس کا کیا جواب دیا اور پھر ان پر جو عذاب کا عذاب آیا، آیت ۶۵ سے آیت ۷۲ تک حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر ہے اور ان کے پیغام کو مسترد کرنے پر ان کی قوم کے اوپر عذاب بھیجنے کا ذکر ہے۔ آیت ۷۳ سے آیت ۷۹ تک حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر ہے۔ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کیا اور ان کی اونٹنی کی کوئیں کاٹ ڈالیں اور پھر ان پر عذاب آیا۔ آیت ۸۰ سے آیت ۸۴ تک حضرت لوط علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ان کی قوم ہم جنس پرستی کا شکار تھی۔ حضرت لوط علیہ السلام کے منع فرمانے کے باوجود باز نہ آئی اور عذاب کا شکار ہوئی۔ آیت ۸۵ سے آیت ۱۰۲ تک حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ان کی قوم ناپ تول میں کمی کرنے میں مبتلا تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے منع کرنے کے باوجود باز نہ آئی اور عذاب کا شکار ہوئی۔ اس قصہ کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مختلف اطوار سے مشرکوں کو اپنے عذاب سے ڈرایا ہے اور اپنی رحمت کے حصول کی طرف متوجہ کیا ہے۔ آیت ۱۰۳ سے آیت ۱۱۱ تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طویل قصہ بیان فرمایا ہے۔ ان کے معجزات، فرعون کے دربار میں ان کا جانا، فرعون کے ساحروں پر غالب آنا، بنو اسرائیل کی فرعون سے نجات اور ان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کے مقابلہ میں ان کی سرکشی، ان تمام امور کا تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ ان آیتوں کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ سے بھی خطاب ہے اور سابقہ قوموں کی سرکشی کی وجہ سے ان پر جو عذاب آیا اس سے اہل مکہ کو ڈرایا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے اور سیدنا محمد ﷺ کی بعثت کی بشارت دی ہے اور آپ کے دین اور آپ کی امت کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

۸۔ آیت ۱۲۲ سے آیت ۲۰۶ تک اہم امور یہ ہیں: آیت ۱۲۲ سے آیت ۱۲۴ تک اولاد آدم سے مشتاق لینے کا ذکر ہے۔ آیت ۱۲۵-۱۲۴ میں بلعم باعور کا ذکر ہے۔ آیت ۱۸۶-۱۸۷ تک گزشتہ امتوں کے واقعات سے عبرت حاصل کرنے، کفار کی شقاوت اور محرومی اور کفار کو ڈھیل دینے کا ذکر فرمایا ہے۔ آیت ۱۸۸-۱۸۶ تک وقوع قیامت کا علم اور علم غیب کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہونے کا ذکر فرمایا ہے۔ آیت ۱۸۹-۱۹۰ سے دوبارہ انسان کی پیدائش اور حضرت آدم اور حضرت حواء کا ذکر ہے۔ آیت ۱۹۱-۱۹۸ تک شرک کا تفصیل سے رد فرمایا ہے۔ آیت ۲۰۶-۱۹۹ تک مکارم اخلاق، شیطان کے اغواء سے بچنے، اتباع وحی اور رجوع الی اللہ کا بیان فرمایا ہے۔

سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف کی باہمی مناسبت

۱۔ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ جو امور سورۃ الانعام میں اجمالاً بیان کیے گئے، ان کو اس سورت میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً انبیاء سابقین علیہم السلام کا الانعام میں اجمالاً ذکر تھا اس سورت میں ان کا ذکر بہت تفصیل سے کیا گیا ہے گویا کہ سورۃ الانعام بہ منزلہ متن ہے اور سورۃ الاعراف بہ منزلہ شرح ہے۔

۲- سورة الانعام میں اجمالاً فرمایا تھا هو الذی خلقکم من طین (الانعام: ۲) وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور اس سورت میں بہت تفصیل سے بتایا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کس طرح پیدا ہوئے اور اولاد آدم سے میثاق لینے کا ذکر فرمایا ہے۔

۳- سورة الانعام میں فرمایا تھا کتب علی نفسه الرحمة (الانعام: ۱۲) اس نے (محض اپنے کرم سے) اپنی ذات پر رحمت لازم کر لی ہے اور اس سورت میں اس رحمت کو تفصیل سے بیان فرمایا:

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاكْتُبُهَا
لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ
بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ۔ (الاعراف: ۱۵۶)

اور میری رحمت ہر چیز کو محیط ہے سو میں دنیا اور آخرت کی
بھلائی ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو اللہ سے ڈرتے ہیں اور
زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

۴- الانعام کے آخر میں فرمایا تھا:

وَأَن هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ

اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے لہذا اس پر چلو۔

(الانعام: ۱۵۳)

اور اس سورت کے اول میں اس سیدھے راستہ کا بیان کرتے ہوئے فرمایا:

كِتَابٌ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ
حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنذِرَ بِهِ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝
اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِن
دُونِهِ أَوْلِيَاءَ۔ (الاعراف: ۲۰۳)

یہ عظیم کتاب ہے جو آپ کی طرف نازل کی گئی ہے سو آپ
کے دل میں اس (کی تبلیغ) سے تنگی نہ ہو تاکہ آپ اس کے
ساتھ ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لیے نصیحت ہے ۝
لوگو! اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری
طرف نازل کیا گیا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر (اپنے) دوستوں کی
پیروی نہ کرو۔

۵- الانعام میں فرمایا تھا:

ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا
كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝ (الانعام: ۱۶۳)

پھر تمہیں اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے تو وہ تمہیں اس چیز کی
خبر دے گا جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔

اور اس سورت کے شروع میں اس دن کے احوال کی تفصیل بیان فرمائی:

فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ
الْمُرْسَلِينَ ۝ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا
كُنَّا غَائِبِينَ ۝ (الاعراف: ۶۰-۷)

تو جن لوگوں کی طرف رسول بھیجے گئے ہم ان سے ضرور
سوال کریں گے اور بے شک ہم رسولوں سے بھی ضرور سوال
کریں گے اور ہم ان پر ان کے احوال اپنے علم سے ضرور بیان
کریں گے اور ہم (ان سے) غائب نہ تھے۔

۶- سورة الانعام میں فرمایا تھا:

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ مِثَالِهَا وَمَنْ
جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا
يُظْلَمُونَ ۝ (الانعام: ۱۶۰)

جو شخص نیکی لے کر آئے تو اس کے لیے اس کی مثل دس
نیکیاں ہیں اور جو شخص برائی لے کر آئے تو اسے صرف اسی ایک
برائی کی سزا دی جائے گی اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تبیان القرآن

جلد چہارم

اور نیک اعمال پر جزاء اور برے اعمال پر سزا میزان پر نیکوں اور برائیوں کے وزن کرنے کے بعد مترتب اور مستحق ہوگی اور وزن کرنے کا بیان سورۃ الاعراف میں ہے:

وَالْوِزْنَ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ نَفَلَتْ مَوَازِينَهُ
فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ
مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ
بِمَا كَانُوا يَآئِنًا يَظْلِمُونَ ۝ (الاعراف: ۸-۹)

اور اس دن اعمال کا وزن کرنا برحق ہے، پھر جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہونے والے ہیں ۝ اور جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے تو یہ وہی ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو خسارے میں ڈالا کیونکہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے ۝

یہ چند وجوہ سورۃ الانعام اور الاعراف میں باہم ربط اور مناسبت کی ہیں جو خاتم الحفظ حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ کی نکات آفرینی سے ماخوذ ہیں۔ سورۃ الاعراف کے تعارف میں یہ چند ضروری امور بیان کرنے کے بعد ہم اب اس سورت کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ اللہ العالمین! اس سورت اور باقی تمام سورتوں کی تفسیر میں میری غیب سے مدد فرما، مجھے غلطیوں اور لغزشوں سے محفوظ اور مامون رکھ اور مجھے صراط مستقیم پر قائم اور برقرار رکھ اور مجھے وہ مضامین القا فرما جو حق اور صواب ہوں اور تیری رضا اور تیرے رسول ﷺ کی خوشنودی کا موجب ہوں!

سُورَةُ الْأَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ لِمِائَتَانِ وَسِتِّ آيَاتٍ وَارْبَعٌ وَعِشْرُونَ رُكُوعًا

سورہ الاعراف مکی ہے اس میں دوسو چھ آیتیں اور چوبیس رکوع ہیں

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝

اللہ ہی کے نام سے شروع کرتا ہوں، جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے ۝

الْمَثَّ ۝ كِتَابٌ أَنْزَلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ

الآن من ۝ یہ عظیم کتاب آپ کی طرف نازل کی گئی ہے، سو آپ کے دل میں اس (کی تبلیغ) سے تنگی نہ ہو

مِّنْهُ لَتُنذِرَ بِهِ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ إِلَيْكُم مِّنْ

تاکہ آپ اس کے ساتھ ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لیے نصیحت ہے ۝ (اے لوگو!) اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب

رِسَالَتِكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝

کی جانب سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے، اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے دوستوں کی پیروی نہ کرو، تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو ۝

وَكَم مِّن قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا فَجَاءَهَا بَسَائِبَاتٌ وَأَوْهَمُ قَائِلُونَ ۝

اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کر دیا، پس ان پر ہمارا عذاب (اجانک) رات کے وقت آیا یا جس وقت وہ سو رہے تھے ۝

فَمَا كَانَ دَعْوَاهُمْ إِذْ جَاءَهُمْ بِآسِنًا إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّا كُنَّا

جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو اس وقت ان کی یہی چیخ و پکار تھی کہ بیشک ہم ہی ظالم

ظالمین ۵ فَلَسَّكَ الَّذِينَ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَسَّكَ

تھے ۵ پس ہم ان لوگوں سے ضرور باز پرس کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم

الْمُرْسَلِينَ ۶ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ۷

رسولوں بھی ضرور پوچھیں گے ۷ پھر ہم خود کامل علم کے ساتھ ان کے تمام احوال بیان کریں گے، ہم غائب تو نہیں تھے ۷

وَالْوِزْنَ يَوْمَ مِيزَانٍ ۸ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ

اور اس دن اعمال کا وزن کرنا برحق ہے، پس جن (کی نیکیوں) کے پلٹے بھاری ہوئے تو وہی

الْمُقَلَّبُونَ ۹ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا

کامیاب ہیں ۹ اور جن (کی نیکیوں) کے پلٹے ہلکے ہوئے تو وہی اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالنے

أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ ۱۰ وَلَقَدْ مَكَّنَّا فِي الْأَرْضِ

دلے ہیں کیوں کہ وہ ہماری آیتوں پر ظلم کرتے تھے ۱۰ اور ہم نے تم کو زمین پر قابض کر دیا

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ط قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۱۱

اور تمہارے لیے اس (زمین) میں ابواب زینت فراہم کیے (مگر) تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو ۱۱

الْمَصَّصِ كِي تَحْقِيقِ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: الف لام میم صاد ۱۰ (الاعراف: ۱۰)

اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو بھی ان حروف مقطعات سے شروع فرمایا تاکہ ایک بار پھر یہ تسمیہ ہو کہ قرآن مجید معجز کلام ہے اور اس چیلنج کی طرف پھر اشارہ ہو کہ کوئی جن اور انسان قرآن مجید کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثل بھی نہیں لاسکتا اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کلام ہے کیونکہ یہ قرآن عربوں کی لغت اور ان کے حروف تہجی مثلاً الف لام میم صاد وغیرہ سے مرکب ہے۔ اگر منکرین کے زعم کے مطابق یہ کسی انسان کا کلام ہے تو ان ہی حروف سے مرکب کر کے وہ بھی قرآن مجید کی کسی ایک سورت کی مثل کلام بنا کر لے آئیں کیونکہ یہ کلام ان حروف مجاہد سے مرکب ہے جن سے تمام اہل عرب اپنے کلام کو مرکب کرتے ہیں اور جب باوجود شدید مخالفت اور علوم و معارف کی روز افزوں ترقی کے چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی کوئی منکر اس کلام کی نظیر نہ لاسکتا تو روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ یہ قرآن کسی انسان کا کلام نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ المص کا معنی ہے انا اللہ افصل (میں اللہ، تفصیل کرتا ہوں) امام رازی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور کہا ہے کہ ان حروف کی رعایت سے اس کا معنی انا اللہ اصلح (میں اللہ اصلاح کرتا ہوں) بھی ہو سکتا ہے اور اول الذکر کی ثانی الذکر پر ترجیح کی کوئی دلیل نہیں ہے اور میم کی رعایت سے انا اللہ الملک (میں اللہ بادشاہ ہوں) بھی ہو سکتا ہے اس لیے ان حروف کو اول الذکر معنی پر محمول کرنا ترجیح بلا مرجح اور بلا دلیل ہے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ المص اللہ تعالیٰ کا اسم ہے، لیکن یہ بھی بلا دلیل ہے کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ المص کسی نبی کا نام ہو یا کسی فرشتے کا نام ہو بلکہ تحقیق یہ ہے کہ المص اس سورت کا اسم لقب ہے اور یہ اس سورت کا اسم بھی ہو سکتا ہے۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۱۹۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

زیادہ صحیح یہ ہے کہ حروف مقطعات اوائل سورت کے اسرار ہیں اللہ تعالیٰ نے اس راز سے صرف نبی ﷺ کو مطلع فرمایا ہے اور نبی ﷺ کے وسیلہ اور فیض سے اللہ تعالیٰ نے اولیاء عارفین اور علماء کاملین میں سے جن کو چاہا، ان اسرار سے مطلع فرمایا ان حروف کی زیادہ تحقیق اور وضاحت ہم نے البقرہ: ۱ میں کر دی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ عظیم کتاب آپ کی طرف نازل کی گئی ہے، سو آپ کے دل میں اس (کی تبلیغ) سے تنگی نہ ہو تاکہ آپ اس کے ساتھ ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لیے نصیحت ہے (الاعراف: ۲)

قرآن مجید کی تبلیغ میں نبی ﷺ کے حرج یا شک کی تحقیق

حرج کا معنی ہے تنگی (المفردات، ص ۱۱۲) حدیث میں ہے: ہوا اسرائیل سے احادیث بیان کرو، اس میں حرج نہیں ہے، یعنی اس میں کوئی گناہ نہیں ہے یا اس پر پابندی نہیں ہے۔ (التمہایہ، ج ۱، ص ۳۶۱، الفائق، ج ۱، ص ۲۳۸، مجمع بحار الانوار، ج ۱، ص ۳۶۷)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ قرآن مجید کی تبلیغ میں اس خوف سے آپ کا دل تنگ نہ ہو کہ کفار آپ کی تکذیب کریں گے، اس آیت میں آپ کو قرآن مجید سے ڈرانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور اس سے پہلے یہ فرمایا کہ آپ کے دل میں اس کی تبلیغ سے تنگی نہ ہو کیونکہ قرآن مجید کی تبلیغ کرنا اور اس سے ڈرنا اسی وقت کامل ہو گا جب آپ کے دل میں اس کی تبلیغ سے تنگی نہ ہو۔ اور اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمائی ہے، اس لیے آپ کو یہ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور حمایت آپ کے ساتھ ہے لہذا آپ کے دل میں اس کی تبلیغ سے تنگی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ جس کا اللہ حافظ اور ناصر ہو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا سو آپ قرآن مجید کی تبلیغ کرنے، اس سے ڈرانے اور اس کے ساتھ نصیحت کرنے میں مشغول رہیں اور کفار اور مشرکین کی مخالفت کی مطلقاً پروا نہ کریں۔

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبہ میں فرمایا: سنو میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دوں جو تم کو معلوم نہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے مجھے آج تعلیم دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے اپنے بندوں میں سے کسی بندہ کو جو کچھ مال عطا کیا ہے وہ حلال ہے (جب تک اللہ تعالیٰ اس کو حرام نہ فرمائے۔ اس کا مقصد ان مشرکوں کا رد کرنا ہے جنہوں نے از خود بحیرہ اور سائبہ وغیرہ کو حرام کر لیا تھا) میں نے اپنے تمام بندوں کو اس حال میں پیدا کیا کہ وہ (فطرتاً) باطل سے دور رہنے والے تھے اور بے شک ان کے پاس شیطان آئے اور انہوں نے ان کو دین (برحق) سے پھیر دیا اور جو چیزیں میں نے ان پر حلال کی تھیں، وہ انہوں نے ان پر حرام کر دیں، اور ان کو میرے ساتھ

شُرک کرنے کا حکم دیا جس (شُرک) پر میں نے کوئی دلیل نہیں قائم کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کو دیکھا اور اہل کتاب کے چند باقی لوگوں کے سوا تمام عرب اور عجم کے لوگوں سے ناراض ہو اور اللہ نے فرمایا میں نے تم کو آزمائش کے لیے بھیجا ہے اور تمہارے سبب سے (دوسروں کی) آزمائش کے لیے میں نے تم پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس کو پانی نہیں دھو سکتا۔ تم اس کو نیند اور بیداری میں پڑھو گے، اور بے شک اللہ نے مجھے قریش کو جلانے کا حکم دیا ہے، میں نے کہا اے میرے رب اوہ تو میرا سر پھاڑ دے اور اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے چھوڑ دے گے، اللہ نے فرمایا ان کو اس طرح نکال دو جس طرح انہوں نے تم کو نکالا ہے، تم ان سے جہاد کرو، ہم تمہاری مدد کریں گے، تم خرچ کرو، ہم تم پر خرچ کریں گے، تم ایک لشکر بھیجو، ہم اس سے پانچ گنا لشکر بھیجیں گے۔ اپنے فرمانبرداروں کے ساتھ اپنے نافرمانوں کے خلاف جنگ کرو۔ (الحدیث)

(صحیح مسلم، صفحہ الجند: ۶۳، ۲۸۶۵) ۷: ۷، السنن الکبریٰ للنسائی، ج ۵، رقم الحدیث: ۸۰۷۰)

یہ حدیث اس آیت کی بہ منزلہ تفسیر ہے اور اس میں یہ بیان ہے کہ نبی ﷺ کو کفار اور مشرکین کی مخالفت اور ان کی ضرر رسانی کا خدشہ تھا اور آپ کو اس سے پریشانی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں اور قرآن کریم کی تبلیغ اور اشاعت سے آپ کا دل تنگ نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی نصرت اور حمایت آپ کے ساتھ ہے لہذا آپ ان کی مخالفت کی بالکل پروا نہ کریں۔

اس آیت کا دوسرا محمل یہ ہے کہ باوجود بسیار کوشش اور پرزور تبلیغ کے مشرکین اپنی ہٹ دھرمی پر قائم تھے اور کفر، عناد اور سرکشی پر اصرار کرتے تھے۔ اس سے نبی ﷺ کو بے حد قلق اور رنج ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے ایمان نہ لانے سے آپ کے دل میں رنج اور تنگی نہ ہو تاکہ آپ کشادہ دلی اور پوری لگن کے ساتھ ان کو اس قرآن کے ذریعہ اخروی عذاب سے ڈراتے رہیں، اس معنی کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے:

اگر وہ اس قرآن پر ایمان نہ لائے تو کہیں فرط غم سے آپ جان دے دیں گے۔

(الکہف: ۶)

اگر وہ اس قرآن پر ایمان نہ لائے تو شاید آپ (فرط غم سے) جان دے دیں گے۔

(الشعراء: ۳)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، قتادہ اور سدی سے اپنی اسانید کے ساتھ یہ نقل کیا ہے کہ اس آیت میں حرج شک کے معنی میں ہے یعنی آپ کے دل میں قرآن مجید کے متعلق شک نہ ہو۔

(جامع البیان، جز ۸، ص ۱۵۳-۱۵۴، مطبوعہ دار الفکر، بیروت ۱۴۱۵ھ)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے بھی حرج کی تفسیر میں اس معنی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ شک کو حرج اس لیے کہتے ہیں کہ شک کرنے والے کے دل میں تنگی ہوتی ہے اس کے برخلاف یقین کرنے والے کو شرح صدر ہوتا ہے پھر اس کی تائید میں یہ آیت پیش کی ہے:

اگر آپ (بہ فرض محال) اس چیز کے متعلق شک میں ہوں جو ہم نے آپ کی طرف نازل فرمائی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لیں جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔

(یونس: ۹۴)

ہمارے نزدیک نبی ﷺ کی طرف قرآن مجید میں شک کرنے کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے۔ شک ایمان کے منافی ہے اس لیے یہ محال ہے کہ نبی ﷺ قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے میں شک کریں۔ علاوہ ازیں لغت کی کسی کتاب میں حرج کا معنی شک نہیں ہے اور مجاز پر کوئی قرینہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس اس کے خلاف پر قرائن ہیں اور قرآن مجید کی اس آیت سے استشاد کرنا باطل ہے۔ اولاً اس لیے کہ اس میں لفظ ”اگر“ کے ساتھ کلام ہے جس سے شک کا وقوع ثابت نہیں اور ثانیاً یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں نبی ﷺ مخاطب نہ ہوں بلکہ عام سننے والا مخاطب ہو۔ ہمارے استاذ علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ نے اس آیت کو اسی پر محمول کیا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کلام بطور تعریض ہو بہ ظاہر شک کا اسناد آپ کی طرف ہو اور مراد آپ کی امت ہو۔

قرآن مجید سے ڈرانے اور نصیحت کرنے کے الگ الگ محمل

اس آیت میں فرمایا ہے تاکہ آپ اس (قرآن) کے ساتھ ڈرائیں اور یہ ایمان والوں کے لیے نصیحت ہے۔

ہر چند کہ قرآن کریم تمام لوگوں کے لیے نصیحت ہے لیکن چونکہ اس سے فائدہ صرف مومنین حاصل کرتے ہیں اور وہی اس کی نصیحت کو قبول کرتے ہیں اس لیے فرمایا کہ یہ مومنین کے لیے نصیحت ہے۔ اس آیت میں قرآن مجید سے ڈرانے کا بھی ذکر ہے اور قرآن مجید سے نصیحت کرنے کا بھی ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض ضدی اور سرکش ہوتے ہیں اور لذات جسمانیہ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کو انبیاء علیہم السلام اخروی عذاب سے ڈراتے ہیں اور بعض انسان نیک اور شریف ہوتے ہیں اور حق بات کو قبول کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ ان کے لیے انبیاء علیہم السلام کی صرف تنبیہ اور نصیحت ہی کافی ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے لوگو!) اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے۔

اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے دوستوں کی پیروی نہ کرو، تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو (الاعراف: ۳)

احادیث کے حجت ہونے کے دلائل اور ان کی حجیت کی وضاحت

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کا ذکر فرمایا تھا اور اس بات کا ذکر فرمایا تھا کہ امت کو ڈرانے اور نصیحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرمایا ہے اور اب اس آیت میں امت کو یہ حکم دیا ہے کہ نبی ﷺ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے وہ اس کی اتباع کریں اور اس پر عمل کریں اور اس آیت میں احادیث مبارکہ کے حجت ہونے پر دلیل ہے، کیونکہ جس طرح نبی ﷺ پر قرآن مجید نازل کیا گیا ہے اسی طرح آپ پر احادیث مبارکہ بھی نازل کی گئی ہیں، فرق یہ ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ اور معانی دونوں نازل ہوئے ہیں اور احادیث کے نبی ﷺ پر صرف معانی نازل ہوئے اور ان معانی کو نبی ﷺ نے اپنے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے اس آیت کے علاوہ اور بھی متعدد آیات میں احادیث مبارکہ کے حجت ہونے پر دلیل ہے ان میں سے بعض آیات یہ ہیں:

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر: ۷) سے تم کو منع کریں ان سے باز رہو۔

اگر رسول اللہ ﷺ صرف قرآن مجید کے احکام پر عمل کرانے اور فقط قرآن مجید کی آیات پہنچانے پر مامور ہوتے اور قرآن مجید کے علاوہ احکام دینے کے مجاز نہ ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ آیت نازل نہ فرماتا۔ نیز فرمایا:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ
آپ کہئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو محبوب بنالے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔

(آل عمران: ۳۱)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت اور مغفرت کے حصول کو آپ کی اتباع پر موقوف کر دیا ہے، کیونکہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو قرآن مجید پر عمل کرو بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اگر تم اللہ کی محبت چاہتے ہو تو میری یعنی رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرو۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ
اور ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں سے بیان فرمائیں کہ ان کی طرف کیا نازل کیا گیا ہے۔ (النحل: ۳۳)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کی تعلیم اور تبیین کے بغیر قرآن مجید کے معانی معلوم نہیں ہو سکتے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا ہے۔ آپ کے احکام کی اطاعت اور آپ کے افعال کی اتباع قیامت تک کے مسلمانوں پر واجب ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے براہ راست احکام حاصل کیے اور آپ کو دیکھ کر آپ کی سنت کی پیروی کی۔ اب سوال یہ ہے کہ بعد کے لوگوں کو آپ کے احکام اور آپ کے افعال کا کس ذریعہ سے علم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے افعال کو ہمارے اعمال کے لیے نمونہ بنایا ہے۔ لہذا جب تک آپ کے افعال ہمارے افعال کے سامنے نہ ہوں ہم اپنے اعمال رسول اللہ ﷺ کے افعال کے مطابق کیسے کر سکیں گے اور آپ کے احکام کی اطاعت کیسے کر سکیں گے اور جب کہ آپ کے احکام اور آپ کے افعال کی اطلاع صرف احادیث سے ہی ممکن ہے تو معلوم ہوا کہ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارکہ اللہ کی حجت تھی اسی طرح ہمارے حق میں آپ کی احادیث مبارکہ اللہ کی حجت ہیں۔ اور اگر ان احادیث کو معتبر ماخذ نہ مانا جائے تو بندوں پر اللہ کی حجت ناتمام رہے گی۔

نیز اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر رسول اللہ ﷺ نہ بتلاتے تو ہمیں کیسے معلوم ہوتا کہ صلوٰۃ سے مراد یہ معروف نماز ہے۔ اذان کے ان مخصوص الفاظ کا کیسے پتہ چلتا، تکبیر تحریم سے لے کر سلام پھیرنے تک نماز کے تمام ارکان، واجبات، سنس اور آداب کا ہمیں کیسے علم ہوتا۔ زکوٰۃ کے نصاب اور ادائیگی کی مقدار کا اور اس کی تمام شرائط اور مواعظ کا ہمیں کیسے علم ہوتا، اسی طرح روزہ کی تمام تر تفصیلات، اس کی قضا اور کفارہ کا بیان ہمیں کیسے معلوم ہوتا۔ حج اور عمرہ کے ارکان، واجبات، مستحبات اور مفادات کیسے معلوم ہوتے۔ ان میں سے کسی چیز کا بھی قرآن مجید میں بیان نہیں ہے۔ عمد رسالت میں صحابہ کرام کو یہ تمام تفصیلات براہ راست آپ سے سن کر اور آپ کو دیکھ کر حاصل ہوئیں اور بعد کے مسلمانوں کو ان احادیث سے معلوم ہوئیں جو متعدد اسانید سے صحابہ کرام سے مروی ہیں اور بعد میں ان احادیث کی باقاعدہ تدوین کی گئی اور آج ان سے استفادہ کے لیے صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ جس طرح قرآن مجید کے معانی کے مبین اور معلم ہیں، اسی طرح آپ بعض احکام کے شارع بھی ہیں جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ
الْخَبَائِثَ
(الاعراف: ۱۵۷) ناپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں حسب ذیل احادیث ہیں، امام ابوداؤد متوفی ۲۵۷ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت مقدم بن معدی کرب بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سنو مجھے کتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل بھی، سنو عنقریب ایک شکم سیر شخص اپنے تخت پر بیٹھا ہوا کہے گا تم (صرف) اس قرآن کو لازم پکڑ لو اس میں جو چیزیں تم حلال پاؤ ان کو حلال قرار دو، اور اس میں جن چیزوں کو تم حرام پاؤ ان کو حرام قرار دو، سنو تمہارے لیے پالتو گدھے

کا گوشت حلال نہیں ہے اور نہ تمہارے لیے ہر کچیلوں والا درندہ حلال ہے اور نہ ذی کی راستہ میں پڑی ہوئی چیز، سو اس صورت کے کہ اس چیز کا مالک اس سے مستغنی ہو اور جو شخص کسی قوم کے پاس جائے اس قوم پر اس کی میزبانی کرنا لازم ہے۔ اگر وہ اس کی مہمان نوازی نہ کریں تو اس مہمان کے لیے ان لوگوں سے بہ قدر ضیافت مال چھین لینا جائز ہے۔

حدیث کا یہ آخری جملہ اس صورت پر محمول ہے جب مہمان حالت اضطرار میں ہو اور اس کے پاس اپنا پیٹ بھرنے کے لیے میزبان کا مال لینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ ہو ورنہ قرآن مجید اور دیگر احادیث میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے کھانے سے منع فرمایا ہے۔

(سنن ابوداؤد، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۶۰۳، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۶۷۲-۲۶۷۳، سنن ابن ماجہ، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۲-۱۳، مسند احمد، ج ۴، ص ۱۳۱-۱۳۰، طبع قدیم، المستدرک، ج ۱، ص ۱۰۹، سنن دارمی، ج ۱، رقم الحدیث: ۵۸۶)

نیز امام عبداللہ بن عبدالرحمن دارمی سمرقندی متوفی ۲۵۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت حسان بیان کرتے ہیں کہ حضرت جبرائیل نبی ﷺ پر اسی طرح سنت نازل کرتے تھے جس طرح قرآن مجید نازل کرتے تھے۔ (سنن دارمی، رقم الحدیث: ۵۸۸، مطبوعہ دارالکتب العربی، بیروت)

مکحول بیان کرتے ہیں کہ سنت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ سنت ہے جس پر عمل کرنا فرض ہے اور اس کو (بہ طور انکار یا اہانت) ترک کرنا کفر ہے۔ اور دوسری قسم وہ سنت ہے جس پر عمل کرنا باعث فضیلت ہے اور جس کے ترک کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (سنن دارمی، رقم الحدیث: ۵۸۹)

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن انہوں نے نبی ﷺ کی ایک حدیث بیان کی تو ایک شخص نے کہا کتاب اللہ میں اس کے خلاف ہے۔ انہوں نے کہا میں تم کو ایسا کرتے ہوئے نہ دیکھوں کہ میں تم کو رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کروں اور تم اس حدیث کا کتاب اللہ سے معارضہ کرو۔ رسول اللہ ﷺ تم سے زیادہ کتاب اللہ کو جاننے والے تھے۔

(سنن دارمی، رقم الحدیث: ۵۹۰)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جو حدیث بہ ظاہر قرآن مجید کے خلاف ہو لیکن کسی باریک اور خفی وجہ سے اس کی قرآن مجید کے ساتھ مطابقت ہو سکتی ہو تو اس کو قرآن مجید کے معارض اور خلاف قرار نہیں دیا جائے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں نماز میں مطلقاً قرآن کریم پڑھنے کا حکم ہے اور کسی خاص سورت کو پڑھنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ فرمایا ہے:

فَأَقْرءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ (المزمل: ۲۰)

تمہیں جتنا قرآن پڑھنا آسان لگے اتنا پڑھ لیا کرو۔

اس کے برخلاف حدیث میں ہے:

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص سورہ فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہیں ہوگی۔

(صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۶۵، صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ: ۳۳، (۳۹۳) ۸۵۰، سنن ابوداؤد، ج ۱، رقم الحدیث: ۸۲۲، سنن الترمذی، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۳۷، سنن النسائی، ج ۲، رقم الحدیث: ۹۱۱، سنن ابن ماجہ، ج ۱، رقم الحدیث: ۸۳۷، سنن کبریٰ للنسائی، ج ۵، رقم الحدیث: ۸۰۰۹)

لیکن اس حدیث کا محمل یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز کامل نہیں ہوگی۔ مطلقاً قرآن مجید نماز میں پڑھنا فرض ہے اور سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے اور اگر کسی نے نماز میں سورہ فاتحہ کو نسیاً ترک کر دیا تو سجدہ سہو واجب ہو گا اور اگر اس کو عمدتاً ترک

کر دیا تو نماز اس وقت میں واجب الاعداء ہوگی۔ اس لیے یہ حدیث قرآن مجید کے خلاف نہیں ہے۔

البتہ جو حدیث صریح قرآن کے خلاف ہو اور اس کی کوئی صحیح توجیہ ممکن نہ ہو تو اس کو قرآن مجید کے مقابلہ میں ترک کر دیا جائے گا اور اس کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا کلام نہیں ہے اور کسی زندیق نے اس حدیث کو گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا اور اصطلاحاً وہ حدیث موضوع قرار دی جائے گی۔ اس کی مثال یہ حدیث ہے:

امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی المتوفی ۳۶۰ھ اپنی سند کے ساتھ حضرت ضحاک بن زبل الجہنی سے ایک طویل حدیث روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز کی بعد صحابہ سے فرمایا آج رات تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟ حضرت ضحاک نے ایک طویل خواب بیان کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تعبیر بیان فرمائی۔ اس تعبیر میں آپ کا یہ ارشاد بھی ہے دنیا (کی عمر) سات ہزار سال ہے اور میں اس کے آخری ہزار میں ہوں۔ (الحدیث)

(المعجم الکبیر، ج ۸، رقم الحدیث: ۸۱۳۶، دلائل النبوة للسیوطی، ج ۷، ص ۳۸-۳۶، کنز العمال، ج ۱۳، رقم الحدیث: ۳۸۳۳۳، مجمع الزوائد، ج ۷، ص ۱۸۴)

اس حدیث کی سند میں ایک راوی سلیمان بن عطاء القرظی ہے جو مسلمہ بن عبد اللہ الجہنی سے روایت کرنے میں منفرد ہے۔ حافظ جمال الدین ابو الحجاج یوسف الرزی المتوفی ۷۳۲ھ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

امام بخاری نے کہا اس کی احادیث میں مناکیر ہیں۔ امام ابو زرعة نے کہا یہ منکر الحدیث ہے:

(تمذیب الکمال فی اسماء الرجال، ج ۸، ص ۸۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

امام ابن حبان نے کتاب الضعفاء میں اس کے متعلق لکھا ہے یہ ایک بوڑھا شخص تھا جو مسلمہ بن عبد اللہ الجہنی سے ایسی چیزیں روایت کرتا تھا جو موضوعات کے مشابہ ہیں اور ثقہ راویوں کی احادیث کے مشابہ نہیں ہیں اور امام ابو حاتم نے اس کو منکر الحدیث کہا۔ (تمذیب التہذیب، ج ۳، ص ۱۹۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام ابن ابی حاتم رازی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے جس میں سے چھ ہزار سال گزر چکے ہیں۔ (تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۸، ص ۲۴۹۹، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ، ۱۳۱۷ھ)

امام ابن ابی حاتم نے اس حدیث کی سند ذکر نہیں کی جس سے اس کا حال معلوم ہوتا۔ البتہ یہ حدیث صریح قرآن کے خلاف ہے اور اس حدیث کا موضوع اور جھوٹ ہونا بالکل ظاہر ہے کیونکہ اگر یہ حدیث صحیح ہوتی اور سیدنا محمد ﷺ کی بعثت کے ایک ہزار سال بعد قیامت نے آنا ہوتا تو ہر شخص کو معلوم ہو جاتا کہ اب قیامت کے آنے میں کتنا وقت باقی رہ گیا ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں ہے:

لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً (الاعراف: ۱۸۷)

قیامت تم پر اچانک ہی آئے گی۔

علاوہ ازیں اب نبی ﷺ کی بعثت کے بعد ایک ہزار اور چار سو سال سے زیادہ سال گزر چکے ہیں جبکہ اس حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ کی بعثت کے بعد دنیا کی عمر ایک ہزار سال ہے گویا چار سو سال پہلے قیامت آ جانا چاہیے تھی لہذا اس حدیث کا جھوٹ ہونا بالکل واضح ہے۔ کسی زندیق نے ایک جعلی سند بنا کر ایک جھوٹ کو نبی ﷺ کی طرف منسوب کر دیا۔ معاذ اللہ! امام عبد الرحمن بن علی بن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ حضرت انس بن مالک سے روایت کیا ہے اور اس کے متعلق لکھا ہے۔ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ پر وضع کی گئی ہے اور اس کو وضع کرنے والا العلاء بن زیدل ہے۔ ابن المدینی

نے کہا کہ وہ حدیث وضع کرتا تھا۔ امام ابو حاتم رازی اور امام ابو داؤد نے کہا کہ وہ متروک الحدیث ہے اور امام ابن حبان نے کہا کہ اس نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک من گھڑت مجموعہ روایت کیا ہے جس کا ذکر جائز نہیں ہے۔
ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۳ھ نے بھی اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔

(موضوعات کبیر، ص ۹۸، مطبوعہ مطبع مجبائی، دہلی)

امام علی بن عمر الدار قطنی متوفی ۳۸۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس عنقریب میری مختلف احادیث آئیں گی پس تمہارے پاس میری جو حدیث کتاب اللہ اور میری سنت (معروفہ) کے موافق پہنچے، وہ میری حدیث ہے اور تمہارے پاس میری جو حدیث کتاب اللہ اور میری سنت (معروفہ) کے مخالف پہنچے، وہ میری حدیث نہیں ہے۔
امام دار قطنی نے اس حدیث کو چار مختلف اسانید کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(سنن دار قطنی، ج ۳، رقم الحدیث: ۴۳۳۰-۴۳۲۹-۴۳۲۸-۴۳۲۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کر دیا، پس ان پر ہمارا عذاب (اچانک) رات کے وقت آیا جس وقت وہ دوپہر کو سو رہے تھے جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو اس وقت ان کی یہی چیخ و پکار تھی کہ ہم ظالم تھے ○ (الاعراف: ۵-۳)
مشکل الفاظ کے معانی اور آیات سابقہ سے مناسبت

”بأس“ علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ نے لکھا ہے کہ بأس کا معنی ہے خوف شدید اور جنگ میں شدت۔ (مجمع بحار الانوار، ج ۱، ص ۱۳۵-۱۳۴، مطبوعہ مکتبہ دار الامان المدینہ المنورہ، ۱۴۱۵ھ) اور سب سے زیادہ خوف نزول عذاب کے وقت ہو گا۔ اور علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے کہ بأس کا معنی عذاب بھی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا
اور اللہ کی گرفت بہت مضبوط ہے اور اللہ کا عذاب بہت

(النساء: ۸۴) سخت ہے۔

(المفردات، ص ۶۶، مطبوعہ مکتبہ مرتضویہ، ۱۳۶۲ھ)

بیانا اوہم قائلون بیت کے معنی ہیں رات کا وقت اور قیلولہ کا معنی ہے دوپہر کا وقت۔ حدیث میں ہے انہ کان لایبیت مالا ولا یقبلہ یعنی جب آپ کے پاس مال آتا تو آپ اس کو رات تک روکتے نہ دوپہر تک۔ اگر صبح مال آتا تو دوپہر سے پہلے اس کو تقسیم کر دیتے اور اگر دوپہر کے بعد مال آتا تو اس کو رات آنے سے پہلے تقسیم کر دیتے۔

(الفاہق، ج ۱، ص ۱۲، طبع بیروت، التہامیہ، ج ۱، ص ۱۷۰، طبع ایران، مجمع بحار الانوار، طبع مدینہ منورہ)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو احکام شرعیہ کی تبلیغ کرنے اور عذاب الہی سے ڈرانے کا حکم دیا تھا اور لوگوں کو نبی ﷺ کے احکام کو قبول کرنے اور آپ کی پیروی کرنے کا حکم دیا تھا اور اس آیت میں ان کو وعید سنائی ہے کہ پچھلی امتوں میں سے جن لوگوں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور ان کے پیغام کو قبول نہیں کیا ان پر اچانک اللہ کا عذاب آگیا بعض پر رات کے وقت اور بعض پر دوپہر کو آرام کے وقت میں۔

ایک اشکال کا جواب

اس آیت میں فرمایا ہے: اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کر دیا پس ان پر ہمارا عذاب (اچانک) رات کے وقت آیا جس وقت وہ دوپہر کو سو رہے تھے اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت کا بظاہر معنی یہ ہے کہ پہلے ان بستیوں کو ہلاک کر دیا اور پھر

تبیان القرآن

جلد چہارم

ان پر عذاب آیا۔ حالانکہ ان پر عذاب نازل کرنا ہی ان کی ہلاکت تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں عبارت میں ایک لفظ محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کرنے کا حکم دیا یا ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ کیا۔ پس ان پر ہمارا عذاب آیا۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ
فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ -
اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لو۔
الآية (المائدہ: ۶)

حالانکہ چہروں اور ہاتھوں کو نماز کے لیے قیام کے وقت نہیں اس سے پہلے دھویا جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں بھی ایک لفظ محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو تو اپنے چہروں کو اور کہنیوں سمیت اپنے ہاتھوں کو دھو لو۔

نزول عذاب کے وقت معذبین کا اعتراف جرم

آیت ۵ میں فرمایا ہے: جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو اس وقت ان کی یہی چیخ و پکار تھی کہ ہم ظالم تھے اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب کفار پر عذاب نازل ہوتا ہے تو اس وقت وہ اعتراف کر لیتے ہیں کہ درحقیقت وہی ظالم اور مجرم تھے اور اس عذاب کے مستحق تھے۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی قوم اس وقت تک عذاب سے ہلاک نہیں ہوئی جب تک کہ انہوں نے خود اس عذاب کا عذر بیان نہیں کیا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے عبد الملک سے پوچھا یہ کس طرح ہو سکتا ہے تو انہوں نے یہ آیت پڑھی: جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو اس وقت ان کی یہی چیخ و پکار تھی کہ بیشک ہم بھی ظالم تھے۔ (الاعراف: ۵)

(جامع البیان، جز ۸، ص ۱۵۸، دار الفکر، تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۵، ص ۱۳۳۹، ۱۳۳۸، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز)
ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور آپ کی مخالفت کرنا دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے۔ جب ایسے لوگ غفلت اور لہو و لعب میں مشغول ہوتے ہیں تو ان پر اچانک عذاب آجاتا ہے۔ ہر سرکش مجرم پر جب دنیا میں عذاب آتا ہے تو وہ اپنے جرم کا اعتراف کر لیتا ہے اور اس پر تادم ہوتا ہے۔ گزشتہ امتوں کی نافرمانی اور ان پر اچانک عذاب کے نزول کے واقعات کو بیان کر کے اس امت کو تنبیہ کرنا مقصود ہے۔ تاکہ وہ اپنے گناہوں سے باز آجائیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ کفار پر عذاب ٹھنڈا کرنا اللہ تعالیٰ کا عین عدل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس ہم ان لوگوں سے ضرور باز پرس کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے اور ہم رسولوں سے بھی ضرور پوچھیں گے ○ پھر ہم خود کامل علم کے ساتھ ان کے تمام احوال بیان کریں گے، ہم غائب تو نہیں تھے ○ (الاعراف: ۷-۶)

قیامت کے دن رسولوں اور ان کی امتوں سے سوالات

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ رسولوں کی مخالفت کرنے کی وجہ سے دنیا میں اچانک عذاب آجاتا ہے۔ اب اس آیت میں فرمایا ہے کہ ان سے ان کی بد اعمالیوں پر مواخذہ ہوگا۔ اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ہر شخص سے سوال کرے گا خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ اللہ تعالیٰ امتوں سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کرے گا اور یہ کہ ان کی طرف جو رسول بھیجے گئے تھے

انہوں نے ان کو تبلیغ فرمائی تھی یا نہیں اور انہوں نے رسولوں کی تبلیغ کا کیا جواب دیا تھا۔ اور رسولوں سے بھی ان کی تبلیغ کے متعلق سوال کرے گا اور یہ کہ ان کی امتوں نے ان کی تبلیغ کا کیا جواب دیا تھا انجام کار ان کی امت ایمان لائی یا نہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی دیگر آیات میں بھی اس مضمون کو بیان فرمایا ہے:

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَحْبَبْتُمْ
الْمُرْسَلِينَ (القصص: ۶۵)

اور جس دن اللہ ان کو ندا فرما کر ارشاد فرمائے گا تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا؟

فَوَرَّيْكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ عَمَّا
كَانُوا يَعْمَلُونَ (الحج: ۹۳-۹۴)

سو آپ کے رب کی قسم ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے ان تمام کاموں کے متعلق جو وہ کرتے تھے ۝

ان آیتوں میں امتوں سے سوال کے متعلق ارشاد ہے۔ اور رسولوں سے سوال کا ذکر اس آیت میں ہے:

يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ الرُّسُلَ فَيَقُولُ مَاذَا أَحْبَبْتُمْ ۝
قَالُوا لَا عِلْمَ لَنَا بِئِكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ۝
(المائدہ: ۱۰۹)

جس دن اللہ رسولوں کو جمع فرمائے گا پھر فرمائے گا تم کو کیا جواب دیا گیا؟ وہ کہیں گے ہم کو کچھ علم نہیں، بے شک تو ہی سب غیبوں کا جاننے والا ہے۔

اور اس حدیث میں بھی رسولوں سے سوال کے متعلق اشارہ ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص محافظ اور مصلح ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کے ماتحت لوگوں کے متعلق سوال ہوگا۔ امام محافظ اور مصلح ہے اور اس سے اس کی رعایا (عوام) کے متعلق سوال ہوگا۔ ایک شخص اپنے اہل کا محافظ اور مصلح ہے اور اس سے اس کے اہل کے متعلق سوال ہوگا۔ اور عورت اپنے خاوند کے گھر کی محافظ اور مصلح ہے اور اس سے اس گھر کی حفاظت اور اصلاح کے متعلق سوال ہوگا۔ خادم اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کے مال کے متعلق سوال ہوگا اور ایک شخص اپنے باپ کے مال کا محافظ اور مصلح ہے اور اس سے اس مال کے متعلق سوال ہوگا۔ اور تم میں سے ہر شخص محافظ اور مصلح ہے اور اس سے اپنے زیر انتظام اور زیر حفاظت چیزوں اور لوگوں کے متعلق سوال ہوگا۔

(صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۸۹۳، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۴۵۱-۲۵۵۸-۲۵۵۳، ج ۵، رقم الحدیث: ۵۱۸۸-۵۲۰۰، ج ۷، رقم الحدیث: ۷۱۳۸، صحیح مسلم الامارۃ: ۲۰، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۷۱۱، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۹۲۸، مسند احمد، ج ۲، ص ۱۱۱، طبع قدیم)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت (الاعراف: ۶) کی تفسیر میں فرمایا: اللہ تعالیٰ لوگوں سے سوال کرے گا کہ انہوں نے رسولوں کو کیا جواب دیا اور رسولوں سے ان کی کی ہوئی تبلیغ کے متعلق سوال کرے گا۔

(جامع البیان، جز ۸، ص ۱۵۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی ابن آدم اس وقت تک اپنے رب کے سامنے قدم نہیں ہٹا سکے گا جب تک اللہ تعالیٰ اس سے پانچ چیزوں کے متعلق سوال نہ کرے۔ اس نے اپنی عمر کن کاموں میں

تبیان القرآن

جلد چہارم

فناکی اس نے اپنی جوانی کن کاموں میں گزاری، اس نے اپنا مال کہاں سے حاصل کیا اور کن کاموں میں خرچ کیا اور اس نے جو علم حاصل کیا تھا، اس کے مطابق کیا عمل کیا؟ (سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۳۲۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

قیامت کے دن مجرموں سے سوال کرنے اور سوال نہ کرنے کے محامل ان آیات سے یہ معلوم ہوا کہ کفار سے ان کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا لیکن قرآن مجید کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار سے سوال نہیں کیا جائے گا:

فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذُنُوبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌ ۝

سو اس دن کسی گنہ گار کے گناہوں کے متعلق کسی انسان (الرحمن: ۳۹) اور جن سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

وَلَا يُسْأَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ ۝

اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ (القصص: ۷۸)

امام رازی نے اس سوال کے متعدد جوابات دیے ہیں۔

۱- لوگوں سے ان کے اعمال کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ کراناکاتین نے ان کے تمام اعمال لکھے ہوئے ہیں اور وہ ان کے صحائف اعمال میں محفوظ ہیں لیکن ان سے یہ سوال کیا جائے گا کہ ان کے ان اعمال کا داعیہ، باعث اور محرک کیا تھا، جس کی وجہ سے انہوں نے اعمال کیے۔

۲- کبھی سوال لاعلمی کی بنا پر علم کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں محال ہے اور کبھی سوال زبرد توخ اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے کیا جاتا ہے جیسے کوئی شخص کسے میں نے تم پر اتنے احسانات کیے تھے پھر تم نے میرے ساتھ یہ دغا بازی اور فراڈ کیوں کیا؟ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۝ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۝

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ ۝ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝

(البلد: ۸-۱۱)

کیا ہم نے انسان کی دو آنکھیں نہیں بنائیں ۝ اور دو زبان اور دو ہونٹ ۝ اور ہم نے اس کو (نیکی اور بدی کے) دونوں واضح راستے دکھا دیے ۝ تو وہ (نیک عمل کی) دشوار گھائی میں سے کیوں نہیں گزرا۔

اور ان آیتوں میں سوال کرنے کا یہی معنی مراد ہے۔

۳- قیامت کا دن بہت طویل ہوگا اور اس میں بندوں کے مختلف احوال اور معاملات ہوں گے۔ کسی وقت میں اللہ تعالیٰ سوال نہیں فرمائے گا اور کسی دوسرے وقت میں سوال فرمائے گا جیسے کسی وقت میں شفاعت نہیں ہوگی اور کسی وقت میں شفاعت ہوگی۔ اور کسی وقت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں ہوگا اور کسی وقت میں اس کا دیدار ہوگا۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے: ہم غائب تو نہ تھے۔ یعنی ہم ان کے کاموں کو دیکھ رہے ہیں، ان کی باتوں کو سن رہے ہیں اور ہم کو معلوم ہے کہ وہ کیا چھپاتے ہیں اور کیا ظاہر کرتے ہیں اور ہم قیامت کے دن ان کے تمام کاموں کی خبر دیں گے، خواہ وہ کام کم ہوں یا زیادہ۔ وہ معمولی ہوں یا غیر معمولی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا نَحْنُ نَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي

ظُلْمَتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ

مُبِينٍ ۝ (الانعام: ۵۹)

اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر وہ اس کو جانتا ہے اور نہ کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں ہوتا ہے اور نہ کوئی خشک و تر مگر وہ روشن کتاب میں مرقوم ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس دن اعمال کا وزن کرنا برحق ہے۔ پس جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہماری ہوئے تو وہی کامیاب ہیں ○ اور جن (کی نیکیوں) کے پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالنے والے ہیں، کیونکہ وہ ہماری آیتوں پر ظلم کرتے تھے ○ (الاعراف: ۸-۹)

مشکل الفاظ کے معانی اور آیت سابقہ سے مناسبت

”وزن“ علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ وزن کا معنی ہے کسی چیز کی مقدار کی معرفت حاصل کرنا۔ اور عرف عام میں ترازو سے کسی چیز کے تولنے کو وزن کرنا کہتے ہیں۔ (المفردات، ص ۵۲۲، مطبوعہ ایران، ۱۳۶۲ھ)

علامہ جار اللہ زمخشری متوفی ۵۸۳ھ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھجور کے درخت پر لگی ہوئی کھجوروں کو فروخت کرنے سے منع فرمایا حتیٰ کہ اس درخت سے کھجوروں کو کھایا جائے اور ان کا وزن کیا جائے۔ ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے پوچھا وزن سے کیا مراد ہے؟ فرمایا اس کی مقدار کا اندازہ کیا جائے۔

(الفتاویٰ، ج ۳، ص ۳۵۸، مطبوعہ بیروت، ۱۳۶۷ھ، التہامیہ، ج ۵، ص ۱۸۲، مطبوعہ ایران، ۱۳۶۷ھ، تاج العروس، ج ۱۰، ص ۳۶۰، مطبوعہ مصر)

”میزان“ علامہ زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں: جس آلہ کے ساتھ چیزوں کا وزن کیا جائے اس کو میزان کہتے ہیں۔ زجاج نے کہا ہے کہ جو میزان قیامت میں ہوگی اس کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے۔ تفسیر میں ہے کہ وہ ایک ترازو ہے جس کے دو پلڑے ہیں۔ دنیا میں میزان اتاری گئی تاکہ لوگ عدل کے ساتھ باہم معاملہ کریں اور اس کے ساتھ اعمال کا وزن کیا جائے گا۔

(تاج العروس، ج ۹، ص ۳۶۱، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ)

”موازن“ یہ میزان کی جمع ہے۔ اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قیامت کے دن میزان تو صرف ایک ہوگی۔ پھر یہاں جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ موزون کی جمع ہے اور موزون متعدد ہوں گے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اہل عرب واحد پر بھی تعظیماً جمع کا اطلاق کر دیتے ہیں اور تیسرا جواب یہ ہے کہ جو اعمال وزن اور حساب کے لائق ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔ افعال قلوب، افعال جوارح (ظاہری اعضاء کے افعال) اور اقوال اور ہو سکتا ہے کہ ان تینوں کے لیے الگ الگ میزان ہوں۔ ایک قول یہ ہے کہ وزن کرنے والوں کی اکثریت کے اعتبار سے میزان کو جمع کر کے لایا گیا ہے۔

اس سے پہلی آیت میں قیامت کے دن انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں سے سوال کرنے کا ذکر تھا اور یہ قیامت کے دن کا ایک حال ہے اور دوسرا حال میزان پر اقوال اور اعمال کا وزن کرنا ہوگا۔ سو اس آیت میں قیامت کے دن کا یہ دوسرا حال بیان فرمایا ہے۔

اعمال کے وزن کے متعلق مذاہب علماء

مجاہد، ضحاک، اعمش اور بہ کثرت متاخرین کا مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن اعمال کو وزن کرنے سے مراد عدل اور قضاء ہے۔ کیونکہ دنیا میں لین دین میں عدل کا ذریعہ ترازو میں وزن کرنا ہے اور وزن کرنے کو عدل اور قضاء لازم ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ جس شخص کے اعمال کا میزان میں وزن کیا جائے گا تو وہ اللہ کے عادل اور حکیم ہونے کا اقرار کرے گا یا نہیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے عادل اور حکیم ہونے کا اقرار کرے گا تو اس کے لیے میزان کی کوئی حاجت نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں اور گناہوں کے متعلق جو بھی فیصلہ فرمائے گا وہ اس کو تسلیم ہوگا اور اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ کو عادل اور صادق نہیں مانتا تو پھر وہ نیکیوں اور

گناہوں کے کیے ہوئے وزن کو بھی نہیں مانے گا تو پھر میزان میں اس کے کیے ہوئے وزن کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی نیک مسلمان کے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور اس کی نیکیوں کا پلڑہ گناہوں کے پلڑے سے بھاری ہو گا تو اس مسلمان شخص اور اس کے دوستوں کو فرحت اور مسرت حاصل ہوگی اور تمام اہل محشر کے سامنے اس کے جنتی ہونے پر حجت قائم ہوگی۔ جو لوگ دنیا میں اس کو حقیر سمجھتے تھے ان کے سامنے اس کی عزت و توقیر اور وجاہت ظاہر ہوگی اور وہ اپنے محسن کے سامنے سرخرو ہو گا اور یہ میزان کا بہت بڑا فائدہ ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، جمہور صحابہ، تابعین اور علماء راہنہ کا مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن اعمال کا حقیقی وزن کیا جائے گا۔ مانعین کا اس پر اعتراض یہ ہے کہ اعمال از قبیل اعراض ہیں اور وزن اجسام کا کیا جاتا ہے، اعراض کا نہیں کیا جاتا۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان اعراض کے مقابلہ میں اجسام پیدا فرمادے اور ان اجسام کا وزن کیا جائے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ نیک اعمال حسین اجسام میں متحمل کر دیے جائیں گے اور بد اعمال قبیح اجسام میں متحمل کر دیے جائیں گے اور ان کا وزن کیا جائے گا۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ نفس اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا بلکہ صحائف اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ مؤخر الذکر دونوں جوابوں کے متعلق احادیث ہیں جن کا ہم عنقریب ذکر کر رہے ہیں۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۰۳-۲۰۴، مع التلخیص والتوضیح، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

قرآن مجید سے میزان کے ثبوت پر دلائل

وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ ۝

(الانبیاء: ۴۷)

اور قیامت کے دن ہم انصاف کی میزان رکھیں گے سو کسی شخص پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا اور اگر رائی کے دانہ کے برابر (بھی کسی کا عمل) ہو تو ہم اسے لے آئیں گے اور ہم حساب لینے کے لیے کافی ہیں۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ۝

(المؤمنون: ۱۰۳-۱۰۴)

سو جن کی میزان کے (نیکی کے) پلڑے بھاری ہوئے وہی فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کی میزان کے (نیکی کے) پلڑے ہلکے ہوئے تو یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالا اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۝ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۝ فَأُمَةٌ هَٰوِيَةٌ ۝

(القارعة: ۶-۹)

سو جس (کی نیکی) کے پلڑے بھاری ہوں گے تو وہی پسندیدہ عیش میں ہو گا اور جس (کی نیکی) کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو اس کا ٹھکانا ہویہ (دہکتی آگ کا گہرا گڑھا) ہو گا۔

احادیث اور آثار سے میزان کے ثبوت پر دلائل

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میزان کو رکھا جائے گا، اگر اس میں آسمانوں اور زمینوں کو رکھا جائے تو وہ اس کی بھی گنجائش رکھتی ہے۔ پس فرشتے کہیں گے: اے رب اس میں کس کو وزن کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہوں گا، فرشتے کہیں گے تو پاک ہے ہم تیری اس طرح عبادت نہیں کر سکے جو تیری عبادت کا حق ہے۔ (الحدیث) امام حاکم متوفی ۴۰۵ھ نے کہا ہے کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ (المستدرک، ج ۳، ص ۵۸۶، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ)

حافظ ذہبی متوفی ۸۴۸ھ نے امام حاکم کی موافقت کی ہے۔ (تلخیص المستدرک، ج ۲، ص ۵۸۶، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ) امام عبد اللہ بن المبارک متوفی ۱۸۱ھ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ (کتاب الزهد، رقم الحدیث: ۱۳۵۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت) امام ابو بکر محمد بن الحسین آجری متوفی ۳۶۰ھ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے۔

(الشریعہ، ص ۳۳۹، مطبوعہ دار السلام، ریاض)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: نیکیوں اور برائیوں کا میزان میں وزن کیا جائے گا۔ اس میزان کی ایک ڈنڈی اور دو پلڑے ہیں۔ رہا مومن تو اس کا عمل حسین صورت میں آئے گا اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھا جائے گا تو اس کی نیکیوں کا پلڑا برائیوں کے پلڑے کے مقابلہ میں بھاری ہوگا۔

(شعب الایمان، ج ۱، ص ۲۶۳، رقم الحدیث: ۲۸۳، الجامع لاحکام القرآن، جزء ۷، ص ۱۵۱، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ) عبید اللہ بن غیرار نے کہا قیامت کے دن اقدام اس طرح ہوں گے جیسے ترکش میں تیر۔ خوش قسمت وہ شخص ہے جسے اپنے قدموں کے لیے جگہ مل جائے اور میزان کے پاس ایک فرشتہ نذا کرے گا، سنو فلاں بن فلاں (کی نیکیوں) کا پلڑا بھاری ہے، اس نے ایسی کامیابی حاصل کی ہے کہ پھر کبھی ناکام نہیں ہوگا۔ سنو فلاں بن فلاں (کی نیکیوں) کا پلڑا ہلکا ہے یہ ناکام ہو گیا ہے اس کے بعد کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۵، ص ۱۳۳۱، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ المکرمہ، ۱۳۱۷ھ)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کا ظاہر اس کے باطن سے زیادہ راجح ہو قیامت کے دن میزان میں اس (کی نیکیوں) کا پلڑا ہلکا ہو گا اور جس شخص کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ راجح ہو قیامت کے دن میزان میں اس (کی نیکیوں) کا پلڑا بھاری ہوگا۔ (الدر المنثور، ج ۳، ص ۷۰، مطبوعہ ایران، البدور السافرة، رقم الحدیث: ۹۱۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو لفظ زبان پر آسان ہیں۔ اور میزان میں بھاری ہیں اور رحمن کو محبوب ہیں۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔

(صحیح البخاری، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۳۰۶، ج ۸، رقم الحدیث: ۷۵۱۳، صحیح مسلم، الذکر: ۳۱، سنن الترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۳۶۷، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۸۰۶)

حضرت ابومالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وضو نصف ایمان ہے اور الحمد للہ میزان کو بھر لیتا ہے۔ (صحیح مسلم، الامارۃ، ۲۲۳) سنن الترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۵۱۷، سنن الدارمی، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۵۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے تمام آسمانوں اور زمینوں اور جو کچھ ان میں ہے، اور ان کے درمیان ہے، اور ان کے نیچے ہے، اگر تم ان کو لے کر آؤ اور اس کو میزان کے ایک پلڑے میں رکھ دو اور کلمہ شہادت کو دوسرے پلڑے میں رکھ دو تو وہ پہلے پلڑے سے بھاری ہوگا۔ (المعجم الکبیر، ج ۱۲، ص ۲۵۳، رقم الحدیث: ۱۳۰۲۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت میں سے ایک شخص کو قیامت کے دن تمام لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا۔ اس کے (گناہوں کے) ننانوے (۹۹) رجسٹر کھولے جائیں گے۔ ان میں سے ہر رجسٹر حد نظر تک ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم ان میں سے کسی چیز کا انکار کرتے ہو، وہ کہے گا نہیں! اے میرے رب! پھر فرمائے گا کیا میرے لکھنے والے فرشتوں نے تم پر کوئی زیادتی کی ہے؟ وہ کہے گا نہیں! اے میرے رب! پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں نہیں میرے پاس تمہاری ایک نیکی ہے اور آج تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا پھر اس کے لیے ایک پرچی نکالی جائے گی جس پر لکھا ہوگا

تبیان القرآن

جلد چہارم

اشھدان لا الہ الا اللہ و اشھدان محمد عبده و رسوله وہ کہے گا اے میرے رب یہ ایک پرچی اتنے بڑے رجسٹروں کے سامنے کیا وقعت رکھتی ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا بے شک تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ پھر ایک پلڑے میں یہ پرچی ہوگی اور دوسرے پلڑے میں وہ رجسٹروں کا پلڑا ہلکا ہوگا اور اس پرچی کا پلڑا بھاری ہوگا اور اللہ کے نام کے مقابلہ میں کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی!

(سنن الترمذی، ج ۴، رقم الحدیث: ۲۶۳۸، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۴۳۰۰، المستدرک، ج ۱، ص ۵۲۹) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میزان کو قائم کیا جائے گا۔ پھر ایک شخص کو لایا جائے گا اور اس کے گناہوں کو ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے گا۔ وہ پلڑہ جھک جائے گا اور اس کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔ جب وہ پیٹھ موڑ کر جائے گا تو رخصت کے پاس سے اس کو ایک بلانے والا بلائے گا۔ جلدی نہ کرو، جلدی نہ کرو اس کی ایک نیکی باقی ہے۔ پھر کلمہ شہادت کی ایک پرچی لائی جائے گی اور اس آدمی کی نیکیوں کے پلڑے میں رکھ دی جائے گی اور اس سے میزان جھک جائے گی۔ (مسند احمد، رقم الحدیث: ۷۰۶۶، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۸۲)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اچھے اخلاق سے بڑھ کر میزان میں کوئی چیز بھاری نہیں ہے۔

(سنن ابوداؤد، ج ۴، رقم الحدیث: ۴۷۹۹، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۰۰۹، مسند احمد، ج ۱۰، رقم الحدیث: ۲۷۵۸، صحیح ابن حبان، ج ۲، رقم الحدیث: ۴۸۱، مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۸، ص ۵۱۶، اللاب المفرد، رقم الحدیث: ۲۷۰، مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث: ۲۰۱۵۷، شرح السنن، ج ۲، رقم الحدیث: ۷۸۳، حلیہ الاولیاء، ج ۵، ص ۲۳۳، الشریعہ، رقم الحدیث: ۸۶۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے اللہ پر ایمان اور اس کے وعدہ کی تصدیق کی وجہ سے اللہ کی راہ میں گھوڑے کو باندھا، اس گھوڑے کا چارہ، اس کا پانی اور اس کی لید اور اس کا پیشاب قیامت کے دن میزان میں وزن کیا جائے گا۔

(صحیح البخاری، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۸۵۳، المستدرک، ج ۲، ص ۹۲، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۱۰، ص ۲۷، شرح السنن، رقم الحدیث: ۲۶۳۸)

امام ابن المبارک متوفی ۱۸۱ھ نے حماد بن سلیمان سے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص آئے گا۔ وہ اپنے نیک اعمال کو بہت کم جان رہا ہوگا۔ وہ اسی کیفیت میں ہوگا کہ بادل کی طرح ایک چیز آئے گی اور اس کی نیکیوں کے پلڑے میں جاگرے گی۔ اس سے کہا جائے گا یہ وہ چیز ہے جو تم لوگوں کو نیکیوں کی تعلیم دیتے تھے۔ تمہارے بعد تمہاری تعلیم سے نیکیاں ظہور میں آئیں اور تم کو ان کا اجر دیا گیا۔ (کتاب الزهد لابن المبارک، رقم الحدیث: ۱۳۸۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جو مسلمان شخص بھی ان کی حفاظت کرے گا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ وہ دونوں آسان کام ہیں اور کم لوگ ان کو کرتے ہیں۔ (پہلی خصلت یہ ہے کہ) ہر نماز کے بعد دس مرتبہ سبحان اللہ کہے، اور دس مرتبہ الحمد للہ کہے، اور دس مرتبہ اللہ اکبر کہے۔ یہ زبان سے ڈیڑھ سو بار پڑھنا ہے اور میزان میں یہ ڈیڑھ ہزار نیکیاں ہیں (اور دوسری خصلت یہ ہے کہ) اور جب بستر پر جائے تو چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہے، اور تینتیس مرتبہ الحمد للہ کہے اور تینتیس مرتبہ سبحان اللہ کہے۔ یہ زبان سے ایک سو مرتبہ پڑھنا ہے اور میزان میں ایک ہزار نیکیاں ہیں تو بتاؤ تم میں سے کون شخص ایک دن رات میں ڈھائی ہزار نیکیاں کرتا ہے۔

(سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۵۰۶۵، سنن الترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۳۲۱، سنن ابن ماجہ، ج ۱، رقم الحدیث: ۹۲۶، سنن النسائی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۳۳۷، مصنف عبدالرزاق، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۱۸۹)

آیا میزان میں صرف مسلمانوں کا وزن ہو گا یا کافروں کا بھی وزن ہو گا؟

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا یا کافروں کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا۔ بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ صرف مسلمانوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا اور کافروں کے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ
فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ وَزْنًا (الكهف: ۱۰۵)

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی آیتوں اور اس سے ملاقات کا انکار کیا سو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے۔

لیکن اس مسئلہ میں تحقیق یہ ہے کہ جن کافروں کو اللہ تعالیٰ جلد دوزخ میں ڈالنا چاہے گا ان کو بغیر وزن اعمال کے دوزخ میں ڈال دے گا اور بقیہ کافروں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے:

وَمَنْ حَقَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ
خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ
(المؤمنون: ۱۰۳)

اور جن کی میزان کے پلڑے جکے ہوئے تو یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالا وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

اسی طرح بعض مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ بغیر وزن اعمال اور بغیر حساب کے جنت میں داخل کر دے گا۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری امت میں سے ستر ہزار جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو نہ دم کراتے ہوں گے، نہ بد شکونی نکالتے ہوں گے اور نہ جسم کو لوہے کے داغ سے جلاتے ہوں گے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہوں گے۔ امام بخاری نے اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اس حدیث کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔

(صحیح مسلم، ایمان: ۳۶۷، صحیح البخاری، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۵۳۲، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۳۵۳، مسند احمد، ج ۱، ص ۲۵۳، ۲۴۳، ۲۰۳، ۲۰۱، ۲۷۱)

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: قیامت کے دن شہید کو لایا جائے گا اور اس کو حساب کے لیے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر صدقہ دینے والے کو لایا جائے گا اور اس کو حساب کے لیے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر مصیبت میں مبتلا شخص کو لایا جائے گا اس کے لیے میزان قائم کی جائے گی نہ اس کے اعمال کا رجسٹر کھولا جائے گا اور اس پر اتنا اجر و ثواب انڈیل دیا جائے گا کہ عیش و آرام میں رہنے والے محشر میں یہ تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں ان کے جسموں کو قینچی سے کاٹ ڈالا جاتا اور ان کو بھی ایسا اجر و ثواب مل جاتا۔ (المعجم الکبیر، ج ۱۲، رقم الحدیث: ۱۲۸۲۹، حلیۃ الاولیاء، ج ۳، ص ۹۱)

ان مسلمانوں کی مغفرت کی صورتیں جن کی نیکیاں گناہوں کے برابر یا گناہوں سے کم ہوں گی آیت ۸ میں فرمایا ہے: پس جن (کی نیکیوں) کے پلڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہیں۔ اس آیت سے مراد مومن ہیں

اور آیت ۹ میں فرمایا ہے: اور جن (کی نیکیوں) پلڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالنے والے ہیں کیونکہ وہ ہماری آیتوں پر ظلم کرتے تھے۔ اس آیت سے کافر مراد ہیں۔ کیونکہ وہی اللہ کی آیتوں کا انکار کر کے ان پر ظلم کرتے تھے۔

ان آیتوں میں صالح اور نیک مسلمانوں کا ذکر فرمایا ہے جن کی نیکیوں کے پلڑے بھاری ہوں گے اور کافروں کا ذکر فرمایا ہے جن کی نیکیوں کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔ اس آیت میں ان مسلمانوں کا ذکر نہیں ہے جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اور نہ ان مسلمانوں کا ذکر ہے جن کی نیکیاں برائیوں سے کم ہوں، رہے وہ مسلمان جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں تو وہ اعراف میں ہوں گے اور بعد میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ان کو جنت میں داخل فرمادے گا اور رہے وہ مسلمان جن کے گناہ نیکیوں سے زیادہ ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل اور اپنے نبی ﷺ کی شفاعت سے جنت میں داخل فرمادے گا یا کچھ عذاب دے کر یا بغیر عذاب دیے ان کو محض اپنے فضل و کرم سے دوزخ سے نجات دے گا اور جنت میں داخل فرمادے گا۔

نبی ﷺ کی شفاعت سے نجات کے متعلق یہ حدیث ہے۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کی ایک مقبول دعا ہوتی ہے اور ہر نبی نے اپنی اس مقبول دعا کو دنیا میں ہی جلد خرچ کر لیا اور میں نے اپنی اس دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کے لیے چھپا کر رکھا ہے اور یہ ان شاء اللہ میری امت میں سے ہر اس شخص کو حاصل ہوگی جو اس حال میں فوت ہوا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ کیا ہو۔ (صحیح البخاری، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۳۰۴، صحیح مسلم، الایمان: ۳۳۸، (۱۹۹) ۲۸۳، سنن الترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۶۱۳، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۴۳۰۷، موطا امام مالک، رقم الحدیث: ۴۹۲، مسند احمد، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۰۳۱۵، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۶۳۶۱، مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث: ۴۰۸۶۴)

محض اپنے فضل سے عذاب دینے کے بعد دوزخ سے نجات دینے کے متعلق یہ حدیث ہے۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اہل جنت کو جنت میں داخل فرمائے گا اور اپنی رحمت سے جس کو چاہے گا جنت میں داخل فرمائے گا اور اہل جہنم میں سے جس کو چاہے گا جہنم میں داخل کر دے گا۔ پھر فرمائے گا دیکھو جس کے دل میں رائی کے ایک دانہ کے برابر بھی ایمان ہو، اس کو جہنم سے نکال لو، پس وہ لوگ جہنم میں سے اس حال میں نکالے جائیں گے کہ ان کا جسم جل کر کوئلہ ہو چکا ہوگا۔ پھر ان کو آب حیات کی نہر میں ڈالا جائے گا اور وہ اس نہر میں سے اس طرح تروتازہ ہو کر نکلنا شروع ہوں گے جیسے دانہ پانی کے بہاؤ والی مٹی میں سے زردی مائل ہو کر آگ پڑتا ہے۔

(صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۲، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۵۶۰، صحیح مسلم، ایمان، ۳۰۴، (۱۸۳) ۳۳۹)

اور محض اپنی رحمت سے بغیر عذاب دیے ہوئے جنت میں داخل کرنے کے متعلق یہ حدیث ہے۔ امام مسلم روایت کرتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن مومن کو اپنے رب عزوجل کے قریب کیا جائے گا حتیٰ کہ اللہ اس کے اوپر اپنی رحمت کا پر رکھ دے گا اور اس سے اس کے گناہوں کا اقرار کرائے گا اور فرمائے گا تم (اس گناہ کو) پہچانتے ہو؟ وہ کہے گا: ہاں میرے رب میں پہچانتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں تم پر ستر کیا تھا (تمہارا پردہ رکھا تھا) اور آج میں تمہیں بخش دیتا ہوں۔ پھر اس کو اس کی نیکیوں کا اعمال نامہ دیا جائے گا اور رہے کافر اور منافق تو ان کو تمام لوگوں کے سامنے بلایا جائے گا اور کہا جائے گا یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا تھا۔

(صحیح البخاری، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۳۴۱، صحیح مسلم، التوبہ: ۵۲، (۲۷۸) ۶۸۸۲، السنن الکبریٰ، ج ۶، رقم الحدیث: ۱۱۲۴۲، سنن ابن

ماجہ، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۸۳)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے تم کو زمین پر قابض کر دیا اور تمہارے لیے اس (زمین) میں اسباب زیت فراہم کیے (مگر تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔) (الاعراف: ۱۰)

مشکل الفاظ کے معانی اور آیات سابقہ سے مناسبت

ولقد مکنکم: یعنی اے بنو آدم ہم نے تمہارے لیے زمین کو مستقر بنایا اور زمین میں تمہیں جگہ دی، یا ہم نے تم کو زمین پر قبضہ دیا اور زمین میں تصرف کرنے کی قدرت دی۔

معایش: یہ معیشت کی جمع ہے۔ جن چیزوں سے زندگی بسر کی جاتی ہے۔ مثلاً کھانے پینے کی چیزیں۔ ان کو معیشت کہتے ہیں۔ علامہ طاہر پٹی متوفی ۹۸۶ھ نے لکھا ہے کہ جو چیزیں حیات کا آلہ ہیں، مثلاً زرعی پیداوار اور دودھ دینے والے جانوروں کے تھن ان کو معیشت کہتے ہیں۔ (مجمع بحار الانوار، ج ۳، ص ۱۹، مطبوعہ دارالایمان، مدینہ منورہ، ۱۳۱۵ھ)

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو قبول کرنے اور ان کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا تھا۔ اس کے بعد ان کی پیروی نہ کرنے پر ان کو دنیا کے عذاب سے ڈرایا۔ اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب اچانک رات کے وقت آیا یا جس وقت وہ دوپہر کو سو رہے تھے۔ (الاعراف: ۳) پھر ان کو آخرت کے عذاب اور مواخذہ سے ڈرایا پس ہم ان لوگوں سے ضرور باز پرس کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے۔ (الاعراف: ۶) پھر فرمایا: پس جن (کی نیکیوں) کے پڑے بھاری ہوئے تو وہی کامیاب ہیں O اور جن (کی نیکیوں) کے پڑے ہلکے ہوئے تو وہی اپنی جانوں کو نقصان میں ڈالنے والے ہیں۔ (الاعراف: ۸-۹) اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بندوں پر اپنی نعمتوں کو یاد دلایا ہے اور انہیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی ترغیب دی ہے تاکہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کر کے اس کا احسان مانیں اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی دعوت اور ان کے پیغام کو قبول کریں اور ان کی اطاعت اور اتباع کریں کیونکہ نعمتوں کی کثرت زیادہ اطاعت کو واجب کرتی ہے۔

معایش کی تفصیل

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو معایش (اسباب زیت) بنائے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے کہ بعض معایش کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا۔ مثلاً دریاؤں میں پانی پیدا کیا، آسمان سے بارش نازل فرمائی، پھلوں اور غلوں کو اگایا، حلال جانور پیدا کیے اور بعض اسباب زیت وہ ہیں جن کو انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت سے اپنے اکتساب کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔ جیسے انسان تجارت اور محنت مزدوری کر کے رزق حاصل کرتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت یہ ہے کہ انسان زمین میں بستے ہیں اور اس میں تصرف کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فہم و دانش اور قوت و توانائی سے ہر دور میں انسان کی فوز و فلاح، اس کی بہتری، سہولت اور مصلحت کے لیے نئے ذرائع اور وسائل تلاش کر رہے ہیں۔ پہلے انسان بتوں سے بدن ڈھانپتا تھا، پھر سوت اور ریشم کے لباس کا دور آیا اور اب انسان پٹولیم سے بھی لباس بنانے لگا ہے۔ پہلے لکڑی اور کوئلہ سے آگ حاصل کرتا تھا، پھر قدرتی گیس کا دور آیا۔ برقی توانائی کے بعد ایٹمی توانائی کا دور آیا۔ پہلے بری سفر، خچروں اور گھوڑوں سے اور بحری سفربانی کشتیوں سے کیا جاتا تھا۔ پھر موٹر کاروں، ریل گاڑیوں اور دہخانی جہازوں کا دور آیا اور اب ہوائی جہازوں، پہلی کاپروں اور راکٹوں کا دور ہے۔ بہت سی بیماریوں کا پہلے پانا تھا لوگ ان میں مبتلا ہو کر مر جاتے تھے۔ اب ان بیماریوں اور ان کے علاج کا پتا چلا لیا گیا ہے۔ مثلاً ذیابیطس ہے، ہائی بلڈ پریشر ہے، دل اور دماغ کے پیچیدہ امراض ہیں۔ فالج ہے، دماغ کی رگ کا پھٹ جانا ہے۔ سرجری کا طریقہ ایجاد ہوا اور طب کی دنیا میں بہت سے لاینحل مسئلے حل ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ان اسباب زیت اور ان سے فائدہ اٹھانے والی قوتوں کو انسان کی بہتری اور اس کی مصلحت کے لیے بنایا ہے

اور یہ مادی فوائد اس لیے عطا کیے ہیں کہ ان کی مدد سے انسان روحانی حیات میں تزکیہ اور جلاء کو حاصل کرے اور اپنے باطن کو پاک اور صاف کر کے اپنے آپ کو اخروی نعمتوں کا اہل بنائے۔ سو انسان کو چاہیے کہ وہ ان نعمتوں کے نتیجے میں اپنے آپ کو گناہوں سے پاک رکھے اور ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرے۔

شکر کا لغوی اور اصطلاحی معنی

علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

علامہ مجد الدین فیروز آبادی متوفی ۸۹۷ھ نے قاموس میں لکھا ہے کہ شکر کا معنی ہے احسان کو پہچاننا اور اس کو بیان کرنا۔ اور علامہ فیروز آبادی نے بصائر میں لکھا ہے کہ شکر کی تین قسمیں ہیں۔ شکر بالقلب: یہ نعمت کا تصور کرنا ہے۔ شکر باللسان: یہ نعمت دینے والے کی حمد و ثناء کرنا اور زبان سے تعظیم کرنا ہے اور شکر بالجوارح: یہ بہ قدر استحقاق، نعمت کے بدلہ میں کوئی نعمت دینا ہے۔ (بعض علماء نے اس کی تعریف میں کہا یہ تعظیماً کھڑے ہونا، یا ہاتھوں اور پیروں کو بوسہ دینا ہے اور سجدہ کرنا ہے) نیز علامہ فیروز آبادی نے کہا کہ شکر پانچ بنیادوں پر مبنی ہے:

۱- منعم کے سامنے شکر کرنے والے کا عجز و انکسار سے پیش آنا۔

۲- منعم سے محبت کرنا۔

۳- اس کی نعمت کا اعتراف کرنا۔

۴- اس نعمت پر منعم کی تعریف کرنا۔

۵- منعم کی نعمت کو اس کی ناپسندیدہ جگہ استعمال نہ کرنا۔

یہ پانچ امور شکر کی اساس اور بناء ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک امر بھی نہ ہو تو شکر ادا نہیں ہوگا۔ یہ پانچ امور شکر کا مرجع

اور مدار ہیں۔

جنید بغدادی نے کہا: شکر یہ ہے کہ تم یہ گمان کرو کہ تم اس نعمت کے اہل نہ تھے۔ ابو عثمان نے کہا: شکر یہ ہے کہ تم یہ جان لو کہ تم منعم کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہو۔ رویم نے کہا: شکر یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو منعم کی خدمت کے لیے فارغ کر لو۔ شبلی نے کہا: شکر یہ ہے کہ تم نعمت کو نہ دیکھو، نعمت دینے والے کو دیکھو۔ اس کا معنی یہ ہے کہ نعمت میں مشغول ہونے کی وجہ سے تم منعم سے غافل نہ ہو جاؤ۔ اور کمال شکر یہ ہے کہ بندہ نعمت اور منعم دونوں کا مشاہدہ کرے۔ کیونکہ بندہ جس قدر زیادہ نعمت کا مشاہدہ کرے گا، اس قدر زیادہ شکر ادا کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے کہ اس کا بندہ اس کی نعمت کو دیکھے اور اس کا اعتراف کرے اور اس پر اس کی ثناء اور تعریف کرے، اور اس نعمت کی وجہ سے اللہ سے محبت رکھے۔ سو اس کے کہ وہ نعمت فنا ہو جائے یا گم ہو جائے۔

علامہ فیروز آبادی نے کہا: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ شکر اور حمد میں سے کون افضل ہے۔ حدیث میں ہے حمد شکر کی سردار ہے۔ جس شخص نے اللہ کی حمد نہیں کی، اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اقسام اور اسباب کے اعتبار سے شکر حمد سے عام ہے۔ (کیونکہ حمد صرف زبان سے ہوتی ہے اور شکر، زبان، دل اور اعضاء اور جوارح سے بھی ہوتا ہے) اور متعلق کے اعتبار سے شکر حمد سے خاص ہے۔ کیونکہ شکر صرف نعمت پر ادا کیا جاتا ہے جبکہ حمد میں یہ قید نہیں ہے۔ (وہ مطلقاً زبان سے کسی کی ثناء کرنے کو کہتے ہیں) مثلاً یہ نہیں کہا جائے گا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حیات، اس کی سمع اور بصر اور اس کے علم پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں بلکہ یوں کہا جائے گا کہ ہم ان اوصاف پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی نعمتوں پر ہم دل

میں جو اس کی تعظیم کرتے ہیں یا سجدہ شکر بجالاتے ہیں، تو اس کو حمد نہیں کہا جائے گا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور ہم زبان سے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کی ثناء اور تعریف کرتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی حمد بھی ہے اور اس کا شکر بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان میں عموم و خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔

شکور کا معنی ہے بہت زیادہ شکر ادا کرنے والا۔ قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق ہے انہ کان عبدا شکورا (بنو اسرائیل: ۳) یعنی وہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے لیے اس کی بہت کوشش سے عبادت کرتے تھے اور شکور اللہ تعالیٰ کی بھی صفت ہے۔ واللہ شکور حلیم (التغابن: ۱۷) اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ بندوں کے کم اعمال پر دگنا چوگنا بلکہ بہت زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں کا شکر کرتا ہے یعنی ان کو بخش دیتا ہے۔ اللہ کی طرف جب شکر کی نسبت ہو تو اس کا معنی ہے اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا اور ثواب عطا فرمانا۔ (تاج العروس، ج ۳، ص ۳۱۲، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ)

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۰۶ھ لکھتے ہیں:

شکر کا لغوی معنی یہ ہے کسی نعمت پر زبان، دل یا دیگر اعضاء سے منعم کی تعظیم و تکریم کرنا۔

اور شکر کا اصطلاحی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کو سمع، بصر اور دیگر نعمتیں جو عطا کی ہیں ان کو اپنے مقاصد تخلیق کے مطابق خرچ کرنا۔ (کتاب التعریفات، ص ۶۵، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ)

امام محمد بن محمد غزالی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

دل کا شکر یہ ہے کہ نعمت کے ساتھ خیر اور نیکی کا قصد کیا جائے اور زبان کا شکر یہ ہے کہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے اور باقی اعضاء کا شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں خرچ کیا جائے، اور ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں صرف ہونے سے بچایا جائے۔ حتیٰ کہ آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ چیزوں کو دیکھے اور اس کی ناپسندیدہ چیزوں کو دیکھنے سے باز رہے۔ یعنی جن چیزوں کے دیکھنے میں اجر و ثواب ہے ان کو دیکھے اور جن چیزوں کا دیکھنا گناہ ہے ان کو نہ دیکھے۔ علیٰ هذا القیاس۔ تمام اعضاء کا حکم ہے۔ (احیاء العلوم، ج ۳، ص ۳۳۸، مطبوعہ دار الخیر، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

شکر کے متعلق قرآن مجید کی آیات

وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُوا (البقرہ: ۱۵۲)
مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَ
أَمَنْتُمْ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا

(النساء: ۱۳۷)

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ○ (آل عمران: ۱۳۵)
إِعْمَلُوا آلَ دَاوُدَ شُكْرًا وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ
الشَّاكِرِينَ (سبا: ۱۳)

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ
عَذَابِي لَشَدِيدٌ (ابراہیم: ۷)

شکر ادا کرنے کے طریقوں کے متعلق احادیث

ہم اس سے پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ نعمت ملنے پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرنا اس نعمت کا شکر ہے۔ اس کے متعلق یہ حدیث

ہے۔ امام ابن ماجہ متوفی ۲۴۳ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی بندہ اللہ کی دی ہوئی نعمت پر الحمد للہ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس سے افضل نعمت عطا فرماتا ہے۔

(سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۸۰۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم نے الحمد لله رب العلمین کہا تو تم نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر دیا اور اللہ تعالیٰ تمہاری نعمت میں زیادتی کرے گا۔

(جامع البیان، ج ۱، ص ۹۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت اسود بن سریع رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی ثناء اور تعریف میں الحمد للہ سے زیادہ کوئی کلمہ پسند نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود الحمد للہ سے اپنی ثناء کی ہے۔

(مسند احمد، ج ۵، رقم الحدیث: ۱۵۵۸۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۴ھ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نعمت خواہ کتنی پرانی ہو جائے جب بھی بندہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیا ثواب عطا فرماتا ہے اور مصیبت خواہ کتنی پرانی ہو جائے جب بھی بندہ اس پر انا لله وانا الیہ راجعون پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو نیا ثواب اور اجر عطا فرماتا ہے۔ نعمت پر شکر ادا کرنے سے اس نعمت کی مسؤلیت کم ہو جاتی ہے اور مصیبت پر صبر کرنے سے اس کے ثمرات کی حفاظت ہوتی ہے۔

(نوادر الاصول، ج ۲، ص ۲۰۳، مطبوعہ دار الجیل، بیروت، ۱۳۱۴ھ)

شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کی جائے اور اس کی کسی نعمت کی بے قدری نہ کی جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور اپنے گھر میں روٹی کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا دیکھا۔ آپ اس کے پاس چل کر گئے۔ آپ نے اس کو اٹھایا، اس پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: اے عائشہ! اللہ کی نعمتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ جس نعمت کی لوگ ناقدری کرتے ہیں، ان کے پاس وہ نعمت بہت کم دوبارہ آتی ہے۔

(نوادر الاصول، ج ۳، ص ۱۷۳، مطبوعہ دار الجیل، بیروت، ۱۳۱۴ھ)

شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کم چیز پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے اور اللہ کی نعمت کا اظہار کیا جائے۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے قلیل چیز کا شکر ادا نہیں کیا اس نے کثیر چیز کا بھی شکر ادا نہیں کیا اور اللہ کی نعمت کا بیان کرنا شکر ہے اور اس کو ترک کرنا کفر ہے۔ (علامہ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح

ہے) (مسند احمد، ج ۱۴، رقم الحدیث: ۱۸۳۶۱، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ، ۱۳۱۶ھ)

شکر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بندوں کا شکر ادا کیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو بندوں کا شکر ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

(سنن ابوداؤد، ج ۴، رقم الحدیث: ۳۸۱۱، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۹۶۱، مسند احمد، ج ۷، رقم الحدیث: ۷۹۵، مطبوعہ قاہرہ،

صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۲۰۷۰، الادب المفرد، رقم الحدیث: ۲۱۸، مسند ابو یعلیٰ، رقم الحدیث: ۱۱۴۲)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو کوئی چیز دی گئی تو وہ اس کے بدلہ میں کوئی چیز دے۔ اگر کوئی چیز نہ ملے تو اس کی تعریف کرے۔ جس نے اس کی تعریف کی اس نے اس کا شکر کیا اور جس نے اس کو چھپایا اس نے کفر کیا۔ (سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۸۱۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے ساتھ کوئی نیکی کی گئی اور اس نے اس نیکی کرنے والے سے کہا جزا ک اللہ خیر اس نے اس شخص کی پوری تعریف کر دی۔

(سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۰۴۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

راحت کے ایام میں مصیبت کے ایام کو یاد کرنا بھی شکر ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص مصیبت میں مبتلا کیا گیا ہو پھر اس کو یاد کرے تو اس نے شکر ادا کیا اور اگر اس نے اس مصیبت کو چھپایا تو اس نے ناشکری کی۔

(سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۸۱۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

شکر کی فضیلت کے متعلق احادیث

حضرت صیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے مومن کے حال پر تعجب ہوتا ہے۔ اس کے ہر حال میں بھلائی ہے۔ اگر اس کو راحت پہنچے تو وہ شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کی فلاح ہے اور اگر اس کو ضرر پہنچے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کی فلاح ہے۔ (صحیح مسلم، زہد: ۶۳، ۲۹۹۹ (۳۶۵)، مسند احمد، ج ۳، ص ۳۲۲-۳۲۳، ج ۶، ۱۵، طبع قدیم)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: کہ میرے رب نے مکہ کی وادی کو پیش کیا تاکہ اس کو میرے لیے سونا بنا دے۔ میں نے کہا: نہیں! اے میرے رب! میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں گا اور ایک دن بھوکا رہوں گا، جب میں بھوکا ہوں گا تو تجھے یاد کروں گا تجھ سے فریاد کروں گا اور جب میں سیر ہوں گا تو تیرا شکر ادا کروں گا اور تیری حمد کروں گا۔

(سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۳۵۳، مسند احمد، ج ۸، رقم الحدیث: ۲۲۲۵۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

حضرت فضیل بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص سے ملاقات کی۔ آپ نے اس سے پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: میں ٹھیک ہوں، آپ نے پھر پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا: میں ٹھیک ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، آپ نے فرمایا میں تم سے یہی سنا چاہتا تھا۔ (کتاب الدعاء للبرانی، رقم الحدیث: ۱۹۳۹)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایمان کے دو نصف ہیں، نصف میں صبر ہے اور نصف میں شکر ہے۔ (شعب الایمان، رقم الحدیث: ۹۷۱۵، الجامع الصغیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۳۱۰۶)

اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا

اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کر سجدہ

لَادَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ط لَمْ يَكُنْ مِنَ السَّاجِدِينَ ⑪

کرد، تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا اور وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا ○

تبیان القرآن

جلد چہارم

قَالَ مَا مَنَعَكَ إِلَّا تَسْجُدًا إِذْ أَمَرْتُكَ ۖ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ۖ

فرمایا تجھ کو مجھہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا، اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں

خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۚ ۱۲ قَالَ فَأَهْبِطْ مِنْهَا

تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے ○ فرمایا تو یہاں سے اتر

فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّغِيرِينَ ۚ ۱۳

تجھے یہاں گھمنڈ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، سو نکل جا بیشک تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے ○

قَالَ أَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يَبْعَثُونَ ۚ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ۚ ۱۴

اس نے کہا مجھے اس دن تک کی ہمت دے جس دن سب لوگ اٹھائے جائیں گے ○ فرمایا بیشک تو ہمت پانے والوں میں سے ہے ○

قَالَ فِيمَا آغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۚ ۱۵ ثُمَّ

اس نے کہا قسم اس بات کی کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے تو میں بھی تیری صراطِ مستقیم پر ضرور لوگوں کی گھات میں بیٹھا ہوں گا ○ پھر

لَا يَتَّبِعُهُمْ مِنَ الْبَيْنِ أَيْدِيَهُمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ

میں لوگوں (کو بہکانے کے لیے ضرور ان) کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں اور

وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۚ ۱۶ قَالَ اخْرُجْ

بائیں سے آؤں گا اور تو اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا ○ فرمایا یہاں سے

مِنْهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ

ذلیل اور دھتکارا ہوا ہو کر نکل جا ، البتہ جو لوگ تیری پیروی کریں گے میں تم سب سے

مِنْكُمْ أَجْبَعِينَ ۚ ۱۷

دوزخ کو بھر دوں گا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورت بنائی، پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو مجھہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا اور وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔

آیات سابقہ سے مناسبت

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی اس نعمت کا ذکر فرمایا تھا کہ اس نے انسانوں کو زمین میں بسایا اور ان کو اسباب زیست فراہم کیے اور اس آیت میں ان پر اپنی ایک اور نعمت کا ذکر فرمایا ہے اور اس میں انسان کی تخلیق کی ابتداء کا ذکر فرمایا ہے کہ اس نے انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور انہیں مسجود ملائکہ بنایا اور باپ پر جو انعام کیا جاتا ہے وہ بیٹے پر انعام کے قائم مقام ہوتا ہے، کیونکہ باپ کا شرف اور اس کا بلند مقام بیٹے کے لیے باعث فخر ہوتا ہے۔ اور اس سے فثایہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس قدر انعامات سے نوازا ہے تو پھر ان کا ایمان نہ لانا اور کفر پر ڈٹے رہنا اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور اس کی احسان فراموشی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے۔ تم اللہ کے ساتھ کس طرح کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تم میں جان ڈالی، پھر وہ تمہاری جان نکالتا ہے پھر تمہیں زندہ کرے گا۔ (البقرہ: ۲۸)

ایک اشکال کا جواب

اس آیت میں فرمایا ہے: اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورت بنائی۔ پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔ اس سے یہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہم کو پیدا کیا، پھر حضرت آدم کو فرشتوں سے سجدہ کرایا۔ حالانکہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا اور ان کو مسجود ملائکہ بنایا اس کے بعد ان کی نسل سے ہم کو پیدا فرمایا۔ اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

۱- اس آیت میں ”ہم نے تم کو پیدا کیا“ اس سے مراد ہے ہم نے تمہارے باپ آدم کو پیدا کیا اور ہم نے تمہارے باپ آدم کی صورت بنائی جیسا کہ ایک اور آیت میں بھی انسان سے مراد آدم ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سَلْسَلَةٍ مِّنْ طِينٍ
(المؤمنون: ۱۲)

اور بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے پیدا کیا۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ
مِنْهَا زَوْجَهَا يَسْكُنَ إِلَيْهَا (الاعراف: ۱۸۹)

(اللہ) وہی ہے جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی ذات سے اس کی بیوی کو بنایا تاکہ وہ اس کی طرف سکون حاصل کرے۔

۲- مجاہد نے یہ بیان کیا ہے کہ ”تم کو پیدا کیا“ اس سے مراد یہ ہے کہ آدم کو پیدا کیا اور ”پھر تمہاری صورت بنائی“ اس سے مراد ہے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں ان کی اولاد کی صورت بنائی۔

۳- اس آیت میں ایک لفظ مقدر ہے۔ ”پھر ہم تمہیں خبر دیتے ہیں“ اور پوری آیت کا معنی اس طرح ہو گا اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر تمہاری صورت بنائی۔ پھر ہم تمہیں خبر دیتے ہیں کہ پھر ہم نے فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو.....

حضرت آدم علیہ السلام کی سواح کے بعض اہم واقعات

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس لعین کا قصہ سات سورتوں میں ذکر فرمایا ہے۔ (البقرہ، الاعراف، الحجر، بنو اسرائیل، الکہف، طہ، ص)

ہم اس قصہ کے مباحث کی تفسیر اور تفصیل سورہ البقرہ میں بیان کر چکے ہیں یہاں پر ہم بعض ان امور کو بیان کریں گے جن کا وہاں ہم نے ذکر نہیں کیا تھا۔ یہاں پر ہم احادیث اور آثار کی روشنی میں حضرت آدم علیہ السلام کی سواح بیان کر رہے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کی مرحلہ وار تخلیق

امام ابو القاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی ۵۷۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اپنی پسندیدہ چیزیں پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی شان کے مطابق عرش پر مستوی ہوا اور فرشتوں سے فرمایا: میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (البقرہ: ۳۰) پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو مٹی لینے کے لیے زمین پر بھیجا۔ زمین نے کہا: میں اس بات سے تم سے اللہ کی پناہ طلب کرتی ہوں کہ مجھ سے کوئی چیز کم کی جائے یا میری کوئی چیز خراب کی جائے۔ حضرت جبرئیل لوٹ آئے اور مٹی نہیں لی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: یا رب! اس نے مجھ سے تیری پناہ طلب کی اور میں نے اس کو پناہ دے دی، پھر حضرت میکائیل کو بھیجا، اس نے پھر اسی طرح کہا وہ بھی لوٹ آئے، پھر حضرت عزرائیل کو بھیجا اس نے ان سے بھی اللہ کی پناہ طلب کی۔ انہوں نے کہا میں اس بات سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں کہ میں اللہ کے حکم پر عمل کرائے بغیر لوٹ جاؤں، انہوں نے زمین کے ہر خطہ سے مٹی لے کر جمع کی اور اس کو خلط ملط کر دیا۔ اس میں سرخ مٹی بھی تھی اور سفید بھی۔ یہی وجہ ہے کہ بنو آدم مختلف رنگ کے ہیں۔ وہ اس مٹی کو لے کر اوپر چڑھے اور اس کو گویا کر دیا، پھر اس گندھی ہوئی مٹی کو پڑا رہنے دیا حتیٰ کہ وہ سڑ گئی۔ جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ (الحجر: ۲۶)

اور بے شک ہم نے انسان کو بھتی ہوئی خشک مٹی سے بنایا جو پہلے سیاہ بدبودار گارا تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنے ہاتھوں سے بنایا تاکہ ابلیس خود کو ان سے بڑا نہ سمجھے اور وہ جمعہ کے دن چالیس سال کے برابر عرصہ تک بشر کی صورت میں پتلا بنے ہوئے پڑے رہے۔ فرشتے ان کو دیکھ کر خوف زدہ ہوتے تھے اور ابلیس سب سے زیادہ خوف زدہ ہوتا تھا۔ اس پتلے کو مارنے سے ایسی آواز آتی تھی جیسے مٹکے کو مارنے سے آواز آتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (الرحمن: ۱۴) بنایا۔

اس نے انسان کو ٹھیکری کی طرح بھتی ہوئی سوکھی مٹی سے

ابلیس کہتا تھا اس کو کس لیے بنایا گیا ہے، اس نے فرشتوں سے کہا اس سے مت ڈرو! یہ اندر سے کھوکھلا ہے۔ اگر مجھ کو اس پر مسلط کیا گیا تو میں اس کو ہلاک کر دوں گا۔ جب اس میں روح پھونکنے کا وقت آیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَإِذَا اسْتَوَيْنَا وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ (الحجر: ۲۹)

سو جب میں اس کو درست کر لوں اور اس میں اپنی طرف سے (پسندیدہ) روح پھونک دوں تو تم سب اس کے لیے سجدہ میں گر جانا۔

جب اس پتلے میں روح پھونکی اور وہ ان کے سر میں داخل ہوئی تو ان کو چھینک آئی۔ فرشتوں نے ان سے کہا کہو الحمد للہ تو انہوں نے کہا الحمد للہ۔ اور جب روح ان کی آنکھوں میں داخل ہوئی تو انہوں نے جنت کے پھلوں کی طرف دیکھا اور جب روح ان کے پیٹ میں پہنچی تو ان کو طعام کی خواہش ہوئی اور انہوں نے پیروں تک روح کے پہنچنے سے پہلے ہی جنت کے پھلوں کی طرف چھلانگ لگانی چاہی۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء: ۳۷)

انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے۔

پھر ابلیس کے سوا تمام فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا، جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے:

پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا ○ سوا ابلیس کے اس نے گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے ہو گیا ○ فرمایا اے ابلیس! تجھے اس کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تو نے اب گھمنڈ کیا یا تو پہلے ہی سے گھمنڈ کرنے والوں میں سے تھا ○ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اس کو مٹی سے بنایا ○ فرمایا تو اس (جنت) سے نکل جا بے شک تو مردود ہو گیا ○

فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ إِلَّا ابْلِيسَ اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ ○ قَالَ يَا ابْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِينَ ○ قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ○ قَالَ فَأَخْرِجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ○ (ص ۷۷-۷۸)

(مختصر تاریخ دمشق، ج ۴، ص ۲۱۷-۲۱۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۰۳ھ)

حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد کا مشاہدہ کرانا امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو قیامت تک ان کی اولاد کی پیدا ہونے والی رو میں ان کی پشت سے جھڑ گئیں۔ اور ان میں سے ہر انسان کی دونوں آنکھوں کے سامنے نور کی شعاعیں تھیں۔ پھر ان لوگوں کو حضرت آدم کے سامنے پیش کیا۔ حضرت آدم نے پوچھا: اے میرے رب! یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: یہ تمہاری اولاد ہیں۔ حضرت آدم نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا وہ شخص اور اس کی نور کی شعاعیں انہیں بہت اچھی لگیں۔ پوچھا: اے میرے رب! یہ کون شخص ہے؟ فرمایا: تمہاری اولاد کے آخری لوگوں میں سے ایک شخص ہے اس کا نام داؤد ہے۔ کہا: اے میرے رب تو نے ان کی کتنی عمر مقرر کی ہے؟ فرمایا: ساٹھ سال، کہا: اے میرے رب! میری عمر میں سے اس کی عمر کے چالیس سال زیادہ کر دے۔ جب حضرت آدم کی عمر پوری ہو گئی تو ان کے پاس ملک الموت آئے۔ کہا: کیا میری عمر میں سے ابھی چالیس سال باقی نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا: کیا یہ چالیس سال آپ نے اپنے بیٹے داؤد کو نہیں دیے تھے؟ حضرت آدم نے انکار کر دیا سو ان کی اولاد نے بھی انکار کر دیا اور حضرت آدم بھول گئے سو ان کی اولاد بھی بھول گئی اور حضرت آدم نے (اجتہادی) خطا کی سو ان کی اولاد نے بھی خطا کی۔ (سنن الترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۰۸۷)

حافظ ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

اور جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کی جانوں پر انہیں گواہ بنا دیا (فرمایا) کیا میں تمہارا رب نہیں؟ سب نے کہا کیوں نہیں! ہم نے گواہی دی تاکہ قیامت کے دن تم یہ نہ کہو کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا لَنَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ ○

(الاعراف: ۱۷۲)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تم پر سات آسمانوں کو گواہ کرتا ہوں اور تم پر تمہارے باپ آدم کو گواہ کرتا ہوں تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ جان لو کہ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ لہذا تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، میں عنقریب تمہارے پاس رسول بھیجوں گا جو تم کو میرا عہد اور میثاق یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابوں کو نازل کروں گا،

انہوں نے کہا ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو ہمارا رب اور ہمارا معبود ہے اور تیرے سوا ہمارا کوئی رب نہیں ہے، حضرت آدم نے ان میں غنی اور فقیر کو اور خوبصورت اور بد صورت لوگوں کو دیکھا، حضرت آدم نے کہا: اے میرے رب اگر تو اپنے تمام بندوں کو ایک جیسا کر دیتا فرمایا مجھے یہ پسند ہے کہ میرا شکر ادا کیا جائے۔ حضرت آدم نے ان میں انبیاء علیہم السلام کو دیکھا ان کے چہرے چراغ کی طرح منور تھے۔ ان کو رسالت اور نبوت کے میثاق کے ساتھ خاص کیا گیا تھا۔ اس کے متعلق یہ آیت ہے:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَ
مِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ
أَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا (الاحزاب: ۷)

اور جب ہم نے (تبلیغ رسالت پر) نبیوں سے عہد لیا اور آپ سے اور نوح سے اور ابراہیم سے اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے اور ہم نے ان سے پختہ عہد لیا۔

(تاریخ دمشق، ج ۳، ص ۲۲۰-۲۱۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۰۳ھ)

حضرت آدم علیہ السلام کی آزمائش

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کے دائیں کندھے پر مارا اور سفید رنگ کی ان کی اولاد نکالی۔ وہ چیونٹی کی مثل تھے۔ اور بائیں کندھے پر مارا اور اس سے ان کی سیاہ رنگ کی اولاد نکالی، وہ کونکوں کی طرح تھے۔ پھر دائیں جانب والوں کے لیے فرمایا یہ جنت کی طرف ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے اور بائیں جانب والوں کے لیے فرمایا یہ دوزخ کی طرف ہیں اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے۔

ابراہیم مزنی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا: کیا فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو کعبہ کی طرح کر دیا تھا اور فرشتوں کو ان کی طرف سجدہ عبادت کرنے کا حکم دیا۔ جس طرح اس نے اپنے بندوں کو کعبہ کی طرف سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

قنادہ نے کہا: حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں رہنے اور کھانے پینے کا حکم دیا اور ایک درخت سے منع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو آزمائش میں مبتلا کیا جس طرح اس سے پہلے فرشتوں کو مبتلا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کو اطاعت میں مبتلا کیا ہے، جس طرح اس سے پہلے زمین اور آسمان کو اطاعت میں مبتلا کیا تھا۔ ان سے فرمایا: تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے حاضر ہو جاؤ انہوں نے کہا: ہم خوشی سے حاضر ہوتے ہیں۔ (حم السجدة: ۱۱) سو حضرت آدم علیہ السلام کو آزمائش میں مبتلا کیا اور ان کو جنت میں رکھا۔ فرمایا کہ جہاں سے چاہو، فراخی سے کھاؤ اور ایک درخت سے کھانے سے منع فرما دیا۔ یہ آزمائش قائم رہی حتیٰ کہ انہوں نے اس ممنوع کار تکاب کر لیا۔ اس وقت ان کی شرم گاہ کھل گئی اور ان کو جنت سے اتار دیا گیا۔ حضرت آدم نے کہا: اے میرے رب! اگر میں توبہ کر لوں اور اصلاح کر لوں تو کیا جنت کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا! اور تب انہوں نے کہا:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا مُكْتَدِرِينَ وَإِنَّا لَنَكُونُ
تَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ

اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ (الاعراف: ۲۳)

انہوں نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور اللہ کے دشمن ابلیس نے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور نہ توبہ کی، لیکن اس نے قیامت تک کی مہلت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی دعا قبول کر لی۔ حضرت آدم کو معاف کر دیا اور شیطان کو قیامت تک کی مہلت دے دی۔

(تاریخ دمشق، ج ۳، ص ۲۲۱-۲۲۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۰۳ھ)

حضرت آدم کا سیدنا محمد ﷺ کے وسیلہ سے دعا کرنا اور اس حدیث کی تحقیق امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب حضرت آدم علیہ السلام سے (اجتہادی) خطا سرزد ہو گئی تو انہوں نے سر اٹھا کر عرش کی طرف دیکھا اور کہا: میں تجھ سے (سیدنا) محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے، اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی محمد کیا ہے! اور محمد کون ہیں؟ تب انہوں نے کہا تیرا نام برکت والا ہے، تو نے جب مجھے پیدا کیا تھا، تو میں نے عرش کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تو اس میں لکھا ہوا تھا: لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تو میں نے جان لیا کہ اس سے زیادہ مرتبہ والا کون شخص ہو گا جس کا نام تو نے اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی اے آدم وہ تمہاری اولاد میں آخر النبیین ہیں اور ان کی امت تمہاری اولاد میں سے آخری امت ہے اور اے آدم! اگر وہ نہ ہوتے تو میں تم کو (بھی) پیدا نہ کرتا۔

(المعجم الصغير، ج ۲، ص ۸۳، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ، المعجم الصغير، ج ۲، رقم الحدیث: ۹۹۲، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، المعجم الاوسط، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۳۹۸، مطبوعہ مکتبہ المعارف، ریاض، الشریعہ للاجرى، ص ۳۷۰-۳۷۳، ریاض، المستدرک، ج ۲، ص ۶۱۵، مطبوعہ دار الباز مکہ المکرمہ، دلائل النبوة، للیسقطی، ج ۵، ص ۳۸۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، وفاء الوفاء لابن الجوزی، ص ۳۳، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ لائل پور، مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۲۵۳، مطبوعہ دار الکتب العربیہ بیروت، مجمع البحرین، ج ۶، ص ۱۵۱، مطبوعہ مکتبہ الرشید، ریاض، المحصن الکبریٰ، ج ۱، ص ۶، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، لائل پور، (کتب تاریخ و سیرت) البدایہ و النہایہ، للحافظ ابن الکثیر، ج ۱، ص ۸۱، ج ۲، ص ۳۲۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، المواہب اللدنیہ، ج ۱، ص ۳۵، ج ۳، ص ۳۱۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، شرح المواہب للزرکانی، ج ۱، ص ۳۲، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، سبل الہدی و الرشاد، ج ۱، ص ۸۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، سیرت طیبہ، ج ۱، ص ۳۵۳، مطبوعہ شرکہ مکتبہ و مطبعہ مصطفیٰ البابی الحلبي و اولادہ عمر، قصص الانبیاء للحافظ ابن کثیر، ج ۱، ص ۳۰، مطبوعہ مکتبہ زرار مصطفیٰ، (کتب تفسیر) در مشور، ج ۱، ص ۱۳۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، تفسیر شمسی، ج ۱، ص ۵۳، مطبوعہ مؤسسہ الاعلیٰ بیروت، روح البیان، ج ۱، ص ۱۱۳، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کونہ، روح المعانی، ج ۱، ص ۲۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، (دیگر کتب) فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۲، ص ۱۵۱، مطبوعہ السعودیہ العربیہ، شفاء السقام للبسکی، ص ۱۲۰، مطبوعہ حیدر آباد دکن، علامہ جلال الدین سیوطی نے در مشور، ج ۱، ص ۱۳۲، اور المحصن ج ۱، ص ۶ میں اور علامہ علی متقی ہندی نے کنز العمال ج ۱۱، ص ۳۵۵ میں اس حدیث کو امام ابو نعیم کی دلائل النبوة کے حوالے سے بھی درج کیا ہے۔ میں نے امام ابو نعیم کی دلائل النبوة کو حرفاً حرفاً دیکھا ہے۔ اس میں یہ حدیث نہیں ہے اس سلسلہ میں ان بزرگ محدثین کو تسامح ہوا ہے)

امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے لیکن یہ ان کا تسامح ہے۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے بلکہ یہ حدیث موضوع ہے۔ (تلخیص المستدرک، ج ۶، ص ۶۱۵) علامہ ذہبی کا اس حدیث کو موضوع لکھنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی سند میں کوئی وضاع راوی نہیں ہے اور ذہبی نے اس کے موضوع ہونے پر کوئی دلیل نہیں دی۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث سنداً ضعیف ہے۔ جیسا کہ امام بیہقی نے دلائل النبوة میں اور حافظ ابن کثیر نے البدایہ و النہایہ اور قصص الانبیاء میں اس کی تصریح کی ہے کہ اس کا ایک راوی عبد الرحمن بن زید بن اسلم ضعیف ہے۔ علامہ ذہبی نے بھی اس کو ضعیف ہی لکھا ہے۔ وضاع نہیں قرار دیا اور فضائل میں ضعیف احادیث کا اعتبار کیا جاتا ہے اور قوی دلیل یہ ہے کہ حافظ ابن تیمیہ نے اس حدیث سے وسیلہ کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۲، ص ۱۵۱، مطبوعہ السعودیہ العربیہ)

ہرچند کہ عبدالرحمن بن زید بن اسلم کو اکثر ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے لیکن بعض ائمہ حدیث نے اس کی تعدیل اور تحسین بھی کی ہے۔ حافظ جمال الدین یوسف مزنی اس کے متعلق لکھتے ہیں:

امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے عبدالرحمن بن زید بن اسلم کی احادیث سے استدلال کیا ہے۔

امام ابو حاتم کا دوسرا قول یہ ہے کہ عبدالرحمن بن زید بن اسلم ابن ابی الرجال سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور ابو احمد بن عدی نے کہا اس کی احادیث حسن ہیں لوگوں نے ان کو حاصل کیا ہے۔ اور بعض نے اس کو صادق قرار دیا ہے اور یہ ان راویوں میں سے ہے جن کی احادیث لکھی جاتی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(تمذیب الکمال، ج ۱۱، ص ۱۹۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ، تمذیب التذیب، ج ۶، ص ۱۶۲، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نیز امام ابن جوزی نے الوفاء میں اس حدیث کو جس سند سے ذکر کیا ہے اس میں عبدالرحمن بن زید بن اسلم نہیں ہے، شیخ ابن تیمیہ نے بھی اسی سند کے ساتھ اس حدیث کا ذکر کیا ہے، لہذا عبدالرحمن بن زید کی وجہ سے جو اس حدیث کو ضعیف کہا گیا ہے وہ اعتراض اصلاً ساقط ہو گیا۔

حضرت آدم کے سکون کے لیے حضرت حوا کو پیدا کرنا

حافظ ابو القاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی ۵۷۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر کئی صحابہ رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ ابلیس کو جنت سے نکالا گیا اور اس پر لعنت کی گئی اور حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں رکھا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں گھبراتے تھے اور ان کی کوئی بیوی نہیں تھی جس سے وہ سکون حاصل کرتے۔ ایک دن وہ سو گئے۔ بیدار ہوئے تو ان کے سرانے ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی جس کو اللہ عزوجل نے ان کی پسلی سے پیدا کیا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے کہا میں ایک عورت ہوں۔ آپ نے پوچھا: تمہیں کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اس نے کہا: تاکہ آپ مجھ سے سکون حاصل کریں۔ فرشتوں نے پوچھا: اے آدم! اس کا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا: اس کا نام حوا ہے۔ فرشتوں نے پوچھا: آپ نے اس کا نام حوا کیوں رکھا۔ انہوں نے کہا کیونکہ یہ حی (زندہ) سے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا: اور ہم نے فرمایا: اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور اس سے فراخی سے کھاؤ جہاں سے تم چاہو اور تم دونوں اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم حد سے بڑھنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ (البقرہ: ۳۵) نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کے لیے ان کی ان شرم گاہوں کو ظاہر کرادے جو ان سے چھپائی ہوئی تھیں اور کہا (اے آدم و حوا) تمہارے رب نے تمہیں اس درخت سے صرف اس لیے منع کیا ہے کہ کہیں تم فرشتہ بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ اور ان دونوں سے قسم کھا کر کہا کہ بے شک میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں ○ پھر فریب سے انہیں (اپنی طرف) جھکالیا تو جب انہوں نے اس درخت کو چکھا تو ان کی شرم گاہیں ان پر ظاہر ہو گئیں اور وہ اپنے بدن پر جنت کے پتے جوڑنے لگے اور ان کے رب نے انہیں ندا فرمائی کیا اس درخت سے میں نے تم دونوں کو نہیں روکا تھا؟ اور تم سے (یہ) نہیں کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ (الاعراف: ۲۱-۲۲) اس درخت سے کھانے میں حوا نے سبقت کی، پھر حضرت آدم علیہ السلام سے کہا تم بھی کھاؤ، کیونکہ میں نے کھایا تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ (حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے تنزیہاً ممانعت کی ہے، تحرماً منع نہیں فرمایا۔ اس لیے کھانے میں کوئی حرج نہیں اور یہ بھول گئے کہ یہ ممانعت تحرماً تھی۔ یا انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس معین درخت سے منع فرمایا ہے۔ اگر میں اس نوع کے کسی اور درخت سے کھاؤں تو پھر حرج نہیں ہے اور یہ بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ کی منشا اس درخت کی نوع سے منع کرنا تھا۔ پھر جب

انہوں نے اس درخت سے کھالیا اور وہ بے لباس ہو گئے اور پتوں سے جسم چھپانے لگے تو انہوں نے کہا: اس نے تیری قسم کھائی تھی اور میرا یہ گمان نہیں تھا کہ تیری مخلوق میں سے کوئی شخص تیری قسم جھوٹی بھی کھا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ○ فرمایا اترو تمہارے بعض بعض کے لیے دشمن ہیں اور تمہارے لے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ اور ایک وقت تک فائدہ اٹھانا ہے ○ (الاعراف: ۲۳-۲۴)

(مختصر تاریخ دمشق، ج ۴، ص ۲۲۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۳ھ)

حضرت آدم علیہ السلام کا دنیا میں تشریف لانا

عطایان کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں فرشتوں کی تسبیح اور ان کی آواز سنتے تھے۔ زمین پر آنے کے بعد یہ نعمت ان سے جاتی رہی۔ انہوں نے اپنے رب عزوجل سے اس کی شکایت کی۔ ان سے کہا گیا کہ یہ بھی آپ کی اس (ظاہری) خطا کا ثمرہ ہے، البتہ میں آپ کے لیے ایک بیت اتاروں گا۔ آپ اس کے گرد طواف کریں جس طرح فرشتے عرش کے گرد طواف کرتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام بستیوں اور جنگلوں کی مسافت طے کر کے اس بیت کے پاس آئے اس کے گرد طواف کیا اور اس کے پاس نماز پڑھی۔ اسی طرح اس بیت کا طواف کرتے رہے، حتیٰ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا اور اللہ تعالیٰ نے اس بیت کو اٹھالیا اور قوم نوح کو غرق کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان ہی بنیادوں پر حضرت نوح علیہ السلام سے وہ بیت بنوایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ہند سے پیدل چل کر چالیس مرتبہ حج کیا۔

(مختصر تاریخ دمشق، ج ۴، ص ۲۲۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۳ھ)

حضرت آدم علیہ السلام کی وفات

حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام پر جب وفات کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے کہا: اے بیٹو! میں جنت کے پھلوں کی خواہش کر رہا ہوں، وہ جنت کے پھل ڈھونڈنے چلے گئے۔ ان کے سامنے سے فرشتے آئے، ان کے پاس کفن اور خوشبو تھی، اور کدالیں اور پھاوڑے تھے۔ انہوں نے حضرت آدم کے بیٹوں سے کہا: تم کیا تلاش کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ہمارا باپ بیمار ہے، ہم اس کے لیے جنت کے پھل ڈھونڈ رہے ہیں۔ فرشتوں نے کہا: واپس جاؤ، تمہارے باپ کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ فرشتے آئے تو حضرت حواء نے ان کو پہچان لیا۔ وہ حضرت آدم کے پاس گئیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا: مجھ سے دور رہو۔ تمہاری وجہ سے میں فتنہ میں مبتلا ہوا تھا۔ مجھے اور میرے رب عزوجل کے فرشتوں کو تنہا چھوڑ دو۔ پھر فرشتوں نے حضرت آدم کی روح قبض کر لی۔ ان کو غسل دیا، ان کو کفن پہنایا اور ان کے جسم پر خوشبو لگائی اور ان کے لیے قبر کھود کر لحد بنائی ان پر نماز جنازہ پڑھی۔ پھر ان کی قبر میں اترے اور ان کو قبر میں داخل کیا اور قبر پر کچی اینٹیں رکھیں۔ پھر ان کی قبر سے نکلے اور ان کی قبر کو مٹی سے پر کر دیا۔ پھر کہا: اے آدم کے بیٹو! یہ تمہارے لیے کفن دفن کا طریقہ ہے۔

عطاء خراسانی نے بیان کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات پر سات دن تک مخلوق روتی رہی۔

(مختصر تاریخ دمشق، ج ۴، ص ۲۲۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۳ھ)

حضرت آدم علیہ السلام کا برزخ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مباحثہ

امام محمد بن اسماعیل بخاری متونی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام میں مباحثہ ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے آدم! آپ ہمارے باپ ہیں! آپ نے ہمیں نامراد کیا اور جنت سے نکال دیا۔ ان سے حضرت آدم نے کہا: اے موسیٰ! تم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ساتھ سرفراز کیا اور اپنے دست قدرت سے تمہارے لیے تورات لکھی۔ کیا تم مجھے اس کام پر ملامت کر رہے ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کرنے سے چالیس سال پہلے میرے متعلق مقدر کر دیا تھا نبی ﷺ نے فرمایا پھر حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غلبہ پا گئے۔

(صحیح البخاری، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۶۱۳، صحیح مسلم، قدر: ۱۳ (۲۶۵۲) ۶۶۱۸، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۴۷۰۱، السنن الکبریٰ، ج ۶، رقم الحدیث: ۱۱۳۲۹)

حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام میں یہ مباحثہ ہو سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں حضرت آدم علیہ السلام کی قبر کے پاس ہوا ہوا ہو سکتا ہے کہ دونوں کے وصال کے بعد عالم برزخ میں یہ مباحثہ ہوا ہو۔ حضرت آدم علیہ السلام نے شجر ممنوع کھانے پر تقدیر کا عذر اپنی زندگی میں پیش نہیں کیا بلکہ زندگی میں اپنے اس فعل پر اظہار ندامت اور توبہ اور استغفار ہی کرتے رہے، جبکہ ان کا یہ فعل بھولے سے ہوا تھا اور یہ گناہ نہیں تھا۔ اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کی اس مثال کو سامنے رکھ کر کوئی شخص اپنے دانستہ گناہوں پر یہ عذر پیش نہیں کر سکتا کہ اس کی تقدیر میں یونہی لکھا تھا۔ جب تک انسان دارالتکلیف میں ہے، اس پر مکلفین کے احکام جاری ہوں گے۔ اس کو ملامت کی جائے گی اور اس پر حد یا تعزیر حسب عمل جاری ہوگی اور اگر بغیر توبہ کے مر گیا تو عذاب کا مستحق ہوگا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا فعل اول تو حقیقتاً معصیت نہیں تھا۔ ثانیاً انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ دارالتکلیف سے جانے کے بعد فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرمایا تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا جبکہ میں نے تجھے حکم دیا تھا، اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے ○ (الاعراف: ۱۲)

سجدہ کا لغوی اور شرعی معنی

علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

سجدہ کا لغت میں معنی ہے: سر نیچے کرنا، جھکنا، عاجزی اور خاکساری کرنا اور اس کا فقہی معنی ہے زمین پر پیشانی رکھنا اور اس سے بڑھ کر عاجزی اور تذلل متصور نہیں ہے۔

(التہامیہ، ج ۲، ص ۳۰۹، ۳۰۲، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۸ھ، مجمع بحار الانوار، ج ۳، ص ۳، مطبوعہ مکتبہ دارالایمان مدینہ

منورہ، ۱۳۱۵ھ)

قرآن مجید میں سجدہ کے اطلاق

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

سجدہ کا شرعی معنی ہے: اللہ کے لیے تذلل اور عاجزی کرنا اور اس کی عبادت کرنا اور یہ انسان، حیوانات اور جمادات سب کو شامل ہے اور اس سجدہ کی دو قسمیں ہیں۔ سجدہ بالا اختیار اور سجدہ بالتسخیر۔ سجدہ بالا اختیار پر انسان ثواب کا مستحق ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے:

فَاسْجُدْ لِلَّهِ وَاعْبُدْ ○ (النجم: ۶۲)

سو اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔

اور سجدہ بالتسخیر اور سجدہ بالا اختیار دونوں کی مثال یہ آیت ہے:

وَلِيْلِهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي
الْاَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا
يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (النحل: ۴۹)

اور آسمانوں اور زمینوں میں جو چیزیں ہیں وہ سب اللہ ہی
کو سجدہ کرتی ہیں، (ہر قسم کے) جاندار اور سب فرشتے اور وہ
تکبر نہیں کرتے۔

اور صرف سجدہ بالتسخیر کی مثال یہ آیتیں ہیں:

وَالشَّجَرُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ (الرحمن: ۶)

اور زمین پر پھیلنے والے پودے اور اپنے تنے پر کھڑے
درخت سجدہ کرتے ہیں۔

وَلِيْلِهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا
وَتَكْرَهًا ۝ (الرعد: ۱۵)

مجبوری سے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور ان کے سائے (بھی)
صبح اور شام کو۔

قرآن مجید میں سجدہ کا اطلاق سجدہ عبودیت کی بجائے سجدہ تعظیم پر بھی کیا گیا ہے:

اَسْجُدْ وَالْاٰدَمَ (البقرہ: ۳۳)

آدم کو سجدہ کرو۔

وَخَشَرُوْا لِهٰٓسُجْدًا (يوسف: ۱۰۰)

اور (ماں، باپ اور بھائی سب) یوسف کے لیے سجدہ میں گر
گئے۔

سجدہ کا اطلاق نماز پر بھی کیا گیا ہے:

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ
(ق: ۳۰) بعد (بھی)۔

رات کے کچھ وقت میں اس کی تسبیح کیجئے اور نمازوں کے

ابلیس جن تھا یا فرشتہ؟

جبوز مفسرین یہ کہتے ہیں کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا۔ ان کی دلیل سورہ بقرہ کی یہ آیت ہے: اور جب ہم نے فرشتوں سے
فرمایا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا۔ (البقرہ: ۳۳) ابلیس کو سجدہ کا حکم اس وقت ہو گا جب وہ فرشتہ ہو، کیونکہ
اس آیت میں سجدہ کا حکم فرشتوں کو دیا گیا ہے اور جو علماء یہ کہتے ہیں کہ ابلیس فرشتہ نہیں تھا، وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابلیس جنی تھا
لیکن وہ فرشتوں کے درمیان چھپا رہتا تھا۔ اس لیے بہ طور تغلیب وہ بھی فرشتوں میں داخل تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جنات کو
سجدہ کرنے کا حکم تھا لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد ان کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ جب اکابر کو کسی کی تعظیم کرنے کا حکم
دیا جائے تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اصغر کو اس کی تعظیم کا بہ طریق اولیٰ حکم ہے۔ ابلیس کے جن ہونے کی واضح دلیل یہ
آیت ہے:

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ

وہ (ابلیس) جنات میں سے تھا سو اس نے اپنے رب کے حکم

(الکہف: ۵۰) سے سرکشی کی۔

اس بحث کی مکمل تفصیل جاننے کے لیے (البقرہ: ۳۳) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

امر کا وجوب کے لیے ہونا

اس آیت میں فرمایا ہے: تجھ کو سجدہ کرنے سے کس چیز نے منع کیا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا علماء اصول نے اس آیت
سے یہ استدلال کیا ہے کہ امر کا تقاضا وجوب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کی اس پر مذمت کی ہے کہ ابلیس نے اللہ کے حکم

کے بعد اس پر عمل نہیں کیا اور بعض علماء نے اس سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ امر کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر فوراً عمل کیا جائے، کیونکہ ابلیس نے جب اس پر علی الفور عمل نہیں کیا تو اس پر گرفت کی گئی۔

حضرت آدم سے افضل ہونے پر ابلیس کا یہ استدلال کہ آگ مٹی سے افضل ہے

اس آیت میں فرمایا ہے کہ ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی یہ وجہ بیان کی: اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

ابلیس کے جواب کی وضاحت یہ ہے کہ آگ مٹی سے بہتر ہے۔ کیونکہ آگ گرم خشک ہے اور مٹی سرد خشک ہے۔ اور حرارت برودت سے افضل ہے۔ کیونکہ گرمی حیات کے اور جوانی کے مناسب ہے اور ٹھنڈک موت اور بڑھاپے کے مناسب ہے اور حیات اور جوانی، موت اور بڑھاپے سے افضل ہے۔ نیز آگ تاثیر اور فعل کرتی ہے اور مٹی اثر قبول کرتی ہے اور انفعال کرتی ہے اور فعل، انفعال سے افضل ہے اور آگ کا خاصہ بلندی کی طرف جانا اور مٹی کا خاصا پستی کی طرف آنا ہے اور بلندی پستی سے افضل ہے۔ سو ان تین وجوہ سے آگ مٹی سے افضل ہے اور ابلیس آگ سے اور حضرت آدم مٹی سے بنائے گئے لہذا ابلیس حضرت آدم سے افضل ہو اور افضل کا مفضل کو سجدہ کرنا حکمت کے خلاف ہے۔

آگ سے مٹی کے افضل ہونے کی دس وجوہات

ابلیس کی یہ دلیل متعدد وجوہ سے باطل ہے کسی مرکب کی چار علتیں ہوتی ہیں۔ علت مادی، علت صوری، علت فاعلی اور علت غائی۔ ابلیس نے اپنے اور حضرت آدم کے درمیان صرف علت مادی سے تقابل کیا اور باقی تین علتوں سے صرف نظر کر لی۔ ثانیاً علت مادی کے اعتبار سے بھی حضرت آدم، ابلیس سے افضل ہیں کیونکہ مٹی آگ سے حسب ذیل وجوہ سے افضل ہے:

- ۱- آگ کی طبیعت کا تقاضا چیزوں کو علی الفور جانا اور ان کو تلف کرنا ہے جبکہ مٹی کسی چیز کو تلف یا ضائع نہیں کرتی۔
- ۲- مٹی میں انسانوں اور حیوانوں کا رزق پیدا ہوتا ہے اور کپاس پیدا ہوتی ہے جس سے انسانوں کا لباس حاصل ہوتا ہے جبکہ آگ میں کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔
- ۳- مٹی میں اگر ایک دانہ ڈالا جائے تو اس کی برکت سے وہ کم و بیش سات سو گنا زیادہ پیدا ہوتا ہے جبکہ آگ کسی چیز کو بڑھانا تو کجا اصلانیت و نابود کر دیتی ہے۔
- ۴- آگ کو اپنے وجود میں مٹی کی احتیاج ہے۔ کیونکہ آگ زمین کے بغیر نہیں مستحق ہوگی۔ جبکہ زمین کو اپنے وجود میں آگ کی احتیاج نہیں ہے۔

۵- اللہ تعالیٰ نے زمین کے بہ کثرت منافع اور فوائد کا قرآن مجید میں ذکر فرمایا ہے:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مَبْنًىٰ (النساء: ۶)

کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كَنًىٰ ۝ أَحْيَاءُ وَأَمْوَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِي

کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے، الی نہ بنایا ۝ زندوں اور مردوں

کے لیے ۝ اور ہم نے اس میں بلند منبھوط پہاڑ پیدا کر دیے۔

(المرسلات: ۲۷-۲۵)

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ حَبِيبًا

وہی ہے جس نے تمہارے نفع کے لیے زمین کی سب چیزوں

(البقرہ: ۲۹) کو پیدا کیا۔

اس کے برخلاف قرآن مجید کی اکثر اور بیشتر آیتوں میں آگ کو عذاب قرار دیا گیا ہے اور اس سے ڈرایا گیا ہے۔

۶۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے زمین کو برکت قرار دیا ہے:

آپ کہئے تم بے شک اس کے ساتھ ضرور کفر کرتے ہو جس نے دودن میں زمین بنائی اور تم اس کے لیے شریک بناتے ہو، یہ پروردگار ہے سارے جہانوں کا O اور جس نے زمین کے اوپر بھاری پہاڑوں کو گاڑ دیا اور اس میں برکت دی، اور اس میں اس کے باشندوں کے لیے چار دنوں میں غذائیں رکھ دیں، جو طلب کرنے والوں کے لیے برابر ہیں۔

قُلْ آئِنكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ آندَادًا ذَلِكُمْ رَبُّ الْعَالَمِينَ O وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِي مِّنْ فَوْقِهَا وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَاءً لِّلنَّاسِ لَيْلِينَ O (حم السجده: ۹-۱۰)

اور ہم نے ابراہیم اور لوط کو اس زمین کی طرف نجات دی جس میں ہم نے تمام جہان والوں کے لیے برکت فرمائی ہے۔

وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ O (الانبیاء: ۷۱)

اور سلیمان کے لیے تیز ہوا مسخر کر دی جو ان کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرٍ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا (الانبیاء: ۸۱)

اس کے برخلاف آگ کی یہی صفت ہے کہ وہ چیزوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

۷۔ مٹی کے شرف کے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں اپنا گھر (البيت المحرم) بنایا ہے جس میں ہر وقت طواف کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو سجدے کیے جاتے ہیں، اس کی عبادت کی جاتی ہے اور تسبیح، تہلیل اور تہجد کی جاتی ہے۔ علیٰ هذا القیاس۔ مسجد نبوی ہے، مسجد اقصیٰ ہے اور بے شمار مساجد ہیں جن میں دن رات اس کی حمد اور عبادت کی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف آگ میں ایسی کوئی فضیلت نہیں ہے۔

۸۔ زمین میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے نفع کے لیے، معدنیات، دریا، سمندر، چشمے، پھلوں کے باغات، غلہ سے لدے ہوئے کھیت، سواریوں کے لیے اصناف و اقسام کے جانور اور طرح طرح کے لباس پیدا کیے ہیں اور اس کے مقابلہ میں آگ کے اندر ایسا کوئی نفع نہیں ہے۔

۹۔ آگ کی زیادہ سے زیادہ فضیلت یہ ہے کہ اس کی حیثیت زمین کے خادم کی ہے۔ اول تو آگ کا وجود زمین کے وسیلہ سے ہے۔ آگ یا لکڑیوں کو جلا کر حاصل ہوتی ہے یا گوہر کو جلا کر۔ یا قدرتی گیس سے اور تیل سے حاصل ہوتی ہے اور ان تمام چیزوں کا حصول زمین سے ہوتا ہے۔ ثانیاً آگ سے کھانا پکایا جاتا ہے یا حرارت حاصل کی جاتی ہے اور کھانے کے اجزاء ترکیبی بھی زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مٹی اصل اور مخدوم ہے اور آگ فرع اور خادم ہے اور اس کو مٹی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔

۱۰۔ ابلیس لعین کا مادہ خلقت (سارج من نار) بھڑکنے والی آگ ہے اور بھڑکنے والی آگ اور شعلے فی نفسہ ضعیف ہیں۔ ہوا ان کو ادھر سے ادھر لے جاتی ہے اور ان کا بھڑکنا ہوا کے تابع ہے۔ اور مٹی فی نفسہ قوی ہے۔ ہوا اس کو اپنے زور سے ادھر ادھر نہیں لے جاسکتی بلکہ مٹی کی دیواریں اور پہاڑ ہوا کے لیے سد راہ بن جاتے ہیں اور قوی، ضعیف سے افضل ہوتا ہے اس لیے مٹی آگ سے افضل ہے۔ ثانیاً ابلیس لعین کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے بنایا گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا مٹی اور پانی کو گوندھ کر دونوں سے بنایا گیا تھا اور پانی بھی آگ سے افضل ہے کیونکہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔ نیز پانی کے افضل ہونے کے لیے یہ آیت کافی ہے:

اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ

(الانبیاء: ۳۰)

الغرض حضرت آدم علیہ السلام کا مادہ خلقت مٹی اور پانی ہے اور یہ دونوں آگ سے افضل ہیں۔ اس لیے ابلیس لعین کا یہ کہنا غلط تھا کہ ”میں آدم سے بہتر ہوں“۔

حضرت آدم کا چاروں علتوں کی وجہ سے ابلیس سے افضل ہونا

علت مادی کے بعد دوسری فضیلت کی وجہ علت صوری ہے اور علت صوری کے اعتبار سے بھی حضرت آدم علیہ السلام افضل ہیں:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝

بے شک ہم نے انسان کو سب سے حسین تقویم (ساخت)

(التین: ۴) میں بنایا۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ الحدیث۔

(صحیح البخاری ج ۷، رقم الحدیث: ۶۲۲۷، صحیح مسلم بر ۱۱۵، (۲۶۱۲) ۶۵۳۲، مسند احمد ج ۲، ص ۳۱۵، ۲۳۳، طبع قدیم)

علت صوری کے بعد تیسری فضیلت کی وجہ علت فاعلی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو حرف کس سے پیدا فرمایا اور

حضرت آدم علیہ السلام کو خاص اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا:

فرمایا: اے ابلیس! تجھے اس کے لیے سجدہ کرنے سے کس

قَالَ يَا ابْلِيسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا

نے روکا ہے میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا؟

خَلَقْتُ يَدَيَّ (ص: ۷۵)

جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا بے شک میں

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ

مٹی سے بشر بنانے والا ہوں ۝ تو جب میں اسے درست کروں

طِيْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ

اور اس میں اپنی طرف کی (خاص) روح پھونک دوں تو تم اس

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ (ص: ۷۲-۷۱)

کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر جانا۔

فضیلت کی چوتھی وجہ علت غائی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی غایت تخلیق اللہ تعالیٰ کی نیابت اور زمین پر اللہ تعالیٰ کی

خلافت ہے۔ فرمایا:

اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا بے شک

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِيْ

میں زمین میں (اپنا) نائب بنانے والا ہوں۔

الْاَرْضِ خَلِيْفَةً (البقرہ: ۳۰)

اور اس سے بڑھ کر کسی مخلوق کی اور کیا فضیلت ہو سکتی ہے کہ وہ اللہ کا نائب اور اس کا خلیفہ ہو۔ اور اس تفصیل سے

واضح ہو گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام علت مادی، صوری، فاعلی اور غائی ہر اعتبار سے ابلیس لعین سے افضل ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ

نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو ابلیس پر لازم اور واجب تھا کہ وہ آپ کو سجدہ کرے لیکن اس نے اللہ تعالیٰ

کے صریح حکم کے مقابلہ میں فاسد قیاس کیا اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ حضرت آدم سے افضل ہے اور افضل کا مفضول کو سجدہ

کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض علماء ظاہر نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ مطلقاً قیاس اور اجتہاد کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے

ہم یہاں پر قیاس اور اجتہاد کی تحقیق کر رہے ہیں۔

ابلیس کے باطل قیاس کی بنا پر منکرین قیاس کے دلائل اور ان کا تجزیہ

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابن سیرین نے کہا سب سے پہلے ابلیس نے قیاس کیا تھا اور سورج اور چاند کی پرستش صرف قیاس کی وجہ سے کی گئی ہے۔
حسن بصری نے کہا سب سے پہلے جس نے قیاس کیا تھا وہ ابلیس ہے۔

(جامع البیان، جز ۸، ص ۱۷۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ، سنن دارمی، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۹۱، طبع بیروت، ۱۳۰۷ھ)
حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصبہانی متوفی ۴۳۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عمرو بن جمیع بیان کرتے ہیں کہ میں، ابن ابی لیلیٰ اور (امام) ابو حنیفہ، حضرت جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عبد اللہ بن شرمہ نے کہا میں اور (امام) ابو حنیفہ، حضرت جعفر بن محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت جعفر بن محمد نے ابن ابی لیلیٰ سے پوچھا: تمہارے ساتھ کون ہے؟ انہوں نے کہا: یہ وہ شخص ہے جس کو امور دین میں بہت مہارت اور بصیرت حاصل ہے۔ حضرت جعفر نے کہا: شاید یہ دین کے معاملات میں اپنی رائے سے قیاس کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: ہاں! حضرت جعفر نے (امام) ابو حنیفہ سے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا: نعمان! (الی قولہ) حضرت جعفر نے امام ابو حنیفہ سے کہا: اے نعمان! مجھے میرے والد نے میرے دادا سے یہ حدیث روایت کی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے سب سے پہلے دین کے معاملہ میں اپنی رائے سے قیاس کیا وہ ابلیس تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: (حضرت) آدم کو سجدہ کرو، اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے، سو جس نے دین میں اپنی رائے سے قیاس کیا، اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ابلیس کے ساتھ اکٹھا کرے گا۔ ابن شرمہ کی روایت میں یہ اضافہ ہے، پھر حضرت جعفر نے ان سے پوچھا: قتل نفس اور زنا میں کون سا گناہ زیادہ بڑا ہے؟ امام ابو حنیفہ نے کہا: قتل نفس۔ حضرت جعفر نے کہا: اللہ تعالیٰ نے قتل نفس کے ثبوت کے لیے صرف دو گواہ کافی قرار دیے۔ پھر زنا کے ثبوت کے لیے چار مردوں کی گواہی کیوں ضروری ہے؟ پھر پوچھا: نماز اور روزے میں کون سا فرض زیادہ اہم ہے؟ امام ابو حنیفہ نے کہا: نماز! حضرت جعفر نے کہا: پھر کیا وجہ ہے کہ حائض عورت صرف روزے کی قضا کرتی ہے اور نماز کی قضا کا حکم نہیں ہے؟ پھر کہا: تمہارے قیاس کرنے پر افسوس ہے! اللہ سے ڈرو اور دین میں اپنی رائے سے قیاس نہ کرو۔

(حلیۃ الاولیاء، ج ۳، ص ۱۹۷-۱۹۶، دار الکتب العربی، بیروت، ۱۳۰۷ھ، ایضاً ج ۳، رقم الحدیث: ۳۷۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت،

۱۳۱۸ھ)

حضرت جعفر بن محمد نے نبی ﷺ سے جو حدیث روایت کی ہے، اس کے متعلق قاضی محمد بن علی بن محمد شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ اور نواب صدیق حسن خان بھوپالی متوفی ۱۳۰۷ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث کی سند میں غور کرنا چاہیے۔ میرا گمان یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہے اور یہ حدیث کا ام ثبوت کے مشابہ نہیں ہے۔

(فتح القدر، ج ۲، ص ۱۹۳، مطبوعہ عالم الکتب، بیروت، فتح البیان، ج ۳، ص ۲۶۲، مطبوعہ المطبعۃ الکبریٰ بولاق، مصر، ۱۳۰۱ھ)

اس حدیث کی سند میں ایک راوی ہے۔ سعید بن عبسہ۔ اس کے متعلق حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی ۷۴۸ھ لکھتے ہیں:

یہی نے کہا یہ کذاب ہے اور ابو حاتم نے کہا یہ صادق نہیں۔ اس نام کا ایک دو سرا شخص ہے وہ مجہول ہے۔ اس نام کا ایک

شبان القرآن

جلد چہارم

تیسرا شخص ہے۔ امام ابن جوزی نے اس پر کوئی طعن نہیں کیا لیکن یہ متعین نہیں ہے کہ اس سند میں کون سا شخص مراد ہے۔

(میزان الاعتدال، ج ۳، ص ۲۲۳، مکتبہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ج ۳، ص ۱۶۱۶ھ)

اس حدیث کا ایک اور راوی ہے عمرو بن جمیع۔ اس کے متعلق حافظ زہبی لکھتے ہیں:

ابن معین نے اس کو کذاب قرار دیا۔ امام دارقطنی اور ایک جماعت نے کہا: یہ متروک ہے۔ ابن عدی نے کہا: اس پر

حدیث گھڑنے کی تہمت ہے۔ امام بخاری نے کہا: یہ منکر الحدیث ہے۔

(میزان الاعتدال، ج ۵، ص ۳۰۴، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ)

نظام معتزلی اور بعض اہل الظاہر قیاس کے منکر ہیں اور صحابہ کرام، تابعین عظام اور ان کے بعد کے جمہور علماء قیاس کے

قائل ہیں اور قیاس سے جو احکام مستنبط ہوں، ان پر عمل کرنا شرعاً جائز ہے اور عقلاً واقع ہے۔ بعض شوافع اور ابوالحسنین بصری

کے نزدیک اس پر عمل کرنا عقلاً واجب ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن، جزء ۷، ص ۱۵۵، مطبوعہ دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

مجوزین قیاس کا احادیث سے استدلال

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ نے اپنی صحیح میں یہ عنوان قائم کیا ہے: جس شخص نے کسی پیش آمدہ مسئلہ کو ایسی

متعارف اصل پر قیاس کیا ہو جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا ہو تاکہ سوال کرنے والا اس مسئلہ کو سمجھ سکے، اور اس عنوان پر

اس حدیث سے استدلال کیا ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئی اور سوال کیا کہ

میری ماں نے حج کرنے کی نذر مانی تھی۔ پھر وہ حج کرنے سے پہلے فوت ہو گئی۔ کیا میں اسکی طرف سے حج کر لوں؟ آپ نے فرمایا:

اس کی طرف سے حج کر لو۔ یہ بتاؤ کہ اگر تمہاری ماں پر قرض ہو تا تو کیا تم اس کو ادا کرتیں؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: پھر اللہ

کا قرض ادا کرو۔ وہ ادا کیے جانے کا زیادہ حق دار ہے۔

(صحیح البخاری، ج ۸، رقم الحدیث: ۷۳۱۵، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

نیز امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق قانیوں کا اجتہاد کرنا اور یہ کہا کہ نبی ﷺ نے

صاحب حکمت کی تعریف کی ہے جبکہ وہ حکمت سے فیصلے کرے اور حکمت کی تعلیم دے اور از خود کوئی حکم نہ دے اور خلفاء سے

مشورے کرے اور اہل علم سے تبادلہ خیال کرے، اور اس پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صرف دو (قسم کے) آدمیوں پر حسد (رشک)

کرنا جائز ہے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور اس مال کو راہ حق میں خرچ کرنے پر اس کو مسلط کر دیا ہو اور دوسرا

وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت دی ہو وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہو اور لوگوں کو تعلیم دیتا ہو۔

(صحیح البخاری، ج ۸، رقم الحدیث: ۷۳۱۶، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

نیز امام بخاری نے ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا: جن احکام کی معرفت دلائل سے ہو پھر دلائل کی یہ تفسیر کی کہ نبی ﷺ

نے گھوڑوں کے احکام بیان فرمائے اور جب آپ سے گدھوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے ان کا حکم اس آیت سے مستنبط

کیا فسن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ اور نبی ﷺ سے گوہ کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: میں اس کو کہتا ہوں

ہوں اور نہ اس کو حرام کرتا ہوں اور نبی ﷺ کے دسترخوان پر گوہ کھائی گئی ہے۔ اس سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے

یہ استدلال کیا ہے کہ گوہ حرام نہیں ہے اور اس عنوان کے تحت یہ حدیث سند کے ساتھ بیان کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گھوڑے تین قسم کے ہیں۔ گھوڑا کسی کے لیے باعث اجر ہوتا ہے اور کسی کی پردہ پوشی کا سبب ہوتا ہے اور کسی کے حق میں گناہوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ وہ شخص جس کے لیے اس کا گھوڑا باعث اجر ہے، یہ وہ شخص ہے جس نے گھوڑے کو اللہ کے راستہ میں باندھ دیا۔ وہ چراگاہ یا باغ میں اس کی رسی دراز کر دیتا ہے۔ وہ اس چراگاہ یا باغ سے جو کچھ کھاتا ہے، وہ اس کی نیکیاں ہیں اور اگر وہ اس کی رسی کاٹ دے اور وہ کسی ایک ٹیلے یا دو ٹیلوں پر جائے تو اس کے چلنے اور اس کی لید کے بدلہ میں اس کی نیکیاں ہیں اور اگر وہ کسی دریا سے پانی پئے خواہ اس کا قصد پانی پلانے کا نہ ہو، پھر بھی اس میں اس کی نیکیاں ہیں اور اس گھوڑے میں اس شخص کے لیے اجر ہے۔ اور ایک شخص نے گھوڑے کو اس لیے رکھا کہ وہ اپنی ضروریات میں دوسروں سے مستغنی رہے اور ان سے سوال کرنے سے بچا رہے اور اس پر کسی کو سوار کرنے میں یا اس پر کس کا بوجھ لادنے میں اللہ کے حق کو فراموش نہ کرے تو یہ گھوڑا اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کا سبب ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جس نے اپنے گھوڑے کو فخر کرنے اور ریاکاری کے لیے رکھا تو یہ اس کے اوپر گناہ ہے اور رسول اللہ ﷺ سے گدھوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: مجھ پر ان کے متعلق کوئی خصوصی حکم نازل نہیں ہوا مگر یہ آیت جو تمام احکام کو جامع ہے:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ
يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (الزلزال: ۷-۸)

جس نے ایک ذرہ کے برابر نیکی کی وہ اس کی جزا پائے گا اور
جس نے ایک ذرہ کے برابر برائی کی وہ اس کی سزا پائے گا۔

(صحیح البخاری ج ۸، رقم الحدیث: ۳۷۵۶، صحیح مسلم، الزکوٰۃ: ۲۳، (۹۸۷) ۲۲۵۳، سنن النسائی ج ۶، رقم الحدیث: ۳۵۶۳)

اس حدیث میں نبی ﷺ نے ایک مخصوص اور جزئی حکم پر ایک عام اور کلی حکم سے استدلال کیا ہے اور اس حدیث میں پیش آمدہ مسائل اور جزئیات پر شرعی کلیات سے استدلال کرنے کی دلیل ہے۔

مجوزین قیاس کا آثار صحابہ اور اقوال علماء سے استدلال

علامہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور نبی ﷺ کی سنت سے مسائل کا استنباط کرنا اور اجتہاد کرنا اور امت کا اجماع برحق اور واجب ہے، اور اہل علم کے لیے لازماً فرض ہے۔ اس کے ثبوت میں نبی ﷺ کی احادیث اور صحابہ اور تابعین کی روایات موجود ہیں۔ ابو تمام مالکی نے کہا کہ قیاس کے جواز پر امت کا اجماع ہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ نے ربا الفضل میں چھ چیزوں (سونا، چاندی، گندم، جو، نمک اور کھجور) پر دوسری چیزوں کو قیاس کیا ہے اور ان میں بھی زیادتی کے ساتھ بیع کو حرام قرار دیا ہے اور جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بیعت لینے سے انکار کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ ہمارے دین میں آپ پر راضی ہو گئے تو ہم اپنی دنیا میں آپ پر کیوں راضی نہیں ہوں گے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امامت کو نماز پر قیاس کیا اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کو نماز پر قیاس کیا اور کہا: بہ خدا اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کو جمع کیا ہے میں ان میں تفریق نہیں کروں گا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام کے سامنے شراب کی حد کو حد قذف پر قیاس کیا اور فرمایا: انسان شراب کے نشہ میں ہڈیاں بکتا ہے اور ہڈیاں میں لوگوں پر تہمت لگاتا ہے لہذا اس کی حد بھی اسی کوڑے ہوگی، اور پھر اس حد پر تمام صحابہ کا اجماع ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے فرمایا: کہ جن نئے مسائل میں تم کو تشویش ہو اور کتاب اور سنت میں ان کی تصریح نہ ہو تو ان کے متعلق تم قیاس سے کام لو اور جو چیز حق کے مشابہ ہو اس پر عمل کرو۔ اس حدیث کو امام دارقطنی نے روایت کیا ہے۔ (سنن دارقطنی ج ۲، رقم الحدیث: ۴۴۵۲، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ شام کے علاقہ میں گئے۔ حتیٰ کہ جب وہ مقام سرخ میں پہنچے تو ان سے لشکر کے امراء نے ملاقات کی، جن میں حضرت ابو عبیدہ بن جراح اور ان کے اصحاب بھی تھے۔ انہوں نے یہ خبر دی کہ شام میں وبا پھیل چکی ہے۔ اب ان کا اس میں اختلاف ہوا کہ وہ شام میں داخل ہوں یا نہ ہوں۔ بعض صحابہ نے کہا: ہم ایک کام کے لیے آئے ہیں اور اس کام کو کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے اور بعض نے یہ کہا: کہ آپ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب ہیں اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ آپ ان کو وبا میں جھونک دیں۔ حضرت عمر نے ان لوگوں کو مجلس سے اٹھادیا اور انصار کو بلایا انہوں نے بھی مساجرین کی طرح مشورہ دیا اور ان میں بھی اسی طرح اختلاف ہوا۔ پھر آپ نے ان کو بھی اٹھادیا اور قریش کے عمر رسیدہ لوگوں کو بلایا۔ انہوں نے بالاتفاق یہ کہا کہ لوگوں کو اس بلا میں نہ ڈالیں اور واپس چلیں۔ پھر حضرت عمر نے اعلان کر دیا کہ ہم صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح نے کہا: کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں! حضرت عمر نے فرمایا: اے ابو عبیدہ! کاش تمہارے علاوہ کوئی اور شخص یہ بات کہتا! ہم اللہ کی ایک تقدیر سے اللہ کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہے ہیں۔ یہ بتاؤ اگر تمہارے پاس اونٹ ہوں اور تم ایک وادی میں جاؤ جس کے دو کنارے ہوں، ایک سرسبز ہو اور ایک بخر ہو۔ اگر تم سرسبز کنارے کی طرف جاؤ پھر بھی اللہ کی تقدیر کی طرف جاؤ گے اور اگر بخر کنارے کی طرف جاؤ پھر بھی اللہ کی تقدیر کی طرف جاؤ گے۔ اس وقت حضرت عبدالرحمن بن عوف آگئے جو کسی کام سے گئے ہوئے تھے انہوں نے کہا: اس کے متعلق میرے پاس ایک حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تمہیں کسی علاقہ میں بلا کا علم ہو تو وہاں نہ جاؤ۔ اور جب تم کسی علاقہ میں ہو اور وہاں وبا آجائے تو وہاں سے نہ نکلو۔ پھر حضرت عمر نے اللہ کی حمد کی اور وہاں سے واپس لوٹ گئے۔ (صحیح البخاری، ج ۷، رقم الحدیث: ۵۷۲۹، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

اس مضمون کی احادیث، آثار اور اقوال ائمہ بہ کثرت ہیں اور ان میں یہ دلیل ہے کہ قیاس دین کی ایک اصل اصیل ہے۔ مجتہدین اس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور علماء اس سے استدلال کرتے ہیں اور احکام کا استنباط کرتے ہیں۔ اس پر ہر دور کے علماء کا اجماع رہا ہے اور چند شاذ لوگوں کی مخالفت سے اس اجماع پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جو قیاس ممنوع اور مذموم ہے یہ وہ قیاس ہے جس کی اصل کتاب اور سنت میں موجود نہ ہو اور جو نصوص صریحہ سے متصادم ہو جیسے ابلیس کا قیاس تھا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے صریح حکم کے مقابلہ میں قیاس کیا۔ حالانکہ قیاس اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی مسئلہ میں صریح حکم نہ ہو۔ قرآن میں نہ حدیث میں۔ مخالفین قیاس نے اپنے موقف کی تائید میں جو روایات ضعیفہ اور اقوال رکیکہ پیش کیے ہیں بر تقدیر ثبوت ان کا محمل اس قسم کا قیاس ممنوع اور مذموم ہے جس کی اصل کتاب، سنت اور اجماع امت میں موجود نہ ہو۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج ۷، ص ۱۵۶-۱۵۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

قیاس کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ (النحشہ: ۲)

اے آنکھیں رکھنے والو! عبرت حاصل کرو۔

اس آیت میں قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ سب سے زیادہ بصیرت رکھنے والے تھے اور قیاس کی شرائط پر سب سے زیادہ مطلع تھے اور اس آیت میں آپ کو بھی قیاس کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ آپ بھی قیاس کرتے تھے۔ (المحصول، ج ۲، ص ۱۳۵۶-۱۳۶۳، مطبوعہ مکتبہ نزار معصن، ریاض، ۱۴۱۷ھ)

اور ہم اس سے پہلے اس بحث میں صحیح بخاری کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کے قیاس کرنے کے ثبوت میں حدیث پیش

کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرمایا تو یہاں سے اتر، تجھے یہاں گھنڈ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، سو نکل جا بے شک تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے (الاعراف: ۱۵)

شیطان کے ساتھ طویل مکالمہ اس کی فضیلت کا موجب نہیں

یہ اللہ تعالیٰ اور شیطان کے درمیان مکالمہ ہے۔ سورہ ص میں یہ مکالمہ بہت تفصیل کے ساتھ آیت ۷۴ سے آیت ۸۴ تک ذکر فرمایا ہے۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے: اے ابلیس تجھ کو اسے سجدہ کرنے سے کس نے منع کیا جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا، کیا تو نے (اب) تکبر کیا یا تو (ابتداء) تکبر کرنے والوں میں سے تھا؟ اس نے کہا میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا؟ فرمایا تو اس (جنت) سے نکل جا، کیونکہ بے شک تو مردود ہو گیا اور بے شک قیامت کے دن تک تجھ پر میری لعنت ہے؟ اس نے کہا اے میرے رب! پھر مجھے اس دن تک مہلت دے جس میں لوگ اٹھائے جائیں گے؟ فرمایا بے شک تو مہلت پانے والوں میں سے ہے؟ اس دن تک جس کی میعاد ہمیں معلوم ہے؟ اس نے کہا پس تیری عزت کی قسم میں ان سب کو ضرور بہکاؤں گا؟ ماسوا ان کے جو تیرے پر خلوص بندے ہیں؟ فرمایا یہ حق ہے اور میں حق ہی فرماتا ہوں؟ میں تجھ سے اور تیرے سب پیروکاروں سے جہنم بھر دوں گا۔

قرآن مجید میں اتنا طویل کلام کسی نبی کے ساتھ مذکور نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر اللہ کے ساتھ ہم کلام ہونے سے کوئی شرف اور مقام حاصل ہوتا ہے تو از روئے قرآن زیادہ شرف اور مقام تو ابلیس لعین کو حاصل ہو گیا! اس کے دو جواب ہیں۔ پہلا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے جو کلام فرمایا تھا، وہ براہ راست کلام فرمایا تھا اور ابلیس لعین سے فرشتوں کی وساطت سے کلام فرمایا تھا۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ طور انعام اور اکرام کلام فرمایا تھا اور ابلیس لعین سے یہ طور اہانت کلام فرمایا۔

ابلیس کو جنت سے اترنے کا حکم دیا گیا تھا یا آسمان سے!

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”یہاں سے اتر“۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری نے لکھا ہے: اس کا معنی یہ ہے کہ جنت سے اتر جا۔ کیونکہ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں تکبر کرنے والا یہاں نہیں رہتا۔ (جامع البیان، جز ۸، ص ۱۷۴، مطبوعہ دار الفکر)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ابلیس جنت عدن میں رہتا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اسی جنت میں پیدا کیا گیا تھا اور ابلیس کو اسی جنت سے نکلنے کا حکم دیا گیا تھا۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۱۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اور علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متونی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں: ایک تفسیر یہ ہے کہ تو آسمان سے اتر جا کیونکہ آسمان میں رہنے والے وہ فرشتے ہیں جو متواضع ہیں۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ تو اپنی موجودہ صورت سے دوسری صورت میں منتقل ہو کیونکہ تو نے آگ کی صورت پر فخر اور تکبر کیا سو اس کی صورت تاریک اور سیاہ بنا دی گئی اور اس کی روشنی اور چمک زائل ہو گئی۔ تیسری تفسیر یہ ہے کہ زمین سے سمندروں کے جزیروں کی طرف منتقل ہو جا اور اب وہ زمین میں صرف اس طرح داخل ہو سکے گا جس طرح چور داخل ہوتے ہیں۔ تاہم پہلی تفسیر راجح ہے۔

(الجامع الاحکام القرآن، جز ۷، ص ۱۵۶، مطبوعہ دار الفکر، ۱۳۱۵ھ)

شیخ اشرف علی تھانوی متونی ۱۳۶۳ھ اور مفتی محمد شفیع دیوبندی متونی ۱۳۹۶ھ نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ شیخ

تبیان القرآن

جلد چہارم

تھانوی نے لکھا ہے تو آسمان سے نیچے اتر، تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر کرے (خاص کر آسمان میں رہ کر۔

(بیان القرآن، ج ۱، ص ۳۱۵، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور، معارف القرآن، ج ۳، ص ۵۲۶، مطبوعہ ادارۃ المعارف، کراچی، ۱۹۹۳ء) علامہ قرطبی، شیخ تھانوی اور مفتی محمد شفیع نے جس تفسیر پر اعتماد کیا ہے کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اترنے کا حکم دیا تھا یہ معتزلہ کے مذہب کے مطابق ہے۔ کیونکہ معتزلہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ جنت بنی ہوئی ہے اور حضرت آدم کا پتلا جنت میں تیار کیا گیا اور ابلیس جنت میں رہتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ جنت کا ابھی بنانا عیب ہے۔ جنت کو قیامت کے بعد بنایا جائے گا۔ اس لیے امام رازی نے لکھا ہے کہ بعض معتزلہ نے کہا کہ ابلیس کو آسمان سے اترنے کا حکم دیا گیا تھا۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۱۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام رازی نے بعض معتزلہ فرمایا ہے، کیونکہ اکثر معتزلہ بھی اس کے قائل ہیں کہ جنت بنائی جا چکی ہے اور ابلیس کو جنت سے نکالا گیا تھا۔ مشہور معتزلی مفسر جبار اللہ زمخشری متوفی ۵۲۸ھ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو آسمان سے اترنے کا حکم دیا (کشاف، ج ۲، ص ۹۰) اور ایک دوسرے معتزلی مفسر قاضی ابو محمد عبد الحق بن غالب بن عطیہ اندلسی متوفی ۵۳۶ھ نے لکھا ہے اس کو جنت سے اترنے کا حکم دیا گیا تھا۔ (المحرر الوجیز، ج ۷، ص ۱۹، مطبوعہ مکتبہ تجاریہ، مکہ مکرمہ)

تواضع کرنے والے کے لیے سر بلندی اور تکبر کرنے والے کے لیے ذلت اور پستی

اس آیت میں مذکور ہے کہ ابلیس نے تکبر کیا اور اپنے آپ کو حضرت آدم سے بڑا اور اچھا سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت سے نکال دیا اور فرمایا تو ذلیل ہونے والوں میں سے ہے اور اس کے بعد کی آیت میں مذکور ہے کہ حضرت آدم نے (باوجود بھولے سے شجر ممنوع سے کھانے کے فعل پر) توبہ اور استغفار سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سر پر تاج کرامت رکھا اور زمین کی خلافت انہیں سونپ دی اور ان کو اپنا نائب بنایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے تواضع کرے، اللہ تعالیٰ اس کو بلند کرتا ہے اور جو تکبر کرے اور بڑا بنے تو اللہ تعالیٰ اس کو رسوا اور ذلیل کرتا ہے۔

حضرت عیاض بن یمار رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ تواضع کرو۔ حتیٰ کہ کوئی شخص دوسرے پر فخر نہ کرے۔ اور کوئی شخص کسی کے خلاف بغاوت نہ کرے۔ (صحیح مسلم، صفحہ الجند: ۶۳، (۲۸۶۵) ۷۰۷۳، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۸۹۵، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۲۱۳) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ سبحانہ کے لیے ایک درجہ تواضع کرتا ہے، اللہ اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے، اور جو شخص اللہ کے سامنے ایک درجہ تکبر کرتا ہے، اللہ اس کو ایک درجہ پست کر دیتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو سب سے نچلے طبقہ میں کر دیتا ہے۔

(سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۱۷۶، تہذیب تاریخ دمشق، ج ۳، ص ۲۰، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۰۷ھ) عائشہ بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا: اے لوگو! تواضع کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو اللہ کے لیے تواضع کرتا ہے، اللہ اس کو سر بلند کرتا ہے، اور فرماتا ہے سر بلند ہو اللہ تجھے سر بلند کرے۔ وہ خود اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہے، اور لوگوں کے نزدیک بہت عظیم ہوتا ہے۔ اور جو شخص تکبر کرتا ہے، اللہ اس کو ہلاک کر دیتا ہے اور فرماتا ہے: دفع ہو، وہ خود اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

(المعجم الاوسط، ج ۹، رقم الحدیث: ۸۳۰۳، مطبوعہ مکتبہ المعارف، الرياض، ۱۳۱۵ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اپنے مسلمان بھائی کے لیے تواضع کی،

اللہ اس کو سر بلند کرتا ہے اور جس نے اس پر بڑائی ظاہر کی، اللہ اس کو پست کر دیتا ہے۔

(المعجم الاوسط، ج ۸، رقم الحدیث: ۷۷۰۷، الترغیب والترہیب، ج ۳، ص ۵۳۵، مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۸۳)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے) جس نے میرے لیے اس طرح تواضع کی یہ فرما کر آپ نے اپنی ہتھیلی سے زمین کی طرف اشارہ کیا، میں اس کو اس طرح بلند کرتا ہوں۔ یہ فرما کر آپ نے اپنی ہتھیلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

(المعجم الصغیر، رقم الحدیث: ۶۳۵، مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۸۲، طبع قدیم، مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۱۵۷-۱۵۸، طبع جدید)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس نے کہا مجھے اس دن تک مہلت دے جس دن سب لوگ اٹھائے جائیں گے ○ فرمایا بے

شک تو مہلت پانے والوں میں سے ہے ○ (الاعراف: ۱۵-۱۳)

اس بات کی تحقیق کہ ابلیس لعین کو کتنی زندگی کی مہلت دی ہے

جس دن سب لوگ اٹھائے جائیں گے وہ حشر کا دن ہے اور اس دن کے بعد کسی کو موت نہیں آئے گی۔ ابلیس لعین نے

یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ وہ اس عمومی قاعدہ سے بچ جائے کہ ”ہر شخص کو موت آتی ہے“ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے: ”تو مہلت پانے والوں میں سے ہے ○“ اور سورہ الحج میں فرمایا ہے: ”تجھے وقت معین تک مہلت دی گئی ہے۔“

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِينَ ○ اِلَى يَوْمِ
الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ (الحجر: ۳۸-۳۷، ص ۸۱-۸۰) تک جس کا وقت (ہمیں) معلوم ہے۔

امام رازی، علامہ قرطبی اور دیگر مفسرین نے ایک روایت کی بناء پر یہ کہا ہے کہ الوقت المعلوم سے مراد نفعہ اولیٰ ہے۔

یعنی جب پہلا صور پھونکا جائے گا اور سب لوگوں کو موت آئے گی تو اس کو بھی موت آجائے گی اور ابلیس لعین کو بھی معلوم تھا کہ اس کو نفعہ اولیٰ تک مہلت دی گئی ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ابلیس لعین کو یوم حشر تک مہلت نہیں

دی لیکن اس کو وقت معلوم تک مہلت دی ہے اور یہ وہ دن ہے جس دن میں پہلا صور پھونکا جائے گا اور آسمان و زمین کی ہر چیز ہلاک ہو جائے گی۔ سو وہ بھی مرجائے گا۔ (جامع البیان، ج ۸، ص ۱۷۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

اگر وقت معلوم سے مراد پہلے صور پھونکنے کا دن ہو تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ابلیس لعین کو معلوم ہو گیا کہ وہ کس دن

مرے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کی سنت کے خلاف ہے۔ وہ کسی مخلوق کو اس بات پر مطلع نہیں فرماتا کہ اس نے کس دن مرنا ہے ورنہ انسان تمام عمر گناہ کرتا رہے اور مرنے سے صرف ایک دن پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کر لے تو اس طرح اگر

ابلیس لعین کو معلوم ہو جاتا کہ وہ اس دن مرے گا جس دن پہلا صور پھونکا جائے گا تو وہ ساری عمر لوگوں کو گمراہ کرتا رہتا اور مرنے سے ایک دن پہلے توبہ کر لیتا۔ امام رازی متوفی ۶۰۶ھ نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ وہ اس دن بھی

توبہ نہیں کرے گا۔ لہذا صرف موت کے دن کے علم سے اس کا گمراہ کرنے پر دلیر ہونا لازم نہیں آتا۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام کو اپنے معصوم ہونے کا علم ہے اور اس کے باوجود وہ کسی گناہ پر دلیر ہونا تو کجا اس کے قریب بھی نہیں جاتے۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۱۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

میں کہتا ہوں کہ اس اعتراض کا زیادہ واضح جواب یہ ہے کہ اگر ابلیس لعین کو یہ معلوم بھی ہو جائے کہ اس کو پہلے صور

پھونکنے کے دن تک مہلت دی گئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کو اپنے مرنے کا دن معلوم ہو جائے کیونکہ یہ کسی کو

معلوم نہیں کہ صور کب پھونکا جائے گا اور قیامت کب آئے گی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ وقت معلوم سے مراد نفعہ اولیٰ ہے۔ اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ابلیس لعین کو بھی یہ معلوم ہو کہ وقت معلوم سے مراد نفعہ اولیٰ ہے حتیٰ کہ اس کو اپنے مرنے کے دن کا علم ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چیز صرف اللہ تعالیٰ کے علم میں ہو اور تیسرا جواب یہ ہے کہ یہ صرف سدی کا قول ہے کہ وقت معلوم سے مراد نفعہ اولیٰ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہے اور نہ کسی صحیح سند سے ثابت ہے اور سدی غیر معتبر شخص ہے۔ اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو علم ہے کہ اس نے ابلیس لعین کو کب تک زندہ رہنے کی مہلت دی ہے۔ ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ اس کو یوم حشر تک کی مہلت نہیں دی گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس نے کہا قسم اس بات کی کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے تو میں بھی تیری صراط مستقیم پر ضرور لوگوں کی گھات میں بیٹھا رہوں گا۔ (الاعراف: ۱۶)

اغواء کا معنی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس لعین کا یہ قول نقل فرمایا کہ اے رب تو نے مجھے اغواء کیا یعنی گمراہ کیا۔ اس لیے ہم اغواء کا معنی بیان کر رہے ہیں۔ علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں: (اغواء غوی سے بنا ہے اور) جمالت کی وجہ سے کبھی تو انسان کا کوئی عقیدہ ہی نہیں ہوتا، صحیح نہ فاسد اور کبھی جمالت کی وجہ سے انسان کا فاسد عقیدہ ہوتا ہے اس کو غی اور غوایت کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ (النجم: ۲)

تمہارے پیغمبر نہ گمراہ ہوئے اور نہ ان کا فاسد عقیدہ تھا۔

اس کا معنی عذاب بھی ہے کیونکہ عذاب غوایت کے سبب سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (مریم: ۵۹)

وہ عنقریب عذاب میں ڈال دیے جائیں گے۔

اس کا معنی ناکامی، نامرادی اور محرومی بھی آتا ہے۔

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ (طہ: ۱۲۱)

آدم نے اپنے رب کی (بہ ظاہر) نافرمانی کی تو وہ (جنت سے) محروم ہو گئے۔

اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف اغوا کی نسبت ہو تو اس کا معنی گمراہی کی سزا دینا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

اور اگر میں تمہاری خیر خواہی چاہوں تو میری خیر خواہی

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِي إِنْ أَرَدْتُ أَنْ أَنْصَحَ

تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتی اگر اللہ نے تمہیں تمہاری گمراہی پر

لَكُمْ إِنْ كَانَ اللَّهُ يُرِيدُ أَنْ يُغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (ہود: ۳۳)

عذاب پہنچانے کا ارادہ فرمایا ہو حالانکہ وہ تمہارا رب ہے اور تم

اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

(المفردات، ج ۲، ص ۷۸، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۳۱۸ھ)

قرآن مجید اور احادیث میں اغواء کا لفظ زیادہ تر گمراہ کرنے کا معنی میں وارد ہے۔ احادیث میں یہ مثالیں ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی اس نے

مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ رَشِدَ وَمَنْ

ہدایت پالی اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ گمراہ ہو گیا۔

يَعْصِمُهَا فَقَدْ غَوَىٰ.

(صحیح مسلم، الجمعہ، رقم الحدیث: ۳۸، مسند احمد، ج ۳، ص ۲۵۶، دار الفکر، طبع قدیم)

حدیث معراج میں ہے حضرت جبرئیل نے آپ سے کہا:

لواخذت الخمر غوت امتك۔
اگر آپ خمر (انگور کی شراب) لے لیتے تو آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔

(صحیح البخاری، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۹۳، صحیح مسلم، الایمان، ۲۷۲، مسند احمد، ج ۲، ص ۲۸۲)
ابلیس لعین کا جبر اور قدر میں حیران ہونا اور جبر و قدر میں صحیح مذہب
اللہ تعالیٰ نے شیطان کے اس قول کا ذکر سورۃ الحجر اور سورہ ص میں بھی فرمایا ہے:

قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي
الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ
مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ (الحجر: ۳۹-۴۰)
اس نے کہا اے میرے رب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا تو
میں ضرور ان کے لیے زمین میں (برے کاموں کو) خوش نمائنا
دوں گا اور میں ضرور ان سب کو گمراہ کر دوں گا ۝ ماسوا تیرے
ان بندوں کے جو صاحب اخلاص ہیں ۝

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا
عِبَادَكَ مِنْهُمْ الْمُخْلِصِينَ (ص: ۸۲-۸۳)
اس نے کہا تیری عزت کی قسم میں ضرور ان سب کو گمراہ کر
دوں گا ۝ ماسوا تیرے ان بندوں کے جو صاحب اخلاص ہیں۔

ابلیس لعین نے اپنے کلام میں اللہ تعالیٰ کی طرف بھی گمراہ کرنے کی نسبت کی ہے اور اپنی طرف بھی گمراہ کرنے کی نسبت
کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جبر کا عقیدہ رکھتا تھا۔ یعنی ہر کام اللہ کرتا ہے
اور مخلوق مجبور محض ہے اور اپنی طرف گمراہ کرنے کی نسبت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدر کا عقیدہ رکھتا تھا یعنی انسان اور جن ہر
فعل کے خالق ہیں اور ان کے افعال میں اللہ تعالیٰ کا کوئی دخل نہیں ہے، سو وہ جبر اور قدر میں متردد تھا اور اس وادی میں حیران اور
سرگشتہ تھا۔

اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی فعل کا کسب اور ارادہ انسان کرتا ہے اور اس ارادہ کے مطابق اللہ تعالیٰ اس فعل کو
پیدا فرماتا ہے۔ سو اللہ عزوجل خالق ہے اور انسان کاسب اور صاحب اختیار ہے اور ادب کا تقاضا یہ ہے کہ انسان نیک اور اچھے
افعال کی نسبت اللہ عزوجل کی طرف کرے اور برے افعال کی نسبت اپنے نفس کی طرف کرے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے فرمایا:

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ (الشعراء: ۸۰) اور جب میں بیمار ہوں تو وہی شفا عطا فرماتا ہے۔

ابلیس لعین نے عدا نافرمانی کی اور تکبر کیا اور پھر کہا بما اغويتني تو نے مجھے گمراہ کیا اور حضرت آدم علیہ السلام سے
بھولے سے خطا ہو گئی پھر بھی عرض کیا ربنا ظلمنا انفسنا اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ابلیس لعین کی
اکڑ اور بے ادبی کی وجہ سے اس کو راندہ درگاہ کیا اور قیامت تک کے لیے اس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈالا اور حضرت آدم علیہ
السلام کے ادب اور ان کی تواضع کی وجہ سے ان کے سر پر تاج کرامت رکھا اور زمین پر ان کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اس نے کہا) پھر میں لوگوں کو بہکانے کے لیے ضرور ان کے سامنے اور ان کے پیچھے سے اور
ان کے دائیں اور بائیں سے آؤں گا اور تو اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔ (الاعراف: ۱۷)

ابلیس لعین کا صراط مستقیم سے بہکانے کی سعی کرنا
یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ شیطان کو علم تھا کہ صراط مستقیم کیا ہے اور وہ لوگوں کو اس صحیح رستہ اور منجھ تویمت

بھکانے کے لیے دن رات ہمہ وقت کوشش کرتا رہتا ہے اور اس سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔

امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت برہ بن ابی فاکہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شیطان ابن آدم کے تمام راستوں میں بیٹھ جاتا ہے اور اس کو اسلام کے راستے سے بھکانے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے تم اسلام قبول کرو گے اور اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ دو گے؟ وہ شخص شیطان کی بات نہیں مانتا اور اسلام قبول کر لیتا ہے۔ پھر اس کو ہجرت کرنے کے راستے سے درغلانے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے تم ہجرت کرو گے اور اپنے وطن کی زمین اور آسمان کو چھوڑ دو گے! اور مہاجر کی مثال تو کھونٹے سے بندھے ہوئے اس گھوڑے کی طرح ہے جو ادھر سے ادھر بھاگ رہا ہو اور اس کھونٹے کی حدود سے نکل نہ سکتا ہو۔ وہ شخص اس کی بات نہیں مانتا اور ہجرت کر لیتا ہے۔ پھر شیطان اس کے جہاد کے راستے میں بیٹھ جاتا ہے وہ اس شخص سے کہتا ہے کہ تم جہاد کرو گے اور اپنی جان اور مال کو آزمائش میں ڈالو گے، اگر تم جہاد کے دوران مارے گئے تو تمہاری بیوی کسی اور شخص سے نکاح کر لے گی اور تمہارا مال تقسیم کر دیا جائے گا۔ وہ شخص شیطان کی بات نہیں مانتا اور جہاد کرنے چلا جاتا ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سو جس شخص نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر یہ حق ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کر دے اور جو مسلمان قتل کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر اس کو جنت میں داخل کرنا ہے اور جو مسلمان غرق ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر اس کو جنت میں داخل کرنا ہے اور جس مسلمان کو اس کی سواری نے ہلاک کر دیا تو اللہ کے ذمہ کرم پر اس کو جنت میں داخل کرنا ہے۔

(سنن نسائی، ج ۶، رقم الحدیث: ۳۱۳۳، صحیح ابن حبان، ج ۱۰، رقم الحدیث: ۳۵۹۳، مسند احمد، ج ۳، ص ۲۸۳، دار الفکر، طبع قدیم، مسند احمد، ج ۵، رقم الحدیث: ۱۵۹۵۸، دار الفکر، طبع جدید، مسند احمد، ج ۱۲، رقم الحدیث: ۱۵۹۰۰، دار الحدیث القاہرہ، شیخ احمد شاکر نے اس کے تحت لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ المعجم الکبیر، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۵۵۸، موارد الظمان، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۶۰۱۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ الاصابہ، ج ۲، ص ۱۵، دار الفکر، بیروت، ۱۳۹۸ھ)

ابلیس لعین کا چار جہات سے حملہ آور ہونا اور اس سے تدارک کی دعا

ابلیس لعین نے کہا تھا کہ میں (لوگوں کو بھکانے کے لیے) ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں اور بائیں سے آؤں گا۔ اس کی حسب ذیل تفسیریں ہیں:

حضرت ابن عباس نے فرمایا: سامنے سے مراد یہ ہے کہ میں ان کی دنیا کے متعلق دوسو ڈالوں گا۔ اور پیچھے سے مراد یہ ہے کہ ان کی آخرت کے متعلق دوسو ڈالوں گا اور دائیں سے مراد یہ ہے کہ ان کے دین میں شبہات ڈالوں گا اور بائیں سے مراد یہ ہے کہ ان کو گناہوں کی طرف راغب کروں گا۔

قادر نے کہا کہ سامنے سے آنے کا معنی یہ ہے کہ میں ان کو یہ خبر دوں گا کہ مرنے کے بعد اٹھنا ہے، نہ جنت ہے، نہ دوزخ ہے اور پیچھے کا معنی یہ ہے کہ میں ان کے لیے دنیا کو مزین کروں گا اور انہیں اس کی دعوت دوں گا۔ دائیں جانب کا معنی یہ ہے کہ میں ان کی نیکیوں کو ضائع کرنے کی کوشش کروں گا اور بائیں جانب کا معنی یہ ہے کہ میں ان کے لیے برائیوں کو مزین کروں گا اور انہیں ان کی دعوت دوں گا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے شیطان کو ابن آدم کے اوپر سے آنے کی کوئی راہ نہیں دی کیونکہ اوپر سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔

(جامع البیان، جز ۷، ص ۱۹۱-۱۷۹، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

چونکہ ابلیس لعین انسان پر سامنے پیچھے دائیں اور بائیں سے حملہ آور ہوتا ہے اس لیے نبی ﷺ نے اس کے تدارک کے لیے اپنے عمل سے ہمیں اس دعا کی تعلیم فرمائی ہے۔
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ صبح اور شام کے وقت ان دعاؤں کو کبھی ترک نہیں فرماتے تھے:

اے اللہ! میں تجھ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کا سوال کرتا ہوں، اے اللہ! میں اپنے دین اور اپنی دنیا اور اپنے اہل اور اپنے مال میں تجھ سے عفو اور عافیت کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! میرے عیوب پر پردہ رکھ اور جن چیزوں کا مجھے خوف ہے ان سے مجھے محفوظ رکھ، اے اللہ! مجھے میرے سامنے سے اور میرے پیچھے سے اور میرے دائیں سے اور میرے بائیں سے اور میرے اوپر سے محفوظ رکھ اور میں اس سے تیری عظمت کی پناہ میں آتا ہوں کہ میں اپنے نیچے سے ہلاک کیا جاؤں۔
سعید بن جبیر نے کہا اس سے مراد زمین میں دھنسا ہے۔

(سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۵۰۷۳، سنن نسائی، ج ۸، رقم الحدیث: ۵۵۳۳، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۸۷۱، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۹۶۱۱، مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۱۰، ص ۲۳۰، مسند احمد، ج ۲، ص ۲۵، المعجم الکبیر، ج ۱۲، رقم الحدیث: ۱۳۲۹۶، المستدرک، ج ۱، ص ۵۱۸-۵۱۷، موارد الظمآن، ج ۲، رقم الحدیث: ۲۳۵۶)

ابلیس لعین کے اس دعویٰ کا سبب کہ اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوں گے اس کے بعد ابلیس لعین نے اللہ تعالیٰ سے کہا اور تو اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔
ابلیس نے انسانوں کے متعلق جو گمان کیا تھا کہ ان میں سے اکثر انسان ناشکرے اور کافر ہوں گے، سو انسانوں نے بعد میں اس کے گمان کو سچ کر دکھایا اور فی الواقع اکثر انسان ناشکرے اور کافر ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَقَدْ صَدَقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ
الْاَفْرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (سبا: ۲۰)
اور بے شک ابلیس نے ان پر اپنا گمان سچ کر دکھایا سو مومنوں کے ایک گروہ کے سوا سب انسانوں نے اس کی پیروی کی۔

اب یہاں پر ایک یہ بحث ہے کہ ابلیس نے یہ قول یقین اور جزم سے کیا تھا یا یہ اس کا محض گمان تھا۔ اگر یہ اس نے یقین سے کہا تھا تو اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے کسی طرح یہ لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ یا اس نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول سن لیا تھا:

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (سبا: ۱۳)
میرے شکر گزار بندے بہت کم ہیں۔
یا جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ خبر دی کہ میرے شکر گزار بندے بہت کم ہیں تو اس نے سن لیا تھا۔ یا اس نے فرشتوں سے یہ بات سن لی تھی یا جب فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کیا تو اس کو زمین میں بنائے گا جو زمین میں فساد کرے گا تو اس سے اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اکثر انسان شکر گزار نہیں ہوں گے۔

اور یا یہ قول محض ابلیس کا گمان تھا اور گمان کا منشاء یہ تھا کہ جب وہ حضرت آدم علیہ السلام کو بہکا سکتا ہے تو ان کی اولاد کو بہکانا تو اس کے لیے آسان تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کی انیس قوتیں ہیں جن کا تعلق لذات جسمانیہ سے ہے اور ایک قوت عقل ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت پر ابھارتی ہے۔ وہ انیس قوتیں یہ ہیں: پانچ حواس ظاہرہ، پانچ حواس باطنہ، اور شہوت اور غضب، اور سات دیگر قوتیں ہیں: جاذبہ، ممسکہ، ہاضمہ، دافعہ، قاذفہ، نامیہ اور مولدہ۔ اور ابلیس لعین کے نزدیک یہ آسان تھا کہ وہ انیس

قوتوں کے تقاضوں کو بھڑکائے اور ایک قوت کے تقاضوں کو کم کرے۔ اس لیے اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اور تو اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرمایا یہاں سے ذلیل اور دھتکارا ہوا ہو کر نکل جا، البتہ جو لوگ تیری پیروی کریں گے میں تم سب سے دوزخ کو بھردوں گا۔ (الاعراف: ۱۸)

کیا تمام اہل بدعت اور گمراہ فرقے دوزخی ہیں؟

جب ابلیس لعین نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ چیلنج دیا کہ وہ اصحابِ اخلاص کے سوا سب لوگوں کو گمراہ کر دے گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہاں سے مذعوم اور مدحور ہو کر نکل جا۔ علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ مذعوم کا معنی ہے مذموم، جس کی مذمت کی گئی ہو اور مدحور کا معنی ہے دور کیا ہوا۔ (المفردات، ج ۱، ص ۲۲۱، ۲۲۳، طبع بیروت) وہ کس چیز سے دور کیا ہوا ہے، مفسرین نے اس کی متقارب تفسیریں کی ہیں، یعنی اللہ کی رحمت سے دور کیا ہوا، یا جنت سے دور کیا ہوا یا توفیق سے دور کیا ہوا۔

امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ تمام اصحابِ بدعات اور اصحابِ ضلالت جہنم میں داخل ہوں گے کیونکہ وہ سب ابلیس کے تابع ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: البتہ جو لوگ تیری پیروی کریں گے میں تم سب سے دوزخ کو بھردوں گا۔ (الاعراف: ۱۸)

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۱۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ ابلیس کے پیروکاروں سے جہنم کو بھردے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ وہ ہر پیروکار کو جہنم میں ڈال دے گا۔ اس لیے جو اہل بدعت اور اصحابِ ضلالت اپنی بدعت اور ضلالت سے کفر تک پہنچ گئے ہوں گے وہ دوام اور خلود کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے اور جن کی بدعت اور ضلالت کفر سے کم درجہ کی ہوگی، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہیں، وہ چاہے تو انہیں کچھ سزا دینے کے بعد دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل فرمادے گا اور اگر وہ چاہے تو انہیں ابتداء جنت میں داخل کر دے گا۔ جس طرح فاسق اور گناہ کبیرہ کے مرتکبین بھی ابلیس کے پیروکار ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ تمام فاسق کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا۔ بعض فاسق کو کچھ عرصہ کے عذاب کے بعد دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کر دے گا اور بعض فاسق کو اپنے فضل سے معاف فرمادے گا اور بعض کو نبی ﷺ کی شفاعت سے معاف فرمائے گا اور ان کو دوزخ میں نہیں ڈالے گا اور ابتداء جنت میں داخل فرمادے گا۔

وَيَا دِمْرَاسُكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا

اور اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ (دونوں) جنت میں رہو، سو جہاں سے چاہو تم دونوں کھاؤ،

وَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۹﴾

اور (قصداً) اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ

پھر دونوں کے دلوں میں شیطان نے دوسرے ڈالا، تاکہ (انہما کار) ان دونوں کی جو شرم گاہیں ان سے چھپائی ہوئی تھیں

سَوَاتِيهْمَا وَقَالَ مَا تَهْكِمَا رَبُّكُمَا عَنِ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا

ان کو ظاہر کر دے اور اس نے کہا تمہارے رب نے اس درخت سے تم کو صرف اس لیے روکا ہے کہ

أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ﴿۲۵﴾ وَقَاسَمَهُمَا

کہیں تم فرستے بن جاؤ، یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ ○ اور اس نے ان سے

إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ﴿۲۶﴾ فَذَلَّهُمَا بِعُرْوَةٍ فَلَمَّا ذَاقَا

قسم کھا کر کہا بیشک میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں ○ پھر فریبکے انہیں (اپنی طرف) جھکایا پس جب انہوں نے

الشَّجَرَةَ بَدَاتُ لَهُمَا سَوَاتِيهْمَا وَطَفِقَا يَخْصِفْنَ عَلَيْهْمَا

اس درخت سے چکھاتو ان کی شرمگاہیں ان کے لیے ظاہر ہو گئیں اور وہ اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑنے لگے،

مِنْ وَّرَاقِ الْجَنَّةِ ط وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنِ

اور ان کے رب نے ان سے پکار کر فرمایا: کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے

تِلْكَ الشَّجَرَةَ وَأَقُلُّ لَكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿۲۷﴾

منع نہیں کیا تھا، اور تم دونوں سے یہ نہ فرمایا تھا کہ بیشک شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے؛ ○

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ

دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان

مِنَ الْخَسِرِينَ ﴿۲۸﴾ قَالَ اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدَاوَةٌ وَلَكُمْ فِي

اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ○ فرمایا اترو، تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہیں، اور تمہارے لیے

الْأَرْضِ مُمْسَقَةٌ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ﴿۲۹﴾ قَالَ فِيهَا تَحْيَوْنَ

زمین میں ٹھیرنے کی جگہ ہے اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے ○ فرمایا تم اسی زمین میں زندگی گزارو گے،

وَفِيهَا تَمُوتُونَ وَمِنْهَا تُخْرَجُونَ ﴿۳۰﴾

اور اسی زمین میں مردے اور اسی زمین سے (قیامت کے دن) نکالے جاؤ گے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ (دونوں) جنت میں رہو، سو جہاں سے چاہو تم دونوں کھاؤ اور (قصد) اس درخت کے قریب نہ جانا اور نہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ (الاعراف: ۱۹)

ابلیس لعین کو جنت سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حضرت حوا کو جنت میں سکونت عطا فرمائی اور ایک معین درخت سے ان کو کھانے سے منع فرمایا اور اس ممانعت کا معنی یہ تھا کہ وہ قصد اور ارادہ سے اس درخت سے نہ کھائیں، اگر وہ بالقرض قصد اور ارادہ سے اس درخت سے کھاتے تو وہ معاذ اللہ ظالموں میں سے ہو جاتے لیکن انہوں نے نسیان اور اجتہادی خطا سے اس درخت سے کھایا اس لیے ظالموں سے نہیں تھے اور نہ ان کا یہ فعل گناہ تھا اور ان کا اس پر توبہ اور استغفار کرنا محض ان کی تواضع اور انکسار تھا۔ اور یہ حضرت آدم علیہ السلام کا مقام بلند تھا اور ان کے دل میں خوف خدا کا غلبہ تھا کہ بھولے سے ممنوع کام کیا پھر بھی توبہ اور استغفار کرتے رہے۔ اس کی پوری تفصیل اور تحقیق کے لیے البقرہ: ۳۵ کا مطالعہ فرمائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر دونوں کے دلوں میں شیطان نے وسوسہ ڈالا تاکہ (انجام کار) ان دونوں کی جو شرم گاہیں ان سے چھپائی ہوئی تھیں، ان کو ظاہر کر دے، اور اس نے کہا تمہارے رب نے اس درخت سے تم کو صرف اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے بن جاؤ، یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ اور اس نے ان سے قسم کھا کر کہا بے شک میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں، پھر فریب سے انہیں (اپنی طرف) جھکالیا، پس جب انہوں نے اس درخت سے چکھاتو ان کی شرم گاہیں ان کے لیے ظاہر ہو گئیں، اور وہ اپنے اوپر جنت کے پتے جوڑنے لگے اور ان کے رب نے ان سے پکار کر فرمایا: کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا؟ اور تم دونوں سے یہ نہ فرمایا تھا کہ بے شک شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے؟ اور دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اور اگر تو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے، فرمایا اترو، تم میں سے بعض، بعض کے دشمن ہیں، اور تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک مدت تک فائدہ اٹھانا ہے، فرمایا تم اسی زمین میں زندگی گزارو گے، اور اسی زمین میں مرو گے اور اسی زمین سے (قیامت کے دن) نکلے جاؤ گے، (الاعراف: ۲۵-۲۰)

ابلیس کی وسوسہ اندازی، حضرت آدم کا زمین پر آنا اور توبہ کرنا

اس جگہ یہ سوال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں تھے اور ابلیس لعین کو جنت سے نکال دیا گیا تھا تو اس نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا کے دلوں میں وسوسہ کس طرح ڈالا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے کے لیے دونوں کا ایک جگہ پر ہونا ضروری نہیں ہے۔ ابلیس زمین پر رہتے ہوئے آسمان اور جنت میں رہنے والوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر سکتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا جنت کے دروازے کے قریب کھڑے تھے اور ابلیس لعین جنت کے دروازہ پر کھڑا تھا اور اس نے وہاں سے وسوسہ ڈالا اور تیسرا جواب ایک ضعیف روایت پر مبنی ہے۔ یہ وہب بن منبہ کی روایت ہے۔ جس کو امام عبدالرزاق نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور امام ابن جریر، علامہ قرطبی اور حافظ ابن کثیر نے اس کو اپنی اپنی تفاسیر میں درج کیا ہے اور دوسرے مفسرین نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے:

امام عبدالرزاق بن ہمام متوفی ۲۱۱ھ اپنی سند کے ساتھ وہب بن منبہ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ کو جنت میں رکھا اور ان کو اس درخت سے منع کیا، اس درخت کی شاخیں بہت گھنی تھیں اور فرشتے اپنے دوام اور خلود کے لیے اس درخت سے کھاتے تھے جب ابلیس لعین نے ان کو درغلانے کا ارادہ کیا تو سانپ کے پیٹ میں داخل ہو گیا۔ اس وقت اونٹ کی طرح سانپ کی چار ٹانگیں تھیں اور وہ اللہ کی مخلوق میں بہت حسین جانور تھا۔ سانپ جنت میں

داخل ہوا تو ابلیس اس کے پیٹ سے نکل آیا اور اس نے اس ممنوع درخت سے پھل توڑا اور اس کو حضرت حوا کے پاس لے کر آیا اور ان سے کہا دیکھو یہ کیسے درخت کا پھل ہے۔ اس کی خوشبو کیسی عمدہ ہے۔ اس کا کتنا لذیذ ذائقہ ہے اور کتنا حسین رنگ ہے۔ حضرت حوا نے اس درخت سے کھالیا۔ پھر اس کو حضرت آدم کے پاس لے کر گئیں اور کہا دیکھیں اس کی کتنی نفیس خوشبو ہے، کتنا لذیذ ذائقہ ہے اور کتنا حسین رنگ ہے۔ حضرت آدم نے بھی اس سے کھالیا۔ پھر ان دونوں کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں۔ پھر حضرت آدم (شرم سے) درخت (کی گھنی شاخوں) میں داخل ہو گئے تو ان کو ان کے رب نے ندا فرمائی اے آدم! تم کہاں ہو؟ انہوں نے کہا: اے رب! میں یہاں ہوں۔ فرمایا تم اس سے باہر نہیں آتے؟ عرض کیا: اے رب مجھے تجھ سے حیا آتی ہے! پھر حوا سے فرمایا: تم نے میرے بندہ کو دھوکا دیا! تم کو جب بھی حمل ہو گا تو تم کو تکلیف ہوگی اور جب بھی وضع حمل کا وقت آئے گا تو تمہیں موت کا مزہ آجائے گا! اور سانپ سے فرمایا تم اس ملعون کو اپنے پیٹ میں داخل کر کے لے گئے جس نے میرے بندہ کو دھوکا دیا! اب تم پیٹ کے بل چلتے رہو گے اور تمہارا رزق صرف مٹی ہوگا! تم بنو آدم کے دشمن رہو گے اور بنو آدم تمہارے دشمن ہوں گے۔ تم ان کو ڈسنے کی کوشش کرو گے اور وہ تم کو پتھروں اور لانیوں سے ہلاک کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہب سے کسی نے پوچھا کیا فرشتے بھی کھاتے ہیں؟ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

(تفسیر عبدالرزاق 'ج' ۱، ص ۳۱۶، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۱۱ھ، جامع البیان 'ج' ۱، ص ۳۳۶-۳۳۷، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ، الجامع لاحکام القرآن 'ج' ۱، ص ۲۹۵-۲۹۶، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ وہ درخت جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور ان کی زوجہ کو منع فرمایا تھا، گندم کا تھا۔ جب ان دونوں نے اس درخت سے کھالیا تو ان کی شرم گاہیں ظاہر ہو گئیں۔ وہ ان کو جنت کے بتوں سے چھپانے لگے۔ وہ انجیر کے درخت کے پتے تھے جو ایک دوسرے سے چپے ہوئے تھے۔ حضرت آدم پیٹھ موڑ کر جنت کی طرف چل دیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ندا فرمائی: اے آدم! کیا تم مجھ سے بھاگ رہے ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں! اے رب! لیکن اے رب تیری عزت کی قسم! مجھے یہ گمان نہ تھا کہ کوئی شخص تیرے نام کی جھوٹی قسم کھا سکتا ہے، فرمایا میں تم کو ضرور زمین کی طرف اتار دوں گا اور تم کو روزی مشقت سے حاصل ہوگی۔ پھر حضرت آدم اور حضرت حوا کو زمین کی طرف اتارا گیا اور انہیں لوہے کی صنعت کی تعلیم دی اور انہیں کھیتی باڑی کا حکم دیا۔ انہوں نے فصل اگائی اور اس میں پانی دیا۔ پھر فصل پکنے کے بعد دانہ کو کوٹا اور اس کو بھوسے سے الگ کیا، پھر اس کو پیسا، پھر آٹا گونداھا، پھر روٹی پکائی۔ (جامع البیان 'جز' ۸، ص ۱۸۸-۱۸۷، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت آدم نے اس درخت سے کھالیا تو ان سے کہا گیا آپ نے اس درخت سے کیوں کھالیا؟ جس سے میں نے آپ کو منع فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا: مجھ سے حوا نے کہا تھا۔ فرمایا: میں نے اس کو یہ سزا دی ہے کہ اس کو حمل بھی مشقت سے ہو گا اور وضع حمل بھی مشقت سے ہو گا۔ اس وقت حوا رونے لگیں۔ ان سے کہا گیا کہ تم اور تمہاری اولاد روتی رہے گی۔ (جامع البیان 'جز' ۸، ص ۱۸۹، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

قنادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! اگر میں تجھ سے توبہ اور استغفار کروں؟ فرمایا پھر میں تمہیں جنت میں داخل کر دوں گا اور رہا ابلیس تو اس نے اللہ تعالیٰ سے توبہ کا سوال نہیں کیا بلکہ مہلت کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو وہ چیز عطا فرمادی جس کا اس نے سوال کیا تھا۔

ضحاک نے بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جن کلمات کی تلقین کی تھی، وہ یہی تھے ربنا ظلمنا

انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنكونن من الخسرين O

(جامع البيان 'جز ۸' ص ۱۹۰، دار الفکر، بیروت ۱۳۱۵ھ)

حضرت آدم کے فرشتہ اور دائی بننے کی طمع پر اعتراضات اور ان کے جوابات

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ ابلیس لعین نے حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں فرشتہ بننے کی خواہش کس طرح پیدا کی۔ جبکہ حضرت آدم علیہ السلام دیکھ چکے تھے کہ فرشتوں نے تو حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت کا اعتراف کیا تھا اور ان کو سجدہ کیا تھا۔ نیز کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فرشتے نبی سے افضل ہوتے ہیں ورنہ حضرت آدم فرشتے بننے کی طمع میں اس ممنوع درخت سے نہ کھاتے!

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات مفعول میں وہ وصف ہوتا ہے جو افضل میں نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم فرشتہ اس لیے بنا چاہتے ہوں کہ ان کو بھی فرشتوں کی طرح قدرت اور قوت حاصل ہو جائے یا وہ بھی فرشتوں کی طرح اپنی خلقت میں جو ہر نورانی ہو جائیں یا وہ بھی فرشتوں کی طرح عرش اور کرسی کے ساکنین میں سے ہو جائیں!

دوسرا سوال یہ ہے کہ ابلیس لعین نے یہ کہا تھا کہ آپ اس درخت سے کھا کر ہمیشہ رہنے والوں میں سے ہو جائیں گے اور حضرت آدم نے اس کی طمع میں اس درخت سے کھایا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ کچھ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان پر موت نہیں آئے گی اور اس سے موت اور قیامت کا انکار لازم آتا ہے اور یہ کہ دوام اور خلود تو حشر کے بعد ہوگا۔ حشر سے پہلے خلود کا عقیدہ رکھنا کفر ہے سو موت سے اور قیامت سے پہلے خلود کی طمع کرنا کفر ہے اور اس سے العیاذ باللہ حضرت آدم علیہ السلام کا کفر لازم آتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ چند لوگوں کے خلود سے قیامت کا انکار لازم نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ
وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ (الزمر: ۶۸)

اور صور پھونکا جائے گا تو سب آسمانوں والے اور زمینوں والے بے ہوش ہو جائیں گے مگر جنہیں اللہ چاہے گا۔

اس اعتراض کا دوسرا جواب یہ ہے کہ خلود کا معنی طویل زمانہ بھی ہو سکتا ہے حضرت آدم علیہ السلام نے یہی معنی مراد لیا ہو۔ اور اس کا تیسرا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا نے یہ یقین نہیں کیا تھا کہ کچھ لوگ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان پر موت نہیں آئے گی اور نہ یہ ان کا گمان تھا انہوں نے محض و فور شوق سے اس شجر ممنوع سے کھایا۔

آیا شجر ممنوع سے کھانا گناہ تھا؟ اگر گناہ نہیں تھا تو سزا کیوں ملی؟ اور آدم و ابلیس کے

معرکہ میں کون کامیاب رہا؟

ایک سوال یہ ہے کہ اس درخت سے کھانے کی ممانعت تزییما نہیں تھی، تحریماً تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ تم دونوں نے (قصداً) اس درخت سے کھایا تو تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے اور جس کام کا ارتکاب ظلم ہو وہ گناہ کبیرہ ہوتا ہے۔ اور گناہ کبیرہ عصمت نبوت کے منافی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ابلیس لعین سے حضرت آدم علیہ السلام کا مکالمہ ہوا اور ان کے دل میں اس کو کھانے کا شوق پیدا ہوا تو فور شوق میں وہ یہ بھول گئے کہ اس سے کھانے کی ممانعت تحریماً تھی اور انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ یہ ممانعت تزییما تھی۔ اس لیے آپ کا اس درخت سے کھانا اجتہادی خطا اور نسیان پر مبنی تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ عَاهَدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلِ فَنَسِيَ
اور بے شک ہم نے اس سے پہلے آدم سے اس درخت

وَلَمْ نَجِدْكَ عَزْمًا (طہ: ۱۱۵)

کے قریب نہ جانے کا) عمد لیا تھا، سو وہ بھول گئے اور ہم نے ان کا (نافرمانی کا) قصد نہ پایا۔

اور اجتہادی خطا اور نسیان گناہ نہیں ہے۔ لہذا حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت پر کوئی حرف نہیں آیا اور ان کا توبہ اور استغفار کرنا ان کی تواضع اور انکسار ہے، اور ان کی ندامت اور شرمندگی اس وجہ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس ممانعت کو کیوں بھول گئے، اس کو یاد کیوں نہیں رکھا۔ ہرچند کہ بھول چوک سے بچے رہنا انسان کی قدرت اور اختیار میں نہیں ہے لیکن ان کے بلند مقام کے اعتبار سے وہ یہ سمجھے تھے کہ ایک آن کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کو یاد نہ رکھنا یا کسی چیز کے شوق سے اس قدر مغلوب ہونا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یاد نہ رہے۔ یہ بھی تقصیر ہے اور وہ اسی بنا پر ندامت اور شرمندگی سے روتے رہے اور اللہ تعالیٰ سے توبہ اور استغفار کرتے رہے۔ تاہم آپ کا یہ فعل گناہ نہیں تھا۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ پھر آپ کو سزا کیوں ملی اور کپڑے کیوں اتر گئے اور جنت سے کیوں اتارے گئے سو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس درخت سے کھانے کا لازمی اثر اور نتیجہ تھا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھولے سے زہر کھالے تو ہرچند کہ اس کا یہ فعل گناہ نہیں ہے لیکن زہر کھانے کے بعد لازماً اس کی موت واقع ہو جائے گی کیونکہ زہر کھانے کا لازمی اثر اور نتیجہ موت ہے۔ سو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس شجر کو بے لباس ہونے کا سبب بنایا تھا تو خواہ آپ نے بھولے سے اس شجر کو کھلایا، لیکن بے لباس ہونے کا لازمی اثر اور نتیجہ اس پر مرتب ہو گیا۔ یہ کوئی سزا نہیں تھی۔ اور رہا جنت سے اتر کر زمین پر آنا تو وہ آپ نے بہر حال زمین پر آنا تھا۔ کیونکہ آپ کو پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ آپ زمین پر اللہ کے خلیفہ اور نائب بنیں، اور یہ نہ کہا جائے کہ اس معرکہ میں ابلیس کامیاب ہو گیا اور آپ ناکام ہو گئے۔ کیونکہ ابلیس تو جنت میں صرف آپ کا عارضی قیام برداشت نہیں کر رہا تھا اور آپ زمین پر اس لیے آئے کہ زمین پر اپنی اولاد میں سے اپنے پیرو کاروں کو قیامت کے دن دائمی طور پر اپنے ساتھ لے کر جنت میں جائیں۔ سو آپ اپنی بے شمار اولاد کے ساتھ دوام اور ہمیشگی کے لیے جنت میں جائیں گے اور ابلیس اپنے پیرو کاروں کے ساتھ ہمیشہ ہمیش کے لیے دوزخ میں جائے گا۔ سو اس معرکہ کے نتیجہ میں کامیاب حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ناکام ابلیس لعین ہے۔

يٰۤاِبْنِيۤ اٰدَمُ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ لِبَاسًا یُّوَارِیۤ سَوْۤاَتِکُمْ وَرِیۤسًا

اے اولادِ آدم! بیشک ہم نے تم پر ایسا لباس نازل کیا ہے جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور وہ تمہاری زینت (بھی) ہے

وَلِبَاسُ التَّقْوٰی لَا ذٰلِكَ خَیۡرٌۭ ذٰلِكَ مِنْۢ مِّنۡ اٰیٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّہُمْ

اور تقویٰ کا لباس، وہی سب سے بہتر لباس ہے، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت

یَدَّکُرُوۡنَ ﴿۳۶﴾ یٰۤاِبْنِیۤ اٰدَمُ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ کَمَاۤ اَخۡرَجَ اٰبَیۡکُمُ

حاصل کریں ○ اے اولادِ آدم! کہیں شیطان تم کو فتنہ میں مبتلا نہ کرے، جس طرح وہ تمہارے ماں باپ کے

مِّنَ الْجَنَّةِ یَنۡزِعُ عَنْہُمَا لِبَاسًا لِّیۡرِیۡہُمَا سَوْۤاَتِہُمَا اِنَّہٗ

جنت کے اخراج کا سبب بنا تھا اور ان کے لباس اترنے کا سبب بنا تھا تاکہ انجام کار وہ انہیں ان کی شرم گاہیں دکھائے، بے شک

تبیان القرآن

جلد چہارم

يُرِيكُمْ هُودَ وَقَبِيلَهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرْوَنَّهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ

(شیطان) اور اس کا قبیلہ نہیں دیکھتا ہے جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ سکتے ، بے شک ہم نے شیطانوں کو ان

أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۗ وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا

لوگوں کا دوست بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے ○ اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ

وَجَدْنَا عَلَيْهَا أَبَاءَنَا وَانَّهُ أَمَرَنَا بِهَا قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ

ہم نے ان ہی کاموں پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور میں اللہ نے ان کاموں کا حکم دیا ہے ، آپ مجھے بے شک اللہ

بِالْفَحِشَاءِ ۗ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۗ قُلْ أَمْرٌ رَبِّي

بے حیائی کا حکم نہیں دیتا ، کیا تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں ہے ○ آپ مجھے کہ میرے رب نے

بِالْقِسْطِ وَأَقْبَلُوا وَجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ

انصاف کا حکم دیا ہے ، اے لوگو! ہر نماز کے وقت اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اخلاص کے ساتھ اطاعت کرتے ہوئے

لَهُ الدِّينَ ۗ كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ۗ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا

اسی کی عبادت کرو ، جس طرح اس نے تم کو ابتداءً پیدا کیا ہے ، اسی طرح تم لوٹو گے ○ ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دی اور ایک گروہ

حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلَالَةُ ۗ إِنَّهُمْ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ

گمراہی پر ڈٹا رہا ، انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا کارساز بنا

دُونِ اللَّهِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ۗ بَيْنِي وَأَدَمَ خَدَا

یا ، اور ان کا یہ زعم ہے کہ وہی ہدایت یافتہ ہیں ○ اے اولادِ آدم! ہر عبادت

زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ

کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو ، اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچ نہ کرو ، بیشک اللہ

لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۗ

فضول خرچ کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے اولاد آدم ابے شک ہم نے تم پر ایسا لباس نازل کیا ہے جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور وہ تمہاری زینت (بھی) ہے اور تقویٰ کا لباس وہی سب سے بہتر لباس ہے، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں O (الاعراف: ۲۶)

مشکل اور اہم الفاظ کے معانی

لباس: یہ لبس سے بنا ہے۔ لبس کا اصل معنی ہے کسی شے کو چھپالینا۔ ہر وہ چیز جو انسان کی قبیح چیز کو چھپالے، اس کو لباس کہتے ہیں۔ شوہر اپنی بیوی اور بیوی اپنے شوہر کو قبیح چیزوں سے چھپالیتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کی عفت کی حفاظت کرتے ہیں اور خلاف عفت چیزوں سے ایک دوسرے کے لیے مانع ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں ایک دوسرے کا لباس فرمایا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ

وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

(البقرہ: ۱۸۷)

لباس سے انسان کی زینت ہوتی ہے۔ اسی اعتبار سے فرمایا ہے لباس التقوی۔ تقویٰ کا معنی ہے برے عقائد اور برے اعمال کو ترک کرنا اور پاکیزہ سیرت کو اپنانا۔ جس طرح کپڑوں کا لباس انسان کو سردی، گرمی اور برسات کے موسموں کی شدت سے محفوظ رکھتا ہے، اسی طرح تقویٰ کا لباس انسان کو اخروی عذاب سے محفوظ رکھتا ہے۔

(المفردات، ج ۲، ص ۵۷۶، مع توضیح، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۳۱۸ھ)

ریش: ریش پرندہ کے پر کو کہتے ہیں اور چونکہ پر پرندے کے لیے ایسے ہیں جیسے انسان کے لیے لباس، اس لیے انسان کے لباس کو بھی ریش کہتے ہیں اور ریش سے زینت اور خوبصورتی کا معنی بھی مراد ہوتا ہے۔

(المفردات، ج ۱، ص ۲۷۱، مطبوعہ مکہ مکرمہ)

لا یفتنکم: کہیں تم کو فتنہ میں نہ ڈال دے۔ فتنہ کا معنی ہے ابتلا اور امتحان۔ جس طرح ابلیس نے حضرت آدم اور حوا کو شجر ممنوع کی طرف مائل کر کے اس کو کھانے یا نہ کھانے کی آزمائش میں ڈال دیا تھا، اسی طرح وہ تم کو بھی ممنوع کاموں کی طرف راغب کر کے آزمائش میں نہ ڈال دے۔

آیات سابقہ سے مناسبت

حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر فرمایا ہے کہ جب ان کی شرم گاہ کھل گئی تو وہ اس کو درخت کے پتوں سے ڈھانپنے لگے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہاں پر یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لباس اس لیے پیدا فرمایا ہے کہ اس سے لوگ اپنی شرم گاہوں کو چھپائیں اور اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان اور انعام ہے کہ اس نے لباس کے ذریعہ لوگوں کو اپنی ستر پوشی پر قادر فرمایا۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لباس کو نازل فرمایا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ لباس کے مادی اجزاء مثلاً کپاس وغیرہ کو پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا۔

دوسری وجہ مناسبت یہ ہے کہ اس سے پہلی آیات میں حضرت آدم اور حضرت حوا کو زمین پر اترنے کا حکم دیا اور زمین کو ان کے لیے جائے قرار بنایا۔ اب یہ بتایا ہے کہ زمین پر رہنے کے لیے انسان کو جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پیدا فرمائی ہیں اور ان چیزوں میں سے دین اور دنیا کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لباس ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس عظیم نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اخلاص کے ساتھ اس کی عبادت کرے۔

لباس کی نعمت پر شکر ادا کرنا

مجاہد اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: قریش بیت اللہ کا برہنہ طواف کرتے تھے اور کوئی شخص طواف کے وقت کپڑے نہیں پہنتا تھا۔ (جامع البیان، ج ۸، ص ۱۹۳، دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جنملاء عرب کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ شرم گاہ کھلی رکھنا بہت بے شرمی کی بات ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی جب شرم گاہ کھل گئی تو وہ اپنی شرم گاہ کو پتوں سے ڈھانپنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا کہ لباس نازل فرمایا سو اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔
امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین درہم کا ایک کپڑا خریدا۔ آپ نے اس کو پہننے کے بعد کہا: اللہ کے لیے حمد ہے جس نے مجھے ایسا لباس عطا کیا جس سے میں لوگوں میں جمال حاصل کروں اور اس سے اپنی شرم گاہ کو چھپاتا ہوں، پھر کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح فرماتے ہوئے سنا ہے۔

(مسند احمد، ص ۱۵۷، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۵، ص ۱۳۵، مکتبہ نزار مصطفیٰ، درمشور، ج ۳، ص ۳۳۵)

مرد اور عورت کی شرم گاہوں کے مصادیق میں مذہب فقہاء

انسان کی شرم گاہ، جس کا چھپانا فرض ہے، اس کے مصادیق میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے۔ ابن ابی ذئب، داؤد ظاہری، (غیر مقلدین کے امام) ابن ابی عبیدہ اور ابن جریر طبری کا موقف یہ ہے کہ مرد اور عورت کے صرف بول و براز (پیشاب، پاخانہ) کی جگہ شرم گاہ ہے اور اس کا چھپانا واجب ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے لباسا یواری سواتکم (الاعراف: ۲۶)
امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ خیبر میں گئے۔ ہم نے وہاں منہ اندھیرے صبح کی نماز پڑھی۔ نبی ﷺ سوار ہوئے اور میں بھی حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے پیچھے ایک سواری پر سوار ہوا۔ نبی ﷺ نے خیبر کی گلیوں میں گھوڑے کو دوڑایا۔ اس وقت میرا گھٹنا نبی ﷺ کی ران سے مس کر رہا تھا، پھر آپ نے اپنی ران سے چادر ہٹائی حتیٰ کہ میں نبی ﷺ کی ران کی سفیدی کی طرف دیکھتا رہا۔ (الحدیث)

(صحیح بخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۳۷۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۲ھ)

اس حدیث سے ان علماء نے یہ ثابت کیا ہے کہ ران شرم گاہ نہیں ہے۔

امام مالک نے کہا ہے کہ ناف شرم گاہ نہیں ہے اور کوئی شخص اپنی بیوی کے سامنے اپنی ران کو عریاں کرے تو میں اس کو مکروہ قرار دیتا ہوں۔ امام شافعی نے کہا صحیح یہ ہے کہ ناف اور گھٹنے شرم گاہ نہیں ہیں۔

ناف کے شرم گاہ نہ ہونے پر دلیل یہ حدیث ہے:

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

عمیر بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا۔ ہماری حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ حضرت ابو ہریرہ نے حضرت حسن سے کہا: مجھے اپنی قمیص اٹھا کر دکھاؤ، میں تمہیں اس جگہ بوسہ دوں گا جہاں میں نے رسول اللہ ﷺ کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر حضرت ابو ہریرہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی ناف پر بوسہ دیا۔

(مسند احمد، ج ۳، ص ۲۵۵، ۲۹۳، دار الفکر، طبع قدیم، شیخ احمد شاکر، متوفی ۱۳۷۶ھ نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد)

ج ۷، رقم الحدیث: ۷۳۵۵، دار الحدیث قاہرہ، امام طبرانی کی روایت میں ہے حضرت حسن نے پیٹ کھولا اور ناف پر ہاتھ رکھا۔ حافظ البیہقی نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، 'مجمع الزوائد' ج ۹، ص ۱۷۷، 'المستدرک' ج ۳، ص ۱۶۸

اس حدیث سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اگر ناف شرم گاہ ہوتی اور اس کا چھپانا واجب ہوتا تو حضرت حسن رضی اللہ عنہما حضرت ابو ہریرہ کو اپنی ناف دکھاتے نہ حضرت ابو ہریرہ ان کی ناف کو بوسہ دیتے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مرد کی ناف سے لے کر گھٹنے تک پورا جسم شرم گاہ ہے اور واجب الستر ہے۔ ناف شرم گاہ نہیں ہے اور گھٹنا شرم گاہ ہے۔ امام ابو حنیفہ کی دلیل حسب ذیل احادیث ہیں:

امام دار قطنی متوفی ۵۳۸۵ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ گھٹنوں کے اوپر کا حصہ شرم گاہ ہے اور ناف کا نچلا حصہ شرم گاہ ہے۔

(سنن دار قطنی، ج ۱، رقم الحدیث: ۸۷۹، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۷ھ، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۲، ص ۲۹۲)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گھٹنا شرم گاہ ہے۔

(سنن دار قطنی، ج ۱، رقم الحدیث: ۸۷۸، بیروت، ۱۳۱۷ھ)

اس سے پہلے صحیح بخاری کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ غزوہ خیبر میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے نبی ﷺ نے ران پر سے کپڑا ہٹایا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ غیر ارادی طور پر آپ کا ہاتھ لگ گیا ہو اور حضرت انس نے اس سے یہ سمجھا کہ آپ نے دانستہ ران سے کپڑا ہٹایا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ امام بخاری فرماتے ہیں:

حضرت ابن عباس، جرہد اور محمد بن جحش رضی اللہ عنہم نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ران شرم گاہ ہے اور حضرت انس کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنی ران سے کپڑا ہٹایا۔ حضرت انس کی حدیث سند کے لحاظ سے راجح ہے اور حضرت جرہد کی حدیث احتیاط کے لحاظ سے راجح ہے۔ (صحیح بخاری، ج ۱، باب ۱۳، مسابذ کرفی الفخذ)

اور عورت کا پورا جسم شرم گاہ ہے اور واجب الستر ہے ماسوا اس کے چہرے اور ہاتھوں کے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: عورت (مکمل) واجب الستر ہے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو جھانک کر دیکھتا ہے۔

(سنن ترمذی، ج ۲، رقم الحدیث: ۲۷۸، مجمع الزوائد، ج ۲، ص ۳۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

زید بن قنفذ کی والدہ نے حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا عورت کتنے کپڑوں میں نماز پڑھے؟ آپ نے فرمایا: دوپٹے میں اور اتنی لمبی قمیص میں جو اس کے پیروں کی پشت کو چھپالے۔

(سنن ابوداؤد، ج ۱، رقم الحدیث: ۶۳۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

امام ابوداؤد نے قتادہ سے مرسلہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب لڑکی بالغ ہو جائے تو اس کے چہرے اور پنچوں تک ہاتھوں کے سوا کسی عضو کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔

(انصبا الراية، ج ۱، ص ۲۹۹، حیدرآباد کن، فتح القدر، ج ۱، ص ۲۶۶، دار الفکر، بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے اولاد آدم! کہیں شیطان تم کو فتنہ میں نہ مبتلا کر دے، جس طرح وہ تمہارے ماں باپ کے جنت سے اخراج کا سبب بنا تھا اور ان کے لباس اترنے کا سبب بنا تھا تاکہ انجام کار وہ انہیں ان کی شرم گاہیں دکھائے، بے شک وہ

(شیطان) اور اس کا قبیلہ تمہیں دیکھتا ہے جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے، بے شک ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا رحمت بنایا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔ (الاعراف: ۲۷)

حضرت آدم کے جنت سے باہر آنے کا سبب ان کا خلیفہ بننا تھا یا شجر ممنوع سے کھانا انبیاء علیہم السلام کے قصص اور واقعات بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ بعد کے لوگ اس سے سبق حاصل کریں اور انبیاء علیہم السلام کی پاکیزہ سیرتوں پر عمل پیرا ہوں اور راہ حق میں ان کی دی ہوئی قربانیوں کو اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ یہاں پر یہ بتلانا ہے کہ ابلیس لعین کی وسوسہ اندازیوں سے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو خبردار رہنا چاہیے۔ وہ جنت سے ان کے ماں باپ کے اخراج کا سبب بن چکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی اولاد بھی اس کی فریب کاریوں اور کفر و شرک اور گناہوں کو زینت دینے اور ان کی طرف مائل کرنے کی وجہ سے کفر و شرک یا حرام کاموں میں مبتلا ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں جنت سے عارضی یا دائمی طور پر محروم ہو جائیں۔

اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کے بہکانے پر شجر ممنوع سے کھانے کی وجہ سے حضرت آدم کو جنت سے زمین کی طرف بھیجا گیا اور سورہ بقرہ: ۳۰ میں فرمایا ہے: میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خلافت کی وجہ سے زمین پر بھیجے گئے اور بظاہر ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کا سبب حقیقی کار خلافت انجام دینا ہے اور سبب ظاہری شجر ممنوع سے کھانا ہے۔

جنات کے انسانوں کو دیکھنے اور انسانوں کے جنات کو نہ دیکھنے کی تحقیق

اس آیت میں فرمایا ہے کہ شیطان اور اس کا قبیلہ انسانوں کو دیکھتا ہے اور انسان اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات اور شیاطین میں ایسی قوت اور اک پیدا کی ہے جس کی وجہ سے وہ انسانوں کو دیکھ لیتے ہیں اور عام انسان میں ایسی قوت اور اک پیدا نہیں کی جس کی وجہ سے وہ جنات اور شیاطین کو دیکھ سکیں۔ کیونکہ جنات اور شیاطین کے جسم لطیف ہیں۔ اس لیے ان کی شعاع بھر بہت قوی ہے وہ اجسام لطیفہ اور اجسام کثیفہ دونوں کو دیکھ لیتی ہے اور عام انسانوں کے اجسام کثیف ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی شعاع بھر لطیف اجسام کو نہیں دیکھ سکتی۔ البتہ انبیاء علیہم السلام بہ طور معجزہ اور اولیاء کرام بہ طور کرامت جنات اور شیاطین کو دیکھ لیتے ہیں۔ اس لیے ہم نے کہا ہے کہ عام انسان جنوں کو نہیں دیکھ سکتے یعنی خاص انسان ان کو دیکھ لیتے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنات کو مسخر کر دیا تھا اور وہ ان سے سخت مشقت والے اور کٹھن کام لیتے تھے۔

اور بعض جنات میں سے سلیمان کے تابع کر دیے تھے جو ان کے سامنے ان کے رب کے حکم سے کام کرتے تھے اور (انہیں بتا دیا کہ) ان میں سے جو ہمارے حکم کی نافرمانی کرے گا ہم اسے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب چکھائیں گے۔ سلیمان جو کچھ چاہتے تھے وہ ان کے لیے بناتے تھے، اونچے قلعے اور جنتیں، حوض کی مثل بڑے بڑے ٹب اور (چولہوں پر) کڑی ہوئی بڑی بڑی دیکھیں۔

وَمِنَ الْجِنَّةِ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَن يَنفِخِ فِيهِم مِّنْ أَمْرِنَا نُنْفِئُهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ ۝ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِنْ مَّحَارِبٍ وَتَمَايِلٍ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَّاسِيَتٍ (سبا: ۱۳-۱۴)

اور ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ نے بھی شیطان کو دیکھا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا گزشتہ رات ایک بہت بڑا جن مجھ پر حملہ آور ہوا تاکہ میری نماز فاسد کر دے میں نے ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دوں۔ حتیٰ کہ صبح کو تم سب اس کو دیکھ لیتے۔ (مسلم کی ایک روایت میں ہے: بے شک اللہ کا دشمن ابلیس آگ کا ایک شعلہ میرے منہ پر مارنے کے لیے آیا، میں نے تین بار کہا میں تجھ سے اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، پھر میں نے کہا میں تجھ پر اللہ کی لعنت نامہ کرتا ہوں، وہ پیچھے نہیں ہٹا تو میں نے اس کو پکڑنے کا ارادہ کیا اور اگر ہمارے بھائی سلیمان کی دعائے ہوتی تو وہ بندھا ہوا ہوتا اور مدینہ کے بچے اس سے کھلتے) پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی یہ دعایا آئی: اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھے ایسی بادشاہی عطا فرما جو میرے بعد اور کسی کے لائق نہ ہو۔ (ص: ۳۵) پھر آپ نے اس کو ناکام واپس کر دیا۔

(صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۳۶۱-۳۶۲-۳۲۸۳، صحیح مسلم، المساجد: ۳۹، (۵۳۱) ۱۱۸۹، ۳۰، (۵۳۲) ۱۱۹۰، سنن النسائی، ج ۱، رقم الحدیث: ۵۳۹)

حضرت ابو ہریرہ نے بھی شیطان کو دیکھا ہے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی زکوٰۃ کی حفاظت پر مجھے مامور فرمایا، پھر ایک شخص میرے پاس آیا اور وہ مٹھی بھر کر اناج لے جانے لگا، میں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا بخدا میں تجھ کو ضرور پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤں گا۔ اس نے کہا میں محتاج ہوں، میرے اہل و عیال ہیں اور مجھے سخت ضرورت ہے۔ میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح مجھ سے نبی ﷺ نے پوچھا تمہارے گزشتہ رات کے قیدی نے کیا کیا، میں نے کہا یا رسول اللہ! اس نے مجھ سے سخت ضرورت اور عیال کی شکایت کی مجھے اس پر رحم آیا میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا اس نے تم سے جھوٹ بولا وہ پھر آئے گا۔ سو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پھر آئے گا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا وہ پھر آئے گا۔ سو میں گھات لگا کر بیٹھ گیا اور وہ دوسری رات مٹھی بھر کر اناج اٹھا کر لے جانے لگا میں نے اس کو پکڑ لیا اور میں نے کہا میں تجھ کو ضرور پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤں گا۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دو، میں محتاج ہوں اور مجھ پر عیال کی ذمہ داری ہے۔ میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ مجھے اس پر رحم آیا۔ میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا: اے ابو ہریرہ تمہارے قیدی نے کیا کیا؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! اس نے سخت حاجت اور عیال کی شکایت کی مجھے اس پر رحم آیا اور میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ آپ نے فرمایا اس نے تم سے جھوٹ بولا۔ وہ پھر آئے گا۔ میں تیسری رات پھر اس کی گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے آکر اناج اٹھایا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ میں نے اس سے کہا تین بار ہو چکی ہے، میں تجھ کو پکڑ کر ضرور رسول اللہ ﷺ کے پاس لے کر جاؤں گا۔ تو کتا ہے میں نہیں آؤں گا اور تو پھر آجاتا ہے۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں چند ایسے کلمات بتاؤں گا جن سے اللہ تعالیٰ تم کو نفع دے گا۔ میں نے کہا: وہ کلمات کیا ہیں؟ اس نے کہا: جب تم بستر پر سونے کے لیے جاؤ تو پوری آیتہ الکرسی پڑھ لیا کرو تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ تمہاری حفاظت کرے گا اور صبح تک شیطان تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ صبح مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے گزشتہ رات کے قیدی نے کیا کیا؟ میں نے کہا اس نے کہا تمہیں تمہیں چند ایسے کلمات سکھاؤں گا جن کی وجہ سے اللہ تمہیں نفع دے گا۔ آپ نے فرمایا: وہ کلمات کیا ہیں! میں نے عرض کیا اس نے مجھ سے کہا: جب تم بستر پر سونے کے لیے جاؤ تو اول سے آخر تک آیتہ الکرسی پڑھو اور اس نے مجھ سے کہا: پھر اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرتا رہے گا اور صبح تک شیطان

نبیان القرآن

جلد چہارم

تمہارے قریب نہیں آئے گا۔ اور صحابہ نیکی پر بہت حریص تھے۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا ہرچند کہ وہ جھوٹا ہے، لیکن یہ بات اس نے سچ کہی ہے۔ اے ابو ہریرہ! کیا تم جانتے ہو کہ تین راتوں تک تم سے کون باتیں کرتا رہا، انہوں نے کہا نہیں! آپ نے فرمایا: وہ شیطان تھا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۲۳۱۱، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۸۸۹)

پہلی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے شیطان کو دیکھنے کا ذکر اور دوسری حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شیطان کو دیکھنے کا ذکر ہے۔ نبی ﷺ نے شیطان کو اس کی اصل صورت میں دیکھا یہ آپ کا معجزہ ہے اور عام انسان اس پر قادر نہیں ہیں اور حضرت ابو ہریرہ نے شیطان کو انسان کی صورت میں دیکھا اور سورہ اعراف میں جو فرمایا ہے تم اس کو نہیں دیکھ سکتے، اس کا معنی یہ ہے کہ عام انسان جنات اور شیاطین کو ان کی اصل شکل میں نہیں دیکھ سکتے۔

جنات کے انسانوں پر تصرف کرنے کا بطلان

عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے کہ جنات انسانوں پر مسلط ہو کر ان کے اعضاء میں تصرف کرتے ہیں۔ ان کی زبان سے بولتے ہیں اور ان کے ہاتھوں اور پیروں سے افعال صادر کرتے ہیں۔ پھر کوئی عامل آکر جن اتارتا ہے اور آئے دن اخبارات میں اس کے متعلق اخلاق سوز خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ ہم نے شرح صحیح مسلم، جلد سابع (۷) میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے اوپر بہت دلائل قائم کیے ہیں۔ ان پر قوی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ ممکن ہو کہ ایک شخص کے اعضاء پر کسی جن کا تصرف ہو تو ایک شخص کسی کو قتل کر دے اور کہے کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا، جن نے کیا ہے، میرے اعضاء پر اس وقت جن کا تصرف تھا تو کیا شریعت اور قانون میں اس کو اس قتل سے بری قرار دیا جائے گا اور اگر بالفرض شریعت کی رو سے وہ بے قصور ہو تو کیا قرآن اور حدیث میں ایسی ہدایت ہے کہ جو شخص جن کے زیر اثر ہو کر کسی شخص کو قتل کر دے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

نیز اگر جنات اور شیاطین لوگوں کو مجبوظ کرنے اور ان کی عقل کو ضائع کرنے پر قادر ہوں تو اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ وہ انسان کے بہت بڑے دشمن ہیں تو وہ اکثر انسانوں کی عقلوں کو ضائع کیوں نہیں کرتے۔ خصوصاً علماء، فضلاء اور عبادت گزار زاہدوں کی (بلکہ ان علماء کے ساتھ ایسا زیادہ کرنا چاہیے جو جنات پر انسانوں کے تصرف کا انکار کرتے ہیں اور یہ ناکارہ بھی ان میں شامل ہے) کیونکہ جنات کی علماء اور زاہدوں کے ساتھ عداوت بہت زیادہ ہے اور جب کہ ایسا نہیں ہو تو معلوم ہوا کہ جنات اور شیاطین کو انسانوں پر کسی وجہ سے قدرت حاصل نہیں ہے اور اس نظریہ کے بطلان پر قرآن مجید کی یہ آیت واضح دلیل ہے۔

شیطان قیامت کے دن دوزخیوں سے کہے گا:

وَمَا كَانَ لِي عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَن دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي (ابراہیم: ۲۲)

اور مجھے تم پر کوئی غلبہ نہ تھا مگر یہ کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میری بات مان لی۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۲۲، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب وہ کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے ان ہی کاموں پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور ہمیں اللہ نے ان کاموں کا حکم دیا ہے۔ آپ کہتے کہ بے شک اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔ (الاعراف: ۲۸)

فاحشہ کا معنی اور مراد اور کفار کے اس قول کا رد کہ اللہ نے فاحشہ کا حکم دیا ہے

فاحشہ: علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ جو بات یا جو کام بہت زیادہ برا ہو، اس کو فحش، فحشاء اور فاحشہ

کہتے ہیں۔ (المفردات، ج ۲، ص ۳۸۳، کتب نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ھ)
 علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے کہ ہر وہ گناہ اور معصیت جس کی برائی زیادہ ہو، اس کو فحش، فحشاء اور فاحشہ کہتے ہیں اور فاحشہ زنا کے معنی میں بہ کثرت مستعمل ہے اور ہر برے قول اور فعل کو فاحشہ کہا جاتا ہے۔ کسی کی بات کے سختی اور جارحیت سے جواب دینے کو بھی فحش کہتے ہیں۔ (النهاية، ج ۳، ص ۳۷۲، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۸ھ)
 مجاہد نے کہا اس آیت میں فاحشہ سے مراد، زمانہ جاہلیت میں مشرک مردوں اور عورتوں کا برہنہ طواف کرنا ہے۔

(جامع البیان، جز ۸، مطبوعہ دار الفکر، بیروت ۱۴۱۵ھ)

مشرکین برہنہ طواف کرنے کے جواز میں دو دلیلیں پیش کرتے تھے۔ ایک دلیل یہ تھی کہ ہم اپنے باپ دادا کی تقلید کرتے ہیں وہ اسی طرح کرتے تھے۔ اس دلیل کا اللہ تعالیٰ کئی بار رد فرما چکا ہے کہ جاہلوں اور کافروں کی تقلید کرنا جائز نہیں ہے اور دوسری دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ اس طرح بے حیائی سے طواف کرنے کا ہمیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ دوسرا رد یہ فرمایا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے برہنہ طواف کرنے کا حکم دیا ہے۔ تم کسی کتاب کے معقد ہونے کسی نبی کے، اور اللہ کا حکم یا نبی سے معلوم ہوتا ہے اور یا اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب سے۔
 اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہئے کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔ اے لوگو! ہر نماز کے وقت اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اخلاص کے ساتھ اطاعت کرتے ہوئے اسی کی عبادت کرو جس طرح اس نے تم کو ابتداءً پیدا کیا ہے، اسی طرح تم لوٹو گے۔ (الاعراف: ۲۹)

قَسَطٌ اور عدل کے معانی

قسط کا معنی ہے کسی چیز کے دو برابر حصے کرنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَقِمْوَا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ (الرحمن: ۹) اور انصاف کے ساتھ وزن کو درست رکھو۔

قَسَطٌ کا معنی ہے ظلم کرنا اور اَقْسَطٌ کا معنی ہے عدل کرنا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَأَمَّا الْقَائِسُطُونَ فَكَانُوا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (الحسن: ۱۵)

(الحسن: ۱۵)

وَأَقْسَطُوا أِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ (الحجرات: ۹)

اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو بہت پسند فرماتا ہے۔

(المفردات، ج ۲، ص ۳۲۳، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۸ھ)

عدل، عدالت اور معادلہ۔ ان کا معنی ہے مساوات۔ عدالت اور عدل دونوں کا معنی مساوات ہے۔ لیکن عدل امور معنویہ میں مساوات کو کہتے ہیں اور عدل امور محسوسہ میں مساوات کو کہتے ہیں۔ مثلاً وزن۔ پیمائش اور عدد میں مساوات کو کہتے ہیں اور عدل کی محسوسات میں مساوات اس آیت میں ہے:

وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ (النساء: ۱۲۹)

(النساء: ۱۲۹)

اس میں یہ اشارہ ہے کہ انسان کی فطرت میں کسی ایک طرف میلان کرنا ہے۔ اس لیے انسان اپنی بیویوں کے درمیان محبت میں مساوات کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ بِأَمْرٍ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ

(النحل: ۹۰)

عدل کا معنی ہے مکافات اور بدلہ میں مساوات۔ خیر کا بدلہ خیر اور شر کا بدلہ اس کے مساوی شر۔ مثلاً:

جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا - (الشوری: ۴۰) برائی کا بدلہ اس جیسی اتنی ہی برائی ہے۔

اور احسان کا معنی ہے نیکی کے بدلہ میں اس سے زیادہ نیکی کی جائے اور برائی کے بدلہ میں اس سے کم برائی کی جائے۔ جتنی رقم کسی سے قرض لی تھی اتنی ہی واپس کر دینا عدل ہے۔ اور اس سے زیادہ رقم واپس کرنا احسان ہے اور کسی نے دس گھونے مارے ہوں تو بدلہ میں اس کو دس گھونے مارنا عدل ہے اور صرف ایک گھونسا مارنا احسان ہے۔

(المفردات، ج ۲، ص ۲۲۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

اخلاص کا معنی

اخلاص، خالص سے بنا ہے۔ جس چیز میں کسی چیز کی آمیزش کا شبہ ہو، جب وہ اس سے صاف ہو جائے تو اس کو خالص کہتے ہیں۔ یعنی جو چیز ملاوٹ سے پاک ہو۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اخلاص کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف اس کی رضا جوئی یا اس کے حکم کی فرمانبرداری کی نیت سے کی جائے۔ اس میں کسی کو دکھانے یا سنانے کی نیت نہ ہو اور نہ اس کام پر اپنی تعریف سننے کی خواہش ہو۔ اخلاص کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ کی پرستش اور اس کی رضا جوئی کے سوا ہر ایک کی پرستش اور اس کی رضا جوئی سے بری ہو جائے۔ (المفردات، ج ۱، ص ۲۰۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

قرآن مجید میں اخلاص کے ساتھ عبادت کرنے کا حکم

اس سے پہلی آیت میں یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فحشاء (بے حیائی کرنے) کا حکم نہیں دیا۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس چیز کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قسط (عدل) کا حکم دیا ہے اور قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے اور اخلاص کے ساتھ اللہ سے دعا کرنے اور اس کی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے۔

قسط سے مراد ہے لالہ الا اللہ کا اعتقاد رکھنا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَسْكُوتُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (آل عمران: ۱۸)

اللہ نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور فرشتوں نے اور علماء نے در آنحالیکہ وہ عدل کے ساتھ قائم ہیں یہ کہ اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ بہت عزت والا بڑی حکمت والا۔

اس آیت میں دوسرا حکم یہ دیا ہے کہ قبلہ کی طرف رخ کرو اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور اس کی عبادت کرو۔

عمل میں اخلاص کے فوائد اور ثواب کے متعلق احادیث

امام ابو یوسف ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مسلمان میں یہ تین اوصاف ہوں اس کے دل میں کبھی کھوٹ (کینہ اور فساد) نہیں ہوگا۔ اس کے عمل میں اللہ کے لیے اخلاص ہو، وہ ائمہ مسلمین کے لیے خیر خواہی کرے اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ لازم رہے۔ (الحديث) (سنن ترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۶۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

امام احمد بن شعیب نسائی متوفی ۳۰۳ھ روایت کرتے ہیں:

مصعب بن سعد اپنے والد بنی شیبہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ اس امت کے ضعیف لوگوں کی دعاؤں کی نمازوں اور ان کے اخلاص کی وجہ سے اس امت کی مدد فرماتا ہے۔

(سنن نسائی، ج ۶، رقم الحدیث: ۳۱۷۸، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

حضرت معاذ بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے دین میں اخلاص رکھو تمہارا قلیل عمل (بھی) کافی ہوگا۔ امام حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔

(المستدرک، ج ۳، ص ۳۰۶، حلیۃ الاولیاء، ج ۱، ص ۲۳۳، الجامع الصغیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۹۸، الجامع الکبیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۳۱) حضرت ضحاک بن قیس بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اپنے تمام اعمال اخلاص کے ساتھ کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اخلاص کے بغیر کسی عمل کو قبول نہیں کرتا۔ حافظ سیوطی نے اس حدیث کو صحیح لکھا ہے۔

(سنن دار قطنی، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۳۰، الجامع الصغیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۹۹، الجامع الکبیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۳۲)

حضرت ابو درداء بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی عبادت اخلاص کے ساتھ کرو۔ پانچ (فرض) نمازیں پڑھو اور اپنے اموال کی زکوٰۃ خوشی سے ادا کرو۔ اپنے مہینہ (رمضان) کے روزے رکھو، اپنے بیت (کعبہ) کا حج کرو (اور) اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔ حافظ البیہقی نے اس حدیث کو ضعیف لکھا ہے۔

(حلیۃ الاولیاء، ج ۵، ص ۱۶۶، مجمع الزوائد، ج ۱، ص ۳۵، الجامع الصغیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۳۰۰، الجامع الکبیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۳۳) حضرت عمر بن الخطاب بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اعمال کا مدار صرف نیت پر ہے۔ ہر شخص کے عمل کا وہی ثمرہ ہے جس کی اس نے نیت کی ہے، تو جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے اور جس شخص کی ہجرت دنیا کی طرف ہو جس کو وہ پائے یا کسی عورت کی طرف ہو جس سے وہ نکاح کرے، تو اللہ کے نزدیک اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔

(صحیح البخاری، ج ۱، رقم الحدیث: ۱، صحیح مسلم، الامارۃ: ۱۵۵، سنن ابوداؤد، ج ۲، رقم الحدیث: ۲۲۰۱، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۶۵۳، سنن النسائی، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۵، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۲۲۷، سنن احمد، ج ۱، ص ۲۵، مسند الحمیدی، رقم الحدیث: ۲۸، صحیح ابن خزیمہ، رقم الحدیث: ۱۳۲، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۱، ص ۲۹۸، المستمسق، رقم الحدیث: ۶۳، صحیح ابن حبان، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۸۸، حلیۃ الاولیاء، ج ۸، ص ۳۲، سنن دار قطنی، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۲۸)

حضرت انس بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میری امت کے تین گروہ ہوں گے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جنہوں نے خالص اللہ عزوجل کے لیے عبادت کی ہوگی۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جنہوں نے دکھاوے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہوگی۔ اور ایک گروہ ان لوگوں کا ہوگا جنہوں نے دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہوگی۔ تو جس نے دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہوگی، اس سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تو نے میری عبادت سے کس چیز کا ارادہ کیا تھا؟ وہ کہے گا دنیا کا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یقیناً جس چیز کو تو نے جمع کیا تھا، اس نے تجھ کو نفع نہیں دیا اس کو دوزخ میں لے جاؤ اور جس نے ریاکاری کے لیے عبادت کی تھی، اس سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تیری عبادت صرف ریاکاری کے لیے تھی، اس میں سے میری طرف کوئی چیز نہیں پہنچی اور وہ ریا تھے، آج نفع نہیں دے گا، اس کو دوزخ میں لے جاؤ اور جس نے خالص اللہ عزوجل کے لیے عبادت کی تھی، اس سے فرمائے گا، تو نے میری عبادت کرنے سے کس چیز کا ارادہ کیا تھا۔ وہ شخص کہے گا تیری عزت اور جلال

کی قسم! تو ضرور مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے۔ میں تیری رضا جوئی اور جنت کے لیے تیری عبادت کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے بندہ نے سچ کہا اس کو جنت کی طرف لے جاؤ۔ (حافظ البیہمی نے کہا اس حدیث کی سند میں ایک راوی عبید بن اسحاق کو جمہور نے ضعیف کہا ہے اور ابو حاتم رازی اور ابن حبان نے اس کی توثیق کی ہے اور اس کی سند کے باقی راوی ثقہ ہیں)

(شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۸۰۸، المعجم الاوسط، ج ۶، رقم الحدیث: ۵۱۰۱، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۳۵۰)

عمل میں اخلاص نہ ہونے سے نقصان اور عذاب کے متعلق احادیث

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب قیامت کے دن مہرزہ نامہ اعمال لائیں گے اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: اس صحیفہ کو قبول کر لو اور اس صحیفہ کو چھوڑ دو۔ فرشتے کہیں گے تیری عزت کی قسم! ہم نے وہی لکھا ہے جو اس نے عمل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم نے سچ کہا (لیکن) اس کا عمل میری ذات کے لیے نہیں تھا۔ آج میں صرف اسی عمل کو قبول کروں گا جو میری ذات کے لیے کیا گیا ہوگا۔ حافظ البیہمی نے کہا: یہ حدیث دو سندوں سے مروی ہے اور اس کی ایک سند صحیح ہے۔

(المعجم الاوسط، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۱۲۹، سنن دار قطنی، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۲۹، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۳۵)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی نیک عمل کو باقی رکھنا نیک عمل کرنے سے زیادہ دشوار ہے۔ ایک شخص تنہائی میں کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اس کا اجر ستر گنا لکھ دیا جاتا ہے۔ پھر شیطان اس کو بہکا تا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اس عمل کا لوگوں سے ذکر کرتا ہے اور اس کا اعلان کر دیتا ہے۔ پھر اس کی وہ نیکی (مخفی نیکیوں کے بجائے) ظاہر نیکیوں میں لکھ دی جاتی ہے اور تنہائی میں عمل کرنے کی وجہ سے جو اس کا زیادہ اجر تھا، وہ کم کر دیا جاتا ہے اور شیطان اس کو مسلسل ورغلا تا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ چاہتا ہے کہ اس کی اس نیکی کا ذکر کیا جائے اور اس نیکی پر اس کی تعریف کی جائے۔ پھر اس کے عمل کو ظاہری نیکیوں سے بھی کاٹ دیا جاتا ہے اور یہ لکھ دیا جاتا ہے کہ اس نے یہ عمل ریاکاری کے طور پر کیا تھا۔ سو جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، وہ اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے اور بے شک ریاکاری شرک ہے۔

(شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۸۱۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۰ھ)

(ہر چند کہ اس حدیث کی سند میں مجہول راوی ہیں لیکن اس کا معنی صحیح ہے اور درج ذیل حدیث میں اس کی تائید ہے)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے جس کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا وہ ایک شہید ہوگا۔ اس کو لایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو دی ہوئی نعمتیں بتلائے گا۔ جن کا وہ اعتراف کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم نے ان نعمتوں کے مقابلہ میں کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا میں نے تیری راہ میں قتال کیا حتیٰ کہ میں شہید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تم جھوٹ کہتے ہو تم نے اس لیے قتال کیا تھا تاکہ یہ کہا جائے کہ تم بہت بہادر ہو۔ سو وہ کہا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر ایک شخص کو لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا اور پڑھایا اور قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی دی ہوئی نعمتیں بتلائے گا جس کا وہ اعتراف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے ان نعمتوں کے مقابلہ میں کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا: میں نے علم حاصل کیا اور پڑھایا اور میں نے تیرا قرآن پڑھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے جھوٹ بولا تم نے اس لیے علم حاصل کیا تھا تاکہ تم کو عالم کہا جائے اور تم نے قرآن پڑھا تاکہ یہ کہا جائے کہ وہ قاری ہے سو کہا گیا۔ پھر اللہ کے حکم سے اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا اور اس شخص کو پیش کیا جائے گا جس کو اللہ نے وسعت دی تھی اور اس کو ہر قسم کا مال عطا فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی دی ہوئی نعمتیں بتلائے گا اور وہ ان کا اعتراف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم نے ان نعمتوں کے مقابلہ میں کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا: میں نے اپنے مال کو نیکی کے ہر اس راستہ میں تیری خاطر خرچ کیا جو تجھ کو پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

تم نے جھوٹ بولا تم نے تو یہ اس لیے کیا تھا تاکہ یہ کہا جائے کہ یہ بہت سخی ہے۔ سو وہ کہا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

(صحیح مسلم، الامارۃ: ۱۵۲، (۱۹۰۵) ۲۸۲۰، سنن الترمذی، ج ۲، رقم الحدیث: ۲۳۸۹، سنن النسائی، ج ۶، رقم الحدیث: ۳۱۳، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۹، ص ۱۹۸)

اخلاص ہونے پر فائدہ اور اخلاص نہ ہونے کے نقصان کے متعلق ایک اسرائیلی روایت
امام محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ لکھتے ہیں:

اسرائیلیات میں مذکور ہے کہ ایک عابد بہت بڑے عرصہ تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا رہا۔ اس کے پاس کچھ لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ فلاں جگہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایک درخت کی عبادت کرتے ہیں۔ وہ عابد غضبناک ہو اور کلباڑا کندھے پر رکھ کر اس درخت کو کاٹنے کے لیے چل پڑا۔ راستے میں ابلیس اس کو ایک بوڑھے آدمی کی شکل میں ملا اور پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: میں اس درخت کو کاٹنے جا رہا ہوں۔ ابلیس نے کہا: تمہارا اس درخت سے کیا تعلق ہے؟ تم بلاوجہ اپنی عبادت کو چھوڑ کر ایک غیر اہم کام کے درپے ہو رہے ہو۔ عابد نے کہا: یہ کام بھی میری عبادت ہے۔ ابلیس نے کہا: میں تم کو وہ درخت کاٹنے نہیں دوں گا۔ پھر ان دونوں میں کشتی ہوئی۔ عابد نے اس کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور اس کے سینہ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ابلیس نے کہا: مجھے چھوڑ دو۔ میں تم کو ایک مشورہ دیتا ہوں۔ عابد نے اس کو چھوڑ دیا۔ ابلیس نے کہا: اے شخص! اللہ نے تم سے یہ کام ساقط کر دیا ہے۔ اور تم پر اس کو فرض نہیں کیا۔ اور تم اس درخت کی عبادت نہیں کرتے اور اگر کوئی اور عبادت کرتا ہے تو اس کا تم سے مواخذہ نہیں ہو گا اور اس زمین میں اللہ تعالیٰ کے انبیاء بہت ہیں۔ اگر اللہ چاہے گا تو اس درخت کی پرستش کرنے والوں کی طرف اپنا کوئی نبی بھیج دے گا۔ اور اس نبی کو اس درخت کے کاٹنے کا حکم دے گا۔ عابد نے کہا: میں اس درخت کو ضرور کاٹوں گا اور ابلیس کو کشتی کے لیے لٹکارا اور عابد ابلیس کو پچھاڑ کر اس کے سینہ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ آخر ابلیس عاجز آ گیا اور اس سے کہنے لگا: تمہارا کیا مشورہ ہے؟ میں تم کو درمیانی راہ بتاتا ہوں۔ وہ تمہارے لیے زیادہ بہتر اور زیادہ فائدے مند ہوگی۔

عابد نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ ابلیس نے کہا: مجھے چھوڑ دو تاکہ میں تم کو تفصیل سے بتاؤں! عابد نے اس کو چھوڑ دیا۔ ابلیس نے کہا: تم فقیر آدمی ہو۔ تمہارے پاس مال نہیں ہے۔ لوگ تمہاری کفالت کرتے ہیں اور تم ان پر بوجھ ہو۔ اور شاید کہ تمہارے دل میں خواہش ہو کہ تم اپنے بھائیوں کی مالی امداد کرو اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ غم خواری کرو اور تم سیر ہو کر کھاؤ اور لوگوں سے مستغنی رہو؟ عابد نے کہا: ہاں! ابلیس نے کہا: پھر درخت کاٹنے سے باز آ جاؤ اور تمہیں ہر رات اپنے سرہانے دو دینار مل جائیں گے۔ صبح کو تم وہ دو دینار لے لینا اور ان کو اپنے اوپر اور اپنے عیال کے اوپر خرچ کرنا اور اپنے بھائیوں کے اوپر صدقہ کرنا تو یہ تمہارے اور دیگر مسلمانوں کے لیے اس درخت کے کاٹنے سے زیادہ سود مند ہو گا۔ اور اس درخت کے بعد وہاں اور درخت اگ سکتا ہے اور اس کے کاٹنے سے ان کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا اور تمہارے مسلمان ضرورت مند بھائیوں کو اس درخت کے کاٹنے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

عابد ابلیس کی اس پیشکش پر غور کرنے لگا اور بے ساختہ کہنے لگا بات تو اس بوڑھے کی سچی ہے۔ میں نبی تو ہوں نہیں جو مجھ پر اس درخت کا کاٹنا لازم ہو اور نہ اللہ نے مجھے اس درخت کے کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ حتیٰ کہ میں اس درخت کے نہ کاٹنے کی وجہ سے گنہ گار ہو جاؤں اور جو صورت اس نے بتائی ہے اس میں زیادہ نفع ہے۔ سو دونوں نے قسم کھا کر اس بات پر معاہدہ کر لیا۔ عابد لوٹ آیا۔ اس نے اپنے معبد میں رات گزاری۔ صبح کو اسے اپنے سرہانے دو دینار مل گئے۔ اس نے وہ دینار لے

لیے۔ اسی طرح اگلے دن بھی ہوا۔ تیسری صبح کو عابد کو اپنے سرہانے کوئی چیز نہیں ملی۔ وہ غضب ناک ہو اور کلباڑی کندھے پر ڈال کر چل پڑا۔ اس کے سامنے سے ابلیس ایک بوڑھے کی صورت میں آتا ہوا ملا۔ اس نے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ عابد نے کہا: میں اس درخت کو کاٹوں گا۔ ابلیس نے کہا: تم جھوٹ بولتے ہو۔ خدا کی قسم! تم اس درخت کو کاٹنے پر قادر نہیں ہو۔ اور تمہارے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ عابد پہلی بار کی طرح اس سے کشتی کے لیے آگے بڑھا۔ ابلیس نے کہا: اب یہ نہیں ہو سکتا۔ اور ایک ہی ہلے میں اس کو پچھاڑ دیا اور عابد چڑیا کی طرح اس کے پیروں میں گر پڑا اور ابلیس اس کے سینہ پر بیٹھ گیا۔ ابلیس نے کہا باز آ جاؤ ورنہ میں تم کو ذبح کر دوں گا۔ عابد نے غور کیا تو اس کو ابلیس کے مقابلہ میں بالکل طاقت محسوس نہیں ہوئی۔ عابد نے کہا تم مجھ پر غالب آ گئے۔ اب مجھ کو چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ میں پہلی بار تم پر کس طرح غالب آیا تھا اور اس بار کیوں نہ غالب آ سکا!

ابلیس نے کہا: اس لیے کہ پہلی بار تم اللہ کے لیے غضب ناک ہوئے تھے اور تمہاری نیت آخرت تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے تمہارے لیے مسخر کر دیا اور اس بار تم اپنے نفس اور دنیا کے لیے غضب ناک ہوئے تو میں نے تم کو پچھاڑ دیا۔

(احیاء العلوم، ج ۴، ص ۲۸۵-۲۸۴، مطبوعہ دار الخیر، بیروت ۱۴۱۳ھ)

اخلاص سے کیا ہوا کم عمل بغیر اخلاص کے زیادہ اعمال سے افضل ہے

علامہ عبدالرؤف المناوی المتوفی ۱۰۲۱ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن الکمال نے کہا ہے کہ لغت میں اخلاص کا معنی ہے عبادت میں ریا کو ترک کرنا۔ اور اصطلاح میں اس کا معنی ہے جس چیز کی آمیزش کا شائبہ بھی ہو اس سے دل کو خالص کر لینا۔ پس جس شخص کی کسی فعل سے غرض صرف ایک ہو اور وہ غرض اللہ کا تقرب اور اس کی رضا جوئی ہو اور اس کے دل میں دنیا کی محبت بالکل نہ ہو حتیٰ کہ اس کا کھانا پینا بھی طبعی تقاضوں کی وجہ سے نہ ہو بلکہ محض اللہ کے حکم پر عمل کرنے اور اس کے حکم کی اطاعت کے لیے تقویت حاصل کرنے اور اس کے رسول ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کے لیے ہو تو اس نیت سے اس کا ہر عمل اخلاص سے ہو گا اور جس شخص کی اپنے فعل سے غرض واحد ہو اور وہ غرض ریا اور دکھاوا ہو، ایسا شخص اپنے نفس اور دنیا سے محبت کرتا ہے اور اس کے دل و دماغ میں ہر وقت اپنے نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی دھن سمائی رہتی ہے اور اس کے دل میں اللہ کی محبت کے لیے بالکل جگہ نہیں ہوتی۔ ایسے شخص کی عبادت ریا سے بالکل محفوظ نہیں رہتیں، اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر کبھی روحانیت کا غلبہ ہوتا ہے کبھی نفسانیت کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی ان کے افعال میں اخلاص ہوتا ہے اور کبھی ان کے افعال میں ریا ہوتا ہے۔

امام غزالی نے کہا ہے عبادت کم ہو، لیکن اس میں ریا اور تکبر نہ ہو اور اس عبادت کا باعث اخلاص ہو تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عبادت کی غیر متناہی قیمت ہے اور عبادت بہت زیادہ ہو لیکن اخلاص سے خالی ہو تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی کوئی قیمت اور حیثیت نہیں ہے۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے اس کے تدارک کی کوئی سبیل پیدا فرمادے۔ اس لیے اہل بصیرت زیادہ عمل میں کوشش نہیں کرتے بلکہ اخلاص کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قدر و قیمت صاف شفاف اور صیقل چیز کی ہوتی ہے، کثرت کی نہیں ہوتی۔ ایک سچا موتی ہزار ٹھیکریوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ جو لوگ بہت زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں، اور بہ کثرت روزے رکھتے ہیں اور نمازوں میں اخلاص اور خضوع اور خشوع کے درپے نہیں ہوتے اور نہ روزوں میں للہیت کے جذبہ کی کوشش کرتے ہیں، اپنی نمازوں اور روزوں کی بڑی تعداد سے دھوکا کھاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ بے مغز خردنوں کے ڈھیر کی کیا قدر و قیمت ہے۔

(فیض القدر، ج ۱، ص ۴۱۵-۴۱۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، ۱۴۱۸ھ)

انسانوں کے حشر کی کیفیت

اس کے بعد فرمایا: جس طرح اس نے تم کو ابتدا میں پیدا کیا ہے، اسی طرح تم لوٹو گے۔

محمد بن کعب نے اس کی تفسیر میں کہا: جس کو اللہ تعالیٰ نے ابتداء اہل شقاوت میں سے پیدا کیا ہے وہ قیامت کے دن اہل شقاوت سے اٹھے گا خواہ وہ پہلے نیک کام کرتا ہو، اور جس کو اللہ تعالیٰ نے ابتداء اہل سعادت سے پیدا کیا، وہ قیامت کے دن اہل سعادت سے اٹھے گا خواہ وہ پہلے برے کام کرتا رہا ہو۔ جیسے ابلیس لعین کو اللہ تعالیٰ نے اہل شقاوت سے پیدا کیا تھا وہ پہلے نیک کام کرتا تھا لیکن وہ انجام کار کفر کی طرف لوٹ گیا اور جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے جادوگر، وہ پہلے فرعون کے تابع تھے لیکن بعد میں فرعون کو چھوڑ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ سو ابلیس اپنی ابتداء خلقت کے اعتبار سے شقاوت کی طرف اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے جادوگر اپنی ابتداء خلقت کے اعتبار سے سعادت کی طرف لوٹ گئے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے بھی اس آیت کی اسی طرح تفسیر کی ہے۔

(جامع البیان، جز ۸، ص ۲۰۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے جس طرح انسان ماں کے پیٹ سے ننگے پیر، ننگے بدن اور غیر مخنوں پیدا ہوا تھا، وہ حشر میں بھی اسی طرح طرح ننگے پیر، ننگے بدن اور غیر مخنوں اٹھے گا۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم محشر میں ننگے پیر، ننگے بدن اور غیر مخنوں اٹھائے جاؤ گے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُمْ وَعَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ (الانبیاء: ۱۰۳)

جس طرح ہم نے پہلے پیدائش کی ابتداء کی تھی، اسی طرح ہم پھر اس کو دہرائیں گے، یہ ہمارا وعدہ ہے، ہم اس کو ضرور (پورا) کرنے والے ہیں۔

اور سب سے پہلے جس کو لباس پہنایا جائے گا، وہ حضرت ابراہیم ہیں۔ (مسلم کی ایک روایت میں ہے: حضرت عائشہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! عورتیں اور مرد دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا: اے عائشہ! وہ دن اس سے بہت ہولناک ہو گا کہ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں)

(صحیح البخاری، ج ۴، رقم الحدیث: ۳۳۴۷، صحیح مسلم، الحشر: ۵۸ (۲۸۵۹) ۷۰۶۸، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۳۳۱، سنن النسائی، ج ۴، رقم الحدیث: ۲۰۸۷، صحیح ابن حبان، ج ۱۶، رقم الحدیث: ۷۳۴۷، مسند احمد، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۰۹۶، سنن کبریٰ للسیوطی، ج ۲، ص ۱۳۸، المعجم الکبیر، ج ۱۲، رقم الحدیث: ۱۲۳۱۲)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دی اور ایک گروہ گمراہی پر ڈٹا رہا، انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا کارساز بنا لیا اور ان کا یہ زعم ہے کہ وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ (الاعراف: ۳۰)

ابتداء فطرت میں ہر انسان کا ہدایت یافتہ ہونا

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایسی صلاحیت اور استعداد کے ساتھ پیدا کیا، جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات اور اس کی وحدانیت کی معرفت حاصل کر سکے اور اس کو خیر اور شر کے دونوں راستے دکھا دیے۔ پھر بعض انسانوں نے اس فطری صلاحیت کو ضائع کر دیا اور شیطان نے ان کو دنیا کی رنگینیوں اور دل فریبوں کے دام میں پھانس لیا، ان کو

تبیان القرآن

جلد چہارم

ان کے ضمیر نے سرزنش کی نبیوں اور رسولوں اور ہر دور کے علماء حق نے ان کو اللہ کے دین کو قبول کرنے کی دعوت دی لیکن وہ شیطان کے بتائے ہوئے راستے پر ڈٹے رہے اور وہ یہ گمان کرتے تھے کہ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہی برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَلَمْ نَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۚ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ ۚ
وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (البلد: ۱۰-۸)

کیا ہم نے اس کی دو آنکھیں نہیں بنائیں؟ اور زبان اور دو ہونٹ؟ اور ہم نے اسے (نیکی اور بدی کے) دونوں واضح راستے دکھادیے۔

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر مولود فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر آپ فرماتے پڑھو، اے لوگو! اپنے اوپر اللہ کی بنائی ہوئی سرشت (فطرت اسلام) کو لازم کر لو جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی سرشت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی یہی دین راست ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (الروم: ۳۰) دوسری روایت میں ہے: جو شخص بھی پیدا ہوا وہ اس فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی اور نصرانی بنا دیتے ہیں۔ جیسے اونٹ سالم اور کامل الاعضاء پیدا ہوتا ہے کیا تم اس میں کوئی نقص دیکھتے ہو؟ حتیٰ کہ تم اس کے اعضاء کاٹتے ہو۔ صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ! یہ بتائیے! جو شخص بچپن میں فوت ہو جائے؟ آپ نے فرمایا اللہ ہی جاننے والا ہے وہ کیا کرنے والا تھا؟

(صحیح مسلم، قدر: ۲۳، ۲۴، ۲۶۵۸، ۶۶۳۳، ۶۶۳۴، صحیح البخاری، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۳۵۹، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۷۱۳، سنن ترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۱۳۵، موطا امام مالک، رقم الحدیث: ۵۶۹، مسند احمد، ج ۳، رقم الحدیث: ۸۵۷۰)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ ہر بچہ اسلام کی صلاحیت اور استعداد کے ساتھ پیدا ہوتا ہے پھر اگر اس کے ماں باپ یا اس میں سے کوئی ایک مسلمان ہو تو وہ اسلام پر برقرار رہتا ہے اور اگر اس کے ماں باپ کافر ہوں تو دنیا میں اس پر کفر کا حکم جاری ہوتا ہے اور اگر بالغ ہونے کے بعد بھی وہ اپنے اختیار سے اسی کفر پر برقرار رہے تو وہ آخرت کے حکم کے اعتبار سے بھی کافر ہو گا۔ اور اگر اس پر سعادت غالب آجائے اور وہ اسلام قبول کر لے تو پھر وہ مسلمان ہو گا اور اگر وہ بالغ ہونے سے پہلے مر گیا تو اس کو آخرت میں عذاب نہیں ہو گا اور صحیح بخاری میں آپ کا ارشاد ہے کہ مشرکین کی اولاد بھی جنت میں ہو گی۔

(صحیح البخاری، ج ۸، رقم الحدیث: ۷۰۳)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو فطرت اسلام پر پیدا کیا اسی وجہ سے سب نے عالم میثاق میں اللہ کی ربوبیت کا اقرار کیا لیکن اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ کون اس فطرت کے مطابق ہدایت پر رہے گا اور کون کفر میں مبتلا ہو گا اور اس پر ڈٹ جائے گا اور شیطان کو اپنا کار ساز بنالے گا۔ اس لیے فرمایا: ایک گروہ کو اللہ نے ہدایت دی اور ایک گروہ گمراہی پر ڈٹا رہا، انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا کار ساز بنا لیا اور ان کا یہ زعم ہے کہ وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے اولاد آدم! ہر عبادت کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو، اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچ نہ کرو، بے شک اللہ فضول خرچ کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (الاعراف: ۳۱)

برہنہ طواف کی ممانعت کا شان نزول اور لوگوں کے سامنے برہنہ ہونے کی ممانعت

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں: کہ پہلے عورت برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتی تھی اور یہ کہتی تھی:

کوئی مجھے ایک کپڑا دے دیتا جس کو میں اپنی شرم گاہ پر ڈال دیتی، آج بعض یا کل کھل جائے گا، اور جو کھل جائے گا میں اس کو کبھی حلال نہیں کروں گی۔ تب یہ آیت نازل ہوئی ہر نماز کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو۔ (الاعراف: ۳۱)

(صحیح مسلم، تفسیر ۲۵، ۳۱۶ (۳۰۲۸)، مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ، ۱۳۱۷ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ لوگ بیت اللہ کا برہنہ طواف کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زینت کا حکم دیا۔ زینت سے مراد وہ لباس ہے جو شرم گاہ چھپائے۔ اس کے علاوہ عمدہ کپڑے اور اچھی چیزیں بھی زینت ہیں اور انہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہر نماز کے وقت اپنی زینت کو پہنیں۔

(جامع البیان، جز ۸، ص ۲۱۱، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

زہری بیان کرتے ہیں کہ عرب بیت اللہ کا برہنہ طواف کرتے تھے، ماسوا قریش اور ان کے حلیفوں کے۔ ان کے علاوہ جو لوگ طواف کرنے کے لیے آتے، وہ اپنے کپڑے اتار دیتے اور قریش کے دیے ہوئے کپڑے پہن لیتے اور اگر ان کو قریش میں سے کوئی عاریتاً کپڑے دینے والا نہ ملتا تو وہ اپنے کپڑے پھینک کر برہنہ طواف کرتا اور اگر وہ ان ہی کپڑوں میں طواف کر لیتا تو وہ طواف کے بعد ان کپڑوں کو پھینک دیتا اور ان کپڑوں کو اپنے اوپر حرام کر لیتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہن لیا کرو۔ (جامع البیان، جز ۸، ص ۲۱۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس حج میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق کو امیر بنایا تھا جو کہ حجۃ الوداع سے پہلے تھا، اس میں حضرت ابو بکر نے مجھے لوگوں کی ایک جماعت کے ساتھ قربانی کے دن یہ اعلان کرنے کے لیے بھیجا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی بیت اللہ کا برہنہ طواف کرے گا۔

(صحیح مسلم، ج ۳، ص ۳۳۵، (۱۳۳۷) صحیح البخاری، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۶۲۲، سنن ابوداؤد، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۹۳۶، سنن نسائی،

ج ۵، رقم الحدیث: ۲۹۵۷)

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک بھاری پتھر اٹھا کر لارہا تھا اور میں نے چھوٹا سا تہبند باندھا ہوا تھا۔ اچانک میرا تہبند کھل گیا، اس وقت میرے کندھے پر وزنی پتھر تھا، اس وجہ سے میں تہبند کو اٹھا نہیں سکا، حتیٰ کہ میں نے پتھر کو اس کی جگہ پہنچا دیا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جا کر اپنا تہبند اٹھاؤ اور اس کو باندھ لو اور ننگے بدن نہ پھرا کرو۔

(صحیح مسلم، حیض ۷۸، (۳۳۱) ۷۵۷، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۰۱۶)

تعمیر کعبہ کے وقت تہبند اتار کر کندھے پر رکھنے کی روایت پر بحث و نظر

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب کعبہ کو بنایا گیا تو نبی ﷺ اور عباس پتھر اٹھا کر لارہے تھے۔ عباس نے نبی ﷺ سے کہا پتھروں کی وجہ سے اپنا تہبند اپنے کندھے پر رکھ لیں، آپ نے ایسا کیا پھر آپ زمین پر گر گئے اور آپ کی دونوں آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں، پھر آپ کھڑے ہوئے اور آپ نے فرمایا میری چادر، میری چادر، پھر آپ پر چادر باندھ دی گئی۔

(صحیح البخاری، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۵۸۲، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۸۲۹، صحیح مسلم، حیض: ۷۶، (۳۳۰) ۷۵۵، مسند احمد، ج ۲، ص ۲۹۵،

ج ۳، ص ۳۸۰، ۳۱۰)

اس حدیث میں یہ ذکر ہے کہ آپ نے اپنا تہبند اتار دیا تھا اور آپ معاذ اللہ برہنہ ہو گئے اور اسی کی دہشت سے آپ بے ہوش ہو گئے۔ یہ حدیث آپ کے بلند منصب، آپ کی عظمت اور شان اور آپ کے مقام نبوت کے خلاف ہے۔ علامہ نووی، علامہ یحییٰ اور علامہ عسقلانی میں سے کسی نے بھی اس اشکال کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علامہ قرطبی نے اس حدیث کو المعجم میں شامل نہیں کیا۔ صرف علامہ محمد بن خلیفہ وشتانی ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ نے اپنی شرح میں اس اشکال کو دور کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں یہ تصریح نہیں ہے کہ آپ کا ستر کھل گیا تھا، کیونکہ آپ اول امر میں تہبند کھلتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اور غالباً اس وقت آپ پر کسی کی نظر نہیں پڑی تھی اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے: حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل نے مجھے یہ عزت اور کرامت دی ہے کہ میں مختون پیدا ہوا اور میری شرم گاہ کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔

(المعجم الصغیر، رقم الحدیث: ۹۳۶، المعجم الاوسط، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۱۳۴، دلائل النبوة لابی نعیم، ج ۱، رقم الحدیث: ۹۱، مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۲۲۳، کنز العمال، ج ۱۱، رقم الحدیث: ۳۱۹۲۳، ۳۲۱۳۴۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی سفیان بن محمد فزاری متفرد ہے۔ علامہ ابن جوزی نے اس پر جرح کی ہے۔ العلل المتساہیہ، ج ۱، ص ۱۶۵، حافظ ابن کثیر نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے، البدایہ والنہایہ، ج ۲، ص ۲۶۵)

اور بعض روایات میں ہے کہ فرشتہ نازل ہوا اور اس نے میرا تہبند باندھ دیا۔

(اکمال اکمال المعلم، ج ۲، ص ۱۹۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

ہر چند کہ یہ حدیث جس میں آپ کے تہبند کھولنے کا ذکر ہے، سند صحیح کے ساتھ مروی ہے لیکن اول تو یہ مراسیل صحابہ میں سے ہے جن کا مقبول ہونا بہر حال مختلف فیہ ہے۔ ثانیاً یہ حدیث درایت کے خلاف ہے۔ کیونکہ قریش نے بعثت سے پانچ سال پہلے کعب بنیایا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف پینتیس سال تھی اور پینتیس سال کے مرد کے لیے اس کے چچا کا زراہ شفقت یہ کہنا کہ ”تم اپنا تہبند اتار کر اپنے کندھے پر رکھ لو ماکہ تم کو پتھر نہ چھبیں“ درایتاً صحیح نہیں ہے۔ یہ بات کسی کم سن بچے کے حق میں تو کہی جاسکتی ہے، پینتیس سال کے مرد کے لیے صحیح نہیں ہے اور علامہ بدر الدین یحییٰ، علامہ ابن حجر وغیرہما نے امام ابن اسحاق سے یہی نقل کیا ہے کہ قریش کے کعب بنانے کا واقعہ بعثت سے پانچ سال پہلے کا ہے۔

علامہ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

امام عبدالرزاق نے اور اسی سند کے ساتھ امام حاکم اور امام طبرانی نے نقل کیا ہے کہ قریش نے وادی کے پتھروں سے کعب کو بنایا اور اس کو آسمان کی جانب بیس (۲۰) ہاتھ بلند کیا اور جس وقت نبی ﷺ اجیاد سے پتھراٹھا اٹھا کر لارہے تھے اس وقت آپ نے ایک دھاری دار چادر کا تہبند باندھا ہوا تھا۔ آپ نے اس چادر کا پلو اٹھا کر اپنے کندھے پر رکھ لیا اور اس چادر کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے آپ کی شرم گاہ ظاہر ہو گئی۔ اس وقت ایک آواز آئی: اے محمد! (ﷺ) اپنی شرم گاہ ڈھانپ لیں، اس کے بعد آپ کو عریاں نہیں دیکھا گیا، اس وقت آپ کی بعثت میں پانچ سال تھے۔ اس کے بعد علامہ ابن حجر نے امام عبدالرزاق کی سند سے لکھا کہ مجاہد نے کہا کہ یہ بعثت سے پندرہ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ (اس وقت آپ کی عمر پچیس سال تھی) امام عبدالبر نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور موسیٰ بن عقبہ نے اپنے مغازی میں اسی پر اعتماد کیا ہے۔ لیکن مشہور پہلا قول ہے (یعنی بعثت سے پانچ

سال پہلے کا) (فتح الباری، ج ۳، ص ۳۳۲، ۳۳۱، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، ۱۳۰۱ھ)

علامہ بدر الدین محمود بن احمد یعنی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

طبقات ابن سعد میں محمد بن جابر بن مطعم سے روایت ہے جس وقت رسول اللہ ﷺ لوگوں کے ساتھ بیت اللہ کی تعمیر کے لیے پتھر لارہے تھے اس وقت آپ کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ لوگوں نے اپنے اپنے تہبند اپنے اپنے کندھوں کے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ سو رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا کیا پھر آپ گر پڑے اور آپ کو ندا کی گئی ”اپنی شرم گاہ کو ڈھکنے“ اور یہ آپ کو پہلی ندا کی گئی تھی۔ ابوطالب نے کہا اے بھتیجے! اپنا تہبند اپنے سر کے نیچے رکھ لو۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا مجھ پر جو مصیبت آئی ہے وہ صرف برہنہ ہونے کی وجہ سے آئی ہے۔ (عمدة القاری ج ۹ ص ۲۱۵ مطبوعہ ادارہ المطبعة المنيرية ۱۳۳۸ھ)

امام عبد الملک بن ہشام متوفی ۲۱۳ھ لکھتے ہیں:

امام ابن اسحاق نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی عمر پینتیس سال کی ہوئی تو قریش نے کعبہ کے بنانے پر اتفاق کیا۔

(السيرة النبوية ج ۱ ص ۲۲۹ مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۱۵ھ)

علامہ ابو القاسم عبد الرحمن بن عبد اللہ السبیلی المتوفی ۵۸۱ھ لکھتے ہیں:

کعبہ کو پانچ مرتبہ بنایا گیا پہلی بار شیث بن آدم نے بنایا۔ دوسری بار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان ہی بنیادوں پر بنایا اور تیسری بار اسلام سے پانچ سال پہلے قریش نے بنایا۔ چوتھی بار حضرت عبد اللہ بن زبیر نے بنایا اور پانچویں بار عبد الملک بن مروان نے بنایا۔ (الروض الانف ج ۱ ص ۱۲۷ مطبوعہ مکتبہ فاروقیہ ملتان)

علامہ ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ نے بھی علامہ سبیلی کے حوالے سے اس عبارت کو نقل کیا ہے۔

(اکمال اکمال المعلم ج ۲ ص ۱۸۹ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۵ھ)

علامہ محمد بن یوسف صالحی شامی متوفی ۹۳۲ھ لکھتے ہیں:

حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ مجاہد سے منقول ہے کہ یہ آپ کی بعثت سے پندرہ سال پہلے کا واقعہ ہے اور امام ابن اسحاق نے جس پر جزم کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آپ کی بعثت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے اور یہی زیادہ مشہور ہے اور یہی صحیح ہے۔

(ابل الهدی والرشاد ج ۲ ص ۱۷۳ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۳ھ)

ہم نے متعدد مستند کتب کے حوالہ جات سے یہ بیان کیا ہے کہ قریش نے جس وقت کعبہ کی تعمیر کی تھی اس وقت آپ کی عمر پینتیس سال تھی اور پینتیس سال کے کسی عام مذہب انسان کے حال سے بھی یہ بہت بعید ہے کہ وہ اپنا تہبند اتار کر اپنے کندھے پر رکھ لے۔ چہ جائیکہ وہ شخص ہو جس کی حیا اور وقار تمام دنیا میں سب سے عظیم اور مثالی ہو۔ اس لیے یہ احادیث ہر چند کہ سنداً صحیح ہیں لیکن درایتاً صحیح نہیں ہیں؛ جبکہ اس حدیث کے راوی حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری ہیں اور اس واقعہ کے وقت ان کی عمر دو سال تھی۔ کیونکہ یہ ۹۳ سال کی عمر گزار کر ۷۷ھ میں فوت ہوئے تھے۔ (الاستیعاب علی ہاشم الاصابہ ج ۱ ص ۲۲۲) اس حساب سے ہجرت کے وقت ان کی عمر ۲۰ سال تھی۔ اور بعثت کے وقت ان کی عمر سات سال تھی اور یہ بعثت سے پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے تو اس وقت ان کی عمر دو سال تھی اور اس وقت یہ مدینہ میں تھے حالانکہ یہ مکہ کا واقعہ ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ واقعہ کسی سے سنا ہو گا جس کے نام کی انہوں نے تصریح نہیں کی اور رسول اللہ ﷺ کی حیا اور وقار پر کوئی حرف آنے کی بہ نسبت ہمیں یہ زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کو مسترد کر دیا جائے کیونکہ روایت حدیث میں امام بخاری اور امام مسلم کی جو عظمت اور مقام ہے اس کی بہ نسبت کہیں زیادہ بلکہ سب سے زیادہ عظمت اور شان رسول اللہ ﷺ کی حیا اور وقار کی ہے۔

کھانے پینے میں وسعت کی گنجائش اور اعتدال کا حکم اور بسیار خوری کا اسراف ہونا
نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور کھاؤ اور پو اور فضول خرچ نہ کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں کھانے اور پینے کو حلال فرمادیا ہے جب تک کہ
فضول خرچ نہ ہو اور تکبر نہ ہو۔ جتنی مقدار کھانے اور پینے سے رمت حیات باقی رہ سکتی ہے، اتنی مقدار کھانا اور پینا فرض ہے۔
رزق حلال کمانے اور بدنی عبادات انجام دینے کے لیے جتنی صحت اور توانائی کی ضرورت ہے، اس کے لیے جس قدر کھانے کی
ضرورت ہے، اتنا کھانا بھی فرض ہے۔ اپنی صحت کے تحفظ اور اپنے آپ کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے پرہیزی کھانا کھانا
اور نقصان دہ چیزوں کو ترک کرنا واجب ہے۔ نبی ﷺ نے مسلمانوں کو وصال کے (پے در پے) روزے رکھنے سے اسی لیے منع
فرمایا کیونکہ اس سے بدن لاغر اور کمزور ہوتا ہے اور انسان کی توانائی کم ہوتی ہے۔ جتنی مقدار کھانا جان کی بقا اور توانائی کی حفاظت
کے لیے ضروری ہے، اس سے کم کھانا کوئی نیکی ہے نہ اس میں کوئی زہد و تقویٰ ہے۔ اور بسیار خوری ناجائز اور گناہ ہے اور یہ
فضول خرچ کی ممانعت میں داخل ہے۔ یہ جان ہماری ملکیت نہیں ہے یہ ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے اس کو ضائع کرنا جائز نہیں
ہے۔ مرغن اور چٹ پٹی اشیاء کے کھانے سے انجام کار انسان ہولناک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اس سے تبخیر اور تیزابیت بڑھ
جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں السر ہو جاتا ہے۔ زیادہ چکنائی والی اشیاء کھانے سے خون میں کلیسٹرول بڑھ جاتا ہے جسم بھاری بھر
کم ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ پھر بھی احتیاط نہ کی جائے تو انجامنا ہو جاتا ہے
اور دل کے دورے پڑتے ہیں اور جسم کے کسی عضو پر فالج کرنے کا خدشہ رہتا ہے۔ بعض اوقات برین ہیمریج ہو جاتا ہے اور
دماغ کی کوئی رگ پھٹ جاتی ہے۔ مسلسل سگریٹ نوشی سے خون کی شریانیں سکڑ جاتی ہیں اور فالج کا خطرہ رہتا ہے۔ کھانسی، دمہ
اور گلے کی خرابی اس کے عام اثرات ہیں، بلڈ پریشر بڑھتا ہے اور جگر سکڑ جاتا ہے، الغرض تمباکو کھانے اور پینے کے بہت نقصانات
ہیں۔ اسی طرح بسیار خوری کے بھی بہت زیادہ نقصانات ہیں جن کا ہم نے اجمالاً ذکر کیا ہے۔ جدید اور قدیم حکماء نے صحت کی
حفاظت کے لیے ہمیشہ کم کھانے کی تلقین کی ہے۔ نبی ﷺ نے بھی کم کھانے کی تاکید کی ہے اور بسیار خوری کی مذمت فرمائی
ہے۔

بسیار خوری کی مذمت میں احادیث

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت مقدم بن معدی کرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے آدمی کے
پیٹ سے بڑھ کر کسی برتن کو بھرنا برا نہیں ہے۔ ابن آدم کے لیے چند لقمے کافی ہیں جن سے اس کی کمر قائم رہ سکے اور اگر اس
نے لامحالہ زیادہ کھانا ہو تو (پیٹ کا) تہائی حصہ کھانے کے لیے رکھے اور تہائی حصہ پانی کے لیے اور تہائی حصہ سانس لینے کے لیے۔

(سنن ترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۳۸۷، السنن الکبریٰ للنسائی، رقم الحدیث: ۲۷۶۹، مسند احمد، ج ۶، رقم الحدیث: ۱۷۱۸۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص مہمان ہوا وہ کافر تھا (شامہ بن اثال) رسول
اللہ ﷺ نے اس کے لیے ایک بکری کا دودھ لانے کا حکم دیا۔ اس نے ایک بکری کا دودھ پیا اور دودھ پی لیا۔ پھر دوسری بکری کا پھر
تیسری بکری کا حتیٰ کہ وہ سات بکریوں کا دودھ پیا اور دودھ پی گیا۔ صبح اٹھ کر اس نے اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر اس کے
لیے ایک بکری کا دودھ لانے کا حکم دیا، پھر دوسری بکری کا دودھ لایا گیا تو وہ اس کو پورا نہ پی سکا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا
مومن ایک آنت میں پیتا ہے اور کافرسات آنتوں میں پیتا ہے۔ (امام مسلم کی دیگر روایات میں اس طرح ہے، مومن ایک آنت

میں کھاتا ہے اور کافرات آنتوں میں کھاتا ہے)

(صحیح مسلم، اشربہ: ۱۸۶، (۲۰۶۳، ۵۲۸۱) سنن ترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۲۶، السنن الکبریٰ للنسائی، ج ۳، رقم الحدیث: ۶۸۹۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے سامنے ڈکار لی تو آپ نے فرمایا ہمارے سامنے اپنی ڈکار روک کر رکھو کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ سیر ہو کر کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن بہت زیادہ بھوکے ہوں گے۔ (سنن ترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۳۸۶، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۵۰)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ بھی اسراف ہے کہ تم اپنی ہر خواہش کے مطابق چیز کھا لو۔ (سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۵۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت لجلجہ بن علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب سے میں نبی ﷺ کے ساتھ اسلام لایا ہوں میں نے کبھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا میں صرف اتنا کھاتا پیتا ہوں جس سے میری حیات باقی رہ سکے۔

(المعجم الکبیر، ج ۱۹، رقم الحدیث: ۳۸۷، ص ۲۱۸، مجمع الزوائد، ج ۵، ص ۳۱)

پرہیز کی اہمیت کے متعلق احادیث

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث بختانی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ام المنذر بنت قیس الانصاریہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ (بیماری سے اٹھ کر) کمزور تھے اور ہمارے پاس کھجوروں کا خوشہ لٹکا ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر اس سے کھجوریں کھانے لگے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی کھانے کے لیے کھڑے ہوئے رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمانے لگے، چھوڑو، تم کمزور ہو۔ حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو اور چقدر کا کھانا بنایا تھا۔ میں وہ لے کر آئی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے علی اس سے کھاؤ، یہ تمہارے لیے زیادہ فائدہ مند ہے۔

(سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۸۵۶، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۰۴۳، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۴۲، مسند احمد، ج ۶، ص ۳۶۳، مشکوٰۃ، ج ۲، رقم الحدیث: ۴۲۱۶)

حضرت قتادہ بن النعمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کا دنیا سے اس طرح پرہیز کراتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی شخص استسقاء کے مریض کا پانی سے پرہیز کراتا ہے۔

(سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۰۴۳، صحیح ابن حبان، ج ۲، رقم الحدیث: ۶۶۹، المستدرک، ج ۳، ص ۳۰۹، ۲۰۷)

امام محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ لکھتے ہیں:

ایک ماہر سوادی حکیم نے کہا وہ دوا جس کے ساتھ کوئی بیماری نہ ہو، وہ یہ ہے کہ جب تک بھوک نہ ہو، مت کھاؤ اور ابھی بھوک باقی ہو تو کھانا چھوڑ دو۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بسیار خوری بیماری کی جڑ ہے اور پرہیز کرنا دوا کی جڑ ہے اور بدن کو اس کی عادت کے مطابق عادی بناؤ۔ (احیاء العلوم، ج ۳، ص ۲۲۱، مطبوعہ دار الخیر، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

علامہ محمد بن محمد زبیدی حنفی متوفی ۱۲۰۵ھ لکھتے ہیں:

”پرہیز کرنا دوا کا سردار ہے“ یہ عرب کے حکیم حارث بن کلدہ کا کلام ہے اور امام ابن ابی الدنیانے کتاب الصحت میں وہب بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ طب کارئیس پرہیز ہے اور حکمت کارئیس خاموشی ہے۔

(اتحاف السادة المتقين، ج ۷، ص ۳۰۰، مطبوعہ مینہ، مصر، ۱۳۱۱ھ)

کھانے پینے کے آداب کے متعلق احادیث

حضرت سلمان بنی اشجہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے سے کھانے میں برکت ہوتی ہے۔ میں نے اس کا نبی ﷺ سے ذکر کیا اور میں نے بتایا کہ میں نے تورات میں کیا پڑھا تھا تو آپ نے فرمایا کھانے میں برکت کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے اور کلی کرنے سے ہوتی ہے۔

(سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۵۳، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۷۶۱، مسند احمد، ج ۹، رقم الحدیث: ۲۳۷۹۳، مسند ابوداؤد، الیاسی، رقم الحدیث: ۱۶۷۴)

حضرت انس بن مالک بنی اشجہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو یہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں خیر کی کثرت کرے، وہ کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے اور کلی کرے۔

(سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۲۶۰، دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

حضرت حکم بن عمیر بنی اشجہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک طعام (کی دعوت) میں تھے۔ ایک شخص نے گھروالوں کے خادم سے تولیہ طلب کیا، اس نے کپڑا لا کر دیا اس نے اس سے ہاتھ پونچھے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کپڑے کو تم نے پہنا نہ ہو اس کا تولیہ نہ بناؤ۔ (غالبا آپ کا مطلب یہ تھا کہ اس کام کے لیے پرانے کپڑے استعمال کرو)

(المعجم الکبیر، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۳۹۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ ابن بزاز کردری حنفی متوفی ۸۲۷ھ نے لکھا ہے کہ کھانے کے آداب میں سے یہ ہے کہ پہلے ہاتھ دھوئے اور ہاتھ نہ پونچھے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھولے اور ہاتھ پونچھ لے۔

(فتاویٰ بزاز یہ علی ہاشم الہندی، ج ۶، ص ۳۵۲، مطبعہ امیریہ بولاق، مصر، ۱۳۱۰ھ)

حضرت عمر بن ابی سلمہ بنی اشجہؓ بیان کرتے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت آپ کے پاس طعام رکھا تھا، آپ نے فرمایا اے میرے بیٹے قریب آؤ، بسم اللہ پڑھو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے آگے سے کھاؤ۔

(سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۶۳، صحیح البخاری، ج ۶، رقم الحدیث: ۵۳۷۶، صحیح مسلم، شریہ: ۱۰۸، (۲۰۲۲) ۵۱۷۱، سنن ابی داؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۷۷۷، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۲۶۵، مسند احمد، ج ۵، رقم الحدیث: ۱۶۳۳۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو بسم اللہ پڑھے اگر وہ اس کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول گیا تو کہے بسم اللہ فی اولہ و آخرہ۔

(سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۶۵، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۷۶۷، صحیح ابن حبان، ج ۱۲، رقم الحدیث: ۵۲۱۳، مسند احمد، ج ۱۰، رقم الحدیث: ۲۶۱۳۸، سنن کبریٰ للسیقی، ج ۷، ص ۲۷۶)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ طعام اور مشروب میں پھونک نہیں مارتے تھے اور نہ برتن میں سانس لیتے تھے۔

(سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۲۸۸، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۷۲۸، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۹۶، ۱۸۹۵)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دسترخوان بچھایا جائے تو کوئی شخص دسترخوان اٹھانے سے پہلے کھڑا نہ ہو خواہ اس کا پیٹ بھر گیا ہو وہ اپنا ہاتھ نہ کھینچے حتیٰ کہ قوم فارغ ہو جائے اور اپنا عذر بیان کرے۔ کیونکہ جب کوئی شخص اپنا ہاتھ کھانے سے کھینچ لیتا ہے تو وہ اپنے ہم نشین کو شرمندہ کرتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ابھی اس کو کھانے

کی حاجت ہو۔ (سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۲۹۵، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہوتا ہے جب وہ کوئی چیز کھا کر پانی کر اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے۔

(صحیح مسلم، الذکر والدعا: ۲۳، (۲۷۲۳) سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۲۳)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب کوئی چیز کھاتے یا پیتے تو یہ دعا کرتے الحمد لله الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا من المسلمین۔

(سنن الترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۳۶۸، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۲۸۳)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کھانے کے بعد یہ دعا کی: الحمد لله الذی اطعمنی هذا ورزقنیہ من غیر حول منی ولا قوہ تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

(سنن الترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۳۶۹، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۰۲۳، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۲۸۵)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوالحیثم بن الیمان نے نبی ﷺ کے لیے کھانا تیار کیا۔ نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کو بھی دعوت دی، جب سب کھانے سے فارغ ہو گئے تو نبی ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کو جزا دو۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! اس کی جزا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب کوئی شخص کسی کے گھر جائے اور اس کا کھانا کھائے اور اس کے مشروبات پئے اور وہ اس کے لیے دعا کر دے تو یہ اس کی جزا ہے۔

(سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۸۵۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

کھڑے ہو کر کھانے پینے کی ممانعت کے متعلق احادیث

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی شخص کھڑا ہو کر پانی پئے قداہ نے کہا ہم نے پوچھا اور کھانا، حضرت انس نے فرمایا یہ تو زیادہ برا ہے یا فرمایا: یہ زیادہ خبیث کام ہے۔

(صحیح مسلم، اشریہ: ۱۱۳، (۲۰۲۳) ۵۱۷۷، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۸۶، سنن ابی داؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۷۱۷، سنن ابن

ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۲۳، سنن دارمی، ج ۲، رقم الحدیث: ۲۱۲۷، صحیح ابن حبان، ج ۱۲، رقم الحدیث: ۵۳۲۱، مسند الطیالسی، رقم الحدیث:

۲۰۰۰، مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۸، ص ۲۰۶، سنن کبریٰ، ج ۷، ص ۲۸۱-۲۸۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص ہرگز کھڑے ہو کر پانی نہ پئے سو جو شخص بھول جائے اس کو چاہیے وہ قے کر دے۔ (صحیح مسلم، اشریہ: ۱۱۶، (۲۰۲۶) ۵۱۸۱۱)

اس حدیث کو ائمہ ستہ میں سے صرف امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

کھڑے ہو کر پانی پینے کے جواز کے متعلق احادیث

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

نزال بن برة بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ظہر کی نماز پڑھی، پھر لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوفہ کی کھلی جگہ میں بیٹھ گئے۔ حتیٰ کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا، پھر پانی لایا گیا اور انہوں نے وضو کیا، پھر کھڑے ہو کر وضو کا بچا ہوا پانی پیا،

طبیان القرآن

جلد چہارم

پھر فرمایا لوگ کھڑے ہو کر پانی پینے کو مکروہ کہتے ہیں۔ اور بے شک نبی ﷺ نے اس طرح کیا ہے جس طرح میں نے کیا ہے۔
(صحیح البخاری، ج ۶، رقم الحدیث: ۵۶۱۶، ۵۶۱۵، سنن ابو داؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۷۱۸، سنن النسائی، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۳۰، شرح معانی الآثار، ج ۲، ص ۳۵۷، مسند احمد، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۹۵، مسند ابو-علی، ج ۱، رقم الحدیث: ۳۰۹، ۳۶۸، شامل ترمذی، رقم الحدیث: ۲۱۰، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۱، ص ۷۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پیا۔

(صحیح البخاری، ج ۶، رقم الحدیث: ۵۶۱۷، صحیح مسلم، اشریہ: ۱۳۰، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱، سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۸۹، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۲۹۶۳، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۲۲، صحیح ابن حبان، ج ۱۲، رقم الحدیث: ۵۳۱۹، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۵، ص ۸۶، مسند احمد، ج ۱، ص ۲۱۳، ۲۳۳، ۲۳۹، شرح معانی الآثار، ج ۲، ص ۳۵۸، المعجم الصغیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۳۵۷، مسند ابو-علی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۳۰۶، مسند حمیدی، رقم الحدیث: ۳۸۱، شرح السنہ، ج ۶، رقم الحدیث: ۲۹۳۱-۲۹۳۰)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عمد میں پیدل چلتے ہوئے کھاتے تھے اور کھڑے ہوئے پیتے تھے۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۸۷، سنن ابن ماجہ، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۰۱، صحیح ابن حبان، ج ۱۲، رقم الحدیث: ۵۳۲۵، ۵۳۲۳، ۵۳۲۲، مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۸، ص ۲۰۵، سنن دارمی، ج ۲، رقم الحدیث: ۲۱۲۵، مسند احمد، ج ۲، ص ۱۰۸، طبع قدیم، مسند احمد، ج ۲، رقم الحدیث: ۵۸۷۹، طبع جدید دار الفکر، مسند الطیالسی، رقم الحدیث: ۱۹۰۳، المستقی، رقم الحدیث: ۸۶۷، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۷، ص ۲۸۳، مختصر اتحاف السادہ المہرۃ، ج ۵، رقم الحدیث: ۲۲۳۵)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کھڑے ہو کر (مشروب) پیتے ہوئے دیکھا۔ امام ابو یوسف نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۹۰، مسند احمد، ج ۲، ص ۲۱۵، ۲۰۶، ۱۹۰، ۱۷۹، ۱۷۴، شرح السنہ، ج ۶، رقم الحدیث: ۲۹۳۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے (مشروب) پیتے ہوئے دیکھا ہے۔

(المعجم الاوسط، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۲۳۵، حافظ البیہقی نے کہا اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ مجمع الزوائد، ج ۵، ص ۸۰) حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کھڑے ہوئے (کوئی مشروب) پیتے ہوئے دیکھا۔ اس حدیث کی اسناد صحیح ہے۔ امام بزار کی روایت میں ہے آپ نے کھڑے ہو کر دودھ پیا۔

(مسند ابو-علی، ج ۶، رقم الحدیث: ۳۵۶۰، مسند بزار، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۸۹۹) حافظ البیہقی نے کہا ہے کہ امام ابو-علی اور امام بزار کی سند صحیح ہے۔ (مجمع الزوائد، ج ۵، ص ۷۹) حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ ان کے پاس تشریف لائے، ان کے گھر میں ایک مشک لٹکی ہوئی تھی، آپ نے کھڑے ہو کر مشک کے منہ سے پانی پیا۔

(مسند احمد، ج ۳، ص ۱۱۹، ج ۶، ص ۳۳۱، ۳۷۶، المعجم الکبیر، ج ۲۵، ص ۱۲۷-۱۲۸، المعجم الاوسط، ج ۱، رقم الحدیث: ۶۵۸، شرح معانی الآثار، ج ۲، ص ۳۵۸)

حافظ البیہقی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کی سند میں البراء بن زید ہے۔ اس کو کسی نے ضعیف نہیں کہا۔ (حافظ ابن حجر نے کہا

یہ مقبول ہے۔ تقریباً تہذیب 'ج' ۱ ص ۱۲۳ اور اس حدیث کے باقی تمام راوی صحیح ہیں۔ (مجمع الزوائد 'ج' ۵ ص ۷۹) کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت اور جواز کے متعلق فقہاء اسلام کی آراء علامہ یحییٰ بن شرف نوادی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

کھڑے ہو کر پانی پینے کے جواز اور ممانعت کی دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ ممانعت کراہت تنزیہی پر محمول ہے اور نبی ﷺ کا کھڑے ہو کر پینا بیان جواز پر محمول ہے۔ اور نبی ﷺ کا فعل مکروہ تنزیہی نہیں ہے کیونکہ آپ پر شریعت کا بیان کرنا واجب ہے، آپ کو اس عمل میں واجب کا ثواب ملے گا۔

(صحیح مسلم بشرح النوادی 'ج' ۹ ص ۵۵۳۵، 'المصباح'، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ المکرمہ ۱۳۱۷ھ)

علامہ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم المالکی القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

حضرت انس نے نبی ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ علماء میں سے کسی نے بھی اس ممانعت کو تحریم پر محمول نہیں کیا یہ صرف غیر مقلدین کے اصول کے مطابق ہے۔ جمہور کے نزدیک کھڑے ہو کر پانی پینا جائز ہے اور سلف میں سے حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کا یہی موقف ہے اور جمہور فقہاء اور امام مالک اس سے استدلال کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پیا ہے اور ان کے نزدیک نبی ﷺ کا یہ فعل ممانعت کی احادیث کے بعد ہے، کیونکہ یہ حجت الوداع کا واقعہ ہے تو یہ اس ممانعت کا ناخ ہے، اور آپ کے بعد خلفاء ثلاثہ نے بھی اس ممانعت کے خلاف عمل کیا اور یہ بات بہت بعید ہے کہ ممانعت کی احادیث ان سے مخفی رہیں، جبکہ وہ نبی ﷺ کے ساتھ لازماً رہتے تھے اور دین پر عمل کرنے میں بہت سخت تھے۔ اور اگر نسخ کا قول نہ کیا جائے اور ان احادیث میں تطبیق دی جائے تو یہ کہا جائے گا کہ ممانعت کی احادیث خلاف اولیٰ پر محمول ہیں۔

حضرت انس نے قتادہ کے سوال کے جواب میں یہ فرمایا کہ کھانے کا معاملہ تو اور زیادہ برا ہے۔ اس کا اہل علم میں سے کوئی قائل نہیں ہے اور یہ محض ان کی رائے ہے، روایت نہیں ہے اور اصل اباحت ہے۔

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ آپ نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے اس لیے منع فرمایا ہے کہ کھڑے ہو کر کوئی شخص جلدی سے ڈگڈگا کر پانی پئے گا تو اس کو درد جگر ہو جائے گا یا اس کا گلگاٹھ جائے گا یا اس کے حلق یا معدہ میں درد ہو جائے گا۔ اس لیے اس کو کھڑے ہو کر پانی نہیں پینا چاہیے اور نبی ﷺ نے اس وقت کھڑے ہو کر پانی پیا جب آپ کو یہ خطرہ نہیں تھا۔ یا کسی ضرورت یا حاجت کی بنا پر پیا، خصوصاً اس لیے کہ آپ زمزم پر تھے اور وہ لوگوں کے رش کی جگہ ہے یا آپ نے اس لیے کھڑے ہو کر پانی پیا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ روزے سے نہیں ہیں۔ یا اس لیے کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا مستحب تھا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص ہرگز کھڑے ہو کر پانی نہ پئے۔ سو جس شخص نے بھول کر پیا، وہ قے کر دے۔

اس پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ جو شخص بھول کر کھڑے ہو کر پانی پئے، اس پر قے کرنا واجب نہیں ہے۔ بعض مشائخ نے کہا زیادہ ظاہر یہ ہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور کھڑے ہو کر کھانے کے جواز میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہر چند کہ قتادہ کی رائے اس میں مختلف ہے۔ (المعجم 'ج' ۵ ص ۲۸۶-۲۸۵، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت ۱۳۱۷ھ)

علامہ محمد بن خلیفہ وشتانی ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ لکھتے ہیں:

امام مالک اور اکثر فقہاء نے کھڑے ہو کر پانی پینے کو جائز قرار دیا ہے۔ کیونکہ امام بخاری اور امام ترمذی نے حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے کھڑے ہو کر پانی پیا ہے۔ اور ایک قوم نے ممانعت کی احادیث کی بنا پر کھڑے ہو کر پانی پینے کو مکروہ کہا ہے۔ ہمارے بعض مشائخ نے یہ کہا ہے کہ ممانعت کی احادیث اس شخص کی طرف راجع ہیں جو اپنے اصحاب کے لیے پانی لے کر آیا اور ان کو پانی پلانے سے پہلے خود کھڑے ہو کر پانی پی لیا جبکہ احسن طریقہ یہ ہے کہ قوم کے ساتی کو سب سے آخر میں پانی پینا چاہیے اور ان میں ظاہر تطبیق اس طرح ہے کہ ممانعت کی احادیث تنزیہ پر محمول ہوں اور کھڑے ہو کر پینے کی احادیث جواز پر محمول ہوں یا یہ کہا جائے کہ ممانعت کی احادیث اس پر محمول ہیں کہ کھڑے ہو کر پانی پینے سے صحت بدن کو ضرر کا خطرہ ہے۔ اس لیے آپ نے احتیاطاً کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا اور نغمی نے یہ کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینے سے پیٹ کی بیماری ہوتی ہے۔

قاضی عیاض مالکی نے کہا ہے کہ امام مالک اور امام بخاری نے کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت کی احادیث کو روایت نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک ممانعت کی یہ احادیث صحیح نہیں ہیں۔ انہوں نے صرف جواز کی احادیث روایت کی ہیں۔ امام مسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت کی تین حدیثیں روایت کی ہیں اور تینوں معلول ہیں۔ پہلی حدیث (صحیح مسلم: ۲۰۲۳) قتادہ نے حضرت انس سے روایت کی ہے۔ اور یہ معنعن ہے اور شعبہ قتادہ کی احادیث سے اجتناب کرتے تھے جب تک کہ وہ حدیثانہ کہیں۔ دوسری حدیث (صحیح مسلم: ۲۰۲۵) قتادہ کی ابو یحییٰ الاسواری سے روایت ہے۔ انہوں نے کہا یہ بیسی غیر مشہور ہے اور اس سند میں قتادہ کا اضطراب اس کے معلول ہونے کے لیے کافی ہے۔ علاوہ ازیں یہ احادیث اباحت کے خلاف ہیں جس پر سلف اور خلف کا اجماع ہے۔ تیسری حدیث (صحیح مسلم: ۲۰۲۶) عمرو بن حمزہ کی ابو غطفان سے روایت ہے انہوں نے حضرت ابو ہریرہ سے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص ہرگز کھڑے ہو کر پانی نہ پئے جو بھولے سے پی لے تو وہ قے کر دے۔ عمرو بن حمزہ نے کہا: یہ حدیث دیگر احادیث (اباحت) سے مخالفت کی گنجائش نہیں رکھتی۔ جبکہ صحیح یہ ہے کہ یہ (مؤخر اند کر جملہ) حضرت ابو ہریرہ کا قول ہے۔ (اکمال اکمال المعلم، ج ۷، ص ۱۳۸-۱۳۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ حسین بن محمد الطیبی متوفی ۵۷۳ھ نے علامہ نووی کی طرح دونوں حدیثوں میں تطبیق دی ہے اور ممانعت کی احادیث کو تنزیہ پر اور اباحت کی احادیث کو بیان جواز پر محمول کیا ہے اور اخیر میں لکھا ہے کہ یہ ممانعت تادیب، ارشاد اور اولیٰ اور افضل کام کرنے کی ہدایت پر محمول ہے۔ (شرح الطیبی، ج ۸، ص ۱۸۷-۱۸۶، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی ۱۴۱۳ھ)

ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۳ھ نے بھی علامہ طیبی کی طرح لکھا ہے۔

(مرقات، ج ۸، ص ۲۱۶، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان ۱۳۹۰ھ)

علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

امام مسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت کی احادیث روایت کی ہیں اور بعض احادیث کھڑے ہو کر پانی پینے کے جواز کی ہیں۔ امام بخاری نے روایت کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے وضو کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پیا اور فرمایا لوگ کھڑے ہو کر پانی پینے کو مکروہ کہتے ہیں اور میں نے نبی ﷺ کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے جس طرح تم نے مجھے دیکھا ہے۔ (صحیح البخاری، ج ۶، رقم الحدیث: ۵۶۱۶، ۵۶۱۵، سنن ابوداؤد، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۷۱۸، سنن النسائی، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۳۰، شرح معانی الآثار، ج ۲، ص ۳۵۷) اور امام ترمذی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں پیدل چلتے ہوئے کھاتے تھے اور کھڑے ہوئے پیتے تھے۔ (سنن الترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۸۷) امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے اور امام طحاوی نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر (مشروب) پیتے تھے۔ (شرح معانی الآثار، ج ۲،

ص ۳۵۸، مسند البرز، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۸۹۸) اور امام طحاوی نے حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر مشک کے منہ سے پانی پیا۔ (شرح معانی الآثار، ج ۲، ص ۳۵۸) اس حدیث کو امام احمد اور امام طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ (مسند احمد، ج ۳، ص ۱۱۹، ج ۶، ص ۳۳۱، ۳۷۶، مجتم کبیر، ج ۲۵، ص ۱۲۷-۱۲۶، مجتم اوسط، ج ۱، رقم الحدیث: ۶۵۸) اس کے بعد علامہ عینی نے علامہ نووی اور علامہ طحاوی کی عبارات کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ علامہ نووی کی عبارات ہم نقل کر چکے ہیں اور علامہ ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی متوفی ۳۲۱ھ کی عبارت یہ ہے:

نبی ﷺ نے ہر طریقہ تحریم کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع نہیں فرمایا بلکہ مشک سے منہ لگا کر کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے تاکہ پانی بدبودار نہ ہو جائے، لہذا یہ منع کرنا امت پر شفقت اور رحمت کی وجہ سے تھا، یا امت سے کوئی اور ضرر دور کرنے کے لیے منع فرمایا۔ مبادا انہیں کھڑے ہو کر پانی پینے سے کوئی ضرر لاحق ہو جائے اور جب وہ ضرر دور ہو گیا تو وہ ممانعت بھی اٹھ گئی اور جب متعدد احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے اور صحابہ نے کھڑے ہو کر پانی پیا ہے تو معلوم ہو گیا کہ وہ ممانعت اب اٹھ چکی ہے۔ ہمارے نزدیک ان احادیث کی یہی توجیہ ہے۔

(شرح معانی الآثار، ج ۲، ص ۳۵۹، ملخصاً، مطبوعہ کراچی، عمدة القاری، ج ۹، ص ۲۷۹، مطبوعہ ادارہ الطباعة المنيرية، مصر، ۱۳۳۸ھ) خلاصہ یہ ہے کہ علامہ نووی شافعی اور علامہ طیبی کے نزدیک کھڑے ہو کر پانی پینا خلاف اولیٰ ہے۔ علامہ قرطبی مالکی اور علامہ ابی مالکی کے نزدیک کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت کی احادیث منسوخ ہیں یا پھر آپ نے ضرر کی وجہ سے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ امام ابو جعفر طحاوی حنفی کا بھی یہی موقف ہے۔ علامہ بدر الدین عینی حنفی کا بھی یہی رجحان ہے اور ملا علی قاری حنفی کی رائے یہ ہے کہ آپ نے یہ طور تادیب اور شفقت کے کھڑے ہو کر پینے سے منع فرمایا ہے اور جمہور فقہاء احناف کے نزدیک یہ مکروہ تنزیہی یا خلاف اولیٰ ہے۔

وضو کے بچے ہوئے پانی اور زمزم کے پانی کو کھڑے ہو کر پینے کا استحباب

در مختار شرح تنویر الابصار میں مذکور ہے ”وضو کا بچا ہو پانی اور اسی طرح آب زمزم قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو کر پینا بیٹھ کر پئے اور ان دو پانیوں کے سوا کھڑے ہو کر پینا مکروہ تنزیہی ہے“ اس عبارت سے علامہ شامی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آب زمزم اور وضو کا بقیہ پانی بھی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز اور مباح ہے۔ مستحب نہیں ہے۔ مستحب ان کو بھی بیٹھ کر پینا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

حاصل کلام یہ ہے کہ ان دونوں مواضع پر کھڑے ہو کر پینے کا مکروہ نہ ہونا بھی محل کلام ہے چہ جائیکہ ان میں مستحب کا قول کیا جائے اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ ان مواضع پر کھڑے ہو کر پینا مکروہ نہیں ہے۔ اگرچہ مستحب بھی نہیں ہے کیونکہ زمزم کے پانی میں شفاء ہے۔ اسی طرح وضو کے بقیہ میں بھی شفاء ہے۔

(رد المحتار، ج ۱، ص ۸۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۰۷ھ)

ہمیں اس مسئلہ میں علامہ شامی رحمہ اللہ کی رائے سے اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک آب زمزم کی تعظیم کے قصد سے اس کو قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو کر پینا مستحب اور باعث ثواب ہے کیونکہ آب زمزم شعائر اللہ میں سے ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم کرنا مستحب ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى
الْمُؤْمِنِينَ (الحج: ۳۲)

اور جس نے اللہ کی نشانیوں کی تعظیم کی تو بے شک یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔

علامہ شامی سے مقدم اجلہ فقہاء نے بھی زمزم کے پانی کو کھڑے ہو کر پینا مستحب لکھا ہے۔

علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاری متوفی ۵۵۴۲ھ لکھتے ہیں:

وضوء کے آداب میں سے یہ ہے کہ وضوء کا بچا ہوا پانی قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر پئے اور امام خواہر زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پئے اور اسی طرح زمزم کے پاس بھی کھڑے ہو کر پئے۔

(خلاصۃ الفتاویٰ، ج ۱، ص ۲۵، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کونٹہ)

علامہ حسن بن منصور اوزجندی (قاضی خان) متوفی ۲۹۵ھ نے وضوء کی سنتوں میں لکھا ہے کہ وضوء کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر

پئے۔ (فتاویٰ قاضی خان علی ہاشم السندی، ج ۱، ص ۳۵)

علامہ عالم بن العلاء الانصاری الاندلسی المتوفی ۵۷۸۶ھ لکھتے ہیں:

امام خواہر زادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وضوء کا بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر پئے اور دو جگہوں کے سوا کھڑے ہو کر پانی نہ پئے۔

ایک اس مقام پر اور ایک زمزم پر۔ (فتاویٰ تاتارخانیہ، ج ۱، ص ۱۱۳-۱۱۲، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۳۱۱ھ)

علامہ شیخ حسن بن عمار بن علی الشرنبلالی الحنفی المتوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

وضوء کا بچا ہوا پانی قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر پینا مستحب ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے وضوء کا بچا ہوا

پانی اور زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پیا ہے اور آپ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص ہرگز کھڑے ہو کر نہ پئے اور جو بھول جائے وہ قے

کرے۔ اور علماء کا اجماع ہے کہ یہ ممانعت تزیہی ہے جو کہ طہی بنا پر ہے نہ کہ دینی بنا پر۔

(مراقی الفلاح علی ہاشم اللہادی، ص ۷۷-۷۶، مطبوعہ مصر)

عالم گیری میں بھی وضوء کے بچے ہوئے پانی کو کھڑے ہو کر پینا مستحب لکھا ہے۔ (فتاویٰ ہندیہ، ج ۱، ص ۸، طبع مصر)

نیز علامہ شامی کی اپنی عبارت میں بھی ان کی تحقیق کے ضعیف ہونے کی تصریح ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

اور سراج میں مذکور ہے کہ ان دو جگہوں کے سوا کھڑے ہو کر پانی پینا مستحب نہیں ہے۔ اس عبارت سے استفادہ ہوتا ہے

کہ شارح (علامہ حکنفی صاحب در مختار) کا مختار ضعیف ہے جیسا کہ اس پر حموی وغیرہ نے تنبیہ کی ہے۔ (کیونکہ اس عبارت کا

تقاضا یہ ہے کہ وضوء کا بچا ہوا پانی اور زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے۔)

(رد المحتار، ج ۱، ص ۸۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۷ھ)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا متوفی ۱۳۴۰ھ کا ارشاد ہے:

زمزم اور وضوء کا پانی شرع میں کھڑے ہو کر پینے کا حکم ہے اور لوگوں نے دو اور اپنی طرف سے لگا لیے ہیں۔ ایک سبیل کا

اور دو سرا جھوٹا پانی اور دونوں جھوٹے۔ (الملفوظ، ج ۲، ص ۶، مطبوعہ مدینہ، بلیکسنگ کمپنی، کراچی)

صدر الشریعہ مولانا امجد علی متوفی ۱۳۷۶ھ لکھتے ہیں:

اور بچا ہوا پانی کھڑے ہو کر تھوڑا پی لے کہ شفاء امراض ہے۔

(بہار شریعت، ج ۲، ص ۱۲، مطبوعہ ضیاء القرآن، بلیکیشنز، لاہور)

نیز مولانا امجد علی لکھتے ہیں:

اسی طرح آب زمزم کو بھی کھڑے ہو کر پینا سنت ہے۔ یہ دونوں پانی اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

(بہار شریعت، ج ۱۶، ص ۲۹، مطبوعہ ضیاء القرآن، بلیکیشنز، لاہور)

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ

(اے نبی) آپ کہیے، اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور اس کی

مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً

دی ہوئی پاک چیزوں کو، آپ کہیے یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو

يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ تَفْصِيلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۳۲﴾ قُلْ

خصوصاً ان ہی کے لیے ہیں، ہم جاننے والے لوگوں کے لیے اسی طرح تفصیل سے آیتوں کو بیان کرتے ہیں آپ کہیے

إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَّنَ وَالْأثْمَارَ

کہ میرے رب نے تو صرف بے حیائی کے کاموں کو حرام کیا ہے، خواہ وہ ظاہر ہوں، خواہ پوشیدہ اور گناہ کو اور

الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا

ناحق زیادتی کو، اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ شریک بناؤ جس کی اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی

وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ

اور یہ کہ تم اللہ کے متعلق ایسی بات کہو جسے تم نہیں جانتے ○ اور ہر قوم کے لیے ایک عباد مقرر ہے

فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿۳۴﴾

جب وہ عباد پوری ہو جائے گی تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکیں گے اور نہ ایک گھڑی آگے ہو سکیں گے ○

يَبْنِي أَدَمَ مِمَّا يَأْتِيَنَّكَ رَسُولٌ مِنْكَ يْقَصُّونَ عَلَيْكَ آيَاتِنَا

اے اولادِ آدم! اگر تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہارے سامنے میری آیتیں بیان کریں،

فَمِنَ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۵﴾ وَ

سو جو شخص اللہ سے ڈرا اور نیک ہو گیا، تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ○ اور

الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ

جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان (کو ماننے) سے تکبر کیا، تو وہی لوگ دوزخ والے

النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۶﴾ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ

ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○ پس اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کے متعلق جھوٹی باتیں گھڑ

كذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۖ أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمُ نَصِيبُهُم مِّنَ الْكِتَابِ ط

کہ اللہ پر بہتان بانیے یا اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے ، ان لوگوں کو کتاب کے مطابق ان کا حصہ ملتا رہے گا ،

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُمْ رَسُولُنَا يُتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا إِنَّا كُنْتُمْ

حتیٰ کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی روجوں کو قبض کرنے کے لیے پہنچیں گے ، تو وہ پوچھیں گے

تَدَّعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ط قَالُوا اصْلُوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلٰىٰ اَنْفُسِهِمْ

بتاؤ کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پرستش کرتے تھے ، وہ کہیں گے وہ سب ہم سے کم ہو گئے اور وہ خود اپنے خلاف

اَنْتُمْ كَانُوا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ ادْخُلُوْا فِيْ اُمُوْقَدَّ خَلَّتْ مِنْ

گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے ○ اللہ فرمائے گا اس دوزخ میں داخل ہو جاؤ جس میں تم سے

قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنَّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ

پہلے گزے ہوئے جن اور انس داخل ہو چکے ہیں ، جب بھی کوئی جماعت (دوزخ میں) داخل ہوگی

لَعْنَتٌ اٰخِرَتَهَا ط حَتّٰى اِذَا رَاكُوفِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اٰخِرُهُمْ

تو وہ اپنی جیسی جماعت پر لعنت کرے گی ، حتیٰ کہ جب اس میں سب جمع ہو جائیں گے تو بعد والے پہلوں کے

لَا وِلٰهُمُ رَبٌّ اِلَّا هُوَ لَا يَرٰ اَصْحٰبُ النَّارِ اِلَّا اَعْيُنُهُمْ اِيَّاكُمْ يَتَوَفَّوْنَ

متعلق کہیں گے ، اے ہمارے رب : ہم کو انہوں نے گمراہ کیا تھا ، سو تو ان کو دگن آگ کا عذاب دے ،

قَالَ لِكُلِّ ضِعْفٍ وَلٰكِنْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَالَتْ اُولٰٓئِهِمْ

اللہ فرمائے گا ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے ○ اور پہلے لوگ بعد والوں سے کہیں گے

لَا خُرَابُهَا فَمَا كَانْ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فذُقُوا الْعَذَابَ

ہمیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے سو عذاب کو چکھو اس

بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُونَ ۷

سب سے جو تم کرتے تھے ۷

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے نبی!) آپ کہئے: اللہ کی زینت کو کس نے حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور اس کی دہی ہوئی پاک چیزوں کو؟ آپ کہئے یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خصوصاً ان ہی کے لیے ہیں ہم جاننے والے لوگوں کے لیے اسی طرح تفصیل سے آیتوں کو بیان کرتے ہیں (الاعراف: ۳۲) لباس پہنتے وقت دعا کرنے اور شکر ادا کرنے کے متعلق احادیث اس آیت میں زینت سے مراد لباس ہے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث ذکر کی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: کھاؤ اور پو اور لباس پہنو اور صدقہ کرو بغیر فضول خرچی اور تکبر کے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: تم جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو جب تک فضول خرچ یا تکبر نہ ہو۔

(صحیح البخاری کتاب اللباس، باب الج ۷، ص ۳۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں:

زمانہ جاہلیت میں لوگ کعبہ کا برہنہ طواف کرتے تھے اور پاک اور حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے تب یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ان لوگوں سے فرمائیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے زینت پیدا کی ہے تم خوبصورت لباس پہنو اور اللہ کے رزق میں سے حلال چیزیں کھاؤ۔ (جامع البیان ج ۸، ص ۱۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تو اس کا نام لیتے۔ خواہ قمیص ہو یا عمامہ ہو پھر یہ دعا کرتے: اے اللہ! تیرے لیے حمد ہے کہ تو نے مجھے یہ کپڑا پہنایا، میں تجھ سے اس کپڑے کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور جس کے لیے یہ بنایا گیا ہے اس کی خیر کا سوال کرتا ہوں اور میں اس کپڑے کے شر سے اور جس کے لیے یہ بنایا گیا ہے اس کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۰۲۰، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۷۷۳)

حضرت ام خالدہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ کپڑے آئے ان میں ایک چھوٹی اوننی چادر تھی۔ آپ نے پوچھا: تمہاری رائے میں اس کا کون زیادہ مستحق ہے؟ لوگ خاموش رہے۔ آپ نے فرمایا: میرے پاس ام خالدہ کو لاؤ۔ ان کو بلایا گیا تو آپ نے وہ چادر ان کو پہنادی آپ نے دوبار فرمایا: تم اس کو پرانا کرو اور دوسروں کے لیے چھوڑو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۰۲۳، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۸۴۵)

لباس کی انواع اور اقسام کے متعلق احادیث

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ کو تمام کپڑوں میں قمیص سب سے زیادہ پسند تھی۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۰۲۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۷۶۸)

حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شيروانیاں تقسیم کیں اور مخرمہ کو کچھ نہیں دیا۔ مخرمہ نے کہا: اے بیٹے مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے چلو میں ان کو لے گیا۔ پھر کہا: رسول اللہ ﷺ کو میرے لیے بلاؤ۔ میں

تبیان القرآن

جلد چہارم

نے آپ کو بلایا۔ آپ تشریف لائے در آنحالیکہ آپ کے پاس ان شیرانیوں میں سے ایک شیروانی تھی۔ آپ نے فرمایا: میں نے تمہارے لیے اس کو چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۰۲۸، صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۸۰۰)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس شخص کو تہبند میسر نہ ہو وہ شلو اور پنے اور جس شخص کو جوتے میسر نہ ہوں وہ موزے پنے۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۸۰۴)

حضرت معتمر کے والد بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو زرد رنگ کی اونی ٹوپی پنے ہوئے دیکھا۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۸۰۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سفید ٹوپی پنتے تھے۔ (المعجم الاوسط، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۱۷۹، مجمع الزوائد، ج ۵، ص ۱۲۱) حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قضاء حاجت کے لیے گئے، پھر آپ آئے، میں آپ کے پاس پانی لے کر آیا۔ آپ نے وضو کیا۔ اس وقت آپ نے شامی کوٹ پہنا ہوا تھا۔ آپ نے کلی کی تاک میں پانی ڈالا اور چہرہ دھویا۔ پھر آپ اپنی کلائیوں کو آستینوں سے نکالنے لگے۔ وہ آستینیں تنگ تھیں پھر آپ نے کوٹ کے نیچے سے ہاتھوں کو نکال لیا اور کلائیوں کو دھویا اور سر پر اور موزوں پر مسح کیا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۷۹۸، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۶۱۶، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۱۲۳)

جعفر بن عمرو بن حرث کے والد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا نبی ﷺ منبر پر تشریف فرماتے اور آپ نے سیاہ عمامہ باندھا ہوا تھا اور عمامہ کی ایک طرف (شملہ) کو دو کندھوں کے درمیان ڈالا ہوا تھا۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۰۷۷، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۱۳۵۹، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۵۳۳۵، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۸۲۱، ۳۵۸۷)

لباس کے رنگوں کے متعلق احادیث

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم سفید لباس پہنو وہ تمہارا بہترین لباس ہے اور اسی میں اپنے مردوں کو کفن دو اور بہترین سرمہ اٹھ ہے یہ نظر تیز کرتا ہے اور بال اگاتا ہے۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۰۶۱، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۵۶۶)

حضرت براء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ متوسط قامت کے تھے۔ میں نے آپ کو سرخ حله (ایک قسم کی دو چادریں) ایک بہ طور تہبند باندھی جائے اور ایک بالائی بدن پر لپیٹ لی جائے) میں دیکھا۔ میں نے آپ سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں دیکھی۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۸۳۲)

حضرت براء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سرخ حله میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ حسین کوئی ذی لمہ (جس کے بال کانوں کی لو سے متجاوز ہوں) نہیں دیکھا۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۳۳۷، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۱۸۳، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۷۳۰، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۵۲۳۸، مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: ۴۷۶۷)

عبداللہ بن بریدہ اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما دو سرخ قمیصیں پنے ہوئے آئے وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر سے اترے اور ان کو اپنی گود میں بٹھالیا۔ الحدیث۔ (جن احادیث میں سرخ لباس کی ممانعت ہے وہ مرجوح اور ضعیف ہیں یا مودول ہیں)

(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: ۳۷۸۱، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۶۰۰، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۱۱۰۹، سنن النسائی، رقم

الحدیث: ۱۳۱۲)

زید بن اسلم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنی داڑھی کو زرد رنگ سے رنگتے تھے حتیٰ کہ ان کے کپڑے بھی زرد رنگ سے بھر جاتے تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ زرد رنگ سے کیوں رنگتے ہیں؟ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس رنگ سے رنگتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ کو اس سے زیادہ اور کوئی رنگ پسند نہیں تھا اور آپ اپنے تمام کپڑوں کو رنگتے تھے حتیٰ کہ عمامہ کو بھی۔ (جن احادیث میں زرد لباس کی ممانعت ہے، وہ بھی ضعیف یا مودول ہیں)

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۰۶۳، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۵۰۸۸، صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۸۵۱، صحیح مسلم، رقم الحدیث:

(۱۱۸۷)

حضرت ابو رثہ بن شیبہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والد بنی شیبہ کے ساتھ نبی ﷺ کی طرف گیا۔ میں نے دیکھا آپ پر دو سبز رنگ کی چادریں تھیں۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۰۶۵، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۵۳۲۱، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۸۲۱، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث:

۵۹۹۵، مسند احمد، رقم الحدیث: ۷۱۳۱، المعجم الکبیر، ج ۲۲، رقم الحدیث: ۷۲۱، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۸، ص ۲۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ ایک صبح کو باہر گئے اور آپ کے اوپر سیاہ رنگ کی اوننی چادر تھی۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۸۲۲، صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۰۸۱، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۰۳۲)

اجلے، صاف اور عمدہ لباس پہننے کے متعلق احادیث

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی تکبر ہو، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک شخص نے کہا: ایک آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کی جوتی اچھی ہو۔ آپ نے فرمایا: اللہ جمیل (حسین) ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے۔ تکبر حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۹۱، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۰۰۶، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۰۹۱، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۵۹،

شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۱۹۲)

امام احمد کی روایت میں ہے اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے یہ اچھا لگتا ہے کہ میرے کپڑے دھلے ہوئے ہوں اور میرے سر میں تیل لگا ہوا ہو اور میری جوتی نئی ہو۔ اس نے اور بھی کئی چیزیں ذکر کیں حتیٰ کہ اپنے چابک کی ڈوری کا بھی ذکر کیا اور پوچھا یا رسول اللہ! کیا یہ چیزیں تکبر سے ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں یہ جمال ہے اور بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال سے محبت کرتا ہے۔ لیکن تکبر حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔

(مسند احمد، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۷۸۹، طبع جدید، دار الفکر، شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد، ج ۳، رقم

الحدیث: ۳۷۸۹، طبع دار الحدیث، قاہرہ، ۱۳۱۶ھ)

ابوالاحوص کے والد بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا آپ نے مجھے گھٹیا کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو آپ نے فرمایا: کیا تمہارے پاس مال ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! میرے پاس ہر قسم کا مال ہے۔ (دوسری روایت میں ہے: میرے پاس اونٹ، بکریاں، گھوڑے، غلام ہر قسم کا مال ہے) آپ نے فرمایا جب اللہ نے تمہیں مال دیا ہے تو تم پر اس کا اثر ظاہر ہونا

چاہیے۔ (سنن النسائی، رقم الحدیث: ۵۲۳۹، ۵۲۳۸، ۵۳۰۹، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۰۶۳، شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۱۹۷)

تبیان القرآن

جلد چہارم

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا بنی شیبہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ یہ پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھے۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۸۲۸، مسند احمد، ج ۷، رقم الحدیث: ۱۹۹۵۳، دار الفکر، طبع جدید)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے آپ نے ایک شخص کو دیکھا جس کے بال غبار آلود اور بکھرے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا: کیا اس کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس کے ساتھ یہ اپنے بالوں کو سنوار سکے؟ ایک اور شخص کو دیکھا جو میلے کپڑے پہنے ہوئے تھا آپ نے فرمایا: کیا اس شخص کو پانی میسر نہیں ہے جس سے یہ اپنے کپڑوں کو دھو سکے۔ (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۰۶۲، شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۲۲۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسلام صاف ستھرا ہے سو تم صاف ستھرے رہو، کیونکہ جنت میں صرف صاف ستھرے لوگ داخل ہوں گے۔

(المعجم الاوسط، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۸۹۰) (اس کی سند ضعیف ہے)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں گئے۔ جس وقت ہم ایک درخت کے نیچے ٹھہرے ہوئے تھے تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ لیا۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! سائے کی طرف آ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے۔ اس وقت مجھے دسترخوان میں ایک چھوٹی سی ککڑی ملی۔ آپ نے پوچھا یہ تم کو کہاں سے ملی؟ پھر آپ نے کوئی بات ذکر کی۔ پھر ایک شخص چلا گیا جس نے دو پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف دیکھ کر فرمایا: کیا اس کے پاس ان دو کپڑوں کے سوا اور کوئی کپڑا نہیں ہے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کے دو کپڑے صندوق میں رکھے ہوئے ہیں جو میں نے اس کو پہنائے تھے۔ آپ نے فرمایا: اس کو بلاؤ اور اس سے کہو کہ وہ دو کپڑے پہن لے۔ اس نے جا کر وہ کپڑے پہن لیے۔ (الحدیث) امام بزار نے اس حدیث کو متعدد اسانید سے روایت کیا ہے جن میں سے ایک کی سند صحیح ہے۔ (مسند البراز، رقم الحدیث: ۲۹۶۲، ۲۹۶۳، ۲۹۶۴)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے ایک کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: کیا تم میں سے ہر شخص کے پاس دو کپڑے ہیں؟ پھر ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تو حضرت عمر نے کہا: جب اللہ نے وسعت دی ہے تو وسعت کو اختیار کرو۔ (الحدیث) (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۶۵)

محمد بن سیرین نے کہا: تمیم نے ایک ہزار درہم کی چادر خریدی جس کو پہن کر وہ نماز پڑھتے تھے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۸، رقم الحدیث: ۳۹۶۵)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ میں سے ایک شخص کو سات سو درہم کا لباس خرید کر پہنایا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۸، رقم الحدیث: ۳۹۶۶)

قیمتی اور معمولی لباس پہننے کی احادیث میں تطبیق

بعض احادیث میں خوب صورت لباس نہ پہننے اور معمولی کپڑے پہننے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ہم پہلے وہ احادیث بیان کریں گے اور پھر ان کی توجیہات ذکر کریں گے۔

سہل بن معاذ بن انس رضی اللہ عنہما اپنے والد بنی شیبہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے اللہ کے لیے تواضع کرتے ہوئے (نمائت قیمتی) لباس کو ترک کر دیا، حالانکہ وہ اس پر قادر تھا، اللہ

تعالیٰ قیامت کے دن اس کو لوگوں کے سامنے بلائے گا حتیٰ کہ اس کو اختیار دے گا کہ وہ ایمان کے حلوں میں سے جس حلہ کو چاہے پہن لے۔ (یہ حدیث حسن ہے)

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۳۸۹، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۰۳۳، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۵۶۲، مسند احمد، ج ۷، رقم الحدیث: ۱۹۷۷۹، المستدرک، ج ۱، ص ۶۱، ج ۲، ص ۱۸۳، شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۱۳۸)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے قدرت کے باوجود خوبصورت لباس کو تواضعاً ترک کر دیا اللہ اس کو عزت کے حلے پہنائے گا۔ (یہ حدیث ضعیف ہے)

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۷۷۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل اس شخص سے محبت کرتا ہے جو روزمرہ استعمال کے عام کپڑے پہنتا ہے اور اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس نے کیا پہنا ہے۔ اس حدیث کی سند میں ابولہب ہے اور وہ ضعیف ہے۔ (شعب الایمان، رقم الحدیث: ۶۱۷۶)

ان روایات کا ایک جواب یہ ہے کہ جن احادیث میں عمدہ اور قیمتی کپڑے پہننے کی ترغیب دی گئی ہے، وہ صحیح السند ہیں اور یہ احادیث حسن یا ضعیف ہیں۔ اس لیے یہ روایات ان احادیث سے متصادم ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اسلام کا فناء اعتدال اور میانہ روی کی ہدایت دینا ہے۔ انسان نہ تو ایسا کرے کہ اچھے اور صاف ستھرے لباس پر قدرت کے باوجود پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے اور نہ ایسا کرے کہ نہایت فاخرانہ اور طمطراق والی پوشاک پہنے۔ نہ اس قدر گھٹیا اور معمولی کپڑے پہنے جس سے اس کی خساست اور دنائت ظاہر ہو اور نہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر قیمتی لباس پہنے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ مسلمان کی قلبی واردات اور دلی کیفیات بدلتی رہتی ہیں۔ کبھی اس پر صبر اور زہد کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ روزمرہ کے معمولی کپڑے پہنتا ہے اور کبھی اس پر اللہ کی نعمتوں کے اظہار اور شکر کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ عمدہ اور قیمتی لباس پہنتا ہے۔ ہم جس آیت کی تفسیر کر رہے ہیں، اس میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی زینت کے اظہار کا حکم ہے، اس لیے عمدہ اور قیمتی لباس کے سلسلے میں مزید چند احادیث بیان کر رہے ہیں۔

امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن الحنظلہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم اپنے بھائیوں کے سردار ہو سو تم اپنی جوتیوں کو ٹھیک کرو اور حسین لباس پہنو۔ (الحدیث) (شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۰۴)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھے وہب بن کیسان نے بتایا۔ میں نے نبی ﷺ کے چھ اصحاب کو دیکھا جو خز (ریشم اور اون کا مخلوط) لباس پہنتے تھے۔ شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۱۱۲

ابن انس بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر کے تمام فقہاء کو حسین لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے۔

(شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۲۲۰)

سنت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی میلے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔ آپ کبھی کبھی تیل لگانا پسند کرتے تھے اور سر میں کنگھی کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ میلے کپڑوں اور پرانے بالوں کو ناپسند کرتا ہے۔ (شعب الایمان، ج ۵، رقم الحدیث: ۶۲۲۶)

لباس پہننے کے شرعی اور فقہی احکام

علامہ سید محمد امین ابن عبدین شامی حنفی متونی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

لباس پہننا بعض صورتوں میں فرض ہے، بعض میں واجب، بعض میں مستحب، بعض میں مباح، بعض میں مکروہ اور بعض صورتوں میں حرام ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

فرض: لباس کی جتنی مقدار شرم گاہ چھپانے کے لیے ضروری ہو اتنی مقدار کا لباس پہننا فرض ہے۔ (مرد کی شرم گاہ ناف سے گھٹنے تک ہے اور عورت کا تمام بدن شرم گاہ ہے سوائے چہرے، ہاتھ اور پیروں کے، محارم کے سامنے چہرے، ہاتھ اور پیروں کو ظاہر کرنا جائز ہے اور اجنبی مردوں کے سامنے بلا ضرورت شرعی ان کا ظاہر کرنا جائز نہیں ہے)

واجب: سردی اور گرمی کے اثرات سے جسم کو محفوظ کرنے کیلئے جس قدر لباس پہننا ضروری ہو اس کا پہننا واجب ہے۔

مستحب: اظہار زینت کے لیے قدر زائد اور خوبصورت لباس پہننا مستحب ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے کے اوپر اس کی نعمت کے آثار دکھائی دیں۔ اسی طرح سفید، سیاہ اور سبز رنگ کا لباس پہننا مستحب ہے۔

مباح: جمعہ اور عید کے مواقع پر اور تقریبات اور محافل میں قیمتی اور نفیس لباس پہننا مباح ہے۔ اسی طرح رنگنے کے بعد حیوانوں اور درندوں کی کھالوں کا لباس پہننا بھی مباح ہے۔

مکروہ: ہر وقت قیمتی اور نفیس پوشاک پہننا مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے ضرورت مندوں کے دلوں میں بغض پیدا ہوتا ہے اور اس میں اسراف ہے اور تکبر کا خطرہ ہے۔ تکبر یہ ہے کہ وہ قیمتی اور فاخرانہ لباس پہن کر معمولی کپڑے پہننے والوں کو کمتر اور حقیر جانے۔

حرام: ریشم کا لباس مردوں کے لیے حرام ہے البتہ اگر کسی کپڑے پر چار انگل کی مقدار ریشم کے نیل بوٹے بنے ہوئے ہوں تو پھر جائز ہے۔ اسی طرح اگر چار انگل کی مقدار سونے کا کام کیا ہو تو پھر بھی جائز ہے اور اس کی اصل یہ حدیث ہے:

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما نے جابہ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: نبی اللہ ﷺ نے ریشم کے پہننے سے منع فرمایا سوا دویا تین یا چار انگلیوں کی مقدار کے۔

(صحیح مسلم، لباس: ۱۵ (۲۰۶۹) ۵۳۱۸، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۷۲۷، سنن کبریٰ للنسائی، رقم الحدیث: ۹۶۳۰، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۵۳۳۱، مسند احمد، ج ۱، رقم الحدیث: ۳۶۵)

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ رسول اللہ ﷺ کا جبہ ہے۔ انہوں نے ایک طیالسی کسروانی جبہ نکالا جس کی آستینوں اور گریبان پر ریشم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ حضرت اسماء نے کہا: جبہ حضرت عائشہ کی وفات تک ان کے پاس تھا اور جب ان کی وفات ہوئی تو پھر میں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ نبی ﷺ اس جبہ کو پہنتے تھے۔ ہم اس جبہ کو دھو کر اس کا پانی بیماروں کو پلاتے ہیں اور اس جبہ سے ان کے لیے شفاء طلب کرتے ہیں۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۴۰۵۴، صحیح مسلم، لباس: ۱۰ (۲۰۶۹) ۵۳۱۰، سنن کبریٰ للنسائی، ج ۷، رقم الحدیث: ۹۵۸۸، رد المحتار، ج ۵، ص ۲۲۳-۲۲۴، ملخصاً و موضحاً، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

زینت اور تجمل کے متعلق مفسرین مذاہب اربعہ کی تحقیق

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متونی ۶۶۸ھ زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ آیات عمدہ اور نفیس کپڑوں کے پہننے پر دلالت کرتی ہیں۔ عید، جمعہ، لوگوں سے ملاقات اور رشتہ داروں کی ملاقات کے وقت قیمتی اور خوبصورت لباس پہننا چاہیے۔ امام ابو العالیہ کہتے ہیں کہ مسلمان جب ایک دوسرے کی زیارت کرتے تھے تو خوبصورت لباس پہنتے تھے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے مسجد کے دروازے پر ایک ریشمی حلہ فروخت ہوتے ہوئے دیکھا، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! اگر آپ جمعہ اور وفود سے ملاقات کے وقت پہننے کے لیے یہ حلہ خرید لیتے تو اچھا ہوتا! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس کپڑے کو وہ پہنتا ہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ نبی ﷺ نے اس لباس کے خوبصورت ہونے کی بناء پر اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ اس کے ریشمی ہونے کی وجہ سے منع فرمایا تھا۔ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار درہم کا ایک حلہ خریدا جس کو پہن کر وہ نماز پڑھتے تھے۔ اور مالک بن دینار عدن کی ایک نہایت قیمتی پوشاک منگا کر پہنتے تھے۔ امام احمد بن حنبل ایک دینار کا لباس خرید کر پہنتے تھے۔ یہ حضرات کب قیمتی کپڑوں سے اعراض کر کے موٹے جھوٹے کپڑوں کو ترجیح دینے والے تھے؟ اور ”لباس التقویٰ ذالک خیر“ کا معنی معمولی اور گھٹیا کپڑے پہننا نہیں ہے، ورنہ یہ نفوس قدسیہ لباس التقویٰ کو ترک کرنے والے نہیں تھے، بلکہ یہی لوگ اصحاب علم، ارباب معرفت اور اہل تقویٰ تھے اور ثاٹ اور گاڑھا پہننے والے دوسرے لوگ تو فقط اہل دعویٰ ہیں اور ان کے دل تقویٰ سے خالی ہیں۔ خالد بن شاذب بیان کرتے ہیں کہ میں حسن بصری کے پاس گیا، ان سے فرقد ملنے کے لیے آئے۔ حسن بصری نے ان کی چادر دیکھ کر کہا اے ام فرقد کے بیٹے! نیکی اس چادر میں نہیں ہے، نیکی سینے میں ہوتی ہے اور اس کی تصدیق عمل سے ہوتی ہے، اسی طرح معروف کرخی کے بھتیجے ابو محمد، ابو الحسن کے پاس آئی جبہ پہن کر گئے، ابو الحسن نے ان سے کہا: اے ابو محمد آیا تم نے اپنے دل کو صوفی بنایا ہے یا اپنے جسم کو؟ اپنے دل کو صاف رکھو خواہ لباس کسی قسم کا پہنو! علامہ ابو الفرج ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کہا: میں معمولی اور پیوند لگا ہوا لباس چار وجہ سے ناپسند کرتا ہوں:

۱- یہ سلف صالحین کا لباس نہیں ہے اور سلف صالحین بلا ضرورت لباس میں پیوند نہیں لگاتے تھے۔

۲- اس قسم کے لباس سے غربت کا اظہار ہوتا ہے، حالانکہ انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے آثار کو ظاہر کرے۔

۳- اس قسم کا لباس پہننے سے زہد کا اظہار ہوتا ہے، حالانکہ ہمیں زہد کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔

۴- اس قسم کا لباس عموماً ان لوگوں کا شعار ہے جو ظاہر شریعت سے خارج ہیں اور جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے، اس کا شمار اسی قوم سے ہوتا ہے۔

علامہ طبری نے کہا ہے کہ جس شخص نے بالوں اور اون کے لباس کو سوتی لباس کے حصول کے باوجود ترجیح دی، اس نے خطا کی، اسی طرح اس شخص نے بھی خطا کی جس نے گوشت ترک کر کے دال اور سبزی کھانا شروع کر دی۔ (یہاں اون کے کپڑوں سے یہ مراد ہے کہ بعض لوگ صوفیت کا اظہار کرنے کے لیے اون والی کھال کا لباس بنا لیتے تھے، جس کی ہیئت کذائی آج کل کے گاڑھے اور ثاٹ سے بھی زیادہ بد نما ہوتی تھی۔ آج کل کپڑے کی صنعت بہت ترقی کر چکی ہے اور اون کو متعدد کیمیائی مراحل سے گزار کر اس کا نہایت صاف شفاف اور قیمتی لباس تیار کیا جاتا ہے۔ ایسا لباس اس حکم میں داخل نہیں ہے، سعیدی غفرلہ) بشر بن حارث سے اون پہننے کے متعلق سوال کیا گیا تو ان کو برا لگا اور ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ انہوں نے کہا شہروں میں آئی کپڑے پہننے سے میرے نزدیک زرد رنگ کا اور ریشم اور اون کا مخلوط کپڑا پہننا بہتر ہے۔

علامہ ابو الفرج نے کہا سلف صالحین متوسط کپڑوں کا لباس پہنتے تھے، بہت قیمتی لباس پہنتے تھے نہ بہت گھٹیا کپڑے پہنتے تھے

اور جمعہ، عید اور رشتہ داروں سے ملاقات کے وقت بہت عمدہ لباس پہنتے تھے اور بہت معمولی اور حقیر کپڑے پہننا فقر اور زہد کے اظہار کو متضمن ہے اور یہ ایک طرح سے اللہ تعالیٰ سے شکایت کرنا ہے اور اس قسم کے لباس سے لباس پہننے والے کی تحقیر ہوتی ہے اور یہ تمام باتیں مکروہ اور ممنوع ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ عمدہ لباس پہننا خواہش نفس کی پیروی ہے، اور ہمیں نفسانی خواہشوں سے جہاد کرنے کا حکم دیا ہے، نیز اس میں مخلوق کو اپنی زیبائش دکھانا ہے، حالانکہ ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہمارے تمام افعال اللہ کے لیے ہوں مخلوق کے لیے نہ ہوں، اس کا جواب یہ ہے کہ نفس کی ہر خواہش مذموم نہیں ہے اور نہ مخلوق کے لیے ہر زینت مکروہ ہے۔ اس چیز سے اس وقت ممانعت کی جائے گی جب شریعت نے اس سے منع کیا ہو یا اس کی بنیاد دین اور عبادت میں ریاکاری ہو۔ انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ خوبصورت دکھائی دے اور اس چیز میں شریعت نے اس پر ملامت نہیں کی۔ اسی وجہ سے بالوں میں کنگھی کی جاتی ہے اور آئینہ دیکھا جاتا ہے اور عمامہ درست کیا جاتا ہے اور اندر معمولی کپڑے اور اوپر قیمتی پوشاک پہنی جاتی ہے اور ان میں سے کوئی چیز مکروہ اور مذموم نہیں ہے اور مکحول نے حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت کیا ہے کہ کچھ صحابہ دروازہ کے باہر حضور کے منتظر تھے، آپ ان سے ملنے کے لیے جانا چاہتے تھے، گھر میں ایک چھاگل میں پانی تھا آپ پانی میں دیکھ کر اپنی داڑھی اور بالوں کو درست کرنے لگے۔

میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ بھی ایسا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: ہاں جب کوئی شخص اپنے بھائیوں سے ملنے جائے تو اپنے آپ کو تیار کر کے جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جمیل (خوب رو) ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے اور امام مسلم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے دل میں ایک ذرہ کے برابر بھی تکبر ہو، وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ ایک شخص نے کہا: ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کے جوتے اچھے ہوں۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر، حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔ اس معنی میں بکثرت احادیث ہیں جو صفائی اور حسن و جمال کے حصول پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت خالد بن معدان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کنگھی، آئینہ، تیل، مسواک اور سرمہ کو ساتھ لے کر سفر میں جاتے تھے۔ امام ابن سعد نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ سر میں بہت تیل لگاتے تھے اور پانی سے داڑھی کو درست کرتے تھے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی اور آپ سونے سے قبل ہر آنکھ میں تین بار سرمہ لگاتے تھے۔

(الجامع لاحکام القرآن، جزء ۷، ص ۱۷۸-۱۷۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں زینت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

۱- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ زینت سے مراد لباس ہے جس سے انسان اپنی شرم گاہ کو چھپا سکے۔

۲- زینت سے مراد عام ہے اور اس میں زینت کی تمام اقسام شامل ہیں۔ اس میں بدن کو صاف کرنا، سواریاں رکھنا اور انواع و اقسام کے زیورات شامل ہیں اور اگر مردوں پر سونے، چاندی اور ریشم کی حرمت کے متعلق نص نہ آئی ہوتی تو وہ بھی اس عموم میں شامل ہوتے اور پاکیزہ رزق سے مراد بھی عام ہے اس میں تمام پسندیدہ اور لذیذ کھانے پینے کی چیزیں داخل ہیں اور اس میں ازواج سے لذت اندوزی اور خوشبو لگانا بھی داخل ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں گوشت نہ کھاؤں! آپ نے فرمایا: نرم روی اختیار کرو، کیونکہ مجھے جب گوشت مل جاتا ہے تو میں گوشت کھاتا ہوں اور اگر میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں کہ وہ مجھے ہر روز گوشت کھلائے تو وہ ایسا کرے گا۔ حضرت عثمان بن مظعون نے کہا میرے دل میں آتا ہے کہ میں خوشبو نہ لگاؤں! آپ نے فرمایا: سختی نہ کرو۔ کیونکہ جبرئیل نے مجھے کبھی کبھی خوشبو لگانے کا حکم پہنچایا ہے اور یہ کہا ہے کہ جمعہ کے دن خوشبو لگانے کو ترک نہ کریں پھر آپ نے فرمایا: اے عثمان! میری سنت سے اعراض نہ کرو، کیونکہ جس شخص نے میری سنت سے اعراض کیا اور توبہ سے پہلے مر گیا تو فرشتے اس کا چہرے میرے حوض سے پھیر دیں گے۔ یہ حدیث اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت اسلامیہ میں زینت کی تمام اقسام جائز ہیں اور ان سے متصف ہونے کی اجازت ہے۔ ماسوائے چیزوں کے جن کی کسی دلیل سے ممانعت ہو، اسی لیے ہم نے کہا کہ قل من حرم زینة اللہ میں زینت کی تمام اقسام داخل ہیں۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۳۱-۲۳۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

زینت کی تفسیر میں دو قول ہیں:

۱- زینت سے مراد کپڑے ہیں اور اس کی تفسیر میں تین قول ہیں:

(الف) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری اور علماء کی ایک جماعت نے کہا اس سے یہ مراد ہے کہ کپڑے پہن کر طواف کیا کرو۔

(ب) مجاہد اور زجاج وغیرہ نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ نماز میں شرمگاہ کو ڈھانپا جائے۔

(ج) علامہ ماوردی نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ جمعہ اور عید وغیرہ میں خوبصورت اور دیدہ زیب لباس پہنا جائے۔

۲- ابورزین نے کہا زینت سے کنگھی وغیرہ کرنا مراد ہے۔ (زاد المسیر، ج ۳، ص ۱۸۷، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت)

علامہ ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے خذوا زینتکم عند کل مسجد یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسجد میں جانے کے لیے زینت والا لباس پہننا مستحب ہے اور روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جمعہ اور عید میں اس کو میرے لیے مستحب کیا گیا ہے۔ (احکام القرآن، ج ۳، ص ۳۳، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں ہے خذوا زینتکم عند کل مسجد بعض مفسرین نے یہاں زینت سے خوبصورت لباس مراد لیا ہے۔ کیونکہ اس لفظ سے یہی معنی متبادر ہے۔ امام باقر رضی اللہ عنہ کی طرف بھی یہی تفسیر منسوب ہے۔ روایت ہے کہ جب امام حسن رضی اللہ عنہ نماز پڑھنے جاتے تو نہایت عمدہ لباس پہنتے۔ ان سے کہا گیا کہ اے ابن رسول اللہ! آپ اس قدر عمدہ لباس کیوں پہنتے ہیں؟ فرمایا اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تو میں اپنے رب کے لیے جمال اختیار کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ زینت سنت ہے واجب نہیں ہے۔ (روح المعانی، ج ۸، ص ۱۰۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

قل من حرم زینة اللہ (الایہ) کی تفسیر میں علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ جس وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو انہوں نے خنز (ریشم اور اون کا مخلوط کپڑا) کا جبہ پہنا ہوا تھا۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خوارج کی طرف بھیجا تو انہوں نے سب سے افضل کپڑے

پننے، سب سے اچھی خوشبو لگائی اور سب سے اچھی سواری پر سوار ہوئے اور جب خوارج نے ان کو دیکھ کر یہ کہا کہ آپ ہم میں سب سے افضل ہیں اور آپ منکبرین کا لباس پہن کر اور ان کی سواری پر بیٹھ کر آئے ہیں تو حضرت ابن عباس نے یہ آیت پڑھی: قل من حرم زينة الله التي اخرج لعباده اور حق بات یہ ہے کہ جس زینت کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ہے وہ اس آیت کے عموم میں داخل ہے اور اس کے استعمال میں کوئی توقف نہیں کیا جائے گا لایہ کہ اس میں تکبر کا دخل ہو۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ ایک ہزار درہم کی چادر اوڑھ کر تشریف لے گئے اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ چار سو دینار کی چادر اوڑھتے تھے اور اپنے اصحاب کو بھی اس کا حکم دیتے تھے اور امام محمد بھی بہت قیمتی لباس پہنتے تھے اور فرماتے تھے میں اس لیے زیب و زینت کے ساتھ رہتا ہوں کہ میری بیویاں کسی اور کی زیب و زینت کی طرف نہ دیکھیں۔ اور فقہاء نے یہ تصریح کی ہے کہ خوبصورت لباس پہننا مستحب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو کوئی نعمت دیتا ہے تو وہ یہ چاہتا ہے کہ اس بندے پر اس نعمت کے آثار نظر آئیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیوند لگی ہوئی قمیص نہیں پہنتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی حکمت یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمال ان کی اتباع کرتے تھے اور یہ خدشہ تھا کہ اگر آپ نے قیمتی لباس پہنا تو آپ کے عمال بھی قیمتی لباس پہنیں گے اور اگر ان کے پاس پیسے نہ ہوئے تو پھر وہ لوگوں سے یا اموال مسلمین سے ناجائز طور پر پیسے حاصل کریں گے۔ (روح المعانی، ج ۸، ص ۱۱۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اشیاء میں اباحت کے اصل ہونے کی تحقیق

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ ہر وہ چیز جو مسلمانوں کے لیے زینت اور نفع کے حصول کا باعث ہو، وہ حلال ہے۔ ماسوا اس کے کہ اس کی حرمت یا کراہت پر قرآن اور سنت میں کوئی نص موجود ہو، اور اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ جس چیز کے حصول میں مسلمانوں کے لیے ضرر ہو، اس کا ترک کرنا واجب ہے کیونکہ اس کے ترک کرنے میں ہی مسلمانوں کا نفع ہے اور موجب ضرر اشیاء کی حرمت پر یہ آیت بھی دلالت کرتی ہے:

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ
اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

(البقرہ: ۱۹۵)

اس آیت سے یہ قاعدہ بھی معلوم ہوا کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے یعنی تمام کاموں کا کرنا اصل میں جائز اور مباح تھا پھر جن کاموں کی قرآن اور حدیث میں ممانعت آگئی، وہ ممنوع ہو گئے اور باقی تمام کام اپنی اصل پر جائز رہے۔ مثلاً پہلے شراب پینا اور جو اکیلنا مباح تھا۔ اسی طرح پہلے چار سے زیادہ عورتوں سے نکاح کرنا مباح اور جائز تھا اور جب ان کاموں کی ممانعت شریعت میں آگئی تو یہ کام ممنوع ہو گئے۔

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

تحریر (از علامہ ابن ہمام) میں یہ تصریح ہے کہ جمہور احناف اور شوافع کا مختار مذہب یہ ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ (التحریر مع شرح التیسیر، ج ۱، ص ۱۷۲، مطبوعہ مکتبہ المعارف، ریاض) اور علامہ ابن ہمام کے شاگرد علامہ قاسم نے بھی ان کی اتباع کی ہے اور ہدایہ کی فصل حداد میں بھی مذکور ہے۔ اباحت اصل ہے۔ (مدایہ اولین، ص ۳۲۸، مطبوعہ مکتبہ شرکہ علیہ، ملتان) اور قاضی خان نے الخطر والاباحت کے اوائل میں لکھا ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے۔ (فتاویٰ قاضی خاں علی ہاشم الہندی، ج ۳، ص ۲۰۰، مطبوعہ مطبعہ امیریہ کبری بولاق، مصر، ۱۳۱۰ھ) اور تحریر کی شرح میں مذکور ہے کہ یہ بصرہ کے معتزلہ، بہ کثرت شافعیہ اور اکثر حنفیہ خصوصاً عراقیوں کا قول ہے اور امام محمد نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا ایک شخص کو کسی نے کہا مردار کھاؤ یا

شراب پو' ورنہ میں تم کو قتل کر دوں گا اور اس نے اس شخص کا کمانہ مانا اور اس شخص نے اس کو قتل کر دیا تو مجھے یہ خدشہ ہے کہ وہ گنہ گار ہوگا، کیونکہ مردار کھانا اور شراب پینا صرف اللہ کے منع کرنے سے حرام ہوا ہے۔ اس عبارت میں امام محمد نے اباحت کو اصل قرار دیا ہے اور حرمت کو ممانعت کے عارض ہونے کی وجہ سے مشروع قرار دیا ہے۔ (تیسیر التحریر، ج ۲، ص ۱۶۱، مطبوعہ ریاض) اور شیخ اکمل الدین نے اصول بزدوی کی شرح میں لکھا ہے کہ استیلاء کفار کے باب میں شارح نے جو یہ لکھا ہے کہ اباحت معتزلہ کی رائے ہے (در مختار علی ہاشم رد المختار، ج ۳، ص ۲۴۴) اس پر اعتراض ہے۔

(رد المختار، ج ۱، ص ۷۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۰۷ھ)

نیز علامہ ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

شارح (صاحب در مختار) کا یہ کہنا کہ اباحت معتزلہ کی رائے ہے کتب اصول کے مخالف ہے، کیونکہ علامہ ابن ہمام نے تحریر میں یہ لکھا ہے کہ جمہور احناف اور شوافع کا یہ مذہب ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے اور اصول بزدوی کی شرح میں علامہ اکمل الدین نے فرمایا ہے ہمارے اکثر اصحاب اور اکثر اصحاب شافعی کا مذہب یہ ہے کہ جن کاموں کے متعلق یہ جائز ہے کہ شریعت ان کے مباح ہونے کا حکم دے یا ان کے حرام ہونے کا حکم دے وہ تمام کام احکام شرع وارد ہونے سے پہلے اپنی اصل پر مباح ہیں۔ حتیٰ کہ جس شخص تک شریعت نہ پہنچی ہو اس کے لیے مباح اور جائز ہے کہ وہ جو چاہے کھائے۔ امام محمد نے کتاب الاکراہ میں اسی طرح اشارہ کیا ہے کیونکہ انہوں نے فرمایا مردار کھانا اور شراب پینا صرف شرعی ممانعت کی وجہ سے حرام ہے۔ پس انہوں نے اباحت کو اصل قرار دیا ہے اور حرمت کو عارضہ ممانعت کی وجہ سے مشروع قرار دیا ہے۔ جبائی (معتزلی) ابو ہاشم اور غیر مقلدین کا بھی یہی قول ہے اور ہمارے بعض اصحاب اور بعض اصحاب شافعی اور معتزلہ بغداد کا مذہب یہ ہے کہ اشیاء میں اصل ممانعت ہے اور اشاعرہ اور عام محدثین کا مذہب یہ ہے کہ اشیاء میں اصل توقف ہے۔ حتیٰ کہ جس شخص تک شرعی احکام نہ پہنچے ہوں وہ کسی چیز کو نہ کھائے اگر اس نے کھایا تو اس کے فعل کو نہ حلال کہا جائے گا نہ حرام۔

(رد المختار، ج ۳، ص ۲۴۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

قاضی ابو الخیر عبد اللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی ۶۸۵ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ کھانے پینے اور پہننے کی چیزوں اور انواع تجملات میں اصل اباحت ہے۔

(انوار التزیل مع الکا زرونی، ج ۳، ص ۱۷، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۶ھ)

قرآن مجید کی زیر بحث آیت کے علاوہ حسب ذیل حدیث سے بھی اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ حضرت سلمان بنی شہید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے گھی، پنیر اور پوستین کے متعلق سوال کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس چیز کو اللہ نے کتاب میں حلال کر دیا وہ حلال ہے اور جس چیز کو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کر دیا وہ حرام ہے۔ اور جس چیز سے اللہ نے سکوت فرمایا وہ معاف ہے۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۷۳۲، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۳۶۷، المستدرک، ج ۳، ص ۱۱۵)

ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۳ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ (مرقات، ج ۸، ص ۱۹۳، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۳۹۰ھ)

قاضی ابو بکر ابن العربی المالکی المتوفی ۵۴۳ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت سلمان کا قول ہے لیکن اس کا معنی حدیث صحیح سے ثابت ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ

تعالیٰ نے تمہیں چند چیزوں کا حکم دیا ہے ان پر عمل کرو اور چند چیزوں سے منع فرمایا ہے ان سے اجتناب کرو۔ اور اس نے اپنی رحمت سے چند چیزوں سے سکوت فرمایا ان کے متعلق سوال نہ کرو۔

(سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۱۰، ص ۱۳، سنن دار قطنی، ج ۴، رقم الحدیث: ۴۳۵۰)

اور جب نبی ﷺ کسی چیز کا حکم دیں تو اس کی تعمیل کرنے پر بھی اتفاق ہے اگرچہ اس کی صفت میں اختلاف ہے کہ وہ امر واجب ہے یا مستحب۔ اور جب کسی چیز سے منع فرمائیں تو اس سے اجتناب پر بھی اتفاق ہے اگرچہ اس کی صفت میں اختلاف ہے کہ وہ مکروہ تحریمی ہے یا مکروہ تنزیہی اور جس چیز سے رسول اللہ ﷺ سکوت فرمائیں اس کے متعلق دو قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اصل میں مباح ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ اصل میں موقوف ہے۔

(عارضۃ الاحوذی، ج ۷، ص ۲۲۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

معمولات اہل سنت کا جواز اور استحسان

جب یہ واضح ہو گیا کہ تمام کاموں میں اباحت اصل ہے اور جس چیز کے عدم جواز یا کراہت پر کوئی شرعی دلیل نہیں ہے اس کام کو کرنا بلا کراہت جائز ہے۔ اس اصول پر اہل سنت کے تمام معمولات جائز ہیں مثلاً بغیر تعین شرعی کی نیت کے سال کے مختلف ایام میں میلاد شریف منعقد کرنا۔ نبی ﷺ کے فضائل اور آپ کی سیرت کا بیان کرنا، خلفاء راشدین اور اہل بیت اطہار کے ایام شہادت اور وفات میں ان کا تذکرہ کرنا اور نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب اور اہل بیت کو قرآن خوانی اور طعام کے صدقہ کا ثواب پہنچانا۔ اسی طرح اولیاء کرام کے ایام وصال میں ان کا تذکرہ کرنا اور ان کو عبادت اور طعام کے صدقہ کا ثواب پہنچانا۔ ہر چند کہ خصوصیت کے ساتھ یہ کام عمد رسالت میں نہیں کیے گئے لیکن رسول اللہ ﷺ نے ان کاموں سے منع نہیں فرمایا اور یہ کام اسلام کے کسی حکم سے متصادم نہیں ہیں اس لیے یہ اپنی اصل پر مباح ہیں اور حسن نیت سے موجب ثواب اور بابت خیر و برکت ہیں۔ عمد صحابہ اور تابعین میں اس کی بہت مثالیں ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے حضرت ابو بکر اور دیگر اکابر صحابہ کا قرآن کریم کو ایک مصحف میں جمع کرنا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تراویح کو جماعت سے پڑھوانے کا اہتمام کرنا اور اس کو بدعت حسنہ قرار دینا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآن مجید کی قرات کو باقی لغات سے ختم کر کے صرف لغت قریش پر باقی رکھنا، عبد الملک بن مروان کے حکم سے قرآن مجید کے حروف پر نقطے اور حرکات اور اعراب کا لگایا جانا، عمر بن عبد العزیز کے دور خلافت میں مساجد کی عمارتوں میں محراب کا بنایا جانا اور قرآن مجید کے نسخوں میں سورتوں کے اسماء اور آیتوں اور رکوعوں کی تعداد کو لکھنا یہ سب بدعت حسنہ ہیں جس کو تمام امت مسلمہ نے قبول کر لیا ہے۔ سوا اہل سنت کے معمولات کو بھی ان ہی نظائر کی روشنی میں جائز سمجھنا چاہیے اور بلا وجہ ان پر یہ بدگمانی نہیں کرنی چاہیے کہ انہوں نے ان معمولات کو فرض اور واجب سمجھ لیا ہے۔ اسی طرح سوئم، چہلم اور عرس کی عرفی تعینات کو تعینات شرعی نہیں قرار دینا چاہیے۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ جیسے مساجد میں گھڑیوں کے حساب سے نمازوں کے اوقات متعین کر لیے جاتے ہیں اور کسی شخص کو بھی یہ بدگمانی نہیں ہوتی کہ یہ تعین شرعی ہے۔

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آیت اپنے عموم پر ہے ہر کھانے کی چیز اس میں داخل ہے کہ جس کی حرمت پر نص وارد نہ ہوئی ہو تو جو لوگ توشہ گیارہویں، میلاد شریف، بزرگوں کی فاتحہ، عرس، مجالس شہادت وغیرہ کی شیرینی، سبیل کے شربت کو ممنوع کہتے ہیں، وہ اس آیت کے خلاف کر کے گنہ گار ہوتے ہیں اور اس کو ممنوع کہنا اپنی رائے کو دین میں داخل کرنا ہے اور یہی بدعت و ضلالت ہے۔

(حاشیہ خزائن العرفان، ص ۲۲۸، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہتے کہ میرے رب نے تو صرف بے حیائی کے کاموں کو حرام کیا ہے، خواہ وہ ظاہر ہوں خواہ پوشیدہ، اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو، اور یہ کہ تم اللہ کے ساتھ شریک بناؤ جس کی اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی، اور یہ کہ تم اللہ کے متعلق ایسی بات کہو جسے تم نہیں جانتے۔ (الاعراف: ۳۳)

ان گناہوں کا بیان جو تمام گناہوں کی اصل ہیں

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ زمانہ جاہلیت میں کفار نے جن چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے ان پر حرام نہیں فرمایا تھا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کو حرام فرمایا ہے۔ سو فرمایا اللہ تعالیٰ نے فواحش کو اثم (گناہ) کو، ناحق زیادتی کو، شرک کو اور بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی بات کہنے کو حرام فرمایا ہے۔ فواحش سے مراد ہے کبیرہ گناہ۔ اور اثم سے مراد مطلق گناہ ہے خواہ کبیرہ ہو یا صغیرہ۔ اس کے بعد جن تین چیزوں کا ذکر فرمایا ہے، یعنی ناحق زیادتی، شرک اور بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی بات کہنا۔ ہرچند کہ یہ بھی گناہ کبیرہ میں داخل ہیں لیکن چونکہ یہ زیادہ سنگین جرم ہیں اس لیے ان کا خصوصیت کے ساتھ علیحدہ ذکر کیا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ فواحش سے مراد ہے زنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَقْرَبُوا الزَّيْنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً
اور زنا کے قریب نہ جاؤ بے شک وہ بے حیائی ہے۔

(بنی اسرائیل: ۳۲)

خواہ ظاہر ہو خواہ پوشیدہ۔ ظاہر سے مراد علی الاعلان بدکاری ہے۔ جس طرح لوگ اجرت دے کر پیشہ ور عورتوں سے بدکاری کرتے ہیں یا جس طرح آج کل کل گر لڑ اور سوسائٹی گر لڑ کو کلبوں اور ہوٹلوں سے بک کیا جاتا ہے اور پوشیدہ سے مراد ہے کسی لڑکی یا عورت سے عشق و محبت کے نتیجے میں خفیہ طریقہ سے یہ کام کیا جائے۔ اور اثم سے مراد ہے شراب نوشی اور جو ا کھیلنا۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ
لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں،
فِيهِمَا آثَمٌ كَبِيرٌ (البقرہ: ۲۱۹)
آپ کہتے ان میں بڑا گناہ ہے۔

بعض اوقات شراب کے نشہ میں انسان دوسروں کی عزت پر حملہ آور ہوتا ہے۔ ان کو گالیاں دیتا ہے اور ان پر تہمت لگاتا ہے۔ اور جوئے کے نتیجے میں مال حرام کھایا جاتا ہے اور بعض اوقات لڑائی جھگڑا اور مار پیٹ بھی ہوتی ہے۔ سو یہ تمام گناہ اس میں داخل ہیں۔

اور ناحق زیادتی سے مراد ہے کسی کا ناحق مال چھین لینا یا کسی کو ناحق قتل کر دینا، اور شرک سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی توحید کے منافی یا اس کے خلاف کوئی بات کرنا۔ اور بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کے متعلق کوئی بات کرنے سے مراد یہ ہے کہ بغیر علم اور تحقیق کے کوئی عقیدہ بنا لینا۔ اور یہ پانچ گناہ تمام گناہوں کی اصل ہیں اور باقی تمام بد عقیدے گناہ اور ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہ ان پانچ گناہوں میں داخل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہر قوم کے لیے ایک میعاد مقرر ہے جب وہ میعاد پوری ہو جائے گی تو وہ نہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکیں گے اور نہ ایک گھڑی آگے ہو سکیں گے (الاعراف: ۳۳)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتایا تھا کہ انسان پر اللہ تعالیٰ نے کیا کیا کام حرام کیے ہیں اور اس آیت میں یہ بتایا کہ اس کی زندگی کا ایک وقت معین ہے اور جب وہ وقت آجائے گا تو اس پر لامحالہ موت آجائے گی اور اس کو چونکہ موت کا وقت بتایا

تبیان القرآن

جلد چہارم

نہیں گیا اس لیے وہ ہر وقت موت کا منتظر رہے اور حرام کاموں سے بچتا رہے، ایسا نہ ہو کہ وہ کسی حرام کام میں مشغول ہو اور اس کی موت کا وہی وقت مقرر ہو۔

حضرت ابن عباس، حسن اور مقاتل نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کو ایک معین وقت تک کے لیے عذاب سے مہلت دی ہے سو جو قومیں اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کرتی رہیں ان کو ایک مدت تک مہلت دی گئی اور جب وہ مدت پوری ہو گئی تو ان پر عذاب آگیا اور اس کے وقت میں کوئی کمی یا بیشی نہیں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہارے سامنے میری آیتیں بیان کریں، سو جو شخص اللہ سے ڈرا اور نیک ہو گیا تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان (کو ماننے) سے تکبر کیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ○

(الاعراف: ۳۶-۳۵)

رہب آیات

اس سے پہلی آیت میں انسانوں کی زندگی کے بعد ان کی موت کا ذکر فرمایا تھا۔ اب بتایا ہے کہ اگر انہوں نے اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کی تھی تو مرنے کے بعد انہیں کوئی خوف اور غم نہیں ہو گا اور اگر انہوں نے اپنی یہ زندگی سرکشی اور انحراف میں گزاری تھی تو پھر مرنے کے بعد انہیں دائمی عذاب کے لیے دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ رسول کا ان لوگوں کی جنس سے ہونا جن کی طرف اس کو مبعوث کیا گیا

اس آیت میں اولاد آدم سے مراد اہل مکہ ہیں اور رسل سے مراد سید الرسل، خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں اور آپ کے متعلق جمع کا صیغہ اس لیے استعمال فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ میں اپنے رسول کو اسی سنت کے مطابق بھیجا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ پہلی امتوں میں اپنے رسول بھیجتا رہا تھا۔ رسولوں کو اس صفت کے ساتھ مقید فرمایا ہے کہ وہ خود تم میں سے ہیں۔ اس قید کے متعلق امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ فرماتے ہیں۔ اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

(الف) جب رسول لوگوں کی جنس سے ہو گا تو لوگوں پر اللہ کی حجت بہ طریق اولیٰ پوری ہوگی۔

(ب) لوگوں کو اس رسول کے حالات اور اس کا پاک دامن ہونا پہلے سے معلوم ہوگا۔

(ج) لوگوں کو اس کی قوت اور طاقت کا حال پہلے سے معلوم ہو گا اور جب اس سے معجزات کا ظہور ہو گا تو وہ جان جائیں گے کہ یہ افعال اس کی قوت اور طاقت سے باہر ہیں تو یہ معجزات لامحالہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ظاہر ہوئے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَوْ جَعَلْنَاهُمْ مَلَكَآ جَعَلْنَاهُمْ رَجُلًا
اور اگر ہم فرشتہ کو رسول بناتے تو ضرور اس کو مرد ہی

(الانعام: ۹) بناتے۔

کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کسی جن یا فرشتہ کو اس کی اصل حقیقت کے اعتبار سے رسول بناتا تو یہ گمان کیا جاسکتا تھا کہ یہ معجزات اس کی اپنی غیر معمولی قوت سے ظہور میں آئے ہیں اور جب انسان کو رسول بنایا گیا اور اس نے چاند کو دو ٹکڑے کیا اور ڈوبا ہوا سورج لوٹایا اور درختوں سے کلمہ پڑھوایا تو معلوم ہو گیا کہ یہ افعال انسان کی قوت میں نہیں ہیں تو ضرور اللہ کا فعل ہیں اور یہ شخص ضرور اللہ کا نمائندہ اور اس کا رسول ہے جس کی تصدیق کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ غیر معمولی افعال پیدا کیے ہیں اور اس کی تائید کے لیے معجزات ظاہر فرمائے ہیں۔

(د) اگر وہ رسول کسی اور جنس سے ہوتا تو لوگ اس کے ساتھ مانوس نہ ہوتے اور اس کے ساتھ الفت اور محبت نہ ہوتی۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۳۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ رسول لوگوں کی جنس سے ہوں گے تاکہ رسولوں کی دعوت کا قبول کرنا زیادہ قریب ہو۔

(الجامع لاحکام القرآن، جزء ۷، ص ۱۸۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابن عاشور لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ رسول تم میں سے ہوں گے یعنی بنو آدم سے ہوں گے۔ اس میں بنو آدم کو یہ تنبیہ ہے کہ وہ یہ توقع نہ کریں کہ ان کے پاس فرشتوں میں سے کوئی رسول آئے گا، کیونکہ رسول مرسل الہم کی جنس سے ہوتا ہے اور اس آیت میں پچھلی امتوں کے ان جاہلوں پر تعریض ہے جنہوں نے اپنے رسولوں کی رسالت کا اس لیے انکار کیا تھا کہ وہ ان کی جنس سے تھے۔ مثلاً قوم نوح نے کہا:

مَا نَرُكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (ہود: ۲۷)

(اے نوح!) ہم تمہیں صرف اپنے ہی جیسا بشر دیکھتے ہیں۔

اور مکہ کے مشرکین نے بھی سیدنا محمد ﷺ کی رسالت کا صرف اس لیے انکار کیا کہ آپ بشر تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمْ
الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا
قُلْ لَوْ كُنَّا فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةً يَّمْسُونَ
مُطَمِّئِينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ السَّمَاءِ
مَلَكًا رَسُولًا (بنی اسرائیل: ۹۵-۹۴)

اور لوگوں کو ایمان لانے سے صرف اس چیز نے روکا جب

ان کے پاس ہدایت آچکی تھی کہ انہوں نے کہا کیا اللہ نے بشر کو

رسول بنا کر بھیجا؟ ○ آپ کہئے کہ اگر زمین میں (رہنے والے)

فرشتے ہوتے جو (اس میں) اطمینان سے چلتے پھرتے تو ہم ضرور

ان پر آسمان سے کوئی فرشتہ ہی رسول بنا کر اتارتے ○

ان آیتوں میں یہ تصریح ہے کہ رسول مرسل الہم کی جنس سے ہوتا ہے۔

(التحریر والتبیین، ج ۸، ص ۱۰۸، مطبوعہ تیونس)

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ اعلیٰ حضرت قدس سرہ کے ترجمہ کے ساتھ ملا کر سورہ بنو

اسرائیل کی آیت ۹۵-۹۴ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اور کس بات نے لوگوں کو ایمان لانے سے روکا جب ان کے پاس ہدایت آئی مگر اسی نے کہ بولے کیا اللہ نے آدمی کو رسول بنا کر بھیجا (رسولوں کو بشر ہی جانتے رہے اور ان کے منصب نبوت اور اللہ تعالیٰ کے عطا فرمائے ہوئے کمالات کے مقرر اور معترف نہ ہوئے۔ یہی ان کے کفر کی اصل تھی۔ اور اسی لیے وہ کہا کرتے تھے کہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا اس پر اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ سے فرماتا ہے کہ اے حبیب ان سے) تم فرماؤ اگر زمین میں فرشتے ہوتے چہن سے چلتے تو ان پر ہم رسول بھی فرشتہ اتارتے (کیونکہ وہ ان کی جنس سے ہوتا لیکن جب زمین میں آدمی بستے ہیں تو ان کا ملائکہ میں سے رسول طلب کرنا نہایت ہی بے جا ہے)

نوٹ: ترجمہ اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا ہے اور تو سین میں صدر الافاضل رحمہ اللہ کی تفسیر ہے۔

مفتی احمد یار خاں نعیمی متوفی ۱۳۹۱ھ بنو اسرائیل آیت ۹۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی اگر زمین میں بجائے انسانوں کے فرشتے بستے ہوتے تو نبی بھی فرشتہ ہی آتا۔ کیونکہ نبی تبلیغ کے لیے تشریف لاتے ہیں

اور قوم کو تبلیغ وہی کر سکتا ہے جو قوم کی زبان اور اس کے طور طریقوں سے واقف ہو۔ ان کے دکھ دردوں سے خبردار ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ نبی قوم کی جنس سے ہو۔ تعجب ہے کہ کفار فرشتوں کو انسان سے افضل سمجھتے تھے اس لیے کہتے تھے کہ فرشتہ نبی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ انسان فرشتوں سے افضل ہے۔ فرشتوں نے انسان کو سجدہ کیا نہ کہ انسان نے فرشتوں کو۔

(نور العرفان، ص ۳۶۳، مطبوعہ ادارہ کتب اسلامیہ، گجرات)

رسول کا لوگوں کی جنس سے ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اگر وہ لوگوں کی جنس سے نہ ہو تو اس کے افعال امت کے لیے نمونہ اور واجب الاتباع نہیں ہو سکیں گے کیونکہ لوگ کہہ سکیں گے کہ وہ اور جنس سے ہے اور ہم اور جنس سے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ افعال اس کی جنس سے ممکن اور سہل ہوں اور ہماری جنس سے ممکن اور سہل نہ ہوں اور پھر اللہ تعالیٰ کی حجت بندوں پر پوری نہیں ہوگی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام رسول نوع انسان اور ہماری جنس سے بشر بنائے اور نبی ﷺ سے فرمایا آپ کہئے میں بشر اور رسول ہوں۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا (بنی اسرائیل: ۹۳)
 آپ کہئے میرا رب پاک ہے میں صرف بشر اللہ کا بھیجا ہوا (رسول) ہوں۔
 قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ (الكهف: ۱۱۰)
 آپ کہئے میں صرف بشر ہوں تمہاری مثل (خدا) نہیں ہوں (میری طرف وحی کی جاتی ہے بے شک تمہارا اور میرا معبود ایک ہی ہے۔)

کفار آپ کو محض بشر کہتے تھے رسول نہیں مانتے تھے اور بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے اور یہی ان کا کفر تھا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ آپ عام انسان اور عام بشر نہیں ہیں بلکہ انسان کامل اور افضل البشر اور سید البشر ہیں اور کوئی شخص کسی وجودی وصف میں آپ کا مماثل نہیں ہے بلکہ سب عدم الوہیت میں آپ کے مماثل ہیں یعنی جس طرح ہم خدا نہیں ہیں اسی طرح آپ بھی خدا نہیں۔ بعض لوگ غلو کر کے کہتے ہیں کہ آپ نہ خدا ہیں نہ خدا سے جدا ہیں۔ نہ اللہ کے عین ہیں نہ غیر ہیں۔ یہ باطل نظریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ واجب ہے آپ ممکن ہیں۔ اللہ تعالیٰ قدیم ہے آپ حادث ہیں۔ اللہ تعالیٰ معبود ہے آپ عابد ہیں۔ اور ممکن واجب کا اور حادث قدیم کا اور عابد معبود کا غیر ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ آپ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ آپ کی رضا اللہ کی رضا ہے۔ آپ کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔ آپ کی بیع اور شراء اللہ کی بیع اور شراء ہے۔ آپ کے ساتھ معاملہ اللہ کے ساتھ معاملہ ہے اور آپ اللہ کے نائب مطلق ہیں اور اللہ کے اذن اور اس کے حکم سے مختار کل ہیں جس کو چاہیں نواز دیں اور جنت عطا فرمادیں۔ لیکن آپ کا چاہا کبھی اللہ کے چاہے کے مخالف نہیں ہوتا۔ آپ اللہ کے تابع اور اللہ کے موافق ہیں۔ العیاذ باللہ۔ اللہ کے مخالف اور باغی نہیں ہیں۔

مختار کل کی وضاحت

ہم نے جو نبی ﷺ کے متعلق مختار کل لکھا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو کل اختیار دے کر خود معطل ہو گیا ہے، معاذ اللہ یہ صریح کفر ہے۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ نبی ﷺ جو کچھ کرنا چاہیں اس پر آپ قادر اور مختار ہیں کیونکہ یہ صرف اللہ عزوجل کی شان ہے کہ وہ جو چاہے کرتا ہے۔ نبی ﷺ تو چاہتے تھے کہ تمام کافر اسلام لے آئیں خصوصاً ابوطالب کے لیے آپ کی بڑی خواہش اور بہت کوشش تھی کہ وہ مسلمان ہو جائیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس لیے مختار کل کا ہمارے نزدیک صرف یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کل مخلوق سے زیادہ اختیار عطا فرمایا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور

اس کی مرضی کے تابع ہو کر جس معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کو قبول فرمالتا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کے حکم سے بھی دعا فرماتے ہیں اور اپنی وجاہت کی بناء پر بھی دعا فرماتے ہیں اور بعض امور میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی طاقت اور قدرت سے براہ راست تصرف بھی فرماتے ہیں۔ ان تمام امور کے ثبوت میں احادیث صحیحہ وارد ہیں۔

نیک مسلمان حشر کے دن آیا گھبراہٹ میں مبتلا ہوں گے یا نہیں!

نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

سو جو شخص اللہ سے ڈرا اور نیک ہو گیا تو ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور غم کا تعلق ماضی سے ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کو قیامت کے دن نہ مستقبل میں عذاب کا خوف ہو گا اور نہ ماضی میں انہیں اپنے کیے ہوئے کاموں کا کوئی غم ہو گا۔ کیونکہ دنیا میں انہوں نے سب نیک کام کیے اور اگر انہوں نے شیطان یا شامت نفس سے کوئی غلط کام ہو گیا تو انہوں نے مرنے سے پہلے اس پر توبہ کر لی اور اپنی اصلاح کر لی۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ نیک مسلمانوں کو قیامت کی ہولناکیوں سے کوئی خوف اور غم ہو گا یا نہیں۔ بعض علماء کا موقف یہ ہے کہ ان کو قیامت کی ہولناکیوں اور اس دن کی سختیوں سے کوئی غم اور خوف نہیں ہو گا۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ (الانبیاء: ۱۰۳)

سب سے بڑی گھبراہٹ انہیں غمگین نہیں کرے گی۔

اور بعض علماء کا مسلک یہ ہے کہ نیک مسلمانوں کو بھی اس دن گھبراہٹ ہو گی ان کی دلیل یہ آیت ہے:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۚ وَأُمِّهِ وَأَبْنَيْهِ ۚ

جس دن انسان اپنے بھائی سے بھاگے گا اور اپنی ماں اور

وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۚ لِكُلِّ أُمَّرٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ

اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے اور ان میں

شَأْنٌ يُغْنِيهِ (عبس: ۳۴-۳۳)

سے ہر شخص کو اس دن اپنی فکر ہو گی جو اسے (دوسروں سے)

بے پرواہ کر دے گی۔

اول الذکر علماء اس آیت کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اگرچہ وقتی طور پر نیک مسلمانوں کو بھی فکر اور پریشانی ہو گی لیکن مال کار

انہیں امن اور عافیت اور فرحت اور سرور حاصل ہو گا جیسا کہ اس آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَجْوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۚ ضَاحِكَةٌ

اس دن بعض چہرے روشن ہوں گے اور مسکراتے ہوئے

مُسْتَبْشِرَةٌ ۚ وَوَجْوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۚ

شاداب اور اس دن کئی چہرے غبار آلود ہوں گے اور ان پر

تَرَهَقُهَا قَتَرَةٌ ۚ أُولَئِكَ هُمُ الْكٰفِرَةُ

سیاہی چھائی ہو گی اور وہی لوگ کافرید کار ہوں گے اور

الْفَجَرَةُ ۚ (عبس: ۳۸-۳۷)

گنہ گار مسلمانوں کے لیے دائمی عذاب کا نہ ہونا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جن لوگوں نے رسولوں کی پیش کی ہوئی اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے تکبر کیا

سو وہی لوگ دوزخی ہیں اور وہی اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ہمارے علماء نے اس آیت سے معتزلہ اور خوارج کے خلاف استدلال کیا

ہے کہ گنہ گار مسلمانوں کو اگر دوزخ میں ڈالا گیا تو ان کو عذاب کے بعد دوزخ سے نکال لیا جائے گا کیونکہ دوزخ کے عذاب کا دوام

اور خلود صرف کافروں کے لیے ہے جیسا کہ اس آیت میں کافروں کے متعلق یہ طریقہ حصر فرمایا ہے کہ وہی دوزخ میں ہمیشہ رہیں

گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ کے متعلق جھوٹی باتیں گھڑ کر اللہ پر بہتان باندھے یا اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے! ان لوگوں کو کتاب کے مطابق ان کا حصہ ملتا رہے گا حتیٰ کہ جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے کے لیے پہنچیں گے تو وہ پوچھیں گے بتاؤ کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پرستش کرتے تھے؟ وہ کہیں گے وہ سب ہم سے گم ہو گئے اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔ (الاعراف: ۳۷)

اللہ پر بہتان باندھنے اور اس کی آیتوں کو جھٹلانے کی تفصیل

اس سے پہلی آیت میں کافروں کے متعلق فرمایا تھا کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کو ماننے سے تکبر کیا۔ اب اسی سیاق میں فرمایا: پس اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو گا جو اللہ کے متعلق جھوٹی باتیں گھڑ کر بہتان باندھے یا اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے!

اللہ پر بہتان باندھنے والے وہ کافر ہیں جنہوں نے بتوں کو یا ستاروں کو اللہ کا شریک بنایا یا وہ کافر جنہوں نے دو خدا قرار دیے ایک یزداں اور ایک اہرمن۔ یا وہ جنہوں نے اللہ کے لیے بیٹیاں اور بیٹے ٹھہرائے۔ اسی طرح وہ کافر جنہوں نے بحیرہ، سائب، حامی اور وسیلہ کو از خود حرام قرار دیا اور پھر اس حرمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ اسی طرح اس کے عموم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو از خود کوئی مسئلہ گھڑ لیتے ہیں اور اپنی طرف سے کسی مستحب کام کو فرض یا واجب قرار دیتے ہیں اور اس کے عموم میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو قرآن اور حدیث کی صریح نصوص کے مقابلہ میں اپنے پیروں اور مولویوں کے اقوال کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس کے بعد ان کافروں کا ذکر کیا جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ اس سے مراد وہ کافر ہیں جو اللہ تعالیٰ کے جود، اس کی وحدانیت اور اس کی الوہیت کے دلائل کا انکار کرتے ہیں یا اس سے مراد وہ کافر ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی کتابوں، خصوصاً قرآن مجید کا انکار کرتے ہیں یا اس سے مراد وہ کافر ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسولوں خصوصاً سیدنا محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں۔

کتاب یا لوح محفوظ میں اللہ پر بہتان باندھنے والوں کی سزا

اس کے بعد فرمایا ان لوگوں کو کتاب کے مطابق ان کا حصہ ملتا رہے گا۔ کتاب کی دو تفسیریں ہیں ایک تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور ایک تفسیر یہ ہے کہ کتاب سے مراد نوشتہ تقدیر ہے۔

اگر کتاب سے مراد لوح محفوظ ہو تو اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں ان کافروں کے لیے جتنا عذاب لکھ دیا تھا، ان کو وہ عذاب مل کر رہے گا۔ یہ تفسیر ابو صالح اور حسن سے مروی ہے۔

(جامع البیان، جز ۸، ص ۲۲۲، دار الفکر)

پھر بعض علماء نے حسب ذیل آیات سے اس عذاب کی تفصیل بیان کی ہے:

وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ
وَجُوهَهُمْ مُمْسُودَةٌ (الزمر: ۶۰) دن ان کے منہ کالے دیکھیں گے۔

وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا (طہ: ۱۰۲) اور ہم مجرموں کو اس حال میں اٹھائیں گے کہ ان کی

آنکھیں نیلی ہوں گی۔

يُعْرِفُ الْمُجْرِمُونَ بِسَبْمِهِمْ فَبُؤُوحَدُ
بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ (الرحمن: ۴۱)
اس دن مجرم اپنی صورتوں سے پہچانے جائیں گے ان کو
پیشانی کے بالوں اور پاؤں سے پکڑا جائے گا۔
إِذِ الْأَغْلُلُ فِيَّ أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلْسِلُ
يُسْحَبُونَ (المؤمن: ۷۱)
جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی ان کو
اس حال میں گھسیٹا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کافروں کے چہرے سیاہ، آنکھیں نیلی ہوں گی اور ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، وہ اپنے
چہروں سے پہچانے جائیں گے اور ان کو پیشانی اور پیروں سے پکڑ کر گھسیٹا جائے گا۔ ان آیات کے علاوہ قرآن مجید میں ان کے
عذاب کی اور بھی کئی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

کتاب کی تفسیر میں دیگر اقوال

امام عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۵۹ھ لکھتے ہیں:
کتاب کی تفسیر میں متعدد اقوال ہیں:

مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان کے اعمال سے جو کچھ ان کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے وہ
ان کو ضرور حاصل ہوگا۔ حسن نے کہا: ان کے لیے گمراہی یا ہدایت جو بھی مقدر کر دی گئی ہے وہ ان کو ضرور حاصل ہوگی۔
حضرت ابن عباس سے ایک اور روایت ہے کہ ان کے لیے خیر اور شر جو کچھ مقدر کر دیا گیا ہے وہ ان کو ضرور حاصل ہوگا۔
ربیع نے کہا: ان کے لیے جس قدر رزق، عمر اور عمل مقدر کر دیا گیا ہے وہ ضرور ان کو حاصل ہوگا۔
عکرمہ اور ابوصالح نے کہا: ان کے لیے جو عذاب مقرر کر دیا گیا ہے وہ ان کو ملے گا۔

زجاج نے کہا: ان کے لیے کتاب میں جو جزا بیان کی گئی ہے وہ ان کو ضرور ملے گی۔ اور کتاب کی پانچ تفسیریں کی گئی ہیں:

(۱) لوح محفوظ (۲) اللہ کی تمام کتابیں (۳) قرآن کریم (۴) ان کے اعمال نامے (۵) قضا و قدر

(زاد المسیر، ج ۳، ص ۱۹۳، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۰۷ھ)

تقدیر کے متعلق ہم نے شرح صحیح مسلم، ج (۷) میں تفصیل سے لکھا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ
بندہ اپنے اختیار اور ارادہ سے کیا کرے گا اور کیا نہیں کرے گا اور وہ اپنے اعمال کے نتیجہ میں جنت کا مستحق ہو گا یا جہنم کا۔ اس کے
اسی علم سابق کا نام تقدیر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب ہمارے فرشتے ان کی رو میں قبض کرنے کے لیے پہنچیں گے، اس سے مراد ملک الموت اور اس
کے معاون فرشتے ہیں۔ اس آیت سے مراد کفار کو سرزنش کرنا ہے کہ وہ اپنے آباء و اجداد کی تقلید کو ترک کر کے سیدنا محمد ﷺ
کی نبوت پر ایمان لے آئیں اور اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک لہ مان لیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ فرمائے گا اس دوزخ میں داخل ہو جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے جن
اور انس داخل ہو چکے ہیں، جب بھی کوئی جماعت (دوزخ میں) داخل ہوگی تو وہ اپنی جیسی جماعت پر لعنت کرے گی، حتیٰ
کہ جب اس میں سب جمع ہو جائیں گے تو بعد والے پہلوں کے متعلق کہیں گے: اے ہمارے رب ہم کو انہوں نے
گمراہ کیا تھا، سو تو ان کو دگنا آگ کا عذاب دے، اللہ فرمائے گا: ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے ○
اور پہلے لوگ بعد والوں سے کہیں گے تمہیں ہم پر کوئی فضیلت نہیں ہے، سو عذاب کو چکھو اس سبب سے جو تم کرتے
تھے۔ (الاعراف: ۳۸-۳۹)

دوزخ میں کفار کے احوال

ان دو آیتوں میں کفار کے دوزخ میں داخل ہونے کی کیفیت کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس دوزخ میں داخل ہو جاؤ جس میں تم سے پہلے گزرے ہوئے جن اور انس داخل ہو چکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام کفار ایک ہی مرتبہ میں دوزخ میں نہیں داخل ہوں گے۔ بلکہ پہلے ایک جماعت داخل ہوگی اس کے بعد دوسری جماعت داخل ہوگی اور ان میں سابق اور مسبوق ہوں گے اور بعد میں آنے والے پہلوں کے حال کا مشاہدہ کریں گے۔

پھر فرمایا: جب بھی کوئی جماعت (دوزخ میں) داخل ہوگی تو وہ اپنی جیسی جماعت پر لعنت کرے گی۔ اس کا معنی یہ ہے کہ مشرکین مشرکین پر لعنت کریں گے۔ اسی طرح یہود یہود پر لعنت کریں گے اور نصاریٰ نصاریٰ پر۔

پھر فرمایا تو بعد والے پہلوں کے متعلق کہیں گے: اس کی تفسیر میں تین قول ہیں۔ امت کے آخر امت کے اول سے کہیں گے، آخری زمانہ کے لوگ پہلے زمانہ کے لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے اس بد عقیدگی کو شروع کیا تھا اور تیسرا قول یہ ہے کہ دوزخ میں آخر میں داخل ہونے والے پہلے داخل ہونے والوں سے کہیں گے جنہوں نے ان کو گمراہ کیا تھا۔ پھر فرمایا: وہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہم کو انہوں نے گمراہ کیا تھا سو تو ان کو دگنا آگ کا عذاب دے۔

ضعف کا معنی

ضعف کا معنی ہم نے دگنا کیا ہے۔ کیونکہ ضعف کا اکثر استعمال اسی معنی میں ہوتا ہے۔

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے ضعف کا معنی شے اور اس کی مثل ہے۔ دس کا ضعف بیس اور سو کا ضعف دو سو ہے۔ (المفردات، ج ۲، ص ۳۸۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ ریاض)

علامہ مجد الدین ابن اثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے: ضعف کا معنی دگنا ہے۔ کہا جاتا ہے اگر تم مجھے ایک رہم دو گے تو میں تمہیں اس کا ضعف دوں گا یعنی دو رہم دوں گا۔ ایک قول یہ ہے کہ کسی شے کا ضعف اس کی ایک مثل ہے اور دو ضعف دو مثلیں ہیں۔ ازہری نے کہا ہے کہ کلام عرب میں ضعف کا معنی ایک مثل سے لے کر زیادہ امثال تک ہے اور یہ دو مثلوں میں منحصر نہیں ہے۔ پس کم از کم ضعف ایک مثل میں منحصر ہے اور اکثر ضعف کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اسی اعتبار سے یہ حدیث ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز، تنہا نماز پر پچیس درجہ ضعف ہوتی ہے۔

(صحیح مسلم، رقم الحدیث المساجد: ۲۴۷۷) (التمایہ، ج ۳، ص ۸۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، ۱۳۱۸ھ)

دو گنے عذاب پر ایک سوال کا جواب

پھر فرمایا: اللہ فرمائے گا ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے۔ اس کا بہ ظاہر معنی یہ ہے کہ وہ جس قدر عذاب کے مستحق ہوں گے ان کو اس کا دگنا عذاب دیا جائے گا اور یہ عدل کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کو ان کے جرائم کے مطابق ہی عذاب ہوگا۔ لیکن ان کو یہ عذاب مسلسل ہوتا رہے گا۔ مثلاً ان کو درد کی ایک کیفیت لاحق ہوگی اس کے بعد پھر اس کی مثل لاحق ہوگی۔ اور پھر ایک مثل لاحق ہوگی اور یہ سلسلہ مسلسل جاری رہے گا۔ اس لیے فرمایا ہر ایک کے لیے دگنا عذاب ہے اور ہم ضعف کا معنی بیان کر چکے ہیں کہ کسی شے کی ایک مثل سے لے کر غیر متناہی امثال تک ضعف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّمُ لَهُمْ آبْوَابُ

بیشک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کو ماننے سے تکبر کیا ان کے لیے اس وقت تک آسمان کے دروازے نہیں

السَّمَاءِ وَلَا يَدُخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلْبِغَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ط

کھوے جائیں گے اور وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے (سوراخ) میں داخل ہو جائے،

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿۳۰﴾ لَمْ يَمِّنْ مِنْ جَهَنَّمَ مَهَادٌ وَمِنْ فَوْقِهِمْ

اور ہم اسی طرح مجرموں کو سزا دیتے ہیں ○ ان کے لیے دوزخ (کی آگ) کا بچھونا ہوگا اور ان کے اوپر

غَوَاشٍ ط وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الطَّالِبِينَ ﴿۳۱﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

اسی کا اور سنا ہوگا، اور ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں ○ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک

الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ

عمل کیے، اور ہم کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالتے، وہی لوگ جنتی ہیں، وہ

هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۳۲﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غَلٍّ يُجْرِي

اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ○ اور ہم نے ان کے سینوں سے (ایک دوسرے کے خلاف) رنجش کو نکال دیا ہے،

مِنْ تَحْتِهِمُ الْإِنهْرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا

ان کے نیچے دریا بہ رہے ہیں وہ کہیں گے اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں پہنچایا، اور اگر اللہ

كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَا أَنَّ هَدَانَا اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلًا مِنَّا

ہمیں نہ پہنچاتا تو ہم از خود یہاں نہیں پہنچ سکتے تھے، بیشک ہمارے پاس ہمارے رب کے رسول تھے

بِالْحَقِّ وَنُودُوا أَن تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾

سے کر آئے، اور ان کو یہ ندا کی جانے لگی کہ تم اپنے (نیک) اعمال کی وجہ سے جنت کے وارث کیے گئے ہو ○

وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ أَصْحَابَ النَّارِ ۖ إِنَّ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا

اور اہل جنت دوزخیوں سے پکار کر کہیں گے کہ بیشک ہمارے رب نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اس کو

رَبُّنَا حَقًّا ۖ هَلْ وَجَدْتُمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۖ قَالُوا نَعَمْ ۖ قَاذَن

سچا پایا، کیا تم نے بھی اس وعدے کو سچا پایا جو تم سے تمہارے رب نے کیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں! پھر ان کے

مُؤَدِّنَ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿۳۷﴾ الَّذِينَ يَصْدَوْنَ

در بیان ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو ○ جو (لوگوں کو) اللہ کے راستے

عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيُعْونَهَا عَوْجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَفْرُونَ ﴿۳۸﴾ وَ

سے روکتے تھے اور اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور وہ آخرت کے منکرتے ○ اور

بَيْنَهُمْ حِجَابٌ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيئِهِمْ

ان دونوں (جنتیوں اور دوزخیوں) کے در بیان ایک حجاب ہے، اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو ہر ایک (جنتی یا دوزخی) کو

وَنَادُوا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلِّمُوا عَلَيْكُمْ لَمَّا دَخَلُوا هُمْ

اس کی علامت پہنچائیں گے اور وہ اہل جنت پکار کر کہیں گے تم پر سلام ہو، وہ ابھی جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے

يَطْمَعُونَ ﴿۳۹﴾ وَإِذَا مَرُفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا

اور وہ اس کی امید رکھیں گے ○ اور جب ان کی آنکھیں دوزخ والوں کی طرف پھیری جائیں گی، تو وہ کہیں گے

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۴۰﴾

اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ نہ کرنا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کو ماننے سے تکبر کیا، ان کے لیے اس وقت تک آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے (سوراخ) میں داخل ہو جائے اور ہم اسی طرح مجرموں کو سزا دیتے ہیں ○ ان کے لیے دوزخ (کی آگ) کا بچھونا ہو گا اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہو گا اور ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیتے ہیں ○

(الاعراف: ۳۱-۴۰)

کفار کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولنے کے متعدد محامل

اس سے پہلی آیتوں میں بھی کفار کے عذاب کا ذکر فرمایا تھا یہ آیت بھی اسی سلسلہ سے متعلق ہے۔ اس آیت میں فرمایا ہے کہ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔ اس کی حسب ذیل تفسیریں ہیں:

۱۔ علی بن طلحہ اور مجاہد وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کفار کے اعمال اور ان کی دعاؤں کی قبولیت کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور اس کی دلیل درج ذیل آیات ہیں:

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر: ۱۰) فرماتا ہے۔

كَذَٰلِكَ إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ۝

حق یہ ہے کہ بے شک نیکی کرنے والوں کا نامہ اعمال ضرور

(المطففين: ۱۸) (ساتویں آسمان کے اوپر) ملیں میں ہے۔

۲- امام رازی نے اس آیت سے یہ مستنبط کیا ہے کہ کافروں پر آسمان سے کوئی خیر اور برکت نازل نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا
عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن
كَذَّبُوا فَآخَذْنَهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور (اللہ سے)

ڈرتے رہتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کو

کھول دیتے لیکن انہوں نے (اللہ کی آیتوں کو) جھٹلایا تو ہم نے

انہیں ان کے ان کاموں کی وجہ سے گرفت میں لے لیا جو وہ

(الاعراف: ۹۶)

کرتے تھے۔

۳- ضحاک نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ کافروں کی روحوں کے لیے آسمان کے دروازے

نہیں کھولے جائیں گے اور وہ اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ٹانگے میں داخل ہو جائے اور

اونٹ کا سوئی کے ٹانگے میں داخل ہونا محال ہے اور جو محال پر موقوف ہو وہ بھی محال ہوتا ہے۔ کفار کے لیے آسمان کے دروازے

نہ کھولے جانے اور جنت میں ان کے داخل نہ ہو سکنے پر حسب ذیل حدیث میں دلیل ہے:

کافروں کے لیے آسمان کا دروازہ نہ کھولنے کے متعلق حدیث

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک انصاری کے جنازہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گئے۔ جب ہم

قبر پہنچ کر خاموشی سے بیٹھ گئے تو نبی ﷺ نے دو یا تین بار فرمایا: قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ طلب کرو۔ پھر آپ نے فرمایا جب

مسلمان بندہ دنیا سے منقطع ہو کر آخرت کی طرف روانہ ہونے لگتا ہے تو ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے اور کہتا

ہے: اے پاکیزہ روح! اللہ کی مغفرت اور اس کی رضا کی خاطر نکل۔ پھر وہ روح جسم سے اس طرح نکلتی ہے جس طرح پانی کے

قطرے مشک سے نکلتے ہیں۔ جب فرشتے اس روح کو لے کر فرشتوں کی جماعت کے پاس سے گزرتے ہیں تو وہ پوچھتے ہیں یہ پاکیزہ

روح کون ہے؟ وہ اس کا وہ نام بتاتے ہیں جو دنیا میں اس کا اچھا نام تھا، جب وہ آسمان دنیا کے سامنے پہنچ کر اس کا دروازہ کھلواتے

ہیں تو وہ کھول دیا جاتا ہے اور اسی طرح وہ ساتویں آسمان تک پہنچ جاتے ہیں۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میرے اس بندہ کے نامہ

اعمال کو ملیں میں لکھ دو۔ اور اس کو زمین کی طرف لوٹادو۔ پھر اس کی روح اس کے جسم میں لوٹادی جاتی ہے۔ پھر اس کے پاس دو

فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور پوچھتے ہیں تیرا دین کیا

ہے؟ وہ کہتا ہے میرا دین اسلام ہے اور پوچھتے ہیں یہ کون شخص ہے جو تم میں مبعوث کیا گیا تھا؟ وہ کہتا ہے یہ رسول اللہ ﷺ

ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں تمہیں ان کا علم کیسے ہوا؟ وہ کہتا ہے میں نے اللہ کی کتاب میں پڑھا، میں ان پر ایمان لایا اور ان کی تصدیق کی۔

پھر ایک منادی اعلان کرتا ہے کہ میرے بندہ نے سچ کہا، اس کے لیے جنت سے فرش بچھا دو اور اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس

کے لیے جنت کی کھڑکی کھول دو۔ (الی قولہ) اور جب کافر کی دنیا سے روانگی کا وقت آتا ہے تو اس کے پاس سیاہ رنگ کے فرشتے

ٹاٹ لے کر آتے ہیں۔ پھر ملک الموت آکر اس کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں اے خبیث روح! اللہ کے غصہ اور

غضب کی طرف نکل! اس کی روح جسم کے اجزاء میں پھیل جاتی ہے اور اس کو اس طرح کھینچ کر نکالا جاتا ہے جس طرح گیلے اون

تبیان القرآن

سے لوہے کی سح کو کھینچ کر نکالا جاتا ہے۔ روح کے نکلتے ہی وہ اس کو ٹاٹ میں لپیٹ لیتے ہیں۔ وہ روح سخت بدبودار ہوتی ہے۔ وہ اس کو لے کر جہاں سے گزرتے ہیں فرشتے پوچھتے ہیں یہ کون خبیث روح ہے؟ پھر وہ اس کا وہ نام بتاتے ہیں جو دنیا میں اس کا بہت قبیح نام تھا۔ جب وہ اس روح کو لے کر آسمان دنیا پر پہنچتے ہیں اور آسمان کا دروازہ کھلواتے ہیں تو ان کے لیے دروازہ نہیں کھولا جاتا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: لا تفتح لهم ابواب السماء ولا يدخلون الجنة حتى يلج الحمل في سم الخياط (الاعراف: ۴۰) اللہ فرماتا ہے اس کا اعمال نامہ زمین کے سب سے نچلے طبقہ جحیم میں پھینک دو۔ پھر اس کی روح کو نیچے پھینک دیا جاتا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی:

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخَطَفَهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوَىٰ بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيبٍ (الحج: ۳۱)

اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر اسے (مردار خور) پرندے اچک لیتے ہیں یا اسے آندھی کسی دور جگہ میں پھینک دیتی ہے۔

پھر اس کی روح اس کے جسم میں لوٹادی جاتی ہے پھر فرشتے اس کو قبر میں بٹھاتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے افسوس میں نہیں جانتا! پھر پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے افسوس میں نہیں جانتا! پھر پوچھتے ہیں یہ کون شخص ہیں جو تم میں مبعوث کیے گئے تھے؟ وہ کہے گا افسوس میں نہیں جانتا! پھر ایک منادی آسمان سے ندا کرے گا اس کے لیے دوزخ سے فرش بچھا دو اور اس کے لیے دوزخ کی کھڑکی کھول دو اور اس کی قبر کو تنگ کر دیا جائے گا حتیٰ کہ اس کی پسلیاں ایک طرف سے دوسری طرف نکل جائیں گی۔ پھر ایک بد شکل اور بدبودار شخص آئے گا اور کہے گا میں تیرا خبیث عمل ہوں اور وہ کافر کے گا: اے میرے رب قیامت قائم نہ کرنا۔

(مسند احمد، ج ۳، ص ۲۸۸-۲۸۹، دار الفکر، طبع قدیم، مسند احمد، ج ۶، رقم الحدیث: ۱۸۵۵۹، طبع جدید دار الفکر، اس کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد، ج ۱۳، رقم الحدیث: ۱۸۴۴۳، دار الحدیث قاہرہ، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۷۵۳، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۴۴۶۲، مجمع الزوائد، ج ۵، ص ۴۹-۵۰)

نوٹ: مسند احمد کی روایت میں بہت زیادہ تفصیل ہے۔ سنن ابوداؤد اور سنن ابن ماجہ کی روایات میں اتنی تفصیل نہیں ہے لیکن نفس مضمون واحد ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَّذِي جَاءَ بِالنُّفُوسِ لِيُحْيِيهَا وَلِيُنَبِّئَهُمْ عَمَلَهُمْ هُمْ فِيهَا وَلِيُخْرِجَهُمْ فِي سَعْيِهِم بِأَعْيُنِنَا ۗ سَتَجِدُنَا غَافِلِينَ (الاعراف: ۴۲)

بار نہیں ڈالتے وہی لوگ جنتی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ (الاعراف: ۴۲)

قرآن مجید کا اسلوب یہ ہے کہ وعدہ اور وعید دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر فرماتا ہے۔ اس سے پہلی آیتوں میں کفار کے لیے عذاب کی وعید بیان فرمائی تھی اس آیت میں مسلمانوں کے لیے ثواب کے وعدہ کا بیان فرمایا ہے۔ اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تصدیق کی اور جو کچھ آپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحی آئی تھی اس کا اقرار کیا اور جن چیزوں کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا ان پر عمل کیا اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے روکا تھا ان سے مجتنب رہے اور پھر درمیان میں یہ واضح فرمایا کہ ہم نے جن کاموں کا حکم دیا ہے یا جن کاموں سے روکا ہے وہ سب کام انسان کی طاقت اور اس کی وسعت میں ہیں اور ہم کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہیں ڈالتے تو وہی لوگ جنتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اور اس میں کافروں کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ جنت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا حصول بہت آسان کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے ان کے سینوں سے (ایک دوسرے کے خلاف) رنجش کو نکال دیا ہے، ان کے نیچے دریا بہ رہے ہیں، وہ کہیں گے اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں پہنچایا اور اگر اللہ ہمیں نہ پہنچاتا تو ہم از خود یہاں نہیں پہنچ سکتے تھے بے شک ہمارے پاس ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے اور ان کو یہ ندا کی جائے گی کہ تم اپنے (نیک) اعمال کی وجہ سے جنت کے وارث کیے گئے ہو (الاعراف: ۴۳)

اہل جنت کے دلوں سے دنیا کی رنجشوں اور شکایتوں کا محو ہو جانا

اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کے سینوں سے ان رنجشوں کو نکال دے گا جو دنیا میں وہ ایک دوسرے کے خلاف رکھتے تھے۔ کیونکہ کینہ کا سبب شیطان کے وسوسے ہیں اور شیطان اس وقت دوزخ میں جل رہا ہوگا۔ اس لیے اہل جنت کے سینے اور ان کے دل ہر قسم کے بغض، کینہ اور کدورت سے صاف ہوں گے۔

ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

قائدہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مجھے امید ہے کہ میں، عثمان، طلحہ اور زبیر ان لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور ہم نے ان کے سینوں سے (ایک دوسرے کے خلاف) رنجش کو نکال دیا ہے۔

(جامع البیان، جز ۸، ص ۲۴۰، دار الفکر، تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۵، ص ۸۷، ۱۳، نزار مصطفیٰ مکہ المکرمہ)

ابو نصرہ بیان کرتے ہیں کہ اہل جنت کو جنت کے پاس روک لیا جائے گا اور بعض کا بعض سے حق دلایا جائے گا۔ حتیٰ کہ جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو کسی کا کسی کے خلاف ایک ناخن کے برابر بھی حق یا مطالبہ نہیں رہے گا اور اہل دوزخ کو دوزخ کے پاس روک لیا جائے گا اور ہر ایک کا حق دلایا جائے گا حتیٰ کہ جب وہ دوزخ میں داخل ہوں گے تو کسی کو کسی کے خلاف ایک ناخن کے برابر بھی ظلم کی شکایت نہیں ہوگی۔ (جامع البیان، جز ۸، ص ۲۴۱، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب مسلمانوں کی دوزخ سے نجات ہو جائے گی تو ان کو جنت اور دوزخ کے درمیان پل پر روک لیا جائے گا۔ پھر ان میں سے جس نے جس کے ساتھ دنیا میں زیادتی کی ہوگی اس کا قصاص لیا جائے گا۔ پس جب ان کو پاک اور صاف کر دیا جائے گا (اور کسی کو کسی سے شکایت نہیں رہے گی) تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ پس اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں (سیدنا) محمد کی جان ہے، ان میں سے ہر ایک شخص کو جنت میں اپنے ٹھکانے کا دنیا کے ٹھکانے سے زیادہ علم ہوگا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۶۵۳۵، ۲۴۴۰، مسند احمد، ج ۳، ص ۷۳، ۷۴، ۶۳، ۳۱)

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ جنت کے درجات مختلف ہوں گے اور نچلے درجے والے اوپر کے درجہ والوں سے حسد نہیں کریں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو حسد اور بغض سے پاک کر دیا ہے اور اس کا سبب یہ ہوگا کہ حسد اور بغض شیطان کے وسوسوں سے ہوتا ہے اور وہ اس وقت دوزخ میں ہوگا۔

کفار کی جنتوں کا مسلمانوں کو وراثت میں ملنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور ان کو یہ ندا کی جائے گی کہ تم اپنے (نیک) اعمال کی وجہ سے جنت کے وارث کیے گئے ہو۔

(الاعراف: ۴۳)

ہر کافر اور مومن کے لیے جنت میں ایک ٹھکانا بنایا گیا ہے، لہذا جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل

دوزخ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو اہل دوزخ کو جنت دکھائی جائے گی تاکہ وہ اس میں اپنا ٹھکانہ دیکھ لیں اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ تمہارے ٹھکانے ہیں اگر تم ایمان لے آتے اور اللہ کی اطاعت کرتے تو تم کو جنت میں یہ ٹھکانے دے دیے جاتے۔ پھر اہل جنت سے کہا جائے گا کہ اے اہل جنت، تم ان ٹھکانوں کو بہ طور وراثت لے لو کیونکہ تم نیک عمل کرتے تھے، پھر جنت میں کافروں کے ٹھکانے اہل ایمان میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ اسی طرح ہر کافر اور مومن کے لیے دوزخ میں بھی ایک ٹھکانا بنایا گیا ہے اور مسلمانوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد ان کو دوزخ میں ان کے ٹھکانے دکھائے جائیں گے کہ اگر وہ ایمان نہ لاتے تو ان کو دوزخ کے ان ٹھکانوں میں رکھا جاتا۔ پھر ان کے حصہ کی دوزخیں کافروں کو دی جائیں گی اور یہ اس لیے ہے کہ قیامت کے دن کافر اللہ تعالیٰ سے یہ نہ کہہ سکے کہ اگر میں ایمان لاتا تو تو نے میرے لیے جنت میں کوئی ٹھکانا تو بنایا ہی نہیں تھا تو مجھے جنت میں کس جگہ رکھتا؟

اس مضمون پر حسب ذیل احادیث دلالت کرتی ہیں:

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر دوزخی جنت میں اپنا ٹھکانا دیکھے گا پھر یہ کہے گا: کاش اللہ مجھے ہدایت دے دیتا! اور یہ دیکھنا اس کے لیے حسرت کا باعث ہو گا! اور ہر جنتی دوزخ میں اپنا ٹھکانا دیکھے گا پھر کہے گا: اگر اللہ مجھے ہدایت نہ دیتا تو میں یہاں ہوتا اور یہ دیکھنا اس کے لیے شکر کا موجب ہو گا۔

(مسند احمد، ج ۱، ص ۵۱۲، طبع قدیم دار الفکر، اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد، ج ۹، رقم الحدیث: ۱۰۶۰۰، دار الحدیث قاہرہ، ۱۳۱۶ھ

مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۳۹۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ہر دوزخ میں داخل ہونے والے کو جنت میں اس کا ٹھکانا دکھایا جائے گا بشرطیکہ وہ ایمان لے آتا، تاکہ اسے حسرت ہو۔ اور ہر جنت میں داخل ہونے والے کو دوزخ میں اس کا ٹھکانا دکھایا جائے گا اگر وہ برے کام کرتا تاکہ وہ زیادہ شکر کرے۔

(مسند احمد، ج ۲، ص ۵۳۱، اس کی سند صحیح ہے، مسند احمد، ج ۹، رقم الحدیث: ۱۰۹۲۲، مجمع الزوائد، ج ۱، ص ۳۹۹)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایک یہودی یا نصرانی دے گا اور فرمائے گا یہ تمہارا دوزخ کی آگ سے فدیہ ہے۔

(صحیح مسلم، التوبہ، ۲۹، (۲۷۶۷) (۶۸۷۸)

علامہ نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ایک روایت میں ہے جب کوئی مسلمان شخص فوت ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں ایک یہودی یا عیسائی کو دوزخ میں داخل کر دیتا ہے اور ایک روایت میں ہے قیامت کے دن بعض مسلمان پہاڑوں کے برابر گناہ لے کر آئیں گے اللہ تعالیٰ ان کے گناہ بخش دے گا اور ان گناہوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے اوپر ڈال دے گا۔ اس حدیث کا وہی معنی ہے جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ (جس کو ابھی ہم نے بیان کیا ہے)

جنت میں دخول کا حقیقی سبب اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے نہ کہ نیک اعمال

نیز اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ تم اپنے اعمال کی وجہ سے جنت میں داخل ہوئے ہو حالانکہ قرآن مجید کی دیگر آیات اور احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتی ہے نہ کہ بندہ کے عمل سے:

جو لوگ اللہ اور (اس کے) رسول کی اطاعت کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا جو کہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں اور یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے فضل ہے اور وہ کافی جاننے والا ہے۔

سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اس (کے دامن رحمت) کو مضبوطی سے تھام لیا تو عنقریب اللہ ان کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا۔

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے وہ جنتوں کے باغوں میں ہوں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس ہر وہ چیز ہوگی جس کو وہ چاہیں گے یہی ہے بہت بڑا فضل۔

بے شک متقی لوگ امن کی جگہ میں ہوں گے ○ جنتوں میں اور چشموں میں ○ وہ باریک اور موٹے ریشم کا لباس پہنے آسنے سامنے ہوں گے ○ ایسا ہی ہو گا ہم بڑی آنکھوں والی حوروں کو ان کی زوجیت میں دیں گے ○ وہ وہاں پر ہر قسم کے پھل اطمینان سے طلب کریں گے ○ وہ پہلی موت کے سوا جنت میں کسی موت کا مزہ نہیں چکھیں گے اللہ نے ان کو دوزخ کے عذاب سے بچایا ○ (انہیں یہ سب نعمتیں ملیں) آپ کے رب کے فضل سے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے ○

تاکہ اللہ اپنے فضل سے ان لوگوں کو جزا دے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے۔

وہ دائمی جنتوں میں داخل ہوں گے، وہاں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان جنتوں میں ان کا لباس ریشم کا ہو گا ○ اور وہ کہیں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے ہم سے غم کو دور کر دیا، بے شک ہمارا رب بہت بخشنے والا اور جزا دینے والا ہے، جس نے ہم کو اپنے فضل سے دائمی مقام میں اتارا۔

اور احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان عمل سے نہیں، اللہ کے فضل سے جنت میں جائیں گے۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل ہرگز جنت میں

وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَ الرَّسُولَ فَأُولَئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَ الصِّدِّيقِينَ وَ الشُّهَدَاءِ وَ الصَّالِحِينَ وَ حَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا ○ ذَٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللَّهِ وَ كَفَى بِاللَّهِ عَلِيمًا ○ (النساء: ۷۰-۷۱)

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَ اعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ فَضْلٍ ○ (النساء: ۱۷۵)

وَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَاتِ الْجَنَّاتِ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ○ (الشورى: ۲۲)

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ○ فِي جَنَّاتٍ وَ عُرْوٍ ○ يَلْبَسُونَ مِنْ سُندُسٍ وَ اسْتَبْرَقٍ مُّتَقَابِلِينَ ○ كَذَٰلِكَ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ○ يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهِةٍ أَمِينٍ ○ لَا يَدْخُلُونَ فِيهَا الْمَوْتِ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ وَ وَفَّيْنَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ○ فَضْلًا مِّن رَّبِّكَ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○ (الدخان: ۵۴-۵۱)

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِن فَضْلِهِ ○ (الروم: ۳۵)

جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَ لُؤْلُؤًا وَ لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ○ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزْنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ○ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِن فَضْلِهِ ○ (فاطر: ۳۵-۳۳)

داخل نہیں کرے گا صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! آپ کو بھی نہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھ کو بھی نہیں سوا اس کے کہ اللہ مجھے اپنے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۶۷۳، صحیح مسلم، المنافقین ۷۵، (۲۸۱۶) ۶۹۸۳، مسند احمد، ج ۲، ص ۲۸۲، ۲۸۸، ۵۰۳، ۵۱۳، طبع قدیم، دار الفکر، المعجم الکبیر، ج ۷، رقم الحدیث: ۷۲۱۸، المعجم الاوسط، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۳۱۵، مسند البرز، ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۳۸، (۳۳۳۷)

دخول جنت کے لیے اعمال کو سبب قرار دینے کے محامل

اب جبکہ قرآن مجید کی متعدد آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمان اپنے عمل کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے جنت میں جائیں گے تو سورۃ الاعراف کی اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اور جنتیوں کو یہ ندا کی جائے گی کہ تمہارا جنت میں داخلہ تو اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوا ہے اور تمہارے نیک اعمال کی وجہ سے تم کو کفار کی چھوڑی ہوئی جنتیں بہ طور وراثت مل جائیں گی اور اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ جنت میں دخول کا ایک سبب حقیقی ہے اور ایک سبب ظاہری ہے۔ سبب حقیقی تو اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات اور احادیث میں بیان فرمایا ہے اور اس کا سبب ظاہری مسلمانوں کے نیک اعمال ہیں جیسا کہ سورۃ الاعراف کی اس آیت میں بیان فرمایا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ نیک اعمال فی نفسہ جنت میں دخول کا سبب نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے نیک اعمال کو دخول جنت کا سبب بنایا ہے تو اصل چیز تو اللہ کا کرم اور اس کا فضل ہے۔ چوتھا جواب یہ ہے کہ انسان بالغ ہونے کے بعد عبادات اور نیک اعمال شروع کرتا ہے اور عبادت اور نیک اعمال شروع کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ اس کو غیر متناہی نعمتیں عطا کر چکا ہے۔ اب اس کے یہ نیک اعمال تو پچھلی نعمتوں کا ہی شکر ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں چہ جائیکہ وہ ان نیک اعمال کی وجہ سے کسی نئے اجر کا مستحق ہو ان نعمتوں کے مقابلہ میں جو عبادات اور شکر کی کمی ہے اگر اللہ اس کو ہی معاف کر دے تو یہ اس کا بہت بڑا کرم ہے، کسی اور اجر و ثواب کے مطالبہ کا کیا جواز ہے! ایک شخص کسی کو دس کروڑ روپے پہلے ہی دے دے پھر وہ شخص اس کے ہاں پچاس ساٹھ سال کام کرے جس کی اجرت پچاس لاکھ روپے بنتی ہو، اب وہ کام کرنے والا اس سے اپنی اجرت کا مطالبہ کرے تو وہ شخص یہ نہیں کہے گا کہ میرے تو پہلے ہی ۹ کروڑ پچاس لاکھ روپے تمہاری طرف نکلتے ہیں، اگر میں پچھلا قرض ہی معاف کر دوں تو بڑی بات ہے۔ آئندہ اجرت کے مطالبہ کا کیا جواز ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اہل جنت دوزخیوں سے پکار کر کہیں گے کہ بے شک ہمارے رب نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا، ہم نے اس کو سچا پایا۔ کیا تم نے بھی اس وعدہ کو سچا پایا جو تم سے تمہارے رب نے کیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں! پھر ان کے درمیان ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔ جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے اور اس کو ٹیڑھا کرنا چاہتے تھے اور وہ آخرت کے منکر تھے۔ (الاعراف: ۳۵-۳۴)

حشر کے دن کفار کی توبہ کارگر نہیں ہوگی

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حشر کے دن جب کفار یہ اعتراف کریں گے کہ ان کے رب نے ان سے سچا وعدہ کیا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف کریں گے اور شرک سے بیزاری کا اظہار کریں گے اور شیطان اور دوسرے گمراہ کرنے والوں کی مذمت کریں گے اور اپنے کیے پر نادم ہوں گے تو کیا ان کا برائی پر نادم ہونا اور حق کا اعتراف کر لینا ان کی توبہ کے قائم مقام نہیں ہے اور کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْمَلُ

اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے۔

عَنِ السَّيِّئَاتِ (الشوری: ۲۵)

اس کا جواب یہ ہے کہ حشر کا دن دارالجزاء ہے اور دارالعمل دنیا ہے۔ ان کی توبہ اور ایمان کی جگہ دنیا تھی۔ حشر کے دن توبہ کرنا مفید ہے نہ ایمان لانا۔ قرآن مجید میں ہے اللہ تعالیٰ غرغره موت کے وقت بھی توبہ قبول نہیں فرماتا:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ

ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئے تو وہ کہے کہ میں نے اب توبہ کی اور نہ ان لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے جو حالت کفر پر مرتے ہیں۔

حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ
الْكَفْرَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفْرًا

(النساء: ۱۸)

اور جب غرغره موت کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی تو موت کے بعد توبہ کیسے قبول ہوگی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غرغره موت کے وقت اور موت کے بعد انسان غیب کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور غیب کے مشاہدہ کے بعد ایمان لانا معتبر نہیں ہے، معتبر غیب پر ایمان لانا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان دونوں (جنتیوں اور دوزخیوں) کے درمیان ایک حجاب ہے، اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو ہر ایک (جنتی اور دوزخی) کو اس کی علامت سے پہچانیں گے اور وہ اہل جنت سے پکار کر کہیں گے تم پر سلام ہو، وہ ابھی جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اور وہ اس کی امید رکھیں گے اور جب ان کی آنکھیں دوزخ والوں کی طرف پھیری جائیں گی تو وہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہمیں ظالم لوگوں کے ساتھ نہ کرنا (الاعراف: ۳۷-۳۶)

الاعراف کا معنی اور مصداق

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے کہ الاعراف جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہے۔

(المفردات، ج ۲، ص ۳۳۲، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ بیروت)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الاعراف بلند چیز ہے اور لغت میں الاعراف کا معنی ہے بلند جگہ۔ یہ عرف کی جمع ہے۔

علماء نے اصحاب الاعراف کے متعلق دس اقوال ذکر کیے ہیں:

۱- حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ابن عباس نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں۔

۲- مجاہد نے کہا: یہ صالح فقہاء اور علماء ہیں۔

۳- مہدوی نے کہا: یہ شہداء ہیں۔

۴- قسیری نے کہا: یہ وہ فاضل مومن اور شہید ہیں جو اپنے کاموں سے فارغ ہو کر لوگوں کے احوال کا مطالعہ کرنے کے لیے

فارغ ہو گئے۔ یہ لوگ جب اہل دوزخ کو دیکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتے ہیں کہ ان کو دوزخ کی طرف لوٹایا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور جب یہ ان اہل جنت کو دیکھتے ہیں جو ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے تو ان کے دخول کی امید رکھتے ہیں۔

۵- مٹھی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ الاعراف پل صراط پر ایک بلند جگہ ہے جس پر حضرت عباس، حضرت حمزہ، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہم ہیں۔ وہ اپنے ٹھین کو سفید چہرے سے پہچانتے ہیں۔ اور اپنے بغضین کو سیاہ چہرے سے پہچانتے ہیں۔

۶- زہراوی نے کہا: یہ وہ نیک لوگ ہیں جو قیامت کے دن لوگوں کے اعمال کی گواہی دیں گے اور یہ ہر امت میں ہیں۔
۷- زجاج نے کہا: یہ انبیاء ہیں۔

۸- ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کبیرہ گناہ کیے ان کے صغیرہ گناہ بھی تھے جو مصائب اور آلام کی وجہ سے معاف نہیں ہو سکے۔ یعنی یہ گناہ گار لوگ ہیں۔

۹- تیسری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ زنا سے پیدا شدہ لوگ ہیں۔

۱۰- ابو مجلز نے ذکر کیا کہ یہ ملائکہ ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، جز ۸، ص ۱۹۱-۱۹۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اہل الاعراف جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ جنت میں داخل ہونے کی طمع رکھتے ہوں گے۔ پھر اگر ان کے متعلق ہم یہ کہیں کہ وہ اشرف اہل جنت ہیں تو اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو الاعراف پر بٹھایا اور جنت میں ان کا داخلہ موخر کر دیا تاکہ وہ اہل جنت اور اہل نار کے احوال کو دیکھ سکیں۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو جنت کے بلند درجات کی طرف منتقل فرمائے گا جیسا کہ نبی ﷺ سے روایت ہے کہ نچلے درجات والے بلند درجات والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسا کہ تم آسمان کے کناروں پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتے ہو اور ابو بکر اور عمران لوگوں میں سے ہیں اور تحقیق یہ ہے کہ اصحاب الاعراف اشرف اہل قیامت ہیں اور جب محشر میں سب لوگ کھڑے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اصحاب الاعراف کو الاعراف میں بٹھادے گا جو کہ بہت معزز اور بلند جگہ ہوگی اور جب جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو جنت کے بلند درجات میں منتقل فرمادے گا سو وہ لوگ ہمیشہ بلند درجات میں رہیں گے۔

اور اگر اصحاب الاعراف کی یہ تفسیر کی جائے کہ وہ اہل جنت سے کم درجہ کے ہوں گے تو ہم کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو الاعراف میں بٹھائے گا اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور احسان سے یہ امید رکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس مقام سے جنت کی طرف منتقل کر دے گا۔ اور جب اصحاب الاعراف اہل دوزخ کو دیکھیں گے تو وہ اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اہل دوزخ میں سے نہ کرے، اور ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرے اور آباء و اجداد کی اندھی تقلید نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی ﷺ کی رسالت میں غور و فکر کرے اور ان پر ایمان لا کر ان کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرے اور دنیا اور آخرت کی سرخروئی حاصل کرے۔

وَنَادَىٰ اصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيَاهِهِمْ قَالُوا

اور اصحاب الاعراف جن (دوزخیوں) کو ان کی علامتوں سے پہچانتے تھے ان سے پکار کر کہیں گے تمہاری جماعت

مَا آغَتْي عَنْكُمْ جَعَلَكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿۲۸﴾ أَهْلُوا الدِّينِ

تم کو مذاہب نہ چھڑایا اور نہ اس (مال و دولت) نے جس کی وجہ سے تم تکبر کرتے تھے ○ کیا یہ (جنتی لوگ) وہی (نہیں)

أَقْسَمْتُ لَآيُنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ أَدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ

ہیں جن کے متعلق تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ اللہ ان کو اپنی رحمت بالکل نہیں دے گا: (انہی سے کہا گیا ہے) تم جنت میں داخل ہو جاؤ

وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿۵۹﴾ وَنَادَى أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ

تم پر کوئی خوف ہوگا اور نہ تم غمگین ہو گے ○ اور اہل دوزخ اہل جنت سے پکار کر کہیں گے ہم پر

أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ

تھوڑا پانی انڈیل دو، یا کچھ اس میں سے لے دو جو اللہ نے تمہیں رزق دیا ہے تو (اہل جنت) کہیں گے بیشک اللہ نے یہ

حَرَّمَهَا عَلَى الْكٰفِرِينَ ﴿۶۰﴾ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَلَعِبًا

پانی اور رزق کافروں پر حرام کر دیا ہے ○ جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا لیا تھا اور

وَعَزَّتْهُمْ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ نَنسِفُهُمْ كَمَا نَسَوُا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ

جن کو دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا تو آج کے دن ہم انہیں بھلا دیں گے جس طرح انہوں نے اس دن کی

هٰذَا وَمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ جِئْتَهُم بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ

ملاقات کو بھلا رکھا تھا اور وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے ○ بیشک ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کو

عَلَىٰ عَلَيْهِمْ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿۶۲﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا

ہم نے اپنے عظیم علم کے مطابق تفصیل سے بیان کیا ہے اور وہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے ○ کیا وہ (اس کتاب)

تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلَهُ يَقُولُ الَّذِينَ سُوءُ مِنْ قَبْلُ

پر ایمان لانے کے لیے) اس کی وعید کے وقوع کا انتظار کر رہے ہیں! جس دن وہ وعید واقع ہوگی تو جو لوگ اس کو پہلے فراموش کر

قَدْ جَاءَتْ رُسُلٌ مِّمَّنَّا بِالْحَقِّ فَهَلْ لَنَا مِنْ شَفْعَاءٍ فَيَشْفَعُوا

چکے تھے وہ کہیں گے بیشک ہمارے رب کے رسول حق نے آئے تھے تو کیا ہمارے کوئی سفارشچی ہیں جو ہماری سفارش کریں؟

لَنَا أَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلْ غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ قَدْ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ

یا ہم کو دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم ان کاموں کے برخلاف کام کریں جو پہلے کرتے تھے بیشک انہوں نے اپنے آپ کو خسارے

وَصَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۵۳﴾

میں ڈال دیا اور ان سے وہ بتان گم ہو گئے جن کا وہ افتراء کرتے تھے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اصحاب الاعراف جن دوزخیوں کو ان کی علامتوں سے پہچانتے تھے ان سے پکار کر کہیں گے تمہاری جماعت نے تم کو عذاب سے نہ چھڑایا اور نہ اس (مال و دولت) نے جس کی وجہ سے تم تکبر کرتے تھے ○ کیا یہ (جنتی لوگ) وہی نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسم کھا کر کہتے تھے کہ اللہ ان کو اپنی رحمت بالکل نہیں دے گا! (انہی سے کہا گیا ہے کہ) تم جنت میں داخل ہو جاؤ نہ تم پر کوئی خوف ہو گا اور نہ تم غمگین ہو گے ○ (الاعراف: ۳۸-۳۹)

اصحاب الاعراف کو دخول جنت کا اذن

جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو اصحاب الاعراف دوزخیوں کو ان کی دوزخی علامات سے پہچان کر کہیں گے تم دنیا میں جو مال اور اسباب جمع کرتے تھے اور جن چیزوں پر تم تکبر کیا کرتے تھے وہ تم سے اللہ کے عذاب کو دور نہ کر سکے۔ ابو جہل نے کہا: اس آیت میں اصحاب الاعراف سے مراد ملائکہ ہیں اور حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اصحاب الاعراف گنہ گار مسلمان ہیں وہ الاعراف پر کھڑے ہوں گے۔ وہ اہل جنت کی طرف دیکھ کر جنت میں داخل ہونے کی خواہش کریں گے اور اہل دوزخ کو دیکھ کر دوزخ سے پناہ طلب کریں گے۔ پھر ان کو جنت میں داخل کر دیا جائے گا پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا یہ (اصحاب الاعراف) وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم یہ کہتے تھے کہ ان کو اللہ اپنی رحمت بالکل نہیں دے گا؟ پھر اصحاب الاعراف سے فرمائے گا: تم جنت میں داخل ہو جاؤ نہ تم پر کوئی خوف ہو گا اور نہ تم غمگین ہو گے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے اور اللہ کی اور اس کے رسولوں کی اطاعت کرنے سے اپنے مال و دولت کی وجہ سے تکبر کرتے تھے، ان سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اے متکبرو! کیا یہی وہ کمزور اور پس ماندہ لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ان کو اللہ کی رحمت سے کچھ نہیں ملے گا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے اپنے فضل اور اپنی رحمت سے ان کو بخش دیا ہے۔ اے اصحاب الاعراف! جنت میں داخل ہو جاؤ، تم نے دنیا میں جو گناہ اور جرم کیے تھے، تمہیں اب ان کے مواخذہ اور ان پر سزا کا کوئی خوف نہیں ہو گا اور نہ تمہیں اس کا کوئی رنج ہو گا کہ تم سے دنیا میں نیکیاں رہ گئیں۔ (جامع البیان، ج ۸، ص ۲۶۱-۲۵۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اہل دوزخ اہل جنت سے پکار کر کہیں گے ہم پر تھوڑا سا پانی انڈیل دو، یا کچھ اس میں سے دے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے تو وہ (اہل جنت) کہیں گے بے شک اللہ نے یہ پانی اور رزق کافروں پر حرام کر دیا ہے ○ جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشایا لیا تھا اور جن کو دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا تو آج کے دن ہم انہیں بھلا دیں گے جس طرح انہوں نے اس دن کی ملاقات کو بھلا کر رکھا تھا اور وہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے ○ (الاعراف: ۵۱-۵۰)

کافروں کو دوزخ میں کھانے پینے سے محروم رکھنے کی سزا دینا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اہل دوزخ چونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان پر جو غریبوں اور مسکینوں کے حقوق فرض کیے تھے ان کو ادا نہیں کرتے تھے، وہ بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے نہ پیاسوں کو پانی پلاتے تھے، سو اللہ تعالیٰ دوزخ میں آگ کے عذاب کے علاوہ ان پر بھوک اور پیاس کا عذاب بھی نازل کرے گا پھر وہ بھوک اور پیاس کی شدت سے بلبلا کر اہل جنت سے فریاد کریں گے کہ تم ہم پر کچھ پانی ڈال دو یا تم کو جو طعام دیا ہے، اس طعام سے کچھ دے

دو تو اہل جنت ان کو جواب دیں گے کہ اللہ نے پانی اور طعام کو ان لوگوں پر حرام کر دیا ہے جنہوں نے دنیا میں اس کی توحید کو ماننے سے انکار کیا تھا، اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی تھی۔

پھر فرمایا: ان لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشایا لیا تھا۔ حضرت ابن عباس نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ جب بھی ان کو اللہ کے دین کی دعوت دی جاتی تو یہ دعوت دینے والوں کا مذاق اڑاتے تھے۔

پھر فرمایا: تو آج کے دن ہم انہیں بھلا دیں گے جس طرح انہوں نے اس دن کی ملاقات کو بھلا رکھا تھا۔ یعنی ہم ان کو اسی طرح دوزخ میں بھوکا پیاسا چھوڑے رکھیں گے جس طرح انہوں نے اس دن کی ملاقات سے بے پرواہ ہو کر ایمان لانے کو اور نیک اعمال کو چھوڑ رکھا تھا۔

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک بندے سے فرمائے گا: کیا میں نے تیرا نکاح نہیں کیا تھا؟ میں نے تجھے عزت نہیں دی تھی؟ اور کیا میں نے تیرے لیے گھوڑے اور اونٹ مسخر نہیں کیے تھے؟ اور کیا تو سرداری اور افسری نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا کیوں نہیں! پھر فرمائے گا: تو مجھ سے ملاقات کا یقین رکھتا تھا؟ وہ کہے گا نہیں! پھر اللہ فرمائے گا ہم آج تجھے بھلا دیتے ہیں جس طرح تو نے ہمیں بھلا دیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۱۷۶)

اللہ کی راہ میں پانی خرچ کرنے کی اہمیت اور اجر و ثواب
اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سب سے عظیم نعمت پانی ہے کیونکہ دوزخ کے عذاب میں گرفتار کافر سب سے پہلے پانی کا سوال کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کی راہ میں سب سے زیادہ ثواب پانی خرچ کرنے کا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے افضل صدقہ پانی کا ہے۔ کیا تم نے نہیں سنا کہ جب اہل دوزخ اہل جنت سے فریاد کریں گے تو یہ کہیں گے کہ ہم پر پانی انڈیل دو، یا کچھ اس رزق سے دے دو جو اللہ نے تم کو دیا ہے۔

(مسند ابو-علیٰ، ج ۵، رقم الحدیث: ۲۶۷۳، المعجم الاوسط، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۰۱۵، شعب الایمان، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۳۸۰، تفسیر ابن ابی حاتم، ج ۵، ص ۱۳۹۰، تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۱۷۶، مطبوعہ دار الاندلس، بیروت، تفسیر در مشور، ج ۳، ص ۲۶۸، مطبوعہ دار الفکر، بیروت) امام ابو داؤد روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: کس چیز کا صدقہ کرنا آپ کو زیادہ پسند ہے؟ آپ نے فرمایا: پانی کا۔ (سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۱۶۷۹، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۶۸۳)

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! سعد کی والدہ فوت ہو گئی ہیں کس چیز کا صدقہ کرنا افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: پانی کا تو حضرت سعد نے کنواں کھدوا دیا اور کہا یہ سعد کی ماں کے لیے ہے۔

(سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۱۶۸۱، سنن نسائی، رقم الحدیث: ۳۶۶۶، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۶۸۳) ان احادیث سے یہ واضح ہو گیا کہ پانی پلانے سے اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے اور احادیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کتے کو پانی پلانے سے بھی عمر بھر کے گناہوں کو بخش دیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک شخص جا رہا تھا اس کو بہت شدید پیاس لگی۔ اس نے کنوئیں میں اتر کر پانی پیا تو اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس نے سوچا اس کتے کو بھی ایسے ہی پیاس لگی ہے جیسے مجھے لگی تھی۔ اس نے کنوئیں میں اتر کر اپنے موزہ میں پانی بھرا پھر باہر آ کر اس موزہ سے کتے کو پانی پلایا۔ اللہ

تعالیٰ نے اس کے اس عمل کو قبول فرمایا اور اس کو بخش دیا۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ کیا جانوروں کے ساتھ نیکی کرنے کا بھی اجر ملتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہر تر جگر کے ساتھ نیکی میں اجر ہے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۲۳۶۳، صحیح مسلم، سلام: ۵۳۱، (۲۲۳۳) ۵۷۵۱، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۲۵۵۰، شعب الایمان، ج ۳،

رقم الحدیث: ۳۳۷۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک کتا کنوئیں کی منڈیر کے گرد گھوم رہا تھا۔ جس کو پیاس نے ہلاک کر دیا تھا اچانک بنو اسرائیل کی فاحشہ عورتوں میں سے ایک عورت نے اس کو دیکھ لیا اس نے اپنا موزہ اتارا اور اس میں پانی بھر کر اس کو پلایا۔ اس سبب سے اس عورت کو بخش دیا گیا۔

(صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۳۳۶۷، صحیح مسلم، سلام: ۱۵۵، (۲۲۳۵) ۵۷۵۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جس جگہ پانی دستیاب ہو وہاں کسی شخص نے کسی مسلمان کو ایک گھونٹ پانی پلایا تو گویا اس نے ایک غلام کو آزاد کر دیا اور جس جگہ پانی دستیاب نہ ہو وہاں کسی شخص نے کسی مسلمان کو پانی پلایا تو گویا اس نے اس مسلمان کو زندہ کر دیا۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۳۷۴، علامہ ابن الجوزی نے کہا یہ حدیث موضوع ہے، الموضوعات، ج ۲، ص ۱۷۰)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

امام ابن عدی نے کہا: یہ حدیث موضوع ہے اس حدیث کی آفت احمد ہے۔ اس میں حسن بن ابی جعفر کو وہم ہوا ہے اور یہ متروک ہے۔ اس نے اس حدیث کو علی بن زید سے روایت کیا ہے اور وہ اس سے زیادہ ضعیف ہے۔ اس کو علی بن زید نے از سعید بن المسیب از ام المومنین عائشہ روایت کیا ہے اور امام ابن ماجہ نے اس کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔

(الکامل ابن عدی، ج ۲، ص ۷۲۰، اللالی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ، ج ۲، ص ۷۲)

حافظ نور الدین علی بن ابی بکر البیہقی المتوفی ۸۰۷ھ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

اس حدیث کو امام طبرانی نے المعجم الاوسط میں (ایک دوسری سند سے) روایت کیا ہے۔ (المعجم الاوسط، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۵۸۸) اس کی سند میں زہیر بن مرزوق ہے۔ امام بخاری نے کہا: وہ مجہول اور منکر الحدیث ہے۔ (گویا یہ حدیث ضعیف ہے)

(مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۱۳۳، مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۲ھ)

مرثد بن عیاض بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے سوال کیا یا رسول اللہ! مجھے وہ عمل بتلائے جو مجھے جنت میں داخل کر دے۔ آپ نے پوچھا: کیا تمہارے والدین میں سے کوئی ایک زندہ ہے؟ اس نے کہا نہیں! آپ نے کئی بار یہ سوال کیا پھر فرمایا: تم پانی پلاؤ، اس نے کہا: میں کیسے پانی پلاؤں؟ آپ نے فرمایا: جب لوگوں کے پاس پانی ہو تو ان کو پانی کا آلہ مہیا کر دو اور جب ان کے پاس پانی نہ ہو تو ان کو پانی لا کر دو۔

(مسند احمد، ج ۵، ص ۳۶۸، المعجم الکبیر، ج ۱، ص ۷۰، حافظ البیہقی نے کہا اس کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد، ج ۳، ص ۱۳۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: دو شخص جنگل میں سفر کر رہے تھے۔ ایک عابد تھا اور دوسرا گنہ گار تھا۔ عابد کو سخت پیاس لگی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس کے ساتھی کے پاس ایک ڈول میں پانی تھا وہ دل میں کہنے لگا: خدایا اگر یہ نیک بندہ پیاسا مر گیا جبکہ میرے پاس پانی تھا تو میں کبھی کوئی خیر حاصل نہیں کر سکوں گا اور اگر میں نے اس کو اپنا پانی پلا دیا تو میں یقیناً مر جاؤں گا۔ پھر اس نے اللہ پر توکل کیا اور اس کو پانی پلانے کا عزم کر لیا۔ اس نے اس بے ہوش عابد پر پانی چھڑکا

اور اس کو اپنے حصہ کا پانی پلا دیا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ حتیٰ کہ دونوں نے جنگل کی مسافت کو طے کر لیا۔ وہ گناہ گار آدمی جب قیامت کے دن حساب کے لیے کھڑا کیا گیا تو اس کو دوزخ میں بھیجنے کا حکم دیا گیا۔ فرشتے اس کو لے جا رہے تھے کہ اس شخص نے اس عابد کو دیکھ لیا، اس نے عابد سے کہا: اے فلاں شخص! کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟ عابد نے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا: میں وہ شخص ہوں جس نے جنگل کے دن تم کو اپنے اوپر ترجیح دی تھی۔ عابد کے گاہاں! میں نے تم کو پہچان لیا! پھر وہ فرشتوں سے کہے گا ٹھہرو، ٹھہرو، پھر وہ کھڑا ہو کر اپنے رب سے دعا کرے گا اور کہے گا اے میرے رب! تو جانتا ہے اس شخص نے جو مجھ پر احسان کیا تھا! اور کس طرح اس نے مجھے اپنے اوپر ترجیح دی تھی! اے میرے رب! اس کو میری خاطر بخش دے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا وہ تمہاری خاطر ہے، پھر وہ عابد آئے گا اور اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔

(المعجم الاوسط، رقم الحدیث: ۲۹۷۰، اس حدیث کی روایت میں ابو ظلال متفرد ہے امام بخاری اور امام حبان نے اس کی توثیق کی ہے اور اس میں کلام ہے، 'مجمع الزوائد' ج ۳، رقم الحدیث: ۱۳۳-۱۳۲، مطبوعہ بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے اپنے عظیم علم کے مطابق تفصیل سے بیان کیا ہے اور وہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے (الاعراف: ۵۲) قرآن مجید کی خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے اہل جنت، اہل دوزخ اور اہل اعراف کے احوال تفصیل سے بیان فرمائے اور یہ بیان کیا کہ وہ ایک دوسرے سے کیا گفتگو کریں گے تاکہ لوگ ان کے کلام میں غور و فکر کریں اور ان کاموں اور ان چیزوں سے بچیں جو اللہ کے عذاب کا موجب ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توحید کے دلائل میں غور و فکر کے لیے تیار ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کتاب کی خصوصیات بیان فرمائیں کہ ہم نے ایسی کتاب نازل کی جس میں جدا جدا احکام بیان کیے ہیں جن کی وجہ سے ہدایت گمراہی سے ممتاز ہو جاتی ہے اور انسان الجھن اور پریشانی سے محفوظ رہتا ہے اور یا اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس کتاب میں اپنی آیات کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے اور ان میں اجمال اور اغلاق نہیں ہے اور یہ کتاب ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ ہر چند کہ اس کتاب کی ہدایت تمام انسانوں کے لیے ہے لیکن چونکہ اس کی ہدایت سے صرف مومن اور مسلمان ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے فرمایا کہ یہ کتاب ایمان والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا (وہ اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے) اس کی وعید کے وقوع کا انتظار کر رہے ہیں؟ جس دن وہ وعید واقع ہوگی تو جو لوگ پہلے اس کو فراموش کر چکے تھے وہ کہیں گے بے شک ہمارے بے رسول حق لے آئے تھے تو کیا ہمارے کوئی سفارشی ہیں جو ہماری سفارش کریں؟ یا ہم کو دوبارہ دنیا میں لوٹا دیا جائے تو ہم ان کاموں کے برخلاف کام کریں جو پہلے کرتے تھے، بے شک انہوں نے اپنے آپ کو خسارہ میں ڈال دیا اور ان سے وہ بہتان گم ہو گئے جن کا وہ افتراء کرتے تھے۔ (الاعراف: ۵۳) کفار کے اخروی خسارہ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے کفار کی ہدایت کے لیے جو رسول بھیجے تھے اور جو کتابیں نازل فرمائی تھیں، ان رسولوں نے یہ فرمایا تھا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو تم کو سخت عذاب ہو گا۔ اسی طرح آسمانی کتابوں میں بھی یہ وعید بیان کی گئی تھی، یا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے رسولوں نے یہ فرمایا تھا کہ قیامت آئے گی اور سب کچھ فنا ہو جائے گا اور پھر ان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ایمان نہ لانے والوں کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔ ان وعیدوں کے باوجود کفار ایمان نہ لائے تو ان کے ظاہر حال کے تقاضے سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایمان لانے کے لیے اس انتظار میں ہیں کہ وہ وعید واقع ہو جائے یعنی

ان پر سخت عذاب آجائے جو ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے یا قیامت آجائے اور ان کا مواخذہ کر کے ان کو دوزخ میں ڈال دیا جائے اور جب وہ وعید واقع ہو جائے گی یعنی قیامت آجائے گی تو اس وقت وہ اعتراف کریں گے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول، اللہ کا سچا پیغام لے کر آئے تھے اور اس وقت وہ صرف دو چیزوں میں سے کسی ایک کی خواہش کر سکیں گے ایک یہ کہ کوئی ان کی اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش کر کے ان کی مغفرت کرائے یا ان کو دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے اور وہ دوبارہ دنیا میں جا کر کفر اور شرک اور برے کاموں کی بجائے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے رسولوں کی رسالت کا اقرار کریں لیکن ان میں سے ان کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوگی اور سوائے نقصان کے ان کے پلے میں کچھ نہیں رہے گا اور جن جھوٹے خداؤں کی وہ دنیا میں پرستش کرتے تھے، وہ ان کے کسی کام نہ آسکیں گے اور جن باطل مذاہب کو ثابت کرنے کے لیے وہ دنیا میں سردھڑکی بازی لگاتے تھے، ان کا جھوٹ اور باطل ہونا اس دن واضح ہو جائے گا۔

إِنَّ مَا بَدَأَ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا،

ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشَىٰ اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَ

پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا، وہ رات سے دن کو چھپا لیتا ہے (اور دن) اس کے پیچھے تیزی سے دوڑتا ہے

الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَالنُّجُومِ مَسْحَرَاتٍ بِأَمْرِهَا ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ

اور سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے حکم کے تابع ہیں، سو پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کی شان کے لائق ہے

تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۵۴﴾ أَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً ۗ إِنَّهُ

اللہ بہت بڑا ہے تمام جہانوں کا رب ○ تم اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو، بے شک وہ

لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿۵۵﴾ وَلَا تَقْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا

حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا ○ اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو،

وَادْعُوا خَوْفًا وَطَبَعًا ۗ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۶﴾

اور اللہ سے ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے دعا کرو، بے شک اللہ کی رحمت نیلی کرنے والوں سے قریب ہے ○

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيْحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۗ حَتَّىٰ إِذَا

اور وہی ہے جو اپنی رحمت کی بارش کے آگے آگے خوشخبری کی ہواؤں کو بھیجتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ ہوائیں بھاری

أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سَقْنَهُ لِيَكِيدَ مَيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا

بادل کو اٹھایا جیسی ہیں تو ہم اس کو کسی بجز زمین کی طرف روانہ کر دیتے ہیں پھر ہم اس سے پانی نازل کرتے ہیں، پھر ہم اس پانی سے

بِهِ مِنْ كُلِّ الشَّرَائِبِ كَذَلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۵۸﴾

ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں، اسی طرح ہم مردوں کو (قبروں سے) نکالیں گے، شاید کہ تم نصیحت حاصل کرو

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرِجُ نَبَاتًا بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبِثَ كَا

جو اچھی زمین ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے اپنی پیداوار نکالتی ہے اور جو خراب زمین ہوتی ہے اس کی

يَخْرِجُ إِلَّا نَكِدًا كَذَلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَشْكُرُونَ ﴿۵۹﴾

پیداوار صرف تھوڑی سی نکلتی ہے، ہم شکر کرنے والوں کے لیے اسی طرح بار بار آیات کو بیان کرتے ہیں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا، پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا، وہ رات کو دن سے ڈھانپ لیتا ہے اور دن اس کے پیچھے تیزی سے دوڑتا ہے اور سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے حکم کے تابع ہیں، سو پیدا کرنا اور حکم دینا اسی کی شان کے لائق ہے، اللہ بہت برکت والا ہے تمام جہانوں کا رب (الاعراف: ۵۳)

اہم اور مشکل الفاظ کے معانی

رب: یہ اصل میں مصدر ہے۔ اس کا معنی ہے کسی شے کو تدریجاً اپنے کمال تک پہنچانا۔ یہ بہ طور اسم فاعل کے مستعمل ہوتا ہے اس کا معنی ہے تمام موجودات کی تربیت اور ان کی مصلحتوں کا متکفل۔ اس لفظ کا بغیر اضافت کے مطلقاً اللہ عزوجل کے غیر کے لیے بولنا جائز نہیں ہے اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے غیر دونوں کے لیے بولنا جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی مثال ہے: ربکم ورب ابائکم الاولین (الصفت: ۱۲۶)

اور غیر اللہ کے لیے استعمال کی مثال یہ آیت ہے:

أَذْكَرُنِي عِنْدَ رَبِّكَ فَانْسَهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرًا

اپنے رب (مالک، بادشاہ) کے سامنے میرا ذکر کرنا، پس

شیطان نے اس کو بھلا دیا کہ وہ اپنے رب کے سامنے ذکر کرتا۔

رَبِّهِ (یوسف: ۳۲)

اللہ: یہ اس کا اسم ذات (علم) ہے جو واجب الوجود ہے، تمام عبادتوں کا مستحق ہے، اور اس کی ہر صفت قدیم بالذات ہے، وحدہ لا شریک ہے، وہ تمام مخلوق کا خالق ہے اور تمام کمالات کا جامع ہے اور ہر قسم کا عیب اور نقص اس کے حق میں محال ہے، یہ نام اس کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے علاوہ کسی اور کا یہ نام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (مریم: ۶۵)

کیا تم اس نام کا کوئی اور معنی جانتے ہو؟

فی سنة ایام: ایام یوم کی جمع ہے۔ اس سے مراد طلوع شمس سے غروب شمس تک کا وقت ہے۔ اور کبھی اس سے مطلقاً زمانہ کی مدت مراد ہوتی ہے، خواہ وہ کتنی ہی مدت ہو۔ (المفردات: ج ۲، ص ۷۲۰)

تبیان القرآن

جلد چہارم

علامہ زبیدی نے لکھا ہے کہ یوم کا مشہور معنی ہے طلوع شمس سے لے کر غروب شمس تک کی مقدار اور تخمین کے نزدیک ایک طلوع شمس سے لے کر دوسرے طلوع شمس تک کی مقدار یوم ہے یا ایک غروب سے لے کر دوسرے غروب تک کی مقدار اور مطلقاً زمانہ کے معنی میں بھی یوم کا استعمال ہوتا ہے۔ (تاج العروس، ج ۹، ص ۱۱۵، مطبوعہ مصر ص ۱۱۵، چھ دن) اس سے مراد ہے ایام دنیا میں سے چھ دنوں کی مقدار۔ کیونکہ وہاں سورج کا طلوع اور غروب نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایک لمحہ میں سات آسمان اور سات زمینیں پیدا فرمادیتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اطمینان اور تدریج کی تعلیم کے لیے تمام آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔

استوی: لغت میں استواء کا معنی ہے کسی چیز کا کسی چیز سے بلند ہونا۔ کسی چیز کا کسی چیز پر بیٹھنا۔ نیز اس کا معنی ہے کسی چیز کا قصد کرنا۔ کسی شے کا معتدل ہونا، اللہ تعالیٰ کے استواء کا معنی ہے اس کی ذات اور صفات کا ہر چیز سے بلند ہونا۔ اللہ تعالیٰ کا اپنی شان کے لائق عرش پر جلوہ فرما ہونا۔

عرش: بادشاہ کا تخت۔ گھر کی چھت کو بھی عرش کہتے ہیں۔ چھپر کو بھی عرش کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ اللہ کے عرش کی حقیقت کو کوئی شخص نہیں جانتا ہم صرف اس کا نام جانتے ہیں۔ ایک قوم نے یہ کہا ہے کہ فلک اعلیٰ عرش ہے اور کرسی فلک الکوکب ہے۔ اور اس پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے: امام بیہقی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ پر سب سے عظیم آیت کون سی نازل ہوئی ہے؟ آپ نے فرمایا: آیت الکرسی! پھر آپ نے فرمایا: اے ابوذر! سات آسمان کرسی کے مقابلہ میں ایک انگوٹھی کی طرح ہیں جو کسی جنگل کی زمین میں پڑی ہو۔ اور عرش کی کرسی پر فضیلت اس طرح ہے جیسے جنگل کی زمین کی فضیلت اس انگوٹھی پر ہے۔

(الاسماء والصفات، ج ۴، ص ۲۰۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت) (المفردات، ج ۲، ص ۲۲۹، مطبوعہ مکتبہ نزار، مصطفیٰ الباز، مکہ

مکرمہ، ۱۳۱۸ھ)

قدیم فلاسفہ کا یہ قول تھا کہ آسمان نو ہیں اور ہر اوپر والا آسمان نچلے آسمان کو اس طرح محیط ہے جس طرح پیاز کے چھلکے ایک دوسرے کو محیط ہوتے ہیں۔ نواں آسمان فلک الافلاک ہے۔ تمام ثوابت (غیر متحرک ستارے) اس میں مرکوز ہیں۔ اور آٹھواں آسمان فلک اطلس ہے۔ پھر ہر آسمان میں سات سیاروں میں سے ایک سیارہ مرکوز ہے اور ان سیاروں کی یہ ترتیب ہے: زحل، مشتری، مریخ، شمس، زہرہ، عطارد اور قمر اور شریعت میں صرف سات آسمانوں کا ذکر ہے۔ جن علماء نے اطلاقات شرعیہ کو فلاسفہ کے اقوال کے مطابق کرنے کا قصد کیا انہوں نے کرسی کو آٹھواں آسمان اور عرش کو نواں آسمان قرار دیا۔ لیکن یہ عبث کوشش ہے کیونکہ فلاسفہ کے اقوال کسی یقینی دلیل پر مبنی نہیں ہیں بلکہ وہ صرف ظن، تخمین، وہم اور قیاس پر مبنی ہیں۔ جبکہ وحی دلیل قطعی ہے۔ اس لیے وحی الہی کو یونانی فلسفیوں کے اقوال کے تابع کرنا صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ واضح رہے کہ قدیم فلسفہ یونان اور چیز ہے اور سائنس اور چیز ہے۔ فلاسفہ کے نظریات ان کے عقلی اور وہمی دلائل پر مبنی ہوتے ہیں جبکہ سائنس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے۔ جس قدر ایجادات ہوئی ہیں، برقی آلات، برقی سواریاں، برقی ساز و سامان، ریڈیو، ٹی۔وی، ٹیلی فون اور مختلف امراض کی ایلو پیٹھک دوائیں، اور طبی آلات اور شوگر، بلڈ پریشر اور کلسترول ناپنے کے پیمانے۔ یہ سب سائنس کی بدولت حاصل ہوئے ہیں ان میں سے کوئی چیز فلسفیوں کے اقوال سے حاصل نہیں ہوئی۔ سائنس دان اپنے حساب کتاب کے ذریعہ کئی سال پہلے بتا دیتے ہیں کہ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ کو فلاں وقت پر سورج یا چاند گرہن لگے گا اور اتنی دیر تک رہے گا اور فلاں فلاں ملک میں فلاں فلاں وقت پر نظر آئے گا اور فلاں فلاں ملک میں نظر نہیں آئے گا اور آج تک اس کے سرموظف نہیں ہوا۔ اسی طرح جب وہ

چاند کی طرف راکٹ چھوڑتے ہیں تو بتادیتے ہیں کہ اس کا آخری کیپول جس میں خلا نورد ہوتے ہیں، وہ فلاں تاریخ کو اتنے بجے سمندر کے فلاں علاقہ میں گرے گا۔ اور کبھی اس کے خلاف نہیں ہوا۔

یہ سب کچھ ایک کمپیوٹرائزڈ نظام کے تحت ہو رہا ہے۔ اور یہ سب صحیح حساب و کتاب اور سائنس کا کرشمہ ہے۔ بعض لوگ جو فلسفہ اور سائنس کا فرق بھی نہیں جانتے، وہ یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ پہلے سائنس دان کہتے تھے کہ سورج اور چاند ساکن ہیں اور اب کہتے ہیں کہ متحرک ہیں۔ اس لیے سائنس کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کرنا صحیح نہیں ہے۔ وہ کل کچھ کہتی ہے، آج کچھ کہتی ہے۔ حالانکہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ فلسفہ ایک نظریہ ہے اور سائنس تجربہ اور مشاہدہ ہے اور آج دنیا کے ہر شعبہ میں ترقی سائنس کی بنیاد پر ہے۔ اور قرآن مجید کی کوئی تصریح سائنس کے خلاف نہیں ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا کوئی ارشاد جو صحیح سند سے ثابت ہو، سائنس کے خلاف نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ضعیف روایت سائنس کے خلاف ہو تو اس کا سبب اس متن کا ضعف نہیں ہے۔ بلکہ اس سند کا ضعف ہے۔ نیز ہم سائنس کے تابع ہو کر قرآن مجید کی تفسیر نہیں کرتے بلکہ سائنس کے ذریعہ قرآن مجید کی حقانیت کا اظہار کرتے ہیں کہ جو بات اب سائنس سے ثابت ہوئی ہے، وہ بہت پہلے قرآن مجید نے بتادی تھی۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ جو لوگ سائنس کے مخالف ہیں، وہ اپنی عام زندگی میں بلکہ عبادات میں بھی سائنسی ایجادات سے استفادہ کرتے ہیں۔ پٹرول کاروں، بسوں، ریل گاڑیوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں۔ بجلی کی روشنی اور پنکھوں سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ٹیلی فون اور ٹیلی گراف سے فائدہ اٹھاتے ہیں، مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکر پر تقریریں کرتے ہیں اور گھڑیوں کے حساب سے نماز پڑھاتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی کے اعلانات سے یا گھڑیوں کے حساب سے سحر اور افطار کرتے ہیں۔ رمضان، عید الفطر، عید الاضحیٰ اور حج کے مہینوں کا علم بھی ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعہ ہوتا ہے اور ان سب کا ثبوت سائنسی تحقیقات کا مرہون منت ہے۔ یا تو یہ لوگ اب سے ایک ہزار سال پہلے کے طور طریقوں کے مطابق زندگی بسر کریں یا پھر سائنس کے اصولوں پر اعتراض کرنا چھوڑ دیں۔

یغشی اللیل النہار: وہ رات سے دن کو چھپا لیتا ہے۔

حشیئا: حث کا معنی کسی کو برانگیختہ کرنا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ دن رات کو جلد طلب کرتا ہے۔

الخلق: کسی شے کو عدم سے وجود میں لانا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے اور اس کا خاصہ ہے۔

الامر: حکم دینا، تدبیر اور تصرف کرنا۔

اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلیل

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے آخرت کے احوال بیان فرمائے تھے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت پر دلائل بیان فرمائے ہیں تاکہ ان دلائل میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لایا جائے اور توحید اور رسالت پر ایمان لانے سے ہی انسان کی آخرت بہتر ہوتی ہے۔

آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش کسی فاعل مختار اور قادر پر موقوف ہے، کیونکہ ان کا اجسام مخصوص، صور مخصوص اور اوضاع مخصوص پر ہونا کسی مرتج اور مخصص کا تقاضا کرتا ہے، اور اس مرتج کا واجب الوجود ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ ممکن اپنے وجود میں پھر کسی مخصص اور مرتج کا محتاج ہو گا اور قطع تسلسل کے لیے ہمیں ایک واجب الوجود فاعل کو ماننا پڑے گا اور واجب الوجود کا واحد ہونا ضروری ہے کیونکہ تعدد وجہا محال ہے اور یہ اس لیے محال ہے کہ اگر دو واجب الوجود فرض کیے جائیں تو نفس وجوب ان دونوں میں مشترک ہو گا۔ اور چونکہ اثنینیت بلا امتیاز باطل ہے اس لیے ان میں ایک ماہہ الامتیاز بھی ہو گا پس ان میں

تبیان القرآن

جلد چہارم

سے ہر ایک ماہہ الا شراک اور ماہہ الاتیاز سے مرکب ہو گا اور ہر مرکب حادث اور ممکن ہوتا ہے اور یہ خلاف مفروض ہے کیونکہ ان کو واجب فرض کیا تھا اور لازم آیا کہ یہ ممکن ہیں اور یہ خرابی تعدد و جہا ماننے سے لازم آئی۔ اس لیے واجب الوجود صرف ایک ہو گا وہ نہیں ہو سکتے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کا آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہی خالق ہے اور وہ واحد ہے۔ زمینوں اور آسمانوں کو چھ دنوں میں بنانے کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں بنایا ہے حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو ایک لمحہ میں بھی بنا سکتا تھا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک حد اور مدت مقرر فرمائی ہے۔ سردیوں اور گرمیوں کے موسم بنائے لیکن یہ موسم بھی تدریجاً ظہور میں آتے ہیں۔ سخت سردی اچانک سخت گرمی میں تبدیل نہیں ہوتی بلکہ تدریجاً سردی سے گرمی اور گرمی سے سردی کی طرف موسم کا انتقال ہوتا ہے۔ انسان کی پیدائش کا عمل بھی اچانک وجود میں نہیں آتا بلکہ نطفہ نو ماہ میں تدریجاً انسان کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح نباتات کی روئیدگی ہے۔ کفار پر جو دنیا میں عذاب آئے وہ بھی اچانک نہیں آئے۔ ان کو بار بار تنبیہ کی گئی ڈرایا گیا اور ہر طرح حجت پوری کرنے کے بعد ان پر عذاب بھیجا گیا جبکہ وہ فوری عذاب کا مطالبہ کرتے تھے۔ غرض اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی حد اور مدت مقرر کی ہے اور اسی سنت کے مطابق زمینوں اور آسمانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں بنایا ہے۔ نیز جو چیز دفعتاً وجود میں آئے اس کے متعلق یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید یہ اتفاقی حادثہ ہے اور جس چیز کو ایک معین مدت میں تدریجاً بنایا جائے اس کو اتفاقی حادثہ قرار دینا صحیح نہیں ہو گا بلکہ ہر ذی شعور یہ کہے گا کہ اس کو قادر اور حکیم نے ایک خاص منصوبہ اور خاص مصلحت سے بنایا ہے۔ سو زمینوں اور آسمانوں کا چھ دنوں میں بننا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس غالب اور قوی زبردست علیم و حکیم اور قادر و قیوم کی حکمت اور قدرت کا ساختہ برداشتہ ہے۔ اور اس میں مخلوق کو یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ کسی کام کے کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے بلکہ ہر کام طمینان اور صحیح منصوبہ بندی سے کرنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو ایک لمحہ میں پیدا کرنے پر قادر تھا اس کے باوجود اس نے چھ دنوں میں زمینوں اور آسمانوں کو بنایا۔

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ چھ دن اتوار، پیر، منگل، بدھ، جمعرات اور جمعہ ہیں۔ تمام خلق ان ہی ایام میں مجتمع ہوئی اور ان ہی ایام میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیے گئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان میں سے ہر دن ایام دنیا کی مقدار کے برابر تھا یا ہر دن ایک ہزار سال کا تھا۔ جیسا کہ مجاہد اور امام احمد بن حنبل نے اس کی تصریح کی ہے اور حضرت ابن عباس سے بھی ایک روایت ہے۔ بہر حال یوم السبت (ہفتہ کا دن) میں کوئی چیز پیدا نہیں کی گئی کیونکہ یہ ساتواں دن ہے اور اس کا نام سبت رکھا گیا ہے جس کا معنی ہے قطع کرنا۔ پیدائش کا سلسلہ اس دن منقطع ہو گیا تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۷، ص ۱۷۸، مطبوعہ دارالاندلس بیروت)

چھ دنوں کی تفصیل میں احادیث کا اضطراب اور معتبر حدیث کی تعین

امام عبد اللہ بن محمد بن جعفر المعروف بابی الشیخ المتوفی ۳۹۶ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہود نے نبی ﷺ کے پاس آکر آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کے دن زمین کو بنایا اور منگل کے دن پہاڑوں کو بنایا اور ان میں نفع بخش چیزوں کو بنایا اور بدھ کے دن درخت، پانی، شہر، آباد اور نجر زمین کو بنایا۔ یہ چار دن ہیں جیسا کہ اس آیت میں ہے:

فَلْأَيُّكُمْ لَسْكَفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ
فِي يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُونَ لَهُ أُنْدَادًا ذَلِكَ رَبُّ

آپ کہئے بے شک تم ضرور اس کا کفر کرتے ہو جس نے دو

دنوں میں زمین کو بنایا اور تم اس کے لیے شریک قرار دیتے ہو

الْعَلَمِينَ ۝ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا اَنْقِوَاتَهَا فِي اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ ۝ (حم السجده: ۹-۱۰)

یہ ہے رب العالمین ۝ اور زمین میں اس کے اوپر سے بھاری پہاڑوں کو نصب کر دیا اور اس میں برکت فرمائی اور اس زمین میں (اس کے باشندوں کی) غذائیں چار دنوں میں مقدر فرمائیں جو مانگنے والوں کے لیے برابر ہیں۔

اور دوسری روایت میں ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ عزوجل نے سب سے پہلے اتوار اور پیر دونوں میں زمین کو بنایا اور اس کے باشندوں کی روزی چار دنوں میں مقدر فرمائی۔ پہاڑ نصب کیے، دریا جاری کیے، درخت اگائے اور سمندر رواں کیے اور یہ منافع منگل اور بدھ دونوں میں بنائے۔ پھر یہ آیت پڑھی:

نُمِ اسْتَوَىٰ اِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَاِلَى الْاَرْضِ اَنْتِ يَا طُورًا وَاَوْ كَرَّمًا قَالَتَا اَنْتِنَا طَائِعِيْنَ ۝ فَقَضَهُنَّ سَبْعَ سَمُوْتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ (حم السجده: ۱۱-۱۲)

پھر آسمان کی طرف قصد فرمایا اور آنچلیکہ وہ دھواں تھا تو اسے اور زمین کو فرمایا تم دونوں حاضر ہو جاؤ خواہ خوشی سے خواہ ناخوشی سے، ان دونوں نے کہا ہم خوشی سے حاضر ہوئے ۝ تو ان کو دو دنوں میں پورے سات آسمان بنا دیا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: یہ دو دن جمعرات اور جمعہ ہیں۔

(کتاب العظمتہ، ص ۲۹۲-۲۹۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کو زمین بنائی اور منگل اور بدھ کو اس میں پہاڑ نصب کیے، دریا جاری کیے اور درخت اگائے اور جمعرات اور جمعہ کو آسمان بنائے اور ہفتہ کا دن فراغت کا تھا۔ یہود اس دن چھٹی مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے آرام فرمایا تھا۔ نبی ﷺ ان کے اس قول پر ناراض ہوئے اور آپ نے یہ آیت پڑھی:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ ۝ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝

اور بے شک ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ دنوں میں بنایا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی ۝ تو آپ ان کی باتوں پر صبر کیجئے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے۔ (ق: ۳۸-۳۹)

(کتاب العظمتہ، ص ۲۹۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کو دو دنوں میں زمین کو پیدا کیا اور اس میں منگل اور بدھ کو دو دنوں میں اس کے باشندوں کی روزی مقدر کی اور جمعرات اور جمعہ کو دو دنوں میں آسمانوں کو پیدا کیا اور جمعہ کی آخری ساعت میں (عصر اور مغرب کے درمیان) حضرت آدم کو عجلت سے پیدا کیا اور یہی وہ ساعت ہے جس میں قیامت واقع ہوگی۔

(کتاب الاسماء والصفات للہیتمی، ص ۳۸۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اللہ نے اتوار اور پیر کو زمین بنائی اور منگل کے دن پہاڑ بنائے اور دریا اور درخت بدھ کو بنائے اور پرندے، وحشی جانور، درندے، حشرات الارض اور آفت (مصیبت) جمعرات کو بنائی اور انسان کو جمعہ کے دن بنایا اور ہفتہ کے دن پیدا کرنے سے فارغ ہو گیا۔ (کتاب العظمتہ، ص ۲۹۳، مطبوعہ بیروت، ۱۳۱۳ھ)

تبیان القرآن

جلد چہارم

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: اللہ عزوجل نے ہفتہ کے دن مٹی (زمین) پیدا کی اور اتوار کے دن اس میں پہاڑ نصب کیے اور پیر کے دن درخت پیدا کیے اور منگل کے دن ناپسندیدہ چیزیں پیدا کیں اور بدھ کے دن نور پیدا کیا اور جمعرات کے دن زمین میں جانور پیدا کیے اور جمعہ کی آخری ساعت میں عصر اور مغرب کے درمیان آدم علیہ السلام کو پیدا کیا۔

(صحیح مسلم، المناقبین: ۲۷، (۲۷۸۹) ۶۹۲۰، مسند احمد، ج ۳، رقم الحدیث: ۸۳۲۹، سنن کبریٰ للنسائی، رقم الحدیث: ۱۳۵۵۷)

علامہ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

نور سے مراد اجسام نیرہ ہیں مثلاً سورج، چاند اور ستارے اور یہ حدیث اس بات کو مستغنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدھ کے دن تمام آسمانوں کو پیدا کیا کیونکہ یہ تمام سیارے آسمانوں میں ہیں اور ان کا نور اور روشنی آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اس حدیث میں آسمانوں کی پیدائش کی تصریح نہیں ہے اور اس میں ہفتہ کے پورے سات دن ذکر کیے گئے ہیں اور اگر ان سات دنوں کے بعد کسی ایک دن میں آسمانوں کو پیدا فرمایا تو آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش آٹھ دنوں میں قرار پائے گی اور یہ قرآن مجید کی تصریح کے خلاف ہے۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے سلسلہ میں معتمد قرآن مجید کی یہ آیات ہیں:

اِنَّكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ (الابيات) (حم السجدہ: ۹-۱۲)

(المعجم، ج ۷، ص ۳۲۳، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ صحیح مسلم کی اس حدیث میں صرف زمین کی پیدائش سات دنوں میں ذکر کی گئی ہے جبکہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں یہ تصریح ہے کہ تمام زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش چھ دنوں میں کی گئی ہے اس لیے یہ حدیث صریح قرآن کے خلاف ہونے کی وجہ سے غیر معتبر ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ امام بخاری اور دیگر حفاظ حدیث نے اس حدیث پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے اس کو کعب احبار سے سنا ہے یعنی یہ اسرائیلیات سے ہے اور حدیث مرفوع نہیں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۱۷۸) زمینوں اور آسمانوں کی پیدائش کے سلسلہ میں مضطرب اور متعارض احادیث وارد ہیں جن میں سے ہم نے بعض کو ذکر کیا ہے۔ ان احادیث میں وہی حدیث معتبر ہے جو قرآن مجید کے مطابق ہے اور سورہ حم السجدہ میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ چار دنوں میں سے اللہ تعالیٰ نے دو دنوں میں زمینوں کو بنایا اور باقی دو دنوں میں پہاڑوں اور زمین کے باشندوں کی غذاؤں کے لیے دوسری چیزوں کو بنایا اور اس کے بعد دو دنوں میں آسمانوں کو بنایا اور اس کے موافق وہ روایت ہے جس کو امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

(کتاب الاسماء والصفات، ص ۳۸۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اور امام محمد بن جعفر بن جریر متوفی ۳۱۰ھ کی یہ روایت بھی قرآن مجید کے موافق ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہود رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اتوار اور پیر کو زمین بنائی اور منگل کو اس میں پہاڑ اور دیگر نفع آور چیزیں بنائیں اور بدھ کو درخت، دریا، شہر اور آباد اور دیران زمینیں بنائیں۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: بے شک تم ضرور اس کا کفر کرتے ہو جس نے دو دنوں میں زمین کو بنایا اور تم اس کے لیے شریک قرار دیتے ہو یہ ہے رب العالمین O اور زمین میں اس کے اوپر سے بھاری پہاڑوں کو نصب کر دیا اور اس میں برکت فرمائی اور اس زمین میں (اس کے باشندوں کی) غذائیں چار دنوں

میں مقدر فرمائیں جو مانگنے والوں کے لیے برابر ہیں ○ (حم السجدہ: ۹۰-۱۰) اور جمعرات کے دن اللہ نے آسمان کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن ستاروں کو، سورج کو، چاند کو اور فرشتوں کو پیدا کیا اور جمعہ کے دن آخری تین ساعات میں سے پہلی ساعت میں ہر مرنے والے شخص کی موت پیدا کی، اور دوسری ساعت میں انسان کو نفع دینے والی چیزوں کی آفت پیدا کی اور تیسری اور آخری ساعت میں آدم کو پیدا کیا اور ان کو جنت میں رکھا اور ابلیس کو انہیں سجدہ کرنے کا حکم دیا اور ساعت کے آخر میں ابلیس کو جنت سے نکال دیا۔ یہود نے پوچھا: اے سیدنا محمد! (صلی اللہ علیک وسلم) پھر کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا پھر اللہ عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ انہوں نے کہا: آپ نے ٹھیک بتایا ہے کاش! آپ اس بات کو مکمل کر دیتے! انہوں نے کہا: پھر (ہفتہ کے دن) اللہ نے آرام کیا۔ نبی ﷺ سخت غضب ناک ہوئے۔ تب یہ آیت نازل ہوئی اور بے شک ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ دنوں میں بنایا اور ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی ○ تو آپ ان کی باتوں پر صبر کیجئے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کیجئے طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے۔ (ق: ۳۹-۳۹)

(جامع البیان، ج ۲۳، ص ۱۱۸-۱۱۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، المستدرک، ج ۲، ص ۴۵۱-۴۵۰، امام ذہبی نے امام حاکم کی موافقت کی ہے، تلخیص المستدرک، ج ۲، ص ۴۵۱-۴۵۰، الدر المنثور، ج ۷، ص ۱۳، طبع بیروت) عرش پر استواء اور اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کے متعلق شیخ ابن تیمیہ کا موقف اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا۔ شیخ احمد بن عبد الحلیم بن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ لکھتے ہیں:

اللہ پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں اپنی جو صفات بیان کی ہیں، اور رسول اللہ ﷺ نے جو آپ کی صفات بیان کی ہیں ان پر بغیر تحریف اور بغیر تکلیف اور تمثیل کے ایمان لایا جائے (یعنی ان صفات کی کوئی تاویل نہ کی جائے نہ ان کی مخلوق کے ساتھ مثال دی جائے) بلکہ یہ ایمان رکھا جائے کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سمیع اور بصیر ہے اور اللہ نے جس چیز کے ساتھ خود کو موصوف کیا ہے اس کی نفی نہ کی جائے اور اللہ کے کلمات کو بدلانہ جائے اور اس کے اسماء اور اس کی آیات کو بدلانہ جائے۔ نہ ان کا کوئی معنی متعین کیا جائے اور نہ مخلوق کی صفات سے ان کی مثال دی جائے کیونکہ اللہ سبحانہ کا کوئی ہم نام ہے نہ اس کا کوئی کفو ہے، نہ کوئی اس کی مثل اور نظیر ہے نہ اس کا مخلوق پر قیاس کیا جائے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ خود اپنے آپ کو اور دوسروں کو زیادہ جاننے والا ہے اور اس کا قول سب سے زیادہ سچا ہے۔ پھر اس کے تمام رسول سچے ہیں، بہ خلاف ان لوگوں کے جو بغیر علم کے اللہ کے متعلق باتیں کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعَزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ ○
سَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ ○ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ
الْعَالَمِينَ ○ (الصافات: ۱۸۲-۱۸۰)

آپ کا رب عزت والا ہے آپ کا رب ہر اس عیب سے پاک ہے جو (کفار) بیان کرتے ہیں اور سلام ہو رسولوں پر اور تمام خوبیاں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

رسولوں کے مخالفین اللہ کی جو صفات بیان کرتے تھے اللہ نے ان سے اپنی برأت فرمائی ہے اور رسولوں نے جو اللہ کی نقص اور عیب سے برأت بیان کی تھی ان پر سلام بھیجا ہے۔ (الی قولہ) اللہ سبحانہ کے لیے سمیع اور بصیر ثابت ہے کیونکہ اس نے فرمایا ہے: هو السميع البصير (الی قولہ) اللہ کے لیے چہرہ ثابت ہے کیونکہ اس نے فرمایا ہے: وبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام اور کل شیء ہالک الا وجہہ اور اللہ کے لیے دو ہاتھ ثابت ہیں کیونکہ اس نے فرمایا ہے: ما منعك ان تسجد لما خلقت بيدى اور اللہ کے لیے دو آنکھیں ثابت ہیں کیونکہ اس نے فرمایا ہے: واصبر

لحکم ربک فانک باعیننا اور اللہ کے لیے عرش پر استواء ثابت ہے کیونکہ اس نے فرمایا ہے الرحمن علی العرش استوی اور اس طرح کی سات آیتیں ہیں۔

(العقیدۃ الواسطیہ مع شرحہ، ص ۶۳-۱۵، ملخصاً، مطبوعہ دار السلام، ریاض، ۱۴۱۳ھ)

اس کے بعد احادیث سے استدلال کرتے ہوئے شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

اللہ آسمان دنیا کی طرف اپنی شان کے لائق نازل ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں ہمارا رب آسمان دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اللہ خوش ہوتا ہے اور ہنستا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کو اپنے بندہ کی توبہ سے اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی تم میں سے کسی ایک کو گم شدہ اونٹنی کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اللہ ان دو آدمیوں کو دیکھ کر ہنستا ہے جن میں سے ایک دوسرے کو قتل کرتا ہے اور دونوں جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اللہ کی ٹانگ اور قدم ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جہنم میں لوگوں کو ڈالا جاتا رہے گا حتیٰ کہ وہ کہے گی کیا اور زیادہ بھی ہیں حتیٰ کہ رب العزت اس میں اپنی ٹانگ رکھ دے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس میں اپنا قدم رکھ دے گا۔ (بخاری و مسلم)

(العقیدۃ الواسطیہ، ص ۸۳-۸۰، ملخصاً، مع شرحہ مطبوعہ دار السلام، ریاض، ۱۴۱۳ھ)

شیخ ابن تیمیہ کی ان عبارات کا بظاہر یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا چہرہ، آنکھیں، دو ہاتھ، ٹانگ اور قدم ہے اور وہ عرش پر مستوی ہے۔ شرح العقیدۃ الواسطیہ میں لکھا ہے اس کا معنی ہے وہ عرش پر بلند ہے یا چڑھنے والا یا اس پر مستقر ہے۔ اللہ کی یہ صفات مخلوق کی صفات کی طرح نہیں ہیں اور ان کی کوئی مثال نہیں ہے۔ ان صفات کی کوئی تاویل اور توجیہ کرنا جائز نہیں ہے چونکہ ان صفات کا قرآن اور سنت میں ذکر ہے اس لیے ان کو اسی طرح ماننا لازم ہے۔ بہ ظاہر یہ عقیدہ، اشاعرہ اور دیگر متقدمین کے عقیدہ کی مثل ہے لیکن شیخ ابن تیمیہ کے معاصر اور بعد کے ثقہ علماء نے یہ کہا ہے کہ شیخ ابن تیمیہ کے ان اقوال سے اللہ تعالیٰ کے لیے جہت اور جسمیت کا ماننا لازم آتا ہے اس بناء پر بعض علماء رانجین نے شیخ ابن تیمیہ کو گمراہ کہا اور بعض نے ان کی تکفیر کر دی۔

استواء اور صفات کے مسئلہ میں شیخ ابن تیمیہ کے مخالفین

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

شیخ ابن تیمیہ نے عقیدہ حمویہ اور واسطیہ میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ، پیر، چہرہ اور پنڈلی کا جو ذکر آیا ہے وہ اس کی صفات حقیقیہ ہیں اور اللہ تعالیٰ عرش پر بذاتہ مستوی ہے اس سے کہا گیا کہ اس سے تمیز اور انقسام لازم آئے گا تو اس نے کہا کہ میں یہ نہیں جانتا کہ تمیز اور انقسام اجسام کے خواص میں سے ہے اسی وجہ سے ابن تیمیہ کے متعلق کہا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے تمیز اور انقسام کا قائل ہے۔ (الدرر الکامنہ، ج ۱، ص ۱۵۲، مطبوعہ دار الجلیل، بیروت)

علامہ احمد بن حجر ہیتمی مکی متوفی ۹۷۴ھ لکھتے ہیں:

ابن تیمیہ کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمیت، جہت، اور انتقال سے موصوف ہے اور وہ عرش کے برابر ہے نہ چھوٹا نہ بڑا۔ اللہ تعالیٰ اس قبیح انتراء سے پاک ہے جو کہ صریح کفر ہے۔

(الفتاویٰ الحدیثیہ، ص ۱۰۰، مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، بہ مصر، ۱۳۵۶ھ)

تبیان القرآن، جلد ثانی میں النساء ۱۵۸ کی تفسیر میں ہم نے بہ کثرت علماء کی عبارات نقل کی ہیں جنہوں نے اس مسئلہ میں شیخ

ابن تیمیہ کی تکفیر کی ہے۔
استواء اور صفات کے مسئلہ میں شیخ ابن تیمیہ کے موافقین
ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۳ھ لکھتے ہیں:

شیخ عبد اللہ انصاری حنبلی قدس سرہ نے شرح منازل السائرین میں شیخ ابن تیمیہ سے اس تہمت کو دور کیا ہے کہ وہ اللہ کے لیے جہت کے قائل تھے اور اللہ تعالیٰ کو جسم مانتے تھے اور انہوں نے شیخ مذکور سے تکفیر اور تفسیل کی نفی کی ہے ان کی عبارت یہ ہے:

شیخ ابن تیمیہ نے اللہ تعالیٰ کے اسماء اور اس کی صفات کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کر کے اور ان کے معانی متبادرہ کے اعتقاد کی تلقین کر کے ان اسماء اور صفات کی حرمت کو محفوظ کیا ہے۔ کیونکہ جب امام مالک رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ الرحمن علی العرش استوی میں اللہ تعالیٰ کے عرش پر استواء کا کیا معنی ہے؟ تو امام مالک نے پہلے سر جھکا کر غور کیا پھر کہا استواء معلوم ہے (کسی چیز پر مستقر ہونا یا کسی چیز پر بلند ہونا) اور اس کی کیفیت عقل میں نہیں آسکتی (کہ اللہ کس طرح عرش پر مستوی ہے) اور اس (استواء) پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا سوال کرنا بدعت ہے۔ امام مالک نے اس کے معنی کے معلوم ہونے اور اس کی کیفیت کے انسانی عقل میں نہ آنے کے درمیان فرق کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہ جواب اللہ تعالیٰ کی صفات سے متعلق تمام مسائل میں کافی شافی ہے۔ سمع، بصر، علم، حیات، قدرت، ارادہ، اللہ کا نزول، غضب، رحمت اور اس کا ہنسنا۔ ان تمام الفاظ کے معانی معلوم ہیں اللہ کے ساتھ ان کے اتصاف کی کیفیت انسان کی عقل میں نہیں آسکتی، کیونکہ کسی چیز کی کیفیت تب عقل میں آتی ہے جب اس کی ذات اور کنہ کا علم حاصل ہو چکا ہو۔ اور جب اس کی ذات غیر معلوم ہے تو اس کی صفات کی کیفیت کیسے عقل میں آسکتی ہے اور اس باب میں صحیح موقف یہ ہے کہ اللہ کو اسی صفت کے ساتھ موصوف کیا جائے جس صفت کے ساتھ خود اللہ نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے اور اس کے رسول نے جس صفت کے ساتھ اس کو موصوف کیا ہے اور ان صفات میں نہ کوئی تحریف کی جائے (بایں طور کہ از خود ان صفات کا کوئی معنی یا محمل بیان کیا جائے) نہ ان صفات کو معطل کیا جائے (یعنی ان کی نفی کی جائے) نہ ان کی کیفیت بیان کی جائے (ان کی کوئی تاویل کی جائے) اور نہ ان کی کوئی مثال بیان کی جائے، بلکہ اللہ کے اسماء اور اس کی صفات کو ثابت کیا جائے اور ان سے مخلوقات کی مشابہت کی نفی کی جائے۔ پس تمہارا صفت کو ثابت کرنا تشبیہ سے منزہ ہو اور تمہارا نفی کرنا تعطیل سے منزہ ہو۔ سو جس نے استواء کی حقیقت کی نفی کی وہ معطل ہے اور جس نے مخلوقات کے مخلوقات پر استواء کے ساتھ تشبیہ دی وہ مشبہ ہے۔ اور جس نے یہ کہا کہ اللہ کے استواء کی مثل کوئی چیز نہیں ہے وہ موحد ہے اور منزہ ہے۔ یہاں تک علامہ عبد اللہ انصاری حنبلی کا کلام ہے۔ اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق شیخ ابن تیمیہ کا اعتقاد اسلاف صالحین اور جمہور متاخرین کے اعتقاد کے موافق ہے اور ان کی عبارت پر یہ طعن اور تشنیع صحیح نہیں ہے۔ ان کا یہ کلام بعینہ امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے موافق ہے جو انہوں نے القعد الاکبر میں تحریر فرمایا ہے۔ (ہم عنقریب اس عبارت کو نقل کریں گے) اس سے معلوم ہو گیا کہ شیخ ابن تیمیہ پر یہ اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے جہت اور جسم کا عقیدہ رکھتے تھے۔ (مرقات، ج ۸، ص ۲۵۲-۲۵۱، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)

نوٹ: شیخ ابن تیمیہ نے نبی ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے سفر کو حرام کہا ہے اس بنا پر شیخ ابن تیمیہ کی تکفیر کو ملا علی قاری رحمہ الباری نے شرح الشفاء علی نسیم الریاض، ج ۳، ص ۵۱۳ میں صحیح قرار دیا ہے اور ان کی یہ کتاب مرقات کے بعد کی تصنیف ہے۔ اس لیے مرقات میں جو انہوں نے شیخ ابن تیمیہ کو اس امت کا ولی کہا ہے، اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔

علامہ محمد امین بن محمد المختار الجکفی الشنقیلی لکھتے ہیں:

عرش پر استواء اور اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کے معاملہ میں دو باتوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے ایک یہ کہ اللہ جل و علا حوادث کی مشابہت سے منزہ ہے۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جن صفات کے ساتھ اپنے آپ کو موصوف کیا ہے یا اللہ کے رسول ﷺ نے جن صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف کیا ہے ان صفات پر ایمان رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے بعد رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اللہ کی صفات کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے لیے جس وصف کو ثابت کیا یا رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے لیے کسی وصف کو ثابت کیا، پھر کسی شخص نے اللہ تعالیٰ سے اس وصف کی یہ زعم کرتے ہوئے نفی کی کہ وہ وصف اللہ کی شان کے لائق نہیں ہے تو اس نے اپنے آپ کو اللہ جل و علا اور رسول اللہ ﷺ سے زیادہ عالم قرار دیا۔ سبحانک هذا بہتان عظیم۔ اور جس نے یہ اعتقاد رکھا کہ اللہ کا وصف مخلوق کے اوصاف کے مشابہ ہے تو وہ مشبہ، ملحد اور گمراہ ہے اور جس نے اللہ جل و علا اور رسول اللہ ﷺ کے ثابت کیے ہوئے اوصاف کو اللہ کے لیے مانا جبکہ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہ اوصاف، مخلوقات کی صفات کی مشابہت سے منزہ ہیں تو وہ مومن ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کمال اور جلال کو اور مشابہت خلق سے تنزیہ کو ماننے والا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس بات کو واضح فرمادیا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ
اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے والا ہے اور دیکھنے والا ہے۔ (الشوری: ۱۱)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے صفات کمال اور جلال کو ثابت فرمایا ہے اور مخلوق کے ساتھ مشابہت کی نفی فرمائی ہے۔ (اضواء البیان، ج ۲، ص ۲۴۳-۲۴۲، مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، ۱۳۰۸ھ)

استواء اور صفات کے مسئلہ میں متقدمین احناف کا موقف امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت متوفی ۱۵۰ھ فرماتے ہیں:

اللہ نہ جوہر ہے نہ عرض ہے، نہ اس کی کوئی حد ہے، نہ اس کا کوئی منازع ہے، نہ اس کا کوئی شریک ہے، نہ اس کی کوئی مثال ہے اور اس کا ہاتھ ہے اور اس کا چہرہ ہے اور اس کا نفس ہے۔ قرآن مجید میں اللہ نے جو چہرہ، ہاتھ اور نفس کا ذکر کیا ہے، وہ اس کی صفات بلا کیف ہیں اور یہ توجیہ نہ کی جائے کہ ہاتھ سے مراد اس کی قدرت یا نعمت ہے کیونکہ اس توجیہ میں اس کی صفت کو باطل کرنا ہے اور یہ قدریہ اور معتزلہ کا قول ہے لیکن اس کا ہاتھ اس کی صفت بلا کیف ہے اور اس کا غضب اور اس کی رضا اس کی صفات میں سے بلا کیف دو صفتیں ہیں۔

(الفقہ الاکبر مع شرح، ص ۳۶-۳۷، مطبوعہ شرکہ مکتبہ و مطبعہ مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۳۷۵ھ)

علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الحمام الحنفی المتوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے اور یہ ایسا استواء نہیں ہے جیسا ایک جسم کا دوسرے جسم پر استواء ہوتا ہے کہ وہ اس سے تماس ہوتا ہے۔ یا اس کی محازات (سمت) میں ہوتا ہے بلکہ جو استواء اس کی شان کے لائق ہو جس کو اللہ سبحانہ ہی زیادہ جاننے والا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اس پر ایمان لانا واجب ہے کہ اللہ عرش پر مستوی ہے اور مخلوق کے ساتھ اس کی مشابہت کی نفی کی جائے۔ رہا یہ کہ استواء علی العرش سے مراد عرش پر غلبہ ہو تو یہ ارادہ بھی جائز ہے۔ البتہ اس ارادہ کے واجب ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے اور واجب وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ البتہ اگر یہ خدشہ ہو کہ عام لوگ استواء سے وہی معنی سمجھیں گے کہ جو جسم

کے لوازم سے ہے کہ اللہ عرش سے متصل ہے یا عرش کے مماس ہے یا عرش کی محازات میں ہے تو استواء کو غلبہ سے تعبیر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح کتاب اور سنت میں جو ایسے الفاظ ہیں جن سے جسمیت ظاہر ہوتی ہے مثلاً انگلی، قدم اور ہاتھ ان پر ایمان لانا واجب ہے کیونکہ انگلی اور ہاتھ وغیرہ اللہ کی صفت ہیں۔ ان سے مراد یہ مخصوص اعضاء نہیں ہیں بلکہ وہ معنی مراد ہے جو معنی اللہ کی شان کے لائق ہے اور اللہ سبحانہ ہی اس معنی کو زیادہ جاننے والا ہے اور کبھی ہاتھ اور انگلی کی تاویل قدرت اور قہر سے کی جاتی ہے اور نبی ﷺ نے فرمایا حجر اسود اللہ کا دایاں ہاتھ ہے اس کی تاویل کی جاتی ہے تاکہ عام لوگوں کی عقلیں اللہ تعالیٰ کی جسمیت کی طرف نہ منتقل ہوں۔ اس تاویل سے یہ ارادہ بھی ممکن ہے لیکن اس پر جزم اور یقین نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے اصحاب (ماتریدیہ) کے قول کے مطابق یہ الفاظ تشابہات سے ہیں اور تشابہ کا حکم یہ ہے کہ اس دنیا میں ان کی مراد متوقع نہیں ہے۔

(مسارہ مع شرح السامره، ج ۱، ص ۳۶-۳۱، دائرة المعارف الاسلامیہ، مکران)

واضح رہے کہ استواء اور ہاتھ وغیرہ کی علامہ ابن ہمام نے جو تاویل بیان کی ہے امام ابو حنیفہ اور دیگر اسلاف نے اس تاویل سے منع کیا ہے۔

استواء اور صفات کے مسئلہ میں متقدمین شافعیہ کا موقف

امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی شافعی متوفی ۴۵۸ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے لیے صرف ان صفات کو بیان کرنا جائز ہے جن پر کتاب اللہ دلالت کرتی ہو یا رسول اللہ ﷺ کی سنت دلالت کرتی ہو، یا اس پر اس امت کے متقدمین کا اجماع ہو یا جس پر عقل دلالت کرتی ہو۔ مثلاً حیات، قدرت، علم، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور اس کی مثل صفات ذاتیہ، اور مثلاً خلق کرنا، رزق دینا، زندہ کرنا، مارنا، معاف کرنا، سزا دینا اور ان کی مثل صفات فعلیہ، اور جن صفات کا اثبات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خبر سے ہوا، جیسے چہرہ، دو ہاتھ، آنکھ، یہ اس کی صفات ہیں۔ اور جیسے عرش پر مستوی ہونا اور آنا اور نازل ہونا اور اس طرح دوسری اس کے فعل کی صفات۔ یہ صفات اس لیے ثابت ہیں کہ قرآن اور حدیث میں ان کا ذکر ہے، ان صفات کو اس طرح مانا جائے کہ ان صفات کی مخلوق کے ساتھ مشابہت نہ ہو۔

(کتاب الاسماء والصفات، ص ۱۱۱-۱۱۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

سفیان ثوری نے کہا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جس اوصاف کو اپنے لیے ثابت کیا ہے، ان کی فارسی یا عربی میں تفسیر کرنا جائز نہیں ہے۔ (کتاب الاسماء والصفات، ص ۳۱۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

امام ابو الحسن بن مسعود الفراء البغوی الشافعی المتوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

کلبی اور مقاتل نے کہا استویٰ کا معنی ہے استقر (قرار پکڑا) ابو عبیدہ نے کہا اس کا معنی ہے سعد (چڑھلا) معتزلہ نے کہا اس کا معنی ہے استولی (اللہ عرش پر غالب ہے) اور اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ عرش پر استواء اللہ کی صفت بلا کیف ہے۔ انسان کے لیے اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا علم وہ اللہ عز و جل کے سپرد کر دے۔ (اس کے بعد انہوں نے امام مالک سے سوال اور ان کا جواب لکھا ہے) سفیان ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن المبارک اور دیگر علماء اہل سنت نے اس آیت کی تفسیر میں کہا یہ آیت اور دیگر صفات کے متعلق آیات، آیات تشابہات میں سے ہیں ان کو اسی طرح بلا کیف (یعنی استواء کی کیفیت جانے بغیر) ماننا چاہیے۔ (معالم التنزیل، ج ۲، ص ۱۳۸-۱۳۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

استواء اور صفات کے مسئلہ میں متقدمین مالکیہ کا موقف

امام حافظ ابو عمرو یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر مالکی اندلسی متوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں:

الرحمن على العرش استوى (طہ: ۵) کی تفسیر میں امام مالک سے سوال کیا گیا کہ اللہ عرش پر کس طرح مستوی ہے؟ امام مالک نے فرمایا: استوی کا معنی معلوم ہے (بلند ہے یا بیٹھا ہے) اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور تمہارا اس کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے اور میرا گمان ہے کہ تم بد عقیدہ ہو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ عرش کے اوپر ہے اور اس سے تمہارا کوئی عمل مخفی نہیں ہے۔ ابن السبارک نے کہا رب تبارک و تعالیٰ سات آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر رات کے آخری تہائی حصہ میں ہمارا رب تبارک و تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۱۳۵، الموطا، رقم الحدیث: ۲۱۳، مسند احمد، ج ۲، ص ۷۸)

اس قسم کے جو اطلاقات قرآن اور سنت میں ہیں ان کے متعلق علماء اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی کیفیت کو جانے بغیر ان پر ایمان لانا حق ہے۔ وہ کہتے ہیں اللہ نازل ہوتا ہے اور کیفیت نزول کو بیان نہیں کرتے اور نہ کیفیت استواء کو بیان کرتے ہیں۔ عباد بن عوام سے شریک نے کہا: بعض لوگ ان احادیث کا انکار کرتے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے نزول کا ذکر ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے پاس یہ احادیث ان ہی اسانید سے پہنچی ہیں جن اسانید سے نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج کے احکام کے متعلق احادیث پہنچی ہیں اور ہم نے اللہ عز و جل کو ان احادیث سے ہی پہچانا ہے امام شافعی نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کی سنت صرف اتباع ہے اور بعض لوگوں نے یہ توجیہ کی کہ رب کے نزول کا معنی یہ ہے کہ اس کی رحمت اور اس کی نعمت نازل ہوتی ہے یہ توجیہ باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی نعمت تو رات اور دن کے ہر وقت میں نازل ہوتی ہے۔ اس میں رات کے آخری تہائی حصہ یا کسی اور وقت کی خصوصیت کا کیا دخل ہے؟ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ خصوصیت کے ساتھ اپنی رحمت سے دعا قبول فرماتا ہے۔ کیونکہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! کس وقت میں دعا زیادہ قبول ہوتی ہے آپ نے فرمایا: آدھی رات کے بعد۔ (مسند احمد، ج ۵، ص ۱۷۹)

اور ہمیشہ نیک لوگ رات کے پچھلے پہراٹھ کر استغفار کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے والمستغفرین بالاسحار (آل عمران: ۱۷) رات کے پچھلے پہراٹھ کر استغفار کرنے والے۔

(الاسناد کار ج ۸، ص ۱۵۳-۱۵۱، مطبوعہ موسسہ الرسالہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

نیز امام ابن عبد البر مالکی اندلسی متوفی ۴۶۳ھ لکھتے ہیں:

ایوب بن صلاح مخزومی نے ہم سے فلسطین میں بیان کیا کہ ہم امام مالک کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ایک عراقی نے آپ کے پاس آکر سوال کیا کہ اللہ عرش پر کس طرح مستوی ہے؟ امام مالک نے غور کرنے کے بعد فرمایا: تم نے اس چیز کے متعلق سوال کیا ہے جو مجہول نہیں ہے اور تم نے اس کیفیت کے متعلق سوال کیا ہے جو عقل میں نہیں آسکتی اور تم بد عقیدہ شخص ہو۔ پھر اس شخص کو آپ کی مجلس سے نکال دیا گیا۔ یحییٰ بن ابراہیم بن مزین نے کہا: امام مالک نے اس قسم کی باتوں میں بحث کرنے سے اس لیے منع فرمایا کیونکہ ان میں حد، صفت اور تشبیہ ہے اور اس میں نجات تب ہوگی جب اللہ تعالیٰ کے ان اقوال پر توقف کیا جائے جس میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی صفت، چہرے اور ہاتھوں سے بیان کی ہے اور کشادہ کرنے اور استواء سے اپنی صفت بیان کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سو تم جس طرف بھی پھرو وہیں اللہ کا چہرہ ہے۔

فَاَيْنَمَا تُولُوْا فَوَجْهُ اللّٰهِ (البقرہ: ۱۱۵)

بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کشادہ (کھلے ہوئے) ہیں۔

بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَيْنِ (المائدہ: ۶۴)

وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ
وَالسَّمَوَاتُ مَطْوِيَّاتٌ بِيَمِينِهِ ۝ (الزمر: ۶۷)
الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى (طه: ۵)

قیامت کے دن سب زمینیں اس کی مٹھی میں ہوں گی اور
تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہوں گے۔
رحمن عرش پر جلوہ فرما ہے۔

اس لیے مسلمان کو وہی کنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا ہے اور اسی پر توقف کرنا چاہیے اور اس سے تجاوز
نہیں کرنا چاہیے اور اس کی تفسیر نہیں کرنی چاہیے اور یہ نہیں کنا چاہیے کہ یہ کس طرح ہے۔ کیونکہ اس میں ہلاکت ہے۔ اللہ
تعالیٰ نے اپنے بندوں کو قرآن مجید پر ایمان لانے کا مکتب کیا ہے اور ان کو اس کی ان آیتوں کی تاویل میں غور کرنے کا مکتب نہیں
کیا جن آیتوں کا اس نے علم عطا نہیں کیا۔ (التمہید، ج ۷، ص ۱۵۲، مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۱۳۰۴ھ)

امام مالک نے عمر بن الحکم سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: میری ایک باندی
بکریوں کو چراتی تھی ایک دن ایک بکری گم ہو گئی میں نے اس کے متعلق اس سے پوچھا تو اس نے کہا اس کو بھیڑیا کھا گیا۔ مجھے اس
پر افسوس ہوا۔ میں بھی آخر انسان ہوں میں نے اس کو ایک تھپڑ مار دیا اور مجھ پر (پہلے سے) ایک غلام کو آزاد کرنا تھا۔ کیا میں اس
غلام کی جگہ اس باندی کو آزاد کر دوں؟ رسول اللہ ﷺ نے اس باندی سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمان میں۔ آپ
نے پوچھا: میں کون ہوں؟ اس نے کہا: آپ رسول اللہ ہیں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو آزاد کر دو۔

(الموطا، رقم الحدیث: ۱۵۱۱، صحیح مسلم، صلوٰۃ، ۳۳ (۵۳۷) ۱۱۷۹، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۹۳۰)

امام ابن عبد البر فرماتے ہیں:

نبی ﷺ نے اس باندی سے جو سوال کیا کہ اللہ کہاں ہے؟ تو اس نے کہا: آسمان میں۔ تمام اہل سنت (اور وہ محدثین ہیں)
اس پر متفق ہیں اور وہ وہی کہتے ہیں جو اللہ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ اللہ عرش پر مستوی ہے۔ (طہ: ۵) اور اللہ عزوجل آسمان
میں ہے اور اس کا علم ہر جگہ ہے اور یہ قرآن مجید کی ان آیات سے بالکل ظاہر ہے:

ءَأَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخْسِفَ بِكُمْ
الْأَرْضَ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ (الملک: ۱۶)
إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ
الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (فاطر: ۱۰)

کیا تم اس سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں
زمین میں دھنسا دے تو وہ اس سے لرزے لگے۔
پاک کلمے اسی کی طرف چڑھتے ہیں اور نیک عمل کو اللہ بلند
فرماتا ہے۔

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ

(المعارج: ۴)

قرآن مجید میں اس کی بہت مثالیں ہیں اور ہم نے اپنی کتاب تمہید میں اس سے زیادہ بیان کیا ہے۔

(الاستاذ کار، ج ۲۳، ص ۱۶۸-۱۶۷، طبع بیروت، ۱۳۱۳ھ)

ہمیشہ سے مسلمانوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ جب ان پر کوئی آفت آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کے لیے اپنے
چہروں اور اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی جنت نہیں ہے لیکن چونکہ علو اور بلندی کو باقی
جہات پر شرف اور فضیلت حاصل ہے اس لیے دعا کے وقت آسمان کی طرف دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عرش کو پیدا کیا، اس کو اس
کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے بندوں کو اس کی ضرورت تھی تاکہ وہ دعا کے وقت حیران نہ ہوں کہ وہ کس کی طرف منہ کریں
جیسے اس نے کعبہ کو پیدا کیا تاکہ لوگ عبادت کے وقت اس کی طرف منہ کریں۔ حالانکہ اللہ کا حقیقت میں گھر ہے نہ اس کو اس کی

تبیان القرآن

چند چہارم

ضرورت ہے۔ اسی طرح اس نے آسمان کو پیدا کیا تاکہ لوگ جان لیں کہ وہ اپنی دعاؤں میں کس طرف متوجہ ہوں۔

امام ابن عبد البر مالکی اندلسی متوفی ۴۶۳ھ فرماتے ہیں:

معزلہ یہ کہتے ہیں کہ استواء کا مجازی معنی مراد ہے اور وہ ہے استولی یعنی اللہ عرش پر غالب ہے۔ یہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ پھر عرش کی خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تو ہر چیز پر غالب ہے اور کلام میں اصل یہ ہے کہ اس کو حقیقت پر محمول کیا جائے اور اللہ کے کلام کو اشہر اور اظہر وجوہ پر محمول کرنا لازم ہے جب تک کہ حقیقت پر محمول کرنے سے کوئی ایسا مانع نہ ہو جس کا مانع ہونا سب کے لیے واجب التسلیم ہو۔ اور اگر ہر مجاز کے مدعی کا ادعا مان لیا جائے تو پھر کوئی عبارت ثابت نہیں ہوگی۔ اور اللہ عزوجل نے اپنے کلام میں جن الفاظ سے خطاب کیا ہے ان سے ان ہی معانی کا ارادہ کیا ہے جن معانی کا اہل عرب اپنے محاورات اور خطابات میں ان الفاظ سے ارادہ کرتے تھے اور استواء کا معنی اور مفہوم لغت میں معلوم ہے اور وہ ہے کسی چیز پر ارتفاع اور بلند ہونا اور کسی چیز پر قرار اور جگہ پکڑنا۔ ابو عبیدہ نے استواء کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا: ”بلند ہوا“ عرب کہتے ہیں استویت فوق الدابہ میں سواری کے اوپر بلند ہوا یا بیٹھا۔ حافظ ابن عبد البر نے کہا: استواء کا معنی بلندی پر جگہ پکڑنا ہے اور اس کی دلیل حسب ذیل آیات میں ہے:

لَتَسْتَوُوا عَلَىٰ ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ (الزخرف: ۱۳)
وَأَسْتَوَىٰ عَلَى الْجُودَىٰ (هود: ۴۴)
فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَمَنْ مَعَكَ عَلَى الْفُلْكِ (المؤمنون: ۲۸) جائیں۔

تاکہ تم ان کی پشت کے اوپر بیٹھو اور جب تم ان کی پشت کے اوپر بیٹھ جاؤ تو تم اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو۔ اور کشتی جو دی پہاڑ کے اوپر ٹھہر گئی۔ اور جب آپ اور آپ کے ساتھی کشتی کے اوپر بیٹھ جائیں۔

ہم عرش پر اللہ تعالیٰ کے استواء کی کیفیت کو نہیں جانتے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عرش پر مستوی نہ ہو جیسے ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہمارے بدنوں میں ہماری روہیں ہیں لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ ہمارے بدن میں ہماری روح کس کیفیت سے ہے اور اس کیفیت کے علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہماری روہیں نہ ہوں اس طرح عرش پر اللہ کے استواء کی کیفیت کے علم نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عرش پر مستوی نہ ہو۔

(التعمید، ج ۷، ص ۱۳۱-۱۳۲، ملخصاً، ”موضوعات“، مطبوعہ المکتبۃ القدوسیہ، لاہور، ۱۴۰۳ھ)

استواء اور دیگر صفات کے مسئلہ میں متقدمین حنابلہ کا موقف

امام جمال الدین عبد الرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

بعض لوگوں نے کہا کہ استوی بمعنی استولی ہے۔ ائمہ لغت کے نزدیک یہ معنی مردود ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا عرب استوی کو استولی کے معنی میں نہیں پہچانتے، جس شخص نے یہ کہا اس نے بہت غلط کیا۔ استوی فلان علی کذا (فلاں شخص نے فلاں پر غلبہ پایا) یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ شخص اس سے بعید ہو اور وہ اس پر قادر نہ ہو۔ پھر بعد میں اس پر قدرت اور غلبہ حاصل کرے، اور اللہ عزوجل ہمیشہ سے تمام چیزوں پر غالب ہے۔ ہم ملحدہ کے صفات کو معطل کرنے سے اور مجسمہ کی تشبیہ سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ (زاد المسیر، ج ۳، ص ۲۱۳، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۰۷ھ)

علامہ محمد بن احمد السفارینی الحنبلی المتوفی ۱۱۸۸ھ لکھتے ہیں:

حنبلیوں کا مذہب سلف صالحین کا مذہب ہے۔ وہ اللہ کو ان اوصاف کے ساتھ موصوف کرتے ہیں جن کے ساتھ خود اللہ

نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے۔ اور جن اوصاف کے ساتھ اس کے رسول نے اس کو موصوف کیا ہے، بغیر کسی تحریف اور تعطیل کے اور تکلیف اور تمثیل کے، اللہ کی ذات ذوات میں سے کسی ذات کے مشابہ نہیں اور اس کی صفات کمالیہ میں سے کوئی صفت ممکنات کی کسی صفت کے مشابہ نہیں ہے۔ قرآن مجید اور نبی ﷺ کی سنت میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات وارد ہیں، ان کو اسی طرح قبول کرنا اور تسلیم کرنا واجب ہے جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں۔ ہم اس کے وصف کی حقیقت سے عدول نہیں کرتے اور نہ اس کے کلام میں تحریف کرتے ہیں اور نہ اس کے اسماء اور صفات میں، اور جو کچھ اس باب میں وارد ہے اس میں کوئی زیادتی نہیں کرتے اور جو شخص اس صراط مستقیم سے انحراف کرے تم اس کو چھوڑ دو۔ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ (لوامع الانوار البھیہ، ج ۱، ص ۱۰۷، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۱۱ھ)

نیز علامہ سفارینی حنبلی لکھتے ہیں:

امام احمد بن حنبلہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو اسی وصف کے ساتھ موصوف کیا جائے گا جس وصف کے ساتھ خود اللہ نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے اور جس وصف کے ساتھ اس کے رسول ﷺ نے اس کو موصوف کیا ہے۔ ہر وہ چیز جو نقص اور حدوت کو واجب کرتی ہو اللہ تعالیٰ اس سے حقیقتاً منزہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑے کمال کا مستحق ہے۔ سلف کا مذہب یہ ہے کہ اس قسم کی چیزوں میں غور نہیں کرنا چاہیے اور ان میں سکوت کرنا چاہیے اور ان کا علم اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہ وہ پوشیدہ چیز ہے جس کی تفسیر نہیں کی جائے گی اور انسان پر واجب ہے کہ اس کے ظاہر پر ایمان لائے اور اس کا علم اللہ کے سپرد کر دے۔ ائمہ سلف مثلاً زہری، امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری، یسٹ بن اسد، عبد اللہ بن المبارک، امام احمد اور اسحاق سب یہی کہتے تھے کہ یہ مشابہات ہیں۔ اللہ اور اسکے رسول کے سوا کسی کے لیے ان کی تفسیر کرنا جائز نہیں ہے۔ (لوامع الانوار البھیہ، ج ۱، ص ۹۹-۹۶، ملخصاً، مطبوعہ بیروت، ۱۴۱۱ھ)

استواء اور دیگر صفات کے مسئلہ میں متاخرین کی آراء

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستقر ہونا ممکن نہیں ہے اور اس پر متعدد عقلی دلائل ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ عرش پر مستقر ہو تو اس کی جو جانب عرش کے قریب ہوگی وہ جانب لازماً متناہی ہوگی اور جو چیز متناہی ہو وہ زیادتی اور کمی کو قبول کر سکتی ہے اور جو چیز زیادتی اور کمی کو قبول کر سکے وہ حادث ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ قدیم ہے۔ اور اگر وہ جانب غیر متناہی ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات میں انقسام لازم آئے گا کیونکہ عرش بہر حال متناہی ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات کی ایک جانب عرش سے مماس ہوگی اور ایک جانب فارغ ہوگی اور اس سے انقسام لازم آئے گا اور یہ بیان سابق سے محال ہے۔

امام رازی نے اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستقر ہونے کو باطل قرار دینے کے لیے بارہ دلیلیں قائم کی ہیں۔ جو اکثر مشکل اور دقیق ہیں اور عام فہم نہیں ہیں۔ بہر حال ان کی ایک اور قدرے آسان دلیل یہ ہے:

اگر اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر مستقر ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات عرش سے اعظم ہوگی یا مساوی ہوگی یا اصغر ہوگی۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات عرش سے اعظم ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات میں انقسام لازم آئے گا کیونکہ اب اللہ تعالیٰ کی ذات کا بعض عرش پر مستقر ہو گا اور بعض اس سے زائد ہو گا اور اس سے اس کا منقسم ہونا لازم آئے گا اور اگر اللہ تعالیٰ عرش کے مساوی ہو تو اس کا متناہی ہونا لازم آئے گا کیونکہ عرش متناہی ہے اور جو متناہی کے مساوی ہو وہ متناہی ہوتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی ذات عرش سے اصغر ہو تو اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا متناہی اور منقسم ہونا لازم آئے گا اور یہ تمام

صورتیں بداعت باطل ہیں۔ (تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۵۲-۲۵۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)
علامہ عبد اللہ بن عمر بیضاوی شافعی متونی ۶۸۵ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ کا امر بلند ہو یا غالب ہو اور ہمارے اصحاب سے یہ منقول ہے کہ عرش پر استواء اللہ تعالیٰ کی صفت بلا کیف ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر اس طرح مستوی ہے جس طرح اس نے ارادہ کیا اور آنحالیکہ وہ عرش پر استقرار اور جگہ پکڑنے سے منزہ ہے۔ (انوار التنزیل مع الکا زرونی، ج ۳، ص ۲۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۶ھ)

علامہ محمد بن یوسف المشهور بابن حبان اندلسی المتونی ۵۷۳ھ لکھتے ہیں:
اس آیت کو اپنے ظاہر پر محمول کرنا متعین نہیں ہے جبکہ عقلی دلائل اس پر قائم ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر استواء محال ہے۔ (البحر المحیط، ج ۵، ص ۶۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد بن محمود نسفی حنفی متونی ۷۱۰ھ لکھتے ہیں:
اس آیت کا معنی ہے: اللہ عرش پر غالب ہے۔ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے لیکن عرش چونکہ مخلوقات میں سب سے عظیم جسم ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ عرش پر غالب ہونے کا ذکر فرمایا۔ امام جعفر صادق، حسن بصری، امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ سے یہ منقول ہے کہ استواء معلوم ہے (مستقر ہونا یا بلند ہونا) اور اس کی کیفیت مجہول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کا انکار کفر ہے اور اس کا سوال کرنا بدعت ہے۔

(مدارک التنزیل علی الخازن، ج ۲، ص ۱۰۰، مطبوعہ پشاور)

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متونی ۷۹۲ھ لکھتے ہیں:

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب کہ دین حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مکان اور جہت منتفی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ قرآن اور سنت میں ایسی بے شمار تصریحات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے لیے مکان اور جہت کا ثبوت ہوتا ہے اور باوجود اختلاف آراء اور تفرق ادیان کے سب لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے لیے بلند جانب کی طرف دیکھتے ہیں اور دعا کے وقت آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جہت سے منزہ ہونا عام لوگوں کی عقلوں سے ماوراء ہے حتیٰ کہ جو چیز کسی سمت اور جہت میں نہ ہو لوگ اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں تو ان سے خطاب کرنے کے لیے زیادہ مناسب اور ان کے عرف کے زیادہ قریب اور ان کو دین حق کی دعوت دینے کے زیادہ لائق یہ تھا کہ ان سے ایسا کلام کیا جائے جس میں بظاہر تشبیہ ہو اور ہر چند کہ اللہ تعالیٰ ہر سمت اور جہت سے منزہ ہے لیکن چونکہ بلند جانب تمام جوانب میں سب سے اشرف ہے اس لیے اس جانب کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا گیا اور عقلاء اللہ تعالیٰ کے لیے آسمان کی طرف اس لیے نہیں متوجہ ہوتے کہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ آسمان دعا کا قبلہ ہے۔ کیونکہ تمام خیرات اور برکات اور انوار اور بارشیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں۔ (شرح المقاصد ج ۳، ص ۵۱-۵۰، مطبوعہ منشورات الرضی، قم ایران، ۱۳۰۹ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متونی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اکثر متقدمین اور متاخرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ سبحانہ کی جہت اور مکان سے تنزیہ ضروری ہے کیونکہ جو چیز مکان میں ہو اس کو حرکت اور سکون اور تغیر اور حدوث لازم ہے یہ متکلمین کا قول ہے۔ اور سلف اول رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ سے جہت کی نفی نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے جہت ثابت کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے اور رسولوں نے بھی اس طرح فرمایا ہے اور سلف صالحین میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ حقیقتاً عرش

پر مستوی ہے، البتہ ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ اس کے استواء کی حقیقت میں کیا کیفیت ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن، جز ۷، ص ۱۹۷، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

استوی کا معنی ہے بلند ہے۔ (اللہ عرش پر بلند ہے) اس بلندی سے وہ بلندی مراد نہیں ہے جو مکان اور مسافت کی بلندی ہوتی ہے، یعنی کوئی شخص ایسی جگہ پر ہو جو جگہ دوسری جگہوں سے بلند ہو بلکہ اس سے وہ بلندی مراد ہے جو اللہ کی شان کے لائق ہے۔ تمہیں یہ معلوم ہو گا کہ سلف کا مذہب اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اس کی مراد کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ عرش پر اس طرح مستوی ہے جس طرح اس کا ارادہ ہے در آنحالیکہ وہ استقرار اور جگہ پکڑنے سے منزہ ہے اور استواء کی تفسیر استیلاء (غلبہ پانے) سے کرنا باطل ہے۔ کیونکہ جو شخص اس کا قائل ہے کہ استواء کا معنی استیلاء ہے، وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کا غالب ہونا ہمارے غالب ہونے کی مثل ہے بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ یہ کہے کہ وہ ایسا غالب ہے جو اس کی شان کے لائق ہے تو پھر اس کو چاہیے کہ وہ ابتداء یہ کہے کہ وہ عرش پر اس طرح مستوی ہے جو اس کی شان کے لائق ہے۔

(روح المعانی، جز ۸، ص ۱۳۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا متوفی ۱۳۴۰ھ نے اس آیت کا ترجمہ کیا ہے: ”پھر عرش پر استواء فرمایا جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔“
صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ لکھتے ہیں:

یہ استواء تشابہات میں سے ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ کی اس سے جو مراد ہے حق ہے۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ استواء معلوم ہے اور اس کی کیفیت مجہول اور اس پر ایمان لانا واجب۔ حضرت مترجم قدس سرہ نے فرمایا: اس کے معنی یہ ہیں کہ آفرینش کا خاتمہ عرش پر جا ٹھہرا۔ واللہ اعلم باسرار کتابہ۔

(خزانة العرفان، ص ۳۵۳، مطبوعہ تاج کمپنی لیسٹڈ، لاہور)

استواء علی العرش اور اللہ تعالیٰ کی دیگر صفات کے مسئلہ میں ہم نے کافی طویل بحث کی ہے اور تمام قابل ذکر متقدمین اور متاخرین کے مذاہب اور ان کی آراء تفصیل سے بیان کی ہیں تاکہ ہمارے قارئین کو اس مسئلہ میں ہر پہلو سے کھل و واقفیت ہو جائے۔ بہر حال ہمارا اس مسئلہ میں وہی موقف ہے جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور دیگر سلف صالحین کا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تم اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے دعا کرو بے شک اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں سے قریب ہے (الاعراف: ۵۵-۵۶)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت و وحدانیت اور قدرت اور حکمت پر دلائل قائم کیے تھے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ وہی اس کائنات کا رب ہے تو پھر چاہیے کہ اسی کی عبادت کی جائے اور اسی سے ہر معاملہ میں دعا کی جائے۔

قرآن مجید میں دعا کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دعا بہ معنی عبادت اور دعا بہ معنی سوال۔ دعا بہ معنی سوال کی مثال زیر تفسیر آیت ہے ادعوا ربکم تضرعاً و خفیة ”تم اپنے رب سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے سوال کرو“ اور دعا بہ معنی عبادت کی مثال یہ آیت ہے:

بے شک تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ سب مل کر ایک کبھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَنْ يَخْلُقُوا
دُبَابًا وَّ لَوْ اجْتَمَعُوا لَهُ (الحج: ۲۳)

مانعین دعاء کے دلائل

بعض لوگوں نے دعا کرنے سے منع کیا ہے۔ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ جس چیز کے حصول کے لیے بندہ دعا کر رہا ہے، یا تو اللہ تعالیٰ نے ازل میں اس چیز کو عطا کرنے کا ارادہ کیا ہو گا یا نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے ازل میں اس چیز کے دینے کا ارادہ کیا ہے تو پھر بندہ دعا کرے یا نہ کرے وہ چیز اس کو مل جائے گی، اور اگر اللہ تعالیٰ نے ارادہ کیا ہے کہ بندہ کو وہ چیز نہیں دے گا تو بندہ پھر لاکھ دعا کرے اس کو وہ چیز نہیں ملے گی تو پھر دعا کرنا بے فائدہ ہے۔
- ۲۔ جس مطلوب کے لیے بندہ دعا کر رہا ہے یا تو وہ مطلوب مصلحت اور حکمت کے موافق ہو گا یا نہیں۔ اگر وہ مطلوب مصلحت اور حکمت کے موافق ہے تو اللہ تعالیٰ از خود وہ عطا فرمادے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ فیاض اور جواد ہے اور اگر وہ مطلوب مصلحت اور حکمت کے خلاف ہے تو پھر اللہ تعالیٰ وہ مطلوب نہیں دے گا۔ لہذا دعا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
- ۳۔ بندہ کا دعا کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ تقدیر پر راضی نہیں ہے۔ کیونکہ اگر وہ تقدیر پر راضی ہوتا تو جو کچھ اللہ نے اس کے لیے مقدر کر دیا ہے وہ اس پر مطمئن اور شاکر رہتا اور اپنے حالات کو بدلنے کے لیے دعا نہ کرتا۔ اور تقدیر پر راضی نہ ہونا شرعاً مذموم ہے۔

۳۔ امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رب تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: جو شخص قرآن میں مشغول ہونے کی وجہ سے میرا ذکر اور مجھ سے دعا نہ کر سکا میں اس کو اس سے افضل چیز عطا فرماؤں گا جو میں نے دعا کرنے والوں کو عطا فرمائی ہے۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۹۳۵، اس حدیث کو امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔ خلق افعال العباد، ص ۱۰۵، سنن الدارمی ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۵۶، حلیہ الاولیاء، ج ۷، ص ۳۱۳)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہنا چاہیے۔

۵۔ امام بغوی متوفی ۵۱۶ھ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمود کی جلائی ہوئی آگ میں ڈالا جانے لگا تو حضرت جبرئیل نے آکر عرض کیا: آپ کو کوئی حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہاری طرف کوئی حاجت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا: پھر اپنے رب سے سوال کیجئے انہوں نے فرمایا: اس کو میرے حال کا جو علم ہے وہ میرے سوال کے لیے کافی ہے۔ (معالم التنزیل ج ۳، ص ۲۱۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

مانعین دعا کے دلائل کے جوابات

مانعین دعا نے ترک دعا پر اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور تقدیر سے جو استدلال کیا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ پھر اللہ کی عبادت بھی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اگر اللہ نے ازل میں اس کے جنتی ہونے کا ارادہ کر لیا ہے اور اس کی تقدیر میں اس بندہ کا جنتی ہونا ہے تو پھر وہ عبادت کرے یا نہ کرے وہ جنت میں جائے گا، اور اگر اللہ نے اس کے دوزخی ہونے کا ارادہ کیا ہے اور یہی اس کی تقدیر ہے تو پھر وہ لاکھ عبادت کرے وہ بہر حال دوزخ میں جائے گا۔ نیز پھر اس کو کھانا پینا بھی ترک کر دینا چاہیے کیونکہ اگر اللہ نے اس کو سیر کرنے کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ کھائے پئے بغیر بھی سیر ہو جائے گا ورنہ وہ جتنا بھی کھائے کبھی سیر نہیں ہو گا۔ اور اس کو علاج بھی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس کو بیمار رکھنے کا ارادہ کیا ہے تو وہ کسی دوا سے صحت یاب نہیں ہو گا اور اگر اللہ تعالیٰ نے اس کی صحت کا ارادہ کر لیا ہے تو وہ بغیر دوا کے بھی صحت یاب ہو جائے گا۔ علیٰ هذا القیاس اس کو حصول رزق کے لیے بھی

کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اور نہ کسی منصب اور اقتدار کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ نہ حصول علم کے لیے کوئی سعی کرنی چاہیے اور ان سب کا حل یہ ہے کہ ہمیں اللہ کے علم، اس کے ارادہ اور تقدیر کا کوئی علم نہیں ہے اور جس طرح تقدیر میں ہمارا نفع، ہماری عبادت، ہمارا سیر ہونا، ہماری صحت، ہمارا رزق اور ہمارا علم لکھا ہوا ہے اسی طرح اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ نفع ہمیں دعا سے حاصل ہوگا اور یہ عبادت ہمیں کوشش سے حاصل ہوگی۔ سیر ہونا، ہمارے کھانے سے حاصل ہوگا اور صحت دوا سے حاصل ہوگی۔ علیٰ هذا القیاس۔ تقدیر میں جس طرح یہ امور ہیں اسی طرح ان کے اسباب بھی تقدیر میں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور تقدیر میں اسباب اور مسببات کا سلسلہ مربوط ہے۔

ماہین نے سنن ترمذی کی جس حدیث سے استدلال کیا ہے اس کی سند میں عطیہ بن سعد بن جناہ عوفی ہے۔ امام احمد نے کہا یہ ضعیف الحدیث ہے۔ اس نے کلبی کی کتیب ابو سعید رکھی اور کلبی کی روایت کو ابو سعید کے عنوان سے بیان کرتا تھا۔ ابو زرہ اور ابو حاتم نے اس کو ضعیف کہا۔ امام ابن حبان نے اس کا ضعف میں ذکر کیا۔ امام ابو داؤد نے اس کو ضعیف کہا۔ اس میں تشیع تھا یہ حضرت علی بن ابی طالبؓ کو تمام صحابہ پر مقدم کہتا تھا۔

(تمذیب التذیب ج ۷، ص ۱۹۶-۱۹۵، رقم: ۳۷۸۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۵ھ، تمذیب الکمال رقم: ۳۹۵۶، میزان الاعتدال رقم: ۵۶۶)

دوسری حدیث جس کو امام بغوی نے حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت کیا ہے، اس کو بعض مفسرین کے سوا اور کسی نے ذکر نہیں کیا۔ امام ابن جریر، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن عساکر اور حافظ سیوطی نے اس واقعہ کو متعدد اسانید کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ان تمام روایات میں صرف یہ الفاظ ہیں کہ جب حضرت جبریل نے کہا: آپ کی کوئی حاجت ہے؟ تو حضرت ابراہیم نے فرمایا تم سے کوئی حاجت نہیں ہے! اور یہ الفاظ نہیں ہیں: "اس کو میرے حال کا جو علم ہے وہ میرے سوال کے لیے کافی ہے" اور اس کے معارض یہ روایت ہے جس کو امام ابن جریر نے روایت کیا ہے اس میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم کو جب آگ میں ڈالا جانے لگا تو انہوں نے سر اٹھا کر کہا: "اے اللہ تو آسمان میں واحد ہے اور میں زمین میں واحد ہوں اور زمین میں میرے سوا تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہے اور مجھے اللہ کافی ہے اور وہ کیا اچھا کار ساز ہے۔"

(جامع البیان، جز ۱، ص ۵۵-۵۶، دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ کی اس موقع پر ثنا کی اور کریم کی شادعا ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث حضرت ابی بن کعب پر موقوف ہے اور یہ کعب اخبار کی روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور یہ غالباً اسرائیلیات میں سے ہے اور یہ حدیث مغل ہے کیونکہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اور بہ کثرت احادیث میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی ترغیب اور تلقین کی گئی ہے اور یہ حدیث ان کے مخالف ہے کیونکہ اس میں ترک دعا کی تصریح ہے۔ اور ہمارے لیے حجت قرآن اور حدیث ہے نہ کہ یہ بے اصل اور مغل روایت۔

دعا قبول نہ ہونے کے فوائد

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بہت دفعہ بار بار دعا کہنے کے باوجود دعا قبول نہیں ہوتی پھر دعا کرنے کا کیا فائدہ ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ جب بندہ دعا کرتا ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اللہ کا محتاج ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو اپنا حاجت روا اور کار ساز مانتا ہے تو اس کی دعا قبول ہو یا نہ ہو اس دعا کا یہ فائدہ کم تو نہیں ہے کہ اسے اللہ کی معرفت ہوتی ہے، دعا قبول نہ ہونے کے باوجود جب وہ بار بار اللہ ہی کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کے اس ایمان اور یقین کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک سوال اور گدا کے لیے اللہ کے

نبیان القرآن

جلد چہارم

در کے سوا اور کوئی دروازہ نہیں ہے۔ وہ رد کرے یا قبول، وہ اس کے سوا اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، کسی سے سوال نہیں کرتا، کسی کے آگے نہیں گڑگڑاتا اور یہ دعا کا بہت بڑا فائدہ ہے جس سے بندہ کے توحید پر ایمان کا اظہار ہوتا ہے۔

اگر انسان بار بار دعا کرتا رہے اور اس کی دعا قبول نہ ہو اور وہ اس پر صبر کرے تو اللہ اس سے کوئی مصیبت نال دیتا ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: تم میں سے جو شخص دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا سوال اس کو عطا فرماتا ہے یا اس کی مثل اس سے کوئی مصیبت دور کر دیتا ہے بہ شرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے۔ (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۳۳۹۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

بعض اوقات انسان کی دعا قبول نہ ہو اور وہ اس پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کو آخرت میں اجر عطا فرماتا ہے۔ حضرت ابو سعید بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو مسلمان ایسی دعا کرے جس میں گناہ نہ ہو اور نہ قطع رحم ہو تو اللہ اس کو تین چیزوں میں سے ایک چیز ضرور عطا فرماتا ہے یا تو اس کی دعا جلد قبول فرمالتا ہے یا اس دعا کو اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر دیتا ہے یا اس کی مثل اس سے کوئی مصیبت دور فرما دیتا ہے۔ صحابہ نے کہا پھر تو ہم بہت دعا کریں گے، آپ نے فرمایا اللہ بہت دینے والا ہے۔

(اس حدیث کی سند حسن ہے، مسند احمد ج ۱۰، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ ۱۳۱۶ھ، رقم الحدیث: ۷۵۷۱۰، المستدرک ج ۱، ص ۳۹۳) ہمیں چونکہ مستقبل اور عاقبت امور کا پتا نہیں ہوتا اس لیے ہم بعض اوقات کسی ایسی چیز کی دعا کرتے ہیں جو انجام کار ہمارے لیے مضر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دعا کو قبول نہ کر کے ہمیں اس نقصان سے بچا لیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (البقرہ: ۲۱۶)

ہو سکتا ہے کہ کسی چیز کو تم برا سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے حق میں بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

میں نے البقرہ: ۱۸۶ کی تفسیر میں دعا پر کافی مفصل گفتگو کی ہے اور ان عنوانات پر تقریر کی ہے، اللہ سے دعا کرنے کے متعلق احادیث، ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے متعلق احادیث، فرض نمازوں کے بعد دعا کرنے کے متعلق احادیث، فرض نمازوں کے بعد دعا کرنے کے متعلق فقہاء اسلام کی آراء، طلب جنت کی دعا کرنے کا قرآن اور سنت سے بیان، دعا قبول ہونے کی شرائط اور آداب اور دعا قبول نہ ہونے کی وجوہات۔ اس آیت کی تفسیر میں، میں دعا کی فضیلت میں چند احادیث بیان کروں گا اور چپکے چپکے دعا کرنے کے فوائد اور نکات بیان کروں گا۔ ہمارے زمانہ میں بعض لوگ ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے شدید مخالف ہیں۔ ہر چند کہ سورہ بقرہ کی تفسیر میں اس کے متعلق چند احادیث بیان کر چکا ہوں لیکن بعض محسن کی فرمائش پر میں یہاں مزید جمع کر کے احادیث اور آثار کو بیان کروں گا۔ فاقول وباللہ التوفیق وبہ الاستعانة یلیق۔

دعا کی ترغیب اور فضیلت میں احادیث

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ذر بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اللہ عزوجل سے یہ روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام کیا ہے اور میں نے تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کر دیا سو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو، اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو ما سوا اس کے جس کو میں ہدایت دوں، سو تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تم کو ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو ما سوا اس کے جس کو میں کھانا کھلاؤں سو تم مجھ سے کھانا طلب کرو، میں تم کو کھانا کھلاؤں

گا۔ اے میرے بندو! تم سب بے لباس ہو ماسوا اس کے جس کو میں لباس پہناؤں سو تم مجھ سے لباس مانگو میں تم کو لباس پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب دن رات گناہ کرتے ہو اور میں تمام گناہوں کو بخشا ہوں، سو تم مجھ سے بخشش طلب کرو، میں تم کو بخش دوں گا۔ اے میرے بندو! تم کسی نقصان کے مالک نہیں ہو کہ مجھے نقصان پہنچا سکو، اور تم کسی نفع کے مالک نہیں ہو کہ مجھے نفع پہنچا سکو۔ اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور تمہارے انسان اور جن، تم میں سب سے زیادہ متقی شخص کی طرح ہو جائیں تو میرے ملک میں کچھ اضافہ نہیں کر سکتے، اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور تمہارے انسان اور جن، تم میں سب سے زیادہ بدکار شخص کی طرح ہو جائیں تو میرے ملک سے کوئی چیز کم نہیں کر سکتے، اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اول اور آخر اور تمہارے انسان اور جن کسی ایک جگہ کھڑے ہو کر مجھ سے سوال کریں اور میں ہر فرد کا سوال پورا کر دوں تو جو کچھ میرے پاس ہے اس سے صرف اتنا کم ہو گا جس طرح سوئی کو سمندر میں ڈال کر نکالنے سے (اس میں کمی ہوتی ہے)۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لیے جمع کر رہا ہوں، پھر میں تم کو ان کی پوری پوری جزا دوں گا، پس جو شخص خیر کو پائے وہ اللہ کی حمد کرے اور جس کو خیر کے سوا کوئی چیز (مثلاً آفت یا مصیبت) پہنچے وہ اپنے نفس کے سوا اور کسی کو ملامت نہ کرے۔

(صحیح مسلم، البرود الصلوة: ۵۵، (۲۵۷۷) ۶۳۵۰، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۳۹۵، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۲۵۷، کتاب الاسماء والصفات للبیہقی، ص ۲۶۳)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے جس شخص کے لیے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا، اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اللہ سے جس چیز کا بھی سوال کیا جائے ان میں سے پسندیدہ سوال عافیت کا ہے۔ جو مصیبتیں نازل ہو چکی ہیں اور جو نازل نہیں ہوئیں ان سب میں دعا سے نفع ہوتا ہے۔ سوائے اللہ کے بندو! دعا کرنے کو لازم کر لو۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۵۳۸، المستدرک ج ۱، ص ۴۹۸)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ تقدیر کو صرف دعا مسترد کر سکتی ہے اور عمر میں صرف نیکی سے اضافہ ہوتا ہے اور انسان گناہ کرنے کی وجہ سے رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔ (یہ حدیث حسن ہے)

(صحیح ابن حبان ج ۲، رقم الحدیث: ۸۷۲، المستدرک ج ۱، ص ۴۹۳، امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو یہ نہ بتاؤں کہ کس چیز کی وجہ سے تم کو اپنے دشمنوں سے نجات ملے گی اور کس چیز کے سبب سے تمہارے رزق میں زیادتی ہوگی! تم اپنے دن اور رات میں اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو، کیونکہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔

(مسند ابو یعلیٰ ج ۳، رقم الحدیث: ۱۸۱۲، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۳۷)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندہ کا اپنے رب عزوجل سے سب سے زیادہ قرب سجدہ میں ہوتا ہے سو تم (سجدہ میں) بہت دعا کیا کرو۔

(صحیح مسلم، صلوٰۃ: ۲۱۵، (۳۸۲) ۱۰۶۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۸۷۵، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۱۳۷)

عبداللہ بن صفوان بیان کرتے ہیں کہ ان کی حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پوچھا کیا آپ حج کو جا رہے ہیں؟ میں نے کہا: ہاں! انہوں نے کہا ہمارے لیے خیر کی دعا کریں، کیونکہ نبی ﷺ فرماتے تھے جو مسلمان شخص اپنے بھائی کے حق میں اس کی پس پشت دعا کرتا ہے اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور اس کے سرہانے ایک فرشتہ مقرر کیا ہوا ہوتا ہے جب

بھی وہ اپنے بھائی کے لیے خیر کی دعا کرتا ہے تو وہ فرشتہ کہتا ہے آمین اور تمہارے لیے بھی اس کی مثل ہو۔
آہستہ دعا کرنے کے فوائد اور نکات

آہستگی اور چپکے چپکے دعا کرنے کے نکات اور فوائد حسب ذیل ہیں:

۱- چپکے چپکے دعا کرنے میں زیادہ ایمان ہے کیونکہ جو شخص چپکے چپکے دعا کرتا ہے اس کا یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پوشیدہ دعائیں بھی سن لیتا ہے۔

۲- اس میں زیادہ ادب اور تعظیم ہے کیونکہ بڑوں کے سامنے آہستہ آہستہ بات کی جاتی ہے۔

۳- گڑگڑا کر دعا کرنا آہستگی کے ساتھ دعا کرنے کے زیادہ مناسب ہے۔

۴- آہستگی کے ساتھ دعا کرنے میں زیادہ اخلاص ہے۔ کیونکہ بلند آواز کے ساتھ دعا کرنے میں ریاکاری کا خدشہ ہے۔

۵- جو شخص دور ہو اس سے بلند آواز کے ساتھ بات کی جاتی ہے اور جو قریب ہو اس کے ساتھ آہستہ بات کی جاتی ہے تو جو

شخص آہستگی کے ساتھ دعا کرتا ہے وہ گویا اپنے رب کو بہت قریب سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ سرگوشی میں دعا کر رہا ہے۔

۶- جہرا اور بلند آواز کے ساتھ دعا کرنے سے بسا اوقات انسان تھک جاتا ہے یا اکتا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ جتنی دیر دعا کرتا

رہے اس کی طبیعت میں ملال نہیں ہوتا۔

۷- آہستگی کے ساتھ دعا کرنے سے انسان کے خیالات منتشر اور پریشان نہیں ہوتے اور وہ دل جمعی اور حضور قلب کے ساتھ

دعا کرتا رہتا ہے۔

۸- آہستگی کے ساتھ دعا کرنے سے یہ خطرہ نہیں ہوتا کہ اگر بلند آواز کے ساتھ دعا کرتے ہوئے کسی مخالف یا بد طینت انسان

یا جن نے اس کی دعائیں لی تو وہ اس کو فتنہ میں مبتلا کر دے گا۔

۹- دعا میں انسان اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہے اور اس کو اپنے دل کا حال سنا تا ہے اور جس طرح راز و نیاز خفیہ ہوتے ہیں اسی

طرح دعا بھی خفیہ طریقہ سے مناسب ہے۔

۱۰- حضرت زکریا علیہ السلام نے آہستگی کے ساتھ خفیہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی:

إِذْ نَادَى رَبَّهُ نِدًا خَفِيًّا (مریم: ۳)

جب انہوں نے اپنے رب کو آہستگی کے ساتھ پکارا۔

۱۱- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں نبی ﷺ کے ساتھ جا رہے تھے لوگ با آواز بلند اللہ

اکبر اللہ اکبر کہنے لگے تو نبی ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! اپنے اوپر نرمی کرو تم کسی بہرے کو پکار رہے ہو نہ غائب کو، تم سمیع اور

قریب کو پکار رہے ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔ (الحدیث)

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۶۳۰۹، صحیح مسلم، الدعوات: ۴۴ (۲۷۰۳) ۶۷۳۵، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۱۵۲۶، سنن الترمذی، رقم

الحدیث: ۳۳۷۲)

۱۲- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بہترین ذکر وہ ہے جو

آہستہ ہو اور بہترین رزق وہ ہے جو بہ قدر کفایت ہو۔

(صحیح ابن حبان ج ۳، رقم الحدیث: ۸۰۹، کتاب الزهد للوحید، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۱، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۰، ص ۳۷۵، مسند احمد

ج ۱، ص ۱۷۸، ۱۷۲، مسند ابو-علی رقم الحدیث: ۷۳۱، کتاب الدعاء للعلبرانی، رقم الحدیث: ۱۸۲۳، شعب الایمان للسیوطی، ج ۱، ص ۳۳۰)

۱۳- حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آہستگی کے ساتھ دعا کرنا ستر با آواز بلند دعاؤں کے

تبیان القرآن

جلد چہارم

برابر ہے۔

کتاب الفردوس ج ۲، رقم الحدیث: ۲۸۶۹، الجامع الکبیر ج ۴، رقم الحدیث: ۱۳۰۵۹، الجامع الصغیر ج ۱، رقم الحدیث: ۴۲۰۶، کنز العمال ج ۲، رقم الحدیث: ۳۱۹۶)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس مسئلہ میں ارباب طریقت کا اختلاف ہے کہ آیا عبادات میں اخفاء افضل ہے یا اظہار بعض کے نزدیک اخفاء افضل ہے تاکہ اعمال ریا سے محفوظ رہیں اور بعض کے نزدیک اظہار افضل ہے تاکہ دوسروں کو بھی عبادات میں اقتداء کرنے کی ترغیب ہو۔ شیخ محمد بن عیسیٰ حکیم ترمذی نے کہا اگر کسی شخص کو اپنے اوپر ریاکاری کا خطرہ ہو تو اس کے لیے اخفاء افضل ہے اور اگر وہ شائبہ ریا سے مامون ہو تو اس کے حق میں اظہار افضل ہے تاکہ دوسروں کی اقتداء کا فائدہ حاصل ہو۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۲۸۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۱۵ھ)

خارج نماز دعا کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانے کے متعلق مذاہب فقہاء

دعا کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانے میں علماء کا اختلاف ہے۔ جیر بن مطعم، سعید بن مسیب، سعید بن جبیر، قاضی شریح، مسروق، قتادہ، عطاء، طاؤس اور مجاہد وغیرہم کے نزدیک دعا کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانا مکروہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ استسقاء کے سوا کسی دعا کے وقت ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے آپ اس دعا میں ہاتھ اس قدر اوپر اٹھاتے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو جاتی تھی۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۱۰۳۱) ایک قول یہ ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئے تو اس وقت دعا میں ہاتھ اٹھانا حسن اور عمدہ ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے استسقاء میں اور جنگ بدر کے دن دعا میں ہاتھ اٹھائے تھے۔

علامہ ابو عبد اللہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ فرماتے ہیں: دعا جس طرح سے بھی کی جائے، وہ مستحسن ہے۔ کیونکہ جب بندہ دعا کرتا ہے تو وہ اپنے فقر اور اپنی حاجت کو اور اللہ کی بارگاہ میں عاجزی اور تذلل کو ظاہر کرتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو قبلہ کی طرف منہ کر کے اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا کرے اور یہ مستحسن طریقہ ہے اور اگر چاہے تو اس کے بغیر دعا کرے اور نبی ﷺ نے اس طرح کیا ہے، اور اس آیت میں ہاتھ اٹھانے اور قبلہ کی طرف منہ کرنے کی قید نہیں لگائی اور ان لوگوں کی مدح کی ہے جو ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں خواہ کھڑے ہوں، خواہ بیٹھے ہوں۔ (آل عمران: ۱۹۱) اور نبی ﷺ نے جمعہ کے خطبہ میں دعا کی در آنحالیکہ آپ کا قبلہ کی طرف منہ نہیں تھا۔ (الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۲۰۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت ۱۳۱۵ھ)

بہ کثرت احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہے کہ نبی ﷺ دعا کے وقت دونوں ہاتھ اوپر اٹھاتے تھے اور یہ مستحسن طریقہ ہے جیسا کہ علامہ ابو عبد اللہ قرطبی مالکی نے فرمایا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جو یہ فرمایا ہے کہ نبی ﷺ نے استسقاء کے علاوہ دعا میں دونوں ہاتھ اوپر نہیں اٹھائے، اس کے علماء نے متعدد جوابات دیے ہیں۔

علامہ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم مالکی القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے قول کا معنی یہ ہے کہ نبی ﷺ جس قدر مبالغہ کے ساتھ استسقاء میں دونوں ہاتھ بلند کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی ظاہر ہو جاتی تھی اس قدر مبالغہ کے ساتھ باقی دعاؤں میں ہاتھ بلند نہیں فرماتے تھے، ورنہ نبی ﷺ نے جنگ بدر کے دن اور دیگر مواقع پر دعا میں ہاتھ بلند فرمائے ہیں۔ امام مالک سے ایک روایت یہ ہے کہ دعا میں دونوں ہاتھ اٹھانا مکروہ ہے اور اس کی توجیہ یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ کے لیے جہت کا اعتقاد نہ کرے۔ امام مالک کا مختار یہ ہے کہ جب مصیبت دور

تبیان القرآن

جلد چہارم

کرنے کے لیے دعا کرے تو دونوں ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کرے جیسا کہ استسقاء کی حدیثوں میں ہے اور جب کسی چیز کی رغبت اور طلب کے لیے دعا کرے تو دونوں ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف کرے۔

(المفہم، ج ۲، ص ۵۳۱، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن خلیفہ ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ لکھتے ہیں:

ایک جماعت نے ہر دعائیں دونوں ہاتھ اٹھانے کو مستحب کہا ہے۔ امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ استسقاء میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا مستحب ہے۔

(اکمال اکمال المعلم، ج ۳، ص ۲۷۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت کا ظاہر معنی یہ ہے کہ نبی ﷺ استسقاء کے علاوہ اور کسی دعائیں دونوں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے اور یہ روایت ان احادیث صحیحہ کے معارض ہے جن میں تصریح ہے کہ نبی ﷺ استسقاء کے علاوہ بھی دعاؤں میں دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے اور یہ احادیث بہت زیادہ ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب الدعوات میں مستقل عنوان کے ساتھ ان احادیث کو ذکر کیا ہے۔ بعض علماء کا مسلک یہ ہے کہ ہاتھ بلند کرنے کی احادیث پر عمل کرنا اوٹی ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت اس پر محمول ہے کہ انہوں نے ان مواقع کو نہیں دیکھا اور یا حضرت انس کی روایت اس پر محمول ہے کہ استسقاء کی دعائیں نبی ﷺ بہت زیادہ دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے تھے حتیٰ کہ انہیں چہرے کے متوازی کر لیتے اور آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آتی اور ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف ہوتی اور اس کیفیت کے ساتھ آپ باقی دعاؤں میں ہاتھ بلند نہیں کرتے تھے۔ اس طرح احادیث میں تطبیق ہو جائے گی۔ (فتح الباری ج ۲، ص ۵۱۷، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، ۱۴۰۱ھ)

علامہ بدر الدین عینی حنفی نے بھی یہی تقریر کی ہے۔ (عمدة القاری ج ۷، ص ۵۲، طبع مصر)

نیز علامہ بدر الدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

دعائیں دونوں ہاتھ بلند کرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک سے ایک روایت ہے کہ یہ مکروہ ہے اور دوسرے ائمہ نے ہر دعائیں دونوں ہاتھ اٹھانے کو مستحب کہا ہے اور بعض علماء نے فقط استسقاء میں جائز کہا ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ دعائیں سنت یہ ہے کہ مصیبت دور کرنے کے لیے جب دعا کرے تو دونوں ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف کرے (اس میں زبان حال سے کہنا ہے کہ اے اللہ! جس چیز کو بدلنا بہ ظاہر ہمارے اختیار میں ہے اس کو ہم نے بدل دیا اور جس کو بدلتا تیرے اختیار میں ہے اس کو تو بدل دے، یعنی ہمارے حالات کو مصیبت سے راحت میں بدل دے اور دعا کرنے والا صرف ہاتھوں کو نہ بدلے بلکہ اپنے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دے) اور جب کسی چیز کے حصول کی دعا کرے تو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف کرے۔ حضرت مالک بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب تم اللہ سے سوال کرو تو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے سوال کرو اور ان کی پشت سے سوال نہ کرو۔ امام ابو یوسف سے ایک روایت یہ ہے کہ اگر چاہے تو دعائیں دونوں ہاتھ اٹھائے اور اگر چاہے تو انگلی سے اشارہ کرے محیط میں ہے انگلی سے اشارہ کرے۔

(عمدة القاری ج ۶، ص ۲۳۸-۲۳۹، مطبوعہ ادارہ البیضاء المنیریہ، مصر، ۱۳۳۸ھ)

ملا علی بن سلطان محمد القاری الحنفی المتوفی ۱۰۱۳ھ لکھتے ہیں:

دعا کے آداب سے یہ ہے کہ دونوں ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف بلند کرے گویا کہ فیض لینے اور نزول برکت کے حصول کا

مفتخر ہو تاکہ ان دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرے جیسے اس نے اس برکت کو قبول کر لیا ہے۔

(ارشاد الساری الی مناسک ملا علی قاری ص ۱۳۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: مصیبت دور کرنے کے لیے دعائیں سنت یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف رکھے اور جب اللہ سے کسی چیز کا سوال کرے تو اپنی ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف رکھے۔

(تلخیص الحیر مع شرح المہذب، ج ۵ ص ۱۰۲)

علامہ حسن بن عمار بن علی شرنبلالی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

سلام پھیرنے کے بعد ذکر کرے اس کے بعد اپنے لیے اور مسلمانوں کے لیے وہ دعا کرے جو نبی ﷺ سے منقول ہو۔ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں عرض کیا گیا یا رسول اللہ! کس وقت دعا زیادہ قبول ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا: آدھی رات کو اور فرض نمازوں کے بعد۔ (سنن ترمذی رقم الحدیث: ۳۵۱۰) اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نبی ﷺ سے ملا تو آپ نے فرمایا: اے معاذ! میں تم سے محبت کرتا ہوں تم کسی نماز کے بعد یہ دعا نہ چھوڑو اللہم اعننی علی ذکرک و شکرک و حسن عبادتک (عمل الیوم واللیلہ رقم الحدیث: ۱۱۸، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۲۲) جب یہ دعائیں کرے تو اپنے سینہ تک دونوں ہاتھ اٹھائے اور ہتھیلیوں کو چہرے کی جانب رکھے۔

(مراتی الفلاح علی ہامش المطاوی ص ۱۸۹، مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البابی واولادہ مصر ۱۳۵۶ھ)

علامہ احمد بن محمد بن اسماعیل الطحاوی الحنفی المتوفی ۱۲۳۱ھ اس کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

حصن حصین اور اس کی شرح میں مذکور ہے دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھوں تک آسمان کی جانب بلند کرے کیونکہ وہ دعا کا قبلہ ہے۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ دعا کے وقت تم اپنے دونوں ہاتھ کندھوں یا اس سے ذرا نیچے تک بلند کرو اور وہ جو حدیث میں ہے کہ دونوں ہاتھ اس قدر بلند کرے کہ بغلوں کی سفیدی دکھائی دے سو وہ بیان جواز پر محمول ہے یا استقاء پر۔ یا کسی اور سخت مصیبت کے موقع پر جب دعائیں مبالغہ مقصود ہو، اور النہر میں مذکور ہے کہ دعا کی مستحب کیفیت یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کے درمیان کچھ کشادگی ہو اور اگر کسی وجہ سے دونوں ہاتھ بلند نہ کر سکے تو انگوٹھے کے برابر والی انگلی (سبابہ) سے اشارہ کرے اور شرح حصن حصین میں مذکور ہے کہ ادب کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ہاتھ ملائے اور انگلیوں کو قبلہ کی طرف رکھے اور شرح مشکوٰۃ میں مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرفہ کے دن دونوں ہاتھ ملا کر دعا کی۔

(حاشیہ مطاوی علی مراتی الفلاح ص ۱۸۹-۱۹۰، مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ھ)

ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۳ھ نے بھی لکھا ہے کہ نماز کے بعد دعائیں دونوں ہاتھ بلند کرے اور دونوں ہتھیلیاں چہرے کی جانب کرے۔ (مرقات ج ۲ ص ۲۶۸، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان ۱۳۹۰ھ)

محمد بن حنفیہ بیان کرتے ہیں کہ دعا کی چار قسمیں ہیں: دعا رغبت، دعا رعبت (مصیبت کے وقت کی دعا) دعا تضرع (گڑگڑا کر دعا کرنا) اور دعا خفیہ۔ دعا رغبت میں اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں آسمان کی جانب کرے اور دعا رعبت میں اپنے دونوں ہاتھوں کی پشت اپنے چہرے کے بالقابل کرے جیسے کسی مصیبت میں فریاد کر رہا ہو، اور دعا تضرع میں چھٹکی اور اس کے ساتھ والی انگلی (خنصر اور بنصر) کو موڑے اور انگوٹھے اور درمیانی انگلی کا حلقہ بنائے اور سبابہ سے اشارہ کرے۔ اور دعا خفیہ کو انسان اپنے دل میں کرے۔ اسی طرح مجموع الفتاویٰ میں مختصر حاکم شہید کی شرح سرخی کے حوالے سے مذکور ہے۔

(عالم گیری ج ۵ ص ۳۱۸، مطبوعہ مطبعہ امیریہ کبریٰ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ)

شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی حنفی متونی ۲۸۳ھ مذکور الصدر عبارت کے بعد لکھتے ہیں:

اسی بناء پر امام ابو یوسف نے امالی میں لکھوایا ہے کہ صفامرہ، عرفات اور مزدلفہ وغیرہ میں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں آسمان کی طرف بلند کرے کیونکہ وہ ان مواقع میں رغبت کے ساتھ دعا کرتا ہے اور مختار یہ ہے کہ دعاء قنوت میں امام اور مقتدی دونوں آہستہ دعا کریں کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ بہترین دعا وہ ہے جو خفیہ ہو، اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ امام بلند آواز سے دعا کرے اور مقتدی آمین کہیں۔ وہ اس طریقہ کو خارج نماز دعا پر قیاس کرتے ہیں۔

(المبسوط ج ۱، ص ۱۶۶، مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۹۸ھ)

مبسوط کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ نماز میں امام کو سرادعا کرنا چاہیے اور خارج نماز میں امام کو جبرادعا کرنی چاہیے تاکہ مقتدی اس کی دعا پر مطلع ہو کر آمین کہیں۔

ملا علی بن سلطان محمد القاری الحنفی المتونی ۱۰۱۳ھ لکھتے ہیں:

دعا کے وقت دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں سے آسمان کی طرف بلند کرے کیونکہ وہ دعا کا قبلہ ہے۔ اس کو حضرت ابو حمید ساعدی اور حضرت انس وغیرہ نے روایت کیا ہے اور یہ کہ وہ کندھوں کے بالمقابل دونوں ہاتھوں کو بلند کرے۔ نیز آداب دعا سے یہ ہے کہ وہ ہاتھوں کو ملائے اور انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ رکھے۔ (شرح صحن حصین مطبوعہ مکہ المکرّمہ، ۱۳۰۴ھ)

قاضی محمد بن علی بن محمد شوکانی متونی ۱۲۵۰ھ لکھتے ہیں: دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلا کر کندھوں تک بلند کرے۔ نبی ﷺ نے تقریباً تیس مقامات پر دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کی ہے اور دعائے مانگنے کے بعد دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرے جیسا کہ سنن ترمذی میں حضرت ابن عباس اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

(تحفة الذاکرین ص ۵۸-۵۹، دار القلم، بیروت)

خارج نماز دعا کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانے کے متعلق احادیث

۱- امام محمد بن اسماعیل بخاری متونی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے حضرت خالد بن ولید کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا۔ انہوں نے ان کو اسلام کی دعوت دی۔ وہ اچھی طرح سے یہ نہیں کہہ سکے کہ ہم اسلام لائے۔ وہ کہنے لگے صبا صبا صبا (ہم نے دین بدل لیا) حضرت خالد نے ان کو قتل کرنا اور قید کرنا شروع کر دیا اور ہم میں سے ہر شخص کو انہوں نے ایک قیدی دیا، حتیٰ کہ جس صبح کو حضرت خالد نے ہمیں یہ حکم دیا تھا کہ ہر شخص اپنے اپنے قیدی کو قتل کر دے تو میں نے کہا خدا کی قسم! میں اپنے قیدی کو قتل نہیں کروں گا اور نہ میرے اصحاب میں سے کوئی شخص اپنے قیدی کو قتل کرے گا۔ حتیٰ کہ ہم نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ ماجرا ذکر کیا تب نبی ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر (دوسری روایت میں ہے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر) کتاب الدعوات، باب رفع الایدی فی الدعاء (دو بار یہ دعا کی: اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا، میں اس سے تیری طرف بری ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۳۳۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۳۲۰)

۲- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ دیہاتوں میں سے ایک اعرابی جمعہ کے دن رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! مویشی ہلاک ہو گئے، بچے اور لوگ ہلاک ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کی اور لوگ بھی اپنے ہاتھوں کو بلند کر کے دعا کر رہے تھے، ابھی ہم مسجد سے نکلے نہیں تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ (الحدیث)

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۰۲۹، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۱۶۸، ۱۱۷۳)

۳- حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے حتیٰ کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۰۳۰، صحیح مسلم الاستقاء: ۵، (۸۹۵) ۲۰۳۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۷۳۸)

۴- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ غزوہ حنین سے فارغ ہوئے تو آپ نے حضرت ابو عامر کو ایک لشکر کا امیر بنا کر اوطاس کی طرف بھیجا ان کا مقابلہ درید بن العمد سے ہوا۔ پس درید قتل کر دیا گیا اور اللہ نے اس کے لشکر کو شکست دی۔ حضرت ابو موسیٰ کہتے ہیں کہ آپ نے مجھے ابو عامر کے ساتھ بھیجا تھا۔ حضرت ابو عامر کے گھٹنے میں آکر ایک تیر لگا اور وہ تیر ان کے گھٹنے میں پیوست ہو گیا۔ میں ان کے پاس پہنچا اور کہا اے چچا آپ کو کس نے تیر مارا انہوں نے حضرت ابو موسیٰ کو اشارہ سے بتایا کہ وہ شخص میرا قاتل ہے جس نے مجھ کو تیر مارا ہے۔ میں نے اس کا قصد کیا اور اس کو جالیا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو وہ پیٹھ موڑ کر بھاگا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور میں یہ کہہ رہا تھا تجھے شرم نہیں آتی تو رکتا کیوں نہیں۔ وہ رک گیا اور ہم نے ایک دوسرے پر تلواروں سے حملے کیے۔ میں نے اس کو قتل کر دیا۔ پھر میں نے حضرت ابو عامر سے کہا اللہ نے آپ کے قاتل کو ہلاک کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ تیر نکالو۔ میں نے تیر نکالا تو گھٹنے سے پانی بسنے لگا۔ انہوں نے کہا: اے بھتیجے نبی ﷺ کو میرا سلام کہنا اور عرض کرنا کہ میرے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ اور حضرت ابو عامر نے مجھے اپنا قائم مقام لشکر کا سالار مقرر کیا۔ وہ تھوڑی دیر زندہ رہے پھر فوت ہو گئے۔ جب میں لوٹا تو نبی ﷺ کے گھر میں حاضر ہوا آپ ایک چارپائی پر بغیر بستر کے لیٹے تھے اور آپ کی پشت مبارک اور پہلو پر چارپائی کے نشانات ثبت ہو گئے تھے۔ میں نے آپ سے اپنا اور حضرت ابو عامر کا ماجرا عرض کیا اور یہ بتایا کہ انہوں نے کہا تھا کہ آپ سے کہنا کہ میرے لیے مغفرت کی دعا کریں۔ آپ نے پانی منگوا یا وضو کیا اور دونوں ہاتھ بلند کیے اور یہ دعا کی کہ اے اللہ! اپنے بندے ابو عامر کی مغفرت فرما۔ میں نے نبی ﷺ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی اور آپ نے کہا: اے اللہ! قیامت کے دن اس کو اپنی کثیر مخلوق پر فضیلت عطا فرما۔ میں نے عرض کیا اور میرے لیے بھی مغفرت کی دعا کیجئے آپ نے کہا اے اللہ! عبد اللہ بن قیس کے گناہ کو معاف فرما اور اس کو قیامت کے دن عزت کی جگہ میں داخل کر دے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۲۳، صحیح مسلم، فضائل صحابہ، ۱۶۵، (۲۳۹۸) ۲۶۸۹، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۵، رقم الحدیث: ۸۷۸۱)

۵- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ صبح سویرے خیبر پہنچے اس وقت وہ لوگ اپنے کدال اور پھاوڑے لے کر نکل رہے تھے۔ جب انہوں نے آپ کو دیکھا تو کہا کہ محمد ﷺ لشکر سمیت آپہنچے اور انہوں نے قلعہ کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور فرمایا خیبر تباہ ہو گیا بے شک ہم جس قوم کے صحن میں نازل ہوتے ہیں تو ان لوگوں کی کیسی بری صبح ہوتی ہے جن کو ڈرایا جا چکا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۳۷، مسند احمد ج ۳، ص ۱۶۳-۱۱۱)

۶- سالم بن عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حجرہ اولیٰ پر سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری کے بعد اللہ اکبر کہتے پھر نرم جگہ کا قصد کرتے پھر قبلہ کی طرف منہ کر کے طویل قیام کرتے اور دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کرتے۔ پھر اسی طرح حجرہ وسطیٰ پر کنکریاں مارتے پھر بائیں جانب نرم جگہ کا قصد کرتے اور قبلہ کی طرف منہ کر کے طویل قیام کرتے اور دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کرتے پھر حجرہ عقبہ کی رمی کرتے اور وہاں نہ ٹھہرتے اور کہتے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۷۵۲، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۰۸۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۰۳۲)

۷- زہری بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ اس حجرہ کی رمی کرتے جو مسجد منیٰ کے قریب ہے تو سات کنکریاں مارتے

اور ہر مرتبہ ری کے بعد اللہ اکبر کہتے پھر اپنے آگے بڑھ کر قبلہ کی طرف منہ کر کے ٹھہر جاتے اور دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کرتے اور طویل قیام کرتے۔ پھر دوسرے جمرہ پر آتے اور وہاں سات کنکریاں مارتے اور ہر ری کے بعد اللہ اکبر کہتے پھر بائیں جانب وادی کے قریب چلے جاتے اور قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے اور دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کرتے پھر جمرہ عقبہ کے پاس تشریف لاتے اور وہاں سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہتے پھر لوٹ آتے اور وہاں قیام نہ کرتے۔ زہری نے کہا میں نے سالم بن عبد اللہ سے سنا ہے وہ اپنے والد سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی مثل حدیث بیان کرتے تھے اور حضرت عبد اللہ بن عمر بھی اسی طرح کرتے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۷۵۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۰۸۳، سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۹۰۳)

۸- وہب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابن الزبیر رضی اللہ عنہم کو دیکھا وہ دعا کرتے تھے اور اپنی ہتھیلیوں کو اپنے چہرے پر پھیرتے تھے۔ اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

(الادب المفرد رقم الحدیث: ۶۲۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۳۱۶ھ)

۹- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کر رہے تھے: میں محض بشر ہوں تو میرا مواخذہ نہ فرما میں جس مومن کو بھی ازیت دوں یا برا کہوں تو تو اس پر میرا مواخذہ نہ فرما۔

(الادب المفرد رقم الحدیث: ۶۲۵، یہ حدیث صحیح ہے)

۱۰- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت طفیل بن عمرو الدوسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! دوس، نافرمانی کرتے ہیں اور انکار کرتے ہیں ان کے خلاف دعائے ضرر کیجئے۔ آپ نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور دونوں ہاتھ بلند کیے لوگوں نے گمان کیا کہ آپ ان کے خلاف دعاء ضرر کریں گے۔ آپ نے کہا: "اے اللہ دوس کو ہدایت دے اور ان کو لے آ۔"

(الادب المفرد رقم الحدیث: ۶۲۶، تہذیب تاریخ دمشق، ج ۷، ص ۶۶، مسند حمیدی ج ۱، رقم الحدیث: ۱۰۵۰)

۱۱- حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت طفیل بن عمرو نے نبی ﷺ سے کہا آپ کا ایک مضبوط قلعہ کے متعلق کیا خیال ہے جو دوس کا قلعہ ہے۔ آپ نے اس کا انکار فرمایا کیونکہ یہ سعادت اللہ تعالیٰ نے انصار کے لیے مقرر کر دی تھی۔ پھر حضرت طفیل نے ہجرت کی۔ اور ان کے ساتھ ان کے قبیلہ کے ایک شخص نے بھی ہجرت کی۔ وہ شخص بیمار پڑ گیا اس شخص نے بے صبری کی اور چھری سے اپنے ہاتھ کی رگیں کاٹ ڈالیں اور وہ مر گیا۔ حضرت طفیل نے اس کو خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ اس نے کہا نبی ﷺ کے ساتھ ہجرت کرنے کی وجہ سے اللہ نے مجھے بخش دیا۔ انہوں نے کہا: تمہارے ہاتھ کو کیا ہوا؟ اس نے کہا: مجھے یہ بتایا گیا کہ ہم اس کو ہرگز ٹھیک نہیں کریں گے جس کو تم نے خود خراب کیا ہے۔ حضرت طفیل نے یہ واقعہ نبی ﷺ سے عرض کیا آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی اے اللہ! اس کے ہاتھوں کو بھی معاف کر دے۔ (الادب المفرد رقم الحدیث: ۶۲۹)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

۱۲- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں یہ اس رات کی بات ہے جب رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تھے۔ آپ نے کروٹ لے کر چادر اوڑھی اور جوتے نکال کر اپنے قدموں کے سامنے رکھے اور چادر کی ایک طرف اپنے بستر پر بچھا کر لیٹ گئے، تھوڑی دیر میں نیند کے خیال سے لیٹے رہے۔ پھر آہستہ سے چادر اوڑھی، جو تاپہنا، چپکے سے دروازہ کھولا، آرام سے باہر نکلے اور

آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے بھی چادر سر پر اوڑھی ایک چادر اپنے گرد لپیٹی اور آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ آپ تسبیح (قبرستان) پہنچے اور بہت طویل قیام کیا اور تین بار (دعا کے لیے) ہاتھ بلند کیے اور لوٹ آئے۔

(صحیح مسلم الجنازہ: ۱۰۳، (۹۷۳) ۲۲۱۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۰۳۶، مسند احمد، ج ۶، ص ۲۲۱)

۱۳۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حیا دار کریم ہے جب کوئی شخص اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بلند کرتا ہے تو وہ ان کو نامراد لوٹانے سے حیا فرماتا ہے۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۵۶۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۳۸۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۸۶۵، المستدرک، ج ۱،

ص ۵۳۵، مسند احمد، ج ۵، ص ۳۳۸، کتاب الدعاء، للطبرانی، ص ۸۳، رقم الحدیث: ۲۰۲)

۱۴۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب دعائیں دونوں ہاتھ بلند فرماتے تو جب تک ان ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرتے نہیں تھے ان کو نیچے نہیں کرتے تھے۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۳۹۸)

۱۵۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب بندہ دونوں ہاتھ اللہ کی طرف بلند کرتا ہے تو اللہ اس سے حیا فرماتا ہے کہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے اور اس کے ہاتھوں میں کچھ نہ ہو۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۶۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۳۸۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۸۶۵، المعجم الکبیر، ج ۶، ص ۳۱۳،

کتاب الدعاء للطبرانی، ص ۸۳)

۱۶۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور ہاتھوں کی پشت دونوں سے سوال کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۳۸۷)

۱۷۔ سائب بن یزید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ جب دعا کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے اور اپنے ہاتھوں کو چہرے پر پھیرتے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۳۹۲)

۱۸۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے چہرے کے پاس شہد کی مکھیوں کی بھینٹا ہٹ کی سی آواز سنائی دیتی ایک دن آپ پر وحی نازل ہوئی ہم کچھ دیر ٹھہرے رہے اور جب وہ کیفیت ختم ہو گئی تو آپ نے قبلہ کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ بلند کیے اور یہ دعا کی: اے اللہ! ہمیں زیادہ دے اور ہم میں کمی نہ کر اور ہمیں عزت دے اور ہمیں ذلت سے بچا اور ہمیں عطا فرما اور ہمیں محروم نہ کر اور ہمیں ترجیح دے اور ہم پر کسی کو ترجیح نہ دے اور ہمیں راضی کر اور ہم سے راضی رہ۔ (الحدیث)

(سنن ترمذی رقم الحدیث: ۳۱۸۳، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۳۳۹، مسند احمد، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۲۳، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ،

المستدرک، ج ۱، ص ۵۳۵)

۱۹۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ ستر قاریوں کی شہادت کے قصہ میں بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ جب صبح کی نماز پڑھتے تھے تو دونوں ہاتھ بلند کر کے ان کے قاتلوں کے خلاف دعا پڑھتے تھے۔ (سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۲، ص ۲۱۱)

۲۰۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے دونوں ہاتھ بلند کر کے دو آدمیوں کے خلاف دعا کی۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۱۰، رقم الحدیث: ۹۷۲۳)

۲۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اخلاص اس طرح ہے، آپ نے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کیا اور یہ دعا ہے آپ نے دونوں ہاتھ کندھوں تک بلند کیے اور یہ اہتال ہے پھر آپ نے اور زیادہ

ہاتھ بلند کیے۔ (کتاب الدعاء للطبرانی رقم الحدیث: ۲۰۸)

۲۲۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جنگ احزاب کے دن جب رسول اللہ ﷺ کو تکلیف ہوئی تو آپ نے چادر پھینک دی اور بغیر (اوپر کی) چادر کے کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ خوب بلند کر کے دعا کی۔ اس حدیث کو امام داؤد طیالسی نے روایت کیا ہے۔

(اتحاف السادة المهرة بزوائد المسانيد العشرة، ج ۹، ص ۱۳، رقم الحدیث: ۶۹۳۳)

۲۳۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میدان عرفات میں کھڑے ہوئے اس طرح دعا کر رہے تھے انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ اپنی چھاتیوں تک بلند کیے اور ہتھیایوں کو زمین کی جانب کیا۔

(مسند احمد، ج ۳، ص ۱۳، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۶۸، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۳۰۱۱، ۳۰۱۷)

۲۴۔ حضرت خلد بن سائب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ کسی چیز کا سوال کرتے تو اپنی ہتھیایوں کو اپنی جانب رکھتے اور جب کسی چیز سے پناہ طلب کرتے تو اپنے ہاتھوں کی پشت کو اپنی جانب رکھتے۔

(مسند احمد، ج ۳، ص ۵۶، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۶۸، تلخیص الجیر مع شرح المذنب، ج ۵، ص ۱۰۲)

۲۵۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو میدان عرفات میں دعا کرتے ہوئے دیکھا آپ کے دونوں ہاتھ سینہ کی جانب تھے جیسے کوئی مسکین کھانا مانگ رہا ہو۔

(المعجم الاوسط، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۹۱۳، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۶۸)

۲۶۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ دعا کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے تھے حتیٰ کہ میں ہاتھوں کو بلند کرتے ہوئے اکتا جاتی تھی۔ (مسند احمد، ج ۶، ص ۲۲۵، اس کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۶۸)

۲۷۔ حضرت ابو ہریرہ سلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ دعا میں دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے حتیٰ کہ آپ کے دونوں بغلوں کی سفیدی دکھائی دیتی۔

(مسند ابو علی، ج ۱۳، رقم الحدیث: ۷۴۴۰، المطالب العالیہ، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۳۳۵، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۶۸)

۲۸۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعا میں دونوں ہاتھ بلند کرتے تھے حتیٰ کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دیتی تھی۔

(مسند البرز، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۱۳۷، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۱۴۷۱، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۶۸)

۲۹۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میدان عرفات میں گڑگڑا کر دعا کر رہے تھے۔ آپ کے اصحاب نے کہا یہ اہتال (اللہ سے عجز و انکسار سے دعا کرنا) ہے۔

(مسند البرز، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۱۳۸، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۶۸)

۳۰۔ حضرت یزید بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک جماعت کے ساتھ آئے حتیٰ کہ آپ نے المرطاء کے نزدیک قرن پر قیام کیا۔ اس وقت آپ قبلہ کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ بلند کیے ہوئے دعا کر رہے تھے۔

(المعجم الاوسط، ج ۹، رقم الحدیث: ۸۹۱۸، مجمع الزوائد، ج ۱۰، ص ۱۶۹)

۳۱۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارا رب حیا کرنے والا کریم ہے۔ جب بندہ اس کی طرف دونوں ہاتھ بلند کرتا ہے تو اس کو اس سے حیا آتی ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے اور ان میں کوئی

خیر نہ ہو۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص اپنے دونوں ہاتھ بلند کرے تو وہ تین بار یہ کہے یا حی یا قیوم لا الہ الا انت یا ارحم الراحمین پھر اپنے چہرے پر خیر کو انڈیل دے (یعنی چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ اس کی سند ضعیف ہے)

(المعجم الکبیر ج ۱۲، رقم الحدیث: ۱۳۵۵، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۶۹)

۳۲۔ حضرت سلمان بنی اشجین بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو لوگ بھی اپنے ہاتھوں کو اللہ عزوجل کی طرف اٹھا کر کسی چیز کا سوال کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ (کے ذمہ کرم) پر یہ حق ہے کہ ان کے ہاتھوں میں وہ چیز رکھ دے جس کا انہوں نے سوال کیا ہے۔ (اس حدیث کی سند صحیح ہے) (المعجم الکبیر ج ۶، رقم الحدیث: ۶۱۳۲، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۶۹)

۳۳۔ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تنگ دستی کی شکایت کی آپ نے فرمایا اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرو اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کا سوال کرو۔ امام طبرانی نے اس حدیث کو دو سندوں سے روایت کیا ہے۔ ان میں سے ایک سند حسن ہے۔

(المعجم الکبیر ج ۳، رقم الحدیث: ۳۸۳۲، ۳۸۳۳، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۶۹)

۳۴۔ حضرت خلاد بن سائب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دعا کرتے تو اپنی ہتھیلیوں کو چہرے تک بلند کرتے۔ اس کی سند میں حفص بن ہاشم مجہول ہے۔

(المعجم الکبیر ج ۲، رقم الحدیث: ۱۱۸۵، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۶۹)

۳۵۔ حضرت جریر بنی اشجین بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو میدان عرفات میں دیکھا آپ نے اپنی چادر بغل سے نکالی ہوئی تھی اور دونوں ہاتھ بلند کیے ہوئے تھے جو سر سے متجاوز نہیں تھے اور آپ کے بازو کانپ رہے تھے۔ اس کی سند میں محمد بن عبید اللہ العزری ضعیف راوی ہے۔ (المعجم الکبیر ج ۲، رقم الحدیث: ۲۳۸۶، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۶۹)

۳۶۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے سوال کرو اور ہاتھوں کی پشت سے سوال نہ کرو۔

(سنن کبریٰ للبیہقی ج ۲، ص ۲۱۲، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۶۹، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۲۲۳۳، کنز العمال، رقم الحدیث: ۳۲۳۰، ۳۲۳۱)

(۳۲۳۷)

۳۷۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم بیت اللہ کو دیکھو، جب صفا اور مروہ پر ہو اور جب میدان عرفات میں ہو اور جب مزدلفہ میں ہو اور جب شیطان پر کنکریاں مارو اور جب نماز قائم کرو تو دونوں ہاتھوں کو بلند کرنا ہے۔ (المعجم الاوسط ج ۲، رقم الحدیث: ۱۷۰۹، مجمع الزوائد ج ۳، ص ۲۳۸)

۳۸۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سخت گرمیوں میں تبوک کی طرف گئے۔ ہم ایک جگہ ٹھہرے۔ اس دن ہمیں اتنی سخت پیاس لگ رہی تھی کہ لگتا تھا کہ ہماری گردنیں ڈھلک جائیں گی، حتیٰ کہ ایک شخص پانی کی تلاش میں جاتا اور اس حال میں واپس آتا کہ اس کی گردن ڈھلکی ہوئی ہوتی، اور حتیٰ کہ کوئی شخص اپنے اونٹ کو ذبح کرتا اور اس کی اوجھڑی کو نچوڑ کر پیتا اور باقی کو اپنے کلیجہ پر رکھتا۔ حضرت ابو بکر نے کہا یا رسول اللہ! اللہ آپ کی دعا قبول کرتا ہے آپ ہمارے لیے دعا کیجئے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم یہ چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا ہاں! پھر آپ نے دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کی ابھی وہ ہاتھ نیچے کیے تھے کہ بادل امنڈ آئے اور بارش شروع ہو گئی پھر ٹھہر گئی اور صحابہ نے اپنے برتن پانی سے بھر لیے۔

(المعجم الاوسط ج ۳، رقم الحدیث: ۳۳۱۶)

۳۹۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گھر سے مسجد کی طرف گیا۔ مسجد میں کچھ لوگ ہاتھ بلند کر کے اللہ عزوجل سے دعا کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم لوگ دیکھ رہے ہو ان لوگوں کے ہاتھوں میں کیا ہے؟ میں نے پوچھا آپ ان کے ہاتھوں میں کیا دیکھ رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: نور۔ میں نے عرض کیا: آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ مجھے بھی وہ نور دکھائے۔ حضرت انس نے کہا: آپ نے دعا کی اور میں نے وہ نور دیکھ لیا۔ پھر آپ نے فرمایا اے انس جلدی چلو تاکہ ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہو جائیں پھر میں نبی ﷺ کے ساتھ جلدی جلدی چلا پھر ہم نے بھی اپنے ہاتھ بلند کیے۔ (کتاب الدعاء للبرانی، ص ۸۵، رقم الحدیث: ۲۰۶، التاریخ الکبیر، ج ۳، ص ۲۰۲)

۴۰۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ابن آدم جو بات بھی کرتا ہے وہ لکھ لی جاتی ہے۔ جب وہ کوئی خطا کرے اور اس پر توبہ کرنا چاہے تو اسے بلند ہونے والا نور لانا چاہیے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کرے اور یہ کہے کہ میں اس خطا سے توبہ کرتا ہوں اور میں دوبارہ یہ کبھی نہیں کروں گا تو اس کی وہ خطا بخش دی جائے گی جب تک کہ وہ اس خطا کو دوبارہ نہ کرے۔ (کتاب الدعاء للبرانی، ص ۸۵، رقم الحدیث: ۲۰۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے متعلق حرف آخر

دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائے مانگنے کے متعلق مذکور الصدر احادیث کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث میری نظر میں ہیں لیکن میں اس باب میں صرف چالیس احادیث جمع کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ امت مسلمہ تک چالیس احادیث پہنچانے کے سلسلہ میں متعدد بشارات ہیں ہر چند کہ ان احادیث کی اسناد ضعیف ہیں۔ اسی طرح دونوں ہاتھ بلند کر کے دعائے مانگنے کے باب میں جو ہم نے احادیث پیش کی ہیں، ان میں بھی بعض احادیث کی اسناد ضعیف ہیں لیکن فضائل اعمال میں ضعیف احادیث معتبر ہوتی ہیں اس لیے ہم نے ان احادیث کو بھی شامل کر لیا ہے۔ پہلے ہم چالیس حدیثوں کی حفاظت کے متعلق احادیث پیش کریں گے۔ پھر احادیث ضعیفہ کے معتبر ہونے کے متعلق دلائل پیش کریں گے۔

چالیس حدیثوں کی تبلیغ کرنے والے کے متعلق نوید اور بشارت

امام ابو نعیم احمد بن عبد اللہ الاصبہانی المتوفی ۴۳۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری امت کو ایسی چالیس حدیثیں پہنچائیں جس سے اللہ عزوجل نے ان کو نفع دیا تو اس سے کہا جائے گا جس دروازے سے چاہو جنت میں داخل ہو جاؤ۔

(علیہ الاولیاء، ج ۳، ص ۱۸۹، "علل المتناہیہ"، ج ۱، ص ۱۱۲)

امام حافظ ابو عمرو یوسف ابن عبد البر مالکی اندلسی متوفی ۴۶۳ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے جس امتی نے چالیس حدیثوں کو روایت کیا وہ قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ وہ فقیہ عالم ہو گا۔ امام عبد البر نے کہا اس حدیث کی تمام سندیں ضعیف ہیں۔ (کتاب العلم، ج ۱، ص ۴۳، "علل متناہیہ"، ج ۱، ص ۱۱۸)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری امت کے لیے سنت سے متعلق چالیس حدیثوں کو محفوظ کیا حتیٰ کہ وہ حدیثیں ان تک پہنچادیں میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا اور اس کے حق میں گواہی دوں گا۔ امام ابن عبد البر نے کہا اس حدیث کی سند اس باب کی حدیثوں میں سب سے بہتر ہے لیکن یہ غیر محفوظ ہے اور امام مالک کی روایات میں غیر معروف ہے۔ (کتاب العلم، ج ۱، ص ۴۳، "علل المتناہیہ"، ج ۱، ص ۱۱۷)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری امت کو ان کے دین سے متعلق چالیس حدیثیں پہنچائیں اللہ اس کو اس حال میں اٹھائے گا کہ وہ فقیہ ہو گا اور میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا اور اس کے حق میں گواہی دوں گا۔

(شعب الایمان، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۷۲۵، تہذیب تاریخ دمشق، ج ۲، ص ۳۹۳، مشکوٰۃ، رقم الحدیث: ۲۵۸، المطالب العالیہ، رقم الحدیث: ۳۰۷۶، کنز العمال، ج ۱۰، رقم الحدیث: ۲۸۸۱۷، ۲۹۱۸۲، ۲۹۱۸۳، ۲۹۱۸۴، ۲۹۱۸۵، ۲۹۱۸۶، ۲۹۱۸۷، ۲۹۱۸۸، ۲۹۱۸۹، علی متقی نے یہ احادیث ابن عدی کی کامل، امام ابن عساکر، امام عبدالرزاق، امام بیہقی کی شعب الایمان، امام ابن التجار، امام ابو نعیم کی علیہ اور امام دہلی کے حوالوں سے ذکر کی ہیں)

امام حافظ ابو احمد عبد اللہ بن عدی الجرجانی المتوفی ۳۶۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری امت کو سنت سے متعلق چالیس حدیثیں پہنچائیں میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کروں گا۔

(الکامل فی ضعفاء الرجال، ج ۱، ص ۳۲۳، الجامع الصغیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۸۶۳۶، الععل المتساہیہ، ج ۱، ص ۱۱۶)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے میری امت کو سنت سے متعلق چالیس حدیثیں پہنچائیں میں قیامت کے دن اس کے حق میں گواہی دوں گا۔

(الکامل فی ضعفاء الرجال، ج ۳، ص ۸۹۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری امت کو چالیس ایسی حدیثیں پہنچائیں جو ان کے دین میں نفع دیں وہ شخص قیامت کے دن علماء میں سے اٹھایا جائے گا۔

(الکامل فی ضعفاء الرجال، ج ۵، ص ۱۷۹۹، ج ۶، ص ۲۲۷، ج ۷، ص ۲۵۲۸، الععل المتساہیہ، ج ۱، ص ۱۱۸، البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۳۱۰، شعب الایمان، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۷۲۵، تہذیب تاریخ دمشق، ج ۲، ص ۳۹۳، مختصر تاریخ دمشق، ج ۳، ص ۲۳۸)

چالیس حدیثوں کی تبلیغ پر بشارت کی احادیث کی فنی حیثیت

علامہ عبدالرؤف مناوی شافعی متوفی ۱۰۰۳ھ لکھتے ہیں:

علامہ نووی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی تمام اسناد ضعیف ہیں۔ اور حافظ ابن عساکر نے کہا ہے کہ یہ حدیث حضرت علی، حضرت عمر، حضرت انس، حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود، حضرت معاذ، حضرت ابو امامہ، حضرت ابو الدرداء اور حضرت ابو سعید سے متعدد اسانید کے ساتھ مروی ہیں جن میں سے ہر سند کی صحت پر بحث کی گئی ہے لیکن کثرت طرق اور اسانید سے اس حدیث کی تقویت ہو گئی اور باوجود ضعف کے سب سے عمدہ سند اس حدیث کی ہے جو حضرت معاذ سے مروی ہے۔

(فیض القدر، ج ۱۱، ص ۵۷۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

جس حدیث کا علامہ مناوی نے حافظ ابن عساکر کے حوالے سے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے میری امت کو ان کے دین سے متعلق چالیس حدیثیں پہنچائیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اس حال میں اٹھائے گا کہ وہ فقیہ عالم ہو گا۔

(الععل المتساہیہ، ج ۱، ص ۱۴، المحدث الفاضل، ص ۱۷۳، کتاب العلم، ج ۱، ص ۴۴)

علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی المتوفی ۱۱۶۲ھ لکھتے ہیں:

امام دارقطنی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی تمام اسانید ضعیف ہیں۔ حافظ ابن حجر نے کہا میں نے اس حدیث کو تمام اسانید کے ساتھ ایک رسالہ میں جمع کیا ہے (ارشاد الربیعین الی طریق حدیث الاربعین، یہ رسالہ چھپ چکا ہے) اس کی ہر سند میں علت قادح ہے۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں کہا ہے یہ متن لوگوں کے درمیان مشہور ہے اور اس کی کوئی سند صحیح نہیں ہے۔ علامہ نووی نے کہا ہے کہ حفاظ کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اگرچہ اس کی اسانید متعدد ہیں۔ حافظ ابو طاہر سلفی نے اپنی اربعین میں یہ کہا ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے جن پر اعتماد اور میلان کیا گیا ہے اور جن کی صحت معلوم ہے۔ حافظ منذری نے اس کی توجیہ میں یہ کہا کہ ان کی یہ عبارت اس قول پر مبنی ہے کہ جب حدیث ضعیف متعدد طرق اور اسانید سے مروی ہو تو اس میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ (کشف الخفاء و مزمل الالباس، ج ۲، ص ۲۳۶، مطبوعہ مکتبہ الغزالی، دمشق)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ اربعین نووی کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

یہ حدیث حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس، حضرت انس بن مالک، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے متعدد اسانید کے ساتھ مروی ہے۔ ہر چند کہ اس کے طرق متعدد ہیں اس کے باوجود حفاظ کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور علماء رضی اللہ عنہم نے اس باب میں بے شمار تصنیفات سپرد قلم کی ہیں۔ میرے علم کے مطابق سب سے پہلے عبداللہ بن المبارک نے چالیس حدیثوں کا مجموعہ لکھا۔ پھر الحسن بن سفیان التسانی نے اور ابوبکر الاجری نے، اور ابوبکر محمد بن ابراہیم الاصفہانی نے اور محمد بن اسلم الطوسی نے اور امام الدار قطنی نے اور امام حاکم، امام ابو نعیم اور ابو عبد الرحمن اسلمی نے اور ابوسعید المالینی اور ابو عثمان الصابونی نے اور عبداللہ بن محمد الانصاری نے اور ابوبکر البیہقی نے اور بے شمار متقدم اور متاخر علماء نے۔

اور میں نے ان ائمہ اعلام اور حفاظ اسلام کی اقتداء کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا کہ میں بھی چالیس حدیثیں جمع کروں۔ اور بے شک علماء کا اتفاق ہے کہ فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا جائز ہے۔ اس کے باوجود میرا صرف اس حدیث پر اعتماد نہیں ہے بلکہ دیگر احادیث صحیحہ پر اعتماد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے حاضر غائب کو پہنچادے اور آپ نے فرمایا اللہ اس کو تروتازہ رکھے جس نے میری حدیث کو سنا، اس کو یاد رکھا اور جس طرح اس کو سنا تھا، اس طرح پہنچادیا۔ (اربعین نووی، ص ۵-۴، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی)

جیسا کہ علامہ نووی نے فرمایا فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا جائز ہے۔ نیز جب کوئی حدیث متعدد اسانید سے مروی ہو تو حسن ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں نے بھی اس حدیث میں مذکور بشارتوں کی امید پر اور ان علماء اسلام کی اتباع کرتے ہوئے تبیان القرآن کی جلد ثانی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے متعلق اور اس جلد رابع میں دونوں ہاتھ بلند کر کے دعا کرنے کے متعلق چالیس حدیثیں جمع کی ہیں کیونکہ اہل علم کے عمل سے بھی حدیث ضعیف پر عمل کرنا جائز ہے بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کی تصریح کی ہے۔

(الکتب علی کتاب ابن الصلاح، ج ۱، ص ۴۹۵-۴۹۴)

حدیث ضعیف پر عمل کرنے کے قواعد اور شرائط

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

محدثین، فقہاء اور دیگر علماء نے یہ کہا ہے کہ فضائل اور ترغیب اور ترہیب میں حدیث ضعیف پر عمل کرنا جائز ہے جبکہ وہ موضوع نہ ہو۔ (کتاب الاذکار، ص ۷، مطبوعہ مکتبہ مصطفیٰ البابی المحلی و اولادہ، مصر)

اگر حدیث کی اسانید الگ الگ ضعیف ہوں تو ان کا مجموع قوی ہوتا ہے۔ کیونکہ بعض، بعض کے ساتھ مل کر قوی ہو جاتی ہیں اور وہ حدیث حسن ہوتی ہے اور اس کے ساتھ استدلال کیا جاتا ہے۔

(شرح المذنب، ج ۷، ص ۱۹۷، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

علامہ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی متوفی ۹۰۲ھ لکھتے ہیں:

حدیث ضعیف پر عمل کرنے کی حسب ذیل شرائط ہیں:

- ۱- وہ حدیث بہت شدید ضعیف نہ ہو۔ پس جس حدیث کی روایت میں کذابین یا مستہم با کذب منفرد ہوں یا جو بہت زیادہ غلطی کرتے ہوں ان کی روایات پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔ یہ شرط متفق علیہ ہے۔
 - ۲- وہ حدیث کسی عام شرعی قاعدہ کے تحت مندرج ہو اور جس حدیث کی کوئی اصل نہ ہو وہ اس قاعدہ سے خارج ہے۔
 - ۳- اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس کے ثبوت کا اعتقاد نہ کیا جائے تاکہ نبی ﷺ کی طرف وہ بات منسوب نہ ہو جو آپ نے نہیں فرمائی۔ مؤخر الذکر دونوں شرطیں ابن عبدالسلام اور ابن دقیق العید سے منقول ہیں۔
- اور میں کہتا ہوں کہ امام احمد سے یہ منقول ہے کہ حدیث ضعیف پر اس وقت عمل کیا جائے جب اس کے سوا دوسری حدیث نہ مل سکے۔ اور اس حدیث کے معارض کوئی اور حدیث نہ ہو اور امام احمد سے دوسری روایت یہ ہے کہ لوگوں کی رائے کی بہ نسبت ہمیں حدیث ضعیف زیادہ محبوب ہے اور ابن حزم نے ذکر کیا ہے کہ تمام احناف اس پر متفق ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ حدیث ضعیف پر عمل کرنا رائے اور قیاس پر عمل کرنے سے افضل ہے۔

(القول البدیع، ص ۳۶۳-۳۶۴، مطبوعہ مکتبہ المودع، طائف)

دعائیں حد سے بڑھنے کا ممنوع ہونا

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (الاعراف: ۵۵)

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ دعائیں حد سے بڑھنا ممنوع ہے۔ یعنی انسان اللہ تعالیٰ سے دعائیں ایسی چیز کا سوال کرے جو اس کی حیثیت سے بڑھ کر ہو۔ مثلاً وہ نبی بننے کی دعا کرے یا یہ دعا کرے کہ اس کو آخرت میں انبیاء کا مقام اور ان کا رتبہ ملے۔ امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اے اللہ میں تجھ سے جنت کی دائیں جانب سفید محل کا سوال کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا: اے بیٹے! اللہ سے جنت کا سوال کرو اور دوزخ سے پناہ طلب کرو۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: غنقریب میری امت میں سے کچھ لوگ وضوء اور دعائیں حد سے بڑھیں گے۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۹۶، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۸۶۳، مسند احمد، ج ۵، رقم الحدیث: ۱۶۸۰۱)

حرام چیزوں اور گناہ کا سوال کرنا بھی دعائیں حد سے بڑھنا ہے۔ یا جن چیزوں کے متعلق معلوم ہو کہ اللہ ایسا نہیں کرے گا ان کی دعا کرے۔ مثلاً یہ دعا کرے کہ وہ قیامت تک زندہ رہے یا یہ دعا کرے کہ اس سے کھانے پینے کے اور دیگر لوازم بشریہ مرتفع ہو جائیں یا یہ دعا کرے کہ وہ معصومین سے ہو جائے یا عالم الغیب ہو جائے یا اس کے ہاں بغیر بیوی کے بچہ ہو جائے۔

حد سے زیادہ چلا کر یا زور و شور سے دعا کرنا بھی حد سے بڑھنے میں داخل ہے اور بے پرواہی اور لاپرواہی سے دعا کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ یا اللہ تعالیٰ کا ایسی صفات سے ذکر کرنا جو اس کی شان کے لائق نہ ہوں وہ بھی حد سے بڑھنے میں داخل ہے۔

تبیان القرآن

جلد چہارم

محسنین کا معنی

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: بے شک اللہ کی رحمت محسنین کے قریب ہے۔ (الاعراف: ۵۶)

محسنین کا معنی ہے احسان کرنے والے۔ یعنی نیکی اور اچھے کام کرنے والے۔ احسان سے یہاں مراد ہے اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لانا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا، اس کی طرف رجوع کرنا، اس پر توکل کرنا، اس سے حیا کرنا، اس سے ڈرنا، اس سے محبت کرنا اور اس کی عبادت اس طرح کرنا گویا کہ وہ اس کے سامنے کھڑا ہے اور اس کے جلال اور ہیبت سے وہ لرزہ بر اندام ہے۔ اور اس کے تمام احکام کی اطاعت کرنا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ احسان ہے اور درحقیقت یہ خود اپنے ساتھ احسان ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: هل جزاء الاحسان الا الاحسان (الرحمن: ۶۰) احسان کا بدلہ صرف احسان ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور جو کچھ سیدنا محمد ﷺ لے کر آئے اس پر عمل کیا، اس کی جزاء صرف جنت ہے اور یہی اس آیت کا معنی ہے کہ اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے۔

معتزلہ نے یہ کہا ہے کہ اللہ کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو مسلمان گناہ گار ہیں اور جو کبیرہ گناہ کرتے ہوئے بغیر توبہ کے مر گئے، ان کے قریب اللہ کی رحمت نہیں ہوگی اور مغفرت اور جنت اللہ کی رحمت ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ بغیر توبہ کے مرنے والے مرتکب کبیرہ کی مغفرت نہیں ہوگی اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لایا اور اس نے کچھ نیک اعمال بھی کیے، وہ محسنین میں داخل ہے خواہ اس نے گناہ کبیرہ بھی کیے ہوں کیونکہ محسنین کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس نے ساری عمر نیک کام کیے ہوئے ہوں اور کسی نیکی کو نہ چھوڑا ہو اور کسی برائی کو نہ کیا ہو، جس طرح عالم کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا عالم ہو اور کسی چیز سے جاہل نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (النساء: ۴۸)

بے شک اللہ اپنے ساتھ شرک کیے جانے کو نہیں بخشے گا اور جو اس سے کم گناہ ہو وہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔

پس مسلمان مرتکب کبیرہ اگر بغیر توبہ کے مر گیا تو وہ اللہ کی مشیت میں ہے وہ چاہے گا تو اس کو ابتداء اپنے فضل محض سے بخش دے گا اور اگر وہ چاہے گا تو اس کو اپنے نبی ﷺ کی شفاعت سے بخش دے گا اور اگر چاہے گا تو اس کو کچھ سزا دے کر بخش دے گا۔ لیکن کوئی مسلمان بھی اللہ کی بخشش سے بالکل محروم نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور وہی ہے جو اپنی رحمت (کی بارش) کے آگے آگے خوش خبری کی ہواؤں کو بھیجتا ہے، حتیٰ کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادل کو اٹھالیتی ہیں تو ہم اس کو کسی بنجر زمین کی طرف روانہ کر دیتے ہیں، پھر ہم اس سے پانی نازل کرتے ہیں، پھر ہم اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں، اسی طرح ہم مردوں کو (قبروں سے) نکالیں گے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

(الاعراف: ۵۷)

اس کائنات میں حشر کے دن مردوں کو زندہ کرنے کی نشانی

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا تھا کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے والا ہے، وہی کائنات میں حاکم اور تصرف کرنے والا ہے اور اس نے انسان کے لیے کائنات کو مسخر کر دیا ہے اور اس نے انسان کو یہ ہدایت دی کہ وہ اپنی ہر ضرورت میں اور ہر آفت اور مصیبت میں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور اس نے یہ بیان فرمایا کہ اس کی رحمت نیکی کرنے والوں کے قریب ہے۔ اور اب اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ وہی رزاق ہے اور حصول رزق کا اہم ذریعہ آسمانی بارش ہے جس کی وجہ سے دریاؤں، چشموں

اور کنوؤں میں انسانوں اور جانوروں کے لیے پینے کا پانی اور کھیتوں کو سیراب کرنے کے لیے پانی فراہم ہوتا ہے۔ اور جس طرح وہ بجز زمین کو بارش کے ذریعہ سرسبز اور زندہ فرماتا ہے اسی طرح وہ قیامت کے دن مردوں کو زندہ فرمائے گا۔

امام ابو داؤد الطیالسی اور امام بیہقی وغیرہما نے حضرت ابو رزین عقیلی سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ مخلوق کو کس طرح دوبارہ زندہ فرمائے گا اور مخلوق میں اس کی کیا علامت ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا تم کبھی اپنی قوم کی خشک اور قحط زدہ زمین کے پاس سے نہیں گزرے! اور پھر اس زمین کو سبزہ سے لہلہاتے ہوئے نہیں دیکھا! انہوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: یہ مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ یہ حدیث صحیح ہے اور اس آیت کے موافق ہے۔

(اتذکرہ، ص ۲۱۰، دارالکتب العلمیہ، بیروت)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا جب پہلا صور پھونکنے کے بعد لوگ مرجائیں گے تو عرش کے نیچے سے ان پر بارش ہوگی اور وہ اس طرح اگنے لگیں گے جس طرح بارش سے سبزہ اگتا ہے حتیٰ کہ جب ان کے اجسام مکمل ہو جائیں گے تو ان میں روح پھونک دی جائے گی۔ پھر ان پر نیند طاری کر دی جائے گی اور وہ اپنی قبروں میں سو جائیں گے اور جس وقت دوسرا صور پھونکا جائے گا تو ان کے سروں اور آنکھوں میں نیند کا خمیر ہوگا اور ان کی ایسی کیفیت ہوگی جس طرح کسی سوئے ہوئے شخص کو اچانک بیدار کرنے سے ہوتی ہے اور اس وقت وہ یہ کہیں گے:

يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا هَذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (یس: ۵۲)

ہائے افسوس ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے اٹھا دیا (پھر ایک منادی کہے گا) یہ وہ ہے جس کا رحمن نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں نے سچ کہا تھا۔

(جامع البیان، جز ۸، ص ۲۷۳، دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو اچھی زمین ہوتی ہے وہ اپنے رب کے حکم سے پیداوار نکالتی ہے اور جو خراب زمین ہوتی ہے اس کی پیداوار صرف تھوڑی سی نکلتی ہے، ہم شکر کرنے والوں کے لیے اسی طرح بار بار آیات کو بیان کرتے ہیں۔

(الاعراف: ۵۸)

اچھی اور خراب زمینوں میں مسلمانوں اور کافروں کی مثال

اللہ تعالیٰ نے مومن اور کافر کے لیے یہ مثال بیان فرمائی ہے۔ مومن کی مثال اچھی زمین ہے اور کافر کی مثال خراب زمین ہے اور نزول قرآن کی مثال بارش ہے۔ سو جس طرح اچھی زمین پر بارش ہو تو اس سے سبزہ، پھل، پھول اور غلہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح وہ پاکیزہ روہیں جو جہالت اور برے اخلاق سے مبرا اور منزہ ہوتی ہیں، جب وہ نور قرآن سے مزین ہو جاتی ہیں، تو ان سے عبادات، معارف اور اخلاق حمیدہ ظاہر ہوتے ہیں اور جس طرح خراب زمین پر بارش ہو تو اس سے کم پیداوار ہوتی ہے، اسی طرح جب خراب روہوں پر قرآن پاک کی تلاوت کی جائے تو ان سے بہت کم معارف الہیہ اور اخلاق حمیدہ ظاہر ہوتے ہیں۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے جو ہدایت اور علم دے کر بھیجا ہے، اس کی مثال اس کثیر بارش کی طرح ہے جو زمین پر برستی ہو۔ ان زمینوں میں سے بعض صاف ہوتی ہیں جو بہت زیادہ خشک اور تر گھاس اگاتی ہیں اور بعض زمینیں سخت ہوتی ہیں وہ پانی کو روک لیتی ہیں۔ اللہ اس زمین سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ وہ اس سے پانی پیتے ہیں۔ اپنے جانوروں کو پلاتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں اور بعض زمینیں ہموار اور چکنی ہوتی ہیں وہ پانی کو روکتی

ہیں نہ گھاس کو اگاتی ہیں۔ پس یہ مثال اس شخص کی ہے جو اللہ کے دین کی فہم حاصل کرتا ہے۔ اور اللہ نے مجھے جو دین دے کر بھیجا ہے وہ اس کو نفع دیتا ہے۔ پس وہ علم حاصل کرتا ہے اور لوگوں کو تعلیم دیتا ہے۔ اور اس شخص کی مثال ہے جو اس دین کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتا اور اس ہدایت کو قبول نہیں کرتا جس کے ساتھ مجھے مبعوث کیا گیا ہے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۷۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

وحی الہی اور دین اسلام کی مثال نبی ﷺ نے بارش سے دی ہے اور فقہاء کی مثال اس زمین سے دی ہے جو بارش سے سیراب ہونے کے بعد سبزہ اگاتی ہیں اور لوگ اس سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح فقہاء آپ کی احادیث سے مسائل نکالتے ہیں اور لوگ ان سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور محدثین کی مثال اس زمین سے دی ہے جو اپنے اندر پانی جمع کر لیتی ہے اور لوگ اس پانی سے فائدہ حاصل کرتے ہیں، اسی طرح محدثین احادیث کو جمع کرتے ہیں اور لوگ ان سے فیض یاب ہوتے ہیں اور کفار اور منافقین کی مثال اس زمین سے دی ہے جو بارش سے نہ خود فائدہ اٹھاتی ہے نہ لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچاتا ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ

بے شک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، پس انہوں نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا

مِّنْ إِلَهِ غَيْرُهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ

تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، بے شک مجھے تم پر ایک عظیم دن کے عذاب کا خطرہ ہے ○ ان کی

الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنِّي لَأَنْذَرُكَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴿۶۰﴾ قَالَ يَقْرُم

قوم کے سرداروں نے کہا بے شک ہم آپ کو یقیناً کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں ○ انہوں نے کہا اے میری قوم

لَيْسَ بِي ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّي رَسُولٌ مِّنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۶۱﴾ أَلَيْسَ لَكُمْ

مجھ میں کسی قسم کی گمراہی نہیں ہے لیکن میں رب العالمین کی جانب سے رسول (پیغام پہنچانے والا) ہوں ○ میں تمہیں اپنے رب کے

رِسَالَتِ رَبِّي وَأَنْصَحُ لَكُمْ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۶۲﴾

پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے ان باتوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے ○

أَوْحَيْتُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ

کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد کے ذریعہ ایک نصیحت

لِيُنذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَنْجَيْنَاهُ

آئی ہے تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تم متقی ہو جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے ○ تو انہوں نے ان کی تکذیب کی پس ہم نے ان کو

وَالَّذِينَ مَعَهُ فِي الْهَلِكِ وَأَعْرَفْنَا الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے (ان سب کو) نجات دے دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا،

إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا عَمِينَ ۝

بے شک وہ اندھے لوگ تھے ۝

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، پس انہوں نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، بے شک مجھے تم پر ایک عظیم دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

(الاعراف: ۵۹)

حضرت نوح علیہ السلام کا نام و نسب اور ان کی تاریخ ولادت
حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی متوفی ۷۷۳ھ لکھتے ہیں:

حضرت نوح علیہ السلام کا شجرہ نسب یہ ہے: نوح بن لامک بن متوشلخ بن خنوخ (اور لیس) بن یرد بن ملائیل بن قین بن انوش بن شیث بن آدم ابو البشر علیہ السلام۔

امام ابن جریر وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی وفات کے ایک سو چھبیس سال بعد حضرت نوح علیہ السلام پیدا ہوئے اور اہل کتاب کی تاریخ میں مذکور ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک سو چھیالیس سال کا عرصہ ہے۔

امام ابن حبان نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے: حضرت ابو امامہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا حضرت آدم نبی تھے؟ فرمایا: ہاں اوہ ایسے نبی تھے جن سے کلام کیا گیا۔ پوچھا حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان کتنا عرصہ ہے؟ فرمایا: دس قرن (صدیاں) یہ حدیث صحیح ہے۔

(صحیح ابن حبان، ج ۱۳، رقم الحدیث: ۶۱۹۰، المعجم الکبیر، ج ۸، رقم الحدیث: ۷۵۳۵، امام طبرانی کی روایت میں یہ اضافہ ہے یا رسول اللہ! رسول کہتے ہیں؟ فرمایا: ۳۱۳، المستدرک، ج ۲، ص ۲۶۲، مجمع الزوائد، ج ۱، ص ۱۹۶، مسند احمد، ج ۵، ص ۱۷۸، ۱۷۹، مسند البرز، ج ۱، ص ۱۶۰) اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان ایک ہزار سال ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ اپنی سند کے ساتھ عکرمہ سے روایت کرتے ہیں: حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان دس قرن (قرن کا معنی ہے ایک صدی یا ایک صدی کے لوگ، نسلیں) ہیں اور وہ سب اسلام پر تھے۔

(اللبقات الکبریٰ، ج ۱، ص ۴۲، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

حافظ ابن کثیر نے اس حدیث کو صحیح البخاری کے حوالہ سے درج کیا ہے۔ لیکن یہ ان کا وہم ہے۔ یہ حدیث صحیح البخاری میں ہے نہ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں۔

حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس وقت مبعوث کیا جب بتوں کی عبادت اور شیطانوں کی اطاعت شروع ہو چکی تھی اور لوگ کفر اور گمراہی میں مبتلا ہو چکے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول ہیں جن کو بندوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ بعثت کے وقت ان کی عمر میں اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ ان کی عمر اس وقت پچاس سال تھی اور دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی عمر اس وقت تین سو پچاس سال تھی اور امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے لکھا ہے ان کی

تبیان القرآن

جلد چہارم

عمر اس وقت چوراسی سال تھی۔
بت پرستی کی ابتدا کیسے ہوئی؟

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ محمد بن قیس سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان کچھ نیک لوگ تھے اور ان کے پیروکار ان کی اقتداء کرتے تھے۔ جب وہ نیک لوگ فوت ہو گئے تو ان کے پیروکاروں نے کہا: اگر ہم ان کی تصویریں بنالیں تو اس سے ہماری عبادت میں زیادہ ذوق اور شوق ہوگا۔ سو انہوں نے ان نیک لوگوں کی تصویریں بنالیں۔ جب وہ فوت ہو گئے اور ان کی دوسری نسل آئی تو ابلیس نے ان کے دل میں یہ خیال ڈالا کہ ان کے آباء ان تصویروں کی عبادت کرتے تھے اور اسی سبب سے ان پر بارش ہوتی تھی۔ سو انہوں نے ان تصویروں کی عبادت کرنی شروع کر دی اور امام ابن ابی حاتم نے عروہ بن الزبیر سے روایت کیا ہے کہ وہ 'غوث'، 'یعوق'، 'سواع' اور 'نسر' حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے اور 'ود' ان میں سے نیک تھے۔ (جامع البیان، ج ۲۹، ص ۱۲۲ مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام ابن ابی حاتم نے باقر سے روایت کیا ہے کہ وہ ایک نیک شخص تھا اور وہ اپنی قوم میں بہت محبوب تھا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو اس کی قوم کے لوگ باہل کی سرزمین میں اس کی قبر کے گرد بیٹھ کر روتے رہے۔ جب ابلیس نے ان کی آہ و بکا دیکھی تو وہ ایک انسان کی صورت میں متمثل ہو کر آیا اور کہنے لگا میں نے تمہارے رونے کو دیکھا ہے، تمہارا کیا خیال ہے میں تمہارے لیے ود کی ایک تصویر بنا دوں۔ تم اپنی مجالس میں اس تصویر کو دیکھ کر اسے یاد کیا کرو۔ انہوں نے اس سے اتفاق کیا۔ اس نے ود کی تصویر بنادی جس کو وہ اپنی مجلسوں میں رکھ کر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جب ابلیس نے یہ منظر دیکھا تو کہا میں تم میں سے ہر ایک کے گھر میں ود کا ایک مجسمہ (بت) بنا کر رکھ دوں تاکہ تم میں سے ہر شخص اپنے گھر میں ود کا ذکر کیا کرے انہوں نے اس کو مان لیا۔ پھر ہر گھر میں ود کا ایک بت بنا کر رکھ دیا۔ پھر ان کی اولاد بھی یہی کچھ کرنے لگی۔ پھر اس کے بعد جو نسلیں آئیں وہ یہ بھول گئیں کہ وہ ایک انسان تھا وہ اس کو خدا مان کر اس کی عبادت کرنے لگیں۔ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اس بت کی پرستش شروع کر دی سو اللہ کو چھوڑ کر جس بت کی سب سے پہلے پرستش شروع کی گئی وہ ود نام کا بت تھا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۱۰، ص ۶۱، ۲۳، ۲۵، ۳۳ مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت اور ان کا اول رسل ہونا

خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ بت جس کی وہ عبادت کرتے تھے اصل میں اللہ کا کوئی نیک بندہ تھا جس کی انہوں نے تصویر اور اس کا مجسمہ بنالیا تھا۔ امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت ام حبیبہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ انہوں نے حبشہ میں ایک گرجا دیکھا جس کا نام ماریہ تھا۔ انہوں نے اس کی خوبصورتی کا اور اس میں رکھی ہوئی تصاویر کا ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ جب ان میں کوئی نیک شخص مرجاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے اور اس میں یہ تصویریں رکھ دیتے تھے۔ یہ لوگ اللہ عزوجل کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث ۳۲۷، صحیح مسلم، المساجد: ۱۶، (۵۲۸) ۱۱۶۱، سنن نسائی، رقم الحدیث: ۷۰۳)

غرض یہ کہ جب زمین میں بت پرستی عام ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ اور اپنے رسول حضرت نوح علیہ السلام کو بھیجا۔ وہ لوگوں کو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کی دعوت دیتے تھے اور ان کو غیر اللہ کی عبادت سے منع کرتے تھے اور حضرت نوح زمین پر اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے رسول ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف بھیجا جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ کی حدیث شفاعت میں ہے۔ قیامت کے دن لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں

گے: ”اے نوح! آپ زمین والوں کی طرف سب سے پہلے رسول ہیں۔“ (الحدیث)

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۴۷۱۲، صحیح مسلم، الایمان: ۳۲۷، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۳۳۲، سنن کبریٰ للنسائی،

رقم الحدیث: ۱۱۲۸۶، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۳۰۷)

حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کا بیان

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو نو سو پچاس سال تبلیغ کی جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ
أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (العنکبوت: ۱۳)

سال کم ایک ہزار سال رہے۔

سورہ نوح میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی تبلیغ کرنے اور اس کے جواب میں ان کی قوم کے انکار کرنے اور ان سے مایوس ہونے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کا ان کے لیے عذاب کی دعا کرنے کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے:

بے شک ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ وہ اپنی قوم کو ڈرائیں اس سے پہلے کہ ان کے اوپر دردناک عذاب آ جائے۔ نوح نے کہا اے میری قوم! میں تمہیں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ تمہارے لیے تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور ایک مقرر وقت تک تم کو مہلت دے گا۔ بے شک جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آ جائے تو وہ موخر نہیں ہو تا کاش تم جانتے۔ نوح نے دعا کی اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات اور دن (حق کی) دعوت دی (لیکن) میری اس دعوت سے ان پر بھاگنے کے سوا اور کوئی اثر نہیں ہوا اور بے شک جب بھی میں نے ان کو بلایا کہ تو انہیں بخش دے تو انہوں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے اوپر اپنے کپڑے لپیٹ لیے اور ضد کی اور بہت تکبر کیا۔ میں نے پھر انہیں بلند آواز سے پکارا، پھر میں نے ظاہر اور خفیہ طریقہ سے (بھی) انہیں سمجھایا۔ میں نے کہا تم اپنے رب سے بخشش طلب کرو، بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر موسلا دھار بارش بھیجے گا۔ وہ مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کرے گا، وہ تمہارے لیے باغات اگائے گا اور تمہارے لیے دریا بہا دے گا۔ تمہیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی عظمت کو نہیں مانتے۔ حالانکہ اس نے تمہیں مرحلہ وار پیدا کیا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے سات آسمان ایک دوسرے کے اوپر بنائے۔ اور ان میں چاند کو روشن اور سورج کو چراغ بنایا۔ اور اللہ نے تمہیں ایک نوع کی روئیدگی سے اگایا۔ پھر تم کو وہ اس زمین میں لوٹائے گا اور (دوبارہ) تم کو نکالے گا۔ اور اللہ نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا۔ کہ تم اس کے کشادہ راستوں میں چلو۔ نوح نے دعا کی اے میرے رب! انہوں نے میری نافرمانی کی اور اس کی پیروی کی جس نے ان کے مال اور اولاد میں نقصان کے سوا اور کوئی زیادتی نہیں کی۔ اور انہوں نے بہت بڑا مکر کیا۔ اور ان کافروں نے کہا تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور وہ اور سواع اور یثوق اور نسر کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ اور یقیناً انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کر دیا اور اے میرے رب ظالموں کے لیے صرف گمراہی کو زیادہ کرنا۔ وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق کیے گئے پھر آگ میں ڈال دیے گئے تو انہوں نے اللہ کے مقابلہ میں کسی کو اپنا مددگار نہ پایا۔ اور نوح نے دعا کی اے میرے رب زمین پر کوئی بسنے والا کافر نہ چھوڑو۔ اگر تو نے انہیں چھوڑا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی اولاد بھی بدکار کافر ہی ہوگی۔ اے میرے رب! میری مغفرت فرما اور میرے ماں باپ کی مغفرت فرما اور جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوا اور تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کی مغفرت فرما اور ظالموں کے لیے صرف ہلاکت کو زیادہ فرما۔ (نوح: ۱-۲۸)

تبیان القرآن

جلد چہارم

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر طوفان کا عذاب

جب حضرت نوح علیہ السلام کی اس طویل عرصہ تک تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہو اور چند نفوس کے سوا کوئی مسلمان نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے ان کو کشتی بنانے کا حکم دیا اور انہیں یہ خبر دی کہ قوم نوح پر طوفان کا عذاب آئے گا اور حضرت نوح علیہ السلام اور دیگر ایمان والوں کو کشتی کے ذریعے اس طوفان سے بچالیا جائے گا۔ اس کا بیان سورہ ہود کی چند آیات میں ہے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے:

انہوں نے کہا اے نوح! بے شک تم ہم سے بحث کرتے رہے ہو اور تم ہم سے بہت زیادہ بحث کر چکے ہو، پس اگر تم سچے ہو تو ہمارے پاس اس عذاب کو لے آؤ جس سے تم ہم کو ڈراتے رہے ہو (حضرت) نوح نے کہا: اگر اللہ چاہے گا تو وہی تمہارے پاس اس عذاب کو لائے گا اور تم (اسے) عاجز کرنے والے نہیں ہو (اور اگر اللہ نے تمہیں گمراہی پر برقرار رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے تو اگر میں تمہاری خیر خواہی کا ارادہ کر بھی لوں تب بھی میری خیر خواہی تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، وہ تمہارا رب ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے (کیا وہ) (مشرکین مکہ) یہ کہتے ہیں کہ اس کلام کو خود انہوں نے گھڑ لیا ہے۔ آپ کہئے اگر (بالفرض) میں نے اس کلام کو گھڑ لیا ہے تو میرا گناہ مجھ پر ہو گا اور میں تمہارے گناہوں سے بری ہوں (اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ آپ کی قوم میں سے صرف وہی لوگ صاحب ایمان ہوں گے جو پہلے ہی ایمان لائے ہیں تو آپ ان کے کرتوتوں سے غم نہ کریں) اور آپ ہماری وحی کے مطابق ہماری آنکھوں کے سامنے کشتی بنائیے اور جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کی مجھ سے آپ کوئی سفارش نہ کریں وہ ضرور غرق کیے جائیں گے (اور نوح کشتی بنا رہے تھے اور جب بھی ان کی قوم کے (کافر) سردار ان کے پاس سے گزرتے تو ان کا مذاق اڑاتے، نوح نے کہا: اگر تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو تو عنقریب ہم بھی تمہاری ہنسی اڑائیں گے جیسا کہ تم ہماری ہنسی اڑا رہے ہو (پس عنقریب تم جان لو گے کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو رسوا کرے گا اور کس پر دائمی عذاب آتا ہے) حتیٰ کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور تورجوش مارنے لگا تو ہم نے کہا: (اے نوح!) ہر قسم سے ایک جوڑا، دو عدد (نرا ارادہ) اس کشتی میں سوار کر لو اور اپنے اہل کو (بھی) ماسوا ان کے جن کے متعلق غرقالی کا قول واقع ہو چکا ہے اور ایمان والوں کو (بھی) سوار کر لو اور جو ان پر ایمان لائے تھے وہ بہت ہی کم تھے (اور نوح نے کہا اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے، بے شک میرا رب ضرور بخشنے والا، بہت رحم فرمانے والا ہے) وہ کشتی ان کو پہاڑوں جیسی موجوں کے درمیان سے لے جا رہی تھی اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا جو ان سے الگ تھا، اے میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھ نہ رہو (اس نے کہا: میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں جو مجھے پانی سے بچالے گا، نوح نے کہا: آج کے دن اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں ہے مگر وہی بچے گا جس پر اللہ رحم فرمائے گا اور ان کے درمیان ایک موج حائل ہو گئی تو وہ ڈوبنے والوں میں سے ہو گیا (اور حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی نکل لے اور اے آسمان رک جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام پورا کر دیا گیا اور کشتی جو دی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور کہا گیا کہ ظالم لوگوں کے لیے دوری ہے) اور نوح نے اپنے رب کو پکار کر عرض کیا: اے میرے رب! بے شک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور یقیناً تیرا وعدہ سچا ہے اور تو تمام حاکموں سے بڑا حاکم ہے (فرمایا اے نوح! بے شک وہ آپ کے اہل سے نہیں ہے یقیناً اس کے کام نیک نہیں ہیں، آپ مجھ سے وہ چیز نہ مانگیں جس کا آپ کو علم نہیں، میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیں) نوح نے کہا: اے میرے رب! میں اس بات سے تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں تجھ سے ایسی چیز کا سوال کروں جس کا مجھے علم نہیں اور اگر تو نے میری مغفرت نہ کی اور مجھ پر رحم نہ فرمایا تو میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤں گا (فرمایا گیا: اے نوح کشتی سے اترو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ تم پر اور ان جماعتوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں اور کچھ جماعتیں ایسی ہیں جن کو ہم (عارضی) فائدہ پہنچائیں گے پھر انہیں ہماری طرف سے درد

ناک عذاب پہنچے گا (ہود: ۳۸-۳۲)
طوفان نوح اور کشتی کی بعض تفصیل

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں کتنے آدمی تھے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ اسی نفر تھے۔ ان کے ساتھ ان کی عورتیں بھی تھیں۔ اور کعب احبار سے روایت ہے کہ یہ بہتر (۷۲) نفس تھے۔ حضرت نوح کی بیوی جو ان کی کل اولاد حام، سام، یافث اور یام کی ماں تھیں، اور یام کو اہل کتاب کنعان کہتے ہیں اور یہی غرق ہو گیا تھا حضرت نوح کی بیوی بھی غرق ہونے والوں کے ساتھ غرق ہو گئی تھی کیونکہ وہ کافرہ تھی۔

مفسرین کی ایک جماعت نے بیان کیا ہے کہ یہ طوفان زمین کے پہاڑوں سے پندرہ ذراع (ساڑھے بائیس فٹ) تک بلند ہو گیا تھا اور یہ طوفان تمام روئے زمین پر آیا تھا۔ زمین کے تمام طول و عرض میں، نرم اور سخت زمین میں، پہاڑوں میں، میدانوں میں اور ریگستانوں میں۔ غرض روئے زمین پر کوئی جگہ ایسی نہیں بچی تھی جہاں پر یہ طوفان نہ آیا ہو۔

قنادہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے متبعین دس رجب کو کشتی میں سوار ہوئے تھے وہ ایک سو پچاس دن تک سفر کرتے رہے اور دس محرم کو وہ کشتی سے باہر آئے اور اس دن انہوں نے روزہ رکھا۔ امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ کا یہود کے پاس سے گزر ہوا انہوں نے دس محرم کو روزہ رکھا ہوا تھا۔ آپ نے پوچھا یہ کیسا روزہ ہے؟ انہوں نے کہا اس دن اللہ نے حضرت موسیٰ اور بنو اسرائیل کو غرق سے نجات دی تھی اور اسی دن جو دی پر کشتی ٹھہری تھی تو حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے روزہ رکھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا حضرت موسیٰ اور اس روزے کے تمہاری بہ نسبت ہم زیادہ حقدار ہیں۔

امام ابن اسحاق نے کہا کہ اہل کتاب نے ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح سے فرمایا: تم لوگ کشتی سے اترو اور ان تمام جانوروں کو اتارو جو تمہارے ساتھ ہیں۔ بعض جاہل فارسیوں نے اور اہل ہند نے وقوع طوفان کا انکار کیا اور بعض نے اقرار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طوفان ارض بابل (عراق) میں آیا تھا یہ بے دین مجوسیوں کا قول ہے ورنہ تمام اہل ادیان کا اس پر اتفاق ہے اور تمام رسولوں سے منقول ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ طوفان آیا تھا اور یہ تمام روئے زمین پر چھا گیا تھا۔
حضرت نوح علیہ السلام کی عمر

اہل کتاب کا قول یہ ہے کہ جس وقت حضرت نوح علیہ السلام کشتی میں سوار ہوئے تھے اس وقت ان کی عمر چھ سو سال تھی اور حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ اس کے بعد تین سو پچاس سال زندہ رہے لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ قرآن مجید میں یہ تصریح ہے کہ وہ بعثت کے بعد اپنی قوم میں نو سو پچاس سال تک رہے۔ پھر اس کے بعد ان ظالموں پر طوفان آیا۔ پھر اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ طوفان آنے کے بعد کتنا عرصہ زندہ رہے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ چار سو اسی سال کی عمر میں ان کی بعثت ہوئی اور طوفان کے بعد وہ ساڑھے تین سو سال زندہ رہے اس حساب سے ان کی عمر ایک ہزار سات سو اسی سال ہے۔

امام ابن جریر، امام ازرقی اور دیگر مورخین نے کہا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قبر مسجد حرام میں ہے اور یہ قوی قول ہے۔ (البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۱۸۳-۱۰۰، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

بعض محققین نے لکھا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اس علاقہ میں رہتی تھی جو آج دنیا میں عراق کے نام سے مشہور ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں ہے اور جو روایات کردستان اور آرمینیا میں زمانہ قدیم سے تواتر کے ساتھ منقول ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔

قصہ نوح نازل کرنے کے فوائد

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ وہ آسمان سے بارش نازل فرما کر مردہ زمین کو زندہ فرماتا ہے اور اس آسمانی بارش کی وجہ سے زمین میں روئیدگی ہوتی ہے جو انسانوں کی مادی حیات کا سبب ہے۔ اور اب اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کا ذکر ہے جو سب سے پہلے رسول ہیں جن کو انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا اور رسولوں کا بھیجنا انسانوں کی روحانی حیات کا سبب ہے اور جس طرح مادی حیات انسانوں کے لیے نعمت ہے اسی طرح روحانی حیات بھی انسانوں کے لیے نعمت ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ نازل کر کے حسب ذیل امور پر تنبیہ کی گئی ہے۔

۱- اس قصہ سے نبی ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ مشرکین مکہ جو آپ کے کھلے ہوئے معجزات اور روشن دلائل کو دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لاتے تو آپ اس سے ملول خاطر نہ ہوں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کائنات میں جب سب سے پہلے رسول آئے تو ان کے دلائل اور معجزات دیکھنے کے باوجود ان کی قوم ان پر ایمان نہیں لائی تھی اور ہمیشہ سے رسولوں کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے۔

۲- اس قصہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ منکرین کا انجام بالآخر عذاب الہی میں مبتلا ہونا ہے اور یہ دنیا میں ان کا حصہ ہے اور آخرت میں ان کو دائمی عذاب ہو گا اور مومنین کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بالآخر سرفرازی اور آخرت میں سرخروئی عطا فرماتا ہے۔

۳- اس قصہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ دنیا میں کافروں کو لمبے عرصہ تک ڈھیل دیتا ہے، لیکن بالآخر ان کو اچانک اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو کافر اس ڈھیل سے مغرور اور مومن اس سے ملول نہ ہوں۔

۴- یہ قصہ سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ آپ امی تھے آپ نے کسی استاذ کے سامنے زانوئے تلمذت کیا تھا نہ کسی کتاب کا مطالعہ کیا تھا اور جب آپ نے یہ قصہ ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا تو واضح ہو گیا کہ آپ اس قصہ پر صرف اللہ تعالیٰ کی وحی سے مطلع ہوئے تھے اور وحی صرف نبی پر ہوتی ہے اس سے ثابت ہوا کہ آپ کی نبوت برحق تھی۔

اللہ تعالیٰ کے مستحق عبادت ہونے پر دلیل

اس آیت میں تین چیزیں مذکور ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، مجھے تم پر عظیم دن کے عذاب کا خوف ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے پہلے اپنی قوم کو عبادت کا حکم دیا پھر اس کی دلیل ذکر فرمائی کہ وہی تمہاری عبادت کا مستحق ہے۔ اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے کیونکہ ان کو دنیا میں جو نعمتیں حاصل ہوئیں وہ سب اللہ نے عطا فرمائیں، ہر نعمت کو عطا فرمانے والا اور ہر مصیبت کو دور کرنے والا وہی ہے، اس کے سوا کوئی نہیں ہے تو پھر وہی عبادت کا مستحق ہے سو تم اسی کی عبادت کرو۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے محسن کی تعظیم اور تکریم کرتا ہے، اس کی تعریف کرتا ہے اور اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ سب سے بڑا اور حقیقی محسن اللہ تعالیٰ ہے تو پھر وہی عبادت کا مستحق ہے اور اسی کی عبادت کرنے کا حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا۔

اس کے بعد فرمایا: مجھے تم پر عظیم دن کے عذاب کا خوف ہے۔ اس خوف سے مراد یقین ہے یا ظن۔ اگر اس سے مراد یقین ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی ان پر عذاب نازل فرمائے گا اور آخرت میں بھی ان کو عذاب ہو گا۔ اور اگر خوف بمعنی ظن ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو غالب گمان تو یہ تھا کہ یہ منکرین اپنے انکار اور کفر پر ڈٹے رہیں گے اور لامحالہ ان پر عذاب آئے گا لیکن ایک مرجوح امکان یہ بھی تھا کہ یہ سب لوگ ایمان لے آئیں اور ان پر جو عذاب متوقع ہے وہ ٹل جائے۔ اس لیے فرمایا مجھے تم پر عذاب کا خوف ہے۔

اس عذاب سے مراد عذاب طوفان بھی ہو سکتا ہے اور عذاب قیامت بھی اور چونکہ نوح علیہ السلام نے عظیم دن کا عذاب فرمایا ہے تو اس سے بہ ظاہر قیامت کے دن کا عذاب مراد ہے۔ کیونکہ عظیم دن سے قیامت کا دن ہی متبادر ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: بے شک ہم آپ کو یقیناً کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں ○ انہوں نے کہا: اے میری قوم! مجھ میں کسی قسم کی گمراہی نہیں ہے لیکن میں رب العالمین کی جانب سے رسول ہوں ○ میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے ان باتوں کو جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے ○ (الاعراف: ۶۲-۶۰)

اہم اور مشکل الفاظ کے معانی

الملاء: مال دار اور معاشرہ میں بااثر لوگ جن کی لوگوں کے دلوں پر ہیبت چھائی رہتی تھی مجلس میں ان ہی کی طرف نگاہیں اٹھتی تھیں اور وہ محفل میں صدر نشین ہوتے تھے اور وہ نوح علیہ السلام سے مقابلہ اور مناظرہ کرتے تھے۔

فسی ضلال مبین: وہ نوح علیہ السلام سے کہتے تھے کہ آپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں۔ یعنی اللہ کی توحید، اپنی نبوت، احکام شرعیہ اور قیامت اور آخرت کے متعلق آپ جو کچھ کہتے ہیں، وہ خطا پر مبنی ہے اور غلط ہے۔

لیس بی ضلالہ: کفار نے حضرت نوح کی طرف کھلی گمراہی کے جس عیب کی نسبت کی تھی، اس کی حضرت نوح نے اپنی ذات سے نفی کی اور اپنی سب سے مکرم اور مشرف صفت کا بیان کیا اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے مخلوق کی طرف رسول اور پیغام رساں ہیں اور ان کو اپنے رب کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور ان کی خیر خواہی کرتے ہیں۔ تبلیغ رسالت یعنی پیغام پہنچانے کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جن چیزوں کا مکلف کیا ہے، یعنی اوامر اور نواہی، ان کا بیان کرتے ہیں، ان کے لیے کیا کام کرنا ضروری ہیں اور کن کاموں کا نہ کرنا ضروری ہے اور یہ کہ کن کاموں پر دنیا میں ان کی مذمت ہوگی اور آخرت میں عذاب ہوگا اور کن کاموں پر ان کی دنیا میں تحسین ہوگی اور آخرت میں ثواب ہوگا۔ یہ وہ پیغامات ہیں جن کو وہ اپنے رب کی طرف سے پہنچاتے تھے، اور نصیحت اور خیر خواہی کا معنی یہ ہے کہ ان کو ایمان اور اعمال صالحہ کی تلقین اور ترغیب دیتے تھے اور کفر اور معصیت سے روکتے تھے اور ان کو عذاب الہی سے ڈراتے تھے۔

پھر فرمایا: میں اللہ کی طرف سے ان باتوں کو جانتا ہوں جن کو تم نہیں جانتے۔ یعنی میں جانتا ہوں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کی تو وہ تم کو طوفان کے عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ نیز میں جانتا ہوں کہ وہ آخرت میں تم کو ایسے سخت اور دردناک عذاب میں مبتلا کرے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے اور اس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں اللہ کی توحید اور صفات کو جانتا ہوں جس کو تم نہیں جانتے اور اس کا مقصد ان علوم کے حصول کی ترغیب دینا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا تمہیں اس پر تعجب ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد کے ذریعہ ایک نصیحت آئی ہے تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تم متقی ہو جاؤ اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے ○ تو انہوں نے ان کی تکذیب کی پس ہم نے ان کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے (ان سب کو) نجات دے دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا، بے شک وہ اندھے لوگ تھے ○ (الاعراف: ۶۳-۶۲)

حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت پر قوم نوح کے استبعاد اور تعجب کی وجوہات

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اپنی جنس میں سے ایک انسان کے رسول بنانے کو مستبعد خیال کرتی تھی اور اس پر تعجب کرتی تھی۔ ان کے اس استبعاد اور تعجب کی حسب ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں:

۱۔ رسول بھیجنے کا مقصد چند احکام کا مکلف کرنا ہے اور اس تکلیف سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ نفع اور ضرر سے پاک ہے اور نہ بندہ کو اس سے کوئی فائدہ ہے کیونکہ ان احکام کی وجہ سے وہ اس دنیا میں مشقت میں مبتلا ہوتا ہے اور ان احکام پر عمل کرنے کی وجہ سے آخرت میں ثواب کا حصول متوقع ہے۔ تو اللہ تعالیٰ ان احکام کا مکلف کیے بغیر بھی اس ثواب کو پہنچانے پر قادر ہے تو پھر ان احکام کا مکلف کرنا عبث ہو گا اور اللہ تعالیٰ عبث کام سے پاک ہے لہذا کسی رسول کی بعثت باطل ہو گئی۔ کیونکہ رسول صرف احکام پہنچانے کے لیے مبعوث کیا جاتا ہے۔

۲۔ اگر احکام کے مکلف کیے جانے کو مان بھی لیا جائے تو تب بھی رسول کا بھیجنا غیر ضروری ہے کیونکہ رسول اچھے کاموں کا حکم دے گا اور برے کاموں سے روکے گا اور اچھائی اور برائی کے ادراک کے لیے عقل کافی ہے جو جو کام عقل کے نزدیک اچھا ہو گا اس کو ہم کریں گے اور جو برا ہو گا اس کو ترک کر دیں گے پھر کسی رسول کو بھیجنے کی کیا ضرورت ہے!

۳۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ رسول کا بھیجنا ضروری ہے تو پھر کسی فرشتے کو بھیجنا چاہیے، کیونکہ ان کی اہمیت زیادہ سخت ہو گی اور ان کی پاکیزگی زیادہ اکمل ہو گی، ان کا کھانے پینے سے مستغنی ہونا معلوم ہے اور ان کا گناہوں سے معصوم ہونا اور جھوٹ سے دور ہونا متحقق ہے۔

۴۔ اور اگر یہ مان لیا جائے کہ کسی بشر کو رسول بنایا جائے تو اس بشر کو رسول بنانا چاہیے جو معاشرہ میں اپنی دولت اور حکومت کی وجہ سے معزز ہو جس کی لوگوں کے دلوں میں عزت ہو اور اس کا رعب اور دبدبہ ہو، جبکہ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس مال تھا نہ حکومت۔

ان وجوہات کی بناء پر حضرت نوح علیہ السلام کے دعویٰ نبوت اور رسالت پر ان کی قوم کو تعجب ہوتا تھا اور وہ ان کے رسول ہونے کو مستبعد گردانتے تھے۔ اور جن باتوں کو حضرت نوح وحی کہتے تھے، وہ ان کو حضرت نوح کے دماغ کی خرابی (العیاذ باللہ) خیال کرتے تھے اس لیے کہتے تھے کہ تم کھلی گمراہی میں ہو۔

قوم نوح کے استبعاد اور تعجب کا ازالہ

حضرت نوح علیہ السلام نے ان کے اس تعجب اور انکار کو زائل کیا بایں طور کہ اللہ کو کسی کی نیکی سے فائدہ اور کسی کی برائی سے کوئی نقصان نہیں لیکن اللہ نے ان لوگوں کو سخت احکام کا مکلف کیا تاکہ اس کے حکم پر عمل کرنے والوں کو ثواب اور نافرمانی کرنے والوں کو عذاب ہو اور اس سے اس کا فضل اور عدل ظاہر ہو گا۔ وہ رحیم و کریم بھی ہے اور قہر و غضب کرنے والا بھی ہے اور ان احکام کی تکلیف اور رسولوں کی بعثت سے اس کی ان صفات کا ظہور ہو گا۔ عقل تمام احکام کے حسن اور قبح کا ادراک نہیں کر سکتی اور عقل یہ معلوم نہیں کر سکتی کہ اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر کس طرح ادا کیا جائے، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی کے اوقات اور طریقوں کو محض عقل سے نہیں جانا جاسکتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اللہ اپنا کوئی رسول بھیجے جو بندوں کو یہ بتائے کہ اللہ کس فعل سے راضی اور کس فعل سے ناراض ہوتا ہے اور اگر اللہ فرشتہ کو رسول بنا دیتا تو لوگ اس سے کیسے استفادہ کرتے! وہ اس کو دیکھ سکتے تھے نہ اس کا کلام سن سکتے تھے اور چونکہ فرشتہ اور انسان الگ الگ جنس سے ہیں تو فرشتہ کے افعال انسانوں کے لیے نمونہ اور حجت نہ ہوتے اور رہا یہ کہ اللہ نے کسی تو نگر اور حاکم کو رسول نہیں بنایا بلکہ ایک نادار شخص کو رسول بنایا تو اس میں اللہ کی حکمتیں ہیں کیونکہ جو شخص معاشرہ میں ذی اقتدار ہو لوگ اسے رسول تو کیا خدا بھی مان لیتے ہیں۔ جیسے فرعون اور نمرود کو لوگوں نے خدا مان لیا تھا۔ اللہ یہ چاہتا تھا کہ لوگ دولت اور حکومت کی طاقت کی بناء پر اس کی وحدانیت کو نہ مانیں بلکہ علم اور حکمت کی بناء پر اور دلائل اور معجزات کی قوت سے اللہ کی وحدانیت کو مانیں۔ اس لیے اس نے ایک انسان کو

رسالت کے لیے منتخب کیا اور اس میں یہ قوت اور صلاحیت رکھی کہ وہ اللہ سے وحی حاصل کر سکے اور مخلوق کو پہنچا سکے۔ اس کا غیب اور شہادت دونوں سے رابطہ ہو وہ بذریعہ وحی اللہ کے عذاب پر مطلع ہو کر لوگوں کو اس سے ڈرائے اور ان کو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے کی ترغیب دے تاکہ ان پر رحم کیا جائے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو طوفان سے نجات دے دی اور منکرین اور مکذبین کو غرق کر دیا کیونکہ ان کے دل توحید، نبوت، احکام شرعیہ اور آخرت کو ماننے سے اندھے بن گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَهَلْ أَبْصَرْتُمْ
فَلْيَنْفِسْهُ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا (الانعام: ۱۰۳)

بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ہدایات کی روشن نشانیاں آگئیں تو جس نے (ان کو) آنکھیں کھول کر دیکھ لیا تو اس میں اسی کا فائدہ ہے اور جو اندھا بنا رہا تو اس میں اسی کا نقصان ہے۔

وَالِی عَادِ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يُقَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ

اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی (ہم قبیلہ) ہود کو بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا

إِلَهِ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿۶۵﴾ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ

تمہاری عبادت کا کوئی ستمی نہیں ہے تو کیا تم نہیں ڈرتے ○ ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا، بے شک ہم آپ کو

إِنَّا لَنُرِيكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنُظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿۶۶﴾ قَالَ

حماقت میں مبتلا پاتے ہیں اور بیشک ہم آپ کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں ○ انہوں نے کہا

يَقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۶۷﴾

اے میری قوم! مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے لیکن میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں ○

أَبْلَغَكُمْ رِسَالَتِي وَإِنَّا لَكُم نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿۶۸﴾ أَوْ عَجِبْتُمْ أَنْ

میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا قابل اعتماد خیر خواہ ہوں ○ کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ

جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَلَى رَجُلٍ مِنْكُمْ لِيُنذِرَكُمْ وَأَذْكُرُوا

تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد کے ذریعہ ایک نصیحت آئی ہے تاکہ وہ تمہیں ڈرائے، اور یاد کرو

إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ

جب قوم نوح کے بعد اللہ نے تم کو ان کا جانشین بنا دیا اور تمہاری جسامت کو بڑھا دیا، سو

بَصُطَةً فَاذْكُرُوا الْإِلَهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا اجْتَنِبْنَا

تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو ○ انہوں نے کہا کیا آپ ہمارے پاس

لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَاتَّبِعْنَاكَ

اس لیے آئے ہیں کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ان (معبودوں) کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے، سو آپ ہمارے

إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۷۰﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ

پاس وہ (عذاب) لے آئیں جس کا آپ ہم سے وعدہ کرتے رہے ہیں اگر آپ سچوں میں سے ہیں ○ (ہو د نے) کہا یقیناً تمہارے رب کی طرف سے

رِجْسٌ وَغَضَبٌ أَتَّجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءِ سَيِّئَاتِهِمَا أَنْتُمْ وَ

تم پر عذاب اور غضب نازل ہو گیا، کیا تم مجھ سے ان ناموں کے متعلق جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ

أَبَاؤَكُمْ مَا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ط فَاَنْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ

لیے ہیں، جن کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی، سو تم (عذاب کا) انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ

مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ﴿۷۱﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَطَعْنَا

انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ○ پس ہم نے ہود کو اور ان کے اصحاب کو اپنی رحمت سے نجات دی اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ

دَابِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَمَا كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿۷۲﴾

دی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان دلے نہ تھے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی (ہم قبیلہ) ہود کو بھیجا انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ

کی عبادت کرو اس کے سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے تو کیا تم نہیں ڈرتے ○

حضرت ہود علیہ السلام کا شجرہ نسب

حضرت ہود علیہ السلام کا شجرہ نسب یہ ہے:

ہود بن عبد اللہ بن رباح بن الجارود بن عاد بن عوض بن ارم بن سام بن نوح نبی اللہ علیہ السلام۔

ایک قول یہ ہے کہ ہود علیہ السلام نے جامع دمشق میں ایک باغ بنایا تھا اور ان کی قبر وہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی

قبر مکہ میں ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ ان کی قبر یمن میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو سب سے پہلے نبی مبعوث کیا وہ ادریس علیہ السلام ہیں۔ (یہ حافظ ابن عساکر کی تحقیق ہے۔) ہود کے

نزدیک حضرت نوح علیہ السلام اول رسل ہیں) پھر حضرت نوح، پھر حضرت ابراہیم، پھر حضرت اسماعیل، پھر حضرت اسحاق، پھر

حلد جہارم

تبیان القرآن

حضرت یعقوب، پھر حضرت یوسف، پھر حضرت لوط، پھر حضرت ہود بن عبد اللہ علیہم السلام۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا دس نبیوں کے علاوہ باقی تمام انبیاء بنو اسرائیل سے مبعوث ہوئے ہیں۔ وہ دس نبی یہ ہیں:

حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت لوط، حضرت صالح، حضرت شعیب، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق،
حضرت یعقوب، حضرت عیسیٰ اور حضرت سیدنا محمد ﷺ (یہ گیارہ بنتے ہیں)
حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد کی طرف بعثت

حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد تھی یہ لوگ بت پرست تھے۔ انہوں نے بھی ود، سواع، سخوت اور نسر کی طرح بت بنا لیے تھے ان کے ایک بت کا نام ہبار تھا اور ایک بت کا نام سمود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت ہود کو بھیجا، حضرت ہود کا تعلق اس قبیلہ سے تھا جس کا نام الحلود تھا۔ حضرت ہود متوسط نسب کے تھے اور مکرم جگہ کے رہنے والے تھے بہت حسین و جمیل تھے اور عاد کی طرح جسم تھے۔ اور آپ کی داڑھی بہت دراز تھی۔ حضرت ہود نے ان لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دی اور ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اللہ کو ایک مانیں اور لوگوں پر ظلم نہ کریں۔ اس کے علاوہ انہیں اور کوئی حکم نہیں دیا اور انہیں نماز یا کسی اور حکم شرعی کی دعوت نہیں دی، لیکن انہوں نے اللہ کو ماننے سے انکار کیا اور حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب کی اور انہوں نے کہا: ہم سے زیادہ طاقت ور کون ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے عاد کے بھائی کی طرف ہود کو بھیجا اور حضرت ہود ان کی قوم کے ایک فرد تھے اور ان کے دینی بھائی نہ تھے۔ (مختصر تاریخ دمشق، ج ۲، ص ۱۳۹-۱۴۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۱ھ)

حضرت ہود نے کہا: یاد کرو تم قوم نوح کے جانشین ہو اور تم کو معلوم ہے جب انہوں نے نافرمانی کی تو ان پر کس طرح عذاب آیا تھا تم اس سے عبرت کیوں نہیں پکڑتے۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد سورتوں میں قوم عاد کی تفصیل بیان کی ہے ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر حسب ذیل ہے:

عاد کی قوت اور سطوت اور ان پر عذاب نازل ہونے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

اور یاد کیجئے عاد کے بھائی (ہم قبیلہ) کو جب انہوں نے اپنی قوم کو "الاحقاف" میں ڈرایا اور ان سے پہلے کئی ڈرانے والے پیغمبر گزر چکے تھے کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو مجھے تم پر ایک عظیم دن کے عذاب کا خوف ہے۔ (الاحقاف: ۲۱)

یمامہ، عمان، بحرین، حضرموت اور مغربی یمن کے بیچ میں جو صحرائے اعظم "الدنا" یا "الربع الخالی" کے نام سے واقع ہے وہ الاحقاف ہے یہ بہت بڑا ریگستان ہے۔ ہرچند کہ یہ آبادی کے قابل نہیں ہے لیکن اس کے اطراف میں کہیں کہیں آبادی کے لائق تھوڑی زمین ہے۔ خصوصاً اس حصہ میں جو حضرموت سے نجران تک پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی وہ آباد نہیں ہے تاہم زمانہ قدیم میں اسی حضرموت اور نجران کے درمیانی حصہ میں "عاد ارم" کا مشہور قبیلہ آباد تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کی نافرمانی کی پاداش میں نیست و نابود کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (قوم عاد نے) کہا کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دو، تو تم وہ (عذاب) ہم پر لے آؤ جس کا تم ہم سے وعدہ کر رہے ہو، اگر تم بچوں میں سے ہو، ہود نے فرمایا: علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تمہیں وہی پیغام پہنچاتا ہوں جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں، لیکن میں گمان کرتا ہوں کہ تم جاہل لوگ ہو، پھر جب انہوں نے اس (عذاب) کو بادل کی طرح اپنے میدانوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے یہ بادل ہے جو ہم پر برسے گا، (نہیں) بلکہ یہ وہ عذاب ہے جس کو تم نے جلدی طلب کیا ہے یہ ایک (سخت) آندھی ہے جس میں دردناک عذاب ہے، یہ ہر چیز کو اپنے رب

کے حکم سے برباد کر ڈالے گی، پھر انہوں نے اس حلق میں صبح کی کہ ان کے گھروں کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی ہم مجرموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں ○ اور بے شک ہم نے انہیں ان چیزوں پر قدرت دی تھی جن پر تمہیں قدرت نہیں دی اور ہم نے ان کے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو ان کے کان اور آنکھیں اور دل ان کے کچھ کام نہ آسکے کیونکہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور ان کو اس عذاب نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ (الاحقاف: ۲۶-۲۴)

جس وقت ان پر عذاب آیا اس وقت قحط اور خشک سالی تھی جب انہوں نے امنڈتا ہوا بادل دیکھا تو خوش ہو کر کہنے لگے بہت برسنے والی گھٹا آئی ہے اب سب ندی نالے بھر جائیں گے اور خوش حالی آجائے گی لیکن یہ بڑے زور کی آندھی تھی جو سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی اور اس کے زور کے سامنے آدمی، درخت اور جانور تنکوں کی مانند تھے۔ یہ آندھی ہر چیز کو اکھاڑ کر پھینک رہی تھی اور ہر چیز تباہ کر رہی تھی اور سوائے مکانوں کے کھنڈرات کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (حضرت ہود نے اپنی قوم سے کہا) کیا تم ہر اونچے مقام پر فضول کاموں کے لیے یادگار تعمیر کرتے ہو ○ اور اس امید پر بلند و بالا عمارت بناتے ہو کہ تم ان میں ہمیشہ رہو گے ○ اور جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو سخت جابروں کی طرح پکڑتے ہو ○ سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ○ اور اس سے ڈرو جس نے تمہاری ان چیزوں سے مدد کی جن کو تم جانتے ہو ○ اس نے تمہاری چوپایوں اور بیٹوں سے مدد کی ○ اور باغوں اور چشموں سے ○ بے شک مجھے تم پر عظیم دن کے عذاب کا خوف ہے ○ انہوں نے کہا ہمارے لیے برابر ہے آپ نصیحت کریں یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ ہوں ○ یہ صرف وہی پرانے لوگوں کی عادت ہے ○ اور ہم عذاب یافتہ نہیں ہوں گے ○ سو انہوں نے ہود کو جھٹلایا تو ہم نے ان کو ہلاک کر دیا ○ بے شک اس میں ضرور نشانی ہے اور ان کے اکثر لوگ مومن نہ تھے ○ اور بے شک آپ کا رب ہی ضرور غالب ہے ○ بے حد رحم فرمانے والا ○ (الشعراء: ۱۳۰-۱۳۸)

نیز فرمایا: کیا آپ نے نہ دیکھا کہ آپ کے رب نے قوم عاد کے ساتھ کیا معاملہ کیا ○ ارم (کے لوگ) ستونوں (کی طرح لے) قد والے ○ جن کی مثل شہروں میں کوئی پیدا نہ کیا گیا تھا ○ (الفرج: ۸-۶)

نیز فرمایا: رہی قوم عاد تو اس نے زمین میں ناحق سرکشی کی اور کہا ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے؟ کیا انہوں نے یہ نہیں جانا کہ اللہ جس نے ان کو پیدا کیا ہے وہ ان سے زیادہ قوت والا ہے اور وہ ہماری آیتوں کا انکار (ہی) کرتے رہے ○ سو ہم نے (ان کی) نحوست کے دنوں میں ان پر خوفناک آواز والی آندھی بھیجی تاکہ ہم انہیں دنیا کی زندگی میں ذلت والا عذاب چکھائیں اور آخرت کا عذاب تو یقیناً زیادہ ذلت والا ہے اور ان کی بالکل مدد نہیں کی جائے گی۔ (حم السجدہ: ۱۶-۱۵)

نیز فرمایا: بے شک ہم نے ان پر نہایت سخت تیز آواز والی آندھی بھیجی (ان کے حق میں) دائمی نحوست کے دن میں ○ وہ آندھی لوگوں کو (اس طرح) اٹھا کر (زمین پر) دے مارتی تھی گویا کہ وہ کھجور کے اکھڑے ہوئے درختوں کی جڑیں ہیں ○ تو کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا خوف دلانا ○ (القمر: ۲۱-۱۹)

نیز فرمایا: اور رہے قوم عاد کے لوگ تو وہ ایک سخت گرجتی ہوئی نہایت تیز آندھی سے ہلاک کیے گئے ○ اللہ نے اس آندھی کو ان پر سات راتوں اور آٹھ دنوں تک متواتر مسلط کر دیا تھا وہ آندھی جڑ کاٹنے والی تھی، سو (اے مخاطب اگر) تو اس وقت وہاں موجود ہوتا تو اس قوم کو اس طرح گرا ہوا دیکھتا کہ گویا وہ گری ہوئی کھجوروں کے تنے (پڑے) ہیں ○ سو کیا تجھ کو ان میں کا کوئی بچا ہوا نظر آتا ہے ○ (الحاقہ: ۸-۶)

قوم عاد کے وطن کی تاریخی حیثیت

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ قوم عاد الاحقاف میں رہتی تھی۔ (الاحقاف: ۲۱)

علامہ محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری المتوفی ۱۱۷۷ھ لکھتے ہیں:

الاحقاف کا معنی ہے ریگستان، جو ہری نے کہا کہ الاحقاف عاد کا وطن ہے، ازہری نے کہا یہ یمن کے شہروں کا ریگستان ہے قوم عاد یہاں رہتی تھی۔ (لسان العرب، ج ۹، ص ۵۲، مطبوعہ نشر ادب الحوزة ایران، ۱۳۰۵ھ)

علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی حنفی متوفی ۱۳۰۵ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: الاحقاف ارض مہرہ اور عمان کے درمیان ایک وادی ہے۔ ابن اسحاق نے کہا: الاحقاف عمان سے لے کر حضرموت تک ایک وادی ہے۔ قنادر نے کہا: الاحقاف ارض یمن میں بلندی پر ایک ریگستان ہے۔ یاقوت حموی نے کہا ان تینوں اقوال میں اختلاف نہیں ہے۔

(تاج العروس، ج ۶، ص ۷۳، مطبوعہ مطبعہ الخیریہ، مصر، ۱۳۰۶ھ، معجم البلدان، ج ۱، ص ۱۱۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۹۹ھ)

علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری متوفی ۱۳۱۸ھ (رحمہ اللہ) لکھتے ہیں:

قرآن کریم میں احقاف سے مراد وہ ریگستان ہے جو عمان سے حضرموت تک پھیلا ہوا ہے، اس کا کل رقبہ تین لاکھ مربع میل بتایا جاتا ہے اسے الربع الخالی بھی کہتے ہیں۔ بعض مقالات پر ریت اتنی باریک ہے کہ جو چیز وہاں پہنچے، اندر دھنستی چلی جاتی ہے۔ بڑے بڑے مہم جو سیاح بھی اس کو عبور کرنے کی جرات نہیں کرتے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں کسی زمانہ میں اپنے عہد کی ایک طاقتور زبردست اور متمول قوم آباد تھی۔ (ضیاء القرآن ج ۳، ص ۳۹۰، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، ۱۳۹۹ھ)

سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

الاحقاف صحرائے عرب (الربع الخالی) کے جنوب مغربی حصہ کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عاد کا علاقہ عمان سے یمن تک پھیلا ہوا تھا۔ اور قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ ان کا اصل وطن الاحقاف تھا۔ جہاں سے نکل کر وہ گرد و پیش کے ممالک میں پھیلے اور کمزور قوموں پر چھا گئے۔ آج کے زمانہ تک بھی جنوبی عرب کے باشندوں میں یہی بات مشہور ہے کہ عاد اسی علاقہ میں آباد تھے۔ موجودہ شرمکلا سے تقریباً ۱۵۲ میل کے فاصلہ پر شمال کی جانب میں حضرموت میں ایک مقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہود کا مزار بنا رکھا ہے اور وہ قبر ہود کے نام سے ہی مشہور ہے۔ ہر سال پندرہ شعبان کو وہاں عرس ہوتا ہے اور عرب کے مختلف حصوں سے ہزاروں آدمی وہاں جمع ہوتے ہیں۔ یہ قبر اگرچہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے لیکن اس کا وہاں بنایا جانا اور جنوبی عرب کے لوگوں کا کثرت سے اس کی طرف رجوع کرنا کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ہے کہ مقامی روایات اسی علاقہ کو قوم عاد کا علاقہ قرار دیتی ہیں۔

الاحقاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شاندار تمدن رکھنے والی طاقتور قوم آباد ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہو گا اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگ زار بنا دیا ہو گا۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک لوق و دوق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۸۳۳ء میں یوریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارہ پر پہنچ گیا۔ وہ کہتا ہے کہ حضرموت کی شمالی سطح مرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فیٹ نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قطعے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ

بیان القرآن

ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدو اس علاقہ سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل سفوف کی طرح ہے۔ میں نے دور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ پانچ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا اور اس رسی کا سرا جل گیا جس کی ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔

مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ ہو Arabia And The Isles Harold Ingrams, London 1946.

(تفسیر القرآن، ج ۳، ص ۶۱۵، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، مارچ ۱۹۸۳ء)

صالحین کے عرس کی تحقیق

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اس اقتباس سے جہاں الاتحاف کی تاریخی حیثیت پر روشنی پڑتی ہے، وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ نبیوں اور مقدس اور برگزیدہ بندوں کا عرس منانا صرف اہل سنت بریلی مکتبہ فکر کی اختراع نہیں ہے بلکہ دنیا کے ہر خطہ میں مسلمان بزرگوں کا عرس مناتے ہیں۔ عرس کی معنوی اصل یہ ہے۔

امام محمد بن عمر الوائد متوفی ۲۰۷ھ بیان کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ ہر سال شہداء احد کی قبروں کی زیارت کرتے تھے، جب آپ گھائی میں داخل ہوتے تو بہ آواز بلند فرماتے: السلام علیکم۔ کیونکہ تم نے صبر کیا، پس آخرت کا گھر کیا ہی اچھا ہے! پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما ہر سال اسی طرح کرتے تھے۔ پھر حضرت عمر بن الخطاب ہر سال اسی طرح کرتے تھے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہما۔

(کتاب المغازی، ج ۱، ص ۳۱۳، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، ۱۴۰۲ھ، دلائل النبوة، ج ۳، ص ۳۰۸، مطبوعہ بیروت، شرح الصدور، ص ۲۱۰، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۰۲ھ، در مشور، ج ۳، ص ۵۶۸، مصنف عبدالرزاق، ۵۴۳/۲ (قدیم)۔ رقم الحدیث (جدید) ۶۷۴۵۔)

اور عرس کی لفظی اصل یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ قبر میں منکر نکیر آکر سوال کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص کے متعلق کیا کہا کرتے تھے اور جب مردہ یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور کلمہ شہادت پڑھتا ہے تو اس کی قبر وسیع اور منور کر دی جاتی ہے اور اس سے کہتے ہیں کہ اس عروس کی طرح سو جاؤ جس کو اس کے اہل میں سب سے زیادہ محبوب کے سوا کوئی بیدار نہیں کرتا۔ (الحدیث)

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۰۷۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

اس حدیث میں مومن کے لیے عروس کا لفظ وارد ہے اور عروس کا لفظ عرس سے ماخوذ ہے اور یہ عرس کی لفظی اصل ہے۔ عرس کی حقیقت یہ ہے کہ سال کے سال صالحین اور بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کی جائے۔ ان پر سلام پیش کیا جائے اور ان کی تعریف و توصیف کے کلمات کہے جائیں اور اتنی مقدار سنت ہے، اور قرآن شریف پڑھ کر اور صدقہ و خیرات کا انہیں ثواب پہنچانا یہ بھی دیگر احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور ان کے وسیلہ سے دعا کرنا اور ان سے اپنی حاجات میں اللہ سے دعا کرنے اور شفاعت کرنے کی درخواست کرنا اس کا ثبوت امام طبرانی کی اس حدیث سے ہے جس میں عثمان بن حنیف نے ایک شخص کو نبی ﷺ کے وسیلہ سے دعا کرنے اور آپ سے شفاعت کی درخواست کرنے کی ہدایت کی۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

(المعجم الصغیر، ج ۱، ص ۱۸۳-۱۸۴، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ، مدینہ منورہ، ۱۳۸۸ھ، حافظ منذری متوفی ۶۵۶ھ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔) (الترغیب والترہیب، ج ۱، ص ۴۶۰-۴۶۱، اور شیخ ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ فتاویٰ ابن تیمیہ، ج ۱، ص ۲۷۳-۲۷۴)

(ص ۲۷۳-۲۷۴)

اسی طرح امام ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑ گیا تو حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کی قبر مبارک پر حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! اپنی امت کے لیے بارش کی دعا کیجئے کیونکہ وہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ (الحدیث)

(المصنف، ج ۱۲، ص ۳۲، مطبوعہ کراچی، حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کے متعلق فرمایا کہ اس کی سند صحیح ہے، فتح الباری، ج ۲، ص ۳۹۶-۳۹۵، مطبوعہ لاہور)

ان تمام مباحث کی تفصیل کے لیے شرح صحیح سم جلد ۷ کا مطالعہ فرمائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر سال صالحین کے مزارات کی زیارت کے لیے جانا، ان کو سلام پیش کرنا اور ان کی تحسین کرنا نبی ﷺ اور خلفاء راشدین کی سنت ہے۔ اور ان کے لیے ایصالِ ثواب کرنا اور ان کے وسیلہ سے دعا کرنا اور ان سے شفاعت کی درخواست کرنا بھی صحابہ کرام کی سنت ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، اور ہمارے نزدیک عرس منانے کا یہی طریقہ ہے۔ باقی اب جو لوگوں نے اس میں اپنی طرف سے اضافات کر لیے ہیں، وہ بزرگان دین کی نذر اور منت مانتے ہیں اور ڈھول، باجوں گاجوں کے ساتھ جلوس کی شکل میں ناچتے گاتے ہوئے اوباش لڑکے چادر لے کر جاتے ہیں اور چادر چڑھانے کی بھی منت مانی جاتی ہے اور مزارات پر سجدے کرتے ہیں اور مزار کے قریب میلہ لگایا جاتا ہے اور مزامیر کے ساتھ گانا بجانا ہوتا ہے اور موسیقی کی ریکارڈنگ ہوتی ہے تو یہ تمام امور بدعتِ سینہ قبیحہ ہیں۔ علماء اہل سنت و جماعت ان سے بری اور بیزار ہیں۔ یہ صرف جملاء کا عمل ہے اور ہم اللہ تعالیٰ سے ان کی ہدایت کی دعا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: بے شک ہم آپ کو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں اور بے شک ہم آپ کو جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں ○ انہوں نے کہا: اے میری قوم مجھ میں کوئی حماقت نہیں ہے لیکن میں رب العظیم کی طرف سے رسول ہوں ○ میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا قابل اعتماد خیر خواہ ہوں ○ کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد کے ذریعہ ایک نصیحت آئی ہے تاکہ وہ تمہیں ڈرائے اور یاد کرو جب قوم نوح کے بعد اللہ نے تم کو ان کا جانشین بنا دیا اور تمہاری جسامت کو بڑھا دیا سو تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو ○ (الاعراف: ۶۹-۶۶)

حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ اور حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کے مابین فرق

حضرت ہود علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے تھے اس لیے حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ کو حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کے بعد ذکر فرمایا ہے اور اس قصہ میں مذکور ابتدائی آیات تقریباً ویسی ہی ہیں جیسی حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں ذکر کی گئی، البتہ بعض وجوہ سے ان میں فرق ہے:

۱- حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں عبادت کا حکم دینے کے بعد انہوں نے فرمایا تھا مجھے تم پر ایک عظیم دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔ (الاعراف: ۵۹) اور اس قصہ میں حضرت ہود نے عبادت کا حکم دینے کے بعد فرمایا: تو کیا تم نہیں ڈرتے! (الاعراف: ۶۵) اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام پہلے رسول تھے اور ان سے پہلے دنیا میں کسی بڑے عذاب کے نازل ہونے کا واقعہ پیش نہیں آیا تھا، اس لیے انہوں نے کہا: مجھے تم پر ایک عظیم دن کے عذاب کا خطرہ ہے، اور چونکہ حضرت ہود علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے تھے اور طوفانِ نوح کا واقعہ تو اتر سے مشہور ہو چکا تھا، اس لیے انہوں نے صرف اس کثرت پر اکتفا لیا تو پس کیا تم ڈرتے نہیں ہو!

۲- حضرت نوح علیہ السلام سے منکروں نے کہا تھا ہم آپ کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں (الاعراف: ۶۰) اور حضرت ہود علیہ السلام سے منکروں نے کہا ہم آپ کو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں اور ہم آپ کو جھوٹوں سے گمان کرتے ہیں۔ (الاعراف: ۶۶) اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام بہت بڑی کشتی بنا کر خود کو تھکا رہے تھے اور آپ نے لوگوں کو ایک بہت بڑے طوفان کی آمد سے خبردار کیا تھا اور چونکہ اس سے پہلے طوفان کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی تھی اس لیے منکرین نے کہا آپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں اور حضرت ہود علیہ السلام نے بتوں کی عبادت کو باطل قرار دیا تھا اور ان کی عبادت کو بے وقوفی فرمایا تھا اس لیے انہوں نے بھی مقابلتہ توحید کی دعوت دینے کو بے وقوفی کہا۔

۳- حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا تھا: میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: میں تمہارا قابل اعتماد خیر خواہ ہوں۔ (الاعراف: ۶۸) حضرت نوح علیہ السلام چونکہ دعوت کی بار بار تجدید کرتے تھے اس لیے انہوں نے جملہ فعلیہ استعمال فرمایا اور حضرت ہود علیہ السلام ثبوت اور استقرار کے ساتھ دعوت دیتے تھے اس لیے اس کو جملہ اسمیہ کے ساتھ تعبیر فرمایا۔ نیز حضرت ہود کی قوم نے ان کو جھوٹوں کی طرف منسوب کیا تھا اس لیے انہوں نے ان کا رد کرتے ہوئے فرمایا تم تو مجھے پہلے امین کہتے تھے اور میں تمہارے نزدیک معتمد تھا تو اب اچانک میں بے وقوف کیسے ہو گیا!

۴- حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں یہ فرمایا تھا: کیا تمہیں اس پر تعجب ہے کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے تم ہی میں سے ایک مرد کے ذریعہ نصیحت آئی ہے تاکہ وہ تم کو ڈرائے۔ (الاعراف: ۶۲) اور حضرت ہود علیہ السلام نے اس کے بعد یہ بھی فرمایا: اور یاد کرو جب قوم نوح کے بعد اللہ نے تم کو ان کا جانشین بنا دیا اور تمہاری جسامت کو بڑھا دیا سو تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ (الاعراف: ۶۹)

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم پر اللہ تعالیٰ کی دو نعمتوں کا ذکر فرمایا ایک تو یہ کہ انہیں حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ان کی زمین کا وارث بنایا اور دوسری یہ کہ ان کو قوم نوح سے زیادہ بڑی جسامت اور قوت عطا فرمائی۔ امام بغوی نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ان کی قامت اسی ذراع (ایک سو بیس فٹ) تھی۔ وہب نے کہا: ان میں سے ایک آدمی کا سر بڑے گنبد کی طرح تھا۔ (معالم التنزیل، ج ۲، ص ۱۳۲، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت) حضرت ہود نے فرمایا: ان نعمتوں کو یاد کرو یعنی ایسے عمل کرو جو ان نعمتوں کے لائق ہوں یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لاؤ اور اس کی نعمتوں کا شکر کرو۔

حضرت نوح اور ہود علیہما السلام کے مقابلہ میں سیدنا محمد ﷺ کی زیادہ عزت اور وجاہت حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے کہ جب منکروں نے حضرت نوح علیہ السلام کی طرف ایک عیب کی نسبت کی اور ان سے کہا کہ آپ کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں تو انہوں نے اس عیب سے خود اپنی براءت کی اور کہا: اے میری قوم مجھ میں گمراہی نہیں ہے (الاعراف: ۶۰) اور حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ میں مذکور ہے کہ جب منکروں نے ان سے کہا کہ ہم آپ کو حماقت میں مبتلا پاتے ہیں تو انہوں نے خود اپنی براءت کی اور کہا: اے میری قوم مجھ میں حماقت نہیں ہے۔

اور جب سیدنا محمد ﷺ کی طرف مشرکین نے عیوب کی نسبت کی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی براءت کے لیے نہیں چھوڑا بلکہ اللہ نے آپ کی طرف سے براءت بیان کی۔ ولید بن مغیرہ نے آپ کو مجنون کہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ما انتہ بنعمة ربك بمجنون وان لک
لاجرا غیر ممنون وانک لعلی خلق
عظیم (القلم: ۳-۲)

آپ اپنے رب کے فضل سے (ہرگز) مجنون نہیں ہیں ○
اور یقیناً آپ کے لیے غیر متناہی اجر و ثواب ہے ○ اور بے شک
آپ خلق عظیم پر فائز ہیں۔

عاص بن وائل نے آپ کو ابتر (مقطوع النسل) کہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّا أَعْطَيْنَكَ الْكَوْثَرَ ۖ فَصَلِّ لِرَبِّكَ ۖ
وَأَنْحَرْ ۖ إِنَّا شَانِيكَ ۖ هُوَ الْأَبْتَرُ ۖ (الكوثر: ۱-۳)

بے شک ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا فرمائی ۰ تو آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں اور قربانی کریں ۰ یقیناً آپ کا دشمن ہی ابتر (مقطوع النسل) ہے۔

جب اللہ نے اپنی کسی حکمت کی وجہ سے چند دن آپ پر وحی نازل نہیں کی تو ایک مشرک عورت نے کہا (سیدنا) محمد ﷺ کو ان کے رب نے چھوڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالضُّحَىٰ ۖ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىٰ ۖ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَاقَلَىٰ (الضحى ۱-۳)

چاشت کی قسم ۰ اور رات کی قسم جب سیاہی پھیل جائے ۰ آپ کے رب نے آپ کو نہیں چھوڑا اور نہ وہ آپ سے بیزار ہوا۔

جب رسول اللہ ﷺ نے سب لوگوں کو، کوہ صفا پر جمع کر کے دعوت توحید کی تو ابولہب نے کہا تبا لک تم پر تباہی ہو تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۖ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ
مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۖ سَيَصْلَىٰ نَارًا إِذْ أَتَىٰ لَهَبٌ ۖ
وَأَمْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۖ (اللب: ۱-۴)

ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ تباہ ہو گیا ۰ اس کو اس کے مال اور کمائی نے کوئی فائدہ نہ دیا ۰ وہ عنقریب سخت شعلوں والی آگ میں داخل ہو گا ۰ اور اس کی عورت (بھی) لکڑیوں کا گٹھا (سر) اٹھائے ہوئے ۰

رسول اللہ ﷺ کا مقام تو بہت بلند ہے آپ کے قرابت دار اور اصحاب بھی اللہ کو اتنے عزیز تھے کہ اگر کسی نے ان کو عیب لگایا تو اللہ تعالیٰ نے اس عیب سے ان کی براءت بیان کی، حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اللہ تعالیٰ نے سورہ نور کی دس آیتوں میں (النور: ۲۰-۱۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت بیان کی۔ اور جب منافقین نے صحابہ کرام کو سفہاء (جاہل، احمق) کہا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی براءت بیان کی۔ قرآن مجید میں ہے:

قَالُوا اتُّؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ
السُّفَهَاءُ وَلَكِنْ لَا يَعْلَمُونَ (البقرہ: ۱۳)

انہوں نے کہا: کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لائے ہیں سنو یقیناً وہی بے وقوف ہیں، لیکن وہ نہیں جانتے ۰

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انہوں نے کہا: کیا آپ ہمارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ان (معبودوں) کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے، سو آپ ہمارے پاس وہ (عذاب) لے آئیں جن کا آپ ہم سے وعدہ کرتے رہے ہیں، اگر آپ سچوں میں سے ہیں ۰ (ہود نے) کہا یقیناً تمہارے رب کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب نازل ہو گیا، کیا تم مجھ سے ان ناموں کے متعلق جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھے ہیں، جن کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی، سو تم عذاب کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں میں سے ہوں ۰ پس ہم نے ہود کو اور ان کے اصحاب کو عذاب سے نجات دی اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ایمان لانے والے نہ تھے ۰ (الاعراف: ۷۳-۷۰)

اللہ تعالیٰ کی توحید اور استحقاق عبادت پر دلیل حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو بت پرستی ترک کرنے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی دعوت دی، اور اس پر یہ

قوی دلیل قائم کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بہت زیادہ انعام کیے ہیں اور بہت عقل اس پر دلالت کرتی ہے کہ ان انعامات میں اور ان نعمتوں کے دینے میں ان بتوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اور عبادت انتہائی تعظیم کا نام ہے اور انتہائی تعظیم کا وہی مستحق ہے جس نے انتہائی نعمتیں عطا کی ہوں، اور جب انتہائی نعمتیں اللہ نے عطا کی ہیں تو وہی عبادت کا مستحق ہے اور بت اس کے لائق اور سزاوار نہیں ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے۔

حضرت ہود علیہ السلام کی اس قوی اور قطعی دلیل کا ان کی قوم سے کوئی جواب نہیں بن پڑا اور انہوں نے جان چھڑانے کے لیے اپنے باپ دادا کی تقلید کا سہارا لیا اور کہا کیا آپ ہمارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں اور ان کی عبادت چھوڑ دیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے سو آپ ہمارے پاس وہ (عذاب) لے آئیں جس کا آپ ہم سے وعدہ کرتے رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام سے یہ نقل کیا کہ انہوں نے کہا: یقیناً تمہارے رب کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب نازل ہو گیا۔ اس پر یہ اعتراض ہے کہ اس وقت تک تو عذاب نازل نہیں ہوا تھا، پھر حضرت ہود علیہ السلام نے کیسے فرمایا کہ تم پر عذاب نازل ہو گیا اس کا جواب یہ ہے کہ جس چیز کا مستقبل میں واقع ہونا یقینی اور قطعی ہو اس کو ماضی کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ نے تم پر عذاب نازل کر دیا اس معنی میں ہے کہ اس نے تم پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ کر لیا اور حضرت ہود علیہ السلام کے نزدیک اس عذاب کا واقع ہونا یقینی تھا۔

اس کے بعد حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا کیا تم مجھ سے ان ناموں کے متعلق جھگڑ رہے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں جن کے متعلق اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی۔ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ تم بتوں کو الہ کہتے ہو حالانکہ ان میں الوہیت کا کوئی معنی نہیں ہے۔ تم نے کسی بت کا نام عزی رکھا ہے حالانکہ اس میں عزت کا کوئی معنی نہیں ہے۔ اور تمہارے مذہب کے ثبوت پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا انجام اور ان پر عذاب کے نزول کو بیان کیا۔ اس کی تفصیل ہم اس رکوع کے شروع میں بیان کر چکے ہیں۔

قَالَ يٰ قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

اور ہم نے (قوم) ثمود کی طرف ان کے (ہم قبیلہ) بھائی صالح کو بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس

مِنْ اِلٰهِ غَيْرِكُمْ قَدْ جَاءَكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ هٰذِهِ نَاقَةُ اللّٰهِ

کے سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، بیشک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی آچکی ہے، یہ اللہ کی اونٹنی

لَكُمْ اٰيَةٌ قَدْ رَوٰهَا تَاْكُلُ فِيْ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمْسُوْهَا سَوْءًا

تمہارے لیے نشانی ہے، اس کو (آزاد) چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرے اور اس کو بُرائی (کے ارادہ) سے نہ چھونا، ورنہ

فِيَاْخُذْكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۳ وَاذْكُرْ وَاذْجَعَلَكُمْ خُلَفَاءً مِنْ

تمہیں دردناک عذاب گرفت میں لے لے گا ۝ اور یاد کرو جب (قوم) عاد کے بعد اللہ نے تمہیں ان کا

بَعْدَ عَادٍ وَبَوَاكُرٍ فِي الْأَرْضِ تَتَّخِذُونَ مِنْ سُهُولِهَا

جائیں بنایا اور زمین میں تم کو بسایا، تم نرم زمین میں محلات بناتے ہو اور پہاڑوں کو

قُصُورًا وَتَنْجِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا فَادْكُرُوا اللَّهَ وَ

تراش کر گھر بناتے ہو، پس تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں

لَا تَعْتَوُوا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿۴۷﴾ قَالَ الْمَلَائِكَةُ اسْكُرُوا

فاد نہ پھیلاتے پھرو ○ ان کی قوم کے حکم سرداروں نے ان

مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ اسْتَضَعُّوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ إِنَّ

کمزور لوگوں سے کہا جان میں سے ایمان لا چکے تھے کیا نہیں اس پر یقین ہے کہ صالح

صِدْحًا مَرَّسَلٌ مِّنْ رَبِّهِ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿۴۸﴾ قَالَ

اپنے رب کی طرف بھوث کیے گئے ہیں، انہوں نے کہا وہ جس چیز کے ساتھ بھیجے گئے ہیں ہم اس پر ایمان لانے والے ہیں ○

الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كِفَرُونَ ﴿۴۹﴾ فَعَقَرُوا

حکمران نے کہا تم جس پر ایمان لائے ہو ہم اس کا کفر کرنے والے ہیں ○ پھر انہوں نے

النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يُصَلِّهِ أَتِنَابًا نَّعَدْنَا

اونٹنی کی کوئیں کاٹ دیں اور اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور کہا اے صالح! ہم پر وہ عذاب لے آؤ جس سے تم ہم کو

إِنْ كُنْتُمْ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۵۰﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي

ڈراتے تھے، اگر تم رسولوں میں سے ہو ○ تو ان کو زلزلہ (کے عذاب) نے پکڑ لیا پس وہ صبح کو اپنے گھروں

دَارِهِمْ جِثْبِينَ ﴿۵۱﴾ فَتَوَلَّى عَنْهُمْ وَقَالَ يَا قَوْمِ لَقَدْ أَبْلَغْتُكُمْ رَسُولًا

میں اونٹ سے منہ پڑے رہ گئے ○ پھر صالح نے ان سے منہ پھیر لیا اور فرمایا اے میری قوم! بیشک میں نے تمہیں اپنے

رَبِّي وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلَكِنْ لَا تُحِبُّونَ النَّصِيحِينَ ﴿۵۲﴾

رب کا پیغام پہنچا دیا اور تمہیں نصیحت کی لیکن تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے (قوم) ثمود کی طرف ان کے (ہم قبیلہ) بھائی صالح کو بھیجا۔ (الآیہ) (الاعراف: ۷۹-۷۳)
قوم ثمود کی اجمالی تاریخ

حضرت صالح علیہ السلام جس قوم میں پیدا ہوئے اس کا نام ثمود ہے۔ قوم ثمود بھی سامی اقوام کی ایک شاخ ہے۔ عاد اولیٰ کی ہلاکت کے وقت جو ایمان والے حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ بچ گئے تھے یہ قوم ان ہی کی نسل سے ہے۔ اس کو عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ قوم ثمود، ثمود نام کے ایک شخص کی طرف منسوب ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں اس کا نسب یہ ہے کہ ثمود بن عابر بن ارم بن سام بن نوح۔ یہ قوم مقام الحجر میں رہتی تھی جو حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ ہے۔ (معالم التنزیل، ج ۲، ص ۱۳۵)

حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب الحجر ہے۔ آج کل یہ جگہ فح الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں اور اس زمانہ میں بھی بعض مصری محققین نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک مکان دیکھا جس کو پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے اس میں متعدد کمرے اور ایک بڑا حوض ہے۔ مشہور مورخ مسعودی نے لکھا ہے الحجر کا یہ مقام جو حجر ثمود کہلاتا ہے، شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبہ اس کے سامنے پڑتی ہے اور جس طرح عاد کو عاد ارم کہا گیا ہے اسی طرح ان کی ہلاکت کے بعد ان کو ثمود ارم یا عاد ثانیہ کہا جاتا ہے۔ ثمود کے زمانہ کا ٹھیک تعین تو نہیں کیا جاسکا لیکن یہ بات بہر حال یقینی ہے کہ یہ قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے صفحہ ہستی پر نمودار ہو کر مٹ چکی تھی۔ ثمود بھی اپنے پیش رو بت پرستوں کی طرح ایک بت پرست قوم تھی۔ اور اس کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کے لیے حضرت صالح علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔

حضرت صالح علیہ السلام کا نسب اور قوم ثمود کی طرف ان کی بعثت

امام بغوی متونی ۵۱۶ھ نے حضرت صالح علیہ السلام کا نسب اس طرح لکھا ہے: صالح بن عبید بن آسف بن ماح بن عبید بن خادر بن ثمود۔ (معالم التنزیل، ج ۲، ص ۱۳۵) حضرت صالح علیہ السلام نے قوم ثمود کو بار بار بت پرستی سے منع کیا اور خدائے واحد کی عبادت کرنے کی ہدایت کی لیکن ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ حضرت صالح کی مخالفت کرتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے اور یہ کہتے تھے اگر ہمارا طریقہ غلط ہوتا اور ہمارا دین باطل ہوتا تو آج ہم کو یہ دہن دولت، سرسبز و شاداب باغات، میوہ جات اور پھلوں کی کثرت اور یہ بلند، عالی شان، مضبوط اور مستحکم مکان حاصل نہ ہوتے۔ تم خود اپنا حال دیکھو اور اپنے پیروکاروں کی غربت اور افلاس پر نظر ڈالو اور پھر بتاؤ کہ خدا کے نزدیک مقبول تم ہو یا ہم ہیں!

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا تم جن مضبوط مکانوں اور دیگر سامان زیست پر فخر کر رہے ہو، اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ لائے تو یہ سب ایک پل میں فنا ہو جائیں گے۔ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت کو مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ اگر واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں تو اللہ کی طرف سے کوئی نشان دکھائیں تب صالح علیہ السلام نے فرمایا تمہارا مطلوبہ نشان اس اونٹنی کی شکل میں موجود ہے۔ اللہ نے تمہارے اور اس کے درمیان پانی کی باری مقرر فرمادی ہے ایک دن یہ پانی پئے گی اور ایک دن تم پیو گے، اونٹنی کی پوری تفصیل حسب ذیل ہے:

قوم ثمود کا حضرت صالح سے معجزہ طلب کرنا اور معجزہ دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لانا اور

ان پر عذاب کا نازل ہونا

حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر متونی ۷۷۳ھ لکھتے ہیں:

مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ ایک دن ثمود اپنی مجلس میں جمع ہوئے وہاں حضرت صالح علیہ السلام بھی آگئے۔ حضرت صالح

علیہ السلام نے حسب معمول ان کو اللہ پر ایمان لانے اور بت پرستی ترک کرنے کی دعوت دی، ان کو وعظ اور نصیحت کی اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ ثمود نے پتھر کی ایک چٹان کی طرف اشارہ کر کے کہا اگر آپ اس چٹان سے ایسی ایسی صفت کی ایک اونٹنی نکالیں جو دس ماہ کی گاجھن ہو اور فوراً بچہ دے دے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے پختہ قسمیں لیں کہ اونٹنی نکلنے کے بعد وہ ایمان لے آئیں گے۔ پھر صالح علیہ السلام نے نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان کا مطالبہ پورا کر دے۔ تب اللہ تعالیٰ نے اس چٹان سے ایک بہت بڑی اونٹنی نکال دی جو ان کی طلب کردہ صفات کے مطابق تھی۔ جب انہوں نے یہ عظیم الشان معجزہ دیکھا تو ان میں سے بہت لوگ ایمان لے آئے لیکن اکثر اپنے کفر اور گمراہی پر قائم رہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لیے نشانی ہے اس کو اللہ کی زمین پر کھانے دو وہ جہاں چاہتی چرتی تھی، ایک دن وہ پانی پینے جاتی اور ایک دن قوم ثمود جاتی اور جس دن وہ پانی پینے جاتی تو کنوئیں کا سارا پانی پی جاتی۔ ثمود اپنی باری پر اگلے دن کی ضروریات کے لیے پانی جمع کر کے رکھتے تھے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس دن وہ سب لوگ اس اونٹنی کا دودھ پی لیتے تھے۔ پھر شیطان نے ان کو فتنہ میں مبتلا کر دیا۔ ایک شخص ولد الزنا تھا اس کی آنکھیں نیلی اور رنگ سرخ تھا اس کا نام قیدار بن سالف بن جندع تھا۔ وہ ان کا رئیس تھا سب کے مشورہ سے اس نے اس اونٹنی کی ٹانگیں کاٹ کر اس کو ہلاک کر دیا۔

امام ابن جریر وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ ثمود پانی کی باری کی تقسیم سے تنگ آچکے تھے لیکن وہ اس اونٹنی کو قتل کرنے سے ڈرتے تھے۔ تب صدوق نام کی ایک حسین اور مالدار عورت نے مصدع اور قیدار کے سامنے یہ پیشکش کی کہ اگر تم دونوں اس اونٹنی کو قتل کر دو تو میں، خود اور ایک اور، سین لڑکی تم کو عیش کے لیے بہ طور انعام دی جائیں گی۔ آخر یہ طے ہو گیا کہ وہ راستہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور جب اونٹنی چراگاہ کی طرف جائے گی تو اس کو قتل کر دیں گے اور سات اور آدمیوں نے ان کی مدد کی اور یہ نو آدمی مل کر اس اونٹنی کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

انہوں نے یہ سازش کی تھی کہ وہ اونٹنی کو قتل کر کے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے اہل کو بھی قتل کر دیں گے پھر ان کے وارثوں سے کہیں گے کہ ہم تو موقع واردات پر موجود ہی نہ تھے۔ یہ لوگ گھات لگا کر بیٹھ گئے اور جب اونٹنی سامنے آئی تو مصدع نے اس کو تیر مارا اور قیدار نے اس کی ٹانگیں کاٹ کر اس کو ہلاک کر دیا۔ اس کا بچہ یہ دیکھ کر پہاڑی میں غائب ہو گیا۔ حضرت صالح علیہ السلام کو جب اس کی خبر ہوئی تو انہوں نے فرمایا: آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا، اب اللہ کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تم کو تباہ کر دے گا۔ پھر چمک اور کڑک کا عذاب آیا اور اس نے رات میں سب کو تباہ کر دیا۔

(البدایہ والنہایہ، ج ۱ ص ۱۳۵، ۱۳۴، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۹۷۳ء)

قوم ثمود کی سرکشی اور ان پر عذاب نازل کرنے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

ثمود نے اپنی سرکشی سے (اپنے رسول کو) جھٹلایا ○ جب ان میں کاسب سے بد بخت اٹھا ○ تو اللہ کے رسول نے ان سے کہا اللہ کی اونٹنی کو (ایذا پہنچانے) اور اس کے پانی کی باری (کو) بند کرنے) سے احتراز کرو ○ تو انہوں نے اس (رسول) کو جھٹلایا اور اس کی کوئی نچیں کاٹ دیں ○ تو ان کے رب نے ان کے گناہ کے سبب ان پر ہلاکت ڈال دی، اس بستی کو پیوند زمین بنا دیا ○ اور وہ ان کو سزا دینے سے نہیں ڈرتا ○

كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ○ إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا ○ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ○ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا ○ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا ○ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ○ (الشمس: ۱۵-۱۱)

قوم ثمود کے نو آدمیوں کی سازش کے متعلق قرآن مجید میں ہے:

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُفْسِدُونَ
فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ قَالُوا تَقَاسَمُوا
بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهِ
مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ وَ
مَكْرُوا مَكْرًا وَمَكْرَتَنَا مَكْرًا وَأَهُم لَّا يَشْعُرُونَ ۝
فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ أَنَا
دَمَرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ فَنِلَّكَ
بِوَيْتِهِمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً
لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ وَأَنْحَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَ
كَانُوا يَتَّقُونَ ۝ (النمل: ۵۳-۴۸)

اور ثمود کے شہر میں نو شخص ملک میں فساد کرتے تھے اور
اصلاح نہیں کرتے تھے ۝ انہوں نے کہا: سب آپس میں اللہ کی
قسم کھا کر عہد کرو کہ ہم ضرور صالح اور ان کے اہل پر شب خون
ماریں گے پھر ہم ان کے وارث سے کہیں گے کہ اس گھر کے
لوگوں کے قتل کے موقع پر ہم حاضر ہی نہ تھے اور بے شک ہم
ضرور سچے ہیں ۝ انہوں نے سازش کی اور ہم نے خفیہ تدبیر ☆
کی اور ان کو پتا ہی نہ چلا ۝ تو آپ دیکھئے کہ ان کی سازش کا کیسا
انجام ہوا بے شک ہم نے ان کو اور ان کی ساری قوم کو ہلاک
کر دیا ۝ سو یہ ان کے دیر ان گھر گرے پڑے ہیں کیونکہ انہوں
نے ظلم کیا تھا اور بے شک اس میں جانے والوں کے لیے
(عبرت کی) نشانی ہے ۝ اور ہم نے ان لوگوں کو نجات دے دی
جو ایمان لائے تھے اور اللہ سے ڈرتے تھے ۝

اونٹنی کا قاتل ایک شخص تھا یا پوری قوم ثمود

قوم ثمود کا قیدار کو اونٹنی کے قتل کے لیے بلانا اور اس کا اونٹنی کو قتل کرنا اس کا ذکر ان آیات میں ہے:

كَذَبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّمَّنَّا
وَإِحْدَاثًا تَتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا لَفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ۝ أَلْقَى
الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌّ ۝
سَيَعْلَمُونَ عَذَابَ مَنْ الْكَذَّابُ الْأَشِرُّ ۝ إِنَّا
مُرْسِلُوا النَّاتَةَ فِتْنَةً لَهُمْ فَأَرْتَقِبْهُمْ وَ
اصْطَبِرْ ۝ وَتَيْفُهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قَسَمٌ بَيْنَهُمْ
كُلُّ شَرْبٍ مُّحْتَضِرٌ ۝ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ
فَتَعَاطَى فَعَقَّرَ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِي ۝
إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا
كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ۝ (القمر: ۳۱-۲۳)

ثمود نے ڈرانے والے رسولوں کو جھٹلایا ۝ انہوں نے کہا:
کیا ہم اپنوں میں سے ایک بشر کی اتباع کریں، تب تو ہم یقیناً
ضرور گمراہی اور عذاب میں ہوں گے ۝ کیا ہم میں سے صرف
اسی پر وحی نازل کی گئی بلکہ وہ بڑا جھوٹا متکبر ہے ۝ غنقریب وہ
(قیامت کے دن) جان لیں گے کہ کون بڑا جھوٹا متکبر ہے ۝ بے
شک ہم ان کی آزمائش کے لیے اونٹنی بھیجنے والے ہیں تو (اے
صالح!) آپ (ان کے انجام کا) انتظار کریں اور صبر سے کام
لیں ۝ اور ان کو بتا دیجئے کہ پانی ان کے (اور اونٹنی کے)
درمیان تقسیم کیا ہوا ہے، ہر ایک اپنے اپنے پینے کی باری پر حاضر
ہو گا ۝ تو انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا سو اس نے (اونٹنی کو
پکڑا اور) اس کی کوئی نہیں کاٹ دیں ۝ تو کیسا ہوا میرا عذاب

☆ (حضرت صالح علیہ السلام نے جب انہیں عذاب کی خبر سنائی تو انہوں نے انتقاماً حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کی
سازش کی۔ جب وہ لوگ اپنے منصوبہ کے مطابق حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے گئے تو اللہ تعالیٰ نے راستہ ہی
میں ان پر پتھر برسایا اور ان کو ہلاک کر دیا اور یہ اللہ کی خفیہ تدبیر تھی)

اور ڈرائنا O بے شک ہم نے ان پر ایک خوفناک آواز بھیجی تو وہ
کانٹوں کی باڑ لگانے والے کی بچی ہوئی باڑ کے چورے کی طرح
(ریزہ ریزہ ہو کر) رہ گئے O

سورہ القمر کی ان آیات میں بتایا ہے کہ ایک شخص (قیدار) نے اونٹنی کی کوئیں کاٹ کر اس کو ہلاک کیا تھا اور سورہ
الاعراف اور سورہ الشمس میں فرمایا کہ قوم ثمود نے اس کی کوئیں کاٹی تھیں۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ ہر چند کہ یہ ایک شخص کا
فعل تھا لیکن چونکہ پوری قوم اس مجرم کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اس جرم میں ثمود کی مرضی کا آلہ کار تھا اس لیے اس کا الزام
پوری قوم ثمود پر عائد کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش پر کیا جائے یا جس گناہ پر قوم راضی ہو وہ ایک
قومی گناہ ہے بلکہ جو گناہ قوم کے درمیان علی الاعلان کیا جائے اور قوم اس کو برانہ جانے وہ بھی قومی گناہ ہے۔
اونٹنی کے معجزہ ہونے کی وجوہات

اس اونٹنی کو "اللہ کی اونٹنی" اس اونٹنی کی تعظیم اور تکریم کے طور پر فرمایا ہے جیسے کعبہ کو بیت اللہ فرمایا ہے۔ اور اونٹنی کا
معجزہ ہونا اس وجہ سے ہے کہ پتھر کی چٹان پھٹ گئی اور اس سے اونٹنی نکل آئی اور یہ خلاف عادت اور معجزہ ہے اور اونٹنی کا صرف
اپنی باری پر پانی پینے کے لیے آنا اور کنوئیں کا سارا پانی پی جانا اور دیگر حیوانات کا اس دن کنوئیں پر نہ آنا اور دوسرے دن آنا یہ
تمام باتیں خلاف عادت اور معجزہ ہیں۔

قوم ثمود کے عذاب کی مختلف تعبیریں اور ان میں وجہ تطبیق

ایک اعتراض یہ ہے کہ قوم ثمود کے عذاب کو متعارض اور متضاد عنوانوں سے تعبیر فرمایا گیا ہے، ایک جگہ اس عذاب کو
الرجفہ (زلزلہ) (الاعراف: ۷۸) سے تعبیر فرمایا اور ایک جگہ اس عذاب کو الطاغیہ (حد سے تجاوز کرنے والی چیز) سے تعبیر
فرمایا (الحاقہ: ۵) اور متعدد جگہ اس کو الصیحه (ہولناک آواز) سے تعبیر فرمایا۔ (ہود: ۶۷، الحجر: ۸۳، القمر: ۳۱) اس کا جواب یہ ہے
کہ اصل میں یہ عذاب ایک خوفناک زلزلہ کی صورت میں آیا تھا اور زلزلہ میں ہولناک آواز ہوتی ہے اس لیے اس کو
الصیحه سے بھی تعبیر فرمایا اور چونکہ یہ آواز بہت زیادہ حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس لیے اس کو الطاغیہ سے بھی
تعبیر فرمایا۔

قرآن مجید کی ان سورتوں میں قوم ثمود کا ذکر کیا گیا ہے۔ الاعراف، ہود، الحجر، الشعراء، النمل، فصلت، النجم، القمر، الحاقہ،
الشمس۔

قوم ثمود کے قصہ کے متعلق احادیث اور آثار

امام عبدالرزاق بن ہمام متوفی ۲۱۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابوالطفیل بیان کرتے ہیں کہ ثمود نے کہا: اے صالح! اگر آپ سچے ہیں تو کوئی نشانی دکھائیں! حضرت صالح نے ان سے کہا:
زمین کے کسی پہاڑ کی طرف نکلو تو وہ پہاڑ پھٹ پڑا اور اس کے شکاف سے اونٹنی اس طرح نکل آئی جس طرح حاملہ کے پیٹ سے
بچہ نکلتا ہے۔ حضرت صالح نے ان سے فرمایا: یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے اس کو اللہ کی زمین میں چھوڑ دو تاکہ کھاتی
پھرے اور اس کو برائی کے ارادہ سے نہ چھوٹا ورنہ تم کو دردناک عذاب اپنی گرفت میں لے لے گا۔ (الاعراف: ۷۳) اس کے لیے
پینے کی باری ہے اور تمہارے لیے پینے کی باری کا ایک دن مقرر ہے۔ (الشعراء: ۱۵۵) جب وہ اس پابندی سے تنگ آگئے تو انہوں
نے اس اونٹنی کی کوئیں کاٹ دیں۔ حضرت صالح نے ان سے فرمایا: تم صرف تین دن اپنے گھروں میں فائدہ اٹھا لو پھر تم پر عذاب

آئے گا یہ اللہ کا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا نہ ہوگا۔ (صود: ۶۵) ایک اور سند سے روایت ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے ان سے فرمایا تم پر عذاب آنے کی علامت یہ ہے کہ پہلے دن جب تم صبح کو اٹھو گے تو تمہارے چہرے زرد ہوں گے دوسری صبح کو تمہارے چہرے سرخ ہوں گے اور تیسرے دن صبح کو تمہارے چہرے سیاہ ہوں گے جب انہوں نے یہ علامت دیکھی تو انہوں نے خوشبو لگائی اور عذاب کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے۔

(تفسیر عبد الرزاق، ج ۱، رقم الحدیث: ۹۱۱، الدر المنثور، ج ۳، ص ۳۹۲، تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۵، ص ۱۵۱۵)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ الحجر کے پاس سے گزرے تو آپ نے فرمایا: نشانیوں کا سوال نہ کرنا کیونکہ حضرت صالح کی قوم نے نشانیوں کا سوال کیا تھا وہ اس راستہ سے آتے تھے اور اس راستہ سے لوٹتے تھے انہوں نے اپنے رب کی حکم عدولی کی انہوں نے اس اونٹنی کی کوئی نہیں کاٹ دیں۔ ایک دن وہ اونٹنی ان کا پانی پیتی تھی اور ایک دن وہ اس کا دودھ پیتے تھے تو انہوں نے اس کی کوئی نہیں کاٹ دیں پھر ایک ہولناک آواز نے ان کو پکڑ لیا آسمان کے نیچے جتنے بھی لوگ تھے سب کو اللہ نے ہلاک کر دیا۔ ماسوا ایک شخص کے جو اللہ کے حرم میں تھا، عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ شخص کون تھا؟ فرمایا ابو رغال۔ جب وہ حرم سے باہر آیا تو وہ بھی اس عذاب میں گرفتار ہو گیا۔

(تفسیر عبد الرزاق، ج ۱، رقم الحدیث: ۹۱۵، اس کی سند صحیح ہے، مسند احمد، ج ۱۱، رقم الحدیث: ۱۳۰۹۲، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ، جامع

البیان، جز ۸، ص ۲۹۸، مجمع الزوائد، ج ۷، ص ۵۰، المستدرک، ج ۲، ص ۳۲۰)

امام ابو داؤد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ طائف گئے تو ہم ایک قبر کے پاس سے گزرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ ابو رغال کی قبر ہے۔ اس حرم کی وجہ سے اس سے عذاب دور ہو گیا تھا جب وہ حرم سے نکلا تو اس جگہ اس کو وہی عذاب آپہنچا تو اس کو دفن کر دیا گیا اور اس کی علامت یہ ہے کہ اس کے ساتھ سونے کی ایک شاخ بھی دفن کی گئی تھی۔ اگر تم اس قبر کو کھودو گے تو اس شاخ کو حاصل کر لو گے تو لوگوں نے اس قبر کو کھود کر اس سے وہ سونے کی شاخ نکال لی۔

(سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۳۰۸۸، تفسیر عبد الرزاق، رقم الحدیث: ۹۱۶، جامع البیان، جز ۸، ص ۲۹۹)

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ الحجر سے گزرے تو ہم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جن لوگوں نے اپنی جان پر ظلم کیا تھا ان کے گھروں کے پاس سے بغیر روئے نہ گزرنا کہیں تم پر بھی ویسا عذاب نہ آجائے پھر آپ نے اونٹنی کو تیزی سے دوڑایا اور اس مقام کو پیچھے چھوڑ دیا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۳۸۰، صحیح مسلم، زہد، ۳۹-۲۹۸۰-۴۲۹، تفسیر عبد الرزاق، رقم الحدیث: ۹۱۸، جامع البیان، جز ۸،

ص ۳۰۰)

وَلَوْ طَأَذُ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ

اللہ ہم نے لوط کو بھیجا جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسی بے حیائی کرتے ہو جو تم سے پہلے جہان والوں

أَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِينَ ﴿۸۰﴾ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً لِّمَنْ دُونِ

میں سے کسی نے نہیں کی ○ بے شک تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس نفسانی خواہش کے لیے

النَّسَاءِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ﴿۸۴﴾ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ

آتے ہو بلکہ تم تو (حیوانوں کی) حد سے (بھی) تجاوز کرنے والے ہو ان کی قوم کا صرف یہی جواب تھا کہ انہوں

إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أَنَاسٌ

نے کہا ان کو اپنی بستی سے نکال دو، بے شک یہ بڑے پارس لوگ

يَتَطَهَّرُونَ ﴿۸۵﴾ فَأَنْجَيْنَاهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ﴿۸۶﴾

یہیں ○ پس ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو نجات دی سو ان کی بیوی کے وہ مذاہب میں باقی رہنے والوں میں برگی

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَأَنْظَرُ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے ان پر پتھر برسائے سو دیکھو مجرموں کا کیا انجام ہوا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ (الاعراف: ۸۴-۸۰)

حضرت لوط علیہ السلام کا شجرہ نسب

امام ابو القاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی ۵۷۱ھ لکھتے ہیں:

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ ان کا شجرہ نسب یہ ہے: لوط بن ہار ان (ہار ان حضرت ابراہیم کے بھائی تھے) بن تارخ بن ناحور بن ساروع بن ارعوب بن نافع بن غابر بن شالخ بن ارغشد بن سام بن نوح بن ملک بن متوشلخ بن خنوخ (یہ حضرت ادریس ہیں) بن مھلہیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس شخص نے سب سے پہلے اللہ کی راہ میں قتال کیا وہ حضرت ابراہیم خلیل الرحمن ہیں جب اہل روم نے حضرت لوط علیہ السلام کو قید کر لیا تو حضرت ابراہیم نے ان سے قتال کیا اور حضرت لوط کو چھڑایا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں سب سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ نبی ﷺ کو ان کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی، آپ ان کے متعلق خبروں کے منتظر تھے کہ قریش کی ایک عورت آئی اور کہنے لگی اے ابو القاسم! میں نے آپ کے داماد کو سفر میں دیکھا ہے، ان کی اہلیہ کمزور لوگوں کے ساتھ دراز گوش پر سوار تھیں اور وہ اس کو چلا رہے تھے اور اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ ان دونوں کا صاحب ہو، بے شک لوط علیہ السلام کے بعد عثمان اپنے اہل کے ساتھ اللہ کی طرف ہجرت کرنے والے پہلے شخص ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کا مقام بعثت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ارض مقدسہ کی طرف بھیجا گیا اور حضرت لوط علیہ السلام کو چار شہروں کی طرف بھیجا گیا: سدوم، اموراء، عاموراء اور صبوراء۔ ان میں سے ہر شہر میں ایک لاکھ جنگ جو لوگ تھے ان کا مجموعہ چار لاکھ تھا۔ ان میں سب سے بڑا شہر سدوم تھا۔ حضرت لوط اسی میں رہتے تھے، یہ شام کے شہروں میں سے ہے اور فلسطین سے ایک دن اور رات کی مسافت پر واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کو مہلت دی تھی انہوں نے اسلامی شرم و حیاء کے حجاب چاک کر دیے اور بہت بڑی

تبیان القرآن

جلد چہارم

بے حیائی کا ارتکاب کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے دراز گوش پر سوار ہو کر قوم لوط کے شہروں میں جاتے اور ان کو نصیحت کرتے وہ ان کی نصیحت کو قبول کرنے سے انکار کرتے تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم جس علاقہ میں رہتی تھی اس کو آج کل شرق اردن کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ عراق اور فلسطین کے درمیان میں واقع ہے۔ تورات میں اس علاقہ کے صدر مقام کانام سدوم بتایا گیا ہے جو یا تو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا یا اب بحیرہ مردار میں غرق ہو چکا ہے۔ اب صرف بحیرہ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی ہے جسے آج تک بحر لوط کہا جاتا ہے۔ اردن کی وہ جانب جہاں آج بحر مردار یا بحر لوط واقع ہے اس کے قریب رہنے والوں کا اعتقاد ہے کہ یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں یہ خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے سدوم اور عامورا وغیرہ یہیں تھے۔ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس زمین کا تختہ الٹ دیا گیا اور سخت زلزلے آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا۔ اس سے اس کا نام بحر مردار اور بحر لوط ہے۔ اس زمانہ کے محققین نے بھی بحر مردار کے ساحل پر بعض تباہ شدہ بستیوں کے آثار دیکھے کر یہ یقین کر لیا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جس جگہ کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے۔

حضرت لوط کے ہاں فرشتوں کا حسین اور نوخیز لڑکوں کی شکل میں مہمان ہونا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب بد معاشوں نے یہ سنا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس مہمان آئے ہیں تو وہ حضرت لوط علیہ السلام کے دروازہ پر پہنچے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے دروازہ بند کر دیا اور کہا تم میری بیٹیوں سے نکاح کر لو۔ (ہود: ۶۷) حضرت لوط کو اپنے مہمانوں کی بے حرمتی کا اندیشہ تھا اور ان کے ہاں یہ دستور تھا کہ ایک شخص صرف ایک عورت سے نکاح کرتا تھا، انہوں نے کہا: تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے اور تم جانتے ہو کہ ہماری خواہش کیا ہے۔ (ہود: ۷۹) حضرت لوط نے فرمایا: اللہ سے ڈرو اور مجھے اپنے مہمانوں کے متعلق شرمندہ نہ کرو، کیا تم میں کوئی نیک آدمی نہیں ہے؟ انہوں نے حضرت لوط کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دروازہ توڑ کر اندر گھس گئے۔ پھر حضرت جبرئیل اپنی اصل صورت میں آگئے اور کہا: اے لوط! پریشان نہ ہوں، ہم فرشتے ہیں یہ ہم تک نہیں پہنچ سکتے، ہمیں ان کو عذاب دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت جبرئیل نے کہا: آپ رات کے کسی حصہ میں اپنے گھر والوں کو لے کر اس بستی سے نکل جائیں، وہ لوگ جب اندر آئے تو حضرت جبرئیل نے اپنے پران کے چروں پر مل دیے ان کے چہرے خون آلود ہو گئے اور ان کی آنکھیں نکل کر زمین پر گر پڑیں۔ تب انہوں نے کہا اے لوط! تمہارے پاس جاؤ گے جنہوں نے ہمیں اندھا کر دیا وہ ٹھوکریں کھاتے ہوئے باہر نکلے اور جیسے ہی صبح ہوئی، ان کو عذاب نے آیا۔

قوم لوط میں ہم جنس پرستی کی ابتداء

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم میں عورتوں کی بجائے مردوں سے نفسانی خواہش پوری کرنے کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ ان کے باغات میں پھل تھے اور ان کے کچھ پھل باغات سے اور ان کے گھروں سے باہر لٹکتے رہتے تھے، ایک بار ان کے ہاں قحط پڑ گیا اور پھلوں میں کمی ہو گئی۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ جو پھل باہر لٹکے ہوئے ہوتے ہیں اگر تم مسافروں کو ان کے کھانے سے منع کر دو تو تمہارے لیے کشادگی ہو جائے گی۔ انہوں نے سوچا کس طرح منع کریں پھر انہوں نے یہ قانون بنایا کہ جو مسافر بھی پھل توڑے گا اس کو ان کے ساتھ نکاح کرنا ہو گا اور اس کو چار درہم جرمانہ دینا ہو گا۔ اس طرح تمہارے پھل محفوظ رہیں گے اور یوں ان کو ہم جنس پرستی کی لت پڑ گئی اور یہ وہ نتیجہ فعل تھا جو ان سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا تھا۔

قوم لوط میں اس عمل کی ابتداء کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک دن ان کے مردوں کے پاس شیطان انتہائی خوبصورت بچے کی

شکل میں آیا اور اس نے ان کو اپنے ساتھ اس عمل کی دعوت دی۔ انہوں نے اس کے ساتھ یہ عمل کیا پھر ان کو اس عمل کی لت پڑ گئی۔

حضرت لوط کی بیوی کی خیانت اور قوم لوط کی بری عادتیں

حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں نے خیانت کی تھی۔ ان کی یہ خیانت زنا نہیں تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق لوگوں سے یہ کہا تھا کہ یہ مجنون ہیں۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ جب ان کے پاس فرشتے بہ صورت مہمان آئے تو اس نے لوگوں کو جا کر بتا دیا کہ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس مہمان آئے ہوئے ہیں۔ ضحاک نے کہا حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام کی بیویوں کی خیانت چغلی کرنا تھی۔

حسن بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قوم لوط کو دس عادتوں کی وجہ سے ہلاک کیا گیا اور میری امت میں اس سے ایک عادت زیادہ ہوگی۔ ان کے مرد ہم جنس پرست تھے، وہ غلیل سے شکار کرتے تھے، کنکریاں مارتے تھے، حمام میں کھیلتے تھے، دف بجاتے تھے، شراب پیتے تھے، داڑھی کٹاتے تھے اور مونچھیں لمبی رکھتے تھے، سیٹی بجاتے تھے اور تالیاں پیٹتے تھے، ریشم پہنتے تھے اور میری امت میں ان سے ایک عادت زیادہ ہوگی کہ عورتیں عورتوں سے جنسی خواہش پوری کریں گی۔

(کنز العمال، ۱۰۳۱۳، مختصر تاریخ دمشق، ج ۲۱، ص ۲۳۱-۲۳۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۰ھ)

عمل قوم لوط کی عقلی قباحتیں

امام رازی متوفی ۶۰۶ھ نے قوم لوط کے عمل (اعلام) کی حسب ذیل عقلی خرابیاں بیان کی ہیں:

۱- اکثر لوگ اولاد کے حصول سے احتراز کرتے ہیں کیونکہ اولاد کی وجہ سے انسان پر ان کی پرورش کا بوجھ پڑ جاتا ہے جس کو اٹھانے کے لیے انسان کو زیادہ مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جماع کو بہت بڑی لذت کے حصول کا سبب بنا دیا ہے، انسان اس لذت کے حصول کے لیے جماع کے فعل کا اقدام کرتا ہے۔ اور جماع کے بعد خواہی نخواستی بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کی بقاء کے لیے جماع میں یہ لذت رکھی ہے۔ اب اگر انسان اس لذت کو کسی اور طریقہ سے حاصل کر لے جس سے بچہ پیدا نہ ہو تو اس سے وہ حکمت مطلوبہ حاصل نہیں ہوگی اور اس سے نسل انسانی منقطع ہوگی اور یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے اس لیے اس عمل کا حرام ہونا ضروری ہوا۔

۲- مرد اپنی فطرت اور وضع کے اعتبار سے فاعل ہے اور عورت منفعیل ہے اور جب اس عمل کے نتیجے میں مرد خود منفعیل ہو گا تو یہ فطرت اور حکمت کے خلاف ہے۔

۳- قضاء شہوت کے لیے مرد کا عورت کے ساتھ یہ عمل کرنا جانوروں کے شہوانی عمل کے مشابہ ہے، اس عمل کو صرف اس وجہ سے اچھا قرار دیا گیا ہے کہ یہ حصول اولاد کا سبب ہے۔ اور جب یہ عمل اس طریقہ سے کیا جائے جس میں حصول اولاد ممکن نہ ہو تو یہ نری حیوانیت ہے اور انسانیت کے بلند مقام سے حیوانوں کی پستی میں جا گرتا ہے۔

۴- جب مرد مرد کے ساتھ یہ فعل کرے گا تو مان لیا کہ فاعل کو اس عمل سے لذت حاصل ہوگی مگر اس سے مفعول کو بہت بڑا عار اور عیب لاحق ہوگا، جو تمام عمر اس کی ذلت اور رسوائی کا سبب ہوگا اور وہ کبھی فاعل کے ساتھ آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکے گا تو ایسی چند منٹ کی خیس اور گھٹیا لذت کے حصول کا کیا فائدہ جس سے دوسرے شخص کو تمام عمر کے لیے عیب لگ جائے۔

۵- اس عمل کے بعد فاعل اور مفعول میں دائمی عداوت ہو جاتی ہے اور مفعول کو فاعل کی شکل سے نفرت ہو جاتی ہے اور

بعض اوقات مفعول فاعل کو قتل کرنے کا منصوبہ بناتا ہے۔ اس کے برعکس شوہر اپنی بیوی کے ساتھ جب یہ عمل کرتا ہے تو ان میں الفت اور محبت اور بڑھتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا
إِيَّهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (الروم: ۲۱)

اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون پاؤ اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے رحم میں منی کو جذب کرنے کی بہت زبردست قوت رکھی ہے پس جب مرد عورت کے ساتھ یہ عمل کرتا ہے تو مرد کے عضو کی نالی سے منی کے تمام قطرات منجذب ہو کر عورت کے رحم میں پہنچ جاتے ہیں اس کے برعکس جب مرد کے ساتھ یہ عمل کرے گا تو مفعول کی مقعد میں چونکہ منی کو جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہے تو اس عمل کے بعد فاعل کے عضو کی نالی میں کچھ قطرات اور ذرات رہ جاتے ہیں جن میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے جس سے عضو سوج جاتا ہے اور مملک قسم کے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً سوزاک وغیرہ۔

قرآن مجید میں عمل قوم لوط کی مذمت

قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں قوم لوط کے عمل کی مذمت فرمائی گئی ہے:

آتَاوُنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَلَمِينَ ۝ وَتَذَرُونَ مَا
خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لَكُمْ قَوْمٌ
عَادُونَ ۝ (الشعراء: ۱۶۶-۱۶۵)

کیا تم جہان والوں میں سے مردوں کے پاس آتے ہو؟ ۝
اور اپنی ان بیویوں کو چھوڑ دیتے ہو جو تمہارے رب نے
تمہارے لیے پیدا کی ہیں بلکہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو۔
بے شک تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش کے لیے
مردوں کے پاس آتے ہو بلکہ تم تو حیوانوں کی حد سے (بھی)
تجاوز کرنے والے ہو۔

احادیث میں عمل قوم لوط کی مذمت اور سزا کا بیان

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جن لوگوں کو تم قوم لوط کا عمل کرتے پاؤ تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دو۔

(سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۴۴۶۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۳۶۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۵۶۱، شعب الایمان رقم الحدیث: ۵۸۳۶)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے اپنی امت پر جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے وہ قوم لوط کا عمل ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۳۶۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۵۶۳، المستدرک ج ۳، ص ۳۵۷)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اہل ذمہ پر ظلم کیا جائے گا تو دشمن کی حکومت ہو جائے گی اور جب زنا بہ کثرت ہو گا تو قیدی بہ کثرت ہوں گے اور جب قوم لوط کا عمل کرنے والے زیادہ ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنا دست رحمت مخلوق سے اٹھالے گا پھر وہ کوئی پرواہ نہیں کرے گا کہ وہ کس وادی میں ہلاک ہوتے ہیں۔

(المعجم الکبیر، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۷۵۵، مجمع الزوائد، ج ۶، ص ۲۵۵)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے سات قسم کے لوگوں کو سات آسمانوں کے اوپر سے لعنت فرماتا ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک پر تین بار لعنت کو دہراتا ہے۔ فرماتا ہے: جس نے قوم لوط کا عمل کیا، وہ ملعون ہے۔ جس نے قوم لوط کا عمل کیا وہ ملعون ہے، جس نے قوم لوط کا عمل کیا، وہ ملعون ہے۔ جس نے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا وہ ملعون ہے، جس نے جانوروں کے ساتھ بد فعلی کی وہ ملعون ہے، جس نے اپنے ماں باپ سے تعلق توڑا وہ ملعون ہے۔ جس نے ایک عورت اور اس کی بیٹی کو ایک نکاح میں جمع کیا وہ ملعون ہے، جس نے اللہ کی حدود کو بدلا وہ ملعون ہے۔ جس نے اپنے آپ کو اپنے مالکوں کے غیر کی طرف منسوب کیا وہ ملعون ہے۔

(المعجم الاوسط، ج ۹، رقم الحدیث: ۸۴۹۲، مجمع الزوائد، ج ۶، ص ۶۷۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: چار شخص ایسے ہیں جو اللہ کے غضب میں صبح کرتے ہیں اور اللہ کی ناراضگی میں شام کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! وہ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ مرد جو عورتوں کی مشابہت کریں اور وہ عورتیں جو مردوں کی مشابہت کریں، اور جو لوگ جانوروں سے بد فعلی کریں اور جو لوگ مردوں سے خواہش پوری کریں۔

(المعجم الاوسط، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۸۵۳، شعب الایمان، رقم الحدیث: ۵۸۳۰، الکامل لابن عدی، ج ۶، ص ۲۲۳۳، مجمع الزوائد)

محمد بن المنکدر بیان کرتے ہیں کہ حضرت خالد بن ولید نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ میں نے عرب کے بعض قبیلوں میں یہ دیکھا ہے کہ وہاں مرد کے ساتھ اس طرح فعل کیا جاتا ہے جس طرح عورت کے ساتھ فعل کیا جاتا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے مشورہ کیا۔ ان میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہوں نے کہا: یہ وہ گناہ ہے جس کو صرف ایک امت نے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو اس امت پر عذاب بھیجا اس کا آپ لوگوں کو علم ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس شخص کو آگ میں جلادیا جائے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کا اس پر اجماع ہو گیا کہ اس کو آگ میں جلادیا جائے۔ پھر حضرت ابو بکر نے اس شخص کو آگ میں جلانے کا حکم دیا۔ یہ حدیث حسن ہے۔

(شعب الایمان، رقم الحدیث: ۵۳۸۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جو شخص قوم لوط کا عمل کرتا ہو اس کے متعلق نبی ﷺ نے فرمایا: اوپر والے اور نیچے والے دونوں کو رجم (سنگسار) کر دو۔

(سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۲۵۶۲، المستدرک ج ۴، ص ۳۵۵، المعجم الاوسط، ج ۳، رقم الحدیث: ۳۱۲۸، مجمع الزوائد، ج ۶، ص ۶۷۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عز و جل اس مرد کی طرف نظر رحمت نہیں فرماتا جو مرد سے جنسی خواہش پوری کرے یا عورت سے عمل معکوس کرے۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۱۶۸، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۳۱۹۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا گیا کہ لوطی کی حد کیا ہے؟ فرمایا اس کو شہر کی سب سے اونچی عمارت سے نیچے پھینکا جائے، پھر اس کو سنگسار کر دیا جائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۹، ص ۵۲۹، السنن الکبریٰ، ج ۸، ص ۳۳۲)

یزید بن قیس نے بیان کیا کہ حضرت علی نے لوطی کو سنگسار کیا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۹، ص ۵۳۰، السنن الکبریٰ، ج ۸، ص ۳۳۲)

زہری نے بیان کیا کہ اگر لوطی شادی شدہ ہو تو اس کو سنگسار کیا جائے اور اگر کنوارا ہو تو اس کو سو کوڑے مارے جائیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۹، ص ۵۳۱، مصنف عبدالرزاق، ج ۷، ص ۳۶۳، السنن الکبریٰ، ج ۸، ص ۳۳۳)

عمل قوم لوط کی سزا میں مذاہب فقہاء

علامہ موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں:

اس فعل کی سزا میں امام احمد سے مختلف روایتیں ہیں ایک روایت یہ ہے کہ اس کی سزا یہ ہے کہ وہ کنوارہ ہو یا شادی شدہ اس کو سنگسار کر دیا جائے۔ حضرت علی، حضرت ابن عباس، جابر بن زید، عبد اللہ بن معمر اور زہری کا بھی یہی مسلک ہے، کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب مرد، مرد سے خواہش پوری کرے تو وہ دونوں زانی ہیں اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک روایت یہ ہے کہ اس کو جلادیا جائے اور دوسری روایت یہ ہے کہ دونوں کو قتل کر دیا جائے کیونکہ سنن ابو داؤد میں یہ حدیث ہے کہ تم جن کو قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاعل اور مفعول بہ دونوں کو قتل کر دو۔

(المغنی، ج ۹، ص ۵۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ)

امام شافعی کے نزدیک اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کو سنگسار کیا جائے گا اور اگر وہ کنوارہ ہے تو اس کو کوڑے مارے جائیں گے، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ فعل زنا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فعل وطی حرام ہونے میں زنا کے مشابہ ہے۔

(شرح المہذب، ج ۲۰، ص ۲۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

امام مالک کے نزدیک فاعل کو رجم کیا جائے گا خواہ وہ کنوارا ہو یا شادی شدہ۔ اسی طرح مفعول اگر بالغ ہو تو اس کو بھی سنگسار کیا جائے گا۔ امام مالک سے دوسری روایت یہ ہے کہ اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کو سنگسار کیا جائے گا اور اگر وہ کنوارہ ہے تو اس کو قید کیا جائے گا اور اس کو سزا دی جائے گی۔ عطاء، ابراہیم نخعی اور ابن المسیب کا بھی یہی مذہب ہے۔

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس فعل میں مطلقاً حد نہیں ہے بلکہ تعزیر ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک اگر اس نے کسی اجنبی کے ساتھ یہ فعل کیا ہے تو اس پر حد ہے، کنوارے کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے گا اور اگر اس نے اپنے غلام، باندی یا بیوی کے ساتھ یہ فعل کیا ہے تو اس پر بالاتفاق حد نہیں ہے بلکہ تعزیر ہے۔ زیادات میں مذکور ہے اگر کوئی شخص اس فعل کا عادی ہے تو پھر اس کی سزا خلیفہ کی طرف مفض ہے۔ اگر وہ مناسب سمجھے تو اس کو قتل کر دے، اگر چاہے تو اس کو کوڑے مارے اور اگر چاہے تو اس کو قید کر دے۔ فتح القدر میں مذکور ہے اگر کوئی شخص بار بار یہ فعل کرے تو مفتی بہ قول پر اس کو قتل کر دیا جائے گا۔ درر غرر میں مذکور ہے تعزیر یہ ہے کہ اس کو آگ میں جلادیا جائے یا اس پر دیوار گرا دی جائے یا اس کو بلندی سے گرا دیا جائے پھر اس کو سنگسار کیا جائے۔ الحادی میں مذکور ہے اس کو کوڑے مارنا زیادہ صحیح ہے۔ فتح القدر میں مذکور ہے اس کو قید میں رکھا جائے حتیٰ کہ وہ توبہ کر لے یا مر جائے اور اگر وہ اس فعل کا عادی ہو تو اس کو خلیفہ المسلمین قتل کر دے۔

(رد المحتار، ج ۳، ص ۱۵۶-۱۵۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

قوم لوط پر عذاب کی کیفیت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا فَأَنْظَرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (الاعراف: ۸۴)

سو ہم نے ان پر پتھر برسائے سو دیکھو مجرموں کا کیسا انجام

ہوا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے محمد ﷺ آپ دیکھئے کہ قوم لوط کے جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی اور

انہوں نے دلیری سے بے حیائی کے کام کیے اور مردوں سے خواہش نفس پوری کی ان کا کیسا انجام ہوا۔
اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا انہوں نے اپنا پران شہروں کے نیچے داخل کیا اور اس زمین کو اکھاڑ کر بلند کیا حتیٰ کہ
آسمان والوں نے کتوں اور مرغوں کی چیخ و پکار کو سنا پھر انہوں نے بلندی سے اس زمین کو پلٹ دیا اور ان پر پتھروں کی کنکریاں
برسائیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، جزء ۷، ص ۲۲۲)

جب عذاب الہی کا وقت آگیا اور رات کی ابتداء ہوئی تو فرشتوں کے اشارہ پر حضرت لوط اپنے خاندان سمیت دوسری
طرف سے نکل کر سدوم سے رخصت ہو گئے لیکن ان کی بیوی نے ان کی رفاقت سے انکار کر دیا اور راستہ ہی سے لوث کر سدوم
واپس آگئی۔ جب رات کا پھیلا پھر ہوا تو پہلے تو ایک ایبت ناک چیخ نے اہل سدوم کو تہ و بالا کر دیا پھر آبادی والی زمین کو اوپر اٹھا کر
الٹ دیا گیا اور اوپر سے پتھروں کی بارش نے ان کا نام و نشان مٹا دیا اور وہی ہوا جو اس سے پہلے کفار کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام
ہو چکا ہے۔

وَالِی مَدِیْنٍ اَخَاهُمْ شَعِیْبًا ط قَالَ یَقَوْمِ اَعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ

اور اہل مدین کی طرف ہم نے ان کے (ہم قبیلہ) بھائی شعیب کو بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے

مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرَہٗ ط قَدْ جَآءَتْكُمْ بَیِّنَاتٌ مِّنْ رَبِّکُمْ فَارْجِعُوْا لَکِیْلٍ

سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے، پس تم

وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ وَلَا تَقْسِدُوْا فِی

پورا پورا ناپ اور تول کرو، اور لوگوں کو کم تول کر ان کی چیزیں نہ دو، اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں

الْاَرْضِ بَعْدَ اَصْلَاحِہَا ط لَیْکُمْ خَیْرٌ لِّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۸۵﴾

فساد نہ کرو، اگر تم ایمان لانے والے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے ۰

وَلَا تَقْعُدُوْا وَاِبْکُلٍ مِّنْ اِطْرَافِہِمْ وَاَعْدُوْنَ وَتَصَدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ

اور ہر راستہ پر اس لیے نہ بیٹھو کہ ایمان والوں کو ڈراؤ اور اللہ کے راستہ پر چلنے سے

اللّٰهِ مِنْ اَمْنٍ بِہٖ وَتَبْغُوْنَہَا عِوَجًا ط وَاذْکُرُوْا اِذْ کُنْتُمْ قَلِیْلًا

رد کو اور اس (سیدھے) راستہ کو ٹیڑھا کرنے کی کوشش کرو، اور یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے

فَکَثَرْتُمْ وَاَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۸۶﴾ وَاِنْ کَانَ

تو اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا، اور غور سے دیکھ لو مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے ۰ اگر تمہاری ایک بات

طَائِفَةٌ مِّنْكُمْ آمَنُوا بِالَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ وَطَائِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا

اس (دین) پر ایمان لائی جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی ،

فَاصْبِرْ وَرَاحَتِي يَخْتَصِمُ اللَّهُ بَيْنَنَا وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴿۸۷﴾

تو صبر کرو حتیٰ کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اہل مدین کی طرف ہم نے ان کے (ہم قبیلہ) بھائی شعیب کو بھیجا انہوں نے کہا: اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہاری عبادت کا کوئی مستحق نہیں ہے، بے شک تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے، پس تم پورا پورا اناپ اور تول کرو، اور لوگوں کو کم تول کر ان کی چیزیں نہ دو، اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں فساد نہ کرو، اگر تم ایمان لانے والے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ (الاعراف: ۸۵)

حضرت شعیب کا نام و نسب

حافظ علی بن حسن بن عساکر متوفی ۵۷۱ھ لکھتے ہیں:

ایک قول یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام، بویب بن مدین بن ابراہیم کے بیٹے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ شعیب بن مسمون بن عنقا بن ثابت بن مدین بن ابراہیم کے بیٹے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ یہ سحر بن لادی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم کے بیٹے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اقوال ہیں۔

ان کی دادی اور ایک قول کے مطابق ان کی والدہ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی تھیں۔ یہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ عراق سے شام کی طرف ہجرت کی اور ان کی ساتھ دمشق سے گزرے۔ وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت شعیب اور بلعم اس قبیلہ سے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس دن ایمان لایا تھا جس دن ان کو آگ میں ڈالا گیا تھا اور انہوں نے حضرت ابراہیم کے ساتھ شام کی طرف ہجرت کی اور حضرت ابراہیم نے حضرت لوط کی بیٹیوں سے ان دونوں کا نکاح کر دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ اہل تورات کے نزدیک ان کا نام تورات میں میکائیل ہے اور سریانیہ میں ان کا نام حری بن ہسعو ہے اور عبرانیہ میں ان کا نام شعیب ہے۔

مدین اور اصحاب الایکھ ایک قوم ہیں یا الگ الگ؟

عکرمہ نے کہا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے سوا کسی نبی کو دو مرتبہ نہیں بھیجا گیا۔ ان کو ایک مرتبہ مدین کی طرف بھیجا گیا پھر اس قوم کی نافرمانی کی بناء پر اس کو ایک زبردست گرج دار آواز سے ہلاک کر دیا گیا اور دوسری دفعہ ان کو اصحاب الایکھ (سر سبز جھاڑیوں والے علاقے کے رہنے والے) کی طرف بھیجا گیا جن کو سائبان والے عذاب نے پکڑ لیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن فرمایا مدین اور اصحاب الایکھ دو امتیں ہیں جن کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا (ہر چند کہ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے لیکن اس حدیث کی بنا پر یہی قول راجح ہے کہ یہ دو الگ الگ امتیں ہیں۔ سعیدی غفرلہ)

قواد نے کہا اللہ تعالیٰ نے جو اصحاب الرس (اندھے کنوئیں والے) (الفرقان: ۳۸) فرمایا ہے اس سے مراد حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم ہے۔

اور ایک قول یہ ہے کہ مدین اور اصحاب الایکھ ان دونوں سے مراد ایک قوم ہے۔

(مختصر تاریخ دمشق، ج ۱۰، ص ۳۰۹-۳۰۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۰۵ھ)

حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ کی تحقیق یہ ہے کہ اصحاب الایکھ اور مدین دونوں سے مراد ایک ہی قوم ہے۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے:

مدین اس قوم کا نام ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے مدین کی نسل سے ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام بھی اسی نسل سے تھے اور قوم مدین جس علاقہ میں آباد تھی وہ سرسبز جھاڑیوں پر مشتمل تھا اس لیے اس کو اصحاب الایکھ بھی کہا گیا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس علاقہ میں ایک نام کا ایک درخت تھا اور مدین اس درخت کی پرستش کرتے تھے اس لیے ان کو اصحاب الایکھ کہا گیا۔ بہر حال مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ الگ الگ قومیں ہیں یا یہ دونوں ایک قوم ہیں۔

(البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۱۹۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حضرت شعیب کا مقام بعثت

قرآن مجید میں ہے:

وانهما لبامام مبین (الحجر: ۷۹) اور لوط کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھیں۔

جو شاہراہ حجاز کے قافلوں کو شام، فلسطین، یمن، بلکہ مصر تک لے جاتی تھی اور بحر قلزم کے مشرقی کنارے سے ہو کر گزرتی تھی قرآن مجید اسی کو امام مبین فرماتا ہے۔ یہ شاہراہ قریشی قافلوں کے لیے بہت متعارف اور تجارتی سڑک تھی۔ مدین کا قبیلہ بحر قلزم کے مشرقی کنارہ اور عرب کے شمال مغرب میں شام کے متصل حجاز کا آخری حصہ تھا۔ بعض متاخرین لکھتے ہیں:

مدین کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا۔ مگر جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانہ میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور -نبوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی اور ایک دوسری تجارتی شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں واقع تھیں۔ اسی بناء پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقع تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی، کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔

حضرت شعیب کی قوم پر عذاب کا نزول

سورۃ الشعراء میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب نازل کرنے کا ذکر فرمایا ہے۔ ان آیتوں کا ترجمہ یہ ہے:

اصحاب الایکھ نے رسولوں کی تکذیب کی ○ جب ان سے شعیب نے کہا کیا تم نہیں ڈرتے؟ ○ بے شک میں تمہارے لیے امانت دار رسول ہوں ○ سو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو ○ میں تم سے اس کی تبلیغ پر کوئی اجر طلب نہیں کرتا میرا اجر تو صرف اللہ رب العلمین پر ہے ○ پورا پورا ناپ کر دو اور کم ناپنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ ○ اور درست ترازو سے وزن کرو ○ اور لوگوں کی چیزیں کم تول کرنے دو اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ ○ اور اس سے ڈرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلی جماعتوں کو پیدا کیا ہے ○ انہوں نے کہا: آپ تو صرف سحر زدہ لوگوں میں سے ہیں ○ اور آپ تو صرف ہم جیسے بشر ہیں، اور ہم آپ کو صرف جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں ○ اگر آپ سچے ہیں تو ہم پر آسمان کا کوئی نکڑا گرا دیں ○ شعیب نے کہا: میرا رب تمہارے کاموں کو

تبیان القرآن

جلد چہارم

خوب جانتا ہے O تو انہوں نے شعیب کو جھٹلایا پس ان کو سائبان والے دن کے عذاب نے پکڑ لیا۔ بے شک وہ بڑے خوفناک دن کا عذاب تھا O بے شک اس میں ضرور نشانی ہے اور ان کے اکثر مومن نہ تھے O اور بے شک آپ کا رب ہی ضرور غالب بہت رحم فرمانے والا ہے O (الشعراء: ۱۹۱-۱۷۶)

ایک اور مقام پر فرمایا:

اور شعیب کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: (اے لوگو!) اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو یقیناً نقصان اٹھانے والے ہو گے O تو ان کو ایک زلزلہ نے پکڑ لیا پھر انہوں نے اس حال میں صبح کی کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ ہلاک ہوئے پڑے تھے O (الاعراف: ۹۱-۹۰)

علامہ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

علماء نے کہا ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب کو مدین کی طرف بھیجا تو ان کی عمر بیس سال تھی۔ یہ لوگ ناپ اور تول میں کمی کیا کرتے تھے۔ حضرت شعیب نے ان کو کمی کرنے سے منع فرمایا۔ حضرت شعیب کا لقب خطیب الانبیاء ہے کیونکہ وہ اپنی قوم کو بہت اچھا جواب دیتے تھے۔ جب ان کی قوم کی سرکشی نے بہت طول پکڑا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر سخت گرمی مسلط کر دی۔ وہ اپنے گھروں میں گئے تو وہاں بھی گرمی کا سامنا تھا۔ پھر وہ جنگل کی طرف نکل گئے تو اللہ تعالیٰ نے ایک بادل بھیجا جس نے ان کو دھوپ سے سایہ مہیا کیا اس بادل کے نیچے ان کو بہت ٹھنڈک اور آرام ملا۔ پھر انہوں نے باقی لوگوں کو بلایا اور سب اس بادل کے نیچے جمع ہو گئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک آگ بھیجی جس نے ان سب کو جلادیا۔ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ یوم الظلمہ (سائبان یا بادل کے دن) کا عذاب تھا۔

مدین کی ہلاکت کے بعد حضرت شعیب نے باقی عمر اصحاب الایکہ میں گزار دی اور انہیں اللہ سبحانہ کی طرف دعوت دیتے رہے اور انہیں اللہ تعالیٰ کو واحد ماننے اور اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیتے رہے مگر ان کی سرکشی دن بہ دن بڑھتی رہی پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر گرمی مسلط کی اور ان پر بھی وہی عذاب آیا۔ (مرآة الزمان، ج ۱، ص ۳۸۸-۳۸۷)

قنادہ نے بیان کیا ہے کہ اہل مدین کو ایک زبردست گرج دار آواز کا عذاب آیا تھا اور اصحاب الایکہ پر مسلسل سات دن گرمی مسلط کی گئی پھر اللہ تعالیٰ نے آگ بھیجی جس نے ان کو کھالیا اور یہی یوم الظلمہ کا عذاب تھا۔ (سورہ الاعراف میں مدین پر زلزلہ کے عذاب کا ذکر ہے یہ زلزلہ اسی آواز سے آیا تھا اور سورہ الشعراء میں اصحاب الایکہ پر یوم الظلمہ کے عذاب کا ذکر ہے)

ابو المنذر نے کہا پھر حضرت شعیب نے اپنی بیٹی کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نکاح کر دیا پھر وہ مکہ چلے گئے اور وہیں فوت ہو گئے اور ان کی عمر ایک سو چالیس سال تھی اور ان کو حجر اسود کے سامنے مسجد حرام میں دفن کیا گیا۔

(المنتظم، ج ۱، ص ۲۱۱-۲۰۹، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر کے متعلق دوسری روایت یہ ہے:

حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر

شیخ محمد حفظ الرحمن سیوہاروی لکھتے ہیں:

حضرت شعیب علیہ السلام کی قبر ہے جو زیارت گاہ عوام و خواص ہے وہاں کے باشندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ شعیب (علیہ السلام) کی قبر ہے۔ حضرت شعیب مدین کی ہلاکت کے بعد یہاں بس گئے تھے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ حضرت موت کے مشہور شہر

”شیون“ کے مغربی جانب ایک مقام ہے جس کو شام کہتے ہیں۔ اس جگہ اگر کوئی مسافر وادی ابن علی کی راہ ہوتا ہوا شمال کی جانب چلے تو وادی کے بعد وہ جگہ آتی ہے جہاں یہ قبر ہے، یہاں مطلق کوئی آبادی نہیں ہے اور جو شخص بھی یہاں آتا ہے صرف زیارت ہی کے لیے آتا ہے۔ (قصص القرآن، ج ۱، ص ۳۵۳، مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۷۲ء)

شیخ حفظ الرحمن کے اس اقتباس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام اور نفوس قدسیہ کی مبارک قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنا دنیا کے تمام مسلمانوں کا شعار رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (نیز شعیب نے کہا) اور ہر راستہ پر اس لیے نہ بیٹھو کہ ایمان والوں کو ڈراؤ، اور اللہ کے راستہ پر چلنے سے روکو، اور اس (سیدھے) راستہ کو ٹیڑھا کرنے کی کوشش کرو، اور یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے تو اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا اور غور سے دیکھ لو مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے، اگر تمہاری ایک جماعت اس (دین) پر ایمان لائی جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی تو صبر کرو حتیٰ کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ (الاعراف: ۸۷-۸۶)

ڈرا دھمکا کر ناجائز رقم ہٹانے والے

حضرت شعیب علیہ السلام نے مدین کو راستہ پر بیٹھنے سے منع فرمایا کیونکہ وہ راستہ پر بیٹھ کر ایمان والوں کو ڈراتے تھے اور اللہ کے راستہ پر چلنے سے لوگوں کو روکتے تھے۔

حضرت ابن عباس، قتادہ اور مجاہد نے بیان کیا ہے کہ وہ ان راستوں پر بیٹھ جاتے تھے جو حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف جاتے تھے اور جو لوگ حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف جانا چاہتے تھے ان کو روکتے تھے اور کہتے تھے ان کے پاس نہ جاؤ وہ کذاب ہیں، جیسا کہ قریش نبی ﷺ کے ساتھ کرتے اور یہ اس آیت کا ظاہری معنی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس سے مراد ڈاکہ ڈالنا ہے جو لوگ راستہ پر چلنے والے مسافروں کو ڈرا دھمکا کر لوٹ لیتے ہیں۔ اس کی پوری تفصیل اور تحقیق المائدہ: ۳۳ میں گزر چکی ہے۔

بعض علماء نے کہا: اس زمانہ میں اس سے مراد ناجائز ٹیکس وصول کرنے والے ہیں جو لوگوں سے جبراً وہ وصول کرتے ہیں جو شرعاً ان پر لازم نہیں ہیں۔ ہمارے زمانہ میں حکمرانوں نے ہر چیز پر انواع و اقسام کے ٹیکس عائد کیے ہوئے ہیں اور عوام کے ٹیکسوں سے صدر، وزیر اعظم، وفاقی وزراء، گورنر اور صوبائی وزراء کی رہائش کے لیے عالی شان محل نما بنکے اور کوٹھیاں ہیں۔ ان کے سفر کرنے کے لیے خصوصی طیارے ہیں۔ یہ سال میں ان گنت مرتبہ بیرونی دوروں پر جاتے ہیں اور اپنے ساتھ خوشامدیوں کے ٹولے کو لے جاتے ہیں اور ان کو شاپنگ کے لیے بڑی بڑی رقمیں دی جاتی ہیں۔ ان کے اللوں تلوں پر مشتمل اخراجات لاکھوں روپیہ سے متجاوز ہیں۔ غریب عوام کے کھانے کے لیے روٹی بمشکل میسر ہوتی ہے، سر چھپانے کے لیے چھت کا سایہ حاصل کرنا بہت کٹھن ہے اور یہ عوام کے خون پسینے سے کمائی ہوئی رقم سے جبراً ٹیکس وصول کر کے بے دردی سے اپنی عیاشیوں پر خرچ کرتے ہیں۔ قومی منصوبوں کے نام پر عالمی بینک سے قرض لیتے ہیں اور اس رقم کو اپنی عیاشیوں میں خرچ کر دیتے ہیں اور قوم کو قرض میں گرفتار کر دیتے ہیں۔

ہمارے زمانہ میں غنڈے، مسنڈے اور دہشت گرد دکانوں اور گھروں سے زبردستی بھتہ وصول کرتے ہیں۔ فظورانہ، زکوٰۃ اور چرم ہائے قربانی بھی جبراً وصول کرتے ہیں اور اس رقم کو اسلحہ خریدنے اور اپنی رنگ رلیوں اور عیاشیوں پر خرچ کرتے ہیں۔ گاڑیاں چھین کر ڈاکے ڈالتے ہیں اور قتل و غارت گری کی وارداتیں کرتے ہیں۔ وہ بھی

اس آیت کے عموم میں داخل ہیں۔

قوم شعیب کو ترغیب اور ترہیب

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب کا یہ قول نقل فرمایا: اور یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے تو اللہ نے تم کو زیادہ کر دیا۔ اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ ان کو اللہ کی اطاعت پر برانگیختہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ان کو دور رہنے کی ترغیب دی جائے۔ اس آیت کے تین محمل ہیں۔ ایک یہ کہ تم عدد میں کم تھے تو تم کو تعداد میں زیادہ کر دیا۔ دوسرا یہ کہ تمہارے پاس مال کم تھا تو تم کو زیادہ مال عطا کیا اور تیسرا یہ کہ تم جسمانی طور پر کمزور تھے تو تم کو طاقتور کر دیا۔

اس کے بعد فرمایا: غور سے دیکھ لو مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ پہلی آیت میں ان کو ایمان لانے کی ترغیب دی تھی اور اس آیت میں ان کو ترہیب کی ہے اور ایمان نہ لانے پر ڈرایا ہے۔

قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَشْعِبُ

ان (شعیب) کی قوم کے شکر سرداروں نے کہا اے شعیب! ہم تم کو اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں ضرور

وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرِيْبَتِنَا أُولَئِكَ فِي مِلَّتِنَا قَالَ

اپنی بستی سے نکال دیں گے یا پھر تم ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ، شعیب نے جواب دیا خواہ

أَوْ كُنتُمْ كَارِهِينَ ﴿۸۸﴾ قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنْ عُدْنَا فِي

ہم اس کو ناپسند کرنے والے ہوں۔ بیشک ہم نے اللہ پر بہتان باندھ دیا اگر ہم تمہارے دین میں داخل ہو

مِلَّتِكُمْ بَعْدَ إِذْ نَجَّيْنَا اللَّهُ مِنْهَا وَمَا يَكُوْنُ لَنَا أَنْ نَعُوْدَ فِيهَا

گئے اس کے بعد کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے اور ہمارے لیے اس دین میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے

إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا عَلَى اللَّهِ

سوا اس کے کہ اللہ ہی چاہے جو ہمارا رب ہے، ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے، ہم نے اللہ پر ہی توکل

تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَأَنْتَ خَيْرُ الْفَاتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾

کیا ہے، اے ہمارے رب! ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ فرما دے اور تو سب اچھا فیصلہ کرنے والا ہے،

وَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِيِنِ اتَّبَعْتُمْ شَعِيْبًا اِنْتُمْ

اطس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا (اے لوگو!) اگر تم نے شعیب کی اتباع کی تو تم ضرور نقصان اٹھانے

إِذَا الْخُسُوفُ ۙ فَاُخْذَتْهُمْ الرِّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جِثْمِينَ ۙ ﴿٩١﴾

والوں میں سے ہو گئے ○ سوان کو ایک ہرناک آواز (زلزلہ) نے پڑا اور جمع کے وقت وہ اپنے گھروں میں اونٹوں سے زبردہ پڑے تھے

الَّذِينَ كَذَّبُوا شَعِيًّا كَانُوا يَخْتَوٰقِيهَا ۙ الَّذِينَ كَذَّبُوا شَعِيًّا

جن لوگوں نے شعیب کی تکذیب کی تھی (وہ صفحہ ہستی سے اس طرح مٹ گئے) گویا کہ کبھی ان گھروں میں بسے ہی نہ تھے، جن لوگوں نے شعیب کی تکذیب

كَانُوا هُمُ الْخٰسِرِينَ ۙ ﴿٩٢﴾ فَتَوَلٰٓى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰ قَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ

کی تھی وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے تھے ○ پھر شعیب ان سے کنارہ کش ہو گئے اور کہا اے میری قوم! میں نے تمہیں اپنے رب کے

رِسٰلَتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۙ ﴿٩٣﴾

پینامات پہنچا دیے تھے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی تھی، تو اب میں کافروں (کے عذاب) پر کیوں کراؤں! ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس (شعیب) کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا: اے شعیب! ہم تم کو اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں، ضرور اپنی بستی سے نکال دیں گے یا پھر تم ہمارے دین میں داخل ہو جاؤ، شعیب نے جواب دیا خواہ ہم اس کو ناپسند کرنے والے ہوں ○ (الاعراف: ۸۸)

حضرت شعیب علیہ السلام پر کفر میں لوٹنے کے اعتراض کے جوابات

قرآن مجید میں ہے اولتعودن فی ملتنا اس کا معنی ہے ”یا پھر تم ہمارے دین میں واپس ہو جاؤ“ اس سے یہ ظاہر ہے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام پہلے ان کے دین میں شامل تھے۔ گویا آپ پہلے (العیاذ باللہ) کافر تھے۔ اس سوال کے متعدد جواب دیے گئے ہیں۔

۱- حضرت شعیب علیہ السلام کے پیروکار ان کے دین میں داخل ہونے سے پہلے کافر تھے۔ سوان کی قوم کے کافر سرداروں نے حضرت شعیب کو تغلیباً ان کے پیروکاروں میں شامل کر کے یہ کہا کہ تم ہمارے دین میں واپس آ جاؤ۔

۲- کافر سرداروں نے عوام پر تلیس اور اشتباہ ڈالنے کے لیے اس طرح کہا تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام پہلے ان کے ہی ہم عقیدہ تھے اور پھر ان سے منحرف ہو کر کسی نئے دین میں داخل ہو گئے اور حضرت شعیب نے جواب بھی ان کے ایہام کے موافق دیا کہ اگر ہم تمہارے دین میں واپس آ گئے۔

۳- حضرت شعیب علیہ السلام ابتداء میں اپنے دین کو مخفی رکھتے تھے۔ اس سے انہوں نے یہ سمجھا کہ وہ اپنی قوم کے دین پر ہیں۔

۴- اس آیت میں عود مبرورت کے معنی میں ہے یعنی یا پھر تم ہمارے دین میں آ جاؤ اور ہم نے اسی اسلوب پر اس آیت کا ترجمہ کیا ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے بطور استفہام انکار اور تعجب کے فرمایا کہ تم ہمیں اپنے دین میں داخل ہونے کے لیے کہتے ہو کیا تم ہمیں ہماری مرضی اور پسند کے خلاف اپنے دین میں داخل کر لو گے، تم کو یہ علم نہیں کہ توحید کا عقیدہ ہمارے دلوں

میں پوست ہے اس کو کوئی نہیں نکال سکتا۔ تم ہمیں اس بستی سے نکلنے کی دھمکی دیتے ہو تو سن لو کہ دین کی محبت کے مقابلہ میں وطن کی محبت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (حضرت شعیب نے کہا) بے شک ہم نے اللہ پر بہتان باندھ دیا اگر ہم تمہارے دین میں داخل ہو گئے اس کے بعد کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے اور ہمارے لیے اس دین میں داخل ہونا ممکن نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ ہی چاہے جو ہمارا رب ہے ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے، ہم نے اللہ ہی پر توکل کیا ہے، اے ہمارے رب ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ فرمادے اور تو سب سے اچھا فیصلہ فرمانے والا ہے (الاعراف: ۸۹)

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں تمہارے دین میں دخول سے محفوظ رکھا ہے اور ہمیں اب کفر میں داخل ہونے پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت میں یہی ہو تو پھر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے اور ہر چیز میں اس کی حکمت بالغہ ہے، سو تم یہ طمع نہ کرو کہ اللہ کی مشیت میں یہ ہو گا کہ وہ اپنے مخلص بندوں کو ایمان پر ثابت قدم نہیں رکھے گا اور وہ ہمیں گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و برتر ہے کہ وہ اپنے مخلص بندوں اور مومنوں کو مرتد کرنا چاہے اور ان کو کفر اور گمراہی میں ڈالنا چاہے یہ چیز اللہ کی حکمت کے خلاف ہے اور ہم نے ہر چیز اور ہر بات میں اللہ ہی پر توکل کر لیا ہے اور جو اللہ پر توکل کرے تو وہ اس کو کافی ہے۔

اور جو اللہ پر توکل کرے تو وہ اسے کافی ہے۔
وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ

(الطلاق: ۳)

توکل کا لغوی اور اصطلاحی معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ نے لکھا ہے کہ توکل کے دو معنی ہیں ایک معنی ہے کسی کو والی بنانا اور دوسرا معنی ہے کسی پر اعتماد کرنا۔ (المفردات، ج ۲، ص ۶۸۹، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ المکرمہ) علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ لکھتے ہیں:

توکل یہ ہے کہ تمام معاملات کو اللہ کے حوالے کر دیا جائے جو مسبب الاسباب ہے اور اسباب عادیہ سے قطع نظر کر لی جائے، اور دوسری تعریف یہ ہے کہ جو چیز انسان کی طاقت سے باہر ہے اس میں سعی اور کوشش کو ترک کر دیا جائے اور جو سبب اس کی طاقت میں ہے اس کے حصول کی سعی کی جائے اور یہ گمان نہ کرے کہ مسبب کا حصول اس سبب سے ہوا ہے بلکہ اس کے حصول کا اللہ کی جانب سے اعتقاد رکھے۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اونٹنی کو باندھ کر توکل کروں یا اس کو کھلا چھوڑ کر توکل کروں، آپ نے فرمایا: اس کو باندھ کر توکل کرو۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۵۲۵، دار الفکر بیروت، جامع الاصول، ج ۱۱، رقم الحدیث: ۹۵۰۵، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۸ھ) لوہے سے داغنے اور دم کرانے پر توکل سے بری ہونے کا اشکال بہ ظاہر اس حدیث کے معارض یہ حدیث ہے:

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے گرم لوہے سے داغ لگایا یا دم کرنے کو طلب کیا تو وہ توکل سے بری ہو گیا۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۰۶۲، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۸۶۵، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۳۹۰، مسند احمد، ج ۴، ص ۲۳۹)

طبع قدیم 'مسند احمد' ج ۶، رقم الحدیث: ۱۸۲۲۵، طبع جدید 'مسند حمیدی' رقم الحدیث: ۷۶۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸، ص ۶۹، مسند عبد بن حمید، رقم الحدیث: ۳۹۳، السنن الکبریٰ للبیہقی، ج ۹، ص ۳۳۱، جامع الاصول، ج ۷، رقم الحدیث: ۵۶۳۳، شعب الایمان، ج ۲، رقم الحدیث: (۱۱۶۵)

اس حدیث کا یہ معنی نہیں ہے کہ جس شخص نے علاج کی نیت سے اپنے کسی عضو پر گرم لوہے سے داغ لگایا یا کسی شخص سے دم کرایا تو وہ توکل سے بری ہو گیا کیونکہ نبی ﷺ نے خود علاج کرنے کی ہدایت کی ہے۔
دوا کرنے اور علاج کرانے کے متعلق احادیث

حضرت جابر بنی شہذہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر بیماری کی دوا ہے پس جب کسی بیماری کی دوا حاصل ہو جائے تو وہ اللہ کے اذن سے تندرست ہو جاتا ہے۔

(صحیح مسلم، الطب: ۶۹، (۲۲۰۳) ۵۶۳۷، السنن الکبریٰ للنسائی، ج ۴، رقم الحدیث: ۷۵۵۶، مسند احمد، ج ۳، ص ۳۳۵، جامع الاصول، ج ۷، رقم الحدیث: ۵۶۳۷)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ نے کوئی بیماری نازل نہیں کی مگر اس کی دوا بھی نازل کی ہے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۶۷۸، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۳۳۹، جامع الاصول، ج ۷، رقم الحدیث: ۵۶۳۰، السنن الکبریٰ للنسائی، ج ۴، رقم الحدیث: ۷۵۵۵)

حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا ہم دوا کریں آپ نے فرمایا دوا کرو، کیونکہ اللہ نے جو بیماری بنائی ہے اس کے لیے دوا بھی بنائی ہے سوائے بڑھاپے کی بیماری کے۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۸۵۵، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۳۳۶، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۰۳۵، السنن الکبریٰ للنسائی، ج ۴، رقم الحدیث: ۷۵۵۳، مسند الحمیدی، رقم الحدیث: ۸۲۳، جامع الاصول، ج ۶، رقم الحدیث: ۵۶۲۸، الادب المفرد، رقم الحدیث: ۲۹۱، صحیح ابن حبان، ج ۱۳، رقم الحدیث: ۶۰۶۱، مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۸، ص ۲، المعجم الکبیر، ج ۱، رقم الحدیث: ۳۶۹، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۹، ص ۳۳۳)

حضرت جابر بنی شہذہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف ایک طبیب بھیجا، اس نے ان کی ایک رگ کاٹی پھر اس پر گرم لوہے سے داغ لگایا۔

(صحیح مسلم، سلام: ۷۳، (۲۲۰۷) ۵۶۳۱، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۸۶۳، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۳۹۳، مسند احمد، ج ۳، ص ۳۰۳، مسند عبد بن حمید، رقم الحدیث: ۱۰۱۸، جامع الاصول، ج ۷، رقم الحدیث: ۶۵۸۵)

حضرت جابر بنی شہذہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ کو تیر کے زخم کی وجہ سے گرم لوہے سے داغ لگایا۔ (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۸۶۶، جامع الاصول، ج ۷، رقم الحدیث: ۵۶۸۳)

دوا اور دم سے نبی ﷺ کا علاج کرانا رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اپنا علاج فرمایا ہے۔

سئل بن سعد بنی شہذہ سے سوال کیا گیا کہ نبی ﷺ کا کس چیز سے علاج کیا گیا تھا؟ انہوں نے کہا: اب اس چیز کو مجھ سے زیادہ جاننے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ڈھال میں پانی لے کر آتے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس سے زخم کو دھوتیں

پھر چٹائی کو جلایا گیا اور اس کی راکھ زخم میں بھردی گئی۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۲۳۳، صحیح مسلم، جلد: ۱۰۰، ۱۷۹۰) سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۰۹۲، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۳۶۳، مسند احمد، ج ۸، رقم الحدیث: ۲۲۸۶۳، صحیح ابن حبان، ج ۱۳، رقم الحدیث: ۶۵۷۸)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ گردن کی دونوں جانبوں کی رگوں اور کندھوں کے درمیان فصد لگواتے تھے اور آپ سترہ انیس اور اکیس تاریخ کو فصد لگواتے تھے۔ (نبی ﷺ نے فرمایا: تمہاری بہترین دوا فصد لگانا ہے)

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۶۹۶، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۰۵۸، ۳۸۶۰، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۳۸۳، صحیح ابن حبان، ج ۱۳، رقم الحدیث: ۶۰۷۷، مسند احمد، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۲۱۹۲، سنن کبریٰ للہیثمی، ج ۹، رقم الحدیث: ۳۳۰، جامع الاصول، ج ۷، رقم الحدیث: ۵۶۷۳)

حضرت سلمیٰ رضی اللہ عنہا جو نبی ﷺ کی خدمت کرتی تھیں وہ بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ کے پیر میں جب بھی کوئی چھالا یا زخم ہوتا تو آپ مجھے حکم دیتے کہ میں اس پر ہندی لگا دوں۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۰۵۳، سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۳۸۵۸، مسند عبد بن حمید، رقم الحدیث: ۱۵۶۳، مسند احمد، ج ۶، ص ۳۶۲، جامع الاصول، ج ۷، رقم الحدیث: ۵۶۳۵)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ بیمار ہوتے تو ایک مٹھی کلونجی پھانک لیتے اور اس کے اوپر پانی اور شہد پیتے۔ (المعجم الاوسط، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۰۹، مجمع الزوائد، ج ۵، ص ۸۷)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب نبی ﷺ بیمار ہوتے تو حضرت جبریل آکر آپ پر ان کلمات سے دم کرتے باسم یبریک ومن کل داء یشفیک ومن شر حاسد اذا حسد وشر کل ذی عین۔
(صحیح مسلم، الطب، ۳۹، (۲۱۸۵) ۵۵۹۵)

اشکال مذکور کا جواب

جب ان متعدد احادیث صحیحہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ نبی ﷺ نے بیماری میں علاج کرنے کا حکم دیا ہے اور آپ نے خود بھی بیماری میں علاج کیا ہے اور آپ پر دم کیا گیا ہے اور آپ نے صحابہ کا داغ لگانے سے علاج کیا ہے، تو واضح ہو گیا کہ دوا، دم اور علاج کے ذریعہ اسباب کی رعایت کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ کھانے کے ذریعہ بھوک کو دور کرنا اور پانی کے ذریعہ پیاس کو دور کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ نبی ﷺ غار حراء میں کئی کئی دنوں کا کھانا لے کر جاتے تھے۔ ازواج مطہرات کو ایک سال کی خوراک فراہم کرتے تھے۔ جنگ احد میں آپ دو زہر ہیں پہن کر گئے تھے، بیماری میں علاج کرتے تھے، دم کراتے تھے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ کسی مقصود کے اسباب کو حاصل کرنا توکل کے منافی نہیں ہے کیونکہ آپ سید المتوکلین ہیں، اور جس حدیث میں یہ ہے کہ جس شخص نے گرم لوہے سے جسم کو داغایا دم کرایا، وہ توکل سے بری ہو گیا۔ اس کی تاویل یہ ہے کہ جس نے ان کو شفا کا قطعی اور یقینی سبب گمان کیا اور اس سے غافل ہو گیا کہ شفاء اللہ نے دینی ہے تو وہ توکل سے بری ہو گیا، اور جس نے یہ گمان کیا کہ یہ محض اسباب غالبہ ہیں اور شفا کی صرف اللہ سے امید رکھی تو اس کا توکل اپنے حال پر ہے جیسا کہ نبی ﷺ کی سیرت مبارکہ سے ظاہر ہے۔

توکل کی تعریف پر ایک اور اشکال کا جواب
یہ حدیث بھی بہ ظاہر توکل کی تعریف کے خلاف ہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر تم اللہ پر اس طرح توکل کرو جس طرح توکل کرنے کا حق ہے تو تمہیں اس طرح رزق دیا جائے گا جس طرح پرندوں کو رزق دیا جاتا ہے، وہ صبح کو خالی پیٹ ہوتے ہیں اور شام کو ان کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۳۵۱، جامع الاصول، ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۶۱۹، مسند احمد، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۰۵، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۱۶۳، کتاب الزہد لابن المبارک، رقم الحدیث: ۵۵۹، مسند ابو یعلیٰ، ج ۱، رقم الحدیث: ۲۳۷، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۷۳۰، المستدرک، ج ۳، ص ۳۱۸، حلیہ الاولیاء، ج ۱۰، ص ۶۹، شعب الایمان، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۱۸۲)

اللہ تعالیٰ پر کماحقہ توکل کرنے کا معنی یہ ہے کہ تم یہ یقین رکھو کہ ہر چیز کو وجود میں لانے والا صرف اللہ ہے اور کسی چیز کا ملنا یا نہ ملنا، نفع اور نقصان، فقر اور غنا، مرض اور صحت، امتحان میں کامیابی اور ناکامی، موت اور حیات اور ان کے علاوہ دوسری چیزیں سب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اختیار میں ہیں۔ پھر اس یقین کے ساتھ اپنے مطلوب کو حاصل کرنے کے لیے اسباب کو بروئے کار لایا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسے ہی شاد کام کرے گا جیسے وہ پرندوں کو شاد کام کرتا ہے وہ صبح رزق کی تلاش میں خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کو بھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ واپس آتے ہیں۔ اس حدیث کا معنی یہ نہیں ہے کہ کسب کو ترک کر دیا جائے کیونکہ پرندے بھی رزق کی تلاش میں سعی اور کسب کرتے ہیں۔

امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ فرماتے ہیں قناعت اور توکل کے بعض مدعی بغیر زاد راہ کے سفر کرتے ہیں اور وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ بدعت ہے، صحابہ اور سلف صالحین سے منقول نہیں ہے بلکہ سلف صالحین زاد راہ لے کر سفر کرتے تھے اور ان کا توکل زاد راہ پر نہیں اللہ پر ہوتا تھا۔ (احیاء العلوم، ج ۳، ص ۲۳۱، مطبوعہ دار الخیر، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

حضرت شعیب علیہ السلام جب اپنی قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے دعا کی: اے ہمارے رب ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ فرمادے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ ان کی کافر قوم پر عذاب نازل فرمائے جس سے حضرت شعیب کا اور ان کے متبعین کا حق پر ہونا واضح ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس کی قوم کے کافر سرداروں نے کہا (اے لوگو!) اگر تم نے شعیب کی اتباع کی تو تم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گے ○ سو ان کو ایک ہولناک آواز (زلزلہ) نے پکڑ لیا اور صبح کے وقت وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ مردہ پڑے تھے ○ جن لوگوں نے شعیب کی تکذیب کی تھی (وہ صفحہ ہستی سے اس طرح مٹ گئے) گویا کہ کبھی ان گھروں میں بے ہی نہ تھے، جن لوگوں نے شعیب کی تکذیب کی تھی وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے تھے ○ پھر شعیب ان سے کنارہ کش ہو گئے اور کہا اے میری قوم! میں نے تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے تھے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی تھی تو اب میں کافروں (کے عذاب) پر کیوں افسوس کروں ○

(الاعراف: ۹۳-۹۰)

نزول عذاب سے حضرت شعیب علیہ السلام کی نبوت کی صداقت

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا تھا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم نے حضرت شعیب کی تکذیب کی۔ اس آیت میں ان کی ایک اور گمراہی کا ذکر فرمایا کہ انہوں نے لوگوں سے کہا: اگر تم نے شعیب کی اتباع کی تو تمہیں نقصان ہو گا۔ اس کا ظاہر مطلب یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی اتباع کے بعد تم کو وہ فائدہ حاصل نہیں ہو گا جو تم ناپ تول میں کمی کے ذریعہ حاصل کرتے تھے۔ یا ان کا مطلب یہ تھا کہ تم دین میں گھمانے میں رہو گے، کیونکہ ان کے نزدیک حضرت شعیب علیہ السلام کا دین باطل

تبیان القرآن

جلد چہارم

بِأَسْوَاحِي وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿۹۸﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ فَلَا يَأْمَنُ

چاشت کے وقت آجائے جب وہ کھیل کود میں مشغول ہوں ○ تو کیا وہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہیں؛ حالانکہ اللہ کی خفیہ

مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمَ الْخَاسِرُونَ ﴿۹۹﴾

تدبیر سے صرف وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو تباہ و برباد ہونے والے ہوں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا تو ہم نے (اس نبی کی تکذیب کے باعث) اس بستی والوں کو تنگی اور تکلیف میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ فریاد کریں ○ پھر ہم نے ان کی بد حالی کو خوش حالی سے بدل دیا حتیٰ کہ وہ خوب پھلے پھولے اور انہوں نے کہا: ہمارے باپ دادا پر بھی تنگی اور فراخی آتی رہی ہے سو ہم نے ان کو اچانک گرفت میں لے لیا اور ان کو پتہ بھی نہیں چلا۔ (الاعراف: ۹۵-۹۴)

مشکل الفاظ کے معانی

قریبہ: وہ جگہ جس میں لوگ اجتماعی طور پر رہتے ہوں، اس کا اطلاق شہروں اور دیہاتوں دونوں پر ہوتا ہے۔
الباساء: شدت اور مشقت۔ مثلاً جنگ کی مشقت، ناپسندیدہ اور ناگوار چیز۔ اس کا اطلاق زیادہ تر فقر اور جنگ کی مصیبت پر ہوتا ہے۔

الضراء: وہ چیز جو انسان کے نفس یا اس کی معیشت میں ضرر پہنچائے۔ مثلاً مرض، اس کا مقابل السراء اور النعماء ہے۔
يضرعون: اس کا معنی ضعف اور ذلت ہے۔ اس سے مراد ہے تذلل اور عاجزی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنا۔
عفوا: عفو کا معنی ہے کسی چیز کو حاصل کرنے کا قصد کرنا۔ گناہ سے درگزر کرنا، کسی چیز میں زیادتی کا قصد کرنا، یا زیادہ ہونا یہاں یہی مراد ہے۔

رج اور راحت کے نزول میں کافروں اور مسلمانوں کے احوال اور افعال کا فرق
اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کی قوموں پر ان کے کفر اور تکذیب کی وجہ سے عذاب نازل کرنے کا ذکر فرمایا تھا اور اس آیت میں ایک عام قاعدہ بیان فرمایا ہے کہ جس بستی میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں کی طرف کوئی رسول بھیجا اور پھر اس بستی والوں نے اس رسول کی تکذیب کی تو پہلے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ کی اور جب وہ تنبیہ کے باوجود اپنی سرکشی سے باز نہیں آئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ملیامیت کرنے کے لیے عذاب بھیج دیا اور جن اقوام پر عذاب بھیجنے کا اللہ تعالیٰ نے پہلے ذکر کیا ہے وہ صرف ان اقوام کی خصوصیت نہ تھی۔

اور تمام قوموں کی یہ سرشت رہی ہے کہ پہلے اللہ ان کو تنگی، بیماری اور قحط کی آفتوں میں مبتلا کرتا ہے۔ پھر ان کو فراخی اور صحت عطا فرماتا ہے اور خشک سالی دور فرمادیتا ہے تاکہ وہ اللہ کو پہچانیں اور اس کی نعمتوں کی قدر کریں اور اس پر ایمان لائیں۔ لیکن جب وہ ان نعمتوں سے اچھی طرح فائدہ اٹھا لیتے ہیں، ان کی تعداد اور ان کے مال میں زیادتی ہو جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ایسا ہمیشہ سے ہمارے باپ دادا کے ساتھ بھی ہوتا رہا ہے، کبھی ان پر برے دن آتے تھے اور کبھی اچھے دن۔ یہ اللہ کی قدرت اور وحدانیت یا اس کے رسول کی صداقت کی دلیل نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کافر مصیبت سے عبرت حاصل کرتے ہیں نہ راحت پر شکر ادا کرتے ہیں، اور مومن کی کیفیت اس کے بالکل برعکس ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

حضرت مصیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن کے حال پر تعجب ہوتا ہے اس کے ہر حال میں خیر ہے اور یہ صفت مومن کے سوا اور کسی میں نہیں ہے، اگر اس کو راحت پہنچتی ہے تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے تو یہ اس کے لیے خیر ہے۔ اور اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ بھی اس کے لیے خیر ہے۔

(صحیح مسلم، زہد: ۶۳، (۲۹۹۹) ۷۳۶۵، مسند احمد، ج ۴، ص ۳۳۲، سنن دارمی، رقم الحدیث: ۲۷۸۰، جامع الاصول،

ج ۹، رقم الحدیث: ۷۰۱۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مومن مرد اور مومن عورت کی جان، مال اور اولاد پر ہمیشہ مصیبتیں آتی رہتی ہیں حتیٰ کہ وہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کرتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۴۰۷، مسند احمد، ج ۳، رقم الحدیث: ۸۹۱۸، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۹۱۳،

المستدرک، ج ۱، ص ۳۳۶)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں اپنے بندے کی دنیا میں دو آنکھیں لے لیتا ہوں تو میرے نزدیک اس کے لیے جنت کے سوا اور کوئی جزا نہیں ہے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۶۵۳، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۴۰۸، جامع الاصول، ج ۶، رقم الحدیث: ۴۶۲۵)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن اہل عافیت جب مصیبت اٹھانے والوں کا ثواب دیکھیں گے تو یہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کی کھال کو دنیا میں قینچی سے کاٹ دیا جاتا۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۴۱۰، المسکوٰۃ، رقم الحدیث: ۱۵۷۰، الترغیب والترہیب، ج ۴، ص ۲۸۲)

پس مسلمانوں کو چاہیے کہ جب ان پر مصائب آئیں تو وہ یہ یقین کریں کہ یہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہیں اور ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جائیں گے۔ وہ ان مصائب پر صبر کریں اور ان پر اوپلانا نہ کریں اور حرف شکایت زبان پر نہ لائیں اور جب ان پر اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو تو اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کریں اور اگر انہوں نے رنج و راحت کے ایام کو گردشِ دوراں اور زمانہ کی عادت پر محمول کیا تو پھر ان کا یہ عمل کافروں کے عمل کے مشابہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور ڈرتے رہتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں (کے دروازے) کھول دیتے مگر انہوں نے (رسولوں کو) جھٹلایا تو ہم نے ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا ○ تو کیا بستیوں والے اس بات سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب راتوں رات آجائے جب وہ سو رہے ہوں ○ اور کیا بستیوں والے اس بات سے بے خوف ہیں کہ ہمارا عذاب ان کو چاشت کے وقت آجائے جب وہ کھیل کود میں مشغول ہوں ○ تو کیا وہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے صرف وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو تباہ و برباد ہونے والے ہوں ○

(الاعراف: ۹۹-۹۶)

نیک اعمال نزولِ رحمت کا سبب ہیں اور بد اعمال نزولِ عذاب کا باعث ہیں

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ اگر بستیوں والے اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاتے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے اور جن چیزوں سے اس نے منع کیا ہے ان سے باز رہتے تو اللہ ان پر آسمانوں اور زمینوں سے برکتوں کے دروازے کھول

دیتا۔ آسمان سے بارشیں نازل فرماتا اور زمین سبزہ اور فصل اگاتی اور ان کے جانوروں اور مویشیوں میں کثرت ہوتی اور ان کو امن اور سلامتی حاصل ہوتی لیکن انہوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر اور ان کی معصیت کی وجہ سے ان پر خشک سالی اور قحط کو مسلط کر دیا۔

اس کے بعد دوسری آیتوں سے مقصود انہیں اس بات سے ڈرانا ہے کہ کہیں ان کی غفلت کے اوقات میں ان پر اچانک عذاب آجائے۔ مثلاً جس وقت یہ سوئے ہوں یا دن کے کسی وقت میں جب یہ سو و لعب میں مشغول ہوں تو ان پر اچانک عذاب آجائے۔ پھر فرمایا: کیا یہ اللہ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں اور اللہ کی خفیہ تدبیروں میں سے یہ ہے کہ ان کی بے خبری میں اچانک ان پر عذاب آجائے۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ ایمان صحیح اخروی سعادت اور دنیاوی کشادگی کا سبب ہے اور کفر اور معصیت عذاب کا لازمی نتیجہ ہے۔ ان آیات میں مسلمانوں کو اعمال صالحہ کی ترغیب دی ہے اور کافروں کو عذاب سے ڈرایا ہے۔

أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِ أَهْلِهَا أَنْ لَوْ

جو لوگ سابق ساکنین ارض کے بعد اس زمین کے وارث ہوئے کیا انہوں نے یہ ہدایت نہیں پائی کہ اگر ہم

نَشَاءُ أَصَبْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَمَا لَا يَشْعُرُونَ

چاہیں تو ان کو ان کے گناہوں کی سزا دیں، اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پھر وہ کچھ نہیں سنتے ○

تِلْكَ الْقُرَى نَقِصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَاءِهَا ۚ وَلَقَدْ جَاءَتْهُمْ رُسُلٌ

یہ وہ بستیاں ہیں جن کی خبریں ہم آپ کو بیان کرتے ہیں، بیشک ان بستیوں والوں کے پاس ان کے رسول واضح

بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا مِنْ قَبْلُ كَذَلِكَ يَطْبَعُ

مہجرات لے کر آئے ہیں پس وہ ان پر ایمان لانے کے لیے بالکل تیار نہ ہوئے کیوں کہ اس سے پہلے وہ ان کی تکذیب کر چکے تھے،

اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ الْكَافِرِينَ ۙ وَمَا وَجَدْنَا إِلَّا كَثْرَهُمْ مِنْ عَهْدِ

اسی طرح اللہ تعالیٰ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے ○ اور ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں کو عہد پورا کرنے والا نہ پایا،

وَرَأَوْا وَجَدْنَا أَكْثَرَهُمْ لَفِٰسِقِينَ ۙ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِم مُّوسَىٰ

اور بے شک ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان ہی پایا ○ پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر

بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۚ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ

فرعون اور اس کی جماعت کی طرف بھیجا، انہوں نے ان نشانوں کے ساتھ ظلم کیا، تو آپ دیکھیے کہ فساد کرنے

عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۰۲﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ يُفْرَأُونَ مِنِّي رَسُولٌ

دلوں کا کیا انجام ہوا ○ اور موسیٰ نے کہا اے فرعون میں رب العالمین

مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۰۳﴾ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَن لَّا أَقُولُ عَلَى اللَّهِ إِلَّا

کی طرف سے رسول ہوں ○ میرا یہ منصب ہے کہ میں اللہ کے متعلق حق کے سوا کوئی بات نہ

الْحَقُّ طَقَدَّ جُنُكُم بِيْنِنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۱۰۴﴾

کہوں، بیشک میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک قوی دلیل لایا ہوں (موسے فرعون) تو میرے ساتھ بنو اسرائیل کو بھیج دے ○

قَالَ إِن كُنتَ جِدَّتْ بَايِعَةٍ فَأْتِ بِهَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿۱۰۵﴾

فرعون نے کہا اگر تم کوئی دلیل لائے ہو تو اس کو پیش کرو اگر تم سچے ہو ○

فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿۱۰۶﴾ وَنَزَعْنَا مِن يَدِهِ فَإِذَا هِيَ

پس موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا پس وہ اچانک جیتا جاگتا اژدھا ہو گیا ○ اور اپنا ہاتھ نکالا تو وہ

بَيْضَاءَ لِلنَّظِيرِينَ ﴿۱۰۷﴾

دیکھنے والوں کے لیے روشن ہو گیا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو لوگ سابق ساکنین ارض کے بعد اس زمین کے وارث ہوئے، کیا انہوں نے یہ ہدایت نہیں پائی کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو ان کے گناہوں کی سزا دیں، اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پھر وہ کچھ نہیں سنتے ○ (الاعراف: ۱۰۰)

کفار مکہ پر عذاب نہ بھیجنے کی وجہ

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے پچھلی امتوں کے کفار کا حال اجماعاً اور تفصیلاً بیان فرمایا کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ نے نبی اور رسول بھیجے اور جب انہوں نے بار بار اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور متعدد بار یہ کہا کہ اگر تم سچے ہو تو چاہیے کہ تمہاری مخالفت کرنے کی وجہ سے ہم پر عذاب آئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل کیا جس کے آثار اب بھی جزیرہ نمائے عرب اور اس سے ملحق علاقوں کے راستوں میں پائے جاتے ہیں اور بعض عربوں نے بھی ان کا مشاہدہ کیا تھا۔ مکہ کے کافر بھی نبی کریم ﷺ سے یہ کہتے تھے کہ اگر آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور ہم آپ کی مخالفت کر رہے ہیں تو پھر آپ کی مخالفت کی وجہ سے ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ اہل مکہ جو قوم نوح، قوم ثمود اور قوم مدین کے بعد ان علاقوں میں آباد ہوئے ہیں، کیا پچھلی قوم کے عذاب کے آثار دیکھ کر ان کو یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی عذاب میں مبتلا کر دیں۔ ان کو عذاب نہ دینے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو عذاب دینا ہماری قدرت میں نہیں ہے بلکہ

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو عذاب دینا ہماری حکمت میں نہیں ہے۔

اور کفار مکہ کو عذاب نہ دینے کی ایک حکمت یہ ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ

اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کو عذاب دے
(الانفال: ۳۳) در آنحالیکہ آپ ان میں موجود ہیں۔

کفار مکہ کے دلوں پر مہر لگانے کی توجیہ

اس کے بعد فرمایا: اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے کفر اور عناد کی سزا کے طور پر ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اب یہ ایمان نہیں لاسکتے۔ اور مر سے مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ایسی علامات ثبت کر دی ہیں جن سے فرشتے یہ جان لیتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور اس آیت میں نبی ﷺ کو یہ تسلی دینا ہے کہ اگر آپ کی پیغم تبلیغ کے باوجود یہ ایمان نہیں لاتے تو آپ غم نہ کریں آپ کی تبلیغ کی اثر آفرینی میں کوئی کمی نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ ان کو سزا دینے کے لیے ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اس کے بعد فرمایا پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔ حالانکہ یہ ظاہر وہ سنتے تو تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک سنا وہ ہے جو سننے کے بعد اس کو قبول کرے اور چونکہ وہ قبول نہیں کرتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ سننے والے نہ تھے۔

اس آیت کی ایک اور تقریر یہ ہے کہ کفار مکہ سیدنا محمد ﷺ کو منصب نبوت کے لیے نااہل کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے آپ تو ہماری طرح بشر ہیں اس لیے ہم آپ کے دین میں داخل نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے کہ (سیدنا) محمد ﷺ نبوت کے لائق نہیں بلکہ حقیقت میں تم ان کے امتی ہونے کے اہل نہیں ہو۔ اس لیے ہم نے سزا کے طور پر تمہارے دلوں پر مہر لگا دی ہے اب تم چاہو بھی تو ہمارے نبی کے امتی نہیں بن سکتے اور ان کے دین میں داخل نہیں ہو سکتے۔

سابقہ امتوں کے عذاب سے کفار مکہ کا سبق حاصل نہ کرنا

اس پوری آیت کی دوسری تقریر یہ ہے کہ پچھلی امتوں کے بعد جو لوگ اس خطہ زمین پر آکر آباد ہوئے انہوں نے اس زمین پر آثار عذاب دیکھ کر یہ سبق کیوں حاصل نہیں کیا کہ پچھلی امتوں پر ان کے انکار اور تکذیب کی وجہ سے عذاب آیا تھا سو اگر انہوں نے بھی انکار اور تکذیب کی روش برقرار رکھی تو ان پر بھی عذاب آسکتا ہے۔ پھر خود ہی فرمایا: انہوں نے یہ سبق اس لیے حاصل نہیں کیا کہ ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور یہ مہر لگانا ان پر جبر اور ظلم نہیں ہے بلکہ ان کے متواتر کفر اور عناد کا نتیجہ ہے اور جب ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے تو وہ کسی نصیحت کو قبول کرنے کے لیے نہیں سنتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ وہ بستیاں ہیں جن کی خبریں ہم آپ کو بیان کرتے ہیں، بے شک ان بستیوں والوں کے پاس

ان کے رسول واضح معجزات لے کر آئے پس وہ ان پر ایمان لانے کے لیے بالکل تیار نہ ہوئے، کیونکہ اس سے پہلے وہ ان کی تکذیب کر چکے تھے اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے (الاعراف: ۱۰۱)

سیدنا محمد ﷺ کا علم غیب اور آپ کی رسالت پر دلیل

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام کی امتوں کے احوال بیان فرمائے کہ ان رسولوں کی قوموں نے اپنے رسولوں کی تکذیب کی اور انجام کار ایسے عذاب سے دوچار ہوئے جس کی وجہ سے صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹ گیا اور خصوصیت کے ساتھ ان پانچ قوموں کے احوال اس لیے بیان

فرمائے کہ یہ قومیں جزیرہ نما عرب اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں میں رہنے والی تھیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ ڈھیل دی اور ان کو بہ کثرت نعمتیں عطا فرمائیں جس کی وجہ سے انہوں نے یہ زعم کر لیا کہ ان کا موقف درست ہے اور رسولوں کا پیش کیا ہوا دین غلط ہے۔ اور سیدنا محمد ﷺ کو بھی اسی علاقہ میں مبعوث فرمایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان پانچ قوموں کے احوال بیان فرما کر مکہ والوں کو تنبیہ فرمائی کہ تم کفر اور تکذیب میں گزشتہ قوموں کی پیروی نہ کرنا ورنہ تم بھی عذاب الہی کے مستحق ہو جاؤ گے!

اس آیت میں سیدنا محمد ﷺ کی نبوت پر بھی دلیل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ آپ کو ان پانچ قوموں کے احوال سے مطلع فرمایا اور آپ نے کسی سے نہ یا کسی کتاب میں پڑھے بغیر ان قوموں کے احوال بیان فرمائے جس سے معلوم ہوا کہ آپ کو یہ خبریں صرف وحی الہی سے حاصل ہوئی ہیں اور جس پر وحی نازل ہو وہی نبی ہوتا ہے۔ نیز آپ نے یہ غیب کی خبریں بیان کی ہیں اور نبی وہی ہوتا ہے جو غیب کی خبریں دیتا ہے۔ سو آپ کا نبی ہونا واضح ہوا۔ ان خبروں کے علاوہ اور بھی بہت سے غیوبات کا آپ کو علم ہے بلکہ آپ کو سب رسولوں سے زیادہ غیب کا علم ہے تاہم آپ کو عالم الغیب کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ عالم الغیب کا لفظ عرف اور شرع میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے البتہ آپ کو مطلع علی الغیب کہنا درست ہے۔

تمام نبی حامل معجزہ ہیں

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک ان بستیوں والوں کے پاس ان کے رسول واضح معجزات لے کر آئے۔

اس آیت سے یہ تو صراحتاً معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پانچ رسولوں کو واضح معجزات عطا فرمائے تھے اگرچہ ذکر صرف حضرت صالح علیہ السلام کے اس معجزہ کا کیا ہے کہ انہوں نے ایک پتھر کی چٹان سے اونٹنی نکالی، اور اس آیت سے اشارہ یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو معجزہ دے کر بھیجا کیونکہ اگر نبی کے پاس معجزہ نہ ہو تو وہ کس بنیاد پر اپنی رسالت کو ثابت کرے گا اور اگر نبی کے پاس معجزہ نہ ہو تو نبی صادق اور نبی کاذب میں امتیاز کا کوئی ذریعہ نہیں رہے گا۔ علاوہ ازیں اس حدیث میں اس پر بھی دلیل ہے کہ ہر نبی کو معجزہ عطا فرمایا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کو اس قدر معجزات دیے گئے ہیں جن کی وجہ سے ایک بشران پر ایمان لے آئے اور مجھے وحی (قرآن مجید) عطا کی گئی جو اللہ نے مجھ پر نازل فرمائی پس مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے متبعین تمام نبیوں سے زیادہ ہوں گے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۲۹۸۱، صحیح مسلم، الایمان: ۲۳۹، (۱۵۲) ۳۷۸، مسند احمد، ج ۲، ص ۳۵۱-۳۵۲، السنن الکبریٰ للنسائی، رقم

الحدیث: ۱۱۲۹)

نبی ﷺ کے معجزہ کا دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے امتیاز

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ ہر نبی کو اتنے معجزات دیے گئے جن کی وجہ سے کوئی بشر ایمان لاسکے اور مجھے قرآن مجید دیا گیا ہے جس کی مثل کسی کو نہیں دی گئی اس لیے فرمایا: میرے متبعین سب سے زیادہ ہوں گے۔ اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے اس پر جادو یا شعبدہ وغیرہ کا گمان نہیں کیا جاسکتا جبکہ دوسرے انبیاء کے معجزات کے متعلق یہ گمان کیا جاسکتا ہے۔ اس کا تیسرا معنی یہ ہے کہ انبیاء سابقین علیہم السلام کے معجزات ان کے زمانوں کے ساتھ گزر گئے اور ان کے زمانوں میں بھی ان معجزات کا مشاہدہ صرف ان لوگوں نے کیا تھا جو اس موقع پر موجود تھے اور ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کا معجزہ قرآن مجید ہے جو قیامت تک باقی رہے گا اور اس میں جو فصاحت اور بلاغت ہے اور غیب کی خبریں ہیں اس کی نظیر لانے سے بلکہ اس کی ایک سورت کی بھی نظیر لانے سے تمام جن اور انس اجتماعی اور انفرادی طور پر ناکام اور عاجز رہے، اور علم کی روز افزوں ترقی اور مخالفین

کی کثرت کے باوجود اب تک عاجز ہیں۔ قرآن مجید کی پیش گوئیوں کو کوئی جھٹلا نہیں سکا اور قرآن مجید کا دعویٰ ہے کہ اس میں کمی اور زیادتی نہیں ہو سکتی اور کوئی شخص اس میں کمی اور بیشی ثابت نہیں کر سکا۔ ہمارے نبی ﷺ کے عہد سے لے کر قیامت تک ہمارے نبی ﷺ کے سوا کسی نبی کی نبوت پر کوئی دلیل یا معجزہ قائم نہیں ہے۔

معجزہ کی تعریفات

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی حنفی متوفی ۸۱۶ھ لکھتے ہیں:

وہ کام جو اللہ کی عادت جاریہ کے خلاف ہو اور خیر اور سعادت کی دعوت دیتا ہو اور اس کام کو پیش کرنے والا نبوت کا مدعی ہو اور اس خلاف عادت کام سے اس کے اس دعویٰ کے صدق کے اظہار کا قصد کیا گیا ہو کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ اس خلاف عادت کام کو معجزہ کہتے ہیں۔ (کتاب التعریفات ص ۱۵۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۸ھ)

علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ لکھتے ہیں:

معجزہ وہ کام ہے جو خرق (خلاف) عادت ہو اور اس کے ساتھ اس کے معارضہ کا چیلنج مقرون ہو اور اس کا معارضہ نہ کیا جا سکے۔ ایک قول یہ ہے کہ معجزہ وہ امر ہے جس سے نبوت یا رسالت کے مدعی کے صدق کے اظہار کا قصد کیا گیا ہو اور بعض علماء نے اس میں یہ قید بھی لگائی ہے کہ وہ امر اس کے دعویٰ کے موافق ہو اور بعض علماء نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ وہ امر زمانہ تکلیف کے مقارن ہو کیونکہ ایام تکلیف کے ختم ہونے کے بعد بھی خوارق (اللہ تعالیٰ کی عادت جاریہ کے خلاف امور یا کام) کا ظہور ہو گا لیکن ان سے تصدیق کا قصد نہیں کیا جائے گا۔ (شرح القاصد ج ۵، ص ۱۱، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی، ایران ۱۳۰۹ھ)

علامہ کمال الدین عبدالواحد بن ہمام حنفی متوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:

معجزہ اس خلاف عادت کام کو کہتے ہیں جو دعویٰ نبوت سے مقرون ہو اور اس سے نبوت کے مدعی کا صدق ظاہر ہو۔

(السامرہ، ص ۲۱۳، مطبوعہ دائرة المعارف الاسلامیہ، مکران، بلوچستان)

علامہ ابوالحسن علی بن محمد ماوردی شافعی متوفی ۳۵۰ھ لکھتے ہیں:

معجزہ اس فعل کو کہتے ہیں جو عام بشر کی عادت اور اس کی طاقت کے خلاف ہو اور وہ فعل حقیقتاً صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت سے صادر ہو اور بہ ظاہر مدعی نبوت سے صادر ہو اور ہو۔ (اعلام النبوة، ص ۳۲، مطبوعہ دار احیاء العلوم بیروت ۱۳۰۸ھ)

معجزہ کی شرائط

علامہ احمد بن محمد القسطلانی متوفی ۹۲۳ھ لکھتے ہیں:

معجزہ وہ کام ہے جو خلاف عادت ہو اور معارضہ کے چیلنج کے ساتھ مقرون ہو اور انبیاء علیہم السلام کے صدق پر دلالت کرتا ہو۔ اس کو معجزہ اس لیے کہتے ہیں کہ بشر اس کی مثال لانے سے عاجز ہے۔ اس کی حسب ذیل شرائط ہیں:

۱- معجزہ وہ کام ہونا چاہیے جو خلاف عادت ہو جیسے چاند کا دو ٹکڑے ہونا، انگلیوں سے پانی کا پھوٹ پڑنا، لاشی کا عصبین جانا، پتھر سے اونٹنی کا نکالنا۔ اس قید سے وہ کام خارج ہو گئے جو عادت کے مطابق ہوں۔

۲- اس فعل کے معارضہ اور مقابلہ کو طلب کیا جائے اور بعض نے کہا اس فعل کے ساتھ رسالت کا دعویٰ مقرون ہو۔

۳- مدعی رسالت نے جس فعل کو صادر کیا ہے کوئی شخص اس فعل کی مثل نہ لاسکے۔ اور بعض نے کہا معارضہ سے مامون ہونے کے ساتھ دعویٰ رسالت ہو۔ اس قید سے وہ امور خلاف عادت نکل گئے جو دعویٰ نبوت سے پہلے صادر ہوں جیسے اعلان نبوت سے پہلے ہمارے نبی ﷺ پر بادل کا سایہ کرنا اور شق صدر وغیرہ۔ ان کو ارباب کہتے ہیں۔ اسی طرح اس قید سے اولیاء اللہ

کی کرامت بھی خارج ہو گئیں کیونکہ ان کے ساتھ دعویٰ نبوت مقرون نہیں ہوتا۔
قاضی ابوبکر باقلانی نے کہا ہے کہ معجزہ کی تعریف میں جو تحدی کی شرط لگائی گئی ہے یعنی اس فعل کے معارضہ اور مقابلہ کو طلب کیا جائے اس کی دلیل کتاب میں ہے نہ سنت میں نہ اس پر اجماع ہے اور بے شمار معجزات ایسے ہیں جن کی صدور میں معارضہ اور مقابلہ کو طلب نہیں کیا جاتا۔ مثلاً کنکریوں کا کلمہ پڑھنا، انگلیوں سے پانی کا پھوٹ پڑنا، ایک صاع (چار کلو گرام) طعام سے دو سو آدمیوں کو پیٹ بھر کر کھلا دینا، آنکھ میں لعاب دہن ڈالنا، بکری کے گوشت کا کلام کرنا، اونٹ کا شکایت کرنا اور بڑے بڑے معجزات اور تحقیق یہ ہے کہ سوائے قرآن مجید کے اور کسی معجزہ میں تحدی نہیں کی گئی۔

۴- چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ فعل مدعی نبوت کے دعویٰ کے موافق ہو۔ اگر وہ خلاف عادت فعل مدعی نبوت کے خلاف ہو تو وہ معجزہ نہیں ہو گا بلکہ وہ اہانت ہوگی۔

واضح رہے کہ قرآن اور حدیث میں معجزہ کا لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ معجزہ کے لیے آیت 'بینہ' اور برہان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اذا جاء تهم اية (الانعام: ۱۲۳) لقد جاء تهم رسلهم بالبينات (الاعراف: ۱۰۱) فذانك برهان من ربك (القصص: ۳۲) (المواهب اللدنیہ، ج ۲، ص ۱۹۱-۱۹۲، ملخصاً، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ)

افعال غیر عادیہ کی دیگر اقسام
معجزہ کے علاوہ خرق عادت فعل کی حسب ذیل قسمیں ہیں:

- ۱- ارباھص: جو خلاف عادت امر نبی کے لیے اعلان نبوت سے پہلے ظاہر ہو۔ جیسے اعلان نبوت سے پہلے نبی ﷺ پر بادل کا سایہ کرنا۔
- ۲- کرامت: مومن کامل کے ہاتھ سے جو خلاف عادت کام صادر ہو، جیسے غوث اعظم کا مردوں کو زندہ کرنا۔
- ۳- معونت: عام مومن کے ہاتھ سے جو خلاف عادت کام صادر ہو۔ جیسے ایک شخص نے اپنے پالتو کتے کے متعلق دعا کی کہ وہ اس کے گھر کے اندر نہ آئے صرف باہر رہا کرے، سو ایسا ہی ہو گیا۔
- ۴- استدراج: کسی کافر کے ہاتھ پر اس کے دعویٰ کے موافق خلاف عادت کام صادر ہو جیسے دجال کئی کام کرے گا۔
- ۵- اہانت: جو کافر نبوت کا مدعی ہو اس کے ہاتھ پر خلاف عادت امر ظاہر ہو لیکن وہ امر اس کے دعویٰ کا کذب ہو، جیسے ایک کانے شخص نے مسیلمہ کذاب سے کہا: تم دعا کرو کہ میری آنکھ بیٹا ہو جائے۔ مسیلمہ کذاب نے دعا کی تو اس کانے کی صحیح آنکھ بھی نابینا ہو گئی اور وہ مکمل اندھا ہو گیا۔ یا جیسے مرزا غلام احمد قادیانی نے پیش گوئی کی کہ اس کا نکاح محمدی بیگم سے ہو گا لیکن اس کا نکاح مرزا سلطان محمد سے ہو گیا۔ پھر مرزا غلام احمد نے پیش گوئی کی کہ مرزا سلطان محمد مر جائے گا اور محمدی بیگم بعد میں اس کے نکاح میں آجائے گی لیکن ہوا یہ کہ مرزا غلام احمد مر گیا اور سلطان محمد اس کی موت کے بعد دیر تک زندہ رہا، نیز مرزا نے پیش گوئی کی کہ عیسائی پادری آتھم ۵ ستمبر ۱۸۸۳ء کے دن مر جائے گا اس وقت وہ بیمار تھا اور ہسپتال میں زیر علاج تھا، لیکن اس تاریخ کو وہ تندرست ہو گیا اور زندہ رہا اور عیسائیوں نے اس کا جلوس نکالا۔

معجزات، انبیاء کے اختیار میں ہونے پر محدثین، فقہاء اور متکلمین کے دلائل

علامہ عبدالرحمن بن محمد الانباری المتوفی ۵۷۷ھ لکھتے ہیں:

معجزہ میں شرط یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہو کیونکہ معجزہ اس حیثیت سے دلالت کرتا ہے کہ وہ مدعی نبوت کے لیے اللہ کی

جانب سے تصدیق ہے۔ اگر معجزہ اللہ کا فعل نہ ہو تو یہ معلوم نہیں ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے مدعی نبوت کی تصدیق کی ہے۔

(کتاب الداعی الی الاسلام، ص ۲۸۱، مطبوعہ دار البشائر الاسلامیہ، ۱۳۰۹ھ)

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

ایک قوم نے معجزہ میں یہ شرط لگائی ہے کہ وہ نبی کی قدرت میں نہ ہو کیونکہ اگر معجزہ نبی کا مقدور ہو گا جیسے اس کا ہوا کی طرف چڑھنا اور پانی پر چلنا تو وہ اللہ کی طرف سے تصدیق کے قائم مقام نہیں ہو گا اور یہ اعتراض کچھ وزن نہیں رکھتا کیونکہ جب نبی اس فعل پر قادر ہو گا اور دوسرا کوئی شخص اس پر قادر نہیں ہو گا تو وہ فعل معجزہ ہو گا۔ علامہ آمدی نے کہا: آیا معجزہ نبی کی قدرت میں ہے یا نہیں؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ بعض ائمہ نے یہ کہا کہ ہوا کی طرف چڑھنے اور پانی پر چلنے میں محض چڑھنا یا چلنا معجزہ نہیں ہے، کیونکہ یہ نبی کے لیے مقدور ہے اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نبی کے لیے اس پر قدرت پیدا کر دے، اس مثال میں جو چیز معجز ہے وہ اس مثال میں نفس قدرت ہے اور یہ قدرت نبی کا مقدور نہیں ہے (کیونکہ یہ قدرت اللہ کے پیدا کرنے سے ہوتی ہے) اور بعض ائمہ نے کہا کہ اس مثال میں ہوا کی طرف چڑھنا یا پانی پر چلنا ہی معجز ہے (نہ کہ اس پر قدرت) کیونکہ یہ فعل مخارق (مخالف) عادت ہے اور یہ فعل اللہ تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

(شرح المواقف، ج ۸، ص ۲۲۳-۲۲۴، مطبوعہ ایران)

علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ اس قول کے زیادہ صحیح ہونے کی وجہ بیان کرتے ہیں:

کیونکہ مقصود یہ ہے کہ دوسرے اس فعل سے عاجز ہوں اور اس سے نبی ﷺ کی تصدیق حاصل ہو جائے گی اور یہی مقصود ہے۔ نیز لکھتے ہیں جو اس کے قائل ہیں کہ معجزہ نبی کی قدرت میں نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ نفس قدرت معجز ہے اور یہ نبی کا مقدور نہیں ہے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نفس قدرت کو معجزہ نہیں کہتے بلکہ اس خاص فعل کو معجزہ کہتے ہیں اور اس خاص فعل (مثلاً اس مثال میں ہوا کی طرف چڑھنا) پر نبی قادر ہے اور اس کا غیر قادر نہیں ہے اور معجزہ سے یہی مقصود ہے۔

(حاشیہ سیالکوٹی علی شرح المواقف، ج ۸، ص ۲۲۴، مطبوعہ ایران)

اس بحث میں زیادہ واضح بات یہ ہے کہ جو ائمہ یہ کہتے ہیں کہ مثلاً ہوا کی طرف چڑھنا یہ مخصوص فعل معجز نہیں ہے بلکہ اس پر نفس قدرت معجز ہے ان پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں خلاف عادت افعال کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ عام عادت کے مطابق جو افعال ہوتے ہیں مثلاً پہاڑ پر چڑھنا یا زمین پر چلنا ان افعال میں بھی نفس قدرت اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ہوتی ہے تو پھر چاہیے کہ ان عام عادی افعال میں بھی نفس قدرت معجز ہو پھر اس دلیل سے عام عادت کے مطابق افعال بھی معجزہ قرار پائیں گے

حقیقت یہ ہے کہ عام انسانوں کی عادت کے مطابق افعال ہوں یا انبیاء علیہم السلام کے خلاف عادت افعال ہوں ان افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور ان افعال کے کاسب انسان اور انبیاء علیہم السلام ہیں اور ان افعال کے ساتھ دو قدرتیں متعلق ہوتی ہیں ایک قدرت بہ حیثیت خلق، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور ایک قدرت بہ حیثیت کسب، یہ انسان اور انبیاء کا کام ہے، اور جس طرح عام افعال عادیہ ہمارے اختیار میں دیے گئے ہیں اسی طرح خلاف عادت افعال اور معجزات انبیاء علیہم السلام کے اختیار میں دیے گئے ہیں۔

امام محمد بن محمد غزالی متوفی ۵۰۵ھ لکھتے ہیں:

نبی کوئی نفسہ ایک ایسی صفت حاصل ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے خلاف عادت افعال (معجزات) پورے ہوتے ہیں

جس طرح ہماری ایک صفت ہے جس کی وجہ سے ہماری حرکات قدرت اور اختیار سے ہوتی ہیں اگرچہ قدرت اور مقدور دونوں اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں۔ (احیاء العلوم، ج ۵، ص ۵۳، مطبوعہ دار الخیر بیروت، ۱۳۱۳ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ نے بھی امام غزالی کی اس عبارت سے استدلال کیا ہے۔

(فتح الباری، ج ۱۲، ص ۳۶۷، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور، ۱۰۳۱ھ)

علامہ سعد الدین تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ اس بحث میں لکھتے ہیں:

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر چیز کو وجود میں لانے والا صرف اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ خصوصاً مردوں کو زندہ کرنے، لاشیٰ کو سانپ بنانے، چاند کو شق کرنے اور پتھر کے سلام کرنے میں۔ علاوہ ازیں حکیم قادر مختار نے انبیاء علیہم السلام کو معجزات صادر کرنے کے لیے جو قدرت اور اختیار عطا کیا ہے وہ مطلوب کی افادیت میں کافی ہے۔ اسی وجہ سے معتزلہ کا یہ مذہب ہے کہ معجزہ یا اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے یا اس کے حکم سے واقع ہوتا ہے یا اس کے قدرت اور اختیار دینے کی وجہ سے واقع ہوتا ہے۔

(شرح القاصد ج ۵، ص ۱۷، مطبوعہ ایران)

علامہ تفتازانی کی اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض معجزات محض اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتے ہیں اور ان میں نبی کا بالکل دخل نہیں ہوتا اور بعض معجزات کو اللہ تعالیٰ نبی کے قبضہ اور اختیار میں کر دیتا ہے اور وہ جب چاہتے ہیں ان معجزات کو صادر کرتے ہیں۔

علامہ محمد بن احمد سفارینی حنبلی متوفی ۱۱۸۸ھ لکھتے ہیں:

شیخ ابن تیمیہ نے کہا کہ نبی ﷺ کے جو معجزات، قدرت، فعل اور تاثیر سے متعلق ہیں، ان کی حسب ذیل انواع ہیں:

۱- بعض معجزات عالم علوی میں ہیں جیسے چاند کا دو ٹکڑے ہونا۔ آسمان کا آگ کے گولوں سے محفوظ رہنا اور آسمان کی طرف معراج۔

۲- بعض نضا میں ہیں جیسے استسقاء اور استسواء (بارش کا طلب کرنا اور بادلوں کا چھٹنا) میں بادلوں کا آنے اور جانے میں آپ کی اطاعت کرنا۔

۳- انسانوں، جنات اور حیوانوں میں آپ کا تصرف کرنا۔

۴- درختوں، لکڑیوں اور پتھروں میں آپ کا تصرف کرنا۔

۵- آسمان کے فرشتوں کا آپ کی تائید کرنا۔

۶- نبی ﷺ کی دعا کا قبول ہونا۔

۷- ماضی اور مستقبل کے غیب کی خبریں دینا۔

۸- کھانے پینے کی چیزوں اور پھلوں کا زیادہ ہو جانا۔ ان کے علاوہ اور کئی انواع کے معجزات ہیں جن میں آپ کی نبوت اور

رسالت کے دلائل اور علامات ہیں۔ (الوامع الانوار الالہیہ ج ۲، ص ۲۹۳-۲۹۴، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۱۱ھ)

شیخ ابن تیمیہ کی اس تحریر سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض معجزات نبی ﷺ کے اختیار میں ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے لکھا ہے کہ بادل آپ کی اطاعت کرتے تھے اور آپ انسانوں، حیوانوں، درختوں اور پتھروں میں تصرف کرتے تھے۔

معجزات پر انبیاء کے اختیار کے ثبوت میں احادیث

جنات اور شیاطین پر تصرف کے متعلق یہ حدیث ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گزشتہ رات ایک بہت زبردست جن نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا تاکہ میری نماز خراب کرے، اللہ نے مجھے اس پر قدرت دی اور میں نے اس کو دھکا دیا، میں نے ارادہ کیا کہ اس کو مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کے ساتھ باندھ دوں حتیٰ کہ تم سب اس کو دیکھو پھر مجھے اپنے بھائی سلیمان کی یہ دعایاد آئی "اے اللہ مجھے بخش دے اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو سزاوار نہ ہو"۔ (ص: ۳۵) پھر اللہ نے اس کو ناکام لوٹا دیا۔

(صحیح مسلم المساجد: ۳۹ (۵۲۱) ۱۱۸۹، صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۴۶۱۱، السنن الکبریٰ للنسائی، ج ۲، رقم الحدیث: ۱۳۳۰)

علامہ نووی نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو شیطان کے باندھنے پر قدرت دی تھی لیکن آپ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کے پیش نظر ادا کیا اور تواضعاً ایسا نہیں کیا۔

درختوں پر نبی ﷺ کے تصرف کے متعلق یہ حدیث ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا: میں کس طرح پہچانوں کہ آپ نبی ہیں! آپ نے فرمایا: اگر میں کھجور کے اس خوشہ کو درخت سے بلاؤں تو تم گواہی دو گے کہ میں اللہ کا رسول ہوں (ﷺ)۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے اس کو بلایا تو کھجوروں کا وہ خوشہ درخت سے اتر آیا اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے آکر گر گیا پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لوٹ جاؤ تو وہ لوٹ گیا پھر وہ اعرابی مسلمان ہو گیا۔ یہ حدیث حسن غریب صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۳۸، مسند احمد ج ۱، رقم الحدیث: ۱۹۵۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۵۲۳، المعجم الکبیر ج ۱۲، رقم الحدیث: ۱۲۶۲۲، دلائل النبوة للسیوطی ج ۶، ص ۱۵، سنن داری رقم الحدیث: ۲۳، جامع الاصول ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۹۵)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مسجد کی چھت کھجور کے شہتیروں پر بنائی گئی تھی اور نبی ﷺ ان میں سے ایک شہتیر سے ٹیک لگا کر خطبہ دیتے تھے۔ جب آپ کا منبر بنایا گیا اور آپ اس پر بیٹھ گئے تو ہم نے اس شہتیر کے رونے کی آواز سنی جس طرح اونٹنی اپنے بچے کے فراق میں روتی ہے حتیٰ کہ نبی ﷺ اس کے پاس آئے آپ نے اس پر ہاتھ رکھا تو وہ پرسکون ہو گیا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۵۸۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۳۷، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۳۹۵، جامع الاصول، ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۹۷، مسند احمد، ج ۳، ص ۳۰۰)

اور انسانوں پر تصرف کے متعلق یہ حدیث ہے:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب غزوہ تبوک کے لیے جا رہے تھے تو اثناء سفر میں ہم نے ایک سفید پوش شخص کو ریگستان سے آتے ہوئے دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کن ابا خیشمہ ابو خیشمہ ہو جا تو وہ ابو خیشمہ ہو گیا۔ (صحیح مسلم توبہ، ۵۳، (۲۷۹) ۶۸۸۳)

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ قاضی عیاض نے فرمایا: کہ کن یہاں تحقق اور وجود کے لیے ہے یعنی اے شخص تجھے چاہیے کہ تو حقیقتاً ابو خیشمہ ہو جا۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض نے جو کہا ہے وہ صحیح ہے۔

(صحیح مسلم بشرح النووی ج ۱۱، ص ۶۹۱۰، مطبوعہ مکتبہ الباز مکہ مکرمہ، ۱۳۱۷ھ)

علامہ ابو العباس قرطبی مالکی متوفی ۶۵۶ھ نے بھی یہی لکھا ہے۔ (المعجم، ج ۷، ص ۹۶، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت، ۱۳۱۷ھ)

علامہ ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ نے بھی قاضی عیاض کے حوالے سے یہی تقریر کی ہے۔

(اکمال الکمال، المعجم، ج ۹، ص ۱۸۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

انبیاء کے اختیار میں معجزات ہونے پر ایک اشکال کا جواب

معجزات پر نبی کی قدرت نہ ہونے پر بعض علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ
لِكُلِّ آجَلٍ كِتَابٍ (الرعد: ۳۸)

مگر اللہ کے اذن سے ہر وعدہ کے لیے ایک نوشتہ تقدیر ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں نشانی (آیت) سے مراد کفار کے فرمائشی معجزات ہیں۔ اور اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تم جن معجزات کی فرمائش کرتے ہو وہ میں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر پیش نہیں کر سکتا۔ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ کوئی نبی اللہ کی دی ہوئی طاقت اور قدرت سے بھی کوئی معجزہ پیش نہیں کر سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ جب معجزات پر قدرت عطا فرماتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا اذن ہی ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں تصریح ہے کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے اذن سے مادر زاد اندھوں اور برص کے مریضوں کو تندرست کرتے تھے اور اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

علامہ نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ اور علامہ محمود بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ نے حدیث جریج کی شرح میں لکھا ہے کہ بعض اوقات اولیاء اللہ کی کرامات ان کی طلب اور ان کے اختیار سے واقع ہوتی ہیں اور یہی صحیح مذہب ہے۔

(شرح مسلم، ج ۲، ص ۳۱۳، مطبوعہ کراچی، عمدة القاری، ج ۷، ص ۲۸۳، مطبوعہ مصر)

اور جب بعض اوقات اولیاء اللہ کی کرامات ان کے اختیار سے واقع ہوتی ہیں تو بعض اوقات انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا ان کے اختیار سے واقع ہونا زیادہ لائق ہے۔

معجزات کے صدور میں علماء دیوبند کا موقف

علماء دیوبند کے نزدیک معجزہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، ظاہر اور حقیقتاً نبی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے ظل کے لحاظ سے نہ کسب کے لحاظ سے اور نبی سے معجزہ کا صدور ایسے ہے جیسے کاتب کے قلم سے لکھنے کا صدور ہو جیسے قلم بے اختیار ہوتا ہے ایسے ہی نبی بے اختیار ہوتا ہے۔ شیخ رشید احمد گنگوہی متوفی ۱۳۲۳ھ نے اس موضوع پر فارسی میں ایک طویل مقالہ لکھا ہے جس کو مکمل نقل کرنا تو مشکل ہے۔ ہم اس کی بعض عبارات نقل کر رہے ہیں جن سے ان کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے۔

شیخ رشید احمد گنگوہی متوفی ۱۳۲۳ھ لکھتے ہیں:

بعض افعال خاصہ الہیہ بعض اوقات فرشتوں اور نبیوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور ان افعال کے وقوع میں ان کی کوئی قوت اختیار، قدرت اور اقتدار نہیں ہوتا، لہذا ان افعال کو کھانے اور پہننے کی طرح افعال اختیار یہ اور اعمال مقدور میں سے شمار نہیں کرنا چاہیے اور ان کی مثال کاتب اور قلم کی سی ہے، جس طرح لکھنے میں قلم کی کوئی قدرت اور اختیار نہیں ہے اسی طرح ان افعال کے صدور میں نبیوں کا بھی کوئی اختیار نہیں ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ، کامل، ص ۱۷۳، ملخصاً، مطبوعہ کراچی)

مولانا حیدر علی ٹونکی نے اپنی بعض تصنیفات میں لکھا ہے: اور وہ جو عوام کا گمان ہے کہ کرامت اولیاء کا خود اپنا فعل ہوتا ہے یہ باطل ہے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جس کو وہ ولی کے ہاتھ پر اس کی تکریم اور تعظیم کے لیے ظاہر فرماتا ہے، اور ولی کا اور نہ ہی نبی کا اس کے صدور میں اختیار ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ و تقدس کے افعال میں کسی کا اختیار نہیں ہے۔

(فتاویٰ رشیدیہ، کامل، ص ۱۷۵، مطبوعہ کراچی)

بلکہ یہ اس پر مبنی ہے کہ معجزہ نبی کا فعل نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کا فعل ہے جس کو اس نے نبی کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے افعال میں ان افعال کا کسب بندہ سے ہے اور ان افعال کا خلق خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور معجزہ میں

بندہ کا کسب بھی نہیں ہوتا۔ پس اس آیت کا معنی یہ ہے:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ

آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی جبکہ آپ نے صورتاً

(الانفال: ۱۷) خاک کی مٹھی پھینکی تھی لیکن وہ خاک کی مٹھی حقیقتاً اللہ نے پھینکی تھی۔

اور یہ معنی بھی مراد نہیں ہے کہ آپ نے خاک کی مٹھی خلقتاً نہیں پھینکی جبکہ آپ نے خاک کی مٹھی کسباً پھینکی تھی، اس لیے کہ یہ بھی تمام افعال میں جاری ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ، کامل، ص ۱۷۶، مطبوعہ کراچی)

سو افعال اختیار یہ میں عادتاً تصرف ہوتا ہے ظاہراً اور فعل حق تعالیٰ کا مخفی ہے اور معجزات و تصرفات میں ظاہر بھی عجز ہے مثل قلم کے۔ (فتاویٰ رشیدیہ، کامل، ص ۱۷۷، مطبوعہ کراچی)

معجزات کے صدور میں علماء اہل سنت کا موقف

اس مسئلہ میں ہمارا موقف یہ ہے کہ معجزات اور کرامات ہوں یا عام افعال، تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ عام افعال عادیہ میں جس طرح عام مسلمانوں کا کسب اور اختیار ہوتا ہے اور ان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح معجزات اور کرامات میں کسب اور اختیار انبیاء اور اولیاء کا ہوتا ہے اور ان افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ جیسا کہ ہم نے امام غزالی اور حافظ ابن حجر عسقلانی سے صراحتاً نقل کیا ہے اور شیخ ابن تیمیہ، علامہ نووی، علامہ عینی، علامہ تفتازانی اور علامہ میر سید شریف جرجانی ایسے محدثین، فقہاء اور متکلمین کا بھی یہی نظریہ ہے۔ البتہ بعض معجزات اور کرامات جو ان کے حاطین سے متصف اور مباشر نہیں ہوتے ان کے صدور میں انبیاء اور اولیاء کا مطلقاً دخل نہیں ہوتا۔ خلقتاً نہ کسباً جیسے قرآن مجید کا نزول۔ مردوں کو زندہ کرنا، چاند کا شق ہونا وغیرہ۔

شیخ رشید احمد گنگوہی نے اپنے موقف کے ثبوت میں لکھا ہے کہ و ما رمیت اذ رمیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ آپ نے خلقتاً خاک کی مٹھی نہیں پھینکی جبکہ آپ نے کسباً خاک کی مٹھی پھینکی تھی لیکن اہل سنت کے معتمد اور مستند مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں یہی لکھا ہے کہ آپ نے خاک کی مٹھی خلقتاً نہیں پھینکی جبکہ آپ نے خاک کی مٹھی کسباً پھینکی تھی۔ ان عبارات کو نقل کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اس آیت کا شان نزول اور پس منظر بیان کر دیں:

امام حسین بن محمد فراہی متوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جب جنگ بدر کے دن مسلمانوں اور کافروں کے لشکر بالقابل ہوئے تو نبی ﷺ نے خاک آلود کنکریوں کی ایک مٹھی بھر کر کفار کے چروں پر ماری اور فرمایا: ان کے چہرے قبیح ہو جائیں تو ہر کافر کی آنکھوں یا منہ یا نکتوں میں اس میں سے کچھ نہ کچھ گر گیا اور اس کے بعد کافروں کو شکست ہو گئی۔

(معالم التنزیل، ج ۲، ص ۲۰۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

واضح رہے کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ خاک کی مٹھی کفار کے چروں پر مارنے کا واقعہ جنگ بدر میں پیش آیا تھا۔ لیکن احادیث میں یہ ہے کہ یہ واقعہ غزوہ حنین میں پیش آیا تھا۔

(صحیح مسلم مغازی، ۸۱ (۱۷۷۷)، مسند الحمیدی، رقم الحدیث: ۳۵۹، مسند احمد، ج ۱، ص ۲۰۷، طبع قدیم، مسند احمد، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۷۷۵، طبع جدید دار الفکر، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۱۶۱)

بہر حال خاک کی مٹھی ایک ہزار کافروں کے منہ پر ماری جائے اور وہ خاک ہر کافر کی آنکھوں اور منہ میں چلی جائے یہ فعل

خرق عادت اور معجزہ ہے تو اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ
(الانفال: ۱۷) تھی لیکن اللہ نے وہ مٹھی ماری تھی۔ اور آپ نے خاک کی مٹھی نہیں ماری جب آپ نے ماری

شیخ رشید احمد گنگوہی نے لکھا ہے اس میں خلق اور کسب دونوں کی نفی ہے اور یہ معنی نہیں ہے کہ خاک کی مٹھی آپ نے خلقتاً نہیں ماری جب آپ نے وہ مٹھی کسباً ماری تھی تاکہ معجزہ میں نبی کا کسب ثابت ہو لیکن اس کے برخلاف اہل سنت کے مستند اور معتمد مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے کہ خاک کی مٹھی آپ نے خلقتاً نہیں ماری جبکہ آپ نے وہ مٹھی کسباً ماری تھی اور معجزہ پر نبی ﷺ کا کسب اور اختیار ثابت کیا ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے لیے خاک کی مٹھی مارنے کو ثابت بھی کیا ہے اور آپ سے اس کی نفی بھی کی ہے اس لیے اس معنی پر حمل کرنا واجب ہے جبکہ آپ نے خاک کی مٹھی خلقتاً نہیں ماری اور کسباً ماری تھی۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۶۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ نے بھی امام رازی کی اس عبارت کو نقل کر کے اس سے بندوں کے کسب کرنے پر استدلال کیا ہے۔ (روح المعانی، ج ۹، ص ۱۸۵) اس کے بعد مزید لکھتے ہیں:

میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ نبی ﷺ کے لیے جو خاک کی مٹھی کو پھینکنا ثابت کیا گیا ہے اس سے مراد وہی مخصوص پھینکنا ہو جس نے عقول کو حیران کر دیا ہے اور نبی ﷺ کے لیے اس کا اثبات حقیقتاً ہو کہ آپ نے یہ فعل اس قدرت سے کیا جو آپ ﷺ کو عطا کی گئی تھی اور وہ قدرت اللہ تعالیٰ کے اذن سے موثر تھی۔ لیکن چونکہ عام انسانوں کی قدرت سے اس قسم کا اثر واقع نہیں ہو سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی آپ سے نفی کی اور اس کو اپنے لیے ثابت فرمایا۔

(روح المعانی، ج ۹، ص ۱۸۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ ابوالبرکات احمد بن محمد نسفی حنفی متوفی ۷۱۰ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں یہ بیان ہے کہ بندہ کا فعل بندہ کی طرف کسباً منسوب ہوتا ہے اور اللہ کی طرف خلقتاً منسوب ہوتا ہے۔ (مدارک علی هامش الخازن، ج ۲، ص ۱۸۵، مطبوعہ پشاور)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے خلقتاً وہ مٹھی نہیں پھینکی جب آپ نے کسباً وہ مٹھی پھینکی تھی۔ (عناویہ القاضی علی ایضادای، ج ۳، ص ۲۶۱، مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۲۸۳ھ)

علامہ سلیمان بن عمر المعروف بالمل متوفی ۱۲۰۳ھ لکھتے ہیں:

نبی ﷺ سے فعل کی نفی باعتبار ایجاد کے حقیقتاً ہے اور آپ کے لیے فعل کا اثبات باعتبار کسب ہے۔ (الفتوحات الالہیہ، ج ۲، ص ۲۳۵، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ، کراچی)

ان کثیر حوالہ جات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاء علیہم السلام سے بہ اعتبار کسب کے معجزات صادر ہوتے ہیں اور ان کو خلق اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت اور اس کے اذن سے ان معجزات کو صادر کرتے ہیں۔ البتہ جن معجزات کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کا فعل متعلق نہیں ہوتا وہ محض اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں جیسے قرآن مجید کا نزول،

مردوں کو زندہ کرنا اور چاند کاشق ہونا۔ مدت سے یہ ارادہ تھا کہ میں معجزات کے متعلق ایک مفصل بحث لکھوں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اب یہ توفیق عطا کی۔ وما توفیقی الا باللہ ولا حول ولا قوة الا باللہ العلی العظیم۔

پہلے تکذیب کرنے کی وجہ سے بعد میں ایمان نہ لانے کی توجیہات

اللہ تعالیٰ نے ان بستیوں کی خبریں بیان کرتے ہوئے فرمایا: بے شک ان بستیوں والوں کے پاس ان کے رسول واضح معجزات لے کر آئے، پس وہ ان پر ایمان لانے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئے، کیونکہ اس سے پہلے وہ ان کی تکذیب کر چکے تھے، اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے (الاعراف: ۱۰۱)۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: اس سے پہلے تکذیب سے مراد یہ ہے کہ عالم میثاق میں جب ارواح سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ماننے کا عہد لیا گیا تو انہوں نے ناپسندیدگی سے زبانی اقرار کیا تھا اور دل میں تکذیب قائم رکھی تھی اور اسی سابق تکذیب کی وجہ سے انہوں نے عالم اجسام میں آنے کے بعد بھی تکذیب کی۔

دوسری توجیہ یہ ہے کہ شروع میں جب انبیاء علیہم السلام نے ان کو تبلیغ کی اور توحید کی دعوت دی تو انہوں نے اپنے باپ دادا کی تقلید کی وجہ سے انکار کر دیا۔ پھر بعد میں جب ان پر دلائل اور معجزات کی وجہ سے حق واضح ہو گیا تو پھر انہوں نے اپنے سابق انکار سے رجوع کرنا اپنے لیے باعث عار اور اپنی انا کے خلاف سمجھا اور اسی انکار پر قائم رہے۔ اس کی تیسری توجیہ یہ ہے کہ اگر ہم ان کو ان کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیں اور پھر ان کو دنیا میں بھیجیں تو یہ پھر بھی اللہ، اس کے رسول اور احکام شرعیہ کی تکذیب کریں گے۔ جیسا کہ اس آیت میں ہے:

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا وَالْمَآنُفُوْا عَنْهُ (الانعام: ۲۸)

اور اگر انہیں دنیا میں لوٹا دیا گیا تو پھر یہ دوبارہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو منع کیا گیا تھا۔

اس کی چوتھی توجیہ یہ ہے کہ رسولوں کے آنے سے پہلے یہ کفر پر اصرار کرتے تھے تو رسولوں کے آنے کے بعد بھی ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ پانچویں توجیہ یہ ہے کہ معجزات دیکھنے سے پہلے یہ کفر کرتے تھے تو معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس کے بعد فرمایا: اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ یعنی جب یہ کفر اور سرکشی میں حد سے بڑھ جاتے ہیں تو یہ طور سزا اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے ان میں سے اکثر لوگوں کو عہد پورا کرنے والا نہ پایا اور بے شک ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان ہی پایا (الاعراف: ۱۰۲)۔

دعاؤں سے مصیبت ٹلنے کے بعد اللہ کو فراموش کر دینا

ان لوگوں سے مراد پچھلی امتوں کے کافر لوگ ہیں اور عہد سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں سے عالم میثاق میں لیا تھا۔ امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ سے روایت کرتے ہیں:

حضرت ابی بن کعب بیان کرتے ہیں کہ اس عہد سے یہ مراد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام روحوں کو نکال کر عہد لیا فرمایا: الست بربکم قالوا بلی (الاعراف: ۱۷۲) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا کیوں نہیں! تو یقیناً ہمارا رب ہے۔ اور اب یہ اس وعدہ کو فراموش کر کے شرک کرنے لگے اور مختلف بتوں کی پرستش کرنے

تبیان القرآن

جلد چہارم

گے۔

اس عہد سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ جب انسان پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ اب اگر اس مصیبت سے نجات دے دی تو وہ ضرور اللہ کی اطاعت اور شکرگزاری کرے گا اور جیسے ہی اللہ اس مصیبت سے نجات دے دیتا ہے تو وہ پھر شرک اور ناشکری کرنے لگتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

آپ پوچھئے تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے جسے تم عاجزی اور چپکے چپکے سے پکارتے ہو، اگر ہمیں اس (مصیبت) سے نجات دے دی تو ہم ضرور شکر کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے ○ آپ کہئے کہ تم کو اس مصیبت سے اللہ ہی نجات دیتا ہے اور ہر مصیبت سے پھر تم شرک کرتے ہو۔

قُلْ مَنْ يُنَجِّبِكُمْ مِّنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَّئِن أَنجَانَا مِن هَذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ○ قُلِ اللَّهُ يُنَجِّبِكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ مُشْرِكُونَ ○
(الانعام: ۶۳-۶۴)

نیز فرماتا ہے:

اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب ہی کی طرف رجوع کرتا ہوا اس کو پکارتا ہے پھر جب اللہ اسے کوئی نعمت عطا فرمادیتا ہے تو وہ اس تکلیف کو بھول جاتا ہے جس کے لیے وہ اللہ کو پکارتا تھا اور اللہ کے لیے شریک بنانے لگتا ہے تاکہ اللہ کے راستے سے لوگوں کو گمراہ کرے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَنْدَادًا لِّبُضَلِّ عَنْ سَبِيلِهِ
(الزمر: ۸)

اس آیت میں فرمایا ہے کہ اکثر لوگوں کو عہد پورا کرنے والا نہ پایا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ پچھلی امتوں میں سب کافر اور فاسق اور عہد فراموش نہ تھے، بعض ایسے بھی تھے جو اپنے رسولوں پر ایمان لے آئے تھے، نیک عمل کرتے تھے اور عہد پورا کرتے تھے گویا ایسے نیک لوگ بہت کم تھے۔

یہاں تک حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم السلام اور ان کی امتوں کے قصص بیان فرمائے اب اس کے بعد والی آیتوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر شروع ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر ہم نے ان کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کی جماعت کی طرف بھیجا، سو انہوں نے ان نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا، تو آپ دیکھئے کہ فساد کرنے والوں کا کیسا انجام ہوا ○ (الاعراف: ۱۰۳)

حضرت آدم سے حضرت موسیٰ اور حضرت موسیٰ سے ہمارے نبی ﷺ تک کا زمانہ امام محمد بن سعد نے عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان دس قرن ہیں اور وہ سب اسلام پر تھے۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۱، ص ۳۲، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

نیز امام محمد بن سعد نے محمد بن عمر بن واقد اسلمی سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان دس قرن ہیں اور قرن ایک سو سال کی مدت ہے۔ اور حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے درمیان دس قرن ہیں اور حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ بن عمران کے درمیان دس قرن ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ بن عمران اور حضرت عیسیٰ کے درمیان ایک ہزار نو سو سال ہیں اور اس زمانہ میں رسالت منقطع نہیں تھی اور اس مدت میں بنو اسرائیل کی

جلد چہارم

تبیان القرآن

طرف ایک ہزار نبی بھیجے گئے اور حضرت عیسیٰ اور ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کے میلاد کے درمیان پانچ سو انتہر سال کی مدت ہے۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۶ ص ۵۳، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے تین ہزار سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور حضرت آدم علیہ السلام کے پانچ ہزار چار سو انتہر سال بعد ہمارے رسول ﷺ کی ولادت ہوئی اور یہ ۱۴۱۹ھ ہے۔ اس حساب سے حضرت آدم علیہ السلام کی ولادت سے اب تک ۶۹۴۱ سال گزر چکے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔
امام ابو القاسم علی بن الحسن ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ لکھتے ہیں:

سب سے پہلے جس نبی کو مبعوث کیا گیا وہ حضرت ادریس ہیں۔ پھر حضرت نوح، پھر حضرت ابراہیم، پھر حضرت اسماعیل، پھر حضرت اسحاق، پھر حضرت یعقوب بن اسحاق، پھر حضرت یوسف بن یعقوب، پھر حضرت لوط، پھر حضرت ہود، پھر حضرت صالح، پھر حضرت شعیب، پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام۔ (یہ امام ابن عساکر کی تحقیق ہے اور حافظ ابن کثیر کے نزدیک سب سے پہلے حضرت نوح کو مبعوث کیا گیا) (مختصر تاریخ دمشق ج ۲۵ ص ۳۰۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت ۱۴۰۹ھ)
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، پرورش، نکاح، نبوت اور فرعون کو تبلیغ حضرت ابراہیم علیہ السلام تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب اس طرح ہے:
حضرت موسیٰ بن عمران بن قاصٹ بن عازر بن لادئی بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام۔

(البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۲۳۷، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

امام عبدالرحمان بن علی الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

علماء سیرت نے بیان کیا ہے کہ کابنوں نے فرعون (فرعون) مصر کے بادشاہوں کا لقب ہے۔ اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا، جدید تحقیق یہ ہے کہ یہ دیمیسس ثانی کا بیٹا منفتح تھا اس کا دور حکومت ۱۲۹۲ قبل مسیح سے لے کر ۱۲۲۵ قبل مسیح پر ختم ہوتا ہے) سے کہا کہ بنو اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہو گا جس کے ہاتھوں سے تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ تب فرعون نے حکم دیا کہ بنو اسرائیل کے نو مولود بیٹوں کو قتل کر دیا جائے۔ پھر قبیلوں نے فرعون سے شکایت کی کہ اگر تم اسی طرح بنو اسرائیل کے نو مولود بیٹوں کو قتل کرتے رہے تو ہماری خدمت کے لیے بنو اسرائیل میں سے کوئی باقی نہیں بچے گا! تب وہ ایک سال پیدا ہونے والے بیٹوں کو قتل کر دیتا اور ایک سال پیدا ہونے والے بیٹوں کو چھوڑ دیتا۔

حضرت ہارون علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال کے بیٹوں کو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اس سال پیدا ہوئے جس سال کے بیٹوں کو قتل کرانا تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ حضرت ہارون کی پیدائش کے ایک سال بعد پیدا ہوئے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ حضرت ہارون کی پیدائش کے تین سال بعد پیدا ہوئے۔ وہب بن منبہ نے بیان کیا ہے کہ فرعون نے ستر ہزار نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کر دیا۔ جب حضرت موسیٰ کی والدہ کو حضرت موسیٰ کا حمل ہوا تو کسی کو معلوم نہیں ہوا اور انہوں نے حضرت موسیٰ کی ولادت کی۔ ان کی بہن مریم کے سوا اور کسی کو خبر نہیں دی۔ جب حضرت موسیٰ پیدا ہوئے تو ڈھونڈنے والے ان کے پاس پہنچے انہوں نے حضرت موسیٰ کو تور میں ڈال دیا لیکن وہ سلامت رہے۔ پھر انہوں نے تین ماہ تک ان کو چھپا کر رکھا۔ پھر ان کو اندیشہ ہوا تو انہوں نے حضرت موسیٰ کو تابوت میں رکھ کر دریا میں ڈال دیا۔ پانی اس تابوت کو بہا کر فرعون تک لے گیا۔ فرعون نے جب تابوت کھولا اور ان کو دیکھا تو کہا یہ میرے دشمن عبرانیوں میں سے ہے یہ ذبح ہونے سے کیسے بچ گیا! اس کی بیوی آسیہ نے کہا یہ ایک سال سے بڑی عمر کا ہے اور تم نے اس سال پیدا ہونے والے لڑکوں کو ذبح کا حکم دیا تھا۔ اس کو چھوڑ

تبیان القرآن

جلد چہارم

دو یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا۔

فرعون کے ہاں صرف بیٹیاں پیدا ہوتی تھیں اس لیے اس نے حضرت موسیٰ کو رہنے دیا اور ان سے محبت کرنے لگا۔ حضرت موسیٰ کی والدہ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ حضرت موسیٰ فرعون کے گھر پہنچ گئے انہوں نے ان کی بہن مریم کو فرعون کے ہاں بھیجا تاکہ معلوم ہو کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے۔ ان کی بہن دوسری عورتوں کے ساتھ آسیہ کے پاس گئیں اور وہاں معلوم ہوا کہ بہت سی دودھ پلانے والی عورتوں کو بلایا گیا ہے لیکن حضرت موسیٰ نے کسی کا دودھ نہیں پیا۔ تب حضرت موسیٰ کی بہن نے کہا:

هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ
وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ (القصص: ۱۲)

آیا میں تمہیں ایسے گھروالوں کی طرف راہنمائی کروں جو
تمہارے لیے اس بچہ کی پرورش کریں اور وہ اس کے خیر خواہ
ہوں۔

انہوں نے پوچھا وہ کون ہیں؟ اس نے کہا وہ عمران کی بیوی حنہ ہے۔ انہوں نے اس کو بلوایا۔ حضرت موسیٰ کی والدہ آئیں تو حضرت موسیٰ نے ان کا دودھ پی لیا اور سو گئے۔

جب حضرت موسیٰ کے دودھ پینے کی مدت ختم ہو گئی تو ایک دن فرعون ان کو اپنی گود میں لے کر بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کی داڑھی پکڑ کر کھینچ لی۔ فرعون کے کما جلا کو بلاؤ اس کو ابھی زنج کراتے ہیں۔ آسیہ نے کہا: یہ نا سمجھ بچہ ہے پھر اس نے یا قوت اور انگارے حضرت موسیٰ کے سامنے ڈالے۔ حضرت موسیٰ نے انگارہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا جس سے ان کی زبان جل گئی اور اس میں لکنت پیدا ہو گئی جس کو دور کرنے کے لیے انہوں نے اللہ سے دعا کی تھی:

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِي ۖ يَفْقَهُوا
قَوْلِي ۖ (طہ: ۲۸-۲۷) لیں۔

اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ
سکیں۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام جوان ہو گئے وہ فرعون کی سواریوں پر سوار ہوتے اور اس کی طرح لباس پہنتے۔ اور لوگ انہیں موسیٰ بن فرعون کہتے تھے۔ ایک دن حضرت موسیٰ شہر گئے تو وہاں دو آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھا ایک ان کی قوم بنو اسرائیل سے تھا اور دوسرا ان کے دشمن قبلیوں میں سے تھا۔ اس اسرائیلی نے قبلی کے خلاف حضرت موسیٰ سے مدد طلب کی۔ حضرت موسیٰ نے قبلی کے ایک گھونسا مارا جس سے وہ مر گیا۔ (حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس کو گھونسا مارنا تادیب تھا۔ آپ کا اس کو قتل کرنے کا قصد نہیں تھا اور نہ عادتاً ایک گھونسا کھا کر کوئی مرتا ہے۔ وہ قضاء الہی سے مر گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فعل کسی وجہ سے بھی گناہ نہیں تھا۔ آپ کا اس پر نام ہونا اور اس پر استغفار کرنا آپ کے انکسار اور تواضع کی وجہ سے تھا) حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قتل پر نام ہوئے اور آپ اپنے گرفتار ہونے کی وجہ سے خوف زدہ تھے۔ دوسرے دن وہ اسرائیلی کسی اور شخص سے لڑ رہا تھا اور اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھر اس کے خلاف مدد طلب کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس اسرائیلی کی مدد کا ارادہ کیا اور اس نے غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھا کہ شاید آپ اس کو مارنے لگے ہیں۔ اس نے کہا: کیا آپ مجھے اس طرح قتل کرنا چاہتے ہیں جس طرح آپ نے کل ایک شخص کو قتل کر دیا تھا! (القصص: ۱۸-۱۵) تب لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ قاتل ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ کو پکڑنے کے لیے نکلے حضرت موسیٰ خوف زدہ ہو کر اس شہر سے نکلے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مدین کے راستے پر لگا دیا۔ (المنتظم، ج ۱، ص ۲۱۹-۲۱۷، طبع بیروت)

اس کے بعد کا واقعہ سورہ القصص میں اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے:

(حضرت) موسیٰ مدین پہنچے تو دیکھا وہاں لوگ ایک کنوئیں سے پانی نکال رہے ہیں اور اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے دور ایک طرف دو عورتیں کھڑی ہیں جو اپنے جانوروں کو پانی کی طرف جانے سے روک رہی ہیں۔ (حضرت) موسیٰ نے ان سے پوچھا تم کیوں الگ کھڑی ہو؟ انہوں نے کہا: ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک کہ یہ لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر واپس لے جائیں اور ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں تو (حضرت) موسیٰ نے ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا پھر سائے کی طرف آگئے اور کہا: اے میرے رب میں یقیناً اس خیر اور برکت کا محتاج ہوں جو تو نے مجھ پر نازل کی ہے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ان دو عورتوں میں سے ایک عورت شرم و حیا سے چلتی ہوئی آئی اس نے کہا: میرے والد آپ کو بلاتے ہیں تاکہ آپ کو پانی پلانے کی اجرت دیں، جب (حضرت) موسیٰ ان لڑکیوں کے باپ کے پاس گئے تو انہوں نے ان کو اپنے حالات بتائے، ان لڑکیوں کے والد نے کہا: آپ ڈریں نہیں! آپ نے ظالم لوگوں سے نجات پالی ہے۔ ان لڑکیوں میں سے ایک نے کہا: اے اباجان آپ انہیں اجرت پر رکھ لیں، بے شک آپ جس کو اجرت پر رکھیں ان میں وہی بہترین ہے جو قوی اور امانت دار ہو۔ ان کے والد نے کہا: میں یہ چاہتا ہوں کہ میں ان دو لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں اس (مہر) پر کہ تم آٹھ سال تک اجرت پر میرا کام کرو اور اگر تم دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری طرف سے (تبرع) ہوگا، اور میں تم کو مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا، تم ان شاء اللہ مجھے نیکو کاروں میں سے پاؤ گے۔

(حضرت) موسیٰ نے کہا: یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی میں ان میں سے جو مدت بھی پوری کر دوں تو مجھ پر کوئی تاوان نہیں اور ہمارے قول پر اللہ نگہبان ہے۔ پھر جب (حضرت) موسیٰ نے مدت پوری کر دی تو وہ اپنی بیوی کو لے کر چلے تو انہوں نے پہاڑ طور کی طرف ایک آگ دیکھی، انہوں نے اپنی اہلیہ سے کہا: ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں تمہارے پاس اس کی کچھ خبر لاؤں یا آگ کی کوئی چنگاری لاؤں تاکہ تم تاپو۔ پھر جب (حضرت) موسیٰ آگ کے پاس آئے تو انہیں میدان کے داہنے کنارے سے برکت والے مقام میں ایک درخت سے ندا کی گئی کہ اے موسیٰ! بے شک میں ہی اللہ ہوں تمام جہانوں کا پروردگار، اور یہ کہ آپ اپنا عصا ڈال دیں پھر جب (حضرت) موسیٰ نے اسے اس طرح لہراتے ہوئے دیکھا گویا وہ سانپ ہے تو وہ بیٹھ پھیر کر چل دیے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا (ندا آئی) اے موسیٰ! سامنے آئے اور خوف نہ کیجئے بے شک آپ امن والوں میں سے ہیں۔ آپ اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال لے وہ سفید چمکتا ہوا بے عیب نکلے گا، اور اپنا بازو اپنی طرف (سینے سے) ملائیں خوف دور ہونے کے لیے، سو یہ دو مضبوط دلیلیں آپ کے رب کی طرف سے ہیں فرعون اور اس کے درباریوں کی طرف (آپ دعوت دیں) بے شک وہ فاسق لوگ ہیں۔ (حضرت) موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میں نے ان میں سے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ اور میرے بھائی ہارون جو مجھ سے زیادہ فصیح زبان والے ہیں تو انہیں میری مدد کے لیے میرے ساتھ رسول بنا کر بھیج دے تاکہ وہ میری تصدیق کریں بے شک میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔ فرمایا: ہم عنقریب آپ کے بازو کو آپ کے بھائی کے ساتھ مضبوط کر دیں گے اور آپ دونوں کو غلبہ عطا فرمائیں گے تو وہ ہماری نشانیوں کے باعث آپ تک نہ پہنچ سکیں گے، آپ اور آپ کے متبعین ہی غالب رہیں گے۔ پس جب ان کے پاس (حضرت) موسیٰ ہماری کھلی ہوئی نشانیاں لے کر پہنچے تو انہوں نے کہا: یہ تو صرف من گھڑت جادو ہے اور ہم نے یہ باتیں اپنے پہلے باپ دادا کے زمانہ میں (کبھی) نہیں سنیں۔ اور (حضرت) موسیٰ نے کہا: میرا رب اس کو خوب جانتا ہے جو میرے رب کی طرف سے ہدایت لے کر آیا ہے (اور وہ خوب جانتا ہے) کہ آخرت کا انجام کس کے لیے اچھا ہوگا، بے شک ظالم لوگ فلاح نہیں پاتے۔ اور فرعون نے کہا: اے درباریو! میں تمہارے لیے اپنے سوا کوئی معبود نہیں جانتا سوا اے ہامان! میرے لیے کچھ اینٹوں کو آگ سے پکاؤ پھر میرے لیے ایک

اونچی عمارت بنانا تاکہ میں موسیٰ کے معبود کو جھانک کر دیکھوں اور بے شک میں اس کو جھوٹوں سے گمان کرتا ہوں۔ فرعون اور اس کے لشکر نے زمین میں بے جا تکبر کیا اور یہ زعم کیا کہ وہ ہماری طرف نہیں لوٹائے جائیں گے تو ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو پکڑ لیا سو ہم نے ان سب کو دریا میں پھینک دیا تو آپ دیکھئے کہ ظالموں کا کیسا انجام ہوا۔ (القصص: ۳۰-۲۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے اہم واقعات کو قرآن مجید کی اس سورت اور دیگر سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ ان کی تفصیل اور تحقیق ہم ان آیتوں کی تفسیر میں ان شاء اللہ بیان کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ملک الموت آئے اور کہا: اپنی رب کی دعوت پر چلئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک تھپڑ مارا اور ملک الموت کی آنکھ نکال دی۔ ملک الموت اللہ کے پاس گئے اور عرض کیا: تو نے مجھے ایسے بندے کے پاس بھیجا ہے جس کا مرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کی آنکھ لوٹادی اور فرمایا: میرے بندہ کے پاس جا کر کہو تم زندگی چاہتے ہو، اگر تم زندگی چاہتے ہو تو ایک بیل کی پشت پر ہاتھ رکھ دو، جس قدر بال آپ کے ہاتھ کے نیچے آئیں گے، آپ اتنے سال زندہ رہیں گے۔ حضرت موسیٰ نے کہا: پھر کیا ہوگا؟ کہا پھر موت ہوگی؟ فرمایا: پھر ابھی عنقریب، اے میرے رب! مجھے ارض مقدسہ سے ایک پتھر پھینکنے کے فاصلے پر موت عطا فرماتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر میں اس جگہ ہوتا تو میں تمہیں ان کی قبر راستے کے ایک جانب کثیب احمر کے پاس دکھاتا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۲۰۷، صحیح مسلم فضائل انبیاء: ۱۵۸-۱۵۷، (۲۳۷۲) ۶۰۳۳-۶۰۳۳، سنن النسائی رقم الحدیث:

۲۰۸۹، مسند احمد، ج ۲، ص ۳۱۵-۳۶۹)

امام عبدالرحمن بن علی جوزی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

ابو عمران جوینی نے کہا جب موسیٰ علیہ السلام پر موت کا وقت آیا تو موسیٰ علیہ السلام رو رہے تھے، فرمایا: میں موت کی وجہ سے نہیں رو رہا بلکہ اس لیے رو رہا ہوں کہ موت کے وقت میری زبان ذکر الہی سے خشک ہو جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تین بیٹیاں تھیں۔ ان کو بلا کر فرمایا: اے میری بیٹیو! عنقریب بنو اسرائیل تمہارے سامنے دنیا پیش کریں گے تم اس میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرنا۔ علماء سیر نے بیان کیا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات کے تین سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد حضرت یوشع کے لیے وصیت کی تھی اور آپ باب لد پر فوت ہوئے تھے۔ امام ابو جعفر طبری نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال تھی۔ اس میں اختلاف ہے کہ حضرت موسیٰ سرزمین شام میں فوت ہوئے یا نہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ میدان تہ میں فوت ہوئے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون سب میدان تہ میں فوت ہوئے اور حضرت یوشع کے سوا کوئی بیت المقدس میں داخل نہیں ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چالیس سال بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بنو اسرائیل کے ساتھ میدان تہ سے نکل آئے تھے اور بنو اسرائیل سے فرمایا تھا:

اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے چاہو کھاؤ۔ امام ابن جریر نے کہا یہی قول صحیح ہے۔ اور حضرت موسیٰ نے ہی بنو اسرائیل کے نیک لوگوں کے ساتھ جبارین کی اس بستی کو فتح کیا تھا۔ کیونکہ اہل سیرت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت موسیٰ نے ہی عوج بن عنق سے قتال کیا تھا۔ عوج ان کا بادشاہ تھا اور بلعام ان لوگوں میں سے تھا جن کو حضرت موسیٰ نے قید کیا تھا اور پھر قتل کر دیا تھا۔ (تاریخ طبری، ج ۱، ص ۳۳۶-۳۳۳، ملخصاً)

ابو الحسین بن المنادی نے کہا یہود کو یہ معلوم نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کہاں ہے اگر ان کو معلوم ہوتا تو وہ اللہ کو چھوڑ کر ان کو خدا بنا لیتے۔ (المنتظم ج ۱، ص ۲۵۳-۲۵۴، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

حافظ ابو القاسم علی بن حسن بن عساکر متوفی ۵۷۱ھ لکھتے ہیں:

جب حضرت موسیٰ اپنی والدہ اپنی اولاد اور اپنی الہیہ سے الوداع ہو گئے تو آپ نے حضرت یوشع کو بلایا اور انہیں لوگوں پر خلیفہ بنا دیا اور ملک الموت کے پاس گئے۔ ملک الموت نے ان سے کہا: اے موسیٰ موت کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ حضرت موسیٰ نے ان سے فرمایا: مجھ پر اللہ کا حکم جاری کر دو۔ وہ دونوں بستی سے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ حضرت جبرائیل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل کھڑے ہوئے ان دونوں کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر وہ سب مل کر چلنے لگے حتیٰ کہ وہ ایک قبر کے پاس سے گزرے جس پر سفید عمامہ باندھے ہوئے لوگ کھڑے تھے ان سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔ حضرت موسیٰ نے ان سے پوچھا: تم یہ کس کی قبر کھود رہے ہو؟ انہوں نے کہا: ایک ایسے بندہ کی جس سے اللہ محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا: کیا تم مجھے اجازت دو گے کہ میں اس قبر میں اتر کر اس کو دیکھ لوں؟ انہوں نے کہا: ہاں! جب حضرت موسیٰ علیہ السلام قبر میں اترے تو وہ جنت تک کشادہ کر دی گئی اور جنت کی تروتازگی اور اس کی خوشبو پہنچنے لگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس قبر میں لیٹ گئے پھر دعا کی اے اللہ مجھے وہ بندہ بنا دے جس سے تو محبت کرتا ہے اور وہ تجھ سے محبت کرتا ہے پھر ملک الموت نے ان کی روح کو قبض کر لیا۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نے آگے بڑھ کر ان کی نماز جنازہ پڑھی اور پھر قبر پر مٹی ڈال دی گئی۔

(مختصر تاریخ دمشق ج ۲۵، ص ۳۹۳-۳۹۴، الکامل فی تاریخ، ج ۱، ص ۱۱۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شب معراج میں کئیب احمر کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قریب سے گزرا وہ اپنی قبر میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔

(صحیح مسلم فضائل ۱۶۳، ۲۳۷۵ (۲۳۷۴)، سنن النسائی: ۱۶۳۱)

علامہ بدر الدین محمد بن احمد یعنی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کس جگہ واقع ہے اس میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں حسب ذیل اقوال ہیں:

۱- حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی قبر میدان تہ میں ہے۔ ضحاک نے بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک پتھر پھینکنے کے فاصلہ کے برابر ارض مقدسہ میں داخل ہوئے تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر معلوم نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو مبسم رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی قبروں کو یہود جان لیتے تو ضرور ان کو اپنا خدا بنا لیتے۔ ابن اسحاق نے کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کا صرف رخمہ کو علم تھا یہ وہ شخص ہے جو اس پر مطلع تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو میدان تہ میں دفن کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عقل سلب کر لی تاکہ وہ کسی کو بتانہ سکے۔

۲- حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر بیت المقدس کے باب لد کے قریب ہے۔ طبری نے کہا: یہی قول صحیح ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قول کیسے صحیح ہو سکتا ہے حالانکہ حضرت ابن عباس، وہب اور عام علماء نے یہ کہا ہے کہ ان کی قبر میدان تہ میں ہے۔

۳- حافظ ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ذکر کیا ہے کہ ان کی قبر عالیہ اور عویلہ کے درمیان ہے اور یہ مسجد قدم کے نزدیک دو محلے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ ان کی قبر خواب میں وہاں دکھائی گئی تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ عالیہ معروف جگہ ہے اور عویلہ ایک

ثبیان القرآن

گرجے کے پاس ہے۔ (مختصر تاریخ دمشق، ج ۲۵، ص ۳۹۸، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۹ھ)

۴۔ بصری اور البقاء کے درمیان وادی ماب میں ان کی قبر ہے۔

۵۔ حافظ ابو القاسم نے کعب الاحبار سے روایت کیا ہے کہ ان کی قبر دمشق میں ہے اور حافظ ابن حبان نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر مدینہ اور بیت المقدس کے درمیان مدین میں ہے۔ اس پر محمد بن عبد الواحد الضیاء نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مدین بیت المقدس کے قریب ہے نہ ارض مقدسہ کے، اور مشہور یہ ہے کہ ان کی قبر اریحا میں ہے جو ارض مقدسہ میں ہے اور ایک قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قبر کثیب احمر کے پاس ہے جیسا کہ حدیث میں ہے اور اس قبر کے پاس دعا مستجاب ہے۔

علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیت المقدس کے قریب موت کی دعا کی اور بیت المقدس میں مدفون ہونے کی دعا نہیں کی۔ کیونکہ ان کو یہ خدشہ تھا کہ ان کی قبر لوگوں میں مشہور ہو جائے گی تو لوگ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ فضیلت والی جگہوں میں دفن ہونا مستحب ہے اور صالحین کی قبروں کے پاس مدفون ہونا مبارک ہے۔ (صحیح مسلم بشرح النووی، ج ۱۰، ص ۶۲۳۱-۶۲۳۲، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور موسیٰ نے کہا اے فرعون! میں رب العالمین کی طرف سے رسول ہوں، میرا یہ منصب ہے کہ میں اللہ کے متعلق حق کے سوا کوئی بات نہ کہوں، بے شک میں تمہارے رب کی طرف سے ایک قوی دلیل لایا ہوں، سو (اے فرعون!) تو میرے ساتھ بنو اسرائیل کو بھیج دے، فرعون نے کہا اگر تم کوئی دلیل لائے ہو تو اس کو پیش کرو اگر تم سچے ہو (الاعراف: ۱۰۶-۱۰۷)

فرعون کے دعویٰ خدائی کا رد

حضرت موسیٰ نے کہا: اے فرعون! فرعون مصر کے بادشاہوں کا لقب ہے، جیسے حبشہ کے بادشاہوں کا لقب نجاشی ہے۔ روم کے بادشاہوں کا لقب قیصر ہے اور ایران کے بادشاہوں کا لقب کسریٰ ہے۔ ہندو بادشاہ اپنے آپ کو راجہ کہلاتے تھے اور مسلمان بادشاہ اپنے آپ کو سلطان کہلاتے تھے۔ فرعون کا نام قابوس تھا۔ یا ولید بن مسعب بن ریان تھا۔ جدید تحقیق یہ ہے کہ اس کا نام منفتح تھا۔

فرعون خدائی کا دعویٰ دار تھا اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ابتدائی کلام میں یہ فرمایا کہ میں رب العالمین کا نمائندہ (رسول) ہوں اور اس کلام سے فرعون کے دعویٰ خدائی کا رد فرمایا کیونکہ عبادت کا مستحق وہ ہے جو تمام جانوں کا رب ہو۔ آسمانوں، زمینوں، سورج، چاند اور ستاروں کا پیدا کرنے والا ہو۔ پتھروں، درختوں، حیوانوں اور انسانوں کا پیدا کرنے والا ہو، فرعون ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں تو فرعون سے پہلے بھی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ فرعون کا خدائی کا دعویٰ باطل ہے۔ عبادت کا مستحق اور خدا وہی ہے جو تمام جانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

قبیضیوں کا بنو اسرائیل کو غلام بنانا

اس کے بعد حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ میں چونکہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا رسول ہوں اس لیے مجھ پر واجب ہے کہ میں حق اور صداقت کے سوا کوئی بات نہ کہوں۔ میرے رسول ہونے پر ایک قوی دلیل موجود ہے اور جب میری رسالت ثابت

ہے تو اے فرعون میں تجھے یہ حکم دیتا ہوں کہ تو بنو اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے۔

مصر کے قدیم باشندے قبلی تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت سے چار سو سال پہلے جب حضرت یوسف علیہ السلام یہاں پر آئے اور ان کی اولاد یعنی بنو اسرائیل یہاں پھیل گئی تو مصر کے بادشاہ یعنی فرعون نے ان کو غلام بنالیا اور وہ بنو اسرائیل سے بیگار لیتے تھے۔ ان سے جانوروں کا دودھ نکلاتے، زمینوں کی کھدائی کراتے اور دیگر مشقت کے کام لیتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانا چاہی۔ اس لیے فرمایا: فرعون بنو اسرائیل کو ان کے ساتھ بھیج دے۔ فرعون نے کہا: اگر تم اپنے دعویٰ کے مطابق اللہ کے رسول ہو تو اس دعویٰ پر کوئی دلیل پیش کرو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا پس وہ اچانک جیتا جاگتا اژدھا ہو گیا اور اپنا ہاتھ (گریبان سے) نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لیے روشن ہو گیا (الاعراف: ۱۰۸-۱۰۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاشی اژدھا بن گئی تھی۔ وہ بہت بڑا اژدھا تھا۔ مجاہد نے کہا ہے کہ اس کے دو جبروں کے درمیان چالیس ذراع (ساتھ فٹ) کا فاصلہ تھا۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاشی ڈالی تو وہ بہت بڑا اژدھا بن گیا جو اپنا منہ کھولے ہوئے فرعون کی طرف دوڑ رہا تھا۔ جب فرعون نے دیکھا کہ وہ اژدھا اس کو کھانے کے لیے دوڑ رہا ہے تو وہ تخت کے اندر گھس گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی کہ اس کو روک لے سوانہوں نے اس کو روک لیا۔ (جامع البیان، ج ۶، ص ۲۰، مطبوعہ دار الفکر، تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۵، ص ۱۵۳۲)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لاشی پھینکی تو وہ زرد رنگ کا ایک بال دار اژدھا ہو گیا اس کے دونوں جبروں کے درمیان اسی ذراع (ایک سو بیس فٹ) کا فاصلہ تھا۔ وہ اپنی دم پر کھڑا ہو گیا اور وہ زمین سے تقریباً ایک میل بلند تھا۔ اس کا ایک جبر زمین پر تھا اور دوسرا جبر فرعون کے محل کی دیوار پر تھا۔ وہ فرعون کے پکڑنے کے لیے دوڑا۔ فرعون اپنا تخت چھوڑ کر بھاگا اور آنحلیکہ اس کے دست جاری تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ اس ایک دن میں اس کے چار سو دست جاری ہوئے اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے پیٹ میں بیماری ہو گئی جو تادم مرگ دور نہ ہو سکی۔ ایک روایت میں ہے کہ فرعون کا جبر اس نے اپنی ڈاڑھوں میں پکڑ لیا۔ اس نے لوگوں پر حملہ کیا لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی اور پچیس ہزار آدمی رش میں مارے گئے۔ پھر فرعون نے چیخ کر کہا: اے موسیٰ میں تمہیں اس ذات کی قسم دے کر کہتا ہوں جس نے تمہیں بھیجا ہے، تم اس اژدھے کو پکڑ لو۔ میں تم پر ایمان لے آؤں گا اور تمہارے ساتھ بنو اسرائیل کو بھیج دوں گا حضرت موسیٰ نے اس اژدھے کو پکڑ لیا تو وہ پھر لاشی ہو گیا۔ (روح المعانی، ج ۹، ص ۲۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

بہ ظاہر اس روایت میں کافی مبالغہ ہے لیکن علامہ آلوسی ایک ثقہ عالم ہیں۔ انہوں نے اس روایت کو اعتماد کے ساتھ نقل کیا ہے اس لیے اس کی کچھ نہ کچھ اصل ضرور ہوگی کیونکہ اگر وہ عام اژدھا ہوتا تو چند لوگ مل کر اس کو مار ڈالتے۔ لہذا اتنی بات یقینی ہے کہ وہ اژدھا بہت بڑا اور غیر معمولی جسم اور خوفناک تھا اور یہ بھی بعید نہیں ہے کہ خوف اور دہشت سے جب فرعون تخت چھوڑ کر بھاگا ہو تو اس کے دست نکل گئے ہوں تاہم ان کی گنتی بعید از قیاس ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب اس کے درباری اور دیگر قبلی اژدھے کو دیکھ کر خوفزدگی سے بھاگے ہوں تو بھگدڑ میں بہت سے درباری اور قبلی مارے گئے ہوں لیکن ان کا پچیس ہزار ہونا ناقابل فہم ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دوسرا معجزہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو وہ بہت روشن اور چمک دار تھا اور جب دوبارہ گریبان میں ہاتھ ڈالا تو وہ معمول کے مطابق تھا۔

حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ بہت سفید تھا اور اس کی یہ سفیدی برص یا کسی اور بیماری کی وجہ سے نہیں تھی۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۲۱، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ اس نور کی وجہ سے آسمان اور زمین کی ہر چیز روشن ہو گئی تھی۔

(روح المعانی ج ۹، ص ۲۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا السَّحِرُ عَلِيمٌ ۙ يُرِيدُ

قوم فرعون کے سرداروں نے (آپس میں) کہا یقیناً یہ شخص بہت ماہر جادوگر ہے ○ یہ چاہتا ہے

أَنْ يُخْرِجَكُمْ مِنْ أَرْضِكُمْ ۖ فَمَاذَا تَأْمُرُونَ ۙ قَالُوا أَرْجَاهُ

کہ تمہیں تمہاری زمین سے نکال دے، اب تمہارا کیا مشورہ ہے؟ ○ انہوں نے فرعون سے کہا اس کے

وَأَخَاهُ وَأَرْسِلْ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ ۙ يَا تُوَكُّ بِكُلِّ سِحْرٍ

اور اس کے بھائی کو بھیرا لو اور جمع کرنے والوں کو شہروں میں بھیج دو ○ جو تمہارے پاس ہر ماہر جادوگر کو

عَلَيْهِمْ ۙ وَجَاءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوا إِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا

سے آئیں ○ اور جادوگر فرعون کے پاس آئے اور کہا اگر ہم غالب ہو گئے تو یقیناً ہمارے لیے

مَنْ الْعَالِيَيْنِ ۙ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۙ قَالُوا

انعام ہو گا؟ ○ فرعون نے کہا ہاں! اور بیشک تم ضرور مقربین میں سے ہو جاؤ گے ○ جادوگروں نے کہا

يَمُوسَىٰ إِنَّمَا أَنْ تُلْقَىٰ وَإِنَّمَا أَنْ تَكُونَ نَحْنُ الْمُلْقِينَ ۙ

اے موسیٰ! آیا آپ پہلے (عسا) ڈالیں گے یا ہم پہلے ڈالیں ○

قَالَ الْقُوا فَلَمَّا الْقُوا سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوهُمْ

موسیٰ نے کہا تم ڈالو، جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کو خوف زدہ کر دیا

وَجَاءُوا بِسِحْرِ عَزِيمٍ ۙ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ

اور انہوں نے بہت بڑا جادو پیش کیا ○ اور ہم نے موسیٰ کو وحی فرمائی کہ تم اپنا عصا ڈال دو

فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿۱۲۶﴾ فَرَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا

تو وہ فوراً ان کے جھوٹے طلسم کو ننگنے لگا ○ سو حق کا غلبہ ثابت ہو گیا اور جو کچھ وہ کرتے تھے اس کا

يَعْمَلُونَ ﴿۱۲۷﴾ فَغَيَّبْنَا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صَغِيرِينَ ﴿۱۲۸﴾ وَالْقَى السَّحْرَةَ

بطلان ظاہر ہو گیا ○ پس فرعون اور اس کے درباری مغلوب ہو گئے اور ذلیل و خوار ہو کر واپس آئے ○ اور جادوگر سجدہ میں

سُجِدِينَ ﴿۱۲۹﴾ قَالُوا امَّا رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۳۰﴾ رَبِّ مُوسَى وَهَارُونَ ﴿۱۳۱﴾

گر پڑے ○ انہوں نے کہا ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے ○ جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے ○

قَالَ فِرْعَوْنُ اَمَنْتُمْ بِهِ قَبْلَ اَنْ اُذِنَ لَكُمْ اِنَّ هَذَا لَمَكْرٌ

فرعون نے کہا تم میری اجازت لینے سے پہلے ایمان لے آئے ؟ یقیناً یہ تمہاری خفیہ سازش ہے

مَكْرٌ تَمْوَدُّ فِي الْمَدِيْنَةِ لِيُخْرِجُوْا مِنْهَا اَهْلَهَا فَاَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

جو تم نے مل کر شہر میں تیار کی ہے تاکہ اس شہر کے بستے والوں کو اس شہر سے نکال دیا سو تقریباً تم اس کا خمیازہ بھگتو گے ○

لَا قِطْعَانَ اَيْدِيكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَأَمْلِيْتُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

میں ضرور تمہارے ہاتھوں اور پاؤں کو مخالفت جاہلوں سے کاٹ دوں گا پھر میں ضرور تم سب کو سول پر چڑھاؤں گا ○

قَالُوْا اِنَّا اِلَى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَمَا نُنْقِمُ مِنْكَ اِلَّا اَنْ اَمَّا بِاٰيَاتِ

انہوں نے کہا بیشک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں ○ تو ہم سے صرف اس بات کا انتقام لے رہا ہے کہ جب ہمارے

رَبِّنَا لَمَّا جَاءَنَا طَرَسْنَا فَرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّاَتَوْفَاتَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

پاس ہمارے رب کی نشانیاں آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے اے ہمارے رب: ہم پر صبرانڈیل دے اور حالتِ اسلام میں ہماری روح قبض کرنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قوم کے سرداروں نے (آپس میں) کہا: یقیناً یہ شخص بہت ماہر جادوگر ہے ○ یہ چاہتا

ہے کہ تمہیں تمہاری زمین سے نکال دے اب تمہارا کیا مشورہ ہے ○ انہوں نے (فرعون سے) کہا: اس کو اور اس

کے بھائی کو ٹھیرالو اور جمع کرنے والوں کو شہروں میں بھیج دو ○ جو تمہارے پاس ہر ماہر جادوگر کو لے آئیں ○ جادوگر

فرعون کے پاس آئے اور کہا اگر ہم غالب ہو گئے تو یقیناً ہمارے لیے انعام ہو گا ○ فرعون نے کہا ہاں اور بے شک تم

ضرور مقررین میں سے ہو جاؤ گے ○

ہر نبی کا معجزہ اس چیز کی جنس سے ہوتا ہے جس چیز کا اس زمانہ میں چرچا ہو اس زمانہ میں جادو کا بڑا چرچا تھا اور جادو کی بہت سی قسمیں تھیں اور جادو کی بعض قسمیں بہت بڑی اور بہت حیران کن تھیں اسی لیے فرعون کی قوم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق خیال کیا کہ یہ بہت ماہر جادوگر ہیں۔ پھر انہوں نے آپس میں کہا کہ انہوں نے اتنے بڑے جادو کو اس لیے پیش کیا ہے کہ شاید یہ ملک اور ریاست کے طلب گار ہیں۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اس قول کو فرعون کی قوم کی طرف منسوب کیا ہے اور سورۃ الشعراء میں اس قول کو خود فرعون کی طرف منسوب کیا ہے اور یہ بہ ظاہر تعارض ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ قول فرعون کا بھی ہو اور اس کے درباریوں کا بھی ہو۔ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ نے اس قول کو اس کے درباریوں کی طرف منسوب کیا اور سورۃ الشعراء میں اس قول کو خود فرعون کی طرف منسوب کیا۔

”اب تمہارا کیا مشورہ ہے؟“ اس کے متعلق مفسرین نے کہا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ فرعون کا کلام ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ درباریوں کا کلام ہو۔

”بے شک تم ضرور مقربین میں سے ہو جاؤ گے“ جادو گروں نے فرعون سے اجر کا سوال کیا تھا۔ جواب میں فرعون نے کہا تم مقربین میں سے ہو جاؤ گے اس جواب میں ان کے اجر کا ذکر تو نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرعون کا مطلب یہ تھا کہ بے شک تم کو اجر بھی ملے گا اور تم مقربین میں سے بھی ہو جاؤ گے۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ یہ ستر جادوگر تھے اور ایک ان کا سردار تھا جو ان کو جادو سکھاتا تھا یہ مجوسی شخص تھا۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اس زمانہ میں جادو کا بہت چرچا تھا جیسا کہ متکلمین نے کہا ہے کہ ہر نبی کو اس جنس سے معجزہ دیا جاتا ہے جس جنس کا اس زمانہ میں بہت غلبہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادو کا بہت چرچا تھا تو ان کو ایسا معجزہ دیا گیا جو جادو کے مشابہ تھا اور وہ جادو گروں کے تمام کمالات پر غالب آگیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب اور حکمت کا بہت غلبہ تھا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیحائی کا ایسا کمال دے کر بھیجا جو ان کی تمام طب اور حکمت پر غالب آگیا اور ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کے زمانہ میں فصاحت اور بلاغت کا بہت غلبہ تھا تو نبی ﷺ کو ایسا فصیح اور بلیغ کلام دے کر بھیجا جس کی نظیر لانے سے تمام جن اور انس عاجز ہو گئے۔

سحر کی تعریف اور سحر اور معجزہ میں فرق

کسی خبیث اور بدکار شخص کے مخصوص عمل کے ذریعہ کسی غیر معمولی اور خلاف عادت کام کے ظہور کو سحر کہتے ہیں اور یہ باقاعدہ کسی استاذ کی تعلیم سے حاصل ہوتا ہے اور اسی تعریف سے سحر کا معجزہ اور کرامت سے فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ معجزہ نبی کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے جس کی نیکی اور پاکیزگی معاشرہ میں مشہور ہوتی ہے اور سحر خبیث اور بدکار شخص سے ظاہر ہوتا ہے۔ نیز سحر کسی استاذ سے سیکھا جاتا ہے جب کہ معجزہ نبی سے بغیر کسی شخص کی تعلیم کے ظاہر ہوتا ہے اور معجزہ نبی اس لیے پیش کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی عبادت اور نیکی اور پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے اور اپنے آپ کو اللہ کا فرستادہ اور رسول قرار دیتا ہے۔ جبکہ ساحر دعویٰ نبوت کی دلیل کے لیے سحر پیش کرتا ہے نہ وہ لوگوں کو عبادت اور پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے بلکہ اس کا مقصد لوگوں کو حیران کرنا اور کسی دنیاوی مفاد کو حاصل کرنا ہوتا ہے اور نبی دنیاوی مفادات سے بے نیاز ہوتا ہے اور اسی فرق سے سحر اور کرامت کا فرق بھی ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ کرامت بغیر تعلیم کے کسی نیک مسلمان کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہے اور یہ کسی نہیں وہی ہوتی ہے جبکہ سحر کسب اور تعلیم سے کسی فاسق اور شریر شخص کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے۔ سحر کسی شخص کی طبیعت یا

اس کی فطرت کا خاصہ نہیں ہے اور یہ بعض جگہوں، بعض اوقات اور بعض شرائط کے ساتھ مخصوص ہے۔ جادو کا معارضہ دیا جاتا ہے اور اس کو کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے۔ سحر کرنے والا فسق کے ساتھ ملعون ہوتا ہے، ظاہری اور باطنی نجاست سے ملوث ہوتا ہے اور دنیا اور آخرت میں رسوا ہوتا ہے۔ اہل حق کے نزدیک سحر عقلاً جائز اور ثابت ہے اور قرآن اور سنت میں اس کا بیان ہے۔

معتزلہ نے کہا سحر کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ محض نظر بندی ہے اور اس کا سبب کربت، ہاتھ کی صفائی اور شعبدہ بازی ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہے:

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنٌ وَلٰكِنَّ الشَّيْطٰنَ كَفَرُوْا
يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ (البقرہ: ۱۰۲)

اور سلیمان نے کوئی کفر نہیں کیا، البتہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے، وہ لوگوں کو جادو (کفریہ کلمات) سکھاتے تھے۔

اسی آیت میں مذکور ہے کہ سحر کے ذریعہ شوہر اور بیوی میں تفریق ہو جاتی تھی۔ نیز قرآن مجید میں ہے:

وَمِنْ شَرِّ النَّفٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ (الفلق: ۴)

آپ کہئے کہ میں گر ہوں میں (جادو کی) بست پھونک مارنے والی عورتوں کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔

نیز حدیث صحیح میں ہے کہ ایک یہودی لبید بن اعصم نے رسول اللہ ﷺ پر سحر کر دیا تھا جس کی وجہ سے آپ تین راتیں بیمار رہے۔ (صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۷۵۶۳) اس کی تحقیق بنی اسرائیل: ۴۷ میں دیکھیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے:

يُخٰتِلِ الْاِيۡهَ مِنْ سِحْرِهٖمۡ اَنۡهَآ تَسْعٰى

حضرت موسیٰ کی طرف یہ خیال ڈالا گیا کہ ان کے سحر کی وجہ سے وہ لائیاں اور رسیاں دوڑ رہی ہیں۔ (طہ: ۶۶)

اس سے معلوم ہوا کہ جادو کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ صرف نظر بندی ہے اور کسی کے ذہن میں خیال ڈالنا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ فرعون کے جادو گروں کا سحر ہی تخیل اور نظر بندی تھا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جادو کی کوئی اور حقیقت نہیں ہے۔ (شرح القاصد ج ۵، ص ۸۱-۸۰، 'ملخصاً و موضحاً'، مطبوعہ ایران، ۱۳۰۹ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

جس چیز کا سبب مخفی ہو اس کو سحر کہتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب کام ہوتا ہے جو خرق عادت کے مشابہ ہوتا ہے۔ اس میں قول، عمل اور اعتقاد تینوں کا دخل ہے۔ اس میں شیطان کی مدح اور الفاظ شرکیہ پڑھ کر دم کیا جاتا ہے۔ ستاروں کی عبادت اور دوسرے جرائم کرنے پڑتے ہیں اور شیطان سے محبت کرنی ہوتی ہے۔ سحر وہی شخص کر سکتا ہے جس کا نفس خبیث ہو اور اس کو شیطان کے ساتھ مناسبت ہو۔ جس طرح فرشتے ان ہی لوگوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں جو دائمی عبادت کرتے ہوں اور اللہ کے ساتھ قرب میں فرشتوں کے مشابہ ہوں، اسی طرح شیاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں جو قول، فعل اور اعتقاد کی خباثت اور نجاست میں شیاطین کے مشابہ ہوں۔ اس تعریف سے ساحر، نبی اور ولی سے ممیز ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو مختلف ترکیبوں، آلات اور دواؤں کے ذریعہ عجیب و غریب کام کر کے دکھاتے ہیں، وہ دراصل شعبدہ باز ہیں۔ ان کو ساحر مجازاً کہا جاتا ہے اور یہ بھی بعض کے نزدیک شرعاً مذموم ہے۔

علامہ نووی نے روضۃ الطالبین (ج ۷، ص ۱۹۸) میں یہ تصریح کی ہے کہ سحر بلا جہت حرام ہے۔ جمہور نے سحر کی یہ تعریف کی ہے کہ سحر ایک خلاف عادت کام ہے یہ اعمال مخصوصہ کے ذریعہ اس شخص سے صادر ہوتا ہے جس کا نفس خبیث اور شریر ہو۔

جمہور کے نزدیک سحر کی حقیقت ہے اور ساحر ہوا میں اڑ سکتا ہے، پانی پر چل سکتا ہے، انسان کو قتل کر سکتا ہے اور انسان کو گدھا بنا سکتا ہے۔ ان تمام کاموں میں فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ساحر کو یہ قدرت نہیں دی کہ وہ سمندر کو چیر دے، مردے کو زندہ کر دے اور پتھر کو گویا کر دیے اور اس طرح کے دوسرے کام جو انبیاء علیہم السلام کے معجزات ہیں۔ معتزلہ اور اہل سنت میں سے الاستر ابازی کا یہ مذہب ہے کہ ساحر ایسے کاموں پر قادر نہیں ہوتا جن کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ورنہ نبوت کے اثبات کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

بعض محققین نے سحر اور معجزہ میں یہ فرق کیا ہے کہ معجزہ میں نبی تحدی (چیلنج) کرتا ہے کہ اس جیسا کام کر کے دکھاؤ اور سحر میں تحدی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ جھوٹے نبی کے دعویٰ کے موافق خرق عادت ظاہر نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ منصب نبوت کو کذاہین سے محفوظ رکھتا ہے۔

سحر اور ساحر کا شرعی حکم

علامہ تفتازانی نے کہا ہے کہ جادو کا عمل کرنا کفر ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے اور حدیث میں جو سحر کو کبار میں سے شمار فرمایا ہے یہ اس کے منافی نہیں ہے کیونکہ کفر بھی کبیرہ گناہ ہے اور شیخ ابو منصور ماتریدی نے یہ کہا ہے کہ سحر کو مطلقاً کفر قرار دینا خطا ہے بلکہ اس کی حقیقت سے بحث کرنی چاہیے اگر جادو کے عمل میں کوئی ایسی چیز ہو جو ایمان کو رد کرتی ہو تو یہ کفر ہو گا ورنہ نہیں۔ پھر جو سحر کفر ہو اس میں مردوں کو قتل کر دیا جائے گا اور عورتوں کو نہیں قتل کیا جائے گا اور جس سحر کے ذریعہ کسی شخص کو ہلاک کر دیا جائے اس کے مرتکب کا حکم ذاکوؤں کی طرح ہے۔ اس میں مرد اور عورت برابر ہیں اور جب ذاکو توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی انہوں نے خطا کی کیونکہ فرعون کے جادو گروں کی توبہ قبول کر لی گئی تھی۔ مدارک میں اسی طرح مذکور ہے اور یہی بات اصول کے قریب ہے۔ امام ابو حنیفہ سے مشہور روایت یہ ہے کہ جب کسی شخص کے متعلق یقین ہو جائے کہ وہ ساحر ہے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اگر وہ کہے کہ میں جادو کو ترک کرتا ہوں تو اس کے قول کو قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر وہ کہے کہ میں جادو کو ہوں تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ امام ابو حنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ ام المومنین حضرت حفصہ کی باندی نے ان پر جادو کرنے کا اعتراف کیا تو آپ نے حضرت عبدالرحمن بن زید کو اسے قتل کرنے کا حکم دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے حکم دیا تھا کہ ہر ساحر اور ساحرہ کو قتل کر دو، سو تین ساحروں کو قتل کر دیا گیا۔ ساحر کو مطلقاً قتل کرنے پر امام شافعی نے اعتراض کیا ہے کیونکہ نبی ﷺ نے اس یہودی کو قتل نہیں کیا جس نے آپ پر جادو کیا تھا۔ اور مومن کا بھی اسی طرح حکم ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ذمیوں کے وہ حقوق ہیں جو مہاجرین کے ہیں اور ذمیوں کے وہ فرائض ہیں جو مہاجرین کے ہیں۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۳۱)

سحر کے سیکھنے اور سکھانے کا حکم

جادو کے سیکھنے اور سکھانے میں بھی اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ کفر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلَيْكُنَّ الشَّيْطَانِ كَفَرُوا يَعْلَمُونَ النَّاسَ

السِّحْرَ (البقرہ: ۱۰۲)

اس آیت میں کفر کی علت جادو سکھانا ہے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ شیطانوں نے کفر کیا اور وہ اس کے باوجود جادو سکھاتے تھے اور دوسرا قول یہ ہے کہ جادو کا سیکھنا اور سکھانا حرام ہے اور

جمہور علماء کا یہی مختار ہے۔ اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ دونوں مکروہ کام ہیں۔ یہ بعض کا قول ہے اور چوتھا قول یہ ہے کہ یہ دونوں مباح ہیں۔ البتہ وہ جادو سکھانا مذموم ہے جس کا مقصد لوگوں کو گمراہ کرنا ہو۔ امام رازی کا یہی مختار ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ جادو کا علم قبیح ہے نہ مذموم، کیونکہ فی ذاتہ علم میں شرف اور فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر: ۹)

کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔

اور جو شخص جادو کو نہ جانتا ہو وہ جادو اور معجزہ میں فرق نہیں کر سکے گا اور معجزہ کے معجز ہونے کا علم واجب ہے تو ثابت ہوا کہ جادو کا علم حاصل کرنا واجب ہے اور جو چیز واجب ہو وہ کیسے حرام اور قبیح ہو سکتی ہے، لیکن امام رازی کی دلیل پر یہ اعتراض ہے کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ فی نفسہ جادو کا علم قبیح ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جادو کا عمل کرنا ممنوع ہے اور چونکہ جادو کا علم جادو کے عمل کا ذریعہ ہے اس لیے وہ بھی ممنوع ہو گا کیونکہ شریعت میں ممنوع کام کا ذریعہ بھی ممنوع ہے۔ جیسے فی نفسہ زنا ممنوع ہے اور اس کے مقدمات مثلاً بوس و کنار اس فعل کے ارتکاب کا ذریعہ ہیں تو ان سے بھی منع فرمادیا اور فرمایا:

لَا تَقْرُبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً
زنا کے قریب بھی مت جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی کا کام ہے۔

(الاسراء: ۳۲)

شریعت میں اس کی بہت مثالیں ہیں۔

اس پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ہم یہ نہیں مانتے کہ معجزہ اور سحر میں فرق کرنا سحر کے علم پر موقوف ہے کیونکہ اکثر بلکہ تقریباً تمام علماء کو معجزہ اور سحر میں فرق کا علم ہے۔ حالانکہ ان کو سحر کا علم نہیں ہے۔ نیز جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ان میں فرق کو جاننے کے لیے یہ کافی ہے کہ معجزہ کا ظہور نبی پر ہوتا ہے جس کی نیکی لوگوں میں معروف ہوتی ہے اور وہ لوگوں کو اللہ کی عبادت اور نیکی اور پرہیزگاری کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے برخلاف سحر فاسق اور خبیث شخص سے صادر ہوتا ہے اور وہ کسی نیک کام کی دعوت نہیں دیتا اور اس پر تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر جادو کا علم حاصل کرنا واجب ہوتا تو حضرات صحابہ کرام، اختیار تابعین اور بعد کے ائمہ اور فقہاء جادو کے بہت بڑے عالم ہوتے حالانکہ ان میں سے کسی سے بھی یہ منقول نہیں ہے تو کیا ان اسلاف نے اس واجب کو ترک کر دیا تھا اور صرف امام رازی نے اس واجب پر عمل کیا ہے!

(روح المعانی ج ۱، ص ۳۳۸-۳۳۰، ملخصاً و موضحاً، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جادو گروں نے کہا: اے موسیٰ! آیا آپ پہلے (عصا) ڈالیں گے یا ہم پہلے ڈالیں؟ موسیٰ نے کہا تم ڈالو، جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کو خوف زدہ کر دیا اور انہوں نے بہت بڑا جادو پیش کیا اور ہم نے موسیٰ کو وحی فرمائی کہ تم اپنا عصا ڈال دو تو وہ فوراً ان کے جھوٹے طلسم کو نکلنے لگا، سو حق کا غلبہ ثابت ہو گیا اور جو کچھ وہ کرتے تھے اس کا بطلان ظاہر ہو گیا، پس فرعون اور اس کے درباری مغلوب ہو گئے اور ذلیل و خوار ہو کر واپس ہوئے۔

(الاعراف: ۱۱۹-۱۱۵)

حضرت موسیٰ اور فرعون کے جادو گروں کا مقابلہ

جادو گروں نے حضرت موسیٰ سے کہا: اے موسیٰ! آیا آپ پہلے عصا ڈالیں گے یا ہم اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پہلے ڈالیں، انہوں نے اپنے اس سوال میں حسن ادب کو ملحوظ رکھا اور اپنے ذکر سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیا، اور اسی ادب کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان لانے کی توفیق دی۔

تبیان القرآن

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم ڈالو اس پر یہ اعتراض ہے کہ ان کالٹھیاں ڈالنا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے مقابلہ میں معارضہ کرنا تھا، اور معجزہ کا معارضہ کرنا کفر ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کفر کرنے کا حکم کیونکر دیا جب کہ کفر کا حکم دینا بھی کفر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کا ثبوت اور غلبہ اس پر موقوف تھا کہ وہ اپنی لٹھیاں ڈالیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان لٹھیوں کو نکل لے تو حضرت موسیٰ نے ان کو لٹھیاں ڈالنے کا حکم اس حیثیت سے دیا تھا کہ ان کے معجزہ کا غلبہ ثابت ہو اور وہ انجام کار ان جادو گروں کے ایمان لانے کا ذریعہ ہو۔

جب جادو گروں نے اپنی لٹھیاں ڈالیں تو انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان کو خوفزدہ کر دیا، اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوت معیضہ سے لوگوں کے دماغوں پر تاثیر کی اور لوگوں کی آنکھوں پر سحر کیا، سو ان کو وہ لٹھیاں اور سانپ دوڑتے ہوئے معلوم ہونے لگے، ایک قول یہ ہے کہ ان لکڑیوں اور رسیوں میں پارہ بھرا ہوا تھا سورج کی تیش سے وہ پارہ حرکت کرنے لگا جس سے وہ لٹھیاں اور رسیاں دوڑتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اور لوگ ان سے خوفزدہ ہو گئے۔ اور ہم نے موسیٰ کو وحی فرمائی کہ تم اپنا عصا ڈال دو تو وہ فوراً ان کے جھوٹے طلسم کو نکلنے لگا۔

مفسرین نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بہت بڑا سانپ بن گیا اور جب اس نے اپنا منہ کھولا تو اس کے دو جبرٹوں کے درمیان اسی ذراع (ایک سو بیس فٹ) کا فاصلہ تھا۔ اس نے ان کی تمام رسیوں اور لٹھیوں کو نکل لیا، اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اس کو پکڑا تو وہ پہلے کی طرح لٹھی بن گیا، اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عظیم الشان معجزہ تھا، کیونکہ وہ بہت بڑا اثر دہا جو ہزاروں لٹھیوں اور رسیوں کو نکل چکا تھا ان کی آن میں پہلے کی طرح متوسط لٹھی بن گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے لٹھیوں اور رسیوں کو معدوم کر دیا یا ان کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اڑا دیا اور کسی کو ان کے ریزہ ریزہ ہونے اور ہوا میں تحلیل ہونے کا پتہ نہ چل سکا اور یہ فعل صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی قدرت سے ظہور میں آیا، کیونکہ کسی چیز کو موجود کرنا یا معدوم کرنا، اللہ تعالیٰ ہی کا خاصہ ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام صرف لٹھی کو پھینکنا اور اس کو پکڑنا تھا اور اس لٹھی میں یہ صفت اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ تھی اور لٹھی کو پھینکنا اور پکڑنا بھی اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے اذن کے تابع تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان اور خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر ایسے عظیم الشان معجزہ کو ظاہر فرمایا۔ تاہم بعض معجزات انبیاء علیہم السلام کی قدرت سے بھی ظہور میں آتے ہیں لیکن وہ قدرت بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہوتی ہے۔ اور درحقیقت وہی تمام معجزات کا خالق ہے۔ سو حق کا غلبہ ثابت ہو گیا اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا اس کا بطلان ظاہر ہو گیا۔

حق کے غلبہ کے ظہور کا سبب یہ ہے کہ جادو گروں نے کہا کہ موسیٰ نے جو کچھ کیا اگر وہ جادو ہوتا تو ہماری لٹھیاں اور رسیاں گم نہ ہوتیں اور جب وہ گم ہو گئیں تو معلوم ہوا کہ یہ کام اللہ سبحانہ کی خلق اور اس کی تقدیر سے ہوا ہے اس میں جادو کا کوئی دخل نہیں تھا، اور اسی وجہ سے معجزہ جادو سے متمیز ہو گیا۔

”پس فرعون اور اس کے درباری مغلوب ہو گئے اور ذلیل و خوار ہو کر واپس ہوئے۔“

جب فرعون کے جادو گروں کی لٹھیوں اور رسیوں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا نکل گیا اور بغیر کسی شعبدہ، حیلہ اور شبہ کے وہ تمام لٹھیاں غائب ہو گئیں تو فرعون اور اس کے درباریوں نے جس طمطراق سے ان جادو گروں کو بلایا تھا، وہ رائیگاں گیا اور ان کے غرور کا سر نیچا ہو گیا تو وہ انتہائی ذلت کے ساتھ پسپا ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جادوگر سجدہ میں گر پڑے، انہوں نے کہا: ہم رب العالمین پر ایمان لے آئے، جو موسیٰ

اور ہارون کا رب ہے۔ (الاعراف: ۱۲۲-۱۲۰)

جادو گروں کے ایمان لانے میں علم کی فضیلت

امام ابن جریر نے ذکر کیا ہے کہ فرعون نے ستر ہزار جادو گر جمع کیے تھے اور انہوں نے ستر ہزار لائٹھیاں اور ستر ہزار رسیاں میدان میں پھینکی تھیں۔ امام ابن جوزی نے ذکر کیا ہے کہ وہ لائٹھیاں اور رسیاں ایک مربع میل میں پھیلی ہوئی تھیں۔ امام رازی نے ذکر کیا ہے کہ وہ لائٹھیاں اور رسیاں اتنی تھیں کہ وہ تین سو اونٹوں کا بار تھیں اور جب ان سب لائٹھیوں اور رسیوں کو حضرت موسیٰ کے عصا نے نکل لیا اور وہ معمول کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں تھا تو جادو گروں نے آپس میں کہا یہ چیز جادو سے خارج ہے بلکہ یہ محض اللہ کا فعل ہے اور اس سے انہوں نے استدلال کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے سچے نبی ہیں۔

مستکلمین نے کہا یہ آیت فضیلت علم پر بہت قوی دلیل ہے، کیونکہ وہ جادو گر جادو کی حقیقت سے واقف تھے ان کو معلوم تھا کہ جادو کا انتہائی کمال کیا ہے اور اس وجہ سے انہوں نے جان لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ جادو کی حقیقت سے خارج ہے، اگر وہ جادو کے علم میں کامل نہ ہوتے تو وہ یہ استدلال نہیں کر سکتے تھے۔ وہ یہ سوچتے کہ شاید یہ ہم سے بڑے جادو گر ہیں، اس لیے یہ اس چیز پر قادر ہیں جس سے ہم عاجز ہیں، لیکن چونکہ وہ جادو کے علم میں کامل تھے اس لیے انہوں نے جان لیا کہ یہ جادو نہیں ہے بلکہ یہ خالق کائنات کی قدرت کا شاہکار ہے۔ پس وہ جادو کے علم میں کامل ہونے کی وجہ سے کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہو گئے۔ سوچئے کہ جب جادو کے علم میں کمال کا یہ ثمرہ ہے تو دین اسلام اور شریعت کے علم میں کمال حاصل کرنے کا کیا ثمرہ ہو گا!

رب موسیٰ و ہارون کہنے کی وجہ

جادو گر پہلے سجدہ میں گر گئے، پھر اس کے بعد کہا: ہم رب العالمین پر ایمان لائے، اس کی کیا وجہ ہے؟ جب کہ بظاہر پہلے ایمان کا اظہار کرنا چاہیے تھا پھر سجدہ کرنا چاہیے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ان کے دل و دماغ میں اللہ تعالیٰ کی معرفت آگئی تو وہ اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے بے اختیار سجدہ میں گر گئے اور اللہ کی معرفت، کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہونے اور اللہ کے سامنے خضوع اور تذلل کا اظہار کرنے کے لیے بے اختیار سجدہ میں گر گئے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب انسان کو کوئی نعمت ملے تو اس کو بے اختیار سجدہ میں گر جانا چاہیے۔

انہوں نے کہا، ہم رب العالمین پر ایمان لائے، جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے ○

اس جگہ یہ سوال ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون العالمین میں داخل ہیں۔ پھر العالمین کے بعد موسیٰ اور ہارون کا ذکر کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ جادو گروں کو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی وجہ سے ایمان نصیب ہوا تھا اس لیے انہوں نے کہا: ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر وہ صرف یہ کہتے کہ ہم رب العالمین پر ایمان لائے تو ہو سکتا ہے کہ فرعون یہ کہتا کہ یہ مجھ پر ایمان لائے ہیں کیونکہ وہ بھی رب العالمین ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا، اس لیے انہوں نے کہا: ہم موسیٰ اور ہارون کے رب پر ایمان لائے ہیں اور تیسری وجہ یہ ہے کہ ہر چند کہ العالمین میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون داخل تھے لیکن ان کی فضیلت کی وجہ سے ان کا علیحدہ ذکر کیا جیسا کہ اس آیت میں ہے: ”وملائکتہ ورسلہ و جبریل و میکئل“ (البقرہ: ۹۸) ہر چند کہ ملائکہ میں جبریل اور میکائل داخل ہیں لیکن ان کی فضیلت کی وجہ سے ان کا علیحدہ ذکر کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرعون نے کہا: تم میرے اجازت دینے سے پہلے ایمان لے آئے؟ یقیناً یہ تمہاری خفیہ سازش ہے جو تم نے مل کر شہر میں تیار کی ہے تاکہ اس شہر کے رہنے والوں کو اس شہر سے نکال دو، عنقریب تم اس کا خمیازہ بھگتو گے ○

میں ضرور تمہارے ہاتھوں اور پاؤں کو مخالف جانبوں سے کٹ دوں گا پھر میں ضرور تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا انہوں نے کہا بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں O تو ہم سے صرف اس بات کا انتقام لے رہا ہے کہ جب ہمارے پاس ہمارے رب کی نشانیاں آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے اے ہمارے رب ہم پر صبر اندل دے اور حالت اسلام میں ہماری روح قبض کرنا۔ (الاعراف: ۱۲۶-۱۲۳)

فرعون کا عوام کو شبہات میں ڈالنا

فرعون نے جب یہ دیکھا کہ جن لوگوں کو سب سے زیادہ جادو کا علم تھا وہ لوگوں کے بہت بڑے اجتماع کے سامنے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئے تو اس کو اپنی خدائی کا خطرہ پڑ گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر بہت قوی دلیل قائم ہو گئی۔ تو اس نے لوگوں کو اپنی بندگی پر قائم رکھنے کے لیے فوراً دو شبہات ڈالے۔ ایک شبہ یہ ڈالا کہ یہ جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دلیل کی قوت کی وجہ سے ان کی نبوت پر ایمان نہیں لائے بلکہ ان کا مقابلہ دراصل نور اکتشی تھی اور انہوں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ جادوگر عہد اہار جائیں گے تاکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دلیل کا غلبہ ظاہر ہو۔

امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے سردار کی مقابلہ سے پہلے ملاقات ہوئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ بتاؤ اگر میں تم پر غالب آ جاؤں تو کیا تم مجھ پر ایمان لے آؤ گے اور اس بات کی گواہی دو گے کہ جس دین کی دعوت دے رہا ہوں وہ حق ہے جادوگروں کے سردار نے کہا کل ہم ایسا جادو پیش کریں گے جس پر کوئی جادو غالب نہیں آسکے گا اور خدا کی قسم اگر تم مجھ پر غالب آ گئے تو میں ضرور تم پر ایمان لے آؤں گا اور میں ضرور یہ گواہی دوں گا کہ تمہاری دعوت سچی ہے۔ فرعون ان کو باتیں کرتا ہوا دیکھ رہا تھا اس لیے اس نے کہا: یقیناً یہ تمہاری خفیہ سازش ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غالب ہونا پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے مطابق تھا حقیقت میں وہ غالب نہیں ہوئے تھے۔ (جامع البیان ج ۹، ص ۳۱، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

فرعون لعین نے دو سرا شبہ یہ ڈالا ان کا مقصد تمہیں تمہارے وطن سے نکالنا ہے اس لیے انہوں نے یہ نور اکتشی کی ہے فرعون کا مقصد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کامیابی کے اثرات کو زائل کرنا تھا تاکہ اس کے رعایا اس کی خدائی کے متعلق بدگمان نہ ہو پھر اس نے کہا تم عنقریب جان لو گے اپنے اس قول سے اس نے مسلمان ہونے والے جادوگروں کو سزا کی دھمکی دی۔ آیا فرعون اپنی دھمکی پر عمل کر سکا یا نہیں؟

”میں ضرور تمہارے ہاتھوں اور پاؤں کو مخالف جانبوں سے کٹ دوں گا پھر میں ضرور تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا“۔ یہ اجمال کے بعد تفصیل ہے اور یہ فرعون کی تفصیلی دھمکی ہے۔ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ فرعون نے اس دھمکی پر عمل کیا یا نہیں امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے سولی پر لٹکایا اور جس شخص نے سب سے پہلے ہاتھوں اور پاؤں کو مخالف جانبوں سے کٹا وہ فرعون تھا۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۳۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

بعض مفسرین نے کہا: فرعون اس دھمکی پر عمل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا بِأَيِّتِنَا

فرمایا: ہم عنقریب آپ کے بازو کو آپ کے بھائی کے ساتھ مضبوط کر دیں گے اور ہم آپ دونوں کو غلبہ عطا فرمائیں گے

اَنْتُمْ وَمَنْ اَتَّبَعَكُمْ الْغَالِبُونَ۔ سو وہ آپ دونوں تک ہماری نشانوں کے سبب نہ پہنچ سکیں گے

(القصص: ۳۵) آپ دونوں اور آپ کی اتباع کرنے والے غالب رہیں گے۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متبعین کو غلبہ کی بشارت دی ہے، اس لیے فرعون ان کو قتل نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس استدلال پر یہ اعتراض ہے کہ اس آیت میں غلبہ سے مراد دلیل اور حجت کا غلبہ ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ انہوں نے دعا کی تھی کہ حالت اسلام میں ہم پر وفات طاری کرنا اور وفات سے مراد طبعی موت ہے اس کا معنی ہے ان کو قتل نہیں کیا گیا اور یہ زیادہ قوی دلیل ہے۔

امام ابن جریر نے متعدد سندوں کے ساتھ یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ دن کے ابتدائی حصہ میں وہ جادو گر تھے اور دن کے آخری حصہ میں وہ شہداء تھے، نیز انہوں نے اپنے لیے صبر کی دعا کی تھی اور صبر کی دعا اسی وقت کی جاتی ہے جب انسان کسی امتحان، آزمائش اور بلا میں گھر جائے۔ یعنی سولی پر چڑھائے جانے اور ہاتھوں اور پاؤں کے کاٹے جانے سے وہ ڈگمگانہ جائیں اور اپنے ایمان پر برقرار رہیں اور ان کو اسلام پر ہی موت آئے۔ ان دلائل سے اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے کہ فرعون نے اپنی دھمکی پر عمل کر لیا تھا۔

راہ حق میں قربانی دینے کے لیے تیار رہنا

”انہوں نے کہا: بے شک ہم اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔۔۔ الخ“

جب انسان دین حق کو قبول کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس راہ میں مصائب اور مشکلات پر ثابت قدم رہنے کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ایسی قوت اور جرأت پیدا کر دیتا ہے، ان جادو گروں نے جب بصیرت سے حق کو پہچان لیا تو پوری جرأت کے ساتھ اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اور اس راہ میں پیش آنے والے مصائب کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا، اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنا چاہیے اور اس دنیا کی فانی لذتوں پر آخرت کی دائمی نعمتوں کو قربان نہیں کرنا چاہیے اور راہ حق کی خاطر ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اتُّذِرُ مَوْسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيَفْسِدُوا فِي

اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے (فرعون سے) کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو زمین میں فساد کرنے کے لیے چھوڑے گا؛

الْأَرْضِ وَيَذُرُكَ وَإِلَيْكَ تُسْقَلُ اٰیۡنًا هُمْ وَنَسْتَحْيٰ

تاکہ وہ تجھ کو اور تیرے مبعودوں کو چھوڑے رہیں، فرعون نے کہا ہم عنقریب ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی بیٹیوں کو

نِسَاءَهُمْ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوْا

زندہ بسنے دیں گے، اور بیشک ہم ان پر غالب ہیں ○ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو

بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُورِثُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ

اور صبر کرو، بیشک ساری زمین صرف اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے

وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوا أَوْ دِينًا مِّن قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا مِنَّا

اور اچھا انجام متقین کے لیے ہے ○ انہوں نے کہا (اے موسیٰ): آپ کے ہمارے پاس آنے سے پہلے بھی ہیں اذیتیں پہنچائی گئی تھیں اور

بَعْدَ مَا جِئْنَا قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُهْلِكَ عَدُوُّكُمْ وَ

آپ کے ہمارے پاس آنے کے بعد بھی (موسیٰ نے) کہا عنقریب تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں زمین

يَسْتَخْلِفُكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرْ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ﴿۱۲۹﴾

میں ان کا جانشین بنا دے گا ، پھر وہ تمہارے اعمال کو ظاہر فرمائے گا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور فرعون کی قوم کے سرداروں نے (فرعون سے) کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو زمین میں فساد کرنے کے لیے چھوڑ دے گا؟ تاکہ وہ تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑے رہیں 'فرعون نے کہا: ہم عنقریب ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رہنے دیں گے اور بے شک ہم ان پر غالب رہیں گے۔ (الاعراف: ۱۲۷)

فرعون کی قوم نے جب دیکھا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا نہ ان کو کوئی سزا دی تو انہوں نے یہ کہا: کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو زمین میں فساد کرنے کے لیے چھوڑ دے گا؟ تاکہ وہ تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑے رہیں 'فرعون نے حضرت موسیٰ سے اس لیے کوئی تعرض نہیں کیا تھا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو دیکھ کر بہت زیادہ خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس کو ڈر تھا کہ اگر حضرت موسیٰ نے اس پر عصا چھوڑ دیا تو وہ اژدہا بن کر اس کو کھا جائے گا۔ تاہم اس نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے قوم کو جواب دیا کہ ہم عنقریب ان کے بیٹوں کو قتل کر دیں گے اور بیٹیوں کو چھوڑ دیں گے گویا موجودہ نسل کے ختم ہونے کے بعد بنو اسرائیل کی صرف عورتیں رہ جائیں گی اور عورتوں سے تمہیں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ گویا کہ یہ ایک طویل المیعاد منصوبہ تھا۔ اور اس سے وقتی طور پر قبیلوں کو تسلی دینا مقصود تھی۔

قبیلوں نے کہا تھا تاکہ وہ تجھ کو اور تیرے معبودوں کو چھوڑے رہیں۔ فرعون کے معبود کی تفسیر میں حسب ذیل اقوال ہیں:

- ۱- فرعون نے اپنی قوم کے لیے چھوٹے چھوٹے بت بنا رکھے تھے اور اس نے اپنی قوم کو ان کی عبادت کرنے کا حکم دیا تھا اور خود کو وہ کہتا تھا کہ میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں۔ اور ان بتوں کا بھی رب ہوں۔
 - ۲- حسن بصری نے کہا: فرعون خود بھی بتوں کی عبادت کرتا تھا۔
 - ۳- امام رازی نے فرمایا کہ فرعون ستاروں کی تاثیر کا قائل تھا اور اس نے ستاروں کی صورتوں کے بت بنا رکھے تھے اور وہ خود بھی ان کی عبادت کرتا تھا اور قوم سے بھی ان کی عبادت کراتا تھا۔
 - ۴- امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ فرعون کی ایک گائے تھی جس کی اس کی قوم عبادت کرتی تھی اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب بھی وہ کوئی خوب صورت گائے دیکھتے تو فرعون اس کی عبادت کا حکم دیتا تھا۔
- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، بیشک ساری زمین صرف اللہ کی ہے وہ

اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔ اور اچھا انجام متقین کے لیے ہے۔ انہوں نے کہا (اے موسیٰ!) آپ کے ہمارے پاس آنے سے پہلے بھی ہمیں اذیتیں پہنچائی گئی تھیں اور آپ کے ہمارے پاس آنے کے بعد بھی۔ (موسیٰ نے) کہا: عنقریب تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں زمین میں ان کا جانشین بنا دے گا، پھر وہ تمہارے اعمال کو ظاہر فرمائے گا۔ (الاعراف: ۱۲۸-۱۲۹)

اللہ پر ایمان کامل کی وجہ سے مصائب کا آسان ہو جانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دو چیزوں کا حکم دیا اور دو چیزوں کی بشارت دی، ایک یہ حکم دیا کہ اللہ سے مدد طلب کرو اور دوسرا یہ حکم دیا کہ مصائب پر صبر کرو، اور اللہ تعالیٰ سے استمداد اور استعانت کے حکم کو پہلے بیان فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور اس کو چلانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اور ہم اس کے بندے اور مملوک ہیں اور مالک کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی مملوک میں جس طرح چاہے تصرف کرے تو اس کا دل اللہ کی معرفت کے نور سے روشن ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مالک کی محبت میں مستغرق ہو جاتا ہے، پھر اس پر جو مصیبت اور تکلیف وارد ہو وہ سمجھتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تو وہ خوشی اور محبت سے ان مصائب کو گلے لگا لیتا ہے اور ان پر کوئی شکوہ اور شکایت نہیں کرتا، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نمود کی جلانی ہوئی آگ میں بے خطر کود پڑے، حضرت اسماعیل نے راضی بہ رضا ہو کر چھری تلے اپنی گردن رکھ دی، حضرت ایوب علیہ السلام نے صبر و استقامت سے تمام بیماریوں کو برداشت کیا۔ سو جس شخص کا اللہ پر یقین محکم ہو اس کے لیے مصائب اور مشکلات پر صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل کو ایک یہ بشارت دی کہ اللہ ان کے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور اس کی جگہ ان کو اس زمین کا وارث کر دے گا۔ کیونکہ زمین کا مالک اللہ ہے، وہ جس کو چاہے اس زمین کا وارث بنا دیتا ہے، اور دوسری بشارت یہ دی کہ اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو آخرت میں بھی تمہارا اچھا انجام ہو گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ پر ایمان اور تقویٰ قائم رکھنے کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں کامیابی اور سرفرازی حاصل ہو جاتی ہے۔

کسی بات کو سمجھنے کے لیے سوال کرنے کا جواز

بنو اسرائیل نے جب فرعون کی وعید اور اس کی دھمکیوں کو سنا تو وہ سخت خوفزدہ ہوئے اور گھبرا گئے اور انہوں نے کہا: ہمیں آپ کے آنے سے پہلے بھی اذیت دی گئی اور آپ کے آنے کے بعد بھی۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے سے پہلے فرعون لعین نے بنو اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ وہ ان سے جزیہ لیتا تھا۔ اور ان سے سخت مشکل کام لیتا تھا، اور ان کو سہولت اور آرام سے منع کرتا تھا، ان کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا تو ان کو یہ وثیقہ امید ہو گئی کہ اب ان کی مشکلات کے دن ختم ہو گئے اور ان کو اب فرعون کے ظلم و ستم سے نجات مل جائے گی، لیکن جب انہوں نے فرعون کو پھر دھمکیاں دیتے ہوئے سنا، تو ان کی امید پھر ڈوب گئی اور انہوں نے رنج اور مایوسی سے یہ کہا کہ ہمیں آپ کی آمد سے پہلے بھی اذیت دی گئی تھی اور آپ کے آنے کے بعد بھی ہم ظلم و ستم کے سائے میں ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بنو اسرائیل کے اس کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کو مکروہ جانا اور یہ کفر ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام آئے اور انہوں نے یہ بشارت دی کہ اب تمہاری

مصیبتوں کے دن گزر گئے تو انہوں نے اس سے یہ سمجھا کہ ان کی مصیبتیں اسی وقت ختم ہو جائیں گی اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے مصائب تو ان پر اسی طرح چھائے ہوئے ہیں تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس خوشخبری کی کیفیت جاننے کے لیے سوال کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے یہ وضاحت کی کہ ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان کے مصائب اسی وقت ختم ہو جائیں گے بلکہ ان کی نجات کا جو وقت اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادیا ہے ان کی نجات اسی وقت ہو گئی۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا عنقریب تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں زمین میں ان کا جانشین بنا دے گا پھر وہ تمہارے اعمال کو ظاہر فرمائے گا۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اگر استاد یا شیخ کی کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو دریافت حال کے لیے سوال کیا جاسکتا ہے اور اس کی نظیر یہ حدیث ہے:

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جب کوئی حدیث سنتیں جس کا مطلب انہیں سمجھ نہ آتا تو وہ دوبارہ آپ سے رجوع کرتیں حتیٰ کہ اس کو سمجھ لیتیں اور نبی ﷺ نے فرمایا جس شخص کا حساب لیا گیا اس کو عذاب دیا گیا حضرت عائشہ نے کہا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا:

فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۖ فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حِسَابًا يَّسِيرًا ۚ (الانشقاق: ۸-۷)

تو جس شخص کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا سو اس سے بہت آسان حساب لیا جائے گا۔

آپ نے فرمایا: یہ تو اعمال نامہ کو پیش کرنے کے متعلق ہے۔ لیکن جس سے حساب میں مناقشہ کیا جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۹۳۹، ۶۵۳۶، ۷۵۳۷، ۱۰۳)

وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ وَنَقَّصْنَا مِنَ الثَّمَرَاتِ

اور بیشک ہم نے فرعون کے متبعین کو کئی سال قحط اور پھلوں کی پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا تاکہ وہ

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۱۳۰﴾ فَإِذَا جَاءَتْهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا النَّاهِذَةُ وَإِنْ

نصیحت قبول کریں ○ پس جب ان پر خوشحالی آتی تو وہ کہتے کہ یہ ہمارے بے بے اور جب

تُصِبُهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ ۗ إِلَّا إِنَّمَا طَائِرُهُمْ

ان پر بدحالی آتی تو وہ اس کو موسیٰ اور ان کے اصحاب کی نحوست قرار دیتے، سنو! ان کافروں کی نحوست اللہ کے نزدیک

عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۳۱﴾ وَقَالُوا هُمَاتَا تَتَابَعَا

(ثابت) ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے ○ اور انہوں نے کہا اے موسیٰ! آپ جب بھی ہیں

مِنْ آيَةٍ لِّتَسْحَرَنَّا بِهَا ۖ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳۲﴾ فَأَرْسَلْنَا

سحر کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی نشانی لائیں گے تو ہم آپ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں ○ پس ہم نے ان پر طوفان

عَلَيْهِمُ الطُّوفَانُ وَالْجَرَادُ وَالْقُمَّلُ وَالضَّفَادِعُ وَالذَّمَارِيطُ

بھیجا اور ٹڈی دل کے بادل اور جوئیں اور مینڈک اور خون ، درآںمایکہ یہ الگ الگ نشانیں

مَفْصَلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مَّجْرِمِينَ ﴿۱۲۳﴾ وَلَمَّا وَقَعَ

تھیں تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ تھی ہی مجرم قوم ○ اور جب بھی ان پر

عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يَا مُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ

کوئی عذاب آتا تو وہ کہتے اے موسیٰ! آپ کے رب نے آپ سے جو وعدہ کیا ہے اس کی بناء پر ہمارے حق میں دعا کیجیے

لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي

اگر آپ نے ہم سے یہ عذاب دور کر دیا تو ہم ضرور بہ ضرور آپ پر ایمان لے آئیں گے اور ہم ضرور بہ ضرور آپ کے ساتھ بنو اسرائیل

إِسْرَائِيلَ ﴿۱۲۴﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُم بِالْغُورَةِ

کو روانہ کر دیں گے ○ پس جب ہم نے ان سے اس مدت میں تک کے لیے عذاب دور کر دیا جس مدت تک پہنچنا ان

إِذَا هُمْ يَنْكُتُونَ ﴿۱۲۵﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ يَوْمَئِذٍ

کے لیے مغر تھا تو وہ توڑا اپنا بھد توڑنے والے تھے ○ پھر ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا کیوں کہ انہوں نے ہماری نشانوں

كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿۱۲۶﴾ وَأَوْسَرْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ

کو جھٹلایا تھا اور وہ ان سے لاپرواہی برتتے تھے ○ اور جس قوم کو کمزور سمجھا جاتا تھا اس کو ہم نے

كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقِ الْأَرْضِ وَمَعَارِبِهَا الَّتِي بَرَكْنَا

اس سرزمین کے مشرق اور مغرب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں ،

فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا

اور بنو اسرائیل پر آپ کے رب کا بھلائی پہنچانے کا وعدہ پورا ہو گیا کیوں کہ انہوں نے صبر

صَبَرُوا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا

کیا تھا ، اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی بنائی ہوئی عمارتوں اور ان کی چڑھائی ہوئی بیلوں کو تباہ و برباد کر

يَعْرِشُونَ ﴿۱۳۷﴾ وَجُوزُنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلَى

دیا ○ اور ہم نے بنو اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا تو وہ ایک ایسی قوم کے

قَوْمٍ يَّعْكِفُونَ عَلَىٰ أَمْثَلِمْ لَهُمْ ۖ قَالُوا أَيُّ مَوْسَىٰ اجْعَلْ لَنَا

پاس سے گزسے جو اپنے بتوں کے سامنے اُس جائے (مٹکف) بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا اے موسیٰ ہمارے لیے بھی ایک ایسا

إِلَهًا كَمَا لَهُمُ إِلَهَةٌ ۖ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ﴿۱۳۸﴾ إِنَّ هَؤُلَاءِ

معبود بنا دیجیے جیسے ان کے معبود ہیں، موسیٰ نے کہا بیشک تم جہالت کی باتیں کرتے ہو ○ بیشک جس کام میں یہ لوگ

مُتَّبِعُونَ مَا هُمْ فِيهِ وَيَبْطُلُونَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۹﴾ قَالَ أَغَيَّرَ اللَّهُ

مصرف ہیں وہ برباد ہونے والا ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ سراسر غلط ہے ○ اور موسیٰ نے کہا کیا میں اللہ کے سوا

أَبْغَيْكُمْ إِلَهًا وَهُوَ فَضْلُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۱۴۰﴾ وَإِذْ أَنْجَيْنَاكُمْ مِّن

تہا سے لیے کوئی اور معبود تلاش کروں حالانکہ اس نے تمہیں (اس زمانہ میں) سب جہانوں پر فضیلت دی ہے ○ اور (اے بنو اسرائیل) یا کرو

إِلْفِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمُ سَوَاءَ الْعَذَابِ يُقْتَلُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَ

جب ہم نے تم کو فرعون کے متبعین سے نجات دے دی جو تم کو بڑا عذاب دیتے تھے، وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور

يَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ ۗ وَفِي ذَلِكُمْ بَلَاءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۱۴۱﴾

تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت سخت آزمائش تھی ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک ہم نے فرعون کے متبعین کو کئی سال قحط اور پھلوں کی پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا تاکہ وہ نصیحت کو قبول کریں ○ جب ان پر خوش حالی آتی تو وہ کہتے کہ یہ ہمارے سبب سے ہے اور جب ان پر بد حالی آتی تو وہ اس کو موسیٰ اور ان کے اصحاب کی نحوست قرار دیتے، سنو! ان کافروں کی نحوست اللہ کے نزدیک (ثابت) ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (الاعراف: ۱۳۱-۱۳۰)

مشکل اور اہم الفاظ کے معانی

آل فرعون: فرعون کی قوم اور اس کے خواص اور یہ اس کے درباریوں کی جماعت ہے۔ "آل" کا استعمال کسی شخص کے قربت داروں میں ہوتا ہے۔ جیسے آل ابراہیم اور آل عمران یا اس کا استعمال کسی کے متبعین اور اس کے پیرو کاروں میں ہوتا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: "ادخلوا آل فرعون اشد العذاب" (المومن: ۴۶) فرعون کے متبعین کو بہت سخت عذاب میں ڈال دو۔ اس کی پوری تحقیق ہم نے البقرہ: ۱۲۹ میں کی ہے۔

سنین: یہ سنت کی جمع ہے جس کا معنی سال ہے، لیکن اس کا اکثر استعمال ان سالوں کے لیے کیا جاتا ہے جس میں خشک سالی اور قحط ہو، حدیث میں ہے: "واجعلها عليهم كسنى يوسف" اے اللہ ان پر یوسف علیہ السلام کی طرح قحط کے سال مقرر کر دے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۸۰۳، صحیح مسلم، المساجد، ۲۹۳، ۶۷۵، ۱۵۱۲، سنن نسائی، رقم الحدیث: ۱۰۷۳، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۱۲۳۳، مسند احمد بن حنبل، ج ۲، ص ۲۳۹)

الحسنة: ہر اس چیز کو حسن کہتے ہیں جو خوبصورت ہو اور اس کی طرف رغبت کی جاتی ہو، اس کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو حسا، حسن ہو جیسے خوبصورت چہرے، خوب صورت نقوش وغیرہ، دوسری وہ جو عقلاً حسن ہو جیسے فائدہ مند اور نفع آور کام، دوا اور پرہیز وغیرہ۔ تیسری وہ جو شرعاً حسن ہوں جیسے ایمان اور اعمال صالحہ، اور "الحسنہ" ہر اس نعمت کو کہتے ہیں جس کے حصول سے انسان اپنی روح، بدن اور احوال میں فرحت اور سرور کو پائے، یہاں "الحسنہ" سے مراد ہے کھیتوں اور باغات کا سرسبز اور شاداب ہونا اور زمین کا زرخیز ہونا اور "السنہ" اس کی ضد ہے یعنی خشک سالی اور قحط۔

بطيرة: طیر اور تشاءم کا معنی ہے بد شگون اور بد فال، نکالنا، حدیث میں ہے: "لا عدوی ولا طيرة" کوئی مرض بخفہ متعدی نہیں ہوتا اور نہ کوئی بد شگون ہے۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۷۵۳، صحیح مسلم، سلام: ۱۰۲، (۲۲۲۰) ۵۶۸۰، مسند احمد، ج ۱، ص ۱۷۳) نیز حدیث میں ہے تین چیزوں سے کوئی شخص سلامت نہیں "الطيرة والحسد والظن" بد شگونی، حسد اور بد گمانی، کما گیا پھر ہم کیا کریں؟ فرمایا: جب تم بد شگونی نکالو تو اپنے کام پر روانہ ہو، اور جب تم حسد کرو تو اس کے درپے نہ ہو اور جب تم بد گمانی کرو تو اس کی تحقیق نہ کرو۔ (کنز العمال، رقم الحدیث: ۳۳۷۸۹، فتح الباری، ج ۱۰، ص ۳۸۲)

ایک اور حدیث میں ہے الطيرة شرک بد شگونی شرک ہے اور ہم میں سے کوئی شخص نہیں ہے مگر..... (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۹۱۰، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۶۲۰، ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۵۳۸، مسند احمد، ج ۱، ص ۳۸۹) حدیث کا معنی یہ ہے کہ بد شگونی کو موثر حقیقی اعتقاد کرنا شرک ہے اور ہم میں سے ہر شخص کے دل میں بد شگونی کا خیال آتا ہے۔ لیکن اللہ پر توکل سے بد شگونی زائل ہو جاتی ہے۔

قوم فرعون پر پے در پے بلا میں اور آفتیں نازل کرنے کی حکمت اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: عنقریب تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا، اور اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اس نے وقفہ وقفہ سے فرعون کی قوم پر عذاب نازل فرمایا تاکہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو، ایک قسم کا عذاب نازل کرنے کے بعد ان کو توبہ کرنے اور رجوع کرنے کا موقع دیا۔ پھر دوسری قسم کا عذاب نازل فرمایا۔ اور اس طرح وقفہ وقفہ سے چھ قسم کا عذاب نازل فرمایا، لیکن جب انہوں نے کسی طرح رجوع نہیں کیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں سمندر میں فوج کر دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہو گیا کہ اس نے بنو اسرائیل کے دشمن کو ہلاک کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر پے بہ پے مصائب اور بلائیں اس لیے نازل فرمائیں کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں کیونکہ انسان کی عادت ہے کہ جب اس پر مصیبت پڑتی ہے تو اس کا دل نرم ہو جاتا ہے اور وہ تکلیف اور گھبراہٹ میں اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے:

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ
تَدْعُونَ إِلَّا آتَاءَهُ (سورۃ ائیل: ۶۷)

اور جب تم کو سمندر میں آفت پہنچتی ہے تو اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ۔ اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے در آنحالیکہ وہ اس کی طرف رجوع کر رہا ہوتا ہے۔ (الزمر: ۸)

پس جب ان پر خوش حالی آتی تو وہ یہ کہتے کہ یہ ہمارے سبب سے ہے اور جب ان پر بد حالی آتی تو وہ اس کو موسیٰ اور ان کے اصحاب کی نحوست قرار دیتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ ان کو متنبہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو پے بہ پے آفتیں اور بلائیں نازل کیں ان سے انہوں نے کوئی سبق یا نصیحت حاصل نہیں کی بلکہ ان کا کفر اور سرکشی اور بڑھ گئی اور اللہ تعالیٰ جب بھی ان کو سرزنش اور نصیحت کرنے کے لیے ان پر کوئی مصیبت نازل فرماتا تو وہ اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی نحوست قرار دیتے۔ اسلام نے کسی چیز سے برا شگون نکلانے یا کسی چیز کو منحوس سمجھنے کی ہمت مذمت کی ہے، نبی ﷺ کسی چیز سے نیک شگون تو لیتے تھے لیکن بد شگون کی آپ نے مذمت فرمائی ہے۔

فال اور شگون نکلانے کی تحقیق

امام رازی نے لکھا ہے کہ جب نبی ﷺ مدینہ آئے تو یہود نے اس کو بد شگون کہا اور کہا: ان کے آنے سے چیزیں مہنگی ہو گئیں اور بارشیں کم ہو گئیں۔ عرب بد فالی اور بد شگون کو طائر، طیر اور طیرہ کہتے تھے وہ طائر (پرنده) سے فال نکالتے اور فال نکلانے کے لیے پرنده کو اڑاتے۔ پھر اگر پرنده دائیں جانب سے آتا تو اس کو نیک شگون قرار دیتے اور اگر وہ بائیں جانب سے آتا تو اس کو بد شگون قرار دیتے۔ اس کے بعد مطلقاً بد شگون کے لیے طائر اور طیر کا لفظ استعمال ہونے لگا۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۴۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، روح المعانی جز ۹، ص ۳۲، بیروت)

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی چیز سے بد فال نہیں نکالتے تھے، آپ جب کسی عامل کو بھیجتے تو اس کا نام پوچھتے اگر آپ کو اس کا نام اچھا لگتا تو آپ خوش ہوتے اور آپ کے چہرے پر بشارت دکھائی دیتی اور اگر آپ کو اس کا نام ناپسند ہوتا تو آپ کے چہرے پر ناپسندیدگی دکھائی دیتی اور جب آپ کسی بستی میں داخل ہوتے تو آپ اس کا نام پوچھتے اگر آپ کو اس کا نام اچھا لگتا تو آپ خوش ہوتے اور آپ کے چہرے پر بشارت دکھائی دیتی اور اگر آپ کو اس کا نام ناپسند ہوتا تو آپ کے چہرے پر ناپسندیدگی دکھائی دیتی۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۹۲۰، مسند احمد، ج ۵، ص ۳۳۰، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۵۷۹۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کلمہ (بات) سنا جو آپ کو اچھا لگا آپ نے فرمایا: ہم نے تمہارے منہ سے فال لے لی ہے۔ (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۹۱۷، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۵۷۹۹)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی کام کے لیے روانہ ہوتے تو آپ کو یہ سننا اچھا لگتا یا راشد (اے ہدایت پانے والے) یا نجیح (اے کامیاب ہونے والے)

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۶۲۲، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۵۸۰۰)

حضرت عروہ بن عامر قریشی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے سامنے بد فالی کا ذکر کیا گیا، آپ نے فرمایا: سب سے اچھی چیز نیک فال ہے اور فال مسلمان کو کسی منہم سے نہیں روکتی، پس جب تم میں سے کوئی شخص کسی ناپسندیدہ چیز کو دیکھے تو کہے: اے اللہ! تیرے سوا کوئی شخص اچھائیوں کو نہیں لاسکتا، اور تیرے سوا کوئی برائیوں کو دور نہیں کر سکتا، اور گناہوں سے باز رہنا اور نیکیوں کو کرنا تیری مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۹۱۹، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۵۸۰۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین بار فرمایا بدشگونی شرک ہے، حضرت ابن مسعود نے کہا: ہم میں سے ہر شخص کو بدشگونی عارض ہوتی ہے اور اس کے دل میں اس سے سخت ناپسندیدگی آتی ہے لیکن اللہ پر توکل اس کو زائل کر دیتا ہے۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۹۱۰، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۶۲۰، مسند احمد، ج ۱، ص ۳۸۹، رقم الحدیث: ۳۶۸۷، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۵۳۸، الادب المفرد، رقم الحدیث: ۹۰۹، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۵۸۰۲)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی مرض متعدی ہوتا ہے نہ کوئی بدشگونی ہے اور مجھ کو فال پسند ہے، صحابہ نے پوچھا: فال کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: اچھی بات، نیک بات۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۷۵۳، صحیح مسلم، سلام، ۱۱۰، (۲۲۲۳)، ۵۶۹۰، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۹۱۶، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۱۶۲۱، مسند احمد، ج ۳، ص ۱۳۰، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۵۳۷، الادب المفرد، رقم الحدیث: ۱۶۱۵، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۵۸۰۳)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی مرض متعدی ہوتا ہے نہ کوئی بدشگونی ہے، (اور اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو) تین چیزوں میں نحوست ہوتی، گھوڑے میں، عورت میں اور مکان میں۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۰۹۳، صحیح مسلم، سلام، ۱۱۵، (۲۲۲۵)، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۹۲۲، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۸۳۳، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۳۵۷۱، مسند احمد، ج ۲، ص ۱۱۵، طبع قدیم، رقم الحدیث: ۵۹۶۳، طبع جدید، الادب المفرد، رقم الحدیث: ۹۱۵، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۵۸۰۳)

حضرت روہف بن سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص بدشگونی کی وجہ سے اپنی مہم پر نہیں گیا وہ شرک میں آلودہ ہو گیا۔ (مسند البرزازی، رقم الحدیث: ۳۰۳۶، مجمع الزوائد، ج ۵، ص ۱۰۶)

بدشگونی کی ممانعت کا سبب

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

تھیر (بدشگونی) کی اصل وجہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین طیر (پرنده) پر اعتماد کرتے تھے، جب ان میں سے کوئی شخص کسی کام کے لیے نکلتا تو وہ پرنده کی طرف دیکھتا اگر وہ پرنده دائیں طرف اڑتا تو وہ اس سے نیک شگون لیتا اور اپنے کام پر روانہ ہو جاتا اور اگر وہ پرنده بائیں جانب اڑتا تو وہ اس سے بدشگونی نکالتا اور لوٹ آتا، بعض اوقات وہ کسی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے خود پرنده کو اڑاتے تھے، پھر جس جانب وہ اڑتا تھا اس پر اعتماد کر کے اس کے مطابق مہم پر روانہ ہوتے یا نہ ہوتے۔

جب شریعت آگئی تو اس نے ان کو اس طریقہ سے روک دیا، چونکہ مشرکین بدفال اور بدشگون پر اعتماد کرتے تھے تو مسلمانوں میں بھی اس کے اثرات آگئے۔ اس وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا تین چیزوں سے کوئی شخص خالی نہیں ہوتا، بدشگونی، بدگمانی، اور حسد۔ پس جب بدشگونی نکلے تو تم واپس نہ ہونا، اور جب تم حسد کرو تو اس کو طلب نہ کرنا اور جب تم بدگمانی کرو تو اس کی تحقیق نہ کرنا اور تم اللہ ہی پر توکل کرو، اس حدیث کو امام عبدالرزاق نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اور اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام بیہقی اور امام ابن عدی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کاہن کے پاس گیا یا جس نے تیر سے فال نکالی یا جو شخص بدشگونی کی وجہ سے سفر سے واپس آ گیا وہ بلند درجات کو نہیں پاسکتا۔ نیز امام ابوداؤد، امام ترمذی اور امام ابن حبان نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا

تبیان القرآن

جلد چہارم

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بد شگون نکلنا شرک ہے، آپ نے اس کو شرک اس لیے قرار دیا کہ ان کا اعتقاد یہ تھا کہ شگون اور فال کی وجہ سے کوئی نفع حاصل ہوتا ہے یا کوئی ضرر دور ہوتا ہے، گویا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شگون کو شریک کر لیا اور جس نے بد شگون کی پروا نہیں کی اور سفر روانہ ہو گیا تو اس پر اس بد شگون کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

(فتح الباری ج ۱۰، ص ۲۱۳، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور - ۱۳۰۱)

نیک فال کے جواز کا سبب اور بد فال کو شرک قرار دینے کی توجیہ

علامہ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

بد شگون یہ ہے کہ انسان کوئی بات سنتا ہے یا کوئی چیز دیکھتا ہے اور اس سے اس کو یہ خوف ہوتا ہے کہ جس چیز کو اس نے حاصل کرنے کا قصد کیا ہے وہ حاصل نہیں ہو سکے گی اور فال اس کی ضد ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کوئی بات سنے یا کوئی چیز دیکھے تو پھر یہ امید رکھے کہ جس چیز کو اس نے حاصل کرنے کا قصد کیا ہے وہ حاصل ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا: بد شگون کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور سب سے اچھی چیز فال ہے۔

(صحیح مسلم رقم: ۲۲۲۳، صحیح بخاری رقم: ۲۷۵۵، مسند احمد ج ۲، ص ۲۶۶)

حضرت بریدہ بن حبیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بد شگون نہیں لیتے تھے لیکن آپ (نیک) فال نکالتے تھے۔ حضرت بریدہ اپنے اہل قبیلہ بنی سہم کے ستر نفر کے ساتھ (ہجرت کے سفر میں) نبی ﷺ کو گرفتار کرنے کے لیے پہنچے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا بریدہ! تب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر کی طرف مڑ کر فرمایا: ”بردا امرنا و صلح“ ہمارا معاملہ ٹھنڈا اور اچھا ہو گیا۔ (آپ نے بریدہ سے برد کی فال نکالی اور برد کا معنی ہے ”ٹھنڈا ہونا۔ سعیدی) پھر فرمایا: تم کن لوگوں سے ہو؟ میں نے کہا ”اسلم“ سے، آپ نے حضرت ابو بکر سے فرمایا ”سلمنا“ ہم سلامتی سے رہیں گے۔ پھر فرمایا تم کس قبیلہ سے ہو؟ میں نے کہا: بنو سہم سے، آپ نے فرمایا: خرج سہمنا ہمارا حصہ نکل آیا۔

(الاستیعاب علی هامش الاصابہ ج ۱، ص ۱۷۳، اسد الغابہ ج ۱، ص ۱۹۶)

آپ فال کو اس لیے پسند فرماتے تھے کہ نیک فال سے انشراح نفس (شرح صدر، تسکین قلب) ہو جاتا ہے، اور انسان کو جب یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کی حاجت پوری ہو جائے گی اور اس کی امید بر آئے گی اور وہ اللہ تعالیٰ سے بھی یہ حسن ظن رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے بھی یہ فرمایا ہے کہ میں بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں اور آپ بد شگون کو اس لیے ناپسند فرماتے تھے کہ یہ مشرکین کا عمل ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بد گمانی ہوتی ہے، جیسا کہ امام ابو داؤد نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین بار فرمایا: بد شگون شرک ہے اور جو شخص بد شگون کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ پر نہیں ہے) سوا اس شخص کے جو بد شگون کے باوجود اپنی مہم پر روانہ ہو جائے اور بد شگون کی بالکل پروا نہ کرے۔ البتہ انسان اس پر قادر نہیں ہے کہ اس کے دل میں بد شگون کا بالکل خیال نہ آئے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت معاویہ بن الحکم نے عرض کیا کہ ہم میں سے بعض لوگ بد شگون کرتے ہیں تو آپ نے فرمایا: یہ وہ چیز ہے جو ان کے دلوں میں کھٹکتی ہے تو وہ اس کے درپے نہ ہوں، اور بعض روایات میں ہے اس سے ان کو ضرر نہیں ہوگا، لیکن جب انسان اللہ پر توکل کرے تو بد شگون جاتی رہتی ہے، اسی لیے آپ نے فرمایا: جب تم بد شگون نکالو، تو اپنی مہم پر روانہ ہو اور اللہ پر توکل کرو۔ (الکامل ابن عدی ج ۳، ص ۱۵۲۳)

عورت، مکان اور گھوڑے میں بد شگونی کی توجیہ

بد شگونی نیک فال کی ضد ہے۔ آپ نے فرمایا: شوم (بد شگونی یا نحوست) کوئی چیز نہیں ہے، شوم صرف تین چیزوں میں ہے: عورت، گھوڑا اور مکان۔

(صحیح بخاری رقم الحدیث: ۵۷۷۲، ۵۷۷۳، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۲۲۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۸۴۳، سنن التسائی، رقم الحدیث: ۳۵۷۱)

بعض علماء نے یہ کہا کہ اس حدیث میں نفی کے عموم سے یہ تین چیزیں مستثنیٰ ہیں اور ان تین چیزوں میں فی الواقع شوم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جیسے زمانہ جاہلیت میں مشرکین بعض چیزوں سے بد شگونی لیتے تھے اور ان کو منحوس (بے برکت) کہتے تھے اسی طرح ان تین چیزوں میں نحوست ہے، اور یہ چیزیں فی الواقع مضر ہیں، بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کسی مخصوص مکان یا کسی مخصوص عورت کے متعلق انسان کے دل میں خیال آئے کہ یہ منحوس ہے تو وہ اپنے اطمینان کے لیے دوسرا مکان بدل لے یا دوسری عورت سے نکاح کر لے، لیکن وہ یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی چیز اپنی ذات میں مضر نہیں ہے اور ہر چیز کا وہی خالق ہے اور اس کی نظیر یہ ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جذام کے مریض سے اس طرح بھاگو جس طرح شیر سے بھاگتے ہیں اور یہ جواب ہر اس چیز میں جاری ہو سکتا ہے جس کے متعلق انسان کے دل میں یہ خیال آئے کہ وہ منحوس ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جس علاقہ میں طاعون پھیلا ہوا ہو وہاں جانے سے منع کیا ہے، اور وہاں کے رہنے والوں کو اس علاقہ سے نکلنے سے بھی منع کیا ہے، اور اگر مکان، عورت اور گھوڑے میں نحوست ہو تو اس کو تبدیل کرنے کی رخصت ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں تین قسم کی چیزیں ہیں؟

پہلی قسم وہ ہے جس سے بالکل ضرر نہیں ہوتا، نہ ہمیشہ نہ اکثر اوقات، نہ بعض اوقات، نہ نادر ایسی وجہ ہے کہ شریعت نے اس کا بالکل اعتبار نہیں کیا جیسے کسی سفر میں کوئے کا ملنا، یا کسی گھر میں الو بولنا۔ زمانہ جاہلیت میں مشرکین ان چیزوں میں ضرر کا اعتقاد کرتے تھے اور ان کو منحوس اور بد شگون کہتے تھے، اسلام نے ان کا رد کیا اور کہا: ان میں کوئی بد شگونی نہیں ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں بالعموم ضرر ہو مثلاً کسی علاقہ میں طاعون ہو یا اور کوئی وبا ہو تو احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اس علاقہ میں جانا نہیں چاہیے اور وہاں سے بھاگنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ بھاگنے والے کو ضرر لاحق ہو جائے اور بھاگنے کے سلسلہ میں اس کی محنت رائیگاں چلی جائے۔

تیسری قسم وہ ہے جس کا ضرر کلیتہً نہ ہو، بعض صورتوں میں ہو اور اکثر میں نہ ہو، مثلاً زیادہ عرصہ کسی مکان میں رہنے سے ضرر ہو یا بیوی یا گھوڑے سے کوئی ضرر پہنچے تو اس کو تبدیل کرنے کی رخصت ہے۔

(المعجم، ج ۶، ص ۶۳۱-۶۳۶، مطبوعہ دار ابن کثیر دمشق، بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن خلیفہ وشتانی ابی مالکی لکھتے ہیں:

بعض روایات اس طرح ہیں "اگر کسی چیز میں شوم (نحوست) ہو تو وہ عورت، مکان اور گھوڑے میں ہے۔"

(صحیح مسلم، سلام، ۱۱۸-۱۱۷)

اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ ان تین چیزوں میں قطعیت کے ساتھ بد شگونی یا نحوست نہیں ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز میں نحوست نہیں ہے لیکن اگر تم میں سے کوئی اپنے مکان میں رہنے کو ناپسند کرتا ہو تو اس مکان کو تبدیل کر دے اور اگر

کوئی شخص بیوی کو ناپسند کرتا ہو تو اس کو طلاق دے دے اور گھوڑا پسند نہ ہو تو اس کو فروخت کر دے۔ ایک جواب یہ ہے کہ مکان کی نحوست یہ ہے کہ مکان تنگ ہو یا اس کے پڑوسی اچھے نہ ہوں اور گھوڑے کی نحوست یہ ہے کہ اس کے ساتھ جمانہ کیا جاسکے اور عورت کی نحوست یہ ہے کہ اس سے اولاد نہ ہو۔ اور یہ نحوست اس معنی میں نہیں ہے جس معنی میں زمانہ جاہلیت میں لوگ بعض چیزوں سے نحوست اور بدشگونی کا اعتقاد کرتے تھے۔ ان کے نزدیک نحوست اور بدشگونی کا معنی یہ تھا کہ کسی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے انسان کسی چیز کو دیکھ لے یا اس کی آواز سن لے تو پھر وہ ناکام ہو جائے اور عورت گھوڑے اور مکان میں جس قسم کی نحوست بیان کی گئی ہے یہ وہ نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نحوست کی نفی اور اثبات کے محل الگ الگ ہیں۔ ایک اور جواب یہ ہے کہ عورت گھوڑے اور مکان میں شوم کا معنی تظیر (بدشگونی یا نحوست) نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ یہ چیزیں اس کی طبیعت کے موافق نہ ہوں عورت کی سعادت یہ ہے کہ وہ صالحہ (نیک) ہو اور مکان کی سعادت یہ ہے کہ وہ وسیع ہو اور گھوڑے کی سعادت یہ ہے کہ اس پر آسانی سے سواری ہو سکے اور ان کی شقاوت یہ ہے کہ یہ چیزیں اچھی نہ ہوں علامہ طیبی نے یہ کہا ہے کہ ان تین چیزوں میں شوم نہیں ہے اور حدیث کا معنی یہ ہے کہ اگر کسی چیز میں شوم ہو سکتی ہے تو ان تین چیزوں میں ہو سکتی تھی کیونکہ انسان ان چیزوں کے ساتھ زیادہ رہتا ہے تو اگر نحوست ہوتی تو ان میں ہوتی اور جب ان میں نحوست نہیں ہے تو کسی چیز میں نحوست نہیں ہے۔

(اکمال اکمال المعلم ج ۷، ص ۳۲۸-۳۲۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

بعض لوگ بعض دنوں یا بعض مہینوں کو منحوس سمجھتے ہیں یا بعض کام بعض دنوں میں اچھا نہیں جانتے اور اس سلسلہ میں بعض ضعیف یا بعض موضوع روایات بھی پیش کرتے ہیں۔ لیکن ان احادیث صحیحہ کے سامنے یہ تمام امور باطل ہیں، تمام دن اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اور کسی میں کوئی نحوست نہیں ہے اور اس طرح کا عقیدہ رکھنا زمانہ جاہلیت کے مشرکین کے عقائد کی طرح ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو اس قسم کے عقائد سے محفوظ رکھے۔

بدشگونی لینا کفار کا طریقہ ہے
قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص یا کسی چیز کو منحوس قرار دینا کفار کا طریقہ ہے۔
اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تو جب انہیں خوشحالی پہنچتی تو کہتے یہ ہماری وجہ سے ہے اور اگر انہیں کوئی بد حالی پہنچتی تو (اسے) موسیٰ اور ان کے اصحاب کی نحوست قرار دیتے سنو ان (کافروں) کی نحوست اللہ کے نزدیک (مقدر) ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

فَإِذَا جَاءَهُمْ الْحَسَنَةُ قَالُوا النَّاهِيهِ وَإِنْ تُصِبَّهُمْ سَيِّئَةٌ تَنْظُرُوا بِمُوسَىٰ وَمَنْ مَعَهُ أَهْلًا
إِنَّمَا ظَنَرُهُمْ عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ (الاعراف: ۱۳۱)

(کافروں نے) کہا ہم نے تم سے برا شگون لیا ہے اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں ضرور شکار کر دیں گے اور ہماری طرف سے تم کو ضرور دردناک عذاب پہنچے گا۔

قَالُوا إِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَئِن لَّمْ تَنْتَهُوا لَنَرْجِمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُم مِّنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ (یٰس: ۱۸)

(کافروں نے حضرت صالح سے) کہا: ہم نے آپ کے ساتھیوں سے برا شگون لیا ہے۔ (حضرت صالح نے) فرمایا: تمہاری بدشگونی اللہ کے پاس ہے، بلکہ تم لوگ فتنہ میں مبتلا ہو۔

قَالُوا أَظَلَّيْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طَائِرُكُمْ عِنْدَ اللَّهِ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُونَ۔ (النمل: ۳۷)

کسی چیز سے بد شکونی لینے یا کسی دن کو منحوس قرار دینے کے متعلق فقہاء اسلام کے نظریات

علامہ شرف الدین حسین بن محمد بن عبد اللہ الطیبی المتوفی ۷۷۳ھ لکھتے ہیں:

(نیک) فال نکالنے کی رخصت ہے اور تطہیر (بد شکونی) منع ہے۔ اگر کوئی انسان کسی چیز کو دیکھے اور وہ اس کو اچھی لگے اور وہ اس کو اپنی حاجت یا مہم پر جانے کے لیے ابھارے تو وہ اس پر عمل کرے اور اگر وہ کوئی ایسی چیز دیکھے جس کو منحوس شمار کیا جاتا ہو اور وہ اس کو اس کی مہم پر جانے سے منع کرے تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے بلکہ وہ اپنی مہم پر اور اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے روانہ ہو جائے اور اگر اس نے اس بد شکونی کو قبول کر لیا اور اپنی مہم پر روانہ نہیں ہوا تو یہ طہیرہ (بد شکونی) ہے۔

(الکاشف عن حقائق السنن ج ۸، ص ۳۱۳-۳۱۴، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۳۱۳ھ)

سنن ابوداؤد اور سنن ترمذی میں ہے اطیرۃ (بد شکونی لینا) شرک ہے، آپ نے اس کو اس لیے شرک فرمایا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں مشرکین جن چیزوں کو منحوس قرار دیتے تھے ان کو ناکامی اور نامرادی کے حصول میں سبب موثر خیال کرتے تھے اور یہ شرک جلی ہے اور اگر ان چیزوں کو من جملہ اسباب قرار دیا جائے تو پھر یہ شرک خفی ہے۔

(الکاشف عن حقائق السنن، ج ۸، ص ۳۲۰)

حضرت سعد بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کسی چیز میں شوم (نخوست) ہو تو وہ مکان، گھوڑے اور عورت میں ہے۔ (سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۹۲۱، صحیح مسلم، سلام، ۱۱۸-۱۱۷، شرح السنن، ج ۶، ص ۲۷۳، مسند احمد، ج ۱، ص ۱۸۰) اس حدیث میں شوم کا معنی نخوست نہیں ہے بلکہ اس کا معنی ہے جو چیز شریعت اور طبیعت کے مخالف ہو اور مکان میں شوم یہ ہے کہ وہ تنگ ہو اور اس کے پڑوسی اچھے نہ ہوں اور عورت میں شوم یہ ہے کہ وہ بانجھ ہو یا بد زبان ہو اور گھوڑے میں شوم یہ ہے کہ اس پر جمانہ ہو سکے یا وہ اڑیل ہو یا بہت مزگا ہو، اس کی تائید علامہ بغوی کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ اگر تمہیں اپنا مکان رہائش کے لیے ناپسند ہو یا بیوی سے صحبت ناپسند ہو یا گھوڑا پسند نہ ہو تو وہ ان کو تبدیل کر لے حتیٰ کہ اس کی ناپسندیدگی زائل ہو جائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا: ہم پہلے ایک گھر میں رہتے تھے ہماری تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور ہمارا مال بھی بہت زیادہ تھا، پھر ہم دوسرے گھر میں منتقل ہو گئے ہماری تعداد بھی کم ہو گئی اور ہمارا مال بھی کم ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس گھر کو چھوڑ دو اور آنا لیکہ یہ مذموم ہے۔ (سنن ابوداؤد، رقم: ۳۹۲۳، سنن بیہقی، ج ۸، ص ۱۳۰، کنز العمال، رقم: ۲۸۶۳۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اس مکان سے اس لیے منتقل ہونے کا حکم دیا کیونکہ وہ لوگ اس گھر میں رہنے سے متوحش اور متنفر تھے اور وہ ان کے مزاج کے موافق نہ تھا، نہ اس لیے کہ اس مکان میں فی نفسہ کوئی نخوست تھی۔

(شرح السنن، ج ۶، ص ۲۷۳)

علامہ طہیبی فرماتے ہیں کہ قاضی عیاض نے اس حدیث کا یہ معنی کیا ہے کہ اگر کسی چیز میں شوم ہوتی تو ان تین چیزوں میں شوم ہوتی اور جب ان میں شوم نہیں ہے تو پھر کسی چیز میں شوم نہیں ہے۔

(الکاشف عن حقائق السنن ج ۸، ص ۳۲۱، مطبوعہ کراچی)

امام حسین بن مسعود بغوی متوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

نبی ﷺ نے تطہیر کو اس لیے باطل کہا ہے کہ نفع یا ضرر پہنچانے میں کسی چیز کی تاثیر نہیں ہے، انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے کام پر جائے خواہ فال اس کے موافق ہو یا مخالف، وہ اپنے رب پر توکل کر کے اپنی مہم پر روانہ ہو، زمانہ جاہلیت میں لوگ

صفر کے مہینہ کو منحوس قرار دیتے تھے تو نبی ﷺ نے اس کو باطل فرمایا اور فرمایا: لا صفر۔۔۔۔۔

(شرح السنہ ج ۶، ص ۲۶۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۳۱۲ھ)

خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ مہینہ کا آخری بدھ دائمی منحوس

ہے۔ (تاریخ بغداد ج ۱۳، ص ۳۰۵، الموضوعات لابن الجوزی ج ۱، ص ۳۷۵)

حافظ سیوطی نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (الجامع الصغیر ج ۱، رقم: ۸) اور بعض علماء نے اس کو موضوع کہا ہے۔

(سلسلہ الاحادیث الضعیفہ رقم: ۱۵۸۱) علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس کی اسناد ضعیف اور وضع سے خالی نہیں۔

(المآلی المصنوعہ ج ۱، ص ۴۳۲-۴۳۹)

علامہ شمس الدین عبدالرؤف السناوی الشافعی المتوفی ۱۰۲۱ھ لکھتے ہیں:

اس دن کا منحوس ہونا تطیر کی جہت سے نہیں ہے۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے، تمام ایام اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور بعض ایام کی فضیلت میں بہت سی احادیث وارد ہیں۔ اور تطیر (بدشگونگی) امور دین میں سے نہیں ہے بلکہ یہ فعل جاہلیت سے ہے، نجومی کہتے ہیں کہ بدھ کا دن عطارد کا دن ہے اور عطارد منحوس ستارہ ہے اور ان کا یہ قول دین سے خارج ہے، یہ دن قوم عاد کے لیے نامبارک تھا کیونکہ اس دن ان پر عذاب آیا تھا۔ سو اس دن کو منحوس فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ اس دن اللہ سے ڈرنا چاہیے کیونکہ اس دن اللہ کا عذاب آیا تھا، اور اللہ سے بکثرت توبہ اور استغفار کرنا چاہیے جس طرح نبی ﷺ جب الحجر میں گئے تو آپ نے فرمایا ان معذبین کے پاس سے روتے ہوئے گزرنا، اول تو یہ حدیث سنداً ضعیف یا موضوع ہے اور یہ ان احادیث صحیحہ سے تصادم اور تعارض کی صلاحیت نہیں رکھتی جن میں یہ تصریح ہے کہ کسی چیز میں شوم یا نحوست نہیں ہے اور بر تقدیر تسلیم اس کی یہی تاویل ہے کہ یہ دن قوم عاد کے لیے نامبارک ثابت ہوا تھا، اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ قیامت تک کے لیے یہ دن ہر شخص کے لیے نامبارک ہے، علامہ شامی نے دہلی کی سند ضعیف سے ایک حدیث ذکر کی ہے کہ جس نے بدھ کے دن ناخن تراشے اس سے وسوسہ اور خوف نکل جاتا ہے اور اس کو امن اور شفا حاصل ہوتی ہے۔ (رد المحتار ج ۵، ص ۲۶۰)

اور منہاج الحلی میں اور شعب الیہتی میں یہ حدیث ہے کہ بدھ کے دن زوال کے بعد دعا قبول ہوتی ہے اور صاحب الہدایہ نے کتاب تعلیم و تعلم میں لکھا ہے کہ بدھ کے دن جو کام شروع کیا جائے وہ پورا ہو جاتا ہے۔ علامہ مناوی نے بدھ کی سعادت اور برکت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے ہفتہ کے دنوں میں سے ہر دن میں کوئی نہ کوئی مصیبت اور آفت نازل ہوئی اور ہر دن میں کوئی نہ کوئی نعمت ملی ہے اس لیے کوئی دن بھی منحوس نہیں ہے، تمام دن اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور کسی دن بھی کوئی کام کرنا شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ احادیث صحیحہ سے یہی ثابت ہے اور جن روایات میں بعض ایام کی نحوست کا ذکر ہے وہ موضوع ہیں یا شدید ضعیف ہیں۔

(فیض القدر ج ۱، ص ۸۶-۸۹، ملخصاً و موضحاً، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۸ھ)

علامہ بدر الدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

زمانہ جاہلیت میں لوگ بدشگونگی کی وجہ سے اپنے مطلوبہ کاموں کو کرنے سے رک جاتے تھے، شریعت اسلام نے بدشگونگی کو باطل کیا اور اس سے منع فرمایا اور یہ خبر دی کہ کسی نفع کے حصول یا کسی ضرر کے دور کرنے میں شگون کا کوئی اثر نہیں ہے۔

(عمدة القاری ج ۲۱، ص ۲۳۷، مطبوعہ ادارة الطباعة المنيرية، مصر ۱۳۳۸ھ)

ملا علی قاری حنفی متوفی ۱۰۱۳ھ لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”بدشگونی لینا شرک ہے“۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ بدشگونی کے تقاضے پر عمل کرنے سے ان کو نفع حاصل ہوتا ہے یا ان سے ضرر دور ہوتا ہے اور جب انہوں نے اس کے تقاضے پر عمل کیا تو گویا انہوں نے شرک کیا اور یہ شرک خفی ہے، اور اگر کسی شخص نے یہ اعتقاد کیا کہ حصول نفع یا دفع ضرر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز مستقل موثر ہے تو یہ شرک جلی ہے، آپ نے اس کو شرک اس لیے فرمایا کہ وہ یہ اعتقاد کرتے تھے کہ جس چیز سے انہوں نے بدفالی لی ہے وہ مصیبت کے نزول میں موثر سبب ہے اور بالعموم ان اسباب کا لحاظ کرنا شرک خفی ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ جمالت اور سوء اعتقاد بھی ہو تو اس کا شرک خفی ہونا اور بھی واضح ہے۔

(مرقات ج ۹، ص ۷-۶، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی متونی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں:

نبی ﷺ نے فرمایا: ”لاطیبرۃ“ یعنی حصول نفع اور دفع ضرر میں بدشگونی لینے کی کوئی تاثیر اور دخل نہیں ہے اور بدشگونی نہیں لینا چاہیے اور نہ اس کا اعتبار کرنا چاہیے، جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا، شریعت نے اس کو سبب نہیں بنایا۔

(اشعۃ اللمعات ج ۳، ص ۶۲۰، مطبوعہ تیج کمار لکھنؤ)

نیر شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

نبی ﷺ نے فرمایا: ”لاصفر“ بعض علماء کے نزدیک اس سے مراد ماہ صفر ہے جو محرم کے بعد آتا ہے، عام لوگ اس ماہ کو مصیبتوں، بلاؤں اور آفتوں اور حادثوں کا مہینہ قرار دیتے تھے، یہ اعتقاد بھی باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں۔

(اشعۃ اللمعات ج ۳، ص ۶۲۰، مطبوعہ لکھنؤ)

بقیہ کہتے ہیں: میں نے محمد بن راشد سے پوچھا: رسول اللہ ﷺ کے ارشاد ”ولا صفر“ کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے کہا: لوگ ماہ صفر کے دخول کو منحوس سمجھتے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”لا صفر“ یعنی صفر میں نحوست نہیں ہے۔

(مرقات ج ۹، ص ۴، مطبوعہ ملتان)

اس سے معلوم ہوا کہ کسی دن کو منحوس، نامسعود اور نامبارک خیال کرنا اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متونی ۱۳۳۰ھ سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص کے متعلق مشہور ہے کہ وہ منحوس ہے اگر اس کی منحوس صورت دیکھ لی جائے یا کسی کام کو جاتے ہوئے وہ سامنے آجائے تو ضرور دقت اور پریشانی ہوتی ہے اور یہ بات بار بار کے تجربہ سے ثابت ہے، اب اگر کہیں کام کو جاتے ہوئے وہ سامنے آجائے تو لوگ اپنے مکان پر واپس آجاتے ہیں اور کام پر نہیں جاتے۔ اعلیٰ حضرت اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: شرع مطہر میں اس کی کچھ اصل نہیں، لوگوں کا وہم سامنے آتا ہے۔ شریعت میں حکم ہے ”اذا تطیبرتم فامضوا“ جب کوئی شگون بدگمان میں آئے تو اس پر عمل نہ کرو، وہ طریقہ محض ہندوانہ ہے مسلمانوں کو ایسی جگہ چاہیے کہ ”اللہم لا تطیر الاطیبرک ولا خیر الا خیرک ولا الہ غیرک“ پڑھ لے اور اپنے رب پر بھروسہ کر کے اپنے کام کو چلا جائے، ہرگز نہ رکے نہ واپس آئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۹، ص ۱۳۹، مطبوعہ مکتبہ رضویہ، کراچی)

بدشگونی کے سلسلہ میں خلاصہ بحث

خلاصہ یہ ہے کہ تمام دن اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور کوئی دن نامسعود اور نامبارک نہیں ہے، اسی طرح تمام انسان اور اشیاء اللہ کی پیدا کردہ ہیں اور ان میں سے کوئی چیز منحوس نہیں ہے اور حوادث، آفات، بلاؤں اور مصائب کے نازل ہونے میں

کسی چیز کا دخل نہیں ہے۔ بیماریوں، آفتوں اور مصیبتوں کے نازل ہونے کا تعلق تکوین اور تقدیر سے ہے، دن اور کسی شے کا کسی شر کے حدوث اور کسی آفت کے نزول میں کوئی دخل اور اثر نہیں ہے، ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور بس! اسی لیے کسی بھی جائز صحیح کام کو کسی دن اور کسی چیز کی خصوصیت کی وجہ سے ترک کرنا جائز نہیں ہے اور کوئی دن اور کوئی چیز منحوس، نامسعود اور نامبارک نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور انہوں نے کہا (اے موسیٰ!) آپ جب بھی ہمیں مسحور کرنے کے لیے کوئی نشانی لائیں گے تو ہم آپ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں ○ پس ہم نے ان پر طوفان بھیجا اور ٹڈی دل، جوئیں اور مینڈک اور خون، در آنحالیکہ یہ الگ الگ نشانیاں تھیں، انہوں نے تکبر کیا اور وہ تھی ہی مجرم قوم۔ (الاعراف: ۱۳۳-۱۳۴)

قوم فرعون پر طوفان اور ٹڈی دل وغیرہ بھیجنے کا عذاب

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت اور گمراہی بیان کی تھی کہ انہوں نے خشک سالی، قحط اور پھلوں کی کم پیداوار کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے اصحاب کی نحوست (العیاذ باللہ) کی طرف منسوب کیا اور یہ نہ جانتا کہ بارش کا نہ ہونا اور غلہ اور پھلوں کا کم پیدا ہونا یا زیادہ ہونا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے اور ان سب چیزوں کا اللہ تعالیٰ خالق ہے کسی مخلوق میں اس کا دخل نہیں ہے، اور اس آیت میں ان کی ایک اور جہالت اور گمراہی بیان فرمائی ہے کہ وہ معجزہ اور سحر میں فرق نہیں کرتے تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاشی جو اڑ رہا بن گئی تھی اس کو سحر کہتے تھے، حالانکہ ان کے تمام بڑے بڑے ساحر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کے سامنے عاجز ہو چکے تھے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب فرعون کی قوم نے یہ کہا: اے موسیٰ! آپ جب بھی ہمیں مسحور کرنے کے لیے کوئی نشانی لائیں گے تو ہم آپ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام تیز مزاج تھے، اس وقت انہوں نے قوم فرعون کے خلاف دعاء ضرر کی: ”اے میرے رب! تیرا بندہ فرعون زمین میں بہت تکبر اور سرکشی کر رہا ہے اور اس کی قوم نے تیرے عہد کو توڑ دیا ہے، اے میرے رب! ان پر عذاب نازل فرما جو ان کے لیے عذاب ہو اور میری قوم کے لیے نصیحت ہو اور بعد والوں کے لیے نشانی اور عبرت ہو، تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر طوفان بھیجا۔ اور وہ زبردست طوفانی بارش تھی جس سے ان کے گھروں میں پانی بھر گیا، بنو اسرائیل اور قبیلوں کے گھر ملے جلے تھے، قبیلوں کے گھر تو پانی سے بھر گئے حتیٰ کہ ان کی گردنوں تک پانی پہنچ گیا۔ ان میں سے جو شخص بیٹھا وہ پانی میں ڈوب جاتا اور بنو اسرائیل کے گھروں میں پانی کا ایک قطرہ بھی داخل نہیں ہوا، اور قبیلوں کی زمینوں پر پانی جمع ہو گیا، وہ کھیتی باڑی اور دیگر کوئی کام نہ کر سکے، ایک سینچر سے دوسرے سینچر تک یہی کیفیت رہی، تب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہم کو اس بارش کے طوفان سے نجات دے دے تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کے ساتھ بنو اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تو ان سے وہ طوفان اٹھایا گیا، اور اس سال ان کی بہت اچھی فصل ہوئی ایسی کبھی نہ ہوئی تھی، ہر طرف سبزہ پھیل گیا اور درخت ہرے بھرے ہو گئے۔ تب قبیلوں نے کہا یہ پانی تو ہمارے حق میں نعمت تھا اس سے ہماری فصل اچھی ہوئی اور ہمارے درخت پھلوں سے لد گئے، سو وہ ایمان نہیں لائے اور ایک مہینہ تک آرام اور عافیت سے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ٹڈی دل کے بادل بھیجے انہوں نے ان کی تمام فصلوں، پھلوں، حتیٰ کہ درختوں تک کو چاٹ لیا۔ بلکہ انہوں نے دروازوں کو مکان کی چھتوں کو ہر قسم کی لکڑی کو ان کے ساز و سامان کو، کپڑوں کو حتیٰ کہ دروازوں کی کیلوں تک کو کھالیا، وہ ٹڈیاں ہر چیز کو کھا رہی تھیں اور ان کی بھوک ختم نہیں ہو رہی تھی۔ تب قبیلوں نے چٹے چلائے اور بہت فریاد کی اور کہا: اے موسیٰ! آپ سے آپ کے

رب نے جو وعدہ کیا ہے اس وعدہ کے واسطے اپنے رب سے دعا کیجئے اگر اس نے ہم سے یہ عذاب دور کر دیا تو ہم ضرور آپ پر ایمان لے آئیں گے اور انہوں نے حضرت موسیٰ سے بہت پختہ وعدہ کیا اور بہت پکی قسمیں کھائیں۔ ان پر مڈیوں کا یہ عذاب ایک سینچر سے دوسرے سینچر تک رہا تھا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے مڈیوں کا یہ عذاب دور کر دیا۔ بعض احادیث میں ہے کہ مڈیوں کے سینہ پر لکھا ہوا تھا: "جند اللہ الاعظم" (اللہ کا عظیم لشکر)

ایک روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا فضا میں مشرق سے مغرب کی طرف گھمایا تو مڈیاں جہاں سے آئی تھیں وہیں واپس چلی گئیں، ان کے کھیتوں میں جو بچا کھچا غلہ باقی رہ گیا تھا انہوں نے کہا یہ بھی کافی ہے اور ہم اپنے دین کو نہیں چھوڑیں گے، انہوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور اپنی بد اعمالیوں پر ڈٹے رہے۔ سو وہ ایک ماہ تک عافیت سے رہے پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر قمل بھیج دیں، قمل کی تفسیر میں اختلاف ہے، سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ گندم کے جو سرسریاں وغیرہ نکلتی ہیں وہ قمل ہیں، مجاہد، سدی، قتادہ اور کلبی وغیرہ نے کہا ہے کہ قمل بغیر پروں کی مڈیاں ہیں، بعض نے کہا وہ چیچر کی ایک قسم ہیں اور بعض نے کہا وہ جوئیں ہیں اور بعض نے کہا وہ ایک قسم کا کیرا ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا: وہ شہر سے باہر بستیوں کے پاس کسی بڑے ٹیلے کے پاس جائیں اور اس ٹیلے پر اپنا عصا ماریں، عصا مارنے سے اس ٹیلے کے اندر سے وہ کیرے (قمل) پھوٹ پڑے وہ ان کے بچے کھجے کھیتوں کو کھا گئے وہ ان کے کپڑوں میں گھس گئے، ان کا کھانا ان کیروں سے بھر جاتا، وہ ان کے بالوں میں، ان کی پلکوں میں، ان کی بھنوں میں گھس گئے، وہ ان کے ہونٹوں اور ان کی کھالوں میں گھسنے لگے۔ ان کا چین و قرار جاتا رہا، وہ سو نہیں سکتے تھے، بالآخر وہ بے چین اور بے قرار ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس گئے اور رورور فریاد کی اور کہا: ہم توبہ کرتے ہیں، آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہم سے یہ عذاب اٹھالے، ان پر سات دن یہ عذاب رہا تھا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو ان سے یہ عذاب اٹھایا گیا، لیکن انہوں نے پھر عمد شکنی کی اور دوبارہ برے اعمال شروع کر دیے اور کہنے لگے کہ ہم یہ یقین کرنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ ایک جادوگر ہیں جنہوں نے ریت کے ٹیلے کو قمل سے بدل ڈالا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مینڈکوں کا عذاب بھیجا۔ جس سے ان کے گھر اور ان کے صحن بھر گئے، ان کے کھانے اور کھانے کے برتن مینڈکوں سے بھر گئے، وہ جب بھی کسی کھانے کے برتن کو یا کھانے کو کھولتے تو اس میں مینڈک بھرے ہوئے ہوتے۔ جب کوئی شخص بیٹھتا تو مینڈک اچھل کر اس کی ٹھوڑی پر چڑھ جاتے اور جب وہ بات کرنا چاہتا تو مینڈک پھدک کر اس کے منہ کے اندر چلے جاتے، وہ ان کی دیکھوں میں اچھل کر چلے جاتے اور ان کا کھانا خراب کر دیتے اور ان کی آگ بجھا دیتے۔ وہ جب سونے کے لیے کروٹ لیتے تو دوسری جانب مینڈکوں کا ڈھیر لگ جاتا اور وہ کروٹ نہ بدل سکتے۔ وہ منہ میں نوالہ ڈالنے کے لیے منہ کھولتے تو نوالہ سے پہلے مینڈک منہ میں چلا جاتا، وہ آٹا گوندھتے تو آٹے میں مینڈک لتھڑ جاتے، اور جب وہ سالن کی دیگچی کھولتے تو وہ دیگچی مینڈکوں سے بھری ہوئی ہوتی تھی۔

حضرت عباس نے فرمایا: پہلے مینڈک خشکی کے جانور تھے لیکن جب انہوں نے اللہ کے حکم کی اطاعت کی اور جوش کھاتی ہوئی دیگچی میں پھدک کر چلے جاتے اور بھڑکتے ہوئے نور میں چھلانگ لگا دیتے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اچھی اطاعت کی وجہ سے ان کو پانی کا جانور بنا دیا۔ قبضیوں پر ایک ہفتہ تک مینڈکوں کا عذاب رہا۔ وہ پھر روتے پٹتے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس گئے اور بہت معافی مانگی اور توبہ کی اور قسمیں کھائیں اور بہت پکے وعدے کیے کہ وہ اب وعدہ نہیں توڑیں گے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی، اللہ تعالیٰ نے ان سے مینڈکوں کا عذاب اٹھایا، اور وہ ایک ماہ تک آرام اور عافیت کے ساتھ رہے، پھر انہوں نے اپنے وعدوں اور قسموں کو توڑ دیا اور اپنے کفر کی طرف لوٹ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر ان کے

خلاف دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر خون کا عذاب بھیجا، پھر دریائے نیل میں خون پینے لگا۔ ان کے گھروں میں رکھا ہوا پانی خون بن گیا۔ وہ کنوؤں اور نہروں سے جو پانی لاتے تھے وہ سرخ رنگ کا گاڑھا خون ہوتا تھا۔ انہوں نے فرعون سے شکایت کی کہ اب تو ہمیں پینے کا پانی بھی میسر نہیں ہے۔ فرعون نے کہا کہ یہ موسیٰ کا جادو ہے، قبطیوں نے کہا یہ جادو کہاں سے ہو گیا ہمارے تمام برتنوں میں سرخ سیال خون بھرا ہوا ہے، پھر فرعون نے قبطی اور اسرائیلی کو جمع کیا قبطی کے پیالہ میں خون ہوتا اور اسرائیلی کے پیالہ میں پانی ہوتا، پھر جب قبطی اسرائیلی کا پیالہ لے کر پانی پینا چاہتا تو اس کے منہ کے پاس جا کر خون بن جاتا، وہ پانی کے مشکوں کو دیکھتے تو قبطی کے مشکے میں خون ہوتا اور اسرائیلی کے مشکے میں پانی ہوتا حتیٰ کہ پیاس سے مجبور ہو کر قوم فرعون کی عورت اسرائیلی کے پاس جا کر پانی مانگتی۔ اسرائیلی اس کو پیالے میں پانی دیتا لیکن قبطی عورت جب اس سے پیالہ کو پکڑتی تو وہ خون بن جاتا۔ پھر وہ عورت اسرائیلی سے کہتی کہ تم میرے منہ میں اس پانی کی کلی کر دو، جب اسرائیلی کلی کرتا تو قبطی کے منہ میں پہنچ کر وہ پانی خون بن جاتا۔ اور فرعون کو جب پیاس لگتی تو وہ درختوں کی تر چھال کو چبانا اور اس میں سے سخت کھار اور کڑوا پانی نکلتا۔ وہ سات دن تک اس سخت عذاب میں مبتلا رہے اور خون کے سوا کوئی چیز نہ پی سکے۔ پھر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس روتے پیتے ہوئے آئے اور کہنے لگے: اے موسیٰ! اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہم سے اس عذاب کو اٹھالے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے اور آپ کے ساتھ بنو اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ عذاب اٹھالیا، ان پر طوفان، ٹڈی دل، سرسریوں، مینڈکوں اور خون کا عذاب پے پے آیا، ہر عذاب کا دورانیہ سات دن تھا۔ اور دو عذابوں کے درمیان عافیت کا وقفہ ایک ماہ تھا۔ لیکن ہر قسم کا عذاب بھگتنے کے باوجود وہ راہ راست پر نہیں آئے اور وہ ایمان لانے سے تکبر کرتے رہے اور دراصل وہ تھے ہی مجرم لوگ۔

(معالم التنزیل ج ۲، ص ۱۶۱-۱۶۰، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، تفسیر ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۳۹-۱۵۴۴، جامع البیان ج ۹، ص ۵۰-۴۶)

زاد المسیر، ج ۳، ص ۲۵۱-۲۵۰، الدر المنثور، ج ۳، ص ۵۲۰)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ قوم فرعون ایمان نہیں لائے گی تو پھر اتنے معجزات دکھانے کی کیا ضرورت تھی!

امام رازی نے اس کے دو جوابات دیے ہیں، ایک جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مالک ہے جو چاہے کرے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ اس قدر معجزات دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے کچھ لوگ ایمان لے آئیں گے، اور اس کا یہ جواب بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرعون کی قوم کی شقاوت اور قساوت دکھانا چاہتا تھا، کیونکہ اس قوم کو بعد میں سمندر میں غرق کر دیا گیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے بار بار نشانیاں دکھا کر اپنی حجت پوری کی تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ قوم فرعون کو غرق کر دیا گیا اگر ان کو موقع دیا جاتا تو ہو سکتا تھا وہ ایمان لے آتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بار بار مواقع دیے لیکن وہ اپنی ہٹ دھرمی اور تکبر پر قائم رہے اور ایمان نہ لائے۔

علامہ قرطبی مالکی متونی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے کہ اسرائیل نے ازسماک از نون شامی روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ساحروں پر غلبہ پانے کے بعد چالیس سال تک رہے اور بیس سال تک انہیں مختلف معجزات دکھاتے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو غرق کر دیا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۲۳۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب بھی ان پر کوئی عذاب آتا تو وہ کہتے اے موسیٰ! آپ کے رب نے آپ سے جو وعدہ کیا ہے اس کی بناء پر ہمارے حق میں دعا کیجئے، اگر آپ نے ہم سے یہ عذاب دور کر دیا تو ہم ضرور بہ ضرور

آپ پر ایمان لے آئیں گے اور ہم ضرور بہ ضرور آپ کے ساتھ بنو اسرائیل کو روانہ کر دیں گے ○ پس جب ہم نے ان سے اس مدت معینہ تک کے لیے عذاب دور کر دیا جس مدت تک پہنچنا ان کے لیے مقدر تھا تو وہ فوراً اپنا عہد توڑنے والے تھے ○ پھر ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ان سے لاپرواہی برتتے تھے ○

ستر ہزار فرعونوں کا طاعون میں مبتلا ہونا

اس آیت میں رجز کا ذکر کیا ہے اس کا معنی عذاب ہے۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ اس عذاب سے مراد وہی پانچ قسموں کا عذاب ہے جس کا اس سے پہلی آیت میں ذکر فرمایا ہے یعنی طوفان، ٹڈیوں اور قمل وغیرہ کا عذاب اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد طاعون ہے۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

ابن زید نے کہا رجز سے مراد وہ عذاب ہے جو ان پر ٹڈیوں اور سرسریوں کی صورت میں مسلط کیا گیا تھا وہ ہر بار یہ عہد کرتے تھے کہ اگر ان سے یہ عذاب دور کر دیا گیا تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئیں گے اور ہر بار اس عہد کو توڑ دیتے تھے۔ سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں جب قوم فرعون پر ان مذکورہ پانچ قسموں کا عذاب آچکا اور وہ ایمان نہیں لائی اور نہ انہوں نے بنو اسرائیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھیجا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا: تم میں سے ہر شخص ایک مینڈھا زخ کرے پھر اس کے خون سے اپنی ہتھیلی کو رنگ لے پھر اپنے دروازے پر وہ ہاتھ مارے۔ قبیلوں نے بنو اسرائیل سے پوچھا: تم اپنے دروازوں پر یہ خون کیوں لگا رہے ہو؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ تم پر ایک عذاب بھیجے گا جس سے ہم سلامت رہیں گے اور تم ہلاک ہو جاؤ گے، قبیلوں نے کہا: تو اللہ تعالیٰ تم کو صرف ان علامات سے پہچانے گا؟ انہوں نے کہا: ہم کو ہمارے نبی نے اسی طرح حکم دیا ہے۔ پھر صبح کو فرعون کی قوم کے ستر ہزار افراد کو طاعون ہو چکا تھا اور شام کو وہ سب مر چکے تھے اور ان کو دفنایا بھی نہیں گیا۔ اس وقت فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اے موسیٰ آپ کے رب نے آپ سے جو وعدہ کیا ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دعا کیجئے اگر آپ نے ہم سے یہ عذاب دور کر دیا تو ہم ضرور بہ ضرور آپ پر ایمان لے آئیں گے اور ہم ضرور بہ ضرور آپ کے ساتھ بنو اسرائیل کو روانہ کر دیں گے ○ پس جب ہم نے ان سے اس مدت معینہ تک کے لیے عذاب دور کر دیا جس مدت تک پہنچنا ان کے لیے مقدر تھا تو وہ فوراً اپنا عہد توڑنے والے تھے ○

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں رجز سے مراد ان مذکورہ پانچ قسموں کا عذاب ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد طاعون کا عذاب ہو۔ قرآن مجید میں اور کسی حدیث میں یہ ذکر نہیں ہے کہ یہاں رجز سے کون سا عذاب مراد ہے۔

عقائد میں تقلید کا مذموم ہونا اور فروع میں تقلید کا ناگزیر ہونا

اس کے بعد فرمایا: پھر ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کو سمندر میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ان سے لاپرواہی برتتے تھے۔ اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم فرعون سے متعدد بار عذاب کو دور کیا لیکن وہ اپنے کفر اور ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئے اور وہ بالآخر اس میعاد پر پہنچ گئے جو ان کو ڈھیل دینے کی آخری حد تھی۔ انتقام کا معنی ہے نعمت سلب کرنا اور سزا دینا اور ”لیم“ کا معنی ہے سمندر۔ امام رازی نے کشاف کے حوالہ سے لکھا ہے ”یم“ کا معنی ہے بہت گہرا سمندر جس کی گہرائی کا اندازہ نہ کیا جاسکے۔ غفلت کا معنی ہے قوت حافظہ، حاضر دماغی اور بیدار مغزی میں کمی کی وجہ سے سو کا طاری ہونا اور انسان کا کسی چیز کو بھول جانا۔ (المفردات ج ۲، ص ۲۶۹، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ) اب یہاں پر یہ اعتراض ہے کہ غفلت انسان کا اختیاری فعل نہیں ہے تو پھر غفلت کی وجہ سے ان کو کیوں سزا دی گئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

تنبیان القرآن

جلد چہارم

ہے: ہم نے ان کو سمندر میں اس لیے غرق کر دیا کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے غافل تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں غفلت سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے اعراض کرتے تھے اور لاپرواہی برتتے تھے اور ان سے کوئی سبق اور نصیحت حاصل نہیں کرتے تھے۔ ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اس آیت میں ان کو سزا دینے کے دو سبب بیان کیے ہیں۔ ایک آیات کی تکذیب کرنا اور دوسرا ان سے لاپرواہی برتنا۔ حالانکہ ان کے علاوہ وہ اور بہت سارے گناہ کرتے تھے مثلاً بنو اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور ان سے بلاوجہ بے گار لیتے تھے اور زمین میں طرح طرح سے فساد کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں حصر کا کوئی کلمہ نہیں ہے کہ ان کو صرف ان ہی دو سیبوں سے سزا دی گئی ہے اور ان دو سیبوں کا خصوصیت سے اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ تمام فساد اور گناہوں کی جڑ یہ دو چیزیں تھیں۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آتے اور ان نشانیوں سے سبق حاصل کرتے تو دوسرے گناہوں میں نہ پڑتے۔

امام رازی نے فرمایا ہے: اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بلا دلیل اندھی تقلید کرنا مذموم اور باطل ہے جیسا کہ فرعون کی قوم کھلی کھلی اور واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود کفر میں فرعون کی تقلید کرتی تھی۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۴۸، مطبوعہ بیروت)

اہل سنت جو ائمہ اربعہ کی تقلید کرتے ہیں اس پر اس آیت سے اعتراض نہیں ہوتا۔ اولاً اس لیے کہ اس آیت میں اصول میں تقلید کی مذمت ہے اور اہل سنت اصول میں ائمہ کی تقلید نہیں کرتے بلکہ اصول (یعنی توحید اور رسالت) کو دلائل سے مانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اصول میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور عقائد میں سب متفق ہیں اور فروع میں ائمہ کی تقلید کرتے ہیں اور اس تقلید کا یہ معنی ہے کہ احکام فرعیہ پر عمل کا جو طریقہ ہمارے امام نے کتاب اور سنت سے مستنبط کیا ہے اس میں ظن غالب یہ ہے کہ وہی صحیح ہے۔ اور دوسرے امام کا طریقہ خطا پر مبنی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے امام کے اجتہاد میں غلطی ہو اور دوسرے امام کا اجتہاد صحیح ہو لیکن اجتہادی غلطی پر مواخذہ نہیں ہوتا اور اس پر بہر حال ایک اجر ملے گا۔ اس کے برخلاف عقائد میں تقلید نہیں ہوتی نہ ان میں ائمہ کا اختلاف ہوتا ہے اور ثانیاً اس لیے کہ ہم ائمہ کی اندھی تقلید نہیں کرتے انہوں نے احکام فرعیہ پر عمل کرنے کے جو طریقے کتاب اور سنت سے اخذ کیے ہیں ان سب پر قرآن اور حدیث سے دلائل موجود ہیں جن پر مفصل کتابیں دستیاب ہیں۔ اس کے باوجود ائمہ نے کہا ہے کہ اگر ہمارا کوئی قول حدیث کے خلاف ہو تو حدیث پر عمل کرو اور ہمارے قول کو چھوڑ دو۔ اور ایک عام انسان کو اتنا علم نہیں ہوتا کہ وہ از خود احکام فرعیہ پر عمل کرنے کے طریقوں کو کتاب اور سنت سے نکال سکے بلکہ اس کو قرآن مجید کی تمام آیات کے معانی کا ہی علم نہیں ہوتا اور نہ اس کی نظر میں تمام احادیث ہوتی ہیں نہ ان کے معانی کا علم ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے امام کی تقلید کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جس قوم کو کمزور سمجھا جاتا تھا اس کو ہم نے اس سرزمین کے مشارق اور مغارب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں اور بنو اسرائیل پر آپ کے رب کا بھلائی پہنچانے کا وعدہ پورا ہو گیا، کیونکہ انہوں نے صبر کیا تھا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کی بنائی ہوئی عمارتوں اور ان کی چڑھائی ہوئی بیلوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ (الاعراف: ۱۳۷)

بنو اسرائیل کو شام پر قابض کرنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل سے فرمایا تھا: عنقریب تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تم کو زمین میں ان کا جانشین بنا دے گا۔ (الاعراف: ۱۲۹) اور یہاں جب اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ اس نے قوم فرعون کو سمندر میں غرق کر کے اس کو سزا دے دی ہے اور مومنین کو یہ بھلائی پہنچائی کہ ان کو برکتوں والی سرزمین کا وارث بنا دیا

فرمایا: جس قوم کو کمزور سمجھا جاتا تھا اس کو ہم نے اس سرزمین کے مشارق اور مغارب کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں۔ بنو اسرائیل کو اس لیے کمزور سمجھا جاتا تھا کہ فرعون ان کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا اور ان کی بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا اور ان سے جزیہ لیتا تھا اور ان سے سخت مشکل اور دشوار کام بہ طور بیگار کراتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کے مشارق اور مغارب کا وارث بنا دیا۔

وہ سرزمین جس کے مشرق اور مغرب میں اللہ تعالیٰ نے برکتیں رکھی ہیں اس کا مصداق کون سی زمین ہے؟

امام عبد الرزاق متوفی ۲۱۱ھ، امام ابن جریر متوفی ۳۱۰ھ اور امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ نے لکھا ہے اس سے مراد سرزمین شام ہے۔ (تفسیر امام عبد الرزاق ج ۱، ص ۳۲۱، جامع البیان جز ۹، ص ۵۸، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۵)

حافظ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے امام عبد بن حمید، امام ابن المنذر اور امام ابن عساکر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس سے مراد سرزمین شام ہے۔ (الدر المشورج ۳، ص ۵۲۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے اس سے مراد شام اور مصر ہے۔ کیونکہ مصر ہی فرعون لعنہ اللہ کے قبضہ اور تصرف میں تھا اور جس سرزمین میں اللہ تعالیٰ نے برکتیں رکھی ہیں اس کا مصداق صرف شام ہے۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۳۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

اس سرزمین سے مراد "ارض مقدسہ" ہے۔ جس کے متعلق فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ وہ بنو اسرائیل کو اس زمین میں لے جانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ سرزمین ان کے باپ دادا کا وطن ہے اور موسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے دشمن کو ہلاک کر دے گا تو وہ ان کو اس سرزمین میں لے جائیں گے جہاں ان کے باپ دادا رہتے تھے یا عمالقہ کی ہلاکت کے بعد ان کو اس سرزمین میں منتقل کر دیا جائے گا کیونکہ اس وقت وہ سرزمین عمالقہ کے قبضہ میں تھی۔ (روح المعانی جز ۹، ص ۳۷، طبع بیروت)

خلاصہ یہ ہے کہ فرعون کی ہلاکت کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو مصر میں متمکن کیا اور عمالقہ کی شکست کے بعد ان کو شام میں متمکن کر دیا اور ان کے باپ دادا کا وطن شام تھا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی ان کے آباء میں سے تھے جنہوں نے مصر میں رہائش اختیار کر لی تھی، یعنی مصر اور شام دونوں ان کے باپ دادا کے وطن تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان دونوں ملکوں کا بتدریج وارث کیا پہلے مصر کا اور پھر شام کا۔ یہ سرزمین ظاہری اور باطنی برکتوں سے مالا مال تھی۔ ظاہری برکت یہ تھی کہ یہ زمین زرخیز تھی۔ باغات کی کثرت اور پانی کی فراوانی تھی اور باطنی برکت یہ تھی کہ شام میں کثیر انبیاء کی قبریں تھیں اور مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر تھی۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی نے لکھا ہے کہ بنو اسرائیل کو سرزمین فلسطین کا وارث بنا دیا گیا تھا۔

(تفہیم القرآن ج ۲، ص ۷۳، مطبوعہ لاہور)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں:

امام ابن ابی حاتم، امام عبد بن حمید، امام ابن جریر، امام ابن المنذر، امام عبد الرزاق، امام ابو الشیخ اور امام ابن عساکر نے لکھا ہے اس سرزمین سے مراد شام ہے۔

امام ابو الشیخ نے عبد اللہ بن شوذب سے روایت کیا ہے کہ اس سے مراد سرزمین فلسطین ہے۔

سرزمین شام کی فضیلت کے متعلق احادیث

امام ابن ابی شیبہ، امام احمد، امام ترمذی، امام رویانی، امام ابن حبان، امام طبرانی اور امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے گرد بیٹھے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں پر قرآن مجید کو جمع کر رہے تھے، اچانک آپ نے فرمایا: شام کے لیے خیر اور سعادت ہو۔ آپ سے پوچھا گیا کس لیے؟ آپ نے فرمایا: رحمن کے فرشتے ان پر اپنے پر پھیلانے ہوئے ہیں۔

امام احمد، امام ابو داؤد، امام ابن حبان اور امام حاکم نے حضرت عبداللہ بن حوالہ الازدی سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عنقریب تم مختلف لشکر دیکھو گے ایک لشکر شام میں، ایک لشکر عراق میں اور ایک لشکر یمن میں۔ حضرت حوالہ نے کہا: یا رسول اللہ! میرے لیے کوئی جگہ منتخب کیجئے، آپ نے فرمایا: تم شام میں لازماً رہو اور جو وہاں نہ رہے وہ اس کی دائیں جانب رہے اور جو وہاں عمد شکنی کرے اس کو نکالے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے شام اور اہل شام کی ضمانت دی ہے۔

امام ابن عساکر نے واثلہ بن الاسقع سے روایت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم شام میں لازماً رہو وہ اللہ کے شہروں میں سب سے زیادہ فضیلت والا ہے، اس میں اللہ کے سب سے زیادہ نیک بندے رہتے ہیں اور جو وہاں نہ رہ سکے وہ اس کی دائیں جانب رہے اور جو وہاں عمد شکنی کرے اس کو نکالے۔ کیونکہ اللہ نے مجھے شام اور اہل شام کی ضمانت دی ہے۔

امام حاکم نے سند صحیح کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ ہر ایمان والا شام میں چلا جائے گا۔

امام ابن ابی شیبہ نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رعد، برق اور برکتیں شام کی طرف ہجرت کریں گی۔

امام ابن ابی شیبہ نے کعب سے روایت کیا ہے کہ تمام شہروں میں اللہ کا محبوب شہر شام ہے اور شام میں محبوب قدس ہے اور قدس میں محبوب نابلس پہاڑ ہے۔

امام احمد اور امام ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اے اللہ ہمارے شام اور یمن میں برکت دے۔ مسلمانوں نے کہا: اور ہمارے نجد میں، آپ نے فرمایا: وہاں زلزلے اور فتنے ہوں گے اور وہیں سے شیطان کا سینگھ طلوع ہوگا۔ (الدر المنثور ج ۳، ص ۵۳۰-۵۲۸، مطبوعہ دار الفکر، بیروت ۱۴۱۳ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے بنو اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا تو وہ ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرے جو جنوں کے سامنے آسن جمائے (معتکف) بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا معبود بنا دیجئے جیسے ان کے معبود ہیں، موسیٰ نے کہا: بے شک تم جہالت کی باتیں کرتے ہو، بے شک جس کام میں یہ لوگ مصروف ہیں وہ برباد ہونے والا ہے اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ سراسر غلط ہے، موسیٰ نے کہا: کیا میں اللہ کے سوا تمہارے لیے کوئی اور معبود تلاش کروں؟ حالانکہ اس نے تمہیں (اس زمانہ میں) سب جہان والوں پر فضیلت دی ہے،

اور (یاد کرو اے بنو اسرائیل!) جب ہم نے تم کو فرعون کے متبعین سے نجات دے دی، جو تم کو برا عذاب دیتے تھے، وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت سخت آزمائش تھی، (الاعراف: ۱۳۱-۱۳۸)

مشکل اور اہم الفاظ کے معانی

جاوزنا: اس کا معنی ہے عبور کرنا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونا۔ اس آیت میں بائے تعدیہ ہے اس لیے اس کا معنی ہے عبور کرنا۔

بعکفون: مکوف کا معنی ہے کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا اور بہ طور تعظیم کے اس کو لازم پکڑ لینا۔ الاعتکاف کا شرعی معنی ہے عبادت کی نیت سے مسجد میں قیام کرنا۔

اصنام: چاندی، پتیل یا کسی اور دھات سے یا مٹی یا لکڑی سے بنایا ہوا مجسمہ۔ مشرکین تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے۔ یہ مجسمہ کبھی کبھی انسان کی واقعی صورت کے مطابق بنایا جاتا ہے اور کبھی خیالی صورت کے مطابق بنایا جاتا ہے جیسے حضرت ابراہیم، حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے خیالی مجسمے بنائے گئے ہیں۔ عبادت کی نیت سے ان کی تعظیم کرنا شرک ہے اور صرف تعظیم کے لیے یہ مجسمے یا تصاویر رکھنا حرام ہے جیسے بعض لوگ علماء اور مشائخ کی تصویریں تبرک اور تعظیم کی نیت سے رکھتے ہیں۔ بعض لوگ زینت (ڈیکوریشن) کے نیت سے انسانوں اور جانوروں کے مجسمے رکھتے ہیں یہ عمل بھی حرام ہے۔

الہ: معبود۔

مناسبت اور ربط آیات

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ہلاک کر دیا اور ان کی زمین کا ان کو وارث بنا دیا۔ اس کے بعد ایک بہت بڑی نعمت کا ذکر فرمایا اور وہ یہ ہے کہ ان کو سلامتی کے ساتھ سمندر سے گزار دیا اور دوسری سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے اس کی کیفیت بیان فرمائی ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر اپنا عصا مارا تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو چیر دیا اور بنو اسرائیل کے لیے اس کو خشک راستہ بنا دیا اور جب وہ سمندر کے پار پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک قوم بتوں کی عبادت کر رہی ہے تو انہوں نے جہالت سے کہا: اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا معبود بنا دیجئے جیسے ان کے معبود ہیں۔

بنو اسرائیل نے کون سا سمندر پار کیا تھا اور کس جگہ کسی قوم کو بتوں کی عبادت کرتے ہوئے دیکھا تھا؟

جس قوم کے پاس سے بنو اسرائیل کا گزر ہوا تھا اس کے متعلق امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں:

قنادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا: یہ قوم لخم تھی۔ اور ایک قول یہ ہے کہ یہ کنعانیوں کی قوم تھی جس کے خلاف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتال کا حکم دیا گیا تھا۔ (جامع البیان جزء ۹، ص ۶۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

جس سمندر کو بنو اسرائیل نے عبور کیا تھا اس کا نام ”بحر قلزم“ ہے۔ علامہ طبری نے مجمع البیان میں لکھا ہے کہ یہ دریائے نیل تھا لیکن یہ غلط ہے جیسا کہ البحر المحیط میں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دس محرم کو یہ سمندر عبور کیا تھا اور فرعون اور اس کا لشکر ہلاک ہو گیا تھا۔ اور بنو اسرائیل اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔

(روح المعانی جزء ۹، ص ۴۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

شیخ محمد حفظ الرحمن سیوہاری لکھتے ہیں:

بنو اسرائیل نے بحر قلزم کو پار کر کے جس سرزمین پر قدم رکھا یہ عرب کی سرزمین تھی جو قلزم کے مشرق میں واقع ہے۔

تبیان القرآن

جلد چہارم

یہ لقی و دق بے آب و گیہ میدان سے شروع ہوتی ہے جو تورات کی زبان میں بیابان شور، سین، وادی سینا (تیب) کے نام سے مشہور ہے اور طور تک اس کا دامن وسیع ہے۔ یہاں شدید گرمی پڑتی ہے اور دور دور تک سبزہ اور پانی کا پتا نہیں۔

اس بات کا قطعی فیصلہ تو ناممکن ہے کہ وہ خاص مقام متعین کیا جاسکے جس سے بنی اسرائیل گزرے اور سمندر کو عبور کر گئے تاہم قرآن اور تورات کی مشترک تصریحات و نصوص سے یہ متعین کیا جاسکتا ہے کہ بنو اسرائیل نے بحر قلزم (بحر احمر Red Sea) کے کسی کنارے اور دہانہ سے عبور کیا یا درمیانی کسی حصہ سے۔ بحر احمر دراصل بحر عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمین عرب واقع ہے اور مغرب میں مصر۔ شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں ایک شاخ (خلیج عقبہ) جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں اور دوسری (خلیج سوز) اس کے مغرب میں واقع ہے۔ یہ دوسری شاخ پہلی سے بڑی ہے اور شمال میں بڑی دور تک چلی گئی ہے بنو اسرائیل اسی کے درمیان سے گزرے ہیں۔ اس شاخ کے شمالی دہانہ کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے جس کا نام بحر روم ہے اور بحر روم اور بحر احمر کے اس شمالی دہانہ کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے۔ یہی وہ راستہ تھا جہاں مصر سے فلسطین اور کنعان جانے والے کو بحر احمر عبور کرنا نہیں پڑتا تھا اور اس زمانہ میں یہ راہ قریب کی سمجھی جاتی تھی اور بنو اسرائیل نے بحکم الہی یہ راہ اختیار نہیں کی تھی۔ اب اس خشک زمین کو کھود کر بحر احمر کو بحر روم سے ملا دیا گیا ہے اور اس ٹکڑے کا نام نهر سوز ہے اور بحر احمر کے شمالی دہانہ پر سوز کے نام سے ایک شہر آباد ہے جو مصر کی بندرگاہ شمار ہوتا ہے۔

(نقص القرآن ج ۱، ص ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، مطبوعہ دارالاشاعت، کراچی)

سید ابوالاعلیٰ مودودی متونی ۱۳۹۹ھ لکھتے ہیں:

بنو اسرائیل نے جس مقام سے بحر احمر کو عبور کیا وہ غالباً موجودہ سوز اور اسماعیلیہ کے درمیان کوئی مقام تھا۔ یہاں سے گزر کر یہ لوگ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقے کی طرف ساحل کے کنارے روانہ ہوئے، اس زمانہ میں جزیرہ نمائے سینا کا مغربی اور شمالی حصہ مصر کی سلطنت میں شامل تھا۔ جنوب کے علاقہ میں موجودہ شہر طور اور ابو زہیمہ کے درمیان تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں جن سے اہل مصر بہت فائدہ اٹھاتے تھے اور ان کانوں کی حفاظت کے لیے مصریوں نے چند مقامات پر چھاؤنیاں قائم کر رکھی تھیں۔ انہی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی مقعہ کے مقام پر تھی جہاں مصریوں کا ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جس کے آثار اب بھی جزیرہ نمائے جنوب مغربی علاقہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے قریب ایک اور مقام بھی تھا جہاں قدیم زمانہ سے سامی قوموں کی چاند دیوی کا بت خانہ تھا۔ غالباً انہی مقامات میں سے کسی کے پاس سے گزرتے ہوئے بنی اسرائیل کو جن پر مصریوں کی غلامی نے مصرت زدگی کا چھا خاصہ گہرا ٹھپہ لگا رکھا تھا، ایک مصنوعی خدا کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی۔

(تفہیم القرآن ج ۲، ص ۷۵-۷۴، مطبوعہ لاہور، ۱۳۰۲ھ)

شرک کے فعل کا جہالت اور حماقت ہونا

بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا "ہمارے لیے بھی ایک ایسا معبود بنا دیجئے جیسے ان کے معبود ہیں" یہ چیز بدہمت عقل کے خلاف ہے کہ جس چیز کو حضرت موسیٰ علیہ السلام بنائیں وہ حضرت موسیٰ کا بنو اسرائیل کا اور تمام جہان کا خالق اور مدبر ہو کیونکہ جو اپنے بننے میں حضرت موسیٰ کا محتاج ہو وہ ان کا اور تمام جہان کا محتاج الیہ اور خالق کیسے ہو سکتا ہے؟ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تم کیسی جہالت اور بے عقلی کی باتیں کرتے ہو۔ عبادت انتہائی تعظیم کو کہتے ہیں اور انتہائی تعظیم کا مستحق وہ ہے جس نے انتہائی انعام کیا ہو اور جو اپنے وجود میں غیر کا محتاج ہو اس میں کسی پر انعام کرنے کی استطاعت کہاں سے ہوگی اور جن لوگوں کو تم بتوں کی عبادت کرتے ہوئے دیکھ رہے ہو ان کے انفعال تباہ و برباد ہونے والے ہیں اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں وہ سب غلط اور باطل ہے۔

بنو اسرائیل کی ناشکری اور احسان فراموشی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل کی بتوں کی فرمائش کے جواب میں پہلے فرمایا: اپنے ہاتھوں سے اپنا خدا بنا جہالت کی بات ہے۔ پھر فرمایا: جن کو دیکھ کر تم فرمائش کر رہے ہو وہ سب تباہ و برباد ہونے والے ہیں۔ پھر تیسری بار فرمایا جو کچھ یہ بت پرست قوم کر رہی ہے وہ سراسر غلط ہے اور چوتھی بار ان کی حماقت پر تعجب کرتے ہوئے فرمایا: کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں؟ حالانکہ اس نے تم کو (اس زمانہ میں) سب پر فضیلت دی ہے یعنی اللہ نے تم پر یہ احسان کیا کہ اس نے تم کو سب جہانوں پر فضیلت دی اور تم اس کا جواب اس احسان فراموشی کے ساتھ دے رہے ہو کہ اللہ کو چھوڑ کر پتھر کی بنائی ہوئی صورتوں کی پرستش کرنا چاہتے ہو! بنو اسرائیل کی فضیلت یہ تھی کہ ان کے دین کو ثابت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتنے کثیر اور قوی معجزات ظاہر فرمائے جو اس سے پہلے کسی کے لیے ظاہر نہیں کیے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک اور اہم اور بڑی نعمت اور احسان کا ذکر کیا جبکہ انہیں فرعون اور اس کی قوم کی غلامی سے نجات دلائی جو کئی سو سالوں سے ان پر طرح طرح کے ظلم کر رہے تھے۔ سو فرمایا: اور یاد کرو (اے بنو اسرائیل!) جب ہم نے تم کو فرعون کے متبعین سے نجات دے دی جو تم کو برا عذاب دیتے تھے، وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت سخت آزمائش تھی۔ سو کتنے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ جیسے ہی تم فرعون سے نجات پا کر سلامتی سے سمندر پار پہنچے اور آزاد فضا میں سانس لیا تو تم اللہ کا ان نعمتوں پر شکر کرنے کے بجائے اس کی عبادت میں شریک بنانے کے لیے فرمائشیں کرنے لگے واضح رہے کہ بت پرستی کے لیے معبود بنانے کا مطالبہ تمام اسرائیلیوں نے نہیں کیا تھا بلکہ بعض ناشکروں نے کیا تھا۔

کسی مسلمان موحّد کو مشرک قرار دینے کا بطلان

بعض لوگ مطلقاً یا رسول اللہ اکہنے کو شرک کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام سے مدد مانگنے کو بھی مطلقاً شرک کہہ دیتے ہیں اور نبی ﷺ کو حاضر ناظر یا آپ کے حق میں علم غیب کو بھی مطلقاً شرک کہہ دیتے ہیں حالانکہ شرک اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبی ﷺ اللہ کی عطا کے بغیر از خود اپنی طاقت سے سنتے ہیں، از خود اللہ کے اذن کے بغیر مدد کرتے ہیں، آپ خود موجود اور بصیر ہیں اور آپ کو از خود علم حاصل ہے اور اگر آپ اللہ کی دی ہوئی طاقت سے ان اوصاف سے متصف ہوں تو شرک کیسے ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو بنو اسرائیل کو اس وقت بھی مشرک نہیں کہا جب وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دیں جس کی ہم عبادت کریں۔ حالانکہ اس سے بڑا شرک اور کیا ہوگا بلکہ صرف یہی فرمایا تم کیسی جہالت کی باتیں کرتے ہو! اور یہ لوگ یا رسول اللہ اکہنے والے کلمہ گو مسلمانوں کو مشرک کہتے ہیں حالانکہ جو مسلمان کلمہ پڑھتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا بندہ کہتے ہیں وہ آپ کے متعلق یہ کیسے عقیدہ رکھ سکتے ہیں کہ آپ از خود سنتے ہیں یا از خود جانتے ہیں بلکہ وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپ کے تمام اوصاف اور کمالات عطائی ہیں۔ اس پر کسی نے یہ معارضہ کیا کہ پھر تو آپ کو عطائی خدا اکنا بھی صحیح ہوگا لیکن یہ محض مغالطہ آفرینی ہے کیونکہ خدا قدیم اور واجب الوجود ہوتا ہے وہ عطائی نہیں ہو سکتا۔ اس کے برخلاف علم، قدرت اور اختیار عطائی ہو سکتے ہیں اور ہیں، ہمیں علم اور اختیار ہماری حیثیت سے عطا کیا گیا اور انبیاء علیہم السلام کو ان کے مقام کے اعتبار سے علم اور اختیار عطا کیا گیا ہے۔

وَعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَّمْنَا فِيهَا وَعْدَنَا بِمِيقَاتِ

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا، پھر اس میں دس راتوں کا اضافہ کیا سو آپ کے رب کی مقررہ مدت

رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً ۖ وَقَالَ مُوسَى لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي

مکمل چالیس راتیں ہو گئی ، اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا تم میری قوم میں میری

فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿۱۲۴﴾ وَلَمَّا جَاءَ

جائینی کرنا اور ٹھیک ٹھیک کام کرنا اور مفسدوں کے طریقہ پر کار بند نہ ہونا ○ اور جب موسیٰ ہمارے

مُوسَى لِيُقَابِلَنَا وَكَلَّمَ رَبُّهُ قَالَ رَبِّ أِمْرِئِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ ۗ

مقرر کیے ہوئے وقت پر آئے ، اور ان کے رب نے ان سے کلام فرمایا تو عرض کیا اے میرے رب! مجھے اپنی ذات دکھا کہ میں تجھے دیکھوں

قَالَ لَنْ تَرِيَنِي وَلَكِنْ أَنْظُرْ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ

فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے البتہ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر (میری تجلی کے باوجود) یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو عنقریب تم

فَسَوْفَ تَرِيَنِي ۖ فَلَمَّا تَجَلَّىٰ رَبُّهُ لِلْجَبَلِ جَعَلَهُ دَكًّا وَخَدَّ

مجھے دیکھ سکو گے ، پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش

مُوسَى صَبَعًا ۖ فَلَمَّا أَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا

ہو کر گر پڑے ، پھر جب ان کو ہوش آیا تو کہا تو پاک ہے میں نے تیرے حضور توبہ کی اور میں

أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۲۵﴾ قَالَ يَمُوسَىٰ إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ

ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں ○ فرمایا اے موسیٰ! میں نے تم کو لوگوں پر اپنے پیغامات اور اپنے کلام

بِرِسَالَتِي وَبِكَلَامِي ۖ فَخُذْ مَا آتَيْتُكَ وَكُن مِّنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۲۶﴾

سے نصیحت دی ، پس میں نے تم کو جو کچھ دیا ہے وہ لے لو اور شکر ادا کرنے والوں میں سے ہو جاؤ ○

وَكَتَبْنَاكَ فِي الْأَنْوَٰرِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ

اور ہم نے ان کے لیے (تورات کی) تختیوں میں ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی تھی ،

شَيْءٍ مِّنْ فَخْرٍ قُوَّةٍ وَأَمَرَ قَوْمَكِ يَا خُدَّاءِ بِأَحْسَنِهَا سَأُوْرِكُمْ

سو ان تختیوں کو قوت کے ساتھ پکڑو ، اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اس کی بہترین باتوں پر عمل کریں ، عنقریب میں تم کو

ذَارِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ سَاۡمِرْفٌ عَنِ اٰیٰتِي الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي

فاسقوں کا گھر دکھاؤں گا ○ میں عنقریب ان لوگوں (کے دلوں) کو اپنی آیات سے پھیر دوں گا جو زمین

الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَا يُؤْمِنُوْا بِهَا وَاِنْ

میں ناحق تبصر کرتے ہیں ، وہ اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ایمان نہیں لائیں گے اور اگر وہ

يَّرُوْا سَبِيْلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا وَاِنْ

ہدایت کا راستہ دیکھ لیں پھر بھی اس کو اختیار نہیں کریں گے ، اور اگر وہ

يَّرُوْا سَبِيْلَ الْغٰیِّ يَتَّخِذُوْهُ سَبِيْلًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِآٰیٰتِنَا

گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس راستہ کو اختیار کر لیں گے ، کیوں کہ انہوں نے ہمیشہ ہماری آیتوں کی تکذیب کی

وَكَانُوْا عٰتٰی غٰفِلِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِآٰیٰتِنَا وَلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ

اور وہ ان سے اعراض کرنے والے تھے ○ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں اور آخرت کی پیشی کی تکذیب کی

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ الْاٰمَانَ كَاۡنُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۷﴾

ان کے سب (نیک) عمل ضائع ہو گئے ، ان کو ان ہی کاموں کی سزا ملے گی جو وہ کیا کرتے تھے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا پھر اس میں دس راتوں کا اضافہ کیا۔ سو آپ کے رب کی مقررہ مدت مکمل چالیس راتیں ہو گئی اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا اور ٹھیک ٹھیک کام کرنا اور مفسدوں کے طریقہ پر کاربند نہ ہونا (الاعراف: ۱۴۲)

رابط آیات مناسبت اور موضوع

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا مثلاً ان کو فرعون کی غلامی اور اس کے بے گار لینے سے نجات دی اور ان کو مستقل امت بنایا اور ان کے دین کو ثابت کرنے کے لیے اتنے کثیر معجزات ظاہر فرمائے جو اس سے پہلے کسی امت کے لیے ظاہر نہیں فرمائے تھے۔ اور اس آیت میں ان پر تورات کے نزول کا بیان ہے جس میں ان کی زندگی کے لیے دستور العمل تھا اور اللہ تعالیٰ کے احکام تھے جن پر انہوں نے عمل کرنا تھا۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں بنو اسرائیل سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ ان کے دشمن کو ہلاک کر دے گا تو وہ ان کے پاس اللہ کی کتاب لائیں گے جس میں یہ بیان ہو گا کہ ان پر کیا کام کرنے فرض ہیں اور کیا کام ان کے لیے ممنوع ہیں۔ اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات کتنے دنوں کے بعد مقرر کی گئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ اور نائب بنانے کا ذکر ہے۔

حضرت موسیٰ کے لیے پہلے تیس راتیں اور پھر دس راتیں مزید مقرر کرنے کی حکمت

امام عبدالرحمن بن محمد بن ادريس ابن ابی حاتم الرازی المتوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنو اسرائیل سے فرمایا: حضرت ہارون کی اطاعت کرنا کیونکہ میں نے ان کو تم پر اپنا جانشین (خلیفہ) مقرر کر دیا ہے، میں اپنے رب کے پاس جا رہا ہوں، اور ان کو بتایا کہ میں تیس دن کے بعد واپس آ جاؤں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تیس دن روزے رکھے انہوں نے اس بات کو ناپسند کیا کہ وہ اپنے رب سے ہم کلام ہوں اور ان کے منہ سے بو آرہی ہو (روزہ رکھنے سے منہ سے ایک خاص قسم کی بو آتی ہے) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زمین سے گھاس اٹھا کر اس سے اپنے منہ کو صاف کیا اور گھاس کو چبایا۔ جب اللہ تعالیٰ کے پاس گئے تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا تم نے روزہ کیوں افطار کیا (گھاس کیوں چبائی) حالانکہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا خوب علم ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! میں نے اس چیز کو ناپسند کیا کہ میں تجھ سے اس حال میں کلام کروں کہ میرے منہ سے بو آرہی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! کیا تم نہیں جانتے کہ روزہ دار کے منہ کے بو مجھے مشک سے زیادہ پسند ہے۔ اب واپس جاؤ اور دس روزے مزید رکھو پھر میرے پاس آنا، سو حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تیس راتوں سے مراد ذوالقعدہ کا مہینہ ہے اور بعد میں جو دس دن زیادہ کیے، ذوالحجہ کے دس دن ہیں۔

(تفسیر ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۵۶، مطبوعہ مکتبہ المکرمہ، جامع البیان جز ۹، ص ۲۳۷)

بعض علماء نے اس روایت سے اختلاف کیا ہے۔ کیونکہ احادیث صحیحہ میں مسواک کی بہت فضیلت ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر مجھے مسلمانوں پر دشوار نہ ہوتا تو میں انہیں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔ (صحیح مسلم، اللہارۃ ۳۲، (۲۵۲) ۵۷۸) اور حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دس چیزیں فطرت (سنت) سے ہیں اور ان دس چیزوں میں آپ نے مسواک کا ذکر فرمایا۔ (صحیح مسلم، اللہارۃ ۵۶، (۲۶۱) ۵۹۳) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مسواک سے منہ کی پاکیزگی ہوتی ہے اور رب راضی ہوتا ہے۔ (صحیح البخاری: ۱۹۳۳) اس لیے مسواک کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ روزے رکھنے کا حکم دینا بہ ظاہر محل نظر ہے۔

اب پھر یہ سوال ہو گا کہ تیس راتوں کے بعد الگ سے دس دنوں کو ذکر کرنے کی کیا توجیہ ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ ابتداء چالیس راتوں کا ذکر فرماتا، پہلے تیس راتوں کے وعدہ کا ذکر فرمایا پھر اس کے بعد دس راتوں کا اضافہ فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ چالیس راتوں کی مدت مکمل ہو گئی۔ اس کی حسب ذیل توجیہات ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تیس راتوں اور دنوں میں روزے رکھنے کا حکم دیا اور ان ایام میں عبادت کرنے کا حکم دیا، پھر باقی دس دنوں میں تورات نازل کی گئی اور ان ہی ایام میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوا۔

۲- حضرت موسیٰ علیہ السلام تیس راتیں پوری کر کے پہاڑ طور پر گئے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ سامری نے ان کی قوم کو شرک میں مبتلا کر دیا ہے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اس میعاد کو پورا کرنے سے پہلے اپنی قوم کی طرف واپس گئے پھر دوبارہ واپس آئے اور دس دن کے روزے رکھے۔

۳- یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلی تیس دن کی مدت صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہو اور بعد کے دس دن کی مدت ان ستر منتخب اسرائیلیوں کے لیے ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ طور پر گئے تھے۔ اس کا تفصیلی ذکر الاعراف: ۱۵۵ میں

آئے گا۔

میقات کا معنی اور کسی کام کی مدت مقرر کرنے کی اصل

اس آیت میں فرمایا ہے حضرت موسیٰ کے رب کا میقات چالیس راتوں میں مکمل ہو گیا۔ علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے جس وعدہ کو پورا کرنے کے لیے کوئی وقت مقرر کیا گیا ہو اس کو میقات کہتے ہیں۔ اس طرح کسی کام کے وقت کے لیے جو جگہ متعین کی گئی ہو اس کو بھی میقات کہتے ہیں۔ جیسے حج کے مواقیت ہیں۔ (المفردات، ج ۲، ص ۶۸۶، طبع مکہ مکرمہ)

ہمارے علماء نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ کسی وعدہ کی تکمیل کے لیے مدت مقرر کرنا قدیم طریقہ ہے۔ اسی طرح کسی کام کے لیے مدت مقرر کرنا بھی قدیم طریقہ اور اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کو بنانے کے لیے چھ دنوں کی مدت مقرر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ
اور بے شک ہم نے آسمانوں اور زمینوں کو اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہم کو اس سے بالکل تھکاوٹ نہیں ہوئی۔ (ق: ۳۸)

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک مدت مقرر کرنے کے بعد اس میں اضافہ کرنا بھی جائز ہے اور حاکم کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک مدت کے بعد دوسری مدت مقرر کر سکتا ہے۔

بندوں کے اعذار کی آخری مدت ساٹھ سال ہے

اللہ تعالیٰ نے بندوں کی لغزشوں سے درگزر کرنے کی بھی ایک مدت مقرر کر دی ہے اور اس مدت کے بعد اس کی لغزشوں پر کوئی عذر قبول نہیں فرماتا۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص کی اجل کو اللہ تعالیٰ نے ساٹھ سال تک پہنچادیا ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کے تمام اعذار (بہانوں) کو زائل کر دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۳۱۹، مسند احمد ج ۳، رقم الحدیث: ۸۶۵۳)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد انسان کا کوئی عذر باقی نہیں رہا کہ وہ یہ کہہ سکے کہ اگر میری عمر زیادہ کر دی جاتی تو میں اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر لیتا اور جب کہ وہ اب عذر کی انتہا کو پہنچ چکا ہے تو اب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کے لیے اس کا کوئی عذر باقی نہیں رہا جبکہ وہ جو عمر گزار چکا ہے اس میں وہ اللہ کی عبادت اور اس کے احکام کی اطاعت پر قادر تھا۔ سو اس کو چاہیے کہ اب وہ اللہ تعالیٰ سے صرف استغفار کرے اور اس کے احکام کی اطاعت کرے اور آخرت کی طرف بالکل متوجہ ہو جائے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے لیے اب کوئی عذر اور بہانہ نہیں چھوڑا۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر اپنی حجت پوری کرنے کے بعد ان کا مواخذہ فرماتا ہے۔

معمر کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو ساٹھ یا ستر سال کی عمر تک مہلت دیتا ہے اور جب وہ اس عمر کو پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعذار کو زائل کر دیتا ہے۔ یعنی اس عمر کے بعد اب ترک اطاعت پر کوئی عذر کارگر نہیں ہوگا۔

علامہ ابن بطلان نے کہا کہ ساٹھ سال کی عمر کو اس لیے حد مقرر فرمایا ہے کہ یہ انسان کی عادت غالب عمر کے قریب ہے۔ اور

یہ وہ عمر ہے جس میں انسان اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے ڈرتا ہے اور موت کے انتظار میں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بندہ کو بار بار موقع عطا فرماتا ہے اور یہ اللہ سبحانہ کا بندوں پر لطف اور کرم ہے حتیٰ کہ وہ ان کو حالت جہل سے حالت علم کی طرف منتقل کرتا ہے۔ پھر ان کو مہلت دیتا ہے حتیٰ کہ واضح حجّتوں کے بعد ان سے مواخذہ نہیں فرماتا۔ ہر چند کہ انسانوں کی فطرت میں دنیا سے محبت کرنا اور لمبی امیدیں رکھنا ہے لیکن ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے نفسوں سے مجاہدہ کریں اور اللہ تعالیٰ نے جن نیک کاموں کا حکم دیا ہے وہ کام کریں اور جن برے کاموں سے روکا ہے ان سے باز رہیں۔ اور اس حدیث میں یہ اشارہ ہے کہ جب انسان ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ جائے تو اس کی موت آنے کا غالب گمان ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کی عمریں ساٹھ سے ستر سال تک ہوں گی اور بہت کم ستر سال سے تجاوز کریں گے۔ بعض حکماء نے یہ کہا ہے کہ انسان کی عمر کے چار ادوار ہیں۔ (۱) بچپن (۲) جوانی (۳) ادھیڑ عمر (۴) بڑھاپا اور یہ عمر کا آخری دور ہے اور زیادہ تر یہ دور ساٹھ اور ستر سال کی عمر میں ہوتا ہے اور اس وقت انسان کی جسمانی قوت ضعف اور انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے اور اب اس کو چاہیے کہ وہ بالکلہ آخرت کی طرف متوجہ ہو جائے کیونکہ اب وہ قوت اور نشاط کی پہلی حالت کی طرف نہیں لوٹ سکتا اور اسی حدیث سے علماء شافعیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ جو شخص ساٹھ سال کی عمر کو پہنچ گیا پھر بھی اس نے قدرت اور استطاعت کے باوجود حج نہیں کیا تو وہ گنہ گار ہو گا اور اگر اس سے پہلے قدرت کے باوجود تاخیر کی تو وہ گنہ گار نہیں ہو گا۔ (فتح الباری ج ۱۱، ص ۲۳۰، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

امام مالک نے کہا ہمارے شہر کے علماء چالیس سال تک لوگوں سے مل جل کر رہتے ہیں اور دنیا کو طلب کرتے ہیں اور چالیس سال کے بعد وہ ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۸، ص ۲۳۹، دار الفکر، ۱۴۱۵ھ)

شمسی اور قمری تاریخ مقرر کرنے کا ضابطہ

یہ آیت اس پر بھی دلالت کرتی ہے کہ تاریخ کا اعتبار دنوں کی بجائے راتوں سے کرنا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ثلاثین لیلۃ "تیس راتیں" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قمری مہینہ کی ابتداء رات سے ہوتی ہے۔ صحابہ کرام کا بھی یہی معمول تھا اور عجمیوں کا معمول اس کے خلاف ہے، کیونکہ وہ تاریخ کا اعتبار شمسی مہینوں سے کرتے ہیں۔ علامہ ابن العربی نے کہا: دنیاوی امور اور منافع میں شمسی مہینوں کا حساب جائز ہے اور عبادات اور شرعی احکام میں قمری مہینوں کے حساب سے تاریخیں مقرر کرنا واجب ہے۔

حضرت ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنانا اور ان کو نصیحت فرمانا ان کی شان میں کمی کا موجب نہیں اس کے بعد فرمایا: اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا تم میری قوم میں میری جانشینی کرنا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر جا کر اللہ تعالیٰ سے مناجات کا ارادہ کیا تو اپنے فرائض حضرت ہارون علیہ السلام کو سونپ دیے۔ اس آیت میں کسی کو اپنا نائب بنانے کی اصل ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نبوت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شریک تھے تو انہوں نے حضرت ہارون کو اپنا خلیفہ کیسے بنایا! کیونکہ جو شخص کسی انسان کا شریک ہو وہ اس کے خلیفہ سے بڑے مرتبہ کا ہوتا ہے اور کسی انسان کو بڑے مرتبہ سے کم مرتبہ پر مقرر کرنا اس کی توہین ہے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو خلیفہ بنانا کس طرح جائز ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قاعدہ یہی ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نبوت میں اصل تھے کیونکہ پہلے ان کو نبی بنایا گیا اور ان کی دعا سے حضرت ہارون کو نبی بنایا گیا اور وہ ان کے وزیر تھے اور فرعون اور بنو اسرائیل کے ساتھ تمام معاملات میں حضرت موسیٰ ہی کو خطاب کیا گیا، ان ہی سے کلام کیا گیا اور ان ہی پر کتاب نازل کی گئی ان ہی

کو معجزات عطا کیے گئے اور فرعون اور قبطیوں کے نزدیک وہی مسئول تھے اور رشد و ہدایت کا کام اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر بنو اسرائیل سے عمل کرانا حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے ذمہ تھا۔ اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنانے کا معنی یہ تھا کہ بنو اسرائیل کی رشد و ہدایت کے سلسلہ میں جو فرائض منصبی موسیٰ علیہ السلام انجام دیتے تھے وہ اب حضرت ہارون علیہ السلام نے انجام دینے ہیں اور اس معنی میں ان کو اپنا خلیفہ بنانے سے ان کے مرتبہ میں ہرگز کمی نہیں ہوئی۔

نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام سے فرمایا:

”اور ٹھیک ٹھیک کام کرنا اور مفسدوں کے طریقہ پر کاربند نہ ہونا۔“

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نبی تھے اور نبی ٹھیک ٹھیک کام ہی کرتا ہے اور مفسدوں کی پیروی نہیں کرتا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام سے اس طرح کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بہ طور تاکید فرمایا تھا یا پھر بہ طور تعریض تھا یعنی صراحتاً حضرت ہارون کو خطاب تھا اور اشارتاً اپنی قوم سے خطاب تھا۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ (ہود: ۱۱۲)

سو آپ اسی طرح قائم رہیں جس طرح آپ کو حکم دیا گیا ہے۔

نبی ﷺ نبی معصوم ہیں، آپ سے یہ متصور نہیں ہے کہ آپ اللہ کے حکم کے خلاف کوئی کام کریں۔ اس لیے یہ ارشاد بھی تاکید اور تعریض کے طور پر ہے۔ اسی طرح اس آیت میں فرمایا:

وَلَيْسَ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ (البقرہ: ۱۳۵)

اور اگر آپ نے (بالفرض) علم آنے کے بعد بھی ان کی خواہشات کی پیروی کی تو بے شک آپ کا شمار ضرور ظالموں میں سے ہو گا۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

لَيْسَ أَشْرَكَتَ لِيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○ (الزمر: ۶۵)

اگر (بالفرض) آپ نے (بھی) شرک کیا تو آپ کے عمل ضائع ہو جائیں گے اور آپ ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

آپ سے یہ متصور ہے کہ آپ یہودیوں کی پیروی کریں نہ یہ متصور ہے کہ آپ شرک کریں کیونکہ آپ نبی معصوم ہیں۔ اس کے باوجود آپ کو ان دونوں کاموں سے بہ طور تاکید منع فرمایا یا پھر خطاب آپ کو فرمایا اور مراد آپ کی امت ہے۔ اسی سبب پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے انہوں نے حضرت ہارون سے بہ طور تاکید یا بہ طور تعریض کلام فرمایا۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے حضرت علیؑ بہ منزلہ ہارون ہیں امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو (مدینہ میں اپنا) خلیفہ بنایا۔ حضرت علی نے کہا: یا رسول اللہ! آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں خلیفہ بنا رہے ہیں! آپ نے فرمایا: کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے! البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔

(صحیح مسلم، فضائل الصحابہ: ۳۱ (۲۳۰۳) ۶۱۰۱، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۳۱۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷۵۲، السنن الکبریٰ للنسائی ج ۳ رقم الحدیث: ۸۳۳۵، مسند احمد ج ۱، ص ۱۸۵)

حدیث مذکور سے روافض کا حضرت علی کی خلافت بلا فصل پر استدلال

اس حدیث سے روافض، امامیہ اور شیعہ کے تمام فرقوں نے اس پر استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بنی اللہ کو تمام امت پر اپنا خلیفہ بنا دیا تھا۔ اور اس بنا پر روافض نے تین کے سوا تمام صحابہ کی تکفیر کر دی، کیونکہ صحابہ کرام نے اس نص صریح کو چھوڑ کر اپنے اجتہاد سے حضرت علی بنی اللہ کے غیر کو خلیفہ بنا دیا۔

چوتھی صدی کے مشہور شیعہ عالم شیخ ابو عمرو محمد بن عمر بن عبد العزیز کشی لکھتے ہیں:

ابو جعفر علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد تین شخصوں کے سوا سب مرتد ہو گئے تھے۔ میں نے پوچھا: وہ تین شخص کون ہیں؟ انہوں نے کہا: مقداد بن اسود، ابوذر غفاری اور سلمان فارسی۔ (رجال کشی، ص ۱۲، مطبوعہ ایران) اور شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی رازی متوفی ۳۲۸ھ روایت کرتے ہیں:

عبدالرحیم قصیر بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو جعفر علیہ السلام سے کہا کہ جب ہم لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ سب لوگ مرتد ہو گئے تھے تو لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا اے عبدالرحیم! رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد سب لوگ دوبارہ جاہلیت کی طرف لوٹ گئے تھے۔ (الروضہ من الکافی (فروع کافی ج ۸) ص ۲۹۶، مطبوعہ طهران ۱۳۶۲ھ)

اور جن لوگوں نے تمام امت اور خصوصاً تمام صحابہ کی تکفیر کی ان کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید صحابہ کرام کے نقل کرنے اور جمع کرنے سے ثابت ہے اگر یہ ناقلین کافر تھے تو ان کی نقل پر بھی اعتماد نہیں ہوگا۔ نیز تمام احادیث بھی ان ہی صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہیں، اگر یہ کافر تھے تو تمام احادیث بھی غیر معتبر قرار پائیں گی اور جب قرآن اور حدیث دونوں غیر معتبر اور غیر معتمد قرار پائے تو شریعت بالکل باطل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کی حجت بندوں پر قائم نہ رہی۔

روافض کے استدلال مذکور کا جواب

اور اس حدیث سے ان کا حضرت علی کی تمام امت پر خلافت کا استدلال کرنا باطل ہے۔ کیونکہ نبی ﷺ نے ایک خاص معاملہ میں ایک خاص وقت کے لیے حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنایا تھا جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک خاص وقت تک کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنایا تھا اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی مناجات سے واپس آگئے تو حضرت ہارون اپنی سابق حالت پر لوٹ آئے۔ علاوہ ازیں حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اصل رسالت میں شریک اور ان کے وزیر تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد وہ ان کے خلیفہ نہیں تھے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں حضرت ہارون علیہ السلام کا میدان تہ میں انتقال ہو گیا تھا، اس لیے اس حدیث سے روافض اور شیعہ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ اس حدیث کی زیادہ سے زیادہ اس چیز پر دلالت ہے کہ نبی ﷺ نے غزوہ تبوک جاتے وقت حضرت علی بنی اللہ کو صرف مدینہ میں بچوں اور عورتوں کی حفاظت کے سلسلہ میں اپنا نائب بنایا تھا اور نماز پڑھانے کے لیے ان کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا تھا بلکہ یہ منصب حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم کے سپرد کیا تھا اور جب نبی ﷺ غزوہ تبوک سے واپس آگئے تو حضرت علی بنی اللہ اپنی پہلی حیثیت کی طرف لوٹ آئے اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ پر حضرت ابن ام مکتوم بنی اللہ وغیرہ کو اپنا نائب بنایا تھا جیسا کہ ہم عنقریب باحوالہ بیان کریں گے۔ سو اس حدیث سے حضرت علی بنی اللہ کا تمام امت پر دامنا خلیفہ بننا لازم نہیں آتا۔

حضرت ابن ام مکتوم کو تمام مغازی میں خلیفہ بنانا

امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

شعیبی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تیرہ غزوات میں تشریف لے گئے اور ہر غزوہ میں آپ نے ابن ام مکتوم کو خلیفہ بنایا وہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے، حالانکہ وہ نابینا تھے۔

شعیبی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن ام مکتوم کو غزوہ تبوک میں خلیفہ بنایا وہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے۔

فائدہ: ابن ام مکتوم کے نام میں اختلاف ہے بعض نے کہا ان کا نام عبد اللہ بن قیس ہے اور مشہور یہ ہے کہ ان کا نام عمرو بن قیس ہے۔ ان کی والدہ کا نام عاتکہ بنت عبد اللہ ہے ان کی کنیت ام مکتوم ہے۔ عمرو بن ام مکتوم مکہ میں قدیم اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ جنگ بدر سے کچھ عرصہ پہلے ہجرت کر کے مدینہ آئے اور دار القراء میں ٹھہرے۔ یہ مدینہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے لیے اذان دیتے تھے اور عام غزوات میں رسول اللہ ﷺ ان کو خلیفہ بناتے تھے اور یہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے۔ ایک روایت یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر گئے ہوئے تھے تو یہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے۔

(الطبقات الکبریٰ ج ۳، ص ۲۰۶-۲۰۵، مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۳۸۸ھ)

امام ابن الاثیر علی بن محمد الجزری المتوفی ۶۳۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے تیرہ غزوات میں حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں خلیفہ بنایا اور جب رسول اللہ ﷺ حجتہ الوداع کے لیے تشریف لے گئے تب بھی آپ نے ان ہی کو خلیفہ بنایا تھا۔

(اسد الغابہ ج ۳، ص ۲۵۲، رقم: ۴۰۱۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

حافظ ابو عمرو یوسف بن عبد البر القرطبی المتوفی ۴۶۳ھ نے بھی واقدی کی روایت سے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تیرہ غزوات میں حضرت ابن ام مکتوم کو خلیفہ بنایا اور امام ابن الاثیر کی طرح ان غزوات کا تفصیل سے ذکر بھی کیا ہے۔

(الاستیعاب ج ۳، ص ۲۷۶، رقم: ۱۹۶۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۵ھ)

حافظ احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

امام ابن اسحاق نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے ہمارے پاس حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہجرت کر کے آئے پھر حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے اور نبی ﷺ عام غزوات میں ان کو مدینہ میں خلیفہ بناتے تھے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھاتے تھے۔

اس کے بعد حافظ عسقلانی نے امام عبد البر کے حوالے سے ان تیرہ غزوات کی تفصیل ذکر کی ہے۔

(الاصابہ ج ۳، ص ۳۹۵، رقم: ۵۷۸۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۵ھ)

حضرت ابن ام مکتوم کی خلافت سے حضرت علی کے متعلق مزعوم خلافت بلا فصل پر معارضہ

ان کثیر حوالہ جات سے واضح ہو گیا کہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے تیرہ مرتبہ مدینہ میں اپنا خلیفہ بنایا اور مسلمانوں کی نمازوں کا امام بنایا اور جب تیرہ مرتبہ خلیفہ بننے اور مسلمانوں کی نمازوں کا امام بننے سے یہ لازم نہیں آیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد تمام امت کے امیر اور خلیفہ بن جائیں تو صرف ایک مرتبہ مدینہ میں خلیفہ بننے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے کیسے لازم آئے گا کہ وہ امت کے خلیفہ بن جائیں جبکہ نمازوں کے امام اس وقت بھی حضرت ابن ام مکتوم تھے۔ نیز اگر یہ حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل پر دلیل تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے اس وقت کیوں نہیں

استدلال کیا جب ان سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے کہا جا رہا تھا۔

نیز یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے حضرت موسیٰ کے لیے ہارون تھے۔ اور حضرت ہارون حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں امت پر کنٹرول نہیں کر سکے اور اس میں تفرقہ ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بھی ایسا ہی ہوا اور امت تفرقہ میں بٹ گئی، ہر چند کہ حق پر حضرت علی تھے جیسا کہ حق پر حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر بالفرض اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے بعد حضرت علی کی خلافت کی طرف اشارہ ہے تو اس بشارت سے مراد وہی زمانہ ہے جس زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنایا گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر آئے اور ان کے رب نے ان سے کلام فرمایا تو عرض کیا اے میرے رب! مجھے اپنی ذات دکھا کہ میں تجھے دیکھوں، فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے البتہ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر (میری تجلی کے باوجود) یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو عنقریب تم بھی مجھے دیکھ سکو گے، پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب ان کو ہوش آیا تو کہا تو پاک ہے میں نے تیرے حضور توبہ کی اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں (الاعراف: ۱۴۳)

اللہ تعالیٰ کے کلام کے متعلق مذاہب اسلام

اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں حسب

ذیل مذاہب ہیں:

۱- حنبلیہ اور حنویہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام آواز اور حروف سے مرکب ہے اور یہ کلام قدیم ہے اور یہ مذہب بدایت باطل ہے کیونکہ جو چیز اجزاء سے مرکب ہو اس میں تقدیم اور تاخیر ہوتی ہے اس لیے وہ چیز قدیم نہیں ہو سکتی۔
۲- کرامیہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کا کلام آواز اور حروف سے مرکب ہے اور اس کا محل اور موصوف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ مذہب بھی باطل ہے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کا محل حوادث ہونا اور حوادث سے موصوف ہونا لازم آتا ہے اور جو محل حوادث ہو وہ خود حادث ہوتا ہے۔

۳- معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کا کلام آواز اور حروف سے مرکب ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور چیز کے ساتھ قائم ہے مثلاً درخت وغیرہ کے ساتھ۔

۴- اہل سنت و جماعت ماتریدیہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ایک صفت ازلی ہے اس میں آواز اور حروف نہیں ہیں اور اس صفت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہیں سنا انہوں نے ان آوازوں اور حروف کو سنا جو درخت کے ساتھ قائم تھے۔
۵- اہل سنت اشاعرہ کا یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام ایک صفت ہے اس میں حروف اور آواز نہیں ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی صفت کو سنا تھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی رنگ اور جسم نہیں ہے اور اس کے باوجود دکھائی دے گا حالانکہ جس چیز کا رنگ نہ ہو اس کا دکھائی دینا انسان کے لیے غیر متصور ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کلام بغیر آواز اور حروف کے حضرت موسیٰ نے سنا جبکہ انسان کے نزدیک بغیر آواز اور حروف کے کسی کلام کا سنائی دینا غیر متصور ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۵۳، ملخصاً، مرتباً، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۱۵ھ)

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح کلام لفظی ہوتا ہے اسی طرح کلام نفسی بھی ہوتا ہے۔ کلام لفظی وہ ہے جو عادتاً سنائی دیتا ہے جیسا کہ معروف کلام ہے اور کلام نفسی وہ ہے جو کلمات اور حروف پر مشتمل ہوتا ہے مگر عادتاً سنائی نہیں دیتا۔ اس کی مثال

یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہماری تعریف میں یہ کہے کہ ”میں نے آپ جیسا خوش اخلاق یا آپ جیسا حسین کوئی نہیں دیکھا“ تو ہمیں یہ الفاظ اور جملے یاد آتے رہتے ہیں اور ہمارے ذہن میں ان الفاظ کی تصویر گھومتی رہتی ہے حالانکہ یہ الفاظ بعد میں سنائی نہیں دیتے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہمیں کوئی دلخراش بات کہے تو وہ بات مدتوں ہمارے دل سے نہیں نکلتی اور ہمیں وہ بات یاد آتی رہتی ہے۔ خصوصاً جب ہم اس شخص کو دیکھیں تو اس کے کہے ہوئے الفاظ کی تصویر ہمارے ذہن میں آجاتی ہے سو یہ کلام نفسی ہے اور الفاظ نفسیہ ہیں۔ قرآن مجید میں جو اللہ کا کلام ہے وہ بھی کلام نفسی ہے اور قدیم ہے وہ ان ہی الفاظ نفسیہ پر مشتمل ہے اور الفاظ میں بغیر تقدم اور تاخر کے یہ کلام نفسی ہے اس کلام کی قرأت جو ہم کرتے ہیں وہ کلام لفظی ہے اور حادث ہے اور مقروء یعنی جن الفاظ نفسیہ کی ہم قرأت کرتے ہیں وہ قدیم ہے۔ مثلاً جب ہم الحمد للہ رب العالمین کی قرأت کریں گے تو پہلے الحمد پڑھیں گے پھر اللہ پھر رب العالمین لیکن یہ پورا قرآن کلام نفسی کے مرتبہ میں بغیر تقدم اور تاخر کے اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور قدیم ہے۔ اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جب ہم کو کوئی بات یاد آتی ہے تو یوں نہیں ہوتا کہ پہلے اس بات کا ایک لفظ یاد آتا ہو پھر دوسرا پھر تیسرا پھر چوتھا بلکہ بیک وقت مکمل کلام کی تصویر ہمارے ذہن میں آجاتی ہے۔ اسی طرح مکمل قرآن نفسی بغیر تقدم اور تاخر کے اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو کلام کیا وہ بھی کلام نفسی تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس کلام کو سننا خلاف عادت اور ان کا معجزہ تھا کیونکہ بغیر آواز کے کسی کلام کو سننا انسان کی عادت اور اس کے معمول کے خلاف ہے۔ میں نے اس مقام کو اسی طرح سمجھا ہے اور امر واقعہ کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قواعد اسلام کے مطابق ہے اور بعض متقدمین اور محققین کی عبارت میں بھی اس تفصیل کی طرف اشارات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے کلام کی کیفیت کے متعلق احادیث اور آثار

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ بیان کرتے ہیں:

امام بزار، امام ابن ابی حاتم، امام ابو نعیم نے الحلیہ میں اور امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے طور کے دن کلام فرمایا تو یہ اس دن کے کلام کا مغائر تھا جب ان کو اس نے ندا کی تھی۔ حضرت موسیٰ نے اللہ سے کہا اے میرے رب! جس طرح تو نے مجھ سے کلام کیا ہے، کیا تیرا کلام اسی طرح کا ہے؟ فرمایا اے موسیٰ! میں نے دس ہزار زبانوں کی قوت سے تجھ سے کلام کیا ہے اور مجھے تمام زبانوں کی قوت ہے اور اس سے بہت زیادہ ہے، حضرت موسیٰ جب بنو اسرائیل کی طرف واپس گئے تو انہوں نے کہا اے موسیٰ! رحمن کے کلام کی صفت بیان کیجئے آپ نے کہا تم اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ کیا تم نے ایسی گرج اور کڑک کی آواز سنی ہے جو بہت شیریں لگتی ہو؟ اللہ کا کلام اس کے قریب ہے اور وہ اس طرح نہیں ہے۔

حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں کعب سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا تو حضرت موسیٰ نے پوچھا: اے میرے رب! کیا تیرا کلام اسی طرح ہے؟ فرمایا: اے موسیٰ! میں دس ہزار زبانوں کی قوت سے کلام کر رہا ہوں اور مجھے تمام زبانوں کی قوت ہے اور اگر میں تمہارے ساتھ اپنے کلام کی کنہ اور حقیقت کے ساتھ کلام کروں تو تم فنا ہو جاؤ۔

امام عبدالرزاق، امام ابن جریر، امام ابن المنذر، امام ابن ابی حاتم اور امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں کعب سے روایت کیا ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تمام زبانوں سے کلام کیا تو حضرت موسیٰ نے کہا: اے میرے رب میں نہیں سمجھ رہا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں ان کی آواز کی مثل کلام فرمایا، تب حضرت موسیٰ نے پوچھا: اے

میرے رب! کیا تیرا کلام اسی طرح ہے؟ فرمایا نہیں! میرا کلام جس طرح ہے اگر تم اس کو اسی طرح سن لو تو تم نیست و نابود ہو جاؤ۔ حضرت موسیٰ نے پوچھا: اے میرے رب! کیا تیری مخلوق میں کوئی چیز تیرے کلام کے مشابہ ہے؟ فرمایا نہیں! البتہ تم نے بہت زیادہ گرجدار بجلی کی کڑک جو سنی ہو اس کو اس کے قریب کہا جاسکتا ہے۔

امام ابن المنذر، امام ابن ابی حاتم اور امام حاکم نے سند کی تصحیح کے ساتھ عبدالرحمن بن معاویہ سے روایت کیا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے ان کی طاقت کے مطابق کلام فرمایا اور اگر اللہ ان سے اپنے حقیقی کلام کے ساتھ کلام فرماتا تو حضرت موسیٰ اس کی بالکل طاقت نہ رکھتے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام چالیس راتیں اس کیفیت میں رہے کہ جو شخص بھی ان کو دیکھتا تھا، وہ رب العالمین کی تاب نہ لا کر مر جاتا تھا۔ (الدر المنثور ج ۲، ص ۵۳-۵۳۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۳ھ)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام کی بعض تفصیلات

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ بیان کرتے ہیں:

امام سعید بن منصور، امام ابن المنذر، امام حاکم، امام ابن مردویہ اور امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام فرمایا تھا اس دن حضرت موسیٰ نے اونی جبہ پہنا ہوا تھا، اونی چادر تھی، اونی شلوار تھی اور غیر مذبح دراز گوش کی کھال کی جوتیاں پہنی ہوئی تھیں۔

امام ابن ابی شیبہ نے اور امام احمد نے کتاب الزہد میں اور امام ابو خیشمہ نے کتاب العلم میں اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے کلام کیا تو پوچھا اے میرے رب! تجھے اپنے بندوں میں سے کون سب سے زیادہ محبوب ہے؟ اللہ عز و جل نے فرمایا جو بندہ میرا بہت زیادہ ذکر کرتا ہو۔ پھر پوچھا تیرے بندوں میں کون سب سے اچھا حاکم ہے؟ فرمایا: وہ شخص جو لوگوں کے خلاف جس طرح فیصلہ کرتا ہو اسی طرح اپنے خلاف بھی فیصلہ کرے۔ پوچھا اے میرے رب! تیرے بندوں میں کون سب سے زیادہ غنی ہے؟ فرمایا جو اس چیز پر راضی ہو جو میں نے اس کو عطا کی ہے۔

امام حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں اور امام بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: دنیا میں زہد کی مثل کسی نے کوئی کام نہیں کیا اور میری حرام کردہ چیزوں سے بچنے سے بڑھ کر کسی نے میرا تقرب حاصل نہیں کیا اور میرے خوف سے رونے سے بڑھ کر کسی نے میری عبادت نہیں کی۔ حضرت موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! تو نے ان کے لیے کیا تیار کیا ہے اور ان کی کیا جزا ہے؟ فرمایا: جو لوگ دنیا میں زہد کرتے تھے میں ان کے لیے اپنی جنت مباح کردوں گا وہ اس میں جہاں چاہیں گے رہیں گے اور جو لوگ حرام کاموں سے بچتے تھے تو میں قیامت کے دن ہر شخص سے اس کا حساب لیتے وقت مناقشہ کروں گا اور اس کے اعمال کی تفتیش کروں گا لیکن میں ان سے حیا کروں گا اور ان کو عزت اور کرامت دوں گا۔

امام ابو بکر بن ابی عاصم نے کتاب السنہ میں اور امام ابو نعیم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی راستہ میں جا رہے تھے تو ان کو جبار عز و جل نے ندا کی: یا موسیٰ! حضرت موسیٰ نے دائیں بائیں دیکھا تو کچھ نظر نہیں آیا، پھر دوسری بار ندا کی یا موسیٰ بن عمران! انہوں نے پھر دائیں بائیں دیکھا تو کچھ نظر نہیں آیا اور ان پر خوف طاری ہو گیا پھر تیسری بار ندا کی: یا موسیٰ بن عمران! میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ نے کہا لیک لیک! اور سجدہ میں گر پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ بن عمران! اپنا سر اٹھاؤ، انہوں نے اپنا سر

اٹھایا تو فرمایا: اے موسیٰ! اگر تم چاہتے ہو کہ تم اس دن میرے عرش کے سائے میں رہو جس دن میرے عرش کے سوا اور کسی چیز کا سایہ نہیں ہو گا تو تم یتیم کے لیے شفیق باپ کی طرح ہو جاؤ اور بیوہ کی مہربان خاوند کی طرح کفالت کرو، اے موسیٰ بن عمران! تم رحم کرو تم پر رحم کیا جائے گا۔ اے موسیٰ! تم جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ اے موسیٰ بنو اسرائیل کے نبی! جس نے مجھ سے اس حال میں ملاقات کی کہ وہ (سیدنا) محمد (ﷺ) کی نبوت کا منکر تھا میں اس کو دوزخ میں ڈال دوں گا۔ حضرت موسیٰ نے کہا محمد کون ہے؟ فرمایا: اے موسیٰ! مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم! میں نے ان سے افضل کوئی مخلوق پیدا نہیں کی، میں نے عرش، آسمانوں، زمینوں، سورج اور چاند کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ ملا کر لکھا ہے اور مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم! میری تمام مخلوق پر اس وقت تک جنت حرام ہے جب تک کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) اور ان کی امت اس میں داخل نہ ہو جائے، حضرت موسیٰ نے پوچھا: اور (سیدنا) محمد (ﷺ) کی امت کون ہے؟ فرمایا ان کی امت اترتے چڑھتے ہر حال میں حمد کرنے والی ہے، وہ دن کو روزہ رکھیں گے اور رات کو ڈرتے رہیں گے، میں ان کے کم عمل کو بھی قبول کر لوں گا اور ان کو لالہ اللہ کی شہادت کی وجہ سے جنت میں داخل کر دوں گا۔ حضرت موسیٰ نے کہا: مجھے اس امت کا نبی بنا دے، فرمایا: اس امت کا نبی ان ہی میں سے ہو گا پھر کہا: اچھا مجھے اس نبی کی امت میں سے بنا دے، فرمایا: تم اس سے پہلے ہو۔ اے موسیٰ! ٹھہرو میں تمہیں اور ان کو دارالجلال میں اکٹھا کر دوں گا۔

(کتاب السنہ ج ۱، ص ۳۰۵، الشریعہ ج ۱، ص ۲۲۲، حلیۃ الاولیاء ج ۳، ص ۲۲۹-۲۳۰، طبع جدید، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

امام ابن الشاہین نے کتاب الترغیب میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! اس شخص کے لیے کیا اجر ہے جو اس عورت سے تعزیت کرے جس کا بچہ فوت ہو چکا ہو؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جس دن کسی چیز کا سایہ نہیں ہو گا اس دن میں اس کو اپنے سایہ میں رکھوں گا۔

امام ابن ابی حاتم نے العلاء بن کثیر سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں اپنے کلام سے نوازا، عرض کیا نہیں اے میرے رب! فرمایا اس لیے کہ میں نے کوئی ایسی مخلوق پیدا نہیں کی جو تمہاری طرح متواضع ہو۔ (الدر المشورج ج ۳، ص ۵۳۲-۵۳۷، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۳ھ)

اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کے متعلق اہل قبلہ کے مذاہب

اس کے بعد فرمایا: (حضرت موسیٰ نے کہا) اے میرے رب! مجھے اپنی ذات دکھا کہ میں تجھے دیکھوں فرمایا: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔ الآیہ (الاعراف: ۱۴۳)

اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا عقلاً ممکن ہے، محال نہیں ہے اور اس پر اجماع ہے کہ یہ روایت آخرت میں واقع ہوگی، اور مومن اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور کافر نہیں دیکھیں گے، اور اہل بدعت میں سے معتزلہ، خوارج اور بعض مرجئہ کا مذہب یہ ہے کہ مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نہیں دیکھے گا اور اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا عقلاً محال ہے، ان کا یہ قول غلط اور باطل ہے، کتاب و سنت کی تصریحات، صحابہ، فقہاء تابعین اور اخیار امت کا اس پر اجماع ہے کہ مومنین آخرت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور بیس سے زیادہ صحابہ سے اس قسم کی احادیث مروی ہیں۔

اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ رویت ایک قوت ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں پیدا کرتا ہے، اس کے لیے شعاع بصری کا دکھائی دینے والے کو احاطہ کرنا اور دکھائی دینے والے کا دیکھنے والے کے بالقابل ہونا شرط نہیں ہے، لہذا اس سے یہ لازم نہیں آتا

کہ آخرت میں جب مسلمان اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے تو ان کی شعاع بصری اللہ تعالیٰ کا احاطہ کر لے یا اللہ تعالیٰ دیکھنے والوں کی بالمقابل جانب ہو، معتزلہ نے اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کا اس لیے انکار کیا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا محاط ہونا اور اس کے لیے سمت اور جہت کا ہونا لازم آئے گا، ہاں ہم جو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اس میں یہ چیز اتفاقاً پائی جاتی ہے لیکن یہ شرط نہیں ہے اور جب مومن اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے تو اس سے اللہ تعالیٰ کا مقابل جہت میں ہونا لازم نہیں آئے گا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ بصیر ہے اور وہ ہمیں دیکھتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے دیکھنے سے اس کا جانب مقابل میں ہونا لازم نہیں آتا تو اس کے دکھائی دینے سے جانب مقابل میں ہونا کس طرح لازم آئے گا

منکرین رویت کے دلائل اور ان کے جوابات

منکرین کی ایک دلیل تو سورۃ الاعراف کی یہ مذکورہ آیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دیکھنے کی نفی ہے، اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کی نفی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے یہ نہیں فرمایا میں ہرگز دکھائی نہیں دوں گا۔ ان کی دوسری دلیل یہ آیت ہے:

ان کی دوسری دلیل یہ آیت ہے:

لَا تَدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ
آ نکھیں اس کو نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا
(الانعام: ۱۰۳) ہے۔

اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس میں دنیا میں اللہ کو دیکھنے کی نفی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس میں کفار کے دیکھنے کی نفی ہے اور ہمارا مسلک یہ ہے کہ مسلمان آخرت میں اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ ان کی تیسری دلیل یہ آیت ہے:

وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ
اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذْنَاكُمُ الضُّعْفَةَ وَأَنْتُمْ
تَنْظُرُونَ (البقرہ: ۵۵)
اور یاد کرو جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم تم پر اس وقت
تک کبھی ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلانہ
دیکھ لیں پس تم کو کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا اور آنحالیکہ
تم دیکھتے تھے۔

معتزلہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جائز اور ممکن ہو تا تو اللہ تعالیٰ بنو اسرائیل کے اس مطالبہ کے سبب ان پر عذاب نازل نہ فرماتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اس لیے عذاب نازل نہیں فرمایا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ایک امر محال کا سوال کیا تھا۔ بلکہ عذاب اس لیے نازل فرمایا تھا کہ انہوں نے سرکشی اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تھا اور ایمان لانے کو اللہ تعالیٰ کے دیکھنے پر موقوف کر دیا تھا گویا کہ وہ حالت کفر میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا چاہتے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ کافروں کو اپنا دیدار نہیں کرائے گا۔

رہا یہ امر کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنا جائز اور ممکن ہے اور محبت الہی کی وجہ سے اس کی رویت کا سوال کرنا جائز ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی آیت میں ہے: موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! مجھے اپنی ذات دکھا کہ میں تجھے دیکھوں۔

(الاعراف: ۱۲۳)

اگر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی آرزو کرنا اور دعا کرنا جائز ہو تا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نبوت کے علوم و معارف کے حامل ہو کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعائیں کرتے اور اگر بالفرض یہ دعا ناجائز ہوتی تو اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایسی دعا کرنے سے منع فرما

دیتا۔ اور رویت کے امکان پر دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَيْكِنِ أَنْظُرَ إِلَى الْجَبَلِ فَإِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهُ
فَسَوْفَ تَرَانِي
البتہ تم اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر (میری تجلی کے باوجود)
یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۵۳)

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دیکھنے کو پہاڑ کے برقرار رہنے پر معلق کیا ہے اور پہاڑ کا اپنی جگہ برقرار رہنا ہی
نفسہ ممکن ہے اور جو ممکن پر موقوف ہو وہ بھی ممکن ہوتا ہے، پس ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ممکن
تھا۔

اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے پر اہل سنت کے قرآن مجید سے دلائل

وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝
قیامت کے دن کچھ چہرے تروتازہ ہوں گے، اپنے رب کی

(القیامہ: ۲۲-۲۳) طرف دیکھنے والے ہوں گے۔

كَأَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ ۝
حق یہ ہے کہ وہ اس دن اپنے رب کے دیدار سے ضرور

(المطففين: ۱۵) محجوب ہوں گے۔

اس آیت سے صراحتاً تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکیں گے مگر اس سے اشارہ یہ
ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے اور اسی صورت میں یہ آیت کفار کے لیے حسرت اور محرومی کا
موجب ہوگی، کیونکہ اگر مسلمان بھی اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکتے تو کفار یہ کہہ سکتے تھے کہ اس میں ہماری کیا تخصیص ہے۔ مسلمان بھی
تو اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کر سکتے۔

اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے کے متعلق احادیث

امام محمد بن اسماعیل بخاری متونی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں: حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ
ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے چودھویں شب کے چاند کی طرف دیکھا آپ نے فرمایا: سنو تم عنقریب اپنے رب کو
اس طرح دیکھو گے جس طرح تم اس چاند کو دیکھ رہے ہو، تمہیں اس کو دیکھنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی، پس اگر تم کو قدرت
ہو تو طلوع شمس سے پہلے اور غروب شمس سے پہلے نماز پڑھنے سے مغلوب نہ ہونا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۵۳، صحیح مسلم، مساجد: ۲۱۲، سنن الترمذی، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۱۷۷، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث:

۳۷۲۹، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۵۹۲، مسند احمد، ج ۴، ص ۳۶۰، سنن کبریٰ للسیتی، ج ۱، ص ۳۵۹، مسند حمیدی، رقم الحدیث: ۷۹۹، مسند

ابوعوانہ، ج ۱، ص ۳۷۶)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں
گے؟ آپ نے فرمایا: جب آسمان پر ابر نہ ہو تو کیا تمہیں سورج اور چاند کو دیکھنے سے کوئی تکلیف ہوتی ہے؟ ہم نے عرض کیا نہیں!
آپ نے فرمایا اسی طرح تم کو اس دن اپنے رب کو دیکھنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی جس طرح تمہیں سورج اور چاند کو دیکھنے
سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۷۳۳۹، صحیح مسلم، الایمان: ۳۰۲، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۷۳۰، مسند احمد، ج ۲، ص

۵۳۳، ۲۹۳، ۲۵۷، ج ۳، ص ۱۶، مسند حمیدی، رقم الحدیث: ۱۱۷۸، مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث: ۲۰۸۵۶، المستدرک، ج ۳، ص ۵۸۲،

طبیان القرآن

جلد چہارم

مشکوٰۃ، رقم الحدیث: ۵۵۵۵، کنز العمال رقم الحدیث: (۳۹۶۹۸)

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے ہر شخص کے ساتھ اس کا رب کلام فرمائے گا، اس شخص کے اور اس کے رب کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا اور نہ کوئی حجاب ہوگا جو اس کے رب کو دیکھنے سے مانع ہو۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۷۴۴۳، صحیح مسلم، الزکوٰۃ: ۶۷ (۱۰۱۶) ۲۳۰۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۱۵، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۱۸۴۳، مسند احمد، ج ۴، ص ۳۷۷ (۲۵۶۳))

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے اور ان کے ہاتھ میں ایک سفید آئینہ تھا میں نے کہا: اے جبرئیل ایہ کیا چیز ہے؟ کہا یہ جمعہ ہے جس کو آپ کا رب آپ پر پیش کرتا ہے تاکہ وہ دن آپ کے لیے اور آپ کے بعد آپ کی قوم کے لیے عید ہو جائے، آپ اول ہیں اور یہود و نصاریٰ آپ کے بعد ہیں، آپ نے فرمایا: ہمارے لیے اس عید میں کیا ہے؟ کہا: اس دن میں آپ (سب) کے لیے خیر ہے، اس دن میں آپ (سب) کے لیے ایک ساعت ہے، اس ساعت میں جو شخص بھی اپنے رب سے خیر کی دعا کرے گا اور وہ اس کی قسمت میں ہو تو اللہ اس کو وہ خیر عطا فرمائے گا اور اگر وہ خیر اس کی قسمت میں نہ ہو تو اس سے عظیم چیز کو اس کے لیے ذخیرہ کر دے گا یا اس کی قسمت میں جو شر ہوگا اس شر سے اس کو پناہ میں رکھے گا۔ میں نے کہا: اس آئینہ میں یہ سیاہ نکتہ کیسا ہے! انہوں نے کہا: یہ وہ ساعت ہے جو جمعہ کے دن قائم ہوتی ہے اور ہمارے نزدیک جمعہ تمام دنوں کا سردار ہے اور آخرت میں ہمارے نزدیک اس کا نام یوم المزید ہے۔ میں نے کہا: تم اس دن کو یوم المزید کس وجہ سے کہتے ہو؟ انہوں نے کہا: آپ کے رب عزوجل نے جنت میں مشک سے زیادہ خوشبودار ایک سفید وادی بنائی ہے، جب جمعہ کا دن آتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ علیین سے اپنی کرسی پر نازل ہوتا ہے، حتیٰ کہ اس کرسی کے گرد نور کے منبر بچھا دیے جاتے ہیں اور انبیاء آکر اس کرسی کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ان منبروں کے گرد سونے کی کرسیاں بچھا دی جاتی ہیں پھر صدیقین اور شہداء آکر ان کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں، پھر اہل جنت آتے ہیں اور نیلوں پر بیٹھ جاتے ہیں، پھر ان کا رب تبارک و تعالیٰ ان سب پر تجلی فرمائے گا حتیٰ کہ وہ سب اس کے چہرے کی طرف دیکھیں گے۔ (الحدیث)

(مسند البرز، رقم الحدیث: ۳۵۱۹، مسند ابو-علی رقم الحدیث: ۳۲۲۸، المعجم الاوسط، رقم الحدیث: ۶۷۱۳، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۳۲۱، المطالب العالیہ ج ۱، ص ۱۵۸-۱۵۷، رقم الحدیث: ۵۷۹، اس کی سند صحیح ہے۔)

اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے پر قرآن مجید سے ایک اور دلیل

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: پھر جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے پر دلیل ہے، کیونکہ کسی چیز کے علم سے وہ چیز منجلی (روشن) ہو جاتی ہے، اور کسی چیز کو دکھانا بھی اس چیز کو روشن کر دیتا ہے اور علم کی بہ نسبت دکھانے سے چیز زیادہ منجلی (روشن) ہوتی ہے، اس لیے یہاں پر تجلی سے مراد دکھانا زیادہ اولیٰ ہے۔ اور اس آیت کے معنی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو پہاڑ نے دیکھا تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ پہاڑ تو ایک پتھر ہے اس کا دیکھنا غیر متصور ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑ میں حیات، عقل اور فہم پیدا کی ہے اس طرح اس میں رویت اور بصارت بھی بعید نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یجبال اوبی معہ والطیر (سبا: ۱۰)

اے پہاڑ وادواؤد کے ساتھ تسبیح کرو اور اے پرندو تم بھی!

نیز پہاڑ پتھروں کی جنس سے ہیں اور پتھروں کے متعلق فرمایا:

وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ
بے شک بعض پتھر ضرور خوف خدا سے گر پڑتے ہیں۔

(البقرہ: ۷۴)

اور جب پہاڑ تسبیح کرتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں تو وہ دیکھ بھی سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب پہاڑ اور موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نبی کی طاقت پہاڑ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔

منکرین رویت کے ایک اعتراض کا جواب

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور جب ان کو ہوش آیا تو کہا تو پاک ہے میں نے تیرے حضور توبہ کی، اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔

معتزلہ نے کہا: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے رویت کا سوال کرنا گناہ ہے جب ہی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے توبہ کی، اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کی اجازت کے بغیر رویت کا سوال کیا تھا اس لیے انہوں نے اپنے اس فعل پر توبہ کی اور ہر چند یہ سوال کرنا گناہ نہیں تھا لیکن ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے نزدیک گناہوں کے حکم میں ہوتی ہیں، اور میں سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والا ہوں کہ تیرے اذن کے بغیر تجھ سے سوال کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ نے جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو گئے تو ہوش میں آ کر کہا سبحانک یعنی ہم پر ریزہ ریزہ ہونے اور بے ہوش ہونے کی آفت اور مصیبت پہنچی اور تو ہر قسم کی آفتوں اور مصیبتوں اور ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک ہے۔

انبیاء علیہم السلام کو ایک دوسرے پر فضیلت نہ دینے کے متعلق حدیث

اس آیت میں کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بے ہوش ہونے کا ذکر ہے، رسول اللہ ﷺ نے بھی ایک حدیث میں اس واقعہ کا ذکر فرمایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک یہودی اپنا کچھ سلمان بیچ رہا تھا اس کو اس سلمان کے عوض جو قیمت دی گئی اس کو اس نے ناپسند کیا اور کہا: نہیں! اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام انسانوں پر فضیلت دی! ایک انصاری نے یہ سنا تو اس یہودی کے چہرے پر ایک طمانچہ مارا اور کہا: تو یہ کہتا ہے کہ اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام انسانوں پر فضیلت دی، حالانکہ ہمارے درمیان رسول اللہ ﷺ موجود ہیں اور یہودی رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور کہا: یا ابا القاسم! میرے لیے ذمہ اور عہد ہے (یعنی میں ذمی ہوں) اور آپ کے ذمہ میری حفاظت ہے) اور فلاں شخص نے میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے پوچھا: تم نے اس کے منہ پر کیوں طمانچہ مارا ہے؟ اس نے کہا: یا رسول اللہ! اس نے کہا تھا اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام انسانوں پر فضیلت دی ہے، حالانکہ آپ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ تب رسول اللہ ﷺ غضبناک ہوئے حتیٰ کہ آپ کے چہرے سے غضب ظاہر ہو رہا تھا، پھر آپ نے فرمایا: انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت مت دو۔ ایک روایت میں ہے کہ مجھے انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت نہ دو۔ (بخاری: ۳۶۳۸) کیونکہ صور میں پھونکا جائے گا تو آسمان اور زمین میں سب بے ہوش ہو جائیں گے، سو ان کے جن کو اللہ چاہے گا۔ پھر دوسری بار صور

تبیان القرآن

جلد چہارم

پھونکا جائے گا تو سب سے پہلے مجھے اٹھایا جائے گا تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام عرش کو پکڑے ہوئے ہوں گے، میں (از خود) نہیں جانتا کہ طور کے دن کی بے ہوشی میں ان کا شمار کر لیا گیا یا ان کو مجھ سے پہلے اٹھایا گیا تھا اور میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی شخص یونس بن متی علیہ السلام سے افضل ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۱۳، ۳۳۰۷، صحیح مسلم، فضائل انبیاء: ۱۵۹ (۲۳۷۳) سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۶۷۱، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۳۲۳۵، مسند احمد، ج ۳، ص ۳۱-۳۳، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۳۰۸-۶۳۰۹)

”مجھے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت مت دو“ اس حدیث کے جوابات

اس حدیث پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ نبی ﷺ بالاتفاق تمام انبیاء اور مرسلین سے افضل ہیں، پھر آپ نے یہ کیسے فرمایا: مجھے انبیاء علیہم السلام کے درمیان فضیلت مت دو، اس اعتراض کے جوابات حسب ذیل ہیں:

آپ کے ارشاد کا یہ معنی ہے کہ نفس نبوت میں کسی نبی کو دوسرے نبی پر فضیلت مت دو، کیونکہ نفس نبوت میں تمام نبیوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

لَا نَفَرِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ (البقرہ: ۲۸۵) ہم (ایمان لانے میں) اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے۔

اور اس ارشاد کا یہ معنی نہیں ہے کہ مراتب اور درجات کے لحاظ سے کسی رسول کو دوسرے پر فضیلت مت دو کیونکہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ بعض رسول بعض رسولوں سے افضل ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُم عَلَىٰ بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّا كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ (البقرہ: ۲۵۳) یہ سب رسول، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا، اور ان میں سے کسی کو (تمام) درجات پر بلندی عطا فرمائی۔

دوسرے جواب کے ضمن میں تمام انبیاء پر نبی ﷺ کی فضیلت کے متعلق احادیث

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ نے یہ ارشاد اس وقت فرمایا تھا جب آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس پر مطلع نہیں فرمایا تھا کہ اللہ عزوجل نے آپ کو تمام نبیوں اور رسولوں پر فضیلت دے دی، اور جب اللہ جل مجدہ نے آپ کو اس فضیلت پر مطلع فرمادیا تو آپ نے خود بیان فرمایا کہ آپ تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں، جیسا کہ حسب ذیل احادیث میں اس کی تصریح ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں سب سے پہلے جنت کی شفاعت کرنے والا ہوں، جتنی زیادہ میری تصدیق کی گئی ہے اتنی کسی نبی کی تصدیق نہیں کی گئی اور بعض نبی ایسے تھے کہ ان کی امت میں سے صرف ایک شخص نے ان کی تصدیق کی تھی۔ (صحیح مسلم، الایمان: ۳۳۲ (۱۹۶) مشکوٰۃ، رقم الحدیث: ۵۷۴۳)

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں گا اور کوئی فخر نہیں، اور میرے ہی ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہو گا اور کوئی فخر نہیں، اور اس دن ہر نبی میرے جھنڈے کے نیچے ہو گا خواہ وہ آدم ہوں یا ان کے علاوہ، اور سب سے پہلے جس شخص سے زمین پھٹے گی وہ میں ہوں، اور کوئی فخر نہیں۔

(سنن الترمذی، تفسیر سورہ بنی اسرائیل، ۱۸، رقم الحدیث: ۳۱۳۸، مشکوٰۃ، رقم الحدیث: ۵۷۶۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب بیٹھے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ حجرہ سے نکلے اور ان کی باتیں سننے لگے، بعض صحابہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا، دوسرے نے کہا: حضرت موسیٰ

سے اللہ نے کلام فرمایا، ایک اور نے کہا حضرت عیسیٰ اللہ کے کلمہ اور اس کی (پسندیدہ) روح ہیں، کسی نے کہا: حضرت آدم کو اللہ نے منتخب کر لیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: میں نے تمہاری باتیں سن لیں، تم نے کہا: ابراہیم خلیل ہیں وہ ایسے ہی ہیں، تم نے کہا موسیٰ اللہ کے کلیم ہیں، وہ ایسے ہی ہیں، تم نے کہا عیسیٰ اللہ کا کلمہ اور اس کی (پسندیدہ) روح ہیں، وہ ایسے ہی ہیں، تم نے کہا آدم اللہ کے صفی ہیں، وہ ایسے ہی ہیں، سنو میں اللہ کا محبوب ہوں اور فخر نہیں، اور میں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا اٹھانے والا ہوں گا اور فخر نہیں، اور میں سب سے پہلے جنت، کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا تو اللہ تعالیٰ اس کو میرے لیے کھول دے گا، اور میرے ساتھ فقراء مومنین داخل ہوں گے اور فخر نہیں، اور میں اولین اور آخرین میں اللہ کے نزدیک سب سے عزت والا ہوں اور کوئی فخر نہیں۔ (سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۶۱۶، سنن الدارمی، رقم الحدیث: ۴۷، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۵۷۶۲)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: میں تمام رسولوں کا قائد ہوں اور کوئی فخر نہیں، میں خاتم النبیین ہوں اور کوئی فخر نہیں، میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں اور میں وہ ہوں جس کی سب سے پہلے شفاعت قبول کی جائے گی اور فخر نہیں۔ (مشکوٰۃ، رقم الحدیث: ۵۷۶۳)

تیسرا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ نبی ﷺ کو یہ علم تھا کہ آپ افضل الانبیاء ہیں، لیکن آپ نے تواضعاً اور اوبا انبیاء علیہم السلام پر خود کو فضیلت دینے سے منع فرمایا، لیکن اس جواب پر یہ اشکال ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ملامت سے منع فرماتے، جبکہ اس حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ سخت غضبناک ہوئے حتیٰ کہ آپ کے چہرے سے آثار غضب ظاہر ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک یہ فضیلت دینا صرف نامناسب نہیں بلکہ حرام تھا۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ مجھے دوسرے انبیاء پر اس طرح فضیلت مت دو جو دوسرے نبیوں میں نقص کی موجب یا موہم ہو۔ پانچواں جواب یہ ہے کہ مجھے دوسرے نبیوں پر اس طریقہ سے فضیلت مت دو جو کسی لڑائی جھگڑے کا موجب ہو، جیسا کہ اس واقعہ میں ہوا تھا۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان تفضیل کے مسئلہ میں زیادہ بحث تمحیص اور غور و فکر نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ دوران بحث تمہارے منہ سے ایسا لفظ نکل جائے جو نامناسب ہو اور اس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کے احترام میں کمی آئے۔

ساتواں جواب یہ ہے کہ اپنی آراء اور اپنی اہواء سے کسی نبی کو دوسرے نبی پر فضیلت مت دو، ہاں قرآن اور حدیث کے دلائل سے فضیلت کو بیان کرو۔

آٹھواں جواب یہ ہے کہ ایک نبی کو دوسرے نبی پر فضائل کی تمام انواع و اقسام سے فضیلت مت دو، حتیٰ کہ مفضول کے لیے کوئی فضیلت باقی نہ رہے۔

نواں جواب یہ ہے کہ کسی اہل کتاب مثلاً یہودی یا نصرانی کے سامنے تمام نبیوں پر میری فضیلت مت بیان کرو، ہو سکتا ہے کہ وہ تعصب میں آکر میرے متعلق کوئی تحقیر کا کلمہ کہے۔

دسواں جواب یہ ہے کہ میری دوسرے نبیوں پر فضیلت بیان کرنے میں اتنا مبالغہ نہ کرو کہ مجھے خدائی صفات سے متصف کر دو جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں مبالغہ کیا اور انہیں خدا اور خدا کا بیٹا کہا۔

گیارہواں جواب کے ضمن میں نبی ﷺ کی شان میں غلو کرنے کی ممانعت گیارہواں جواب یہ ہے کہ دوسرے نبیوں پر میری فضیلت بیان کرنے میں اتنا مبالغہ نہ کرو کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے بڑھا دو۔

نبی ﷺ نے فرمایا میرے متعلق اس طرح غلو نہ کرو جیسے نصاریٰ نے ابن مریم کے متعلق غلو کیا، میں تو صرف اس کا بندہ ہوں پس تم کہو وہ اللہ کے بندہ اور اس کے رسول ہیں۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۴۳۵، سنن دارمی، رقم الحدیث: ۲۷۸۳، مسند ج ۱، ص ۲۳-۲۴)

اس غلو کی بعض یہ مثالیں ہیں۔

ازاں کیا جہاں دیکھو ایمان والو
پس ذکر حق ذکر ہے مصطفیٰ کا
کہ پہلے زباں حمد سے پاک ہو لے
تو پھر نام لے وہ حبیب خدا کا

یعنی نپاک زبان سے اللہ کا نام لینا تو جائز ہے اور رسول اللہ ﷺ کا نام لینا جائز نہیں ہے، جب کہ جنہی کے لیے قرآن مجید کی تلاوت کرنا ممنوع ہے اور حدیث کا پڑھنا ممنوع نہیں ہے ہرچند کہ خلاف ادب ہے، اسی طرح بے وضو کا قرآن مجید کو چھونا جائز نہیں ہے اور حدیث کو چھونا جائز ہے اگرچہ خلاف ادب ہے۔ اسی طرح غلو پر مشتمل ایک شعر یہ ہے۔

خدا جس کو پکڑے چھڑائے محمد
محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا

اللہ تعالیٰ کفار اور منافقین کی گرفت فرمائے گا تو کیا نبی ﷺ ان کو چھڑائیں گے اور جن مسلمان گنہ گاروں کو آپ چھڑائیں گے تو وہ اللہ کے اذن سے اس کی بارگاہ میں شفاعت کر کے چھڑائیں گے۔ اور دوسرے مصرع پر یہ اعتراض ہے کہ نبی ﷺ نے سردار ان قریش کے ایمان کی طمع میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم سے بے توجہی فرمائی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی طرف توجہ کرنے کا حکم دیا اور یہ آیات نازل فرمائیں۔

انہوں نے تیوری پر بل ڈالے اور منہ پھیرا ○ اس پر کہ
ان کے پاس نابینا حاضر ہوا ○ آپ کو کیا معلوم شاید کہ وہ پاکیزگی
حاصل کرے ○ یا وہ نصیحت قبول کرے تو اس کو نصیحت نفع
دے ○ اور جو بے پرواہی کرتے ہیں ○ تو آپ ان کے درپے
ہوتے ہیں ○ اور اگر وہ پاکیزگی حاصل نہ کریں تو آپ کو کوئی
ضرر نہیں ہوگا ○ اور جو شخص دوڑتا ہوا آپ کے پاس آیا ○
در آنحالیکہ وہ اپنے رب سے ڈرتا ہے ○ تو آپ نے اس سے
بے پرواہی کی۔

عَبَسَ وَ تَوَلَّى ○ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمَى ○ وَمَا
يُذْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزْكٰى ○ اَوْ يَدَّكَرُ فَتَنْفَعُهٗ
الذِّكْرٰى ○ اَمْ اَمِنَ اسْتَفْنٰى ○ فَانْتَ لَهُ
تَصَدَّى ○ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزْكٰى ○ وَاَمَّا مَنْ
جَاءَكَ يَسْعٰى ○ وَهُوَ يَخْشٰى ○ فَانْتَ عَنْهٗ
تَلَهٰى ○ (سورہ عبس: ۱۰-۱۱)

اسی طرح تین صحابہ حضرت کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع پر رسول اللہ ﷺ نے گرفت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو چھڑالیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ تبوک کی مہم بہت سخت اور دشوار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو عام تیاری کا حکم دیا مسلمان اپنی استطاعت کے مطابق تیاری کرنے میں مشغول تھے مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا تیار ہو کر چلا جاؤں گا۔ ایک چھوڑ دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں۔ میں اسی غفلت میں تھا کہ ادھر رسول اللہ ﷺ نے تیس ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دے دیا، میں نے سوچا کہ آپ روانہ ہو گئے ہیں تو کیا ہوا میں

اگلی منزل پر آپ سے جا ملوں گا اسی سوچ و بچار اور آج کل میں وقت نکل گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد میں سخت پریشان تھا سارے مدینہ میں بکے منافقوں یا معذور مسلمانوں کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا میں نے سوچا کہ میں تبوک میں نہ جانے کے متعلق کوئی عذر بیان کر کے جان بچا لوں گا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ خیریت سے تشریف لے آئے ہیں تو سارے جھوٹے عذر کافور ہو گئے اور میں نے سوچا کہ سچ کے سوا کوئی چیز اس بارگاہ میں نجات دینے والی نہیں ہے رسول اللہ ﷺ مسجد میں رونق افروز تھے صحابہ کرام جمع تھے منافقین جھوٹے عذر پیش کر کے ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے۔ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے حاضر ہوا۔ میرے سلام کا آپ نے غضب آمیز تبسم کے ساتھ جواب دیا اور میری غیر حاضری کی وجہ دریافت کی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر میں کسی دنیا دار کے سامنے پیش ہوتا تو جھوٹے عذر بیان کر کے اپنی چرب زبانی سے صاف بچ جاتا مگر یہاں تو اس ذات کے سامنے معاملہ درپیش ہے کہ اگر میں نے جھوٹ بول کر وقتی طور پر اپنے آپ کو بچا بھی لیا تو اللہ تعالیٰ آپ کو حقیقت حال سے مطلع فرمادے گا اس کے برعکس سچ بولنے سے مجھے آپ کی ناراضگی برداشت کرنی پڑے گی مگر اس کا انجام بہتر ہوگا۔ یا رسول اللہ! امر واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس غزوہ تبوک میں نہ جانے کا کوئی عذر نہیں ہے جس وقت میں آپ کے ہمراہ تبوک نہیں گیا اس وقت سے زیادہ وسعت اور فراخی مجھے کبھی حاصل نہیں تھی میں مجرم ہوں آپ جو چاہیں میرے متعلق فیصلہ فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: اس شخص نے سچ کہا ہے اچھا جاؤ اللہ کے فیصلہ کا انتظار کرو بعد میں معلوم ہوا کہ دو شخص (ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع) بھی میری طرح تھے۔ آپ نے ہم تینوں کے متعلق حکم دے دیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے سب علیحدہ رہیں سو کوئی مسلمان ہم سے بات نہیں کرتا تھا نہ سلام کا جواب دیتا تھا وہ دونوں تو خانہ نشین ہو گئے اور گھر میں روتے رہتے تھے۔ میں چونکہ سخت اور قوی تھا مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتا تھا میں آپ کو سلام کرتا تھا اور دیکھتا تھا کہ آپ کے لب مبارک حرکت کرتے ہیں یا نہیں جب میں آپ کو دیکھتا تھا تو آپ میری طرف سے منہ پھیر لیتے تھے۔ مخصوص رشتہ دار اور اعزہ بھی مجھ سے بے گانہ ہو گئے تھے ایک روز مجھے شاہ غسان کا ایک خط ملا کہ تم ہمارے ملک میں آ جاؤ وہاں تمہاری بہت آؤ بھگت ہوگی۔ میں نے سوچا کہ یہ بھی ایک ابتلاء ہے اور وہ خط میں نے جلادیا۔ چالیس دن بعد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک حکم پہنچا کہ میں اپنی بیوی سے بھی الگ ہو جاؤں چنانچہ میں نے اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا مجھے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اگر میں اسی حال میں مر گیا تو رسول اللہ ﷺ تو میری نماز جنازہ بھی نہیں پڑھیں گے اور اگر بالفرض اس اثناء میں رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا تو مسلمان میرا مستقل بایکاث رکھیں گے اور میری میت کے بھی کوئی قریب نہیں آئے گا۔ غرض پچاس دن اسی کیفیت میں گزر گئے۔ زمین اپنی وسعت کے باوجود مجھ پر تنگ ہو گئی اور مجھے زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی کہ اچانک جبل سلع (ایک پہاڑ) سے آواز آئی: "اے کعب بن مالک مبارک ہو!" میں یہ سنتے ہی سجدہ میں گر گیا معلوم ہوا کہ رات کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو یہ خبر دی کہ ہماری توبہ قبول ہو گئی ہے آپ نے نماز فجر کے بعد صحابہ کو مطلع کر کے فرمایا اور مجھے خوش خبری سنانے کے لیے ایک سوار میری طرف دوڑا مگر دوسرے شخص نے پہاڑ پر زور سے ندا کی اور سوار سے پہلے اس کی آواز مجھ تک پہنچ گئی۔ میں نے اپنے کپڑے اتار کر آواز لگانے والے کو دیے۔ پھر میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا مسلمان مجھے جوق در جوق مبارک باد دے رہے تھے۔ مہاجرین میں سب سے پہلے حضرت طلحہ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا رسول اللہ ﷺ کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیری توبہ قبول فرمائی۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۲۷۵۷، صحیح مسلم، التوبہ: ۵۳، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۳۱۸، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۳۳۲۲، صحیح ابن خزیمہ، رقم الحدیث: ۲۳۴۲، سنن الدارمی، رقم الحدیث: ۲۳۵۳، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۱۳۹۳، سنن

الترمذی، رقم الحدیث: ۳۱۰۲، مسند احمد، ج ۳، ص ۲۵۶، جامع الاصول، ج ۲، رقم الحدیث: ۶۶۲

حضرت کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع کی توبہ قبول کرنے اور ان کی نجات کے متعلق جو اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا اس کے متعلق قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئیں:

وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِعُوا حَتَّى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوا أَنْ لَا مَلْجَأَ مِنَ اللَّهِ إِلَّا إِلَىٰ يَوْمِئِذٍ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (التوبة: ۱۱۸)

اور ان تین مسلمانوں کی توبہ قبول فرمائی جن کا حکم موخر رکھا گیا تھا، حتیٰ کہ جب زمین وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر تنگ ہو گئیں اور انہوں نے یہ یقین کر لیا کہ اللہ کے سوا ان کی کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی تاکہ وہ ہمیشہ توبہ کرتے رہیں، بے شک اللہ تعالیٰ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، بہت مہربان ہے۔

ان مذکورہ صدر احادیث میں یہ تصریح ہے کہ نبی ﷺ نے ان تین صحابہ پر گرفت فرمائی اور آپ کے حکم پر مسلمانوں نے پچاس دنوں تک ان سے مقاطعہ جاری رکھا، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرما کر ان کی خلاصی کرا دی اس لیے یہ مصرع صحیح نہیں ہے کہ: ”محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا۔“

رسول اللہ ﷺ کی شان میں غلو کی ایک اور یہ مثال ہے۔

اگر	تحقیق	کنی	حرم	معنی
اگر	صدیق	بادیدہ	بنگری	قوت
نبی	جگر	و	قلب	از
نبی	گرد	محبوب	خدا	

(اگر میرے نظریہ کو جانو اور حضرت صدیق اکبر کی نظر سے دیکھو تو نبی، اللہ سے زیادہ محبوب ہیں)

یہ اشعار قرآن مجید کی اس آیت کے صراحتہً خلاف ہیں:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (البقرہ: ۱۶۵)

اور ایمان والے سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتے

ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کائنات میں سب سے افضل ہیں اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تمام مخلوق سے زیادہ آپ سے محبت ہونی چاہیے لیکن ان تمام تر عظمتوں کے باوجود نبی ﷺ اللہ کے بندہ اور اس کی مخلوق ہیں، اور خالق اور مخلوق کے درمیان اس طرح تقابل کرنا کہ مخلوق خالق سے زیادہ افضل یا زیادہ محبوب یا زیادہ با اختیار ہے صحیح انداز فکر نہیں ہے۔

امام ابو-علی احمد بن علی الترمذی ۳۰۷ھ روایت کرتے ہیں:

عمر بن قنادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت قنادہ بن النعمان رضی اللہ عنہ کی آنکھ جنگ بدر کے دن زخمی ہو گئی اور ان کی آنکھ کا ڈھیلا بہہ کر ان کے رخسار پر آ گیا، مسلمانوں نے اس کو کاٹ کر نکالنے کا ارادہ کیا، پھر نبی ﷺ سے سوال کیا، آپ نے فرمایا: نہیں! پھر حضرت قنادہ کو بلایا آپ نے اپنی ہتھیلی سے وہ ڈھیلا (اپنی جگہ رکھ کر) دبایا، پھر پتا نہیں چلتا تھا کہ ان کی کون سی آنکھ زخمی ہوئی تھی۔

(مسند ابو-علی، ج ۳، رقم الحدیث: ۱۵۴۹، دلائل النبوة للسیقی، ج ۳، ص ۱۰۰-۹۹، اسد الغابہ، ج ۳، ص ۳۷۰، رقم: ۳۷۷، الانساب،

ج ۵، ص ۳۱۸، رقم: ۷۰۹۱)

امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت قتادہ بن النعمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک کمان ہدیہ کی گئی، جنگ احد کے دن رسول اللہ ﷺ نے وہ کمان مجھے دے دی۔ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہوا اس کمان سے تیر مار رہا تھا کہ وہ کمان ٹوٹ گئی، اور میں مستقل رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا رہا جو تیر رسول اللہ ﷺ کے چہرے کی طرف آتا میں اس تیر کے سامنے اپنا چہرہ کر دیتا (اور کمان ٹوٹنے کی وجہ سے) میں اس وقت کوئی تیر نہیں مار رہا تھا، حتیٰ کہ ایک تیر آ کر میری آنکھ میں لگا جس سے میری آنکھ کا ڈھیلا نکل کر میرے چہرے پر آ گیا، میں نے وہ ڈھیلا نکال کر اپنے ہاتھ میں رکھا، جب رسول اللہ ﷺ نے میرے ہاتھ میں نکلی ہوئی آنکھ کا ڈھیلا دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور آپ نے دعا کی: اے اللہ! قتادہ نے تیرے نبی کے چہرے کو اپنے چہرے سے بچایا ہے تو اس کی اس آنکھ کو دونوں میں سے زیادہ حسین اور زیادہ تیز بنا دے، سو ان کی وہ آنکھ دونوں آنکھوں میں سے زیادہ حسین اور زیادہ تیز نظر والی تھی۔

(المعجم الکبیر، ج ۱۹، ص ۸، رقم الحدیث: ۱۲، دلائل النبوة لابی نعیم، ج ۲، رقم الحدیث: ۴۱۷، المستدرک، ج ۳، ص ۲۹۵، الاستیعاب، ج ۳، ص ۳۳۸، رقم: ۲۱۳۱، اسد الغابہ، ج ۳، ص ۳۷۰، رقم: ۳۷۷، الاصابہ، ج ۵، ص ۳۱۸، رقم: ۷۰۹۱، مجمع الزوائد، ج ۶، ص ۱۱۳)

غیر محتاط و اطمینان اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کی دی ہوئی آنکھ میں اتنی روشنی نہیں تھی جتنی مصطفیٰ ﷺ کی دی ہوئی آنکھ میں روشنی تھی، اللہ اور اس کے رسول کی عطا میں تقابل کا یہ انداز بہت خطرناک ہے، یہ دونوں آنکھیں اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی تھیں فرق یہ ہے کہ ایک آنکھ ماں باپ کے جسمانی تو سل سے ملی تھی اور دوسری آنکھ رسول اللہ ﷺ کی دعا سے ملی تھی اس لیے اس آنکھ کا حسن اور اس کی نظر دوسری آنکھ سے زیادہ تھی۔ بہر حال رسول اللہ ﷺ کی فضیلت بیان کرنے میں غلو اور مبالغہ نہیں کرنا چاہیے۔ آپ کی صفات خدا کے برابر بیان کی جائیں، نہ آپ کو خدا سے بڑھایا جائے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا: مجھے انبیاء کے درمیان فضیلت مت دو۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۴۶۳۸) نیز آپ نے فرمایا: بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت مت دو۔ (مسند احمد ج ۳، ص ۴۱) اور فرمایا: مجھے انبیاء پر فضیلت مت دو، اور نہ یونس بن متی پر (البدایہ والنہایہ، ج ۱، ص ۱۷۱) اور ان سب احادیث کا ایک محمل یہ ہے کہ مجھے خدا کے برابر نہ کرو یا مجھے خدا سے نہ بڑھاؤ اور اس محمل کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ نے فرمایا: میرے متعلق اس طرح غلو نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کے متعلق غلو کیا تھا، پس تم کہو وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۴۴۵) اس توجیہ کے بیان کرنے کے سلسلہ میں کلام طویل ہو گیا کیونکہ ہمارے زمانہ میں انبیاء علیہم السلام کی شان بیان کرنے میں بہت افراط اور تفریط ہے، بعض لوگ آپ کی شان بیان کرنے سے مطلقاً منع کرتے ہیں اور آپ کے فضائل میں قطع برید کرتے ہیں اور بعض اس میں افراط کرتے ہیں اور حد سے گزر جاتے ہیں، میں نے اصلاح کی اپنی سی کوشش کی ہے، اللہ تعالیٰ ان سطور میں اثر آفرینی فرمائے۔ (آمین) اب میں اس حدیث کے بقیہ تشریح طلب اجزاء کی وضاحت کرتا ہوں۔ فاقول وباللہ التوفیق وبہ الاستعانة یلیق۔

صعقہ کا معنی

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صور میں پھونکا جائے گا تو جو آسمان میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب پر صعقہ طاری ہوگا، ماسوا ان کے جن کو اللہ چاہے۔ (الزمزم: ۶۸) صعقہ کا معنی موت ہے اور کبھی اس سے مراد بے ہوشی بھی ہوتی ہے، جیسے اس آیت میں ہے وخر موسیٰ صعقاً (الاعراف: ۱۴۳) اس آیت میں جن لوگوں کا صعقہ سے استثناء کیا ہے ان کے مصداقوں میں

جلد چہارم

تبیان القرآن

اختلاف ہے، ایک قول یہ ہے کہ وہ فرشتے ہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ وہ انبیاء ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ وہ شہداء ہیں۔ اور صحیح یہ ہے کہ ان کی تحسین میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں ہے، اور ان میں سے ہر ایک محتمل ہے۔

پھر آپ نے فرمایا: پھر دوسری بار صور میں پھونکا جائے گا تو سب سے پہلے مجھے قبر سے اٹھایا جائے گا تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام عرش کو پکڑے ہوئے ہوں گے، میں از خود نہیں جانتا کہ طور کے دن کی بے ہوشی میں ان کا شمار کر لیا گیا یا (وہ بے ہوش تو ہوئے تھے لیکن) ان کو مجھ سے پہلے اٹھایا گیا۔

انبیاء علیہم السلام کی حیات پر دلائل

علامہ ابو العباس احمد بن عمر قرظی متوفی ۶۵۶ھ نے فرمایا ہے کہ جب پہلی بار صور میں پھونکا جائے گا تو اس سے انبیاء علیہم السلام صرف بے ہوش ہوں گے اور عام انسان سب مرجائیں گے، سو عام لوگوں کے حق میں معتقد کا معنی موت ہے اور انبیاء علیہم السلام کے حق میں معتقد کا معنی بے ہوشی ہے، کیونکہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں ان کے حق میں موت کا معنی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہونا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ شہداء اپنے قتل ہونے اور موت کے بعد اپنے رب کے پاس زندہ ہوتے ہیں، ان کو رزق دیا جاتا ہے اور وہ خوش اور مسرور ہوتے ہیں اور یہ دنیا میں زندہ لوگوں کی صفات ہیں، اور جب شہداء کا یہ مقام ہے تو انبیاء علیہم السلام تو اپنی وفات کے بعد اس حال کے زیادہ لائق اور حقدار ہیں۔ اس کے علاوہ صحیح حدیث میں ہے نبی ﷺ نے فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے اجسام کو کھانا حرام کر دیا ہے۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۱۰۳۷، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۱۳۷۳، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۱۶۳۶)

نیز شب معراج تمام انبیاء علیہم السلام ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کے ساتھ مسجد اقصیٰ میں جمع ہوئے، خصوصاً موسیٰ علیہ السلام کو نبی ﷺ نے قبر میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ (صحیح مسلم، فضائل انبیاء: ۱۵۶، ۲۳۷۳-۲۳۷۴)

اس طرح کی احادیث بہت زیادہ ہیں جن کے مجموعہ سے اس بات کا یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی موت کا معنی یہ ہے کہ وہ ہم سے غائب ہو گئے بایں طور کہ ہم ان کا ادراک نہیں کر سکتے، ہر چند کہ وہ موجود اور زندہ ہیں اور ان کا حال فرشتوں کی طرح ہے کہ وہ بھی موجود اور زندہ ہیں اور ہماری نوع میں سے کوئی شخص ان کو نہیں دیکھتا سوائے اولیاء اللہ کے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کرامت کے ساتھ خاص کر لیا ہے، اور جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں تو وہ آسمان اور زمین کے درمیان ہیں اور جب صور میں پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمینوں میں ہر شخص پر صعقہ طاری ہو گا سوا ان کے جن کو اللہ چاہے، غیر انبیاء کے معتقد کا معنی ہے وہ مرجائیں گے اور انبیاء علیہم السلام صرف بے ہوش ہوں گے۔ اور جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو جو مر گئے تھے وہ زندہ ہو جائیں گے اور جو بے ہوش ہوئے تھے وہ ہوش میں آجائیں گے، اسی لیے نبی ﷺ نے فرمایا میں وہ پہلا شخص ہوں گا جو ہوش میں آئے گا اور یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ حقیقتاً سب سے پہلے ہوش میں آئیں گے اور تمام لوگوں سے پہلے اپنی قبر مبارک سے باہر آئیں گے، خواہ وہ انبیاء ہوں یا ان کے غیر، ماسوا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کیونکہ ان کے متعلق نبی ﷺ کو تردد تھا، آیا وہ آپ سے پہلے ہوش میں آگئے تھے یا وہ پہلے صعقہ سے بے ہوش ہی نہیں ہوئے اور اس کے قائم مقام طور کی بے ہوشی تھی، بہر حال جو بھی شکل ہو اس حدیث کی رو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک ایسی فضیلت حاصل ہے جو ان کے غیر میں سے کسی کو بھی حاصل نہیں۔

(المعجم، ج ۶، ص ۲۳۲-۲۳۱، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبی ﷺ پر فضیلت جزی کی تحقیق

علامہ قرطبی کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی ﷺ پر فضیلت جزی حاصل تھی کہ وہ یا تو پہلے معذ سے بے ہوش نہیں ہوئے یا بے ہوش تو ہوئے تھے لیکن آپ سے پہلے ہوش میں آگئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ بدر الدین عینی نے بھی یہ لکھا ہے کہ ہر صورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے فضیلت ثابت ہے۔ (فتح الباری، ج ۶، ص ۳۳۵، طبع لاہور، عمدة القاری، ج ۱۲، ص ۲۵۱)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں:

نیز یہ فضیلت جزی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ثابت ہے اور یہ فضیلت کلی کے منافی نہیں ہے۔

(اشعة اللمعات، ج ۳، ص ۲۵۱، مطبوعہ تیج کمار لکھنؤ)

ملا علی بن سلطان محمد القاری المتوفی ۱۰۱۳ھ لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس فضیلت کے ساتھ خاص ہونا اس بات کو واجب نہیں کرتا کہ وہ اس ذات سے بڑھ جائیں جو ان پر فضائل کثیرہ اور متعدد وجوہ سے مقدم ہیں۔ (مرقات، ج ۱۱، ص ۱۷، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۳۹۰ھ)

اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام ابو البشر اور اول انسان ہیں اور نبی ﷺ پر ان کی یہ فضیلت جزی ہے لیکن فضیلت کلی نبی ﷺ کو ہی حاصل ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ فضیلت ہے کہ وہ اپنی ثانی کی دعا کی وجہ سے اپنی ولادت کے وقت میں شیطان سے محفوظ رہے اور انہوں نے پنگورے میں کلام کیا اور بچپن ہی میں اپنی نبوت کا اعلان کیا۔ لیکن فضیلت کلی کے حامل صرف نبی ﷺ ہیں۔ علامہ یحییٰ بن شرف نوادی متوفی ۶۷۶ھ نے ایک اور جواب دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

قاضی عیاض فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا تھا کہ ”میں (از خود) نہیں جانتا کہ حضرت موسیٰ بے ہوش ہی نہیں ہوئے یا مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے۔“ یہ اس وقت کی بات ہے جب نبی ﷺ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ حقیقتاً سب سے پہلے آپ ہوش میں آکر قبر سے نکلیں گے۔ اور آپ ہی علی الاطلاق سب سے پہلے اٹھیں گے۔ اور جو گروہ سب سے پہلے قبروں سے اٹھے گا اس میں علی الاطلاق سب سے پہلے آپ اٹھیں گے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اسی گروہ سے ہوں گے۔

(صحیح مسلم بشرح النوادی، ج ۱۰، ص ۶۲۳۳، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ، ۱۳۱۷ھ)

قاضی عیاض اور علامہ نووی کے اس جواب کے اعتبار سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبی ﷺ پر فضیلت جزی بھی نہیں رہی، نبی ﷺ علی الاطلاق سب سے پہلے قبر سے اٹھیں گے۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں تمام اولاد آدم کا سردار ہوں اور میں وہ ہوں جو سب سے پہلے قبر سے اٹھے گا۔ اور میں سب سے پہلے شفاعت کرنے والا ہوں اور میں وہ ہوں جس کی شفاعت سب سے پہلے قبول کی جائے گی۔

(صحیح مسلم، فضائل: ۳ (۲۲۷۸) ۵۸۳۰، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۶۷۳، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۱۵۹، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۳۰۸، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۶۳۷۸، مسند احمد، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۰۹۸۷، طبع جدید دار الفکر، مسند احمد، ج ۱، ص ۲۸۱، ج ۳، ص ۳۳۲، المستدرک، ج ۲، ص ۳۶۵، دلائل النبوة، ج ۱، ص ۱۳، کنز العمال، رقم الحدیث: ۳۱۸۷۹)

قاضی عیاض مالکی متوفی ۵۳۴ھ اور علامہ نووی شافعی، متوفی ۶۷۶ھ کے جواب کو علامہ ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ، علامہ سنوسی مالکی متوفی ۸۹۵ھ، علامہ بدر الدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ، علامہ سیوطی شافعی متوفی ۹۱۱ھ اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی، متوفی

۱۰۵۲ھ نے بھی اپنی شروحات میں نقل کیا ہے:

(اکمال اکمال المعلم ج ۸، ص ۱۳۷، معلم الکمال ج ۸، ص ۱۳۷، عمدۃ القاری ج ۱۲، ص ۲۵۱، الدبیاج ج ۲، ص ۲۰۳، اشعۃ

اللمعات ج ۲، ص ۴۵۱)

بظاہر اس حدیث سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبی ﷺ پر فضیلت لازم آتی ہے۔ مدت دراز سے میں اس اشکال کا جواب دینا چاہتا تھا اور اس حدیث کی مکمل تحقیق کرنا چاہتا تھا، اس کے باوجود نہ جانے کسی وجہ سے شرح صحیح مسلم میں اس کی تشریح مجھ سے رہ گئی، زیر تفسیر آیت میں چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر بے ہوش ہونے کا ذکر ہے اور اس حدیث میں اس کا حوالہ ہے، اس مناسبت سے میں نے اس حدیث کو یہاں ذکر کیا اور اس کی تفصیل اور تحقیق کی۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے اور اس کو اثر آفریں بنائے۔ (آمین) اب پھر میں بقیہ آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: فرمایا: اے موسیٰ! میں نے تم کو لوگوں پر اپنے پیغام اور اپنے کلام سے فضیلت دی، پس میں نے

تم کو جو کچھ دیا ہے وہ لے لو، اور شکر ادا کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ (الاعراف: ۱۴۴)

دیدار نہ کرانے کی تلافی میں کلام سے مشرف فرمانا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اس کے دیدار کو طلب کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کی تلافی میں اور دوسری عظیم نعمتیں عطا فرمائیں گویا کہ یوں فرمایا کہ اگر تم کو دولت دیدار حاصل نہیں ہوئی تو تم رنجیدہ نہ ہو میں تمہیں ایک اور عظیم نعمت عطا فرما رہا ہوں وہ میری رسالت اور میرا کلام ہے، سو تم اس نعمت پر میرا شکر ادا کرو۔ اس آیت میں فرمایا ہے: میں نے تم کو اپنے پیغام اور اپنے کلام سے لوگوں پر فضیلت دی ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے اللہ تعالیٰ نے اوروں کو بھی رسول بنایا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو رسالت اور کلام دونوں کے مجموعہ سے نوازا ہے۔ اور یہاں پر یہ نہیں فرمایا کہ رسالت اور کلام کے ساتھ میں نے تم کو مخلوق پر فضیلت دی ہے بلکہ فرمایا ہے لوگوں پر فضیلت دی ہے، کیونکہ مخلوق میں فرشتے بھی ہیں اور فرشتے اللہ کا کلام بلا واسطہ سنتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس عظیم نعمت پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور کسی نعمت پر شکر کرنے کا معنی یہ ہے کہ اس کے لوازم اور تقاضوں پر عمل کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے ان کے لیے (تورات کی) تختیوں میں ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی تھی، سو ان تختیوں کو قوت کے ساتھ پکڑو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اس کی بہترین باتوں پر عمل کریں، عنقریب میں تم کو فاسقوں کا گھر دکھاؤں گا۔ (الاعراف: ۱۴۵)

تورات کی تختیوں کا مادہ، تعداد اور نزول کی تاریخ

امام عبدالرحمن بن محمد بن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ تورات سونے کے قلموں سے لکھی گئی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات زمرد کی سات تختیوں میں عطا فرمائی تھی، اس میں ہر چیز کا بیان تھا، اور اس میں نصیحتیں لکھی ہوئی تھیں، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات لے کر

آئے تو انہوں نے دیکھا کہ بنو اسرائیل پھڑے کے سامنے بیٹھے ہوئے عبادت کر رہے ہیں، تو جوش غضب سے ان کے ہاتھوں سے تورات گر کر ٹوٹ گئی، پھر وہ ہارون کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کو سر سے پکڑ لیا، پھر اللہ تعالیٰ نے تورات کے چھ حصے اوپر اٹھا لیے اور ایک حصہ رہ گیا۔

جعفر بن محمد اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو تورات نازل کی گئی تھی وہ بیری کے پتوں پر لکھی ہوئی تھی اور اس لوح کا طول بارہ ہاتھ تھا۔

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ تورات کی تختیاں یا قوت کی تھیں اور میں کہتا ہوں کہ وہ زمرد کی تھیں اور اس پر سونے سے لکھا ہوا تھا، اور رخصن تبارک و تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا اور آسمان والوں نے قلم چلنے کی آواز سنی۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

امام ابن ابی شیبہ، امام عبد بن حمید اور امام ابن المنذر نے حکیم بن جابر سے روایت کیا ہے کہ مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کے سوا کسی چیز کو پیدا کرنے میں اپنا ہاتھ نہیں لگایا، اپنے ہاتھ سے جنت میں پودا لگایا، ورس (ایک قسم کی گھاس، جس سے سرخ رنگ نکلتا ہے) اور زعفران کو اس کی مٹی بنایا اور اس میں مشک کے پھاڑ بنائے، حضرت آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا۔ (الدر المشورج ۳، ص ۵۳۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

امام عبد الرحمن بن محمد بن علی بن الجوزی الحنبلی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

تورات کی الواح کے متعلق سات قول ہیں: حضرت ابن عباس نے فرمایا: وہ زمرد کی الواح تھیں، سعید بن جبیر نے کہا: یا قوت کی تھیں، مجاہد نے کہا: سبز زمرد کی تھیں، ابو العالیہ نے کہا: ایک قسم کے کپڑے کی تھیں، حسن بصری نے کہا: لکڑی کی تھیں، وہب بن منبہ نے کہا: پتھر کی تھیں، مقاتل نے کہا: زمرد اور یا قوت کی تھیں۔ ان کی تعداد میں بھی اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: سات الواح تھیں، ابو صالح نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے: دو تختیاں تھیں، اور یہ فراک مختار ہے۔ وہب بن منبہ نے کہا: دس تھیں، مقاتل نے کہا: نو تھیں۔ (زاد المسیرج ۳، ص ۲۵۸، مطبوعہ المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۷ھ)

امام رازی نے لکھا ہے کہ یوم عرفہ (۹ ذوالحجہ) کو حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوئے تھے اور یوم النحر (دس ذی الحجہ) کو اللہ تعالیٰ نے ان کو تورات عطا فرمائی۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۱۰، مطبوعہ احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

تورات میں ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل مذکور ہونے کی توجیہ

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں فرمایا ہے: اور ہم نے ان کے لیے (تورات کی) تختیوں میں ہر چیز کی نصیحت لکھ دی تھی۔

ہر چیز سے مراد عموم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو اپنے دین میں حلال، حرام اور اچھی اور بری چیزوں کے متعلق جن احکام کی احتیاج تھی وہ سب تورات میں لکھی ہوئی تھیں۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۶۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابن جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ فرمایا ہے: ہر چیز سے مراد احکام شرعیہ ہیں مثلاً فرض، واجب، حلال اور حرام وغیرہ۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد ہر چیز کی حکمتیں اور عبرتیں وغیرہ ہیں۔ (زاد المسیرج ۳، ص ۲۵۸، طبع بیروت)

علامہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے کہ عرف اور محاورہ میں کل شئی سے مراد حقیقتاً عموم نہیں ہوتا جیسے کہتے ہیں فلاں آدمی کے پاس ہر چیز ہے، یا میں شہر میں گیا اور میں نے ہر چیز خرید لی۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۸، ص ۲۵۳)

میں کہتا ہوں اس سے عموم بھی مراد ہو سکتا ہے جب کہ اس کا یہ معنی کیا جائے کہ ان کو دنیا میں صلاح اور آخرت میں فلاح کے لیے جس قدر احکام کی احتیاج تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ تمام احکام تورات کی الواح میں لکھ دیے تھے۔

اس کے بعد فرمایا: ”اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی تھی“۔ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کو جس قدر احکام شرعیہ دیے تھے تورات میں ان تمام احکام کی تفصیل لکھ دی تھی، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اجمالی احکام بیان فرمائے ہیں اور ان کی تفصیل سنت اور قیاس سے معلوم ہوتی ہے، لیکن بنو اسرائیل کے لیے احکام کا ماخذ صرف تورات تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام تفصیلات تورات ہی میں لکھ دی تھیں۔ مثلاً نماز کا قرآن مجید میں اجمالی حکم ہے، پانچ اوقات کی تفصیل اور تعین درج نہیں نہ نماز کی رکعات کی تعداد کا بیان ہے اور ہر رکعت میں کیا پڑھنا ہے، اس کا بھی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی مقدار اور نصاب کا قرآن مجید میں ذکر نہیں ہے۔ حج کے فرائض، ارکان، شرائط اور موانع کا ذکر نہیں ہے، ان تمام امور کی تفصیل سنت میں ہے، اسی طرح بعض احکام قیاس سے ثابت ہوتے ہیں مثلاً خمر کو قرآن مجید نے حرام کیا ہے لیکن دیگر نشہ آور چیزوں کی حرمت قیاس سے ثابت ہے۔ بنو اسرائیل کے لیے قیاس اور اجتہاد نہیں تھا نہ ان کے ہاں سنت اور حدیث کی شرعی حیثیت تھی۔ ان کے احکام کا ماخذ صرف تورات تھی، لہذا جو تفصیلات ہم کو سنت اور اجتہاد سے معلوم ہوتی ہیں، وہ تمام تفصیلات اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تورات میں لکھ دی تھیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تورات میں احکام بھی لکھے اور تمام احکام سے متعلق ہر تفصیل لکھ دی، اس لیے فرمایا: ہم نے تورات کی الواح میں ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔

تورات کے احکام کا درجہ بہ درجہ ہونا

اس کے بعد فرمایا: اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اس کی بہترین باتوں پر عمل کریں۔

آیت کے اس حصہ پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ تورات میں کچھ ایسے حکم بھی ہیں جو بہترین نہیں ہیں۔ اس اعتراض کے حسب ذیل جوابات ہیں:

۱- یہ معنی، مفہوم مخالف کے اعتبار سے لیا گیا ہے، اور ہمارے نزدیک قرآن اور حدیث میں مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے، اور تورات کے تمام احکام بہترین ہیں اور جن ائمہ کے نزدیک مفہوم مخالف معتبر ہے، ان کے اعتبار سے جو اب یہ ہے کہ تورات کے احکام درجہ بہ درجہ ہیں اور بعض احکام بعض سے زیادہ بہتر ہیں۔

۲- بنو اسرائیل کو برے کاموں سے روکا گیا تھا اور نیک کاموں کا حکم دیا گیا تھا اور برائی سے رکنا، نیکی کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

۳- معاف کر دینا قصاص لینے سے بہتر ہے، اور صبر کرنا بدلہ لینے سے بہتر ہے۔ سو ان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ قصاص لینے کی بجائے معاف کر دیں اور بدلہ لینے کی بجائے صبر کریں، اس کی نظیر قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ ۝
وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ
فَاجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ
(الشوری: ۴۰-۳۹)

اور وہ لوگ جن پر جب (کسی کا) ظلم پہنچے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ اسی کی مثل برائی ہے، پس جس نے معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ (کرم) پر ہے، بے شک وہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

اس کے بعد فرمایا:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ
الْأُمُورِ ۝ (الشوری: ۴۳)

اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ ضرور ہمت کے کاموں (بہترین کاموں) میں سے ہے۔

۳- تورات میں فرائض، نوافل اور مباح کاموں کے احکام ہیں، فرائض اور نوافل پر عمل کرنا، بہترین عمل ہے اور صرف فرائض پر عمل کرنا اس سے کم درجہ کا ہے اور مباح پر عمل کرنا اس سے بھی کم درجہ کا ہے۔ اسلام میں بھی احکام درجہ بہ درجہ ہیں، پہلے فرائض کا مرتبہ ہے پھر واجبات کا، پھر سنن کا، پھر مستحبات کا، پھر مباحات کا۔

اس کے بعد فرمایا: ”عنقریب میں تم کو فاسقوں کا گھر دکھاؤں گا“۔ حسن اور مجاہد نے کہا: اس سے مراد جہنم ہے۔ عطیہ عوفی نے کہا: اس سے مراد فرعون اور اس کی قوم کا گھر ہے جو کہ مصر ہے۔ قتادہ نے کہا: اس سے مراد جبارہ اور عمالقہ کے گھر ہیں، جو ان کو اللہ نے شام میں دخول کے وقت دکھائے تھے۔ سدی نے کہا: اس سے مراد یہ ہے کہ میں عنقریب تم کو ان لوگوں کا انجام دکھاؤں گا جنہوں نے میرے احکام کی مخالفت کی تھی، سو یہ تمہید اور تحذیر ہے۔ (زاد المسیر ج ۳، ص ۲۶۰)

الواح تورات میں نبی ﷺ اور آپ کی امت کی خصوصیات

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ بیان کرتے ہیں:

امام عبد بن حمید، امام ابن ابی حاتم اور امام ابو الشیخ نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے کہا: اے میرے رب! میں نے تورات کی الواح میں یہ پڑھا ہے کہ ایک امت سب سے آخر میں پیدا ہو گئی اور سب سے پہلے جنت میں داخل ہوگی، تو ان کو میری امت بنا دے! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب میں نے تورات کی الواح میں پڑھا ہے کہ ایک امت سب سے بہترین امت ہے وہ لوگوں کو نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے اور اللہ پر ایمان لائیں گے، تو ان کو میری امت بنا دے، فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک امت پہلی کتاب پر اور آخری کتاب پر ایمان لائے گی اور وہ گمراہوں سے قتال کرے گی، حتیٰ کہ کانے کذاب سے قتال کرے گی تو ان کو میری امت بنا دے، فرمایا: وہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک امت اپنے صدقات کو کھائے گی اور اس کو اس پر اجر ملے گا تو اس کو میری امت بنا دے، فرمایا: وہ امت احمد ہے۔ (قتادہ نے کہا: تم سے پہلی امتوں میں جب کوئی شخص صدقہ کرتا اور اس کا وہ صدقہ قبول ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ اس پر ایک آگ بھیجتا وہ اس صدقہ کو کھا لیتی اور اگر وہ صدقہ قبول نہ ہوتا تو وہ یونہی پڑا رہتا اور اس کو درندے اور پرندے کھا جاتے اور بے شک اللہ نے تمہارے فقراء کے لیے تمہارے اغنیاء سے صدقات کو لیا اور یہ اس کی تم پر تخفیف اور رحمت ہے) کہا: اے میرے رب! میں نے تورات کی الواح میں پڑھا ہے کہ اس امت کا جب کوئی شخص کسی نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو اس کے لیے بھی ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور جب وہ اس نیکی پر عمل کرے تو اس جیسی دس نیکیوں سے لے کر سات سو نیکیاں اور اس کی دگنی نیکیاں لکھی جاتی ہیں، تو ان کو میری امت بنا دے، فرمایا: یہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب! میں نے تورات کی الواح میں یہ پڑھا ہے، اس امت کا کوئی شخص جب کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اس کو اس وقت تک نہیں لکھا جاتا جب تک کہ وہ اس پر عمل نہ کرے اور جب وہ عمل کرے تو پھر اس کا ایک گناہ لکھا جاتا ہے تو اس کو میری امت بنا دے، فرمایا: یہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب میں نے تورات کی الواح میں پڑھا ہے کہ وہ امت لوگوں کی دعوت قبول کرے گی اور ان کی دعا قبول کی جائے گی تو ان کو میری امت بنا دے، فرمایا: وہ امت احمد ہے، پھر حضرت موسیٰ نے کہا: اے اللہ! مجھے امت احمد بنا دے، فرمایا: میں تم کو دو ایسی چیزیں دے رہا ہوں جو میں نے کسی کو نہیں دیں، میں نے تم کو اپنی رسالت اور اپنے کلام کے ساتھ فضیلت دی ہے، یہ ایک چیز ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام راضی ہو گئے اور دوسری چیز یہ ہے کہ موسیٰ کی قوم سے ایک امت ایسی ہوگی جو حق کے ساتھ ہدایت دے گی اور حق کے ساتھ عدل کرے گی۔ پھر موسیٰ علیہ السلام مکمل راضی ہو گئے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۶۳، رقم الحدیث: ۸۹۶۵)

امام ابو الشیخ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جب تورات میں ان خصوصیات کو پڑھا جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ کو عطا کی ہیں تو اپنے رب سے کہا: اے رب! وہ کون سے نبی ہیں جن کو اور جن کی امت کو تو نے اول و آخر بنایا ہے؟ فرمایا وہ محمد نبی امی عربی حرمی تہامی ہیں جو قاذر بن اسماعیل کی اولاد سے ہیں ان کو میں نے محشر میں اول بنایا ہے اور ان کو میں نے (دنیا میں) آخر بنایا ہے اور ان پر رسولوں کو ختم کر دیا ہے، اے موسیٰ! میں نے ان کی شریعت کے ساتھ تمام شرائع کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور ان کی کتاب کے ساتھ تمام کتابوں کو، اور ان کی سنت کے ساتھ تمام سنتوں کو، اور ان کے دین کے ساتھ تمام ادیان کو۔ کہا: اے رب! بے شک تو نے مجھے منتخب کیا ہے اور مجھ سے کلام فرمایا ہے، فرمایا: اے موسیٰ! بے شک تم میرے صفی ہو اور وہ میرے محبوب ہیں، قیامت کے دن میں ان کو بلندی پر اٹھاؤں گا اور ان کے حوض کو سب سے بڑا حوض بناؤں گا اور ان کے حوض پر سب سے زیادہ لوگ آئیں گے، اور ان کے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے۔ کہا: اے رب! تو نے ان کو مکرم اور مشرف بنایا ہے، فرمایا: اے موسیٰ! مجھ پر حق تھا کہ میں ان کو مکرم بناتا اور ان کو اور ان کی امت کو فضیلت دیتا، کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لائیں گے اور میرے تمام رسولوں پر ایمان لائیں گے اور میرے تمام غیب پر ایمان لائیں گے۔

کہا: اے میرے رب! یہ ان کی نعت ہے، فرمایا: ہاں! کہا: اے میرے رب! کیا تو نے ان کو جمعہ حبہ کیا ہے یا میری امت کو؟ فرمایا بلکہ جمعہ ان کے لیے ہے نہ کہ تمہاری امت کے لیے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں ایک امت کی یہ صفت دیکھی ہے کہ ان کا چہرہ اور ان کے ہاتھ پیر سفید ہوں گے، وہ کون ہیں؟ آیا وہ بنو اسرائیل ہیں یا کوئی اور ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، وضو کے آثار سے (قیامت کے دن) ان کا چہرہ اور ان کے ہاتھ پیر سفید ہوں گے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم پل صراط سے بجلی اور آندھی کی طرح گزرے گی، وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم پانچ نمازیں پڑھے گی، وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے نیک لوگ بدکاروں کی شفاعت کریں گے، وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کا کوئی شخص کوئی گناہ کرے گا پھر وضو کرے گا تو اس کا گناہ بخش دیا جائے گا اور جب وہ نماز پڑھے گا تو بغیر کسی گناہ کے نماز پڑھے گا، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم تیرے رسولوں کی تبلیغ کی گواہی دے گی، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا جائے گا جو دوسری امتوں پر حرام تھا، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے لیے تمام روئے زمین تیمم کا آلہ اور مسجد بنا دی جائے گی، وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہیں، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم ایسی ہوگی کہ اس کا ایک آدمی پچھلی امتوں کے تیس آدمیوں سے افضل ہوگا، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم تجھ سے محبت کرے گی، تیرے ذکر میں پناہ لے گی، تیری خاطر غضب میں آئے گی، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے۔ کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے اعمال کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور فرشتے ان کو گلے لگائیں گے، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب! میں نے تورات میں پڑھا ہے کہ ایک قوم کے نیک لوگ جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے، اور ان کے درمیانی طبقہ کے لوگوں سے آسان حساب لیا جائے گا، اور ان کے ظالموں کو بخش دیا جائے گا، وہ کون ہیں؟ فرمایا: وہ امت احمد ہے، کہا: اے میرے رب!

مجھے اس امت میں سے کر دے، فرمایا: اے موسیٰ! تم ان میں سے ہو اور وہ تم میں سے ہیں، کیونکہ تم بھی میرے دین پر ہو اور وہ بھی میرے دین پر ہیں لیکن میں نے تم کو اپنی رسالت اور ہم کلام ہونے کی فضیلت عطا کی ہے سو تم شکر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ۔ (الدر المنثور، ج ۳، ص ۵۵۵-۵۵۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں عنقریب ان لوگوں (کے دلوں) کو اپنی آیات سے پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں، وہ اگر تمام نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ایمان نہیں لائیں گے اور اگر وہ ہدایت کا راستہ دیکھ لیں پھر بھی اس کو اختیار نہیں کریں گے اور اگر وہ گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اختیار کر لیں گے کیونکہ انہوں نے (ہمیشہ) ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور وہ ان سے غفلت برتتے رہے۔ (الاعراف: ۱۳۶)

اللہ کی آیات سے کفار کے دلوں کو پھیرنے کی توجیہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: میں عنقریب ان لوگوں (کے دلوں) کو اپنی آیات سے پھیر دوں گا جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں کو اپنی آیات سے پھیر دیا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان نہ لانے پر کفار کی مذمت کیوں فرمائی ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (الانشقاق: ۲۰)
فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ مُعْرِضِينَ
ان کو کیا ہوا وہ ایمان کیوں نہیں لاتے؟
انہیں کیا ہوا کہ وہ نصیحت سے اعراض کر رہے ہیں۔
(المدثر: ۳۹)

اس کا جواب یہ ہے کہ حسن بصری سے منقول ہے کہ جب کفار اپنے کفر میں مبالغہ کرتے ہیں اور اس حد تک پہنچ جاتے ہیں جس میں ان کا قلب مرجاتا ہے تو پھر ان کو کوئی ہدایت مفید نہیں ہوتی اور ان لوگوں کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اپنی آیات سے پھیر دیتا ہے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔
تکبر کا لغوی اور شرعی معنی

اس آیت میں تکبر کرنے والوں پر بھی وعید فرمائی ہے۔ تکبر کا معنی بیان کرتے ہوئے امام راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ فرماتے ہیں: دل میں اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا اور بڑا سمجھنے کی وجہ سے انسان کو جو حالت حاصل ہوتی ہے اس کو تکبر کہتے ہیں اور سب سے بڑا تکبر یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے تکبر کرے اور حق کو ماننے اور قبول کرنے سے انکار کرے اور عبادت کرنے سے عار محسوس کرے، اگر انسان بڑائی کو حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرے تو یہ محمود ہے اور اگر انسان اپنی بڑائی ظاہر کرے اور اس میں وہ بڑے اوصاف نہ ہوں تو یہ مذموم ہے۔

(المفردات ج ۲، ص ۵۳۵، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

”وہ تکبر کرتے ہیں“ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو افضل الخلق سمجھتے ہیں اور ان کو وہ اختیار حاصل ہے جو ان کے غیر کو حاصل نہیں ہے اور یہ تکبر صرف اللہ کو زیبا ہے کیونکہ وہی ایسی قدرت اور ایسی فضیلت کا مالک ہے جو کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہے، اس لیے وہی تکبر کی صفت کا مستحق ہے۔ بعض علماء نے یہ کہا کہ تکبر کی تعریف یہ ہے کہ انسان دوسروں پر اپنی بڑائی ظاہر کرے اور تمام بندوں کے حق میں تکبر کی صفت مذموم ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حق میں تکبر کی صفت محمود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کا مستحق ہے کہ وہ دوسروں پر اپنی بڑائی ظاہر فرمائے اور اس کے

لے یہ حق ہے اور دوسروں کے لیے باطل ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۶۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)
امام راغب اصفہانی اور امام رازی نے تکبر کا جو معنی بیان کیا ہے وہ درست ہے لیکن تکبر کا شرعی معنی وہ ہے جو نبی ﷺ
کی اس حدیث سے مستفاد ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس شخص کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی
تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک شخص نے کہا: آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو اور اس کی جوتی اچھی ہو، آپ
نے فرمایا: اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر حق بات کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔

(صحیح مسلم الایمان: ۱۳۷، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۴۰۹۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۹۸، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۵۹،
مسند احمد ج ۱، ص ۴۵۱، رقم الحدیث: ۴۳۱۰، جامع الاصول رقم الحدیث: ۸۲۱۰)

تکبر کے معنی کی مزید وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: روئے زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ
جو اس حال میں مرے کہ اس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی تکبر ہو مگر اللہ اس کو دوزخ میں (داخل) کر دے گا، جب
حضرت عبداللہ بن قیس انصاری نے یہ حدیث سنی تو وہ رونے لگے۔ نبی ﷺ نے پوچھا: اے عبداللہ بن قیس تم کیوں رو رہے
ہو؟ انہوں نے کہا: آپ کے ارشاد کی وجہ سے، آپ نے فرمایا: تمہیں مبارک ہو تم جنت میں ہو گے۔ پھر نبی ﷺ نے ایک لشکر
بھیجا اس میں انہوں نے جہاد کیا اور شہادت پائی۔ آپ نے پھر اس حدیث کو تین بار دہرایا، انصار میں سے ایک شخص نے کہا: یا نبی
اللہ! میں جمال سے محبت کرتا ہوں، میں تلوار حمل کرتا ہوں اور میلے کپڑے دھوتا ہوں اپنی جوتی اور اس کے تسموں کو حسین
بناتا ہوں۔ نبی ﷺ نے فرمایا: میری مراد یہ نہیں ہے، تکبر حق کا انکار کرنا ہے اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔ اس نے کہا: یا نبی اللہ!
حق کے انکار کرنے اور لوگوں کو حقیر جاننے کا کیا معنی ہے؟ آپ نے فرمایا: حق کا انکار یہ ہے کہ تمہارا کسی شخص پر مال ہو وہ اس کا
انکار کر دے اور کہے کہ اس کے اوپر کوئی حق نہیں ہے، پھر کوئی شخص اس کو اللہ سے ڈرنے کا حکم دے تو وہ اس کا انکار کرے،
اور لوگوں کو حقیر جاننا یہ ہے کہ ایک شخص ناک چڑھا کر آئے اور جب وہ پس ماندہ اور فقراء لوگوں کو دیکھے تو ان کو سلام نہ کرے
اور ان کو بے وقعت جان کر ان کے پاس نہ بیٹھے، پس یہ وہ شخص ہے جو لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔ پھر نبی ﷺ نے فرمایا: جس شخص
نے پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنے اور جوتی کی مرمت کی اور دراز گوش پر سوار ہوا اور نو کر جب بیمار ہوں تو ان کی عیادت کی اور
بکری کا دودھ دوہا تو وہ تکبر سے بری ہو گیا۔

(المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۲۶۷۵، علامہ احمد بن ابی بکر بصری متوفی ۸۳۰ھ نے اس حدیث کو مسند عبد بن حمید اور حاکم سے نقل

کیا ہے۔ اتحاف السادة المحمرة بزوائد السانید العشرة، ج ۸، ص ۲۹۰)

تکبر کی مذمت اور اس پر وعید کے متعلق قرآن مجید کی آیات

تکبر کی مذمت اور اس پر وعید کے متعلق قرآن مجید کی حسب ذیل آیات ہیں:

اسی طرح اللہ ہر مغرور متکبر کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُّكْبِرٍ

جَبَّارٍ (المومن: ۳۵)

اور ہر متکبر معاند ہلاک ہو گیا۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (ابراہیم: ۱۵)

بے شک وہ تکبر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ (النحل: ۲۳)

إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي
سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ (المومن: ۶۰)

بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ
عنقریب ذلت کے ساتھ جہنم میں داخل ہوں گے۔
تکبر کی مذمت اور اس پر وعید کے متعلق احادیث

حضرت ابو سعید اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ عزوجل ارشاد فرماتا ہے کہ عزت میرا تہ بند ہے اور کبرياء (بڑائی) میری چادر ہے جس شخص نے ان میں سے کسی کو بھی کھینچا میں اس کو عذاب دوں گا۔ امام ابو داؤد کی روایت میں ہے جس نے ان میں سے ایک کپڑے کو بھی کھینچا میں اس کو دوزخ میں ڈال دوں گا۔ (صحیح مسلم البر والصل: ۱۳۶، (۲۶۲۰) ۶۵۵۷، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۰۹۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۷۳، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۱۱۹۳، مسند احمد ج ۲، رقم الحدیث: ۲۳۸، ۴۱۳)

عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: متکبروں کو قیامت کے دن مردوں کی صورت میں چیونٹی کی جسامت میں جمع کیا جائے گا ان کو ہر طرف سے ذلت ڈھانپ لے گی، ان کو دوزخ کے قید خانہ کی طرف ہٹایا جائے گا جس کا نام بولس ہے، اس میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہوں گے، ان کو دوزخیوں کی پیپ پلائی جائے گی۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۹۲، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۸۰۰، مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۵۹۸، مسند احمد ج ۲، ص ۱۷۹، رقم الحدیث: ۶۶۷۷، اللادب المفرد رقم الحدیث: ۵۵۷، جامع الاصول رقم الحدیث: ۸۲۱۳)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیشہ آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کو متکبرین میں لکھ دیا جاتا ہے اور اس کو متکبرین کا عذاب پہنچتا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۰۷، جامع الاصول رقم الحدیث: ۸۲۱۳)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن خطبہ دیا اور فرمایا: اے لوگو! بے شک اللہ عزوجل نے تم سے زمانہ جاہلیت کے بوجھ کو اتار دیا ہے اور تمہارے باپ دادا کی بڑائی کو ختم کر دیا ہے، اب لوگوں کی دو قسمیں ہیں، نیک پرہیزگار، وہ اللہ عزوجل کے نزدیک کرم ہے اور فاجر بد بخت، وہ اللہ عزوجل کے نزدیک ذلیل ہے، تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہاری مختلف قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کی شناخت کرو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۲۷۷، صحیح ابن خزیمہ رقم الحدیث: ۲۷۸۱، جامع الاصول رقم الحدیث: ۸۲۱۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: دوزخ اور جنت نے مباحثہ کیا، دوزخ نے کہا: مجھ میں متکبرین اور متجبرین داخل کیے گئے ہیں اور جنت نے کہا: مجھے کیا پرواہ ہے جب کہ مجھ میں صرف کمزور، عاجز اور متواضع لوگ داخل کیے گئے ہیں۔ (الحدیث: صحیح مسلم المنافقین: ۳۵، (۲۸۳۶) ۷۰۳۰، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۸۵۰)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ شخص جنت میں داخل ہو جائے گا جو اس حال میں مرا کہ وہ ان تین چیزوں سے بری تھا: تکبر، خیانت اور قرض۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۷۸، مسند احمد ج ۸، رقم الحدیث: ۲۲۳۳۲)

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: کیا میں تم کو اہل

جنت کی خبر نہ دوں؟ ہر کمزور شخص جس کو بے حد کمزور سمجھا جاتا ہو اگر وہ اللہ پر (کسی کام کی) قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم ضرور پورا کرے گا اور کیا میں تم کو اہل دوزخ کی خبر نہ دوں؟ ہر سرکش، اکڑ کر چلنے والا تکبر۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۶۵۷، ۶۰۷۱، ۶۰۷۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸۵۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۱۱۶) حضرت نعیم بن ہماز الغطفانی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جو بڑا بنے اور تکبر کرے اور الکبیر المتعال (اللہ تعالیٰ جو حقیقتاً سب سے بڑا ہے) کو بھول جائے اور کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جو دین کے بدلہ میں دنیا لے اور کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جو لہو و لعب میں وقت گزارے اور قبروں کو اور جسم کے بوسیدہ ہونے کو بھول جائے اور کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جو شہمات سے حرام کو حلال کرے اور کیسا برا بندہ ہے وہ بندہ جس کو خواہش (نفس) گمراہ کر دے اور کیسا برا ہے وہ بندہ جو اس چیز میں رغبت کرے جو اس کو ذلیل کر دے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۵۶، مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۲۳۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد شدہ غلام نافع بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مسکین تکبر، بوڑھا زانی اور اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ پر احسان جانے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

(مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۵۶، مطبوعہ دار الکتب العربیہ بیروت)

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بے شک تمہارا رب واحد ہے اور تمہارا باپ واحد ہے، پس کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر تقویٰ کے سوا اور کسی وجہ سے فضیلت نہیں ہے اور مسند بزار میں اس طرح ہے: تمہارا باپ واحد ہے اور تمہارا دین واحد ہے۔ تمہارا باپ آدم ہے اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا تھا۔

(المعجم الاوسط ج ۵، رقم الحدیث: ۴۱۳۳، مسند بزار رقم الحدیث: ۲۰۲۴، ۳۵۸۳، حافظ الہیثمی نے لکھا ہے کہ مسند بزار کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۶۰، مطبوعہ دار الفکر، ۱۳۱۳ھ، طبع جدید)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دو غلام تھے ایک حبشی تھا دوسرا لبلی تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو برا کہا اور نبی ﷺ سن رہے تھے ایک نے دوسرے سے کہا اے لبلی۔ دوسرے نے اس کو کہا اے حبشی۔ آپ نے فرمایا تم دونوں اس طرح نہ کہو، تم دونوں (سیدنا) محمد ﷺ کے اصحاب میں سے ہو۔

(مسند ابو یوسف ج ۷، رقم الحدیث: ۴۱۳۶، مجمع الزوائد ج ۸ ص ۸۶، المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۲۵۲۳، اتحاف السادة المهرة ج ۷،

رقم الحدیث: ۶۱۰۷)

تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے کا مکروہ تحریمی ہونا اور تکبر کے بغیر مکروہ تحریمی نہ ہونا حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ قیامت کے دن اس شخص کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا جس نے اپنا کپڑا تکبر کی وجہ سے (ٹخنوں سے نیچے) لٹکایا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۸۳، صحیح مسلم لباس: ۴۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۷۳۷، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۳۲۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۵۶۹، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۵۷۰، مسند احمد ج ۲ ص ۵۶، رقم الحدیث: ۵۱۸۸، مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۶۳۶)

ابو وائل بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا تہبند (ٹخنوں سے) نیچے لٹکتا رہتا تھا، ان سے اس کے متعلق استفسار کیا گیا، انہوں نے کہا میں ایسا شخص ہوں جس کی پنڈلیاں پتلی ہیں۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۸ ص ۲۰۶، مطبوعہ ادارہ القرآن، کراچی، ۱۳۰۶ھ)

تکبر کے بغیر ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانے کے متعلق فقہاء احناف کی تصریحات

علامہ بدر الدین محمود بن احمد یعنی حنفی متونی ۸۵۵ھ مذکور الصدر حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

جس شخص نے بغیر قصد تکبر کے تہبند ٹخنوں کے نیچے باندھا اس میں کوئی کراہت نہیں ہے نہ کوئی حرج ہے، اسی طرح کسی ضرر کو دور کرنے کے لیے بھی ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانا جائز ہے، مثلاً اس کے ٹخنوں کے نیچے کوئی زخم ہو یا خارش ہو یا اگر وہ ٹخنوں کو نہ ڈھانپنے تو اس پر کھیاں اور دیگر حشرات الارض کے بیٹھنے کا خطرہ ہو اور لمبی قمیص یا لہبا تہبند اور کوئی چیز ڈھانپنے کے لیے میسر نہ ہو۔ (عمدة القاری ج ۲۱ ص ۲۹۵، مطبوعہ ادارہ البیضاء المنیریہ، مصر ۱۳۳۸ھ)

نیز علامہ یعنی لکھتے ہیں:

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ جب حضرت ابو بکر نے اپنے تہبند کے ایک جانب پھسل جانے کا ذکر کیا تو نبی ﷺ نے فرمایا: تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۸۳) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کا تہبند بلا قصد پھسل جائے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر یہ اعتراض ہو کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہر حال میں تہبند لٹکانے کو مکروہ کہتے تھے، اس کے جواب میں علامہ ابن بطلان نے کہا ہے کہ یہ حضرت ابن عمر کی تشدیدات میں سے ہے ورنہ حضرت ابن عمر تو خود اس حدیث کے راوی ہیں ان سے یہ حکم کیسے مخفی ہو سکتا ہے۔

(عمدة القاری ج ۲۱ ص ۲۹۶، مطبوعہ ادارہ البیضاء المنیریہ، مصر ۱۳۳۸ھ)

علامہ بدر الدین یعنی حنفی مزید لکھتے ہیں:

نماز کسوف کے موقع پر رسول اللہ ﷺ جلدی سے اپنا تہبند گھسیٹتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۸۵) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بغیر تکبر کے تہبند گھسیٹ کر چلنا حرام نہیں ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے۔

(عمدة القاری ج ۲۱ ص ۲۹۶، مطبوعہ ادارہ البیضاء المنیریہ، مصر ۱۳۳۸ھ)

غیر ارادی طور پر تہبند قدموں سے نیچے گھسٹ رہا ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اراداً تہبند یا شلوار اتنی لمبی رکھنا کہ وہ قدموں کے نیچے گھسٹ رہی ہو، حرام ہے، خواہ تکبر کی نیت نہ ہو۔ کیونکہ اس میں بہر حال اسراف ہے اور اپنے کپڑوں کو نجاست سے آلودگی کے خطرہ میں ڈالنا ہے۔ البتہ اگر لباس قدموں کے نیچے نہیں گھسٹ رہا تھا صرف ٹخنوں سے نیچے تھا تو یہ بغیر تکبر کے مکروہ تنزیہی ہے اور تکبر کے ساتھ مکروہ تحریمی ہے۔

ملا علی بن سلطان محمد القاری الحنفی المتونی ۱۰۱۳ھ لکھتے ہیں:

بخاری کی حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ بغیر تکبر کے تہبند گھسیٹ کر چلنا حرام نہیں ہے لیکن یہ مکروہ تنزیہی ہے۔

(المرقات ج ۸ ص ۲۳۸، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان ۱۳۹۰ھ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی حنفی متونی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں:

اگر کوئی شخص تکبر، اسراف اور طغیان (سرکشی) کی نیت سے اپنے تہبند کو لہبا بناتا ہے اور اس کو گھسٹتا ہے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی طرف لطف و عنایت کی نظر نہیں فرمائے گا۔ اس قید سے معلوم ہوا کہ اگر تہبند اس طرح نہ ہو تو حرام نہیں ہے لیکن مکروہ تنزیہی ہے۔ اور اگر کوئی عذر ہو مثلاً سردی ہو یا کوئی بیماری ہو (مثلاً ٹخنے کے نیچے کوئی زخم ہو جس پر کھیاں بیٹھتی ہوں ان سے زخم کو بچانے کے لیے ٹخنہ ڈھانپنے) تو بالکل مکروہ نہیں ہے۔

(اشعة اللمعات ج ۳ ص ۵۳۷-۵۳۶، مطبوعہ مطبعہ کمار، لکھنؤ)

نیز شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

حرام وہ صورت ہے جب کوئی شخص عجب اور تکبر سے کپڑا لٹکائے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۳، ص ۵۵۵، مطبوعہ لکھنؤ)
نیز شیخ محقق فرماتے ہیں:

طعام اور لباس میں توسیع، اسراف اور تکبر کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے اور اگر اس طرح نہ ہو تو پھر مباح ہے۔

(اشعۃ اللمعات، ج ۳، ص ۵۵۸، مطبوعہ تیج کمار لکھنؤ)

فتاویٰ عالمگیری میں مذکور ہے:

مرد کا تہ بند ٹخنوں سے نیچے لٹکانا اگر تکبر کی وجہ سے نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے۔ اسی طرح غرائب میں ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ۵، ص ۳۳۳، مطبوعہ مطبعہ امیرہ کبریٰ بولاق، مصر، ۱۳۱۰ھ)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

پانچوں کا کہیں (ٹخنوں) سے نیچا ہونا جسے عربی میں اسبال کہتے ہیں اگر براہ عجب و تکبر ہے تو قطعاً ممنوع و حرام ہے اور اس پر وعید شدید وارد۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے تکبر کی وجہ سے اپنی چادر کو لٹکایا قیامت کے دن اللہ عزوجل اس کی طرف نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا۔ امام ابو داؤد، امام ابن ماجہ، امام نسائی اور امام ترمذی نے بھی الفاظ متقاربہ کے ساتھ اسی طرح روایت کیا ہے، اور اگر بوجہ تکبر نہیں تو بحکم ظاہر احادیث مردوں کو بھی جائز ہے جیسے کہ تکبر کی قید سے تم کو خود معلوم ہوگا، حضرت ابو بکر نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری ازار ایک جانب سے لٹک جاتی ہے فرمایا تو ان میں سے نہیں ہے جو ایسا براہ تکبر کرتا ہو، احادیث میں جو اس پر وعید ہے اس سے یہی صورت مراد ہے کہ بہ تکبر اسبال کرتا ہو ورنہ ہرگز یہ وعید شدید اس پر وارد نہیں مگر علماء در صورت عدم تکبر حکم کراہت تنزیہی دیتے ہیں۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے اگر اسبال تکبر سے نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے، اسی طرح غرائب میں ہے۔

بالجملہ اسبال اگر براہ عجب و تکبر ہے حرام، ورنہ مکروہ اور خلاف اولیٰ نہ حرام و مستحق وعید۔ اور یہ بھی اس صورت میں ہے کہ پانچہ جانب پاشنہ نیچے ہوں اور اگر اس طرف کہیں سے بلند ہیں گو پنجہ کی جانب پشت پا پر ہوں ہرگز کچھ مضائقہ نہیں، اس طرح کالٹکانا حضرت ابن عباس بلکہ خود حضور سرور عالم ﷺ سے ثابت ہے۔ امام ابو داؤد نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ عکرمہ نے دیکھا کہ حضرت ابن عباس نے چادر باندھی اور اگلی جانب سے چادر ان کے قدم کی پشت پر تھی اور چادر کی پچھلی جانب اوپر اٹھی ہوئی تھی، میں نے پوچھا: آپ نے اس طرح چادر کیوں باندھی ہے؟ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح چادر باندھے ہوئے دیکھا ہے۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۰۹۶) اس حدیث کے تمام راوی ثقہ اور عدول ہیں جن سے امام بخاری روایت کرتے ہیں۔ شیخ محقق مولانا عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں اس جگہ سے معلوم ہوا کہ اسبال کی نفی میں ایک جانب سے اونچا کرنا کافی ہے۔ عالمگیری میں ہے کہ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ نصف ساق تک پانچوں کا ہونا بہتر و عزیزیت ہے اکثر ازار پر انوار سید البرار یہیں تک ہوتی تھی۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۱۰، ص ۱۲۵، ایضاً ص ۱۱۰، ۲۹۵، مطبوعہ ادارہ تصنیفات امام احمد رضا، کراچی، ۱۹۸۸ء)

تکبر کے بغیر ٹخنوں سے نیچے لباس رکھنے کے جواز پر شافعی، مالکی اور حنبلی فقہاء کی تصریحات

علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی الشافعی المتوفی ۷۴۲ھ لکھتے ہیں:

امام شافعی نے یہ تصریح کی ہے کہ کپڑا لٹکانے کی تحریم تکبر کے ساتھ خاص ہے۔ ظواہر احادیث کا یہی تقاضا ہے

اور اگر بغیر تکبر کے ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکائے تو پھر یہ مکروہ تزییہ ہے۔

(شرح الیسی ج ۸، ص ۲۰۸، مطبوعہ ادارہ القرآن، کراچی، ۱۳۱۳ھ)

علامہ نووی شافعی اور علامہ کرمانی شافعی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

(شرح مسلم ج ۲، ص ۱۱۵، مطبوعہ کراچی، شرح کرمانی للبخاری، ج ۲۱، ص ۵۳، مطبوعہ بیروت)

حافظ ابو عمرو یوسف بن عبد اللہ بن عبد البر مالکی اندلسی متوفی ۵۴۶ھ لکھتے ہیں:

(موطا امام مالک کی) یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ جس شخص نے بغیر تکبر کے اپنے تہبند کو گھسیٹا (یعنی تہبند اتنا دراز تھا کہ زمین پر گھسٹ رہا تھا) اور نہ اس میں کوئی اکڑ تھی تو اس کو وعید مذکور لاحق نہیں ہوگی۔ البتہ تہبند، قمیص اور باقی کپڑوں کو گھسیٹتے ہوئے چلنا ہر حال میں مذموم ہے اور جو تکبر سے کپڑا گھسیٹے اس کو یہ وعید ہر حال لاحق ہوگی۔

(التعمید ج ۳، ص ۲۲۳، مطبوعہ مکتبہ قدوسیہ لاہور، فتح المالک بتویب التعمید لابن عبد البر، ج ۹، ص ۳۸۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ،

بیروت، ۱۳۱۸ھ)

نیز حافظ ابن عبد البر مالکی "الاستذکار" میں تحریر فرماتے ہیں:

اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ جس شخص نے اپنے تہبند یا کپڑے کو تکبر یا اکڑ سے نہیں گھسیٹا تو اس کو یہ وعید مذکور لاحق نہیں ہوگی اور خیلاء اور بطر کا معنی ہے تکبر کرنا، اکڑ کر چلنا اور لوگوں کو حقیر جاننا۔

(الاستذکار ج ۲۶، ص ۱۸۷-۱۸۶، مطبوعہ موسسہ الرسالہ)

علامہ شمس الدین مقدسی محمد بن مفلح حنبلی متوفی ۵۷۳ھ لکھتے ہیں:

صاحب النظم نے ذکر کیا ہے کہ جس شخص کو تکبر کا خوف نہ ہو اس کے لیے ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانا مکروہ نہیں ہے اور اولیٰ اس کو ترک کرنا ہے۔ (کتاب الفروع ج ۱، ص ۳۳۳، مطبوعہ عالم الکتب، بیروت، ۱۳۰۵ھ)

ان کثیر حوالہ جات سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر تکبر اور اکڑ کر چلنے کی نیت کے بغیر تہبند یا شلوار یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے یہ زیادہ سے زیادہ مکروہ تزییہ یا خلاف اولیٰ ہے۔ البتہ شلوار یا پاجامہ یا تہبند انسان کی قامت اور اس کے قد سے لہانہ ہو کہ قدموں کے نیچے سے گھسٹ رہا ہو، اگر ایسا ہو تو یہ علامہ ابن عبد البر کی تصریح کے مطابق مذموم ہو گا بلکہ اسراف اور زمانہ قدیم کی عورتوں کی مشابہت کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہو گا۔

ٹخنوں سے نیچے پائے لٹکانے میں علماء دیوبند کا موقف

(سوال ۱۱۳) زید کا خیال ہے کہ ازار تحت الکعبین ممنوع اس وقت ہے جب کہ براہ تکبر و خیلاء ہو جیسا کہ عرب کا دستور تھا کہ اس پر فخر کیا کرتے تھے اور جب کہ تکبرانہ ہو محض خوبصورتی اور زینت کے لیے ایسا کرے تو جائز ہے (الی قولہ) چنانچہ احادیث میں اکثر یہ قید مذکور ہے کہ من جر ازارہ خیلاء (جس نے اپنے تہبند کو تکبر سے گھسیٹا) وغیرہ میں خیلاء کی قید ضرور ہے اور جو حدیثیں مطلق ہیں جیسے ما اسفل من الکعبین ففی النار (جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہو وہ دوزخ میں ہے) وہ بھی حسب دستور عرب اسی قید پر محمول ہیں اور مطلق کا مقید پر محمول نہ ہونا اس وقت ہے جبکہ مطلق و مقید دونوں دو واقعہ پر آئے ہوں، جیسے کفارہ قتل و کفارہ ظہار اور اتحاد واقعہ کے وقت حسب اصول حنفیہ مطلق مقید پر محمول ہو جاتا ہے جیسے کفارہ قسم کا۔ قرائت ابن مسعود میں متابعات کے ساتھ مقید ہو جانا۔ نیز اس کی موید وہ حدیث ہے کہ حضرت نے ما اسفل من الکعبین کی وعید بیان کی اور فرمایا: من جر ثوبہ خیلاء، لن ينظر الله اليه يوم القيامة (جس نے تکبر کی

تبعیان القرآن

جلد چہارم

وجہ سے اپنا کپڑا گھسینا قیامت کے دن اللہ اس کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا) تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ! میری ازار لٹک پڑتی ہے الا ان اتعاہد (مگر یہ کہ میں اس کی دیکھ بھال کروں) تو حضرت نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں (رواہ البخاری، کذا فی المسکوٰۃ) پس اگر مطلقاً جرازار (تہبند گھسینا) ممنوع ہوتا تو آپ اجازت نہ دیتے تو معلوم ہوا کہ یہ وعید خیلاء (تکبر) ہی کی صورت ہے اور بلا اس کے جائز ہے اس شبہ کا حل مطلوب ہے۔

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۳ھ اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

نور الانوار میں ایک حکم میں مطلق کو مقید پر محمول کرنے کی بحث میں ہے: صدقہ فطر کے سبب میں دو نصیص وارد ہیں اور اسباب میں کوئی مزاحمت نہیں ہے پس ان کے درمیان جمع کرنا واجب ہے یعنی ہم نے جو کہا ہے کہ حادثہ واحدہ اور حکم واحد میں مطلق کو مقید پر محمول کیا جائے گا یہ اس وقت ہے جب مطلق اور مقید دونوں حکم میں وارد ہوں تضاد کی وجہ سے، لیکن جب مطلق اور مقید اسباب یا شروط میں وارد ہوں تو پھر کوئی مضائقہ اور تضاد نہیں ہے، پس یہ ممکن ہے کہ مطلق اپنے اطلاق کے ساتھ سبب ہو اور مقید اپنی تقیید کے ساتھ سبب ہو اور مانحن فیہ (زیر بحث صورت) میں حکم معصیت ہے اور مطلق جر اور جر الخیلاء اسباب اس کے ہیں یہاں مطلق کو مقید پر محمول کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پس مطلق جر کو بھی حرام کہیں گے اور جر الخیلاء کو بھی۔ (مطلق تہبند گھسینا بھی حرام ہے اور تکبر کی وجہ سے گھسینا بھی حرام ہے)

(امداد الفتاویٰ ج ۳، ص ۱۲۲-۱۲۱، مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم، کراچی)

مطلق کو مقید پر محمول کرنے یا نہ کرنے کے قواعد

شیخ تھانوی کا مذکورہ جواب صحیح نہیں ہے۔ اس جواب کا رد کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ فقہاء احناف کے نزدیک مطلق کو مقید پر محمول کرنے اور نہ کرنے کے قواعد کی وضاحت کر دیں تاکہ عام قارئین بھی اس مسئلہ کو آسانی سے سمجھ لیں۔ فقہاء احناف کے نزدیک جب کسی واقعہ میں ایک حکم ایک جگہ مطلق ہو اور دوسری جگہ مقید ہو تو مطلق کو مقید پر محمول کرنا واجب ہے ورنہ حکم میں تضاد ہوگا۔ ایک جگہ مطلق ہے اور ایک جگہ مقید ہے اس کی یہ مثال ہے:

اللہ تعالیٰ نے قسم توڑنے کا کفارہ بیان فرمایا کہ وہ دس مسکینوں کو متوسط درجہ کا کھانا کھلائے یا ان کو کپڑے پہنائے یا ایک غلام آزاد کرے پھر اس کے بعد فرمایا:

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ

اور جو ان میں سے کچھ نہ پائے تو وہ تین دن کے روزے

(المائدہ: ۸۹) رکھے۔

اس آیت میں تین دن کے روزے مطلق ہیں لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرأت میں ہے فصیام ثلاثة ایام متتابعات تین دن کے مسلسل روزے۔ پہلا حکم مطلق تھا اور دوسرا حکم مقید ہے۔ اب اگر مطلق کو مقید پر محمول نہ کیا جائے تو حکم میں تضاد لازم آئے گا۔ اس لیے یہاں مطلق کو مقید پر محمول کرنا واجب ہے اور تین دن کے پے در پے روزے رکھنا قسم کا کفارہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب مطلق اور مقید حکم میں وارد ہوں تو مطلق کو مقید پر محمول کیا جاتا ہے لیکن جب مطلق اور مقید سبب میں وارد ہوں مثلاً ایک واقعہ میں ایک جگہ حکم کا سبب مطلق ہے اور دوسری جگہ اس واقعہ میں حکم کا سبب مقید ہے تو اب مطلق کو مقید پر محمول کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ ایک حکم کے کئی سبب ہو سکتے ہیں تو جائز ہے کہ ایک سبب مطلق ہو اور دوسرا سبب مقید ہو اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ جیسے ایک حدیث میں ہے: ہر آزاد اور غلام کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرو اور دوسری حدیث میں ہے: ہر آزاد اور مسلمان غلام کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرو۔ پہلی حدیث میں مطلق غلام کا ذکر ہے اور

دوسری حدیث میں مقید ہے، یعنی مسلمان غلام کا ذکر ہے۔ اب مطلق کو مقید پر نہیں محمول کیا جائے گا کیونکہ صدقہ فطرا اور کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا سبب سر (شخص) ہے، پہلی حدیث میں اس حکم کا سبب مطلق سر یعنی (مطلق) غلام ہے اور دوسری حدیث میں مقید سر (شخص) یعنی مسلمان غلام اس حکم کا سبب ہے اور ایک حکم کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ان میں تضاد نہیں ہے۔ اس لیے یہاں مطلق کو مقید پر محمول نہیں کیا جائے گا۔

(نور الانوار ص ۱۶۰-۱۵۹، مطبوعہ کراچی، التوضیح و التلویح، ج ۱، ص ۱۲۲، مطبوعہ کراچی، تیسیر التحریر ج ۱، ص ۳۳۳-۳۳۰، کشف

الاسرار ج ۲، ص ۵۳۵-۵۳۴)

شیخ تھانوی کے دلائل پر بحث و نظر

اس تمہید کے بعد ہم یہ واضح کرتے ہیں کہ شیخ تھانوی کا جواب صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ زیر بحث صورت میں حکم معصیت (نافرمانی) ہے اور مطلق جر اور جر للخیلاء اسباب اس کے ہیں۔ (امداد الفتاویٰ، ص ۱۲۲)

جر ثوب یا جر ثوب للخیلاء (پکڑا گھیننا یا تکبر کی وجہ سے پکڑا گھیننا) یہی تو بعینہ معصیت اور نافرمانی ہے۔ تھانوی صاحب اسی کو حکم بھی قرار دے رہے ہیں اور اسی کو حکم کے اسباب بھی قرار دے رہے ہیں اور یہ صریح کون الشیء سبب النفسہ (کسی چیز کا خود اپنا سبب ہونا) ہے اور یہ بداعتہ باطل ہے، سبب مقدم ہوتا ہے اور اس کا حکم موخر ہوتا ہے اور جب ایک چیز خود اپنا سبب ہوگی تو وہ اپنے آپ پر مقدم ہوگی اور یہ علمی اصطلاح میں دور ہے جو عقلاً محال اور باطل ہے۔

نیز تھانوی صاحب نے لکھا ہے اس بحث میں حکم معصیت ہے۔ (امداد الفتاویٰ، ص ۱۲۲) واضح رہے کہ حکم کے دو معنی ہیں ایک حکم منطقی یا نحوی ہے۔ اس کی تعریف ہے ایک امر کا دوسرے امر کی طرف ایجاباً یا سلباً اسناد اور دوسرا حکم شرعی ہے اس کی تعریف ہے: اللہ تعالیٰ کا حکم جو مکلفین کے افعال سے متعلق ہو۔ (التعریفات ص ۶۶-۶۵، مطبوعہ مکہ مکرمہ) اور مطلق اور مقید کی اس بحث میں حکم سے مراد حکم شرعی ہے یعنی اللہ اور رسول کا حکم۔ پہلے حکم کی مثال ہے کفارہ قسم میں تین دن کے یا مسلسل تین دن کے روزے رکھنا یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور دوسرے حکم کی مثال ہے ہر آزاد اور غلام کی طرف سے صدقہ فطرا اور یا ہر آزاد اور مسلمان غلام کی طرف سے صدقہ فطرا اور یہ رسول ﷺ کے حکم کی مثال ہے۔

اس جواب میں دوسری غلطی یہ ہے کہ اس جواب میں معصیت کو حکم کہا گیا ہے حالانکہ اللہ جل و علا اور اس کے رسول ﷺ نے معصیت کا حکم نہیں دیتے بلکہ معصیت نہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اس حدیث میں سرے سے کوئی حکم ہی نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص فعل پر اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت نہ کرنے کی وعید سنائی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ حدیث اس مخصوص فعل (تکبر سے پکڑا گھیننے) کی ممانعت یا اس سے اجتناب کے حکم کو متضمن ہے، ہم اس حدیث کو بیان کر کے اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں:

عن سالم بن عبد اللہ عن ابیہ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من جر ثوبہ خیلاء لم ينظر اللہ الیہ یوم القیامۃ قال ابو بکر: یا رسول اللہ ان احد شقی ازاری یسترخی الا ان اتعاہد ذالک منه فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لست ممن یصنعه خیلاء۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے تکبر کے سبب سے اپنا پکڑا گھیننا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس پر نظر (رحمت) نہیں فرمائے گا۔ حضرت ابو بکر نے کہا: یا رسول اللہ! میرے تہ بند کی ایک جانب ڈھلک جاتی ہے، سو اس کے کہ میں اس کی دیکھ بھال کروں۔ پس نبی ﷺ نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو یہ (تہ بند گھیننا) تکبر سے کرتے ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۸۳)

تبیان القرآن

جلد چہارم

اس حدیث میں تہنند گھسیٹنے پر وعید کو نبی ﷺ نے وجود اور عدماً خیلاء (تکبر) پر معلق فرمایا ہے۔ وجود کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص تکبر سے تہنند گھسیٹے اس پر آپ نے وعید سنائی ہے اور عدم کی دلیل یہ ہے کہ آپ نے حضرت ابو بکر سے فرمایا: تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے یعنی تم کو یہ وعید لاحق نہیں ہوگی۔ شیخ تھانوی نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ چونکہ خیلاء سبب ہوتا ہے محمد کا اس لیے سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا۔ (امداد الفتاویٰ ج ۳ ص ۱۲۳) یعنی آپ نے جو فرمایا ہے کہ تم تکبر سے ایسا نہیں کرتے اس کا معنی ہے تم عدم ایسا نہیں کرتے اور تکبر سے مراد عدم ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ تاویل باطل ہے کیونکہ سبب بول کر مسبب مراد لینا مجاز ہے اور مجاز کا ارادہ اس وقت کیا جاتا ہے جب حقیقت محال یا متعذر ہو اور یہاں پر اس کلام کو حقیقت پر محمول کرنے اور تکبر کا معنی مراد لینے پر کوئی عقلی یا شرعی مانع نہیں ہے اس لیے کلام رسول کو اپنی خواہش کا معنی بلا وجہ پہنانا باطل ہے۔

جب یہ واضح ہو گیا کہ کپڑا لٹکانے یا گھسیٹنے کی علت تکبر ہے تو جس صورت میں تکبر نہیں ہوگا اس صورت میں وعید بھی لاحق نہیں ہوگی۔ دیکھئے ربا بالفضل کی حرمت کی علت قدر اور جنس کا اتحاد اور بیع کا ادھار ہونا ہے اور جب یہ علت نہیں ہوگی تو ربا بالفضل حرام نہیں ہوگا۔ یا جیسے نماز کی شرط وضو ہے جب وضو نہیں ہوگا تو نماز نہیں ہوگی یا جیسے مثلاً مغرب کی نماز کا سبب غروب آفتاب ہے جب غروب آفتاب نہیں ہوگا تو مغرب کی نماز فرض نہیں ہوگی۔ اسی طرح جب کپڑا لٹکانے میں تکبر نہیں ہوگا تو اس کی وعید بھی لاحق نہیں ہوگی۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ بعض احادیث میں کپڑا لٹکانے پر وعید ہے مگر وہاں خیلاء یا تکبر کا ذکر نہیں ہے۔ مثلاً:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ ما
اسفل من الکعبین من الازار ففی النار۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا:
تہنند کا جو حصہ ٹخنوں سے لٹک رہا ہو گا وہ دوزخ میں ہوگا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۸۷)

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ بعض اوقات کسی حکم یا کسی فعل کی کوئی شرط یا اس کا کوئی سبب بہ طور قید بیان فرماتے ہیں اور پھر اس حکم یا فعل کو اس قید کے بغیر بھی بیان فرماتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اب وہ قید معتبر نہیں ہے، وہ قید اب بھی معتبر ہوتی ہے اور اس کے اعتبار کرنے پر وہ حدیث دلیل ہوتی ہے جس میں اس قید کا ذکر فرمایا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ حدیث ہے:

عن النبی ﷺ لیس فی مال زکوٰۃ حتی
یحول علیہ الحول۔
نبی ﷺ نے فرمایا: جب تک سال نہ گزر جائے کسی مال
میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۷۳)

اس حدیث میں نبی ﷺ نے وجوب زکوٰۃ کے لیے سال گزرنے کی شرط کا ذکر فرمایا ہے، حالانکہ بے شمار احادیث ہیں جن میں اس شرط کا ذکر نہیں ہے، اس کے باوجود وجوب زکوٰۃ میں اس شرط کا اعتبار کیا جاتا ہے کیونکہ اس حدیث میں اس شرط کا ذکر ہے۔ ہم صرف ایک حدیث کا ذکر کر رہے ہیں جس میں وجوب زکوٰۃ کے لیے اس شرط کا ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ ایسی بے شمار احادیث ہیں:

عن علی قال قال رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم قد عفوت عن الخیل والرقيق
فہاتوا صدقة الرقة من کل اربعین درہما
درہم و لیس فی تسعین و مائة شیء فاذا
بلغت مائتین ففیہا خمسة درہم۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے
فرمایا: میں نے گھوڑوں اور غلاموں سے زکوٰۃ معاف کر دی۔
تم ہر چالیس درہم سے ایک درہم چاندی زکوٰۃ دو اور ایک سو
نوے درہم میں بالکل زکوٰۃ نہیں ہے اور جب دو سو درہم ہو
جائیں تو اس میں پانچ درہم زکوٰۃ ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۷۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۶۲۰، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۷۶)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ایک حدیث میں تہبند گھسیٹنے یا ٹخنوں سے نیچے لٹکانے پر وعید بیان فرمائی اور اس کو تکبر پر متعلق فرمایا اور بعض احادیث میں اس قید کا ذکر نہیں فرمایا تو جہاں اس قید کا ذکر نہیں ہے وہاں بھی اس قید کا اعتبار کیا جائے گا اور اس کے اعتبار کرنے پر وہ احادیث دلیل ہیں جن میں آپ نے اس قید کا ذکر فرمایا ہے، جس طرح ہم نے زکوٰۃ میں سال گزرنے کی شرط کے متعلق بیان کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے ہی حمد ہے جس نے مجھے اس مسئلہ کو حل کرنے کی توفیق دی اور شاید کہ قارئین کو کسی اور جگہ یہ تفصیل اور اس مسئلہ کا حل نہ مل سکے۔

شیخ کشمیری اور شیخ میرٹھی کے دلائل
شیخ انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک کپڑے کو گھسیٹنا مطلقاً ممنوع ہے اور امام شافعی نے ممانعت کو تکبر کی صورت میں منحصر کیا ہے اور اگر تکبر کے بغیر کپڑا گھسیٹا جائے تو وہ جائز ہے اور اس وقت یہ حدیث احکام لباس سے نہیں ہوگی اور حق کے زیادہ قریب فقہاء احناف کا مذہب ہے، کیونکہ تکبر فی نفسہ ممنوع ہے اور اس کی کپڑا گھسیٹنے کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اور نبی ﷺ نے حضرت ابو بکر سے جو فرمایا تھا کہ تم تکبر کی وجہ سے تہبند نہیں گھسیٹتے تو اس میں تکبر کو ایک مناسب علت کے طور پر بیان فرمایا ہے ہر چند کہ تکبر پر ممانعت کا مدار نہیں ہے، اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے تہبند گھسیٹنے کے جواز کی علت یہ تھی کہ جب تک وہ خوب احتیاط سے تہبند نہ باندھیں ان کا تہبند پھسل جاتا تھا۔ البتہ عدم تکبر کو آپ نے ایک زائد علت کے طور پر بیان فرمایا جو جواز کی مفید ہے اور اس کی تاکید کرتی ہے اور حضرت ابو بکر کا آپ سے اس مسئلہ کو پوچھنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک ممانعت بہ طور عموم تھی۔ (یعنی تکبر ہو یا نہ ہو تہبند گھسیٹنا ممنوع ہے) اور اگر ان کے نزدیک یہ ممانعت تکبر کی وجہ سے ہوتی تو پھر ان کے سوال کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ حضرت ابو بکر نے یہ سوال کیا تھا: یا رسول اللہ! میرے تہبند کی کی ایک جانب پھسل جاتی ہے الایہ کہ میں اس کو خوب احتیاط سے باندھوں آپ نے فرمایا: تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہوں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۸۳) اور کسی مناسب امر کو بہ طور علت بیان کرنا معروف طریقہ ہے اور ہمارے لیے یہ کہنا جائز ہے کہ تکبر سے تہبند گھسیٹنا اس شخص کے لیے ممنوع ہے جو مضبوطی سے تہبند باندھ سکتا ہو اس لیے فقط تکبر پر ممانعت کا مدار نہیں ہے۔

شیخ بدر عالم میرٹھی اس عبارت پر حاشیہ لکھتے ہیں:

میں یہ کہتا ہوں کہ شریعت نے صرف گھسیٹنے کو تکبر قرار دیا ہے، کیونکہ جو لوگ اپنے کپڑوں کو گھسیٹتے ہیں وہ صرف تکبر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ اور ہم نے اپنے زمانہ میں بھی اس کا تجربہ کیا ہے (مشاہدہ لکھنا چاہیے تھا۔ سعیدی غفرلہ) اور اگر ہمارے زمانہ میں اس طرح نہ ہوتا تو عرب میں بہر حال اس طرح ہوتا تھا، اور اب اس حکم میں سب کو سبب کے قائم مقام کرنا ہے (کپڑا گھسیٹنا سبب ہے اور تکبر سبب ہے اور کپڑا گھسیٹنے سے اس لیے منع کیا ہے کہ وہ تکبر کا سبب ہے۔ سعیدی غفرلہ) جیسے نیند حدث (وضو ٹوٹنا) نہیں ہے لیکن وہ پٹھوں کے ڈھیلے ہونے کا سبب ہے جس سے عموماً ہوا خارج ہو جاتی ہے اس لیے نیند کو حدث کا سبب قرار دے دیا۔ اسی طرح سفر مشقت کے قائم مقام ہے اور مباشرت فاحشہ بھی کسی چیز کے نکلنے کا عادتاً سبب ہے اس لیے مباشرت فاحشہ کو حدث اکبر کا سبب قرار دے دیا۔ اسی طرح کپڑا گھسیٹنا بھی تکبر کا سبب ہے اور یہ ایک پوشیدہ چیز ہے جس کا ادراک کرنا مشکل ہے، جیسے سفر میں مشقت اور نیند میں حدث اور مباشرت فاحشہ میں کسی چیز کا نکلنا۔ اس لیے کپڑا گھسیٹنے پر ممانعت کا حکم لگا دیا گیا، علاوہ ازیں ہم نے تجربہ کیا

ہے کہ ظاہر کا باطن میں اثر ہوتا ہے اسی وجہ سے نیک اور اچھے نام رکھنے کا حکم ہے اور جس شخص نے کپڑا گھسیٹا وہ اس بات سے محفوظ نہیں ہے کہ اس کے باطن میں تکبر سرایت کر جائے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ نبی ﷺ نے یہ حکم دیا ہے کہ نصف پنڈلیوں تک تہبند باندھو۔ اور اگر تم انکار کرو تو ٹخنوں میں تمہارا حق نہیں ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۸۳ - سنن نسائی رقم الحدیث: ۵۳۴۴)

اس میں یہ دلیل ہے کہ یہ حدیث احکام لباس سے ہے اور ٹخنوں سے نیچے ہمارا حق نہیں ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ممانعت میں تکبر کی خصوصیت نہیں ہے اور اس سے بھی زیادہ واضح یہ ہے کہ نبی ﷺ نے عورتوں کو بھی ایک بالشت سے زیادہ لباس لٹکانے کی اجازت نہیں دی، حالانکہ ان کو لباس لٹکانے کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور انہوں نے آپ سے اس کے متعلق سوال کیا اور آپ نے جواب میں تکبر یا عدم تکبر کا فرق نہیں کیا۔

(فیض الباری مع الحاشیہ ج ۴، ص ۳۷۳-۳۷۴، مطبوعہ مجلس علمی سورت ہند، ۱۳۵۷ھ)

شیخ کشمیری، شیخ میرٹھی اور جسٹس عثمانی کے دلائل پر بحث و نظر

شیخ بدر عالم میرٹھی نے لکھا ہے جس طرح نیند حدیث کا سبب ہے اور مباشرت فاحشہ حدیث اکبر کا سبب ہے اور سفر مشقت کا سبب ہے، اسی طرح ہم جرتوب (کپڑا گھسیٹنے) کو تکبر کا سبب قرار دیتے ہیں۔ ان کی اتباع میں جسٹس محمد تقی عثمانی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نیند کا حدیث کے لیے سبب ہونا اور مباشرت فاحشہ کا حدیث اکبر کے لیے سبب ہونا خلاف قیاس ہے اور خلاف قیاس اپنے مورد میں بند رہتا ہے۔ اس پر دوسری چیزوں کو قیاس کرنا جائز نہیں ہے۔ نیز ان چیزوں کو شارع علیہ السلام نے سبب قرار دیا ہے اس لیے وہ ثابت ہیں۔ اور ہماری اور آپ کی وہ حیثیت نہیں ہے کہ ہم از خود کسی چیز کو کسی چیز کا سبب قرار دیں اور وہ حجت شرعیہ ہو جائے۔ نیز شیخ کشمیری اور شیخ میرٹھی کا کلام جرتوب (کپڑا گھسیٹنے) میں ہے اور وہ ہمارے نزدیک بھی ناجائز ہے۔ ہمارے نزدیک وہ لباس جائز ہے جو بغیر تکبر کے ٹخنوں سے نیچے لٹکا ہوا ہو اور پہننے والے کے قد سے متجاوز نہ ہو اور اس کے جواز میں مذاہب اربعہ کے فقہاء متفق ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس مسئلہ پر بہت طویل کلام کیا ہے جس کو جسٹس محمد تقی عثمانی نے تمامہ نقل کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے شیخ بدر عالم میرٹھی کے کلام کا خلاصہ لکھا ہے اور آخر میں یہ طور حاصل بحث یہ لکھا ہے کہ اگر انسان قصد اسباب (ٹخنوں سے نیچے تہبند باندھے) کرے تو وہ مطلقاً ممنوع ہے، خواہ وہ تکبر سے ہو یا بغیر تکبر کے اور اگر اس کا تہبند بلا قصد ٹخنوں سے نیچا رہا تو یہ وہ صورت ہے جس کو نبی ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے جائز فرمایا تھا۔

(تکملہ فتح الملکم ج ۴، ص ۱۲۳، ملخصاً، مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم کراچی)

جو کام بلا قصد ہو وہ خارج از بحث ہے کیونکہ ارادنا کسی کام پر مکروہ یا غیر مکروہ ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ اور اسباب توب اگر انسان کی قامت سے متجاوز نہ ہو اور بغیر تکبر کے ہو تو وہ مذاہب اربعہ کے فقہاء کے نزدیک جائز ہے اور جرتوب مطلقاً ممنوع ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اس لیے جسٹس صاحب کا اسباب توب کو مطلقاً ممنوع کہنا غیر مسموع ہے۔ البتہ مشہور دیوبندی محدث شیخ محمد ادریس کاندھلوی متوفی ۱۳۹۲ھ نے فقہاء مذاہب اربعہ کے مطابق لکھا ہے۔

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر تکبر کے کپڑا لٹکانا حرام نہیں ہے۔ مکروہ تنزیہی ہے۔

(التعلیق! نسج ج ۴، ص ۹۵، ۱۰۰، ۱۰۱، مطبوعہ لاہور)

مُخْنُوں سے نیچے لباس لٹکانے کے متعلق مصنف کی تحقیق

ہماری تحقیق یہ ہے کہ احادیث میں جرثوب اور اسہال الازار کے الفاظ ہیں۔ جرثوب کا معنی ہے کپڑا گھسینا۔ اور اسباب الازار کا معنی ہے تہبند کا مُخْنُوں سے نیچے ہونا۔ اگر کوئی مرد جرثوب کرے یعنی اس کا تہبند یا شلوار کا پانچہ مُخْنُوں سے بہت نیچا ہو حتیٰ کہ اس کے قدموں کے نیچے سے گھسٹ رہا ہو تو یہ بغیر تکبر کے بھی مکروہ تحریمی ہے۔ کیونکہ اس میں بغیر کسی ضرورت اور بغیر کسی فائدہ کے کپڑے کو ضائع کرنا ہے۔ سو یہ اسراف کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جب کپڑا قدموں کے نیچے زمین پر گھسٹتا ہے گا تو نجاست کے ساتھ آلودہ ہو گا اور کپڑے کو محل نجاست میں ڈالنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔

اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ مشابہت ہے، کیونکہ عمد رسالت میں عورتیں کپڑا گھسیٹ کر چلتی تھیں اور مردوں کے لیے عورتوں کی مشابہت اختیار کرنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔ اس لیے اگر جرثوب بغیر تکبر کے ہو پھر بھی مکروہ تحریمی ہے۔ حافظ ابن عبد البر مالکی نے اس کو مذموم فرمایا ہے۔ (تمہید ج ۳ ص ۲۴۴) اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس کو مکروہ تحریمی فرمایا ہے (فتح الباری ج ۱۰ ص ۲۶۳) اور اگر جرثوب (کپڑا گھسینے) کے ساتھ تکبر بھی ہو تو یہ شدید مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے۔ اور اگر اسہال ازار ہو یعنی تہبند یا شلوار کا پانچہ مُخْنُوں کے نیچے ہو لیکن اس کے قد اور قامت کے برابر ہو گھسٹ نہ رہا ہو تو اگر اس میں تکبر نہیں ہے صرف زینت کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے یہ صرف خلاف اولیٰ ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے اور اکڑا کر چلتا ہے اور اتراتا ہے تو پھر یہ تکبر کی وجہ سے مکروہ تحریمی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ حرمت کی علت صرف تکبر ہے اگر ایک مرد نصف پنڈلیوں تک تہبند باندھتا ہے اور اس کے ساتھ تکبر کرتا ہے، اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار سمجھتا ہے اور ان کو حقیر سمجھتا ہے تو یہ بھی مکروہ تحریمی ہے بلکہ حرام ہے، اس لیے حرمت میں اصل تکبر ہے۔

ہماری اس تحقیق کی تائید حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کی اس عبارت میں ہے:

اگر کسی شخص کا لباس بغیر تکبر کے مُخْنُوں سے نیچے لٹک رہا ہو تو اس کا حال مختلف ہے اگر وہ کپڑا اس کے مُخْنُوں کے نیچے لٹک رہا ہو لیکن وہ کپڑا پہننے والے کے قد اور اس کی قامت کے برابر ہو تو اس میں تحریم ظاہر نہیں ہوگی، خصوصاً جبکہ بلا قصد ایسا ہو (یعنی غیر ارادی طور پر تہبند یا شلوار پیٹ سے پھسل کر مُخْنُوں سے نیچے لٹک گئی ہو) جیسا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لیے اس طرح واقع ہوا، اور اگر کپڑا پہننے والے کے قد اور قامت سے زائد ہو تو اس سے منع کیا جائے گا کیونکہ اس میں اسراف ہے اور اس کو حرام کہا جائے گا اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہو گا کہ اس میں عورتوں کی مشابہت ہے، اور یہ پہلی وجہ سے زیادہ قوی وجہ ہے۔ کیونکہ امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس مرد پر لعنت فرمائی ہے جو عورتوں کے لباس کی نوع کا لباس پہنتا ہے۔ اور یہ اس وجہ سے بھی ممنوع ہو گا کہ اس طرح کا لباس پہننے والا اس خدشہ سے محفوظ نہیں ہو گا کہ اس کے لباس پر نجاست لگ جائے (کیونکہ اس کا لباس قدموں کے نیچے گھسٹ رہا ہے) اور اس ممانعت کی طرف اشارہ اس حدیث میں ہے جس کو امام ترمذی نے شامل (رقم الحدیث: ۱۲۱) میں اور امام نسائی نے سنن کبریٰ (رقم الحدیث: ۹۶۸۲-۹۶۸۳) میں حضرت عبید بن خالد رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک تہبند باندھے ہوئے جا رہا تھا اور وہ تہبند زمین پر گھسٹ رہا تھا ناگاہ ایک شخص نے کہا: اپنا کپڑا اوپر اٹھاؤ اس میں زیادہ صفائی اور زیادہ بقا ہے، میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ نبی ﷺ تھے۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ! یہ تو ایک سیاہ اور سفید دھاریوں والا تہبند ہے (یعنی اس معمولی کپڑے میں تکبر کرنے کا کوئی معنی نہیں ہے) آپ نے فرمایا: کیا تمہارے لیے میری شخصیت میں نمونہ نہیں ہے؟ میں نے دیکھا تو آپ نے آدمی پنڈلیوں

تک تہ بند باندھا ہوا تھا (مسند احمد ج ۵، ص ۳۶۳) اور اس وجہ سے بھی ممنوع ہے کہ کپڑا گھسیٹنے میں تکبر کی بدگمانی ہوتی ہے۔ (الی قولہ) قامت سے نیچے کپڑا لٹکانا کپڑا گھسیٹنے کو مستلزم ہے اور کپڑا گھسیٹنا تکبر کو مستلزم ہے خواہ پہننے والے نے تکبر کا قصد نہ کیا ہو اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، احمد بن منیع نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم تہ بند کو گھسیٹنے سے بچو کیونکہ تہ بند کو گھسیٹنا تکبر سے ہے۔ (الخ)

(فتح الباری ج ۱۰، ص ۲۶۳-۲۶۴، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور، ۱۳۰۱ھ)

مٹھنوں سے نیچے لباس رکھنے کے متعلق حرف آخر

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس طویل عبارت کے شروع میں ہی یہ تصریح کر دی ہے کہ اگر کپڑا مٹھنوں سے نیچے لٹک رہا ہو اور وہ اس کی قامت کے برابر اور بغیر تکبر کے ہو تو اس میں تحریم ظاہر نہیں ہے اور اگر وہ اس کی قامت سے متجاوز ہو اور اس کے قدموں تلے گھسٹ رہا ہو تو پھر وہ حرام ہے۔ جسٹس تقی عثمانی نے یہ پوری عبارت نقل کی ہے پھر بھی نتیجہ یہ نکالا ہے کہ قصد کپڑا لٹکانا مطلقاً حرام ہے اور یہ نتیجہ مذاہب اربعہ کے فقہاء کے خلاف ہے بلکہ اگر اس کو اجماع متقدمین کے خلاف کہا جائے تو بعید نہ ہوگا!

شیخ محمد زکریا سہارنپوری متوفی ۱۳۴۶ھ نے بھی اس حدیث کی شرح میں حافظ عسقلانی کی اس تمام عبارت کو نقل کیا ہے، اخیر میں انہوں نے لکھا ہے جو شخص تکبر کی وجہ سے کپڑا گھسیٹے اس کو وعید لاحق ہوگی اور جو شخص کپڑا لٹکا ہونے کی وجہ سے اس کو گھسیٹے یا کسی اور عذر کی وجہ سے اس کو یہ وعید لاحق نہیں ہوگی۔ (اوجز المسائل ج ۶، ص ۲۰۸-۲۰۹، مطبوعہ سہارنپور، ہند)

ہمارے نزدیک اگر کسی شخص کا کپڑا اتنا لٹکا ہے کہ وہ قدموں تلے آکر گھسٹتا ہے تو اس کو پہننا جائز نہیں ہے، اس پر واجب ہے کہ وہ اس کو چھوٹا کرے یا دوسرا پورا لباس پہنے۔ اس غلطی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسباب ثواب اور جرثوبہ میں فرق نہیں کیا۔

بہر حال یہ واضح ہو گیا کہ علماء دیوبند کا تہ بند یا شلوار کے پانچوں کو بغیر تکبر کے بھی مٹھنوں سے نیچے لٹکانے کو حرام قرار دینا مذاہب اربعہ کے تمام فقہاء کے خلاف ہے۔ مرد کی قامت تک کپڑے کا طول بلا تکبر جائز ہے اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو کپڑا قامت سے متجاوز ہو اور قدموں تلے آکر گھسٹ رہا ہو وہ بہر حال میں مکروہ تحریمی ہے۔

میں نے اس مسئلہ پر شرح صحیح مسلم میں بھی کافی سطر سے لکھا ہے، لیکن یہاں بہت زیادہ تفصیل اور تحقیق کی ہے کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ اس مسئلہ میں لوگ بہت تشدد کرتے ہیں اور جس کا پانچ مٹھنوں سے نیچے ہو اس کو نماز دہرانے کا حکم دیتے ہیں۔ چنانچہ مفتی رشید احمد نے احسن الفتاویٰ ج ۳، ص ۴۰۴ میں اسی طرح لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سطور کو نفع آور بنائے اور ان لوگوں کو ہدایت عطا فرمائے جو مسائل شرعیہ میں ایسی تشدید کرتے ہیں جس سے لوگ متنفر ہوتے ہوں۔ جب کہ دین آسان اور سہل ہے۔ اور نبی ﷺ نے دین میں سختی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین والصلوة والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین قائد الانبیاء والمرسلین و علی آلہ المطہرین واصحابہ الکاملین وازواجه الطیبات امہات المومنین وسائر المسلمین۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں اور آخرت کی پیشی کی تکذیب کی ان کے سب (نیک) عمل ضائع ہو گئے ان کو ان ہی کاموں کی سزا ملے گی جو وہ کیا کرتے تھے۔ (الاعراف: ۱۳۷)

کفار کی نیکیوں کا ضائع ہو جانا

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر فرمایا تھا جو ناحق تکبر کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی تکذیب کرتے تھے۔ اور ان کے اسی تکبر اور تکذیب کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو اپنی آیات سے پھیر دیا، اب وہ تمام نشانیاں دیکھنے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے، وہ نیکی کا راستہ دیکھنے کے باوجود اس کو اختیار نہیں کریں گے اور اگر وہ برائی کا راستہ دیکھیں تو فوراً اس کی طرف لپک پڑیں گے۔ اس مقام پر ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہتا کہ ان میں سے بعض کافروں نے کچھ نیک عمل بھی تو کیے تھے، مثلاً رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک، ماں باپ کی خدمت، کمزوروں کی مدد، ناداروں، یتیموں اور یتیموں کی کفالت، رفاہ عامہ کے کام مثلاً کنوئیں کھدوانا، سرائے بنانا، سڑکیں بنانا، آیا ان کو ان نیک کاموں کی کوئی جزا ملے گی؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: چونکہ انہوں نے کفر کیا، ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے انکار کیا اس لیے ان کے تمام نیک اعمال ضائع ہو گئے کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی نیک عمل مقبول نہیں ہوتا۔ اعمال صالحہ کے قبولیت کی شرط ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مرد ہو یا عورت جس نے بھی نیک عمل کیا بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے اور ہم ضرور ان کو ان کے کیے ہوئے نیک کاموں کا اجر عطا فرمائیں گے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ
فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ
بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (النحل: ۹۷)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم کافروں کے تمام اعمال کو ضائع فرمادیں گے۔

کفار ہمارے پاس جو بھی اعمال لے کر آئیں گے ہم ان کو (فضائیں) بکھرے ہوئے غبار کے ذرے بنا دیں گے۔

وَقَدِمْنَا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ
هَبًا مِّنْ سُورٍ (الفرقان: ۲۴) ۲۴
مَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ
(المائدہ: ۵)

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کفار کی نیکیوں کی وجہ سے آخرت میں ان کے عذاب میں تخفیف ہو جائے گی، یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

کفار کے عذاب میں تخفیف کی جائے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ
يُنصَرُونَ (البقرہ: ۸۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! زمانہ جاہلیت میں ابن جدعان رشتہ داروں سے حسن سلوک کرتا تھا اور مسکینوں کو کھانا کھلاتا تھا، کیا یہ عمل اس کو نفع دے گا؟ آپ نے فرمایا: یہ عمل اس کو نفع نہیں دے گا، اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا: اے میرے رب میری خطاؤں کو قیامت کے دن بخش دینا۔

(صحیح مسلم الایمان: ۳۶۵، ۲۱۳) (۵۰۷)

تاہم یہ معاملہ بہ طور عدل ہے اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے کسی کافر کو اسلام لانے کے بعد اس کے زمانہ کفر کی نیکیوں پر اجر عطا فرماتا ہے یا کسی کافر کی نیکیوں کے عوض اس کے عذاب میں تخفیف کر دے تو یہ ممکن ہے۔ چنانچہ ابولہب اور ابوطالب کے عذاب میں تخفیف اسی وجہ سے ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قربت اور حسن سلوک کی وجہ سے

ابوطالب اور ابولہب کو عام قاعدہ سے مستثنیٰ کر لیا گیا۔

فرائض اور واجبات کے ترک پر مواخذہ کی دلیل

اس آیت میں فرمایا ہے: "ان کو ان ہی کاموں کی سزا ملے گی جو وہ کرتے تھے" اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو حرام اور ناجائز کام وہ کرتے تھے اس پر ان کو سزا ملے گی اور جو کام وہ نہیں کرتے تھے اس پر ان کو سزا نہیں ملے گی، یعنی سزا فعل پر ہوگی اور ترک فعل پر سزا نہیں ہوگی۔ تو کافروں نے جو فرائض اور واجبات کو ترک کیا اس آیت کی رو سے ان کو اس پر سزا نہیں ملے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرض اور واجب کی ادائیگی کے وقت میں فرض اور واجب کو ادا کرنے کے بجائے کسی اور کام میں مشغول ہونا حرام ہے سو ان کو ان کاموں پر سزا ملے گی جو وہ فرض اور واجب کی ادائیگی کے اوقات میں کرتے تھے کیونکہ جس وقت میں فرض ادا کرنا تھا اس وقت میں کوئی اور کام کرنا حرام تھا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں فرض اور واجب کے ترک پر بھی سزا کی وعید سنائی ہے:

فِي جَنَّةٍ يَتَسَاءَلُونَ ۝ عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۝
مَا سَأَلَكُمْ فِي سَقَرٍ ۝ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ
الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نَطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝
(المدثر: ۴۴-۴۰)

وہ جنتوں میں ایک دوسرے سے مجرموں کے متعلق سوال کر رہے ہوں گے (پھر مجرموں سے پوچھیں گے) تم کو کس گناہ نے دوزخ میں داخل کیا؟ وہ کہیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح حرام کاموں کے ارتکاب پر عذاب ہوگا، اسی طرح فرائض اور واجبات کے ترک پر بھی عذاب ہوگا۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا

اور موسیٰ کی قوم نے ان کے (جانے کے) بعد اپنے زیروں سے بچھڑے کا ایک مجسمہ بنا لیا جس سے بیل کی آواز

لَهُمْ خُورٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا

نکلتی تھی، کیا انہوں نے یہ (بھی) نہ دیکھا کہ وہ ان سے نہ بات کر سکتا ہے نہ ان کو راستہ دکھا سکتا ہے، (بھیر بھی)

اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ﴿۱۲۸﴾ وَلَمَّا سَقَطَ فِي أَيْدِيهِمْ دَرَأُهَا

انہوں نے اس کو ممبرد بنا لیا اور وہ ظالم تھے ۝ اور جب ان کی خود فریبی کا طسم جاتا رہا اور انہوں نے جان لیا کہ

أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا ۚ قَالَ الْوَالِدِينَ لِمَ يَرِحُ حَنُنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَ مِنَ

وہ گمراہ ہو چکے ہیں، تو انہوں نے کہا اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ فرمائے اور ہم کو نہ بخشے تو ہم ضرور نقصان

مِنَ الْخٰسِرِينَ ﴿۱۲۹﴾ وَلَمَّا رَجِعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ اَسْفًا

اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ۝ اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف لوٹے تو انہوں نے غضبناک ہو کر تاسف سے کہا، تم نے

قَالَ يَسْمَا خَلَفْتُونِي مِنْ بَعْدِي أَجَلْتُمْ أَمْرًا بِيكُمْ وَالْقِي

یرے جانے کے بعد میرے پیچھے کیسے بڑے کام کیے، کیا تم نے اپنے رب کے احکام آنے سے پہلے ہی جلد بازی کی؟

الْأَوَّاحِ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ط قَالَ ابْنُ أَمْرَانَ

اور انہوں نے (تورات کی) تختیاں ڈال دیں اور اپنے بھائی کے سر (کے بالوں) کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے (ہارون نے) کہا اے میری ماں!

الْقَوْمِ اسْتَضَعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي صَلِّ فَلَا تَسْمِتْ بِي الْأَعْدَاءُ

کے بیٹے! ان لوگوں نے مجھے بے بس کر دیا اور قریب تھا کہ یہ مجھے قتل کر دیتے تو آپ مجھ پر دشمنوں کو سنبھالنے کا موقع نہ دیں

وَلَا تَجْعَلْنِي مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۱۵۱ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِإِخْوَتِي

اور مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کیجیے ○ موسیٰ نے دعا کی اے میرے رب مجھے اور میرے بھائی کو معاف

وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ صَلِّ وَأَنْتَ أَرْحَمُ الرَّحِيمِينَ ع ۱۵۱

کرفے اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور موسیٰ کی قوم نے ان کے (جانے کے بعد) اپنے زیوروں سے بچھڑے کا ایک مجسمہ بنالیا جس سے بیل کی آواز نکلتی تھی، کیا انہوں نے یہ (بھی) نہ دیکھا کہ وہ ان سے نہ بات کر سکتا تھا نہ ان کو راستہ دکھا سکتا تھا (پھر بھی) انہوں نے اس کو معبود بنالیا اور وہ ظالم تھے ○ (الاعراف: ۱۴۸)

بنو اسرائیل کے بچھڑا بنانے اور اس کی پرستش کرنے کے متعلق روایات

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

جب موسیٰ علیہ السلام فرعون سے فارغ ہو گئے، طور پر جانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو سمندر سے نجات دی اور فرعون کو غرق کر دیا، حضرت موسیٰ ارض طیبہ میں پہنچے، اللہ تعالیٰ نے وہاں ان پر من اور سلویٰ نازل کیا، اور اللہ نے ان کو حکم دیا کہ وہ اس سے ملاقات کریں۔ جب حضرت موسیٰ نے اپنے رب سے ملاقات کا ارادہ کیا تو انہوں نے حضرت ہارون کو اپنی قوم پر خلیفہ بنایا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے امر اور اس سے میعاد معلوم کیے بغیر ان سے وعدہ کر لیا کہ وہ تمہیں راتوں کے بعد واپس آجائیں گے۔ اللہ کے دشمن سامری نے کہا: تمہارے پاس موسیٰ نہیں آئیں گے اور تمہاری اصلاح صرف خدا کرے گا جس کی تم عبادت کرتے ہو، حضرت ہارون علیہ السلام نے ان کو قسم دی کہ تم ایسا نہ کرو تم ایک دن اور ایک رات حضرت موسیٰ کا اور انتظار کرو اگر وہ آجائیں تو فیہما ورنہ پھر تم جو جی میں آئے کرنا۔ پھر دوسرے دن بھی حضرت موسیٰ نہیں آئے تو سامری نے پھر وہی بات کی۔ حضرت ہارون نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے دس دن اور بڑھادیے ہیں اور اب چالیس دن کی مدت ہو گئی ہے۔

ابو بکر بن عبد اللہ الہزلی بیان کرتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد، سامری حضرت ہارون علیہ السلام کے پاس آکر کہنے لگا، ہم نے قبیلوں کی عید کے دن ان سے بہت سے زیورات عاریتہ لے لیے تھے اور جو لوگ آپ کے پاس ہیں وہ

جلدی جلدی ان زیورات کو بیچ کر خرچ کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ فرعون کی قوم سے عاریتہ لیے تھے اور اب وہ زندہ نہیں ہیں کہ ہم ان کو وہ زیورات واپس کر دیں اور ہم کو پتا نہیں کہ آپ کے بھائی اللہ کے نبی حضرت موسیٰ جب آئیں گے تو ان کی اس مسئلہ میں کیا رائے ہوگی یا تو وہ اس کی قربانی پیش کریں گے پھر آگ اس کو کھا جائے گی اور یا ان کو صرف فقراء کے لیے وقف کر دیں گے۔ حضرت ہارون نے فرمایا: تم نے ٹھیک سوچا اور ٹھیک کہا۔ پھر آپ نے ایک منادی کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ جس شخص کے پاس آل فرعون کے جتنے بھی زیورات ہوں وہ ہمارے پاس لے آئے۔ وہ ان کے پاس تمام زیورات لے آئے۔ حضرت ہارون نے فرمایا: اے سامری! تم اس خزانے کو رکھنے کے زیادہ حقدار ہو۔ سامری نے ان زیورات پر قبضہ کر لیا اور وہ خبیث دشمن خدا سونے کو ڈھالنے والا تھا اس نے اس سے ایک پچھڑے کا مجسمہ بنا لیا اس نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے گھوڑے کے نشان سے ایک مٹھی بھر مٹی لی تھی اس نے اس پچھڑے کے کھوکھلے پیٹ میں وہ مٹی ڈال دی تب وہ مجسمہ پچھڑے کی سی آواز نکالنے لگا۔ اس نے صرف ایک بار یہ آواز نکالی تھی۔ سامری نے کہا تیس راتوں کے بعد جو حضرت موسیٰ نہیں آئے تو وہ دراصل اسی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَاخْرَجَ لَهُمَّ عِجْلًا جَسَدًا آلَهُ خَوَّارًا فَقَالُوا هَذَا إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ فَنَسِيَ (طہ: ۸۸)

سامری نے ان کے لیے پچھڑے کا بے جان مجسمہ بنا کر نکالا
لوگوں نے کہا: یہ ہے تمہارا اور موسیٰ کا معبود موسیٰ تو بھول گئے۔

سامری یہ کہتا تھا کہ موسیٰ تو بھول گئے، تمہارا اصل خدا تو یہ ہے۔

(جامع البیان، جز ۹، ص ۶۶-۶۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

سامری کے متعلق علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

سامری کا نام موسیٰ بن ظفر تھا وہ سامرہ نامی ایک بستی کی طرف منسوب تھا۔ جس سال بنو اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کیا گیا تھا وہ اسی سال پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں نے اس کو پہاڑ کے ایک غار میں چھپا دیا تھا۔ حضرت جبرئیل اس کو غذا پہنچاتے رہے تھے اس وجہ سے وہ حضرت جبرئیل کو پہچانتا تھا جب جبرئیل سمندر کو عبور کرنے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے تھے تاکہ فرعون بھی سمندر میں آجائے تو سامری نے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے سے کچھ مٹی اٹھالی تھی۔ قرآن مجید کی حسب ذیل آیت کا یہی معنی ہے:

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا مِيرِي ۝ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي ۝ (طہ: ۹۶-۹۵)

(موسیٰ نے سامری سے) کہا: اے سامری تو کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا: میں نے وہ چیز دیکھی جو دوسروں نے نہیں دیکھی، تو میں نے رسول (جبرئیل کی سواری) کے نقش قدم سے ایک مٹھی بھر لی، پھر میں نے اس کو (پچھڑے کے پتلے میں) ڈال دیا اور میرے دل میں اسی طرح آیا تھا۔

(الجامع لاحکام القرآن، جز ۷، ص ۲۵۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

امام عبدالرحمن بن محمد بن ابی حاتم رازی متوفی ۳۲۷ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے بنو اسرائیل کو خطبہ دیا اور فرمایا: تم جب مصر سے روانہ ہوئے تو تمہارے پاس قوم فرعون کی امانتیں تھیں اور عاریتہ لی ہوئی چیزیں تھیں اور میرا خیال ہے وہ چیزیں

تمہارے پاس ہیں اور میں ان امانتوں کو اور مانگی ہوئی چیزوں کو تمہارے لیے حلال نہیں قرار دیتا۔ اب ہم وہ چیزیں ان کو واپس تو نہیں کر سکتے، اور نہ ہی ہم ان چیزوں کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ پھر حضرت ہارون علیہ السلام نے ایک گڑھا کھودنے کا حکم دیا اور قوم کو حکم دیا کہ جس شخص کے پاس بھی ان امانتوں اور مانگی ہوئی چیزوں میں سے جو کچھ بھی ہے وہ اس میں لا کر ڈال دے۔ جب لوگوں نے سب کچھ ڈال دیا تو حضرت ہارون نے اس میں آگ لگادی اور فرمایا یہ چیزیں ان کے لیے رہیں نہ ہمارے لیے ہوں گی۔ اور سامری کا اس قوم سے تعلق تھا جو بیل کی عبادت کرتی تھی۔ وہ بنی اسرائیل میں سے نہیں تھا، ان کا پڑوسی تھا۔ اس نے بھی وہی مصائب اٹھائے تھے جو بنو اسرائیل نے اٹھائے تھے۔ اس کے لیے یہ مقدر کر دیا گیا تھا کہ اس نے حضرت جبرئیل کی سواری کے نقش قدم کو دیکھ لیا تھا اور اس سے ایک مٹھی خاک کی اٹھالی تھی۔ حضرت ہارون نے اس سے پوچھا کہ تیری مٹھی میں کیا ہے، اس نے کہا: میں اس وقت تک نہیں بتاؤں گا جب تک کہ آپ یہ دعا نہ کریں کہ جب میں اس مٹھی کو ڈالوں تو جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ بن جائے۔ حضرت ہارون نے فرمایا: تم اس کو گرا دینا اور اس کے لیے دعا کی۔ اس نے کہا میں بیل بنانا چاہتا ہوں۔ اس نے اس گڑھے میں سے تمام لوہے، پیتل اور زیورات وغیرہ کو نکالا تو وہ ایک کھوکھلا بیل بن گیا اور اس سے بیل کی سی آواز آ رہی تھی۔

قداہ نے کہا: جب سامری نے پھڑپھڑایا تو اللہ تعالیٰ نے اسے گوشت اور خون کا بنا دیا اور اس سے آواز آرہی تھی۔ عید بن جیر نے کہا: یہ خدا وہ پھڑپھڑاؤ خود آواز نہیں نکالتا تھا لیکن اس کی دبر (مقعد، مبرز) سے ہو اس کے اندر داخل ہوتی تھی اور اس کے منہ سے نکل جاتی تھی اور اس ہوا کے گزرنے سے وہ آواز پیدا ہوتی تھی۔ سعید بن جیر حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ آواز نکالتا تو بنو اسرائیل سجدہ میں گر جاتے اور جب وہ خاموش ہوتا تو وہ سجدہ سے اپنا سر اٹھا لیتے تھے۔

ضحاک سے روایت ہے کہ اس نے صرف ایک بار آواز نکالی تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کہ وہ ان سے بات کرتا تھا نہ ان کی بات کا جواب دیتا تھا (لیکن یہ استدلال ضعیف ہے، کیونکہ بار بار بیل کی سی آواز نکالنا، اس کے بات کرنے یا کسی بات کے جواب دینے کے ہم معنی نہیں ہے)

(تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۵، ص ۱۵۶۹-۱۵۶۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

کلام کرنے اور ہدایت دینے پر مدار الوہیت کی توجیہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کیا انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ ان سے نہ بات کر سکتا ہے نہ ان کو راستہ دکھا سکتا ہے پھر بھی انہوں نے اس کو معبود بنا لیا۔

اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر وہ پھڑپھڑان سے بات کر سکتا یا ان کو راستہ دکھا سکتا تو پھر بنو اسرائیل کا اس کو معبود قرار دینا صحیح ہوتا۔ حالانکہ محض کسی سے بات کرنے یا کسی کو راستہ دکھانے پر تو الوہیت کا مدار نہیں ہے! اس اعتراض کے متعدد جوابات ہیں:

۱۔ الوہیت کا مدار سات صفات حقیقیہ پر ہے: حیات، علم، قدرت، کلام، سمع، بصر اور ارادہ۔ ان میں سے ایک صفت کلام ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت کلام کا یہ معنی ہے کہ وہ از خود کلام فرماتا ہے اور کسی غیر کی قدرت اور عطا کا اس میں دخل نہیں ہے اور جس کی یہ ایک صفت کلام حقیقی ہوگی اور بغیر کسی احتیاج کے ہوگی اس کی تمام صفات حقیقی ہوں گی، اور اب آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ پھڑپھڑاؤ مطلقاً کلام نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کلام اس کی حقیقی صفت ہو اور وہ بغیر کسی احتیاج کے کلام کرے تو پھر اس کو معبود

قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا!

۲- اللہ تعالیٰ کے ہدایت دینے کا معنی یہ ہے کہ وہ ہدایت کو پیدا کرتا ہے اور یہ پچھڑا جو مطلقاً ہدایت نہیں دے سکتا، وہ ہدایت کو پیدا کر سکتا ہے تو پھر اس کو معبود قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا!

۳- انسان کو اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی ذات و صفات کی ہدایت حاصل ہونا اس پر موقوف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اپنی ذات اور صفات پر جو دلائل قائم کیے ہیں اور زمینوں اور آسمانوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر جو نشانیاں ہیں انسان ان میں صحیح طریقہ سے غور اور فکر کرے، پس وہی ہدایت دے سکتا ہے جو زمینوں اور آسمانوں میں ان نشانیوں کو پیدا کرے اور یہ پچھڑا جو اپنے وجود میں خود دوسروں کا محتاج تھا اور بہ ظاہر سامری کے بنانے سے وجود میں آیا یہ ان نشانیوں کو کیونکر بنا سکتا تھا تو یہ ہدایت دینے پر کیسے قادر ہو سکتا تھا۔ تو اس کو معبود قرار دینا کس طرح صحیح ہوگا۔

۴- اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی سخت مذمت فرمائی ہے کہ یہ پچھڑا جو ان چیزوں پر بھی قدرت نہیں رکھتا جن پر عام انسان قادر ہیں تو تف ہے تم نے ایسے کو خدا مان لیا ہے۔

۵- چونکہ اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے ہم کلام ہوا تھا اور اس نے ان کی قوم کو ہدایت دی تھی اس وجہ سے اس آیت میں یہ تعریف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تو یہ شان ہے کہ وہ کلام فرمانے والا ہے اور ہدایت دینے والا ہے۔ تم اس خدا کو چھوڑ کر کہاں پچھڑے کی پرستش میں مشغول ہو۔

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے: ”اور وہ ظالم تھے“ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو اس کے غیر محل میں رکھنا اور کسی کا حق کسی دوسرے کو دینا۔ عبادت اللہ کا حق ہے۔ جب انسان اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرتا ہے تو وہ اللہ کا حق دوسروں کو دے رہا ہے اور یہی ظلم کرنا ہے بلکہ کائنات میں سب سے بڑا ظلم غیر اللہ کی عبادت اور شرک کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ان کی خود فریبی کا ظلم جاتا رہا اور انہوں نے جان لیا کہ وہ گمراہ ہو چکے ہیں تو انہوں نے کہا اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ فرمائے اور ہم کو نہ بخشے تو ہم ضرور نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے ○

(الاعراف: ۱۴۹)

لما سقط فی ایدہم کا معنی

”ولما سقط فی ایدہم“ عربی محاورہ میں اس کا معنی ہے: جب انہوں نے لغزش کی یا جب وہ پچھتائے۔ زجاج نے کہا اس کا معنی ہے جب ان کے ہاتھوں میں ندامت گر گئی۔ بنو اسرائیل پچھڑے کی عبادت کرنے پر بہت نادام ہوئے تھے۔ اس لیے فرمایا ”ولما سقط فی ایدہم“ جب کوئی ناپسندیدہ اور مکروہ چیز دل میں آئے تو یہ کہتے ہیں اور ہاتھوں سے دل کا استعارہ کرتے ہیں۔

سقوط کا معنی ہے کسی چیز کا اوپر سے نیچے گرنا۔ عرب کہتے ہیں سقط المطر بارش گری اور حمل ساقط ہونا کہتے ہیں جب ناتمام بچہ پیدا ہو۔ جب انسان کسی عمل کا اقدام کرتا ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ یہ عمل اچھا اور درست ہے اور اس عمل سے اس کو عزت اور بلندی حاصل ہوگی۔ اور جب اس پر یہ منکشف ہو کہ یہ عمل باطل اور فاسد تھا تو وہ گویا بلندی سے نیچے گر گیا اور جو عزت اور بلندی اس کو حاصل تھی وہ جاتی رہی۔ اس لیے جب کسی شخص سے خطایا لغزش ہو تو عرب کہتے ہیں ذالک سقط منہ اس کی سر بلندی اور سرفرازی گئی۔

اس کے بعد انہوں نے توبہ اور استغفار کیا۔ اور یہ معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طور سے واپس آنے کے بعد ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف لوٹے تو انہوں نے غضبناک ہو کر تاسف سے کہا تم نے میرے جانے کے بعد میرے پیچھے کیسے برے کام کیے! کیا تم نے اپنے رب کے احکام آنے سے پہلے ہی جلد بازی کی اور انہوں نے (تورات کی) تختیاں ڈال دیں اور اپنے بھائی کے سر (کے بالوں) کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے، (ہارون نے) کہا اے میری ماں کے بیٹے! ان لوگوں نے مجھے بے بس کر دیا اور قریب تھا کہ یہ مجھے قتل کر دیتے، تو آپ مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دیں اور مجھے ان ظالموں میں شامل نہ کیجئے ○ (الاعراف: ۱۵۰)

قوم کی گمراہی پر حضرت موسیٰ آیا طور سے واپسی پر مطلع ہوئے یا پہلے اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ آیا بنو اسرائیل کی گوسالہ پرستی کا علم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ طور سے واپس آنے کے بعد ہوا تھا یا پہاڑ طور پر ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی گمراہی اور گوسالہ پرستی سے مطلع کر دیا تھا۔ امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے اور ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے کچھ آوازیں سنیں تو انہوں نے کہا میں لھو و لعب میں مشغول لوگوں کی آوازیں سن رہا ہوں اور جب انہوں نے یہ معائنہ کیا کہ وہ بچھڑے کی عبادت کر رہے ہیں تو انہوں نے تورات کی الواح کو ڈال دیا جس کے نتیجہ میں وہ ٹوٹ گئیں اور وہ اپنے بھائی کو سر کے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگے۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۸۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

صحیح بات یہ ہے کہ قوم کی گمراہی پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہاڑ پر ہی مطلع فرمادیا تھا۔ قرآن مجید کی صریح آیات اور حدیث صحیح سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا آعَجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يَا مُوسَىٰ ○ قَالَ
هُمُ أَوْلَاءُ عَلِيِّ أَسْرِيٍّ وَ عَجَلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ
لِنَتْرُضِي ○ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِن
بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ الشَّامِرِيُّ ○ فَرَجَعَ مُوسَىٰ
إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ آسِئًا (طہ: ۸۶-۸۴)

(اور ہم نے طور پر موسیٰ سے فرمایا) آپ نے اپنی قوم کو چھوڑ کر آنے میں کیوں جلدی کی اے موسیٰ؟ ○ عرض کیا وہ لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں، اے میرے رب! میں نے آنے میں اس لیے جلدی کی کہ تو راضی ہو جائے ○ فرمایا تو ہم نے آپ کے بعد آپ کی قوم کو آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا ہے ○ تو موسیٰ بہت غم و غصہ کے ساتھ اپنی قوم کی طرف لوٹے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آنکھ سے دیکھنا سننے کی مثل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تمہاری قوم فتنہ میں مبتلا کر دی گئی ہے تو انہوں نے تختیاں نہیں ڈالیں اور جب انہوں نے آنکھ سے دیکھ لیا تو تختیاں زمین پر ڈال دیں اور وہ نتیجتاً ٹوٹ گئیں۔

(المعجم الکبیر ج ۱۳، رقم الحدیث: ۱۲۳۵۱، المعجم الاوسط ج ۱، رقم الحدیث: ۲۵، مسند احمد ج ۱، رقم الحدیث: ۲۳۳۷، مسند البرزنجی ج ۱، رقم الحدیث: ۲۰۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۲۰۷۷، المستدرک ج ۲، ص ۲۲۱، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۷۰، الدر المنثور ج ۳، ص ۵۶۳، حافظ البیہقی نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے ج ۱، ص ۱۵۳)

غضب کا معنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غضب کا تعین

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ غضب اور افسوس کے ساتھ لوٹے۔

علامہ حسین بن محمد رغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

غضب کا معنی ہے انتقام کے ارادہ سے دل کے خون کا کھولنا اور جوش میں آنا۔

(المفردات ج ۲، ص ۲۶۸، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

علامہ مجد الدین محمد بن اثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اللہ کے غضب کا معنی ہے اپنی نافرمانی سے منع کرنا، نافرمانی کرنے والے پر ناراض ہونا۔ اس سے اعراض کرنا اور اس کو عذاب دینا۔ اور مخلوق کے غضب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک محمود ہے اور دوسری مذموم ہے۔ اگر دین اور حق کی خاطر بندہ غضب میں آئے تو یہ غضب محمود ہے۔ اور اگر اپنی نفسانی خواہشوں کے پورا نہ ہونے یا ناجائز حکم کے نہ ماننے یا اس کی ممانعت کرنے کی وجہ سے غضب میں آئے تو یہ غضب مذموم ہے۔ (النهاية ج ۳، ص ۳۳۳، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

حضرت موسیٰ علیہ السلام جو غضب میں آئے تھے وہ اللہ کی نافرمانی اور شرک کی وجہ سے تھا آپ کا یہ غضب محمود تھا۔ انسان جو اپنے ذاتی نقصان کی وجہ سے غضب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اس غضب کے روکنے اور انتقام نہ لینے کی ترغیب دی ہے۔

غیظ و غضب کو ضبط کرنے اور بدلہ نہ لینے کے متعلق قرآن مجید کی آیات اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

جو لوگ تنگی اور فراخی میں (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور نیکو کاروں سے اللہ محبت کرتا ہے۔ اور جو لوگ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب وہ غضبناک ہوں تو معاف کر دیتے ہیں۔

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (آل عمران: ۱۳۴)
وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْأَثَمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (الشوری: ۳۷)

اور جن لوگوں کو (کسی کی) سرکشی پہنچے تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ اسی کی مثل برائی ہے اور جس شخص نے معاف کر دیا اور اصلاح کر لی تو اس کا اجر اللہ (کے ذمہ کرم) پر ہے۔ اور جو صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک یہ ضرور ہمت کے کاموں سے ہیں۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (الشوری: ۴۰-۴۹)
وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (الشوری: ۴۳)

غیظ و غضب کو ضبط کرنے اور بدلہ نہ لینے کے متعلق احادیث

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے ایک طویل حدیث روایت کی ہے اس میں غضب کے متعلق آپ کا ارشاد ہے: سنو! غضب ایک انگارہ ہے جو ابن آدم کے پیٹ میں جلتا رہتا ہے، کیا تم (غضبناک شخص کی) آنکھوں کی سرخی اور اس کی گردن کی پھولی ہوئی رگوں کو نہیں دیکھتے، پس تم میں سے جو شخص غضب میں آئے وہ زمین کو لازم پکڑے، سنو! بہترین آدمی وہ شخص ہے جو بہت دیر سے غضب میں آئے اور بہت جلد راضی ہو جائے، اور بدترین آدمی وہ شخص ہے جو بہت جلد غضب میں آئے اور بہت دیر سے راضی ہو، اور جو شخص دیر سے غضب میں آئے اور دیر سے راضی ہو، اور جو شخص جلدی غضب میں

آئے اور جلدی راضی ہو تو یہ (بھی) اچھی خصلت ہے۔

(مسند احمد ج ۱۰، رقم الحدیث: ۱۱۰۸۶، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ ۱۳۱۶ھ، حافظ شاکر نے کہا، اس حدیث کی سند حسن ہے، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۹۸، امام ترمذی سے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۰۰، صحیح ابن حبان ج ۸، رقم الحدیث: ۳۲۲۱)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: تم لوگ رقبہ کسی کو شمار کرتے ہو؟ ہم نے کہا جس شخص کے ہاں اولاد نہ ہو، آپ نے فرمایا وہ رقبہ نہیں ہے، رقبہ وہ شخص ہے جس کی (نابالغ) اولاد میں سے اس کی زندگی میں کوئی فوت نہ ہو (حتیٰ کہ وہ اس کے لیے فرط اور سلف ہو جائے) پھر فرمایا تم لوگ پہلوان کس کو شمار کرتے ہو؟ ہم نے کہا جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں، آپ نے فرمایا وہ پہلوان نہیں ہے، پہلوان وہ ہے جو غضب کے وقت خود کو قابو میں رکھنے پر قادر ہو۔ (صحیح مسلم، البر الوصلہ، ۱۰۶، ۲۶۰۸، ۶۵۱۸، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۱۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۷۹، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۵۶۵، مسند احمد ج ۳، ص ۲۳۶، الادب المفرد رقم الحدیث: ۱۳۱۷، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۱۹۹)

عروہ بن محمد السعدی اپنے باپ سے اور وہ اپنی دادی عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا غضب شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو صرف پانی سے بجھایا جاتا ہے۔ پس جب تم میں سے کوئی شخص غضبناک ہو تو وہ وضو کرے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۸۳، مسند احمد ج ۳، ص ۲۲۶، جامع الاصول رقم الحدیث: ۶۲۰۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص غضب میں آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے۔ اگر اس کا غضب دور ہو گیا تو فہماور نہ لیٹ جائے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۸۲، مسند احمد ج ۵، ص ۱۵۲، جامع الاصول رقم الحدیث: ۶۲۰۲) کیونکہ جو شخص کھڑا ہو وہ اپنے ہاتھ پیر چلانے پر بیٹھے ہوئے شخص کے بہ نسبت زیادہ قادر ہوتا ہے اور بیٹھا ہوا شخص اس کی بہ نسبت کم قادر ہوتا ہے اور لیٹا ہوا شخص اور بھی کم قادر ہوتا ہے۔

حضرت سلیمان بن صدق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے وہاں دو شخص ایک دوسرے پر سب و شتم کر رہے تھے اور جب ان میں سے ایک شخص دوسرے کو برا کہہ رہا تھا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ نبی ﷺ نے فرمایا مجھے ایک ایسے کلمہ کا علم ہے اگر یہ شخص اس کو پڑھ لے تو اس کا غضب جاتا رہے گا، تب ایک شخص اس کے پاس گیا اور کہا تم پڑھو اعود باللہ من الشیطان الرجیم اس نے کہا کیا مجھے کوئی بیماری ہوئی ہے؟ یا میں مجنون ہوں جاؤ یہاں سے۔

(صحیح مسلم البر الوصلہ، ۱۰۹، ۲۶۱۰، ۶۵۲۳، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۲۸۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۸۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۳۵۹، مسند احمد ج ۶، ص ۳۹۳، الادب المفرد رقم الحدیث: ۳۳۳، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۲۰۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: مجھے وصیت کیجئے اور مجھے زیادہ احکام نہ بتائیں یا اس نے کہا مجھے حکم دیجئے اور مجھے کم سے کم باتیں فرمائیں تاکہ میں بھول نہ جاؤں۔ آپ نے فرمایا تم غضب نہ کرو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۱۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۲۷، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۱۶۸۰، مسند احمد ج ۲، ص ۳۶۶، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۲۰۵)

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے غضب کے تقاضوں کو پورا کرنے پر قادر ہو اور وہ اپنا غضب ضبط کرے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص کو تمام لوگوں کے سامنے بلائے گا اور اس کو یہ اختیار دے گا کہ وہ جو حور چاہے لے لے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۷۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۲۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۸۶، مسند احمد ج ۳، ص ۳۳۸، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۲۰۶)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنا غضب دور کیا اللہ اس سے اپنے عذاب کو دور کر دے گا اور جس نے اپنی زبان کی حفاظت کی اللہ اس کے عیوب پر پردہ رکھے گا۔

(المعجم الاوسط ج ۲، رقم الحدیث: ۱۳۳۲، اس کی سند میں عبد السلام بن ہاشم ضعیف ہے، مجمع الزوائد ج ۸، ص ۶۸، نقیلی نے اس کو ضعفاء میں بیان کیا ہے رقم الحدیث: ۱۱۵)

اگر انسان اپنے کسی ذاتی نقصان یا ذاتی معاملہ کی وجہ سے غضب میں آئے تو اس غضب کو ضبط کرنا چاہیے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے غضب میں آئے تو اس غضب کے تقاضے پر عمل کرے، اگر اس برائی کو طاقت سے بدل سکتا ہو تو طاقت سے بدلے ورنہ زبان سے اس کی مذمت کرے اور یہ بھی نہ کر سکے تو اس کو دل سے برا جانے۔

تورات کی تختیوں کو زمین پر ڈالنے کی توجیہ

اس آیت میں فرمایا ہے ”انہوں نے (تورات کی) تختیاں ڈال دیں۔“

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تورات کی الواح کو زمین پر ڈال دینا ان کے شدت غضب پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ انسان اس قسم کا اقدام اسی وقت کرتا ہے جب وہ شدت غضب سے مدہوش ہو جائے۔ روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ نے تورات کی تختیاں زمین پر ڈالیں تو وہ ٹوٹ گئیں۔ اس کے کل سات اجزاء تھے چھ اس وقت اٹھالے گئے اور صرف ایک حصہ باقی رہ گیا۔ جو اجزاء اٹھالے گئے ان میں ہر چیز کی تفصیل تھی، اور جو ایک حصہ باقی رہ گیا اس میں ہدایت اور رحمت تھی۔

اور کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ قرآن مجید میں صرف یہ ہے کہ انہوں نے تورات کی تختیاں (زمین پر) ڈال دیں۔ رہا یہ کہ انہوں نے تورات کی تختیوں کو اس طرح پھینکا کہ وہ ٹوٹ گئیں یہ قرآن مجید میں نہیں ہے اور یہ کہنا اللہ کی کتاب پر سخت جرات ہے اور اس قسم کا اقدام انبیاء علیہم السلام کے لائق نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۷۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۱۵ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

قاضی ناصر الدین نے کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شدت غضب، فرط صدمہ اور حمیت دین کی وجہ سے تورات کی تختیوں کو پھینک دیا اور جب انہوں نے وہ تختیاں پھینکیں تو ان میں سے بعض ٹوٹ گئیں۔ علامہ صبغۃ اللہ آفندی نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ حمیت دین کا تقاضا یہ ہے کہ کتاب اللہ کا احترام کیا جائے اور اس سے حفاظت کی جائے کہ وہ گر کر ٹوٹ جائے یا اس میں کوئی نقصان ہو یا اس کی بے حرمتی ہو، اور صحیح بات یہ ہے کہ شدت غضب اور فرط غم کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بے قابو ہو گئے اور غیر اختیاری طور پر ان کے ہاتھوں سے یہ تختیاں گر گئیں اور چونکہ ان سے ترک تحفظ صادر ہوا تھا تو اس ترک تحفظ کو تغلیظاً ڈال دینے سے تعبیر فرمایا اور ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے درجہ میں گناہ کا حکم رکھتی ہیں۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں یہ توجیہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل پر کوئی عتاب نہیں کیا گیا حتیٰ کہ یہ کہا جائے کہ ان کے ترک تحفظ کو تغلیظاً ڈال دینے سے تعبیر فرمایا اور یہ کہا جائے کہ ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے درجہ میں گناہ کا حکم رکھتی ہیں۔ ان آیات میں صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر زجر و توبیح کی گئی ہے اور میرے نزدیک اس مقام کی تقریر یہ ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے شرک کو دیکھا تو وہ حمیت دین کی وجہ سے سخت غضب میں آگئے اور انہوں نے اپنے ہاتھ کو جلد فارغ کرنے کے لیے عجلت سے وہ الواح زمین پر رکھ دیں تاکہ وہ اپنے بھائی کا سر پکڑ سکیں جس کو قرآن مجید نے ڈالنے سے تعبیر فرمایا اور اس میں کسی وجہ سے بھی تورات کی تختیوں کی اہانت نہیں ہے اور وہ جو طبرانی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ بعض تختیاں ٹوٹ گئیں تو وہ عجلت سے زمین پر رکھنے کی وجہ سے ٹوٹیں اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غرض نہ تھی اور نہ ان کو یہ گمان تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ یہاں پر صرف دینی حمیت اور فرط غضب کی وجہ سے یہ عجلت ان تختیوں کو زمین پر رکھنا مراد ہے اور بعض علماء نے تختیوں کے ٹوٹنے کے واقعہ کا انکار کیا ہے (جیسے امام رازی) ہرچند کہ یہ روایت مسند بزار، مسند احمد اور معجم طبرانی وغیرہ میں ہے۔

(روح المعانی ج ۹، ص ۶۷-۶۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

حضرت ہارون علیہ السلام کو سر کے بالوں سے پکڑ کر کھینچنے کی توجیہ اور دیگر فوائد اس کے بعد فرمایا اور اپنے بھائی کے سر (کے بالوں) کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے۔

جو لوگ عصمت انبیاء پر طعن کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کسی شخص کے سر کے بالوں کو پکڑ کر کھینچنا اس شخص کا استخفاف اور اس کی اہانت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کی اہانت کی اور یہ عصمت کے خلاف ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کا سر پکڑ کر اپنی طرف بہ طور اہانت نہیں کھینچا تھا بلکہ وہ ان کو اپنے قریب کر کے ان سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے پھر حضرت ہارون نے یہ کیوں کہا تھا کہ اے میری ماں کے بیٹے بے شک قوم نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کو بنو اسرائیل کے جاہلوں اور عاقبت ناندیشوں سے یہ خدشہ تھا کہ وہ یہ گمان کریں گے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ہارون پر بھی اسی طرح غضب ناک ہیں جس طرح بنو اسرائیل پر ان کی گوسالہ پرستی کی وجہ سے غضب ناک تھے۔ اس لیے انہوں نے کہا اے میری ماں جائے قوم نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور پچھڑے کی عبادت ترک کرنے میں انہوں نے میرا حکم نہیں مانا۔ میں نے ان کو اس فعل سے روکا تھا لیکن میرے پاس ایسی قدرت نہیں تھی کہ میں ان کو بہ زور اس فعل سے روک دیتا۔ بنو اسرائیل میری بات نہیں سنتے تھے قریب تھا کہ وہ مجھے قتل کر دیتے۔ تو آپ ہمارے دشمنوں یعنی پچھڑے کی پرستش کرنے والوں کو خوش ہونے کا موقع نہ دیں اور میرا شمار ان ظالموں میں نہ کیجئے جنہوں نے پچھڑے کی عبادت کی تھی۔ یعنی ان سے مواخذہ کرنے میں مجھے ان کے ساتھ شریک نہ کیجئے۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی: اے میرے رب! مجھے معاف فرما کہ میں نے حمیت دین اور شدت غضب کی وجہ سے یہ اقدام کیا اور میرے بھائی کو معاف فرما کہ انہوں نے پچھڑے کی عبادت کرنے والوں پر ایسی شدت نہیں کی جو ان کو کرنی چاہیے تھی اور ہم کو اپنی رحمت میں داخل فرما بے شک تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے سر کو پکڑ کر جو کھینچا تھا اس کی حسب ذیل چار تاویلیں ہیں:

۱۔ کسی کے سر کو پکڑ کر کھینچنا ان کے زمانہ میں متعارف تھا جیسا کہ اب عرب کسی شخص کے اکرام اور اس کی تعظیم کے لیے اس کی داڑھی پکڑتے ہیں۔ سو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان کے سر کو پکڑ کر کھینچنا بہ طور اہانت نہ تھا۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو قریب کر کے ان سے رازدارانہ بات کرنا چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر تورات کی الواح نازل کی ہیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے کہا میرے سر اور میری داڑھی کو نہ پکڑو ورنہ آپ کے اس خفیہ بات کرنے سے بنو اسرائیل کو یہ غلط فہمی ہوگی کہ آپ میری اہانت کر رہے ہیں۔

۳۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شدت غضب سے حضرت ہارون علیہ السلام کا سر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا کیونکہ ان کا گمان یہ تھا کہ حضرت ہارون نے بنو اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے روکنے میں قرار واقعی سختی نہیں کی۔ اور چونکہ ان کا غضب اللہ کے لیے تھا اس لیے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

۴۔ حضرت موسیٰ نے اپنے احوال سنانے کے لیے ان کو اپنے قریب کیا تھا۔ حضرت ہارون کو یہ ناگوار ہوا کیونکہ اس سے بنو اسرائیل کو یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ حضرت موسیٰ حضرت ہارون سے مواخذہ کر رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس سلسلہ میں اپنی معذرت پیش کی۔ حسن بھری نے کہا تمام اسرائیلیوں نے پچھڑے کی عبادت کی تھی کیونکہ اگر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے علاوہ اگر کوئی مومن بچا ہوتا تو حضرت موسیٰ اس کے لیے بھی دعا کرتے۔ حضرت موسیٰ نے اپنے لیے دعا کی کیونکہ انہوں نے شدت جذبات کی وجہ سے حضرت ہارون سے کہا تھا:

قَالَ يٰ هٰرُونَ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْا ۙ اَلَا تَتَّبِعُنَّ مَا فَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۙ (طہ: ۹۳-۹۴)

موسیٰ نے کہا اے ہارون! جب آپ نے ان کو گمراہ ہوتے ہوئے دیکھا تو اس موقع پر میری اتباع کرنے سے آپ کو کیا چیز مانع ہوئی؟ کیا آپ نے میرے حکم کی نافرمانی کی۔

اس کی تلافی کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے ان کے لیے بھی دعا کی۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے بتایا ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اس برائی کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس شخص کو کسی برائی کے مٹانے میں اپنی جان جانے کا خطرہ ہو وہ صرف زبان سے منع کرنے پر اکتفا کرے اور اس میں بھی جان جانے کا خطرہ ہو تو خاموش رہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غضب کی وجہ سے احکام نہیں بدلتے، کیونکہ ہرچند کہ ان کی حالت غضب کی وجہ سے تورات کی تختیاں ساقط ہوئیں تھیں لیکن پھر بھی اس پر یہ حکم مرتب ہوا کہ چند تختیاں ان سے اٹھالی گئیں۔

حالت غضب میں طلاق دینے کا شرعی حکم

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متونی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

حافظ ابن قیم جنبلی نے غضبناک شخص کی طلاق کے متعلق ایک رسالہ لکھا ہے۔ اس میں یہ کہا ہے کہ غضبان شخص کی تین قسمیں ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس کو مبادی غضب حاصل ہوں یعنی غضب کی ابتدائی کیفیت ہو۔ اس کی عقل متغیر نہ ہو اور اس کو علم ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا قصد کر رہا ہے۔ اس قسم میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ وہ انتہائی غضب میں ہو اور اس کو علم نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ اس کا ارادہ ہو۔ اس قسم میں اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اقوال نافذ نہیں ہوں گے اور تیسری قسم وہ ہے جو ان دونوں کے درمیان متوسط ہو باس طور کہ وہ مجنون کی مثل نہ ہو۔ یہ قسم محل نظر ہے

اور دلائل کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اقوال بھی نافذ نہ ہوں۔ حافظ ابن قیم کا کلام ختم ہوا۔ لیکن صاحب الغایہ حنبلی نے اس تیسری قسم میں حافظ ابن قیم کی مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ اس میں اقوال نافذ ہوں گے اور اس کی طلاق واقع ہو جائے گی اور یہ ہمارے موقف کے مطابق ہے جیسا کہ ہم نے مدہوش کی بحث میں لکھا ہے۔ (الی قولہ) پس اس مسئلہ میں مدہوش کی تعریف پر اعتماد کرنا چاہیے اور اسی پر حکم دائر کرنا چاہیے۔ اور جس شخص کے اقوال اور افعال میں اکثر و بیشتر خلل رہتا ہو یا بڑھاپے یا بیماری یا کسی آفت کی وجہ سے کسی کی عقل میں خلل آگیا ہو تو جب تک اس کی یہ کیفیت رہے (یعنی الٹی سیدھی باتیں کرتا ہو اور اٹلے سیدھے کام کرتا ہو) اس کے اقوال اور افعال کا اعتبار نہیں کیا جائے گا خواہ اس کو ان اقوال اور افعال کا علم ہو اور اس نے ان کا ارادہ کیا ہو۔ کیونکہ اس کا یہ علم اور ارادہ معتبر نہیں ہے کیونکہ اس کو ادراک صحیح حاصل نہیں ہے۔ آخر میں علامہ شامی نے یہ لکھا ہے کہ جب کوئی شخص شدید غضب کی حالت میں طلاق دے اور بعد میں اس کو یاد نہ رہے کہ اس نے کیا کہا تھا اور دو آدمی یہ گواہی دیں کہ اس نے طلاق دی تھی تو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی۔ ہاں اگر اس کی عقل میں خلل ہو اور اس کی زبان پر ایسے الفاظ جاری ہوں جن کو وہ سمجھتا ہو نہ ان کا ارادہ کرتا ہو تو یہ جنون کا اعلیٰ مرتبہ ہے اس میں طلاق واقع نہیں ہوگی اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ والوالجہ میں مذکور ہے کہ اگر وہ غضب کی ایسی حالت میں ہو کہ اس کی زبان پر ایسے الفاظ جاری ہوں جو اس کو بعد میں یاد نہ رہیں تو دو گواہوں کے قول پر اعتماد کرنا جائز ہے کہ یہ عبارت ہمارے بیان کی صراحتاً تائید کرتی ہے۔

(رد المحتار ج ۲، ص ۳۲۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۰۷ھ)

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۳۰ھ لکھتے ہیں:

غضب اگر واقعی اس درجہ شدت پر ہو کہ حد جنون تک پہنچا دے تو طلاق نہ ہوگی اور یہ کہ غضب اس شدت پر تھا یا تو گواہان عادل سے ثابت ہو یا وہ اس کا دعویٰ کرے اور اس کی یہ عادت مشہور و معروف ہو تو قسم کے ساتھ اس کا قول مان لیں گے ورنہ مجرد دعویٰ معتبر نہیں۔ یوں تو ہر شخص اس کا ادعا کرے اور غصہ کی طلاق واقع ہی نہ ہو۔ حالانکہ طلاق نہیں ہوتی مگر بحالت غصہ۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۵، ص ۲۲۹، مطبوعہ سنی دارالاشاعت، فیصل آباد)

نیز تحریر فرماتے ہیں:

غصہ مانع وقوع طلاق نہیں بلکہ اکثر وہی طلاق پر حامل ہوتا ہے تو اسے مانع قرار دینا گویا حکم طلاق کا راساً ابطال ہے۔ ہاں اگر شدت غیظ و جوش غضب اس حد کو پہنچ جائے کہ اس سے عقل زائل ہو جائے، خبر نہ رہے کیا کہتا ہوں زبان سے کیا نکلتا ہے تو بے شک ایسی حالت کی طلاق ہرگز واقع نہ ہوگی۔ (الی قولہ) اور اگر وہ دعویٰ کرے کہ اس تحریر کے وقت میرا غصہ ایسی ہی حالت کو پہنچا ہوا تھا کہ میری عقل بالکل زائل ہو گئی تھی اور مجھے نہ معلوم تھا کہ میں کیا کہتا ہوں، کیا میرے منہ سے نکلتا ہے تو اطمینان بندہ کے لیے اس کا ثبوت گواہان عادل سے دے کہ اگرچہ عند اللہ وہ اپنے بیان میں سچا ہو اور اسے عورت کے پاس جانا دیا تہ "روا ہو مگر عورت کو بے ثبوت بقائے نکاح اس کے پاس رہنا ہرگز حلال نہیں ہو سکتا تو ضرور ہوا کہ زید اپنے دعویٰ پر گواہ دے یا اگر معلوم و معروف ہے کہ اس سے پہلے بھی کبھی اس کی ایسی حالت ہو گئی تھی تو گواہوں کی کچھ حاجت نہیں مجرد قسم کھا کر بیان کرے ورنہ مقبول نہیں۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۵، ص ۲۳۲-۲۳۳، مطبوعہ فیصل آباد)

علامہ خیر الدین رملی حنفی متوفی ۱۰۸۱ھ لکھتے ہیں:

شرح الطحاوی سے نقل کر کے تاتار خانہ میں یہ تصریح کی ہے کہ مدہوش کی طلاق واقع نہیں ہوتی اسی طرح محقق ابن ہمام نے فتح القدیر میں اور علامہ ترمذی نے اپنے متن تنویر الابصار میں یہ تصریح کی ہے۔ فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ غیر عاقل

کی طلاق واقع نہیں ہوتی سوا اس کے کہ اس کی عقل نشہ کے سبب سے زائل ہو جو کہ معصیت ہے تو اس صورت میں بہ طور سزا اس کی طلاق واقع ہو جائے گی۔ غیر عاقل میں ہر وہ شخص داخل ہے جس کی عقل ان امور سے زائل ہوئی ہو۔ جنون، عتہ، برسام، انمار (بے ہوشی) اور دھش، جنون ایک مشہور بیماری ہے اور عتہ کا معنی ہے کم فہمی اور کلام کا غلط اور صحیح ہونا۔ اور تدبیر کا فساد یہ عقل کے اختلال کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کبھی وہ عقل مندوں کی طرح کلام کرتا ہے اور کبھی مجنونوں کی طرح اور برسام ایک بیماری ہے جس میں بیمار ہڈیاں بکتا ہے (بے سرو پابا تیں کرتا ہے) اور دھش کا معنی ہے عقل جاتی رہے بھول اور غفلت کی وجہ سے یا عشق کی وجہ سے اور جس نے مدہوش کی تفسیر حیرت زدہ کی ہے اس نے غلطی کی۔ قاموس میں لکھا ہے کہ مدہوش وہ شخص ہے جس کی عقل ذہول یا عشق کی وجہ سے جاتی رہی۔ مجنون کے متعلق حکم یہ ہے کہ جس کے متعلق معلوم ہو کہ اس کو جنون ہو چکا ہے اور اس نے طلاق دی اور اس نے کہا مجھے دوبارہ جنون ہوا اور میں نے طلاق دی تو اس کی قسم کے ساتھ اس کا قول قبول کر لیا جائے گا اور اگر پہلے اس کو جنون نہ ہوا ہو تو اس کا قول قبول نہیں کیا جائے گا۔ خانیہ، تاتار خانیہ اور دیگر کتب میں اسی طرح ہے۔ مدہوش کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔ اگر ایک مرتبہ پہلے وہ مدہوش ہو چکا ہے تو قسم کے ساتھ اس کا قول قبول کر لیا جائے گا اور اگر وہ پہلے مدہوش نہیں ہوا تو قضاء اس کا قول قبول نہیں ہو گا ہاں گواہوں کی گواہی سے ثابت ہو جائے گا اور دیا تہ "اس کا قول قبول ہو جائے گا۔ (الفتاویٰ الخیریہ علی ہامش الخامیہ ج ۱، ص ۶۸-۶۷، مطبوعہ کوئٹہ)

ثبات کا معنی اور اس کا شرعی حکم

اس آیت میں ہے: فلا تشمت بی الاعداء "تو آپ مجھ پر دشمنوں کو ہنسنے کا موقع نہ دیں۔"

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

ثبات کا معنی ہے دشمن کی مصیبت پر خوش ہونا۔

(المفردات ج ۱، ص ۳۵۱، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ مکہ مکرمہ، التہایہ ج ۲، ص ۴۲۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حضرت داؤد بن اسحاق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اپنے (دینی) بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ اس پر رحم

فرمائے گا اور تم کو مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۱۳)

نبی ﷺ نے ثبات اعداء سے محفوظ رہنے کی دعا فرمائی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ بری تقدیر، سختیوں کے آنے، ثبات اعداء اور سخت مصیبت سے اللہ

تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے تھے۔

(صحیح مسلم، الذکر، ۵۳، (۲۷۰۷) ۶۷۳۷، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۶۱۶، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۳۹۱، مسند احمد ج ۲،

ص ۱۷۳)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: موسیٰ نے دعا کی اے میرے رب مجھے اور میرے بھائی کو معاف کر دے اور ہم کو اپنی رحمت

میں داخل فرما اور تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم فرمانے والا ہے۔ (الاعراف: ۱۵۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعاء مغفرت کی توجیہ

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنے بھائی کا عذر واضح ہو گیا اور انہوں نے یہ جان لیا کہ ان پر جو ذمہ داری تھی اس کو پورا

کرنے میں انہوں نے کوئی کمی نہیں کی اور جاہل اسرائیلیوں نے جو گوسالہ پرستی کی تھی، اس کو روکنے کی انہوں نے ہر ممکن

کوشش کی تھی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے جو سختی سے باز پرس کی تھی اس پر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی اور اپنے بھائی

کے لیے بھی معافی چاہی کہ اگر بالفرض ان سے اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کو بھی معاف فرما۔ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں ان سے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ صغیرہ نہ کبیرہ۔ لیکن ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے نزدیک گناہ کا حکم رکھتی ہیں اس لیے وہ استغفار کرتے ہیں۔ نیز ان سے جو اجتہادی خطا سرزد ہوتی ہے اس پر بھی استغفار کرتے ہیں ہر چند کہ اجتہادی خطا پر مواخذہ نہیں ہوتا بلکہ ایک اجر ملتا ہے لیکن وہ مقام عالی کے پیش نظر اس پر بھی استغفار کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے اپنے لیے دعا کی پھر اپنے بھائی کے لیے دعا کی۔ اس میں اسلوب دعا کی تعلیم ہے کہ پہلے اپنے لیے دعا کرے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت کا سب سے زیادہ وہ محتاج ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيْنًا لَهُمْ غَضَبٌ مِّن لَّدُنِّي

بے شک جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا تھا وہ عنقریب اپنے رب کے عذاب میں مبتلا ہوں گے

وَذَلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُفْتِرِينَ ﴿۱۵۲﴾

اور دنیا کی زندگی میں ذلت میں گرفتار ہوں گے، ہم بہتان باندھنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں ○ اور

الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَأَمَّوْا إِنَّ

جن لوگوں نے بُرے عمل کیے پھر بد اعمالیوں کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آئے (تو) آپ کا

رَبِّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَلَمَّا سَكَتَ عَن مُّوسَىٰ

رب اس کے بعد ضرور بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے ○ اور جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو

الْغَضَبِ أَخَذَ الْأَلْوَابِحَ ۚ وَفِي نَسَخِهِ هَادًى وَرَحْمَةً لِّلَّذِينَ

انہوں نے (تورات کی) تختیاں اٹھائیں جن کی تحریر میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو اپنے

هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ ﴿۱۵۴﴾ وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ رَجُلًا

رب سے ڈرتے ہیں ○ اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کر لیا تاکہ

لِمِيقَاتِنَا ۚ فَلَمَّا أَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ

وہ ہمارے مقرر کردہ وقت (پر حاضر ہوں) پھر جب ان کو زلزلہ (بارعد) نے گرفت میں لے لیا تو انہوں نے کہا اے میرے رب!

أَهْلَكْتَهُمْ مِّن قَبْلُ وَإِنَّا أَتُوكُنَّا بِمِثْلِ الْقُرْآنِ

اگر تو چاہتا تو انہیں اور مجھے اس سے پہلے ہلاک کر دیتا، کیا تو ہم میں سے ان نادانوں کے کاموں کی وجہ سے ہمیں ہلاک کرے گا

إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِي مَنْ تَشَاءُ ۗ

یہ تو تیری صرف آزمائش تھی، جس کے ذریعہ تو جس کو چاہے گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور جس کو چاہے تہدایت عطا فرمادیتا ہے،

أَنْتَ وَلِيْنَا فَاعْفُ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ۗ وَكَتَبَ

تو ہی ہمارا کارساز ہے سو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے ○ اور ہمارے لیے

لَنَا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَفِي الْآخِرَةِ إِنَّا هَدَيْنَاكَ إِلَيْكَ ۗ قَالَ

اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں، بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا ہے، فرمایا

عَذَابِي أُصِيبُ بِهِ مَنْ أَشَاءُ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۗ

میں اپنا عذاب تو جسے چاہتا ہوں اسے پہنچاتا ہوں، اور میری رحمت ہر چیز پر محیط ہے،

فَسَاكِبُوا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ

تو عنقریب میں اس (دنیا اور آخرت کی بھلائی) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو گناہوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور ہماری

بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۗ ۝۱۵۶ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ

آیتوں پر ایمان لائیں گے ○ جو اس عظیم رسول نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو وہ اپنے

الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ

پس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو ان کو

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ

نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا، جو ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرے گا

وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي

اور ناپاک چیزوں کو حرام کرے گا اور جو ان سے ان کے بوجھ اتارے گا، اور ان کے گلوں میں بڑے ہوئے طوق

كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۗ قَالَ الَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا

اتارے گا، سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی تعظیم کی اور اس کی نصرت اور حمایت کی اور اس نور کی

التَّوْرَ الَّذِي أَنْزَلْنَا مَعَهُ ۖ وَلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۵۷﴾

پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی لوگ نجات پانے والے ہیں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جن لوگوں نے پچھڑے کو معبود بنایا تھا وہ عنقریب اپنے رب کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلت میں گرفتار ہوں گے ہم بہتان باندھنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں ○ (الاعراف: ۱۵۷)

توبہ قبول کرنے کے باوجود بنو اسرائیل پر عذاب کی وعید کی توجیہ اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ پچھڑے کی عبادت کرنے والوں کی توبہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی تھی جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم اے بے شک تم نے پچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا پس تم اپنے خالق کی طرف توبہ کرو سو ایک دوسرے کو قتل کرو یہ تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لیے بہتر ہے تو اس نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا بے حد رحم فرمانے والا۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ إِنكُمْ ظَلَمْتُمْ
أَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلِ فَتُوبُوا إِلَىٰ
بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ
عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ○ (البقرہ: ۵۳)

اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی تھی۔ یا اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس نے ان کی توبہ قبول فرمائی ہے پھر یہ کس طرح فرمایا کہ یہ لوگ اپنے رب کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اس سوال کے متعدد جواب ہیں:

۱- اس آیت کا مصداق وہ لوگ ہیں جو توبہ کا حکم نازل ہونے سے پہلے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طور سے واپسی سے پہلے مر چکے تھے۔

۲- اس آیت کا مصداق عام بنی اسرائیل ہیں اور عذاب سے مراد دنیاوی عذاب ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وہ عنقریب اپنے رب کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور اس عذاب سے مراد انہیں یہ حکم دینا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کریں۔

۳- اس آیت کے مصداق وہ یہودی ہیں جو نبی ﷺ کے زمانہ میں تھے۔ کیونکہ جس طرح آباء کے محاسن ابناء کے لیے باعث فخر ہوتے ہیں اسی طرح آباء کے عیوب ابناء کے لیے باعث عار ہوتے ہیں اور اس زمانہ کے یہودی بھی اپنے ان آباء کو مانتے تھے۔ اس لیے ان کے متعلق فرمایا کہ وہ عنقریب اپنے رب کے عذاب میں مبتلا ہوں گے اور دنیا کی زندگی میں ذلت میں گرفتار ہوں گے۔

بدعت سینہ کی تعریف

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے ہم افتراء کرنے والوں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔ ان کا افتراء یہ تھا کہ انہوں نے پچھڑے کو معبود قرار دیا۔ جو شخص دین میں کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرتا ہے جس کی اصل کتاب اور سنت میں نہ ہو اور وہ شریعت کے کسی حکم کا مغیر ہو اور اس طریقہ کو کار ثواب قرار دیتا ہو وہ شخص اللہ اور رسول پر افتراء کرتا ہے۔ اس لیے امام مالک بن انس نے بدعتی کو مفتری فرمایا اور اس آیت کو پڑھا۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ امام مالک بن انس رحمہ اللہ نے فرمایا ہر بدعتی کے سر پر ذلت ہوگی اور پھر انہوں نے اس آیت کی

تلاوت کی۔ (الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۲۶۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

ہم نے بدعت کی جو تعریف کی، وہ بدعت سینہ کی تعریف ہے۔ اور اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے شہداء کربلا پر ماتم کرنے اور نوحہ کرنے کو شیعہ باعث اجر و ثواب کہتے ہیں یا پیروں کو دھونے کی بجائے پیروں پر مسح کرنے کو کار ثواب کہتے ہیں اور چند صحابہ کے سوا باقی صحابہ کرام کو تبرا کرتے ہیں اور اس کو ثواب کا کام کہتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ میلاد النبی اور بزرگوں کے لیے ایصال ثواب اور عرس وغیرہ کو بغیر شرعی دلیل کے حرام کہتے ہیں اور ان کو عینی تعسین کے ساتھ بہ طور استہجاب کرنے کو بھی بدعت ناجائز اور حرام کہتے ہیں، ان امور مستحبہ کو حرام کہنا بھی شریعت پر افتراء ہے اور بدعت سینہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جن لوگوں نے برے عمل کیے پھر بد اعمالیوں کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آئے (تو) آپ کا رب اس کے بعد ضرور بہت بخشے والا بڑا مہربان ہے (الاعراف: ۱۵۳)

توبہ کی حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا عموم اور شمول

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے برے عمل کیے پہلے وہ ان پر توبہ کرے باس طور کہ ان برے اعمال پر نادم ہو اور ان سے رجوع کرے اور آئندہ ان برے کاموں کو نہ کرنے کا عزم مصمم کرے اور ان کا تدارک اور تلافی کرے مثلاً جو نمازیں اور روزے رہ گئے ہیں ان کو قضا کرے۔ اگر کسی کا مال غصب کیا تھا تو اس کو واپس کرے۔ پھر کلمہ پڑھے اور یہ تصدیق کرے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا اور اس پر رحم فرمائے گا۔

اس آیت میں یہ تصریح ہے کہ توبہ سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں تو جو شخص اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرے وہ اللہ تعالیٰ کو بخشے والا مہربان پائے گا۔ اس آیت میں گنہ گاروں کے لیے بہت بڑی بشارت ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میرے بندہ نے گناہ کیا پھر کہا اے اللہ! میرے گناہ کو بخش دے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے گناہ کیا اور اس کو علم تھا کہ اس کا رب گناہ کو بخشا بھی ہے اور گناہ پر گرفت بھی فرماتا ہے۔ اس نے پھر دوبارہ گناہ کیا اس کے بعد کہا اے میرے رب! میرے گناہ کو بخش دے۔ پس اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے گناہ کیا اور اس کو علم تھا کہ اس کا رب گناہ کو بخشا بھی ہے اور گناہ پر گرفت بھی فرماتا ہے۔ اس نے پھر بارہ گناہ کیا اور کہا اے میرے رب! میرے گناہ کو بخش دے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے گناہ کیا اور اس کو علم تھا کہ اس کا رب گناہ کو بخشا بھی ہے اور گناہ پر گرفت بھی کرتا ہے (اے میرے بندے!) تو جو عمل چاہے کر میں نے تجھ کو بخش دیا۔

(صحیح مسلم التوبہ ۲۹، (۲۷۵۸) ۶۸۵۲، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۵۰۷، مسند احمد ج ۲، ص ۲۹۶، مسند احمد ج ۲، ص ۴۰۵، جامع

الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۵۸۷۶)

علامہ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

یہ حدیث استغفار کے عظیم فائدہ پر دلالت کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل عظیم، اس کی وسعت، اس کی رحمت، اس کے حلم اور اس کے کرم پر دلالت کرتی ہے اور اس حدیث میں استغفار سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان صرف زبان سے استغفار اور توبہ کرے بلکہ استغفار کا وہ معنی مراد ہے جو دل میں پوست ہو جس سے گناہ پر اصرار کی گرہ کھل جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے پچھلے گناہوں پر نادم ہو۔ اس صورت میں استغفار اس کی توبہ کا ترجمان ہو گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو فتنہ میں مبتلا ہو، اور بہت توبہ کرنے والا ہو۔ (شعب الایمان ج ۵، رقم الحدیث:

(۱۲۱) ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس سے بار بار گناہ صادر ہو اور وہ بار بار توبہ کرے اور جب وہ گناہ کرے تو وہ توبہ کرے، لیکن جو شخص صرف زبان سے استغفر اللہ کہتا ہے اور اس کا دل گناہ کرنے پر مصر ہوتا ہے تو اس کا ایسا استغفار بجائے خود استغفار کا محتاج ہے۔ اور ایسی زبانی توبہ سے صدق دل سے توبہ کرنی چاہیے کہ آئندہ وہ ایسی زبانی اور بے مغز توبہ نہیں کرے گا۔ اور صغیرہ گناہ، کبیرہ گناہ کے ساتھ لاحق ہو جاتا ہے۔ اور جب کسی صغیرہ گناہ پر اصرار کرے تو وہ صغیرہ نہیں رہتا کبیرہ ہو جاتا ہے اور جب کسی کبیرہ گناہ پر استغفار کرے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کا فائدہ یہ ہے کہ دوبارہ گناہ کرنا اگرچہ پہلی بار گناہ کرنے سے زیادہ قبیح ہے کیونکہ دوبارہ گناہ کر کے وہ خود اپنی توبہ توڑ رہا ہے لیکن جب وہ دوبارہ زیادہ گڑگڑا کر توبہ کرے گا اور کریم کے دروازہ پر فریاد کرے گا تو پہلی توبہ سے احسن ہے کیونکہ وہ اس یقین سے توبہ کر رہا ہے کہ اس کے سوا کوئی گناہوں کو بخشنے والا نہیں ہے۔

اس حدیث کے آخر میں ارشاد ہے جو مرضی آئے کریں نے تجھ کو بخش دیا ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ اس کو اب گناہ کرنے کی عام اجازت اور کھلی چھٹی ہے۔ بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے پچھلے گناہ بخش دیے اور آئندہ کے لیے اس کو گناہوں سے محفوظ کر دیا ہے یا یہ کہ اگر اس سے پھر گناہ سرزد ہو گئے تو اللہ تعالیٰ اس کو مرنے سے پہلے توبہ کی توفیق دے دے گا۔ اس کا یہ معنی بھی ہے جب تک تم گناہوں پر توبہ کرتے رہو گے میں تم کو بخشتا رہوں گا۔

(۱) مفہم ج ۷، ص ۸۶-۸۵، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۷ھ

علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں اس پر ظاہر دلالت ہے کہ اگر انسان سو مرتبہ یا ہزار مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ بار گناہ کا تکرار کرے اور ہر بار توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول ہوگی اور اس کے گناہ ساقط ہو جائیں گے اور اگر تمام گناہوں سے ایک بار ہی توبہ کرے تو اس کی توبہ صحیح ہے اور یہ جو فرمایا ہے جو مرضی آئے کرو اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک تم گناہوں پر توبہ کرتے رہو گے میں تم کو بخشتا رہوں گا۔ (صحیح مسلم مع شرحہ للنووی ج ۱۱، ص ۶۸۸۲-۶۸۸۱، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

اللہ تعالیٰ کے عفو و مغفرت کی وسعت اور اس کے رحم و کرم کے عموم و شمول میں بہت احادیث ہیں۔ ہم یہاں پر صرف ایک حدیث اور پیش کر رہے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: اے ابن آدم! تو نے مجھ سے دعا کی اور دعا قبول ہونے کی امید رکھی۔ میں نے تیری پچھلی سب خطائیں بخش دیں اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں کو پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے استغفار کرے تو میں تجھ کو بخش دوں گا اور مجھے کوئی پروا نہیں۔ اے ابن آدم! اگر تو تمام روئے زمین کے برابر بھی گناہ کر کے آئے بہ شرطیکہ تو نے میرے ساتھ شرک نہ کیا ہو تو میں تیرے پاس تمام روئے زمین جتنی مغفرت لے کر آؤں گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۳۷، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۵۸۷۷)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب موسیٰ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو انہوں نے (تورات کی) تختیاں اٹھالیں، جن کی تحریر میں

ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں (الاعراف: ۱۵۳)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے غصہ کی تلافی کرنا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ جان لیا کہ بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی تھی اور ان کا

عذر صحیح تھا تو انہوں نے تورات کی جو تختیاں ڈالی تھیں وہ اٹھالیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے دعا کی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ آیا تھا اس وقت بھی انہوں نے غصہ میں دو کام کیے تھے۔ تورات کی تختیاں زمین پر ڈال دی تھیں اور حضرت ہارون کو سر سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا۔ اور جب غصہ ٹھنڈا ہو گیا تب بھی انہوں نے اس کی تلافی میں دو کام کیے۔ تورات کی تختیاں زمین سے اٹھالیں اور اپنے بھائی کے لیے دعا کی۔

تورات کی تختیاں ٹوٹی تھیں یا نہیں

امام رازی متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے 'الاولاح سے مراد وہی الواح ہیں جو انہوں نے ڈالیں تھیں۔ (گویا الف لام عمد خارجی کا ہے) اور اس میں یہ ظاہر دلیل ہے کہ ان تختیوں میں سے کوئی تختی ٹوٹی تھی نہ باطل ہوئی تھی اور وہ جو بعض روایات میں ہے کہ تورات کے سات اجزا میں سے چھ اجزا اٹھالے گئے تھے اور صرف ایک جز باقی رہ گیا تھا وہ صحیح نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ تختیاں زمین پر ڈالیں تو وہ ٹوٹ گئیں۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس دن روزے رکھے تو اللہ تعالیٰ نے ان تختیوں کو لوٹا دیا اور ان میں بعینہ وہ سب کچھ مذکور تھا جو پہلی تختیوں میں تھا۔ اس تقدیر پر "وفی نسختها" کا معنی یہ ہو گا اس میں جو کچھ لکھا ہوا تھا وہ ہدایت اور رحمت تھی اور اگر ہم یہ کہیں کہ وہ تختیاں ٹوٹی نہیں تھیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تختیاں ڈالنے کے بعد بعینہ ان ہی تختیوں کو اٹھالیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی تھیں اور اب بھی "فی نسختها" کا یہی معنی ہو گا کہ اس کی تحریر میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۷۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۱۵ھ)

اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اس میں نیک کاموں کی ہدایت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طریقوں اور صالح حیات کے لیے اس میں مکمل دستور العمل ہے اور اگر اس میں کوئی کوتاہی ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ سے توبہ کر۔ نہ والوں کے لیے رحمت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور موسیٰ نے اپنی قوم کے ستر آدمیوں کو منتخب کر لیا تاکہ وہ ہمارے مقرر کردہ وقت پر حاضر ہوں پھر جب ان کو زلزلہ (یا رعد) نے گرفت میں لے لیا تو انہوں نے کہا اے میرے رب! اگر تو چاہتا تو انہیں اور مجھے اس سے پہلے ہلاک کر دیتا! کیا تو ہم میں سے ان نادانوں کے کاموں کی وجہ سے ہم کو ہلاک کرے گا! یہ تو تیری صرف آزمائش تھی جس کے ذریعہ تو جس کو چاہے گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور جس کو چاہے تو ہدایت عطا فرما دیتا ہے تو ہی ہمارا کارساز ہے سو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے (الاعراف: ۱۵۵)

ستر اسرائیلیوں کے انتخاب کے سلسلہ میں مختلف روایات

اس آیت کے شان نزول میں کئی روایات ہیں:

امام عبدالرحمن بن محمد المعروف بابن ابی حاتم المتوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، بشر اور بشیر ایک پہاڑ کی طرف روانہ ہوئے، حضرت ہارون اپنے تخت پر لیٹ گئے، اللہ تعالیٰ نے ان پر وفات طاری کر دی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو بنو اسرائیل نے ان سے پوچھا: حضرت ہارون کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ نے ان کو وفات دے دی۔ بنو اسرائیل نے کہا آپ نے ان کو قتل کیا ہے، آپ ان پر حسد کرتے تھے، کیونکہ وہ ہمارے ساتھ بہت نرمی کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا تم تصدیق کے لیے جن کو چاہو منتخب کر لو۔ انہوں نے ستر آدمی منتخب کیے اور جب وہ اس مقررہ وقت پر پہنچے تو انہوں نے حضرت ہارون سے پوچھا:

اے ہارون! تم کو کس نے قتل کیا ہے؟ حضرت ہارون نے کہا مجھے کسی نے قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے وفات دی ہے۔ تب بنو اسرائیل نے کہا اے موسیٰ! ہم آئندہ آپ کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

علامہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ نے شان نزول میں اسی روایت کا ذکر کیا ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۲۶۷، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

دوسری روایت یہ ہے: امام ابن ابی حاتم اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

علی بن ابی طلحہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا اللہ عزوجل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو منتخب کیا تاکہ وہ اپنے رب سے دعا کریں اور انہوں نے اللہ عزوجل سے یہ دعا کی اے اللہ! ہمیں وہ نعمتیں عطا فرما جو تو نے ہم سے پہلے کسی کو نہیں دیں اور نہ ہمارے بعد کسی کو وہ نعمتیں دینا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ دعا ناگوار گزری تب ان کو ایک زلزلہ نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۷، جامع البیان جزء ۹، ص ۹۹-۹۸، مطبوعہ بیروت)

علامہ ابو الحیمان اندلسی المتوفی ۷۵۳ھ نے ان دونوں روایتوں کا اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

(البحر المحیط ج ۵، ص ۱۸۷، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ، امام الحسین بن سعید الفراء البغوی المتوفی ۵۱۶ھ، حافظ اسماعیل بن کثیر متوفی ۷۷۳ھ، علامہ آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ اور بہت مفسرین نے امام ابن جریر متوفی ۳۱۰ھ کی اس روایت پر اعتماد کیا ہے۔

امام محمد بن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ اپنی قوم کی طرف لوٹے اور پچھڑے کی عبادت کرنے پر بنو اسرائیل کو ملامت کی اور پچھڑے کو جلا کر اس کے ذرات کو سمندر میں ڈال دیا۔ پھر حضرت موسیٰ نے اپنی امت میں سے انتہائی نیک افراد جن کی تعداد ستر تھی، سے فرمایا تم میرے ساتھ اللہ سے ملاقات کے لیے چلو اور اپنی اس گنہگار پرستی پر اللہ تعالیٰ سے معذرت کرو۔ جب حضرت موسیٰ ان کو لے کر پہاڑ طور پر گئے تو انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا آپ اپنے رب سے یہ سوال کریں کہ ہم بھی اپنے رب کا کلام سن لیں! حضرت موسیٰ نے فرمایا اچھا، حضرت موسیٰ جب پہاڑ کے قریب پہنچے تو ایک بادل آیا اور اس نے پورے پہاڑ کو ڈھانپ لیا۔ حضرت موسیٰ اس بادل میں داخل ہو گئے اور قوم سے کہا تم قریب آ جاؤ، جب حضرت موسیٰ اپنے رب سے ہم کلام ہوتے تو ان کی پیشانی پر بہت چمکدار نور ظاہر ہوتا جس کو دیکھنے کی کوئی انسان تاب نہیں لاسکتا تھا۔ تو وہ اپنی پیشانی پر نقاب ڈال لیتے تھے۔ جب قوم اس بادل سے اندر داخل ہوئی تو سجدہ میں گر گئی۔ حضرت موسیٰ اللہ تعالیٰ سے کلام کر رہے تھے اور وہ سن رہے تھے۔ جب موسیٰ علیہ السلام فارغ ہوئے اور بادل چھٹ گیا تو یہ لوگ حضرت موسیٰ سے کہنے لگے ہم ہرگز اللہ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو بالکل ظاہر عیاں اور بیاں دیکھ نہ لیں، اسی وقت ان پر بجلی کی ایک کڑک آ پڑی اور وہ سب مر گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور عرض کیا اے اللہ اگر تو چاہتا تو ان کو پہلے ہی ہلاک کر دیتا، جب میں اپنی قوم کے پاس جاؤں گا تو وہ میری کیسے تصدیق کریں گے کہ وہ کڑک سے ہلاک ہو گئے اور آئندہ مجھ پر کب اعتماد کریں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام مسلسل دعا کرتے رہے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان میں روحیں لوٹا دیں۔ پھر بنو اسرائیل نے جو پچھڑے کی پرستش کی تھی اس پر توبہ کی مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا جب تک کہ یہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں فرمائے گا۔

(جامع البیان ج ۱، ص ۲۳۱-۲۳۲، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۴۰۹ھ، تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۷۶، معالم التنزیل ج ۲، ص ۱۷۰، تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۲۲۶، روح المعانی جز ۹، ص ۷۲، تفسیر ایضاً مع الکازرونی ج ۳، ص ۶۳)

امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ ان کو بجلی کی کڑک نے پکڑ لیا جس سے وہ مر گئے پھر ان کو زندہ کیا۔ نیز امام ابن ابی حاتم نے سعید بن حیان سے روایت کیا ہے کہ ان ستر اسرائیلیوں کو بجلی کی کڑک نے اس لیے ہلاک کیا تھا کہ انہوں نے پتھرے کی عبادت کا حکم دیا تھا نہ اس سے منع کیا تھا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

سورۃ بقرہ میں الصاعقہ اور سورۃ الاعراف میں الرجفہ فرمانے کی توجیہ

سورۃ البقرہ میں فرمایا تھا: ان کو ”الصاعقہ“ نے پکڑ لیا (البقرہ: ۵۵) اور اس سورت میں فرمایا ہے ان کو ”الرجفہ“ نے پکڑ لیا۔ الصاعقہ کے معنی ہیں رعديا بجلی کی کڑک اور الرجفہ کے معنی ہیں زلزلہ۔ علامہ بیناوی اور علامہ آلوسی نے لکھا ہے اس سے مراد الصاعقہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بجلی اس زور سے کڑکی ہو کہ پہاڑ میں زلزلہ آگیا ہو اس لیے ایک جگہ اس کو الصاعقہ سے تعبیر فرمایا اور دوسری جگہ الرجفہ سے۔

علامہ ابوالحسن المالوردی المتوفی ۳۵۰ھ لکھتے ہیں:

کلبی نے کہا اس سے مراد زلزلہ ہے۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد موت ہے۔ وہ سب مر گئے تھے پھر ان کو زندہ کیا۔ فراء نے کہا وہ ایک آگ تھی جس نے ان کو جلا ڈالا تھا۔ حضرت موسیٰ کا یہ گمان تھا کہ یہ ہلاک ہو گئے ہیں لیکن وہ ہلاک نہیں ہوئے تھے۔ (الکتب والعیون ج ۲، ص ۲۶۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

علامہ عبدالرحمن بن علی بن محمد الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

الرجفہ سے مراد ہے حرکت شدیدہ اور ان کو حرکت شدیدہ نے جو اپنی گرفت میں لیا تھا اس کے سبب کے متعلق چار قول ہیں:

- ۱- حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضرت ہارون علیہ السلام کے قتل کا الزام لگایا تھا۔
 - ۲- ابن ابی طلحہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا کہ انہوں نے دعا میں حد سے تجاوز کیا تھا، انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ایسی نعمت مانگی تھی جو پہلے کسی کو ملی ہو نہ آئندہ ملے۔
 - ۳- قتادہ اور ابن جریج نے کہا یہ لوگ نیکی کا حکم دیتے تھے نہ برائی سے روکتے تھے۔
 - ۴- سدی اور ابن اسحاق نے کہا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو سننے کا مطالبہ کیا اور اللہ کا کلام سننے کے بعد کہا ہم اس کو دیکھے بغیر اس پر ایمان نہیں لائیں گے۔ (زاد المسیر ج ۳، ص ۲۶۹، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)
- کیا موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ گمان تھا کہ وہ ستر اسرائیلیوں کی وجہ سے ان کو ہلاکت میں مبتلا کرے گا؟

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی: کیا تو ہم میں سے ان نادانوں کے کاموں کی وجہ سے ہم کو ہلاک کرے گا؟ اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے جرم کی سزا دوسرے کو نہیں دیتا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (الزمر: ۷) اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے

گا۔

تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے متعلق کیسے یہ گمان کر لیا کہ اللہ تعالیٰ ان ستر اسرائیلیوں کے قصور کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہلاکت میں مبتلا کرے گا۔ امام رازی نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ استفہام نفی کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرے گا جیسے کہتے ہیں: کیا تم اپنی خدمت کرنے والے کی بے عزتی کرو گے! یعنی تم ایسا نہیں کرو گے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کا معنی یہ ہے کہ تو ہم کو ہلاکت میں نہیں ڈالے گا۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۷۷)

اس اعتراض کا یہ جواب بھی دیا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ گمان نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کسی پریشانی میں مبتلا کرے گا۔ وہ اپنے اس کلام سے ان ستر اسرائیلیوں کی شفاعت کرنا چاہتے تھے جو اپنی نادانی اور حماقت کی وجہ سے رعد کی کڑک میں مبتلا ہو کر مارے گئے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی ذات کو درمیان میں ڈالا کہ یہ تو قصور وار ہیں لیکن اگر ان کی سزا برقرار رکھی گئی تو میں پریشانی میں مبتلا ہوں گا اور بنو اسرائیل ان کے متعلق مجھ سے سوال کریں گے سو تو مہربانی فرما اور میری خاطر ان کو زندہ کر دے۔

اللہ کے معاف کرنے اور مخلوق کے معاف کرنے میں فرق

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعائیں کہا تو سب سے اچھا بخشے والا ہے کیونکہ مخلوقات میں سے جب کوئی کسی کو بخشتا ہے تو یا تو دنیا میں اس سے اپنی تعریف و توصیف کا طالب ہوتا ہے یا آخرت میں ثواب کا طلب گار ہوتا ہے یا معافی مانگنے والے کے حال کو دیکھ کر اس کے دل میں رقت پیدا ہوتی ہے۔ دل سے اس رقت کو زائل کرنے کے لیے وہ معاف کر دیتا ہے یا یہ نیت ہوتی ہے کہ آج میں اس کو معاف کروں گا تو کل کوئی مجھے معاف کر دے گا۔ یا ماضی میں کبھی اس نے اس کو معاف کیا ہو تو اس کا احسان چکانے کے لیے وہ اس کو معاف کر دیتا ہے۔ غرض معاف کرنے سے مخلوق کی کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے اور بے غرض اور بلا عوض معاف کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں بے شک ہم نے تیری طرف رجوع کیا ہے، فرمایا میں اپنا عذاب تو جسے چاہتا ہوں اسے پہنچاتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز پر محیط ہے، تو عنقریب میں اس (دنیا اور آخرت کی بھلائی) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو گناہوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے (الاعراف: ۱۵۶)

حضرت موسیٰ نے دنیا اور آخرت کی جس بھلائی کا سوال کیا تھا وہ کیا چیز تھی؟

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا بقیہ حصہ اور تتمہ ذکر فرمایا ہے۔ دعائیں اصولی طور پر دو چیزیں طلب کی جاتی ہیں مضر چیزوں سے نجات اور مفید چیزوں کا حصول یعنی دفع ضرر اور جلب منفعت۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعائیں پہلے یہ کہا کہ ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ دعا کے اس حصہ میں اپنی امت کے لیے ہلاکت اور عذاب سے نجات کو طلب کیا اور دعا کے دوسرے حصہ میں کہا اور ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ دے اور آخرت میں، اور اس میں جلب منفعت کی اور مفید چیزوں کو طلب کیا اور دنیا اور آخرت کی خیر اور حسنة کو طلب کیا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس آیت میں تلقین فرمائی ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (البقرہ: ۲۰۱)

اور ان میں سے بعض یہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں (بھی) بھلائی عطا فرما۔

دنیا کی بھلائی کیا ہے اور آخرت کی بھلائی کیا ہے؟ علامہ ابو الیمان اندلسی متوفی ۶۵۳ھ نے لکھا ہے "دنیا کی بھلائی سے مراد ہے پاکیزہ حیات اور اعمال صالحہ اور آخرت کی بھلائی سے مراد ہے جنت، اللہ تعالیٰ کا دیدار اور دنیا کی نیکیوں پر ثواب" اور زیادہ

عمدہ بات یہ ہے کہ دنیا کی بھلائی سے مراد نعمت اور عبادت ہے اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت ہے اور اس کے علاوہ اور کیا بھلائی ہو سکتی ہے! (البحر المحیط ج ۵، ص ۱۹۰) علامہ بیضاوی متوفی ۶۸۶ھ نے لکھا ہے ”دنیا کی بھلائی سے مراد اچھی زندگی اور عبادت کی توفیق ہے اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت ہے۔“ (الکازرونی مع ایضاوی ج ۳، ص ۶۳) علامہ ابن جریر متوفی ۳۱۰ھ نے لکھا ہے دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد گناہوں کی بخشش ہے۔ (جامع البیان جز ۹، ص ۱۰۵) علامہ ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے لکھا ہے دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد مغفرت اور جنت ہے۔ علامہ قرطبی متوفی ۶۱۸ھ نے لکھا ہے دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد اس کی جزا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۱۵۷) باقی مفسرین نے بھی تقریباً اسی طرح لکھا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ دعا کی تھی کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی لکھ دے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں یہ بھلائی ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو رسول امی کی پیروی کریں گے جن کا ذکر تورات اور انجیل میں ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو دنیا اور آخرت کی بھلائی مانگی تھی وہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ کی امت کو عطا کر دی۔

امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم اپنی سندوں کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے جو سوال کیا تھا کہ ہمارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لکھ دے وہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے منظور نہیں کیا اور فرمایا کہ یہ میں (سیدنا) محمد ﷺ کی امت کو عطا کروں گا۔

(جامع البیان جز ۹، ص ۱۰۹، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۸۰)

اب یہاں پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ دنیا اور آخرت کی بھلائی کی جو تفسیر علامہ ابو الیمان اندلسی، علامہ بیضاوی، علامہ ابن جریر اور علامہ قرطبی وغیرہم نے کی ہے کہ دنیا کی بھلائی سے مراد اعمال صالحہ ہیں اور آخرت کی بھلائی سے مراد جنت ہے، اس میں سیدنا محمد ﷺ کی امت کی کیا خصوصیت ہے۔ دیگر انبیاء علیہم السلام کی امتیں بھی اعمال صالحہ کریں گی اور جنت میں جائیں گی جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے:

حضرت بریدہ بن حبشہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی ان میں سے اسی صفیں اس امت کی ہوں گی اور چالیس صفیں باقی امتوں کی ہوں گی۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۵۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۲۸۹، مسند احمد ج ۵، ص ۳۳۷، سنن الدارمی ج ۲، رقم الحدیث: ۲۸۳۵، المستدرک ج ۱، ص ۸۲، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۵۹۳۳، کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث: ۱۵۷۲، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۳۵۱۳، کمال ابن عدی ج ۳، ص ۸۵۵، ج ۴، ص ۱۳۲۰، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۷۰، ۷۱، ۷۲)

اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس آیت میں دنیا کی بھلائی سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں احکام شرعیہ آسان ہوں۔ کیونکہ بنو اسرائیل پر بہت مشکل احکام تھے۔ ان کی توبہ یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔ ان کو تیمم کی سہولت حاصل نہیں تھی۔ مسجد کے سوا کسی اور جگہ نماز پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ مال غنیمت حلال نہیں تھا، قربانی کو کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ کپڑے یا بدن پر جس جگہ نجاست لگ جائے اس کو کاٹنا پڑتا تھا۔ گنہ گار اعضا کو کاٹنا ضروری تھا، قتل خطا اور قتل عمد میں قصاص لازمی تھا دیت کی رخصت نہیں تھی۔ ہفتہ کے دن شکار کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ روزہ کا دورانیہ رات اور دن کو محیط تھا اور بہت سخت احکام تھے، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ چاہا کہ دنیا میں ان کے لیے احکام شرعیہ آسان ہو جائیں۔ یہ دنیا کی بھلائی تھی اور آخرت کی بھلائی یہ تھی کہ کم عمل پر اللہ تعالیٰ زیادہ اجر عطا فرمائے۔ ان کو ایک نیکی پر ایک ہی اجر ملتا تھا۔ حضرت موسیٰ چاہتے

تھے کہ ایک نیکی پر دس گنا یا سات سو گنا اجر عطا کیا جائے اور اس معنی میں دنیا کی بھلائی اور آخرت کی بھلائی اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ کی امت کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ اس لیے یہ بھلائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کی بجائے ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کو عطا کر دی! اس لیے فرمایا میں دنیا کی بھلائی اور آخرت کی بھلائی ان لوگوں کو دوں گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو اس عظیم رسول نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو ان کو نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا جو ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرنے کا اور ناپاک چیزوں کو حرام کرے گا جو ان سے بوجھ اتارے گا اور ان کے گلوں میں پڑے ہوئے طوق اتارے گا، سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی تعظیم کی اور اس کی نصرت اور حمایت کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ○ (الاعراف: ۱۵۷)

اس آیت میں سیدنا محمد ﷺ کے نو اوصاف ذکر کیے گئے ہیں (۱) نبی (۲) رسول (۳) امی (۴) آپ کا تورات میں مکتوب ہونا (۵) آپ کا انجیل میں مکتوب ہونا (۶) امر بالمعروف کرنا اور نہی عن المنکر کرنا (۷) پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام کرنا (۸) ان سے بوجھ اتارنا (۹) ان کے گلے میں پڑے ہوئے طوق اتارنا۔
نبی اور رسول کے معنی

علامہ مسعود بن عمر تفتازانی متوفی ۷۹۱ھ لکھتے ہیں:

رسول وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی طرف تبلیغ احکام کے لیے بھیجا اور کبھی اس میں کتاب کی شرط بھی لگائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف نبی عام ہے خواہ اس کے پاس کتاب ہو یا نہ ہو۔ (شرح عقائد نسفی، ص ۱۱۳)

اس تعریف پر یہ اعتراض ہے کہ رسول تین سو تیرہ ہیں اور کتابیں اور صحائف ملا کر ایک سو چودہ ہیں۔ اور باقی رسولوں کے پاس کتاب نہیں تھی۔ اس لیے علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ نبی وہ انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی بغیر کسی بشر کے واسطے کے خبر دے اور ان امور کی خبر دے جن کو محض عقل سے نہیں جانا جاسکتا۔ اور رسول وہ ہے جو ان اوصاف کے علاوہ مرسل الہم کی اصلاح پر بھی مامور ہو۔ (روح المعانی ج ۹، ص ۷۹) لیکن یہ فرق بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ نبی بھی انسانوں کی اصلاح پر مامور ہوتا ہے۔ اس لیے صحیح جواب یہ ہے کہ رسول کے پاس کتاب ہونا ضروری ہے خواہ کتاب جدید ہو یا کسی سابق رسول کی کتاب ہو۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ رسول عام ہے وہ فرشتہ بھی ہوتا ہے اور انسان بھی۔ اس کے برخلاف نبی صرف انسان ہی ہوتا ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ رسول کے لیے ضروری ہے کہ اس پر فرشتہ وحی لائے اور نبی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے۔ یہ جائز ہے کہ اس کے دل پر وحی کی جائے۔ یا خواب میں اس پر وحی کی جائے۔

اس آیت میں نبی ﷺ کے نو اوصاف میں سے ایک تیسرا وصف امی ذکر فرمایا ہے، ہم یہاں لفظ امی کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں اللہ تعالیٰ نے لفظ امی کا ذکر فرمایا ہے۔

قرآن اور سنت میں نبی ﷺ پر امی کا اطلاق

الَّذِينَ يَسْمَعُونَ الرُّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ

جو لوگ اس رسول، نبی امی کی پیروی کریں۔

(الاعراف: ۱۵۷)

اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہیں۔

فَأْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ

(الاعراف: ۱۵۸)

نیز قرآن مجید میں ہے:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ الْأَمَانِيَّ
اور ان میں بعض لوگ ان پڑھ ہیں جو زبان سے لفظوں کو
پڑھنے کے سوا (اللہ کی) کتاب (کے معانی) کا کچھ علم نہیں
رکھتے۔ (البقرہ: ۷۸)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ
جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک عظیم
(الجمعة: ۲) رسول بھیجا۔

ان کے علاوہ سورت آل عمران میں دو جگہ (۷۵، ۲۰) امیین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے خود بھی اپنے لیے امی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم امی لوگ ہیں لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۹۱۳، صحیح مسلم الصیام ۱۵ (۱۰۸۰) ۷۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۳۱۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۱۳۱)

السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۲۳۵۱، مسند احمد ج ۲، ص ۲۴، طبع قدیم، جامع الاصول ج ۶، رقم الحدیث: ۲۳۹۳
امی کا لغوی معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

امی وہ شخص ہے جو نہ لکھتا ہو اور نہ کتاب سے دیکھ کر پڑھتا ہو۔ اس آیت میں امی کا یہی معنی ہے "حوالی بعث فی الامیین رسولاً منهم" قطرب نے کہا امیہ کے معنی غفلت اور جہالت ہیں سو امی کا معنی قلیل المعرفة ہیں۔ اسی معنی میں ہے "ومنہم امیون لا یعلمون الكتاب الامانی" یعنی وہ امی ہیں جب تک ان پر تلاوت نہ کی جائے وہ از خود نہیں جانتے۔ فراء نے کہا یہ وہ عرب لوگ ہیں جن کے پاس کتاب نہ تھی اور قرآن مجید میں ہے "والنسی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندہم فی التوراة والانجیل" ایک قول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو امی اس لیے فرمایا ہے کہ آپ امین کے نبی تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ کو امی اس لیے فرمایا کہ آپ لکھتے تھے نہ کتاب سے پڑھتے تھے اور یہ آپ کی فضیلت ہے کیونکہ آپ حفظ کرنے سے مستغنی تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی ضمانت پر اعتماد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "سنقرئک فلا تنسی" عنقریب ہم آپ کو پڑھائیں گے اور آپ نہیں بھولیں گے۔ اور ایک قول یہ ہے کہ آپ کو امی اس لیے فرمایا کہ آپ ام القرئی یعنی مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے۔ (المفردات ج ۱، ص ۲۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

حدیث میں ہے انا امۃ لانکتب ولانحسب "ہم اہل عرب امی ہیں لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں" آپ کی مراد یہ تھی کہ ہم اسی طرح ہیں جس طرح اپنی ماؤں سے پیدا ہوئے تھے۔ یعنی اپنی جبلت اولیٰ پر ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ امی وہ ہے جو لکھتا نہ ہو۔ نیز حدیث میں ہے بعثت الی امۃ امیہ "میں امی امت کی طرف بھیجا گیا ہوں" یا امی سے عرب مراد ہیں کیونکہ عرب میں لکھنا بالکل نہ تھا یا بہت کم تھا۔ (النهاية ج ۱، ص ۶۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ لکھتے ہیں:

حدیث میں ہے ہم امی لوگ ہیں لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔ یعنی اپنی ماں سے پیدائش کی اصل پر ہیں۔ لکھنا سیکھا ہے نہ حساب کرنا۔ تو وہ اپنی اصل جبلت پر ہیں اور اسی نبج پر ہے امین میں رسول بھیجا گیا۔ علامہ کہانی نے کہا اس میں ام القرئی کی طرف نسبت ہے یعنی مکہ والوں کی طرف۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ عرب میں لکھنے والے بھی تھے اور ان میں سے اکثر حساب جاننے والے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لکھنا نہیں جانتے تھے اور حساب سے مراد ستاروں کا حساب ہے اور وہ اس کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ علامہ طیبی نے کہا ہے کہ ابن صیاد نے نبی ﷺ سے کہا آپ امین کے رسول ہیں۔ اس شیطان کا مطلب یہ تھا کہ آپ صرف عرب کے رسول ہیں دوسروں کے نہیں۔

(مجمع بحار الانوار ج ۱ ص ۱۰۷، مطبوعہ مکتبہ دار الامان المدینہ المنورہ ۱۳۱۵ھ)

علامہ زبیدی متونی ۱۳۰۵ھ لکھتے ہیں:

قاموس میں ہے امی وہ شخص ہے جو لکھتا نہ ہو یا اپنی ماں سے پیدائش کے حال پر باقی ہو اور امی نجی اور قلیل الکلام کو بھی کہتے ہیں۔ اس کی تشریح میں علامہ زبیدی لکھتے ہیں: حضرت محمد ﷺ کو امی اس لیے کہا جاتا ہے کہ عرب قوم لکھتی تھی نہ پڑھتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مبعوث کیا اور آنحالیکہ آپ لکھتے تھے نہ کتاب کو پڑھتے تھے۔ اور یہ آپ کا معجزہ ہے کیونکہ آپ نے بغیر کسی تغیر اور تبدل کے بار بار قرآن مجید کو پڑھا۔ قرآن مجید میں ہے ”وما کنت تتلو من قبلہ من کتاب“ (الایۃ) حافظ ابن حجر عسقلانی نے احادیث رافعی کی تخریج میں لکھا ہے کہ نبی ﷺ پر لکھنے اور شعر گوئی کو حرام کر دیا گیا تھا۔ یہ اس وقت ہے اگر آپ شعر گوئی اور لکھنے کو اچھی طرح بروئے کار لاتے اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ ہر چند کہ آپ کو شعر اور خط میں مہارت تو نہیں تھی لیکن آپ اچھے اور برے شعر میں تمیز رکھتے تھے۔ اور بعض علماء کا یہ دعویٰ ہے کہ پہلے آپ لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن بعد میں آپ نے لکھنا جان لیا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ”وما کنت تتلو من قبلہ (الایۃ) آپ اس سے پہلے نہ کسی کتاب کو پڑھتے تھے نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اور ”اس سے پہلے“ کی قید کا یہ معنی ہے کہ بعد میں آپ نے اس کو جان لیا، کیونکہ آپ کا پہلے نہ جاننا معجزہ کے سبب سے تھا اور جب اسلام پھیل گیا اور لوگوں کے شکوک کا خطرہ نہ رہا تو پھر آپ نے اس کو جان لیا، اور امام ابن ابی شیبہ اور دیگر محدثین نے مجاہد سے روایت کیا ہے ”مامات رسول اللہ ﷺ حتی کتب وقرء“ رسول اللہ ﷺ اس وقت تک فوت نہیں ہوئے جب تک کہ آپ نے لکھ نہیں لیا، اور پڑھ نہیں لیا اور مجاہد نے شعبی سے کہا، اس آیت میں اس کے خلاف نہیں ہے۔ ابن دجیہ نے کہا کہ علامہ ابو زر، علامہ ابو الفتح نیشاپوری اور علامہ باجی مالکی کا بھی یہی نظریہ ہے۔ علامہ باجی نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، بعض افریقی علماء نے بھی علامہ باجی کی موافقت کی ہے اور کہا ہے کہ امی ہونے کے بعد لکھنے کو جان لینا معجزہ کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ آپ کا دوسرا معجزہ ہے، کیونکہ بغیر کسی انسان کے سکھائے کتاب کو پڑھنا اور لکھنا بھی معجزہ ہے۔ ابو محمد بن مغوز نے علامہ باجی کی کتاب کا رد لکھا ہے اور علامہ سمنانی وغیرہ نے کہا ہے کہ آپ بغیر علم کے لکھتے تھے، جیسے بعض ان پڑھ بادشاہ بعض حروف لکھ لیتے تھے حالانکہ ان کو حروف کی تمیز اور شناخت نہیں ہوتی تھی۔ (تاج العروس ج ۸ ص ۱۹۱، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ، مصر ۱۳۰۶ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متونی ۱۳۷۰ھ امی کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

زجاج نے کہا ہے کہ نبی ﷺ کو امی اس لیے کہا ہے کہ آپ امت عرب کی طرف منسوب ہیں جس کے اکثر افراد لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اور امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ ہم امی لوگ ہیں نہ لکھتے ہیں نہ کنتی کرتے ہیں۔ امام باقر نے کہا ہے کہ آپ ام القرئی یعنی مکہ کے رہنے والے تھے اس لیے آپ کو امی

تبیان القرآن

جلد چہارم

فرمایا، یا آپ اپنی ام (ماں) کی طرف منسوب تھے، یعنی آپ اسی حالت پر تھے جس حالت پر اپنی ماں سے پیدا ہوئے تھے، آپ کا یہ وصف اس تشبیہ کے لیے بیان کیا گیا ہے کہ آپ اپنی پیدائشی حالت پر قائم رہنے (یعنی کسی سے پڑھنا، لکھنا نہ سیکھنے) کے باوجود اس قدر عظیم علم رکھتے تھے سو یہ آپ کا معجزہ ہے۔ اسی کا لفظ صرف آپ کے حق میں مدح ہے اور باقی کسی کے لیے ان پڑھ ہونا باعث فضیلت نہیں ہے، جیسا کہ تکبر کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے باعث مدح ہے اور دوسروں کے حق میں باعث مذمت ہے۔ نیز علامہ آلوسی لکھتے ہیں: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ نبی ﷺ سے کسی وقت لکھنے کا صدور ہوا ہے یا نہیں؟ ایک قول یہ ہے کہ ہاں صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے صلح نامہ لکھا اور یہ بھی آپ ﷺ کا معجزہ ہے اور احادیث ظاہرہ کا بھی یہی تقاضا ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ آپ نے بالکل نہیں لکھا اور آپ کی طرف لکھنے کی نسبت مجاز ہے، اور بعض اہل بیت سے روایت ہے کہ آپ لکھے ہوئے الفاظ کو دیکھ کر پڑھتے تھے لیکن اس روایت کی کوئی معتمد سند نہیں ہے، ہاں ابوالشیخ نے اپنی سند کے ساتھ عتبہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ اس وقت تک فوت نہیں ہوئے جب تک آپ نے پڑھا اور لکھا نہیں، شعبی نے اس روایت کی تصدیق کی ہے۔ (روح المعانی، ج ۹، ص ۷۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

رسول اللہ ﷺ کے لکھنے اور پڑھنے پر قرآن مجید سے دلائل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كُنْتُمْ تَلْتَمِسُونَ قَبْلَهُ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكُمْ إِذَا لَارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ﴿۳۸﴾
 (العنکبوت: ۳۸) شبہ پڑ جاتا اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرستوں کو اس (کتاب کے نزول) سے پہلے آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے

اس آیت کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی ﷺ نے کسی استاد سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا، قریش مکہ کے سامنے آپ کی پوری زندگی تھی، آپ کے اہل وطن اور رشتہ داروں کے سامنے، روز پیدائش سے اعلان نبوت تک آپ کی ساری زندگی گزری اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ نے کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ قلم ہاتھ میں لیا اور یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آسمانی کتابوں کی تعلیمات، گزشتہ انبیاء و رسل کے حالات، قدیم مذاہب کے عقائد، تاریخ، تمدن، اخلاق اور عمرانی اور عائلی زندگی کے جن اہم مسائل کو یہ امی شخص انتہائی فصیح و بلیغ زبان سے بیان کر رہے ہیں، اس کا وحی الہی کے سوا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا، اگر انہوں نے کسی مکتب میں تعلیم پائی ہوتی اور گزشتہ مذاہب اور تاریخ کو پڑھا ہوتا تو پھر اس شبہ کی بنیاد ہو سکتی تھی کہ جو کچھ یہ بیان کر رہے ہیں وہ دراصل ان کا حاصل مطالعہ ہے۔ ہر چند کہ کوئی پڑھا لکھا انسان بلکہ دنیا کے تمام پڑھے لکھے آدمی مل کر اور تمام علمی وسائل بروئے کار لا کر بھی ایسی بے نظیر کتاب تیار نہیں کر سکتے، تاہم اگر آپ نے اعلان نبوت سے پہلے لکھنے پڑھنے کا مشغلہ اختیار کیا ہوتا تو جھوٹوں کو ایک بات بنانے کا موقع ہاتھ لگ جاتا، لیکن جب آپ کا امی ہونا، فریق مخالف کو بھی تسلیم تھا تو اس سرسری شبہ کی بھی جڑ کٹ گئی، اور یوں کہنے کو تو ضدی اور معاند لوگ پھر بھی یہ کہتے تھے:

وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (الفرقان: ۵)
 اور انہوں نے کہا یہ پہلے لوگوں کے لکھے ہوئے قصے ہیں جو اس (رسول) نے لکھوا لیے ہیں، سو وہ صبح و شام اس پر پڑھے جاتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ سے لکھنے اور پڑھنے کی نفی کو آپ کے اعلان نبوت سے پہلے کی قید سے مقید کیا ہے اور یہی مقصود ہے۔ کیونکہ اگر اعلان نبوت اور نزول قرآن سے پہلے آپ کا لکھنا پڑھنا ثابت ہوتا تو اس شبہ کی راہ نکل سکتی تھی اور

اس آیت سے آپ کی نبوت اور قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال نہ ہو سکتا۔ اور اس قید لگانے کا یہ تقاضا ہے کہ اعلان نبوت کے بعد آپ سے لکھنے اور پڑھنے کا صدور ہو سکتا ہے اور بعد میں آپ کا لکھنا اور پڑھنا اس استدلال کے منافی نہیں ہے۔

علامہ آلوسی نے بعض اجلہ علماء کا یہ قول نقل کیا ہے:

اس قید سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد نبی ﷺ لکھنے اور پڑھنے پر قادر تھے اور اگر اس قید کا اعتبار نہ کیا جائے تو یہ قید بے فائدہ ہوگی۔ (روح المعانی ج ۲۱ ص ۵، مطبوعہ بیروت)

اس استدلال پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ یہ مفہوم مخالف سے استدلال ہے۔ اور فقہاء احناف کے نزدیک مفہوم مخالف سے استدلال معتبر نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مفہوم مخالف کا استدلال میں معتبر نہ ہونا اتفاقی نہیں ہے کیونکہ باقی ائمہ مفہوم مخالف کا اعتبار کرتے ہیں، خصوصاً جب کہ بکثرت احادیث صحیحہ سے بعثت کے بعد آپ کا لکھنا ثابت ہے، جیسا کہ ہم عنقریب انشاء اللہ باحوالہ بیان کریں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیگر علمی اور عملی کمالات عطا فرمائے ہیں اسی طرح آپ کو لکھنے پڑھنے کا بھی کمال عطا فرمایا ہے، لکھنے کا علم ایک عظیم نعمت ہے، قرآن مجید میں ہے: الذی علم بالقلم ۵ علم الانسان ما لم يعلم (العلق: ۵-۴) ”جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، اور انسان کو وہ علم دیا، جس کو وہ جانتا نہ تھا“۔ امت کے ان گنت افراد کو پڑھنے اور لکھنے کا کمال حاصل ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ کو یہ کمال حاصل نہ ہو! اور اسی ہونے کا فقط یہ مفاد ہے کہ آپ نے کسی مخلوق سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو براہ راست یہ علم عطا فرمایا ہے اور بعثت سے پہلے آپ لکھنے اور پڑھنے میں مشغول نہیں رہے تاکہ آپ کی نبوت میں کسی کو شبہ نہ ہو اور بعثت کے بعد آپ نے پڑھا اور لکھا اور یہ ایک الگ معجزہ ہے۔ کیونکہ بغیر کسی مخلوق سے کس فیض کے پڑھنا اور لکھنا خلاف عادت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے لکھنے پر سید مودودی کے اعتراضات اور ان کے جوابات رسول اللہ ﷺ کے لکھنے پر اعتراض کرتے ہوئے سید مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ لکھتے ہیں:

ان لوگوں کی جسارت حیرت انگیز ہے جو نبی ﷺ کو خواندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ یہاں قرآن صاف الفاظ میں حضور کے ناخواندہ ہونے کو آپ کی نبوت کے حق میں ایک طاقتور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے، جن روایات کا سارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضور لکھے پڑھے تھے یا بعد میں آپ نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا، وہ اول تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی، پھر وہ بجائے خود بھی اتنی کمزور ہیں کہ ان پر کسی استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی، ان میں سے ایک بخاری کی یہ روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کا معاملہ جب لکھا جا رہا تھا تو کفار مکہ کے نمائندے نے رسول اللہ ﷺ کے نام کے ساتھ رسول اللہ لکھے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضور نے کاتب (یعنی حضرت علی) کو حکم دیا کہ اچھا رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو، حضرت علی نے لفظ ”رسول اللہ“ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کے ہاتھ سے قلم لے کر وہ الفاظ خود کاٹ دیے اور محمد بن عبد اللہ لکھ دیا۔ (الی قولہ) ہو سکتا ہے کہ صحیح صورت واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علی نے ”رسول اللہ“ کا لفظ مٹانے سے انکار کر دیا تو آپ نے اس کی جگہ ان سے پوچھ کر اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے ابن عبد اللہ کے الفاظ لکھوا دیے ہوں (الی قولہ) تاہم اگر واقعہ یہی ہو کہ حضور ﷺ نے اپنا نام اپنے ہی دست مبارک سے لکھا ہو تو ایسی مثالیں دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ ان پڑھ لوگ صرف اپنا نام لکھنا سیکھ لیتے ہیں،

باقی کوئی چیز نہ پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ (تفسیر القرآن ج ۳، ص ۱۳-۱۴، ملخصاً، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور)

الجواب

پہلی بات یہ ہے کہ سید مودودی کا یہ لکھنا غلط ہے کہ اعلان نبوت کے بعد نبی ﷺ کا لکھنا قرآن مجید کی اس آیت اور اس استدلال کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن مجید نے آپ کے لکھنے اور پڑھنے کی مطلقاً نفی نہیں کی، بلکہ نزول قرآن سے پہلے آپ کے لکھنے اور پڑھنے کی نفی کی ہے۔ لہذا نزول قرآن کے بعد جن احادیث میں آپ کے لکھنے کا ثبوت ہے وہ روایات قرآن مجید کے خلاف نہیں ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر بکثرت کتب صحاح سے رسول ﷺ کا لکھنا ثابت ہے اور سید مودودی کا ان احادیث کو بجائے خود کمزور کہنا لائق التفات نہیں ہے۔ ثالثاً سید مودودی نے جو یہ تاویل کی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ آپ نے کسی اور کاتب سے لکھوا دیا ہو سو یہ احتمال بلا دلیل ہے اور الفاظ کو بلا ضرورت مجاز پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے۔ رابعاً اس بحث کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ سید مودودی نے نبی امی ﷺ کو عام ان پڑھ لوگوں پر قیاس کیا ہے اور لکھا ہے اگر آپ نے اپنا نام اپنے ہی دست مبارک سے لکھا ہو تو ایسی مثالیں دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہیں کہ ان پڑھ لوگ صرف اپنا نام لکھنا سیکھ لیتے ہیں، باقی کوئی چیز نہیں پڑھ سکتے، نہ لکھ سکتے ہیں۔ عام لوگوں کا ان پڑھ ہونا ان کا نقص اور ان کی جہالت ہے اور رسول اللہ کا امی ہونا آپ کا کمال ہے، کہ دنیا میں کسی استاد کے آگے زانو تلمذ تمہ نہیں کیا، کسی مکتب میں جا کر لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا اور براہ راست خدائے لم یزل سے علم پا کر اولین اور آخرین کے علوم بیان فرمائے اور پڑھ کر بھی دکھایا اور لکھ کر بھی دکھایا۔

تیسرے کہ ناکردہ قرآن درست

کتب خانہ چند ملت شہت

اب ہم قارئین کے سامنے بکثرت حوالہ جات کے ساتھ وہ احادیث پیش کرتے ہیں، جن میں نبی ﷺ کی طرف لکھنے کا اسناد کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے لکھنے کے ثبوت میں احادیث

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ذوالقعدہ میں عمرہ کیا تو اہل مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل ہونے سے منع کر دیا، حتیٰ کہ اس بات پر صلح کی کہ آپ آئندہ سال عمرہ کریں اور مکہ میں صرف تین دن قیام کریں، جب انہوں نے صلح نامہ لکھا تو اس میں یہ لکھا کہ یہ وہ تحریر ہے جس پر محمد رسول اللہ نے صلح کی، کفار مکہ نے کہا ہم اس کو نہیں مانتے، اگر ہم کو یہ یقین ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو نہ منع کرتے لیکن آپ محمد بن عبد اللہ ہیں۔ آپ نے فرمایا میں رسول اللہ ہوں اور میں محمد بن عبد اللہ ہوں۔ پھر آپ نے حضرت علی بن ابی طالب سے فرمایا رسول اللہ (کے الفاظ) مٹا دو، حضرت علی نے کہا نہیں! خدا کی قسم! میں آپ (کے الفاظ) کو ہرگز نہیں مٹاؤں گا، تب رسول اللہ ﷺ نے (لکھنا) شروع کیا، اور آپ اچھی طرح (مہارت سے) نہیں لکھتے تھے۔ پس آپ نے لکھا یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبد اللہ نے صلح کی کہ کوئی شخص مکہ میں ہتھیار لے کر داخل نہیں ہوگا، سو اس کے کہ تلوار نیام میں ہو۔ (الحدیث)

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۲۵۱، مسند احمد ج ۳، ص ۲۹۸، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۱۳۳)

امام بخاری نے اس واقعہ کو ایک اور سند کے ساتھ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اس میں اس طرح

ہے:

جب انہوں نے صلح نامہ لکھا تو اس میں یہ لکھا کہ یہ وہ ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے صلح کی کفار مکہ نے کہا ہم اس کو نہیں مانتے، اگر ہم کو یہ یقین ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو ہم آپ کو منع نہ کرتے، لیکن آپ محمد بن عبد اللہ ہیں، آپ نے فرمایا میں رسول اللہ ﷺ ہوں اور میں محمد بن عبد اللہ ہوں، پھر آپ نے حضرت علی سے کہا رسول اللہ (کے الفاظ) کو مٹا دو، حضرت علی نے کہا نہیں! خدا کی قسم! میں آپ (کے الفاظ) کو نہیں مٹاؤں گا، تب رسول اللہ ﷺ نے اس مکتوب کو پکڑا اور لکھا: یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبد اللہ نے صلح کی۔ (الحديث) (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۶۹۹)

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ ان احادیث پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت براء کی روایت میں اضطراب ہے اور راویوں نے حضرت براء کے جوں کے توں الفاظ نقل نہیں کیے۔ کسی روایت میں لکھنے کا مطلقاً ذکر نہیں، کسی میں صرف ”کتب“ ہے اور کسی میں ہے ”لیس بحسن یکتب“۔

(تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۱۳، ملخصاً، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن)

یعنی بعض روایات میں ہے۔ آپ نے لکھا اور بعض روایات میں ہے آپ اچھی طرح یعنی مہارت سے نہیں لکھتے تھے۔ سید مودودی کا اس اختلاف کو اضطراب قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ یہ ایسا اختلاف نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے ان روایات کا معنی مضطرب ہو جائے۔ اگر اس قسم کے اختلاف کو اضطراب کہا جائے تو پھر تمام احادیث ساقط الاستدلال قرار پائیں گی۔

علاوہ ازیں جن احادیث میں نبی ﷺ کے لکھنے کا ثبوت ہے وہ اور بھی صحابہ کرام سے مروی ہیں اور ان میں ”کتب“ اور ”لیس بحسن یکتب“ کا اختلاف بھی نہیں ہے۔ اب ہم دوسرے صحابہ کی روایات کو پیش کر رہے ہیں:

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا جمعرات کا دن! کیسا تھا وہ جمعرات کا دن! پھر وہ رونے لگے حتیٰ کہ ان کے آنسوؤں سے سگریزے بھیگ گئے۔ پس میں نے کہا اے ابن عباس! جمعرات کے دن میں کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا اس دن رسول اللہ ﷺ کا درد زیادہ ہو گیا تھا، آپ نے فرمایا میرے پاس (قلم اور کاغذ) لاؤ، میں تمہیں ایک ایسا مکتوب لکھ دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے، پس صحابہ میں اختلاف ہو گیا اور نبی علیہ السلام کے پاس اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا، صحابہ نے کہا آپ کا کیا حال ہے؟ کیا آپ بیماری میں کچھ کہہ رہے ہیں؟ آپ سے پوچھ لو۔ (الحديث)

مسلم کی ایک روایت (۳۱۵۶) میں ہے حضرت ابن عباس نے فرمایا سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کا اختلاف اور شور نبی ﷺ اور آپ کے لکھنے کے درمیان حائل ہو گیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۳۳۱، صحیح مسلم، الوصیۃ، ۲۰، (۱۶۳۷) ۳۱۵۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۰۲۹)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض میں مجھ سے فرمایا میرے لیے ابو بکر کو اور اپنے بھائی کو بلاؤ حتیٰ کہ میں ایک مکتوب لکھ دوں، کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کہنے والا کہے گا میں ہی (خلافت کا) مستحق ہوں، اور اللہ اور مومنین ابو بکر کے غیر پر انکار کر دیں گے۔ (صحیح مسلم، فضائل الصحابہ، ۱۱، (۲۳۸۷) ۶۰۶۳)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ نے روم کی طرف مکتوب لکھنے کا ارادہ کیا تو صحابہ نے کہا وہ صرف اسی مکتوب کو پڑھتے ہیں جس پر مہر لگی ہوئی ہو، تو رسول اللہ ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی گویا کہ میں اس کو رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں دیکھ رہا تھا اس پر نقش تھا ”محمد رسول اللہ“۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۵، صحیح مسلم، لباس، ۵۶، (۲۰۹۲) ۵۳۷۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۲۰۲، السنن الکبریٰ للنسائی رقم

الحديث: ۸۸۳۸)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے کسریٰ کی طرف، قیصر کی طرف، نجاشی کی طرف اور ہر جابر بادشاہ کی طرف مکاتب لکھے۔ آپ ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے اور یہ وہ نجاشی نہیں ہے جس کی نبی ﷺ نے نماز جنازہ پڑھی تھی۔
(صحیح مسلم الجہاد والسیرہ ۷۵، (۱۷۷۴) ۴۵۲۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۷۲۳، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۸۳۷)
امام بخاری اور امام مسلم نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں اور امام ابو داؤد اور امام دارمی نے صرف اس واقعہ کو روایت کیا ہے:

حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایلہ کے بادشاہ نے رسول اللہ ﷺ کو خط لکھا اور ایک سفید خچر آپ کو ہدیہ میں بھیجی، رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کو خط لکھا اور اس کو ایک چادر ہدیہ میں بھیجی، اور آپ نے حکم دیا کہ وہ سمندر کے ساتھ جس شہر میں رہتے ہیں اس میں ان کو جزیہ پر رہنے دیا جائے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۸، صحیح مسلم، فضائل، ۱۲، (۱۳۹۲) ۵۸۳۹، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۰۷۹، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۳۹۵، مسند احمد ج ۵، ص ۲۲۵)

حضرت سہل بن ابی حمزہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سہل اور حضرت مجیمہ کسی کام سے خیبر گئے، پھر حضرت مجیمہ کو خبر پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن سہل کو قتل کر کے کنویں میں ڈال دیا گیا، وہ یہود کے پاس گئے، (الی ان قال) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یا تو یہود تمہارے مقتول کی دیت ادا کریں گے اور یا وہ اعلان جنگ کو قبول کر لیں، پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ (فیصلہ) یہود کی طرف لکھ کر بھیج دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۱۹۲، صحیح مسلم الحدود ۶، (۱۶۶۹) ۳۷۰، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۵۲۱، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۷۲۵-۳۷۲۳، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۱۶۳۰)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کے علاوہ یہ حضرت عباس، حضرت عائشہ، حضرت انس، حضرت ابو حمید ساعدی اور حضرت سہل بن ابی حمزہ رضی اللہ عنہم کی روایات ہیں اور یہ سب صحاح ستہ کی روایات ہیں، ان میں سے کسی حدیث کی سند ضعیف نہیں ہے، اور ان تمام احادیث میں نبی ﷺ کے لکھنے کی تصریح ہے اور ان سب کی یہ تاویل کرنا کہ لکھنے سے مراد لکھنے کا حکم دینا ہے صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ مجاز ہے اور جب تک کوئی عقلی یا شرعی استحالہ نہ ہو کسی لفظ کو حقیقت سے ہٹا کر مجاز پر محمول کرنا جائز نہیں ہے اور بلاوجہ حدیث کے الفاظ کو اپنی مرضی کا معنی پہنانا محض اتباع ہوس ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ قرآن مجید سے نزول قرآن کے بعد آپ کے لکھنے اور پڑھنے کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں، نیز لکھنا اور پڑھنا اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت اور کمال ہے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت کو تو یہ نعمت عطا فرمائے اور آپ کو اس نعمت سے محروم رکھے، اور اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ کو لکھنا اور پڑھنا نہیں آتا تھا تو لازم آئے گا کہ اس نعمت اور کمال میں امت آپ سے بڑھ جائے اور یہ کسی طرح جائز نہیں ہے، امت کو اپنے نبی پر مطلقاً فضیلت نہیں ہوتی، جزی نہ کلی۔

نبی ﷺ کے لکھنے کے متعلق محدثین کی تحقیق

علامہ ابو العباس احمد بن عمر القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ سے لکھا محمد بن عبداللہ اور ایک روایت میں ہے آپ نے یہ لکھا، حالانکہ آپ مہارت سے نہیں لکھتے تھے (صحیح البخاری ۳۲۵۱، ۲۶۱۹) علامہ السمنانی، علامہ ابوزر اور علامہ باجی نے اس حدیث کو اپنے ظاہر پر محمول کیا ہے اور ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لکھنا نبی ﷺ کے امی ہونے کے منافی نہیں ہے، اور نہ اس آیت کے معارض ہے، اور آپ نزول قرآن سے پہلے کسی

کتاب کو نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ (العنکبوت: ۳۸) اور نہ اس حدیث کے خلاف ہے ہم ان پڑھ امت ہیں نہ لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم ۷: ۷۱، سنن ابوداؤد ۲۳۱۹) بلکہ ان کی تحقیق یہ ہے کہ آپ کا لکھنا آپ کے معجزہ کا اور زیادہ ہونا ہے اور یہ آپ کے صدق اور آپ کی رسالت کی اور قوی دلیل ہے آپ نے کسی سے سیکھے بغیر اور اس کے عادی اسباب کے حصول کے بغیر لکھا ہے لہذا یہ اپنی جگہ ایک الگ معجزہ ہے اور جس طرح نبی ﷺ نے کسی سے پڑھے بغیر اور علم کے دیگر اسباب حاصل کیے بغیر اولین اور آخرین کے علم کو جان لیا اور یہ آپ کا بہت بڑا معجزہ ہے اور اعلیٰ درجہ کی فضیلت ہے اسی طرح کسی سے سیکھے بغیر لکھنا بھی آپ کے امی ہونے کے خلاف نہیں اور یہ آپ کا بہت بڑا معجزہ ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس وقت آپ نے محمد بن عبداللہ لکھا اس وقت آپ نے چند لکیریں ڈالی ہوں اور ان کا مفہوم محمد بن عبداللہ ہو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان حروف کی شناخت ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان کی شناخت نہ ہو اور ہر تقدیر پر آپ سے امی کا لقب ساقط نہیں ہوگا اندلسی اور اندلس کے علاوہ دوسرے ممالک کے علماء نے اس نظریہ کی مخالفت کی بلکہ علامہ باجی کی تفسیر کی لیکن یہ درست نہیں ہے اور شریعت میں اس پر کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔

(المفہم ج ۴، ص ۶۳۸-۶۳۷، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت ۱۴۱۷ھ)

علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی المتوفی ۷۴۳ھ لکھتے ہیں:

قاضی عیاض نے کہا ہے کہ اس حدیث سے علماء نے اس پر استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر یہ لکھائی جاری کر دی یا تو آپ کے علم کے بغیر قلم نے لکھ دیا یا اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کے لکھنے کا علم دے دیا اور آپ کو پڑھنے والا بنا دیا جب کہ آپ اعلان نبوت کے بعد پڑھتے نہ تھے اور اس سے آپ کے امی ہونے پر اعتراض نہیں ہوتا اور انہوں نے اس موقف پر شعبی کی روایات سے استدلال کیا ہے اور بعض سلف سے منقول ہے کہ جب تک نبی ﷺ نے لکھ نہیں لیا آپ کی وفات نہیں ہوئی اور اکثر علماء نے یہ کہا ہے کہ آپ کا لکھنا مطلقاً ممنوع ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور آپ نزول قرآن سے پہلے کسی کتاب کو نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ (العنکبوت: ۳۸) اور نبی ﷺ کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ہم ان پڑھ امت ہیں نہ لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم ۷: ۷۱، ابوداؤد ۲۳۱۹) اور بخاری اور مسلم کی حدیث میں جو ہے کہ آپ نے محمد بن عبداللہ لکھا اس کا معنی ہے کہ آپ نے اس کے لکھنے کا حکم دیا جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ نبی ﷺ نے حضرت معز بن ایشہ کو رجم کیا یا آپ نے چور کے ہاتھ کاٹنے یا شرابی کو کوڑے لگائے۔

قاضی عیاض نے کہا لکھنے کے قائلین نے اس آیت کا یہ جواب دیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر نزول وحی سے پہلے آپ کتاب سے پڑھتے یا لکھتے تو کفار اس قرآن کے متعلق شک میں پڑ جاتے اور جس طرح آپ کا تلاوت کرنا جائز ہے اسی طرح آپ کا لکھنا بھی جائز ہے اور یہ آپ کے امی ہونے کے منافی نہیں ہے۔ آپ کا صرف امی ہونا معجزہ نہیں ہے کیونکہ نزول وحی سے پہلے آپ کا نہ پڑھنا اور نہ لکھنا اور پھر قرآن پیش کرنا اور ان علوم کو پیش کرنا جن کو امی نہیں جانتے یہ ایک معجزہ ہے۔

اور جن لوگوں نے اس حدیث میں یہ تاویل کی ہے کہ لکھنے کا معنی ہے آپ نے لکھنے کا حکم دیا۔ یہ تاویل ظاہر حدیث سے بلا ضرورت عدول کرنا ہے جب کہ حدیث کی عبارت یہ ہے کہ آپ مہارت سے نہیں لکھتے تھے پھر آپ نے لکھا اس میں یہ تصریح ہے کہ آپ نے خود لکھا اور جس طرح قرآن مجید میں ہے: ہم نے آپ کو شعر کرنا نہیں سکھایا اور نہ یہ آپ کے لائق ہے۔ (یسین: ۶۹) اس کے باوجود آپ نے منظوم کلام کہا مثلاً۔

تبیان القرآن

هل انت الا اصبع دميت
و في سبيل الله ما لقيت

تو صرف ایک انگلی ہے جو زخمی ہوئی ہے، حالانکہ تیرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ اللہ کی راہ میں ہوا ہے۔
کیونکہ آپ نے شعر گوئی کے قصد اور ارادہ کے بغیر یہ منظوم کلام فرمایا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ لکھنا بھی آپ سے اسی طرح
صادر ہوا ہو۔ (شرح الطیبی ج ۸، ص ۷۷-۷۶، مطبوعہ ادارۃ القرآن، کراچی، ۱۳۱۳ھ)

علامہ طیبی کی اس آخری توجیہ سے ہم متفق نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک آپ کو لکھنے کا علم تھا اور آپ نے قصداً لکھا تھا،
غیر ارادی طور پر آپ سے لکھنا صادر نہیں ہوا۔ جو شخص آپ کے امی ہونے کی وجہ سے آپ کے لکھنے اور پڑھنے کا انکار کرتا ہے
ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے نزدیک رسول اللہ ﷺ عالم ہیں یا نہیں۔ اگر وہ آپ کو عالم نہیں مانتا تو وہ مسلمان نہیں ہے
اور اگر وہ آپ کو عالم مانتا ہے تو جس طرح لکھنا پڑھنا امی کے منافی ہے، اسی طرح عالم ہونا بھی امی کے منافی ہیں۔ خصوصاً وہ جو تمام
مخلوقات سے بڑے عالم ہوں، نبی ﷺ احکام شرعیہ کے عالم ہیں اور اسرار الہیہ کے عارف ہیں ایک امی کی یہ صفت کیسے ہو سکتی
ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے امی ہونے کے باوجود آپ کو ان علوم سے نوازا، اسی طرح آپ کو لکھنے اور پڑھنے کے علم سے بھی
نوازا!

علامہ یحییٰ بن شرف نوادی متوفی ۶۷۶ھ، علامہ ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ اور علامہ سنوسی متوفی ۸۹۵ھ ان سب نے قاضی
عیاض کی عبارت نقل کی ہے اور ان لوگوں کا رد کیا ہے جنہوں نے علامہ باجی مالکی متوفی ۳۹۳ھ پر تشنیع کی ہے۔

(صحیح مسلم مع شرح النوادی ج ۸، ص ۳۹۶، اکمال المعلم ج ۶، ص ۳۲۲-۳۲۱، معلم اکمال الاکمال ج ۶، ص ۳۲۱)
علامہ بدر الدین محمود بن احمد یعنی متوفی ۸۵۵ھ لکھتے ہیں:

میں یہ کہتا ہوں کہ یہ منقول ہے کہ نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ (عمدۃ القاری ج ۲، ص ۳۰، مطبوعہ مصر)
نیز لکھتے ہیں:

اور یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۲، ص ۱۷۱، مطبوعہ مصر)
صحیح بخاری میں ہے کہ نبی ﷺ نے محمد بن عبد اللہ لکھا، اس پر یہ -وال ہوا کہ آپ تو امی تھے آپ نے اپنا نام کیسے لکھا؟
علامہ عینی نے اس کے تین جواب دیے ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ امی وہ شخص ہے جو مہارت سے نہ لکھتا ہو نہ کہ وہ جو مطلقاً نہ لکھتا ہو، دوسرا جواب یہ ہے کہ اس میں
اسناد مجازی ہے، اور تیسرا جواب یہ ہے کہ آپ کا لکھنا آپ کا معجزہ تھا۔ (عمدۃ القاری ج ۱۸، ص ۱۱۳، مطبوعہ مصر)
علامہ عینی کا دوسرا جواب صحیح نہیں ہے اور ان کی پہلی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ انہوں نے یہ جواب علامہ باجی کے
مخالفین سے نقل کیا ہے، صحیح جواب وہ ہے جس کو انہوں نے آخر میں ذکر کیا ہے۔

حافظ شہاب الدین احمد بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ نے اس مسئلہ پر بہت تفصیل سے لکھا ہے، ہم یہ پوری عبارت
پیش کر رہے ہیں ہر چند کہ اس کی بعض چیزیں علامہ طیبی کی عبارت میں آچکی ہیں:

علامہ ابوالولید باجی مالکی نے صحیح بخاری کی اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کے لکھنے پر استدلال کیا ہے، جس میں ہے
”پس رسول اللہ ﷺ نے لکھا“ یہ محمد بن عبد اللہ کا فیصلہ ہے، حالانکہ آپ مہارت سے نہیں لکھتے تھے۔ ان کے زمانہ کے علماء
اندلس نے ان پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ قول قرآن مجید کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ہے: ”وما کنت تنلوامن

قبلہ من کتب ولا تخطہ بیسینک“ آپ نزول قرآن سے پہلے نہ تو کتاب سے پڑھتے تھے نہ لکھتے تھے۔ علامہ باجی نے اس کے جواب میں کہا کہ قرآن مجید میں نزول قرآن سے پہلے آپ کے پڑھنے اور لکھنے کی نفی ہے، اور جب معجزات سے آپ کی نبوت ثابت ہو گئی اور آپ کی نبوت میں شک کا خطرہ نہ رہا تو پھر آپ کے پڑھنے اور لکھنے سے کوئی چیز مانع نہیں تھی، اور یہ آپ کا دوسرا معجزہ ہے۔ علامہ ابن دحیہ نے کہا ہے کہ علماء کی ایک جماعت نے علامہ باجی کے موقف کی حمایت کی، ان میں شیخ ابو ذر ہردی، ابو الفتح نیشاپوری اور افریقہ اور دوسرے شہروں کے علماء شامل ہیں۔ بعض علماء نے حضور ﷺ کے لکھنے پر امام ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے استدلال کیا ہے: مجاہد، عون بن عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ اس وقت تک فوت نہیں ہوئے، جب تک آپ نے لکھ اور پڑھ نہیں لیا، مجاہد کہتے ہیں کہ میں نے شعبی سے اس روایت کا ذکر کیا انہوں نے کہا عون بن عبد اللہ نے سچ کہا ہے، میں نے اس روایت کو سنا ہے، (حافظ ابن حجر لکھتے ہیں) سل بن حنظلہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاویہ سے کہا کہ وہ اقرع اور عینہ کے لیے لکھیں۔ عینہ نے اس پر کہا تمہارا کیا خیال ہے کیا میں متکلم کا صحیفہ لے کر جاؤں گا؟ (یعنی تم نے کچھ کا کچھ تو نہیں لکھ دیا؟) اس پر رسول اللہ ﷺ نے اس صحیفہ پر نظر ڈالی اور فرمایا معاویہ نے وہی لکھا ہے جو میں نے کہا تھا یونس کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نزول قرآن کے بعد لکھا ہے (سل بن حنظلہ کی روایت مذکورہ میں آپ کے پڑھنے کا ثبوت ہے۔ سعیدی غفرلہ) قاضی عیاض نے کہا ہے کہ بعض آثار سے پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو لکھنے اور خوش خطی کی معرفت تھی، کیونکہ آپ نے کاتب سے فرمایا قلم اپنے کان پر رکھو یہ تم کو یاد دلائے گا اور آپ نے حضرت معاویہ سے فرمایا دو ات رکھو اور قلم ایک کنار سے رکھو، باء کو لبا کر کے لکھو، سین دندانے دار لکھو اور میم کو کائمت کرو۔ قاضی عیاض نے کہا ہر چند کہ اس روایت سے آپ کا لکھنا ثابت نہیں ہوتا لیکن آپ کو لکھنے کا علم دیا جانا مستبعد نہیں ہے، کیونکہ آپ کو ہر چیز کا علم دیا گیا ہے، اور جمہور نے ان احادیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ احادیث ضعیف ہیں اور حدیبیہ کی حدیث کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے اور اس میں لکھنے والے حضرت علی تھے، اور مسور کی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ حضرت علی نے لکھا تھا اور صحیح بخاری کی حدیث میں تقدیر عبارت اس طرح ہے کہ نبی ﷺ نے صلح نامہ کو لیا اور اس میں محمد رسول اللہ کو مٹا دیا پھر حضرت علی کو وہ صلح نامہ دوبارہ دے دیا، پھر حضرت علی نے اس میں لکھا۔ علامہ ابن التین نے اسی پر اعتماد کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ حدیث میں جو ہے ”آپ نے لکھا“ اس کا معنی ہے آپ نے لکھنے کا حکم دیا، اور اس کی حدیث میں بہت مثالیں ہیں، جیسے ہے آپ نے قیصر کی طرف لکھا اور آپ نے کسریٰ کی طرف لکھا، اور اگر اس حدیث کو اپنے ظاہر پر بھی محمول کیا جائے کہ نبی ﷺ نے اپنا اسم مبارک لکھا تھا، حالانکہ آپ مہارت سے نہیں لکھتے تھے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ لکھنے کے عالم ہوں اور آپ امی نہ ہوں، کیونکہ بہت سے لوگ مہارت سے نہیں لکھتے، اس کے باوجود وہ بعض الفاظ کو پہچانتے ہیں اور ان کو اپنی جگہ پر رکھ سکتے ہیں خصوصاً اسماء کو، اور اس وصف کی وجہ سے وہ امی (ان پڑھا) ہونے سے خارج نہیں ہوتے۔ جیسا اکثر بادشاہ اسی طرح ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس وقت آپ کے ہاتھ پر لکھنے کا عمل جاری ہو گیا ہو اور آپ مہارت سے نہ لکھتے ہوں اور اس صلح نامہ کو آپ نے حسب مشالکھ دیا ہو، اور یہ اس خاص وقت میں الگ ایک معجزہ ہو، اور اس سے آپ امی ہونے سے خارج نہ ہوں۔ اشاعرہ کے ائمہ اصول میں سے علامہ السمنانی نے یہی جواب دیا ہے، اور علامہ ابن جوزی نے بھی ان کی اتباع کی ہے، علامہ سیہلی نے اس جواب کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ ہر چند کہ یہ ممکن ہے اور آپ کے لکھنے سے ایک اور معجزہ ثابت ہوتا ہے، لیکن یہ اس کے مخالف ہے کہ آپ امی تھے جو لکھتا نہیں، اور جس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ ”اگر آپ نزول قرآن سے پہلے لکھتے ہوتے تو منکرین آپ کی نبوت کے متعلق شک میں پڑ جاتے“۔ اس آیت نے تمام شکوک و

شہادت کی جڑ کاٹ دی ہے اور اگر نزول وحی کے بعد آپ کا لکھنا جائز ہوتا تو منکرین پھر شبہ میں پڑ جاتے اور قرآن کے معاندین یہ کہتے کہ آپ مہارت سے لکھتے تھے لیکن اس کو چھپاتے تھے، علامہ سہیلی نے اس کے جواب میں کہا یہ محال ہے کہ بعض معجزات، بعض دوسرے معجزات کے مخالف ہوں اور حق یہ ہے کہ آپ کے لکھنے کا معنی یہ ہے کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لکھنے کا حکم دیا، علامہ سہیلی کی بات ختم ہوئی، حافظ عسقلانی فرماتے ہیں: یہ کہنا کہ فقط اپنا نام لکھنا، آپ کے امی ہونے اور معجزہ کے مخالف ہے سو یہ بہت قابل اعتراض ہے۔ (فتح الباری ج ۷، ص ۵۰۳، ۵۰۴، مطبوعہ دار نشر المکتب الاسلامیہ، لاہور، ۱۳۰۱ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی کی اس آخری بات سے یہ معلوم ہوا کہ جس حدیث میں نبی ﷺ کے لکھنے کا ذکر ہے اس سے آپ کا لکھنا مراد ہے اور آپ کا لکھنا آپ کے معجزہ یا آپ کے امی ہونے کے خلاف نہیں ہے۔ چنانچہ جسٹس محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں: حافظ کامیلان اس طرف ہے کہ اس باب کی حدیث (یعنی حضور ﷺ کا اپنا نام لکھنا) اپنے ظاہر پر محمول ہے اور اس خاص وقت میں رسول اللہ ﷺ کا امی ہونے کے باوجود اپنا نام لکھنا آپ کا معجزہ ہے۔

(تکملۃ فتح الملسم، ج ۳، ص ۱۸۰، مطبوعہ مکتبہ دارالعلوم کراچی، ۱۳۱۳ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے کہا تھا کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس حدیث کو ظاہر پر محمول کرنا رسول اللہ ﷺ کے امی ہونے اور معجزہ کے خلاف ہے اس میں نظر کبیر ہے یعنی بہت بڑا اعتراض ہے، ملا علی قاری متونی ۱۰۱۲ھ نے اس نظر کبیر کو بیان کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

معجزہ قرآنیہ وجوہ کثیرہ سے ثابت ہے۔ اگر اس سے قطع نظر کر لی جاتی کہ قرآن لانے والے امی ہیں، تب بھی یہ معجزہ تھا اور جب اس پر یہ وصف زائد ہوا کہ قرآن کو لانے والے پہلے پڑھتے اور لکھتے نہ تھے تو اس سے اس کا معجزہ ہونا بہ طریق کمال ظاہر ہوا۔ اور معاندین کے اعتراضات منہدم ہو گئے، اس سے ظاہر ہو گیا کہ اگر رسول اللہ ﷺ ابتداء ہی سے قاری اور کاتب ہوتے اور قرآن پیش کرتے، تب بھی یہ آپ کا معجزہ ہوتا اور یہ بالکل واضح ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے۔

(مرقات ج ۸، ص ۷۸، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۳۹۰ھ)

نیز ملا علی قاری دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

قاضی عیاض نے کہا ہے کہ جس طرح نبی ﷺ کا تلاوت کرنا آپ کے امی ہونے کے منافی نہیں ہے اسی طرح آپ کا لکھنا بھی آپ کے امی ہونے کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ آپ کا صرف امی ہونا معجزہ نہیں ہے، آپ نے جب پہلے لکھے، پڑھے بغیر قرآن مجید کو پیش کیا تو یہ آپ کا معجزہ تھا، پھر آپ نے قرآن مجید میں ایسے علوم پیش کیے جن کو امی نہیں جانتے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ نے ایسے علوم پیش کیے جن کو تمام علماء نہیں جانتے اور وہ ایسے علوم ہیں کہ اگر آپ بالکل امی نہ ہوتے تو پھر بھی ان علوم کو پیش کرنا آپ کا معجزہ تھا، کیونکہ قرآن معجزات کثیرہ پر مشتمل ہے اور جن لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ آپ کے لکھنے کا معنی یہ ہے کہ آپ نے لکھنے کا حکم دیا یہ بلا ضرورت ظاہر معنی سے عدول کرنا ہے۔ یہاں پر قاضی عیاض کی عبارت ختم ہوئی، (ملا علی قاری کہتے ہیں) اس توجیہ میں مجھے قاضی عیاض کے ساتھ تو وارد ہو گیا ہے جیسا کہ ان لوگوں پر ظاہر ہوگا، جنہوں نے میری پہلی تقریر (ج ۸، ص ۷۸) کو پڑھا ہوگا۔ (مرقات ج ۸، ص ۹۱-۹۲، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۳۹۰ھ)

شیخ امین احسن اصلاحی امی کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

امی، مدرسہ و کتابی تعلیم و تعلم سے نا آشنا کو کہتے ہیں، امین کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسہ اور رسمی تعلیم و کتابت سے نا آشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے۔ اور اسی طرح بنی اسرائیل جو کہ

حامل کتاب تھے ان کے مقابل کے لیے امت ایک امتیازی علامت تھی۔ (الی قولہ) چنانچہ قرآن نے اس لفظ کو عربوں کے لیے ان کو اہل کتاب سے محض ممیز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی پہلو سے آنحضرت ﷺ کے لیے نبی امی کا لقب استعمال ہوا ہے۔ (تذکر قرآن ج ۲، ص ۵۳، مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن، ۱۳۰۶ھ)

یعنی نبی ﷺ کو امی اس لیے فرمایا ہے کہ آپ نے کسی مدرسہ میں جا کر لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا، اگر اللہ تعالیٰ آپ کو براہ راست لکھنا پڑھنا سکھا دے اور آپ لکھیں اور پڑھیں تو وہ آپ کے امی ہونے کے خلاف نہیں ہے، یا بنو اسرائیل سے امتیاز کے لیے آپ کو امی فرمایا سو یہ بھی آپ کے لکھنے پڑھنے کے خلاف نہیں ہے، جیسا کہ قرآن مجید نے تمام اہل مکہ کو امین فرمایا حالانکہ ان میں لکھنے پڑھنے والے بھی تھے، کاتین وحی تھے اور بدر کے بعض قیدیوں کے پاس ہدیہ کے لیے رقم نہیں تھی تو نبی ﷺ نے ان کا ہدیہ یہ مقرر فرمایا کہ وہ انصار کی اولاد کو پڑھنا لکھنا سکھائیں۔ (مسند احمد رقم الحدیث: ۲۲۱۶، المستدرک ج ۲، ص ۱۲۰)

تورات اور انجیل میں نبی ﷺ کی بشارتوں کے متعلق احادیث

نیز اس آیت میں ارشاد ہے جس کو وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں اس میں نبی ﷺ کا چوتھا اور پانچواں وصف مذکور ہے، تورات میں آپ کا لکھا ہوا ہونا چوتھا وصف ہے اور انجیل میں آپ کا لکھا ہوا ہونا پانچواں وصف ہے۔ احادیث صحیحہ معتبرہ میں رسول اللہ ﷺ کی ان صفات کا ذکر ہے جو تورات اور انجیل میں ہیں، ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں: عطاء بن یسار بیان کرتے ہیں کہ میری حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، میں نے کہا مجھے رسول اللہ ﷺ کی اس صفت کے متعلق بتائیے جو تورات میں ہے۔ انہوں نے کہا اچھا! اللہ کی قسم تورات میں آپ کی ان بعض صفات کا ذکر ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں، وہ یہ ہیں: اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا اور آنحالیکہ آپ شاہد اور مبشر اور نذیر ہیں، اور امین کی پناہ ہیں، آپ میرے بندے اور رسول ہیں، میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے، آپ سخت مزاج اور درشت خو نہیں ہیں، اور نہ بازار میں شور کرنے والے ہیں اور نہ برائی کا جواب برائی سے دیتے ہیں، لیکن معاف کرتے ہیں اور بخش دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک آپ کی روح ہرگز قبض نہیں کرے گا حتیٰ کہ آپ کے سب سے ٹیڑھی قوم کو سیدھا کر دے گا، بایں طور کہ وہ کہیں گے لا الہ الا اللہ اور آپ کے سب سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور پردہ پڑے ہوئے دلوں کو کھول دے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۱۲۵، مسند احمد ج ۲، ص ۱۷۳، طبع قدیم، رقم الحدیث: ۶۶۲۲، طبع جدید، الادب المفرد رقم الحدیث: ۲۳۷، ۲۳۶، دلائل النبوة ج ۱، ص ۳۷۳، سنن داری رقم الحدیث: ۵۶، مجمع الزوائد ج ۸، ص ۲۷۱، جامع الاصول ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۳، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۰۰۳۶)

حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ تورات میں (سیدنا) محمد ﷺ کی صفت لکھی ہوئی ہے، اور حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام آپ کے ساتھ مدفون ہوں گے اور حجرہ میں ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔

(جامع الاصول ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۳۸)

وہب بن منبہ نے حضرت داؤد نبی ﷺ کے قصہ میں ذکر کیا ہے کہ زبور میں داؤد علیہ السلام پر یہ وحی کی گئی تھی۔ اے داؤد! عنقریب تمہارے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام احمد اور محمد ہوگا، وہ صادق اور سید ہوگا، میں اس پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا اور نہ وہ مجھ پر کبھی ناراض ہوگا، میں نے اس کے تمام اگلے اور پچھلے ذنب (بظاہر خلاف اولیٰ سب کام) ان کے ارتکاب سے پہلے ہی معاف کر دیے ہیں، ان کی امت پر رحم کیا گیا ہے، میں نے انبیاء کو جیسے نوافل عطا کیے ہیں ان کو بھی اسی طرح کے نوافل عطا کیے ہیں، اور میں نے نبیوں اور رسولوں پر جس طرح کے فرائض فرض کیے ہیں، ان پر بھی ویسے فرائض فرض کیے ہیں۔ حتیٰ کہ

ثبیان القرآن

جلد چہارم

جب قیامت کے دن وہ میرے پاس آئیں گے تو ان کا نور نبیوں کے نور کی طرح ہوگا، کیونکہ میں نے ان پر فرض کیا ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے وضو کریں جیسا کہ میں نے اس سے پہلے نبیوں پر وضو فرض کیا تھا، اور میں نے ان پر غسل جنابت فرض کیا ہے جس طرح نبیوں پر غسل جنابت فرض کیا تھا، اور میں نے ان کو حج کا حکم دیا ہے جیسا کہ اس سے پہلے نبیوں کو حج کا حکم دیا تھا، اور میں نے ان کو جہاد کا حکم دیا ہے، جیسا کہ اس سے پہلے نبیوں کو جہاد کا حکم دیا تھا، اے داؤد میں نے محمد (ﷺ) اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی ہے، میں نے ان کو چھ ایسی فضیلتیں عطا کی ہیں جو کسی اور امت کو عطا نہیں کیں، میں خطا اور نسیان پر ان کی گرفت نہیں کرتا، اور وہ نادانستہ طور پر جو گناہ کر بیٹھیں، پھر مجھ سے معافی طلب کریں تو میں ان کو معاف کر دیتا ہوں اور وہ آخرت کے لیے جو نیکی کریں میں اس کو دگنا چوگنا کر دیتا ہوں، اور ان کی نیکیوں کا میرے پاس اس سے بھی افضل ذخیرہ ہے۔ اور جب وہ مصائب پر صبر کر کے کہیں گے انا للہ وانا الیہ راجعون تو میں ان کو صلوة، رحمت اور جنات النعیم کی طرف ہدایت عطا کروں گا، اور جب وہ مجھ سے دعا کریں گے تو یا تو میں اس کو فوراً قبول فرماؤں گا، یا اس کے عوض ان سے کوئی برائی دور کروں گا اور یا ان کے لیے آخرت میں اجر کو ذخیرہ کروں گا۔ اے داؤد! محمد (ﷺ) کی امت سے جو شخص یہ شہادت دے گا کہ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے اور میں واحد ہوں اور میرا کوئی شریک نہیں ہے اور وہ اس شہادت میں صادق ہوگا، تو وہ میری جنت میں اور میری کرامت میں میرے ساتھ ہوگا، اور جس نے مجھ سے اس حال میں ملاقات کی کہ اس نے محمد (ﷺ) کی تکذیب کی ہو اور ان کے پیغام کی تکذیب کی ہو اور میری کتاب کا مذاق اڑایا ہو تو میں اس کی قبر میں اس پر عذاب اندیل دوں گا، اور جب وہ قبر سے اٹھے گا تو فرشتے اس کے چہرے اور اس کی دہر پر ضرب لگائیں گے۔ پھر میں اس کو دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ڈال دوں گا۔

(دلائل النبوة ج ۱، ص ۳۸۱-۳۸۰، البدایہ والنہایہ ج ۶، ص ۶۲، تہذیب تاریخ دمشق ج ۱، ص ۳۴۵-۳۴۴)

مقاتل بن حیان روایت کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے حضرت عیسیٰ کی طرف وحی کی کہ تم نبی امی عربی کی تصدیق کرنا جو اونٹ کی سواری کریں گے، زرہ پہنیں گے، عمامہ پہنیں گے جو کہ تاج ہے، اور نعلین پہنیں گے اور ان کے پاس لاشھی ہوگی، ان کے سر کے بال گھنگریالے ہوں گے، کشادہ پیشانی ہوگی، خوبصورت بھوس ہوں گی، بڑی بڑی آنکھیں ہوں گی، بڑا دہانہ ہوگا، اور گہری سیاہ آنکھیں ہوں گی، کھڑی ناک ہوگی، فراخ پیشانی، گھنی ڈاڑھی ہوگی، چہرے پر پسینہ موتیوں کی طرح ہوگا، ان سے مشک کی خوشبو آئے گی۔ ان کی گردن میں چاندی اور گلے میں سونا چھلک رہا ہوگا، ان کے گلے کے نیچے سے ناف تک بال ہوں گے۔ ان کی ہتھیلیاں اور قدم پر گوشت ہوں گے، جب وہ لوگوں کے درمیان ہوں گے تو ان پر چھا جائیں گے اور جب وہ چلیں گے تو لگے کا جیسے بلندی سے ڈھلوان کی طرف آرہے ہوں اور ان کی اولاد کم ہوگی۔

(دلائل النبوة ج ۱، ص ۳۷۸، تہذیب تاریخ دمشق ج ۱، ص ۳۴۵)

موجودہ تورات کے متن میں نبی (ﷺ) کے متعلق بشارتیں

موجودہ تورات میں بھی سیدنا محمد (ﷺ) کی بعثت کے متعلق بشارتیں موجود ہیں:

خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا، یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حواب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں، میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا، جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے

گانہ نے گاتو میں ان کا حساب اس سے لوں گا O

(تورات استثناء، باب ۱۸، آیت ۱۹-۱۵، پرانا عہد نامہ ص ۱۸۳، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور)

اور مرد خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی وہ یہ ہے O اور اس نے کہا: خداوند سینا سے آیا۔ اور شعیر سے ان پر آشکار ہوا۔ اور کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتش شریعت تھی۔ وہ بے شک قوموں سے محبت رکھتا ہے۔ اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں۔ ایک ایک تیری باتوں سے مستفیض ہوگا۔

(تورات استثناء، باب ۳۳، آیت ۲-۳، پرانا عہد نامہ ص ۲۰۱، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور، ۱۹۹۲ء)

تورات کے پرانے (۱۹۲۷ء کے) اردو ایڈیشن میں یہ آیت اس طرح تھی 'دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا۔ اور نبی ^ﷺ مکہ مکرمہ میں دس ہزار صحابہ کے ساتھ داخل ہوئے تھے' اس طرح یہ آیت نبی ^ﷺ پر پوری طرح منطبق ہوتی تھی 'جب عیسائیوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے اس آیت کے الفاظ بدل دیے اور یوں لکھ دیا: اور لاکھوں قدسیوں میں سے آیا۔ تورات کے پرانے (۱۹۲۷ء کے) ایڈیشن میں یہ آیات اس طرح تھیں:

اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا 'دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔

(کتاب مقدس، استثناء، باب ۳۳، آیت ۲، ص ۱۹۲، مطبوعہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور، ۱۹۲۷ء)

اس کی تائید عربی ایڈیشن سے بھی ہوتی ہے 'اس میں یہ آیت اس طرح لکھی ہے:

واتی من ربوات اقدس۔
دس ہزار قدسیوں میں سے آیا۔

(مطبوعہ دارالکتاب المقدس فی العالم العربی، ص ۳۳۳، ۱۹۸۰ء)

لویس معلوف نے ربوۃ کے معنی لکھے ہیں: الجماعة العظيمة نحو عشرة آلاف۔ (المنجد ص ۲۳۷) یعنی تقریباً دس ہزار افراد کی جماعت۔

دیکھو! میرا خادم (پچھلے ایڈیشنوں میں "بندہ" تھا۔ سعیدی غفرلہ) جس کو میں سنبھالتا ہوں، میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر ڈالی، وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا O وہ نہ چلائے گا نہ شور کرے گا، اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دے گی O وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا اور ٹٹھماتی جتی کو نہ بھجائے گا۔ وہ راستی سے عدالت کرے گا O وہ ماندہ نہ ہوگا اور ہمت نہ ہارے گا جب تک کہ عدالت کو زمین پر قائم نہ کرے۔ جزیرے اس کی شریعت کا انتظار کریں گے O جس نے آسمان کو پیدا کیا اور تان دیا جس نے زمین کو اور ان کو جو اس میں سے نکلتے ہیں پھیلایا۔ جو اس کے باشندوں کو سانس اور اس پر چلنے والوں کو روح عنایت کرتا ہے یعنی خداوند یوں فرماتا ہے میں خداوند نے تجھے صداقت سے بلایا میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا O اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لیے تجھے دوں گا O تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور اسیروں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانہ سے چھڑائے O یہوداہ میں ہوں یہی میرا نام ہے، میں اپنا جلال کسی دوسرے کے لیے اور اپنی حمد کھودی ہوئی صورتوں کے لیے روانہ رکھوں گا O دیکھو پرانی باتیں پوری ہو گئیں اور نئی باتیں بتاتا ہوں، اس سے پیشتر کہ واقع ہوں میں تم سے بیان کرتا ہوں O

(تورات، سبیاہ، باب ۳۲، آیت ۱-۹، مطبوعہ پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور ص ۶۹۳، ۱۹۸۰ء)

اس اقتباس کی آیت نمبر ۲ میں ہے: وہ نہ چلائے گا اور نہ شور کرے گا اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دے گی۔ اس آیت میں نبی ﷺ کے متعلق پیش گوئی ہے: حضرت عمرو بن العاص کی یہ روایت گزر چکی ہے کہ تورات میں آپ کی یہ صفت لکھی ہوئی ہے: اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۱۲۵)

اس باب کی آیت نمبر ۶ میں ہے میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا۔ اس کی تائید قرآن مجید کی اس آیت سے ہوتی ہے:

وَاللّٰهُ يَعْصِيْكُمْ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: ۶۷) اور اللہ آپ کی لوگوں سے حفاظت کرے گا۔

عیسائی یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ پیش گوئی حضرت عیسیٰ کے متعلق ہے کیونکہ انجیل میں لکھا ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو پھانسی دے دی اور حضرت عیسیٰ نے چلا کر کہا اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا، ملاحظہ ہو: اور انہوں نے اسے مصلوب کیا اور اس کے کپڑے قرعہ ڈال کر بانٹ لیے۔ (الی قولہ) اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا ایللی۔ ایللی لما شقبتنی؟ یعنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

(متی کی انجیل باب ۲۷، آیت ۴۶، ۳۵، مطبوعہ پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور، ص ۳۳، ۱۹۹۲ء)

نیز اس باب کی آیت ۷ میں ہے کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور اسیروں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانہ سے چھڑائے۔

اس آیت میں بھی نبی ﷺ کے متعلق پیش گوئی ہے اور اس کی تصدیق ان آیتوں میں ہے:

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝
يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ مَجْلَى السَّلَامِ
وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَ
يَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ
(المائدہ: ۱۵-۱۶)

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور آگیا اور کتاب مبین۔ اللہ اس کے ذریعہ ان لوگوں کو سلامتی کے راستوں پر لاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں اور اپنے اذن سے ان کو اندھیروں سے نور کی طرف لاتا ہے اور ان کو سیدھے راستے کی طرف لاتا ہے۔

اور حضرت عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ تورات میں آپ کی یہ صفت ہے: اور اللہ اس وقت تک آپ کی روح ہرگز قبض نہیں کرے گا حتیٰ کہ آپ کے سب سے ٹیڑھی قوم کو سیدھا کر دے گا۔ بایں طور کہ وہ کہیں گے لا الہ الا اللہ اور آپ کے سب سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور پردہ بڑے ہوئے دلوں کو کھول دے گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۱۲۵)

موجودہ انجیل کے متن میں نبی ﷺ کے متعلق بشارتیں

یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا، وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہو اور ہماری نظر میں عجیب ہے؟ ۰ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی ۰

(متی کی انجیل، باب ۲۱، آیت ۴۳-۴۲، مطبوعہ بائبل سوسائٹی لاہور، ص ۲۵، ۱۹۹۲ء)

یہ آیت بھی نبی ﷺ کی بشارت ہے اور قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق ہے:

أُولَئِكَ الَّذِينَ اتَيْنَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ
وَالنُّبُوَّةَ فَإِنْ يَكْفُرْ بِهَا هَؤُلَاءِ فَقَدْ وَكَلْنَا بِهَا
یہ وہی لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم شریعت اور نبوت عطا کی ہے۔ پس اگر ان چیزوں کے ساتھ یہ لوگ کفر

قَوْمًا لِّسُوَابِهَا يَكْفُرِينَ ۝ (الانعام: ۸۹)

کریں تو بیشک ہم نے ان چیزوں پر ایسی قوم کو مقرر فرما دیا ہے جو ان سے انکار کرنے والے نہیں ہیں۔

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو مجھ پر ایمان رکھتا ہے یہ کام جو میں کرتا ہوں وہ بھی کرے گا بلکہ ان سے بھی بڑے کام کرے گا کیونکہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں ۝ اور جو کچھ تم میرے نام سے چاہو گے میں وہی کروں گا تاکہ باپ بیٹے میں جلال پائے ۝ اگر میرے نام سے کچھ چاہو گے تو میں وہی کروں گا ۝ اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے ۝ اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے ۝

(یوحنا کی انجیل باب ۴، آیت ۱۶-۱۲، پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور ص ۹۹، ۱۹۹۳ء)

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جن کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی روح حق جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔ (یوحنا کی انجیل، باب ۱۳، آیت ۲۶، پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور ص ۱۰۰، ۱۹۹۳ء)

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا ۝ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا ۝ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے ۝ راست بازی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے ۝ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے ۝ مجھے تم سے اور بھی بہت سے باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے ۝ لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا ۝ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ نے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا ۝

(یوحنا کی انجیل، باب ۱۶، آیت ۱۳-۷، پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور ص ۱۰۱، ۱۹۹۳ء)

ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سیدنا محمد ﷺ کی آمد کی بشارتیں دی ہیں، قرآن مجید میں ہے:

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ بِنَتِيِّ إِسْرَائِيلَ
إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ
مِنَ التَّوْرَةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي
اسْمُهُ أَحْمَدُ
(الصّف: ۶)

اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں در آنحالیکہ میں اس تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور ایک عظیم رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئیں گے ان کا نام احمد ہے۔

اس بشارت کی مزید تصدیق انجیل کی اس آیت میں ہے:

اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ سے اس کا کچھ نہیں۔

(یوحنا کی انجیل، باب ۱۳، آیت ۳۰، پاکستان بائبل سوسائٹی لاہور ص ۹۹، ۱۹۹۳ء)

نیز ان آیات میں ہے وہ میری گواہی دے گا۔ (یوحنا: باب ۱۳، آیت ۲۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں لوگوں کی بہ نسبت ابن مریم کے زیادہ قریب ہوں، تمام انبیاء علاقہ (باپ شریک) بھائی ہیں، میرے اور ان کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔

(صحیح مسلم فضائل، ۱۳۳، (۲۳۶۵) ۶۰۱۵، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۶۷۵)

ان آیات میں ہے: وہ تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا۔ (یوحنا: باب ۱۶، آیت ۱۳)

تبیان القرآن

جلد چہارم

اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ سیدنا محمد ﷺ سے فرماتا ہے:

إِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ - بے شک آپ ضرور سیدھے راستے کی ہدایت دیتے ہیں۔

(الشوری: ۵۲)

نیز اس آیت میں ہے: وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ نے گا وہی کہے گا۔ (یوحنا، باب ۱۶، آیت ۱۳)

اور قرآن مجید میں سیدنا محمد ﷺ کے متعلق ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۚ (النجم: ۳-۴) اور وہ اپنی خواہش سے بات نہیں کرتے۔ ان کا فرمانا وحی ہوتا ہے جس کی ان کی طرف وحی کی جاتی ہے۔

نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وہ تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ (یوحنا، باب ۱۶، آیت ۱۳)

یہ پیش گوئی بھی سیدنا محمد ﷺ کے متعلق ہے اور اس کی تائید اس حدیث میں ہے:

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس ایک مقام پر تشریف فرما ہوئے اور آپ نے قیامت تک ہونے والے تمام امور بیان کر دیے۔ جس نے ان کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا جس نے ان کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔

(صحیح مسلم الفتن ۲۲، ۲۸۹۱، ۲۸۹۰، ۱۳۰، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۶۰۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۲۳۰)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما ہوئے اور آپ نے مخلوق کی ابتداء سے خبریں دینی شروع کیں، حتیٰ کہ اہل جنت اپنے گھروں میں داخل ہو گئے اور اہل نار اپنے گھروں میں داخل ہو گئے۔ جس نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۹۲)

امریا المعروف اور نہی عن المنکر میں نبی ﷺ کی خصوصیات

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو ان کو نیکی کا حکم دے گا اور برائی سے روکے گا۔ یہ نبی ﷺ کا چھٹا وصف ہے، نیکی کا حکم دینے سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائیں اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں، اور برائی سے روکنے سے مراد یہ ہے کہ وہ شرک نہ کریں، رشوت اور تھوڑے معاوضہ کے بدلہ میں تورات کی آیتوں کا سودا نہ کریں، سیدنا محمد ﷺ کی صفات اور بشارت سے متعلق آیتوں کو لوگوں سے نہ چھپائیں، اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کے مقابلہ میں اپنے علماء اور راہبوں کے اقوال کو ترجیح نہ دیں، اور ہر قسم کے صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کو ترک کر دیں۔

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا کام دوسرے نبیوں اور رسولوں نے بھی کیا ہے، یہاں آپ کے اس وصف کو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، کیونکہ آپ نہایت حکمت اور عمدہ پیرائے کے ساتھ نیکی کا حکم دیتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (النحل: ۱۲۵) حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اپنے رب کے راستے کی طرف بلائیے اور ان پر احسن طریقہ سے حجت قائم کیجئے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم مسجد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، اچانک ایک اعرابی آیا اور کھڑا ہو کر مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اس کو ڈانٹنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اس کا پیشاب منقطع نہ کرو، اس کو چھوڑ دو، پس انہوں نے اس کو چھوڑ دیا، حتیٰ کہ اس نے پیشاب کر لیا (امام بخاری کی روایت میں ہے:

آپ نے فرمایا اس کے پیشاب کے اوپر ایک ڈول پانی بہا دو، تم آسانی کرنے کے لیے بھیجے گئے ہو، مشکل میں ڈالنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔ (رقم الحدیث: ۲۲۰) پھر رسول اللہ ﷺ نے اس اعرابی کو بلایا اور فرمایا یہ مساجد پیشاب یا کسی اور گندگی ڈالنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں، یہ تو صرف اللہ عزوجل کے ذکر، نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہیں، یا جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر آپ نے ایک شخص کو ایک ڈول پانی لانے کا حکم دیا اور اس پر بہا دیا۔

(صحیح مسلم الطہارۃ ۱۰۰ (۲۸۵۰) ۶۳۸، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۰۲۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۵۲۸)

حضرت معاویہ بن الحکم سلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہا تھا، نمازیوں میں سے کسی شخص کو چھینک آئی۔ میں نے کہا یہ حکم اللہ، تو تمنازی مجھے گھور کر دیکھنے لگے، میں نے کہا اس کی ماں روئے تم مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ اور وہ اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ مارنے لگے، تب میں نے جان لیا کہ وہ مجھے چپ کرانا چاہتے ہیں، سو میں چپ ہو گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھ لی، آپ پر میرے ماں باپ نذا ہو جائیں، آپ نے مجھے مارا نہ ڈانٹا نہ برا کہا۔ آپ نے فرمایا اس نماز میں لوگوں کے ساتھ باتیں کرنا جائز نہیں ہے۔ نماز میں تو صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن کی قرأت ہوتی ہے۔ امام ابو داؤد کی دوسری روایت میں ہے: انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کی طرح نرمی کرنے والا کوئی معلم نہیں دیکھا۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۹۳۱-۹۳۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۲۱۷، سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۵۰۲، مسند احمد ج ۵، ص ۴۳۸) نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں نبی ﷺ اس آیت کا مصداق تھے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ
فَقَطًّا غَلِيظًا أَلْقَيْتَ الْأَنِفَاقُومِن حَوْلِكَ
(آل عمران: ۱۵۹) ضرور آپ کے پاس سے بھاگ جاتے۔

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں نبی ﷺ کی یہ بھی خصوصیت تھی کہ آپ کسی کام سے منع فرماتے تو اس کی حکمت بھی بیان فرمادیتے۔ مثلاً یہ حدیث ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو لعنت کرے۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! کوئی شخص اپنے ماں باپ پر کیسے لعنت کرے گا؟ آپ نے فرمایا ایک شخص کسی کے باپ کو گالی دے گا تو وہ (جواب میں) اس کے باپ اور ماں کو گالی دے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۹۷۳، صحیح مسلم الایمان ۱۳۶ (۹۰) ۲۵۷، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۵۱۳۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۰۲، مسند احمد ج ۲، ص ۲۱۶، ۲۱۳، ۱۹۵، ۱۶۳)

آپ کا منشاء یہ تھا کہ کوئی شخص کسی کے ماں باپ کو گالی نہ دے، لیکن آپ نے اس کو ایسے موثر انداز میں فرمایا کہ جب تم کسی کے ماں باپ کو گالی دو گے تو وہ تمہارے ماں باپ کو گالی دے گا اور اس طرح تم اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا سبب بنو گے۔ چنانچہ فرمایا تم اپنے ماں باپ کو گالی نہ دو۔

نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے میں نبی ﷺ کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ آپ جس چیز کا حکم دیتے تھے خود اس پر زیادہ عمل کرتے تھے۔ آپ نے ہمیں پانچ فرض نمازیں پڑھنے کا حکم دیا اور خود بشمول تہجد چھ فرض پڑھتے تھے۔ آپ نے ہمیں طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک روزہ رکھنے کا حکم دیا اور خود وصال کے روزے رکھے جس میں بغیر انظار اور سحر کے

روزے پر روزہ ہوتا ہے۔ اور یہ کئی کئی دن کے روزے ہوتے تھے۔ ہمیں مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دینے کا حکم فرمایا اور خود اپنے پاس مطلقاً مال نہیں رکھتے تھے ہمارے ترکہ میں وراثت جاری کی اور اپنا تمام ترکہ صدقہ قرار دیا، ہمیں چار بیویوں میں عدل کرنے کا حکم دیا اور خود نوازواج میں عدل کر کے دکھایا۔

اور آپ کی چوتھی خصوصیت آپ کی اثر آفرینی تھی، آپ نے انبیاء سابقین کے مقابلہ میں تبلیغ کا سب سے کم وقت پایا اور سب سے زیادہ اپنے پیروکار چھوڑے۔ آپ نے خود فرمایا اہل جنت کی ایک سو بیس صفیں ہیں ان میں سے اسی (۸۰) اس امت کی صفیں ہوں گی اور باقی چالیس صفیں دوسرے انبیاء کی ہوں گی۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۵۵) انبیاء سابقین کی تبلیغ سے انسان بھی بمشکل مسلمان ہوتے تھے، آپ کی تبلیغ سے انسان مسلمان ہوئے، جنات مسلمان ہوئے، گوہ اور ہرنی نے کلمہ پڑھا، شجر و حجر سلام عرض کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ کا ہمزاد بھی مسلمان ہو گیا!

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں

ایک طلوع آفتاب دشت و جبل سحر سحر

آج دنیا میں کسی نبی کے پیروکار اپنے نبی کی صحیح تعلیم پر قائم نہیں ہیں صرف آپ کی امت ہے جو آپ کی تعلیم پر قائم ہے اور انشاء اللہ قیامت تک قائم رہے گی!

اشیاء کو حلال اور حرام کرنا نبی ﷺ کا منصب ہے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کی یہ صفت بیان کی کہ ”جو ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرے گا اور ناپاک چیزوں کو حرام کرے گا“ یہ نبی ﷺ کا ساتواں وصف ہے۔

اس کا معنی یہ ہے کہ جن پاک چیزوں کو انہوں نے اپنی خواہش سے حرام کر لیا ہے ان کو یہ نبی حلال کرے گا اور جن ناپاک چیزوں کو انہوں نے اپنی مرضی سے حلال کر لیا ہے ان کو یہ نبی حرام کرے گا یا اس کا یہ معنی ہے کہ جو پاک چیزیں بنی اسرائیل پر بطور سزا حرام کر دی گئی تھیں ان کو یہ نبی حلال کر دے گا مثلاً حلال جانوروں کی چربی، اور ناپاک اور گندی چیزوں کو حرام کر دے گا مثلاً خون، مردار جانور اور شراب وغیرہ۔ جو چیزیں حرام ذریعہ آمدنی سے حاصل ہوں ان کو بھی حرام کر دے گا۔ مثلاً سود، رشوت اور جو وغیرہ۔

اس آیت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حلال اور حرام کرنے کا منصب عطا فرمایا ہے اور آپ کو یہ منصب عطا کیا ہے کہ آپ پاک چیزوں کو حلال اور ناپاک چیزوں کو حرام کر دیں۔

حضرت مقدم بن معدی کرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سنو! مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی ایک مثل دی گئی ہے، سنو! عنقریب ایک شخص اپنے تخت پر سیر ہو کر بیٹھا ہو گا وہ یہ کہے گا کہ اس قرآن کو لازم رکھو، اس میں جو تم حلال پاؤ اس کو حلال قرار دو، اور اس میں جو حرام پاؤ اس کو حرام قرار دو، اور بے شک جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حرام قرار دیا وہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا، سنو! تمہارے لیے پالتو گدھا حلال نہیں ہے، اور نہ ہر کچیلوں سے شکار کرنے والا درندہ اور نہ راستہ میں پڑی ہوئی ذی کی چیز سو اس کے کہ اس کا مالک اس سے مستغنی ہو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۰۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۷۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۲، سنن دارمی رقم الحدیث: ۵۸۲)

مسند احمد ج ۴، ص ۱۳۲، المستدرک ج ۱، ص ۱۰۹، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۱۶۳)

الطیبات اور النجائث کی تفسیر میں مذاہب اربعہ
امام فخرالدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں الطیبات سے یہ مراد لینا واجب ہے کہ جو چیزیں طبیعت کے نزدیک پاکیزہ اور لذیذ ہیں وہ حلال ہیں اور نفع بخش چیزوں میں اصل حلت ہے، لہذا یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ ہر وہ چیز جو نفس کے نزدیک پاکیزہ اور لذیذ ہے وہ حلال ہے، سوا اس کے کہ کسی اور شرعی دلیل سے وہ حرام ہو، اسی طرح النجائث سے مراد وہ چیز ہے جو نفس اور طبیعت کے نزدیک گھناؤنی ہو اور اس کا استعمال صحت کے لیے مضر ہو وہ حرام ہے کیونکہ ضرر رساں چیزوں میں اصل حرمت ہے سوائے ہر چیز حرام ہے سوا اس کے کسی اور شرعی دلیل سے وہ حلال ہو، اسی قاعدہ کی بناء پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ بیع حرام ہے، کیونکہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہنا خبیث ہے اور اس کی ثمن (قیمت) خبیث ہے اور جب وہ خبیث ہے تو پھر حرام ہے، کیونکہ اس آیت میں ہے وہ تم پر خبیث چیزوں کو حرام کرتے ہیں نیز خمر (انگور کے کچے شیرہ سے بنی ہوئی شراب) حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ر جس (نجس) فرمایا ہے۔ (المائدہ: ۹۰) اور نجس چیز خبیث ہے اور خبیث چیز حرام ہے پس خمر حرام ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۸۲، ۳۸۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی ۶۸۶ھ لکھتے ہیں:

ان پاک چیزوں کو حلال کرتے ہیں جو ان پر حرام تھیں جیسے چربی (یا اونٹ) اور نپاک چیزوں کو ان پر حرام کرتے ہیں جیسے خون، خنزیر کا گوشت اور سود اور رشوت۔ (تفسیر ایضاد مع الکا زونی ج ۳، ص ۶۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۶ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ پاک چیزیں حلال ہیں اور خبیث چیزیں حرام ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا خبائث خنزیر کا گوشت اور سود وغیرہ ہیں۔ اسی بنا پر امام مالک نے گھناؤنی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے مثلاً سانپ بچھو اور گھریلا وغیرہ، اور امام شافعی کے نزدیک طبیبات سے مراد لذیذ چیزیں ہیں لیکن یہ اپنے عموم پر نہیں ہے ورنہ شراب اور خنزیر بھی حلال ہو، بلکہ یہ ان کے ساتھ خاص ہے جن کو شریعت نے حلال قرار دیا، اور ان کے نزدیک خبیث کالفاظ محرمات شرعیہ میں عام ہے۔ اور ان کے نزدیک گھناؤنی چیزیں بھی خبیث ہیں، اس لیے وہ بچھو، گھریلے اور گرگٹ کو حرام کہتے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۲۶۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

علامہ ابو الفرج عبدالرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

طیبات میں چار قول ہیں:

۱- اس سے مراد حلال چیزیں ہیں، یعنی آپ حلال چیزوں کو حلال کرتے ہیں۔

۲- جن چیزوں کو عرب پاک قرار دیتے تھے۔

۳- اس سے مراد چربی ہے جو بنو اسرائیل پر حرام کی گئی تھی۔

۴- اس سے مراد وہ جانور ہیں جن کو مشرکین عرب حرام کہتے تھے۔

یعنی بحیرہ (جو اونٹنی پانچ مرتبہ بچے جنتی اور اس کا آخری بچہ نہ ہوتا تو اس کا کلن چیر دیتے، پھر نہ اس پر سواری کرتے نہ اس کو زبح کرتے، نہ پانی اور چارے سے ہنکاتے اور اس کو بحیرہ کہتے) اور سائبہ (جب سفر درپیش ہو تا یا کوئی شخص بیمار ہو تا تو وہ یہ نذر مانتے کہ اگر میں سفر سے خیریت سے واپس آؤں یا تندرست ہو جاؤں تو میری اونٹنی سائبہ ہے، اس سے بھی بحیرہ کی طرح نفع اٹھانا

تبیان القرآن

حرام ہوتا اور اس کو بھی کھانے پینے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے) اور وسیلہ (بکری جب سات بچے جن چکتی تو اگر ساتوں بچہ نہ ہو تا تو اس کو صرف مرد کھاتے اور اگر مادہ ہوتا تو اس کو بکریوں میں چھوڑ دیتے اور اگر نر اور مادہ دونوں ہوتے تو کہتے یہ اپنے بھائی سے مل گئی ہے اس کو وسیلہ کہتے اس سے بھی نفع اٹھانا حرام ہوتا اور اس کو آزاد چھوڑ دیتے) اور حام (جب اونٹ دس مرتبہ گیا بھن کر دیتا تو اس کو حامی کہتے اس سے نفع اٹھانا حرام کہتے اور اس کو کھانے پینے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے) یہ تعریفیں علامہ ابو البرکات احمد بن محمد نسفی متوفی ۷۱۰ھ نے مدارک التریل ج ۱ ص ۵۳۲ علی ہاشم الخازن میں ذکر کی ہیں۔

سعید بن مسیب بیان کرتے ہیں کہ بحیرہ وہ اونٹنی ہے جس کا دودھ بتوں کے لیے روک دیا جاتا پس کوئی شخص اس کا دودھ نہ دوہتا تھا اور سائبہ وہ اونٹنی ہے جس کو وہ اپنے بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے اور اس پر کوئی چیز نہیں لادی جاتی تھی اور وسیلہ وہ اونٹنی ہے جو پہلی بار نہ جنتی اور دوسری بار مادہ اس کو وہ اپنے بتوں کے لیے چھوڑ دیتے بشرطیکہ وہ اس طرح دو اونٹنیاں جنتی کہ ان کے درمیان نہ ہوتا اور جو اونٹ مخصوص عدد کے مطابق گیا بھن کر تا اس کو حام کہتے تھے اس کو بتوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے اور اس سے نفع نہیں اٹھاتے تھے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۲۳)

اور النجاشث میں تین قول ہیں:

- ۱- اس سے مراد حرام چیزیں ہیں۔
- ۲- جن چیزوں کو عرب خبیث سمجھتے تھے اور ان کو نہیں کھاتے تھے مثلاً سانپ اور حشرات الارض۔
- ۳- جن چیزوں کو مشرکین عرب حلال سمجھتے تھے مثلاً مردار، خون اور خنزیر کا گوشت۔

(زاد المسیر ج ۳ ص ۲۷۳، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۴۰۷ھ)

ملا احمد جون پوری حنفی متوفی ۱۱۳۰ھ لکھتے ہیں:

الطیبات سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ان پر حرام کر دی گئی تھیں، مثلاً چربی وغیرہ یا جو چیزیں شریعت میں حلال ہیں مثلاً جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا۔ سو ان چیزوں کے جن کو کسب حرام سے حاصل کیا گیا ہو اور النجاشث سے مراد وہ چیزیں ہیں جو نجس ہوں جیسے خون اور خنزیر کا گوشت اور جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو یا جو چیزیں حکماً خبیث ہوں جیسے سود اور رشوت وغیرہ اور دوسری چیزیں جو کسب حرام سے حاصل کی گئی ہوں، فقہاء نے کہا ہے کہ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ کو مچھلی کے علاوہ سمندری جانور حرام ہیں۔ کیونکہ وہ سب خبیث ہیں (کیونکہ ان سے گھن آتی ہے) اس میں امام شافعی پر رد ہے۔ کیونکہ وہ تمام سمندری جانوروں کو حلال کہتے ہیں۔ (التفسیرات الاحمدیہ ص ۲۲۱، مطبوعہ مکتبہ حقانیہ، پشاور)

لامام شافعی کے نزدیک تمام سمندری جانور حلال ہیں اور امام مالک کے نزدیک جن سمندری جانوروں کی نظیر خشکی میں حرام ہے وہ سمندر میں بھی حرام ہیں، مثلاً خنزیر اور کتا۔ باقی سمندری جانور ان کے نزدیک حلال ہیں اور ان کے نزدیک وہ خبیث نہیں ہیں کیونکہ ان کو ان سے گھن نہیں آتی اور دراصل گھن کھانا ایک اضافی چیز ہے۔ بعض لوگوں کو بعض چیزوں سے گھن آتی ہے اور بعض دوسروں کو نہیں آتی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نبی ﷺ کا آٹھواں اور نواں وصف ذکر فرمایا جو ان سے بوجھ اتارے گا اور ان کے گلوں میں پڑے ہوئے طوق اتارے گا۔ (الاعراف: ۱۵۷)

بنو اسرائیل کے بوجھ اور ان کے طوق کا اتارنا اس سے مراد وہ شدید احکام ہیں جو بنو اسرائیل پر فرض کیے گئے تھے۔

حذیفہ بیان کرتے ہیں کہ ان کو یہ حدیث پہنچی ہے کہ ابو موسیٰ ایک بوتل میں پیشاب کر رہے تھے، انہوں نے کہا بنو اسرائیل کو جب پیشاب لگ جاتا تو وہ اس جگہ کو کاٹ دیتے تھے۔

(مسند احمد ج ۹، رقم الحدیث: ۲۳۳۰۸، طبع جدید دار الفکر، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۸۳)

امام ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے کہ ان میں سے جب کوئی گناہ کرتا تو اس کے گھر کے دروازے پر لکھ دیا جاتا تھا کہ تمہاری توبہ یہ ہے کہ تم اپنے اہل اور مال کے ساتھ گھر سے نکل کر دشمن کے مقابلہ کو جاؤ حتیٰ کہ تم سب پر موت آ جائے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۸۳، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۳۱۷ھ)

مال غنیمت ان پر حلال نہیں تھا، اس کو ایک آگ آ کر جلا دیتی تھی، ہفتہ کے دن شکار کرنا ممنوع تھا، گنہ گار عضو کو کاٹنا لازم تھا، قتل خطا ہو یا قتل عمد اس میں قصاص لازم تھا، دیت مشروع نہ تھی، تیمم کی سہولت نہ تھی، مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ نماز پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔

سیدنا محمد ﷺ نے ان تمام مشکل اور شدید احکام کے بوجھ اور طوق اتار دیے اور ان کے مقابلہ میں آسان احکام مشروع فرمائے۔

اس آیت میں نبی ﷺ کے نو اوصاف بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا سو جو لوگ اس (نبی) پر ایمان لائے اور اس کی تعظیم کی اور اس کی نصرت اور حمایت کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (الاعراف: ۱۳۷)

اس آیت میں نور سے مراد قرآن مجید ہے، اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن مجید آپ کے ساتھ نازل نہیں ہوا، بلکہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ اس کا امام رازی نے یہ جواب دیا ہے کہ قرآن مجید آپ کی نبوت کے ساتھ نازل ہوا ہے اور یہاں پر یہی معنی مراد ہے اور علامہ آلوسی نے یہ جواب دیا ہے کہ قرآن مجید آپ کے بھیجنے کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ بہر حال نور سے مراد قرآن مجید ہے اور آیت کے اس حصہ میں دو مضمون ہیں، ایک مضمون یہ ہے کہ ایمان وہ معتبر ہے جو آپ کی تعظیم کے ساتھ ہو اور جس نے آپ کی تعظیم نہیں کی وہ مومن نہیں ہے، اور دوسرا مضمون یہ ہے کہ آپ کی تعظیم اور توقیر کرنے کا حکم مقدم ہے اور قرآن مجید کی اتباع کرنے کا حکم موخر ہے، پہلے ہم آپ کی تعظیم اور توقیر کو بیان کر رہے ہیں۔

نبی ﷺ کی تعظیم و توقیر کے متعلق قرآن مجید کی آیات

۱- سورۃ الاعراف: ۱۵۷ میں نبی ﷺ کی تعظیم اور توقیر کرنے اور آپ کی نصرت اور حمایت کرنے کا صراحتاً حکم دیا ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل آیات میں بھی صراحت کے ساتھ نبی ﷺ کی تعظیم اور توقیر کا حکم فرمایا ہے:

بے شک ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور بشارت دینے والا اور (عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا، تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول کی تعظیم اور توقیر کرو اور صبح و شام کو اللہ کی تسبیح کرو۔

۲- اِنَّا ارْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا
لِّتُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَتَعَزَّوْهُ وَتُوقِرُوْهُ
وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (الفتح: ۸-۹)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

۳- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدُمُوا بَيْنَ يَدَيْ
اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَأَتَقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

(الحجرات: ۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ لوگ رمضان کے مہینہ سے پہلے روزے رکھنا مقدم کرتے اور نبی ﷺ سے پہلے روزے رکھنا شروع کر دیتے تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔ (المعجم الاوسط ج ۳، رقم الحدیث: ۲۷۳۳، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض، ۱۴۰۷ھ)

امام عبد بن حمید، امام ابن جریر اور امام ابن المنذر نے حضرت حسن بن علیؓ سے روایت کیا ہے کہ لوگوں نے قربانی کے دن نبی ﷺ سے پہلے ذبح کر دیا تو ان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ دوبارہ ذبح کریں اور یہ آیت نازل ہوئی: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔ (جامع البیان ج ۲۶، ص ۱۵۱، الدر المشورج ۷، ص ۵۳۷)

امام ابن جریر، امام ابی حاتم اور امام ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ مسلمانوں کو نبی ﷺ کے کلام کرنے سے پہلے کلام کرنے سے منع کیا گیا۔

(جامع البیان ج ۲۶، ص ۱۵۰، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۱۰، ص ۳۳۰۲، الدر المشورج ۷، ص ۵۳۶)

امام بخاری نے مجاہد سے تطبیقاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پہلے کوئی شرعی حکم نہ بیان کرو (کوئی فتویٰ نہ دو) حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کی زبان سے فیصلہ فرمائے۔

(صحیح البخاری باب ۳۹، جامع البیان ج ۲۶، ص ۱۵۰، الدر المشورج ۷، ص ۵۳۷، الجامع لاحکام القرآن ج ۱۶، ص ۲۷۳)

۳- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ (الحجرات: ۲)

اے ایمان والو! اس (عظیم) نبی کی آواز پر اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اور ان کے سامنے بلند آواز سے بات نہ کرو جیسے تم ایک دوسرے سے بلند آواز سے باتیں کرتے ہو ایسا نہ ہو کہ تمہارے سب اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں پتا بھی نہ چلے۔

ابن ابی ملیکہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ قریب تھا کہ دو سب سے افضل مسلمان ہلاک ہو جاتے، جب بنو تمیم کی جماعت نبی ﷺ کے پاس آئی تو ان میں سے ایک (حضرت ابو بکر بن علیؓ) نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ان پر اقرع بن حابس کو امیر بنائیے جو بنو مجاشع کا بھائی ہے اور دوسرے (حضرت عمر بن علیؓ) نے کسی اور کو امیر بنانے کے لیے کہا، نافع نے کہا مجھے اس کا نام یاد نہیں ہے پس حضرت ابو بکر نے حضرت عمر سے کہا تم صرف میری مخالفت کا ارادہ کر رہے ہو، حضرت عمر نے کہا تم میری مخالفت کا ارادہ کر رہے ہو، حتیٰ کہ اس معاملہ میں دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اے ایمان والو! اس نبی کی آواز پر اپنی آوازیں اونچی نہ کرو۔

حضرت ابن الزبیر کہتے ہیں اس کے بعد حضرت عمر رسول اللہ ﷺ سے کوئی بات بلند آواز سے نہیں کہتے تھے بہت پست آواز سے بات کرتے حتیٰ کہ حضور ان سے پوچھتے کہ کیا کہا ہے، حضرت ابن الزبیر نے اپنے نانا یعنی حضرت ابو بکر کا ذکر نہیں کیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۸۳۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۲۷۷، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۳۰۱، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۵۱۳، مسند احمد ج ۳، ص ۳، جامع الاصول ج ۲، رقم الحدیث: ۸۰۹، جامع البیان ج ۲، ص ۱۵۵-۱۵۳، الدر المشورج ۷، ص ۵۳۸-۵۳۷)

امام بزار، امام ابن عدی، امام حاکم اور امام ابن مردویہ نے حضرت ابو بکر صدیق بن علیؓ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے کہا یا رسول اللہ! اب میں آپ سے صرف آہستہ آہستہ بات کروں گا۔

(مسند ابی بزار رقم الحدیث: ۲۲۵۷، المستدرک ج ۳، ص ۷۳، الدر المشورج ۷، ص ۵۳۸)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: اے ایمان والو! اس (عظیم) نبی کی آواز پر اپنی آوازیں اونچی نہ کرو (الحجرات: ۲) تو حضرت ثابت بن قیس اپنے گھر میں بیٹھ گئے اور کہا میں اہل دوزخ میں سے ہوں اور نبی ﷺ کے پاس آنے سے رک گئے۔ نبی ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ سے ان کے متعلق پوچھا: اے ابو عمرو! ثابت کو کیا ہوا؟ کیا وہ بیمار ہیں؟ حضرت سعد نے کہا وہ میرے پڑوسی ہیں اور مجھے ان کی بیماری کا کوئی علم نہیں ہے، پھر حضرت سعد، حضرت ثابت کے پاس گئے اور انہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے متعلق پوچھ رہے تھے، حضرت ثابت نے کہا یہ آیت نازل ہوئی ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سب سے زیادہ بلند آواز سے رسول اللہ ﷺ کے سامنے بولتا ہوں، لہذا میں اہل دوزخ سے ہوں، حضرت سعد نے نبی ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں وہ اہل جنت سے ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۸۴۶، صحیح مسلم الایمان، ۱۸۷ (۱۱۹) ۳۰۷، جامع البیان جز ۷، ص ۲، ص ۱۵۴)

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ زہری نے بیان کیا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ثابت بن قیس بن شماس نے کہا اے نبی اللہ! مجھے خوف ہے کہ میں ہلاک ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ کے سامنے آواز بلند کرنے سے منع فرمایا ہے اور میں بلند آواز سے بولنے والا ہوں! اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یہ پسند نہ کرو کہ تمہاری اس کام پر تعریف کی جائے جس کو تم نے کیا ہو اور میں اپنے آپ کو محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنی تعریف چاہتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے تکبر سے منع کیا ہے اور میں حسن و جمال کو پسند کرتا ہوں، آپ نے فرمایا اے ثابت! کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ زندگی میں تم نیک نام ہو اور تمہیں شہادت کی موت آئے اور تم جنت میں داخل ہو، سو انہوں نے نیک نامی کے ساتھ زندگی گزار لی اور میلہ کذاب کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

(جامع البیان جز ۷، ص ۲، ص ۱۵۴، حافظ سیوطی نے اس حدیث کو امام ابن حبان، امام طبرانی اور ابو نعیم کے حوالوں سے ذکر کیا ہے، الدر المشورج، ص ۵۴۹)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی ہے: رسول اللہ ﷺ کی تعظیم اور توقیر کا حکم دینا اور آپ سے گفتگو کرتے وقت آواز کو پست رکھنا، اور بعض علماء نے نبی ﷺ کی قبر مبارک کے پاس آواز بلند کرنے کو بھی منع کیا ہے اور بعض علماء نے علماء کے سامنے بھی آواز بلند کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ علماء انبیاء کے وارث ہیں، قاضی ابو بکر بن العربی نے کہا کہ حیات میں اور بعد از وفات نبی ﷺ کا احترام یکساں ہے، اور آپ کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے ہر شخص پر واجب ہے کہ آپ کے سامنے آواز بلند نہ کرے نہ آپ سے اعراض کرے۔

اس آیت سے یہ مقصود نہیں ہے کہ آپ کے سامنے اس طرح بلند آواز سے بات نہ کرو جس سے استخفاف اور اہانت مترشح ہو کیونکہ یہ کفر ہے اور اس آیت کے مخاطب مومن تھے، بلکہ اس سے مقصود یہ ہے کہ انتہائی پست آواز سے آپ کے سامنے بات چیت کی جائے جیسا کہ کسی بارعب اور پرہیت شخص کے سامنے ادب کے ساتھ پست آواز میں بات کی جاتی ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۱۶، ص ۲۷۹-۲۸۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

امام بخاری نے اپنی سند کے ساتھ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے اس میں ہے:

عروہ نے نبی ﷺ کے اصحاب کو بہ غور دیکھنا شروع کیا، اس نے کہا بہ خدا رسول اللہ ﷺ جب بھی تھوکتے تھے، تو کوئی نہ کوئی صحابی اپنا ہاتھ آگے کر دیتا، پھر اس لعاب مبارک کو اپنے چہرے اور اپنے ہاتھوں پر ملتا اور جب آپ کسی کام کا حکم دیتے تو

سب اس کام کو کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرتے اور جب آپ وضو کرتے تو آپ کے وضو سے بچے ہوئے پانی کو لینے کے لیے وہ سب ایک دوسرے پر اس طرح جھپٹ پڑتے کہ لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں گے اور جب آپ بات کرتے تو آپ کے سامنے سب خاموش ہو جاتے، آپ کی تعظیم کی وجہ سے وہ آپ کو گھور کر نہیں دیکھتے تھے، جب عروہ کفار قریش کی طرف واپس گیا تو اس نے کہا اے میری قوم ابہ خدا میں کئی بادشاہوں، قیصر و کسری اور نجاشی کے پاس وفد بنا کر گیا ہوں اور بہ خدا میں نے نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کی ایسی تعظیم کی جاتی ہو، جیسی تعظیم اصحاب محمد (سیدنا) محمد ﷺ کی کرتے ہیں، بہ خدا جب وہ تھوکتیں تو کوئی نہ کوئی صحابی اس کو اپنی ہتھیلی پر لے لیتا ہے پھر اس کو اپنے چہرے اور جسم پر ملتا ہے اور جب وہ کسی کام کا حکم دیں تو اس کو کرنے کے لیے سب ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو ان کے بچے ہوئے پانی کو لینے کے لیے وہ ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے ہیں اور جب وہ بات کرتے ہیں تو سب خاموش ہو جاتے ہیں، وہ آپ کی تعظیم کی وجہ سے آپ کو گھور کر نہیں دیکھتے۔ (الحدیث)

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۷۳۱-۲۷۳۲، مسند احمد ج ۴، ص ۳۳۰-۳۲۹، طبع قدیم دار الفکر)

رسول اللہ ﷺ کے ادب، اجلال اور احترام کا صحابہ کرام اس طرح لیاظ کرتے تھے کہ آپ سامنے بالکل ساکت اور جاہد بیٹھے رہتے تھے اور مطلقاً ہلے بھی نہیں تھے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں اور ان کے ہلنے سے وہ پرندے اڑ جائیں گے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک انصاری کے جنازے میں گئے، ہم ایک قبر کے پاس پہنچے اور جب لحد بنائی جا رہی تھی تو رسول اللہ ﷺ بیٹھے گئے اور ہم رسول اللہ ﷺ کے ارد گرد بیٹھ گئے گویا کہ ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے تھے۔ (الحدیث)

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۵۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۰۵۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۲۶۹، مسند احمد ج ۴، ص ۲۹۵)

(۲۷۸-۲۸۷، طبع قدیم دار الفکر بیروت)

بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں، (یہ) وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے پرکھ لیا ہے، ان کے لیے بخشش اور بہت بڑا ثواب (الحجرات: ۳) ہے۔

امام ابن جریر لکھتے ہیں: جو لوگ رسول اللہ ﷺ سے بات کرتے وقت آواز پست رکھتے ہیں، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کی ادائیگی اور گناہوں سے اجتناب کے لیے خاص اور مصفیٰ کر لیا ہے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں کہ الحجرات: ۲ کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ سے بہت پست آواز میں بات کرتے تھے۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۱۶، ص ۲۸۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

یعنی نبی ﷺ کی تعظیم اور تکریم اور آپ کے ادب اور احترام کا صلہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اجر عظیم ہے اور آپ کے سامنے اونچی آواز سے بات کرنا اور آپ کے ادب اور احترام کی رعایت نہ کرنا اپنے تمام نیک اعمال کو ضائع کرنا ہے۔

بے شک جو لوگ آپ کو حجروں سے باہر پکارتے ہیں ان (الحجرات: ۳) میں سے اکثر بے عقل ہیں۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عرب کے کچھ لوگ آئے اور کہنے لگے: ہمیں اس شخص کے پاس لے چلو، اگر

یہ نبی ہیں تو ہم اور لوگوں کی بہ نسبت سعادت حاصل کریں گے اور اگر یہ بادشاہ ہیں تو ہم ان کے زیر سایہ رہیں گے، میں ان کو نبی ﷺ کے پاس لے گیا اور آپ کو بتایا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے، پھر وہ نبی ﷺ کے حجروں کے پاس گئے اور زور سے پکارنے لگے، یا محمد یا محمد تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل کی۔ (المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۵۱۲۳، جامع البیان ج ۲، ص ۱۵۸-۱۵۷)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں: دوپہر کے وقت نبی ﷺ آرام فرما رہے تھے تو کچھ لوگ آکر پکارنے لگے یا محمد یا محمد، ہمارے پاس آئیں، آپ بیدار ہو کر باہر آئے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (الجامع لاحکام القرآن ج ۶، ص ۲۸۱)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا

وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (الحجرات: ۵)

اور اگر وہ صبر کرتے حتیٰ کہ آپ (خود) ان کی طرف باہر آتے تو یہ ان کے لیے زیادہ اچھا تھا، اور اللہ بہت بخشنے والا ہے۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کو نیند سے بیدار کرنا بھی آپ کے ادب اور احترام کے خلاف ہے اور آپ کا نام لے کر آپ کو بلانا بھی آپ کے ادب اور احترام کے خلاف ہے، البتہ یا محمد کہہ کر خوشی سے نعرہ لگانا یا آپ کو یاد کرنے کے لیے یا محمد کہنا آپ کو متوجہ کرنے کے لیے یا محمد کہنا جائز ہے اور یا محمد کہہ کر آپ کو بلانا ناجائز ہے، یا رسول اللہ اور یا نبی اللہ کہہ کر آپ کو بلانا چاہیے، سورۃ الحجرات کی یہ تمام آیات آپ کے ادب اور احترام اور آپ کے اجلال اور اکرام پر دلالت کرتی ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ (البقرہ: ۱۰۳)

اے ایمان والو! (اپنے رسول کو) راعنا نہ کہو، انظرنا (ہم پر نظر کریں) کہو اور خوب سن لیا کرو، اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مسلمان نبی ﷺ سے راعنا کہتے تھے، یعنی ہماری رعایت فرمائیے۔ اور ہماری طرف التفات اور توجہ فرمائیے، جب کوئی بات سمجھ نہ آتی تو وہ اس موقع پر کہتے تھے، راعنا، ہماری رعایت فرمائیں، یہودی کی لغت میں یہ لفظ بددعا کے لیے تھا، اور اس کا معنی تھا، سنو تمہاری بات نہ سنی جائے، انہوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور کہنے لگے کہ پہلے ہم ان کو تنہائی میں بددعا دیتے تھے اور اب لوگوں اور برسر محفل ان کو بددعا دینے کا موقع ہاتھ آ گیا ہے تو وہ نبی ﷺ کو مخاطب کر کے راعنا کہتے تھے، اور آپس میں ہنستے تھے، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو یہودی کی لغت کا علم تھا، انہوں نے جب ان سے یہ لفظ سنا تو انہوں نے کہا تم پر اللہ کی لعنت ہو، اگر میں نے آئندہ تم کو نبی ﷺ سے یہ لفظ کہتے ہوئے سنا تو میں تمہاری گردن اڑا دوں گا، یہودی نے کہا کیا تم لوگ یہ لفظ نہیں کہتے؟ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں سے کہا گیا (جب کوئی بات سمجھ نہ آئے) تو تم راعنا نہ کہو بلکہ انظرنا کہو (ہم پر نظر رحمت اور مہربانی فرمائیں) تاکہ یہودی کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ صحیح لفظ کو غلط معنی میں استعمال کریں اور پہلے ہی نبی ﷺ کی بات غور سے سن لیا کرو تاکہ یہ نوبت نہ آئے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۲، ص ۵۷، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو، ایران، ۱۳۸۷ھ)

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر بھی راعنا کہنے سے منع فرمایا گیا ہے:

مِنَ الَّذِينَ هَادُوا يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمِعٍ وَرَاعِنَا لَيْسَ بَالِيسِنِيهِمْ وَطَاعُنَا

بعض یہود اللہ کے کلمات کو اس کے سیاق و سباق سے بدل دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور نافرمانی کی، (اور آپ سے کہتے ہیں) سنئے در آنحالیکہ آپ کی بات نہ سنی گئی ہو اور

فِي الدِّينِ وَلَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا
وَأَسْمَعُ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَأَقْوَمًا وَلَكِنْ
لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا
(النساء: ۳۶)

دین میں طعن کرنے کے لیے اپنی زبان کو موڑ کر راعنا کہتے ہیں،
اور اگر وہ یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی اور آپ
ہماری بات سنیں اور ہم پر نظر (کرم) فرمائیں تو یہ (ان کے حق
میں) بہت اچھا اور بہت درست ہوتا، لیکن اللہ نے ان کے کفر
کی وجہ سے ان پر لعنت فرمادی تو صرف قلیل لوگ ایمان
لائیں گے۔

امام ابن جریر نے ابن زید سے روایت کیا ہے کہ وہ زبان موڑ کر راعنا کی جگہ راعن کہتے تھے اور راعن کے معنی خطا ہیں تو
وہ اس لفظ میں تحریف کر کے آپ کو خطا کرنے والا کہتے تھے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت فرمائی اور اس کا سدباب کرنے کے لیے
مسلمانوں کو راعنا کہنے سے منع فرمادیا۔

رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کے لیے شرعی حکم کی تحقیق

رسول اللہ ﷺ کی توہین کرنا بالاجماع کفر ہے اور توہین کرنے والا بالاتفاق واجب القتل ہے اور اس کی توبہ قبول کرنے میں
ائمہ مذاہب کے مختلف قول ہیں خواہ توہین کا تعلق آپ کی ذات کے ساتھ ہو یا آپ کے نسب کے ساتھ ہو۔ آپ کے دین کے
ساتھ ہو یا آپ کی کسی صفت کے ساتھ ہو اور یہ اہانت خواہ صراحتاً ہو یا کنایتاً ہو یا تعریضاً ہو یا تلویحاً ہو۔ اسی طرح کوئی شخص
آپ کو بددعا کرے، آپ پر لعنت کرے یا آپ کا برا چاہے، آپ کے عوارض بشریہ یا آپ کے متعلق اشیاء یا اشخاص کا آپ کی
طرف نسبت کرتے ہوئے بطریق طعن یا مذمت ذکر کرے۔ غرض جس شخص سے کوئی ایسا کام صادر ہو جس سے آپ کی اہانت
ظاہر ہو وہ کفر ہے اور اس کا قاتل واجب القتل ہے۔

قاضی عیاض لکھتے ہیں:

محمد بن سخون نے کہا ہے: علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ نبی ﷺ کی اہانت کرنے والا اور آپ کی تنقیص (آپ کی شان
میں کمی) کرنے والا کافر ہے اور اس پر عذاب الہی کی وعید جاری ہے اور امت کے نزدیک اس کا حکم قتل کرنا ہے، اور جو شخص اس
کے کفر اور عذاب میں شک کرے وہ بھی کافر ہے۔ (الشفاء ج ۲، ص ۱۹۰، مطبوعہ عبد التواب اکیڈمی، ملتان)

بعض فقہاء حنیفہ کا قول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والے کی توبہ قبول نہیں ہوگی، علامہ علائی لکھتے ہیں:

جو شخص کسی نبی کو گالی دینے سے کافر ہو گیا ہو اس کو بطور حد قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ مطلقاً قبول نہیں ہے (خواہ وہ خود
توبہ کرے یا اس کی توبہ پر گواہی ہو) اور اگر اس نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی تو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا حق
ہے اور نبی کو گالی دینا بندے کا حق ہے اور جو شخص اس کے عذاب اور کفر میں شک کرے گا وہ بھی کافر ہو جائے گا۔

(در مختار علی الرد، ج ۳، ص ۴۴۰، مطبع عثمانیہ استنبول)

علامہ شامی حنفی عدم قول توبہ کی تشریح کرتے ہیں:

کیونکہ حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ حکم دنیا کے ساتھ خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی
توبہ مقبول ہوگی، اسی طرح البحر الرائق میں ہے۔ (رد المحتار ج ۳، ص ۴۰۰، مطبوعہ مطبع عثمانیہ استنبول)

بعض فقہاء شافعیہ کا بھی یہی قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والے کی توبہ مطلقاً قبول نہیں ہے۔ علامہ عسقلانی
لکھتے ہیں:

علامہ ابن منذر نے نقل کیا ہے کہ اس بات پر اتفاق ہے کہ جس شخص نے نبی ﷺ کو صراحتاً گالی دی اس کو قتل کرنا واجب ہے، اور ائمہ شافعیہ میں سے علامہ ابو بکر فاسی نے کتاب الاجماع میں لکھا ہے کہ جس شخص نے نبی ﷺ کو قذف صریح کے ساتھ گالی دی اس کے کفر پر علماء کا اتفاق ہے، اگر وہ توبہ کرے گا تب بھی اس سے قتل ساقط نہیں ہوگا کیونکہ یہ حد قذف ہے اور حد قذف توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔ (فتح الباری ج ۱۲، ص ۲۸۱، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ، لاہور)

احناف اور شوافع کا ایک قول یہ ہے کہ جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو گالی دی اس کو قتل کیا جائے گا، خواہ اس نے توبہ کر لی ہو، امام مالک کی مشہور روایت اور حنابلہ کا مشہور مذہب بھی یہی ہے اور جمہور احناف اور شوافع کا مذہب ہے کہ توبہ کے بعد اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ جیسا کہ ہم عنقریب ذکر کریں گے۔
علامہ ابن قدامہ حنبلی لکھتے ہیں:

جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی وہ کافر ہو گیا خواہ مذاق سے، خواہ سنجیدگی سے اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ سے استہزاء کیا یا اس کی ذات سے یا اس کے رسولوں سے یا اس کی کتابوں سے وہ کافر ہو گیا۔

(المغنی ج ۹، ص ۳۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۰۵ھ)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اگر آپ ان سے پوچھیں تو یہ کہیں گے ہم تو صرف مذاق کر رہے تھے، آپ کہے کیا تم اللہ تعالیٰ، اس کی آیات اور اس کے رسول کا استہزاء کر رہے تھے؟ اب عذر نہ پیش کرو کیونکہ تم ایمان لانے کے بعد یقیناً کافر ہو چکے ہو۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ أَبَا لَلَّهِ وَ آيَاتِهِ وَ رَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ ۝ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ (التوبہ: ۶۶-۶۵)

مشہور آزاد محقق شیخ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

محمد بن سحنون فرماتے ہیں: علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ نبی ﷺ کو گالی دینے والا اور آپ کی تنقیص کرنے والا کافر ہے اور اس کے متعلق عذاب الہی کی وعید ہے اور امت کے نزدیک اس کا حکم قتل ہے اور جو شخص اس کے کفر اور اس کے عذاب میں شک کرے وہ بھی کافر ہے، اور اس مسئلہ میں تحقیق یہ ہے کہ نبی ﷺ کو گالی دینے والا کافر ہے اور اس کو بلا اتفاق قتل کیا جائے گا اور یہی ائمہ اربعہ وغیرہ کا مذہب ہے، اسحاق بن راہویہ وغیرہ نے اس اجماع کو بیان کیا ہے، اور اگر گالی دینے والا ذمی ہو تو امام مالک اور اہل مدینہ کے نزدیک اس کو بھی قتل کیا جائے گا اور عنقریب ہم اس کی عبارت نقل کریں گے۔ اور امام احمد اور محدثین کا بھی یہی مذہب ہے، امام احمد نے متعدد مقامات پر اس بات کی تصریح کی ہے، حنبلی کہتے ہیں: میں نے ابو عبد اللہ (امام احمد) سے سنا وہ فرماتے تھے جس شخص نے نبی ﷺ کو گالی دی یا آپ کی تنقیص کی خواہ مسلمان ہو یا کافر، اس کو قتل کرنا واجب ہے اور میری رائے یہ ہے کہ اس کو قتل کیا جائے اور اس کی توبہ نہ قبول کی جائے۔ (الصارم المسلول ص ۴، مطبوعہ نشر السنہ، بلقان)
قاضی عیاض مالکی لکھتے ہیں:

جان لو کہ امام مالک، ان کے اصحاب، سلف صالحین اور جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جس نے گالی دی اور اس کے بعد توبہ کر لی تو اس کو بطور حد قتل کیا جائے گا نہ بطور کفر، شیخ ابو الحسن قابسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جب کسی شخص نے آپ کو گالی دینے کا اقرار کیا اور اس کے بعد توبہ کر لی اور توبہ کا اظہار کر دیا تو اس کو گالی کے سبب سے قتل کیا جائے گا کیونکہ یہ اس کی حد ہے۔ ابو محمد بن ابی زید نے بھی یہی کہا ہے البتہ اس کی توبہ اس کو آخرت میں نفع دے گی اور وہ عند اللہ

تبیان القرآن

جلد چہارم

مومن قرار پائے گا۔ (الشفاء ج ۲، ص ۲۲۳-۲۲۲، مطبوعہ ملتان)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کو گالی دی ہو اس کی توبہ قبول نہ کرنا امام مالک کا مشہور مذہب ہے، اور امام احمد بن حنبل کا مشہور مذہب بھی یہی ہے اور ایک روایت ان سے یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی، لہذا ان کا مذہب امام مالک کی طرح ہے، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اس کا حکم مرتد کی طرح ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ مرتد کی توبہ قبول کی جاتی ہے جیسا کہ تصدق وغیرہ سے منقول ہے، جب رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والے کا یہ حکم ہے تو حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما یا ان میں سے کسی ایک کو گالی دینے والے کا حکم بطریق اولیٰ یہی ہو گا کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے۔

بہر حال یہ بات ظاہر ہو گئی کہ احناف اور شوافع کا مذہب یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور امام مالک سے بھی یہ ایک ضعیف روایت سے ثابت ہے۔ (رد المحتار ج ۳، ص ۴۰۱-۴۰۲، مطبوعہ مطبعہ عثمانیہ، استنبول)

خلاصہ یہ ہے کہ امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ گستاخ رسول کی (دنیاوی احکام میں) توبہ قبول نہیں ہوگی اور اس کو قتل کیا جائے گا اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی، اور امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور ایک قول یہ ہے کہ (دنیاوی احکام میں) اس کی توبہ قبول نہیں ہوگی اور اس کو ہر حال میں قتل کیا جائے گا۔

فقہاء اسلام کی عبارات کا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی گستاخی کرنے والا مرتد ہے اور واجب القتل ہے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ مرتد وہ شخص ہو گا جو پہلے مسلمان ہو، اگر کوئی غیر مسلم نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو اس کا کیا حکم ہے، سو اس کا حکم بھی یہ ہے کہ اس کو قتل کیا جائے گا اور گستاخی کا معنی یہ ہے کہ سیدنا محمد ﷺ یا انبیاء سابقین میں سے کسی نبی علیہ السلام کے متعلق ایسا لفظ بولے یا ایسا لفظ لکھے جو عرف میں توہین کے لیے متعین ہو تو ایسے شخص کو قتل کر دیا جائے گا خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ (انبیاء سابقین سے مراد وہ نبی ہیں، جن کی نبوت تمام سچے مذاہب میں مسلم ہو۔)

احادیث اور آثار میں غیر مسلم گستاخ رسول کو قتل کرنے کی تصریحات

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کعب بن اشرف کو کون قتل کرے گا؟ کیونکہ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دی ہے، حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس کو قتل کر دوں؟ آپ نے فرمایا ہاں! حضرت محمد بن مسلمہ، کعب کے پاس گئے اور کہا اس شخص نے یعنی نبی ﷺ نے ہمیں تھکا دیا ہے اور ہم سے صدقہ کا سوال کرتا رہتا ہے نیز کہا بہ خدا تم اس کو ضرور طلال میں ڈال دو گے، اور کہا ہم نے اس کی پیروی کی ہے اور اب ہم اس کو چھوڑنا پسند کرتے ہیں، حتیٰ کہ ہم جان لیں کہ آخر کار ماجرا کیا ہو گا، وہ اسی طرح کعب بن اشرف سے باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ موقع پا کر اس کو قتل کر دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۰۳، ۴۰۳۲، ۴۰۳۱، ۲۵۱۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۸۹۱، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۷۶۸)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک نابینا کی باندی ام ولد تھی۔ وہ نبی ﷺ کو برا کہتی تھی اور آپ کو سب و شتم کرتی تھی، وہ نابینا اس کو منع کرتے رہتے تھے اور وہ باز نہیں آتی تھی، ایک رات جب وہ نبی ﷺ کو سب و شتم کر رہی تھی انہوں نے آکر مغول (گیتی یا بھارو، میگان والی لاشی) لے کر اس کو اس کے پیٹ پر رکھ کر دیا۔ حتیٰ کہ اس کو قتل کر دیا اور اس کی ٹانگوں میں ایک بچہ آکر اس کے خون میں لتھڑ گیا، صبح کو لوگوں نے نبی ﷺ سے اس واقعہ کا ذکر کیا، آپ نے سب لوگوں

کو جمع کر کے فرمایا جس شخص نے بھی یہ کام کیا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ کھڑا ہو جائے وہ ٹائینالوگوں کو پھلانگتا ہوا آیا اور نبی ﷺ کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور کہا یا رسول اللہ! میں اس باندی کا مالک ہوں وہ آپ کو سب و شتم کرتی تھی اور برا کہتی تھی میں اس کو منع کرتا تھا لیکن وہ باز نہیں آتی تھی اور اس سے موتیوں کی مانند میرے دو بچے بھی ہوئے اور وہ میری رفیقہ تھی گزشتہ رات وہ پھر آپ کو سب و شتم کر رہی تھی اور برا کہہ رہی تھی میں نے اس کے پیٹ پر گھسیٹ کر اس کو دبایا حتیٰ کہ اس کو قتل کر دیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا سنو! گواہ ہو جاؤ کہ اس کا خون رائیگاں ہے۔ (یعنی اس کا کوئی قصاص یا تاوان نہیں ہوگا)

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۳۶۱، سنن نسائی رقم الحدیث: ۴۰۸۱، المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۱۹۸۵)

حضرت عرفہ بن الحارث کو مصر کا ایک نصرانی ملا جس کا نام مذقون تھا انہوں نے اس کو اسلام کی دعوت دی اس نصرانی نے نبی ﷺ کی شان میں گستاخی کی انہوں نے حضرت عمرو بن العاص کے پاس یہ معاملہ پیش کیا انہوں نے حضرت عرفہ سے کہا ہم ان سے عہد کر چکے ہیں حضرت عرفہ نے کہا ہم اس سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی ایذاء پر عہد کریں ہم نے ان سے صرف اس بات کا عہد کیا تھا کہ ہم ان کو ان کے گرجوں میں عبادت کرنے دیں گے اور اس بات کا عہد کیا تھا کہ ہم ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالیں گے اور اس بات کا عہد کیا تھا کہ ہم ان کی حفاظت کے لیے لڑیں گے اور اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ آپس میں اپنے مذہب کے مطابق عمل کریں گے، لیکن جب وہ ہمارے پاس آئیں گے تو ہم ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا تم نے سچ کہا۔

(المعجم الاوسط ج ۹، رقم الحدیث: ۸۷۴۳، مطبوعہ ریاض، سنن کبریٰ للسیحی ج ۹، ص ۲۰۰، المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۱۹۸۷)

حضرت عمیر بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ ان کی بہن مشرکہ تھی۔ جب وہ نبی ﷺ کے پاس جاتے تو وہ آپ کو سب و شتم کرتی اور آپ کو برا کہتی انہوں نے ایک دن اس کو تلوار سے قتل کر دیا اس کے بیٹے کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ہم کو معلوم ہے کہ اس کو کس نے قتل کیا ہے؟ کیا امن دینے کے باوجود اس کو قتل کیا گیا ہے، اور ان لوگوں کے ماں باپ مشرکہ تھے حضرت عمیر کو یہ خوف ہوا کہ یہ لوگ کسی اور بے قصور کو قتل کر دیں گے انہوں نے نبی ﷺ کے پاس جا کر اس واقعہ کی خبر دی۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے اپنی بہن کو قتل کیا تھا؟ میں نے کہا ہاں! آپ نے پوچھا کیوں؟ میں نے کہا یا رسول اللہ! وہ آپ کے متعلق مجھے ایذا پہنچاتی تھی نبی ﷺ نے اس کے بیٹوں کے پاس کسی کو بھیجا تو انہوں نے کسی اور کا نام لیا جو اس کا قاتل نہیں تھا نبی ﷺ نے اس کے خون کو رائیگاں قرار دیا۔ (المعجم الکبیر ج ۱، رقم الحدیث: ۱۲۳، ص ۶۵-۶۳، مطبوعہ بیروت)

حضرت علی بن ابی طالب بیان کرتے ہیں کہ ایک یہودیہ نبی ﷺ کو سب و شتم کرتی تھی۔ ایک شخص نے اس کا گلا گھونٹ دیا حتیٰ کہ وہ مر گئی نبی ﷺ نے اس کے خون کو رائیگاں قرار دیا۔ (السنن الکبریٰ ج ۹، ص ۲۰۰، طبع بیروت)

حصین بن عبدالرحمن بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر کے پاس ایک راہب کو لایا گیا اور بتایا گیا کہ نبی ﷺ کو سب و شتم کرتا ہے انہوں نے کہا اگر میں سنتا تو اس کو قتل کر دیتا، ہم نے ان کو اس لیے امان نہیں دی کہ نبی ﷺ کو سب و شتم کریں۔

(المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۱۹۸۶، طبع بیروت)

غیر مسلم گستاخ رسول کو قتل کرنے کے متعلق فقہاء مذاہب اربعہ کی تصریحات

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے کعب بن اشرف کو جو حیلہ سے قتل کیا تھا اس کے سبب اور اس کے جواب میں علماء کا اختلاف ہے امام المازری نے کہا انہوں نے اس کو حیلہ سے اس لیے قتل کیا تھا کہ اس نے نبی ﷺ سے کیے ہوئے معاہدہ کو توڑ

دیا تھا اور وہ آپ کی ججو کرتا تھا اور آپ کو سب و شتم کرتا تھا۔ اور اس نے آپ سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ آپ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کرے گا اور وہ آپ کے خلاف لڑنے والوں کے ساتھ شریک جنگ ہو۔

(صحیح مسلم بشرح النووی ج ۸، ص ۵۰۲، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، ریاض، ۱۴۱۷ھ)

علامہ موفق الدین عبد اللہ بن قدامہ مقدسی حنبلی متونی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں:

ذی سے کیا ہوا معاہدہ ختم ہو جاتا ہے خواہ اس کی شرط ہو یا نہ ہو، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مقدمہ آیا کہ کسی غیر مسلم نے کسی مسلمان عورت سے جبراً زنا کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم نے تم سے اس لیے صلح نہیں کی تھی اور اس کو بیت المقدس میں سولی پر لٹکایا گیا اور حضرت ابن عمر سے کہا گیا کہ ایک راہب نبی ﷺ کو سب و شتم کرتا ہے، انہوں نے کہا اگر میں سنتا تو اس کو قتل کر دیتا، ہم نے اس کو اس لیے امان نہیں دی تھی۔ (الکافی ج ۳، ص ۱۸۳، مطبوعہ بیروت)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن خلیفہ ابی مالکی متونی ۸۲۸ھ لکھتے ہیں:

جو شخص رسول اللہ ﷺ کو سب و شتم کرے اس کو قتل کرنا واجب ہے خواہ وہ غیر مسلم ذی ہو، اس میں امام ابو حنیفہ کا اختلاف ہے کیونکہ وہ اس صورت میں ذی کے قتل کو جائز نہیں کہتے۔

(اکمال الکمال المعلم ج ۶، ص ۳۳۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

جمہور فقہاء احناف کا مسلک یہ ہے کہ جو غیر مسلم ذی نبی ﷺ کو سب و شتم کرے اس کو قتل کرنا واجب ہے۔

امام شمس الدین محمد بن احمد سرخسی حنفی متونی ۳۸۳ھ لکھتے ہیں۔

اس طرح اگر کوئی عورت رسول اللہ ﷺ کو ظاہر سب و شتم کرتی ہو تو اس کو قتل کرنا جائز ہے کیونکہ ابو اسحق ہمدانی نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کہا یا رسول اللہ! میں نے ایک یہودی عورت کو سنا وہ آپ کو گالی دے رہی تھی اور بخدا یا رسول اللہ! وہ میرے ساتھ نیکی کرتی تھی لیکن میں نے اس کو قتل کر دیا تو نبی ﷺ نے اس کے خون کو رائیگاں قرار دیا۔ (شرح السیر الکبیر ج ۳، ص ۳۱۸-۳۱۷، مطبوعہ افغانستان، ۱۴۰۵ھ)

علامہ بدر الدین عینی حنفی لکھتے ہیں:

میں اس کے ساتھ ہوں جو یہ کہتا ہے کہ نبی ﷺ پر سب و شتم کرنے والے کو مطلقاً قتل کرنا جائز ہے۔

(عمدة القاری ج ۱۳، ص ۷۱، مطبوعہ ادارة البیباغۃ المنیریہ مصر، ۱۳۳۸ھ)

علامہ محمد بن علی بن محمد الحسکفی الحنفی المتونی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ جب کوئی شخص علی الاعلان نبی ﷺ کو سب و شتم کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ سیر ذخیرہ میں یہ تصریح ہے کہ امام محمد نے فرمایا جب کوئی عورت علی الاعلان نبی ﷺ کو سب و شتم کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ روایت ہے کہ حضرت عمر بن عدی نے سنا کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کو ایذا دیتی تھی انہوں نے رات میں اس کو قتل کر دیا تو نبی ﷺ نے ان کے اس فعل کی تعریف فرمائی۔

(الدر المختار علی حاشیہ رد المحتار ج ۳، ص ۲۸۰-۲۷۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۹ھ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین حنفی متونی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

جو شخص علی الاعلان نبی ﷺ کو سب و شتم کرے یا عداوت سب و شتم کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا خواہ وہ عورت ہو۔

(رد المحتار ج ۳، ص ۲۷۸، مطبوعہ بیروت، ۱۴۰۹ھ)

نبی ﷺ کی تعظیم و توقیر میں صحابہ کرام کا عمل

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا، اور نہ آپ سے بڑھ کر کوئی میری نگاہ میں بزرگ تھا اور آپ کے اجلال کی وجہ سے میں نگاہ بھر کر آپ کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اور اگر مجھ سے یہ سوال کیا جاتا کہ میں آپ کا حلیہ مبارک بیان کروں تو میں نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ میں نے آپ کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھا تھا۔

(صحیح مسلم ایمان، ۱۹۲، (۱۲۱) ۳۱۳، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب مہاجرین اور انصار کے پاس جایا کرتے تھے اور وہ بیٹھے ہوئے ہوتے تھے۔ ان میں حضرت ابو بکر اور عمر بھی ہوتے تھے، پس حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کے سوا کوئی آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا، وہ دونوں آپ کی طرف دیکھتے تھے اور آپ ان کی طرف دیکھتے تھے اور وہ آپ کی طرف دیکھ کر مسکراتے تھے اور آپ ان کی طرف دیکھ کر مسکراتے تھے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۶۸۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۳ھ)

حضرت اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صحابہ کرام آپ کے گرد اس طرح بیٹھے تھے جیسے ان کے سروں پر پرندے ہوں۔ (الحدیث) (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۵۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حجام رسول اللہ ﷺ کا سرمونڈ رہا تھا، اور صحابہ کرام نے آپ کو گھیرے میں لیا ہوا تھا اور جب بھی آپ کا کوئی بال مبارک گرتا تو وہ کسی نہ کسی صحابی کے ہاتھ میں ہوتا۔

(صحیح مسلم الروایا: ۷۵، (۲۳۲۵) ۵۹۲۹)

تضیہ حدیبیہ میں جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان کو مکہ میں مشرکین کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تو قریش نے حضرت عثمان سے کہا تم کعبہ کا طواف کر لو، تو حضرت عثمان نے کہا میں اس وقت تک کعبہ کا طواف نہیں کروں گا جب تک کہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کا طواف نہ کر لیں۔ (دلائل النبوة ج ۲، ص ۱۳۵-۱۳۳)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ سے کوئی بات پوچھنا چاہتا تھا لیکن آپ کی ہیبت کی وجہ سے اس کو برسوں ٹالتا رہا۔ (الشفاء ج ۲، ص ۳۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

وفات کے بعد بھی نبی ﷺ کی تعظیم و تکریم

قاضی عیاض ابو الفضل عیاض بن موسیٰ متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

وفات کے بعد بھی نبی ﷺ کی توقیر اور تعظیم لازم ہے، جس طرح آپ کی حیات میں لازم تھی اور اس کا موقع وہ ہے جب رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا جائے، آپ کی حدیث کا ذکر کیا جائے اور آپ کی سنت کا ذکر کیا جائے اور آپ کا نام مبارک اور آپ کی سیرت طیبہ کا سماع کیا جائے اور آپ کی آل اور عترت کے ساتھ کوئی معاملہ کیا جائے، اور آپ کے اہل بیت اور آپ کے اصحاب کی تعظیم کی جائے۔

ابو ابراہیم تعجبی نے کہا ہر مومن پر واجب ہے کہ جب وہ آپ کا ذکر کرے یا اس کے سامنے آپ کا ذکر کیا جائے تو وہ خضوع اور خشوع کی حالت میں ہو اور اس کی حرکات اور سکنات سے وقار ظاہر ہو اور اس پر اسی طرح ہیبت طاری ہو جیسے وہ آپ کے سامنے مودب کھڑا ہے۔

امیر المؤمنین ابو جعفر نے امام مالک سے رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں مناظرہ کیا، امام مالک نے ان سے کہا امیر المؤمنین! آپ اس مسجد میں اپنی آواز اونچی نہ کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ ادب سکھایا ہے کہ تم نبی کی آواز پر اپنی آوازوں کو

اونچانہ کرو، اور نہ آپ کے سامنے اس طرح بلند آواز سے بولو جس طرح تم آپس میں بلند آواز سے بولتے ہو، (ایسا نہ ہو کہ) تمہارے تمام اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں پتا بھی نہ چلے۔ (الحجرات: ۳)

اور اللہ تعالیٰ نے اس قوم کی مذمت کی جو آپ کو حجروں سے باہر سے پکار کر بلاتی تھی اور ان کو بے عقل فرمایا اور آپ کا احترام اب بھی اسی طرح ہے جس طرح زندگی میں آپ کا احترام تھا۔

خليفة ابو جعفر نے امام مالک کی بات کو تسلیم کر لیا اور پوچھا: جب میں رسول اللہ ﷺ کے مواجہہ شریف میں کھڑا ہو کر دعا کروں تو آپ کی طرف منہ کروں یا قبلہ کی طرف منہ کروں؟ امام مالک نے کہا آپ رسول اللہ ﷺ سے اپنا رخ کیوں پھیرتے ہیں حالانکہ حضور ﷺ آپ کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ ہیں، بلکہ آپ رسول اللہ ﷺ کی طرف منہ کیجئے اور آپ سے شفاعت طلب کیجئے، اللہ تعالیٰ آپ کے حق میں شفاعت کو قبول فرمائے گا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور اگر وہ کبھی اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے تو وہ آپ کے پاس آجاتے، پھر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور رسول (بھی) ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کرتے تو وہ ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا بہت مہربان پاتے۔ (النساء: ۶۴)

مصعب بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ امام مالک کے سامنے جب رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا جاتا تو ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا، اور وہ اسی وقت جھک جاتے، جب امام مالک سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے کہا محمد بن المنکدر سید القراء تھے ہم جب ان سے کسی حدیث کے متعلق پوچھتے تو ان پر اس قدر گریہ طاری ہوتا کہ ہم ان کے لیے رحم کی دعا کرتے اور میں نے حضرت جعفر بن محمد الصادق کو دیکھا وہ بہت ہنس مکھ اور پر مزاح شخص تھے لیکن جب ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا جاتا تو ان کا چہرہ زرد پڑ جاتا اور میں نے ان کو کبھی بغیر وضو کے رسول اللہ ﷺ کی احادیث بیان کرتے ہوئے نہیں دیکھا، پھر امام مالک نے بیان کیا کہ.....

عبدالرحمن بن قاسم نبی ﷺ کا ذکر کرتے تو ان کے رنگ کی طرف دیکھا جاتا، لگتا تھا کہ ان کا خون نچوڑ لیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی ہیبت سے ان کی زبان خشک ہو گئی ہے، اور عامر بن عبد اللہ بن الزبیر کے سامنے جب رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا جاتا تو وہ اس قدر روتے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو ختم ہو جاتے، اور زہری بہت خوش مزاج اور ملنسار شخص تھے لیکن جب ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا جاتا تو لگتا تھا کہ وہ اپنے مخاطب کو بالکل نہیں پہچانتے، یعنی رسول اللہ ﷺ کے تصور میں اس طرح مستغرق ہو جاتے کہ گرد و پیش سے بیگانہ اور بے خبر ہو جاتے۔ صفوان بن سلیم بہت بڑے عابد اور زبردست مجتہد تھے ان کے سامنے جب رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا جاتا تو وہ اس قدر روتے کہ لوگ ان کے پاس سے اٹھ کر چلے جاتے، اور ابن سیرین ہنستے رہتے تھے اور جب ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی حدیث ذکر کی جاتی تو ان پر خشوع طاری ہو جاتا، اور عبدالرحمان بن مدی جب نبی ﷺ کی حدیث پڑھتے تو لوگوں کو خاموش رہنے کا حکم دیتے اور یہ آیت پڑھتے لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النسبی (الحجرات: ۲) اور اس کی یہ تاویل کرتے کہ جس طرح نبی ﷺ کے بات کرتے وقت خاموش ہونا ضروری ہے اسی طرح اس وقت خاموش ہونا ضروری ہے، جب آپ کی حدیث پڑھی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا ادب اور احترام

ابراہیم بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ امام مالک بن انس، امام ابو حازم کی مجلس کے پاس سے گزرے وہ اس وقت حدیث بیان کر رہے تھے، امام مالک وہاں سے چلے گئے اور کہا میرے بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی اور میں نے کھڑے ہو کر رسول اللہ ﷺ کی حدیث کو سننا پسند کیا۔

امام مالک بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے ابن المسیب سے ایک حدیث پوچھی وہ اس وقت لیٹے ہوئے تھے، وہ اٹھ کر بیٹھ گئے پھر حدیث بیان کی اور کہا میں نے اس کو ناپسند کیا کہ میں لیٹ کر رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کروں۔
ابو مصعب بیان کرتے ہیں کہ امام مالک بن انس ہمیشہ با وضو رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کرتے تھے۔
مصعب بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ امام مالک بن انس جب حدیث بیان کرتے تو وضو کرتے، تیار ہوتے، عمدہ لباس پہنتے، پھر حدیث بیان کرتے۔ ابن ابی اویس نے کہا کہ امام مالک راستہ میں یا کھڑے ہوئے یا جلدی کے وقت حدیث بیان کرنا ناپسند کرتے تھے۔

عبد اللہ بن المبارک نے کہا میں امام مالک کے پاس تھا، وہ ہم کو حدیث بیان کر رہے تھے، ان کو بچھو نے سولہ مرتبہ ڈنک مارا، ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو کر زرد پڑ گیا لیکن انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث منقطع نہیں کی۔ جب مجلس ختم ہو گئی تو لوگوں نے آپ کے چہرے کے تغیر کا سبب پوچھا، امام مالک نے فرمایا ہاں! مجھے سولہ مرتبہ بچھو نے ڈنک مارا اور میں صبر کرتا رہا اور میرا صبر صرف رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے احترام کی وجہ سے تھا۔

عبد اللہ بن صالح نے کہا امام مالک اور لیث بغیر وضو کے حدیث نہیں لکھتے تھے، اور قتادہ کہتے تھے کہ مستحب یہ ہے کہ بغیر وضو کے نبی ﷺ کی احادیث نہ پڑھی جائیں، اور اعمش جب بے وضو ہوتے اور حدیث بیان کرنے کا ارادہ کرتے تو شیم کر لیا کرتے تھے۔ (الشفاء ج ۲، ص ۳۹-۳۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

رسول اللہ ﷺ کا ادب قرآن مجید کے عمل پر مقدم ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سو جو لوگ اس (نبی) پر ایمان لائے اور اس کی تعظیم کی اور اس کی نصرت اور حمایت کی اور اس نور کی پیروی کی جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ (الاعراف: ۱۵۷)

اس آیت میں دو چیزیں بتائی گئی ہیں، ایک نبی ﷺ کی تعظیم و توقیر، جس پر ہم نے سیر حاصل گفتگو کر لی ہے، اور دوسری چیز یہ ہے کہ نبی ﷺ کی تعظیم کو اللہ تعالیٰ نے اتباع قرآن پر مقدم فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نبی ﷺ کی تعظیم کو قرآن مجید کے عمل پر مقدم رکھتے تھے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ (النساء: ۲۹)

وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ

(البقرہ: ۱۹۵)

اس کے باوجود حضرت ابو بکر نے غار ثور میں سانپوں کے بل پر اپنا پیر رکھ دیا، سانپ ڈنک مارتے رہے لیکن ابو بکر نے اپنا پیر نہیں ہٹایا۔ محب طبری ابو جعفر احمد متوفی ۶۹۳ھ بیان کرتے ہیں:

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے غار ثور میں پہنچے، پھر کہا آپ پہلے غار میں داخل نہ ہوں جب تک کہ اس میں، میں داخل نہ ہو جاؤں، اگر اس میں کوئی مضر چیز ہے تو آپ سے پہلے مجھے ضرر لاحق ہو۔ وہ غار میں گئے تو انہیں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کو غار میں لے گئے اور غار میں جگہ جگہ سوراخ تھے۔ انہوں نے اپنی قمیص پھاڑ کر اس کی دھجیاں ان سوراخوں میں بھر دیں اور ایک سوراخ باقی رہ گیا۔ حضرت ابو بکر کو یہ خوف ہوا کہ کوئی سانپ نکل کر رسول اللہ ﷺ کو

ایذا نہ پہنچائے تو انہوں نے باقی ماندہ سوراخ پر اپنا پیر رکھ دیا، وہ سانپ حضرت ابو بکر کو ڈنک مار رہا تھا اور حضرت ابو بکر کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ (الریاض النفرۃ فی مناقب العشرہ ج ۱، ص ۱۰۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

علامہ احمد بن محمد القسطلانی متوفی ۹۲۳ھ نے یہ واقعہ اس طرح لکھا ہے:

حضرت ابو بکر غار میں رسول اللہ ﷺ سے پہلے داخل ہوئے تاکہ کسی ناگمانی افتاد کو خود پر ڈالیں اور رسول اللہ ﷺ محفوظ رہیں۔ انہوں نے غار میں ایک سوراخ دیکھا تو اس میں اپنی ایڑی داخل کر دی تاکہ اس میں سے کوئی چیز نکل کر رسول اللہ ﷺ کو ایذا نہ پہنچائے، پھر سانپ ان کو ڈنک مارتا رہا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے، اور ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ داخل ہوئے اور حضرت ابو بکر کی گود میں سر رکھ کر سو گئے۔ اس سوراخ سے حضرت ابو بکر کو ڈنک مارا گیا اور انہوں نے بالکل حرکت نہیں کی، لیکن ان کے آنسو رسول اللہ ﷺ کے چہرے پر گرے۔ آپ نے پوچھا اے ابو بکر کیا ہوا؟ انہوں نے کہا آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں، مجھے ڈنک مارا گیا ہے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے اپنا لعاب دہن لگایا تو حضرت ابو بکر کی تکلیف جاتی رہی۔ (المواہب اللدنیہ ج ۱، ص ۱۳۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۶ھ)

علامہ علی بن برہان الدین العلبی المتوفی ۱۰۴۳ھ نے بھی یہ واقعہ اسی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس میں بھی رسول اللہ ﷺ کے لعاب دہن لگانے کی تصریح ہے۔ (انسان العیون ج ۲، ص ۲۰۵، مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البیابی واولادہ عصر)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

غار کی رات حضرت ابو بکر نے کہا یا رسول اللہ! آپ پہلے مجھے داخل ہونے دیجئے، حضرت ابو بکر غار میں داخل ہوئے اور غار کی دیواروں میں ہاتھ لگا کر دیکھتے رہے اور جہاں سوراخ دیکھتے اپنی قمیص پھاڑ کر اس سوراخ کو بند کر دیتے حتیٰ کہ ان کی پوری قمیص پھٹ گئی اور ایک سوراخ رہ گیا اس میں انہوں نے اپنی ایڑی رکھ دی اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میرے انور سر رکھ کر آرام فرمائیں، سانپ اور بچھو حضرت ابو بکر کو ڈنک مارتے رہے اور انہوں نے بالکل جنبش نہیں کی مبادا حضور بیدار ہو جائیں، لیکن ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اور جب یہ آنسو حضور کے چہرے پر گرے تو آپ بیدار ہو گئے اور فرمایا اے ابو بکر غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ (مدارج النبوت ج ۲، ص ۵۸، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر ۱۹۷۷ء)

علامہ محمد بن یوسف شامی متوفی ۹۲۲ھ نے بھی امام بیہقی اور امام ابی شیبہ کے حوالے سے یہ واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

(سبل الہدی والرشاد ج ۳، ص ۲۳۰)

حافظ اسماعیل بن عمر بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ نے بھی اختصار کے ساتھ یہ واقعہ بیان کیا ہے اور علامہ ابن جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے بھی اختصار کے ساتھ یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

(البدایہ والنہایہ ج ۳، ص ۱۹۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، المنتظم ج ۲، ص ۶۲۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

اور اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

حَافِظُوا عَلٰی الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ
الْوَسْطٰی (البقرہ: ۲۳۸)

اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ عصر کی نماز کی پابندی کا حکم فرمایا ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کی نیند کی خاطر عصر کی نماز ترک کر دی۔

امام ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی متوفی ۳۲۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت اسماء بنت عمیس روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف وحی کی جا رہی تھی اور آپ کا سر حضرت علی بن ابی طالب کی گود میں تھا۔ حضرت علی نے عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی کہ سورج غروب ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے علی تم نے نماز پڑھ لی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، تب رسول اللہ ﷺ نے دعا کی: اے اللہ! یہ تیری اور تیرے رسول کی اطاعت میں تھا، اس پر سورج کو لوٹادے۔ حضرت اسماء کہتی ہیں: میں نے دیکھا کہ سورج غروب ہو گیا تھا، پھر میں نے اس کو غروب کے بعد طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔ (مشکل الآثار ج ۴، رقم الحدیث: ۳۸۵۰، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے مقام صہبہ میں ظہر کی نماز پڑھی، پھر آپ نے حضرت علی کو کسی کام سے بھیجا وہ واپس آگئے، اس اثناء میں نبی ﷺ (عصر کی) نماز پڑھ چکے تھے، نبی ﷺ نے حضرت علی کی گود میں سر رکھا، پھر آپ نے کوئی حرکت نہیں کی حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا، تب نبی ﷺ نے دعا کی: ”بے شک تیرے بندے علی نے اپنے نفس کو تیرے نبی پر روک لیا تھا، سو اس پر سورج کی روشنی لوٹادے“۔ حضرت اسماء کہتی ہیں سورج طلوع ہو گیا حتیٰ کہ اس کی روشنی پہاڑوں اور زمین پر واقع ہوئی۔ پھر حضرت علی اٹھے انہوں نے وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھ لی پھر سورج غائب ہو گیا۔ یہ واقعہ صہبہ میں ہوا تھا۔ (مشکل الآثار ج ۴، رقم الحدیث: ۳۸۵۱)

اس کی تیسری مثال قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ
فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ
وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى
الكَعْبَيْنِ (المائدہ: ۶)

اے ایمان والو! جب (تمہارا) نماز کے لیے کھڑے (ہونے کا) ارادہ ہو، (اور تمہارا وضو نہ ہو) تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پیروں کو کعبوں سمیت دھو لو۔

اس آیت کی رو سے بغیر وضو کے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے حالانکہ ایک سفر کے موقع پر جو مسلمان حضرت عائشہ کا ہاں ڈھونڈنے گئے ہوئے تھے، انہوں نے پانی نہ ہونے کی وجہ سے بغیر وضو کے نماز پڑھ لی۔

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسی سفر میں گئے، جب ہم مقام بیداء یا ذات البیش میں پہنچے تو میرا ہار ٹوٹ گیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کو ڈھونڈنے کے لیے قافلہ کو ٹھہرا دیا، اور لوگ بھی آپ کے ساتھ ٹھہر گئے۔ اس جگہ پانی تھا نہ لوگوں کے پاس پانی تھا، تب لوگ حضرت ابو بکر کے پاس آکر کہنے لگے، کیا آپ حضرت عائشہ کے کارنامے کو نہیں دیکھ رہے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور لوگوں کو ٹھہرایا اور اس جگہ نہ پانی ہے نہ لوگوں کے پاس پانی ہے، تب ابو بکر آئے اور اس وقت رسول اللہ ﷺ میرے زانو پر سر رکھے ہوئے سو رہے تھے، حضرت ابو بکر نے کہا تم نے رسول اللہ ﷺ اور لوگوں کو ٹھہرایا اور اس جگہ پانی ہے نہ لوگوں کے پاس پانی ہے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں: پس حضرت ابو بکر مجھے ڈانٹتے رہے اور جو اللہ نے چاہا وہ کہتے رہے، اور وہ اپنے ہاتھ سے میری کوکھ کو مزوڑ رہے تھے۔ اور چونکہ رسول اللہ ﷺ کا سر میرے زانو پر تھا اس لیے میں ہل نہیں سکتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ سوتے رہے حتیٰ کہ بغیر پانی کے صبح ہو گئی، تب اللہ تعالیٰ نے تیمم کی آیت نازل کی اور مسلمانوں نے تیمم کر لیا۔ اس وقت حضرت اسید بن حضیر نے کہا اے آل ابی بکر یہ کوئی تمہاری پہلی برکت تو نہیں ہے! حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا جس پر میں سوار تھی تو ہمیں اس کے نیچے سے ہار مل گیا۔

(صحیح مسلم کتاب البیض ۱۰۸ (۳۶۷) ۷۹۳، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۰)

نیز امام مسلم روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انہوں نے حضرت اسماء سے عاریتہ ہار لیا، وہ ان سے گم ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب میں سے کچھ لوگوں کو اسے ڈھونڈنے کے لیے بھیجا، پھر صبح کی نماز کا وقت آ گیا تو انہوں نے بغیر وضو کے نماز پڑھ لی اور جب وہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے اس کی شکایت کی، تب اللہ تعالیٰ نے تیمم کی آیت نازل کر دی، اس وقت اسید بن حضیر نے (حضرت عائشہ سے) کہا اللہ آپ کو جزائے خیر دے، جب بھی آپ پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے اس سے نجات کی راہ پیدا کر دی اور مسلمانوں کے لیے اس میں برکت رکھ دی۔

(صحیح مسلم کتاب الحيض ۱۰۹ (۳۶۷) ۷۹۵، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۱۶۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۵۱۸)

قرآن مجید نے جان کو ہلاکت میں ڈالنے سے منع فرمایا ہے اور حضرت ابو بکر نے رسول اللہ ﷺ کے ادب و احترام کی خاطر سانپ اور بچھو کے بل پر اپنی ایزی رکھ کر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال دیا، اور قرآن مجید نے خصوصاً عصر کی نماز کی حفاظت کا حکم دیا اور حضرت علی نے رسول اللہ ﷺ کے ادب اور احترام کی خاطر عصر کی نماز ترک کر دی اور آپ کو نیند سے بیدار نہیں کیا، اور قرآن مجید نے نماز کے لیے وضو کو فرض قرار دیا ہے اس کے باوجود بعض مسلمانوں نے اس موقع پر صبح کی نماز بے وضو پڑھ لی ان حدیثوں سے واضح ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا ادب اور احترام مقدم ہے اور قرآن مجید پر عمل موخر ہے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ

(اے رسول مکرم!) آپ کہیے، اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جس کی ملک میں تمام

مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَمِنُوا

آسمان اور زمینیں ہیں، اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے، سو تم اللہ پر

بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَ

ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر جو نبی امی لقب میں جو اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتے ہیں، اور

اتَّبِعُوا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۸﴾ وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٍ يَهْدُونَ

تم سب ان کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔ ○ اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے وہ لوگ حق کے ساتھ

بِالْحَقِّ وَيَبْغِدُونَ ﴿۱۵۹﴾ وَقَطَعْنَاهُمْ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ أَسْبَاطًا

ہدایت دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ عدل کرتے ہیں ○ اور ہم نے ان (بنو اسرائیل) کو بارہ قبیلوں میں گروہ در گروہ تقسیم

أُمَّةً وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمَهُ أَنْ اضْرِبْ

کر دیا جب موسیٰ کی قوم نے ان سے پانی طلب کیا تو ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ اس پتھر پر اپنا

يَعْصَاكَ الْحَجَرَ فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ

عصا مارو تو اس سے بارہ چٹے پھوٹ نکلے ، ہر گروہ نے اپنے پانی پینے

أَنَابِسٍ مِّمَّ شَرِبْتُمْ وَظَلَّلْنَا عَلَيْمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّانَ وَ

کی جگہ جان لی اور ہم نے ان پر بادل کا سایہ کر دیا اور ہم نے ان پر من و سلوی نازل

السَّلْوَى طُكُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَكِنْ كَانُوا

کیا ، ان پاک چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں ، اور انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی

أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١٦١﴾ وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُوا هَذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا

جانوں پر ظلم کرتے تھے ۰ اور جب ان سے کہا گیا کہ اس شہر میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے

مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ

جہاں سے چاہو کھاؤ اور حطہ (معاف کرنا) کہتے جاؤ اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا ، ہم تمہاری

لَكُمْ خَطِيئَتِكُمْ سَتَرْتُهَا بِظُهُورِكُمْ سَتَرْتُهَا بِظُهُورِكُمْ ﴿١٦٢﴾ قِيلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا

خطائیں بخش دیں گے اور عنقریب نیلو کاروں کو مزید اجر عطا کریں گے ۰ اور ان میں سے ظلم کرنے والوں نے اس بات

مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ رِجَالًا مِنْ

کو اس کے خلاف سے بدل دیا جو ان سے کہی گئی تھی تو ہم نے ان پر آسمان سے عذاب

السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿١٦٣﴾

بھیجا کیوں کہ وہ ظلم کرتے تھے ۰

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے رسول مکرّم!) آپ کہئے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں جس کی ملکیت میں تمام آسمان اور زمینیں ہیں اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے، سو تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر جو امی لقب ہیں، جو اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتے ہیں اور تم سب ان کی پیروی کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ (الاعراف: ۱۵۸)

سیدنا محمد ﷺ کی رسالت کے عموم اور شمول پر قرآن مجید کی آیات

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ میں دنیا اور آخرت کی بھلائی ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو اس نبی امی

لقب کی پیروی کریں گے جن کو یہ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جس رسول کی اتباع کرنے کا ہم نے حکم دیا ہے ان کی رسالت کی دعوت قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے ہے۔

اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ سیدنا محمد ﷺ کی رسالت تمام مخلوق کے لیے ہے اور تمام مخلوق آپ کی رسالت پر ایمان لانے کی مکلف ہے۔ نبی ﷺ کی بعثت کے عموم اور شمول پر درج ذیل آیات بھی دلیل ہیں:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا
وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (سبا: ۲۸)

(اے رسول مکرّم!) ہم نے آپ کو (قیامت تک کے) تمام لوگوں کے لیے ہی خوشخبری سنانے والا اور (عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ
لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا (الفرقان: ۱)

وہ بڑی برکت والا ہے جس نے فیصلہ کرنے والی کتاب اپنے (مکرّم) بند سے پر نازل کی تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے (اللہ کے عذاب سے) ڈرانے والا ہو۔

وَأَوْحَىٰ إِلَيْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ لِأَنذِرْكُمْ بِهِ وَمَن بَلَغَ
(الانعام: ۱۹)

اور میری طرف اس قرآن کی وحی کی گئی ہے تاکہ میں تم کو اس کے ساتھ ڈراؤں اور ان لوگوں کو جن تک یہ (قرآن) پہنچے۔

سیدنا محمد ﷺ کی رسالت کے عموم اور شمول پر احادیث

حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ایسی پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں، ہر نبی کو اپنی مخصوص قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور مجھے ہر سرخ اور سیاہ کی طرف مبعوث کیا گیا ہے، اور میرے لیے غنیمتیں حلال کر دی گئی ہیں اور مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کی گئی تھیں، اور میرے لیے تمام روئے زمین پاکیزہ اور پاک کرنے والی اور مسجد بنا دی گئی ہے، پس جو شخص جس جگہ بھی نماز کا وقت پائے وہیں نماز پڑھ لے، اور ایک ماہ کی مسافت سے میرا رعب طاری کر دیا گیا ہے، اور مجھے شفاعت عطا کی گئی ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۵، صحیح مسلم المساجد ۳ (۵۲۰) ۱۱۳۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۶، سنن احمد ج ۳، ص ۲۰۳، مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: ۱۱۳۵، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۳۲۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے انبیاء پر چھ وجوہ سے فضیلت دی گئی ہے مجھے جو ام الکلم (جامع مانع کلام) عطا کیے گئے ہیں اور میری رعب سے مدد کی گئی ہے اور میرے لیے غنیمتیں حلال کر دی گئی ہیں اور میرے لیے تمام روئے زمین کو پاک کرنے والی (تیمم کا مادہ یا آلہ) اور مسجد بنا دیا گیا ہے اور مجھے تمام مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا اور مجھ پر انبیاء کے آنے کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔

(صحیح مسلم المساجد ۵ (۵۲۳۰) ۱۱۳۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۶۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۵۶۷، مسند احمد ج ۲، ص ۲۳۲، ۲۵۰، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۳۳۰)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے انبیاء میں سے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ میرے لیے تمام روئے زمین پاک کرنے والی (آلہ تیمم) اور مسجد بنا دی گئی، اور پہلے انبیاء میں سے کوئی نبی اپنی محراب (مسجد) کے بغیر کسی اور جگہ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ ایک ماہ کی مسافت کے رعب سے میری مدد کی

گئی ہے، جب میرے سامنے مشرکین آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں میرا رعب قائم کر دیتا ہے، اور پہلے نبی کو اس کی مخصوص قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور مجھے تمام جنات اور انسانوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے، اور پہلے انبیاء خمس (مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ) کو الگ کر دیتے تھے، پھر آگ آکر اس کو کھا جاتی تھی اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس خمس کو اپنی امت کے فقراء میں تقسیم کر دوں، اور ہر نبی کو ایک شفاعت عطا کی گئی ہے (صحیح مسلم میں ہے ہر نبی نے اس شفاعت کو دنیا میں خرچ کر لیا) اور میں نے اس شفاعت کو اپنی امت کے لیے موخر کر لیا ہے۔ (مسند البرزازی رقم الحدیث: ۲۴۴۱)

حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے انبیاء پر پانچ وجوہ سے فضیلت دی گئی ہے۔ مجھے تمام لوگوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، اور میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے لیے ذخیرہ کر لیا ہے، اور ایک ماہ کی مسافت کے رعب سے میری مدد کی گئی ہے اور میرے لیے تمام روئے زمین کو پاک کرنے والی اور مسجد بنا دیا گیا ہے اور میرے لیے غنیمتوں کو حلال کر دیا گیا ہے اور وہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں تھیں۔ (المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۶۶۷۴)

وہ معجزات جو سیدنا محمد ﷺ کی ذات مبارکہ میں ہیں اور جو آپ سے صادر ہوئے

نیز اس آیت میں فرمایا سو تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر جو امی لقب ہیں جو اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا (اے محمد!) آپ کہئے: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، اور رسالت بغیر معجزہ کے ثابت نہیں ہوتی اور آپ کے معجزات دو طرح کے ہیں ایک تو آپ کی ذات خود معجزہ ہے اور دوسرے وہ معجزات جو آپ سے صادر ہوئے، آپ کی ذات خود معجزہ ہے اس کا اشارہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے امی ہونے سے فرمایا اور یہ آپ کا بہت بڑا معجزہ ہے، کیونکہ آپ کسی مدرسہ میں نہیں گئے، کسی استاد سے تعلیم نہیں حاصل کی اور نہ علماء میں سے کسی کے ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوا کیونکہ مکہ مکرمہ علماء کا شہر نہیں تھا اور نہ کبھی رسول اللہ ﷺ زیادہ عرصہ کے لیے مکہ سے باہر گئے تاکہ یہ کہا جاسکے کہ اس عرصہ میں آپ نے کسی سے علم حاصل کر لیا ہو، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ کے سینہ میں علوم و معارف کے دریا موجزن کر دیے۔ پھر آپ پر اس قرآن مجید کو نازل کیا جس میں اولین و آخرین کے علوم ہیں تو باوجود آپ کے امی ہونے کے ان عظیم علوم و معارف کو بیان کرنا آپ کا زبردست معجزہ ہے۔

آپ کا امی ہونا بھی آپ کی ذات میں معجزہ ہے، آپ کے سر کے بال فتح و کامرانی کی ضمانت ہیں، آپ اپنے کانوں سے قریب و دور کی آوازیں سنتے تھے، جنات اور ملائکہ اور خود خالق کائنات کا کلام سنتے تھے، آپ اپنی آنکھوں سے روشنی اور اندھیرے میں، قریب اور دور یکساں دیکھتے تھے، جنات اور فرشتوں کو دیکھا، خود رب کائنات کو دیکھا، آپ اپنی زبان سے جو کہتے تھے وہ ہو جاتا تھا، آپ کے لعاب مبارک میں برکت اور شفا تھی، آپ اپنے ہاتھوں سے زمینوں اور آسمانوں پر یکساں تصرف کرتے تھے، اور زمین و آسمان آپ کے قدموں کی زد میں تھے۔ غرضیکہ آپ کے جسم مبارک کا ہر عضو معجزہ تھا۔

آپ کے صدق، آپ کی دیانت، آپ کی امانت، آپ کی عدالت اور آپ کی شجاعت اور سخاوت کا دور و نزدیک چرچا تھا۔ آپ کو الصادق الامین کہا جاتا تھا۔ یہ آپ کی ذات کا اعجاز تھا کہ جب آپ نے اعلان نبوت کیا تو حضرت خدیجہ الکبریٰ، حضرت صدیق اکبر، اور حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت زید بن حارثہ کسی دلیل کو طلب کیے بغیر آپ پر ایمان لے آئے۔

اور جو معجزات آپ سے صادر ہوئے وہ بہت زیادہ ہیں مثلاً چاند کا شق ہونا، ڈوبے ہوئے سورج کا نکل آنا، آپ کی انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا، اور آپ کی نبوت پر سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے نہ

کوئی اس کی مثال لا سکتا ہے اور علوم و فنون کی وسعت اور مخالفین کی کثرت کے باوجود کوئی شخص قرآن مجید کے اس دعویٰ کو جھٹلا نہیں سکا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جو اللہ پر اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کلمات سے مراد اللہ تعالیٰ کی کتابیں تورات، انجیل اور قرآن ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے، وہ لوگ حق کے ساتھ ہدایت دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔ (الاعراف: ۱۵۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کے نیک لوگوں کا مصداق

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ اس (عظیم) رسول نبی امی پر ایمان لانا تمام لوگوں پر واجب ہے، اب اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں بھی ایک ایسا گروہ تھا جو حق کے ساتھ ہدایت دیتا تھا اور حق کے ساتھ عدل کرتا تھا۔ اس گروہ کا مصداق کون ہے۔ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں:

یہ قوم چین کے پار رہتی ہے، یہ لوگ حق اور عدل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، یہ لوگ سیدنا محمد ﷺ پر ایمان لائے، انہوں نے ہفتہ کے دن شکار کرنے کو ترک کر دیا، یہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، ان کا کوئی آدمی ہم تک پہنچ سکتا ہے نہ ہمارا کوئی آدمی ان تک پہنچ سکتا ہے۔ روایت میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اختلاف ہوا تو ان میں سے ایک گروہ حق کے ساتھ ہدایت دیتا تھا، اور وہ اس پر قادر نہیں تھے کہ بنو اسرائیل کے درمیان رہ سکتے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مخلوق سے دور زمین کے ایک کونے میں پہنچا دیا، ان کے لیے زمین میں ایک سرنگ بنا دی۔ وہ ۲۱ سال میں ڈیڑھ سال تک چلتے رہے حتیٰ کہ وہ چین کے پار پہنچ گئے۔ اور وہ اب تک وہاں دین حق پر قائم ہیں اور لوگوں اور ان کے درمیان ایک سمندر ہے جس کی وجہ سے لوگ ان تک نہیں پہنچ سکتے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۲۷۱، جامع البیان جز ۹، ص ۱۱۸، زاد المسیر ج ۳، ص ۲۷۳، معالم التنزیل ج ۲، ص ۱۷۳،

الدر المنثور ج ۳، ص ۵۸۵، روح المعانی جز ۹، ص ۸۳)

لیکن محققین نے اس تفسیر کو رد کر دیا ہے کیونکہ عادتاً ایسا ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ہو اور دنیا اس سے ناواقف ہو، جب کہ ذرائع ابلاغ اور آمد و رفت کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔

اس آیت کی دوسری تفسیر یہ کی گئی ہے کہ ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کے زمانہ میں یہودیوں کا ایک گروہ تھا جو دین حق پر قائم تھا اور وہ لوگ ہمارے نبی ﷺ پر ایمان لے آئے تھے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب، اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ تو بہت کم ہیں اور قرآن نے ان کو امت سے تعبیر فرمایا جو ان کی کثیر تعداد کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید نے ایک فرد پر بھی امت کا اطلاق فرمایا ہے:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً (النحل: ۱۲۰) بے شک ابراہیم (بہ نفس نفیس) ایک امت تھے۔

(زاد المسیر ج ۳، ص ۲۷۳، تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۸۷، روح المعانی جز ۹، ص ۸۳۸)

میرے نزدیک اس آیت کی زیادہ عمدہ تفسیر یہ ہے کہ بنو اسرائیل میں ہر چند کہ زیادہ تر ضدی، ہٹ دھرم، نافرمان اور فساق فجار تھے لیکن ہر دور میں ان کے اندر چند صالح لوگوں کی بھی ایک جماعت موجود رہی ہے۔ جیسا کہ امت کی تئوں میں اس کی

تقلیل کی طرف اشارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں جہاں بنو اسرائیل کی عمد کھنٹیوں اور بد اعمالیوں پر شدت کے ساتھ سرزنش کی ہے وہاں ان کے اندر اس قلیل گروہ کی تعریف و تحسین بھی فرمائی ہے، حق اور عدل کے الفاظ میں یہ اشارہ ہے کہ اس قلیل گروہ میں علماء بھی تھے اور قضاة بھی، جو دین حق پر قائم تھے اور حق کے ساتھ فیصلے کرتے تھے، ان ہی کی نسل سے ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کے زمانہ میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب پیدا ہوئے، اس تفسیر کی تائید حسب ذیل روایات سے بھی ہوتی ہے:

امام عبدالرحمن بن محمد الرازی بن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے رب میں نے ایک امت ایسی پائی جو اپنے اموال کا صدقہ دے گی، پھر اس کی طرف وہ مال لوٹ آئے گا اور وہ اس کو کھالے گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ امت تمہارے بعد ہوگی اور یہ امت احمد ہے، حضرت موسیٰ نے کہا اے میرے رب! میں نے ایک ایسی امت پائی جو پانچ نمازیں پڑھے گی اور وہ نمازیں ان کے درمیان کے گناہوں کے لیے کفارہ ہو جائیں گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ امت تمہارے بعد ہوگی اور یہ امت احمد ہے، حضرت موسیٰ نے کہا اے میرے رب! مجھے امت احمد میں سے کر دے! تب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو راضی کرنے کے لیے یہ آیت نازل کی: اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے وہ لوگ حق کے ساتھ ہدایت دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔

ابو الصبہاء البکری بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی عالم اور ایک عیسائی عالم کو بلایا اور کہا میں تم لوگوں سے ایک چیز کے متعلق سوال کرتا ہوں اور میں اس کو تم سے بہتر جانتا ہوں، پھر آپ نے یہودی عالم سے کہا یہ بتاؤ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنو اسرائیل کے کتنے فرقے ہو گئے تھے؟ اس نے کہا خدا کی قسم کوئی فرقہ نہیں ہوا، حضرت علی نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا۔ ان کے اکثر فرقے ہوئے تھے اور ایک کے سوا وہ سب دوزخ میں جائیں گے، پھر آپ نے عیسائی عالم سے کہا بتاؤ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیوں کے کتنے فرقے ہو گئے تھے؟ اس نے بھی کہا خدا کی قسم ان میں کوئی فرقہ نہیں ہوا۔ حضرت علی نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، ان کے بہتر فرقے ہوئے تھے اور ایک کے سوا سب دوزخ میں جائیں گے، اور تم اے یہودی سنو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے وہ لوگ حق کے ساتھ ہدایت دیتے ہیں اور اسی کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔ (الاعراف: ۱۵۹) اور یہی گروہ نجات پائے گا اور تم اے نصرانی سنو! بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مِنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءٌ مَّا يَعْمَلُونَ (المائدہ: ۶۶)

اور ان میں سے کچھ لوگ اعتدال پر ہیں اور زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو بہت برے کام کر رہے ہیں۔

اور جو لوگ اعتدال پر ہیں وہی نجات پائیں گے، اور رہے ہم! تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (الاعراف: ۱۸۱)

اور جن کو ہم نے پیدا کیا ہے، ان میں سے ایک گروہ ہے وہ لوگ حق کی ہدایت دیتے اور اسی کے ساتھ عدل اور انصاف کرتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس امت میں سے یہی گروہ نجات پائے گا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۵۸۸-۱۵۸۷، الدر المنثور ج ۳، ص ۵۸۵)

غرض یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں نیک لوگوں کا گروہ بھی ہر دور میں رہا ہے اور ان ہی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم نے ان (بنو اسرائیل) کو بارہ قبیلوں میں گروہ در گروہ تقسیم کر دیا، جب موسیٰ کی قوم نے ان سے پانی طلب کیا تو ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ اس پتھر پر اپنا عصا مارو، تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ہر گروہ نے اپنے پانی پینے کی جگہ جان لی، اور ہم نے ان پر بادل کا سایہ کر دیا اور ہم نے ان پر من و سلویٰ نازل کیا، ان پاک چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں، اور انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ (الاعراف: ۱۶۰)

اللہ کی نعمتوں کے مقابلہ میں بنو اسرائیل کی نافرمانیاں

اس آیت سے مقصود بنو اسرائیل کے احوال کو بیان کرنا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بارہ گروہوں میں تقسیم کر دیا، کیونکہ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی اولاد سے پیدا ہوئے تھے تو ان کو باہم متمیز کر دیا تاکہ یہ ایک دوسرے سے حسد نہ کریں اور ان میں لڑائی جھگڑے اور قتل و غارت کی نوبت نہ آئے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب موسیٰ کی قوم نے ان سے پانی طلب کیا تو ہم نے ان کو حکم دیا کہ پتھر پر اپنا عصا ماریں تو اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، اس آیت میں ”انبجست“ فرمایا ہے اور سورہ بقرہ میں ”فانفجرت“ فرمایا تھا، لغت میں ان دونوں کا معنی ایک ہے اور انبجاس اور انفجار میں کوئی فرق نہیں ہے، اور بعض ائمہ نے فرق کیا ہے انبجاس کا معنی ہے تھوڑا تھوڑا پانی نکلنا اور الانفجار کا معنی ہے بہت زیادہ پانی نکلنا اور ان میں اس طرح تطبیق ہے کہ ابتداء میں تھوڑا تھوڑا پانی نکلا، پھر بعد میں بہت زیادہ اور تیزی سے پانی نکلا، اس کے بعد فرمایا ان پر ہم نے بادل کا سایہ کیا، پھر فرمایا ہم نے ان پر من اور سلویٰ نازل کیا۔ من سے مراد ایک نفیس شیریں ذائقہ دار چیز ہے اور سلویٰ سے مراد بھنے ہوئے بٹیر ہیں، ان سب چیزوں میں ان پر اللہ کی عظیم نعمتوں کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے دھوپ کی تکلیفوں کو دور کیا اور نہایت آسانی سے ان کو کھانے اور پینے کی چیزیں فراہم کیں۔ اس کے بعد فرمایا ان پاک چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تم کو دی ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صرف ان ہی چیزوں کو کھاؤ اور ان کے علاوہ اور کسی چیز کو طلب مت کرو، پھر فرمایا اور انہوں نے ہم پر کوئی ظلم نہیں کیا، اس میں یہ اشارہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے تجاوز کیا، انہوں نے اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کے باوجود کھانے کو ذخیرہ کیا یا اس وقت میں کھایا جس وقت ان کو کھانے سے منع فرمایا تھا اور یا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کے علاوہ کھانے پینے کی اور چیزوں کو طلب کیا اور جب مکلف وہ کام کرتا ہے جس سے اس کو منع کیا گیا تھا تو وہ دراصل خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے، اس لیے فرمایا انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے کیونکہ جب بندہ کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو عذاب خداوندی کا مستحق بنا دیتا ہے۔ البقرہ: ۶۰ اور البقرہ: ۵۷ میں ان امور کی بہت تفصیل سے تفسیر کر دی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ان سے کہا گیا کہ اس شہر میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے جہاں سے چاہو کھاؤ اور حِلْمَةً (معاف کرنا) کہتے جاؤ، اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا، ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور عنقریب نیکو کاروں کو مزید اجر عطا کریں گے، پس ان میں سے ظلم کرنے والوں نے اس بات کو اس کے خلاف بدل دیا جو ان سے کہی گئی تھی تو ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا کیونکہ وہ ظلم کرتے تھے۔ (الاعراف: ۱۶۳-۱۶۱)

البقرہ: ۵۸-۵۹ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔ اور وہاں اس کی مفصل تفسیر کی جا چکی ہے، اس لیے ان آیتوں کی تفسیر کے لیے اس مقام کو دیکھ لیا جائے۔

وَسَأَلَهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةً الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ

اور ان سے اس بستی کے متعلق سوال کیجیے جو سمندر کے کنارے واقع تھی، جب وہ سینچر کے دن

فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِثَّانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَعًا وَيَوْمًا لَا

نجاوز کرتے تھے، جب سینچر کے دن پھلیاں تیرتی ہوئی ان کے پاس آتی تھیں اور جب سینچر کا دن نہ

يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَلِكَ نَبْلُوهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿۱۴۱﴾

ہوتا تو وہ ان کے پاس (آتی کثرت سے) اس طرح نہیں آتی تھیں، ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے تھے

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعْبَرُونَ قَوْمًا لَّا يُهْلِكُهُمْ أَو

اور جب ان میں سے ایک گروہ نے (نصیحت کرنے والوں سے) کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے

مَعِدَّيْكُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعِدَّةٌ إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ

والا ہے یا عذاب شدید میں مبتلا کرنے والا ہے، انہوں نے کہا تا کہ تم تمہارے رب کے سامنے حجت پوری کر سکیں

يَتَّقُونَ ﴿۱۴۲﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ

اور شاید کہ یہ اللہ سے ڈریں اور جب انہوں نے ان باتوں کو بھلا دیا جن کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو

عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا بَيِّنًا بِمَا كَانُوا

نجات دے دی جو برائی سے روکتے تھے اور ظالموں کو بہت برے عذاب میں جڑا یا کیوں کہ وہ نافرمانی

يَفْسُقُونَ ﴿۱۴۳﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً

کرتے تھے اور جب انہوں نے اس چیز سے سرکشی کی جس سے ان کو روکا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا تم ذیل

خَاسِيِينَ ﴿۱۴۴﴾ وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيُبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ

بند بن جاؤ اور یاد کرو جب آپ کے رب نے اعلان کیا تھا کہ وہ قیامت تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرنا ہے گا

مَنْ يُسُوهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّكَ

جران کو بُرا عذاب چکھائیں گے، بیشک آپ کا رب بہت جلد عذاب دینے والا ہے اور بیشک وہ بہت زیادہ

لَغْفُورًا حِيمًا ﴿١٦٦﴾ وَقَطَّعَتْهُمْ فِي الْأَرْضِ أَمْثًا مِنْهُمْ الصَّالِحُونَ

بجٹنے والا بہت مہربان بھی ہے اور ہم نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں کٹی گروہوں میں تقسیم کر دیا، ان میں سے بعض

وَمِنْهُمْ دُونَ ذَلِكَ وَبَلَّوْنَهُمْ بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ

نیک تھے، اور بعض ان سے مختلف تھے، اور ہم نے راستوں اور مصیبتوں کے ساتھ ان کی آزمائش کی تاکہ وہ سیکش سے

يَرْجِعُونَ ﴿١٦٧﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِ هُمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ

پلٹ جائیں ○ پھر ان کے بعد ایسے نااہل لوگ ان کے جانشین ہوئے جو تورات کے وارث ہو کر اس دنیا فانی

عَرَضَ هَذَا الْأَدْنَى وَيَقُولُونَ سَيُغْفِرُ لَنَا وَإِنْ يَأْتِهِمْ عَرَضٌ

کا سامان لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عنقیب ہماری بخشش کر دی جائے گی اور اگر ان کے پاس اس کی طرح اور

مِثْلَهُ يَأْخُذُوهُ وَالْمُرِيءُونَ عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَنْ لَا يَقُولُوا

سامان آجائے تو وہ اس کو بھی لے لیں گے، کیا ان سے کتاب میں یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے شعلے حق کے سوا

عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ وَالذَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ

کچھ نہیں کہیں گے، اور انہوں نے وہ سب کچھ پڑھ لیا جو تورات میں تھا اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے

يَتَّقُونَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦٨﴾ وَالَّذِينَ يَمَسُّونَ الْكِتَابَ أَقَامُوا

آخرت کا گمراہی بہتر ہے، کیا تم (یہ بات) نہیں سمجھتے ○ اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں

الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نَضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ﴿١٦٩﴾ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ

(تو) ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے ○ اور جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ (اس

فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظِلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ

طرح) اٹھالیا تھا گویا کہ وہ ان کے اوپر سایبان ہے اور وہ یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر ضرور گرنے والا ہے (اس وقت ہم نے ان

بِقُوَّةٍ وَإِذْ كُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧٠﴾

سے کہتا تھا) ہم نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑ لو، اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو، تاکہ تم متقی ہو جاؤ ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان سے اس بستی کے متعلق سوال کیجئے جو سمندر کے کنارے واقع تھی، جب وہ سینچر کے دن تجاوز کرتے تھے، جب سینچر کے دن مچھلیاں تیرتی ہوئی ان کے پاس آتی تھیں اور جب سینچر کا دن نہ ہو تا تو وہ ان کے پاس (اتنی کثرت سے) اس طرح نہیں آتی تھیں، ان کی نافرمانی کی وجہ سے ہم ان کو آزمائش میں ڈالتے تھے۔ (الاعراف: ۱۶۳)

نافرمانی پر اصرار کرنے والے اسرائیلیوں کو بندر بنانے کی تفصیل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ یہ قوم حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ”ایلہ“ میں آباد تھی، یہ شہر مدینہ اور شام کے درمیان ساحل سمندر پر واقع تھا، اس جگہ سمندر میں سال کے ایک مہینہ میں اتنی کثرت سے مچھلیاں آتی تھیں کہ پانی دکھائی نہیں دیتا تھا اور باقی مہینوں میں ہفتہ کے دن اس میں بہت مچھلیاں آتی تھیں، ان لوگوں نے مختلف جگہ حوض کھودے اور سمندر سے نالیاں نکال کر ان حوضوں سے ملا دیں، ہفتہ کے دن ان حوضوں میں مچھلیاں چلی جاتیں اور وہ اتوار کے دن ان کا شکار کر لیتے۔ بنو اسرائیل کا ہفتہ کے دن مچھلیوں کو حوضوں میں مقید کر لینا، یہی ان کا حد سے تجاوز کرنا تھا۔ وہ ایک بڑے لمبے عرصے تک اس نافرمانی میں مشغول رہے، نسل در نسل ان کی اولاد بھی اس میں ملوث رہی۔ خدا کا خوف رکھنے والے کچھ لوگ منع کرتے تھے، کچھ اس کو برا جانتے تھے اور اس خیال سے منع نہیں کرتے تھے کہ یہ باز آنے والے نہیں ہیں، نافرمان لوگ کہتے تھے کہ ہم اتنے بڑے عرصہ سے یہ کام کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان مچھلیوں میں اضافہ فرما رہا ہے، مانعین کہتے تھے کہ تم دھوکے میں نہ آؤ، ہو سکتا ہے تم پر عذاب نازل ہو جائے۔ (تفسیر کبیر ج ۱، ص ۳۷۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۹۸ھ)

اس شہر میں رہنے والے ستر ہزار نفوس تھے۔ اور ان کو منع کرنے والے بارہ ہزار تھے، جب مجرموں نے ان کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کر دیا، تو مانعین نے کہا، یہ خدا ہم ایک علاقہ میں نہیں رہیں گے، انہوں نے شہر کے درمیان ایک دیوار کھینچ دی اور ان سے الگ رہنے لگے اور کئی سال اسی طرح گزر گئے، پھر معصیت پر ان کے مسلسل اصرار کی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت کی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا غضب فرمایا ایک دن منع کرنے والے اپنے دروازے سے نکلے تو دیکھا مجرمین میں سے کوئی نہیں نکلا، جب کافی دیر ہو گئی تو وہ دیوار پھاند کر گئے، دیکھا تو وہ تمام لوگ بندر بن چکے تھے، ایک قول یہ ہے کہ جو ان بندر بن گئے تھے اور بوڑھے خنزیر بن گئے تھے، وہ دوسروں کو پہچان رہے تھے اور دوسرے ان کو نہیں پہچان رہے تھے۔ وہ تین دن تک اس حال میں روتے رہے، پھر سب ہلاک ہو گئے اور کوئی مسخ شدہ شخص تین دن سے زیادہ نہیں رہا اور نہ ان کی نسل چلی۔ (تفسیر خازن ج ۱، ص ۶۰، مطبوعہ دار الکتب العربیہ، پشاور)

اس واقعہ کے بیان میں ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کے معجزہ کا اظہار ہے کیونکہ آپ امی تھے۔ آپ نے اعلان نبوت سے پہلے نہ کسی چیز کو پڑھا تھا نہ لکھا تھا اور نہ علماء اہل کتاب کی مجلس میں رہے تھے، اس کے باوجود آپ نے اس واقعہ کو بیان فرمایا جو ان کے علماء کے درمیان معروف تھا۔ ان کی کتابوں میں لکھا ہوا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے جو کچھ بیان فرمایا وہ وحی الہی ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو ہفتہ کے دن شکار کرنے سے منع کر دیا تھا تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ سمندر میں ہفتہ ہی کے دن بکثرت مچھلیاں آتی تھیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش تھی اور بنو اسرائیل کا امتحان تھا کہ وہ مچھلیوں کی بہتات دیکھ کر پھسل جاتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے حکم ماننے پر جے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَحْسِبَ النَّاسَ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا
وَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ (العنكبوت: ۲)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ (محض) اس کہنے پر
چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کی
آزمائش نہیں کی جائے گی۔

اس امتحان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ فرمانبرداروں اور نافرمانوں کو متمیز کر دیتا ہے۔

اس آیت کے دیگر مباحث کہ موجودہ بندر، ان ہی بندروں کی نہل سے ہیں یا نہیں اور تماخ اور تماخ میں فرق کے لیے البقرہ: ۶۵ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ یہ قصہ یہودیوں کے درمیان معروف اور مشہور تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کا علم اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہوا، یہاں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس نے اتنی دیدہ دلیری سے اتنا زبردست گناہ کیا تھا اور ایسی کھلی نافرمانی کی تھی تو اگر یہ لوگ (سیدنا) محمد ﷺ کے معجزات اور صاف صاف نشانیاں دیکھنے کے باوجود آپ کی نبوت کا انکار کریں اور اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہیں تو ان سے کیا بعید ہے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ان میں سے ایک گروہ نے (نصیحت کرنے والوں سے) کہا تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو، جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے، یا عذاب شدید میں مبتلا کرنے والا ہے، انہوں نے کہا تاکہ ہم تمہارے رب کے سامنے حجت پوری کر سکیں اور شاید کہ یہ اللہ سے ڈریں۔ پس جب انہوں نے ان باتوں کو بھلا دیا جن کی ان کو نصیحت کی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دے دی جو برائی سے روکتے تھے اور ظالموں کو بہت بڑے عذاب میں جکڑ لیا کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔ (الاعراف: ۱۶۵-۱۶۴)

تبلیغ کا فرض کفایہ ہونا

اس آیت کی تفسیر میں صحیح قول یہ ہے کہ اس شر کے رہنے والے تین گروہوں پر منقسم تھے، ایک فریق وہ تھا جو ہفتہ کے دن ان پھیلیوں کا شکار کر کے اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نافرمانی کرتا تھا، دوسرا فریق وہ تھا جو ان کو اس نافرمانی سے منع کرتا تھا اور ڈانٹتا تھا، اور تیسرا فریق وہ تھا جو خاموش رہتا تھا، نافرمانی کرتا تھا اور نہ نافرمانی سے روکتا تھا، اور اس فریق نے منع کرنے والوں سے کہا تم ان کو کیوں منع کرتے ہو جبکہ تمہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرنے والا ہے یا عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے، یعنی یہ لوگ گناہوں پر اصرار کر کے اب ایسی حد پر پہنچ چکے ہیں کہ اب ان کا گناہوں سے پلٹنا بہت مشکل ہے، اس لیے اب ان پر وعظ اور نصیحت بے اثر ہے، لہذا اب ان کو نصیحت نہیں کرنی چاہیے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس گیا تو وہ رو رہے تھے اور ان کی گود میں قرآن مجید تھا، میں نے کہا اے ابن عباس! میں آپ پر قربان ہوں، آپ کیوں رو رہے ہیں، حضرت ابن عباس نے سورۃ الاعراف کی ان آیتوں کی تلاوت کی اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجرمین کو سزا دی اور ان کو مسخ کر کے بندر بنا دیا اور جو فریق ان کو برائی سے منع کرتا تھا اس کا ذکر فرمایا کہ اس کو نجات دے دی اور تیسرا فریق جو خاموش رہا تھا اور ان کو منع نہیں کرتا تھا اس کا ذکر نہیں فرمایا آیا ان کی نجات ہوئی یا نہیں۔ اور ہم بھی کئی کاموں کو برا سمجھتے ہیں لیکن منع نہیں کرتے اللہ جانے ہماری نجات ہوگی یا نہیں، عکرمہ کہتے ہیں کہ میں آپ پر قربان ہوں، کیا اس فریق نے ان کاموں کو برا نہیں سمجھا تھا جب کہ اس نے یہ کہا کہ تم ان کو کیونکر منع کرتے ہو جب کہ تمہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہلاک کرنے والا ہے یا عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے، حضرت ابن عباس میرے اس جواب سے خوش ہوئے اور مجھے دو دبیز چادریں دینے کا حکم دیا۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۱۲۸-۱۲۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

امام رازی نے فرمایا کہ برائی سے روکنا فرض علی الکفایہ ہے اور جب بعض لوگوں نے بنو اسرائیل کو اس برائی سے روک

کر یہ فرض ادا کر دیا تو باقی لوگوں سے یہ فرض ساقط ہو گیا، اس لیے اس تیسرے فریق پر عذاب نازل نہیں ہوا۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۹۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر جب انہوں نے اس چیز سے سرکشی کی جس سے ان کو روکا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا تم

ذلیل بندر بن جاؤ۔ (الاعراف: ۱۶۶)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا صبح کو جب وہ نافرمان لوگ اٹھے تو وہ ذلیل بندر بن چکے تھے، وہ تین دن تک اسی کیفیت پر برقرار رہے، لوگوں نے ان کو دیکھا پھر وہ ہلاک ہو گئے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ان میں سے جو ان بندر بن گئے تھے اور بوڑھے خزیر بن گئے تھے لیکن یہ قول اس آیت کے خلاف ہے، اس میں بھی اختلاف ہے کہ جن لوگوں کو مسخ کر کے بندر بنا دیا گیا تھا، موجودہ بندر ان ہی کی نسل سے ہیں یا وہ اسی وقت ہلاک ہو گئے تھے اور ان کی نسل منقطع ہو گئی تھی، ان تمام امور کی تفصیل البقرہ: ۶۵ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں، ان آیات سے حسب ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں:

بعض احکام کا استنباط

۱- ایسے حیلے کرنا ممنوع ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے احکام بالکل معطل ہو جائیں، اور اللہ تعالیٰ کی ممانعت کا کوئی محل باقی نہ رہے، البتہ کسی آدمی کی شخصی ضرورت کے لیے کوئی ایسی خفیہ تدبیر کرنا جس سے وہ ممنوع کام کے ارتکاب سے بچ جائے یہ انفرادی طور پر جائز ہے لیکن اس کو قاعدہ کلیہ بنا لینا جائز نہیں، جیسے لوگ سود کھانے کے لیے بیع عینہ کا حیلہ کریں یا دکان کی پگڑی لینے کے لیے اس دکان یا مکان میں ایک میزیا الماری رکھ کر اس کے عوض پگڑی کی رقم لے لیں۔

۲- ان آیات میں سد ذرائع کی اصل ہے یعنی جو کام کسی حرام کا ذریعہ ہو وہ بھی ممنوع ہے، ان کا سمندر سے نالیاں کھود کر حوضوں کی طرف لانا پھلیوں کے شکار کا ذریعہ تھا، اس لیے اس کو بھی منع کر دیا۔

۳- نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فرض ہے، لیکن یہ فرض کفایہ ہے۔

۴- جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت کے احوال آسان کر دیتا ہے، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے جیسے ان اسرائیلیوں کو آزمائش میں مبتلا کیا کہ ہفت کے دن مچھلیاں بہت آتی تھیں۔

۵- اللہ تعالیٰ کا عذاب اچانک نہیں آتا بلکہ تدریجاً آتا ہے جیسے بنو اسرائیل پر مختلف انواع کے عذاب آتے رہے، پھر ان کو بندر بنا دیا گیا، پھر ان سے حکومت چھینی گئی اور اصل عذاب آخرت میں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یاد کرو جب آپ کے رب نے اعلان کیا تھا کہ وہ قیامت تک ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بڑا عذاب چکھائیں گے، بیشک آپ کا رب بہت جلد عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ بہت زیادہ بخشنے والا بہت مہربان بھی ہے، اور ہم نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں کئی گروہوں میں تقسیم کر دیا، ان میں سے بعض نیک تھے اور بعض ان سے مختلف تھے، اور ہم نے راحتوں اور مصیبتوں کے ساتھ ان کی آزمائش کی تاکہ وہ سرکشی سے پلٹ جائیں۔

(الاعراف: ۱۶۸-۱۶۷)

فلسطین میں اسرائیل کا قیام قرآن مجید کے خلاف نہیں ہے

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود کی سرکشی اور معصیت پر دلیری کا ذکر فرمایا تھا اور یہ کہ اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان کو

نبیان القرآن

جلد چہارم

سخ کر کے بندر بنادیا اور اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے ان کے لیے ذلت اور غلامی مقدر کر دی ہے اور یہ بھی ان کی بد اعمالیوں کی سزا ہے اور یہ ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے زمین میں مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے رسول مکرم! آپ کے رب نے یہود کے پہلے لوگوں کو ان کے انبیاء کی زبان سے یہ خبر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے یہود پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو ذلت اور غلامی کا مزہ چکھائیں گے، ان پر جزیہ فرض کیا جائے گا، ان کی جمعیت ٹوٹ جائے گی اور ان کا شیرازہ بکھر جائے گا اور یہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر زمین پر زندگی گزاریں گے۔ سب سے پہلے ان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خراج کو لازم کیا، پھر ان کو یونانیوں نے غلام بنایا پھر کلدانیوں، کلدانیوں اور بابلیوں نے ان کو محکوم بنایا، پھر روم کے نصاریٰ نے ان کو غلام بنایا اور ان سے جزیہ اور خراج لیا، پھر مسلمانوں نے ان سے جزیہ اور خراج لیا، اس کے بعد قریب کے دور میں جرمنی میں ہٹلر نے ان کو چن چن کر قتل کیا اور ملک بدر کر دیا۔

رہا یہ کہ اب انہوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا ہے اور اسرائیل کے نام سے اپنی حکومت قائم کر لی ہے تو وہ قرآن مجید کے خلاف نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وہ جہاں بھی پائے جائیں گے ان پر ذلت لازم کر دی گئی ہے
 صُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا تَفْتَوُوا لَا
 يَحْبِلُ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٌ مِنَ النَّاسِ
 (آل عمران: ۱۱۳) ساتھ انہیں سہارا مل جائے۔

اور اسرائیل کی حکومت کا قیام برطانیہ اور امریکہ کے سہارے سے ہوا ہے اور اب بھی بظاہر وہاں یہودیوں کی حکومت ہے اور درپردہ برطانیہ اور امریکہ ہی کی حکومت ہے، اگر آج ان کے سروں پر سے برطانیہ اور امریکہ کا سایہ اٹھ جائے تو وہ پھر محکومی اور غلامی کی زندگی گزاریں گے۔

یہودیوں میں نیکو کار اور بد کار

اور ان پر دو سزا عذاب یہ مسلط فرمایا کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دنیا میں رہتے ہیں، ان میں صالح اور نیک لوگ بھی تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے، اور ان میں وہ بھی تھے جو ہمارے نبی محمد ﷺ پر ایمان لائے اور وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے تھے۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں وہ لوگ تھے جو سینچر کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کرتے تھے اور جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم اور بعض وہ لوگ تھے جو نیکی اور پرہیزگاری میں ان سے کم تھے، ان میں سے بعض فاسق و فاجر تھے، اور بعض کافر تھے، یہ لوگ انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے تھے، یہ لوگ جھوٹ بولتے تھے اور سود کھاتے تھے اور رشوت لے کر احکام بدل دیتے تھے اور جھوٹے فیصلے کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ ان دونوں فریقوں کے ساتھ اسی طرح معاملہ فرمائے گا جیسے اوروں کے ساتھ معاملہ فرماتا ہے، نیک لوگوں کو جزا دے گا اور بدکاروں کو سزا دے گا اور اللہ تعالیٰ ان کو آزمائش میں ڈالتا ہے، ان کو نعمتیں اور راحتیں عطا فرماتا ہے تاکہ یہ شکر بجالائیں اور مصائب اور آلام میں مبتلا کرتا ہے تاکہ یہ صبر کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پھر ان کے بعد ایسے نااہل لوگ ان کے جانشین ہوئے جو تورات کے وارث ہو کر اس دنیا فانی کا سامان لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عنقریب ہماری بخشش کر دی جائے گی اور اگر ان کے پاس اس کی طرح اور سامان آجائے تو وہ اس کو بھی لے لیں گے، کیا ان سے کتاب میں یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہیں کہیں گے اور انہوں نے وہ

سب کچھ پڑھ لیا جو تورات میں تھا اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے آخرت کا گھر سب سے بہتر ہے کیا تم یہ بات نہیں سمجھتے۔

(الاعراف: ۱۶۹)

خَلْفٌ اور خَلْفٌ کا معنوی فرق

اس آیت میں ارشاد ہے: فَنُخَلِّفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفًا اور خَلْفٌ کے معنی کے متعلق علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

بعد میں آنے والے ردی اور برے لوگوں کو خَلْفٌ کہتے ہیں۔

(المفردات ج ۱، ص ۲۰۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۸ھ)

خلف اگر لام پر زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا معنی ہے بعد میں آنے والے نیک لوگ اور اگر لام ساکن ہو تو اس کا معنی ہے بعد میں آنے والے برے لوگ اور خلف (لام ساکن ہو تو) کی جمع خلوف ہے اور خلف (لام پر زیر ہو تو) کی جمع اخلاف ہے۔ اسی طرح سَلَفٌ کا معنی ہے گزرے ہوئے نیک لوگ اور اس کی جمع اسلاف ہے اور سَلَفٌ کا معنی ہے گزرے ہوئے برے لوگ اور اس کی جمع سلوف ہے۔ (مثلاً ہمارے اعتبار سے صحابہ کرام اسلاف ہیں اور یزید اور شمر سلوف ہیں اور صحابہ کے اعتبار سے امام ابو حنیفہ خَلْفٌ ہیں اور یزید خَلْفٌ ہے۔

(مجمع بحار الانوار ج ۲، ص ۹۱، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان المدینہ المنورہ ۱۳۱۵ھ، التہامیہ ج ۲، ص ۶۳-۶۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

(لسان العرب ج ۹، ص ۸۵-۸۴، مطبوعہ ایران ۱۳۰۳ھ)

گناہوں پر اصرار کے ساتھ اجر و ثواب کی طمع کی مذمت

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ پھر بنو اسرائیل کے نیک لوگوں کے جانشین برے لوگ ہوئے جو اپنے اسلاف سے تورات کے وارث ہوئے۔ انہوں نے تورات کا مطالعہ کیا اور اس کے احکام کو حاصل کیا۔ نبی ﷺ کے زمانہ میں جو یہودی تھے وہ بھی اسی آیت کا مصداق تھے۔ انہوں نے تورات کے احکام کو پس پشت ڈال دیا اور آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی رنگینیوں اور زیب و زینت کو اختیار کر لیا۔ وہ مال جمع کرنے پر حریص تھے اور اس معاملہ میں حلال اور حرام کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ وہ رشوت لے کر تورات کے احکام بدل دیتے تھے۔ اپنی ریاست چھین جانے کے خوف سے نبی ﷺ کی جو تورات میں صفات تھیں ان کو لوگوں سے چھپاتے تھے۔ اور بعض آیات میں لفظی اور معنوی تحریف کرتے تھے اور ان کا یہ زعم تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بخش دے گا اور ان کی بد اعمالیوں پر ان سے مواخذہ نہیں فرمائے گا وہ کہتے تھے ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں ہمارا سلسلہ انبیاء علیہم السلام سے منسلک ہے، وہ مسلسل نافرمانیاں کرتے رہتے اور گناہوں پر اصرار کرتے اور جس چیز کو وہ پہلے باطل طریقہ سے لے چکے تھے اس کو دوبارہ بھی باطل طریقہ سے لینے سے گریز نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان کا رد کرتے ہوئے فرماتا ہے ”کیا ان سے کتاب میں یہ عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہیں کہیں گے“ انہوں نے تورات کو پڑھا تھا اور اس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ دوسروں کا مال باطل طریقہ سے لینا حرام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولنا حرام ہے۔ اس کے باوجود وہ اس عہد اور میثاق کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ کیا ان کو اتنی سی بات معلوم نہیں تھی کہ دار آخرت اور اس کی دائمی نعمتیں دنیا کی فانی لذتوں سے بہت بہتر ہیں تو پھر چاہیے تھا کہ وہ اللہ سے ڈرتے اور ان بد اعمالیوں اور اپنی سرکشیوں سے باز آجاتے۔

قرآن مجید کی اس آیت میں جس طرح ان بد اعمال یہودیوں کا ذکر فرمایا ہے جو اپنی نافرمانیوں کے باوجود اپنے آپ کو آخری اجر و ثواب کا امیدوار گردانتے تھے سو آج کل کے مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے وہ بھی اپنی بد اعمالیوں کے باوجود خود کو اجر آخرت

کا امیدوار کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عنقریب لوگوں کے سینوں میں قرآن اس طرح بوسیدہ ہو جائے گا جس طرح کپڑا بوسیدہ ہو کر جھڑنے لگتا ہے، وہ بغیر کسی شوق اور لذت کے قرآن کریم کو پڑھیں گے، ان کے اعمال صرف طمع اور حرص ہوں گے وہ خوف خدا سے گناہوں میں کمی نہیں کریں گے وہ برے کام کرنے کے باوجود تبلیغ کریں گے اور یہ کہیں گے کہ عنقریب ہماری بخشش کردی جائے گی کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک نہیں کرتے۔

(سنن دارمی ج ۲، رقم الحدیث: ۳۳۳۶، مطبوعہ دارالکتب العربیہ بیروت، ۱۳۰۷ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں (تو) ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے ○ (الاعراف: ۱۷۰)

اس کتاب سے مراد تورات ہے اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو بار بار ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور اس کی آیتوں کے تقاضوں پر عمل کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی حدود کو نہیں توڑتے تو اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو ضائع نہیں فرمائے گا اور ان کو پورا پورا اجر عطا فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ہم نے ان کے اوپر پہاڑ (اس طرح) اٹھالیا تھا گویا کہ وہ ان کے اوپر سائبان ہے اور وہ یہ گمان کر رہے تھے کہ وہ ان پر ضرور گرنے والا ہے (اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا) ہم نے تمہیں جو کچھ دیا ہے اس کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم متقی ہو جاؤ ○ (الاعراف: ۱۷۱)

جب حضرت موسیٰ بنو اسرائیل کے پاس تورات کی الواح لے کر آئے اور فرمایا ان کو لو اور ان کی اطاعت کا اقرار کرو، تو انہوں نے کہا جب تک اللہ تعالیٰ آپ کی طرح ہم سے کلام نہیں کرے گا ہم یہ اقرار نہیں کریں گے، پھر وہ بجلی کی ایک کڑک کے ذریعے ہلاک کیے گئے، اور پھر زندہ کیے گئے۔ حضرت موسیٰ نے ان سے پھر تورات کے قبول کرنے کے لیے فرمایا انہوں نے پھر انکار کیا، تب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ فلسطین کے پہاڑوں میں سے ایک فرسخ لمبے پہاڑ کو اکھاڑ کر سائبان کی طرح ان پر معلق کر دیں، ان کے پیچھے سمندر تھا اور ان کے سامنے سے آگ آرہی تھی، ان سے کہا گیا کہ قسم کھا کر اقرار کرو کہ تم تورات کے احکام پر عمل کرو گے ورنہ یہ پہاڑ تم پر گر جائے گا، تب انہوں نے تورات پر عمل کرنے کا پختہ عہد کیا اور توبہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔ انہوں نے کروٹ کے بل سجدہ کیا تھا اور مارے خوف کے پہاڑ کی طرف دیکھ رہے تھے، جب اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا تو انہوں نے کہا اس سجدہ سے افضل کوئی سجدہ نہیں ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے قبول کیا اور جس کی وجہ سے اپنے بندوں پر رحم فرمایا۔ پھر انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ کروٹ کے بل یعنی ایک شق پر سجدہ کیا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کو خوب کوشش سے لو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد کرو، یعنی اس میں تدبر اور غور و فکر کرو اور اس کے احکام کو ضائع نہ کرو، کیونکہ کتابوں کو نازل کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کے مقتضی پر عمل کیا جائے، یہ نہیں کہ ان کے معنی پر غور و فکر کیے بغیر ان کی صرف تلاوت کر لی جائے۔ امام نسائی نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ لوگوں میں سب سے بدتر فاسق وہ ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس کے کسی حکم کی طرف رجوع نہیں کرتا، اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلادیا ہے کہ قرآن مجید پڑھنے سے مقصود عمل ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن، ج ۷، ص ۴۳-۴۳۶، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو، ایران، ۱۳۸۷ھ)

وَإِذَا أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ

اور (یاد کیجیے) جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا اور ان کو خود ان کے نفسوں پر گواہ

عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَلَسَتْ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَن تَقُولُوا

کرتے ہوئے فرمایا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں؟ ہم (اس پر) گواہی دیتے ہیں، (یہ گواہی اس لیے ہے) (ج)

يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ ﴿۱۷۲﴾ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ

تا کہ قیامت کے دن تم یہ (منہ) کہہ دو کہ ہم اس سے بے خبر تھے ○ یا تم یہ (منہ) کہہ سکو کہ شرک تو ابتداء

أَبَاءُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّن بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا

ہمارے آباء نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کی اولاد ہیں، کیا تو باطل پرستوں کے فعل کی وجہ سے

فَعَلَّ السَّاطِنُونَ ﴿۱۷۳﴾ وَكَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ يَرْجِعُونَ

ہمیں ہلاک کرے گا ○ اور ہم اسی طرح تفصیل سے آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ حق کی طرف لوٹ آئیں ○

وَإِثْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَاسْلَخَ مِنْهَا فَاتَّبَعَ الشَّيْطَانَ

اور (اسے رسولِ مکرم!) ان پر اس شخص کا حال بیان کیجیے جس کو ہم نے اپنی آیتوں کا علم دیا تو وہ ان کی اطاعت سے نکل گیا پس

فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ ﴿۱۷۴﴾ وَكُونُوا لِرَفَعَةِ يَهَا وَلِكِنَّهُ أَخْلَدَ

شیطان نے اس کا پیچھا کیا، سو وہ گمراہوں میں ہو گیا ○ اور اگر تم چاہتے تو ان آیتوں کے ذریعہ اس کو بندی عطا کرتے مگر وہ پستی

إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ إِن تَحْمِلْهُ

کی طرف جھکا اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کی، سو اس کی مثال اس کتے کی طرح ہے کہ اگر تم اس پر حملہ کرو

عَلَيْهِ يَلْهَثُ أَوْ تَتْرُكُهُ يَلْهَثُ ذَلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ

تب بھی وہ ہانپ کر زبان نکالے یا چھوڑ دو پھر بھی وہ ہانپ کر زبان نکالے، یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہماری آیتوں کو

كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَاقْصِصْ الْقِصَصَ لَعَلَّكُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۱۷۵﴾ سَاءَ

جھٹلاتے ہیں، آپ (لوگوں کے سامنے) یہ واقعات بیان کیجیے تاکہ وہ غور و فکر کریں ○ کیسی بڑی

مَثَلًا لِّلْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَبُوا بآيَاتِنَا وَانفُسَهُمْ كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿۱۷۷﴾

مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور وہ اپنے ہی نفسوں پر ظلم کرتے تھے ○

مَنْ يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدَىٰ ۚ وَمَنْ يُضِلِّ فَآوَلِيكَ هُمُ

جس کو اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو وہ گمراہی پر رکھے سو وہی لوگ نقصان

الْخٰسِرُونَ ﴿۱۷۸﴾ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ

اٹھانے والے ہیں ○ اور بیشک ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے ایسے جن اور انسان پیدا کیے

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا

جن کے دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں (مگر) وہ ان سے دیکھتے نہیں،

وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلَّغْنَا لَهُمُ

اور ان کے کان ہیں (مگر) وہ ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں

أُولَٰئِكَ هُمُ الْعَقْلُونَ ﴿۱۷۹﴾ وَرَبُّهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ

وہ عقلت میں پڑے ہوئے ہیں ○ اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں تو ان ہی ناموں سے

بِهَا ۚ وَذُرُوا الَّذِينَ يُدْعُونَ فِي أَسْمَائِهِ سَاجِدُونَ ۚ مَا

اس کو پکارو، اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں غلط راہ اختیار کرتے ہیں، جو کچھ وہ کرتے ہیں مغرب

كَانُوا يَعْبَلُونَ ﴿۱۸۰﴾ وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةً يَهْدُونَ بِالْحَقِّ

ان کو اس کی سزا دی جائے گی ○ اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایک ایسا گروہ (بھی) ہے جو حق کی

وَبِهِ يَعْدِلُونَ ﴿۱۸۱﴾

ہدایت دیتا ہے اور اسی کے ساتھ عدل کرتا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے بنو آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا اور ان کو خود ان کے نفسوں پر گواہ کرتے ہوئے فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں اہم (اس پر) گواہی دیتے ہیں (یہ گواہی اس لیے لی ہے) تاکہ قیامت کے دن تم یہ (نہ) کہہ دو کہ ہم اس سے بے خبر تھے ○ یا تم یہ (نہ) کہہ سکو کہ شرک تو ابتداء

ہمارے آباء نے کیا تھا اور ہم تو اس کے بعد کی اولاد ہیں، کیا تو باطل پرستوں کے فعل کی وجہ سے ہمیں ہلاک کرے گا؟ اور ہم اسی طرح تفصیل سے آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ وہ حق کی طرف لوٹ آئیں (الاعراف: ۱۷۲-۱۷۳)

بنو آدم سے میثاق لینے کے متعلق احادیث

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سورۃ الاعراف کی اس آیت کے متعلق میں نے نبی ﷺ سے سوال کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا پھر ان کی پشت پر اپنا دایاں ہاتھ پھیرا، پھر اس پشت سے اولاد نکالی پھر فرمایا ان کو میں نے جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہل جنت کے عمل کریں گے۔ پھر ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور ان سے ایک اور اولاد نکالی اور فرمایا میں نے ان کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ اہل دوزخ کے عمل کریں گے۔ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! پھر عمل کس چیز میں ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ جب کسی بندہ کو جنت کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل جنت کے عمل کراتا ہے، حتیٰ کہ وہ شخص اہل جنت کے اعمال پر مرتا ہے پھر اللہ اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے، اور جب کسی بندہ کو دوزخ کے لیے پیدا کرتا ہے تو اس سے اہل دوزخ کے عمل کراتا ہے حتیٰ کہ وہ اہل دوزخ کے اعمال پر مرتا ہے پھر اللہ اس کو دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔

امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۸۶، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۰۳، موطا امام مالک رقم الحدیث: ۱۶۶۱، مسند احمد ج ۱، ص ۳۱۱، صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۶۱۶۶، الشریعہ للاجری، رقم الحدیث: ۱۷۰، کتاب الاسماء والصفات للسیحقی، ص ۳۲۵، المستدرک ج ۱، ص ۳۷، ج ۲، ص ۳۲۳، ج ۲، ص ۵۳۳، التمهید لابن عبدالبرج، ص ۶، ص ۲-۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم کو پیدا کیا تو ان کی پشت پر (ہاتھ) پھیرا تو ان کی پشت سے ان کی اولاد کی وہ تمام روہیں جھڑ گئیں جن کو وہ قیامت تک پیدا کرنے والا تھا، اور ان میں سے ہر انسان کی دو آنکھوں کے درمیان نور کی ایک چمک تھی، پھر وہ سب روہیں حضرت آدم پر پیش کی گئیں۔ حضرت آدم نے کہا اے میرے رب! یہ کون ہیں؟ فرمایا یہ تمہاری اولاد ہیں۔ حضرت آدم نے ان میں سے ایک شخص کو دیکھا جس کی آنکھوں کے درمیان کی چمک ان کو بہت پیاری لگی۔ پوچھا اے رب! یہ کون ہے؟ فرمایا یہ تمہاری اولاد کی آخری امتوں میں سے ایک شخص ہے اس کا نام داؤد ہے۔ کہا اے رب! آپ نے اس کی کتنی عمر رکھی ہے؟ فرمایا ساٹھ سال، کہا اے میرے رب! میری عمر میں سے اس کے چالیس سال زیادہ کر دے۔ جب حضرت آدم کی عمر پوری ہو گئی تو ان کے پاس ملک الموت آیا۔ حضرت آدم نے کہا کیا ابھی میری عمر میں سے چالیس سال باقی نہیں ہیں! انہوں نے کہا کیا آپ نے یہ چالیس سال اپنے بیٹے داؤد کو نہیں عطا کیے تھے! پس حضرت آدم نے انکار کر دیا تو ان کی اولاد نے بھی انکار کر دیا۔ اور آدم بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھول گئی اور حضرت آدم نے (اجتمادی) خطا کی تو ان کی اولاد نے بھی خطا کی۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۸۷، جامع البیان جز ۹، ص ۱۵۵، تفسیر القرآن العظیم لابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۶۱۳)

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان سے میثاق لیا، ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا تو ان کی اولاد کو چونٹوں کی مانند نکالا، پھر ان کی مدت حیات، ان کا رزق اور ان کے مصائب لکھ دیے اور ان کو ان کے نفسوں پر گواہ کیا اور فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں!

(جامع البیان جز ۹، ص ۱۵۰)

محمد بن کعب القرظی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ روجوں کو ان کے اجسام سے پہلے پیدا کیا۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۱۵۷، الدر المشورج ۳، ص ۵۹۹، بحوالہ امام ابن ابی شیبہ)

میشاق لینے کا مقام

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرتے ہی ان کی پشت سے ان کی اولاد کو نکال کر ان سے عمد لیا تھا۔

امام ابن ابی حاتم، امام ابن مندہ اور امام ابو الشیخ نے کتاب العظمت میں اور امام ابن عساکر نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو پیدا کیا تو ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے ہر اس روح کو نکالا جس کو وہ قیامت تک پیدا کرنے والا ہے۔ (الدر المشورج ۳، ص ۶۰۱، جامع البیان جز ۹، ص ۱۳۹)

امام احمد، امام النسائی، امام ابن جریر، امام ابن مردویہ، امام حاکم نے تصحیح سند کے ساتھ اور امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے یوم عرفہ کے دن وادی نعمان میں آدم علیہ السلام کی پشت سے میشاق لیا اور ان کی پشت سے تمام اولاد کو نکالا اور فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟

(الدر المشورج ۳، ص ۶۰۱)

علامہ ابو عبد اللہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ نے لکھا ہے کہ جس جگہ میشاق لیا گیا تھا اس کی تعین میں اختلاف ہے اور اس سلسلہ میں چار اقوال ہیں، حضرت ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ یہ میشاق عرفہ کی ایک جانب وادی نعمان میں لیا گیا تھا، اور ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ سرزمین ہند میں جہاں حضرت آدم علیہ السلام کو اتارا گیا تھا وہیں ان سے یہ میشاق لیا گیا تھا۔ کلبی سے روایت ہے کہ مکہ اور طائف کے درمیان ایک جگہ پر یہ میشاق لیا گیا تھا اور یہ کہ جب حضرت آدم کو جنت سے آسمان دنیا کی طرف اتارا گیا تو وہاں ان سے یہ میشاق لیا گیا تھا۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۲۸۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

میشاق حضرت آدم کی پشت سے ذریت نکال کر لیا گیا تھا یا بنو آدم کی پشتوں سے

قرآن مجید کی اس آیت میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے بیٹوں کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکال کر ان سے میشاق لیا اور احادیث میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکال کر یہ میشاق لیا۔ اور یہ ظاہر یہ تعارض ہے۔ علامہ آلوسی نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت میں جو بنی آدم مذکور ہے اس سے مراد حضرت آدم اور ان کی اولاد ہیں۔ اور اولاد کو ان کی پشتوں سے نکالنے کا معنی یہ ہے کہ بعض لوگ بعض لوگوں سے اپنے اپنے زمانہ میں پیدا ہوتے رہیں گے اور حدیث میں صرف حضرت آدم کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ حضرت آدم اصل ہیں اور اصل کا ذکر کرنے کے بعد فرع کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ اصل کا ذکر فرع کے ذکر سے مستغنی کر دیتا ہے، اور حدیث میں یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ اس میں یہ احتمال ہے کہ یہ ہاتھ پھیرنے والا فرشتہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے اسناد کر دیا کہ وہ حکم دینے والا ہے۔ (علامہ آلوسی نے یہ جواب علامہ بیضاوی سے نقل کیا ہے)

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ حدیث کا یہ معنی نہیں ہے کہ تمام اولاد کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے بالذات نکالا، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ جو اولاد ان سے بالذات اور براہ راست پیدا ہوئی اس کو نکالا اور پھر ان کے بیٹوں کی پشت سے ان کی براہ راست پیدا ہونے والی اولاد کو نکالا اور چونکہ حضرت آدم علیہ السلام منظر اصلی تھے اس لیے کل اولاد کا اسناد ان کی طرف کر دیا، خلاصہ یہ ہے کہ تمام اولاد کو تفصیلاً حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹوں کی پشت سے نکالا گیا اور اجمالاً حضرت آدم علیہ السلام کی

پشت سے نکالا گیا۔ قرآن مجید میں تفصیلاً بیٹوں کی پشت سے تمام اولاد کو نکالنے کا ذکر ہے اور حدیث میں حضرت آدم کی پشت سے تمام اولاد کو اجمالاً نکالنے کا ذکر ہے۔

امام رازی نے یہ فرمایا ہے کہ اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے کہ دو مرتبہ میثاق لیا گیا ہو ایک مرتبہ حضرت آدم کی پشت سے تمام اولاد کو نکال کر میثاق لیا گیا ہو اور دوسری بار ان کے بیٹوں کی پشت سے اولاد کو نکال کر میثاق لیا گیا ہو۔ قرآن مجید میں حضرت آدم کے بیٹوں کی پشتوں سے اولاد کو نکال کر میثاق لینے کا ذکر ہے اور حدیث میں حضرت آدم کی پشت سے اولاد کو نکال کر ان سے میثاق لینے کا ذکر ہے۔

میثاق کے حجت ہونے پر ایک اور اشکال کا جواب

اس آیت میں یہ فرمایا ہے: (یہ گواہی اس لیے لی ہے) تاکہ قیامت کے دن تم یہ (نہ) کہہ دو کہ ہم اس سے بے خبر تھے ○ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر یہ اقرار اضطراری تھا بایں طور کہ ان پر حقیقت واقعی منکشف کر دی گئی تھی اور انہوں نے عین یقین سے مشاہدہ کر لیا تھا تو ان کے لیے جائز ہو گا کہ وہ قیامت کے دن یہ کہہ دیں کہ ہم نے اس وقت اقرار کیا تھا جب ہم پر یہ حقیقت منکشف کر دی گئی تھی اور جب ہم سے یہ انکشاف زائل کر دیا گیا اور ہم کو ہماری آراء کے حوالے کر دیا گیا تو ہم میں سے بعض صحت اور صواب کو پہنچنے اور بعض سے خطا ہوئی اور اگر انہوں نے اس دن نظر اور فکر سے استدلال کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت اور تائید سے صحت اور صواب کو پہنچ کر اقرار کیا تھا تو وہ قیامت کے دن یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح پہلے دن ہماری نصرت اور تائید کی گئی تھی اگر بعد میں بھی ہمیں یہ نصرت اور تائید حاصل ہوتی تو بعد میں بھی ہم اسی طرح اللہ تعالیٰ کی توحید کی گواہی دیتے اور شرک نہ کرتے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ان سے اپنی ربوبیت کا میثاق لیا تھا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں ایسی عقل اور بصیرت رکھ دی تھی جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور معرفت کے اور اک پر قادر تھے۔

اس اعتراض کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اقرار اضطراری تھا اور حقیقت واقعی ان پر منکشف کر دی گئی تھی۔ لیکن ان کا یہ کہنا غلط ہے کہ دنیا میں جسمانی تولد کے بعد ان کو ان کی آراء کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ان سے کہا جائے گا کہ اے جھوٹو! تم کو تمہاری آراء کے حوالے کب کیا گیا تھا کیا ہم نے تمہارے پاس اپنے نبی اور رسول نہیں بھیجے تھے جو تم کو خواب غفلت سے جگا رہے تھے اور تم کو اس عہد اور میثاق کی یاد دلا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت اور وحدانیت پر اور اپنے رسولوں کے صدق پر دلائل قائم کر دیے ہیں اور جب رسولوں نے یہ بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے ازل میں یہ میثاق لیا تھا اور ان کا صدق معجزہ سے ثابت ہو چکا ہے تو اب جو شخص اس میثاق کا انکار کرے گا وہ معاند ہو گا اور اس عہد کا توڑنے والا ہو گا اور مخبر صادق کی خبر کے بعد اس کے بھول جانے اور یاد نہ رہنے کا عذر معتبر نہیں ہو گا۔

کیا یہ میثاق کسی کو یاد ہے؟

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

ذی النون سے پوچھا گیا کیا آپ کو یہ میثاق یاد ہے؟ انہوں نے کہا گویا کہ اب بھی میرے کانوں میں اس عہد اور میثاق کی آواز آ رہی ہے اور بعض عارفین نے یہ کہا کہ لگتا ہے کہ یہ میثاق کل لیا گیا تھا۔ (روح المعانی ج ۹، ص ۱۰۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

نبی ﷺ کا اصل کائنات ہونا

نیز علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

بعض اہل اللہ نے یہ کہا ہے کہ جب حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد کے ذروں کو نکالا گیا تو سب سے پہلے نبی ﷺ کے ذرہ نے جواب دیا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں سے یہ فرمایا:

إِنِّي سَاطِعًا أَوْ كَرِهًا قَالْتَا إِنَّا ظَالِمَاتٌ
خوشی یا ناخوشی سے دونوں حاضر ہو جاؤ (تو) دونوں نے کہا
(حم السجدہ: ۴۱) ہم خوشی سے حاضر ہوئے۔

اس وقت زمین کے جس ذرہ نے سب سے پہلے جواب دیا تھا وہ نبی ﷺ کا ذرہ تھا۔ اور یہ کعبہ کی مٹی کا ذرہ تھا اور سب سے پہلے زمین کا یہی حصہ بنایا گیا تھا، پھر اسی کو پھیلا یا گیا جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے اور جب آپ کی تربت (مٹی) شریفہ کعبہ کی مٹی تھی تو آپ ﷺ کا دفن بھی مکہ میں ہونا چاہیے تھا، کیونکہ روایت ہے کہ جس جگہ کی مٹی سے انسان بنایا جاتا ہے اسی جگہ اس کا دفن ہوتا ہے، لیکن کہا گیا ہے کہ جب طوفان آیا تھا تو ایک جگہ کی مٹی دوسری جگہ پہنچ گئی تھی اور مٹی کا وہ مبارک اور پاک ذرہ جو نبی ﷺ کا مبداء تھا اس جگہ پہنچ گیا جہاں اب مدینہ منورہ میں نبی ﷺ کا دفن اقدس ہے۔ اور اس کلام سے یہ مستفاد ہوا کہ نبی ﷺ تخلیق کی اصل ہیں اور تمام کائنات آپ کی تابع ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ چونکہ آپ کا ذرہ تمام مخلوق کی ام (اصل) ہے اسی وجہ سے آپ کا لقب امی ہے۔

(روح المعانی ج ۹، ص ۱۱۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے رسول مکرم!) ان پر اس شخص کا حال بیان کیجئے جس کو ہم نے اپنی آیتوں کا علم دیا تو وہ ان کی اطاعت سے نکل گیا پس شیطان نے اس کا پیچھا کیا سو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کے ذریعہ اس کو بلندی عطا کرتے مگر وہ پستی کی طرف جھکا اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کی سو اس کی مثال اس کتے کی طرح ہے کہ اگر تم اس پر حملہ کرو تب بھی وہ ہانپ کر زبان نکالے یا چھوڑ دو پھر بھی وہ ہانپ کر زبان نکالے، یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں آپ (لوگوں کے سامنے) یہ واقعات بیان کیجئے تاکہ وہ غور و فکر کریں ○ کیسی بری مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور وہ اپنے ہی نفسوں پر ظلم کرتے تھے ○ (الاعراف: ۱۷۷-۱۷۵)

واتل علیہم نبأ الذی کے شان نزول میں مختلف روایات

ان آیتوں میں نبی ﷺ کو جس شخص کا قصہ بیان کرنے کا حکم فرمایا ہے قرآن مجید اور احادیث میں اس کے نام کی تصریح نہیں ہے نہ اس کی صفت اور اس کی شخصیت کا تذکرہ ہے۔ البتہ مفسرین نے اس کے متعلق مختلف اقوال ذکر کیے ہیں۔ مسروق نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا کہ وہ بنو اسرائیل کا ایک شخص تھا اور اس کا نام بلعم بن ابر تھا۔ عمران بن حصین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس کا نام بلعم بن باعریا بلعم بن باعوراء تھا۔ نافع بن عاصم نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اس کا نام امیہ بن ابی السلت تھا۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۱۶۳-۱۶۰، مطبوعہ بیروت ۱۳۱۵ھ)

عکرمہ نے کہا بلعام نبی تھا اور اس کو کتاب دی گئی تھی، مجاہد نے کہا اس کو نبوت دی گئی تھی اس کی قوم نے اس کو رشوت دی کہ وہ خاموش رہے، اس نے ایسا ہی کیا اور ان کو ان کے فسق و فجور پر ملامت نہیں کی۔ علامہ ماوردی نے کہا یہ اقوال صحیح نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اسی شخص کو نبوت کے لیے منتخب فرماتا ہے جس کے متعلق اس کو علم ہوتا ہے کہ وہ اس کی اطاعت ترک نہیں کرے گا اور معصیت کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ (الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۲۸۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

امام حسین بن مسعود القراء البغوی المتوفی ۵۱۶ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس اور ابن اسحاق وغیرہم نے بیان کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب جبارین سے جنگ کرنے کا قصد کیا اور کنعان سے شام کی طرف روانہ ہوئے تو بلعم کی قوم بلعم کے پاس گئی۔ بلعم کو اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم معلوم تھا۔ ان لوگوں نے بلعم سے کہا موسیٰ بہت سخت آدمی ہے اور اس کے ساتھ بہت بڑا لشکر ہے۔ اور وہ ہم کو ہمارے شہروں سے نکلنے اور ہم سے جنگ کرنے کے لیے آیا ہے، وہ ہم کو قتل کر کے ہمارے شہروں میں بنو اسرائیل کو آباد کرے گا اور تم وہ شخص ہو جو مستجاب الدعوات ہے (جس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں) تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ان کو یہاں سے بھگا دے۔ بلعم نے کہا تم پر افسوس ہے وہ اللہ کے نبی ہیں، ان کے ساتھ فرشتے اور مومنین ہیں، میں ان کے خلاف کیسے بددعا کر سکتا ہوں، اور مجھے اللہ تعالیٰ سے جو علم ملا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر میں نے ان کے خلاف بددعا کی تو میری دنیا اور آخرت برباد ہو جائے گی۔ انہوں نے بار بار اصرار کیا تو اس نے کہا اچھا میں استخارہ کرتا ہوں اور اس کا معمول بھی یہی تھا کہ وہ استخارہ کرنے کے بعد دعا کرتا تھا۔ اس کو نیند میں یہ بتایا گیا کہ ان کے خلاف بددعا نہ کرنا۔ اس نے اپنی قوم سے کہا میں نے استخارہ کیا تھا اور مجھے ان کے خلاف دعا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ پھر اس کی قوم نے اس کو ہدیے اور تحفے پیش کیے جن کو اس نے قبول کر لیا، انہوں نے دوبارہ اس سے بددعا کرنے کے لیے کہا، اس نے پھر استخارہ کیا اس دفعہ اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔ اس کی قوم نے کہا اگر اللہ کو یہ بددعا کرنا پسند نہ ہو تا تو وہ تم کو پہلی بار کی طرح صراحتاً منع فرمادیتا، وہ اس سے مسلسل اصرار کرتے رہے، حتیٰ کہ وہ ان کے کہنے میں آگیا وہ ایک گدھی پر سوار ہو کر ایک پہاڑ کی طرف روانہ ہوا گدھی نے اس کو کئی بار گرایا وہ پھر سوار ہو جاتا تھا۔ بالاخر اللہ کے حکم سے گدھی نے اس سے کلام کیا اور کہا افسوس ہے بلعم تم کہاں جا رہے ہو، کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ فرشتے مجھے جانے سے روک رہے ہیں۔ کیا تم اللہ کے نبی اور فرشتوں کے خلاف بددعا کرنے کے لیے جا رہے ہو؟ بلعم باز نہیں آیا وہ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کر بددعا کرنے لگا۔ وہ بنو اسرائیل کے خلاف بددعا کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی زبان پر اس کی قوم کے خلاف بددعا کے الفاظ آجاتے تھے، اس کی قوم نے کہا اے بلعم یہ کیا کر رہے ہو؟ تم تو ہمارے خلاف بددعا کر رہے ہو! اس نے کہا یہ میرے اختیار میں نہیں ہے، اللہ کی قدرت مجھ پر غالب آگئی، پھر اس کی زبان نکل کر اس کے سینہ کے اوپر لٹک گئی، اس نے کہا میری تو دنیا اور آخرت برباد ہو گئی۔ اب میں تمہیں ان کے خلاف ایک تدبیر بتاتا ہوں، تم حسین و جمیل عورتوں کو بنا سنوار کر ان کے لشکر میں بھیج دو، اگر ان میں سے ایک شخص نے بھی ان کے ساتھ بدکاری کر لی تو تمہارا کام بن جائے گا کیونکہ جو قوم زنا کرے اللہ تعالیٰ اس پر سخت ناراض ہوتا ہے اور اس کو کامیاب ہونے نہیں دیتا۔

بنو اسرائیل کے ایک شخص جس کا نام زمری بن شلوم تھا اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منع کرنے کے باوجود کستی نامی ایک کنعانی عورت کے ساتھ بدکاری کی جس کی پاداش میں اسی وقت بنو اسرائیل پر طاعون مسلط کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ کا مشیر فنحاص بن العیزار نامی ایک اسرائیلی شخص تھا وہ اس وقت وہاں موجود نہ تھا، جب وہ آیا اور اس کو زمری بن شلوم کی سرکشی کا پتہ چلا تو اس نے خیمہ میں گھس کر زمری اور اس عورت دونوں کو قتل کر دیا۔ تب طاعون کا عذاب ان سے اٹھایا گیا لیکن اس اثناء میں ستر ہزار اسرائیلی طاعون کے عذاب سے ہلاک ہو چکے تھے۔

مقاتل نے کہا کہ بلقاء کے بادشاہ نے بلعام سے کہا کہ تم موسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف بددعا کرو، اس نے کہا وہ میرے ہم مذہب ہیں میں ان کے خلاف بددعا نہیں کروں گا۔ بادشاہ نے اس کو سولی دینے کے لیے صلیب تیار کی وہ ڈر گیا اور گدھی پر سوار ہو کر بددعا کرنے کے لیے گیا۔ گدھی راستہ میں رک گئی اور چلتی نہ تھی وہ گدھی کو مارنے لگا گدھی نے کہا مجھے کیوں مارتے ہو؟ مجھے یہی حکم دیا گیا ہے۔ پھر وہ لوٹ آیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے رب! ہم کس وجہ سے میدان تیرے میں بھٹک

رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلعام کی دعا کی وجہ سے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب! جس طرح تو نے میرے خلاف اس کی دعا سن لی ہے اسی طرح اس کے خلاف میری دعا بھی قبول فرما! پھر موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا کی کہ اس سے اسم اعظم چھین لیا جائے اور اس سے ایمان سلب کر لیا جائے۔ سو ایسا ہی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فانسلخ منها یعنی اس سے ایمان اور اسم اعظم چھین لیا گیا۔ (تفسیر ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۶۱)

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص، سعید بن المسیب، زید بن اسلم اور لیث بن سعد نے بیان کیا کہ یہ آیت امیہ بن الصلت ثقفی کے متعلق نازل ہوئی ہے، اس نے کتاب (تورات) کو پڑھا تھا اور اس کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک رسول بھیجے والا ہے، اس کو امید تھی کہ وہ متوقع رسول وہ ہوگا، اور جب اللہ تعالیٰ نے (سیدنا) محمد ﷺ کو رسول بنا دیا تو اس نے آپ سے حسد رکھا اور آپ کا کفر کیا، وہ بہت حکمت والا اور نصیحت کرنے والا تھا۔ وہ بعض ممالک کے دورہ پر گیا جب وہ واپس آیا تو مقتولین بدر کے پاس سے گزرا۔ اس نے ان کے متعلق پوچھا اس کو بتایا گیا کہ ان کو سیدنا محمد ﷺ نے قتل کیا ہے تو وہ کہنے لگا کہ اگر وہ نبی ہوتے تو اپنے رشتے داروں کو قتل نہ کرتے، آخر کار وہ کفر پر ہی مر گیا۔

(تفسیر ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۶۶، معالم التنزیل ج ۲، ص ۱۸۰-۱۷۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے ان روایات کے علاوہ یہ بھی ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ابو عامر راہب کے متعلق نازل ہوئی ہے جس کو نبی ﷺ نے فاسق فرمایا تھا۔ یہ زمانہ جاہلیت میں راہب تھا۔ جب اسلام آیا تو یہ شام چلا گیا اور اس نے منافقین کو مسجد ضرار بنانے کا حکم دیا اور یہ قیصر کے پاس گیا اور اس کو نبی ﷺ کے خلاف لڑنے پر ابھارا، اور یہ وہیں پر مر گیا۔ یہ سعید بن مسیب کا قول ہے اور حسن اور اسم نے کہا کہ یہ آیت اہل کتاب کے ان منافقین کے متعلق نازل ہوئی ہے جو نبی ﷺ کو پہچانتے تھے اور قتادہ، عکرمہ اور ابو مسلم کا قول یہ ہے کہ یہ ان تمام لوگوں کے متعلق عام ہے جن کو ہدایت دی گئی اور انہوں نے ہدایت سے اعراض کیا پھر ان سے ہدایت چھین لی گئی۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۰۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

بد عمل اور رشوت خور عالم کی مذمت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس کو ہم نے اپنی آیتوں کا علم دیا تو وہ ان کی اطاعت سے نکل گیا۔

اس کے دو معنی ہیں ایک معنی یہ ہے کہ ہم نے اس کو دلائل توحید کی تعلیم دی اور وہ ان کا عالم ہو گیا پھر وہ اللہ کی اطاعت سے اس کی معصیت کی طرف اور اس کی محبت سے اس کی ناراضگی کی طرف نکل گیا۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ ہم نے اس پر توحید کی ہدایت پیش کی لیکن اس نے ہدایت کو قبول نہیں کیا اور کفر پر برقرار رہا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا پس شیطان نے اس کا پیچھا کیا سو وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔

اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ جس شخص کو ہدایت دی گئی اور اس نے ہدایت سے اعراض کر کے خواہش نفس اور گمراہی کو اختیار کر لیا اور دنیا کی دلچسپیوں کی طرف راغب ہوا حتیٰ کہ وہ شیطان کا ہم نوا ہو گیا تو اس کا انجام آخرت کی ناکامی اور نامرادی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قصہ اس لیے بیان فرمایا ہے تاکہ لوگ اس کے حال سے عبرت پکڑیں۔

پھر فرمایا اور اگر ہم چاہتے تو اس کو بلندی عطا کرتے مگر وہ پستی کی طرف جھکا اور اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔

اس کا معنی یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے تو اس کے اور اس کے کفر کے درمیان اپنی حفاظت کو حاصل کر دیتے بایں طور کہ اس کو قہراً اور جبراً ہدایت پر قائم کر دیتے لیکن ایسا کرنا اس کو مکلف کرنے کے منافی تھا، اس لیے ہم نے اس کو اس کے اختیار پر قائم رکھا اور اس نے اپنے اختیار سے ہدایت کی بلندی کے بجائے گمراہی کی پستی کو اختیار کر لیا اور اس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔

اس کی نظیر یہ آیتیں ہیں:

سو اگر اللہ چاہتا تو ضرور تم سب کو ہدایت عطا فرماتا۔
اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو ہدایت یافتہ بنا دیتا۔

فَلَوْ شَاءَ لَهَدَىٰكُمْ أَجْمَعِينَ (الانعام: ۱۳۹)
لَوْ شَاءَ اللَّهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيعًا

(الرعد: ۳۱)

ان آیات میں علماء کے لیے بہت سخت حکم ہے، کیونکہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات بینات کا علم عطا فرمایا اور اس کو اپنے اسم اعظم کی تعلیم دی اور اس کو مستجاب الدعوات بنایا یعنی اس کی دعائیں قبول ہوتی تھیں۔ لیکن جب اس نے اپنی نفسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ دین سے نکل گیا اور کتے کی مانند ہو گیا اور اس میں یہ دلیل ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنی بہت زیادہ نعمتیں عطا فرماتا ہے تو اس پر گرفت بھی بہت سخت ہوتی ہے سو اگر وہ شخص ہدایت سے اعراض کرے اور خواہش نفس کی پیروی کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کے اطاف و عنایات سے بہت زیادہ دور ہو جاتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کا علم زیادہ ہو اور اس کی دنیا میں بے رغبتی زیادہ نہ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ ہی دور ہو گیا۔

(الفردوس بماثور الخطاب ج ۳، رقم الحدیث: ۵۸۸۷، الجامع الصغیر ج ۲، رقم الحدیث: ۸۳۹۷، کنز العمال ج ۱۰، رقم الحدیث: ۲۹۰۱۶)
اس وجہ سے علماء نے کہا ہے کہ جو علم اللہ کی اطاعت کے ماسوا کا ہو وہ گناہوں کا مادہ ہے۔ علم کی اصل عبادت کی طرف رغبت ہے اور اس کا ثمرہ سعادت ہے۔ اور زہد کی اصل خوف خدا ہے اور اس کا ثمرہ عبادت ہے۔ پس جب زہد اور علم مل جائیں تو سعادت مکمل ہو جاتی ہے۔ حجت الاسلام نے کہا طلب علم میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں، ایک وہ شخص ہے جو علم کو آخرت کے زاد راہ کے لیے طلب کرتا ہے، وہ علم سے صرف اللہ کی رضا کا ارادہ کرتا ہے یہ کامیاب لوگوں میں سے ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو علم کو دنیا کے مال و متاع کے لیے طلب کرتا ہے اگر توبہ سے پہلے اس کو موت آگئی تو اس کے برے خاتمہ کا اندیشہ ہے، اور اگر اس کو توبہ کی مہلت مل گئی تو یہ کامیاب لوگوں میں سے ہے۔ تیسرا وہ شخص ہے جس پر شیطان غالب ہوتا ہے اور وہ اپنے علم کو مال کی کثرت کا ذریعہ بناتا ہے اور اپنے پیروکاروں کی کثرت کی بنا پر تکبر کرتا ہے اور خواہش نفس کی پیروی کرنے کے باوجود اپنے آپ کو نیکوں میں سے شمار کرتا ہے، سو یہ شخص ہلاک ہونے والوں میں سے ہے۔

مسند الفردوس کی یہ حدیث ضعیف ہے اس کی سند میں موسیٰ بن ابراہیم ہے۔ امام دارقطنی نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ امام ابن حبان نے روضۃ العقلاء میں اس کو موقوف قرار دیا ہے، یہ حضرت علی کا قول ہے۔ امام ازدی نے کتاب الضعفاء میں حضرت علی سے روایت کیا ہے جس شخص کا علم اللہ کے متعلق زیادہ ہو پھر اس کے دل میں دنیا میں محبت زیادہ ہو تو اس پر اللہ کا غضب زیادہ ہوتا ہے۔ (فیض القدر ج ۱۱، ص ۵۶۲۸، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ المکرمہ ۱۳۱۸ھ)

بد عمل اور رشوت خور عالم کی کتے کے ساتھ مماثلت کا بیان

نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا سو اس کی مثال اس کتے کی طرح ہے کہ اگر تم اس پر حملہ کرو تب بھی وہ ہانپ کر زبان نکالے یا چھوڑ دو پھر بھی وہ ہانپ کر زبان نکالے۔

قرآن مجید میں بلہٹ کا لفظ ہے اور جب کتا شدید تھکاوٹ کی وجہ سے یا شدید گرمی اور پیاس کی وجہ سے زبان باہر نکالے تو اس کو عربی میں لہٹ کہتے ہیں۔

جو عالم دین دنیا کے مال و متاع کی وجہ سے دین کے احکام کو پس پشت ڈال دے اس آیت میں اس کی مثال ہانپنے والے کتے

سے دی گئی ہے۔ کتابہ ذات خود ذلیل جانور ہے اور ذلیل تر وہ کتابہ ہے جو ہر وقت ہانپتا رہتا ہو اور زبان باہر نکالے رہتا ہو خواہ تھکاوٹ ہو یا نہ ہو یا شدید گرمی اور پیاس ہو یا نہ ہو گویا کہ ہانپنا اور زبان باہر نکالنا اس کی طبیعت ثانیہ اور عادت اولیہ بن گئی ہو۔ اسی طرح جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے علم دین کی عزت اور کرامت سے نوازا ہو اور اس کو لوگوں کے مال کے مال کچیل لینے سے مستغنی کر دیا ہو، پھر وہ دین کے واضح احکام سے اعراض کر کے دنیا کی طرف جھکے اور اس خبیث عمل اور قبیح فعل پر برقرار رہے اور اس کو پسند کرے تو وہ اپنی طبعی دنائت اور خست کی وجہ سے یہ مذموم کام کر رہا ہے اس کو اس کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ ہر وقت ہانپنے والا کتا کسی ضرورت اور حاجت کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی فطرت ثانیہ کی وجہ سے ہر وقت ہانپتا رہتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ کتے کے ساتھ اس لیے مثال دی گئی ہے کہ حدیث میں دنیا کو مردار اور اس کے طلب گاروں کو کتا قرار دیا گیا ہے۔

امام ابو شجاع شیروبیہ بن شرداد بن شیروبیہ الدہلی المتوفی ۵۰۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ دنیا کی مثال ایسے مردار کی طرح ہے جس پر کتے جمع ہو گئے ہوں اور اس کو گھسیٹ رہے ہوں تو کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تم ان کی مثل کتے ہو اور ان کے ساتھ (اس مردار کو) گھسیٹو۔

(الفردوس بماثور الخطاب ج ۱، رقم الحدیث: ۵۰۲، الدر المستشرہ رقم الحدیث: ۲۳۲، ص ۱۶۹، جمع الجوامع رقم الحدیث: ۸۷۰، کنز العمال

رقم الحدیث: ۶۳۱۵)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم اس کتے پر حملہ کرو پھر بھی زبان نکالے گا اور اگر اس پر حملہ نہ کرو پھر بھی زبان نکالے گا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ زبان نکال کر ہانپنا اس کی فطرت ثانیہ اور عادت اولیہ بن چکی ہے۔ اسی طرح جو شخص گمراہ ہو اور مال پر حرص ہو اس کو تم نصیحت کرو پھر بھی گمراہی پر برقرار رہے گا اور مال کی حرص کرے گا اور اگر اس کو نصیحت کرنا چھوڑ دو پھر بھی وہ گمراہی پر برقرار رہے گا اور مال کی حرص کرے گا۔

ہانپنے والے کتے کی مثال کا تمام گمراہوں اور کافروں کو شامل ہونا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ ان لوگوں کی مثال ہے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ یہ مثال ان تمام لوگوں کو شامل ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ پہلے اہل مکہ یہ تمنا کرتے تھے کہ کوئی ہدایت دینے والا ہادی آئے جو ان کو اللہ کی اطاعت کی طرف ہدایت دے، پھر جب ان کے پاس ایک ایسا شخص کریم آیا جس کی امانت اور دیانت میں ان کو کوئی شک نہیں تھا تو انہوں نے اس کی تکذیب کی اور اللہ کی اطاعت نہ کی۔ سو جب انہیں اللہ کے دین اور اس کی عبادت کی دعوت نہیں دی گئی تھی جب بھی وہ اللہ کی توحید اور اس کی عبادت سے اعراض کرتے تھے اور جب انہیں یہ دعوت دی گئی تب بھی وہ اللہ کی توحید اور اس کی عبادت سے اعراض کرتے تھے تو ان پر یہ مثال منطبق ہو گئی کہ وہ اس ہانپنے والے کتے کی طرح ہیں کہ تم اس پر حملہ کرو تو پھر بھی وہ ہانپتا ہے اور حملہ نہ کرو تو وہ پھر بھی ہانپتا ہے۔

آیات مذکورہ سے مستنبط شدہ احکام شرعیہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیسی بری مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور وہ اپنے ہی نفسوں پر ظلم کرتے تھے ○

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلاتا ہے وہ کتے کی مثل ہے اور یہ کیسی بری مثال ہے، کتے کی فطرت یہ ہے کہ وہ اجنبی شخص پر بھونکنے لگتا ہے اور اگر وہی شخص اسے کوئی روٹی کا ٹکڑا یا ہڈی ڈال دے تو وہ اس کے آگے دم ہلانے لگتا

ہے اس طرح جو بے ضمیر اور رشوت خور علماء اور حکام ہیں وہ لوگوں کو سخت سزاؤں اور جرمانوں سے ڈراتے ہیں اور جب ان کو رشوت کی ہڈی پیش کر دی جائے تو وہ ان کے موافق ہو جاتے ہیں۔ ان آیات میں یہ بتایا ہے کہ ایک شخص کو اللہ کی آیات کا علم دیا گیا لیکن جب اس نے رشوت لے کر غلط کام کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے وہ علم چھین لیا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کسی بے قصور کو نقصان پہنچانے کے لیے یا ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لیے رشوت دینا حرام ہے، ہاں اپنا حق لینے کے لیے یا اپنے آپ کو نقصان سے بچانے کے لیے اگر رشوت دینا ناگزیر ہو تو رشوت دینا جائز ہے البتہ رشوت لینا ہر صورت میں ناجائز ہے۔ سورہ مائدہ میں ہم اس کی تفصیل بیان کر چکے ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بغیر دلیل کے کسی عالم کی تقلید نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے دلائل کا علم دیا جو اس سے چھین لیا گیا، اور خاص طور پر علماء کو اس آیت سے ڈرنا چاہیے کیونکہ ایک عالم کی غلط کاری کی وجہ سے اس کا علم چھین لیا گیا۔ اس لیے علماء کو غلط کاموں کے ارتکاب سے خصوصاً رشوت لے کر غلط کام کرنے سے بچنا چاہیے مبادا ان کا انجام بھی بلعم بن باعوراء کی طرح ہو۔ حکومت بعض علماء کو مختلف مناصب، مراعات اور وظائف دے کر ان سے اپنے حق میں فتوے لیتی ہے اور اپنے موافق بیان دلواتی ہے اگر یہ فتوے اور بیان قرآن اور سنت کی نصوص صریحہ کے خلاف اور ان سے متصادم ہوں تو پھر یہ لوگ اپنے دور کے بلعم بن باعوراء ہیں اور انہیں اس کے انجام سے عبرت پکڑنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جس کو اللہ ہدایت دے سو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو وہ گمراہی پر رکھے سو وہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ○ اور بے شک ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے ایسے انسان اور جن پیدا کیے جن کے دل ہیں مکروہ ان سے سوچتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں (مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں (مگر وہ ان سے سنتے نہیں) وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گمراہ ہیں وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ○ (الاعراف: ۱۷۹-۱۷۸)

ہدایت اور گمراہی کا اللہ کی جانب سے ہونے کا معنی

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے گمراہی کو بہت بری مثال سے واضح فرمایا ہے۔ اس لیے یہاں پر یہ فرمایا کہ ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ کی جانب سے ہیں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب ہدایت اور گمراہی دونوں اللہ کی جانب سے ہیں تو کسی شخص کا ہدایت یافتہ ہونا دنیا میں مدح اور آخرت میں ثواب کا مستحق نہیں ہونا چاہیے اور کسی شخص کا گمراہ ہونا دنیا میں مذمت اور آخرت میں عذاب کا مستحق نہیں ہونا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہدایت اور گمراہی کا پیدا کرنا اللہ کی جانب سے ہے اور ان کا اختیار کرنا بندہ کی طرف مفوض ہے، بندہ اگر ہدایت کو اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں ہدایت کو پیدا کر دیتا ہے اور اگر وہ گمراہی کو اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس میں گمراہی کو پیدا کر دیتا ہے۔ باقی رہا یہ کہ اس اختیار کو کس نے پیدا کیا ہے؟ یہ بہت غامض بحث ہے۔ اس کی تفصیل اور تحقیق کے لیے شرح صحیح مسلم ج ۷، ص ۲۷۹-۲۸۱ کو ملاحظہ فرمائیں۔

اس آیت پر اشکال کے حسب ذیل جوابات بھی دیے گئے ہیں:

- ۱- جس شخص کو اللہ تعالیٰ آخرت میں جنت اور ثواب کی طرف ہدایت دے گا وہ دنیا میں ہدایت یافتہ ہے اور جس شخص کو اللہ تعالیٰ آخرت میں جنت سے گمراہ کر دے گا وہ نقصان اٹھانے والا ہے۔
- ۲- جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور اس نے اس ہدایت کو قبول کر لیا اور اس کے تقاضوں پر عمل کیا وہ ہدایت یافتہ ہے اور جس شخص نے اللہ کی دی ہوئی ہدایت کو قبول نہیں کیا اس کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا اور وہ نقصان اٹھانے والا ہے۔
- ۳- جس نے ہدایت کو اختیار کر لیا اللہ تعالیٰ نے اس پر خاص لطف و کرم فرمایا وہ ہدایت یافتہ ہے اور جس نے گمراہی کو اختیار

کیا وہ اللہ تعالیٰ کے خاص لطف و کرم سے محروم ہو گیا اس کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا اور وہ نقصان اٹھانے والا ہے۔
 بہت سے جنات اور انسانوں کو دوزخ کے لیے پیدا کرنے کی توجیہ
 اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بے شک ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے انسان اور جن پیدا کیے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جن انسانوں اور جنات کے متعلق ازل میں یہ علم تھا کہ وہ کفر پر اصرار کریں گے اور ان کی موت کفر پر ہوگی ان کو اللہ تعالیٰ نے انجام کار دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس آیت میں لام تعلیل کا نہیں ہے بلکہ عاقبت کا ہے جس کا معنی ہے انجام کار۔ اس کی مثال حسب ذیل آیات ہیں:

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَآئِهِ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوا عَن سَبِيلِكَ (يونس: ۸۸)
 اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! تو نے فرعون کو اور اس کے عمال حکومت کو زینت کا سامان اور دنیا کی زندگی کے بہت اموال دیے ہیں تاکہ وہ انجام کار لوگوں کو تیرے راستے سے گمراہ کریں۔

فَالْتَقَطَهُ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُونَ لَهُمْ عَدُوًّا وَحَزَنًا (القصص: ۸)
 سو اس (موسیٰ) کو فرعون کے گھر والوں نے اٹھا لیا تاکہ انجام کار وہ ان کے لیے دشمن اور رنج و غم کا باعث ہو جائے۔

علامہ محمود بن عمر زمخشری متوفی ۵۲۸ھ لکھتے ہیں:

یہ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ ان کے اذہان حق کی معرفت کو قبول نہیں کریں گے اور یہ اپنی آنکھوں سے مخلوقات میں اللہ کی نشانیوں کو نہیں دیکھیں گے اور اللہ تعالیٰ کی آیات جب تلاوت کی جائیں گی تو یہ ان کو غور و فکر سے نہیں سنیں گے، کفر پر اصرار اور ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے قلوب ماؤف ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، ہیں اور ان کے کانوں میں ڈانٹیں ہیں۔ اس آیت سے مقصود یہود کا حال بیان کرنا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب میں انتہا کو پہنچ چکے ہیں، حالانکہ ان کو علم یقین ہے کہ ان کی کتابوں میں جس نبی کی بعثت کا وعدہ کیا گیا ہے وہ یہی ہیں یعنی سیدنا محمد ﷺ اور یہ ان بہت سے لوگوں میں سے ہیں جو ایمان لانے والے نہیں ہیں گویا کہ ان کو پیدا ہی دوزخ کے لیے کیا گیا ہے۔

(۱) لکشاف ج ۲، ص ۱۷۸-۱۷۷، مطبوعہ قم، ایران ۱۳۱۳ھ

اس آیت سے رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے گویا کہ یوں کہا گیا ہے کہ اگر یہ ضدی اور معاند مشرکین ایمان نہیں لاتے اور آپ کی نصیحت کو قبول نہیں کرتے تو آپ پریشان نہ ہوں یہ ضدی مشرکین ان لوگوں میں سے ہیں جن کو انجام کار دوزخ کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ان کی وجہ سے آپ طول خاطر نہ ہوں آپ اپنے دینی معاملات میں اور اپنے متبعین کے ساتھ مشغول رہیے اور ان کی پرواہ نہ کیجئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جنات تو آگ سے پیدا کیے گئے ہیں ان کو آگ کے عذاب کی کیا تکلیف ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے لیکن اگر اس کو اینٹ ماری جائے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے حالانکہ اینٹ بھی مٹی سے بنی ہوئی ہے۔ سو اسی طرح جنات کو بھی آگ سے تکلیف ہوگی خواہ وہ آگ سے بنے ہوئے ہیں۔

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ
 اور میں نے جن اور انس کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ

(الذاریات: ۵۶) میری عبادت کریں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن اور انس کو پیدا کرنے سے مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اور زیر تفسیر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر جن اور انس کو دوزخ کے لیے پیدا فرمایا ہے اور یہ واضح تعارض ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں اور جنات کو اس لیے پیدا فرمایا ہے کہ وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، سو جو اپنے اختیار اور ارادہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے ان کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمائے گا، اور دوزخ میں داخل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنات کو پیدا نہیں فرمایا لیکن جو اپنے اختیار اور ارادے سے کفر کریں گے اور اپنے مقصد تخلیق کے خلاف کام کریں گے ان کو اللہ تعالیٰ انجام کار دوزخ میں داخل فرمائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ مقصد تخلیق اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے اور دوزخ میں داخل کرنا مقصد تخلیق نہیں ہے۔ اس لیے ان آیتوں میں تعارض نہیں ہے۔

عقل کا محل دل ہے یا دماغ؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کے دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں (مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں) مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی وحدانیت کے دلائل پر دل سے غور و فکر نہیں کرتے، اور اس کائنات میں اس کے وجود پر جو نشانیاں ہیں ان کا آنکھوں سے مشاہدہ نہیں کرتے، اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کی جو تلاوت کی جاتی ہے اس کو کانوں سے غور سے نہیں سنتے اور نہ وعظ اور نصیحت کو سنتے ہیں۔

اس آیت میں فرمایا ہے جن کے دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ امام فخر الدین رازی شافعی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: علماء نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ علم کا محل قلب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بہ طور مذمت فقہ اور فہم کی ان کے دلوں سے نفی کی ہے اور یہ اسی وقت درست ہو گا جب فقہ اور فہم کا محل قلب ہو۔ واللہ اعلم۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۱۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۱۵ھ)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے اپنی دو انگلیوں سے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حلال ظاہر ہے اور حرام ظاہر ہے اور ان کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں جن کا بہت سے لوگوں کو علم نہیں ہے سو جو شخص شہادت سے بچا اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا اور جس شخص نے امور مشتبہ کو اختیار کیا وہ حرام میں مبتلا ہو گیا، جس طرح کوئی شخص کسی چراگاہ کی حدود کے گرد جانور چرائے تو قریب ہے کہ وہ جانور اس چراگاہ میں بھی چر لیں، سنو ہر بادشاہ کی ایک خاص حد ہوتی ہے اور یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی حدود اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں اور سنو جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک ہو تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور یاد رکھو وہ گوشت کا ٹکڑا قلب ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۵۰۱، صحیح مسلم الساقات، ۱۰۷ (۱۵۹۹) ۳۰۱۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۳۳۰، ۳۳۲۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۲۰۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۳۵۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۸۳)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: سنو! جسم میں ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ اگر وہ ٹھیک ہو تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور یاد رکھو گوشت کا وہ ٹکڑا قلب ہے۔ علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

ایک جماعت نے اس حدیث سے اس پر استدلال کیا ہے کہ عقل قلب میں ہے سر میں نہیں ہے، اور اس میں اختلاف مشہور ہے۔ ہمارے اصحاب (شافعیہ) اور جمہور متکلمین کا یہ نظریہ ہے کہ عقل قلب میں ہے، اور امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے کہ

نبیان القرآن

جلد چہارم

عقل دماغ میں ہے۔ علامہ مازری لکھتے ہیں عقل کے قلب میں ہونے کے قائلین اس آیت سے استدلال کرتے ہیں فتکون لہم قلوب یعقلون بہا کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے جن سے وہ سمجھتے اور اس آیت سے بھی استدلال کیا ہے ان فی ذلک لذکر لمن کان لہ قلب ”بے شک اس میں دل والے کے لیے نصیحت ہے“۔ ان آیات کے علاوہ اس حدیث سے بھی اس پر استدلال کیا جاتا ہے کہ عقل دل میں ہے۔

علامہ نووی لکھتے ہیں کہ جو علماء یہ کہتے ہیں کہ عقل دماغ میں ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ جب دماغ فاسد ہو تو عقل فاسد ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقل دماغ میں ہوتی ہے۔ علامہ نووی اس دلیل کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ دلیل صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ عقل دماغ میں نہ ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ عادت جاری ہو کہ وہ دماغ کے فساد کے وقت عقل کو فاسد کر دیتا ہو اور اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے۔ (شرح مسلم ج ۲، ص ۲۸، مطبوعہ کراچی)

علامہ نووی کا یہ جواب صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ آنکھ سے بصارت کا ادراک نہیں ہوتا اور آنکھ ضائع ہونے سے بصارت اس لیے چلی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت جاری ہے کہ وہ آنکھوں کے فساد کے وقت بصارت کو فاسد کر دیتا ہے اور یہ بدابہت کے خلاف ہے۔

دماغ کے محل عقل ہونے پر دلائل

عقل کا محل دماغ ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کی استعداد اور صلاحیت جس عضو میں رکھی ہے اس کا محل اسی عضو کو بنایا ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کی عادت جاری ہے اور ہم بدابہت ”جانتے ہیں کہ غور و فکر اور سوچ و بچار کا کام دماغ سے لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ مطالعہ کرنے زیادہ غور و فکر کرنے اور زیادہ سوچ و بچار سے دماغ تھک جاتا ہے دل کو کوئی تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ زیادہ پڑھنے سے سر میں درد ہو جاتا ہے دل میں کوئی درد نہیں ہوتا۔ اگر چربی بڑھ جائے اور مٹاپے سے عارضہ قلب کی بیماری لاحق ہو جائے اور دل کے دورے پڑنے لگیں تو اس سے انسان کی عقل متاثر نہیں ہوتی۔ اسی طرح بلند پریشر بڑھ جانے کی وجہ سے دل کو زیادہ مشقت اور محنت کرنا پڑے تو اس سے بھی عقل کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے برخلاف اگر دماغ کو کوئی بیماری لاحق ہو جیسے عدم ارتکاز، ذہنی انتشار، انجانا خوف، نسیان، مایخولیا اور جنون وغیرہ تو ان بیماریوں سے عقل کی کارکردگی کم یا فاسد ہو جاتی ہے۔ نیز اگر دماغ پر کوئی چوٹ لگ جائے تو اس سے بھی عقل متاثر ہوتی ہے۔ بعض اوقات دماغ کی چوٹ کی وجہ سے انسان کی یادداشت ختم ہو جاتی ہے۔ بعض دفعہ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کم یا ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تمام چیزیں بکثرت مشاہدات اور بدابہت سے ثابت ہیں اور ان کا انکار کرنا بدابہت کا انکار کرنا ہے اور سب سے واضح دلیل یہ ہے کہ مغربی ممالک میں بعض لوگوں کا آپریشن سے دل بدل دیا گیا اگر عقل اور ادراک کا محل دل ہوتا تو دل بدل جانے سے پوری شخصیت بدل جانی چاہیے تھی جبکہ ان لوگوں نے بتایا کہ ان کے علوم اور معلومات، احساسات اور جذبات میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا اور اس سے ثابت ہوا کہ عقل کا محل دماغ ہے دل نہیں ہے۔

قرآن اور حدیث میں دل کی طرف عقل اور ادراک کی نسبت کرنے کی توجیہ

رہا یہ سوال کہ قرآن مجید میں عقل اور ادراک کی نسبت دل کی طرف کی گئی ہے دماغ کی طرف نہیں کی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن سائنس کی زبان میں نہیں بلکہ عرف اور ادب کی زبان میں کلام کرتا ہے اور روزمرہ کی گفتگو، عرف، محاورات اور ادبی زبان میں علم و ادراک، سوچ و بچار، احساسات، جذبات، خیالات بلکہ تقریباً دماغ کے تمام افعال کو سینے اور دل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے حتیٰ کہ کسی چیز کے یاد ہونے کو کہتے ہیں کہ وہ تو میرے سینے میں موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دل میں یہ خیال

آیا، میرا دل اس کو نہیں مانتا، حالانکہ دل تو صرف خون پمپ کرنے کا ایک آلہ ہے۔ سائنسی ترقی کے اس دور میں بھی پڑھے لکھے ادیب اور سائنس دان اپنی گفتگو میں الفت اور محبت اور علم اور ادراک کی نسبت دل کی طرف کرتے ہیں دماغ کی طرف نہیں کرتے۔

قرآن مجید میں عام لوگوں کے عرف اور محاورے کے مطابق خطاب ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: و انزل من السماء ماء اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا (بقرہ: ۲۲) حالانکہ یہ پانی بخارات کی صورت میں زمین سے اوپر جاتا ہے اور بارش کی صورت میں نازل ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ عرف اور محاورے میں کہا جاتا ہے کہ آسمان سے بارش ہوئی، اس لیے اس کے مطابق خطاب فرمایا۔ نیز ارشاد ہے حتی اذا بلغ مغرب الشمس وجدھا تغرب فی عین حمئة (الکھن: ۸۶) یہاں تک کہ جب وہ سورج کے غروب ہونے کی جگہ پہنچے تو انہوں نے اس (سورج) کو سیاہ دلدل کے چشمہ میں غروب ہوتا ہوا دیکھا، حالانکہ عقل اور سائنس کے نزدیک سورج کبھی غروب نہیں ہوتا وہ ہمیشہ اپنے مدار میں گھومتا رہتا ہے اور یہ تو بالکل بدیہی ہے کہ سورج چشمہ میں غروب نہیں ہو سکتا لیکن عرف میں ایسا ہی کہتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں سورج پہاڑ کے پیچھے چھپ گیا اسی طرح عرف کے مطابق یہاں ارشاد فرمایا ہے۔

میرے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ نے فرمایا قرآن مجید میں عام سطح کے لوگوں اور عرف کے مطابق خطاب کیا ہے، اور عقلاء اور سائنس دانوں کی اصطلاح کے مطابق خطاب نہیں کیا، کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ عقل اور سائنس اور اعلیٰ درجہ کے دماغوں کے مطابق خطاب کرتا تو یہ عام لوگوں کے لیے غیر مانوس ہوتا اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکتے اور یہ چیز اللہ تعالیٰ کی حکم کے بھی خلاف تھی اور اس کی رحمت کے بھی خلاف تھی۔

مذکورہ حدیث میں صراحتاً "عقل اور ادراک کی دل کی طرف نسبت نہیں کی گئی بلکہ انسانی دل کو اخلاق اور عادات کا مرکز قرار دیا ہے اگر دل میں اچھے خیالات ہوں تو انسان کے تمام اعضاء سے اچھے افعال کا ظہور ہو گا لیکن چونکہ اخلاق کا اچھا یا برا ہونا بھی انسانی فکر پر موقوف ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس حدیث میں فکر کا مرکز دل کو قرار دیا ہے اور ہمارے نزدیک یہ بھی عرف اور محاورے کے مطابق اطلاق مجازی ہے۔ اس بحث کو مکمل کرنے کے لیے ہم اس سلسلے میں ائمہ مجتہدین اور فقہاء اسلام کے نظریات پیش کریں گے۔ علامہ نووی کے حوالے سے ہم امام شافعی کا نظریہ بیان کر چکے ہیں کہ وہ دل کو عقل کا محل قرار دیتے ہیں اب ہم باقی ائمہ اور فقہاء کے نظریات پیش کریں گے۔ تاہم اس سے پہلے ہم عقل کی تعریف بیان کریں گے۔

عقل کی تعریف میں علماء کے اقوال

علامہ محمد فرید وجدی لکھتے ہیں: عقل انسان میں ادراک کرنے کی قوت ہے اور یہ روح کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے اور اس کا محل مخ (مغز) ہے، جیسا کہ ابصار روح کے خصائص میں سے ایک خاصہ ہے اور اس کا آلہ آنکھ ہے۔

(دائرة المعارف القرن العشرين ج ۶، ص ۵۲۲، مطبوعہ بیروت)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں: عقل وہ قوت ہے جس سے حقائق اشیاء کا ادراک ہوتا ہے ایک قول یہ ہے اس کا محل سر ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا محل قلب ہے۔ (کتاب التعریفات ص ۶۵، مطبوعہ ایران)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں: عقل وہ قوت ہے جس میں علوم اور ادراکات کی صلاحیت ہے اور ایک قول یہ ہے کہ عقل ایک جوہر ہے جس سے غائبات کا بالواسطہ اور محسوسات کا بالمشاہدہ ادراک ہوتا ہے۔ (شرح العقائد ص ۱۶، مطبوعہ دہلی)

علامہ زبیدی نے ایشیالی سے نقل کیا ہے کہ عقل اگر عرض ہے تو وہ نفس میں ایک ملکہ ہے جس کی وجہ سے نفس میں علوم

اور اوراکت کی صلاحیت ہے، اور اگر عقل جوہر ہے تو وہ ایک جوہر لطیف ہے جس کی وجہ سے غائبات کا بالواسطہ اور محسوسات کا بالمشاہدہ ادراک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو دماغ میں پیدا کیا ہے اور اس کا نور قلب میں ہے۔

(تاج العروس، ج ۸، ص ۲۶، مطبوعہ مصر)

علامہ زبیدی نے علامہ مجد الدین کی اس تعریف کو ذکر کیا ہے: عقل وہ قوت ہے جس سے اچھی اور بری چیزوں میں تمیز حاصل ہوتی ہے اور علامہ راغب اصفہانی کی یہ تعریف ذکر کی ہے: عقل وہ قوت ہے جس سے قبول علم کی صلاحیت ہے اور لکھا ہے کہ حق یہ ہے کہ عقل قلب یا دماغ میں ایک روحانی نور ہے جس سے نفس علوم بدیہیہ اور نظریہ کا ادراک کرتا ہے۔

(تاج العروس، ج ۸، ص ۲۵، مطبوعہ مصر)

علامہ شرتونی نے لکھا ہے عقل ایک روحانی نور ہے جس سے نفس علوم بدیہیہ اور نظریہ کا ادراک کرتا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ وہ ایک طبعی صفت ہے جس کی وجہ سے انسان میں فہم خطاب کی صلاحیت ہوتی ہے۔ (اقرّب الموارد، ج ۲، ص ۸۱۲، مطبوعہ ایران)

محل عقل کے بارے میں ائمہ مذاہب کے اقوال

امام ابو حنیفہ نے فرمایا ہے عقل دماغ میں ہے۔ شمس الائمہ سرخسی حنفی لکھتے ہیں:

اگر کوئی شخص کسی کے سر پر ضرب لگائے جس سے اس کی عقل چلی جائے تو عقل کے جانے کے اعتبار سے اس پر دیت لازم ہوگی اور اس میں موضع (ایسی ضرب جس سے ہڈی ظاہر ہو جائے در مختار) کی ارش (جرمانہ) بھی داخل ہوگی اور حسن بنی شاذلی کا قول ہے کہ اس میں موضع کی ارش داخل نہیں ہوگی، کیونکہ جنایت (ضرب لگانے) کا محل مختلف ہے کیونکہ موضع کا محل اور ہے اور عقل کا محل اور ہے برخلاف اس صورت کے جب موضع بالوں کے ساتھ ہو، ہم یہ کہتے ہیں کہ عقل کا جاننا نفس کے تبدیل ہو جانے اور اس کے بہائم (حیوانوں) کے ساتھ لاحق ہو جانے کے مترادف ہے اور یہ بمنزلہ موت ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے سر پر ایسی ضرب لگائے جس سے ہڈی ظاہر ہو جائے اور وہ اس سے مر جائے تو اس سے پوری دیت لازم آتی ہے اور اس میں سر پر ضرب لگانے کا جرمانہ بھی داخل ہے۔ (المبسوط ج ۲۶، ص ۹۹، مطبوعہ بیروت)

شمس الائمہ سرخسی کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اگر سر پر ضرب لگانے سے مکمل عقل زائل ہو جائے تو پوری دیت لازم آئے گی، ورنہ اس کے حساب سے لازم آئے گی اور اس مسئلہ میں یہ دلیل ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ کے نزدیک عقل کا محل دماغ ہے۔

امام مالک کے نزدیک بھی عقل کا محل دماغ ہے۔ علامہ مخون بن سعید تنوخی مالکی لکھتے ہیں:

میں نے امام عبدالرحمان بن قاسم سے سوال کیا کہ کسی شخص کے سر پر عمدہ ایسی ضرب لگائی گئی جس سے اس کی ہڈی ظاہر ہو گئی اور اس کی سماعت اور عقل چلی گئی تو اس مسئلہ میں امام مالک کا کیا قول ہے؟ امام ابن قاسم نے فرمایا اگر اس نے ایسی ضرب لگائی جس سے ہڈی ظاہر ہو گئی اور وہ دماغ تک پہنچ گئی تو موضع کا قصاص لیا جائے گا اور مامومہ (ضرب دماغ تک پہنچنے میں) اس کی ناقلہ دیت ادا کریں گے، اور اگر اس نے کسی کے سر پر ایسی ضرب لگائی جس سے اس کی ہڈی ظاہر ہو گئی اور اس کی سماعت اور عقل چلی گئی تو اس کے علاج کے بعد دیکھا جائے گا اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو موضع میں ضارب سے قصاص لیا جائے گا پھر دیکھا جائے گا آیا اس ضرب سے مضروب کی سماعت اور عقل زائل ہو گئی ہے اگر علاج کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے اور اس کی سماعت اور عقل زائل نہیں ہوئی ہو تو اس کے مال سے سماعت اور عقل کی دیت وصول نہیں کی جائے گی۔

(المدونۃ الکبریٰ، ج ۲، ص ۲۸۷، مطبوعہ بیروت)

اس مسئلہ سے واضح ہو گیا کہ امام مالک کے نزدیک بھی عقل دماغ میں ہے۔ امام شافعی کے بارے میں ہم پہلے علامہ نووی سے نقل کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک عقل قلب میں ہے۔ امام رازی شافعی کی بھی یہی رائے ہے اور امام احمد بن حنبل کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ حنبلی علماء نے عقل کا مستقر قلب قرار دیا ہے۔ علامہ عبدالرحمن بن الجوزی حنبلی لکھتے ہیں:

القلب قطعة من دم جامدة سوداء وهو مستكن في الفواد وهو بيت النفس و مسكن العقل۔

قلب سیاہ جسے ہوئے خون کا ایک ٹوٹرا ہے یہ دل کی کوٹھڑی ہے نفس کا گھر ہے اور عقل کا مسکن ہے۔

(زاد المسیر ج ۱، ص ۲۸، مطبوعہ بیروت)

کفار کا جانوروں سے زیادہ گم راہ ہونا

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گم راہ ہیں وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ انسان اور باقی حیوانات غذا حاصل کرنے کی قوت، نشوونما کی قوت اور تولید کی قوت میں مشترک ہیں، نیز حواس ظاہرہ اور باطنہ میں بھی مشترک ہیں اور تخیل، توہم اور تذکر کے احوال میں بھی مشترک ہیں، انسان اور باقی حیوانات کے درمیان صرف قوت عقلیہ اور فکریہ کی وجہ سے امتیاز ہے جو قوت حق اور خیر کی طرف ہدایت دیتی ہے تاکہ حق اور خیر کے تقاضوں پر عمل کیا جائے۔ جب کفار نے قوت عقلیہ اور فکریہ سے کام لینے سے اعراض کیا اور اس کے توسط سے حق کی معرفت حاصل کرنے اور نیک کام کرنے سے روگردانی کی تو وہ جانوروں کی مانند ہو گئے بلکہ ان سے زیادہ گم راہ، کیونکہ حیوانات کو ان فضائل کے حصول پر کوئی قدرت نہیں ہے اور انسان کو ان کے حصول کی قدرت دی گئی ہے، اور جو لوگ قدرت کے باوجود ان عظیم فضائل کے حصول سے روگردانی کریں ان کا حال ان سے زیادہ خسیس ہو گا جو عجز کی وجہ سے ان فضائل کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اس لیے بھی کہ جانور اللہ تعالیٰ کے اطاعت گزار ہیں اور کفار اپنے رب کے اطاعت گزار نہیں ہیں اور اس لیے بھی کہ جب جانوروں کو کوئی راہ دکھانے والا ہو تو وہ اس کی اطاعت کرتے ہیں اور راستہ سے نہیں بھٹکتے اور کفار کو انبیاء علیہم السلام سیدھا راستہ دکھاتے تھے لیکن وہ ان کی مخالفت کر کے گم راہی کو اختیار کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں تو ان ہی ناموں سے اس کو پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں غلط راہ اختیار کرتے ہیں، جو کچھ وہ کرتے ہیں عنقریب ان کو اس کی سزا دی جائے گی (الاعراف: ۱۸۰)

آیات سابقہ سے ارتباط

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ بہت سے جنات اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے دوزخ کے لیے پیدا کیا اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ اللہ کی یاد سے غافل ہیں، اور اس آیت میں فرمایا اور سب سے اچھے نام اللہ ہی کے ہیں تو ان ہی ناموں سے اس کو پکارو۔ اس میں اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ غفلت اور عذاب جنہم سے نجات کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کا ذکر کرو اور اس کو یاد کرو، اور اصحاب ذوق اور ارباب مشاہدہ کا وجد ان یہ ہے کہ دل جب اللہ کی یاد سے غافل ہو اور دنیا اور اس کی دلچسپیوں اور رنگینیوں کی طرف متوجہ اور راغب ہو تو وہ حرص کی آگ اور زہریر کے بعد اور حجاب میں واقع ہو جاتا ہے اور جب دل میں اللہ کی یاد اور اس کی معرفت ہوتی ہے تو وہ آفتوں اور مصیبتوں کی آگ اور ناکامی اور نامرادی پر حسرتوں کے عذاب سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کا معنی

اللہ تعالیٰ کے لیے اسماء حسنیٰ ہیں۔ کیونکہ یہ اسماء احسن معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد الفاظ

ہیں کیونکہ یہ الفاظ اللہ عزوجل پر دلالت کرتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کو یاد کر لیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ هو اللہ الذی لا الہ الا هو الرحمن الرحیم الملک القدوس (الحديث) (صحیح البخاری رقم الحديث: ۳۹۲، سنن الترمذی رقم الحديث: ۳۵۱۸) اور ایک قول یہ ہے کہ ان اسماء سے مراد صفات ہیں۔ گویا کہ یوں کہا گیا ہے کہ اللہ کے اوصاف حسنیٰ ہیں۔ مثلاً اللہ علم قدیم کے ساتھ عالم ہے اور ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کا خالق ہے اور جس چیز کا ارادہ کرے وہ ہو جاتی ہے وغیرہ۔ کیونکہ اسم کا اطلاق صفت پر بھی ہوتا ہے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنہ ہیں اور انسان اللہ تعالیٰ کو صرف ان ہی اسماء حسنہ کے ساتھ پکارے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء توقیفیہ ہیں نہ کہ اصطلاحیہ، لہذا اللہ تعالیٰ کو یا جواد کہنا جائز ہے اور یا سخی کہنا جائز نہیں ہے اور اس کو یا عالم کہنا جائز ہے اور یا فقیہ کہنا جائز نہیں ہے۔ اور یا عاقل کہنا بھی جائز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں ہے یخادعون اللہ وهو خادعہم (النساء: ۱۱۲) اور و مکروا و مکر اللہ (آل عمران: ۵۳) لیکن دعائیں یا مخادع اور یا مکار کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ افعال کے اطلاق سے مشتق کا اطلاق لازم نہیں آتا اور یہ کہنا جائز ہے کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور ہر چیز کا رب ہے لیکن یہ کہنا جائز نہیں ہے یا خالق الخنزیر، یا خالق الخبائث۔

مقابل رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ ایک صحابی نے نماز میں اللہ اور رحمن سے دعا کی تو ایک مشرک نے کہا (سیدنا) محمد ﷺ اور ان کے اصحاب یہ کہتے ہیں کہ ہم رب واحد کی پرستش کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ وہ دو خداؤں کو پکارتے ہیں (یعنی اللہ اور رحمن کو) تب یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ کو پکارو یا رحمن کو، ان اسماء میں سے جس نام کے ساتھ بھی پکارو اس کے اسماء حسنہ ہیں۔

(حاشیہ محی الدین شیخ زادہ علی ایضادوی ج ۲، ص ۲۸۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی بحث میں ہم پہلے یہ بیان کریں گے کہ اسم مسی کا معنی ہے یا غیر۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اسماء کا توقیفی ہونا بیان کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء کا بیان کریں گے اور آخر میں اسم اعظم کے متعلق بیان کریں گے۔

فنقول وباللہ التوفیق۔

اسم مسی کا معنی ہے یا غیر

علامہ وشتانی ابی مالکی لکھتے ہیں:

اشاعرہ کہتے ہیں کہ اسم مسی کا غیر ہے اور معتزلہ کہتے ہیں کہ اسم مسی کا معنی ہے، اس کی تحقیق یہ ہے کہ اسم کا اطلاق کبھی کلمہ پر ہوتا ہے اور کبھی اسم کا اطلاق ذات اور مسی پر ہوتا ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ حقیقی اطلاق کون سا ہے، اشاعرہ نے کہا کہ اسم کا اطلاق کلمہ پر حقیقت ہے اور مسی پر مجاز ہے اور معتزلہ کا قول اس کے برعکس ہے اور استاذ ابو منصور نے کہا کہ اسم دونوں میں مشترک ہے۔

اشاعرہ کے دلائل میں سے یہ ہے کہ جب کسی معین شخص کا نام پوچھا جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس شخص کا اسم کیا ہے؟ پھر جواب میں وہ کلمہ ذکر کیا جاتا ہے جس سے وہ شخص دوسروں سے ممتاز ہو جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسم کی حقیقت وہ کلمہ ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ تمام امت کا اس پر اجماع ہے اور اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں سو اگر اسم مسی کا معنی ہو تو متعدد خداؤں کا ہونا لازم آئے گا۔

معتزلہ کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے سبح اسم ربک الاعلیٰ (الاعلیٰ: ۱) ”اپنے رب اعلیٰ کے نام کی تسبیح کیجئے“ اور تسبیح اللہ کی ذات کی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسم اس کی ذات کا معنی ہے۔ بہر حال اس مسئلہ میں ہر فریق کے

دلائل اور ان کے جوابات موجود ہیں۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۹، ص ۷۳-۷۴، بیروت)
 اللہ تعالیٰ کے اسماء کے تو قیسی ہونے کی تحقیق
 علامہ دشتانی ابی مالکی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے اسماء تو قیسی ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر اسی اسم کا اطلاق جائز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پر اطلاق کیا ہو یا اس کے رسول ﷺ نے اس اسم کا اطلاق کیا ہو یا اس اسم کے اطلاق پر اجماع منعقد ہو چکا ہو۔ (مثلاً اللہ تعالیٰ پر خدا کا اطلاق کرنا) اور جس اسم کے اطلاق پر اذن شرعی ہو نہ ممانعت ہو اس میں اختلاف ہے۔ اس میں ایک قول توقف کا ہے اور ایک قول ممانعت کا ہے۔ علامہ ابن رشد نے اس قول کو امام اشعری اور امام مالک کی طرف منسوب کیا ہے۔ مقرر نے اس قول کو رد کر دیا ہے کیونکہ ممانعت حکم شرعی ہے اور بغیر دلیل سمعی کے ممانعت شرعی کا حکم صحیح نہیں ہے۔ مقرر نے کہا اگر اس لفظ سے کسی محال معنی کا وہم ہو تو پھر اس اسم کا اطلاق ناجائز ہے اور اگر کسی محال معنی کا وہم نہ ہو تو پھر اس قسم کا اطلاق جائز ہے۔ علامہ باقلانی نے کہا ہر وہ صفت جو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہو اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز ہے بشرطیکہ اس کی ممانعت پر اجماع نہ ہو۔ اس لیے سید اور حنان کا اطلاق جائز ہے اور عاقل اور فقیہ کا اطلاق ناجائز ہے۔ البتہ امام مالک نے سید اور حنان کے اطلاق سے منع کیا ہے۔ علامہ باقلانی نے کہا اللہ تعالیٰ نے جن افعال کے ساتھ خود کو موصوف کیا ہے ان کے اسماء کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں ہے کیونکہ جن چیزوں کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے اور وہ قرآن میں مذکور ہیں تو ان کا جتنا اطلاق قرآن مجید میں آگیا ہے بس اتنا اطلاق جائز ہے اس سے زیادہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً اللہ یستہزیئ بہم اس کی وجہ سے مستہزی کا اور سخر اللہ منہم اس کی وجہ سے ساخر کا اطلاق جائز نہیں ہے اور متکلمین اللہ تعالیٰ پر صانع واجب الوجود اور موثر کا اطلاق بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ (اکمال اکمال المعلم ج ۹، ص ۷۷-۷۸، مطبوعہ بیروت)

حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی لکھتے ہیں:

اسماء حسنیٰ میں اختلاف ہے، آیا یہ تو قیسی ہیں یا نہیں۔ تو قیسی کا مطلب یہ ہے کہ کتاب اور سنت کی نص کے علاوہ کسی اسم کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق جائز نہ ہو۔ امام فخر الدین رازن نے یہ کہا کہ ہمارے اصحاب کا مشہور قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء تو قیسی ہیں اور معتزلہ اور کرامیہ کا قول یہ ہے کہ جب کسی لفظ کی اللہ پر دلالت عظاماً صحیح ہو تو اس کا اطلاق جائز ہے۔ قاضی ابو بکر اور امام غزالی نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء تو قیسی ہیں اور صفات تو قیسی نہیں ہیں۔ (اس کے برخلاف جمہور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اسماء غیر تو قیسی ہیں اور صفات تو قیسی ہیں۔ سعیدی غفرلہ) امام غزالی کی دلیل یہ ہے کہ ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کا وہ نام رکھیں جو آپ کے والد نے رکھا۔ آپ نے خود رکھا۔ اسی طرح مخلوق میں سے کسی بھی بزرگ شخص کا نام ہم از خود نہیں رکھ سکتے اور جب مخلوق کا نام از خود رکھنا ممنوع ہے تو خالق کا نام از خود رکھنا بہ طریق اولیٰ منع ہونا چاہیے۔ اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کسی ایسے اسم یا صفت کا اطلاق جائز نہیں ہے جس سے نقص کا وہم ہو خواہ نص میں اس لفظ کا اطلاق ہو، اس لیے اللہ تعالیٰ کو ماہد، زارع اور فالح کہنا جائز نہیں ہے اگرچہ نص قرآن میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ فنعم الماھدون (الذاریات: ۴۸) نحن الزارعون (الواقعة: ۶۳) فالح الحب والنوی (الانعام: ۹۵)

امام ابو القاسم قسیری نے کہا کہ کتاب، سنت اور اجماع سے جن اسماء کا ثبوت ہو ان اسماء کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز ہے اور جس اسم کا ان میں ثبوت نہ ہو تو اس کا اطلاق جائز نہیں ہے خواہ اس کا معنی صحیح ہو، اور ضابطہ یہ ہے کہ ہر وہ لفظ جس کے اطلاق کا شریعت میں ثبوت ہو عام ازیں کہ وہ مشتق ہو یا غیر مشتق ہو وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔ اور ہر وہ لفظ جس کی نسبت اللہ

نبیان القرآن

جلد چہارم

تعالیٰ کی طرف صحیح ہے، عام ازیں کہ اس میں تاویل ہو یا نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور اس پر اسم کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔

امام رازی نے کہا کہ وہ الفاظ جو اللہ تعالیٰ کی صفات پر دلالت کرتے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ جن صفات کا اللہ تعالیٰ کے لیے ثبوت قطعی ہے ان کا اطلاق مفرد اور مضاف دونوں اعتبار سے صحیح ہے جیسے قادر، قاہر، یا

فلاں پر قادر فلاں پر قاہر۔

۲۔ جن صفات کا بہ طور مفرد اطلاق صحیح ہے اور بطور مضاف خاص شرائط کے ساتھ صحیح ہے۔ مثلاً خالق یا ہر چیز کا خالق کہنا صحیح ہے لیکن بندر اور خنزیر کا خالق کہنا صحیح نہیں ہے۔

۳۔ جن صفات کا بطور مضاف اطلاق صحیح ہے اور بہ طور مفرد صحیح نہیں ہے مثلاً منشی کہنا صحیح نہیں ہے اور منشی المخلوق کہنا صحیح

ہے۔

دوسری قسم وہ ہے کہ اگر شریعت میں اس کا سماع ثابت ہو تو اس اطلاق کیا جائے گا ورنہ نہیں، اور تیسری قسم وہ ہے کہ شریعت میں اس کا بہ حیثیت افعال سماع ہے تو انہی کا اطلاق کیا جائے گا اور ان پر قیاس کر کے ان مشتقات کا اطلاق نہیں کیا جائے گا جیسے مکر اللہ اور یستہزیئ بہم سو اللہ تعالیٰ پر ماکر اور مستہزیئ کا اطلاق نہیں کیا جائے گا۔

(فتح الباری ج ۱۱، ص ۲۲۳-۲۲۴، مطبوعہ لاہور)

علامہ آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

خلاصہ بحث یہ ہے کہ علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جن اسماء اور صفات کے اطلاق کا اذن شرعی ثابت ہے ان کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر اطلاق جائز ہے اور جن کی ممانعت ثابت ہے ان کا اطلاق منع ہے، اور جن اسماء کا شریعت میں اذن ہو نہ ممانعت ہو ان کے اطلاق میں اختلاف ہے بہ شرطیکہ وہ ان اسماء میں سے نہ ہوں جو باقی لغات میں اللہ تعالیٰ کے لیے علم (نام) ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اسماء اعلام کا اطلاق کسی کے نزدیک محل نزاع نہیں ہے۔ نیز ان اسماء کا اطلاق نقص کا موہم نہ ہو بلکہ مدح کا مظہر ہو، سو ایسے اسماء کے اطلاق کو اہل حق نے منع کیا ہے اور جمہور معتزلہ نے جائز کہا ہے۔ قاضی ابوبکر کا اسی طرف میلان ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ پر خدا اور شکری کا اطلاق جائز ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے لہذا اس پر اجماع ہو گیا۔ لیکن یہ استدلال مردود ہے کیونکہ اگر اجماع ثابت ہو تو وہ اذن شرعی کے ثبوت کے لیے کافی ہے اور بحث ان اسماء کے اطلاق میں ہے جن کے لیے اذن شرعی نہ ہو۔ (روح المعانی ج ۹، ص ۱۳۱، مطبوعہ بیروت)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

اگر یہ اعتراض ہو تو اللہ تعالیٰ پر موجود واجب اور قدیم وغیرہا کا اطلاق کیسے صحیح ہو گا کیونکہ ان کا شریعت میں ثبوت نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا اطلاق اجماع سے ثابت ہے اور اجماع بھی دلائل شرعیہ میں سے ہے۔

(شرح العقائد ص ۳۱، مطبوعہ کراچی)

علامہ میر سید شریف لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے اسماء تو قیضی ہیں یعنی ان کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق اذن شرعی پر موقوف ہے اور یہ بحث ان اسماء میں نہیں ہے جو لغات میں اللہ تعالیٰ کے لیے بہ طور علم (نام) وضع کیے گئے ہیں بلکہ بحث ان اسماء میں ہے جو صفات اور افعال سے ماخوذ ہیں۔ سو ان اسماء میں معتزلہ اور کرامیہ کا مذہب یہ ہے کہ جب عقل کے نزدیک اللہ تعالیٰ کا کسی صفت سے متصف ہونا صحیح ہو تو اس کا

اطلاق جائز ہے خواہ اس کا شرع میں ثبوت ہو یا نہ ہو۔ اور ہمارے اصحاب میں سے قاضی ابو بکر نے یہ کہا کہ جب کوئی لفظ ایسے معنی پر دلالت کرے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہو اور اس میں نقص کا وہم نہ ہو تو اس کا اطلاق جائز ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ پر عارف کا اطلاق جائز نہیں، کیونکہ لفظ معرفت سے غفلت کے بعد علم کا ارادہ بھی کیا جاتا ہے، اسی طرح فقیہ کا اطلاق بھی جائز نہیں کیونکہ فقیہ اس شخص کو کہتے ہیں جو متکلم کی غرض کو سمجھ لے۔ اسی طرح عاقل کا اطلاق بھی جائز نہیں کیونکہ عاقل اس شخص کو کہتے ہیں جو غلط کام کرنے سے رکے، اور شیخ اور ان کے متبعین نے یہ کہا ہے کہ توقیف ضروری ہے اور یہی مختار ہے۔

(شرح المواقف ص ۶۸۵، مطبوعہ ہند)

واضح رہے کہ علامہ میر سید شریف نے شیخ کے جس قول میں توقیف کو مختار کہا ہے اس کا تعلق ان اسماء سے ہے جو صفات اور افعال سے ماخوذ ہوں کیونکہ نزاع اور بحث انہی میں ہے۔ رہے وہ اسماء جو لغات میں اللہ تعالیٰ کے لیے اعلام ہیں تو ان کے متعلق علامہ میر سید شریف نے تصریح کر دی ہے کہ وہ محل نزاع سے خارج ہیں اور ان کے اطلاق کے جواز پر سب کا اتفاق ہے اس لیے اللہ تعالیٰ پر خدا کا اطلاق اجماع اور اتفاق سے ثابت ہے اور اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء کی تفصیل

اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کو یاد کر لیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اس اسماء کی تفصیل جامع ترمذی میں ہے۔

امام ترمذی اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں ایک کم سو، جس نے ان کو گن لیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ ہواللہ الذی لا الہ الا هو الرحمن الرحیم الملک القدوس السلام المؤمن المہیمن العزیز الجبار المتکبر الخالق البارئ المصور الغفار القہار الوہاب الرزاق الفتاح العلیم القابض الباسط الخافض الرافع المعز المذل السميع البصیر الحکم العدل اللطیف الخبیر الحلیم العظیم الغفور الشکور العلی الکبیر الحفیظ المقیت الحسیب الجلیل الکریم الرقیب المجیب الواسع الحکیم الودود المجید الباعث الشہید الحق الوکیل القوی المتین الولی الحمید المحصی المبدئ المعید المحی الممیت الحی القيوم الماجد الواجد الصمد القادر المقندر المقدم المؤخر الاول الاخر الظاہر الباطن الوالی المتعالی البر التواب المنتقم العفو الرؤوف مالک الملک ذوالجلال والاکرام المقسط الجامع الغنی المغنی المانع الضار النافع النور الہادی البدیع الباقي الوارث الرشید الصبور۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۱۸)

علامہ نووی لکھتے ہیں:

علماء کا اتفاق ہے کہ اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے اسماء کا حصر نہیں ہے اور اس حدیث کا مقصود یہ ہے کہ یہ وہ ننانوے نام ہیں جس نے ان ناموں کو گن لیا وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے ایک اور حدیث میں یہ ہے میں تجھ سے ہر اسم کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں جس اسم کے ساتھ تو نے اپنے آپ کو موسوم کیا ہے یا جس اسم کو تو نے اپنے علم غیب میں مخصوص کر

تبیان القرآن

جلد چہارم

لیا ہے، حافظ ابو بکر بن العربی مالکی نے بعض علماء سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہزار نام ہیں۔ ابن العربی نے کہا یہ بہت کم ہیں۔ ان اسماء کی تعین کا ذکر جامع ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں ہے۔ بعض اسماء میں اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ ان کا تعین اسم اعظم اور لیلۃ القدر کی طرح مخفی ہے۔ (شرح مسلم ج ۲، ص ۲۲۲، مطبوعہ کراچی)

علامہ قرطبی نے کہا کہ جس شخص نے صحت نیت کے ساتھ جس طرح بھی ان کلمات کو گن لیا، اللہ تعالیٰ کے کرم سے امید ہے کہ وہ اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔ (فتح الباری ج ۱۱، ص ۲۲۵، مطبوعہ لاہور)

اسم اعظم کی تحقیق

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

امام ابو جعفر طبری، امام ابو الحسن الاشعری، امام ابو حاتم بن حبان، قاضی ابو بکر باقلانی وغیرہ نے اسم اعظم کا انکار کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء کو بعض دوسرے اسماء پر فضیلت دینا جائز نہیں ہے، اور امام مالک نے اللہ تعالیٰ کے کسی اسم کو اعظم کہنا مکروہ قرار دیا ہے اور جن احادیث میں اعظم کا ذکر ہے اس سے مراد عظیم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء عظیم ہیں۔ امام ابو جعفر طبری نے کہا میرے نزدیک اس سلسلہ میں تمام اقوال صحیح ہیں۔ کیونکہ کسی حدیث میں یہ نہیں ہے کہ فلاں اسم اعظم ہے اور کوئی اسم اس سے زیادہ اعظم نہیں ہے۔ امام ابن حبان نے کہا کسی اسم کے اعظم ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس اسم کے ساتھ دعا کرنے والے کو عظیم اجر ملے گا۔ امام جعفر صادق اور جنید وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے جس اسم میں ڈوب کر دعا کرے وہی اسم اعظم ہے، اور بعض علماء نے یہ کہا کہ اسم اعظم کا علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اس نے مخلوق میں سے کسی شخص کو اس پر مطلع نہیں کیا۔

بعض علماء اسم اعظم کے ثبوت کے قائل ہیں اور اس کی تعین میں ان کا اختلاف ہے اور اس مسئلہ میں کل چودہ قول ہیں:

- ۱- امام فخر الدین رازی نے بعض اہل کشف سے نقل کیا کہ اسم اعظم "ہو" ہے۔
- ۲- اسم اعظم "اللہ" ہے۔ کیونکہ یہی وہ اسم ہے جس کا اللہ کے غیر پر اطلاق نہیں ہوتا۔
- ۳- اسم اعظم "اللہ الرحمن الرحیم" ہے۔ اس سلسلہ میں امام ابن ماجہ نے حضرت عائشہ سے ایک حدیث روایت کی ہے لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔
- ۴- اسم اعظم "الرحمن الرحیم الحی القیوم" ہے۔ کیونکہ امام ترمذی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے والنہکم الہ واحد لا الہ الا الہ الرحمن الرحیم اور سورۃ آل عمران کی ابتداء اللہ لا الہ الا الہو الحی القیوم اس حدیث کو امام ابو داؤد اور امام ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔

۵- "الہی القیوم" کیونکہ امام ابن ماجہ نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اسم اعظم تین سورتوں میں ہے۔ بقرہ، آل عمران، اور طہ۔ حضرت ابو امامہ کہتے ہیں میں نے ان سورتوں میں اسم اعظم کو تلاش کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ "الہی القیوم" ہے۔ امام فخر الدین رازی نے بھی اس کو ترجیح دی ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ربوبیت پر ان کی دلالت سب اسماء سے زیادہ ہے۔

۶- "الحنان المنان بدیع السموت والارض ذوالجلال والاکرام الہی القیوم" امام احمد اور امام حاکم نے اس کو حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ سنن ابو داؤد اور سنن نسائی میں اس کی اصل ہے اور امام ابن حبان نے اس

کو صحیح قرار دیا ہے۔

۷- "بديع السموات والارض ذوالجلال والاکرام" اس کو امام ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے۔

۸- "ذوالجلال والاکرام" امام ترمذی نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے یا ذاالجلال والاکرام کہا تو نبی ﷺ نے فرمایا اس کی دعا قبول ہوگی۔

۹- "الله لا اله الا هو الاحد الصمد الذي لم يلد ولم يولد ولم يكن له كفوا احد" امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، امام ابن حبان اور امام حاکم نے اس کو حضرت بریدہ بنی شیبہ سے روایت کیا۔ اسم اعظم کی روایت کے سلسلہ میں اس روایت کی سند سب سے زیادہ قوی ہے۔

۱۰- "رَبِّ رَبِّ" امام حاکم نے حضرت ابو درداء اور حضرت ابن عباس سے روایت کیا: اللہ کا اسم اکبر رَبِّ رَبِّ ہے۔ اور امام ابن ابی الدنیانے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جب بندہ رَبِّ رَبِّ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "بلیک میرے بندے! تو سوال کرتے دیا جائے گا"۔

۱۱- "لا اله الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین" امام مسلم اور امام نسائی نے حضرت فضالہ بن عبید بنی شیبہ سے مرفوعاً روایت کیا کہ جو مسلمان شخص ان کلمات کے ساتھ دعا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرمائے گا۔

۱۲- "هو الله الذي لا اله الا هو رب العرش العظيم" امام رازی نے نقل کیا ہے کہ امام زین العابدین نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ان کو اسم اعظم کی تعلیم دے تو انہوں نے خواب میں یہ کلمات دیکھے۔

۱۳- اسم اعظم اسماء حسنیٰ میں مخفی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ سے فرمایا اسم اعظم ان اسماء میں ہے جن سے تم نے دعا کی ہے۔

۱۴- اسم اعظم کلمۃ التوحید ہے۔ اس کو قاضی عیاض نے نقل کیا ہے۔ (فتح الباری ج ۱۱، ص ۲۲۵-۲۲۴، مطبوعہ لاہور)

الحاد کا معنی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ناموں میں الحاد (غلط راہ اختیار) کرتے ہیں جو کچھ وہ کرتے ہیں عنقریب ان کو اس کی سزا دی جائے گی ○

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

الحاد کے معنی ہیں حق سے تجاوز کرنا اور الحاد کی دو قسمیں ہیں ایک اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے یہ ایمان کے منافی ہے۔ دوسری قسم ہے اسباب کو شریک بنانا یہ ایمان کو کمزور کرتا ہے اور ایمان کی گرہ کو نہیں کھولتا۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد کرنے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت بیان کی جائے جس کے ساتھ اس کو موصوف کرنا جائز نہیں ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی ایسی تاویل کی جائے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔

(المفردات ج ۲، ص ۵۷۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۳۱۸ھ)

اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد کی تفصیل

امام فخر الدین محمد بن عمر الرازی الشافعی المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

محققین نے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں الحاد تین قسم پر ہے:

۱- اللہ تعالیٰ کے اسماء مقدسہ ظاہرہ کا غیر اللہ پر اطلاق کیا جائے جیسا کہ کفار نے اپنے بتوں پر اللہ کے ناموں کا ان میں تصرف کر

کے اطلاق کیا۔ مثلاً انہوں نے لفظ اللہ سے اللات بنایا اور العزیز سے عزی بنایا اور المنان سے المنان بنایا اور میلہ کذاب نے خود اپنا نام الرحمن رکھا۔

۲۔ اللہ کا ایسا نام رکھنا جو اس کے حق میں جائز نہیں ہے جیسا عیسائی اللہ تعالیٰ کو مسیح کا باپ کہتے ہیں اور کرامیہ اللہ تعالیٰ پر جسم کا اطلاق کرتے ہیں، اسی طرح معتزلہ اپنی بحث کے دوران کہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا تو وہ جاہل ہو گا اور لائق مذمت ہو گا اور اس قسم کے الفاظ بے ادبی کے مظہر ہیں۔ ہمارے اصحاب نے کہا ہے کہ ہر وہ لفظ جس کا معنی صحیح ہو اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کرنا لازم نہیں ہے، کیونکہ دلیل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق الاجسام ہے لیکن اس کو کیڑوں مکوڑوں اور بندروں کا خالق کہنا جائز نہیں ہے، بلکہ اس قسم کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی تزیہ واجب ہے۔

۳۔ بندہ اپنے رب کا ایسے الفاظ کے ساتھ ذکر کرے جس کا معنی وہ نہیں جانتا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے لفظ کا ذکر کرے جس کا معنی اللہ کی جناب کے لائق نہیں ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۱۷-۳۱۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اللہ تعالیٰ کے اسماء تو قیسی ہونے پر مذاہب اربعہ کے مفسرین کی تصریحات

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی الشافعی المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ اگر ایک لفظ کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ثابت ہو تو کیا اس کے تمام مشتقات کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز ہے؟ تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ نہ اللہ تعالیٰ کے حق میں جائز ہے نہ انبیاء علیہم السلام کے اور نہ ملائکہ کے، کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لیے علم کا لفظ آیا ہے۔ عَلَّمَ ادمَ الاسماءَ کلہا (البقرہ: ۳۱) علمک ما لم تکن تعلم (النساء: ۱۱۳) لیکن اللہ تعالیٰ کو یا معلم کہنا جائز نہیں ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے لیے یحب کا لفظ آیا ہے یحبہم و یحبونہ (المائدہ: ۵۳) لیکن اللہ تعالیٰ کو یا محب کہنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا معاملہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے حق میں وارد ہے وعصی ادم ربہ فغوی (طہ: ۱۲۱) لیکن یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ آدم عاصی و غاوی تھے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حق میں ہے یا ابت استاجرہ (القصص: ۲۶) لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اجیر (اجرت پر کام کرنے والا) کہنا جائز نہیں ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ یہ الفاظ موہم ہیں اس لیے ان کا انحصار ان ہی نصوص میں واجب ہے اور ان سے مشتق الفاظ کے اطلاق میں توسع میرے نزدیک ممنوع اور ناجائز ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۱۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی المتوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن العربی مالکی نے کہا ہے کہ صرف ان ہی اسماء کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور حدیث کی ان پانچ کتابوں میں ہے۔ صحیح البخاری صحیح مسلم سنن الترمذی سنن ابوداؤد سنن النسائی۔ یہ وہ کتابیں ہیں جن پر اسلام کے احکام کا مدار ہے اور ان کتابوں میں الموطا بھی داخل ہے جو تمام تصانیف حدیث کی اصل ہے اور ان کے علاوہ باقی اسماء کو چھوڑ دو۔ (الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۲۹۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

علامہ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ لکھتے ہیں:

زجاج نے کہا ہے کہ کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کو اس نام کے علاوہ کسی اور نام سے پکارے جو اللہ تعالیٰ نے اپنا نام رکھا ہے، اس لیے یا جواد کہنا جائز ہے اور یا خنی کہنا جائز نہیں ہے اور یا رحیم کہنا جائز ہے اور یا رفیق کہنا جائز نہیں ہے۔ علامہ ابو سلیمان خطابی نے کہا ہے کہ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ اللہ کا نام لینے میں غلطی کرنا بیخ اور الحاد ہے۔

(زاد المسیر ج ۳، ص ۲۹۳، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۳۰۷ھ)

علامہ ابواللیث نصر بن محمد السمرقندی الحنفی المتوفی ۳۷۵ھ نے بھی زجاج کا مذکور الصدر قول نقل کیا ہے۔

(تفسیر السمرقندی ج ۱، ص ۵۸۵، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۳ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایک ایسا گروہ (بھی) ہے جو حق کی ہدایت دیتا ہے اور اسی کے ساتھ عدل کرتا ہے۔ (الاعراف: ۱۸۱)

اس امت میں بھی حق کی ہدایت دینے والے اور حق کے ساتھ عدل کرنے والے ہیں

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ہم نے بہت سے جن اور انسانوں کو جہنم کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ (الاعراف: ۱۷۹) اور اس آیت میں فرمایا اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے ان میں ایک گروہ ایسا (بھی) ہے جو حق کی ہدایت دیتا ہے اور اسی کے ساتھ عدل کرتا ہے۔ (الاعراف: ۱۸۱) اس میں یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے لیے بھی بہت مخلوق کو پیدا فرمایا ہے۔ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا تھا اور موسیٰ کی قوم سے ایک گروہ ہے جو حق کی ہدایت دیتا ہے اور اسی کے ساتھ عمل کرتا ہے۔ (الاعراف: ۱۵۹) اور جب اس کلام کو دوبارہ ذکر فرمایا تو اکثر مفسرین کے مطابق اس سے مراد سیدنا محمد ﷺ کی امت ہے اور حسب ذیل روایات اس کی تائید کرتی ہیں۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں: ابن جریج نے کہا ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ نبی اللہ ﷺ نے فرمایا یہ میری امت ہے یہ حق کے ساتھ لیتے ہیں، دیتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں۔

قوادہ نے کہا ہم کو یہ حدیث پہنچی ہے کہ نبی اللہ ﷺ جب اس آیت کی قرائت کرتے تو فرماتے یہ تمہارے لیے ہے اور تم سے پہلے ایک قوم کو بھی اس کی مثل دی گئی ہے۔ پھر یہ آیت پڑھتے ومن قوم موسیٰ امة یهدون بالحق وبہ یعدلون۔ (الاعراف: ۱۵۹)

(جامع البیان جز ۹، ص ۱۸۱-۱۸۰، تفسیر ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۶۳، تفسیر امام عبدالرزاق ج ۱، رقم الحدیث: ۹۶۲، زاد المسیر ج ۳، ص ۲۹۳، معالم التنزیل ج ۲، ص ۱۸۳، الدر المشورج ج ۳، ص ۶۱۶)

اجماع کے حجت ہونے پر احادیث

اس آیت میں اس کی صریح دلیل ہے کہ اجماع امت حجت ہے اور اس کی تائید میں حسب ذیل احادیث ہیں:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے امر (دین) پر قائم رہے گا جو شخص ان کو ناکام کرنا چاہے یا ان کی مخالفت کرنا چاہے وہ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا حتیٰ کہ ان کے پاس اللہ کا امر (موت) آجائے گا اور وہ اسی (طریقہ، دین) پر ہوں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۳۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۹۲۳، مسند احمد ج ۳، ص ۱۰۱، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۳۰، جامع الاصول ج ۱، رقم الحدیث: ۶۷۷۷)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق کے ساتھ غالب رہے گا جو ان کو ناکام کرنا چاہے وہ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا حتیٰ کہ اللہ کا امر آجائے گا اور وہ اسی طرح ہوں گے۔

(صحیح مسلم الامارۃ ۱۷۰، (۱۹۲۰) ۳۸۶۷، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۳۱۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۲۵۲، سنن الترمذی رقم الحدیث:

۲۲۳۶ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۰، مسند احمد ج ۵، ص ۲۷۸، جامع الاصول ج ۹، رقم الحدیث: ۶۷۷۶

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق کی خاطر لڑتا رہے گا اور قیامت تک غالب رہے گا۔ (صحیح مسلم الامارۃ، ۱۷۳، (۱۹۲۳) ۳۸۷۱)

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

معاویہ بن قرۃ اپنے والد بنی بنی سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اہل شام فاسد ہو جائیں تو اس میں تمہارے لیے کوئی خیر نہیں ہے اور میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ کامیاب رہے گا جو ان کو ناکام کرنا چاہے گا وہ ان کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا حتیٰ کہ قیامت قائم ہو جائے گی۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۹۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۶، مسند احمد ج ۷، رقم الحدیث: ۲۰۳۸۳، طبع جدید، مسند احمد ج ۳، ص ۳۳۶، ج ۵، ص ۳۵، طبع قدیم، صحیح ابن حبان ج ۱۶، رقم الحدیث: ۷۳۰۲، المعجم الکبیر ج ۱۹، ص ۵۶، جامع الاصول ج ۹، رقم الحدیث: ۶۷۷۸)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ کا جماعت پر ہاتھ ہے اور جو جماعت سے الگ ہو اوہ دوزخ میں الگ ہو گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۷۳، جامع الاصول ج ۹، رقم الحدیث: ۶۷۶۱، کتاب الاسماء والصفات ص ۳۲۲، کتاب السنن ج ۱، رقم الحدیث: ۸۰، المستدرک ج ۱، ص ۱۱۵)

امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث روایت کرتے ہیں:

حضرت ابومالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے تم کو تین چیزوں سے پناہ دی ہے۔ تمہارے خلاف تمہارا نبی دعاء ضرر نہیں کرے گا جس سے تم سب ہلاک ہو جاؤ۔ اور اہل باطل اہل حق پر غالب نہیں ہوں گے اور تم کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو گے۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۲۵۳، جامع الاصول ج ۹، رقم الحدیث: ۶۷۶۰، اس کی سند ضعیف ہے)

امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ متوفی ۲۷۳ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی اور جب تم اختلاف دیکھو تو سواد اعظم کے ساتھ رہو۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۵۰)

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے رب عزوجل سے تین چیزوں کا سوال کیا اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں مجھے عطا فرمادیں اور ایک دعا سے مجھے منع فرمادیا، میں نے اللہ عزوجل سے سوال کیا کہ میری امت گمراہی پر جمع نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا کر دیا، اور میں نے اللہ عزوجل سے سوال کیا کہ میری امت قحط سے ہلاک نہ ہو جیسا کہ پہلی امتیں ہلاک ہو گئی تھیں تو اللہ عزوجل نے مجھے یہ عطا کر دیا، اور میں نے اللہ عزوجل سے یہ سوال کیا کہ ان کو مختلف فرقوں میں تقسیم نہ کرے جس کے نتیجہ میں بعض بعض سے لڑیں تو اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دعا سے منع کر دیا۔

(مسند احمد بن حنبل ج ۶، ص ۳۹۶، طبع قدیم، دار الفکر بیروت، مسند احمد بن حنبل ج ۱۸، رقم الحدیث: ۲۷۱۰۱، دار الحدیث قاہرہ)

امام عبد اللہ بن عبد الرحمن الدارمی السمرقندی المتوفی ۲۵۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمرو بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے وقت مرحوم پر پہنچایا اور میرے لیے مختصر مدت رکھی، ہم (بعثت میں) آخر ہیں اور قیامت کے دن سابق ہوں گے، اور میں یہ بات بغیر فخر کے کہتا ہوں کہ ابراہیم اللہ کے خلیل ہیں اور موسیٰ اللہ کے برگزیدہ ہیں اور میں اللہ کا حبیب ہوں، قیامت کے دن حمد کا جھنڈا میرے ساتھ ہوگا، اور بے شک اللہ عزوجل نے میری امت کے متعلق مجھ سے وعدہ کیا ہے اور ان کو تین چیزوں سے محفوظ رکھے گا۔ ان کو عام قحط سے ہلاک نہیں فرمائے گا اور نہ ان کو کوئی دشمن نیست و نابود کرے گا اور نہ ان کو گمراہی پر جمع کرے گا۔

(سنن دارمی رقم الحدیث: ۵۳، مطبوعہ دار الکتاب العربی، ۷: ۱۴۰ھ)

حافظ ابو بکر عمرو بن عاصم الضحاک بن مخلد الشیبانی المتوفی ۲۸۷ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت کعب بن عاصم الاشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کو اس بات سے محفوظ رکھا ہے کہ وہ گمراہی پر مجتمع ہو۔ (یہ حدیث حسن ہے)

(کتاب السنن ج ۱، رقم الحدیث: ۸۲، مطبوعہ المکتب الاسلامی، ۱۴۰۰ھ)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت کو اس سے محفوظ رکھا ہے کہ وہ گمراہی پر مجتمع ہوں۔ (یہ حدیث حسن ہے) (کتاب السنن ج ۱، رقم الحدیث: ۸۳)

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم جماعت کے ساتھ لازم رہو، کیونکہ اللہ عزوجل سیدنا محمد ﷺ کی امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ (اس حدیث کی سند جید ہے اور اس کے راوی صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے راوی ہیں)

(کتاب السنن ج ۱، رقم الحدیث: ۸۵، المعجم الکبیر للبرہانی ج ۱، ص ۲۳۰، مجمع الزوائد ج ۵، ص ۲۱۹)

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا سَتَسُدُّ رُجُومًا حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸۲﴾

اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم ان کو بندریج تباہی کی طرف اس طرح لے جائیں گے کہ ان کو پتا بھی نہیں چلے گا۔

وَأُمْلِي لَهُمْ ۗ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿۱۸۳﴾ أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِمْ

اور میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں، بیشک میری خفیہ تدبیر بہت مضبوط ہے۔ کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے صاحب پر

مِنْ جَنَّةٍ ۗ إِنَّهُ هُوَ الَّذِي يَدِيرُ مِيزَانَ ۗ ﴿۱۸۴﴾ أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ

مطلقاً جزون نہیں ہے! وہ تو صرف کلمہ کلا ڈرانے والے ہیں۔ کیا انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کی نشانیوں میں

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ ۗ وَإِنَّ عَسَىٰ أَنْ

غور نہیں کیا اور ہر اس چیز میں جس کو اللہ نے پیدا فرمایا ہے؛ اور اس میں کہ شاید ان کا مقرہ

يَكُونَ قَدًا اقْتَرَبَ أَجْلُهُمْ ۗ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿۱۸۵﴾

وقت قریب آچکا ہے، پس اس قرآن کے بعد وہ اور کس چیز پر ایمان لائیں گے۔

مَنْ يُضِلِّ اللَّهُ فَلَا هَادِيَ لَهُ وَيَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ

جس کو اللہ گمراہی پر رکھے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے اور اللہ ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا ہوا

يَعْبَهُونَ ۝۱۸۶ يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ

مچھوڑ دیتا ہے ۰ یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ وہ کب آنے گی؟ آپ کہیے کہ

إِنَّمَا عَلَيْهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجِيبُهَا لَوْ قُبِهَا إِلَّا هُوَ تَقَلَّتْ فِي

اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے، اس کے وقت پر صرف وہی اس کو ظہور میں لائے گا، آسمانوں اور زمینوں پر

السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمُ إِلَّا بَغْتَةً ۝۱۸۷ يَسْأَلُونَكَ كَاتِبًا

قیامت بہت بھاری ہے وہ تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی، وہ آپ سے اس کے متعلق اس طرح سوال کرتے

حَفِيٌّ عَنْهَا قُلْ إِنَّمَا عَلَيْهَا عِنْدَ اللَّهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا

ہیں گویا آپ اس کی جستجو میں ہیں، آپ کہیے اس کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے، لیکن بہت سے لوگ

يَعْلَمُونَ ۝۱۸۸ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ

نہیں جانتے ۰ آپ کہیے کہ میں اپنے نفس کے لیے کسی نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ

اللَّهُ ۝۱۸۹ وَلَوْ كُنْتَ أَعْلَمُ الْغَيْبِ لَاسْتَكْثَرْتَ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا

چاہے، اور اگر میں (ان خود) غیب کو جانتا تو میں (ان خود) خیر کثیر جمع کر لیتا اور بچے کوئی

مَسِيئَةِ الشُّؤْمِ ۝۱۹۰ إِنَّ آتَانَ الْآيَاتِ يَذُرُّ وَيَشِيدُ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝۱۸۸

تعلیمت نہ پہنچتی، میں تو صرف ایمان والوں کو (عذاب الہی سے) ڈرانے والا اور (آخری ثواب کی) بشارت دینے والا ہوں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہم ان کو بہ تدریج تباہی کی طرف اس طرح لے جائیں گے کہ ان کو پتا بھی نہیں چلے گا اور میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں بے شک میری خفیہ تدبیر بہت مضبوط ہے ۰

(الاعراف: ۱۸۳-۱۸۲)

مشکل الفاظ کے معنی

سنستدرجہم: یہ لفظ استدرج سے بنا ہے اس کا مادہ درجہ ہے۔ درجہ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز لپیٹ کر کسی جگہ رکھ دی جائے۔ اور استدرج کا معنی ہے کسی چیز کو درجہ بہ درجہ اوپر چڑھانا یا درجہ بہ درجہ اس کو نیچے اتارنا اور

اس کا معنی ہے کسی چیز کو تدریجاً لپیٹنا۔ علامہ طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ نے لکھا ہے استدراج کا معنی ہے کسی شے کو تدبیر سے پکڑنا۔

(مجمع بحار الانوار ج ۲، ص ۱۶۸)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم ان کی ہلاکت کو قریب کر دیں گے اور ان کے عذاب کو اس طرح دگنا کر دیں گے کہ ان کو پتا بھی نہیں چل سکے گا، کیونکہ یہ لوگ جب بھی کسی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں یا کوئی گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر نعمت اور خیر کے دروازے کھول دیتا ہے، اس سے یہ بہت خوش ہوتے ہیں اور سرکشی اور گمراہی میں اور زیادہ منہمک اور مستغرق ہو جاتے ہیں اور جوں جوں ان پر نعمتیں زیادہ ہوتی ہیں یہ توں توں زیادہ گناہ کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اچانک ان کو عین غفلت میں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس کسریٰ کے خزانے لائے گئے تو انہوں نے کہا اے اللہ! میں اس بات سے تیری پناہ میں آتا ہوں کہ میں مستدرج ہوں کیونکہ تو نے فرمایا ہے ہم ان کو بہ تدریج تباہی کی طرف اس طرح لے جائیں گے کہ ان کو پتا بھی نہیں چلے گا۔

املسی لہم: اس کا معنی ہے میں ان کو مہلت دیتا ہوں۔ الاملاء کا معنی ہے مدت طویلہ۔ قرآن مجید میں ہے آزر نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا واھجرنی ملیا (مریم: ۴۶) تو لمبی مدت کے لیے مجھ سے دور ہو جا، اور ملوان کے معنی ہیں دن اور رات۔ (المفردات ج ۲، ص ۶۱۳-۶۱۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

”ان کیدی متین“ کید کے معنی ہیں خفیہ تدبیر اور متین کے معنی ہیں مضبوط۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میں دنیا میں ان کو ان کے کفر پر اصرار کے باوجود باقی رکھتا ہوں اور ان کو جلدی سزا نہیں دیتا، اس لیے کہ یہ مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے، اور نہ مجھے سزا دینے سے روک سکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا کید یہ ہے کہ وہ ان کو عذاب دے گا اور اس کو کید اس لیے فرمایا کہ کفار پر وہ عذاب اچانک آئے گا جس کا انہیں پہلے سے بالکل اندازہ نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے صاحب پر مطلقاً جنون نہیں ہے! وہ تو صرف کھلم

کھلا ڈرانے والے ہیں (الاعراف: ۱۸۴)

تفکر کا معنی

اولم یبتفکروا: فکر وہ قوت ہے جو علم کو معلوم کا راستہ دکھاتی ہے، بہ اعتبار نظر عقل کے اس قوت کی جولانی کو تفکر کہتے ہیں، یہ قوت صرف انسان میں ہوتی ہے حیوان میں نہیں ہوتی۔ اور اسی چیز کا تفکر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے جس کی صورت عقل میں حاصل ہو سکے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں تفکر کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں تفکر نہ کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے کہ اس کی صورت عقل میں حاصل ہو۔ اس لیے فرمایا:

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِيَّ أَنفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللَّهُ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ

(الروم: ۸) صرف حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

اسی طرح اس آیت میں بھی فرمایا ہے کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا (الآیہ) غرض ہر جگہ حقائق کائنات میں تفکر کے لیے فرمایا کہیں یہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے اللہ میں تفکر نہیں کیا۔ (المفردات ج ۲، ص ۴۹۷-۴۹۶، مطبوعہ مکہ مکرمہ)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں: عقل سے کسی چیز کے معنی کی تلاش اور طلب کو تفکر کہتے ہیں اور کسی شے میں غور و فکر اور تدبیر کرنے کو تفکر کہتے ہیں۔ جیسے جب ہم بھر (آکھ) سے دیکھتے ہیں تو انکشاف اور جلاء کی حالت مخصوصہ حاصل ہوتی

نبیان القرآن

جلد چہارم

ہے اور اس کا مقدمہ یہ ہے کہ ہم آنکھ کی پتلی کو مرئی (دکھائی دینے والی چیز) کی طرف متوجہ کریں تاکہ ہمیں آنکھ سے یہ رویت حاصل ہو۔ اسی طرح بصیرت کی رویت ہے جس کو علم اور یقین کہتے ہیں اور یہ بھی انکشاف اور جلاء کی حالت مخصوصہ ہے اور اس کا مقدمہ یہ ہے کہ ہم انکشاف اور تجلی کو حاصل کرنے کے لیے عقل کی آنکھ کو مطلوب کی جانب متوجہ کریں اور اس فعل کو نظر عقل کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیا انہوں نے تفکر نہیں کیا۔ اس میں انہیں تامل اور تدبر کرنے اور اشیاء کی معرفت کے لیے غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے، کیونکہ اگر وہ غور و فکر کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ نبی ﷺ کو جنون نہیں ہے۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۲۲۰-۲۱۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

جاہل کفار نبی ﷺ کو کیوں مجنون کہتے تھے اور اس کا جواب

مکہ میں بعض جہال نبی ﷺ کو دو دو جہوں سے جنون کی طرف منسوب کرتے تھے:

پہلی وجہ یہ تھی کہ نبی ﷺ کے افعال ان کے افعال کے مخالف تھے، کیونکہ نبی ﷺ دنیا سے منہ موڑ کر آخرت کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور اللہ عزوجل کی یاد اور اس سے دعا کرنے میں مشغول رہتے تھے، اس وجہ سے آپ کا عمل ان کے طریقہ کے مخالف تھا۔ لہذا انہوں نے اعتقاد کیا کہ آپ مجنون ہیں۔ حسن بصری اور قتادہ نے بیان کیا کہ آپ رات کو صفا پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کو قبیلہ بہ قبیلہ پکارتے اور فرماتے اے بنو فلان! اے بنو فلان! اور ان کو اللہ کے عذاب سے ڈراتے تو کوئی کہنے والا کہتا کہ تمہارا یہ صاحب تو مجنون ہے، رات سے لے کر صبح تک چلاتا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، ”کیا انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ ان کے صاحب پر مطلقاً جنون نہیں ہے۔“ (جامع البیان جز ۹، ص ۱۸۲) اور اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی ﷺ کے معمولات پر غور کرنے کی دعوت دی تاکہ انہیں معلوم ہو کہ نبی ﷺ ان کو عذاب الہی سے ڈرانے کے لیے رات بھر پکارتے ہیں العیاذ باللہ کسی جنون کی وجہ سے نہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ نزول وحی کی وقت نبی ﷺ پر عجیب و غریب حالت طاری ہوتی تھی آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور رنگ زرد پڑ جاتا اور لگتا تھا کہ آپ پر غشی طاری ہو رہی ہے۔ پس جہال یہ کہتے کہ آپ پر جنون ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا کہ آپ پر کسی قسم کا جنون نہیں ہے کیونکہ آپ ان کو اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اپنے فصیح الفاظ کے ساتھ قطعی دلائل اور قوی براہین پیش کرتے ہیں جس کی فصاحت کا معارضہ کرنے سے تمام دنیائے عرب عاجز تھی۔ آپ کے بہت عمدہ اخلاق تھے اور آپ کی معاشرت نہایت پاکیزہ تھی، آپ کی عادات اور خصلت انتہائی نیک تھیں، آپ ہمیشہ اچھے کام کرتے تھے اور اسی وجہ سے آپ تمام صاحبان عقل کے مقتدا اور پیشوا تھے اور یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جو انسان عمدہ اور پاکیزہ شخصیت کا حامل ہو اس کو مجنون قرار دینا کسی طور پر جائز اور درست نہیں ہے اور اس سے واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس لیے بھیجا ہے کہ آپ کافروں کو عذاب سے ڈرائیں اور مومنوں کو ثواب کی طرف راغب کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا انہوں نے آسمانوں اور زمینوں کی نشانیوں میں غور نہیں کیا اور ہر اس چیز میں جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور اس میں کہ شاید ان کا مقرر وقت قریب آچکا ہے، پس اس قرآن کے بعد وہ اور کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ (الاعراف: ۱۸۵)

اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت پر دلائل

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبوت کا بیان فرمایا تھا اور چونکہ نبوت کا ثبوت الوہیت کے ثبوت پر موقوف ہے اس

لے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی الوہیت اور توحید کا بیان فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان کی نشانیوں سے اپنی الوہیت پر استدلال فرمایا ہے، آسمانوں، زمینوں اور ان کے درمیان کی چیزوں میں سے ہم صرف سورج کی شعاع کے ایک ذرہ کو لیتے ہیں، کسی کھڑکی یا روشن دان سے جب سورج کی شعاع اندر آتی ہے تو ہم چمکیلے ذرات پر مشتمل ایک غبار کو دیکھتے ہیں، ہم ان ذرات میں سے ایک ذرہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خاص سمت اور خاص وضع پر ہے، سوال یہ ہے کہ سمتیں اور اوضاع اور احیاز تو غیر مٹائی ہیں تو اس خاص سمت، خاص چیز اور خاص وضع کے لیے اس کا مخصص کون ہے، اس طرح وہ ذرہ اپنے حجم، اپنی صورت و شکل، اپنے رنگ، اپنی طبیعت اور اپنے اثرات میں تمام احجام اور تمام صور اور اشکال اور تمام رنگوں اور تمام طبائع اور اثرات میں مساوی ہے تو اس خاص حجم، خاص شکل و صورت، خاص رنگ، خاص طبیعت اور اثرات میں ان کا مخصص کون ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مخصص کوئی جسم ہے تو وہ جسم بھی ممکن ہو گا تو پھر ہم اس میں کلام کریں گے کہ اس ممکن کو عدم سے وجود میں لانے کا مرجح کون ہے اور یونہی سلسلہ چلتا رہے گا اور قطع تسلسل کے لیے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مخصص اور مرجح جسم ممکن اور حادث نہیں ہے بلکہ وہ جسم کا غیر ہے اور قدیم اور واجب ہے اور یہ ضروری ہے کہ وہ قدیم اور واجب واحد ہو کیونکہ ایک سے زیادہ قدیم اور واجب ہوں تو وہ قدم اور وجوب میں مشترک ہوں گے اور کسی اور جز کی وجہ سے باہم ممتاز اور متمیز ہوں گے، سو ان میں ایک جز مشترک ہو گا وہ قدم اور وجوب ہے اور ایک جز متمیز ہو گا، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوں گے اور جو چیز دو جزوں سے مرکب ہو وہ اپنے اجزاء کی محتاج ہوگی اور ہر مرکب اور محتاج ممکن ہوتا ہے اور امکان اور احتیاج وجوب، قدم اور الوہیت کے منافی ہے، اور ایک آسان دلیل یہ ہے کہ یہ آسمان، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے وہ سب ایک نظم اور ایک طریقہ پر ہیں، اس پوری کائنات کا نظام نظم واحد پر چل رہا ہے، سورج ہمیشہ ایک مخصوص جانب سے طلوع ہو کر دوسری جانب غروب ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس چاند کا طلوع اور غروب ہوتا ہے اور کبھی اس نظام کے خلاف نہیں ہوا، اسی طرح ہمیشہ آسمان پانی برساتا ہے اور غلہ زمین سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی اس نظام کے خلاف نہیں ہوا، سیب کے درخت سے کبھی اخروٹ پیدا نہیں ہوا، کبھی کسی حیوان سے انسان یا کسی انسان سے حیوان پیدا نہیں ہوا اور اس پوری کائنات کا نظم واحد پر جاری رہنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کا ناظم بھی واحد ہے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہ نے اس عالم کے سوا کروڑوں عالم بنائے ہیں اور ہر عالم میں اس سے عظیم عرش ہے، اور اس سے اعلیٰ کرسی ہے اور ان آسمانوں سے وسیع آسمان ہیں، لہذا انسان کی عقل اللہ کے ملک اور ملکوت کا کس طرح احاطہ کر سکتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا يَعْلَمُ جُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (المدثر: ۳۱)

اور آپ کے رب کے لشکر کی تعداد کو اس کے سوا اور کوئی

نہیں جانتا۔

اور جب انسان اللہ کی نشانیوں میں اور کائنات کی وسعتوں میں غور و فکر کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے اسرار میں سوچ و بچار کرے گا تو اس کے لیے یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا

تو پاک ہے ہمیں صرف ان ہی چیزوں کا علم ہے جن کا علم تو

(البقرہ: ۳۲) نے ہمیں دیا ہے۔

آیا بغیر دلیل کے ایمان لانا صحیح ہے یا نہیں؟

قرآن مجید کی متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو مظاہر کائنات میں غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر استدلال کرنے کا حکم دیا ہے۔

قُلْ اَنْظُرُوا مَا ذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

آپ کہئے کہ غور سے دیکھو آسمانوں اور زمینوں میں کیا کیا نشانیاں ہیں۔

(یونس: ۱۰۱)

کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو غور سے نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیا بنایا ہے، اور کس طرح اس کو مزین کیا ہے اور اس میں کوئی شکاف نہیں ہے، اور ہم نے زمین کو پھیلا یا اور اس میں مضبوط پہاڑوں کو پوست کر دیا اور اس میں ہر طرح کے خوش نما پودے اگائے، یہ (اللہ کی طرف) ہر رجوع کرنے والے بندے کے لیے بصیرت اور نصیحت ہیں۔

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْا اِلَى السَّمٰوٰتِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَالْقَبٰنِ فِيْهَا رَوٰسِيْ ۝ وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ تَبٰصِرَةٌ ۝ وَذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (ق: ۶-۸)

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاٰيٰتِ كَيْفَ خُلِقَتْ

(الغاشیہ: ۱۷)

وَ فِى الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ فِىْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تَبْصُرُوْنَ ۝ (الذاریات: ۲۱-۲۰)

اور یقین رکھنے والوں کے لیے زمین میں بہت نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفسوں میں تو کیا تم (ان نشانیوں کو) بغور نہیں دیکھتے۔

ان آیات کی وجہ سے بعض علماء نے یہ کہا کہ جو شخص غور و فکر کر کے دلیل سے اسلام قبول کرے اسی کا اسلام معتبر ہے، اسی وجہ سے امام بخاری نے ”کتاب العلم“ میں ایک باب (۱۱) کا یہ عنوان قائم کیا ہے قول اور عمل سے پہلے علم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَاعَلِمْنَا اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (محمد: ۱۹)

جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے علم سے ابتداء کی ہے، امام بخاری کا مشایہ ہے کہ لا الہ الا اللہ پر ایمان لانے سے پہلے دلیل سے اس کا علم حاصل کرنا ضروری ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص بغیر دلیل کا کلمہ پڑھے اس کا ایمان معتبر نہیں ہے۔

لیکن یہ نظریہ صحیح نہیں ہے ورنہ جب مسلمان کفار سے اسلام کے لیے جہاد کرتے تو کفار کے لیے یہ کہنا صحیح ہوتا کہ تمہارا ہم سے جنگ کرنا اور ہم کو قتل کرنا جائز نہیں ہے حتیٰ کہ تم ہمیں دلائل کے ساتھ اسلام کی حقانیت پر غور و فکر کرنے کی مہلت دو، نیز امام بخاری نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے حتیٰ کہ وہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب وہ یہ کہہ لیں گے تو وہ مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیں گے ماسوا حق اسلام کے اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۵)

نیز اس پر تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ جب کافر یہ کہے کہ اشدان لا الہ الا اللہ و اشدان محمد عبده و رسوله، اور کہے کہ سیدنا محمد ﷺ جو دین لے کر آئے ہیں وہ حق ہے اور میں دین اسلام کے مخالف ہر دین سے بری ہوتا ہوں۔ اور وہ شخص بالغ اور صحیح

العقل ہو تو اس شہادت اور اقرار کے بعد وہ مسلمان ہو گا اور اگر وہ اس شہادت اور اقرار سے منحرف ہو گیا تو وہ مرتد ہو گا اور علامہ سمنانی نے کہا ہے کہ سب سے پہلا واجب یہ ہے کہ انسان 'اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے اور ان تمام امور پر ایمان لائے جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دلائل پر غور و فکر کرے بغیر حجت اور دلیل کے ایمان صحیح ہوتا ہے اس پر واضح دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میری ایک باندی ہے جو میری بکریوں کو چراتی ہے، ایک دن میں اس کے پاس گیا تو بکریوں میں سے ایک بکری کم تھی، میں نے اس کے متعلق سوال کیا تو اس نے کہا اس کو بھیڑیالے گیا تو مجھے افسوس ہوا اور میں بھی آخر بنو آدم میں سے ہوں، میں نے اس کو ایک تھپڑ مار دیا۔ مجھ پر ایک غلام کو آزاد کرنا تھا کیا میں اس باندی کو آزاد کر دوں؟ رسول اللہ ﷺ نے اس باندی سے پوچھا اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا 'آسمان میں؟' آپ نے فرمایا میں کون ہوں؟ اس نے کہا آپ اللہ کے رسول ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو آزاد کر دو۔

(الموطا رقم الحدیث: ۱۵۱۱، صحیح مسلم المساجد ۳۳ (۵۳۷) ۱۱۷۹، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۲۸۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۳۱۸، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۳۱، الاستذکار ج ۲۳، رقم الحدیث: ۱۳۸۳، ص ۱۲۵)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جس کو اللہ گمراہی پر رکھے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے اور اللہ ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔ (الاعراف: ۱۸۶)

کافروں کو گمراہی پر پیدا کرنے کا معنی

اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ کافروں کو اللہ نے گمراہ کیا ہے ورنہ وہ قیامت کے دن یہ حجت پیش کریں گے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو گمراہ کر دیا تھا تو ہماری گمراہی میں کیا قصور ہے؟ اور ہمیں اس گمراہی پر سزا دینا کس طرح عدل و انصاف پر مبنی ہو گا، بلکہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب مسلسل کفریہ عقائد پر جسے رہنے کی وجہ سے کافروں کے دلوں میں گمراہی راسخ ہو گئی اور وہ اپنی سرکشی میں حد سے بڑھ گئے اور انہوں نے اپنے اختیار سے اس چیز کو ضائع کر دیا جو انہیں ہدایت اور ایمان کی دعوت دیتی تو پھر ان کے دلوں اور دماغوں میں دعوت حق کو قبول کرنے کی استعداد جاتی رہی اور وہ اس طرح ہو گئے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو گمراہی پر پیدا کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ وہ کب آئے گی؟ آپ کہئے کہ اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے، اس کے وقت پر صرف وہی اس کو ظہور میں لائے گا، آسمانوں اور زمینوں پر قیامت بہت بھاری ہے وہ تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی، وہ آپ سے اس کے متعلق اس طرح سوال کرتے ہیں گویا آپ اس کی جستجو میں ہیں، آپ کہئے اس کا علم تو صرف اللہ کے پاس ہے، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ (الاعراف: ۱۸۷)

آیات سابقہ سے ارتباط

قرآن مجید کے بنیادی مضمون چار ہیں توحید، رسالت، تقدیر اور قیامت، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے توحید، رسالت اور قضاء و قدر کے متعلق آیات نازل فرمائی تھیں تو اب قیامت کے متعلق آیت نازل فرمائی، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے فرمایا تھا: شاید ان کا مقررہ وقت قریب آچکا ہے۔ (الاعراف: ۱۸۵) تاکہ انہیں توبہ اور اصلاح پر براہِ گنجتہ کیا جاسکے۔ اس کے بعد فرمایا یہ لوگ قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں، تاکہ ان کے دلوں میں یہ بات جاگزیں ہو کہ قیامت کا وقت لوگوں سے مخفی رکھا گیا

ہے اور اس سے مسلمانوں کو توبہ اور اداء واجبات میں جلدی کرنے پر برانگیزتہ کیا جائے۔

مشکل الفاظ کے معانی

الساعة: ساعۃ کا لغوی معنی ہے زمانہ کا قلیل جز جو غیر معین ہو اور عرفی معنی ہے دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے ایک گھنٹہ اور اس کا شرعی معنی ہے قیامت یہ وہ وقت ہے جس میں تمام جہان ختم ہو جائے گا حضرت اسرافیل علیہ السلام پہلا صور پھونکیں گے اور کائنات کی ہر چیز فنا ہو جائے گی۔

ایان مرساها: ایان کا معنی ہے کب، مرسی کا لفظ ارساء سے بنا ہے ارساء السفینہ کا معنی ہے سمندر میں لنگر ڈال کر جہاز کو ٹھہرانا اور یہاں مراد یہ ہے کہ قیامت کے وقوع اور حصول کا وقت کب ہے۔
لا یجلیہا: اس کا معنی ہے اس کو منکشف نہیں کرے گا یا ظاہر نہیں کرے گا۔

بغتۃ: البغت کا معنی ہے کسی چیز کا اچانک بغیر توقع اور وہم و گمان کے واقع ہو جانا، قنادہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ فرماتے تھے کہ قیامت لوگوں پر ٹوٹ پڑے گی، در آنحالیکہ کوئی شخص اپنا حوض ٹھیک کر رہا ہو گا اور کوئی شخص اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہا ہو گا اور کوئی شخص بازار میں سودا بیچ رہا ہو گا اور کوئی شخص اپنے ترازو کو اوپر نیچے کر رہا ہو گا۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۱۸۷-۱۸۶، الدر المنثور ج ۳، ص ۶۱۹)

حفی عنہا: الحفی کا معنی ہے کسی چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی بہت کوشش کرنا، جو شخص کسی چیز کے متعلق سوال کرنے میں بہت مبالغہ کرے اس کو حفی کہا جاتا ہے۔ امام بخاری حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: سئلوا النبی ﷺ حتی احفوه بالمسئلة۔ صحابہ نے نبی ﷺ سے سوالات کیے حتیٰ کہ سوالات میں بہت مبالغہ کیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۰۸۹، صحیح مسلم فضائل ۱۳۷ (۲۳۵۹) ۶۰۰۷، مسند احمد ج ۳، ص ۱۷۷، طبع قدیم)

وقت وقوع قیامت کو مخفی رکھنے کی حکمت

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

یعنی جس وقت قیامت واقع ہوگی اس وقت کو اللہ سبحانہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور اس کی نظیر قرآن مجید کی حسب ذیل

آیات ہیں:

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ (لقمان: ۳۴)

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أَخْفِيهَا (طہ: ۱۵)

بے شک اللہ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔

بلاشبہ قیامت آنے والی ہے میں اس کو مخفی رکھنا چاہتا

ہوں۔

اور وہ کہتے ہیں کہ قیامت کا یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟ اگر تم

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ

سچے ہو؟ آپ کہئے کہ اس کا علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تو

صَادِقِينَ ۝ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا

صرف اللہ کے عذاب سے علی الاعلان ڈرانے والا ہوں۔

نَذِيرٌ مُّبِينٌ (الملك: ۲۶-۲۵)

اور جب حضرت جبرئیل نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا:

جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ جاننے والا نہیں ہے۔ محققین نے کہا ہے کہ بندوں سے قیامت کے وقوع کے وقت

کو مخفی رکھنے کا سبب یہ ہے کہ جب انہیں یہ معلوم نہیں ہو گا کہ قیامت کب آئے گی تو وہ اس سے بہت زیادہ ڈریں گے اور ہر

وقت گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں گے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گناہوں میں مشغول ہوں اور قیامت آجائے اور اللہ تعالیٰ کی

عبادت میں ہر وقت کوشاں رہیں گے۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۳۲۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۱۵ھ)
علم قیامت کے متعلق لوگوں کے سوالات اور نبی ﷺ کے جوابات

امام ابن اسحاق، امام ابن جریر اور امام ابو الشیخ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حمل بن ابی قحیر اور سمویل بن زید نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اگر آپ برحق نبی ہیں تو ہمیں بتائیے کہ قیامت کب آئے گی؟ کیونکہ ہمیں معلوم ہے وہ کیا چیز ہے، تب یہ آیت نازل ہوئی: یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں وہ کب آئے گی! آپ کہنے لگے اس کا علم تو صرف میرے رب کے پاس ہے۔ الایہ۔

امام عبد بن حمید اور ابو الشیخ نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی حضرت جبرئیل سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا السلام علیک یا روح اللہ! انہوں نے جواب دیا وعلیک یا روح اللہ! حضرت عیسیٰ نے کہا اے جبرئیل قیامت کب ہوگی؟ تو جبرئیل نے اپنے پر جھاڑے پھر کہا جس سے سوال کیا گیا ہے وہ سائل سے زیادہ نہیں جانتا وہ آسمانوں اور زمینوں پر بھاری ہے اور وہ اچانک ہی آئے گی۔ (الدر المنثور ج ۳، ص ۶۲۰-۶۱۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ساتیوں میں سے ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! قیامت کب قائم ہوگی؟ آپ نے فرمایا تم پر افسوس ہے! تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے کہا میں نے قیامت کے لیے اس کے سوا اور کوئی تیاری نہیں کی کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں، آپ نے فرمایا تم اس کے ساتھ رہو گے جس سے محبت کرتے ہو، ہم نے پوچھا: ہم بھی اسی طرح ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں! تو ہم اس دن بہت زیادہ خوش ہوئے۔ امام مسلم کی روایت ۶۵۸۹ میں ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا میں اللہ اور اس کے رسول اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر سے محبت کرتا ہوں۔ ہر چند کہ میرے عمل ان کے اعمال کی طرح نہیں ہیں، امام مسلم کی روایت ۶۵۹۱ میں ہے اس اعرابی نے کہا یا رسول اللہ! میں نے قیامت کے لیے بہت بھاری نمازوں، روزوں اور صدقات کی تیاری تو نہیں کی لیکن میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۸۸، ۶۱۶۷، ۷۱۵۳، صحیح مسلم فضائل الصحابہ: ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۱، ۲۶۳۹، ۶۵۸۶، ۶۵۸۹، ۶۵۹۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک مجلس میں مسلمانوں سے گفتگو فرما رہے تھے اسی اثناء میں ایک اعرابی آیا اور اس نے پوچھا قیامت کب ہوگی؟ رسول اللہ ﷺ نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا، بعض مسلمانوں نے کہا آپ نے اس کا سوال سن لیا تھا اور اس کو پسند نہیں فرمایا اور بعض نے کہا آپ نے سنا نہیں، جب آپ نے اپنی گفتگو مکمل فرمائی تو آپ نے پوچھا وہ شخص کہاں ہے جس نے قیامت کے متعلق سوال کیا تھا، اس نے کہا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرنا، اس نے پوچھا امانت کیسے ضائع ہوگی؟ آپ نے فرمایا جب منصب نااہل کے سپرد کر دیا جائے تو قیامت کا انتظار کرنا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۹، ۶۳۹۶، ۵۹، مسند احمد ج ۲، ص ۳۶۱، جامع الاصول ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۹۰۳)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید کی ظاہر آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو وقوع قیامت کے وقت کا علم نہیں تھا، ہاں نبی ﷺ قرب قیامت کو اجمالی طور پر جانتے تھے اور آپ نے اس کی خبر بھی دی ہے۔ (روح المعانی ج ۹، ص ۱۳۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

میں کہتا ہوں کہ نبی ﷺ کو تفصیلی طور پر قیامت کے وقوع اور اس کے احوال کا علم تھا اور اس سلسلہ میں آپ سے بہت احادیث مروی ہیں جن کو ہم باحوالہ جات بیان کر رہے ہیں، فتقول وباللہ التوفیق۔

نبی ﷺ کا علامات قیامت کی خبر دینا

۱- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ ارض حجاز سے ایسی آگ نمودار نہ ہو جس سے بھری کے اونٹوں کی گردنیں روشن ہو جائیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۱۱۸، صحیح مسلم الفتن ۳۲، ۷۱۵۶ (۲۹۰۲)، جامع الاصول ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۸۸۷)

۲- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تمیں کذابوں کا خروج نہ ہو ان میں سے ہر ایک یہ زعم کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔

(صحیح مسلم الفتن ۱۸۳، ۷۲۹۲۳ (۲۹۰۹)، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۳۳۳، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۲۲۵، مسند احمد ج ۲، ص ۳۵۰)

(۷۸۹۵) ۵۲۷ جامع الاصول ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۸۹۵

۳- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو، پس جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا تو سب لوگ ایمان لے آئیں گے اور جو لوگ اس سے پہلے ایمان نہ لائے ہوں ان کا اس دن ایمان لانا مفید نہ ہو گا یا جن لوگوں نے اس سے پہلے ایمان کے ساتھ کوئی نیکی نہ کی ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۵۰۶، صحیح مسلم الایمان ۲۳۸ (۱۵۷)، ۳۸۹، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۰۰۲، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۱۹۱، ۳۲۳۵، مسند احمد ج ۵، ص ۱۳۵، ۱۶۵، جامع الاصول ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۸۹۷)

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۸، جامع الاصول ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۸۹۹)

۴- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ درندے انسانوں سے باتیں نہ کریں اور انسان سے اس کے کوڑے کا پھندا بات نہ کرے اور اس سے اس کی جوتی کا تمہہ بات نہ کرے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۸، جامع الاصول ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۸۹۹)

۵- حضرت سلامہ بنت حر رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ اہل مسجد امامت کرنے کے لیے ایک دوسرے سے کہیں گے اور انہیں نماز پڑھنے کے لیے کوئی امام نہیں ملے گا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۵۸۱، جامع الاصول ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۹۰۸)

۶- قیس بن ابی حازم حضرت مرداس سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا نیک لوگ ایک ایک کر کے چلے جائیں گے اور تلچھٹ (بھوسی) باقی رہ جائیں گے جیسے جو کی بھوسی یا ردی کھجوریں باقی رہ جاتی ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۳۳۳، مسند احمد ج ۳، ص ۱۹۳، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۲۷۲۲، جامع الاصول ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۹۰۹)

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۷۹۰۹)

۷- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی حتیٰ کہ ایک آدمی کسی آدمی کی قبر کے پاس سے گزرے گا اور کہے گا کاش اس کی جگہ میں ہوتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۱۱۵، صحیح مسلم الفتن ۵۳، ۷۱۶۸ (۲۹۰۷)، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۳، الموطا رقم الحدیث: ۱۶۵)

مسند احمد ج ۲، ص ۳۶، جامع الاصول رقم الحدیث: ۷۹۱۱)

۸- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی حتیٰ کہ زمانہ متقارب ہو جائے سال ایک ماہ کی طرح گزرے گا اور مہینہ ہفتہ کی طرح گزرے گا اور ہفتہ ایک دن کی طرح اور ایک دن ایک گھنٹہ کی طرح گزرے گا اور ایک گھنٹہ آگ کی چنگاری کی طرح گزر جائے گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۹۲۹، جامع الاصول رقم الحدیث: ۷۹۱۳)

۹- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قیامت صرف اشرار (بدترین لوگوں) پر قائم ہوگی۔

(صحیح مسلم الفتن ۱۳۱، ۲۹۳۹، ۷۲۶۸، جامع الاصول رقم الحدیث: ۷۹۱۶)

۱۰- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ دو عظیم جماعتوں میں جنگ نہ ہو ان میں بہت بڑی جنگ ہوگی اور ان کا دعویٰ ایک ہوگا اور حتیٰ کہ تمیں دجالوں کذابوں کا ظہور ہوگا ان میں سے ہر ایک یہ گمان کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے اور حتیٰ کہ علم اٹھالیا جائے گا اور زلزلے بکثرت ہوں گے اور زمانہ متقارب ہوگا اور فتنوں کا ظہور ہوگا اور بکثرت قتل ہوگا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۰۹، صحیح مسلم الفتن ۱۷، ۲۸۸۸۰، ۷۱۲۳، مسند احمد ج ۲، ص ۳۱۳، جامع الاصول ج ۱۰،

رقم الحدیث: ۷۹۲۰)

۱۱- حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میری امت میں سے ایک جماعت ہمیشہ اللہ کے دین کے لیے قتال کرتی رہے گی اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی اور کسی کی مخالفت سے ان کو ضرر نہیں ہوگا حتیٰ کہ ان پر قیامت آجائے گی اور وہ اسی حال پر ہوں گے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے کہا ہاں اللہ تعالیٰ ایک ہوا بھیجے گا جس کی خوشبو مشک کی طرح ہوگی اور اس کا مس ریشم کی طرح ہوگا اور جس شخص کے دل میں ایک رائی کے برابر بھی ایمان ہوگا وہ اس کی روح قبض کر لے گی پھر اشرار (بدترین لوگ) باقی رہ جائیں گے اور ان پر قیامت قائم ہوگی۔

(صحیح مسلم الامارۃ ۱۷۶، ۱۹۲۳، ۳۸۷۳، جامع الاصول رقم الحدیث: ۷۹۱۷)

۱۲- حضرت حذیفہ بن اسید الفغاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم آپس میں بحث کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لے آئے آپ نے فرمایا تم کسی چیز کا ذکر کر رہے ہو؟ ہم نے کہا ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں، آپ نے فرمایا قیامت ہرگز اس وقت تک قائم نہیں ہوگی حتیٰ کہ تم اس سے پہلے دس نشانیاں نہ دیکھ لو، پھر آپ نے دھوئیں کا، دجال کا، دابۃ الارض کا، سورج کے مغرب سے طلوع ہونے کا، حضرت عیسیٰ بن مریم کے نزول کا، یاجوج ماجوج کا اور تین مرتبہ زمین کے دھنسنے کا ذکر فرمایا، ایک مرتبہ مشرق میں، ایک مرتبہ مغرب میں، ایک مرتبہ جزیرہ عرب میں اور سب کے آخر میں ایک آگ ظاہر ہوگی جو لوگوں کو محشر کی طرف لے جائے گی۔

(صحیح مسلم الفتن ۳۹، ۲۹۰۱، ۷۱۵۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۳۱۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:

۳۰۳۱، جامع الاصول رقم الحدیث: ۷۹۲۱)

۱۳- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کیا میں تم کو وہ حدیث نہ سناؤں جس کو میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا اور میرے بعد کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا جس نے رسول اللہ ﷺ سے اس کو سنا ہو، آپ نے فرمایا قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ علم اٹھایا جائے گا اور جہل کا ظہور ہوگا اور زنا عام ہوگا اور شراب پی جائے گی اور مرد چلے جائیں گے اور عورتیں باقی رہ جائیں گی،

تبیان القرآن

جلد چہارم

حتیٰ کہ پچاس عورتوں کا کفیل ایک مرد ہو گا۔

(صحیح مسلم العلم ۹ (۲۶۷۱) ۶۶۶۰، صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۸۱، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۲۱۲، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۰۳۵، مسند احمد ج ۳، ص ۱۳۰، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۷۹۲۲)

۱۳- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ زمانہ متقارب ہو جائے گا اور علم کم ہو جائے گا اور فتنوں کا ظہور ہو گا اور قتل بہت زیادہ ہو گا۔

(صحیح مسلم العلم ۱۰ (۲۶۷۲) ۶۶۶۲، صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۷۰۶۲، سنن الترمذی: ۲۲۰۷، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۲۵۵، سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۳۰۵۰، ۳۰۵۱، مسند احمد ج ۲، ص ۵۲۵، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۷۹۲۳)

۱۵- حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب میری امت پندرہ کاموں کو کرے گی تو اس پر مصائب کا آنا حلال ہو جائے گا، عرض کیا گیا یا رسول اللہ ﷺ وہ کیا کام ہیں؟ آپ نے فرمایا جب مال غنیمت کو ذاتی دولت بنا لیا جائے گا اور امانت کو مال غنیمت بنا لیا جائے گا اور زکوٰۃ کو جرمانہ سمجھ لیا جائے گا، جب لوگ اپنی بیوی کی اطاعت کریں گے اور اپنی ماں کی نافرمانی کریں گے اور جب دوست کے ساتھ نیکی کریں گے اور باپ کے ساتھ برائی کریں گے اور جب مسجدوں میں آوازیں بلند کی جائیں گی اور ذلیل ترین شخص کو قوم کا سردار بنا دیا جائے گا اور جب کسی شخص کے شر کے ڈر سے اس کی عزت کی جائے گی، شراب پی جائے گی اور ریشم پہنا جائے گا اور گانے والیاں اور ساز رکھے جائیں گے اور اس امت کے آخری لوگ پہلوں کو برا کہیں گے اس وقت تم سرخ آنڈھیوں، زمین کے دھسنے اور مسخ کا انتظار کرنا۔

(سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۲۱۷، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۷۹۲۵)

۱۶- حضرت ابومالک اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میری امت میں ضرور ایسے لوگ ہوں گے جو ریشم کو شراب کو اور گانے بجانے کے آلات کو حلال کہیں گے اور ضرور کچھ لوگ پہاڑ کے دامن میں رہیں گے جب شام کو وہ اپنے جانوروں کا ریوڑ لے کر لوٹیں گے اور ان کے پاس کوئی فقیر اپنی حاجت لے کر آئے گا تو وہ کہیں گے کہ کل آتا، اللہ تعالیٰ پہاڑ گرا کر ان کو ہلاک کر دے گا اور دوسرے لوگوں کو (جو ریشم، شراب اور باجوں کو حلال کہیں گے) مسخ کر کے قیامت تک کے لیے بندر اور خنزیر بنا دے گا۔

(صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۵۵۹۰، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۰۳۹، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۳۹۳۷)

۱۷- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک کہ عرب کا حاکم وہ شخص نہیں ہو گا جو میرے اہل بیت سے ہے اس کا نام میرے نام کے موافق ہو گا (یعنی محمد) اور دوسری روایت میں ہے اگر ایام دنیا میں سے صرف ایک دن باقی رہ جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اتنا لبا کر دے گا حتیٰ کہ اس دن میں ایک شخص کو میرے اہل بیت سے مبعوث کرے گا جس کا نام میرے نام کے موافق اور جس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام کے موافق ہو گا وہ زمین کو اس طرح عدل اور انصاف سے بھر دے گا جس طرح وہ پہلے ظلم و جور سے بھری ہوئی تھی۔

(سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۲۸۲، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۲۲۳۷)

۱۸- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ مال بہت زیادہ نہ ہو جائے اور حتیٰ کہ ایک آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ لے کر نکلے تو اس کو کوئی شخص نہ ملے جو اس کو قبول کرے۔

(صحیح مسلم الزکوٰۃ، ۶۰، (۱۰۱۲) ۲۳۰۲، مشکوٰۃ، رقم الحدیث: ۵۳۳۰)

۱۹- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے عنقریب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے، وہ حاکم عادل ہوں گے، وہ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کر دیں گے اور جزیہ موقوف کر دیں گے اور مال کو بمائیں گے حتیٰ کہ اس کو کوئی قبول نہیں کرے گا، حتیٰ کہ ایک سجدہ کرنا دنیا اور مافیہا سے بہتر ہوگا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۲۲۲، صحیح مسلم الایمان ۲۲۲ (۱۵۵) ۱۳۸۲، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۵۵۰۵)

۲۰- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس وقت تمہاری کیا شان ہوگی جب تم میں ابن مریم نازل ہوں گے اور امام تم میں سے ہوں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۳۹، صحیح مسلم الایمان ۲۲۳ (۱۵۵) ۳۸۵، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۵۵۰۶)

۲۱- حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عیسیٰ ابن مریم زمین کی طرف نازل ہوں گے وہ شادی کریں گے اور ان کی اولاد ہوگی، اور وہ زمین میں پینتالیس سال رہیں گے پھر فوت ہوں گے اور میرے ساتھ قبر میں دفن کیے جائیں گے، پس میں اور عیسیٰ بن مریم ایک قبر سے ابو بکر اور عمر کے درمیان سے کھڑے ہوں گے۔

(الوفالابن الجوزی ص ۸۱۳، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۵۵۰۸)

۲۲- حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نیند سے بیدار ہوئے در آنحالیکہ آپ کا چہرہ سرخ تھا اور آپ فرما رہے تھے لا الہ الا اللہ اور اس کو آپ نے تین مرتبہ دہرایا، آپ نے فرمایا عرب کے لیے اس شر سے ہلاکت ہو جو قریب آپہنچا ہے یا جوج ماجوج کی بندش آج کے دن کھل گئی، اس کی طرح پھر آپ نے دس کا عقد کیا، حضرت زینب نے کہا یا رسول اللہ! کیا ہم ہلاک ہو جائیں گے حالانکہ ہم میں نیک لوگ موجود ہیں! آپ نے فرمایا ہاں! جب خباثت زیادہ ہو جائے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۹۳، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۳۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸۸۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:

۳۹۵۳، صحیح ابن حبان ج ۲، رقم الحدیث: ۳۲۷، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۷۳۹، مصنف ابن ابی شیبہ رقم الحدیث: ۱۹۰۶۱، مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۳۰۸، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۱۰، ص ۹۳، مسند احمد ج ۱۰، رقم الحدیث: ۲۷۳۸۶)

۲۳- مجمع بن جاریہ الانصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ابن مریم، دجال کو باب لد پر قتل کریں گے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۲۵۸، صحیح ابن حبان ج ۱۵، رقم الحدیث: ۶۸۱۱، المعجم الکبیر ج ۱۹، رقم الحدیث: ۱۰۷۷۷، مصنف عبدالرزاق

رقم الحدیث: ۲۰۸۳۵)

۲۴- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دابة الارض نکلے گا اس کے پاس حضرت سلیمان بن داؤد کی انگوٹھی ہوگی اور حضرت موسیٰ بن عمران علیہم السلام کا عصا ہوگا، وہ مومن کے چہرے کو عصا سے روشن کرے گا اور کافر کی ناک پر انگوٹھی سے نشان لگائے گا حتیٰ کہ قبیلہ کے لوگ جمع ہو جائیں گے اور وہ کہے گا یا مومن یا کافر۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۱۸۷، مسند احمد ج ۳، رقم الحدیث: ۷۹۳۲)

۲۵- امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے رسول اللہ ﷺ کا ایک طویل ارشاد روایت کیا ہے جس کے آخر میں آپ نے فرمایا یوم القیامتہ یوم عاشوراء ہے۔ (یعنی محرم کے مہینہ کی دس تاریخ)

(فضائل الادا قات رقم الحدیث: ۲۳۷، ص ۳۳۱، مکتبہ النارة مکہ مکرمہ ۱۴۱۰ھ)

۲۶۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا سب سے بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے وہ جمعہ کا دن ہے جس میں حضرت آدم پیدا کیے گئے اور اسی دن جنت سے باہر لائے گئے اور قیامت بھی صرف جمعہ کے دن قائم ہوگی۔

(صحیح مسلم الجملہ ۱۸، ۸۵۳، ۱۹۳۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۰۸۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۳۷۳)

۲۷۔ حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دو دنوں میں زمین کو پیدا کیا اور دو دنوں میں اس کی روزی پیدا کی، پھر استواء فرمایا پھر دو دنوں میں آسمانوں کو پیدا فرمایا، زمین کو اتوار اور پیر کے دن پیدا کیا اور منگل اور بدھ کو اس کی روزی پیدا کی اور آسمانوں کو جمعرات اور جمعہ کے دن پیدا کیا اور جمعہ کی آخری ساعت میں عجلت سے حضرت آدم کو پیدا کیا اور اسی ساعت میں قیامت قائم ہوگی۔ (یہ حدیث حکما مرفوع ہے)

(کتاب الاسماء والصفات للسیحی، ص ۳۸۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

نبی ﷺ نے قیامت واقع ہونے سے پہلے اس کی تمام نشانیاں بیان فرمائیں اور موخر الذکر تین حدیثوں میں یہ بھی بتا دیا کہ محرم کے مہینہ کی دس تاریخ کو جمعہ کے دن، دن کی آخری ساعت میں قیامت واقع ہوگی، مہینہ، تاریخ، دن اور خاص وقت سب بتا دیا صرف سن نہیں بتایا، کیونکہ اگر سن بھی بتا دیتے تو ہم آج جان لیتے کہ قیامت آنے میں اب اتنے سال باقی رہ گئے ہیں اور ایک دن بلکہ ایک گھنٹہ پہلے لوگوں کو معلوم ہوتا کہ اب ایک گھنٹہ بعد قیامت آئے گی اور قیامت کا آنا چانک نہ رہتا اور قرآن جھوٹا ہو جاتا کیونکہ قرآن نے فرمایا ہے:

لَا تَأْتِيكُمُ الْبَغْتَةُ (الاعراف: ۱۸۷) قیامت تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی۔

اور نبی ﷺ قرآن مجید کے کذب نہیں صدق تھے اس لیے آپ نے قرآن مجید کے صدق کو قائم رکھنے کے لیے سن نہیں بتایا اور اپنا علم ظاہر فرمانے کے لیے باقی سب کچھ بتا دیا۔

رسول اللہ ﷺ کو علوم خمسہ اور علم روح وغیرہ دیے جانے کے متعلق علماء اسلام کے نظریات قیامت کب واقع ہوگی، بارش کب ہوگی، ماں کے پیٹ میں کیا ہے، انسان کل کیا کرے گا اور کون شخص کس جگہ مرے گا، یہ وہ امور خمسہ ہیں جن کا ذاتی علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے، بحث اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو ان پانچ چیزوں کا علم عطا فرمایا ہے یا نہیں۔ بعض علماء سلف نے نیک نیتی کے ساتھ یہ کہا کہ یہ علوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور اس نے مخلوق میں سے کسی کو ان پانچ چیزوں پر مطلع نہیں فرمایا، اور اکثر اہل اسلام نے یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو عموماً اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خصوصاً ان پانچ چیزوں کے علوم میں سے بھی حظ وافر عطا فرمایا ہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۳۰ھ لکھتے ہیں:

ان تمام اجماعات کے بعد ہمارے علماء میں یہ اختلاف ہوا کہ بیشار علوم غیب جو مولیٰ عزوجل نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمائے، آیا وہ روز اول سے یوم آخر تک تمام کائنات کو شامل ہیں جیسا کہ عموم آیات و احادیث کا مفاد ہے یا ان میں تخصیص ہے۔

بہت اہل ظاہر جانب خصوص گئے ہیں، کسی نے کہا مشابہات کا، کسی نے خمس کا، کثیر نے کہا ساعت کا اور عام علماء باطن اور ان کے اتباع سے بکثرت علماء ظاہر نے آیات و احادیث کو ان کے عموم پر رکھا۔

(خالص الاعتقاد ص ۲۷، مطبوعہ امام احمد رضا اکیڈمی، کراچی)

رسول اللہ ﷺ کو علوم خمسہ و علم روح وغیرہ دیے جانے کے متعلق
جمہور علماء اسلام کی تصریحات

علامہ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم المالکی القرطبی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

فمن ادعی علم شئی منها غیر مسند الی رسول اللہ ﷺ کان کاذباً فی دعواه۔
جو شخص رسول اللہ ﷺ کی وساطت کے بغیر ان پانچ چیزوں کے جاننے کا دعویٰ کرے وہ اس دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

(المعجم، ج ۱، ص ۱۵۶، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، ۱۳۱۷ھ)

علامہ بدر الدین عینی حنفی، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ احمد قسطلانی، ملا علی قاری اور شیخ عثمانی نے بھی اپنی شروح میں علامہ قرطبی کی اس عبارت کو ذکر کیا ہے:

(عمدة القاری ج ۱، ص ۲۹۰، فتح الباری ج ۱، ص ۱۲۳، ارشاد الساری ج ۱، ص ۱۳۸، مرقات ج ۱، ص ۶۵، فتح المعجم ج ۱، ص ۱۷۲) علامہ ابن حجر عسقلانی شافعی لکھتے ہیں:

بعض علماء نے کہا ہے کہ (سورہ بنی اسرائیل کی) آیت میں یہ دلیل نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو روح کی حقیقت پر مطلع نہیں کیا، بلکہ احتمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو روح کی حقیقت پر مطلع کیا ہو اور آپ کو اس کی اطلاع دینے کا حکم نہ دیا ہو، قیامت کے علم کے متعلق بھی علماء نے اسی طرح کہا ہے۔ واللہ اعلم۔

(فتح الباری ج ۸، ص ۳۰۳)

قال بعضهم لیس فی الایة دلیل علی ان اللہ لم یطلع نبیہ علی حقیقة الروح بل یحتل ان یکون اطلعه ولم یامرہ انہ یطلعہم وقد قالوا فی علم الساعة نحو هذا واللہ اعلم

علامہ احمد قسطلانی الشافعی نے بھی یہ عبارت نقل کی ہے۔ (ارشاد الساری ج ۷، ص ۲۰۳)

علامہ زرقانی "المواہب" کی شرح میں لکھتے ہیں:

علم قیامت اور باقی ان پانچ چیزوں کے متعلق جن کا سورہ لقمان کی آخری آیت میں ذکر ہے علماء نے یہی کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پانچ چیزوں کا علم عطا فرمایا اور آپ کو انہیں مخفی رکھنے کا حکم دیا گیا۔

(شرح المواہب باللہ نیہ ج ۱، ص ۲۶۵)

(وقد قالوا فی علم الساعة) و باقی الخمس المذكورة فی آية ان اللہ عنده علم الساعة (نحو هذا) یعنی انہ علمہا تم امر بکتہا۔

علامہ جلال الدین سیوطی الشافعی لکھتے ہیں:

اور بعض علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو امور خمسہ کا علم دیا گیا ہے اور وقوع قیامت کا اور روح کا بھی علم دیا گیا ہے اور آپ کو ان کے مخفی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ذهب بعضهم الی انہ صلی اللہ علیہ وسلم اوتی علم الخمس ایضاً و علم وقت الساعة والروح وانہ امر بکتہم ذالک۔

(شرح الصدور ص ۳۱۹، مطبوعہ بیروت، المحضات الکبریٰ ج ۲، ص ۳۳۵، بیروت، ۱۳۰۵ھ)

علامہ صاوی مالکی لکھتے ہیں:

قال العلماء الحق انہ لم یخرج نبیاً من

علماء کرام نے فرمایا کہ حق بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ

نے دنیا سے اس وقت تک وفات نہیں پائی، جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پانچ چیزوں کے علوم پر مطلع نہیں فرمادیا، لیکن آپ کو ان علوم کے مخفی رکھنے کا حکم فرمایا۔

(تفسیر صاوی ج ۳، ص ۲۱۵)

رسول اللہ ﷺ نے اس وقت تک وفات نہیں پائی جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر اس چیز کا علم نہیں دے دیا جس کا علم دینا ممکن تھا۔ (روح المعانی ج ۱۵، ص ۱۵۳)

اور یہ بات جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وقوع وقت قیامت پر مکمل اطلاع دی ہو مگر اس طریقہ پر نہیں کہ اس سے علم الہی کا شبہا ہو الایہ کہ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ پر اس کا انشاء واجب کر دیا ہو اور یہ علم رسول اللہ ﷺ کے خواص میں ہے ہو، لیکن مجھے اس پر کوئی قطعی دلیل حاصل نہیں ہوئی۔ (روح المعانی ج ۲۱، ص ۱۱۳)

اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے وہ اپنے مخصوص غیب یعنی قیامت قائم ہونے کے وقت پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا، البتہ ان کو مطلع فرماتا ہے جن سے وہ راضی ہوتا ہے اور وہ اللہ کے رسول ہیں۔

(تفسیر کبیر ج ۱۰، ص ۶۷۸)

علامہ علاؤ الدین خازن نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ (تفسیر خازن ج ۳، ص ۳۱۹)

علامہ تفتازانی لکھتے ہیں:

اور جواب یہ ہے کہ یہاں غیب عموم کے لیے نہیں ہے بلکہ مطلق ہے یا اس سے غیب خاص مراد ہے یعنی وقت وقوع قیامت اور آیات کے سلسلہ ربط سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اور یہ بات مستبعد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض رسولوں کو وقت وقوع قیامت پر مطلع فرمائے خواہ وہ رسول ملائکہ ہوں یا رسول بشر۔

(شرح المقاصد ج ۵، ص ۶، طبع ایران)

الدنيا حتى اطلعه الله على تلك الخمس ولكنه امره بكتماها۔

اور علامہ آلوسی خفی فرماتے ہیں:

لم يقبض رسول الله ﷺ حتى علم كل شي يمكن العلم به۔

نیز علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

ويحوز ان يكون الله تعالى قد اطلع حبيبه عليه الصلوة والسلام على وقت قيامها على وجه كامل لكن لا على وجه يحاكي علمه تعالى به الا انه سبحانه اوجب عليه صلى الله تعالى عليه وسلم كتبه لحكمة ويكون ذلك من خواصه عليه الصلوة والسلام وليس عندي ما يفيد الحزم بذلك۔

امام رازی لکھتے ہیں:

عالم الغيب فلا يظهر على غيبه المخصوص وهو قيام القيامة احدثا ثم قال بعده لكن من ارتضى من رسول۔

والجواب ان الغيب ههنا ليس للعموم بل مطلق او معين هو وقت وقوع القيامة بقريته السياق ولا يبعد ان يطلع عليه بعض الرسل من الملائكة او البشر۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:

حق یہ ہے کہ قرآن کی آیت میں اس بات پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو روح کی حقیقت پر مطلع نہیں کیا بلکہ جائز ہے کہ مطلع کیا ہو اور لوگوں کو بتلانے کا حکم آپ کو نہ دیا ہو۔ اور بعض علماء نے علم قیامت کے بارے میں بھی یہی قول کیا ہے اور بندہ مسکین (اللہ اس کو نور علم اور یقین کے ساتھ خاص فرمائے) یہ کہتا ہے کہ کوئی مومن عارف حضور ﷺ سے روح کے علم کی کیسے نفی کر سکتا ہے وہ جو سید مرسلین اور امام العارفین ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات اور صفات کا علم عطا فرمایا ہے اور تمام اولین اور آخرین کے علوم آپ کو عطا کیے ہیں ان کے سامنے روح کے علم کی کیا حیثیت ہے۔ آپ کے علم کے سمندر کے سامنے روح کے علم کی ایک قطرہ سے زیادہ کیا حقیقت ہے۔

(مدارج النبوة ج ۲، ص ۳۰)

و حق آنست کہ در آیت دلیلے نیست بر آنکہ حق تعالیٰ مطلع نگر دانیدہ است حبیب خود را صلے اللہ علیہ وسلم بر ماہیت روح بلکہ احتمال دارد کہ مطلع گردانیدہ باشد و امر نکرد اورا کہ مطلع گرداند این قوم را و بعضی از علماء در علم ساعت نیز این معنی گفته اندالی ان قال ولے گوید بندہ مسکین خصہ اللہ بنور العلم والیقین وچگونہ جرات کند مومن عارف کہ نفی علم بہ حقیقت روح سید المرسلین و امام العارفین صلی اللہ علیہ وسلم کند و دادہ است اورا حق سبحانہ علم ذات و صفات خود و فتح کردہ بروے فتح مبین از علوم اولین و آخرین روح انسانی چہ باشد کہ در جنب حقیقت جامعہ وے قطرہ ایست از دریائے ذرہ از بیضائے فافہم و باللہ التوفیق۔

سید عبدالعزیز دہلوی عارف کامل فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ سے ان پانچ چیزوں کا علم کیسے مخفی ہو گا، حالانکہ آپ کی امت شریفہ میں سے کوئی شخص اس وقت تک صاحب تصرف نہیں ہو سکتا جب تک اس کو ان پانچ چیزوں کی معرفت نہ ہو۔

(الابریز ص ۳۸۳)

و کیف یخفی امر الخمس علیہ صلی اللہ علیہ وسلم والواحد من اهل التصرف من امتہ الشریفۃ لا یمکنہ التصرف الا بمعرفة ہذہ الخمس۔

علامہ احمد قسطلانی شافعی متوفی ۹۱۱ھ تحریر فرماتے ہیں:

کوئی غیر خدا نہیں جانتا کہ قیامت کب آئے گی سو اس کے پسندیدہ رسولوں کے کہ انہیں اپنے جس غیب پر چاہے اطلاع دے دیتا ہے۔ (یعنی وقت قیامت کا علم بھی ان پر بند نہیں) رہے اولیاء وہ رسولوں کے تابع ہیں ان سے علم حاصل کرتے ہیں۔

(ارشاد الساری ج ۷، ص ۱۷۸)

لا یعلم متی تقوم الساعة الا اللہ الامن ارتضیٰ من رسول فانہ یطلعه علی من یشاء من غیبہ والولیٰ تابع لہ یاخذ عنہ۔

اعلیٰ حضرت احمد رضا فاضل بریلوی کے تخصّص اور تتبع سے حسب ذیل حوالہ جات ہیں:

علامہ بیجوری شرح بردہ شریف میں فرماتے ہیں:

لم يخرج صلى الله عليه وسلم من الدنيا الا بعد ان اعلمه الله تعالى بهذه الامور الی الخمسة:

علامہ شنوانی نے جمع التہامیہ میں اسے بطور حدیث بیان کیا ہے کہ:

قد ورد ان الله تعالى لم يخرج النبي ﷺ حتى اطلعہ علی کل شیء -

بے شک وارد ہوا کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو دنیا سے نہ لے گیا جب تک کہ حضور کو تمام اشیاء کا علم عطا نہ فرمایا۔

حافظ الحدیث سیدی احمد مالکی غوث الزماں سید شریف عبدالعزیز مسعود حسنی بنی بکر سے راوی:

هو صلى الله تعالى عليه وسلم لا يخفى عليه شئ من الخمس المذكورة في الآية الشريفة و كيف يخفى عليك ذلك والاقطاب السبعة من امته الشريفة يعلمونها وهم دون الغوث فكيف بالغوث فكيف بسيد الاولين والآخرين الذي هو سبب كل شئ ومنه كل شئ -

یعنی قیامت کب آئے گی، مینہ کب اور کہاں اور کتنا برسے گا۔ مادہ کے پیٹ میں کیا ہے، کل کیا ہوگا۔ فلاں کہاں مرے گا۔ یہ پانچوں غیب جو آیہ کریمہ میں مذکور ہیں ان میں سے کوئی چیز رسول اللہ ﷺ پر مخفی نہیں اور کیونکر یہ چیزیں حضور ﷺ سے پوشیدہ ہیں حالانکہ حضور کی امت سے ساتوں قطب ان کو جانتے ہیں اور ان کا مرتبہ غوث کے نیچے ہے۔ غوث کا کیا کنا پھر ان کا کیا پوچھنا جو سب اگلوں پچھلوں سارے جہان کے سردار اور ہر چیز کے سبب ہیں اور ہر شے انہیں سے ہے۔ (ﷺ)

(خالص الاعتقاد ص ۳۳، مطبوعہ امام احمد رضا اکیڈمی، کراچی)

اللہ تعالیٰ کی ذات میں علوم خمسہ کے انحصار کی خصوصیت کا باعث

سورہ لقمان کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے:

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنزِلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (لقمان: ۳۴)

بے شک اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم، اور وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے جو رحموں میں ہے، اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کرے گا، اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں مرے گا، بے شک اللہ ہی جاننے والا، (جسے چاہے) خبر دینے والا ہے۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان پانچ چیزوں کا ذاتی علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ ہر چیز کا ذاتی علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، پھر ان پانچ چیزوں کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ اس کے دو جواب ہیں، ایک یہ کہ مشرکین ان چیزوں کے متعلق سوال کرتے تھے اس لیے بتایا گیا کہ ان چیزوں کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، دو سرا جواب یہ ہے کہ مشرکین کا اعتقاد یہ تھا کہ ان کے کاہنوں اور نجومیوں کو ان کا علم ہے اس لیے بتایا گیا کہ ان کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔

علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں:

اس آیت میں ان پانچ چیزوں کا شمار کیا گیا ہے، حالانکہ تمام مغیبات کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ان چیزوں کے متعلق سوال کرتے تھے، روایت ہے کہ دیہاتیوں میں سے حارث بن عمر نبی ﷺ کے پاس آئے اور آپ سے قیامت کے وقت کے متعلق سوال کیا اور یہ کہ ہماری زمین خشک ہے میں نے اس میں بیج ڈالنے ہیں، بارش کب ہوگی؟ اور میری عورت حاملہ ہے اس کے پیٹ میں مذکر ہے یا مؤنث، اور مجھے گزشتہ کل کا تو علم ہے لیکن آئندہ کل میں کیا کروں گا؟ اور مجھے یہ علم تو ہے کہ میں کس جگہ پیدا ہوا ہوں لیکن میں کہاں مروں گا؟ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

نیز اہل جاہلیت نجومیوں کے پاس جا کر سوال کرتے تھے اور ان کا یہ زعم تھا کہ نجومیوں کو ان چیزوں کا علم ہوتا ہے، اور اگر کاہن غیب کی کوئی خبر دے اور کوئی شخص اس کی تصدیق کرے تو یہ کفر ہے، نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص کاہن کے پاس گیا اور اس کے قول کی تصدیق کی تو اس نے محمد ﷺ پر نازل شدہ دین کا کفر کیا۔

اور یہ جو بعض روایات میں ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام غیب کی خبریں دیتے ہیں تو ان کا یہ خبر دینا وحی الہام اور کشف کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم دینے سے ہوتا ہے، لہذا ان پانچ چیزوں کے علم کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ ان غیب پر انبیاء، اولیاء اور ملائکہ کے سوا اور کوئی مطلع نہیں ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

عَالِمِ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا
إِلَّا مَن ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ (جن: ۲۷-۲۶)

اطلاع نہیں دیتا مگر جن کو اس نے پسند فرمایا، جو اس کے (سب) رسول ہیں۔

اور بعض غیب وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ خاص کر لیا، جن کی اطلاع کسی مقرب فرشتے کو ہے اور نہ کسی نبی مرسل کو، جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے:

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ
اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، اس کے سوا (بذات خود) انہیں کوئی نہیں جانتا۔ (الانعام: ۵۹)

قیامت کا علم بھی انہی امور میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے وقوع قیامت کے علم کو مخفی رکھا، لیکن صاحب شرع کی زبان سے اس کی علامتوں کو ظاہر فرمادیا، مثلاً خروج دجال، نزول عیسیٰ اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، اسی طرح بعض اولیاء نے بھی الہام صحیح سے بارش ہونے کی خبر دی اور یہ بھی بتایا کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے، اسی طرح ابو العزم اصغمانی شیراز میں بیمار ہو گئے انہوں نے کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے طرطوس میں موت کی دعا کی ہے اگر بالفرض شیراز میں مر گیا تو مجھے یہودیوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔ (یعنی ان کو یقین تھا کہ ان کی موت طرطوس میں آئے گی) وہ تندرست ہو گئے اور بعد میں طرطوس میں ان کی وفات ہوئی، اور میرے شیخ نے بیس سال پہلے اپنی موت کا وقت بتا دیا تھا اور وہ اپنے بتائے ہوئے وقت پر ہی فوت ہوئے تھے۔

(روح البیان ج ۷، ص ۱۰۵-۱۰۳، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ)

اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کے علم میں فرق کے متعلق اعلیٰ حضرت کا نظریہ

۱- بلاشبہ غیر خدا کے لیے ایک ذرہ کا علم ذاتی نہیں، اس قدر خود ضروریات دین سے اور منکر کافر۔

۲- بلاشبہ غیر خدا کا علم معلومات الہیہ کو حاوی نہیں ہو سکتا، مساوی درکنار تمام اولین و آخرین و انبیاء و مرسلین و ملائکہ مقربین سب کے علوم مل کر علوم الہیہ سے وہ نسبت نہیں رکھ سکتے جو کروڑہا کروڑ سمندروں سے ایک ذرا سی بوند کے کروڑوں حصے کو کہ وہ تمام سمندر اور یہ بوند کا کروڑوں حصہ، دونوں متناہی ہیں اور متناہی کو متناہی سے نسبت ضرور ہے۔ بخلاف علوم الہیہ کے غیر

متناہی در غیر متناہی در غیر متناہی ہیں، اور مخلوق کے علوم اگرچہ عرش و فرش، شرق و غرب و جملہ کائنات از روز اول تا روز آخر کو محیط ہو جائیں آخر متناہی ہیں کہ عرش و فرش دو حدیں ہیں، شرق و غرب روز اول و روز آخر دو حدیں ہیں اور جو کچھ دو حدوں کے اندر ہو سب متناہی ہے۔

بالفعل غیر متناہی کا علم تفصیلی مخلوق کو مل ہی نہیں سکتا، تو جملہ علوم خلق کو علم الہی سے اصلاً نسبت ہونی ہی محال قطعی ہے نہ کہ معاذ اللہ تو ہم مساوات۔

۳۔ یوں ہی اس پر اجماع ہے کہ اللہ عزوجل کے دیے سے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کو کثیر وافر غیبوں کا علم ہے یہ بھی ضروریات دین سے ہے، جو ان کا منکر ہو وہ کافر ہے کہ سرے سے نبوت ہی کا منکر ہے۔

۴۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ اس فضل جلیل میں محمد رسول اللہ ﷺ کا حصہ تمام انبیاء تمام جہان سے اتم و اعظم ہے۔ اللہ عزوجل کی عطا سے حبیب اکرم ﷺ کو اتنے غیبوں کا علم ہے جن کا شمار اللہ عزوجل ہی جانتا ہے۔ مسلمانوں کا یہاں تک اجماع تھا۔ (خالص الاعتقاد ص ۲۳-۲۴، ملخصاً، مطبوعہ امام احمد رضا اکیڈمی، کراچی)

علم کی ذاتی اور عطائی کی تقسیم کے متعلق علماء اسلام کی تصریحات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی لکھتے ہیں:

علم یقیناً ان صفات میں ہے کہ غیر خدا کو بہ عطائے خدا مل سکتا ہے تو ذاتی و عطائی کی طرف اس کا انقسام یقینی، یوں ہی محیط و غیر محیط کی تقسیم بدیہی، ان میں اللہ عزوجل کے ساتھ خاص ہونے کے قابل صرف ہر تقسیم کی قسم اول ہے۔ یعنی علم ذاتی و علم محیط حقیقی۔

تو آیات و احادیث و اقوال علماء جن میں دوسرے کے لیے اثبات علم غیب سے انکار ہے، ان میں قطعاً یہی دو قسمیں مراد ہیں۔ فقہاء کہ حکم تکفیر کرتے ہیں انہیں قسموں پر حکم لگاتے ہیں کہ آخر بنائے تکفیری ہی تو ہے کہ خدا کی صفت خاصہ دوسرے کے لیے ثابت کی۔ اب یہ دیکھ لیجئے کہ خدا کے لیے علم ذاتی خاص ہے یا عطائی۔ حاشا اللہ علم عطائی خدا کے ساتھ خاص ہونا درکنار خدا کے لیے محال قطعی ہے۔ کہ دوسرے کے دیے سے اسے علم حاصل ہو پھر خدا کے لیے علم محیط حقیقی خاص ہے یا غیر محیط۔ حاشا اللہ علم غیر محیط خدا کے لیے محال قطعی ہے، جس میں بعض معلومات مجہول رہیں تو علم عطائی غیر محیط حقیقی، غیر خدا کے لیے ثابت کرنا، خدا کی صفت خاصہ ثابت کرنا کیوں کر ہوا۔

تکفیر فقہاء اگر اس طرف ناظر ہو تو معنی یہ ٹھہریں گے کہ دیکھو تم غیر خدا کے لیے وہ صفت ثابت کرتے ہو جو زناہر خدا کی صفت نہیں ہو سکتی لہذا کافر ہو یعنی وہ صفت غیر کے لیے ثابت کرنی چاہیے تھی جو خاص خدا کی صفت ہے۔ کیا کوئی احمق سا احمق ایسا خبیث جنون گوارا کر سکتا ہے۔ (خالص الاعتقاد ص ۱۸، مطبوعہ امام احمد رضا اکیڈمی، کراچی)

علامہ ابن حجر کی متونی ۹۱۱ھ تحریر فرماتے ہیں:

وما ذکرناہ فی الایۃ صرح بہ النووی رحمہ اللہ تعالیٰ فتاواہ فقال معناہا لا یعلم ذالک استقلالاً و علم احاطۃ بکل المعلومات للہ تعالیٰ۔
یعنی ہم نے جو آیات کی تفسیر کی، امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فتاویٰ میں اس کی تصریح کی فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ غیب کا ایسا علم صرف خدا کو ہے جو بذات خود ہو اور جمیع معلومات ایسے کو محیط ہو۔

(فتاویٰ حدیثہ ص ۲۶۸، مطبوعہ مطبعہ مصطفیٰ البابی و اولادہ مصر ۱۳۵۶ھ)

علامہ ابن حجر مکی نے علامہ نووی کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ حسب ذیل ہے:

جن آیات میں اللہ تعالیٰ کے غیر سے علم غیب کی نفی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی استقلالاً غیب کو نہیں جانتا یا اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی کل معلومات کا احاطہ نہیں کر سکتا اور معجزات اور کرامات میں اللہ کے خبر دینے سے علم حاصل ہوتا ہے استقلالاً نہیں ہوتا۔

معناه لا يعلم ذلك استقلالاً وعلم احاطة بكل المعلومات الا الله واما المعجزات والكرامات فحصلت باعلام الله تعالى للانباء والاولياء لاستقلالاً.

(فتاویٰ الامام النووی ص ۱۷۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ البقرہ ۳۴ کی تفسیر میں الانعام ۵۰ کے متعلق لکھتے ہیں:

یدل علی اعترافہ بانہ غیر عالم بكل المعلومات۔ یہ آیت آپ کے اس اعتراف پر دلالت کرتی ہے کہ آپ کل معلومات کو نہیں جانتے تھے۔

(تفسیر کبیر ج ۱، ص ۳۳۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۱۵ھ)

نیز امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ (الانعام: ۵۰) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ میں اس قدرت کا دعویٰ نہیں کرتا جو اللہ کی شان کے لائق ہے۔ اور میں غیب نہیں جانتا اس سے مراد یہ ہے کہ میں اللہ کے علم سے موصوف ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا اور ان دونوں باتوں کا حاصل یہ ہے کہ میں الوہیت کا دعویٰ نہیں کرتا۔

المراد من قوله لا اقول لكم عندى خزائن الله انى لا ادعى كوني موصوفا بالقدرة اللائقة بالاله تعالى و من قوله ولا اعلم الغيب انى لا ادعى كوني موصوفا بعلم الله تعالى وحصل بمجموع الكلامين انه لا يدعى الالهية

(تفسیر کبیر ج ۲، ص ۵۳۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۱۵ھ)

علامہ محی الدین محمد بن مصطفیٰ قوجوی متوفی ۹۵۱ھ علامہ احمد شہاب الدین خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ اور علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی لکھا ہے:

(حاشیہ الشیخ زادہ علی الجلالین ج ۲، ص ۱۶۷، عنایت القاضی ج ۳، ص ۶۵، روح المعانی ج ۷، ص ۱۵۵)

علامہ احمد شہاب خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ شفا کی عبارت کے ساتھ مزج کر کے لکھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا معجزہ علم غیب یقیناً ثابت ہے جس میں کسی عاقل کو انکار یا تردد کی گنجائش نہیں کہ اس میں احادیث بکثرت آئیں اور ان سب سے بالاتفاق حضور کا علم غیب ثابت ہے اور یہ ان آیتوں کے کچھ منافی نہیں جو بتاتی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا اور یہ کہ نبی ﷺ کو یہ کہنے کا حکم ہوا کہ میں غیب جانتا تو اپنے لیے بہت خیر جمع کر لیتا۔ اس لیے کہ آیتوں میں نفی اس علم کی ہے جو بغیر خدا کے

(هذه المعجزة في) اطلاعه صلى الله تعالى عليه وسلم على الغيب (معلومة على القطع) بحيث لا يمكن انكارها او التردد فيها لاحد من العقلاء (الكثرة رواها واتفاق معانيها على الاطلاع على الغيب) وهذا لا ينافي الايات الدالة على انه لا يعلم الغيب الا الله وقوله ولو كنت اعلم

تبيان القرآن

بتائے ہو اور اللہ تعالیٰ کے بتائے سے نبی ﷺ کو علم غیب ملنا تو قرآن عظیم سے ثابت ہے کہ اللہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوا اپنے پسندیدہ رسول کے۔

(نیم الریاض ج ۳، ص ۱۵۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

الغیب لا استکثرت من الخیر فان المنفی علمه من غیر واسطۃ واما اطلاعه صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم علیہ باعلام اللہ تعالیٰ فله فامر متحقق لقوله تعالیٰ فلا یظهر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول۔

علامہ نظام الدین حسین بن محمد نیشاپوری متوفی ۷۷۲ھ، لا اعلم الغیب (الانعام: ۵۰) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آیت کے معنی ہیں کہ علم غیب جو بذات خود ہو وہ خدا کے

ساتھ خاص ہے۔

لا اعلم الغیب فیہ دلالة علی ان الغیب بالاستقلال لا یعلمہ الا اللہ۔

(تفسیر نیشاپوری علی حاشی جامع البیان ج ۸، ص ۱۳۸، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۳۰۹ھ)

علامہ سید ابن عابدین شامی صاحب جامع الفصولین سے نقل فرماتے ہیں:

بحباب بانہ یمكن التوفیق بان المنفی هو العلم بالاستقلال لا العلم بالاعلام او المنفی هو المعجزوم به لا المظنون ویؤیدہ قوله تعالیٰ ان جعل فیہا من یفسد فیہا الا یہ لانہ غیب اخبر بہ الملائکة ظنا منهم او باعلام الحق فینبغی ان یکفر لو ادعاه مستقلا لوالوا خبر بہ باعلام فی نومه او یقظتہ بنوع من الكشف اذ لا منافاة بینہ و بین الا یہ لما مر من التوفیق۔

(یعنی فقہاء نے دعویٰ علم غیب پر حکم کفر کیا اور حدیثوں اور ائمہ ثقافت کی کتابوں میں بہت غیب کی خبریں موجود ہیں جن کا انکار نہیں ہو سکتا) اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ فقہاء نے اس کی نفی کی ہے کہ کسی کے لیے بذات خود علم غیب مانا جائے، خدا کے بتائے سے علم غیب کی نفی نہ کی یا نفی قطعی کی ہے نہ کہ ظنی کی، اور اس کی تائید یہ آیت کریمہ کرتی ہے فرشتوں نے عرض کی کیا تو زمین میں ایسوں کو خلیفہ کرے گا جو اس میں فساد و خون ریزی کریں گے، ملائکہ غیب کی خبر نہیں بولے گمہ فلنا یا خدا کے بتائے سے، تو تکفیر اس پر چاہیے کہ کوئی بغیر خدا کے بتائے علم غیب کا دعویٰ کرے نہ یوں کہ براہ کشف جاگتے یا سوتے میں خدا کے بتائے سے، ایسا علم غیب آیت کے کچھ منافی نہیں۔

(رسائل ابن عابدین ج ۲، ص ۳۱۱، مطبوعہ سہیل اکیڈمی، لاہور ۱۳۹۶ھ)

علامہ شامی فرماتے ہیں کہ متعدد کتب حنفیہ میں مذکور ہے:

لو ادعی علم الغیب بنفسہ یکفر۔

اگر بذات خود علم غیب حاصل کر لینے کا دعویٰ کرے تو کافر

ہے۔ (رسائل ابن عابدین ج ۲، ص ۳۱۱)

نیز علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں:

قال فی التتارخانیہ وفی الحجۃ ذکر فی المملکت انہ لا یکفر لان الاشیاء تعرض علی روح النبی ﷺ وان الرسل یعرفون

تاتارخانیہ اور فتاویٰ مجہ میں ہے ملتقط میں فرمایا کہ جس نے اللہ و رسول کو گواہ کر کے نکاح کیا کافر نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اشیاء نبی ﷺ پر عرض کی جاتی ہیں۔ اور بیشک رسولوں

کو بعض علم غیب ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے غیب کا جاننے والا تو اپنے غیب پر کسی کو مسلط نہیں کرتا مگر اپنے پسندیدہ رسولوں کو۔ علامہ شامی نے فرمایا کہ بلکہ ائمہ اہلسنت نے کتب عقائد میں ذکر فرمایا کہ بعض غیبوں کا علم ہونا اولیاء کی کرامت سے ہے اور معتزلہ نے اس آیت کو اولیاء کرام سے اس کی نفی پر دلیل قرار دیا۔ ہمارے ائمہ نے اس کا رد کیا یعنی ثابت فرمایا کہ اس آیت کریمہ نے اولیاء سے بھی مطلقاً علم غیب کی نفی نہیں فرمائی۔

(رد المحتار، ج ۲، ص ۷۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۰۷ھ)

علامہ علی بن محمد خازن متوفی ۷۲۵ھ اور علامہ سلیمان جمل متوفی ۱۲۰۳ھ الاعراف: ۱۸۸ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

لا اعلم الغیب کا معنی یہ ہے کہ میں اللہ کے مطلع اور قادر کے بغیر غیب کو نہیں جانتا۔

والمعنی لا اعلم الغیب الا ان یطلعنی اللہ علیہ ویقدر لی۔

(باب التاویل للخازن، ج ۲، ص ۱۶۷، مطبوعہ پشاور، حاشیہ الجمل علی الجلالین ج ۲، ص ۲۱۷، مطبوعہ کراچی)

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۶ھ الانعام: ۵۰ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

آیت کے یہ معنی ہیں کہ جب تک وحی یا کوئی دلیل قائم نہ ہو، مجھے بذات خود غیب کا علم نہیں ہوتا۔

لا اعلم الغیب ما لم یوحی الی ولم ینصب علیہ دلیل۔

(انوار التنزیل علی حاشی عنایہ القاضی ج ۳، ص ۶۳، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

یہ جو آیت میں فرمایا کہ غیب کی کنجیاں اللہ ہی کے پاس ہیں اس کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا۔ اس خصوصیت کے معنی یہ ہیں کہ ابتداءً بغیر بتائے ان کی حقیقت دوسرے پر نہیں کھلتی۔

وعندہ مفاتح الغیب وجہ اختصاصها به تعالیٰ انه لا یعلمها کما هی ابتداءً الا هو۔

(عنایہ القاضی ج ۳، ص ۷۳، مطبوعہ دار صادر، بیروت)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ الجمن: ۲۷-۲۵ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ میں از خود نہیں جانتا کہ قیامت کا وعدہ قریب ہے یا بعید ہے سوا اس کے کہ اللہ مجھے اس پر مطلع فرمادے۔ کیونکہ علم غیب اللہ کے ساتھ خاص ہے اور وہ اپنی بعض مخلوق کو اس پر مطلع فرماتا ہے۔

کانہ قبیل ما دری قرب ذالک الموعدو بعده الا ان یطلعنی اللہ علیہ لان علم الغیب مختص به وقد یطلع علیہ بعض خلقه۔

اور اس کے دو تین سطر بعد لکھتے ہیں:

غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس لیے خاص ہے کہ غیب کا بالذات، حقیقی اور یقینی بلا سبب علم (مثلاً غیر کو مطلع کر دینا) اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے علاوہ

واختصاصه به تعالیٰ لانه لا یعلم بالذات والکنه علما حقیقیا یقینیا بغیر سبب کا اطلاع الغیر الا اللہ و علم غیره لبعضه

تبیان القرآن

بعض مخلوق کو غیب کا علم جو عطا فرماتا ہے وہ حقیقت میں غیب نہیں ہے وہ صرف ظاہر کے اعتبار سے غیب ہے، یا جن بعض لوگوں سے وہ پوشیدہ ہے ان کے اعتبار سے غیب ہے۔ اور اس اختصاص کے یہ منافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خبر دینے سے یہ غیب لوگوں کو معلوم ہے کیونکہ یہ اختصاص مستثنیٰ کے ماسوا کے اعتبار سے ہے اور اضافی ہے۔ (یعنی رسولوں کے سوا اور کسی کو یقینی علم غیب نہیں ہوتا) (عناویہ القاضی ج ۸، ص ۲۶۱، طبع دار صادر، بیروت)

ليس علما للغيب الا بحسب الظاهر و
بالنسبة لبعض البشر (الی قوله) ولا يقدح
في هذا الاختصاص كونه معلوما للغير
باعلامه تعالى اذا الاختصاص اضافى
بالنسبة الى من عدا المستثنى.

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۳ھ الانعام: ۵۰، میں لا اعلم الغیب کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اور نہ میں (یہ کہتا ہوں کہ میں) تمام غیبوں کو (جو کہ معلومات الہیہ ہیں) جانتا ہوں۔

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یعنی کوئی شخص جو مدعی نبوت ہو اس کا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ تمام مقدرات الہیہ کے خزانے اس کے قبضہ میں ہیں کہ جب اس سے کسی امر کی فرمائش کی جائے وہ ضرور ہی کر دکھلائے یا تمام معلومات غیبیہ و شہادیہ پر خواہ ان کا تعلق فرائض رسالت سے ہو یا نہ ہو اس کو مطلع کر دیا گیا ہے۔

نیز شیخ عثمانی "قل لا یعلم من فی السموت والارض الغیب الا اللہ" (النمل: ۶۵) کی تفسیر میں لکھتے ہیں: کل مغیبات کا علم بجز خدا کے کسی کو حاصل نہیں (اللہ کا علم حصولی نہیں، حضوری ہے، سعیدی غفرلہ) نہ کسی ایک غیب کا علم کسی شخص کو بالذات بدون عطائے الہی کے ہو سکتا ہے اور نہ مفاہیم غیب اللہ نے کسی مخلوق کو دی ہیں ہاں بعض بندوں کو بعض غیوب پر با اختیار خود مطلع کر دیتا ہے، جس کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرمادیا یا غیب کی خبر دے دی۔

ان عبارات میں علماء دیوبند نے بھی علم غیب کی ذاتی اور عطائی کی طرف تقسیم کا اعتراف کر لیا ہے اور دیگر کثیر علماء اسلام کی عبارت سے بھی ہم نے اس بحث میں علم غیب کی ذاتی اور عطائی کی طرف تقسیم کو واضح تر کر دیا ہے۔
قرآن اور سنت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کے عموم اور علم ما کان وما یکون کی تصریحات

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ
وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ
عَلَيْكَ عَظِيمًا (النساء: ۱۱۳)

اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت نازل کی اور ان تمام چیزوں کا علم دے دیا جن کو آپ پہلے نہیں جانتے تھے اور اللہ کا آپ پر فضل عظیم ہے۔

اس آیت سے علم کلی کے استدلال پر ہم نے اپنی کتاب مقام ولایت و نبوت میں بہت تفصیل سے بحث کی ہے اور اس استدلال کی تائید میں بکثرت حوالہ جات نقل کیے ہیں اور اس استدلال پر وارد ہونے والے اعتراضات کا مکمل ازالہ کر دیا ہے۔ جو لوگ اس بحث کو تفصیل اور تحقیق سے جاننا چاہتے ہوں ان کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

امام بخاری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عمرو بن العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان ایک مجلس میں کھڑے ہوئے پھر آپ نے ابتداء خلق سے خبریں بیان کرنا شروع کیں، حتیٰ کہ جنتیوں کے اپنے ٹھکانوں تک جانے اور جہنمیوں کو اپنے ٹھکانوں تک جانے کی خبریں بیان کیں، جس شخص نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے اس کو بھلا دیا۔

(صحیح بخاری ج ۱، ص ۲۵۳، مطبوعہ کراچی)

حضرت حذیفہ بن الیاسؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ہم میں ایک تقریر فرمائی اور اس میں قیامت تک ہونے والے تمام امور بیان فرمادیے جس شخص نے اسے جان لیا اس نے جان لیا اور جس نے نہ جانا اس نے نہ جانا۔

(صحیح بخاری ج ۲، ص ۹۷۷، مطبوعہ کراچی)

حضرت ابو زید بن العاصؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں صبح کی نماز پڑھائی اور منبر پر رونق افروز ہوئے اور ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ ظہر کا وقت آگیا پھر منبر سے اترے اور ظہر کی نماز پڑھائی اور پھر منبر پر رونق افروز ہوئے اور ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ عصر کا وقت آگیا پھر آپ منبر سے اترے اور عصر کی نماز پڑھائی پھر آپ نے منبر پر چڑھ کر ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا پھر آپ نے ہمیں تمام ماکان و مایکون کی خبریں دیں سو جو ہم میں زیادہ حافظہ والا تھا اس کو ان کا زیادہ علم تھا۔ (صحیح مسلم ج ۲، ص ۳۹۰، مطبوعہ کراچی)

حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی پھر آپ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور آپ نے قیامت تک ہونے والے ہر واقعہ اور ہر چیز کی ہمیں خبر دے دی، جس نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔ (سنن الترمذی ص ۳۱۹، مطبوعہ کراچی)

۱- عن عمرو قال قام فينا رسول الله ﷺ مقاما فاخبرنا عن بدء الخلق حتى دخل اهل الجنة منازلهم واهل النار منازلهم حفظ ذلك من حفظه ونسيه من نسيه۔

نیز امام بخاری روایت کرتے ہیں:

۲- عن حذيفة قال لقد خطبنا النبي ﷺ خطبة ماترك فيها شيئا الى قيام الساعة الا ذكره علمه من علمه وجهله من جهله الحديث۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں:

۳- عن ابي زيد قال صلى بنا رسول الله ﷺ صلى الله عليه وسلم الفجر وصعد المنبر فخطبنا حتى حضرت الظهر فنزل فصلى ثم صعد المنبر فخطبنا حتى حضرت العصر ثم نزل فصلى ثم صعد المنبر فخطبنا حتى غربت الشمس فاخبرنا بما كان وما هو كائن فاعلمنا احفظنا۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

۴- عن ابي سعيد الخدري قال صلى بنا رسول الله ﷺ يوما صلوة العصر بنهار ثم قام خطيبا فلم يدع شيئا يكون الى قيام الساعة الا اخبرنا به حفظه من حفظه و نسيه من نسيه۔

۵- عن ثوبان قال قال رسول الله ﷺ ان الله زوى لى الارض فرايت مشارقها و مغاربها-

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو میرے لیے لپیٹ دیا اور میں نے اس کے تمام مشارق و مغارب کو دیکھ لیا۔
(صحیح مسلم ج ۳، ص ۳۹۰، کراچی)

اس حدیث کو امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔ نیز امام ابو داؤد اور امام احمد نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔

(دلائل النبوة ج ۶، ص ۵۲۷، سنن ابو داؤد ج ۲، ص ۳۲۸، مسند احمد ج ۵، ص ۲۷۸)

امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

۶- (عن معاذ بن جبل قال احتبس عنا رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات غداة من صلوة الصبح حتى كدنا نتر اى عين الشمس فخرج سريعا فثوب بالصلوة فصلى رسول الله صلى الله عليه وسلم و تحوز فى صلوته فلما سلم دعا بصوته فقال لنا على مضافكم كما انتم ثم انفتل الينا فقال اما انى ساحد ثكم ما حسنى عنكم الغداة انى قمت من الليل فتوضات فصليت ما قدر لى فنعست فى صلوتى فاستثقلت فاذا برى تبارك و تعالى فى احسن صورة فقال يا محمد قلت رب لبيك قال فيم يختصم الملاء الاعلى قلت لا ادرى رب قالها ثلاثا قال فرايته وضع كفه بين كتفى قد وجدت برد انا مله بين ثديى فتجلانى كل شئى و عرفت- الحديث الى ان قال قال ابو عيسى هذا حديث حسن صحيح سالت محمد ابن اسماعيل عن هذا الحديث فقال هذا صحيح-

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز میں آنے کے لیے دیر کی، حتیٰ کہ قریب تھا کہ ہم سورج کو دیکھ لیتے، پھر رسول اللہ ﷺ جلدی سے آئے اور نماز کی اقامت کہی گئی رسول اللہ ﷺ نے مختصر نماز پڑھائی، پھر آپ نے سلام پھیر کر بے آواز بلند ہم سے فرمایا جس طرح اپنی صفوں میں بیٹھے ہو بیٹھے رہو، پھر ہماری طرف مڑے اور فرمایا میں اب تم کو یہ بیان کروں گا کہ مجھے صبح کی نماز میں آنے سے کیوں دیر ہو گئی۔ میں رات کو اٹھا اور وضو کر کے میں نے اتنی رکعات نماز پڑھی جتنی میرے لیے مقدر کی گئی تھی پھر مجھے نماز میں اونگھ آئی، پھر مجھے گہری نیند آگئی۔ اچانک میں نے اچھی صورت میں اپنے رب تبارک و تعالیٰ کو دیکھا، اس نے فرمایا اے محمد! میں نے کہا اے میرے رب میں حاضر ہوں، فرمایا ملاء اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا۔ آپ نے کہا میں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا اور اس کے پوروں کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی پھر ہر چیز مجھ پر منکشف ہو گئی اور میں نے اس کو جان لیا۔ (الحدیث)

(سنن الترمذی ص ۳۶۶، کراچی)

امام ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے، میں نے امام بخاری سے ایک حدیث کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا یہ حدیث صحیح ہے۔

۷- نیز امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

عن ابن عباس ان النبي صلى الله عليه وسلم قال اتاني ربي في احسن صورة فقال يا محمد فقلت لبيك ربي وسعديك قال فيم يختصم الملاء الاعلى قلت ربي لا ادري فوضع يده بين كتفي حتى وجدت بردها بين ثديي فعلمت ما بين المشرق والمغرب-

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا میں نے (خواب میں) اپنے رب کو حسین صورت میں دیکھا، میرے رب نے کہا اے محمد میں نے کہا حاضر ہوں یا رب! فرمایا ملاء اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں، میں نے کہا اے میرے رب! میں نہیں جانتا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی، پھر میں نے جان لیا جو کچھ مشرق اور مغرب کے درمیان ہے۔

(الحديث سنن الترمذی ص ۴۶۶، کراچی)

۸- امام احمد بن حنبل اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عن ابن عباس ان النبي صلى الله عليه وسلم قال اتاني ربي عز وجل الليلة في احسن صورة احسبه يعني في النوم فقال يا محمد تدري فيم يختصم الملاء الاعلى قال قلت لا قال النبي صلى الله عليه وسلم فوضع يده بين كتفي حتى وجدت بردها بين ثديي اوقال نحري فعلمت ما في السموات والارض-

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا آج رات کو نیند میں میرا رب عزوجل حسین صورت میں میرے پاس آیا اور فرمایا اے محمد! کیا تم جانتے ہو کہ ملاء اعلیٰ کس چیز میں بحث کر رہے ہیں؟ حضرت ابن عباس کہتے ہیں آپ نے فرمایا نہیں! نبی ﷺ نے فرمایا پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے دو کندھوں کے درمیان رکھا حتیٰ کہ میں نے اپنے سینے میں اس کی ٹھنڈک محسوس کی اور میں نے ان تمام چیزوں کو جان لیا جو آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔

(مسند احمد ج ۱، ص ۳۶۸)

۹- امام احمد بن حنبل نے ایک اور سند سے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں:

فوضع كفيه بين كتفي فوجدت بردها بين ثديي حتى تجلى لي ما في السموات وما في الارض-

اللہ تعالیٰ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو میرے کندھوں کے درمیان رکھا، میں نے اس کی ٹھنڈک کو اپنے سینے میں محسوس کیا حتیٰ کہ میرے لیے وہ تمام چیزیں منکشف ہو گئیں جو آسمانوں میں ہیں، اور جو زمینوں میں ہیں۔ (مسند احمد ج ۳، ص ۳۶۶)

حافظ البیہقی ذکر کرتے ہیں:

۱۰- عن عمر قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله عز وجل قدر لي الدنيا فانا انظر اليها والى ما هو كائن فيها الى يوم القيامة كما انظر الى كفي هذا- رواه الطبراني ورجاله وثقوا على ضعف كثير-

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل نے میرے لیے دنیا اٹھا کر رکھ دی اور میں دنیا کو اور جو کچھ قیامت تک دنیا میں ہونے والا ہے اس کو دیکھ رہا ہوں جیسا کہ میں اپنی اس ہتھیلی کو دیکھ رہا ہوں، اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے، ہر چند کہ اس حدیث کے راوی

تبیان القرآن

جلد چہارم

ضعیف ہیں لیکن ان کی توثیق کی گئی ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۸، ص ۲۷۷، بیروت)

نبی ﷺ کے علم کے عموم اور علم ماکان وما یکون کے متعلق علماء اسلام کی تصریحات حضرت سواد بن قارب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا پھر رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے آپ کی شان میں چند اشعار سنائے جن میں سے ایک شعر یہ ہے۔

فاشهد ان الله لا رب غيره

وانك مامون على كل غائب

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی رب نہیں اور آپ اللہ تعالیٰ کے ہر غیب پر امین ہیں۔

حضرت سواد بن قارب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ اشعار سن کر مجھ سے بہت خوش ہوئے، آپ کے چہرہ اقدس سے خوشی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ فرمایا افلحت باسواد اے سواد تم کامیاب ہو گئے۔ اس حدیث کو بکثرت علماء اسلام نے اپنی تصنیفات میں ذکر کیا ہے۔ بعض علماء کے اسماء یہ ہیں، امام ابو نعیم، امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی، علامہ ابن عبد البر، علامہ سیلی، علامہ ابن الجوزی، حافظ ابن کثیر، علامہ بدر الدین عینی، علامہ جلال الدین سیوطی، علامہ حللی، شیخ عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب نجدی، علامہ محمد بن یوسف الصالی الثامی۔

(دلائل النبوت لابی نعیم ج ۱، ص ۱۱۳، دلائل النبوت للسمعانی ج ۲، ص ۲۵۱، استیعاب علی حاشی الاصابہ ج ۲، ص ۱۲۳، الروض الانف ج ۱، ص ۱۳۰، الوفا ج ۱، ص ۱۵۳، السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۱، ص ۳۳۶، عمدۃ القاری ج ۱، ص ۸، المحاصن الکبریٰ ج ۱، ص ۱۷۱، بیروت، انسان العیون ج ۱، ص ۳۲۳، مختصر سیرت الرسول ص ۶۹، بل الہدیٰ والرشاد ج ۲، ص ۲۰۹) علامہ ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

وعلمک ما لم تکن تعلم من خبر
الاولین والآخرین وماکان وماہو کائن۔

اولین اور آخرین کی خبروں اور ماکان وما یکون میں سے جو کچھ آپ نہیں جانتے تھے وہ سب اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلادیا۔ (جامع البیان ج ۵، ص ۳۷۳، بیروت)

قاضی عیاض لکھتے ہیں:

واما تعلق عقده من ملکوت السموت
والارض وخلق الله وتعيين اسماء الحسنی
وآياته الكبرى وامور الاخرة واشراط الساعة
واحوال السعداء والاشقياء وعلم ما كان
وما یکون مما لم يعلمه الا یوحی۔

ملا علی قاری لکھتے ہیں:

ان علمه (صلی اللہ علیہ وسلم) محیط
بالکلیات والجزئیات۔

نیز ملا علی قاری فرماتے ہیں:

آسمانوں اور زمینوں کی نشانیاں، اللہ تعالیٰ کی مخلوق، اللہ تعالیٰ کے اسماء کی تعین، آیات کبریٰ، امور آخرت، علامات قیامت، اچھے اور برے لوگوں کے احوال اور ماکان وما یکون کا علم اس قبیل سے ہے جس کو نبی ﷺ نے بغیر وحی کے نہیں جانا۔ (الشفاء ج ۲، ص ۱۰۰، ملتان)

رسول اللہ ﷺ کا علم کلیات اور جزئیات کو محیط ہے۔ (المرقات ج ۱۰، ص ۱۵۱)

لوح و قلم، علوم نبی ﷺ سے ایک ٹکڑا اس لیے ہے کہ حضور کے علم انواع انواع ہیں، کلیات، جزئیات، حقائق، دقائق، عوارف اور معارف کہ ذات و صفات الہی سے متعلق ہیں اور لوح و قلم کا علم تو حضور کے مکتوب علم سے ایک سطر اور اس کے سمندروں سے ایک نہر ہے۔ پھر باری ہمہ وہ حضور ہی کی برکت سے تو ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

کون علمها من علومه صلی اللہ علیہ وسلم ان علومه تنوع الی الکلیات والجزئیات و حقائق و دقائق و عوارف و معارف تتعلق بالذات والصفات و عملها انما یکون سطرًا من سطور علمه ونهرًا من بحور علمه ثم مع هذا هو من برکة وجوده صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

(الزبدۃ شرح قصیدہ بردہ، ص ۱۱۶ مطبوعہ پیر جو گوٹھ سندھ ۱۳۰۶ھ)

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

نبوت کی بیالیسویں صفت یہ ہے کہ ان کو مایکون (امور مستقبلہ) کا علم ہو اور تینتالیسویں صفت یہ ہے کہ ان کو ماکان (امور ماضیہ) کا علم ہو، جن کو ان سے پہلے کسی نے نہ بیان کیا ہو۔ (فتح الباری ج ۱۲، ص ۳۶۷)

الثانیة والاربعون اطلاع علی مایکون الثالثة والاربعون الاطلاع علی ماکان مما لم ینقله احد قبله۔

علامہ سید محمود آلوسی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت علم کے ساتھ تجلی کر کے حضور پر قرآن نازل کیا، جس صفت علم سے آسمانوں اور زمین کا کوئی ذرہ غائب نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماکان و مایکون کو جان لیا۔ (روح المعانی ج ۶، ص ۲۲)

(انزلہ بعلمہ) ای متلبسا بعلمہ المحيط الذی لا یعرب عنه مثقال ذرة فی السموت والارض ومن هنا علم صلی اللہ علیہ وسلم ماکان وماهو کائن۔

نیز علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کا اس وقت تک وصال نہیں ہوا جب تک کہ آپ نے ہر اس چیز کو نہیں جان لیا جس کا علم ممکن ہے۔

فلم یقبض النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی علم کل شئی یمکن العلم به۔

(روح المعانی ج ۱۵، ص ۱۵۳)

شیخ اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مجاز شیخ مرتضیٰ حسین چاند پوری لکھتے ہیں:

حاصل یہ ہے کہ سرور عالم ﷺ کو علم مغیبات اس قدر دیا گیا تھا کہ دنیا کے تمام علوم بھی اگر ملائے جائیں تو آپ کے ایک علم کے برابر نہ ہوں۔ (توضیح البیان فی حفظ الایمان، ص ۱۲)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کہئے کہ میں اپنے نفس کے لیے کسی نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں (از خود) غیب کو جانتا تو میں (از خود) خیر کثیر کو جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں تو صرف ایمان والوں کو (عذاب الہی سے) ڈرانے والا اور (اخروی ثواب کی) بشارت دینے والا ہوں۔ (الاعراف: ۱۸۸)

شیخ اسماعیل دہلوی کا رسول اللہ ﷺ کی آخرت میں نفع رسانی پر انکار

اس آیت سے بعض لوگ نبی ﷺ کی تنقیص کرتے ہیں اور آپ کی شفاعت کی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب آپ

کو اپنے لیے نفع اور ضرر کا اختیار نہیں ہے تو دوسروں کو نفع کب پہنچا سکتے ہیں اور اس کی تائید میں ایک حدیث سے بھی استشہاد کرتے ہیں۔

شیخ اسماعیل دہلوی متوفی ۱۲۳۶ھ لکھتے ہیں:

مشکوٰۃ کے باب الخلافت والامارت میں لکھا ہے کہ بخاری اور مسلم نے ذکر کیا کہ نقل کیا ابو ہریرہ نے کہ جب اتری یہ آیت کہ ذرا دے تو اپنی برادری کو جو ناتار کھتے ہیں تجھ سے تو پکارا پیغمبر نے اپنے ناتے والوں کو پھراکھا کر کے پکارا اور جدا جدا بھی۔ سو فرمایا اے اولاد کعب بن لوی کی بچاؤ تم اپنی جانوں کو آگ سے کیونکہ بیشک میں نہیں اختیار رکھتا تمہارا اللہ کے یہاں کچھ یا یوں فرمایا کہ بیشک میں نہیں کام آنے کا تمہارے اللہ کے یہاں کچھ اور اے اولاد مرہ بن کعب اے اولاد عبدالشمس کی بچاؤ تم اپنی جانوں کو آگ سے کیونکہ بیشک میں نہ کام آؤں گا تمہارے اللہ کے یہاں کچھ اور اے اولاد عبدالمناف کی بچاؤ تم اپنی جان کو آگ سے کیونکہ بیشک میں نہ کام آؤں گا تمہارے اللہ کے یہاں کچھ اور اے فاطمہ بچاؤ تم اپنی جان کو آگ سے مانگ لے مجھ سے جتنا چاہے میرا مال نہ کام آؤں گا میں تیرے اللہ کے یہاں کچھ یعنی اور جو لوگ کسی بزرگ کے قرابتی ہوتے ہیں ان کو اس کی حمایت پر بھروسہ ہوتا ہے اور اس پر مغرور ہو کر اللہ کا خوف کم رکھتے ہیں۔ سو اس لیے اللہ صاحب نے اپنے پیغمبر کو فرمایا کہ اپنے قرابتیوں کو ذرا دیوے۔ سو انہوں نے سب کو اپنی بیٹی تک کو کھول کر سنا دیا کہ قرابت کا حق ادا کرنا اسی چیز میں ہو سکتا ہے کہ اپنے اختیار میں ہو سو یہ میرا مال موجود ہے اس میں مجھ کو کچھ بخل نہیں اور اللہ کے یہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کر سکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا سو وہاں کا معاملہ ہر کوئی اپنا اپنا درست کر لے اور دوزخ سے بچنے کی ہر کوئی تدبیر کرے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ فقط قرابت کسی بزرگ کی اللہ کے یہاں کچھ کام نہیں آتی جب تک کچھ معاملہ اللہ ہی سے صاف نہ کرے تو کچھ کام نہیں نکلتا۔ (تقویت الایمان کلاں ص ۲۹ مطبوعہ مطبع علمی لاہور)

شیخ اسماعیل دہلوی کی تقریر کا رد اور ابطال

شیخ اسماعیل دہلوی کی یہ تقریر حسب ذیل وجوہ سے باطل ہے:

۱۔ شیخ اسماعیل دہلوی نے اس حدیث کا حوالہ غلط دیا ہے یہ حدیث مشکوٰۃ کے باب الخلافت والامارت میں نہیں باب الانذار والتحذیر کی فصل ثانی میں ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے مطبوعہ نسخوں میں ص ۳۶۰ پر ہے اور بیروت کی طبع شدہ مشکوٰۃ میں رقم الحدیث: ۵۳۷۳ ہے۔ صحیح البخاری میں رقم الحدیث: ۲۷۵۳ ہے اور صحیح مسلم میں الایمان ۳۲۸ (۲۰۴) ۲۹۱ ہے۔ ترمذی میں رقم الحدیث: ۳۱۹۲ سنن النسائی میں رقم الحدیث: ۳۶۴۲ السنن الکبریٰ للنسائی میں رقم الحدیث: ۷۷۱۳ اور مسند احمد میں 'ج ۶' ص ۱۸۷ پر ہے۔

۲۔ مشکوٰۃ میں اس حدیث کو امام مسلم کی روایت سے ذکر کیا ہے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آگ کے عذاب سے ڈرانے کے بعد یہ جملہ ہے البتہ میرا تمہارے ساتھ رحم کا تعلق ہے میں عنقریب صلہ رحم کروں گا۔ غیر ان لکم رحماً سابلہا ببلہا لہا شیخ اسماعیل دہلوی نے حدیث کے اس جملہ کو چھوڑ دیا حالانکہ مشکوٰۃ میں مسلم کے حوالے سے یہ جملہ موجود ہے۔ جہاں سے انہوں نے اس حدیث کو شروع کیا ہے۔

۳۔ ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۳ھ حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دینا چاہے تو میں تم سے اللہ کے عذاب کو بالکل دور نہیں کر سکتا اور یہ قرآن مجید کی اس آیت سے مقبس ہے:

قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا (الفتح: ۱۱)

آپ کہئے کہ اگر اللہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے یا کوئی نفع پہنچانا چاہے تو اللہ کے مقابلہ میں کون ہے جو کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ (الاعراف: ۱۸۸)

آپ کہئے کہ میں اپنے نفس کے لیے کسی نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں، مگر جو اللہ چاہے۔

اور اس میں توحید کا بیان ہے اور نبی ﷺ ہر چند کہ مومنین کو اپنی شفاعت سے نفع پہنچائیں گے کیونکہ آپ شفاعت کریں گے اور آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی لیکن آپ نے یہاں مطلقاً نفع رسانی سے منع فرمایا تاکہ انہیں عذاب سے ڈرائیں کہ وہ صرف شفاعت پر تکیہ نہ کر لیں اور ان کو آخرت کے لیے کوشش کی ترغیب دیں اور فرمایا میرا تمہارے ساتھ رحم کا تعلق ہے۔ میں عنقریب صلہ رحم کروں گا، میں یعنی میں اپنے قرابت داروں کے ساتھ قرابت کی وجہ سے نیکی اور احسان کروں گا۔ (المرقات ج ۱۰، ص ۱۰۵، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ لکھتے ہیں:

اس کا معنی یہ ہے کہ چونکہ مجھ پر تمہارے رحم اور قرابت کا حق ہے میں اس کی تری سے اس کو ترکوں گا اور صلہ اور احسان کا پانی چھڑکوں گا۔ اس حدیث میں بہت زیادہ مبالغہ کے ساتھ ڈرایا گیا ہے اور نبی ﷺ کی شفاعت اس امت کے گنہگاروں کے لیے بھی ہوگی چہ جائیکہ اپنے اقرباء اور خویشان کے لیے، اور احادیث سے ان کے حق میں شفاعت ثابت ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بے نیازی کا خوف باقی ہے۔ (اشعۃ اللمعات ج ۳، ص ۳۷۲-۳۷۱، مطبوعہ مطبع تاج کمار لکھنؤ)

اہل بیت اور اپنے دیگر قرابت داروں کو رسول اللہ ﷺ کا آخرت میں نفع پہنچانا امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اس منبر پر فرما رہے تھے: ان لوگوں کا کیا حال ہے جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی قرابت آپ کی قوم کو نفع نہیں پہنچائے گی، بیشک میری قرابت دنیا اور آخرت میں مجھ سے ملی ہوئی ہے اور اے لوگو! جب تم حوض پر آؤ گے تو میں حوض پر تمہارا پیشوا ہوں گا۔ (الحدیث)

(مسند احمد ج ۳، ص ۱۸، دار الفکر طبع قدیم، اس حدیث کی سند حسن ہے، مسند احمد ج ۱۰، رقم الحدیث: ۱۱۰۸۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے پہلے میں اپنی امت میں سے اپنے اہل بیت کی شفاعت کروں گا، پھر جو ان سے زیادہ قریب ہوں، اور پھر جو ان سے قریب ہوں، پھر انصار کی شفاعت کروں گا، پھر ان کی جو مجھ پر ایمان لائے اور انہوں نے میری اتباع کی، پھر اہل یمن کی، پھر اہل عرب کی، پھر اعاجم کی۔

(المعجم الکبیر ج ۱۲، رقم الحدیث: ۱۳۵۵۰، الکامل لابن عدی ج ۲، ص ۷۹۰، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۳۱۳۵، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۳۸۱)

۳۸۰، الفردوس بماثور الخطاب، رقم الحدیث: ۲۹، اس حدیث کی سند میں حفص بن ابی داؤد متروک ہے اور یث بن سلیم ضعیف ہے، اللالی المعنوع ج ۲، ص ۳۷۳)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے رب عزوجل سے سوال کیا کہ میرے اہل بیت میں سے کسی کو دوزخ میں داخل نہ فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا فرمادیا۔ (الفردوس بماثور الخطاب، رقم الحدیث: ۳۳۱۳۹)

تبیان القرآن

جلد چہارم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا بے شک اللہ عزوجل نے فرمایا کہ وہ نہ تمہیں عذاب دے گا اور نہ تمہاری اولاد کو۔

(المعجم الکبیر ج ۱۱، رقم الحدیث: ۱۱۶۸۵، حافظ البیہقی نے کہا ہے کہ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے میرے رب نے میرے اہل بیت کے متعلق یہ وعدہ کیا ہے کہ ان میں سے جس نے توحید کا اقرار کیا۔۔۔۔۔ میں ان کو عذاب نہیں دوں گا۔

(المستدرک ج ۳، ص ۱۵۰، حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، الکامل لابن عدی ج ۵، ص ۱۷۰۳، کنز العمال رقم

الحدیث: ۳۳۱۵۶)

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سرگوشی کی، پھر حضرت علی نے صفہ میں عقیل، حضرت حسین اور حضرت عباس سے حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر سے کرنے کے متعلق مشورہ کیا۔ پھر حضرت علی نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ہر سبب (نکاح) اور نسب قیامت کے دن منقطع ہو جائے گا سوا میرے سبب اور نسب کے۔

(المستدرک ج ۳، ص ۱۳۲، المعجم الکبیر ج ۳، رقم الحدیث: ۲۶۳۳، ۲۶۳۴، ۲۶۳۵، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۱۰۳۵۳، السنن

الکبریٰ ج ۷، ص ۱۱۳، المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۳۲۵۸، مجمع الزوائد ج ۳، ص ۲۷۱-۲۷۲، الجامع الصغیر رقم الحدیث: ۶۳۰۹)

حضرت عبد اللہ بن ابی اونی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میں اپنی امت میں سے جس عورت کے ساتھ بھی نکاح کروں اور میں اپنی امت میں سے جس شخص کو بھی نکاح کا رشتہ دوں میرے ساتھ جنت میں ہی رہے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا کر دیا۔

(المعجم الاوسط رقم الحدیث: ۵۷۵۸، مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۱۷، المستدرک ج ۳، ص ۱۳، المطالب العالیہ رقم الحدیث: ۳۰۱۸، کنز

العمال رقم الحدیث: ۳۳۱۳، اسی سے تقارب روایت حضرت عبد اللہ بن عمرو سے بھی مروی ہے، المعجم الاوسط ج ۳، رقم الحدیث: ۳۸۵۶)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے یہ سوال کیا میں جس کو بھی نکاح کا رشتہ دوں اور جس سے بھی نکاح کروں وہ اہل جنت سے ہوں تو اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ عطا کر دیا۔

(کنز العمال رقم الحدیث: ۳۳۱۳۸)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے بھی میرے اہل بیت کے ساتھ کوئی نیکی کی تو میں قیامت کے دن اس کا بدلہ دوں گا۔ (کامل ابن عدی ج ۵، ص ۱۸۸۳، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۳۱۵۲)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے عبد المطلب کی اولاد میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی نیکی کی اور اس نے اس کو دنیا میں اس کا صلہ نہیں دیا تو کل جب وہ مجھ سے ملاقات کرے گا تو مجھ پر اس نیکی کا صلہ دینا واجب ہے۔ (المعجم الاوسط ج ۲، رقم الحدیث: ۱۳۶۹، مجمع الزوائد ج ۹، ص ۱۷۳، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۳۱۵۳)

حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ بیان کیا کرتے تھے کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے ابوطالب کو کوئی نفع پہنچایا وہ آپ کی مدافعت کرتا تھا، اور آپ کی وجہ سے غضب ناک ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا ہاں! اب وہ ٹخنوں تک آگ میں ہے اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۸۸۳، ۶۲۰۸، ۶۵۷۲، صحیح مسلم ایمان ۳۵۷، ۲۰۹، ۵۰۰، مسند احمد ج ۱، ص ۲۰۶، رقم الحدیث: ۱۷۶۳)

جامع الاصول رقم الحدیث: ۶۸۳۳

نفع رسائی کی بظاہر نفی کی روایات کی توجیہ

مؤخر الذکر پانچ حدیثوں کے علاوہ باقی مذکور الصدر تمام احادیث کو علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی نے بھی بیان کیا ہے (رسائل ابن عابدین ج ۱ ص ۵-۴) ان احادیث کے ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

ہم نے جو یہ احادیث ذکر کی ہیں ان کے یہ بات معارض نہیں ہے کہ نبی ﷺ کسی ایک کو بھی اللہ سے مطلقاً نفع یا نقصان پہنچانے کے مالک نہیں ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس بات کا مالک بنائے گا کہ آپ اپنے اقارب کو نفع پہنچائیں بلکہ آپ شفاعت عامہ اور شفاعت خاصہ کے ذریعہ تمام امت کو نفع پہنچائیں گے، سو آپ صرف اسی چیز کے مالک ہوں گے جس کو آپ کا موٹی عزوجل مالک کرے گا، اسی طرح نبی ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے: میں تم کو اللہ کے عذاب سے بالکل مستغنی نہیں کروں گا، اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ مجھے یہ عزت اور مقام نہیں دے گا یا جب تک مجھے منصب شفاعت نہیں دے یا جب تک میری وجہ سے مغفرت کرنے کا مرتبہ مجھے نہیں دے گا، اس وقت تک میں تم کو اللہ کے عذاب سے نہیں چھڑاؤں گا۔ اور چونکہ یہ مقام اللہ کے عذاب سے ڈرانے کا تھا اور نیک اعمال پر برانگیختہ کرنے کا تھا اس لیے آپ نے یہ قیود ذکر نہیں فرمائیں۔ علاوہ ازیں آپ نے اپنے رحم کے حق کی طرف اشارہ بھی فرمایا کہ میرا تمہارے ساتھ رحم کا تعلق ہے اور میں عنقریب اس کی تراوت تمہیں پہنچاؤں گا، یعنی تم کو نفع پہنچاؤں گا اور یہ ان احادیث میں تطبیق کا بہت عمدہ طریقہ ہے، نیز نبی ﷺ نے فرمایا ہے: قیامت کے دن میرے اولیاء متقی ہوں گے (الادب المفرد) اور نبی ﷺ نے فرمایا میرا ولی اللہ ہے اور صالح مومنین ہیں۔ (صحیح مسلم الایمان: ۳۶۶ (۲۱۵) ۵۰۸، مسند احمد ج ۳ ص ۲۰۳، مسند ابو عوانہ ج ۱، رقم الحدیث: ۹۶) سو یہ احادیث آپ کے رحم اور اقارب کو نفع پہنچانے کے خلاف نہیں ہیں، اسی طرح نبی ﷺ کا ارشاد ہے: جس شخص نے اپنے عمل میں دیر کر دی تو اس کا نسب اس پر سبقت نہیں کرے گا۔

(صحیح مسلم الذکر ۳۸، ۶۷۲۶ (۲۶۹۹) سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۹۳۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۲۵، کنز العمال

رقم الحدیث: ۲۸۸۴)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ جس شخص نے اپنے عمل کو مؤخر کر دیا، اس کا نسب اس کو بلند درجات تک پہنچانے میں جلدی نہیں کرے گا۔ اس لیے یہ حدیث نجات کے منافی نہیں ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا باب بہت وسیع ہے، اور یہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حدود کی پامالی پر بہت غیور ہے، اور نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے عبد ہیں اور وہ صرف اسی چیز کے مالک ہیں جس کا آپ کے موٹی نے آپ کو مالک بنا دیا ہے اور آپ کی وہی خواہش پوری ہوتی ہے جس کو پورا کرنا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ (رسائل ابن عابدین ج ۱ ص ۷-۶، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۳۹۶ھ)

اس پر دلیل کہ رسول اللہ ﷺ کی نفع اور ضرر کی نفی ذاتی نفع اور ضرر پر محمول ہے

عباس بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہما حجر اسود کو بوسہ دے رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے کہ بیشک مجھے علم ہے کہ تو ایک پتھر ہے، نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۵۹۷، ۱۶۱۰، صحیح مسلم الحج ۲۳۸ (۱۲۷۰) ۳۰۱۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۸۷۳، سنن الترمذی رقم

حدیث: ۸۶۱، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۹۳۷، الموطا رقم الحدیث: ۸۳۵، مسند احمد ج ۱ ص ۱۶، طبع قدیم، رقم الحدیث: ۹۹، طبع جدید دار الفکر،

تبیان القرآن

جلد چہارم

جامع الاصول ج ۳، رقم الحدیث: ۱۳۳۹)

اس حدیث میں حضرت عمر نے حجر اسود کے نفع اور نقصان پہنچانے کی نفی کی ہے لیکن چونکہ بعض دلائل سے حجر اسود کا نفع اور نقصان پہنچانا ثابت ہے، اس لیے جمہور علماء نے بشمول علماء دیوبند اس حدیث میں بالذات کی قید لگائی ہے یعنی تو بالذات نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، لیکن اللہ کی عطا سے نفع بھی پہنچاتا ہے اور نقصان بھی۔

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ لکھتے ہیں:

حجر اسود بذاتہ نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ (فتح الملکم، ج ۳، ص ۳۲۲، مطبوعہ مکتبہ الحجاز کراچی)

شیخ خلیل احمد سارنپوری متوفی ۱۳۳۶ھ لکھتے ہیں:

حضرت عمر کی مراد یہ تھی کہ حجر اسود بذاتہ نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (بذل الجہود ج ۳، ص ۱۳۰، طبع ملتان)

علامہ عینی نے لکھا ہے کہ حجر اسود بغیر اذن الہی کے نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (عمدۃ القاری ج ۹، ص ۲۳۰) علامہ باجی نے لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (المستمسک ج ۲، ص ۲۸۷) علامہ قسطلانی نے لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (ارشاد الساری ج ۳، ص ۱۵۶) ملا علی قاری نے بھی لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا۔ (مرقات ج ۵، ص ۳۲۵) اور علماء دیوبند میں سے شیخ عثمانی نے (فتح الملکم ج ۳، ص ۳۲۲) اور شیخ خلیل احمد نے (بذل الجہود ج ۳، ص ۱۳۰) میں لکھا ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچاتا، حضرت عمر نے جو حجر اسود کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ تو ایک پتھر ہے اور میں خوب جانتا ہوں کہ تو نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مراد بیان کرتے ہوئے متقدمین علماء اسلام اور خصوصاً علماء دیوبند سب ہی نے بالذات کی قید لگائی ہے کہ حجر اسود بالذات نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں جو نفع رکھا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حق میں حج کی گواہی دے گا وہ یہ نفع ضرور پہنچائے گا۔ اسی اسلوب پر کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں ہے: قل لا املك نفسي نفعاً ولا ضراً الا ما شاء الله (اعراف: ۱۸۸) آپ کہتے ہیں اپنے نفس کے لیے کسی نفع اور ضرر کا مالک نہیں ہوں مگر اللہ تعالیٰ جو چاہے۔ علماء اہل سنت یہاں بھی بالذات کی قید لگاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بذاتہ نفع اور ضرر نہیں پہنچاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے جو آپ میں نفع رکھا ہے وہ نفع آپ پہنچاتے ہیں کہ آپ کا کلمہ پڑھنے، آپ کی تبلیغ اور آپ کی شفاعت سے ارب ہا انسانوں کو نفع پہنچے گا اور وہ سب آپ کی وجہ سے جنت میں جائیں گے۔ یہ کوئی کم نفع ہے؟ لیکن بعض لوگ اس کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بالذات کی قید لگانا اور ذاتی اور عطائی اختیارات کی تقسیم خالص مشرکانہ عقیدہ ہے اور یہ قید خانہ زاد اور سینہ زاد ہے۔ قرآن مجید نے آپ کی ذات سے مطلقاً نفع رسانی کی نفی کر دی ہے اور ذاتی اور عطائی کی تقسیم اہل بدعت کی ایجاد اور اختراع ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ ایک پتھر (حجر اسود) کی نفع رسانی ثابت کرنے کے لیے حضرت عمر کے قول لا تنفع میں بالذات کی قید لگائیں تو کوئی حرج نہیں ہے اور اگر ہم رسول اللہ ﷺ کی نفع رسانی ثابت کرنے کے لیے قل لا املك نفسي میں بالذات کی قید لگائیں تو مجرم قرار پائیں! یہ کہاں کا انصاف ہے؟

رسول اللہ ﷺ کی اس نفع رسانی سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان محمد رسول اللہ کہے تو جنت کا مستحق ہو جاتا ہے بلکہ اس وقت تک کوئی شخص جنت کا مستحق نہیں ہو گا جب تک وہ محمد رسول اللہ نہیں کہے گا، اللہ اکبر! جن کے نام کی نفع رسانی کا یہ عالم ہے ان کی ذات کی نفع رسانی کا کیا عالم ہو گا اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو رسول اللہ ﷺ کی نفع رسانی کا انکار کرتا ہے وہ آپ کا نام نہ لے اور ہمیں جنت میں جا کر دکھلا دے!

رسول اللہ ﷺ کی نفع رسانی میں افراط، تفریط اور اعتدال پر مبنی نظریات
رسول اللہ ﷺ کی نفع رسانی میں افراط پر مبنی یہ عقیدہ ہے۔

خدا جس کو پکڑے چھڑا لے محمد
محمد کا پکڑا چھڑا کوئی نہیں سکتا

الاعراف: ۱۳۳ کی تفسیر میں ہم نے اس شعر کے رد اور ابطال پر دلائل قائم کیے ہیں۔

اور نبی ﷺ کی نفع رسانی میں تفریط پر مبنی یہ عبارات ہیں:

شیخ محمد عبدالوہاب نجدی متوفی ۱۲۰۶ھ لکھتے ہیں:

اور تم جان چکے ہو کہ ان لوگوں کا توحید بوبیت کا اقرار کرنا
ان کو اسلام میں داخل نہیں کرتا، اور ان لوگوں کا انبیاء اور
ملائکہ کی شفاعت کا قصد کرنا اور ان سے اللہ کا قرب حاصل کرنا
یہی وہ چیز ہے، جس نے ان کی جانوں اور مالوں کو مباح کر دیا ہے
(یعنی ان کو قتل کرنا اور ان کا مال لوٹنا جائز ہے)

وعرفت ان اقرارهم بتوحيد الربوبية لم
يدخلهم في الاسلام وان قصدهم
الملائكة والانبيا يريدون شفاعتهم
والتقرب الى الله بذلك هو الذي احل
دماءهم واموالهم-

(كشف اشبات ص ۹، مطبوعہ المکتبہ السلفیہ، بالمدینہ المنورہ، ۱۳۸۹ھ)

شیخ اسماعیل دہلوی متوفی ۱۲۳۶ھ لکھتے ہیں:

پنجم خبر خدا کے وقت میں کافر بھی اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے بلکہ اسی کا مخلوق اور اسی کا بندہ سمجھتے تھے اور ان
کو اس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے، مگر یہی پکارنا اور منتیں ماننی اور نذر و نیاز کرنی اور ان کو اپنا وکیل اور سفارشی
سمجھنا یہی ان کا کفر و شرک تھا سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے گو کہ اس کو اللہ کا مخلوق اور بندہ ہی سمجھے سو ابو جہل اور وہ شرک
میں برابر ہے۔ (تقویت الایمان کلاں ص ۶، مطبوعہ مطبع علمی لاہور)

مخلوق کی نذر اور منت ماننی ہمارے نزدیک ناجائز اور حرام ہے اور انبیاء علیہم السلام کو جب کہ مستقل سامع اعتقاد نہ کرے
جیسا کہ ان کو بندہ سمجھنے سے ظاہر ہوتا ہے تو ان کو پکارنا اور ان سے مدد طلب کرنا بھی جائز ہے اور عمد صحابہ اور تابعین میں یا محمد
کہنے کا رواج تھا۔ (کامل ابن اثیر ج ۳، ص ۲۳۶، البدایہ ج ۶، ص ۳۲۳، فتاویٰ رشیدیہ کامل ص ۶۸)

یہ دونوں چیزیں غیر نزاعی ہیں، ہمارا اعتراض اس پر ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام کو وکیل اور سفارشی سمجھنے پر بھی
شرک کا فتویٰ دیا ہے اور اس کو ابو جہل کے برابر شرک قرار دیا ہے اور مسئلہ شفاعت میں اس سے بڑھ کر تفریط کیا ہوگی!
اور رسول اللہ ﷺ کی نفع رسانی میں توازن اور اعتدال پر مبنی نظریہ وہ ہے جس کو اس مقام پر اہل سنت کے مفسرین نے
بیان فرمایا ہے۔

علامہ محمد بن یوسف ابو الیمان اندلسی المتوفی ۵۴۷ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ میں ان ہی امور پر قادر ہوں جن پر اللہ عزوجل نے مجھے قدرت دی ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ
کے تمام تصرفات اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت کے تابع ہیں۔

(البحر المحیط ج ۵، ص ۲۳۱، عنایۃ القاضی ج ۵، ص ۲۳۳، زاد المسیر ج ۳، ص ۲۹۹، الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۳۰۱)
امام رازی کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے غیر سے علم محیط اور قدرت کاملہ کی نفی کی گئی

ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۲۲۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

علامہ بیضاوی متوفی ۶۸۶ھ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بطور اظہار عبودیت یہ کہلوا یا گیا ہے۔

(انوار التزیل علی حاشیہ عنایت القاضی ج ۴، ص ۲۲۳، مطبوعہ بیروت)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

اور مراد یہ ہے کہ میں اپنے نفس کے لیے نفع اور ضرر کا کسی وقت بھی مالک نہیں ہوں مگر جس وقت اللہ تعالیٰ سبحانہ چاہتا ہے تو مجھے اس پر قادر فرماتا ہے اور اس وقت میں اس کی مشیت سے اس کا مالک ہوتا ہوں، اور یہ استثناء متصل ہے، شیخ ابراہیم کورانی نے کہا یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ بندہ کی قدرت اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کی مشیت سے موثر ہوتی ہے۔

(روح المعانی ج ۹، ص ۱۳۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علم غیب کی تحقیق

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا (آپ کہئے): اگر میں (از خود) غیب کو جانتا تو میں (از خود) خیر کثیر کو جمع کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔ (الاعراف: ۱۸۸)

اس آیت سے بظاہر رسول اللہ ﷺ کے علم غیب کی نفی ہوتی ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے چونکہ غیب کی بے شمار خبریں دی ہیں جیسا کہ ہم نے قیامت کی بتائی ہوئی نشانیوں کے سلسلہ میں غیب کی خبروں پر مشتمل بکثرت احادیث بیان کی ہیں اور انشاء اللہ ابھی مزید احادیث بیان کریں گے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی آیات کا بھی ذکر کریں گے جن سے رسول اللہ ﷺ کو علم غیب دیا جانا واضح ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں علم غیب کی نفی از خود غیب جاننے کی نفی پر محمول ہے اور ہم اس کی تائید میں مفسرین کرام کے اقوال بھی نقل کریں گے، سو پہلے ہم غیب کا لغوی اور اصطلاحی معنی بیان کریں گے، پھر رسول اللہ ﷺ کے لیے علم غیب کے ثبوت میں قرآن مجید کی آیات کو ذکر کریں گے، پھر اس سلسلہ میں احادیث کا ذکر کریں گے اور آخر میں اس آیت کی توجیہ میں مفسرین کے اقوال ذکر کریں گے، فنقول وبالله التوفیق وبہ الاستعانة بلیق۔

غیب کا لغوی معنی

علامہ مجد الدین مبارک بن محمد بن الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

احادیث میں علم بالغیب اور ایمان بالغیب کا بکثرت ذکر ہے اور ہر وہ چیز جو آنکھوں سے غائب ہو وہ غیب ہے عام ازیں کہ وہ دل میں حاصل ہو یا نہ ہو۔ امام احمد روایت کرتے ہیں کہ المغیبت (وہ عورت جس کا شوہر غائب ہو) کو مہلت دو حتیٰ کہ وہ اپنے بکھرے ہوئے پر آگندہ بالوں کو سنوار لے اور موئے زہار صاف کر لے۔ (مسند احمد ج ۳، ص ۲۸۹) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک مغیب عورت کسی شخص کے پاس کچھ خریدنے گئی اس نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی تو اس عورت نے کہا تم پر افسوس ہے میں مغیب ہوں (یعنی میرا شوہر غائب ہے) تو اس شخص نے اس کو چھوڑ دیا۔ (مسند احمد ج ۱، ص ۲۶۹) نیز حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے بھائی کے لیے ظہر غیب (اس کے غیب) میں دعا کرتا ہے تو اس دعا کے ساتھ جو فرشتہ موکل ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ آمین!

(صحیح مسلم الذکر ۸، ۲۷۳۲، ۶۸۰۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۳۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۹۵)

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کے مسلمان پر چھ حق ہیں: جب ملاقات ہو تو اس کو

سلام کرے، جب اس کو چھینک آئے تو اس کو جواب دے (یہ تمک اللہ کے) جب وہ بیمار ہو تو عیادت کرے، جب وہ دعوت دے تو اس کو قبول کرے، جب وہ فوت ہو تو اس کے جنازہ پر جائے، اس کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور غیب میں (اس کی غیر حاضری میں) اس کی خیر خواہی کرے۔ (سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۶۳۳) سنن ترمذی میں ہے: جب وہ حاضر ہو یا غائب ہو تو اس کی خیر خواہی کرے۔ (رقم الحدیث: ۲۷۳۶)

(التمایہ ج ۳، ص ۳۵۸-۳۵۷، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ مع زیادات)

علامہ محمد بن مکرم بن منظور افریقی متوفی ۷۷۱ھ لکھتے ہیں:

الغیب کا معنی ہے: ہر وہ چیز جو تم سے غائب ہو، امام ابو اسحاق نے یومنون بالغیب کی تفسیر میں کہا وہ ہر اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو ان سے غائب ہے اور اس کی نبی ﷺ نے خبر دی ہے جیسے مرنے کے بعد جی اٹھنا، جنت اور دوزخ اور جو چیز ان سے غائب ہے اور اس کی نبی ﷺ نے خبر دی ہے وہ غیب ہے، نیز غیب اس کو کہتے ہیں جو آنکھوں سے پوشیدہ ہو، خواہ وہ دل میں ہو، کہا جاتا ہے کہ میں نے وراء غیب سے آواز سنی یعنی اس جگہ سے سنی جس کو میں نہیں دیکھ رہا۔

(لسان العرب ج ۱، ص ۶۵۳، مطبوعہ ایران، ۱۳۰۵ھ)

علامہ محمد طاہر پٹنی متوفی ۹۸۶ھ لکھتے ہیں:

ہر وہ چیز جو آنکھوں سے غائب ہو وہ غیب ہے عام ازیں کہ وہ دل میں ہو یا نہ ہو۔

(مجمع بحار الانوار ج ۳، ص ۸۲، مطبوعہ مکتبہ دارالایمان، المدینہ المنورہ، ۱۴۱۵ھ)

غیب کا اصطلاحی معنی

قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۶ھ لکھتے ہیں:

غیب سے مراد وہ مخفی امر ہے جس کا نہ حواسِ خمسہ ادراک کر سکیں اور نہ ہی اس کی بداہت عقل تقاضا کرے اور اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ قسم ہے جس کے علم کی کوئی دلیل (ذریعہ) نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ
(الانعام: ۵۹) کوئی نہیں جانتا۔

اور دوسری قسم وہ ہے جس کے علم کے حصول کا کوئی ذریعہ ہو (خواہ عقلی دلیل سے اس کا علم ہو خواہ خبر سے) جیسے اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات اور قیامت اور اس کے احوال کا علم۔

(انوار التنزیل مع الکاثر دینی ج ۱، ص ۱۱۳، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۶ھ)

علامہ محی الدین شیخ زادہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

غیب کی دوسری قسم میں جو قاضی بیضاوی نے کہا ہے کہ جس کے علم پر کوئی دلیل ہو اس سے مراد عام ہے وہ دلیل عقلی ہو یا نقلی ہو، کیونکہ اللہ عزوجل اور اس کی صفات پر عقلی دلائل قائم ہیں (اور ان کو عقل سے جانا جاسکتا ہے) اور قیامت اور اس کے احوال پر دلائل نقلیہ قائم ہیں (اور ان کو قرآن اور احادیث سے جانا جاسکتا ہے) اور یہ دونوں قسمیں غیب ہیں، اور غیب کی اس دوسری قسم کو انسان ان دلائل سے جان سکتا ہے، اور وہ غیب جس کا علم اللہ سبحانہ کے ساتھ مختص ہے وہ غیب کی قسم اول ہے اور سورۃ الانعام کی اس آیت کریمہ میں وہی مراد ہے۔

(حاشیہ شیخ زادہ علی تفسیر بیضاوی ج ۱، ص ۸۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

الغیب وہ چیز ہے جو نہ حواس کے تحت واقع ہو اور نہ بہدہت عقول اس کا تقاضا کریں اور اس کا علم صرف انبیاء علیہم السلام کی خبر سے ہوتا ہے۔ (المفردات ج ۲، ص ۷۵، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۳۱۸ھ)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

غیب کا معنی ہے جو چیز آنکھوں سے پوشیدہ ہو، اسی طرح جو چیز حواس سے اور انسان سے غائب ہو اس پر بھی غیب کا اطلاق ہوتا ہے، اور غیب لوگوں کے اعتبار سے ہے اللہ کے اعتبار سے کوئی چیز غیب نہیں ہے، کیونکہ رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے غائب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے عالم الغیب والشہادۃ اس کا معنی ہے جو چیز تم سے غائب ہے اور جس کا تم مشاہدہ کرتے ہو اللہ ان سب کا عالم ہے، اور یؤمنون بالغیب میں غیب کا معنی ہے جن چیزوں کا حواس سے ادراک نہ ہو سکے اور جن کا بہدہت عقل تقاضا نہ کرے، اور ان کا علم صرف رسل علیہم السلام کے خبر دینے سے ہوتا ہے۔

(نیم الریاض ج ۳، ص ۱۵۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

رسول اللہ ﷺ کو علم غیب دیے جانے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ
وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ
اور اللہ کی شان نہیں کہ وہ تم کو غیب پر مطلع کر دے لیکن
(غیب پر مطلع کرنے کے لیے) اللہ جن لیتا ہے جسے چاہے اور وہ
اللہ کے رسول ہیں۔ (آل عمران: ۱۷۹)

ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ
یہ غیب کی بعض خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی
کرتے ہیں۔ (آل عمران: ۴۳)

عَلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا
إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ (الجن: ۲۷-۲۸)
(اللہ) عالم الغیب ہے سو وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں فرماتا
ما سوا ان کے جن سے وہ راضی ہے اور وہ اس کے (سب)
رسول ہیں۔

مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ لکھتے ہیں:

حق تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنے انبیاء کو جو امور غیب بتاتے ہیں وہ حقیقتاً علم غیب نہیں بلکہ غیب کی خبریں ہیں جو انبیاء کو دی گئی ہیں جس کو خود قرآن کریم نے کئی جگہ انباء الغیب کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

(معارف القرآن ج ۲، ص ۲۳۸، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی، ۱۳۱۳ھ)

ہمارے نزدیک یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو جو غیب کی خبریں بتلائی گئیں ہیں اس سے ان کو علم غیب حاصل نہیں ہوا، کیونکہ شرح عقائد اور دیگر علم کلام کی کتابوں میں مذکور ہے کہ علم کے تین اسباب ہیں، خبر صادق، حواس سلیمہ اور عقل، اور وحی بھی خبر صادق ہے تو جب انبیاء علیہم السلام کو اللہ نے غیب کی خبریں دیں تو ان کو علم غیب حاصل ہو گیا۔ اس لیے صحیح یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو وحی سے علم غیب حاصل ہوتا ہے لیکن یہ علم محیط یا علم ذاتی نہیں ہے۔

آل عمران: ۷۹ کی تفسیر میں شیخ محمود حسن دیوبندی متوفی ۱۳۳۹ھ لکھتے ہیں:

خلاصہ یہ ہے کہ عام لوگوں کو بلا واسطہ کسی یقینی غیب کی اطلاع نہیں دی جاتی، انبیاء علیہم السلام کو وحی جاتی ہے مگر جس قدر

خدا چاہے۔

شیخ اشرف علی تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اور اس آیت سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ جو علم غیب خصائص باری تعالیٰ سے ہے اس میں رسل کی شرکت ہو گئی کیونکہ خواص باری تعالیٰ سے دو امر ہیں اس علم کا ذاتی ہونا اور اس علم کا محیط ہونا۔ یہاں ذاتی اس لیے نہیں ہے کہ وحی سے ہے اور محیط اس لیے نہیں کہ بعض امور خاص مراد ہیں۔ (بیان القرآن ج ۱، ص ۱۵۰، مطبوعہ تاج کمپنی لیتھو گرافک لاہور، کراچی)

رسول اللہ ﷺ کے علم غیب کے متعلق احادیث

قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی متوفی ۵۴۴ھ لکھتے ہیں:

نبی ﷺ کو جس قدر غیب پر مطلع فرمایا گیا تھا اس باب میں احادیث کا ایک سمندر ہے جس کی گہرائی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور آپ کا یہ معجزہ ان معجزات میں سے ہے جو ہم کو یقینی طور پر معلوم ہیں، کیونکہ وہ احادیث معنی متواتر ہیں اور ان کے راوی بہت زیادہ ہیں اور ان احادیث کے معانی غیب کی اطلاع پر متفق ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

(الشفاء ج ۱۱، ص ۲۴۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

۱- حضرت حذیفہ بن یشجبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم میں تشریف فرما ہوئے اور قیامت تک جو امور پیش ہونے والے تھے آپ نے ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑا اور وہ سب امور بیان کر دیے جس نے ان کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے ان کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا اور میرے ان اصحاب کو ان کا علم ہے، ان میں سے کئی ایسی چیزیں واقع ہوئیں جن کو میں بھول چکا تھا جب میں نے ان کو دیکھا تو وہ یاد آ گئیں، جیسے کوئی شخص غائب ہو جائے تو اس کا چہرہ دیکھ کر اس کو یاد آ جاتا ہے کہ اس نے اس کو دیکھا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۶۰۴، صحیح مسلم الجنتہ ۲۳ (۲۸۹۱) ۷۱۳۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۲۴۰، مسند احمد ج ۵، ص ۳۸۵، جامع الاصول، ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۸۲)

۲- حضرت ابو زید عمرو بن الخطاب بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو صبح کی نماز پڑھائی اور منبر پر رونق افروز ہوئے، پھر آپ نے ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ ظہر آگئی، آپ منبر سے اترے اور نماز پڑھائی، پھر منبر پر رونق افروز ہوئے اور ہمیں خطبہ دیا حتیٰ کہ عصر آگئی، پھر آپ منبر سے اترے اور نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ہم کو خطبہ دیا حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا، پھر آپ نے ہمیں ماکان وما یکون (جو ہو چکا ہے اور جو ہونے والا ہے) کی خبریں دیں، پس ہم میں سے زیادہ عالم وہ تھا جو سب سے زیادہ حافظہ والا تھا۔

(صحیح مسلم الجنتہ: ۲۶ (۲۸۹۲) ۷۱۳۳، مسند احمد ج ۳، ص ۳۱۵، مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: ۱۰۲۹، البدایہ والنہایہ ج ۶، ص ۱۹۲، جامع الاصول ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۸۵، الاحاد والثنائی ج ۴، رقم الحدیث: ۲۱۸۳، دلائل النبوة للسیوطی ج ۶، ص ۳۱۳)

۳- حضرت عمر بن الخطاب بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم میں تشریف فرما ہوئے اور آپ نے ہمیں مخلوق کی ابتداء سے خبریں دینی شروع کیں، حتیٰ کہ اہل جنت اپنے ٹھکانوں میں داخل ہو گئے اور اہل دوزخ اپنے ٹھکانوں میں داخل ہو گئے، جس نے اس کو یاد رکھا اس نے یاد رکھا اور جس نے اس کو بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۹۲، امام احمد نے اس حدیث کو حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے، مسند احمد ج ۱۳، رقم الحدیث: ۱۸۱۳۰، طبع دار الحدیث، قاہرہ)

امام ترمذی نے کہا اس باب میں حضرت حذیفہ، حضرت ابو مریم، حضرت زید بن الخطاب اور حضرت مغیرہ بن شعبہ سے

تبیان القرآن

جلد چہارم

احادیث مروی ہیں انہوں نے ذکر کیا کہ نبی ﷺ نے ان کو قیامت تک تمام ہونے والے امور بیان کر دیے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۹۸)

۴۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اس حال میں چھوڑا کہ فضا میں جو بھی اپنے پروں سے اڑنے والا پرندہ تھا آپ نے ہمیں اس سے متعلق علم کا ذکر کیا۔

(مسند احمد ج ۵، ص ۱۵۳، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۱۲۵۸، مطبوعہ قاہرہ، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۶۳، مسند البرزازی رقم الحدیث: ۱۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۲۶۵، حافظ البیہقی نے کہا اس حدیث کے راوی صحیح ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۸، ص ۲۶۳، مسند ابو یعلیٰ، رقم الحدیث: ۵۱۰۹)

ائمہ حدیث نے ایسی احادیث بروایت کی ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو ان کے دشمنوں پر غلبہ کی خبر دی اور مکہ مکرمہ، بیت المقدس، یمن، شام اور عراق کی فتوحات کی خبریں دیں اور امن کی خبر دی اور یہ کہ کل خیبر حضرت علی کے ہاتھوں سے فتح ہوگا اور آپ کی امت پر دنیا کی جو فتوحات کی جائیں گی اور وہ قیصر و کسریٰ کے خزانے تقسیم کریں گے اور ان کے درمیان جو فتنے پیدا ہوں گے اور امت میں جو اختلاف پیدا ہوگا اور وہ پچھلی امتوں کے طریقے پر چلیں گے اور کسریٰ اور قیصر کی حکومتیں ختم ہو جائیں گی اور پھر ان کی حکومت قائم نہیں ہوگی اور یہ کہ روئے زمین کو آپ کے لیے لپیٹ دیا گیا ہے اور آپ نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا ہے اور یہ کہ آپ کی امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر قائم رہے گا اور آپ نے بنو امیہ اور حضرت معاویہ کی حکومت کی خبر دی اور اہل بیت کی آزمائش اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر دی، حضرت معاویہ اور حضرت علی کی لڑائی کی خبر دی، حضرت عمار کی شہادت کی خبر دی، آپ کے اہل بیت میں سب سے پہلے حضرت سیدتنا فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کی وفات کی خبر دی اور یہ کہ آپ کے بعد صرف تیس سال تک خلافت رہے گی اور پھر بادشاہت ہو جائے گی۔ تیس دجالوں کے خروج کی خبر دی، قریش کے ہاتھوں امت کی ہلاکت کی خبر دی۔ قدر یہ اور راضیہ کے ظہور کی خبر دی، ابناء فارس کے دین حاصل کرنے کی خبر دی، اپنی گمشدہ اونٹنی کی خبر دی، جنگ بدر میں کافر کس جگہ گر کر مرے گئے یہ خبر دی، حضرت حسن کے صلح کرانے کی خبر دی، حضرت سعد کی حیات کے متعلق خبر دی اور یہ خبر دی کہ آپ کی ازواج میں سے جس کے ہاتھ زیادہ لمبے ہوں گے وہ آپ سے سب سے پہلے واصل ہوگی، حضرت زید بن صوحان کے ہاتھ کے متعلق پیش گوئی کی، سراقہ کے لیے سونے کے کنگنوں کی خبر دی اور بہت باتوں کی خبر دی، اب ہم ان تمام امور کے متعلق تفصیلاً احادیث بیان کر رہے ہیں۔

۵۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ عزوجل نے تمام روئے زمین کو میرے لیے سکیڑ دیا ہے، سو میں نے اس کے مشارق اور مغارب کو دیکھ لیا اور میری امت کی حکومت عنقریب وہاں تک پہنچے گی جہاں تک کی زمین میرے لیے سکیڑ دی گئی تھی اور مجھے سرخ اور سفید دو خزانے دیے گئے ہیں۔ (الحدیث)

(دلائل النبوت للسیوطی، ج ۶، ص ۲۲، صحیح مسلم الفتن ۱۹ (۲۸۸۹) ۱۲۵، ۱۲۶، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۴۲۵۲، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۵۲)

۶۔ سعید بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے دوات پکڑی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے پیچھے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا اے معاویہ! اگر تم کو کسی علاقہ کا والی بنا دیا جائے تو اللہ سے ڈرنا اور عدل کرنا، حضرت معاویہ نے کہا مجھے اس وقت سے یہ یقین تھا کہ مجھے کسی منصب کا والی بنایا جائے گا اور اس کی وجہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد تھا۔ (مسند احمد ج ۳، ص ۱۰۱، دلائل النبوت ج ۶، ص ۳۳۶، البدایہ والنہایہ ج ۸، ص ۱۲۳)

۷۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خلافت مدینہ میں ہوگی اور طوکیت شام میں۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۸۸، دلائل النبوت ج ۶، ص ۳۳۷)

۸۔ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ان کے گھر آئے انہوں نے آپ کو کھانا کھلایا اور آپ کا سر سہلایا، رسول اللہ ﷺ سو گئے پھر ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کو کس چیز نے ہنسایا؟ آپ نے فرمایا مجھے میری امت کے کچھ لوگ دکھائے گئے جو سمندر کے راستے جہاد کریں گے۔ حضرت ام حرام نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ سے دعا کیجئے کہ اللہ مجھے ان میں سے کر دے آپ نے ان کے لیے دعا کی پھر سو گئے۔ پھر آپ ہنستے ہوئے بیدار ہوئے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟ فرمایا مجھے میری امت کے کچھ لوگ دکھائے گئے جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے۔ (بخاری کی روایت میں ہے: میری امت کا جو پہلا لشکر قیصر کے شہر میں جہاد کرے گا وہ بخشا ہوا ہے۔ رقم الحدیث: ۲۹۲۳) میں نے کہا یا رسول اللہ! میرے لیے دعا کریں کہ اللہ مجھے ان میں سے کر دے۔ آپ نے فرمایا تم پہلے لشکر میں سے ہو۔ حضرت ام حرام بنت ملحان حضرت معاویہ کے زمانے میں سمندر کے راستے جہاد میں گئیں وہ اپنی سواری سے گر گئیں، ان کو سمندر سے نکالا گیا تو جان بحق ہو چکی تھیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۷۸۸، صحیح مسلم الجہاد ۱۶۰، (۱۹۱۲) ۳۸۵۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۳۹۱، سنن الترمذی رقم الحدیث:

۱۶۵۲، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۷۱، دلائل النبوت ج ۶، ص ۳۵۲-۳۵۱)

۹۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کی ہلاکت قریش کے لڑکوں کے ہاتھوں ہوگی، حضرت ابو ہریرہ نے کہا اگر تم چاہو تو میں بنو فلاں اور بنو فلاں کا نام لوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۰۵، ۳۶۰۴، صحیح مسلم الفتن ۷۳، (۲۹۱۷) ۷۱۹۲، دلائل النبوت ج ۶، ص ۳۶۵، ۳۶۴)

۱۰۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا جس نے فاتحہ کی شکایت کی، پھر دوسرا شخص آیا جس نے راستہ میں ڈاکوؤں کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا اے عدی! کیا تم نے الحیرہ دیکھا ہے؟ میں نے کہا میں نے اس کو دیکھا تو نہیں لیکن مجھے اس کی خبر دی گئی ہے، آپ نے فرمایا اگر تمہاری زندگی دراز ہوئی تو تم ایک مسافر کو دیکھو گے جو الحیرہ سے سفر کر کے کعبہ کا طواف کرے گی اور اس کو اللہ کے سوا اور کسی کا خوف نہیں ہوگا، میں نے اپنے دل میں کہا پھر اس شہر کے ڈاکو کہاں چلے جائیں گے جنہوں نے شہروں میں فتنہ اور فساد کی آگ بھڑکادی ہے۔ (پھر فرمایا) اور اگر تمہاری زندگی دراز ہوئی تو تم دیکھو گے کہ ایک شخص مٹھی بھر سونایا چاندی لے کر نکلے گا اور اس کو لینے والے کو ڈھونڈے گا اور اسے کوئی شخص نہیں ملے گا جو اس کو قبول کرے، اور تم میں سے ضرور ایک شخص قیامت کے دن اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی ترجمان نہیں ہوگا جو ترجمہ کرے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں نے تمہاری طرف کوئی رسول نہیں بھیجا تھا جس نے تم کو تبلیغ کی؟ وہ کہے گا کیوں نہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا میں نے تم کو مال نہیں دیا تھا جو تم سے زائد تھا؟ وہ کہے گا کیوں نہیں! پھر وہ اپنی دائیں طرف دیکھے گا تو صرف جہنم نظر آئے گا اور بائیں طرف دیکھے گا تو صرف جہنم نظر آئے گا۔ حضرت عدی کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آگ سے بچو، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے (کے صدقہ) سے، اور جس کو کھجور کا ٹکڑا نہ ملے تو وہ کوئی نیک بات کہہ دے، حضرت عدی کہتے ہیں کہ میں نے ایک مسافر کو دیکھا جس نے الحیرہ سے سفر کر کے خانہ کعبہ کا طواف کیا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہیں تھا، اور میں ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے کسریٰ بن ہرملہ کے خزانوں کو کھولا اور اگر تمہاری زندگی دراز ہوئی تو تم ضرور وہ نشانی دیکھ لو گے جو نبی

ﷺ نے فرمائی تھی کہ ایک آدمی مٹھی بھر (سونایا چاندی) لے کر نکلے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۹۵، دلائل النبوة ج ۶، ص ۳۲۳)

۱۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسریٰ فوت ہو گیا اور اس کے بعد کوئی کسریٰ نہیں ہے اور جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں ہو گا اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے تم ضرور ان کے خزانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے۔

(صحیح مسلم القتن ۷۵ (۲۹۱۸) ۷۱۹۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۲۲۳، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۰۲۷، صحیح ابن حبان ج ۱۵، رقم الحدیث: ۶۶۸۹، سند احمد ج ۳، رقم الحدیث: ۷۲۷۲، طبع جدید، مسند الشافعی ج ۲، ص ۱۸۶، مسند الحمیدی رقم الحدیث: ۱۰۹۳، مصنف عبد الرزاق رقم الحدیث: ۲۰۸۱۳، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۹، ص ۱۷۷)

۱۲۔ حسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس کسریٰ کی پوستین لائی گئی اور ان کے سامنے رکھ دی گئی اور قوم میں حضرت سراقہ بن مالک بن جشم بھی تھے، حضرت عمر نے کسریٰ بن ہرمز کے کنگن، حضرت سراقہ بن مالک کو دیے، انہوں نے ان کو اپنے ہاتھوں میں پن لیا جو ان کے کندھوں تک پہنچ گئے۔ جب حضرت عمر نے حضرت سراقہ کے ہاتھوں میں کنگن دیکھے تو فرمایا الحمد للہ امام شافعی نے کہا حضرت عمر نے حضرت سراقہ کو یہ کنگن اس لیے پہنائے تھے کہ نبی ﷺ نے حضرت سراقہ کی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے فرمایا تھا گویا کہ تمہارے ہاتھ کسریٰ کے کنگن پہنے ہوئے ہیں، امام شافعی نے کہا جب حضرت عمر نے کسریٰ کے کنگن حضرت سراقہ کو پہنائے تو کہا تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جس نے کسریٰ بن ہرمز سے کنگن چھین کر سراقہ بن جشم کو پہنایا جو بنو مدیج کا ایک اعرابی ہے۔ (دلائل النبوة ج ۶، ص ۳۲۶-۳۲۵)

۱۳۔ حضرت انس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ عزوجل نے دنیا کو میرے لیے اٹھالیا اور میں دنیا کی طرف اور قیامت تک دنیا میں جو کچھ ہونے والا ہے اس کو اس طرح دیکھ رہا ہوں جیسے اپنے ان ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو دیکھ رہا ہوں، جو اللہ عزوجل کے حکم سے روشن ہیں، اس نے اپنے نبی کے لیے ان کو روشن کیا، جس طرح پہلے نبیوں کے لیے روشن کیا تھا۔

(حلیۃ الاولیاء ج ۶، ص ۱۰۱، الجامع الکبیر رقم الحدیث: ۳۸۳۹، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۱۸۱۰، ۳۱۹۷۹، حافظ البیہقی نے کہا اس حدیث کے راویوں کی توثیق کی گئی ہے، اس میں سعید بن سنان رھاوی ضعیف راوی ہے، مجمع الزوائد ج ۸، ص ۲۸۷)

۱۴۔ حضرت عبد اللہ بن حوالہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے آپ سے سلمان کی کمی، غربت اور افلاس کی شکایت کی آپ نے فرمایا تمہیں خوش خبری ہو کیونکہ مجھے تم پر اشیاء کی قلت کی بہ نسبت اشیاء کی کثرت کا زیادہ خوف ہے، بہ خدا یہ دین تم میں رہے گا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے سرزمین فارس، سرزمین روم اور سرزمین حمیر فتح کر دے گا۔ (الحدیث) (دلائل النبوت ج ۶، ص ۳۲۷)

۱۵۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ پر سورہ جمعہ نازل ہوئی جب آپ نے یہ آیت پڑھی:

وَآخِرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ
(الجمعة: ۳)

اور وہ نبی ان میں سے دوسروں کو بھی (کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کا باطن صاف کرتے ہیں) جو ابھی ان سے لاحق نہیں ہوئے۔

تو ایک شخص نے پوچھا: یا رسول اللہ! یہ لوگ کون ہیں انہی نے اس کو جواب نہیں دیا، حتیٰ کہ اس نے دو یا تین مرتبہ سوال کیا اور ہم میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بھی تھے تو نبی ﷺ نے حضرت سلمان فارسی پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا اگر ایمان ثریا (ستارے) کے پاس بھی ہو تو ان کی طرف کے لوگ اس کو حاصل کر لیں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۸۹۷، صحیح مسلم فضائل الصحابہ، ۲۳۰ (۲۵۳۶) ۶۳۷۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۳۱۷)

۱۶- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا بنو اسرائیل کا ملکی نظام ان کے نبی چلاتے تھے، جب ایک نبی فوت ہو جاتا تو اس کی جگہ دوسرا نبی آجاتا، اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا اور عنقریب خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے، صحابہ نے پوچھا پھر آپ کیا حکم دیتے ہیں۔ فرمایا پہلے کی بیعت سے وفا کرو، پھر پہلے کی، اور ان کے حقوق ادا کرو، کیونکہ اللہ عزوجل ان سے سوال کرے گا کہ انہوں نے عوام کے ساتھ کس طرح معاملہ کیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۴۵۵، صحیح مسلم الامارہ ۳۳ (۱۸۴۲) ۳۶۹۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۷۱)

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہا بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خلافت تیس سال رہے گی پھر اللہ جس کو چاہے گا ملک دے دے گا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۶۳۶، مسند احمد ج ۵، ص ۴۴، دلائل النبوت ج ۶، ص ۳۳۱)

حضرت ابوبکر کی خلافت دو سال چار ماہ رہی (دس دن کم تھے) حضرت عمر کی خلافت دس سال چھ ماہ چار دن رہی، حضرت عثمان کی خلافت بارہ دن کم بارہ سال رہی اور حضرت علی کی خلافت دو یا تین ماہ کم پانچ سال رہی۔

(دلائل النبوت ج ۶، ص ۳۳۱-۳۳۲، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)

۱۸- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے اپنے مرض الموت میں فرمایا میرے لیے ابوبکر کو اور اپنے بھائی کو بلاؤ کیونکہ مجھے یہ خوف ہے کہ کوئی (خلافت کی) تمنا کرنے والا تمنا کرے گا اور کہے گا کہ میں (خلافت کے) زیادہ لائق ہوں اور اللہ اور مومنین ابوبکر کے غیر کا انکار کر دیں گے۔

(صحیح مسلم فضائل الصحابہ ۱۱، (۲۳۸۷) ۶۰۶۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۴۶۵، مسند احمد ج ۶، ص ۲۲۸، دلائل

النبوت ج ۶، ص ۳۳۳)

۱۹- حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ احد پہاڑ پر چڑھے (ایک راوی کا خیال ہے کہ حضرت انس نے حراء پہاڑ کھاتھا) اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم تھے۔ وہ پہاڑ لرزنے لگا۔ نبی ﷺ نے فرمایا (اے پہاڑ!) ساکن ہو جا، تجھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۷۵، ۳۶۸۶، ۳۶۹۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷۱۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۶۵۱، مسند احمد

ج ۵، ص ۳۳۱، ۳۳۶، دلائل النبوت ج ۶، ص ۳۵۰)

۲۰- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ
صَوْتِ النَّبِيِّ (الحجرات: ۲)

اے ایمان والو! انہی کی آواز کے اوپر اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو۔

تو حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں بیٹھ گئے اور کہا میں اہل دوزخ سے ہوں اور نبی ﷺ کی مجلس میں حاضر نہیں ہوئے، نبی ﷺ نے حضرت سعد بن معاذ سے ان کے متعلق پوچھا اور فرمایا اے ابو عمرو! ثابت کا کیا حال ہے؟ کیا وہ بیمار ہے؟ حضرت سعد نے کہا وہ میرا بڑا دوست ہے اور مجھے اس کی بیماری کا کوئی علم نہیں، پھر حضرت سعد نے ان سے رسول اللہ ﷺ کے

تبیان القرآن

جلد چہارم

دریافت کرنے کا ذکر کیا، حضرت ثابت نے کہا یہ آیت نازل ہو چکی ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے میری آواز سب سے اونچی ہے، پس میں اہل دوزخ سے ہوں، حضرت سعد نے نبی ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا آپ نے فرمایا بلکہ وہ اہل جنت میں سے ہے، امام مسلم کی ایک روایت میں ہے (رقم الحدیث: ۳۱۰) کہ جب حضرت ثابت ہمارے درمیان چلتے تھے تو ہم یقین کرتے تھے کہ یہ جنتی ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۸۳۶، صحیح مسلم الایمان، ۱۸۷، (۱۱۹) ۳۰۷)

حضرت ثابت میلہ کذاب کے خلاف جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

(دلائل النبوة ج ۶، ص ۳۵۵، المستدرک ج ۳، ص ۲۳۳، مجمع الزوائد ج ۹، ص ۳۲۲)

۲۱- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے یہ بیان کیا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک دن میں سویا ہوا تھا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن رکھے گئے ہیں، میں ان سے گھبرا گیا اور مجھ کو وہ ناگوار لگے پھر مجھے اجازت دی گئی کہ میں ان کو پھونک سے اڑا دوں، سو میں نے پھونک مار کر ان کو اڑا دیا۔ عبید اللہ نے کہا ان میں سے ایک عنسی تھا جس کو فیروز نے یمن میں قتل کیا اور دوسرا میلہ تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۰۳۳، صحیح مسلم الروایا ۲۲ (۲۲۷۴) ۵۸۲۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۲۹۹، صحیح ابن جبان ج ۱۵، رقم الحدیث: ۶۶۵۳، مسند احمد ج ۱، ص ۲۶۳، طبع قدیم، مسند احمد ج ۳، رقم الحدیث: ۸۲۵۶، طبع جدید)

۲۲- حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان اس سے مایوس ہو گیا ہے کہ جزیرہ عرب میں نمازی اس کی عبادت کریں لیکن وہ ان میں اختلاف اور نزاع پیدا کرنے کے لیے مایوس نہیں ہے۔

(صحیح مسلم المنافقین ۶۵ (۲۸۱۲) ۶۹۷۰، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۳۳، مسند احمد ج ۳، ص ۳۱۳)

۲۳- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاحبزادی سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور ان سے سرگوشی کی وہ رونے لگیں، پھر دوبارہ سرگوشی کی تو وہ ہنسنے لگیں، حضرت عائشہ نے حضرت فاطمہ سے پوچھا رسول اللہ ﷺ نے کیا سرگوشی کی تھی جس پر آپ رونیں اور پھر سرگوشی کی تو آپ ہنسیں، حضرت فاطمہ نے فرمایا آپ نے مجھ سے سرگوشی کر کے مجھے اپنی وفات کی خبر دی تو میں روئی پھر سرگوشی کر کے یہ خبر دی کی آپ کے اہل میں سے سب سے پہلے میں آپ کے ساتھ لاحق ہوں گی تو پھر میں ہنسی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۲۵، صحیح مسلم فضائل صحابہ، ۹۸ (۲۳۵۰) ۶۱۹۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۳۶۷، مسند احمد ج ۶، ص ۲۸۲، الطبقات الکبریٰ ج ۲، ص ۲۳۷، دلائل النبوت ج ۶، ص ۳۶۵)

۲۴- حضرت ام ورقہ بنت عبد اللہ بن الحارث کی ملاقات کے لیے رسول اللہ ﷺ تشریف لے جاتے اور آپ نے ان کا نام الشہیدہ رکھا تھا، وہ قرآن کی حافظہ تھیں، جب رسول اللہ ﷺ غزوہ بدر کے لیے تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا آپ مجھے اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماریوں کی تیمارداری کروں، شاید اللہ تعالیٰ مجھے شہادت عطا فرمائے، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تم کو شہادت عطا فرمائے گا اور آپ ان کو الشہیدہ کہتے تھے، اور نبی ﷺ نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے گھر کی خواتین کی امامت کیا کریں، ان کو مال غنیمت میں سے ایک باندی اور ایک غلام ملا تھا، جن کو انہوں نے مدبر کر دیا تھا (یعنی ان سے کہہ دیا تھا کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو) حضرت عمر کے دور خلافت میں ان دونوں نے حضرت ام ورقہ کو قتل کر دیا اور دونوں بھاگ گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے ان کو پکڑ لیا گیا اور ان دونوں کو سولی پر لٹکایا، مدینہ میں ان کو سب سے پہلی سولی دی گئی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا تھا، آپ فرماتے تھے چلو الشہیدہ

کی زیارت کے لیے چلیں۔

(مسند احمد ج ۶، ص ۳۰۵، طبع قدیم احمد شاکر نے اس کی ایک سند کو ضعیف اور دوسری سند کو صحیح کہا ہے۔ مسند احمد ج ۱۸، رقم الحدیث: ۲۷۱۵۸، ۲۷۱۵۷، طبع دار الحدیث قاہرہ، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی۔ المستدرک ج ۱، ص ۱۶۱، رقم الحدیث: ۵۹۲، صحیح ابن خزیمہ، ج ۳، ص ۸۹، رقم الحدیث: ۱۶۷۶، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۳، ص ۱۳۰، دلائل النبوة ج ۶، ص ۳۸۱، الاستیعاب رقم الحدیث: ۱۲۲۹۸، الاستیعاب رقم الحدیث: ۳۶۸۶، اسد الغابہ رقم ۷۲۲۶، کتاب الثقات ج ۳، ص ۳۶۳)

۲۵۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے گھر میں وضو کیا اور سوچا آج میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہوں گا، آپ مسجد میں نہیں تھے، میں آپ کی تلاش میں نکلا آپ اریس نامی کنویں کی منڈیر پر کنویں میں ٹانگیں لٹکائے ہوئے بیٹھے تھے، میں اس کے دروازہ پر چلا گیا اور میں نے سوچا کہ میں آج رسول اللہ ﷺ کا دربان بنوں گا، تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے پوچھا: کون ہے، آنے والے نے کہا ابو بکر میں نے کہا ٹھہریں، پھر رسول اللہ ﷺ سے ان کے لیے اجازت طلب کی آپ نے فرمایا ان کو اجازت دے دو، اور ان کو جنت کی بشارت دو، حضرت ابو بکر آکر رسول اللہ ﷺ کی دائیں جانب منڈیر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد حضرت عمر نے دروازے پر دستک دی، میں نے کہا ٹھہریں اور رسول اللہ ﷺ سے ان کے لیے اجازت طلب کی، آپ نے فرمایا ان کو اجازت دے دو اور ان کو جنت کی بشارت دے دو، وہ آکر رسول اللہ ﷺ کی بائیں جانب منڈیر پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد حضرت عثمان نے دروازہ پر دستک دی، میں نے کہا ٹھہریں اور رسول اللہ ﷺ سے ان کے لیے اجازت طلب کی، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ان کو اجازت دے دو، اور جنت کی بشارت دو ان مصائب اور فتنوں کے ساتھ جو ان کو لاحق ہوں گے۔ (ملخصاً)

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۶۹۳، صحیح مسلم فضائل الصحابة ۲۹ (۲۳۰۳) ۶۰۹۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷۱۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۹۱۲، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۴۰۲، مسند احمد ج ۷، رقم الحدیث: ۱۹۶۶۲)

۲۶۔ حضرت مرہ بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتنوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ عنقریب واقع ہونے والے ہیں، اس وقت ایک شخص کپڑے سے اپنے آپ کو ڈھانپنے ہوئے گزرا، نبی ﷺ نے فرمایا یہ شخص اس وقت ہدایت پر ہوگا، میں نے کھڑے ہو کر دیکھا تو وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے، میں نے پھر آپ کی طرف رخ کر کے پوچھا یہ؟ آپ نے فرمایا ہاں!

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷۲۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۹۱۳، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۲، ص ۳۰، المعجم الکبیر ج ۲۰، ص ۷۵۲، مسند احمد ج ۷، رقم الحدیث: ۲۰۳۷۳)

۲۷۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتنوں کا ذکر کیا۔ پھر آپ نے حضرت عثمان بن عفان کے متعلق فرمایا کہ یہ شخص فتنوں میں مظلوماً قتل کیا جائے گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷۲۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۳ھ)

۲۸۔ ابو مسہلم بیان کرتے ہیں کہ جن دنوں میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں محصور تھے۔ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا اور میں اس پر صابر ہوں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷۳۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۱۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۶۹۱۸، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۲، ص ۳۳، مسند احمد ج ۱، رقم الحدیث: ۳۰۷، طبع جدید)

تبیان القرآن

جلد چہارم

۲۹- حضرت ابو سعید خدری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمار بن یاسر کے متعلق فرمایا جس وقت وہ خندق کھود رہے تھے آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا اے ابن سید افسوس ہے! تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔
(صحیح مسلم الفتن ۱۷۰ (۲۹۱۵) ۷۱۸۷، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۰۳۸، دلائل النبوة ج ۶، ص ۴۲۰)

۳۰- فضالہ بن ابی فضالہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے والد حضرت ابو فضالہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لیے گیا، میرے والد نے کہا کاش آپ کی جگہ مجھے اجل آجاتی! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ میں اس وقت تک نہیں مروں گا حتیٰ کہ مجھے امیر بنا دیا جائے اور میری یہ داڑھی خون سے رنگین ہو جائے یعنی میں شہید ہو جاؤں، حضرت علی شہید کر دیے گئے اور حضرت ابو فضالہ حضرت علی کی طرف سے لڑتے ہوئے جنگ صفین میں شہید ہوئے۔

(مسند احمد ج ۱، ص ۱۰۲، طبع قدیم، احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد ج ۱، رقم الحدیث: ۸۰۲، طبع دار الحدیث قاہرہ، المستدرک ج ۳، ص ۱۱۳، اللبقات الکبریٰ ج ۳، ص ۳۳، مجمع الزوائد ج ۹، ص ۱۳۷-۱۳۶، دلائل النبوت ج ۶، ص ۴۳۸)

۳۱- حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا رسول اللہ ﷺ منبر پر بیٹھے ہوئے تھے اور حسن بن علی رضی اللہ عنہما آپ کے پہلو میں تھے آپ کبھی لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے اور کبھی ان کی طرف متوجہ ہوتے، آپ نے فرمایا میرا یہ بیٹا سردار ہے، امید ہے کہ اللہ اس کے سب سے مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح فرمادے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۷۰۲، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۶۱۳۳، مسند احمد ج ۵، ص ۴۹)

۳۲- عمار بن ابی عمار بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ نبی ﷺ کے بال بکھرے ہوئے اور غبار آلود ہیں اور آپ دوپہر کے وقت ایک شیشی اٹھائے ہوئے ہیں جس میں خون بھرا ہوا ہے، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ ندا ہوں یہ کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا یہ حسین اور ان کے اصحاب کا خون ہے میں آج دن سے لے کر اب تک یہ خون جمع کرتا رہا ہوں۔ ہم نے وہ دن یاد رکھا پھر معلوم ہوا کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اسی دن شہید کیا گیا تھا۔
(مسند احمد ج ۱، ص ۲۴۲، ۲۸۳، شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ مسند احمد ج ۲، رقم الحدیث: ۲۱۶۵، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۵۵۳، طبع دار الحدیث قاہرہ، المعجم الکبیر ج ۱۲، رقم الحدیث: ۱۲۸۳، ج ۲، رقم الحدیث: ۲۸۲۲) حافظ البیہقی نے کہا امام احمد کی سند صحیح ہے۔ مجمع الزوائد ج ۹، ص ۱۹۳، البدایہ والنہایہ ج ۶، ص ۲۳۱، المستدرک ج ۲، ص ۳۱۳۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے)

۳۳- حضرت عباس بن عبد المطلب بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بیٹے حضرت عبد اللہ کو کسی کام سے رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا، انہوں نے آپ کے پاس ایک شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو وہ لوٹ آئے۔ حضرت عباس نے رسول اللہ ﷺ سے کہا میں نے اپنے بیٹے کو آپ کے پاس کسی کام سے بھیجا تھا وہ آپ کے پاس ایک شخص کو دیکھ کر لوٹ آئے، اور بات نہ کر سکے، آپ نے فرمایا کیا تم کو معلوم ہے کہ وہ شخص کون تھا، وہ شخص جبریل علیہ السلام تھے اور (حضرت ابن عباس) اس وقت تک فوت نہیں ہوں گے جب تک کہ نایمانہ ہو جائیں اور ان کو علم دیا جائے گا۔

(مسند احمد رقم الحدیث: ۲۶۷۹، ۲۸۳۸، طبع جدید، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۰۵۸۳، ۱۲۸۳۶، حافظ البیہقی نے کہا ہے کہ مسند احمد کی

سند صحیح ہے۔ مجمع الزوائد ج ۶، ص ۲۷۶)

۳۳- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عنقریب تم مصر کو فتح کرو گے اور یہ وہ زمین ہے جس میں قیراط کا ذکر کیا جاتا ہے تم وہاں کے رہنے والوں کے ساتھ خیر خواہی کرنا کیونکہ ان کا ذمہ اور رحم ہے۔ (ذمہ سے مراد حرمت اور حق ہے اور رحم سے مراد یہ ہے کہ حضرت ہاجر، حضرت اسماعیل کی والدہ مصری تھیں)

(صحیح مسلم فضائل الصحابہ، ۲۲۷، (۲۵۳۳) ۶۳۷۵، مسند احمد ج ۶، ص ۱۷۳)

۳۵- حضرت ابو داؤد لیشی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب حنین کی طرف گئے تو مشرکین کے ایک درخت کے پاس سے گزرے جس کو ذات انواط کہا جاتا تھا، جس پر وہ اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے۔ مسلمانوں نے کہا یا رسول اللہ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا ذات انواط بنا دیجئے جیسا ان کے لیے ذات انواط ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ! یہ تو ایسا ہے جیسا موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا ہمارے لیے بھی ایسا خدا بنا دیں جیسے ان کے خدا ہیں، اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے تم ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر سوار ہو گے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۷، صحیح ابن حبان ج ۱۵، رقم الحدیث: ۶۷۰۲، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۰۷۳، مصنف ابن

ابی شیبہ ج ۱۵، ص ۱۰۱، المعجم الکبیر ج ۳، رقم الحدیث: ۳۲۹۱، ۳۲۹۰)

۳۶- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ ہر سو سال کے سر پر (صدی کی انتہایا ابتداء پر) اس امت کے لیے اس شخص کو مبعوث کرے گا جو ان کے لیے ان کے دین کی تجدید کرے گا۔ (یعنی بدعات کو مٹائے گا اور جن احکام پر مسلمانوں نے عمل کرنا چھوڑ دیا تھا ان پر عمل کروائے گا۔)

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۲۹۱، جامع الاصول ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۸۱)

۳۷- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی آخری زندگی میں ایک رات میں عشاء کی نماز پڑھائی اور جب سلام پھیر لیا تو فرمایا مجھے بتاؤ یہ کون سی رات ہے کیونکہ اس کے ایک سو سال بعد ان لوگوں میں سے کوئی زندہ نہیں رہے گا جو روئے زمین پر اب زندہ ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۰۱، صحیح مسلم فضائل الصحابہ، رقم الحدیث: ۲۱۷، (۲۵۳۷) ۶۳۶۱، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۳۳۸، سنن

الترمذی رقم الحدیث: ۲۵۸، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۵۸۷۱)

۳۸- حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اہل خیبر میں سے ایک یہودیہ نے ایک بھنی ہوئی بکری میں زہر ملایا پھر وہ نبی ﷺ کو پیش کی۔ نبی ﷺ نے اس بکری کا ایک دست لیا اور اس میں سے کھایا اور آپ کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے بھی اس میں سے کھایا، پھر نبی ﷺ نے اپنے اصحاب سے کہا اپنے ہاتھ روک لو، اور نبی ﷺ نے اس یہودیہ کو بلوایا اور فرمایا کیا تم نے اس بکری میں زہر ملایا تھا؟ اس نے کہا ہاں! آپ کو کس نے خبر دی؟ نبی ﷺ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے دست کی طرف اشارہ کیا مجھے اس نے خبر دی ہے۔ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا تم نے کس لیے ایسا کیا تھا؟ اس نے کہا میں نے سوچا اگر یہ نبی ہیں تو ان کو اس زہر سے نقصان نہیں ہو گا اور اگر یہ نبی نہیں ہیں تو ہماری خلاصی ہو جائے گی۔ نبی ﷺ نے اس کو معاف کر دیا اور اس کو سزا نہیں دی، اور آپ کے بعض اصحاب جنہوں نے اس بکری کا گوشت کھایا تھا وہ فوت ہو گئے اور نبی ﷺ نے اس بکری سے کھائے ہوئے گوشت کی وجہ سے پیٹھ کے اوپر گردن کے نیچے نصد لگوائی۔ بنو بیاضہ کے آزاد شدہ غلام نے یہ نصد لگائی تھی۔

(سنن دارمی رقم الحدیث: ۶۸، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۵۱۰، الادب المفرد، رقم الحدیث: ۲۳۳، جامع الاصول

ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۸۷

۳۹- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب خیبر فتح ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ کو ایک بکری تحفہ میں پیش کی گئی جو زہر آلود تھی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہاں جتنے یہودی ہیں ان سب کو جمع کرو، یہودیوں کو جمع کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم سے ایک چیز کے متعلق سوال کرتا ہوں؟ کیا تم مجھ سے سچ بولو گے؟ انہوں نے کہا ہاں! اے ابوالقاسم! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارا باپ کون ہے؟ انہوں نے کہا ہمارا باپ فلاں ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے جھوٹ بولا بلکہ تمہارا باپ فلاں ہے۔ تب یہودیوں نے کہا آپ نے سچ کہا اور نیک کام کیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم سے ایک چیز کے متعلق سوال کرتا ہوں کیا تم مجھے سچ بتا دو گے؟ انہوں نے کہا ہاں! اے ابوالقاسم، اور اگر ہم نے جھوٹ بھی بولا تو آپ کو ہمارے جھوٹ کا علم ہو جائے گا جیسا کہ آپ کو ہمارے باپ کے متعلق علم ہو گیا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل دوزخ کون ہیں؟ انہوں نے کہا ہم اس میں تھوڑی دیر رہیں گے، پھر ہمارے بعد تم لوگ دوزخ میں جاؤ گے! تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم دوزخ میں دفع ہو جاؤ، بہ خدا ہم تمہارے بعد اس میں کبھی بھی نہیں جائیں گے، پھر آپ نے فرمایا اگر میں تم سے کسی چیز کے متعلق سوال کروں تو کیا تم سچ سچ بتاؤ گے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا تم نے اس بکری میں زہر ملایا تھا؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے پوچھا تم کو اس کام پر کس چیز نے براگیختہ کیا؟ انہوں نے کہا ہم نے یہ ارادہ کیا تھا کہ اگر آپ جھوٹے ہیں تو ہم کو آپ سے نجات مل جائے گی اور اگر آپ نبی ہیں تو یہ زہر آپ کو ضرر نہیں دے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۷۷۷، مسند احمد ج ۲، ص ۲۵۱، سنن داری رقم الحدیث: ۶۹، جامع الاصول ج ۱۱، رقم

الحدیث: ۸۸۸۶)

۴۰- انصار کے ایک آدمی سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جنازہ میں گئے، آپ قبر کھودنے والے کو وصیت فرما رہے تھے کہ پیروں کی جانب سے قبر کو کشادہ کرو، اور سر کی جانب سے قبر کو کشادہ کرو، جب آپ واپس ہوئے تو ایک عورت کی طرف سے دعوت دینے والا آیا، آپ نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور ہم بھی آپ کے ساتھ تھے، پس کھانا لایا گیا، آپ نے اپنا ہاتھ رکھا، پھر قوم نے اپنا ہاتھ رکھا، سب نے کھایا، ہم نے رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھا آپ اپنے منہ میں ایک لقمہ چبا رہے تھے، آپ نے فرمایا مجھے یہ علم ہوا کہ یہ اس بکری کا گوشت ہے جس کو اس کے مالک کی مرضی کے بغیر لیا گیا ہے، پھر اس عورت کو بلایا گیا اس نے کہا یا رسول اللہ! میں نے کسی کو شیع (بکریاں فروخت کرنے کی جگہ، منڈی) کی طرف بھیجا تھا، تاکہ میرے لیے بکری خرید لی جائے، تو بکری نہیں ملی، میں نے اپنے پڑوسی کو پیغام بھیجا جس نے ایک بکری خریدی تھی کہ وہ بکری مجھے قیمت کے عوض بھیج دے تو وہ پڑوسی نہیں ملا، میں نے اس کی بیوی کو پیغام بھیجا تو اس نے وہ بکری مجھے بھیج دی، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ کھانا قیدیوں کو کھلا دو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۳۳۲، مسند احمد ج ۵، ص ۲۹۳، جامع الاصول ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۸۹، مشکوٰۃ رقم

الحدیث: ۵۹۳۲)

۴۱- حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (جنگ بدر کے دن) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کل یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے اور آپ نے زمین پر ہاتھ رکھا اور کل یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے اور زمین پر ہاتھ رکھا اور کل یہ فلاں کے گرنے کی جگہ ہے اور زمین پر ہاتھ رکھا۔ پھر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے جس جگہ رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ رکھا تھا کوئی شخص اس سے بالکل متجاوز نہیں ہوا (اسی جگہ گر کر مرا) پھر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ان کو

گھسیٹ کر بدر کے کنویں میں ڈال دیا گیا۔ مسلم اور نسائی کی روایت میں ہے کل رسول اللہ ﷺ ہمیں کفار بدر کے گرنے کی جگہیں بتا رہے تھے اور فرما رہے تھے 'کل فلاں یہاں گرے گا۔ انشاء اللہ۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۸۱، صحیح مسلم النافقین: ۷۵ (۲۸۷۲) ۷۰۸۸، سنن نسائی رقم الحدیث: ۲۰۷۳، مسند احمد ج ۳، ص ۲۵۸-۲۱۹، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۵۹۳۸)

۳۲۔ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک سفر سے تشریف لائے اس وقت بڑے زور سے آندھی چلی لگتا تھا کہ سوار دفن ہو جائیں گے 'تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک منافق کی موت کی وجہ سے یہ آندھی بھیجی گئی ہے 'جب ہم مدینہ پہنچے تو ایک بہت بڑا منافق مر چکا تھا۔

(صحیح مسلم النافقین: ۱۵ (۲۷۸۲) ۶۹۰۸، مسند احمد ج ۳، ص ۳۱۵، مسند عبد بن حمید رقم الحدیث: ۱۰۲۹، جامع الاصول ج ۱۱، رقم الحدیث: ۸۸۸۵)

۳۳۔ حضرت ابو موسیٰ بنی شہ: بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سے کچھ چیزوں کے متعلق سوال کیا گیا جن کو آپ نے ناپسند کیا، جب بکثرت سوال کیے گئے تو آپ غضب ناک ہوئے پھر آپ نے لوگوں سے کہا تم جو چاہتے ہو مجھ سے سوال کرو، ایک شخص نے کہا میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا تمہارا باپ سالم ہے شیبہ کا آزاد کردہ غلام، جب حضرت عمر نے آپ کے چہرے پر غضب کے آثار دیکھے تو عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ ہم اللہ عزوجل سے توبہ کرتے ہیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۲، ۷۳، ۷۴)

۳۴۔ حضرت سل بن سعد بنی شہ: بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ خیبر کے دن فرمایا کل میں یہ جھنڈا ضرور اس شخص کو دوں گا جس کے ہاتھوں پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا، وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہو گا اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں، وہ تمام رات مسلمانوں نے اس بے چینی میں گزاری کہ آپ کس کو جھنڈا عطا فرماتے ہیں، صبح کو تمام مسلمان رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب کو اس جھنڈے کے عطا کیے جانے کی امید تھی، آپ نے پوچھا علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے، پھر حضرت علی کو مسلمانوں نے بلایا، وہ لائے گئے، رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن ڈالا اور ان کے لیے دعا کی، وہ تندرست ہو گئے گویا کہ ان کی آنکھوں میں کبھی تکلیف ہی نہ تھی، آپ نے ان کو جھنڈا عطا فرمایا، حضرت علی نے کہا یا رسول اللہ! میں ان سے اس وقت تک قتال کرتا رہوں گا حتیٰ کہ وہ ہماری طرح (مسلمان) نہ ہو جائیں، آپ نے فرمایا اطمینان سے جانا، حتیٰ کہ تم ان کے علاقہ میں پہنچ جاؤ، پھر ان کو اسلام کی دعوت دینا، اور ان کو یہ بتانا کہ ان پر اللہ کا کیا حق واجب ہے، اللہ کی قسم! اللہ تمہارے سب سے کسی ایک شخص کو ہدایت دے دے تو وہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۷۰۱، ۳۰۰۹، صحیح مسلم فضائل الصحابہ: ۳۳ (۲۳۰۶) ۶۱۰۶، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۳۰۳، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۳۹۵)

۳۵۔ حضرت سعد بن ابی وقاص بنی شہ: بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں میری اس بیماری میں عیادت کی جس کی وجہ سے میں موت کے کنارے پہنچ گیا تھا، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ دیکھ رہے ہیں کہ مجھے کتنی تکلیف ہے! میں مال دار ہوں اور میری صرف ایک بیٹی ہے کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں! میں نے کہا کیا نصف مال صدقہ کر دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں، پھر آپ نے فرمایا تہائی مال صدقہ کرو، تہائی مال بہت ہے، اگر تم اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑو تو وہ اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو فقراء چھوڑو اور وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں، اور تم اللہ کی رضا جوئی کے

لیے جو خرچ بھی کرو گے تم کو اس میں اجر دیا جائے گا حتیٰ کہ تم جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں رکھو گے اس پر بھی اجر ملے گا، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میں اپنے احباب کے پیچھے رہ جاؤں گا۔ (یعنی حج کے بعد ان کے ساتھ مدینہ نہ جاسکوں گا؟) آپ نے فرمایا تم ہرگز پیچھے نہیں رہو گے، تم اللہ کی رضا جوئی کے لیے جو بھی کرو گے، تمہارے درجے اس سے زیادہ اور بلند ہوں گے اور شاید کہ تم بعد میں زندہ رہو اور تم سے ایک قوم کو فائدہ اور دوسری کو نقصان ہو، اے اللہ! میرے اصحاب کی ہجرت کو قائم رکھ اور ان کو ان کی ایڑیوں پر نہ لوٹا، لیکن سعد بن خولہ پر افسوس ہے، حضرت سعد نے کہا رسول اللہ ﷺ نے ان پر اس لیے افسوس کیا کہ وہ مکہ میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ (حضرت سعد رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد تک زندہ رہے انہوں نے ایران کو فتح کیا جس سے مسلمانوں کو نفع اور مجوسیوں کو نقصان ہوا)

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۴۰۹، صحیح مسلم الوصیۃ: ۵، (۱۶۲۸) ۲۱۳۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۸۶۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۲۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۰۸، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۲۲۶، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۶۳۵۳، مسند احمد ج ۱، ص ۱۷۹، ج ۳، ص ۳۶۵-۳۲۲)

۳۶- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ تم اس قوم سے جنگ نہ کرو جو بالوں والے چمڑے کی جوتیاں پہنیں گے اور حتیٰ کہ تم ترکوں سے قتال نہ کرو، جن کی آنکھیں چھوٹی ہوں گی اور ناک چھٹی ہوگی اور ان کے چہرے ہتھوڑوں سے کوئی ہوئی ڈھالوں کی مانند ہوں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۸۷، صحیح مسلم الفتن ۶۲ (۲۹۱۲) ۷۱۷۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۳۰۴، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۲۲۲۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۹۶، مسند احمد ج ۲، ص ۲۳۹، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۱۱۰۰، جامع الاصول ج ۱۰، رقم الحدیث: ۷۸۷۰) دو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۹۳، صحیح مسلم الفتن ۷۹ (۲۹۲۲) ۷۲۰۲، مسند احمد ج ۲، ص ۴۱۷)

۳۷- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے غزوہ ہند کا وعدہ کیا کہ اگر میں اس غزوہ کو پالوں تو میں اس میں اپنی جان اور مال کو خرچ کروں اگر میں اس میں شہید ہو گیا تو میں سب سے افضل شہید ہوں گا اور اگر میں لوٹ آیا تو میں جنم سے آزاد ہوں گا۔ (سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۷۳، ۳۱۷۴، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت)

۳۸- حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ تشریف لے گئے اور اہل احد پر نماز جنازہ پڑھی، پھر آپ منبر کی طرف مڑ گئے، (یعنی مسجد کی طرف تشریف لے گئے) آپ نے فرمایا میں تمہارا پیش رو ہوں، اور میں تم پر گواہ ہوں، اور بے شک اللہ کی قسم! میں اب بھی اپنے حوض کی طرف ضرور دیکھ رہا ہوں، اور بے شک مجھے تمام روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں عطا کی گئی ہیں، اور بیشک اللہ کی قسم! مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ میرے بعد تم (سب) مشرک ہو جاؤ گے البتہ مجھے یہ خوف ہے کہ میرے بعد تم دنیا میں رغبت کرو گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۳۳، صحیح مسلم الفتن: ۳۰ (۲۲۹۶) ۵۸۶۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۲۲۳، ۳۲۲۴، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۹۵۳)

۳۹- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جنگ بدر کے دن اہل جاہلیت کا فدیہ چار سو (درہم) مقرر کیا، اور حضرت عباس نے یہ دعویٰ کیا کہ ان کے پاس بالکل مال نہیں ہے، تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھا تو وہ مال کہاں

ہے جو تم نے اور ام الفضل نے مل کر دفن کیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ اگر میں اس مہم میں کام آ گیا تو یہ مال میرے ان بیٹوں کا ہے: الفضل، عبد اللہ اور قثم۔ حضرت عباس نے کہا اللہ کی قسم! مجھے اب یقین ہو گیا کہ آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں، اس بات کا میرے اور ام الفضل کے سوا کسی کو علم نہیں تھا۔ (سبل الہدیٰ والرشاد ج ۳، ص ۶۹، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

۵۰۔ امام ابن سعد، عبد اللہ بن حارث بن نوفل سے روایت کرتے ہیں کہ جب جنگ بدر کے دن نوفل کو قید کیا گیا تو نبی ﷺ نے ان سے فرمایا اپنی جان کے فدیہ میں وہ نیزہ دو جو جدہ میں ہے، انہوں نے کہا اللہ کی قسم! اللہ کے بعد میرے علاوہ کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ میرے پاس جدہ میں نیزہ ہے۔ (سبل الہدیٰ والرشاد ج ۳، ص ۶۹)

۵۱۔ عاصم بن زید السکونی بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاذ بن ابراہیم کو جب نبی ﷺ نے یمن کی طرف بھیجا، ان کے ساتھ نبی ﷺ بھی باہر نکلے، آپ ان کو وصیت فرما رہے تھے، حضرت معاذ سوار تھے اور نبی ﷺ ان کے ساتھ پیدل چل رہے تھے۔ جب آپ نصیحت سے فارغ ہوئے تو فرمایا اے معاذ! امید ہے کہ اس سال کے بعد تم مجھ سے ملاقات نہیں کرو گے اور شاید کہ تم میری مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزر دو، رسول اللہ ﷺ کی جدائی کے خیال سے حضرت معاذ رونے لگے، نبی ﷺ نے فرمایا اے معاذ مت روؤ کیونکہ (آواز سے) رونا شیطان کا کام ہے۔

(مسند احمد ج ۵، ص ۲۳۵، شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد ج ۱۶، رقم الحدیث: ۲۱۹۵۳، دلائل النبوت للسیوطی ج ۵، ص ۳۰۵-۳۰۴)

رسول اللہ ﷺ نے بالخصوص قیامت کے احوال کی جو خبریں دی ہیں، ان کے متعلق ہم نے متعدد کتب حدیث کے حوالہ جات سے چکیں احادیث بیان کی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے علم ماکان وما یكون کے متعلق ہم نے متعدد کتب حدیث کے حوالہ جات سے دس احادیث بیان کی ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے منجملہ غیب کی جو خبریں دی ہیں اس کے متعلق ہم نے متعدد کتب حدیث سے اکیاون احادیث بیان کی ہیں، سو آپ کے علم غیب کے متعلق یہ کل چھیالیس احادیث ہیں اور ہر ہر حدیث متعدد کتب حدیث کے حوالوں سے مزین ہے۔ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے علم غیب سے متعلق تمام احادیث کا احاطہ اور احصاء نہیں کیا اور طوالت کی وجہ سے بے شمار احادیث کو ترک کر دیا، اس سے قارئین کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو علم غیب عطا فرمایا تھا، وہ علم کا ایسا عظیم سمندر ہے جس کا تصور بھی ہم لوگ نہیں کر سکتے۔

رسول اللہ ﷺ سے یہ کہلوانے کی توجیہ کہ اگر میں غیب کو جانتا تو خیر کثیر جمع کر لیتا علامہ علی بن محمد خازن متوفی ۷۲۵ھ لکھتے ہیں:

اگر تم یہ اعتراض کرو کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے بکثرت واقعات کی خبر دی ہے اور یہ رسول اللہ ﷺ کے عظیم معجزوں میں سے ہے تو ان احادیث اور آیت کریمہ ”لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر“ (الاعراف: ۱۸۸) میں کیسے تطبیق ہوگی، تو میں کہوں گا کہ ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ سے بطور تواضع اور ادب یہ کلمات کہلوائے ہوں اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے مطلع اور قادر کے بغیر میں غیب کو نہیں جانتا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نبی ﷺ کو غیب پر مطلع کرنے سے پہلے یہ کلمات کہلوائے ہوں، پھر جب اللہ نے آپ کو مطلع کر دیا تو آپ نے غیب کی خبریں دیں، جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے: عالم الغیب فلا یظہر علی غیبہ احدہا الا من ارتضیٰ من رسول۔ (الجن: ۲۷-۲۶)

یا اس آیت میں کفار کے سوال کا جواب ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سارے معیبات پر مطلع فرمایا تو آپ نے ان کی

خبریں دی اور یہ آپ کا معجزہ ہو گیا اور آپ کی نبوت کی صحت پر دلیل۔ (باب التاویل للمازن ج ۲، ص ۱۶، مطبوعہ پشاور)
 علامہ سلیمان جمل متوفی ۱۲۰۳ھ اور علامہ آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ نے بھی ان جوابات کو ذکر کیا ہے۔ علامہ سلیمان نے ان
 جوابات کو اختیار کیا ہے اور علامہ آلوسی نے ان جوابات میں تامل کی دعوت دی ہے۔

(حاشیہ الجمل علی الجلالین ج ۲، ص ۲۱۷، روح المعانی ج ۹، ص ۱۳۷)

علامہ آلوسی کا مختار جواب یہ ہے کہ اس آیت میں علم غیب کے استمرار کی نفی ہے یعنی اگر میں ہمیشہ غیب کو جانتا ہوتا تو خیر

کثیر کو جمع کر لیتا۔ (روح المعانی ج ۹، ص ۱۳۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ نے یہ جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر علم کی نفی کرائی گئی ہے اور جن احادیث میں علم کا

ثبوت ہے وہ اللہ کے بتانے سے ہے۔ (نیم الریاض ج ۳، ص ۱۵۰، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ لکھتے ہیں:

یہ کلام براہ ادب و تواضع ہے، معنی یہ ہیں کہ میں اپنی ذات سے غیب نہیں جانتا جو جانتا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور اس کی
 اطلاع سے (خازن) حضرت مترجم (اعلیٰ حضرت) قدس سرہ نے فرمایا بھلائی جمع کرنا اور برائی نہ پہنچنا اسی کے اختیار میں ہو سکتا ہے،
 جو ذاتی قدرت رکھے اور ذاتی قدرت وہی رکھے گا جس کا علم بھی ذاتی ہو، کیونکہ جس کی ایک صفت ذاتی ہے تو اس کے تمام
 صفات ذاتی، تو معنی یہ ہوئے کہ اگر مجھے غیب کا علم ذاتی ہوتا، تو قدرت بھی ذاتی ہوتی اور میں بھلائی جمع کر لیتا اور برائی نہ پہنچنے دیتا،
 بھلائی سے مراد راحتیں اور کامیابیاں اور دشمنوں پر غلبہ ہے اور برائیوں سے مراد تنگی اور تکلیف اور دشمنوں کا غالب آنا ہے، یہ
 بھی ہو سکتا ہے کہ بھلائی سے مراد سرکشوں کا مطیع اور نافرمانوں کا فرمانبردار اور کافروں کا مومن کر لینا ہو، اور برائی سے بد بخت
 لوگوں کا باوجود دعوت کے محروم رہ جانا، تو حاصل کلام یہ ہو گا کہ اگر میں نفع اور ضرر کا ذاتی اختیار رکھتا تو اے منافقین و کافرین
 تمہیں سب کو مومن کر ڈالتا اور تمہاری کفری حالت دیکھنے کی تکلیف مجھے نہ پہنچتی۔

(خزائن العرفان علی حاشیہ کنز الایمان ص ۲۸۲، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور)

علماء دیوبند نے بھی اس سے ملتی جلتی اس آیت کی تفسیر کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب کہنے اور آپ کی طرف علم غیب کی نسبت کرنے میں
 علماء دیوبند کا نظریہ

مفتی محمد شفیع دیوبندی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس آیت میں آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ اس کا اعلان کر دیں کہ میں اپنے نفس کے لیے بھی نفع نقصان کا
 مالک نہیں، دوسروں کے نفع نقصان کا تو کیا ذکر ہے۔

اسی طرح یہ بھی اعلان کر دیں کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ہر چیز کا علم ہونا میرے لیے ضروری ہو، اور اگر مجھے علم غیب
 ہوتا تو میں ہر نفع کی چیز کو ضرور حاصل کر لیا کرتا اور کوئی نفع میرے ہاتھ سے فوت نہ ہوتا۔ اور ہر نقصان کی چیز سے ہمیشہ محفوظ ہی
 رہتا اور کبھی کوئی نقصان مجھے نہ پہنچتا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں نہیں ہیں، بہت سے کام ایسے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو
 حاصل کرنا چاہا مگر حاصل نہیں ہوئے اور بہت سی تکلیفیں اور مضرتیں ایسی ہیں جن سے آنحضرت ﷺ نے بچنے کا ارادہ کیا مگر وہ
 مضرت و تکلیف پہنچ گئی۔ غزوہ حدیبیہ کے موقع پر آپ صحابہ کرام کے ساتھ احرام باندھ کر عمرہ کا ارادہ کر کے حدود حرم تک پہنچ
 گئے مگر حرم میں داخلہ اور عمرہ کی ادائیگی اس وقت نہ ہو سکی سب کو احرام کھول کر واپس ہونا پڑا۔

اسی طرح غزوة احد میں آنحضرت ﷺ کو زخم پہنچا اور مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی، اسی طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو آنحضرت ﷺ کی زندگی میں معروف و مشہور ہیں۔

اور شاید ایسے واقعات کے ظاہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہو کہ لوگوں پر عملایہ بات واضح کر دی جائے کہ انبیاء علیہم السلام اگرچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقبول اور افضل خلاق ہیں مگر پھر بھی وہ خدائی علم و قدرت کے مالک نہیں تاکہ لوگ اس غلط فہمی کے شکار نہ ہو جائیں جس میں عیسائی اور نصرانی مبتلا ہو گئے کہ اپنے رسول کو خدائی صفات کا مالک سمجھ بیٹھے اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو گئے۔

اس آیت نے بھی یہ واضح کر دیا کہ انبیاء علیہم السلام نہ قادر مطلق ہوتے ہیں نہ عالم الغیب بلکہ ان کو علم و قدرت کا اتنا ہی حصہ حاصل ہوتا ہے جتنا من جانب اللہ ان کو دے دیا جائے۔

ہاں اس میں شک و شبہ نہیں کہ جو حصہ علم کا ان کو عطا ہوتا ہے وہ ساری مخلوقات سے بڑھا ہوا ہوتا ہے خصوصاً ہمارے رسول کریم ﷺ کو اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا گیا تھا۔ یعنی تمام انبیاء علیہم السلام کو جتنا علم دیا گیا تھا وہ سب اور اس سے بھی زیادہ آپ کو عطا فرمایا گیا تھا۔ اور اسی عطا شدہ علم کے مطابق آپ نے ہزاروں غیب کی باتوں کی خبریں دیں جن کی سچائی کا ہر عام و خاص نے مشاہدہ کیا۔ اس کی وجہ سے یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو ہزاروں لاکھوں غیب کی چیزوں کا علم عطا کیا گیا تھا، مگر اس کو اصطلاح قرآن میں علم غیب نہیں کہہ سکتے اور اس کی وجہ سے رسول کو عالم الغیب نہیں کہا جاسکتا۔

(معارف القرآن ج ۴، ص ۱۳۸-۱۳۷، مطبوعہ ادارۃ المعارف، کراچی ۱۹۹۳ء)

اس کی مزید وضاحت اس تفسیر سے ہوتی ہے جو شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ نے التمل: ۶۵ میں سپرد قلم کی ہے۔

ہاں بعض بندوں کو بعض غیب پر با اختیار خود مطلع کر دیتا ہے جس کی وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص کو حق تعالیٰ نے غیب پر مطلع فرمایا یا غیب کی خبر دے دی، لیکن اتنی بات کی وجہ سے قرآن و سنت نے کسی جگہ ایسے شخص پر عالم الغیب یا فلان - علم الغیب کا اطلاق نہیں کیا۔ بلکہ احادیث میں اس پر انکار کیا گیا ہے کیونکہ بظاہر یہ الفاظ اختصاص علم الغیب بذات الباری کے خلاف موہم ہوتے ہیں، اس لیے علماء محققین اجازت نہیں دیتے کہ اس طرح کے الفاظ کسی بندہ پر اطلاق کیے جائیں۔ گو لغت صحیح ہوں (الی قولہ) واضح رہے کہ علم غیب سے ہماری مراد محض ظنون و تخمینات نہیں اور نہ وہ علم جو قرآن و دلائل سے حاصل کیا جائے بلکہ جس کے لیے کوئی دلیل و قرینہ نہ ہو وہ مراد ہے۔ اور الاعراف: ۱۸۸ کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں: بہر حال اس آیت میں کھول کر بتلادیا کہ اختیار مستقل یا علم محیط نبوت کے لوازم میں سے نہیں جیسا کہ بعض جملاء سمجھتے ہیں۔ ہاں شریعت کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے کامل ہونا چاہیے اور تکوینات کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں ہمارے حضور تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ کو اتنے بے شمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا احصاء کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔

ہمارے نزدیک بھی نبی ﷺ کو باوجود عالم ماکان و مایکون ہونے کے عالم الغیب کہنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح مطلقاً یوں نہیں کہنا چاہیے کہ نبی ﷺ غیب جانتے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ نبی ﷺ کو غیب کا علم دیا گیا یا نبی ﷺ کو غیب پر مطلع کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب کہنے اور آپ کی طرف علم غیب کی نسبت کرنے میں اعلیٰ حضرت کا نظریہ

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا متوفی ۱۳۴۰ھ لکھتے ہیں:

علم غیب عطا ہونا اور لفظ عالم الغیب کا اطلاق اور بعض اجلہ اکابر کے کلام میں اگرچہ بندہ مومن کی نسبت صریح لفظ -علم الغیب وارد ہے کما فی مرآة الفاتح شرح مشکوٰۃ المصابیح للملا علی القاری بلکہ خود حدیث سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سیدنا خضر علیہ الصلاۃ والسلام کی نسبت ارشاد ہے کان یعلم علم الغیب مگر ہماری تحقیق میں لفظ عالم الغیب کا اطلاق حضرت عزت عز جلالہ کے ساتھ خاص ہے کہ اس سے عرفاً علم بالذات متبادر ہے۔ کشاف میں ہے المراد به الخفی الذی لا ینفذ فیہ ابتداء العلم اللطیف الخبیر ولہذا لا یجوز ان یطلق فیقال فلان یعلم الغیب (غیب سے مراد وہ پوشیدہ چیز ہے جس میں ابتدا صرف اللہ تعالیٰ کا علم نافذ ہوتا ہے۔ اس لیے مطلقاً یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ فلاں شخص غیب کو جانتا ہے)

اور اس سے انکار معنی لازم نہیں آتا۔ حضور اقدس ﷺ قطعاً بے شمار غیوب و ماکان و مایکون کے عالم ہیں مگر عالم الغیب صرف اللہ عزوجل کو کہا جائے گا، جس طرح حضور اقدس ﷺ قطعاً عزت و جلالت والے ہیں تمام عالم میں ان کے برابر کوئی عزیز و جلیل نہ ہے نہ ہو سکتا ہے مگر محمد عزوجل کہنا جائز نہیں بلکہ اللہ عزوجل و محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ غرض صدق و صورت معنی کو جو از اطلاق لفظ لازم نہیں نہ منع اطلاق لفظ کو نفی صحت معنی، امام ابن المیر اسکندری کتاب الانتصاف میں فرماتے ہیں کم من معتقد لا یطلق القول به خشية ايهاام غیرہ مسا لا یجوز اعتقاده فلا ربط بین الاعتقاد و الاطلاق (کتنے عقائد ایسے ہیں جن کا مطلقاً قول نہیں کیا جاتا۔ مبادا ان کے غیر کا وہم کیا جائے جن کا اعتقاد جائز نہیں ہے، اس لیے کسی چیز کا اعتقاد رکھنے اور اس کا اطلاق کرنے میں کوئی تلازم نہیں ہے) یہ سب اس صورت میں ہے کہ مقید بقید اطلاق اطلاق کیا جائے یا بلا قید علی الاطلاق مثلاً عالم الغیب یا عالم الغیب علی الاطلاق اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ بالواسطہ یا بالعطا کی تصریح کر دی جائے تو وہ محذور نہیں کہ ایہام زائل اور مراد حاصل۔ علامہ سید شریف قدس سرہ حواشی کشاف میں فرماتے ہیں و انما لم یجز الاطلاق فی غیرہ تعالیٰ لانه یتبادر منه تعلق علم به ابتداء فیکون مناقضا و اما اذا قید وقیل اعلمہ اللہ تعالیٰ الغیب او اطلعه علیہ فلا محذور فیہ (اللہ تعالیٰ کے غیر کے لیے علم غیب کا اطلاق کرنا اس لیے جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے متبادر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ علم کا تعلق ابتداء ہے، تو یہ قرآن مجید کے خلاف ہو جائے گا لیکن جب اس کو مقید کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے غیب کی خبر دی ہے یا اس کو غیب پر مطلع فرمایا ہے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے)۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۹، ص ۸۱، مطبوعہ دارالعلوم امجدیہ، کراچی)

نیز اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فرماتے ہیں:

علم مانی الغد (کل کا علم) کے بارہ میں ام المؤمنین کا قول ہے کہ جو یہ کہے کہ حضور کو علم مانی الغد تھا (کل کا علم تھا) وہ جھوٹا ہے۔ اس سے مطلق علم کا انکار نکالنا محض جمالت ہے علم جب کہ مطلق بولا جائے خصوصاً جب کہ غیب کی خبر کی طرف مضاف ہو تو اس سے مراد علم ذاتی ہوتا ہے۔ اس کی تصریح حاشیہ کشاف پر میر سید شریف رحمۃ اللہ علیہ نے کر دی ہے اور یہ یقیناً حق ہے کہ کوئی شخص کسی مخلوق کے لیے ایک ذرہ کا بھی علم ذاتی مانے یقیناً کافر ہے۔

(ملفوظات ج ۳، ص ۳۴، مطبوعہ مدینہ و بلیٹنگ کمپنی، کراچی)

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور شیخ شبیر احمد عثمانی دونوں نے ہی یہ تصریح کی ہے کہ علوم اولین و آخرین کے حامل ہونے اور بکثرت غیوب پر مطلع ہونے کے باوجود نبی ﷺ کو عالم الغیب کہنا اور آپ کی طرف علم غیب کی نسبت کرنا ہر چند کہ از روئے لغت اور معنی صحیح ہے لیکن اصطلاحاً صحیح نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا

وہ (اللہ ہی) ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر اسی سے اس کی بیوی بنا کر

لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشَّيْهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيًّا فَهَمَزَتْ بِهِ

تا کہ وہ اس سکون حاصل کرے، پھر مرد نے جب اسے ڈھانپ لیا تو اسے خفیف حامل ہو گیا وہ اس کے ساتھ چل پھر رہی

فَلَمَّا أَثْقَلَتْ دَعَا اللَّهُ رَبَّهُمَا لِيَنْزِلَ إِلَيْنَا مَالًا نَكُونُ

مخفی، پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے اللہ سے دعا کی جو ان کا پروردگار ہے کہ اگر تو نے ہمیں صحیح وسالم بیٹا دیا تو ہم ضرور

مِنَ الشَّاكِرِينَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّا آتَاهُمَا مَالًا جَعَلَ لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا

شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے ○ پس جب اللہ نے انہیں صحیح وسالم بیٹا دے دیا تو انہوں نے اس کی عطا میں اس کے شریک

آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿۱۹۰﴾ أَيْشُرِكُونَ مَا لَا يَخْلُقُ

ٹھیرا لے، سو اللہ اس سے بلند ہے جس میں وہ شریک کرتے ہیں ○ کیا یہ ان کو شریک قرار دیتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں

شَيْئًا وَهُمْ يَخْلُقُونَ ﴿۱۹۱﴾ وَلَا يَسْتَطِيعُونَ لَهُمْ نَصْرًا وَلَا أَنْفُسَهُمْ

کر سکتے اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں ○ اور وہ ان (شرکین) کے لیے کسی مدد کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ خود اپنی مدد

يَنْصُرُونَ ﴿۱۹۲﴾ وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَتَّبِعُوكُمْ سَوَاءٌ

کر سکتے ہیں ○ اور (لئے مشرکوں) اگر تم ان بتوں کو ہدایت کے حصول کے لیے پکارو تو وہ تمہارے پیچھے نہ آئیں گے سوائے

عَلَيْكُمْ أَدْعُوهُمْ أَمْ أَنْتُمْ مُّصَابِقُونَ ﴿۱۹۳﴾ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ

یہ برابر سے کہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو ○ بیجا اللہ کو چھوڑ کر

مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادًا أَمْثَلُكُمْ فَاذْعُوكُمْ فَلَيْسَتْ حَيَاتِكُمْ

تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تمہاری طرح بندے ہیں تو تم ان کو پکارو اور پھر چاہیے کہ وہ تمہاری پکار کا جواب دیں

إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۹۴﴾ اللَّهُمَّ ارْجُلُ يَمْشُونَ بِهَا أَمْ لَكُمْ أَيْدٍ

اگر تم سچے ہو ○ کیا ان کے پیر ہیں جن سے وہ چل سکیں یا ان کے ہاتھ ہیں

يُطِشُونَ بِهَا زَمْرَهُمْ أَعْيُنٌ يُّبْصِرُونَ بِهَا زَمْرَهُمْ أَذَانٌ

جن سے وہ پکڑ سکیں ، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھ سکیں ، یا ان کے کان ہیں

يَسْمَعُونَ بِهَا قُلُوبًا ادْعُوا شُرَكَاءَ كُمُ ثُمَّ كِيدُوا فَلَا تَنْظُرُونَ

جن سے وہ سن سکیں ، آپ کیسے کہ تم اپنے شرکاء کو بلاؤ اور پھر اپنی تدبیر مجھ پر آزماؤ اور اس کے بعد مجھے (بالکل) مہلت مت دو

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہ (اللہ ہی) ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پھر اسی سے اس کی بیوی بنائی تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے پھر جب مرد نے اسے ڈھانپ لیا تو اسے خفیف ساحل ہو گیا وہ اسی کے ساتھ چل پھر رہی تھی پھر جب وہ بو جھل ہو گئی تو دونوں نے اللہ سے دعا کی جو ان کا پروردگار ہے کہ اگر تو نے ہمیں صحیح و سالم بنا دیا تو ہم ضرور شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے پس جب اللہ نے انہیں صحیح و سالم بنا دے دیا تو انہوں نے اس کی عطا میں شریک ٹھہرا لیے سو اللہ اس سے بلند ہے جس میں وہ شرک کرتے ہیں (الاعراف: ۱۹۰-۱۸۹)

ان روایات کی تحقیق جن میں مذکور ہے کہ حضرت آدم اور حوا نے اپنے بیٹے کا نام عبد الحارث رکھا

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت سمہ بن جندب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جب حوا حاملہ ہو گئی تو ان کے پاس ابلیس گیا حوا کا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا ابلیس نے ان سے کہا تم اس کا نام عبد الحارث رکھ دو انہوں نے اس کا نام عبد الحارث رکھ دیا پھر وہ بچہ زندہ رہا یہ کام شیطان کے دوسرے سے تھا۔ امام عبد الرزاق نے قتادہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے نام رکھنے میں شرک کیا تھا عبادت میں شرک نہیں کیا تھا۔

(تفسیر امام عبد الرزاق رقم الحدیث: ۹۶۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۸۸، مسند احمد ج ۷، رقم الحدیث: ۲۰۱۳، المستدرک ج ۲، ص ۵۲۵، الدر المنثور ج ۳، ص ۲۶۳)

امام ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث صرف عمر بن ابراہیم از قتادہ کی سند سے مروی ہے۔ اور اس کی روایت لائق احتجاج نہیں ہے۔

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

امام احمد نے کہا ہے اس نے قتادہ سے منکر احادیث روایت کی ہیں۔ امام ابن عدی نے کہا اس نے قتادہ سے ایسی احادیث روایت کیں ہیں جن میں اس کی کوئی موافقت نہیں کرتا۔ امام ابن حبان نے اس کا ضعف میں شمار کیا اور کہا جب یہ قتادہ سے روایت میں مفرد ہو تو اس کی روایت سے استدلال نہیں کیا جائے گا۔

(تہذیب التہذیب ج ۷، ص ۳۵۹، رقم الحدیث: ۵۰۳۰، تہذیب الکمال رقم الحدیث: ۲۲۰۰، لسان المیزان ج ۳، رقم الحدیث: ۱۹۵۹)

حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر متوفی ۷۷۴ھ اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں:

یہ روایت اہل کتاب کے آثار سے ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ سے یہ حدیث صحیح ہے کہ جب اہل کتاب تم سے حدیث

بیان کریں تو تم ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب کرو اور اہل کتاب کی روایات کی تین قسمیں ہیں، بعض وہ ہیں جن کا صحیح ہونا ہمیں کتاب اور سنت سے معلوم ہے۔ بعض وہ ہیں جن کا کذب ہمیں کتاب اور سنت سے معلوم ہے۔ (مثلاً حضرت عیسیٰ کو یہود کا سولی پر لٹکانا) اور بعض وہ ہیں جن کا صدق یا کذب متعین نہیں ہے۔ اور اس روایت کا کذب ہمیں معلوم ہے کیونکہ اگر دونوں میاں بیوی سے مراد حضرت آدم اور حوا ہوں تو لازم آئے گا کہ وہ دونوں مشرک ہوں کیونکہ اس سے اگلی آیت میں ہے پس جب اللہ نے انہیں صحیح و سالم بنادے دیا تو انہوں نے اس کی عطا میں شریک ٹھہرا لیے اور حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں اور معصوم ہیں ان کا شرک کرنا عادتہً محال ہے، اور امام عبدالرزاق کی روایت کلبی سے ہے اور اس کا حال سب کو معلوم ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۲۶۵، مطبوعہ دارالاندلس بیروت ۱۳۸۵ھ)

امام ابن جریر متوفی ۳۱۰ھ اور امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ نے اپنی اپنی سندوں سے روایت کیا ہے:

سعید بن جبیر بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت آدم اور حوا کو زمین پر اتارا گیا تو حضرت آدم کی طبیعت میں شہوت ڈال دی گئی اور انہوں نے حضرت حوا سے عمل زوجیت کیا، جس کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہو گئیں اور ان کے پیٹ میں بچہ حرکت کرنے لگا اور وہ سوچتی تھیں کہ یہ کیا چیز ہے؟ ان کے پاس ابلیس گیا اور کہنے لگا تم نے زمین پر اونٹنی گائے، بکری، دنبہ اور بھیڑ کو دیکھا ہے؟ ہو سکتا ہے تمہارے پیٹ سے ایسی ہی کوئی چیز نکلے، حضرت حوا یہ سن کر گھبرا گئیں، اس نے کہا میری بات مان لو، اس کا نام عبدالحارث رکھو تو پھر تمہارے مشابہ بچہ پیدا ہو گا۔ حواء نے حضرت آدم علیہ السلام سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ حضرت آدم نے فرمایا یہ وہ شخص ہے جس نے ہم کو جنت سے نکلوایا تھا، وہ بچہ مر گیا، حضرت حوا دوبارہ حاملہ ہوئیں ابلیس پھر ان کے پاس گیا اور کہا میری بات مان لو اس کا نام عبدالحارث رکھو، اور ابلیس کا نام فرشتوں میں حارث تھا، اس نے کہا ورنہ کوئی اونٹنی یا گائے یا بکری یا بھیڑ پیدا ہوگی یا تمہارے مشابہ بچہ ہو تو میں اس کو مار دوں گا جیسے میں نے پہلے بچہ کو مار دیا تھا۔ حواء نے اس واقعہ کا حضرت آدم سے ذکر کیا انہوں نے گویا اس پر ناگواری ظاہر نہیں کی، تو حواء نے اس بچہ کا نام عبدالحارث رکھ دیا۔ سعید بن جبیر نے ان آیات کا مصداق حضرت آدم اور حوا کو قرار دیا ہے۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۱۹۳، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۶۳۲، الدر المنثور ج ۳، ص ۶۲۴)

یہ روایت بھی باطل ہے۔ کیونکہ حضرت آدم نے اگر اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث بہ طور علم رکھا تھا اور اس کے لفظی معنی کا لحاظ نہیں کیا تھا تو پھر یہ نام رکھنا شرک نہ ہوا کیونکہ اسماء اعلام میں الفاظ کے معانی امید کا اعتبار نہیں ہوتا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کو ان آیات کا مصداق قرار دینا صحیح نہ ہو اور اگر حضرت آدم نے اپنے بیٹے کا نام عبدالحارث بہ طور صفت رکھا تھا تو پھر یہ شرک ہے اور حضرت آدم علیہ السلام نبی معصوم ہیں ان سے شرک کیسے متصور ہو سکتا ہے یہ کیوں کر متصور ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنے بیٹے کو ابلیس کا بندہ قرار دیں۔

جعلاً لہ شرکاء (انہوں نے اللہ کے شریک بنا لیے) کی توجیہات

اب پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں ہے تو دونوں نے اللہ سے دعا کی نیز دوسری روایت میں ہے جب اللہ نے انہیں صحیح و سالم بنادے دیا تو انہوں نے اس کی عطا میں شریک ٹھہرا لیے یہ دعا کرنے والے اور شریک ٹھہرانے والے کون تھے؟ مفسرین کرام نے ان آیات کی حسب ذیل توجیہات کی ہیں:

۱۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا جہل اور ان کا شرک بیان فرمایا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تم میں سے ہر شخص کو پیدا کیا ہے، اور اسی کی جنس سے اس کی بیوی بنائی اور جب شوہر نے اپنے بیوی سے عمل زوجیت کر لیا اور وہ حاملہ ہو گئی تو دونوں

میاں اور بیوی نے اللہ سے دعا کی، جو ان کا رب ہے کہ اگر تو نے ہمیں صحیح و سالم بیٹا دیا تو ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہو جائیں گے اور جب اللہ تعالیٰ نے انہیں صحیح و سالم بیٹا دے دیا تو وہ اللہ کی دی ہوئی نعمت میں شرک کرنے لگے۔ دہریے کہتے ہیں کہ بچہ کا اس طرح پیدا ہونا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے۔ ستارہ پرست کہتے ہیں کہ یہ ستاروں کی چال اور ان کی تاثیر سے پیدا ہوا اور بت پرست یہ کہتے ہیں کہ یہ ان کے بتوں اور دیوی دیوتاؤں کی دین ہے۔ اور یہ لوگ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ فطرت ہو یا ستارے، بت ہوں یا دیوی اور دیوتا، سب کا پیدا کرنے والا اللہ ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اسی نے اولاد کو بھی پیدا کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں اسی نے بیٹا دیا، حضرت زکریا جب بڑھاپے میں اولاد سے ناامید ہو چکے تھے تو انہوں نے اسی کو پکارا اور اسی سے دعا کرنے کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کی بوڑھی اور بانجھ بیوی کو فرزند عطا کیا۔ سو اولاد کی طلب کے لیے اسی کے آستانہ پر سر جھکانا چاہیے اور اولاد پانے کے بعد اسی کا شکر ادا کرنا چاہیے، البتہ اولاد کی طلب کے لیے نیک لوگوں اور بزرگوں سے دعا کرنا جائز ہے اور ان کے وسیلہ سے دعا مانگنا بھی جائز ہے۔

طلب اولاد کے لیے اگر نذر مانی ہو تو اللہ کی عبادت مقصودہ کی نذر مانی جائے، نذر عبادت ہے اس لیے کسی ولی یا بزرگ کی نذر ماننا جائز نہیں ہے، اگر کسی بزرگ کی دعا سے اولاد ہو یا ان کے وسیلہ کے ساتھ دعا کرنے سے اولاد ہو، تب بھی اللہ کا شکر ادا کرے اور یوں کہے کہ فلاں بزرگ کے وسیلہ سے یا ان کی دعا سے اولاد ہوئی، اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ اللہ کے عطا کرنے سے اولاد ہوئی ہے اور فلاں بزرگ وسیلہ ہیں، اور یوں کہے کہ فلاں بزرگ نے اولاد عطا کی ہے تو یہ سبب کی طرف نسبت ہونے کی وجہ سے شرک نہیں ہے لیکن افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ اس مجازی نسبت کا ذکر کرنے کی بجائے حقیقی نسبت کا ذکر کرے اور اللہ تعالیٰ ہی کا شکر ادا کرے جس نے اس بزرگ کی دعا قبول فرمائی اور جائز حد تک اس بزرگ کی بھی تعظیم کرے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۸۱۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۶۱، مسند احمد ج ۲، ص ۲۵۸، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۳۰۲۵، مجمع الزوائد

ج ۵، ص ۲۱۷)

۲- اس آیت میں ان قریش سے خطاب ہے جو رسول اللہ ﷺ کے عہد میں تھے، اور وہ قصی کی اولاد تھے، اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو ایک نفس یعنی قصی سے پیدا کیا اور اس کی جنس سے اس کی بیوی عمریہ قریشیہ بنائی تاکہ وہ اس سے سکون حاصل کرے اور جب اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کے موافق ان کو صحیح و سالم بیٹا عطا فرمایا تو ان دونوں میاں بیوی نے اس کی دی ہوئی نعمت میں اللہ تعالیٰ کے شریک گھڑ لیے اور انہوں نے اپنے چار بیٹوں کے یہ نام رکھے۔ عبدمناف، عبد العزیٰ، عبد قصی اور عبد اللات اور اس کے بعد ان کے متبعین کے متعلق فرمایا سو اللہ اس سے بلند ہے جس میں وہ شرک کرتے ہیں۔

۳- اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ آیات حضرت آدم اور حواء کے متعلق ہیں تو یہ آیتیں مشرکین کے رد میں نازل ہوئی ہیں اور اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہاں ہمزہ استفہام کا مقدر ہے یعنی اجعل لہ شرکاء اور ان آیتوں کا معنی اس طرح ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حواء کی دعا کے موافق ان کو صحیح و سالم بیٹا عطا کر دیا تو کیا انہوں نے اللہ کے شریک گھڑ لیے تھے؟ تو اے مشرک! تم کیوں اللہ کے لیے شریک گھڑتے ہو؟ اور اللہ اس چیز سے بلند ہے جس میں یہ مشرک اللہ کے لیے شریک بناتے ہیں۔

۴- اس صورت میں دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں جعلا کا فاعل اولاد ہما ہے اور مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کا قائم

مقام کر دیا جو جلا میں ضمیر فاعل ہے اور معنی اس طرح ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم اور حواء کی دعا کے موافق ان کو صحیح و سالم بیٹا دیا تو ان کی اولاد نے اللہ کی دی ہوئی نعمت میں شریک گھڑ لیے۔

۵- قتادہ نے حسن سے روایت کیا ہے کہ یہ آیتیں یہود اور نصاریٰ سے متعلق ہیں یعنی جب اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کی دعا کے موافق صحیح و سالم بیٹا دے دیا تو انہوں نے اس اولاد کو یہود و نصاریٰ بنا دیا اور یوں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا۔

(جامع البیان جز ۹، ص ۱۹۷، زاد المسیر ج ۳، ص ۳۰۳)

۶- حوا ہر مرتبہ ایک مذکر اور ایک مؤنث دو بچے جنتی تھیں اور جلا کا فاعل یہ دو بچے ہیں۔ یعنی جب ان کی دعا سے حضرت حوا کے دو صحیح و سالم بچے ہو گئے تو ان بچوں نے بڑے ہو کر اللہ کے شریک بنا لیے یا پھر ان کی اولاد در اولاد نے۔

(زاد المسیر ج ۳، ص ۳۰۳، مطبوعہ المکتب الاسلامی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

غلط طریقہ سے نام لینے اور نام بگاڑنے کی مذمت

بعض تفاسیر کے مطابق ان آیتوں میں شرک فی التسمیہ (نام رکھنے میں شرک) کی مذمت فرمائی ہے۔ یعنی عبد الحارث، عبد العزیٰ، عبد اللات وغیرہ نام رکھنا شرک ہیں۔ اور عبد اللہ اور عبد الرحمن ایسے نام رکھنے چاہئیں۔ ہمارے زمانہ میں نام کے سلسلہ میں بہت فروگزاشت پائی جاتی ہے بعض لوگ اپنے بچے کا نام عبد الرحمن یا عبد الخالق رکھتے ہیں اور لوگ اس کو رحمن صاحب خالق صاحب کہتے ہیں۔ کسی کا نام عبد الغفور ہوتا ہے اس کو لوگ غفورا، غفور کہتے ہیں۔ کسی کا نام انعام الہی ہوتا ہے اور لوگ اس کو الہی صاحب کہتے ہیں یہ بڑھے لکھے لوگوں کا حال ہے اور پنجاب میں جو ان پڑھ لوگ ہیں وہ غلام محمد کو گاما اور غلام رسول کو سولا کہتے ہیں اور جس کا نام کنیز فاطمہ ہو اس کو بھتو کہتے ہیں۔ یہ نام تو صحیح اور مستحب ہیں لیکن ان ناموں کو غلط طریقہ سے پکارنے والے سخت بے ادبی اور گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَسَابُرُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقِ
بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ فَأُولَئِكَ هُمُ
الظَّالِمُونَ (الحجرات ۱۱)

اور ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ بلاؤ کیسا برا نام
ہے ایمان کے بعد فاسق کہلانا اور جو لوگ توبہ نہ کریں سو وہی
لوگ ظلم کرنے والے ہیں۔

بچوں کا نام رکھنے کی تحقیق

دوسری بڑی خرابی نام رکھنے کے سلسلہ میں ہے لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ نام رکھنے میں انفرادیت ہو اور ان کو یہ شوق ہوتا ہے کہ ان کے بچے کا نام نیا اور اچھوتا ہو۔ خواہ اس کا مطلب، معنی کچھ نہ ہو۔ اس کی ایک عام مثال یہ ہے کہ لوگ شرجیل نام رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ مہمل لفظ ہے اصل لفظ شرجیل ہے۔ اسی طرح بچی کا نام ثوبیہ رکھتے ہیں یہ بھی مہمل لفظ ہے اصل لفظ ثوبیہ ہے۔ بہترین نام عبد اللہ اور امتہ اللہ ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ نام رکھنے کے سلسلہ میں نبی ﷺ نے جو ہدایات دیں ان پر مشتمل احادیث کو یہاں بیان کر دیں۔

پسندیدہ اور ناپسندیدہ ناموں کے متعلق احادیث

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کے نزدیک تمہارے سب سے پسندیدہ نام عبد اللہ اور عبد الرحمن ہیں۔

(صحیح مسلم الآداب ۲ (۲۱۳۲) ۵۲۸۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۸۳۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۲۸)

حضرت زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میرا نام برہ (نیوکار) رکھا گیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم

تبیان القرآن

جلد چہارم

اپنی پاکیزگی اور بڑائی مت بیان کرو، اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ تم میں سے کون نیکو کار ہے۔ صحابہ نے پوچھا ہم ان کا کیا نام رکھیں؟ آپ نے فرمایا اس کا نام زینب رکھو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۹۲، صحیح مسلم الاداب ۱۹ (۲۱۳۲) ۵۵۰۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۳۲)

جن اسماء سے صاحب اسم کی پاکیزگی اور بڑائی ظاہر ہوتی ہو ایسے نام رکھنا ناپسندیدہ اور مکروہ ہیں، جیسے آج کل لوگ نام رکھتے ہیں شمس الزمان، شمس الہدی، اعظم خان، اکبر خان وغیرہ۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ شمس الدین اور محی الدین نام رکھنا ممنوع ہے اس میں خود ستائی کے علاوہ جھوٹ بھی ہے۔ علامہ قرطبی مالکی نے بھی ایسے ناموں کو ممنوع لکھا ہے اور علامہ نووی شافعی نے مکروہ لکھا ہے۔ (رد المحتار ج ۵، ص ۲۶۸)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر کی بیٹی کا نام عاصیہ (گنہ کرنے والی) تھا۔ نبی ﷺ نے ان کا نام بدل کر جمیلہ رکھ دیا۔

(صحیح مسلم الاداب ۱۵ (۲۱۳۹) ۵۵۰۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۹۵۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۸۳۷، سنن

ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۳۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی ﷺ برے ناموں کو تبدیل کر دیتے تھے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۸۳۸، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

شریح بن ہانی اپنے والد بنی شہزادہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کے ساتھ وفد میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے قوم سے سنا کہ وہ ان کی کنیت ابوالحکم کے ساتھ ان کو پکارتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بلا کر فرمایا بے شک اللہ ہی حکم ہے اور اسی کی طرف مقدمات پیش کیے جاتے ہیں تم نے اپنی کنیت ابوالحکم کیوں رکھی ہے؟ انہوں نے کہا میری قوم کا جب کسی معاملہ میں اختلاف ہوتا ہے تو وہ میرے پاس آتے ہیں اور میں ان کے درمیان حکم دیتا ہوں (فیصلہ کرتا ہوں) تو میرے حکم پر دونوں فریق راضی ہو جاتے ہیں (سو اس لیے میری کنیت ابوالحکم ہے یعنی حکم دینے والا) آپ نے فرمایا یہ اچھا نہیں ہے، تمہارے بیٹے ہیں؟ شریح نے کہا میرے تین بیٹے ہیں۔ شریح، مسلم اور عبد اللہ۔ آپ نے پوچھا ان میں سے بڑا کون ہے؟ میں نے کہا شریح، آپ نے فرمایا پس تم ابو شریح (شریح والا) ہو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۹۵۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۳۸۷)

اللہ کے اسماء صفات کی طرف اب کی اضافت کر کے کنیت رکھنا ممنوع ہے تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ یہ شخص اللہ کی صفت والا ہے جیسے کوئی شخص ابو الغفور، ابو الرحیم یا ابو الاعلیٰ کنیت رکھ لے۔

عبدالنبی نام رکھنے کا شرعی حکم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے میرا عبد (بندہ) اور میری بندی، تم سب اللہ کے عبد ہو اور تمہاری عورتیں اللہ کی بندی ہیں۔ لیکن تم کو کہنا چاہیے میرا غلام اور میری باندی یا میرا نوکر اور میری نوکرانی۔

(صحیح مسلم الفاظ الادب ۱۳ (۲۲۳۹) ۲۷۶۵، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۵۵۲، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث:

۱۰۰۷۰، مسند احمد ج ۲، ص ۴۴۴)

کسی شخص کا اپنے مملوک کو میرا عبد کہنا خلاف اولیٰ یا مکروہ تنزیہی ہے، حرام نہیں ہے۔ کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اس کا

مملوک اللہ کا عبد ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے، اب اگر اس کا مالک بھی اس کو اپنا عبد کہے تو اس میں شرک کی مشابہت کا خدشہ ہے، لہذا اس سے احتراز کے لیے اولیٰ ہے کہ اس کو میرا نوکر اور میرا خادم کہے، اور یہ حرام اس لیے نہیں ہے کہ قرآن مجید میں مالک کی طرف عبد کی اضافت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ (النور: ۳۲)

اور تم اپنے بے نکاح (آزاد) مردوں اور عورتوں کا اپنے نیک عباد (غلاموں) اور باندیوں سے نکاح کر دو۔

اسی طرح احادیث میں بھی عبد کی اضافت مسلمان کی طرف کی گئی ہے۔

عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ ﷺ قال لیس علی المسلم فی عبده ولا فی فرسہ صدقۃ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان کے عبد اور اس کے گھوڑے میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۶۳، صحیح مسلم زکوٰۃ ۸، (۹۸۲) ۲۲۳۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۹۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۶۲۸، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۳۶۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۸۱۲)

علامہ ابن بطلان نے کہا کہ اس آیت کی رو سے کسی شخص کا اپنے غلام کو میرا عبد کہنا جائز ہے اور احادیث میں ممانعت تغلیظ کے لیے ہے تحریم کے لیے نہیں، اور یہ مکروہ اس لیے ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے کیونکہ اس کا غلام بہر حال اللہ کا عبد ہے اب اگر وہ اسے میرا عبد کہے تو اس سے اس غلام کا مشترک ہونا لازم آگیا۔

(عمدة القاری ج ۱۳، ص ۱۱۰، مطبوعہ ادارة الطباعة المنيرية، ۱۳۳۸ھ)

بعض لوگوں کا نام عبد النبی اور عبد الرسول رکھا جاتا ہے۔

شیخ اشرف علی تھانوی نے کفر اور شرک کی باتوں کا بیان، اس عنوان کے تحت لکھا ہے۔ علی بخش، حسین بخش، عبد النبی وغیرہ نام رکھنا۔ (ہشتی زیور ج ۱، ص ۳۵، مطبوعہ ناشران قرآن لیتھڈ، لاہور)

ظاہر ہے کہ یہ دین میں غلو اور زیادتی ہے۔ عبد النبی اور عبد الرسول نام رکھنا سورہ نور کی اس آیت کے تحت جائز ہے۔ اور احادیث میں جو ممانعت وارد ہے، اس کی وجہ سے خلاف اولیٰ یا مکروہ تنزیہی ہے۔ ہمارے نزدیک مختار یہی ہے کہ عبد النبی، عبد الرسول اور عبد المصطفیٰ نام رکھنا ہر چند کہ جائز ہے لیکن چونکہ احادیث میں اس کی ممانعت ہے، اس لیے خلاف اولیٰ یا مکروہ تنزیہی ہے، اس لیے افضل اور اولیٰ یہی ہے کہ ان کے بجائے غلام نبی، غلام رسول اور غلام مصطفیٰ نام رکھے جائیں۔

علامہ ابن اثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے کوئی شخص اپنے مملوک کو میرا عبد نہ کہے بلکہ میرا نوکر یا خادم کہے۔ یہ ممانعت اس لیے کی گئی ہے تاکہ مالک سے تکبر اور بڑائی کی نفی کی جائے اور مالک کی طرف غلام کی عبودیت کی نسبت کی نفی کی جائے کیونکہ اس کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہی تمام بندوں کا رب ہے۔

(التمایہ ج ۳، ص ۱۵۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، مجمع بحار الانوار ج ۳، ص ۵۱۲، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان المدینہ

النورہ، ۱۳۱۵ھ)

علامہ عبد الرؤف مناوی شافعی متوفی ۱۰۲۱ھ لکھتے ہیں:

اجلاء الشافعیہ میں سے علامہ ازرعی نے کہا فتاویٰ میں مذکور ہے کہ ایک انسان کا نام عبد النبی رکھا گیا میں نے اس میں توقف

کیا۔ پھر میرا اس طرف میلان ہوا کہ یہ نام حرام نہیں ہے، جب اس کے ساتھ نبی ﷺ کی نسبت سے مشرف ہونے کا ارادہ کیا جائے اور لفظ عبد سے خادم کے معنی کا ارادہ کیا جائے، اور اس نام کی ممانعت کی بھی گنجائش ہے جب جاہلوں کے عقیدہ شرکیہ کا خدشہ ہو یا کوئی شخص لفظ عبد سے حقیقت عبودیت کا ارادہ کرے، علامہ دمیری نے یہ کہا ہے کہ عبد النبی نام رکھنے کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ جب اس سے رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کرنے کا قصد کیا جائے تو جائز ہے اور اکثر علماء کا میلان اس نام رکھنے کی ممانعت کی طرف ہے، کیونکہ اس میں اللہ کا شریک بنانے کا خدشہ ہے اور حقیقت عبودیت کے اعتقاد کا خطرہ ہے۔ جس طرح عبدالدار نام رکھنا منع ہے اور اسی قیاس پر عبد الکعبہ نام رکھنا حرام ہے۔

(فیض القدر ج ۱، ص ۳۲۲-۳۲۱، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۸ھ)

شیخ محمد حنفی لکھتے ہیں:

عبد النبی نام رکھنے کے متعلق ایک قول یہ ہے کہ یہ حرام ہے، کیونکہ اس سے یہ وہم ہو گا کہ نبی ﷺ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اور اس دلیل کو مسترد کر دیا گیا ہے کیونکہ جو شخص بھی عبد النبی کا لفظ سنتا ہے وہ اس سے خادم کا معنی سمجھتا ہے مخلوق کا معنی نہیں سمجھتا۔ ہاں اوٹی یہ ہے کہ یہ نام نہ رکھا جائے تاکہ یہ وہم نہ ہو۔

(حاشیہ فیض القدر علی هامش الراج المنیر ج ۱، ص ۵۱، المطبوعہ المطبعہ الخیریہ ۱۳۰۳ھ)

علامہ شامی لکھتے ہیں:

فقہاء نے عبد فلاں نام رکھنے سے منع کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبد النبی نام رکھنا ممنوع ہے، علامہ مناوی نے علامہ دمیری (شافعی) سے نقل کیا ہے کہ ایک قول جواز کا ہے جبکہ اس نسبت سے مشرف ہونا مقصود ہو، اور اکثر فقہاء نے اس خدشہ سے منع کیا ہے کہ کوئی حقیقت عبودیت کا اعتقاد کرے، جیسے عبدالدار نام رکھنا جائز نہیں ہے۔

(رد المحتار ج ۵، ص ۳۶۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۰۷ھ)

اعلیٰ حضرت متوفی ۱۳۴۰ھ نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے برسر منبر خطبہ میں فرمایا میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا میں آپ کا عبد اور خادم تھا۔ (النور والفضیاء ص ۲۳، مطبوعہ پروگریسو بکس لاہور)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد خلاف اوٹی نہیں ہے کیونکہ آپ نے عبد کے ساتھ خادم کے لفظ کا ذکر فرمایا ہے جس سے عبد بمعنی مخلوق کا وہم پیدا نہیں ہوتا۔

قیامت کے دن انسان کو اس کے باپ کے نام کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا یا ماں کے نام کی طرف؟

قیامت کے دن انسان کو اس کے باپ کے نام کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا۔ امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب کا یہ عنوان قائم کیا ہے لوگوں کو ان کے آباء کے نام سے پکارا جائے گا اور اس باب کے تحت یہ حدیث ذکر کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اولین اور آخرین کو جمع فرمائے گا اور ہر عمد شکن کے لیے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا پھر کہا جائے گا یہ فلاں بن فلاں کی عمد شکنی ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۷۷، صحیح مسلم جماد ۹ (۱۷۳۵) ۳۳۳۸)

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک تم قیامت کے دن اپنے ناموں سے اور اپنے باپوں کے ناموں سے پکارے جاؤ گے تو اپنے اچھے نام رکھو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۹۳۸، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۵۸۱۸، سنن دارمی رقم الحدیث: ۲۶۹۳، مسند احمد ج ۵، ص ۱۹۳، طبع قدیم، اس کی سند صحیح ہے، مسند احمد ج ۱۶، رقم الحدیث: ۲۱۸۵۹، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ، موارد الظمان رقم الحدیث: ۱۹۳۳، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹، ص ۳۰۶، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۴۷۶۷)

بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو اس کی ماں کے نام کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے:

سعید بن عبد اللہ اودی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اس وقت وہ نزع کی کیفیت میں تھے۔ انہوں نے کہا جب میں مر جاؤں تو میرے ساتھ اس طرح عمل کرنا جس طرح رسول اللہ ﷺ نے مردوں کے ساتھ عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارے بھائیوں میں سے کوئی شخص فوت ہو جائے تو تم اس کی قبر کی مٹی ہموار کرنے کے بعد اس کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو جانا پھر کہنا اے فلاں بن فلانہ، کیونکہ وہ تمہاری بات سنے گا اور جواب نہیں دے سکے گا۔ پھر کہنا اے فلاں بن فلانہ تو پھر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جائے گا۔ پھر کہنا اے فلاں بن فلانہ تو وہ کہے گا اللہ تم پر رحم کرے ہم کو ہدایت دو، لیکن تم کو اس کے کلام کا شعور نہیں ہو گا۔ پھر اس سے یہ کہنا کہ یاد کرو جب تم دنیا سے گئے تھے تو ان لا الہ الا اللہ وان محمد عبده ورسوله کی شہادت دیتے تھے اور تم اللہ کو رب مان کر، اور اسلام کو دین مان کر، اور (سیدنا) محمد ﷺ کو نبی مان کر اور قرآن کو امام مان کر راضی تھے۔ پھر منکر اور نکیر میں سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہے گا یہاں سے چلو ہم اس شخص کے پاس نہیں بیٹھتے جس کو جواب تلقین کر دیا گیا ہے۔ ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ! اگر ہم کو اس کی ماں کا نام یاد نہ ہو تو؟ آپ نے فرمایا پھر پکارنے والا اس کو حواء کی طرف منسوب کرے اور کہے یا فلاں بن حواء۔

(المعجم الکبیر ج ۸، رقم الحدیث: ۷۹۷۹، تہذیب تاریخ دمشق ج ۶، ص ۴۲۳، مجمع الزوائد ج ۲، ص ۳۲۳، کنز العمال رقم الحدیث: ۴۲۳۰۶، ۴۲۳۰۳)

اس کا جواب یہ ہے کہ ہماری بحث اس میں ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کو اس کے باپ کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا اور اس حدیث میں یہ مذکور ہے کہ دفن کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر اس شخص کو اس کی ماں کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے لہذا یہ حدیث ہمارے خلاف نہیں ہے۔

اس موضوع پر حسب ذیل احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا پردہ رکھتے ہوئے قیامت کے دن ان کو ان کے ناموں سے پکارے گا۔ (المعجم الکبیر ج ۱۱، رقم الحدیث: ۱۱۲۳۲، البدور السافره ص ۳۳۵، الدر المنثور ج ۸، ص ۵۳) حافظ سیوطی نے البدور السافره میں یہ حدیث اسی طرح ذکر کی ہے لیکن الدر المنثور میں امام طبرانی اور امام ابن مردویہ کے حوالوں سے اس طرح ذکر کی ہے: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کا پردہ رکھتے ہوئے ان کو ان کی ماؤں کی طرف منسوب کر کے پکارے گا۔ لیکن امام طبرانی کی روایت میں ماؤں کا ذکر نہیں ہے۔ حافظ ابی شیبہ نے کہا ہے اس حدیث کا ایک راوی اسحاق بن بشر ابو حذیفہ متروک ہے (مجمع الزوائد ج ۱۰، ص ۳۵۹) حافظ محمد بن احمد ذہبی متوفی ۷۴۸ھ اس کے متعلق لکھتے ہیں: امام ابن حبان نے کہا اس کی احادیث کو اظہار تعجب کے سوا لکھنا جائز نہیں ہے۔ امام دارقطنی نے کہا یہ کذاب متروک ہے۔ علی بن مدینی نے بھی اس کو کذاب قرار دیا یہ شخص ۲۶۰ھ میں بخاری میں فوت ہو گیا تھا۔

(میزان الاعتدال ج ۱، ص ۳۳۵، رقم ۷۴۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۶ھ)

امام ابن عدی، اسحاق بن ابراہیم اللبری کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن اللہ عزوجل کی طرف سے لوگوں پر ستر کرتے ہوئے ان کو ان کی ماؤں کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا۔ امام ابن عدی نے کہا یہ حدیث اس سند کے ساتھ منکر ہے۔

(الکامل فی ضعفاء الرجال ج ۱، ص ۳۳۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ شمس الدین ذہبی اسحاق بن ابراہیم اللبری کے متعلق لکھتے ہیں امام ابن عدی اور امام دارقطنی نے اس کو منکر الحدیث قرار دیا اور امام ابن حبان نے کہا یہ ثقات سے موضوعات کو روایت کرتا ہے، اس کی احادیث کو اظہار تعجب کے سوا روایت کرنا جائز نہیں ہے۔ امام ابن حبان نے اس کی متعدد باطل روایتوں کی مثال ذکر کی ہے، حافظ ذہبی نے اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ منکر ہے۔ (میزان الاعتدال ج ۱، ص ۳۲۷، رقم: ۷۱۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ بدر الدین محمد بن احمد عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

امام بخاری کی صحیح حدیث میں ان لوگوں کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگوں کو صرف ان کی ماؤں کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا تاکہ ان کے آباء پر پردہ رہے۔ نیز اس حدیث سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اشیاء پر حکم ان کے ظاہر کے اعتبار سے لگایا جاتا ہے۔ (عمدة القاری جز ۲، ص ۲۰۱، مطبوعہ ادارة البعثة المنيرية مصر ۱۳۳۸ھ)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن بطلال نے کہا ہے کہ اس حدیث میں ان لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگوں کو صرف ان کی ماؤں کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا تاکہ ان کے (اصل) آباء پر پردہ رہے۔ (علامہ عسقلانی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ یہ وہ حدیث ہے جس کو امام طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اس کی سند بہت ضعیف ہے اور امام ابن عدی نے اس کی مثل حضرت انس سے روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ منکر ہے۔ علامہ ابن بطلال نے کہا کسی شخص کی پہچان اور شناخت کے لیے اس کو اس کے باپ کی طرف منسوب کرنا بہت زیادہ واضح ہے۔ اور اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چیزوں کے ظاہر پر حکم لگانا جائز ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص کی اس کے اسی باپ کی طرف نسبت کی جائے گی جو دنیا میں اس کا باپ مشہور تھا نہ کہ اس کے حقیقی باپ کی طرف اور یہی قول معتمد ہے۔

(فتح الباری ج ۱۰، ص ۵۶۳، مطبوعہ لاہور ۱۳۰۱ھ)

بچوں کا نام محمد رکھنے کی فضیلت

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرا نام رکھو اور میری کنیت نہ رکھو، کیونکہ میں ہی قاسم ہوں اور تمہارے درمیان تقسیم کرتا ہوں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۹۶، صحیح مسلم الاداب ۵، (۲۱۳۱) ۵۳۸۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۲۸)

حضرت ابو وہب جشمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انبیاء کے نام رکھو۔ اور تمام اسماء میں اللہ کو محبوب عبد اللہ اور عبد الرحمن ہیں اور حارث اور ہمام تمام ناموں میں سچے ہیں اور سب سے قبیح نام حرب (جنگ) اور مرہ (کڑواہ) ہے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۹۵۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۵۶۸)

حارث کے صادق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حارث کا معنی ہے کسب اور کام کرنے والا اور ہر انسان کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے، سو یہ نام اپنے معنی کے مطابق ہے اور ہمام کا معنی ہے ارادہ کرنے والا اور ہر انسان کسی نہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے۔

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

علامہ مناوی نے کہا ہے کہ عبد اللہ نام رکھنا مطلقاً افضل ہے، اس کے بعد عبد الرحمن ہے، اس کے بعد محمد نام رکھنا افضل ہے، پھر احمد نام رکھنا، پھر ابراہیم نام رکھنا۔ ایک اور جگہ یہ ہے کہ عبد اللہ اور عبد الرحمن کے ساتھ ان کی مثل دوسرے نام لاحق ہیں مثلاً عبد الرحیم اور عبد المالک وغیرہ۔ اور یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ محمد اور احمد نام، اللہ تعالیٰ کو تمام ناموں میں سب سے زیادہ محبوب ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کا وہی نام رکھا ہے جو اس کو تمام ناموں میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور اس نے اس کا نام محمد یا احمد رکھا تو وہ شخص اور اس کا بچہ دونوں جنت میں ہوں گے۔ اس حدیث کو امام ابن عساکر نے حضرت ابو امامہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ حافظ سیوطی نے کہا ہے اس باب میں یہ سب سے عمدہ حدیث ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ (رد المحتار ج ۵، ص ۲۶۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۰۷ھ)

”محمد“ نام رکھنے کے متعلق متعدد احادیث وارد ہیں ان میں سے بعض کی اسانید ضعیف ہیں لیکن چونکہ فضائل میں احادیث ضعیفہ کا اعتبار ہوتا ہے اس لیے ہم وہ احادیث بیان کر رہے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جس شخص کے ہاں تین بیٹے ہوئے اور اس نے کسی کا نام محمد نہیں رکھا اس نے جہالت کا کام کیا۔

(الکامل لابن عدی ج ۶، ص ۲۱۰، المعجم الکبیر ج ۱۱، رقم الحدیث: ۱۱۰۷۷، مجمع الزوائد ج ۸، ص ۳۹، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۵۲۰۳، مسند الخارث ص ۲۰۰-۱۹۹)

حافظ سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند میں موسیٰ ایسٹ سے متفرد ہے اور وہ ضعیف ہے لیکن اس کا ضعف وضع تک نہیں پہنچا۔ امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی، امام ابن ماجہ اور امام طبرانی نے اس سے احادیث کو روایت کیا ہے، اور امام ابن معین نے اس کی توثیق کی ہے۔ یہ حدیث مسند الخارث میں بھی ہے اور یہ مقبول کی قسم میں داخل ہے۔

(اللآلی المصنوعہ ج ۱، ص ۹۳-۹۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۷ھ)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے تین بیٹے ہوں اور وہ کسی کا نام محمد نہ رکھے تو یہ بے وفائی کے کاموں میں سے ہے اور جب تم اس کا نام محمد رکھو تو نہ اس کو برا کہو (گالی دو) اور نہ اس پر سختی کرو، نہ اس پر ناک چڑھاؤ اور نہ اس کو مارو، اس کی قدر منزلت اور تعظیم و تکریم کرو اور اس کی قسم پوری کرو۔

(الکامل لابن عدی ج ۳، ص ۸۹۰)

امام ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ نے اس حدیث کو منکر قرار دیا ہے۔ حافظ سیوطی لکھتے ہیں اس حدیث کی تقویت اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو امام دہلی متوفی ۵۰۹ھ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے چار بیٹے ہوں اور وہ میرا نام کسی کا نہ رکھے اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔ (الفردوس بماثور الخطاب ج ۳، رقم الحدیث: ۵۹۸۱) نیز امام بکیر نے اپنی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کیا ہے: جب تم کسی کا نام محمد رکھو تو اس نام کی تعظیم کے سبب سے اس کی تعظیم اور توقیر کرو اور اس کی تکریم کرو، اس کی تذلیل اور تحقیر نہ کرو اور اس پر سختی نہ کرو۔

(الجوامع رقم الحدیث: ۲۰۱۰، اللآلی المصنوعہ ج ۱، ص ۹۳، مطبوعہ بیروت، ۱۳۱۷ھ)

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم کسی کا نام محمد رکھو تو نہ اس کو مارو نہ محروم کرو۔ امام دہلی کی روایت میں یہ اضافہ ہے (نام) محمد میں برکت رکھی گئی ہے اور جس گھر میں محمد ہو، اور جس مجلس میں محمد ہو۔

(مسند البرزاز رقم الحدیث: ۱۳۵۹، مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۲۸، الفردوس بماثور الخطاب رقم الحدیث: ۱۳۵۳، کنز العمال رقم الحدیث: ۲۵۱۹۷، ۲۵۲۲۰) (اس حدیث کی سند ضعیف ہے)

امام فراوی اپنی سند کے ساتھ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ایک منادی ندا کرے گا اے محمد! کھڑے ہوں اور جنت میں بغیر حساب کے داخل ہو جائیں تو ہر وہ شخص جس کا نام محمد ہو گا وہ کھڑا ہو جائے گا اور یہ گمان کرے گا کہ یہ اس کو نداء کی گئی ہے تو نام محمد کی کرامت کی وجہ سے ان کو منع نہیں کیا جائے گا۔ (تزیہ الشریعہ مطبوعہ القاہرہ)

حافظ سیوطی لکھتے ہیں: اس حدیث کی سند معضل (منقطع) ہے اور اس کی سند سے کئی راوی ساقط ہیں۔

(اللآلی المصنوعہ ج ۱، ص ۹۷، مطبوعہ بیروت)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور اس نے میری محبت کی وجہ سے اور میرے نام سے برکت حاصل کرنے کی وجہ سے اس کا نام محمد رکھا تو وہ شخص اور اس کا بچہ دونوں جنت میں ہوں گے۔

(تزیہ الشریعہ ج ۱، ص ۱۹۸، جامع الاحادیث الکبیر رقم الحدیث: ۲۳۲۵۵، کنز العمال رقم الحدیث: ۲۵۲۲۳)

حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس باب میں جنتی احادیث وارد ہیں یہ ان سب میں عمدہ حدیث ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ (اللآلی المصنوعہ ج ۱، ص ۹۷، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کیا یہ ان کو شریک قرار دیتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے، اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں اور وہ ان (شرکین) کے لیے کسی مدد کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور (اے مشرک!) اگر تم ان بتوں کو ہدایت کے حصول کے لیے پکارو، تو وہ تمہارے پیچھے نہ آسکیں گے سو تمہارے لیے برابر ہے کہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔

(الاعراف: ۱۹۳-۱۹۱)

بتوں کی بے مائیگی اور بے چارگی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: کیا یہ ان کو شریک بناتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ یہ آیت اس مطلوب پر قوی دلیل ہے کہ ان آیات میں جن لوگوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے ان کا تعلق حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہے، بلکہ اس سیاق اور سبق کا تعلق مشرکین سے ہے۔

اس آیت سے علماء اہل سنت نے یہ استدلال کیا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں ہے، کیونکہ اس آیت کا یہ تقاضا ہے کہ مخلوق کسی چیز کو خلق کرنے پر قادر نہیں ہے۔

دوسری آیت کا مفاد یہ ہے کہ معبود کے لیے ضروری ہے کہ وہ نفع پہنچانے اور ضرر دور کرنے پر قادر ہو اور بت اپنی پرستش کرنے والوں کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، تو ان کی پرستش اور عبادت کرنا کیوں کر درست ہوگی۔ بلکہ بتوں کا حال تو یہ ہے کہ اگر کوئی ان بتوں کو توڑ دے تو وہ اپنے آپ کو اس سے بچا نہیں سکتے، تو جو اپنی ذات سے ضرر کو دور کرنے پر قادر نہیں ہے تو وہ تمہیں تکالیف اور مصائب سے کب بچا سکتے ہیں۔

تیسری آیت میں یہ فرمایا ہے کہ جس طرح یہ بت حصول نفع اور دفع ضرر پر قادر نہیں ہیں، اسی طرح ان کو کسی چیز کا علم بھی نہیں ہے، اس لیے جب تم انہیں کسی نیک کام کے لیے پکارو تو یہ تمہارے پیچھے نہیں لگیں گے، اور اس آیت کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم ان کو کسی خیر اور اچھائی کے لیے پکارو تو یہ تمہاری پکار کا جواب نہیں دیں گے یا تم ان سے کوئی دعا کرو تو یہ تمہاری دعا کو قبول نہیں کریں گے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہارے لیے برابر ہے کہ تم ان کو

پکارو یا خاموش رہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک اللہ کو چھوڑ کر تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تمہاری طرح بندے ہیں تو تم ان کو پکارو اور پھر چاہیے کہ وہ تمہاری پکار کا جواب دیں اگر تم سچے ہو کیا ان کے پیر ہیں جن سے وہ چل سکیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑ سکیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھ سکیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سن سکیں آپ کہئے کہ تم اپنے شرکاء کو بلاؤ اور پھر اپنی تدبیر مجھ پر آزماؤ اور اس کے بعد مجھے (بالکل) مہلت مت دو (الاعراف: ۱۹۵-۱۹۴)

اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ یہ بت تو بے جان پتھر ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ تمہاری طرح بندے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کلام بر تقدیر فرض ہے۔ پہلی آیت میں یہ بتایا ہے کہ جن بتوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ بے جان پتھر ہیں۔ جن کے حواس ہیں اور نہ وہ حرکت کر سکتے ہیں اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ حواس اور عقل رکھتے ہیں اور حرکت بلا راہہ کر سکتے ہیں تب بھی زیادہ سے زیادہ وہ تمہاری طرح بندے ہیں اور ان کو تم پر کوئی فضیلت نہیں ہے پھر تم نے ان کو اپنا خالق اپنا رب اور اپنا معبود کیسے فرض کر لیا۔ پھر اس پر دلیل قائم فرمائی کہ ان کو تم پر کوئی فوقیت نہیں ہے اور اگر تم ان کے رب اور معبود ہونے کے دعویٰ میں سچے ہو تو ان کو پکارو تاکہ وہ تمہاری پکار کا جواب دیں۔

اس آیت میں بتوں کو پکارنے کا جو حکم دیا ہے وہ بتوں کے عجز کو ثابت کرنے کے لیے ہے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ کسی کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے تو پھر وہ خدائی کی صلاحیت کب رکھ سکتے ہیں۔ پس ظاہر ہو گیا کہ اے مشرکوا تم اور وہ ایک جیسے ہیں بلکہ وہ تم سے بھی ارزل اور ادنیٰ ہیں کیونکہ تم تو چلنے پھرنے چیزوں کو پکڑنے اور سننے اور دیکھنے پر قادر ہو اور وہ تو اتنی قدرت بھی نہیں رکھتے۔

حسن بھری نے کہا ہے کہ مشرکین نبی ﷺ کو اپنے بتوں سے خوف زدہ کرتے تھے اس لیے فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم اور تمہارے بت اگر میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو بگاڑ لیں اور پھر مجھے بالکل مہلت نہ دیں اور اس سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ بت کسی کو نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ سو ان کی عبادت کرنا جائز نہیں ہے۔

إِنَّ وَلِيَ اللَّهِ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ ﴿١٩٦﴾

بیشک میرا مددگار اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک لوگوں کی مدد کرتا ہے ○

وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ نَصْرَكُمْ وَلَا

اور تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ خود

أَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُونَ ﴿١٩٦﴾ وَإِنْ تَدْعُوهُمْ إِلَى الْهُدَى لَا يَسْمَعُوا

اپنی مدد کر سکتے ہیں ○ اور اگر آپ انہیں ہدایت کی طرف بلائیں تو وہ سن نہیں سکیں گے ،

وَتَرَاهُمْ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٩٧﴾ خذِ الْعَفْوَ

اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ (بظاہر) آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ (حقیقت میں) بالکل نہیں دیکھ رہے ○ آپ عفو و درگزر کا طریقہ

أَمْرًا بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿١٩٩﴾ وَإِنَّمَا يَنْزِعُكَ مِنْ

اختیار کیجیے اور نیکی کا حکم دیکھیے اور جاہلوں سے اعراض کیجیے ۰ اور (اے مخاطب) اگر شیطان تمہیں کوئی

الشَّيْطَانِ نَزَعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٠٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ

دوسرے ڈالے تو اللہ کی پناہ طلب کرو، بیشک وہ بہت سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ۰ بیشک جو لوگ اللہ

الْقَوَا إِذْ آمَسَّهُمْ طِيفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ

سے ڈرتے ہیں انہیں اگر شیطان کی طرف سے کوئی برا خیال چھو بھی جاتا ہے تو وہ خبردار ہو جاتے ہیں اور اسی وقت ان کی

مُبْصِرُونَ ﴿٢٠١﴾ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُبْصِرُونَ ﴿٢٠٢﴾

آنکھیں کھل جاتی ہیں ۰ اور شیطانوں کے بھائی بند ان کو گمراہی میں کھینچتے ہیں پھر وہ (ان کو گمراہ کرنے میں) کوئی کمی نہیں کرتے ۰

وَإِذْ آلُ تَائِبِهِمْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا قُلُوبَ الَّذِينَ

اور (اے رسولِ معظم) جب آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے تو یہ کہتے ہیں کہ آپ کیوں کوئی نشانی منتخب کر لی آپ کیسے کہیں صرف اس

مَا يُوحَىٰ إِلَىٰ مِنَ رَبِّي هَذَا بَصَائِرٍ مِّنْ رَبِّكُمْ وَهُدًى وَرَحْمَةً

چیز کی اتباع کرتا ہوں جس کی میرے رب کی طرف وحی کی جاتی ہے یہ (قرآن) تمہارے رب کی طرف بصیرت افزا احکام کا مجموعہ ہے اور

لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠٣﴾ وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا

ایمان لانے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ۰ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سناؤ اور خاموش رہو تاکہ تم پر

لَعَلَّكُمْ تَرْحَمُونَ ﴿٢٠٤﴾ وَإِذْ كُرِّمَاتُكَ فِي نَفْسِكَ تُضْرَعُونَ وَخِيفَةُ

رحم کیا جائے ۰ اور اپنے رب کو اپنے دل میں خون اور عاجزی کے ساتھ یاد کرو

وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ

اور زبان سے آواز بلند کیے بغیر صبح اور شام کو یاد کرو اور غفلت کرنے والوں میں سے

مِّنَ الْعَاقِلِينَ ﴿٢٠٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ

نہ ہر جاؤ ۰ بیشک جو آپ کے رب کی بارگاہ کے مقربین ہیں وہ اس کی عبادت سے

عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ ﴿٢٦﴾

سجود نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک میرا مددگار اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ نیک لوگوں کی مدد کرتا ہے ○ اور تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں ○ اور اگر آپ انہیں ہدایت کی طرف بلائیں تو وہ سن نہیں سکیں گے اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ (بہ ظاہر) آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ (حقیقت میں) بالکل نہیں دیکھ رہے۔ (الاعراف: ۱۹۸-۱۹۶)

اللہ اور رسول کے مقرب نیک لوگ ہیں

اس سے پہلی آیتوں میں یہ فرمایا تھا کہ بتوں کو حصول نفع اور دفع ضرر پر مطلقاً قدرت نہیں ہے اور اس آیت میں یہ واضح فرمایا ہے کہ صاحب عقل کو یہ چاہیے کہ صرف اللہ کی عبادت کرے جو دین اور دنیا کے منافع پہنچانے کا ولی ہے۔ دین کے منافع اس طرح پہنچائے کہ اس نے یہ کتاب یعنی قرآن مجید کو نازل فرمایا جس میں معیشت اور آخرت کا مکمل اور جامع نظام ہے اور دنیا کے منافع اس طرح پہنچائے کہ اس نے فرمایا وہ صالحین کا ولی ہے یعنی نیک لوگوں کا مددگار ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بہ آواز بلند فرماتے ہوئے سنا ہے۔ آپ نے فرمایا سنو! میرے باپ کی آل میرے مددگار نہیں ہیں، میرا ولی اللہ ہے اور نیک مسلمان ہیں۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۹۹۰، صحیح مسلم الایمان: ۳۶۶، (۲۱۵) ۵۰۸، مسند احمد ج ۳، ص ۲۰۳)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ میرے ولی (دوست یا مقرب) نیک مسلمان ہیں خواہ وہ نسبتاً مجھ سے بعید ہوں۔ اور جو نیک نہیں ہیں وہ میرے ولی (مقرب) نہیں ہیں خواہ وہ نسبتاً مجھ سے قریب ہوں۔

عمر بن عبد العزیز اپنی اولاد کے لیے کچھ مال جمع نہیں کرتے تھے ان سے اس کا سبب پوچھا گیا انہوں نے کہا اگر میری اولاد صالح اور نیک ہوئی تو اس کا ولی اور مددگار اللہ ہے لہذا اس کو میرے مال کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر میری اولاد مجرم اور گنہ گار ہوئی تو میں اپنے مال سے اس کی مدد نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول ذکر فرمایا ہے:

قَالَ رَبِّ بِمَا أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ أَكُونَ ظَهِيرًا لِّلْمُجْرِمِينَ ○ (القصص: ۱۷)

موسیٰ نے عرض کیا اے میرے رب! چونکہ تو نے مجھ پر احسان فرمایا ہے سو اب میں ہرگز مجرموں کا مددگار نہیں ہوں گا۔

(تفسیر کبیر ص ۳۳۵، غرائب القرآن و رغائب الفرقان ج ۳، ص ۳۶۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۶ھ)

دوسری آیت میں پھر یہ ذکر فرمایا کہ یہ بت نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں نہ اپنی، سو یہ اس لائق نہیں ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے۔ اور اس کے بعد والی آیت میں فرمایا اور آپ انہیں دیکھتے ہیں کہ وہ بظاہر آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، اس سے مراد بت ہیں یا مشرکین۔ اگر اس سے مراد بت ہیں تو ان کے دیکھنے کا معنی یہ ہے کہ وہ آپ کے سامنے اور بالقابل ہیں اور چونکہ دیکھنے والا بالقابل ہوتا ہے اس لیے فرمایا وہ بظاہر دیکھ رہے ہیں حالانکہ حقیقت میں وہ بالکل نہیں دیکھ رہے، اور اگر اس سے مراد مشرکین ہیں تو پھر معنی یہ ہے کہ یہ کفار اور مشرکین ہرچند کہ بہ ظاہر آپ کو دیکھ رہے ہیں لیکن یہ چونکہ آپ کو محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے بلکہ عداوت سے دیکھتے ہیں تو گویا کہ وہ آپ کو نہیں دیکھتے یا چونکہ وہ حق سے اعراض کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں نبوت کے جو دلائل اور نشانیاں رکھی ہیں ان کا اثر قبول نہیں کرتے اس لیے گویا کہ وہ آپ کو نہیں دیکھتے۔

البيان القرآن

جلد چہارم

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ غفور درگزر کا طریقہ اختیار کیجئے اور نیکی کا حکم کیجئے اور جاہلوں سے اعراض کیجئے O

(الاعراف: ۱۹۹)

آیات سابقہ سے ارتباط

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور نیک مسلمانوں کا حامی و ناصر ہے اور بت اور ان کے پجاری کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہیں۔ اور اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے کا صحیح اور معتدل طریقہ بیان فرمایا ہے، کیونکہ صالح اور نیک ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ مخلوق کے ساتھ بھی نیک سلوک کیا جائے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کی رعایت کی جائے۔

معاف کرنے، نیکی کا حکم دینے اور جاہلوں سے اعراض کرنے کے الگ الگ محامل

بندوں کے حقوق کی تفصیل یہ ہے کہ بعض چیزوں میں ان سے تساہل اور درگزر کرنا مستحسن ہے اور بعض چیزوں میں ان سے اغماض اور چشم پوشی کرنا جائز نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کو کوئی انسان ذاتی نقصان پہنچائے تو اس کو معاف کر دینا مستحسن ہے اور اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کرے اور حدود اللہ کو پامال کرے تو اس کے ساتھ مدائنت کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے معاف کرنے کے حکم کا تعلق انسان کے ذاتی معاملات سے ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ کے احکام سے بغاوت اور روگردانی کا معاملہ ہو وہاں نیکی کا حکم دینا اور برائی پر توکنا ضروری ہے اور اگر نیکی کا حکم دینے پر کوئی شخص بد تمیزی اور جہالت سے پیش آئے تو پھر اس سے اعراض کرنے کا حکم ہے۔

امام ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرئیل سے پوچھا: اے جبرئیل اس کا کیا معنی ہے؟ حضرت جبرئیل نے کہا میں اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں گا پھر کہا اللہ تعالیٰ آپ کو یہ حکم دیتا ہے کہ جو آپ پر ظلم کرے اس کو معاف کر دیں جو آپ کو محروم کرے اس کو عطا کریں اور جو آپ سے تعلق توڑے اس سے آپ تعلق جوڑیں۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۲۰۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے فرمایا اے عقبہ بن عامر جو تم سے تعلق توڑے، تم اس سے تعلق جوڑو اور جو تم کو محروم کرے اس کو عطا کرو اور جو تم پر ظلم کرے اس کو معاف کر دو۔ میں دوبارہ ملاقات کے لیے گیا تو آپ نے فرمایا اے عقبہ بن عامر! اپنی زبان پر قابو رکھو، اپنے گناہوں پر روؤ اور تمہارے گھر میں گنجائش رہنی چاہیے۔

(مسند احمد ج ۶، رقم الحدیث: ۱۷۳۵۸، ۱۷۳۵۷، شیخ احمد شاکر نے کہا ہے اس حدیث کی سند صحیح ہے، مسند احمد ج ۱۳،

رقم الحدیث: ۱۷۳۸۳)

غفور اور درگزر کرنے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ
وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ (الشورى: ۳۷)

اور جو لوگ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے اجتناب کرتے ہیں اور جب وہ غضبناک ہوں تو معاف کر دیتے ہیں۔

ہیں۔

اور جو صبر کرے اور معاف کر دے تو یقیناً یہ ضرور ہمت کے کاموں سے ہے۔

اور برائی کا بدلہ اسی کی مثل برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ (کرم پر) ہے۔

اور اگر تم معاف کر دو، اور درگزر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

اور انہیں چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں (اے ایمان والو) کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے۔

آپ ان کو معاف کر دیجئے اور ان سے درگزر کیجئے، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ
(الشوری: ۴۳)

وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (الشوری: ۴۰)

وَإِنْ تَعَفُّوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (التغابن: ۴۱)

وَلْيَعْفُوا وَليَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ (النور: ۲۲)

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (المائدہ: ۴۴)

عفو اور درگزر کرنے کے متعلق احادیث

حضرت معاذ بنی بنی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے غضب کے تقاضے کو پورا کرنے پر قادر ہو، اس کے باوجود وہ اپنے غصہ کو ضبط کر لے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا اور اس کو یہ اختیار دے گا کہ وہ جس بڑی آنکھوں والی حور کو چاہے لے لے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۷۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۲۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۸۶، مسند احمد ج ۵، رقم الحدیث: ۱۵۶۳)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: تم کس شخص کو پہلوان کہتے ہو؟ ہم نے کہا جو لوگوں کو پچھاڑ دے۔ آپ نے فرمایا نہیں پہلوان وہ شخص ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۷۹، صحیح مسلم البرد اصلہ: ۱۰۶، صحیح مسلم البرد اصلہ: ۱۰۶)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو چیزوں کا اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے آسان کو اختیار کرتے بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو اور رسول اللہ ﷺ نے کبھی اپنی ذات کا انتقام نہیں لیا۔ البتہ اگر اللہ کی حدود پامال کی جاتیں تو آپ اللہ کی طرف سے انتقام لیتے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۸۵، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۶۰، صحیح مسلم فضائل: ۷۷ (۲۳۲۷) الموطا رقم الحدیث: ۱۶۷۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی خادم کو مارا نہ عورت کو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۸۶)

حضرت ابو تمیمہ جعفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے نصیحت فرمائیں تو آپ نے فرمایا کسی نیک کام کو حقیر نہ جاننا اور جب تم اپنے کسی بھائی سے ملاقات کرو، تو کشادہ جیوں اور مسکراتے ہوئے ملاقات کرو اور پانی مانگنے والے کو اپنے ڈول سے پانی دینا۔ اگر کسی شخص کو تمہارے کسی عیب کا علم ہو اور وہ تمہیں اس کے ساتھ برا کہے تو تمہیں اس کے جس عیب کا علم ہو تم اس کو اس کے عیب کے ساتھ برا نہ کہنا، تمہیں اس پر اجر ملے گا اور اسے اس کا گناہ ہو گا اور

تبیان القرآن

جلد چہارم

تم تکبر سے تہمند نہ لٹکانا کیونکہ اللہ عزوجل تکبر کو پسند نہیں کرتا اور کسی شخص کو گالی نہ دینا، میں نے اس کے بعد کسی کو گالی نہیں دی نہ بکری کو نہ اونٹ کو۔ (مسند احمد ج ۷، رقم الحدیث: ۲۰۶۶۰، مطبوعہ دار الفکر طبع جدید)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے قدرت کے باوجود کسی کو معاف کر دیا تنگی کے دن اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے گا۔ (المعجم الکبیر ج ۷، رقم الحدیث: ۷۵۸۵)

رسول اللہ ﷺ کے درگزر کرنے کے متعلق احادیث

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ حنین کے دن رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت تقسیم کرتے ہوئے بعض لوگوں کو ترجیح دی۔ اقرع بن حابس اور عینہ کو سو سو اونٹ دیے اور عرب کے سرداروں کو بھی عطا فرمایا، اور ان کو اس دن تقسیم میں ترجیح دی۔ ایک شخص نے کہا اللہ کی قسم! اس تقسیم میں عدل نہیں کیا گیا، اور اس میں اللہ کی رضا جوئی کا قصد نہیں کیا گیا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے کہا میں نے دل میں سوچا کہ میں رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ضرور دوں گا، میں آپ کے پاس گیا اور آپ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ متغیر ہو گیا، پھر آپ نے فرمایا اگر اللہ اور اس کا رسول عدل نہیں کرے گا تو پھر کون عدل کرے گا۔ پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ پر رحم فرمائے ان کو اس سے زیادہ اذیت پہنچائی گئی تھی تو انہوں نے صبر کیا تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۳۳۶، صحیح مسلم زکوٰۃ: ۱۳۰، (۱۰۶۲) ۲۳۰۸، مسند احمد ج ۱، ص ۳۸۰-۳۹۶)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میری ماں مشرکہ تھی میں اس کو اسلام کی دعوت دیتا تھا، ایک دن میں نے اس کو اسلام کی دعوت دی تو اس نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق بہت ناگوار اور بری باتیں کہیں جن سے میں بہت رنجیدہ ہوا، میں روتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے کہا یا رسول اللہ! میں اپنی ماں کو اسلام کی دعوت دیتا تھا اور وہ انکار کرتی تھی، آج میں نے اس کو اسلام کی دعوت دی تو اس نے مجھے ایسی باتیں سنائیں جن سے مجھے بہت رنج ہوا آپ اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت دے، آپ نے دعا کی اے اللہ! ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت دے۔ میں نبی ﷺ کی دعا کی وجہ سے خوش خوش گھر لوٹا، ماں نے میرے قدموں کی آہٹ سنی تو کہا وہیں ٹھہرو اور میں نے پانی گرنے کی آواز سنی، اس نے غسل کیا، کپڑے بدلے، پھر کہا اے ابو ہریرہ! اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا عبده ورسوله میں خوشی سے روتا ہوا رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول کر لی اور ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت دے دی ہے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی اور فرمایا اچھا ہوا۔ (صحیح مسلم فضائل صحابہ ۱۵۸ (۲۳۹۱) ۶۷۷۹)

امام ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر ابو العاص نے بدر کے بعد مدینہ منورہ کے لیے روانہ کیا، وہ اونٹ پر ہودج میں سوار تھیں، قریش مکہ کو ان کی روانگی کا علم ہوا تو انہوں نے حضرت زینب کا پیچھا کیا حتیٰ کہ مقام ذی طویٰ پر ان کو پالیا، ہبار بن الاسود نے ان کو نیزہ مارا حضرت زینب گر گئیں اور ان کا حمل ساقط ہو گیا۔ (السیرۃ النبویہ لابن ہشام ج ۲، ص ۴۶۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

حضرت جیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بحرانہ سے واپسی پر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اچانک دروازہ سے ہبار بن الاسود داخل ہوا مسلمانوں نے کہا یا رسول اللہ! یہ ہبار بن الاسود ہے، آپ نے فرمایا میں نے اس کو دیکھ لیا ہے، ایک شخص اس کو مارنے کے لیے کھڑا ہوا، نبی ﷺ نے اس کو اشارہ کیا کہ وہ بیٹھ جائے، ہبار کھڑا ہوا اور اس نے کہا السلام علیک یا نبی اللہ! اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمدا رسول اللہ! یا رسول اللہ! میں

آپ سے بھاگ کر کئی شہروں میں گیا اور میں نے سوچا میں عجم کے ملکوں میں چلا جاؤں پھر مجھے آپ کی نرم دلی، صلہ رحمی اور دشمنوں سے آپ کا درگزر کرنا یاد آیا، اے اللہ کے نبی، ہم مشرک تھے اللہ نے آپ کے سبب سے ہمیں ہدایت دی، اور ہم کو ہلاکت سے نجات دی۔ آپ میری جمالت سے درگزر فرمائیں اور میری ان تمام باتوں سے جن کی خبر آپ تک پہنچی ہے، میں اپنے تمام برے کاموں کا اقرار کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے تم کو معاف کر دیا، اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا کہ تم کو اسلام کی ہدایت دے دی اور اسلام بچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

(الاصابہ ج ۶، ص ۳۱۳، رقم: ۸۹۵۱، اسد الغابہ رقم: ۲۷۰۹، الاستیعاب رقم: ۲۷۱۰)

ایک ہبار بن الاسود کو معاف کر دینے کی مثال نہیں ہے، آپ نے ابو سفیان کو معاف کر دیا جس نے متعدد بار مدینہ پر حملہ کیا۔ وحشی کو معاف کر دیا جس نے آپ کے عزیز چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو شہید کیا تھا۔ ہند کو معاف کر دیا جس نے حضرت حمزہ کا کلیجہ نکال کر دانتوں سے چبایا تھا، فتح مکہ کے بعد تمام ظالموں کو معاف کر دیا۔ عبد اللہ بن ابی جو ریس المنافقین تھا جو آپ کو ہمیشہ اذیتیں پہنچاتا رہا، جس نے کہا تھا آپ کی سواری سے بدبو آتی ہے، جو غزوہ احد میں عین لڑائی سے پہلے اپنے تین سوسا تھیوں کے ساتھ لشکر اسلام سے نکل گیا تھا، جس نے کہا تھا کہ مدینہ پہنچ کر عزت والے، ذلت والوں کو نکال دیں گے، جس نے آپ کے حرم محترم ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت باندھی اور آپ کو رنج پہنچایا۔ اس نے بھی جب مرتے وقت آپ کی قمیص اپنے کفن کے لیے منگوائی تو آپ نے عطا کر دی، آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی تو آپ نے اس کی درخواست کو قبول فرمایا۔ صفوان بن معطل، عمیر بن وہب، اور عکرمہ بن ابو جہل کو معاف کر دیا۔ سراقہ کو امان لکھ دی اور بہت سے ظالموں اور ستم شعاروں کے مظالم اور ان کی جفاؤں سے اعراض کر کے انہیں معاف کر دیا۔ غرض آپ کی پوری زندگی

خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجہلین سے عبارت تھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے مخاطب!) اگر شیطان تمہیں کوئی دوسوہ ڈالے تو اللہ کی پناہ طلب کرو بے شک وہ

بہت سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ (الاعراف: ۲۰۰)

نزع شیطان کا معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

نزع کا معنی ہے کسی چیز کو فاسد اور خراب کرنے کے لیے اس میں داخل ہونا۔

(المفردات ج ۲، ص ۶۳۱، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۸ھ)

علامہ ابن اثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے:

نزع کا معنی ہے، کسی نوکدار چیز کو چھوٹا۔ کسی کو کسی کے خلاف بھڑکانا، فساد ڈالنا، نزع الشیطان بینہم کا معنی ہے شیطان نے ان کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا اور ان کے درمیان فساد ڈال دیا۔

(النهاية ج ۵، ص ۳۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۸ھ)

دساوس شیطان سے نجات کا طریقہ

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جاہلوں سے اعراض کیجئے اور جاہلوں کی جفا اور جمالت پر انسان کو طبعی طور پر غصہ آتا ہے۔ ابن زید نے کہا کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: اے میرے رب اگر مجھے ان کی باتوں پر غصہ آئے تو کیا کروں، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر شیطان آپ کو غضب میں لائے تو آپ اللہ کی پناہ

بیان القرآن

جلد چہارم

طلب کریں۔ (جامع البیان جز ۹، ص ۲۰۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

نزغ شیطان کا معنی ہے شیطان کا دوسرے۔ سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ میں حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی خدمت میں تھا، ان کے درمیان شیطان نے دوسرے ڈال دیے تھے ان میں سے ہر ایک دوسرے کو برا کہتا رہا، پھر وہ اس وقت تک مجلس سے نہیں اٹھے جب تک کہ ہر ایک نے دوسرے سے معافی نہیں مانگ لی۔

متقدمین میں سے ایک استاد نے اپنے شاگرد سے کہا اگر شیطان تمہیں گناہوں پر اکسائے تو تم کیا کرو گے؟ اس نے کہا میں اس کے خلاف کوشش کروں گا، استاد نے کہا اگر وہ پھر اکسائے؟ کہا میں پھر کوشش کروں گا، استاد نے کہا اگر وہ پھر اکسائے؟ کہا میں پھر کوشش کروں گا۔ استاد نے کہا یہ سلسلہ تو دراز ہو جائے گا۔ استاد نے کہا یہ بتاؤ اگر تم بکریوں کے ریوڑ کے درمیان سے گزرو اور بکریوں کا محافظ کتا تم پر بھونکنے لگے تو تم کیا کرو گے؟ اس نے کہا میں اس کو دور بھگانے کی کوشش کروں گا، استاد نے کہا یہ سلسلہ تو دراز ہو جائے گا لیکن اگر تم بکریوں کے چرواہے سے مدد طلب کرو تو وہ کہتے کہ تم سے دور کر دے گا، اسی طرح جب شیطان تم کو کسی گناہ پر اکسائے تو تم اللہ کی پناہ طلب کرو، وہ شیطان کو تم سے دور کر دے گا۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۳۱۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

دوسرے شیطان کی وجہ سے عصمت انبیاء پر اعتراض اور اس کے جوابات

عصمت انبیاء کے منکرین نے اس آیت سے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے کہ اگر انبیاء علیہم السلام کا گناہ اور معصیت پر اقدام ناممکن ہو تا تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا کہ اگر شیطان تم کو کوئی دوسرے ڈالے تو تم اللہ کی پناہ طلب کرو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو اس آیت میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ ثانیاً جواب یہ ہے کہ اگر اس آیت میں نبی ﷺ کو خطاب ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ اگر بالفرض شیطان آپ کو کوئی دوسرے ڈالے تو آپ اللہ کی پناہ طلب کریں اور اس سے شیطان کا آپ کو دوسرے ڈالنا لازم نہیں آتا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ
اگر بالفرض آپ نے شرک کیا تو آپ کے عمل ضائع ہو جائیں گے۔ (الزمر: ۶۵)

اور اس آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ آپ العیاذ باللہ شرک کریں۔

اور اس کی نظیر یہ آیت ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَبِيدِ
اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی اولاد ہو تو میں پہلے عبادت کرنے والا ہوتا۔ (الزخرف: ۸۱)

ثانیاً شیطان کا صرف دوسرے ڈالنا عصمت کے منافی نہیں ہے، عصمت کے منافی یہ ہے کہ آپ شیطان کا دوسرے قبول کریں اور یہ اس آیت سے ثابت نہیں، بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ
بے شک میرے خاص بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں ہے۔ (الحجر: ۴۲)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان کا قرین لگا دیا گیا ہے اور ایک قرین فرشتوں میں سے لگا دیا گیا ہے، صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا ہاں میرے ساتھ

بھی۔ لیکن اللہ نے اس کے خلاف میری مدد فرمائی وہ مسلمان ہو گیا وہ مجھے نیک باتوں کے سوا کوئی مشورہ نہیں دیتا۔

(صحیح مسلم مناقب ۶۹ (۲۸۱۳) ۶۹۷۵، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۶۷)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک بہت بڑا جن گزشتہ رات مجھ پر حملہ آور ہوا تاکہ میری نماز کو خراب کرے، اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قدرت دی تو میں نے اس کو دھکا دے کر بھگا دیا اور میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ میں اس کو مسجد کے ستونوں میں سے کسی ایک ستون کے ساتھ باندھ دوں حتیٰ کہ صبح کو تم سب اسے دیکھتے۔ پھر مجھے اپنے بھائی سلمان کی یہ دعا یاد آئی:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنْبَغِي
لِأَحَدٍ مِّنْ بَعْدِي (ص: ۳۵)

سليمان نے دعا کی اے میرے رب مجھے بخش دے اور مجھے
ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو زیانہ ہو۔

(صحیح مسلم المساجد ۳۹ (۵۳۹) ۱۱۸۹، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۳۴۰)

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ شیطان کو نبی ﷺ پر کوئی غلبہ نہیں بلکہ نبی ﷺ ہی غالب تھے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ نبی ﷺ شیطان کا وسوسہ قبول کریں۔

مثلاً اس آیت میں بہ ظاہر آپ کو خطاب ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے کہ جب شیطان مسلمانوں کو کسی چیز کا وسوسہ ڈالے تو وہ اس کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں انہیں اگر شیطان کی طرف سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے تو وہ خبردار ہو جاتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں (الاعراف: ۲۰۱)

طائف من الشيطان کا معنی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

انسان کو ورغلانے کے لیے انسان کے گرد گردش کرنے والے شیطان کو طائف کہتے ہیں، کسی چیز کا خیال یا اس کی صورت جو نیند اور بیداری میں دکھائی دے اس کو طائف کہتے ہیں۔

(المفردات ج ۲، ص ۳۰۶، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۸ھ)

علامہ المبارک بن محمد المعروف بابن الاثیر جزری متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

طائف کا اصل معنی جنون ہے پھر اس کو غضب، شیطان کے مس کرنے اور اس کے وسوسہ کے معنی میں استعمال کیا گیا اور اس کو طائف بھی کہتے ہیں۔ (التسایع ج ۳، ص ۱۳۹، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۸ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

طائف کا معنی تخیل ہے اور طائف کا معنی شیطان ہے اور اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جو لوگ گناہوں سے بچتے ہیں جب انہیں کوئی وسوسہ لاحق ہو تو وہ اللہ عز و جل کی قدرت میں اور اللہ نے ان پر جو انعام کیے ہیں ان میں غور کرتے ہیں اور پھر معصیت کو ترک کر دیتے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۳۱۳، مطبوعہ دارالافتاء بیروت)

انسان کس طرح غور و فکر کر کے انتقام لینے کو ترک کرے

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

جب انسان کسی دوسرے شخص پر غضب ناک ہو اور اس کے دل میں شیطان یہ خیال ڈالے کہ وہ اس سے انتقام لے تو پھر

- وہ انتقام نہ لینے کی وجوہات پر غور و فکر کرے اور انتقام لینے کے ارادہ کو ترک کر دے۔ وہ وجوہات حسب ذیل ہیں:
- ۱- انسان کو یہ سوچنا چاہیے کہ وہ خود کتنے گناہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو سزا دینے پر قادر ہے، اس کے باوجود اس سے درگزر کرتا ہے اور اس سے انتقام نہیں لیتا سو اس کو بھی چاہیے کہ وہ انتقام لینے کا ارادہ ترک کر دے۔
 - ۲- جس طرح اس کا مجرم بے بس اور مجبور ہے اسی طرح وہ بھی اللہ کا مجرم ہے اور اس کے سامنے مجبور اور بے بس ہے۔
 - ۳- غضب ناک شخص کو ان احکام پر غور کرنا چاہیے جن میں اسے انتقام کو ترک کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔
 - ۴- اس کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر اس نے غضب اور انتقام کے تقاضوں کو پورا کر دیا تو اس کا یہ عمل موزی درندوں کی طرح ہو گا اور اگر اس نے صبر کیا اور انتقام نہیں لیا تو اس کا یہ عمل انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کی مثل ہو گا۔
 - ۵- اس کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جس کمزور شخص سے آج وہ انتقام لینا چاہتا ہے ہو سکتا ہے کل وہ قوی اور قادر ہو جائے اور یہ کمزور اور ناتواں ہو جائے اور اگر وہ اس کو معاف کر دے تو پھر یہ شخص اس کا احسان مند رہے گا۔

(تفسیر کبیر ج ۵، ص ۲۳۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۱۵ھ)

انسان کس طرح غور و فکر کر کے گناہوں کو ترک کرے

امام رازی نے ترک انتقام کی جو یہ وجوہات بیان کی ہیں ان کو معصیت کی دیگر انواع میں بھی جاری کیا جاسکتا ہے۔ جب بھی شیطان انسان کو کسی معصیت اور گناہ پر اکسائے وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعامات پر غور کرے کہ اللہ اس پر اتنی مہربانی کرتا ہے تو کیا یہ انصاف ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے۔ نیز اس پر غور کرے کہ اگر اس نے یہ گناہ کیا تو اس سے شیطان راضی ہو گا اور اللہ ناراض ہو گا تو کیا یہ جائز ہے کہ وہ اللہ کو ناراض اور شیطان کو راضی کرے۔ نیز یہ سوچنا چاہیے اگر آج اس نے اللہ کے حکم کو بھلا دیا تو ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن اللہ اس کو بھلا دے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنْسِكُمْ كَمَا نَسَيْتُمْ لِقَاءَ
يَوْمِكُمْ هَذَا (الجاثیہ: ۳۳)

اور کہا جائے گا آج ہم تمہیں اس طرح بھلا دیں گے جس طرح تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا۔

اور یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ نے اس کو دنیا میں رزق دینے اور پرورش کرنے کا جو وعدہ کیا ہے وہ اس کو پورا کر رہا ہے تو اس نے کلمہ پڑھ کر اللہ کی اطاعت کا جو وعدہ کیا ہے، وہ اس کو کیوں پورا نہیں کر رہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ
تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارے عہد کو پورا کروں

(البقرہ: ۴۰) گا۔

اور یہ سوچنا چاہیے کہ وہ اللہ سے جو دعا کرتا ہے، اللہ اسے قبول کر لیتا ہے تو پھر کیا یہ انصاف کا تقاضا نہیں ہے کہ اللہ اس سے جو کچھ کہے وہ بھی اس پر عمل کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَجِيبْ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَا نِ قَلْبِ سْتَجِيبُوا
جب دعا کرنے والا دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو انہیں بھی چاہیے کہ وہ بھی میرا حکم مانیں۔

(البقرہ: ۱۸۶)

اور یہ غور کرنا چاہیے کہ اگر اس نے وہ گناہ کر لیا تو وہ فساق و فجار کی مثل ہو گا اور اگر اس نے اس گناہ سے دامن بچا لیا تو وہ انبیاء کا تبع اور اولیاء کی مانند ہو گا۔ اور جو شخص فساق و فجار کے کام کرے گا وہ کیسے یہ توقع کر سکتا ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت کی زندگی اللہ کے نیک بندوں کی طرح ہوگی! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ

جن لوگوں نے دلیری سے گناہ کیے ہیں کیا انہوں نے یہ گمان

تَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءٌ مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (الجاثية: ۲۱)

کر لیا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے کہ ان (سب) کی زندگی اور موت برابر ہو جائے۔ وہ کیا ہی برا فیصلہ کرتے ہیں!

اور یہ بھی سوچنا چاہیے کہ وہ اپنے بچوں، اپنے شاگردوں، مریدوں اور اپنے ماتحت لوگوں کے سامنے بے حیائی کے اور برے کام نہیں کرتا اور جب تنہا ہو اور صرف اللہ دیکھ رہا ہو تو وہ بے حیائی اور برائی کے کاموں سے باز نہیں آتا تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہو گا کہ اس کے دل میں اللہ کا اتنا خوف بھی نہیں ہے جتنا اپنے ماتحت لوگوں اور چھوٹوں کا ہے! حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَخَشَوُا اللَّهَ (المائدہ: ۴۴)

تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ہی ڈرو۔

اور یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر اس نے لوگوں کے ڈر سے برے کام چھوڑ بھی دیے تو وہ اس کو کوئی انعام نہیں دیں گے جب کہ اللہ کے ڈر سے اس نے گناہ اور برے کام چھوڑ دیے تو اللہ نے اس سے بہت بڑے انعام کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (النازعات: ۴۱-۴۰)

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس (امارہ) کو (اس کی) خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔

نیز فرمایا:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٍ (الرحمن: ۴۶)

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔

خوف خدا سے مرنے والے نوجوان کو دو جنتیں عطا فرمانا

امام ابو القاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی ۵۷۱ھ روایت کرتے ہیں:

یحییٰ بن ایوب الخزازی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ حضرت عمر بن الخطاب کے زمانہ میں ایک عبادت گزار نوجوان تھا جس نے مسجد کو لازم کر لیا تھا، حضرت عمر اس سے بہت خوش تھے، اس کا ایک بوڑھا باپ تھا، وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے باپ کی طرف لوٹ آتا تھا، اس کے راستہ میں ایک عورت کا دروازہ تھا وہ اس پر فریفتہ ہو گئی تھی، وہ اس کے راستہ میں کھڑی ہو جاتی تھی، ایک رات وہ اس کے پاس سے گزرا تو وہ اس کو مسلسل بہکاتی رہی حتیٰ کہ وہ اس کے ساتھ چلا گیا، جب وہ اس کے گھر کے دروازہ پر پہنچا تو وہ بھی داخل ہو گئی، اس نوجوان نے اللہ کو یاد کرنا شروع کیا اور اس کی زبان پر یہ آیت جاری ہو گئی:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ (الاعراف: ۲۰۱)

بے شک جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں انہیں اگر شیطان کی طرف سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے تو وہ خبردار ہو جاتے ہیں اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

پھر وہ نوجوان بے ہوش ہو کر گر گیا، اس عورت نے اپنی باندی کو بلایا اور دونوں نے مل کر اس نوجوان کو اٹھایا اور اسے اس کے گھر کے دروازہ پر چھوڑ آئیں۔ اس کے گھر والے اسے اٹھا کر گھر میں لے گئے، کافی رات گزرنے کے بعد وہ نوجوان ہوش میں آیا۔ اس کے باپ نے پوچھا اے بیٹے تمہیں کیا ہوا تھا؟ اس نے کہا خیر ہے، باپ نے پھر پوچھا تو اس نے پورا واقعہ سنایا۔ باپ نے

تبیان القرآن

جلد چہارم

پوچھا اے بیٹے تم نے کون سی آیت پڑھی تھی؟ تو اس نے اس آیت کو دہرایا جو اس نے پڑھی تھی اور پھر بے ہوش ہو کر گر گیا گھر والوں نے اس کو ہلایا جلایا لیکن وہ مرچکا تھا۔ انہوں نے اس کو غسل دیا اور لے جا کر دفن کر دیا، صبح ہوئی تو اس بات کی خبر حضرت عمر بنی شیبہؓ تک پہنچی۔ صبح کو حضرت عمر اس کے والد کے پاس تعزیت کے لیے آئے اور فرمایا تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی؟ اس کے باپ نے کہا رات کا وقت تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا ہمیں اس کی قبر کی طرف لے چلو، پھر حضرت عمر اور ان کے اصحاب اس کی قبر پر گئے، حضرت عمر نے کہا اے نوجوان! جو شخص اپنے رب کی سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کے لیے دو جنتیں ہیں؟ تو اس نوجوان نے قبر کے اندر سے جواب دیا: اے عمر! مجھے میرے رب عزوجل نے جنت میں دو بار دو جنتیں عطا فرمائی ہیں۔

(مختصر تاریخ دمشق ترجمہ عمرو بن جامع، رقم: ۱۱۳، ج ۱۹، ص ۱۹۱-۱۹۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حافظ ابن عساکر کے حوالہ سے اس حدیث کو حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ، حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ اور امام علی متقی ہندی متوفی ۹۷۵ھ نے بھی ذکر کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر الاعراف، ۲۰۱، ج ۳، ص ۲۶۹، طبع دار اللاندس بیروت، شرح الصدور ص ۱۳، طبع دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۰۳، کنز العمال ج ۵، ص ۵۱۷-۵۱۸، رقم الحدیث: ۴۶۳۴)

حافظ ابو بکر احمد بن حسین بیہقی متوفی ۴۵۸ھ نے اپنی سند کے ساتھ اس حدیث کو اختصاراً روایت کیا ہے:

حسن بصری بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب کے زمانہ میں ایک نوجوان نے عبادت اور مسجد کو لازم کر لیا تھا، ایک عورت اس پر عاشق ہو گئی، وہ اس کے پاس خلوت میں آئی اور اس سے باتیں کیں اس کے دل میں بھی اس کے متعلق خیال آیا، پھر اس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کا چچا آیا اور اس کو اٹھا کر لے گیا جب اس کو ہوش آیا تو اس نے کہا اے چچا! حضرت عمر کے پاس جائیں ان سے میرا سلام کہیں اور پوچھیں کہ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کی کیا جزا ہے؟ اس کا چچا حضرت عمر کے پاس گیا، اس نوجوان نے پھر چیخ ماری اور جاں بحق ہو گیا۔ حضرت عمر بنی شیبہؓ اس کے پاس کھڑے ہوئے اور کہا تمہارے لیے دو جنتیں ہیں، تمہارے لیے دو جنتیں ہیں۔

(شعب الایمان ج ۱، ص ۲۶۸-۲۶۹، رقم الحدیث: ۷۳۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۰ھ)

امام بیہقی کے حوالے سے اس حدیث کو حافظ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، امام علی متقی ہندی متوفی ۹۷۵ھ اور علامہ آلوسی متوفی ۱۲۷۵ھ نے بھی ذکر کیا ہے۔

(الدر المشور ج ۶، ص ۱۳۷، طبع قدیم، ج ۷، ص ۷۰۸، طبع جدید دار الفکر، کنز العمال رقم الحدیث: ۴۶۳۵، روح المعانی ج ۲، ص ۱۱۶)

حافظ ابن عساکر نے جو حدیث تفصیلاً روایت کی ہے اس پر حافظ ابن کثیر نے بھی اعتماد کیا ہے اور اس کو اپنی تفسیر میں درج کیا ہے اور اس حدیث سے حسب ذیل امور ثابت ہوتے ہیں۔

- ۱- گناہ کی ترغیب کے موقع پر اللہ کو یاد کر کے اس کے خوف سے گناہ کو ترک کر دینا دو جنتوں کے حصول کا سبب ہے۔
- ۲- نیک مسلمان اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور اللہ کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔
- ۳- نیک مسلمانوں اور اولیاء اللہ کی قبروں کی زیارت کے لیے جانا حضرت عمر بنی شیبہؓ کی سنت ہے۔
- ۴- کسی فوت شدہ مسلمان کی تعزیت کے لیے اس کے والدین اور اعزہ کے پاس جانا حضرت عمر کا طریقہ ہے۔
- ۵- صاحب قبر سے کلام کرنا اور صاحب قبر کا جواب دینا، اس حدیث سے یہ دونوں امر ثابت ہیں۔
- ۶- جن احادیث میں ہے کہ قبر والے ایسا جواب نہیں دیتے جن کو تم سن سکو، ان کا معنی یہ ہے کہ تم ان کا جواب عادتاً نہیں

سکتے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور شیطانوں کے بھائی بندان کو گمراہی میں کھینچتے ہیں پھر وہ (ان کو گمراہ کرنے میں) کوئی کمی نہیں کرتے ○ (الاعراف: ۲۰۲)

شیطان کے بھائی بند کی دو تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد انسانوں میں سے شیطان ہیں اور وہ لوگوں کو گمراہ کر کے شیاطین جنات کی مدد کرتے ہیں اور لوگوں کو گمراہ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ شیاطین کے بھائی بند وہ کفار ہیں جو لوگوں کو گمراہ کر کے شیاطین کی مدد کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے رسول معظم!) جب آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے تو یہ کہتے ہیں کہ آپ نے کیوں نہ کوئی نشانی منتخب کر لی! آپ کہئے کہ میں صرف اس چیز کی اتباع کرتا ہوں جس کی میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، یہ (قرآن) تمہارے رب کی طرف سے بصیرت افروز احکام کا مجموعہ ہے اور ایمان لانے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے ○ (الاعراف: ۲۰۳)

کفار کے فرمائشی معجزات نہ دکھانے کی توجیہ

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ شیاطین الانس اور شیاطین الجن لوگوں کو گمراہ کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے۔ اس آیت میں ان کے گمراہ کرنے کی ایک خاص نوع کو بیان فرمایا ہے کہ وہ بطور سرکشی معجزات مخصوصہ طلب کرتے ہیں مثلاً وہ کہتے تھے:

اور انہوں نے کہا ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ زمین سے ہمارے لیے کوئی چشمہ جاری کر دیں ○ یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو جس کے درمیان آپ بتے ہوئے دریا جاری کر دیں ○ یا آپ اپنے قول کے مطابق ہم پر آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں یا آپ ہمارے سامنے فرشتوں کو لے آئیں ○ یا آپ کے لیے سونے کا کوئی گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم آپ کے چڑھنے پر (بھی) ہرگز ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہم پر ایک کتاب نازل کریں جس کو ہم پڑھیں آپ کہئے کہ میرا رب پاک ہے میں تو صرف بشر ہوں اور اللہ کا فرستادہ (رسول)

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوعًا ○ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّجْوِيلٍ ○ وَعِيبٍ فَتَفْجُرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ○ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمَتِ عَلَيْنَا كَيْسَفًا ○ أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ○ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرؤه ○ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيَ هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا ○ (بنو اسرائیل: ۹۳-۹۰)

جب آپ نے ان کے فرمائشی معجزات پیش نہیں کیے تو وہ کہنے لگے کہ اگر اللہ نے آپ کو یہ معجزات نہیں دیے تو آپ اپنی طرف سے یہ معجزات کیوں نہیں پیش کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا آپ کہئے کہ میرے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ میں اللہ سے کوئی مطالبہ یا فرمائش کروں، اللہ تعالیٰ از خود جو چاہتا ہے میرے ہاتھ سے نشانی یا معجزہ صادر فرمادیتا ہے۔ اور ان کے فرمائشی معجزات کو پیش نہ کرنا اسلام کی تبلیغ، ہدایت اور میری نبوت کے اثبات کے منافی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن نازل فرمایا ہے اور اس کا معجز ہونا بالکل ظاہر ہے، اور جو واقعی ہدایت کا طالب ہو اس کے لیے تو یہ قرآن ہی کافی ہے اور جس نے خواہ مخواہ کی حجت بازی کرنا ہو اس کے لیے سینکڑوں دلائل بھی ناکافی ہیں۔ سیدنا محمد ﷺ کی نبوت پر قرآن مجید کی دلالت تو علمی اور عقلی اعتبار سے ہے۔ نبی ﷺ نے بہ کثرت حسی دلائل بھی پیش کیے، جن کو دیکھ کر بغیر غور و فکر کے بدانتہا آپ کا دعویٰ نبوت میں صادق ہونا

تبیان القرآن

جلد چہارم

ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً آپ نے چاند کے دو ٹکڑے کیے، آپ کی دعا سے ڈوبا ہوا سورج طلوع ہو گیا، پھر نے آپ کو سلام کیا، درخت اور اس کے خوشے آپ کے حکم پر چل کر آئے، مختلف جانوروں نے آپ کا کلمہ پڑھا، کئی بار آپ کی انگلیوں سے پانی جاری ہوا اور کتنی مرتبہ کم کھانا بہت زیادہ آدمیوں کے لیے کافی ہو گیا۔ اس طرح کے اور بہت معجزات ہیں، لیکن تمام معجزات کو دیکھنے کے باوجود سرکش اور ضدی کفار ایمان نہیں لائے، چونکہ یہ لوگ طلب ہدایت کے لیے نہیں بلکہ محض حجت بازی اور ضد بحث کے طور پر معجزات کو طلب کرتے تھے اس لیے ان کے فرمائشی معجزات پیش نہیں کیے گئے۔ نیز سابقہ امتوں میں کفار نے فرمائشی معجزات طلب کیے اور معجزات دکھائے جانے کے باوجود جب وہ ایمان نہیں لائے تو ان پر آسمانی عذاب آیا، اب اگر ان کے فرمائشی معجزات پیش کر دیے جاتے اور پھر بھی یہ ایمان نہ لاتے تو ان پر عذاب آنا چاہیے تھا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے:

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ
اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کو عذاب دے جب کہ

(الانفال: ۳۳) آپ ان میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ○

(الاعراف: ۲۰۴)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی عظمت بیان فرمائی تھی کہ یہ قرآن تمہارے رب کی طرف سے بصیرت افروز احکام کا مجموعہ ہے اور ایمان لانے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے اور اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اس کی عظمت کا یہ تقاضا ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو اس کو غور سے سنا جائے اور خاموش رہا جائے۔
قرآن مجید پڑھنے کے آداب

علامہ طاہر بن عبدالرشید بخاری حنفی متوفی ۵۴۲ھ لکھتے ہیں:

فتاویٰ میں مذکور ہے کہ جو شخص قرآن مجید پڑھنے کا ارادہ کرے اس کو چاہیے کہ وہ بہترین کپڑے پہنے، عمامہ باندھے اور قبلہ کی طرف منہ کرے، اسی طرح عالم پر علم کی تعظیم واجب ہے۔ گرمیوں میں صبح کے وقت قرآن مجید کو ختم کرے اور سردیوں میں اول شب میں۔ اگر وہ قرآن مجید پڑھنے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے اور اس کو ریاکاری کا خدشہ ہو تو اس وجہ سے قرآن کریم پڑھنے اور نماز پڑھنے کو ترک نہ کرے، اسی طرح باقی فرائض کو بھی خوف ریاکی وجہ سے ترک نہ کرے۔ لیٹ کر قرآن مجید پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور قرائت کے وقت اپنی ٹانگیں ملالے۔ کسی شخص نے قرآن مجید کا کچھ حصہ یاد کیا ہو پھر اس کو باقی قرآن مجید یاد کرنے کی فرصت مل جائے تو نفل نماز پڑھنے سے قرآن مجید کو یاد کرنا افضل ہے اور فقہ کا علم حاصل کرنا باقی قرآن مجید کے حفظ کرنے سے افضل ہے، اور بغیر علم کے زہد کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ قرآن مجید خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۳۶۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۳۴۲، خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱، ص ۱۰۳-۱۰۲، مطبوعہ مکتبہ

رشیدیہ، کوئٹہ)

علامہ ابراہیم بن محمد حلبی متوفی ۹۵۶ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید کی جتنی مقدار سے نماز جائز ہوتی ہے قرآن مجید کی اتنی مقدار کو حفظ کرنا ہر مکلف پر فرض عین ہے۔ اور سورہ فاتحہ کو اور کسی ایک سورت کو حفظ کرنا واجب ہے اور پورے قرآن کو حفظ کرنا فرض کفایہ ہے۔ اور سنت عین پڑھنا نفل پڑھنے سے افضل ہے اور قرآن مجید کو مصحف سے پڑھنا افضل ہے کیونکہ اس میں قرآن مجید کے مصحف کو دیکھنے اور قرآن مجید کو پڑھنے

تبیان القرآن

جلد چہارم

دونوں عبادتوں کو جمع کرنا ہے اور با وضو ہو کر قبلہ کی طرف منہ کر کے اچھے کپڑے پہن کر تعظیم اور اکرام کے ساتھ قرآن مجید کو پڑھنا مستحب ہے۔ قرائت سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھے۔ اعوذ باللہ ایک بار پڑھنا مستحب ہے بشرطیکہ قرات کے دوران کوئی دنیاوی کام نہ کرے حتیٰ کہ اگر اس نے سلام کا جو ب دیا یا سبحان اللہ یا لا الہ الا اللہ کہا تو اعوذ باللہ کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ فتاویٰ الحج میں مذکور ہے اور النوازل میں مذکور ہے کہ محمد بن مقاتل سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص نے سورہ توبہ کو بغیر بسم اللہ پڑھے پڑھنا شروع کیا تو انہوں نے کہا اس نے خطا کی۔ علامہ سمرقندی نے کہا سورہ توبہ کو اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھ کر پڑھنا شروع کرے اور یہ قول قراء کی تصریح کے مخالف ہے انہوں نے کہا سورہ توبہ سے پہلے بسم اللہ کو اس لیے نہیں لکھا کہ بسم اللہ امان ہے اور سورہ توبہ رفع امان کے لیے ہے۔ یہ حضرت علی اور حضرت ابن عباس سے منقول ہے اور حضرت عثمان نے فرمایا کہ جب بھی کوئی سورت یا آیت نازل ہوتی تو رسول اللہ ﷺ بتا دیتے تھے کہ اس کو فلاں جگہ رکھو اور رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے اور آپ نے سورہ توبہ کا مقام نہیں بتایا اور میں نے دیکھا کہ اس کا قصہ الانفال کے قصہ کے مشابہ ہے کیونکہ الانفال میں عموذ کا ذکر ہے اور اس میں رفع العمود کا ذکر ہے اس لیے میں نے ان دونوں کو ملا دیا اور ایک قول یہ ہے کہ اس میں صحابہ کا اختلاف تھا بعض نے کہا الانفال اور براءة (توبہ) ایک سورت ہیں جو قتال کے لیے نازل ہوئیں اور بعض نے کہا یہ الگ الگ سورتیں ہیں اس لیے ان کے درمیان فاصلہ کو رکھا گیا اور بسم اللہ کو نہیں لکھا گیا۔ اولیٰ یہ ہے کہ چالیس دن میں ایک بار قرآن مجید ختم کیا جائے دوسرا قول یہ ہے کہ سال میں دو بار قرآن مجید ختم کیا جائے امام ابو حنیفہ سے منقول ہے کہ جس نے سال میں دو بار قرآن مجید کو ختم کیا اس نے قرآن کریم کا حق ادا کر دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ ہفتہ میں ایک بار ختم کرے البتہ تین دن سے کم میں قرآن مجید ختم نہ کرے۔ کیونکہ سنن ابوداؤد ترمذی اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تین دن سے کم میں قرآن مجید کو ختم کیا اس نے قرآن مجید کو نہیں سمجھا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۳۹۴، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۹۴۹)

بستر لیٹ کر قرآن مجید پڑھنا جائز ہے۔ سنن ترمذی میں شداد بن اوس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بستر لیٹ کر قرآن مجید کی کوئی سورت پڑھے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کے لیے ایک فرشتہ مقرر کر دیتا ہے جو اس کی ہر موذی چیز سے حفاظت کرتا ہے البتہ ادباً ٹانگیں ملائے، غسل خانہ میں اور مواضع نجاست میں قرآن مجید پڑھنا مکروہ ہے۔ امام بیہقی نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ دفن کے بعد قبر پر سورہ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھنا مستحب ہے۔

(سنن کبریٰ ج ۳، ص ۵۷-۵۶، مطبوعہ بیروت، غنیۃ المستملی، ص ۳۹۷-۳۹۶، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۳۱۲ھ)

قرآن مجید سننے کا حکم آیا نماز کے ساتھ مخصوص ہے یا خارج از نماز کو بھی شامل ہے

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم میں سے بعض بعض کو نماز میں سلام کیا کرتے تھے کہ سلام علی فلاں سلام علی فلاں۔ حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی واذا قرء القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

بشیر بن جابر روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود نے نماز پڑھائی۔ انہوں نے لوگوں کو امام کے ساتھ نماز میں قرآن پڑھتے ہوئے سنا جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو انہوں نے کہا ابھی تک تمہاری سمجھ داری کا وقت نہیں آیا؟ کیا ابھی تک تمہیں عقل نہیں آئی؟ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموش رہو جس طرح تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے۔

یہ حدیث فقہاء احناف کی دلیل ہے کہ نماز میں امام کے پیچھے قرائت نہیں کرنی چاہیے۔ اس حدیث کو امام ابن جریر کے

علاوہ امام ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ نے بھی روایت کیا ہے۔ (تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، رقم الحدیث: ۸۷۳۰)
ان کے علاوہ حافظ ابن کثیر اور حافظ سیوطی نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۲۷۱، الدر المنثور ج ۳، ص ۶۳۵)

طلحہ بن عبید اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک واعظ وعظ کر رہا تھا اور عبید بن عمیر اور عطاء بن ابی رباح باتیں کر رہے تھے۔ میں نے کہا آپ دونوں وعظ نہیں سن رہے اور وعید کے مستحق ہو رہے ہیں، ان دونوں نے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پھر اپنی نصیحت دہرائی، انہوں نے میری طرف دیکھا اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئے، جب میں نے تیسری بار کہا تو انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا یہ حکم صرف نماز کے متعلق ہے۔

مجاہد، سعید بن جبیر اور ضحاک سے بھی روایت ہے کہ قرآن مجید کو غور سے سننے اور خاموش رہنے کا حکم اس وقت ہے جب قرآن مجید کو نماز میں پڑھا جائے۔

حضرت ابن عباس، ابراہیم نخعی، عامر، قتادہ، ابن زید اور زہری سے بھی یہی مروی ہے کہ یہ حکم نماز کے ساتھ مخصوص ہے۔ صحابہ نے کہا نماز کے علاوہ تلاوت کے دوران قرائت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا نماز کے علاوہ قرآن مجید کی تلاوت نفل ہے خواہ وعظ میں ہو، اس تلاوت کے دوران خاموش رہنا فرض نہیں ہے۔

مجاہد اور عطاء بن ابی رباح سے یہ روایت بھی ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے دوران سننے اور خاموش رہنے کا حکم نماز اور خطبہ میں ہے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ یہ حکم جمعہ کے خطبہ کے متعلق ہے۔ نیز مجاہد سے روایت ہے کہ یہ حکم نماز اور خطبہ کے متعلق ہے۔ عطاء بن ابی رباح سے روایت ہے کہ دو وقتوں میں خاموش رہنا واجب ہے جب امام نماز میں قرآن پڑھ رہا ہو یا وہ خطبہ دے رہا ہو۔

حسن بصری، سعید بن جبیر اور عطاء بن ابی رباح سے بھی یہ روایت ہے کہ یہ حکم نماز اور خطبہ دونوں کے متعلق ہے۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۲۲۰-۲۱۶، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

قرآن مجید کی اس ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید کو خواہ نماز میں پڑھا جائے یا خطبہ اور وعظ میں یا اس کی عام تلاوت کی جائے ہر صورت میں قرآن مجید جب پڑھا جائے تو اس کا سننا فرض ہے اور تلاوت اور قرائت کے وقت خاموش رہنا بھی فرض ہے۔

علامہ ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نسفی حنفی متوفی ۷۱۰ھ لکھتے ہیں:

ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن مجید کی قرائت کے وقت اس کو سننا اور خاموش رہنا لازم ہے خواہ یہ قرات نماز میں ہو یا غیر نماز میں۔

آیا قرآن مجید سننا فرض عین ہے یا فرض کفایہ

علامہ طاہر بن عبد الرشید بخاری متوفی ۵۲۲ھ لکھتے ہیں:

ایک شخص فقہ لکھ رہا ہو اور اس کے پہلو میں دوسرا شخص قرآن مجید پڑھ رہا ہو، اور فقہ میں مشغول شخص کے لیے قرآن مجید سننا ممکن نہ ہو تو نہ سننے والے کا گناہ قرآن مجید پڑھنے والے کو ہو گا، اسی اصل پر اگر کوئی شخص رات کو چھت پر بلند آواز سے قرآن مجید پڑھے اور لوگ سوئے ہوئے ہوں تو وہ شخص گنہ گار ہو گا۔ (خلاصۃ الفتاویٰ ج ۱، ص ۱۰۳، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، کونٹہ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

نماز اور خارج نماز میں قرآن مجید کو سننا مطلقاً واجب ہے، کیونکہ یہ آیت ہر چند کہ نماز کے متعلق وارد ہے، لیکن اعتبار خصوصیت سبب کا نہیں عموم الفاظ کا ہوتا ہے، اور یہ حکم اس وقت ہے جب کوئی عذر نہ ہو۔ قیہ میں مذکور ہے کہ گھر میں بچہ قرآن مجید پڑھ رہا ہو اور گھر والے کام کاج میں مشغول ہوں تو وہ نہ سننے میں معذور ہوں گے بشرطیکہ انہوں نے اس کے پڑھنے سے پہلے کام شروع کیا ہو، ورنہ وہ معذور نہیں ہوں گے۔ اس کے بعد علامہ شامی نے خلاصۃ الفتاویٰ کی عبارت نقل کی ہے کہ اگر فقہ میں مشغول شخص کے پاس کوئی قرآن پڑھے یا رات کو چھت پر پڑھے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں تو ان کے نہ سننے کا گناہ پڑھنے والے پر ہوگا۔ کیونکہ ان کے نہ سننے کا سبب پڑھنے والا ہے۔ یا وہ سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کر کے ازیت پہنچا رہا ہے، اس میں غور کرنا چاہیے، اور شرح المنیہ میں یہ مذکور ہے کہ اصل میں قرآن کریم کا سننا فرض کفایہ ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی تلاوت کا حق یہ ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی تلاوت کو ضائع نہ کیا جائے اور بعض کے خاموش ہو جانے سے یہ حق ادا ہو جاتا ہے، جیسے سلام کا جواب دینا واجب ہے تاکہ مسلمان کے حق کی رعایت ہو اور بعض کے جواب دینے سے یہ حق ادا ہو جاتا ہے اور باقی مسلمانوں سے یہ وجوب ساقط ہو جاتا ہے۔ البتہ قرآن کریم پڑھنے والے پر اس کا احترام کرنا واجب ہے بایں طور کہ وہ بازاروں میں قرآن مجید نہ پڑھے اور نہ ان مقامات پر قرآن کریم پڑھے جہاں لوگ اپنے کاموں میں مشغول ہوں اور اگر اس نے وہاں پڑھا تو قرآن مجید کی حرمت کو ضائع کرنے والا وہی شخص ہوگا، سو وہی گنہ گار ہوگا کہ مشغول لوگ، تاکہ لوگوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے میں حرج نہ ہو۔ (غنیۃ المستملی ص ۹۷، مطبوعہ لاہور، ۱۳۱۲ھ) قاضی القضاة یحییٰ منقاری زادہ نے اس موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے اور اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید کا سنن فرض عین ہے۔

(رد المحتار ج ۱، ص ۳۶۷-۳۶۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۰۷ھ)

علامہ سید احمد مظاہری حنفی متوفی ۱۲۳۱ھ نے غنیۃ المستملی کے حوالے سے یہی لکھا ہے کہ قرآن مجید کا سننا فرض کفایہ ہے۔

(حاشیۃ اللطفاوی علی الدر المختار، ج ۱، ص ۲۳۷، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۵ھ)

علامہ ابراہیم حلبی صاحب غنیۃ المستملی متوفی ۹۵۶ھ نے قرآن مجید سننے کے حکم کو فرض کفایہ قرار دیا ہے اور علامہ شامی اور علامہ مظاہری نے ان کی اتباع کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں مسلمانوں کے لیے آسانی ہے، لیکن ان کی دلیل دو وجہ سے صحیح نہیں ہے اولاً اس لیے کہ انہوں نے قرآن مجید سننے کے حکم کو سلام کا جواب دینے کے حکم پر قیاس کیا ہے حالانکہ سلام کا جواب دینے کا حکم خبر واحد سے ثابت ہے اور اس کا وجوب ظنی ہے اور قرآن مجید سننے کا حکم خود قرآن کریم سے ثابت ہے اور اس کی فرضیت قطعی ہے، سو یہ اعلیٰ کو ادنیٰ پر قیاس کرنا ہے، اور ثانیاً اس لیے کہ سلام کا جواب دینے میں مسلمان کے حق کی رعایت ہے اور قرآن مجید سننے میں اور تلاوت کے وقت خاموش رہنے میں اللہ کے کلام کے حق کی رعایت ہے اور اللہ کے کلام کے حق کی رعایت بندہ کے حق کی رعایت سے کئی درجہ افضل ہے۔ نیز اس سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن مجید کی ایک محفل میں تلاوت کی جارہی ہو اور ایک آدمی خاموش ہو کر سننے اور باقی شرکاء محفل تلاوت کی طرف توجہ نہ کریں اور آپس میں باتیں کرتے رہیں تو یہ امر جائز ہو حالانکہ اس میں قرآن مجید کی صریح بے حرمتی ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک قاضی منقاری زادہ کا یہ قول صحیح ہے کہ قرآن مجید کا سننا فرض عین ہے۔

قرآن مجید سننے کے حکم میں مذاہب فقہاء

اس سلسلہ میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ فقہاء احناف میں سے علامہ منقاری زادہ کے نزدیک قرآن مجید سننا فرض عین ہے اور یہی صحیح ہے اور علامہ حلبی کے نزدیک فرض کفایہ ہے۔

امام مالک کے نزدیک قرآن مجید نماز میں پڑھا جائے یا خارج از نماز اس کا سننا واجب ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن ج ۷، ص ۳۱۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ و اذا قرء فانصتوا (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۴) جب امام قرائت کرے تو خاموش رہو حافظ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

یہ حدیث امام مالک کی اور ان فقہاء کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ جب امام بلند آواز سے قرائت کرے تو مقتدی قرائت نہ کرے اور امام دار قطنی کا اس حدیث پر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ اس حدیث کی صحت پر حفاظ کا اجماع نہیں ہے۔ کیونکہ امام مسلم نے اس حدیث کے صحیح ہونے کی تصریح کی ہے۔ (المفہم ج ۲، ص ۳۹، مطبوعہ دار ابن کثیر، بیروت، ۱۳۱۷ھ)

امام احمد بن حنبل کے نزدیک بھی قرآن مجید کا سننا فرض ہے کیونکہ علامہ موفق الدین عبداللہ بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں:

مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے و اذا قرء القرآن فاستمعوا له وانصتوا (الاعراف: ۲۰۴) اور حضرت ابو ہریرہ نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں آپ نے بلند آواز سے قرائت کی تھی۔ پھر فرمایا کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرائت کی تھی؟ ایک شخص نے کہا ہاں! یا رسول اللہ! میں نے قرائت کی تھی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تب ہی میں سوچ رہا تھا کہ مجھے قرآن پڑھنے میں دشواری کیوں ہو رہی ہے۔ پھر لوگ ان نمازوں میں قرائت کرنے سے رک گئے جن نمازوں میں رسول اللہ ﷺ بلند آواز سے قرائت کرتے تھے۔ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنا۔

(الموطا رقم الحدیث: ۱۹۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۹۱۸، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۳۱۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۲۸-۳۲۹، مسند

احمد ج ۲، ص ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ج ۵، ص ۳۲۵، الکافی ج ۱، ص ۲۳۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۳ھ)

فقہاء شافعیہ کے نزدیک جب قرآن کریم پڑھا جائے تو اس کا سننا مستحب ہے۔ قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی شافعی متوفی ۶۸۵ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کے ظاہر الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی قرآن پڑھا جائے تو اس کا سننا مطلقاً واجب ہو اور عامۃ العلماء کے نزدیک خارج از نماز قرآن مجید کا سننا مستحب ہے اور جو علماء امام کے پیچھے مقتدی کی قرائت کو واجب نہیں کہتے وہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اور یہ استدلال ضعیف ہے۔ (انوار التزیل و اسرار التاویل مع حاشیہ الکاظمی، ج ۳، ص ۸۶)

ڈاکٹر وجہ زحلی مصری لکھتے ہیں:

جن محفلوں میں قرآن مجید کی قرائت کی جائے ان میں قرآن کریم سننے اور خاموش رہنے کو ترک کرنا بہت سخت مکروہ ہے۔ مومن پر لازم ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت اس کے سننے پر حریص ہو، جیسا کہ وہ مجلس میں قرآن مجید کی تلاوت پر حریص ہوتا ہے۔ (التفسیر المنیر ج ۹، ص ۲۳۰-۲۲۹، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۱ھ)

صحیح یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کی جائے تو اس کا سننا اور خاموش رہنا ہر حال میں اور ہر کیفیت میں واجب ہے خواہ نماز ہو یا غیر نماز ہو۔ (التفسیر المنیر ج ۹، ص ۲۳۲، مطبوعہ بیروت)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اللہ کی کتاب کی کسی ایک آیت کو بھی غور سے سنا ہے اس کے لیے دگنی چوگنی نیکی لکھی جائے گی اور جس نے اس آیت کی تلاوت کی وہ قیامت کے دن اس کے لیے نور

ہوگی۔ (اس حدیث کی سند ضعیف ہے)

(مسند احمد ج ۲، ص ۳۴۱، مسند احمد ج ۸، رقم الحدیث: ۸۴۷۵، طبع قاہرہ، الجامع الصغیر رقم الحدیث: ۸۴۲۵)

امام کے پیچھے قرآن سننے میں مذاہب اربعہ

امام ابو اسحاق ابراہیم بن علی الفیروز آبادی اشیرازی الشافعی المتوفی ۴۵۵ھ لکھتے ہیں:

آیا مقتدی پر بھی سورہ فاتحہ کی قرائت واجب ہے اس میں غور کیا جائے گا اگر وہ ایسی نماز ہے جس میں آہستہ قرائت کی جاتی ہے تو مقتدی پر سورہ فاتحہ کی قرائت واجب ہے اور اگر وہ ایسی نماز ہے جس میں بلند آواز سے قرائت کی جاتی ہے تو اس میں دو قول ہیں، کتاب الام اور ابو یعلیٰ میں مذکور ہے کہ اس میں مقتدی پر سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، کیونکہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے ہم کو صبح کی نماز پڑھائی آپ پر قرائت دشوار ہو گئی، آپ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا میں دیکھ رہا تھا کہ تم اپنے امام کے پیچھے قرائت کر رہے تھے! ہم نے کہا اللہ کی قسم ہاں ہم ایسا کر رہے تھے، آپ نے فرمایا سورہ فاتحہ کے سوا ایسا نہ کیا کرو، کیونکہ جو شخص سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی، اور امام شافعی کا قدیم قول یہ ہے کہ جہری نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھے کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں آپ نے بلند آواز سے قرائت کی تھی آپ نے پوچھا کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرائت کی تھی، ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا (تبھی) میں یہ سوچ رہا تھا کہ میری تلاوت میں دشواری کیوں ہو رہی ہے، جب مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سنا تو جن نمازوں میں رسول اللہ ﷺ بلند آواز سے قرائت کرتے تھے، ان نمازوں میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرائت کرنا ترک کر دیا۔ (المہذب ج ۱، ص ۷۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

فقہاء حنبلیہ کے اس مسئلہ میں مختلف اور متضاد اقوال ہیں

علامہ شمس الدین محمد بن مفلح المقدسی الحنبلی المتوفی ۷۶۳ھ لکھتے ہیں:

اثرم نے نقل کیا ہے کہ مقتدی کے لیے سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہے، ابن الزاغوانی نے شرح الخرقی میں اسی طرح ذکر کیا ہے، اور ہمارے اکثر اصحاب اس کے وجوب کو نہیں پہچانتے، اس کو نوادر میں نقل کیا ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے۔ ابن المنذر نے ذکر کیا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ جس نماز میں آہستہ قرائت ہوتی ہے اس میں مقتدی سورہ فاتحہ پڑھے۔ ابو داؤد نے نقل کیا ہے کہ ہر رکعت میں جب امام بلند آواز سے قرائت کرے تو مقتدی اس کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھے اور انہوں نے کہا کہ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ پڑھنا کفایت کرے گا اور سری نماز میں سورہ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے اور سلکات میں پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔

(کتاب الفروع ج ۱، ص ۴۲۷، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، ۱۴۰۵ھ)

علامہ ابن قدامہ حنبلی متوفی ۶۳۰ھ نے لکھا ہے کہ مقتدی پر سورہ فاتحہ پڑھنا واجب نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

وإذا قرء القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔ (الاعراف: ۲۰۴)

(الکافی ج ۱، ص ۲۴۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن علی الخرشی المالکی المتوفی ۱۱۰ھ لکھتے ہیں:

فرض نماز اور نفل نماز میں امام پر سورہ فاتحہ پڑھنا واجب ہے اور مقتدی پر واجب نہیں ہے کیونکہ حدیث میں ہے امام کی قرائت مقتدی کی قرائت ہے خواہ نماز سری ہو یا جہری۔ البتہ سری نماز میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا مستحب ہے۔

(حاشیہ الخرشی علی مختصر سیدی خلیل ج ۱، ص ۲۶۹، مطبوعہ دار صادر بیروت)

فقہاء احناف کے نزدیک نماز سری ہو یا جہری، امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے علامہ علاء الدین ابو بکر بن مسعود الکاسانی الحنفی المتوفی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں:

ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الاعراف: ۲۰۴)

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنا اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو غور سے سننے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے اور جن نمازوں میں آہستہ قرائت کی جاتی ہے ان میں اگرچہ سنا ممکن نہیں ہے لیکن خاموش رہنا ممکن ہے۔ پس اس سے ظاہر نص کے اعتبار سے ان نمازوں میں خاموش رہنا واجب ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے امام کے پیچھے قرائت کرنے کو ترک کر دیا اور ان کے امام رسول اللہ ﷺ تھے۔ پس ظاہر ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے امر سے قرائت کو ترک کیا تھا اور حدیث مشہور میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے امام کو اس لیے امام بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے سو تم اس سے اختلاف نہ کرو جب وہ تکبیر پڑھے تو تم تکبیر پڑھو اور جب وہ قرآن پڑھے تو تم خاموش رہو۔ اس حدیث میں امام کی قرائت کے وقت خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۴۰۴)

ہمارے نزدیک بغیر قرات کے کوئی نماز صحیح نہیں ہوتی اور مقتدی کی نماز بغیر قرات کے نہیں ہے بلکہ یہ نماز قرات کے ساتھ ہے اور وہ امام کی قرات ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے جس شخص کا امام ہو تو امام کی قرات اس شخص کی قرات ہے۔

(یہ حدیث حضرت جابر، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت انس اور حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۸۵۰، شرح معانی الآثار ج ۱، ص ۱۲۸، سنن دار قطنی رقم الحدیث: ۱۲۵۰، حلیۃ الاولیاء ج ۷، ص ۳۸۹، رقم الحدیث: ۱۰۹۵۷، طبع جدید، زوائد البوصیری ج ۲، ص ۳۳۴، رقم الحدیث: ۱۳۴۰، المعجم الاوسط ج ۸، رقم الحدیث: ۷۵۷۵، مجمع الزوائد ج ۲، ص ۱۱۱، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۲۷۹۷، مسند احمد ج ۳، ص ۳۳۹، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۲، ص ۱۶۱-۱۶۰، کمال ابن عدی ج ۶، ص ۲۱۰، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱، ص ۳۷۷، کتاب الآثار للامام محمد ص ۱۷، کتاب الآثار لابن یوسف ص ۲۳، رقم الحدیث: ۱۱۳، بدائع الصنائع ج ۱، ص ۵۲۳، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۸ھ)

اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن یہ حدیث متعدد اسانید سے مروی ہے اس لیے تعدد اسانید کی وجہ سے یہ حدیث حسن لغیرہ ہے اور اسی (۸۰) کبار صحابہ سے امام کے پیچھے قرات کی ممانعت منقول ہے جن میں حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر بھی ہیں اور کئی صحابہ سے یہ منقول ہے کہ امام کے پیچھے قرات کرنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، جبکہ صحیح یہ ہے کہ امام کے پیچھے قرات کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

امام کے پیچھے قرات نہ کرنے کے متعلق احادیث

نافع بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب یہ سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قرات کرے تو وہ فرماتے جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرات اس کے لیے کافی ہے۔ اور جب وہ اکیلا نماز پڑھے تو قرات کرے۔ نافع نے کہا کہ حضرت عبداللہ بن عمر امام کے پیچھے قرات نہیں کرتے تھے۔ (یہ صحیح حدیث ہے)

(الموطا رقم الحدیث: ۱۹۳، سنن دار قطنی رقم الحدیث: ۱۳۸۸، سنن کبریٰ ج ۲، ص ۱۶۱، موطا امام محمد ص ۹۳، شرح معانی

الآثار ص ۱۲۹)

امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی متوفی ۳۲۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا قرات کے لیے خاموش رہو کیونکہ نماز میں صرف ایک شغل ہے اور تمہیں امام کی قرات کافی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے قرات کرتا ہے کاش اس کے منہ میں مٹی بھر دی جاتی۔ عبید اللہ بن مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت جابر بن عبداللہ سے سوال کیا تو انہوں نے کہا کہ کسی نماز میں بھی امام کے پیچھے قرات نہ کرو۔

ابو حمزہ نے حضرت ابن عباس سے سوال کیا کہ کیا وہ امام کے پیچھے قرات کریں، حضرت ابن عباس نے فرمایا نہیں۔

(شرح معانی الآثار ص ۱۲۹، مطبوعہ مجبائی پاکستان، لاہور)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عمر، حضرت جابر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن مسعود سے امام کے پیچھے قرات کی ممانعت ثابت ہے اور حضرت ابو سعید، حضرت عمر اور حضرت ابن عباس سے بھی روایات وارد ہیں۔

(الدرایہ مع الہدایہ الاولین ص ۱۲۱، مطبوعہ مکتبہ شرکت ملیہ، ملتان)

جریر از سلیمان از قوادہ از حضرت عبداللہ بن مسعود روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب امام قرات کرے تو خاموش رہو۔ (امام مسلم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے)

(صحیح مسلم صلاۃ: ۶۳، (۴۰۴) ۸۸۰، مسند احمد ج ۳، ص ۳۹۶، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۹۷۳-۹۷۴)

ان احادیث کے علاوہ ہم متعدد حوالہ جات کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کا امام ہو تو امام کی قرات ہی اس کی قرات ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اپنے رب کو اپنے دل میں خوف اور عاجزی کے ساتھ یاد کرو اور زبان سے آواز بلند کیے بغیر صبح اور شام کو یاد کرو اور غفلت کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ (الاعراف: ۲۰۵)

ذکر خفی کی فضیلت

اس آیت میں یا تو خصوصیت کے ساتھ نبی ﷺ کو خطاب ہے یا اس سے ہر سننے والا مخاطب مراد ہے، اس آیت میں دل سے اللہ کو یاد کرنے کا حکم دیا ہے یا آہستہ اور پست آواز سے ذکر کرنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میں اپنے بندہ کے گمان کے موافق ہوں، اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ میرا ذکر کرتا ہے، اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ ایک جماعت میں میرا ذکر کرے تو میں اس سے بہتر جماعت میں اس کا ذکر کرتا ہوں، اگر وہ ایک باشت میرے قریب ہو تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب ہو تو میں دونوں ہاتھوں کے پھیلاؤ کے برابر اس کے قریب ہوتا ہوں، اور اگر وہ میرے پاس چلتا ہوا آئے تو میں اس کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہوں۔

(صحیح مسلم الذکر ص ۲۱، ۲۶، ۲۷، ۲۸، مسند احمد ج ۲، ص ۳۵۳، طبع قدیم، مسند احمد ج ۸، رقم الحدیث: ۸۶۳۵، طبع قاہرہ)

آہستہ آہستہ ذکر کرنے یا دل میں ذکر کرنے کی فضیلت یہ ہے کہ آہستہ آہستہ ذکر کرنا اخلاص کے زیادہ قریب ہے اور اس کا قبول ہونا زیادہ متوقع ہے۔ اور ذکرنی نفس سے مراد یہ ہے کہ جن اذکار کا وہ زبان سے ذکر کر رہا ہے ان کے معانی سے واقف ہو، اور اس کا دل ذکر کے معانی کی طرف متوجہ ہو اور اس کا ذہن اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلالت میں ڈوبا ہوا ہو، کیونکہ اگر وہ خالی زبان

سے ذکر کرے اور دل اس کے معنی کے تصور اس کی یاد اور خضوع اور خشوع سے خالی ہو تو وہ ذکر بے سود ہے، بلکہ بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ ایسے ذکر سے کوئی ثواب نہیں ملتا۔

معتدل آواز کے ساتھ جہر یا ذکر ممنوع نہیں ہے

دون الحھر من القول زبان سے آواز بلند کیے بغیر اس کا معنی ہے چلا چلا کر ذکر نہ کیا جائے یا گلا پھاڑ کر ذکر نہ کیا جائے جیسے کوئی شخص بہرے سے بات کر رہا ہو یا کسی دور کھڑے ہوئے آدمی سے چلا کر بات کر رہا ہو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے مسلمان بلند آواز کے ساتھ اللہ اکبر اللہ اکبر کہہ رہے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا اے لوگو! اپنے نفسوں کے ساتھ نرمی کرو تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے تم سننے والے اور قریب کو پکار رہے ہو جو تمہارے ساتھ ہے، پھر آپ نے فرمایا در آنحالیکہ میں آپ کے پیچھے تھا اور میں کہتا ہوں لا حول ولا قوۃ الا باللہ گناہوں سے بچنا اور نیکی کی طاقت اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے پھر فرمایا اے عبد اللہ بن قیس! کیا میں تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ کی رہنمائی نہ کروں، میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۳۰۹، صحیح مسلم ذکر ۴۴، (۲۷۰۳) ۶۷۳۵، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۲۸، ۱۵۲۷، ۱۵۲۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۳۷۲، مسند احمد ج ۳، ص ۳۹۲، ۴۰۳)

اس حدیث سے واضح ہو گیا کہ آپ نے گلا پھاڑ کر اور چلا چلا کر ذکر کرنے سے منع فرمایا ہے اور قرآن مجید کی یہ آیت اور یہ حدیث معتدل آواز کے ساتھ ذکر بالجہر کے منافی نہیں ہے۔

ذکر کے لیے صبح اور شام کے اوقات کی تخصیص کی حکمت

صبح اور شام کے اوقات کو ذکر کے ساتھ خاص فرمایا ہے، یوں تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے اور کسی وقت اس کے ذکر اور اس کی یاد سے غافل نہیں رہنا چاہیے لیکن ان اوقات کی خصوصیت یہ ہے کہ صبح کے وقت انسان نیند سے بیدار ہوتا ہے اور نیند بہ منزلہ موت ہے اور بیداری بہ منزلہ حیات ہے اور اس وقت جہان بھی ظلمت سے نور کی طرف منتقل ہوتا ہے اس لیے اس وقت میں اس خاص نعمت پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے۔ اور شام کا وقت جو بہ منزلہ موت ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے کیونکہ موت کے بعد ہی انسان اخروی نعمتوں سے ہم کنار ہوتا ہے، نیز ان اوقات میں انسان پر سکون ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے بہت مناسب اوقات ہیں۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فجر کے وقت رات کے فرشتے جا رہے ہوتے ہیں اور دن کے فرشتے آرہے ہوتے ہیں تو دونوں فرشتے اس کے ذکر کو لکھ لیں گے اور اسی طرح شام کے وقت میں بھی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جو آپ کے رب کی بارگاہ کے مقربین ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں (الاعراف: ۲۰۶)

فرشتوں کی کثرت عبادت سے انسان کو عبادت پر ابھارنا

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کی تلقین کی تھی اور دائماً ذکر کرنے کی ترغیب دی تھی اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ذکر کے محرکات اور بواعث کو مزید تقویت دی ہے اور فرمایا جو آپ کے رب کی بارگاہ کے مقربین ہیں وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ فرشتے بہت مکرّم اور مشرف ہیں وہ طاہر اور معصوم ہیں وہ شہوت اور غضب کے محرکات سے بری ہیں اور کینہ اور حسد کے بواعث سے منزہ ہیں، ان اوصاف اور کمالات کے باوجود جب وہ دائماً اللہ عزوجل

کی عبادت کرتے ہیں اور خضوع اور خشوع سے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور انسان جو کہ جسمانی عظمتوں اور بشری کثافتوں کا مرقع ہے اور شہوت اور غضب کے تقاضوں کی آماجگاہ ہے تو وہ اس بات کے زیادہ لائق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی زیادہ عبادت کرے۔ فرشتوں کی اطاعت اور عبادت کے متعلق قرآن مجید کی اور بھی آیات ہیں:

لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ○ (التحریم: ۶)

وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ○ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّون ○ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ ○ (الصف: ۱۶۶-۱۶۴)

اور ہم (فرشتوں) میں سے ہر ایک کے لیے اس کے قیام کی جگہ مقرر ہے ○ اور بے شک ہم ہی صاف باندھنے والے ہیں ○ اور بے شک ہم ہی تسبیح کرنے والے ہیں۔

وَتَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِظِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (الزمر: ۷۵)

اور آپ فرشتوں کو دیکھیں گے کہ وہ عرش الہی کے گرد حلقہ باندھے ہوئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر رہے ہوں گے۔

فرشتوں کی کثرت عبادت ان کی افضلیت کو مستلزم نہیں

قرآن مجید کی اس آیت میں فرشتوں کی طہارت اور عصمت اور قدر و منزلت کے باوجود ان کی اطاعت اور عبادت کو بیان کر کے عام مسلمانوں کو اللہ کی اطاعت اور عبادت پر براہِ راست فرمایا ہے۔ ان آیات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فرشتے انبیاءِ علیہم السلام سے افضل ہیں کیونکہ ان آیات میں خطاب عام مسلمانوں کی طرف متوجہ ہے اور جہاں تک افضلیت کا تعلق ہے تو ہمارے متکلمین نے تصریح کی ہے کہ رسل بشر رسل ملائکہ سے افضل ہیں اور رسل ملائکہ عامتہ البشر سے افضل ہیں اور عامتہ البشر (نیک مسلمان) عامتہ الملائکہ سے افضل ہیں اور جہاں تک فرشتوں کی کثرت عبادت اور اطاعت کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ فرشتوں میں شہوت اور غضب کا مادہ نہیں رکھا گیا اور ان میں بھوک اور پیاس اور دیگر انسانی اور بشری تقاضے نہیں رکھے گئے اور ان کو اطاعت اور عبادت سے روکنے اور منع کرنے والی کوئی چیز نہیں، نہ ان پر کسی کی کفالت کی ذمہ داری ہے اور انسان کے ساتھ یہ تمام عوارض ہیں سو ان عوارض اور ان تقاضوں کے باوجود انسان کا گناہوں سے رکن اور اللہ کی عبادت کرنا فرشتوں کی عبادت سے کہیں افضل ہے جو ان عوارض اور موانع کے بغیر عبادت کرتے ہیں۔

حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے ولہ یسجدون کا تعارض اور اس کے جوابات

اس آیت کے آخر میں فرمایا ہے اور فرشتے اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔ اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو سجدہ نہیں کرتے حالانکہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تھا! امام رازی نے امام غزالی سے اس سوال کا یہ جواب نقل کیا ہے کہ زمین کے فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا اور آسمان کے عظیم فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ اس لیے اثبات اور نفی کے محل الگ الگ ہیں۔ پھر امام رازی نے خود اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت میں نفی عموم ہے اور حضرت آدم کے قصہ میں خاص فرشتوں کے سجدہ کا ذکر ہے اور خاص عام پر مقدم ہوتا ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۲۳۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۱۵ھ)

امام غزالی اور امام رازی کی عظمتیں مسلم ہیں لیکن میرے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں سجدہ عبودیت کی نفی ہے یعنی فرشتے اللہ کے سوا کسی کو عبادت کا سجدہ نہیں کرتے اور حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم

سے سجدہ تعظیم کیا تھا اور اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ حضرت آدم کو صرف زمین کے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا جبکہ قرآن مجید میں یہ تصریح ہے کہ حضرت آدم کو سب فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ فسجد الملائكة كلهم اجمعون الا ابليس (الحجر: ۳۰) تو ابلیس کے سوا سب کے سب فرشتوں کے اکٹھے ہو کر آدم کو سجدہ کیا نیز البقرہ: ۳۲ کی تفسیر میں خود امام رازی نے یہ تصریح کی ہے کہ اکثرین کا مذہب یہ ہے کہ سب فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا اس پر دو دلیلیں ہیں ایک یہ کہ سورۃ الحجر کی آیت میں جمع کا صیغہ ہے پھر اس کو کل اور اجمعون کی تاکیدات سے موکد کیا ہے۔ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں صرف ابلیس کا استثناء کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ البتہ بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا اور کہا کہ صرف زمین کے فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا تھا اور انہوں نے اس کو مستبعد جانا کہ اکابر ملائکہ کو حضرت آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے۔ (تفسیر کبیر ج ۱، ص ۲۲۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۱۵ھ)

اس لیے محفوظ جواب یہی ہے کہ سب فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ تعظیم ادا کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو فرشتے سجدہ عبادت نہیں کرتے اور سیاق کلام بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تلقین کی جا رہی ہے کہ فرشتے اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں اس کے غیر کو سجدہ عبادت نہیں کرتے۔

سجدہ تلاوت کی تحقیق

سورۃ الاعراف کی یہ آخری آیت ہے اور قرآن مجید میں یہ پہلی آیت سجدہ ہے اور آخری آیت سجدہ سورۃ العلق کی آخری آیت ہے واسجد واقترب (العلق: ۱۹) آیات سجدہ کے متعلق فقہاء کے دو قسم کے اختلاف ہیں، ایک اختلاف اس میں ہے کہ آیت سجدہ کا حکم کیا ہے آیا اس آیت کو پڑھنے یا سننے کے بعد اس آیت پر سجدہ کرنا سنت ہے یا واجب؟ اور دوسرا اختلاف آیات سجدہ کی تعداد میں ہے۔ ہم پہلے آیات سجدہ کے حکم میں فقہاء کا اختلاف بیان کریں گے اور پھر ان کی تعداد میں فقہاء کے مذاہب بیان کریں گے۔

سجدہ تلاوت کے حکم میں مذاہب فقہاء

امام مالک بن انس اسبجی متوفی ۱۷۹ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عروہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے دن منبر کے اوپر سجدہ کی آیت تلاوت کی پھر منبر سے اتر کر سجدہ کیا اور مسلمانوں نے بھی ان کے ساتھ سجدہ کیا، دوسرے جمعہ کو پھر اس آیت کو پڑھا تو مسلمان سجدہ کے لیے تیار ہوئے، حضرت عمر نے کہا اپنی جگہ بیٹھے رہو، بے شک اللہ نے ہم پر اس سجدہ کو فرض نہیں کیا مگر یہ کہ ہم سجدہ کرنا چاہیں پھر حضرت عمر نے سجدہ نہیں کیا اور لوگوں کو سجدہ کرنے سے منع کیا۔ (موطأ امام مالک رقم الحدیث: ۴۸۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۰۹ھ)

امام ابو اسحق ابراہیم بن علی فیروز آبادی شیرازی شافعی متوفی ۴۵۵ھ لکھتے ہیں:

قرآن کی تلاوت کرنے والے اور اس کو غور سے سننے والے دونوں کے لیے سجدہ تلاوت مشروع ہے، کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے سامنے قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور جب سجدہ کی آیت سے گزرتے تو اللہ اکبر کہہ کر سجدہ کرتے اور ہم بھی آپ کے ساتھ سجدہ کرتے، اور اگر قرآن پڑھنے والا سجدہ تلاوت ادا نہ کرے تو اس کو غور سے سننے والا سجدہ کرے، کیونکہ سجدہ دونوں کی طرف متوجہ ہوا ہے تو ایک کے سجدہ ترک کرنے کی وجہ سے دوسرا سجدہ کو ترک نہ کرے، اور جس شخص نے کسی شخص سے تلاوت سنی لیکن وہ اس کو غور سے نہیں سن رہا تھا (آیت سجدہ کی طرف متوجہ نہ تھا) تو اس کے متعلق امام شافعی نے کہا میں اس پر سجدہ کرنے کی ایسی تاکید نہیں کرتا جیسے میں غور سے سننے والے کو سجدہ

کرنے کی تاکید کرتا ہوں۔ کیونکہ حضرت عمر اور حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما نے فرمایا سجدہ اس پر ہے جو غور سے سنے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا سجدہ اس پر ہے جو اس کے لیے بیٹھے۔ اور سجدہ تلاوت کرنا سنت ہے واجب نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے سورہ النجم پڑھی تو ہم میں سے کسی شخص نے سجدہ نہیں کیا۔ (المہذب ج ۱ ص ۸۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ موفق الدین عبد اللہ بن قدامہ مقدسی حنبلی متونی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں:

سجدہ تلاوت واجب نہیں ہے کیونکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے نبی ﷺ کے سامنے سورہ النجم پڑھی تو ہم میں سے کسی نے بھی سجدہ نہیں کیا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اور حضرت عمر نے کہا اے لوگو! ہم آیات سجدہ کے ساتھ گزرتے تھے تو جو سجدہ کر لیتا وہ درست کرتا اور جو سجدہ نہیں کرتا اس پر کوئی گناہ نہیں تھا اور اللہ تعالیٰ نے ہم پر سجدہ تلاوت فرض نہیں کیا۔

(الکافی ج ۱ ص ۲۷۱-۲۷۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۳ھ)

علامہ علی بن ابی بکر المرغینانی الحنفی متونی ۵۹۳ھ لکھتے ہیں

تلاوت کرنے والے پر اور سننے والے پر سجدہ تلاوت ادا کرنا واجب ہے خواہ اس نے سننے کا قصد کیا ہو یا نہیں۔ کیونکہ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: سجدہ اس پر ہے جو اس کو سننے اور جو اس کی تلاوت کرے "لفظ" علی" وجوب کے لیے آتا ہے اور حدیث میں قصد کی قید نہیں ہے۔ (ہدایہ اولین ص ۱۶۳، مطبوعہ شرکہ علیہ ملتان)

علامہ المرغینانی نے جو حدیث نقل کی ہے وہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں بلکہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ اللہبی المتونی ۲۳۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ سجدہ صرف اس شخص پر ہے جو آیت سجدہ کو سنتا ہے۔

(المصنف ج ۲ ص ۶، مطبوعہ ادارة القرآن کراچی ۱۳۰۶ھ)

حفظ نے بیان کیا کہ ابراہیم نخعی، نافع اور سعید بن جبیر نے یہ کہا کہ جس شخص نے آیت سجدہ کو سنا اس پر سجدہ کرنا لازم ہے۔ (المصنف ج ۲ ص ۵، مطبوعہ ادارة القرآن کراچی ۱۳۰۶ھ)

سجدہ تلاوت کے وجوب پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے ان آیات سے بھی استدلال کیا ہے:

وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ
اور جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ سجدہ نہیں کرتے۔

(الانشقاق: ۲۱)

اس آیت میں سجدہ نہ کرنے پر مذمت کی گئی ہے اور مذمت واجب کے ترک کرنے پر ہوتی ہے۔

فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا (النجم: ۶۲) پس اللہ کے لیے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔

وَاسْجُدُوا اقْتَرَبَ (العلق) آپ سجدہ کریں اور (ہم سے مزید) قریب ہوں۔

ان دونوں آیتوں میں سجدہ کا امر کیا ہے اور امر وجوب کے لیے آتا ہے سو ان آیات سے ثابت ہوا کہ سجدہ تلاوت ادا کرنا واجب ہے۔

سجدہ تلاوت کی تعداد میں مذاہب فقہاء

امام مالک بن انس اصبحی متونی ۱۷۹ھ لکھتے ہیں:

ہمارے نزدیک عزائم سجود القرآن گیارہ سجدے ہیں ان میں سے مفصل (الحجرات سے آخر قرآن تک) میں کوئی سجدہ نہیں

تبیان القرآن

جلد چہارم

ہے۔ (یعنی النجم، الاشفاق اور العلق کے سجدات)۔ (الموطا ص ۱۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۰۹ھ)

علامہ ابو الولید سلیمان بن خلف باجی اندلسی مالکی متوفی ۳۹۳ھ لکھتے ہیں:

امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے جمہور اصحاب کا یہی مذہب ہے، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے اور ابن وہب نے کما عزام سجود القرآن چودہ سجدے ہیں اور یہی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ اور ابن حبیب نے کما عزام سجود پندرہ سجدے ہیں انہوں نے سورہ حج کا دو سرا سجدہ بھی شامل کر لیا۔

(المنتقى ج ۱، ص ۳۵۱، مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت)

علامہ ابو بکر محمد بن عبد اللہ المعروف بابن العربی المالکی متوفی ۵۴۳ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں پندرہ سجدے ہیں۔ پہلا سجدہ سورۃ الاعراف کی آخری آیت میں ہے ولہ یسجدون (الاعراف: ۲۰۶) دوسرا سجدہ وظلالہم بالغدو والاصال (الرعد: ۱۵) تیسرا سجدہ ویفعلون ما یؤمرون (النحل: ۵۰) چوتھا سجدہ ویزیدہم خشوعا (بنی اسرائیل: ۱۰۹) پانچواں سجدہ خروا سجدوا وکبیا (مریم: ۵۸) چھٹا سجدہ یفعل ما یشاء (الحج: ۱۸) ساتواں سجدہ تفلحون (الحج: ۷۷) آٹھواں سجدہ نفورا (الفرقان: ۶۰) نواں سجدہ رب العرش العظیم (النمل: ۲۶) دسواں سجدہ وہم لا یتکبرون (السجدہ: ۱۵) گیارہواں سجدہ خروا کعوا واناب (ص: ۲۳) بارہواں سجدہ ان کنتم ایاه تعبدون (حم السجدہ: ۱۵) تیرہواں سجدہ واعبدوا (النجم: ۶۲) چودھواں سجدہ لا یسجدون (الاشفاق: ۲۱) پندرہواں سجدہ واسجدوا اقترب (العلق: ۱۹)۔ (احکام القرآن ج ۲، ص ۳۶۹-۳۶۸، دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۰۸ھ)

امام ابو اسحاق ابراہیم بن علی فیروز آبادی شافعی متوفی ۳۵۵ھ لکھتے ہیں:

امام شافعی کا قول جدید یہ ہے کہ سجدات تلاوت چودہ سجدے ہیں (علامہ ابن العربی مالکی کے حوالے سے جو ہم نے پندرہ آیات سجدہ ذکر کی ہیں ان میں سورۃ ص ۲۳ کے علاوہ باقی وہی آیات سجدہ ہیں) اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے قرآن مجید میں پندرہ سجدوں کی تعلیم دی۔ ان میں سے تین مفصل میں ہیں، دو حج میں ہیں اور امام شافعی کا قول قدیم یہ ہے کہ سجود تلاوت گیارہ سجدے ہیں۔ اور انہوں نے مفصل کے تین سجدے ساقط کر دیے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جب سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں ہجرت فرمائی آپ نے مفصل کی کسی آیت پر سجدہ نہیں کیا۔ (مفصل کے سجدات سے مراد النجم، الاشفاق اور العلق کے سجدات ہیں)

(المہذب ج ۱، ص ۸۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت)

علامہ موفق الدین عبد اللہ بن قدامہ مقدسی حنبلی متوفی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں:

سجدات القرآن چودہ سجدے ہیں (سورہ ص کے سجدہ کے علاوہ باقی مذکورہ سجدات) ان میں سے دو سجدے الحج میں ہیں اور تین مفصل میں ہیں۔ امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ پندرہ سجدے ہیں، ان میں سے ایک ص کا سجدہ ہے، کیونکہ حضرت عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو پندرہ سجدوں کی تعلیم دی، ان میں سے تین مفصل میں ہیں اور دو سجدہ الحج میں ہیں۔ (سنن ابوداؤد) اور صحیح یہ ہے کہ سورہ ص کا سجدہ عزام سجود میں سے نہیں ہے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا سورۃ ص عزام سجود میں سے نہیں ہے۔ (سنن ابوداؤد)

تمام آیات سجدات اجماع سے ثابت ہیں سوائے مفصل کے سجدات کے اور الحج کے دوسرے سجدہ کے اور یہ سجدے حضرت عمرو بن العاص کی حدیث سے ثابت ہیں اور حضرت عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ انہوں نے پوچھا: یا رسول اللہ کیا الحج

میں دو سجدے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں اور جس نے یہ دو سجدے نہیں کیے اس نے ان کو نہیں پڑھا۔ (ابوداؤد)

(الکافی ج ۱، ص ۲۷۲، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاسانی الحنفی المتوفی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید میں چودہ سجدے ہیں۔ وہ یہ ہیں (۱) الاعراف (۲) الرعد (۳) النحل (۴) بنی اسرائیل (۵) مریم (۶) الحج کا پہلا سجدہ (۷) الفرقان (۸) النمل (۹) الم تنزل السجدہ (۱۰) ص (۱۱) حم السجدہ (۱۲) النجم (۱۳) الاشفاق (۱۴) اقرء۔ اس کی تعداد میں دیگر فقہاء سے ہمارے تین اختلاف ہیں، پہلا اختلاف یہ ہے امام شافعی، امام احمد اور بعض فقہاء مالکیہ کے نزدیک سورہ الحج کا دوسرا سجدہ (ارکعوا واسجدوا (الحج: ۷۷)) بھی سجدہ تلاوت ہے اور ہمارے نزدیک وہ نماز کا سجدہ ہے۔ (جن احادیث سے ان ائمہ نے استدلال کیا ہے وہ ضعیف ہیں۔ فتح القدر میں تفصیل کے ساتھ ان کی وجہ ضعف بیان کی گئی ہے) ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما نے ان سجدات کو شمار کیا جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنے تھے اور سورہ الحج کا ایک سجدہ شمار کیا اور حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا سجدہ تلاوت الحج میں پہلا سجدہ ہے اور دوسرا نماز کا سجدہ ہے۔ نیز جب سجدہ کا رکوع کے ساتھ ذکر ہو تو اس سے مراد نماز کا سجدہ ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے واسجدی وارکعی۔ (آل عمران: ۴۳)

دوسرا اختلاف اس میں ہے کہ سورہ ص کا سجدہ ہمارے نزدیک سجدہ تلاوت ہے اور امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک وہ سجدہ شکر ہے۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نماز میں سورہ ص پڑھی اور سجدہ تلاوت کیا اور لوگوں نے بھی ان کے ساتھ سجدہ تلاوت کیا، صحابہ کرام کی ایک جماعت کے ساتھ یہ سجدہ ہوا اور اس پر کسی نے انکار نہیں کیا، اگر یہ سجدہ واجب نہ ہوتا تو اس کو نماز میں داخل کرنا جائز نہ ہوتا۔ نیز روایت ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں سورہ ص پڑھ رہا ہوں جب میں سجدہ کی جگہ پر پہنچا تو دوات اور قلم نے سجدہ کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم دوات اور قلم کی بہ نسبت سجدہ کرنے کے زیادہ حقدار ہیں پھر آپ نے اس مجلس میں سورہ ص کو پڑھنے کا حکم دیا پھر آپ نے اور آپ کے اصحاب نے اس آیت پر سجدہ کیا۔ (اس حدیث کا امام ترمذی اور امام حاکم نے ذکر کیا ہے اور اس میں دوات اور قلم کی جگہ درخت کا ذکر ہے اور اس میں درخت کی اس دعا کا ذکر ہے اے اللہ! مجھ سے اس سجدہ کو اس طرح قبول فرما جس طرح تو نے اس سجدہ کو اپنے بندہ داؤد سے قبول کیا۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۵۷۹، المستدرک ج ۱، ص ۲۲۰-۲۱۹)

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ ہمارے نزدیک مفصل (النجم، الاشفاق، العلق) میں تین سجدے ہیں، اس میں امام مالک کا اختلاف ہے۔ ہماری دلیل حضرت عمران بن حصین کی حدیث ہے جس میں یہ تصریح ہے کہ مفصل میں تین سجدے ہیں۔

(بدائع الصنائع ج ۲، ص ۶-۳، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۸ھ)

حرف آخر

الحمد للہ علی احسانہ آج بہ روز منگل مورخہ ۱۸ شعبان ۱۴۱۹ھ / ۸ نومبر ۱۹۹۸ء کو بعد از نماز ظہر سورۃ الاعراف کی تفسیر مکمل ہو گئی۔ اللہ العالمین جس طرح ان سورتوں کی تفسیر کو آپ نے مکمل کر دیا ہے قرآن مجید کی باقی سورتوں کی تفسیر کو بھی مکمل کرادیں، اور اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائیں، اس کو تاقیام قیامت فیض آفریں رکھیں، اس کو موافقین کے لیے باعث استقامت اور مخالفین کے لیے باعث ہدایت بنائیں اور اس کتاب کو اور میری باقی کتابوں کو مخالفین کے شر اور فساد سے محفوظ رکھیں، اور محض اپنے فضل سے میری مغفرت فرمادیں۔ امین یارب العالمین بحاجہ

نبیان القرآن

حبيبيك سيدنا محمد خاتم النبيين صلوات الله عليه وعلى اله الطاهرين واصحابه
الكاملين وازواجه امهات المؤمنين والعلماء الراستخين والاولياء العارفين-



سُورَةُ الْأَنْقَابِ

(۸)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سورة الانفال

انفال کا معنی

علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں: انفال نفل کی جمع ہے۔ نفل مال غنیمت کو کہتے ہیں۔ لیکن مختلف اعتبارات کی وجہ سے اس کے معنی مختلف ہیں۔ جہاد میں فتح اور کامیابی کے اعتبار سے اس مال کو غنیمت کہتے ہیں اور یہ لحاظ کیا جائے کہ بغیر وجوب کے ابتداء یہ مال اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ ہے اس کو نفل کہتے ہیں اور بعض علماء نے غنیمت اور نفل میں عموم اور خصوص کے اعتبار سے فرق کیا ہے۔ سو جو مال مشقت یا بغیر مشقت کے استحقاق یا بغیر استحقاق کے جہاد میں کامیابی سے پہلے یا اس کے بعد حاصل ہو اس کو مال غنیمت کہتے ہیں اور مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے انسان کو جو مال حاصل ہو اس کو نفل کہتے ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ دشمن سے جنگ کے بغیر مسلمانوں کو جو مال فتنے حاصل ہوتا ہے اس کو نفل کہتے ہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم کے بعد سامان سے جو چیزیں الگ کر لی جاتی ہیں ان کو نفل کہتے ہیں۔

لوگ آپ سے الانفال کے متعلق سوال کرتے ہیں۔

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ (الانفال: ۱)

اس آیت میں الانفال کا یہی آخری معنی مراد ہے۔ (المفردات ج ۲ ص ۶۵۱، مطبوعہ مکتبہ نزار معطفی الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۸ھ)

علامہ ابوالسعادات المبارک بن محمد بن الاثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

نفل کا معنی ہے مال غنیمت (جب ن اور ف پر زبر ہو) اور اس کی جمع انفال ہے۔ اور جب (ف پر جزم ہو) نفل ہو تو اس کا

معنی ہے زیادہ۔ امام ابو داؤد حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں:

ان رسول اللہ ﷺ كان ينفل الربع بعد
رسول الله ﷺ خمس تكاليفه بعد مال غنيمته كما جوت تمانى
الخمسة والثلاث بعد الخمس اذ ارجع - حصہ تقسیم کرتے اور جہاد سے واپسی کے بعد خمس منہا لے کے
تمانی حصہ تقسیم فرماتے۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۷۳۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۵۱، مسند احمد ج ۳ ص ۱۶۰)

نیز امام ابو داؤد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نجد کی طرف ایک لشکر

کے ساتھ روانہ کیا پھر چند مسلمانوں کو بہ طور کمک روانہ کیا۔
فکان سہمان الحیش اثنی عشر بعیرا
اثنی عشر بعیرا و نفل اهل السریة بعیرا
بعیرا و کانت سہمانہم ثلثة عشر ثلثة
عشر۔

اس لشکر کے حصہ میں بارہ بارہ اونٹ آئے۔ آپ نے بہ
طور کمک آنے والے کو ایک ایک اونٹ زیادہ عطا کیا تو ان کا
حصہ تیرہ تیرہ اونٹ ہو گئے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۷۳۱، الموطا رقم الحدیث: ۹۸۷، مسند احمد ج ۲، ص ۶۲)
احادیث میں نفل اور انفال کا ذکر بہت زیادہ آیا ہے اور بعض عبادات کا نام نوافل رکھا گیا ہے کیونکہ وہ فرائض پر زائد ہوتی
ہیں۔ امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث قدسی روایت کی ہے اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لا یزال
العبد یتقرب الی بالنوافل بندہ نوافل کے ذریعہ مسلسل میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۵۰۲، مسند احمد ج ۲، ص ۶۲)

سورۃ الانفال کی وجہ تسمیہ

نفل کا معنی مال غنیمت ہے اور کفار سے چھینے ہوئے سامان سے جو چیزیں الگ کر لی جاتی ہیں ان کو بھی نفل کہا جاتا ہے اور
اس سورت میں نفل کو اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ درج ذیل حدیث سے واضح ہوگا۔ اس لیے اس سورت کا نام
الانفال رکھا گیا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ بدر کے دن میں ایک تلوار لے کر آیا، میں نے کہا یا رسول اللہ!
اللہ تعالیٰ نے میرے سینہ کو مشرکین سے ٹھنڈا کر دیا ہے آپ یہ تلوار مجھے عطا فرمادیں۔ آپ نے فرمایا یہ نہ میری ملکیت ہے،
تمہاری۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاید آپ یہ کسی ایسے شخص کو عطا فرمادیں گے جس نے میری طرح مشقت نہ اٹھائی ہوگی، پھر
تھوڑی دیر بعد رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلا کر فرمایا تم نے مجھ سے یہ تلوار مانگی تھی اس وقت یہ میری ملکیت میں نہیں تھی اور
اب یہ میری ملکیت میں آچکی ہے سواب یہ تمہاری ہے۔ اور تب یہ آیت نازل ہوئی یسئلونک عن الانفال۔ (الانفال: ۱)
یہ (مسلمان) آپ سے مال غنیمت سے زائد چیزوں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۹۰، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۳۱۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۷۳۰)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ بدر کے دن میرے بھائی عمیر کو قتل کر دیا گیا تھا اور میں نے سعید
بن العاص کو قتل کیا تھا، میں نے اس کی تلوار پر قبضہ کر لیا، اس تلوار کا نام ذال لکینہ تھا۔ میں اس تلوار کو نبی ﷺ کے پاس لے کر
گیا، آپ نے فرمایا اس تلوار کو وہاں جا کر ڈال دو جہاں مال غنیمت کا سامان اکٹھا کر کے رکھا گیا ہے۔ میں واپس گیا اور اپنے بھائی
کے قتل کیے جانے اور اس تلوار کے لیے جانے سے مجھے اس قدر رنج ہوا تھا جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ابھی میں تھوڑی
دور ہی گیا تھا کہ سورۃ الانفال نازل ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جاؤ اپنی تلوار لے لو۔

(مسند احمد ج ۱، ص ۱۸۰، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۲، ص ۳۷۰، سنن سعید بن منصور رقم الحدیث: ۲۶۸۹، سنن کبریٰ ج ۶، ص ۲۹۱)

اسباب النزول للواحدی رقم الحدیث: ۳۶۸، الدر المنثور ج ۳، ص ۳

سورۃ الانفال کا زمانہ نزول

امام نحاس، امام ابو الشیخ اور امام ابن مردودیہ نے اپنی سندوں کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے

کہ سورۃ الانفال مدینہ میں نازل ہوئی۔ امام ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن الزبیر اور حضرت زید بن ثابت سے بھی روایت کیا ہے کہ سورۃ الانفال مدینہ میں نازل ہوئی۔ (الدر المستور ج ۳، ص ۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۲ھ)

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ سورۃ الانفال غزوہ بدر میں نازل ہوئی۔ امام ابن اسحاق نے کہا کہ پوری سورۃ الانفال بدر کے معاملات میں نازل ہوئی ہے۔ غزوہ بدر ہجرت کے ڈیڑھ سال بعد رمضان المبارک میں رونما ہوا اور یہ تحویل قبلہ کے دو ماہ بعد ہوا تھا اور اس کے نزول کی ابتداء بدر سے واپسی سے پہلے ہوئی، کیونکہ اس کی پہلی آیت اس وقت نازل ہوئی جب مسلمان بدر میں تھے اور ابھی مال غنیمت کی تقسیم شروع نہیں ہوئی تھی جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

ترتیب نزول کے لحاظ سے سورۃ الانفال کا مقام، اس کی آیتوں کی تعداد اور سبب نزول یہ سورت سورۃ البقرہ کے بعد نازل ہوئی۔ اور یہ مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی دوسری سورت ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ پہلے سورۃ البقرہ نازل ہوئی، پھر آل عمران اور پھر الانفال۔ لیکن زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہونے والی دوسری سورت ہے جو سورۃ البقرہ کے بعد نازل ہوئی۔ یہ واضح رہے کہ ایک سورت کے بعد دوسری سورت نازل ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ دوسری سورت پہلی سورت کے مکمل ہونے کے بعد نازل ہوئی ہے، بلکہ کئی مرتبہ پہلی سورت کے مکمل ہونے سے پہلے دوسری سورت کا نزول شروع ہو جاتا تھا اور سورہ بقرہ کے نزول کی تکمیل سے پہلے سورۃ الانفال کا نزول مکمل ہو گیا تھا۔ کیونکہ سورۃ الانفال میں صرف ایک قسم کے احکام ہیں یعنی مال غنیمت اور جماد سے متعلق احکام ہیں۔ اور سورۃ البقرہ میں عبادات اور معاشرتی اور تمدنی مسائل سے متعلق انواع و اقسام کے احکام ہیں۔

جابر بن زید نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سورۃ الانفال کے نزول سے پہلے اٹھاسی سورتیں نازل ہو چکی تھیں اور اس کا نمبر نواسی ہے۔ اور یہ سورہ آل عمران کے بعد اور سورۃ الاحزاب سے پہلے نازل ہوئی۔ اہل مدینہ، اہل مکہ اور اہل بصرہ کی گنتی کے مطابق اس کی آیات کی تعداد چھتر ہے اور اہل شام کی گنتی کے مطابق اس کی آیات کی تعداد ستر ہے۔ اور اہل کوفہ کی گنتی کے مطابق اس کی آیات کی تعداد پچھتر ہے۔

اس کے نزول کا سبب جنگ بدر کے دن اہل بدر کا مال غنیمت اور انفال میں اختلاف تھا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ بعض صحابہ نے آپ سے انفال کے متعلق سوال کیا تھا جیسا کہ اس کی پہلی آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔

غزوہ بدر کا خلاصہ

جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ سورۃ الانفال غزوہ بدر میں نازل ہوئی۔ غزوہ بدر کی پوری تفصیل کتب سیرت میں ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رجب کے مہینہ میں ایک کافر عمرو بن الحضرمی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ نبی ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ بہت ناراض ہوئے اور صحابہ نے بھی حضرت عبداللہ بن عثمن رضی اللہ عنہ پر بہت برہمی کا اظہار کیا اور کہا تم نے وہ کام کیا جس کا تم کو حکم نہیں دیا گیا تھا۔ حضرمی کے قتل نے تمام کفار قریش کو جوش انتقام سے لبریز کر دیا تھا۔ اسی دوران ابو سفیان قافلہ تجارت کے ساتھ شام گیا ہوا تھا، ابو سفیان نے وہیں سے مکہ خبر بھیج دی۔ کفار قریش نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں اور مدینہ میں یہ خبر پہنچ گئی کہ کفار قریش ایک لشکر جرار کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آرہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کے دفاع کا قصد کیا اور معرکہ بدر پیش آ گیا۔

جنگ کے خاتمہ پر معلوم ہوا کہ صحابہ کرام میں سے صرف چودہ نفوس قدسیہ شہید ہوئے ہیں۔ جن میں سے چھ مہاجر اور آٹھ انصار تھے لیکن دوسری طرف قریش کی کمر ٹوٹ گئی اور ضا دید قریش میں سے جو لوگ بہادری اور مردانگی میں نام آور تھے

سب ایک ایک کر کے مارے گئے۔ ان میں شیبہ، عقبہ، ابو جہل، ابو بکر، ابو بکر صغیر، زید بن اسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف وغیرہم تھے۔ ستر کافر قتل کیے گئے اور ستر گرفتار ہوئے۔ اسیران جنگ کے ساتھ نبی ﷺ نے بہت کریمانہ سلوک کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ ان تمام کافر قیدیوں کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے برعکس حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے تھی کہ ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے۔ نبی ﷺ نے حضرت ابو بکر کی رائے کو پسند کیا اور ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا۔ اس کی پوری بحث ان شاء اللہ متعلقہ آیات کی تفسیر میں آئے گی۔

غزوہ بدر کے متعلق احادیث

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو ابوسفیان کے (قافلہ کے) آنے کی خبر پہنچی تو آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا، حضرت ابو بکر نے کوئی مشورہ دیا آپ نے ان سے اعراض کیا۔ پھر حضرت عمر نے کوئی مشورہ دیا آپ نے ان سے بھی اعراض کیا۔ پھر حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہو کر کہنے لگے یا رسول اللہ! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے اگر آپ ہمیں سمندر میں گھوڑے دوڑانے کا حکم دیں تو ہم سمندر میں گھوڑے دوڑادیں گے، اگر آپ ہمیں برک الغماد تک گھوڑے دوڑانے کا حکم دیں تو ہم ایسا کریں گے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بلایا، لوگ آئے اور وادی بدر میں اترے۔ وہاں قریش کے پانی پلانے والے ملے۔ ان میں بنی حجاج کا ایک سیاہ فام غلام تھا صحابہ نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں سوال کیا۔ اس نے کہا مجھے ابوسفیان کا کوئی پتا نہیں! لیکن یہاں ابو جہل، عقبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف ہیں۔ جب اس نے یہ بتایا تو صحابہ نے اس کو پیٹنا شروع کیا۔ اس نے کہا اچھا میں تمہیں ابوسفیان کے متعلق بتاتا ہوں، جب انہوں نے اس کو چھوڑ کر ابوسفیان کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا مجھے ابوسفیان کا کوئی پتا نہیں لیکن یہاں لوگوں میں ابو جہل، عقبہ، شیبہ اور امیہ بن خلف ہیں۔ جب اس نے یہ کہا تو انہوں نے پھر مارنا شروع کر دیا، اس وقت نبی ﷺ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ نے یہ منظر دیکھا تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا قسم اس ذات کی جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے جب یہ سچ بولتا ہے تو تم اس کو مارتے ہو اور جب یہ جھوٹ بولتا ہے تو تم اس کو چھوڑ دیتے ہو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ فلاں کافر کے گرنے کی جگہ ہے آپ زمین پر اس جگہ اور اس جگہ ہاتھ رکھتے۔ حضرت انس کہتے ہیں کہ پھر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ رکھنے کی جگہ سے کوئی کافر متجاوز نہیں ہوا۔ (یعنی جس جگہ آپ نے جس شخص کا نام لے کر ہاتھ رکھا تھا وہ کافر اسی جگہ گر کر مرا)

(صحیح مسلم مغازی: ۸۳، (۱۷۷۹) ۳۵۳۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۸، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۰۱۴)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ غزوہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ خیمہ میں دعا کر رہے تھے اے اللہ! اپنے عہد اور وعدہ کو پورا فرما۔ اے اللہ! اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔ حضرت ابو بکر نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا یا رسول اللہ! آپ کے لیے یہ دعا کافی ہے، آپ نے اپنے رب سے بہت گڑگڑا کر دعا کی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ سرور ہوتے ہوئے خیمہ سے نکلے در آنحالیکہ آپ اس آیت کی تلاوت کر رہے تھے (کافروں کا) یہ گروہ غنقیب شکست کھایا ہوا ہو گا اور یہ سب پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے ○ بلکہ ان سے (اصل) وعدہ تو قیامت کا ہے اور قیامت بڑی آفت اور بہت کڑوی ہے۔ (القر: ۳۵-۳۴) (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۵۳، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۰۱۷)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں ہم اصحاب محمد ﷺ (یہ باتیں کرتے تھے کہ اصحاب بدر کی تعداد طالوت کے اس لشکر کے برابر تھی جس نے ان کے ساتھ دریا پار کیا تھا اور صرف مومن نے ہی ان کے ساتھ دریا پار کیا تھا اور ان کی تعداد تین

سودس اور کچھ تھی۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۵۸، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۰۱۹)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کو جنگ بدر کے دن کم سن قرار دیا گیا، اس دن ماجرین کی تعداد ساٹھ اور کچھ تھی اور انصار کی تعداد سو چالیس اور کچھ تھی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۵۶، جامع الاصول، رقم الحدیث: ۶۰۲۰)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر کے دن عتبہ بن ربیعہ اور اس کا بیٹا ولید بن عتبہ اور اس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اپنے لشکر سے نکل کر آگے بڑھے اور لکارا کہ کون ہم سے مقابلہ کرے گا۔ ان کے مقابلہ میں انصار کے نوجوان مسلمانوں کے لشکر سے نکلے۔ عتبہ نے پوچھا تم لوگ کون ہو؟ انہوں نے اپنا حسب نسب بتایا۔ عتبہ وغیرہ نے کہا ہمیں تم سے مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ہم اپنے عم زادوں سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے حمزہ آپ کھڑے ہوں، اے علی تم کھڑے ہو، اے عبیدہ بن حارث تم کھڑے ہو۔ پھر حضرت حمزہ عتبہ کے مقابل آئے اور شیبہ کے سامنے میں (حضرت علی) آیا حضرت عبیدہ اور ولید گتھم گتھا ہو گئے اور ہر ایک نے دوسرے کو لہولہان کر دیا۔ پھر ہم ولید کی طرف متوجہ ہوئے اور ہم نے اس کو قتل کر دیا۔ اور ہم حضرت عبیدہ کو اٹھا کر لشکر اسلام میں لے آئے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۶۵، مسند احمد ج ۴، ص ۱۸۳، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۰۳۰)

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امیہ بن خلف (وہ کافر جس کے پاس حضرت بلال رضی اللہ عنہ غلام تھے اور وہ ان پر بہت ظلم کرتا تھا تا آنکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بہت مہنگے داموں سے ان کو امیہ سے خرید کر آزاد کر دیا) سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ مکہ میں میرے مال و دولت کی حفاظت کرے، میں مدینہ میں اس کے مال و دولت کی حفاظت کروں گا۔ جب میں نے معاہدہ میں بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا تو اس نے کہا میں ”رحمن“ کے نام سے واقف نہیں ہوں، تم وہی نام لکھو جو زمانہ جاہلیت میں لکھتے تھے۔ بہر حال میں نے اس سے معاہدہ کر لیا۔ جنگ بدر کے دن میں پہاڑ پر پہنچا تاکہ اس کو قتل ہونے سے بچا سکوں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھ لیا، وہ اس جگہ گئے جہاں انصار بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا اے انصار کے جوانو! وہ امیہ بن خلف ہے، اگر آج امیہ بچ گیا تو میری نجات نہیں ہوگی۔ پھر حضرت بلال نے انصار کی ایک جماعت کے ساتھ ہمارا پیچھا کیا۔ جب مجھے یہ خوف ہوا کہ وہ ہم تک پہنچ جائیں گے تو میں نے امیہ کا بیٹا ان کے سامنے کر دیا تاکہ وہ اس کو قتل کرنے میں مشغول ہو جائیں۔ انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔ پھر انہوں نے ہمارا پیچھا کیا۔ امیہ ایک بھاری بھر کم آدمی تھا جب وہ ہم تک پہنچ گئے تو میں نے اس سے کہا تم اونٹ کی طرح بیٹھ جاؤ وہ اس طرح بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا جسم اس کے اوپر ڈال دیا تاکہ اس کی حفاظت کروں۔ وہ میرے نیچے سے اس کو تلواریں مارنے لگے حتیٰ کہ اس کو قتل کر دیا۔ ان میں سے ایک کی تلوار میری ٹانگ پر لگی۔ حضرت عبدالرحمن ہمیں اپنے پیر کی پشت پر اس زخم کا نشان دکھایا کرتے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۷۱، جامع الاصول ج ۸، رقم الحدیث: ۶۲۰۵)

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ بدر کے دن میں صف میں کھڑا ہوا تھا، میں نے اپنی دائیں اور بائیں جانب دیکھا تو میرے دائیں بائیں انصار کے دو نوجوان کم سن لڑکے کھڑے ہوئے تھے۔ اس وقت میں نے یہ تمنا کی کہ کاش میرے ارد گرد ان سے زیادہ طاقت ور لوگ ہوتے، اچانک ان میں سے ایک نے مجھ سے پوچھا اے چچا! کیا آپ ابو جہل کو پہچانتے ہیں؟ میں نے کہا ہاں! اے بھتیجے! تمہیں اس سے کیا کام ہے؟ اس نے کہا مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتا ہے، قسم اس ذات کی جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے! اگر میں نے اس کو دیکھ لیا تو میرا جسم اس کے جسم سے اس وقت

تک الگ نہیں ہو گا حتیٰ کہ وہ مر جائے جس کی موت پہلے مقرر ہو چکی ہے۔ حضرت عبدالرحمن نے کہا مجھے اس کی بات پر تعجب ہوا۔ پھر دوسرے نے مجھ سے اسی طرح کہا۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میں نے ذیکھا ابو جہل لوگوں کے درمیان پھر رہا ہے میں نے کہا کیا تم نہیں دیکھ رہے یہ ہے وہ شخص جس کے متعلق تم مجھ سے سوال کر رہے تھے۔ حضرت عبدالرحمن نے کہا وہ دونوں نوجوان تلواروں سے اس پر حملہ کرنے کے لیے باز کی طرح جھپٹے اس پر حملہ کیا اور حتیٰ کہ اس کو قتل کر دیا۔ پھر وہ دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے اور آپ کو اس کے قتل کی خبر دی۔ آپ نے پوچھا تم میں سے کس نے اس کو قتل کیا ہے؟ ان میں سے ہر ایک نے کہا میں نے اس کو قتل کیا ہے۔ آپ نے پوچھا کیا تم نے اپنی تلواروں سے خون صاف کر لیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے دونوں تلواروں پر نظر ڈالی پھر آپ نے فرمایا تم دونوں نے اس کو قتل کیا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کے جسم سے چھینا ہو اسامان معاذ بن عمرو بن الجموح کو دیا جائے اور ان نوجوانوں کا نام معاذ بن عمرو بن الجموح اور معاذ بن عفرات تھا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۴۱، صحیح مسلم الجہاد: ۴۲، (۱۷۵۲) ۴۲۸۸، مسند احمد ج ۱، ص ۱۹۲، طبع قدیم، مسند احمد رقم الحدیث: ۶۷۷۳،

طبع جدید، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۰۲۶)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ بدر کے دن فرمایا کون شخص ہمیں دیکھ کر یہ بتائے گا کہ ابو جہل کا کیا ہوا؟ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ گئے تو دیکھا اس کو عفرات کے دو بیٹے قتل کر چکے تھے، حتیٰ کہ وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی داڑھی پکڑ لی اور کہا تو ابو جہل ہے؟ (ابھی اس میں کچھ رمتق حیات تھی) اس نے کہا کیا تمہاری قوم نے مجھ سے بھی بڑے کسی شخص کو قتل کیا تھا؟ صحیح بخاری کی دوسری روایت میں ہے ابو جہل میں ابھی رمتق حیات تھی، اس کی ٹانگ پر تلوار لگی تھی۔ حضرت ابن مسعود نے کہا میں نے اس سے کہا اے اللہ کے دشمن! تجھے اللہ نے ذلیل کر دیا۔ اس نے کہا مجھے اس کی فکر نہیں۔ پھر اس نے کہا کیا تمہاری قوم نے مجھ سے بھی بڑے کسی آدمی کو قتل کیا تھا یا کما کاش مجھے کسانوں کے علاوہ کسی اور نے قتل کیا ہوتا۔ پھر میں نے اس کے اوپر اپنی تلوار ماری۔ اس کی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی مگر وہ اس سے کچھ نہ کر سکا۔ اس نے میرے چہرے پر تھوک دیا۔ اس نے مجھ سے کہا تمہاری تلوار کند ہے، میری تلوار پکڑ لو اور جڑ سے میری گردن کاٹ دو۔ میں نے اس کی تلوار اس پر ماری۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس کی تلوار مال غنیمت کے حصہ سے زیادہ دی۔ عتبہ نے ابو جہل سے واپسی کے لیے کہا تھا تو ابو جہل نے کہا یہ خوف سے بزدل ہو چکا ہے۔ عتبہ نے کہا عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ کس کا پاخانہ خطا ہوتا ہے اور ہم میں سے کون بزدل ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۶۳، ۳۹۶۲، ۳۹۶۱، صحیح مسلم الجہاد: ۱۱۸، (۱۸۰۰) ۲۵۸۱، جامع الاصول رقم الحدیث: ۶۰۳۲، ۶۰۳۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مکہ اور مدینہ کے درمیان تھے، ہم چاند دیکھنے لگے اور میری نگاہ تیز تھی۔ لہذا میں نے چاند دیکھ لیا اور میرے سوا اور کسی کا یہ دعویٰ نہیں تھا کہ اس نے چاند دیکھا ہے۔ میں نے حضرت عمر سے کہا کیا آپ چاند نہیں دیکھ رہے؟ وہ چاند نہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے کہا میں عنقریب چاند دیکھ لوں گا جب میں بستر پر لیٹا ہوا ہوں گا۔ پھر وہ ہمیں اہل بدر کے حالات بتانے لگے۔ انہوں نے کہا رسول اللہ ﷺ ہمیں کفار کے گرنے کی جگہیں بتا رہے تھے اور فرما رہے تھے ان شاء اللہ یہ کل فلاں کے گرنے کی جگہ ہے، ان شاء اللہ یہ کل فلاں کے گرنے کی جگہ ہے۔ حضرت عمر نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، جس جگہ رسول اللہ ﷺ نے نشان لگایا تھا، کوئی کافر اس جگہ سے سرمو متجاوز نہیں ہوا۔ پھر ان تمام کفار کو ایک دوسرے کے اوپر ایک کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ رسول اللہ

ان کے پاس گئے اور فرمایا اے فلاں بن فلاں! اے فلاں بن فلاں! کیا تم نے اس کو برحق جان لیا جس کا تم سے اللہ اور اس کے رسول نے وعدہ کیا تھا، کیونکہ میں نے اس چیز کو برحق پایا جس کا اللہ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ حضرت عمر نے کہا یا رسول اللہ! آپ بے روح اجسام سے کیسے کلام فرما رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا تم میرے کلام کو ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، البتہ یہ میری کسی بات کا جواب نہیں دے سکتے۔

(صحیح مسلم صفت النار: ۷۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۰۷۳، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۰۳۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اس دن رسول اللہ ﷺ نے اہل جاہلیت کا فدیہ چار سو (درہم) مقرر فرمایا تھا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۸۰، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۰۳۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی اور کہا ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے بھانجے عباس کا فدیہ چھوڑ دیں، آپ نے فرمایا اس کا ایک درہم بھی نہ چھوڑنا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۰۱۸، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۰۳۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے فدیہ کی رقومات بھیجیں تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر ابو العاص بن الربیع کو چھڑانے کے لیے مال بھیجا اور انہوں نے وہ ہار بھی بھیج دیا جو ان کو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ابو العاص کے ساتھ ان کی رخصتی کے وقت دیا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے وہ ہار دیکھا تو آپ پر شدید رقت طاری ہو گئی اور آپ نے مسلمانوں سے فرمایا اگر تم مناسب سمجھو تو زینب کے قیدی کو رہا کر دو اور اس کا وہ ہار بھی واپس کر دو۔ مسلمانوں نے کہا برو چشم۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے ابو العاص سے یہ عہد لیا کہ وہ زینب کو آپ کے پاس آنے کے لیے چھوڑ دے گا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ اور انصار کے ایک شخص کو بھیجا اور ان کو حکم دیا کہ تم بطن یا حج (ایک جگہ کا نام) پر ٹھہرنا، حتیٰ کہ تمہارے پاس سے زینب گزریں، پھر تم ان کو ساتھ لے کر یہاں آ جاؤ۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۹۲، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۰۳۳)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا غزوہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کی طرف دیکھا تو وہ ایک ہزار تھے اور آپ کے ساتھ تین سو انیس مرد تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے قبلہ کی طرف منہ کیا اور ہاتھ اٹھا کر با آواز بلند اپنے رب سے یہ دعا کی اے اللہ اتو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا فرما، اے اللہ اتو نے جس چیز کا مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ عطا فرما، اے اللہ اہل اسلام کی یہ جماعت اگر ہلاک ہو گئی تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت نہیں کی جائے گی۔ آپ ہاتھ پھیلا کر با آواز بلند مسلسل دعا کرتے رہے حتیٰ کہ آپ کے شانوں سے چادر گر گئی۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ کے پاس آئے اور چادر پکڑ کر آپ کے کندھوں پر ڈالی اور پھر پیچھے سے آپ کے ساتھ لپٹ گئے اور کہنے لگے یا نبی اللہ! اللہ سے آپ کی یہ دعا کافی ہے، آپ کا رب آپ سے کیے ہوئے وعدہ کو عنقریب پورا فرمائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: (ترجمہ) جب تم اپنے رب سے مدد طلب کر رہے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول فرمائی، میں تمہاری لگاتار ایک ہزار فرشتوں سے مدد فرماؤں گا، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے آپ کی مدد فرمائی۔۔۔۔۔

ابوزمیل نے کہا حضرت ابن عباس نے یہ حدیث بیان کی اس روز ایک مسلمان ایک مشرک کے پیچھے دوڑ رہا تھا جو اس سے آگے تھا، اتنے میں اس نے اپنے اوپر سے ایک کوڑے کی آواز سنی اور ایک گھوڑے سوار کی آواز آئی جو کہہ رہا تھا "اے جیزوم آگے بڑھ" (جیزوم اس فرشتے کے گھوڑے کا نام تھا) پھر اچانک اس نے دیکھا کہ وہ مشرک اس کے سامنے چپت گر پڑا، اس مسلمان

نے اس مشرک کی طرف دیکھا تو اس کی ناک پر چوٹ تھی اور اس کا چہرہ اس طرح پھٹ گیا تھا جیسے کوڑا لگا ہو اور اس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ اس انصاری نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا، آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا یہ تیسرے آسمان سے مدد آئی تھی۔ اس دن مسلمانوں نے ستر مشرکوں کو قتل کیا اور ستر کو گرفتار کر لیا۔ ابو زمیل کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے کہا جب مسلمانوں نے قیدیوں کو گرفتار کر لیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر سے فرمایا تمہارا ان قیدیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ حضرت ابو بکر نے کہا یا نبی اللہ! یہ ہمارے عم زاد اور ہمارے قبیلہ کے لوگ ہیں، میری رائے یہ ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیں اس سے ہمیں کفار کے خلاف قوت حاصل ہوگی اور شاید اللہ تعالیٰ انہیں اسلام کی ہدایت دے دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابن الخطاب! تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، بخدا یا رسول اللہ! میری وہ رائے نہیں ہے جو حضرت ابو بکر کی رائے ہے، لیکن میری رائے یہ ہے کہ آپ انہیں ہمارے حوالے کیجئے تاکہ ہم ان کی گردنیں اتار دیں۔ آپ عقیل کو حضرت علی کے حوالے کیجئے کہ وہ اس کی گردن اتار دیں اور میرا فلاں رشتہ دار میرے حوالے کریں کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ یہ لوگ کافروں کے بڑے اور ان کے سردار ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابو بکر کی رائے پسند آئی اور میری رائے پسند نہیں آئی۔ دوسرے دن جب میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے بتلائیے کہ آپ اور آپ کا صاحب کس وجہ سے رو رہے ہیں، اگر مجھے بھی رونا آیا تو میں روؤں گا اور اگر مجھے رونانا آیا تو میں آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے رونے ایسی صورت بنا لوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں اس واقعہ کی وجہ سے رو رہا ہوں جو تمہارے ساتھیوں کے فدیہ لینے کی وجہ سے مجھ پر پیش آیا ہے، بلاشبہ مجھ پر ان لوگوں کا عذاب پیش کیا گیا جو اس درخت سے بھی زیادہ قریب تھا۔ وہ درخت نبی ﷺ کے قریب تھا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ آیت نازل فرمائی: (ترجمہ) کسی نبی کی شان کے یہ لائق نہیں ہے کہ وہ کفار کا زمین پر خون بہانے سے پہلے ان کو قیدی بنالے۔۔۔۔۔ سو تم کو جو مال غنیمت حاصل ہے، اس کو کھاؤ در آنحالیکہ یہ حلال اور طیب ہے۔ پھر اللہ نے مسلمانوں کے لیے مال غنیمت حلال کر دیا۔

(صحیح مسلم المغازی: ۵۸، (۱۷۶۳) ۳۵۰۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۹۰، جامع الاصول، ج ۸، رقم الحدیث: ۶۹۱۳) سورۃ الانفال کے مضامین کا خلاصہ

انفال (مال غنیمت کے ذخیرہ کے علاوہ کوئی زائد چیز) کے متعلق ایک سوال کا جواب، خوف خدا اور اللہ پر توکل کی تلقین، نماز، صدقہ و خیرات اور جہاد کی ترغیب۔ (النساء: ۱۰۶)

کفار کے قافلہ تجارت پر حملہ کرنے کے بجائے لشکر کفار کے خلاف جہاد کرنے کی اہمیت، فرشتوں کی مدد اور ان کا وجہ اطمینان ہونا، مسلمانوں کی تسکین کے لیے ان پر نیند طاری کرنا اور بارش نازل فرمانا، جو مسلمانوں کے لیے مفید اور کفار کے لیے مضر تھی۔ کفار کی گردنیں اڑانے کا حکم دینا اور کفار کے مقابلہ سے پیٹھ موڑنے کی ممانعت، مسلمانوں کا کفار کو قتل کرنا، دراصل اللہ کا قتل کرنا تھا اور آپ کا خاک پھینکنا بھی درحقیقت اللہ کا خاک پھینکنا تھا۔ بدر کی فتح کے بعد کفار کو متنبہ کرنا کہ اگر تم نے دوبارہ مسلمانوں کے خلاف شرارت کی تو تمہیں پھر سزا دی جائے گی اللہ مسلمانوں کا حامی ہے۔ (الانفال: ۱۹-۷)

مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرنے کا حکم اور نافرمانی کرنے سے ممانعت، جب اللہ اور اس کا رسول بلائیں تو انہیں حاضر ہونے کا حکم، کم تعداد مسلمانوں کا کثیر تعداد کفار پر غالب آنا محض اللہ کی نصرت کی وجہ سے تھا۔ امانت میں خیانت کرنے کی ممانعت، مال اور اولاد کا فتنہ ہونا، خوف خدا سے گناہ ترک کرنے پر مغفرت کی نوید، ہجرت کے وقت نبی ﷺ پر

اللہ کا احسان کہ اس نے آپ کو کفار کے شر اور ان کی سازش سے مامون رکھا۔ کفار کا یہ کہنا کہ اگر یہ قرآن برحق ہے تو اس کے انکار کی وجہ سے ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا، اور اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ان پر عذاب نہیں آئے گا حالانکہ وہ عذاب کے مستحق ہیں۔ نماز کے اوقات میں کافروں کا شور مچا کر مسلمانوں کی عبادت میں خلل ڈالنا اور لوگوں کو اسلام سے روکنا اور اس وجہ سے ان کا مستحق عذاب ہونا۔ (الانفال: ۳۷-۴۰)

کفار کو قبول اسلام کا حکم دینا اور نہ ان کے خلاف جہاد کرنے کا حکم، خمس (مال غنیمت کا پانچواں حصہ) کے مصارف کا بیان، کفار کے تجارتی قافلہ کے مقابلہ میں لشکر کفار کے مقابلہ کی ترجیح، فتح بدر کا اسلام کی حجت ہونا، لشکر کفار کو مسلمانوں کی نگاہوں میں کم کر کے دکھانا اور لشکر اسلام کو کفار کی آنکھوں میں زیادہ کر کے دکھانا یہ محض اللہ کی تائید اور نصرت ہے۔ کفار سے مقابلہ کے وقت ثابت قدم رہنے کا حکم دینا اور آپس کے اختلاف اور بزدلی سے منع کرنا۔ ان کافروں کی روش سے اجتناب کا حکم جو اپنے زور اور طاقت پر اڑتے تھے اور شیطان کے بہکانے میں آگئے اور شیطان کا ان سے بری ہونا۔ (الانفال: ۳۸-۴۸)

منافقین کی مذمت، موت کے وقت کفار کی حالت کا بیان اور آل فرعون کے انجام سے ان کی مشابہت، آل فرعون پر عذاب کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ جن کافروں نے آپ سے عہد شکنی کی، ان کو میدان جنگ میں سزا دینے کا حکم، جو قوم عہد شکنی کرے اس کے معاہدوں کو توڑنے کا حکم، کفار سے جنگ کے لیے آلات حرب جمع کرنے کا حکم، اگر کفار مائل بہ صلح ہوں تو ان سے صلح کرنے کا حکم، اور اگر وہ دھوکا دیں تو آپ اللہ کی نصرت پر توکل کریں۔ اللہ کا مسلمانوں کے دلوں میں الفت پیدا کرنا اور آپ کے لیے اللہ کی نصرت اور مسلمانوں کی حمایت کا کافی ہونا۔ (الانفال: ۶۳-۶۹)

آپ کو یہ حکم دینا کہ مسلمانوں کو جہاد پر راغب کریں، پہلے بیس مسلمانوں کو دو سو کافروں سے مقابلہ کا مکلف کرنا، پھر تخفیف کر کے سو مسلمانوں کو دو سو کافروں سے مقابلہ کا مکلف کرنا۔ کفار کا خون بہائے بغیر ان سے فدیہ لینے کا عدم جواز اور اجتنابی خطا کی وجہ سے مسلمانوں کے فدیہ لینے کو معاف کرنا۔ آپ کی وساطت سے بدر کے قیدیوں کو یہ پیغام دیا کہ اگر تمہارے دلوں میں کوئی نیکی ہے تو تم سے جو فدیہ لیا گیا ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے بہتر چیز عطا فرمائے گا، اور اگر انہوں نے آپ سے خیانت کا ارادہ کیا تو جس طرح اب وہ شکست اور قید و بند سے دو چار ہوئے ہیں دوبارہ پھر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک دوسرے کی حمایت اور ولایت کی بنیاد رکھنا اور جو لوگ دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کریں وہ مسلمانوں کی ولایت اور حمایت میں داخل نہیں ہیں۔ ہاں اگر وہ دینی معاملات میں مدد چاہیں تو تم پر ان کی مدد لازم ہے۔ یہ شرطیکہ اس سے تمہارے کسی سابقہ معاہدہ پر زدنہ پڑے۔ کفار ایک دوسرے کے وارث ہیں۔ اللہ کے احکام پر عمل نہ کرنا بہت بڑے فتنے اور فساد کا موجب ہے۔ مہاجرین، انصار اور مجاہدین کے لیے رزق میں وسعت اور مغفرت کی نوید، بعد میں ایمان لانے والے اور ہجرت کرنے والے بھی پہلوں کے ساتھ لاحق ہیں۔ بعض رشتہ داروں سے زیادہ راجح ہیں ○

(الانفال: ۷۵-۷۶)

سورۃ الانفال کے مقاصد

مال غنیمت کے احکام کا بیان کرنا، مسلمانوں کو چاہیے کہ باہم اتفاق سے رہیں۔ مسلمانوں کا غزوہ بدر کی طرف نکلنا اور قلت تعداد کے باوجود اللہ کی تائید اور نصرت سے کامیابی، دشمن کے خلاف جہاد کی تیاری کرنا، دین کی بنا پر ایک دوسرے کی مدد کرنا، جس سبب سے مسلمان غزوہ بدر کے لیے نکلے۔ معرکہ بدر میں دونوں جماعتوں کے قتال کی کیفیت، منافقوں کے مکرو فریب سے احتراز کرنا، ان سابقہ امتوں کی مثال جنہوں نے اپنے رسولوں کی مخالفت کی اور اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔ مسلمانوں اور کافروں کے

درمیان معاہدوں کے احکام، قیدیوں کے احکام، دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں کے احکام، ان تمام امور کو بیان کرنا اس سورت کے اہم مقاصد میں سے ہے۔

اب میں اللہ تعالیٰ کی توفیق اور تائید سے سورۃ الانفال کی تفسیر شروع کرتا ہوں۔ اللہ العالمین! مجھے اس تفسیر میں ہدایت اور صراط مستقیم پر قائم رکھنا اور خطا اور لغزشوں سے محفوظ اور مامون رکھنا۔ مجھے حق کی اتباع اور باطل سے اجتناب عطا فرمانا اور اس تفسیر کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرمانا اور اس کو قیامت تک مسلمانوں کے لیے اثر آفرین رکھنا۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلٰوةَ وَالسَّلَامَ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّينَ قَائِدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ شَفِيْعِ الْمَذْنِبِيْنَ وَعَلٰی اَزْوَاجِهِ اِمْهَاتِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَعَلٰى اٰلِهِ الطَّاهِرِيْنَ وَاَصْحَابِهِ الْكَامِلِيْنَ وَاٰخِيَارِ التَّابِعِيْنَ وَاَلْعُلَمَاءِ الرَّاسِخِيْنَ مِنَ الْمَفْسِرِيْنَ وَالْمُحَدِّثِيْنَ وَالْفُقَهَاءِ الْمُجْتَهِدِيْنَ وَسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔

غلام رسول سعیدی غفرلہ

۲/ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

۲۲/ دسمبر ۱۹۹۸ء

سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّةٌ وَهِيَ خَمْسٌ وَسَبْعُونَ آيَةً وَعَشْرٌ كُوْعَاتٍ

سورۃ انفال مدنی ہے اس میں پچتر آیتیں ہیں اور دس رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ ہی کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو نہایت رحم فرمانے والا بہت مہربان ہے۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

(اے رسول مکرم!) یہ آپ کے انفال (اموال غنیمت) کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کیسے کہ انفال (کے حکم) کا اللہ اور اس کا رسول مالک ہے

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ

سو تم اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو اور اگر تم مومن (کامل) ہو تو اللہ

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ اِثْمًا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذَكَرَ اللّٰهُ

اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو ۝ وہی لوگ مومن کامل ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے

وَجَلَّتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيٰتُهُ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا

تو ان کے دل غورزدہ ہو جائیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو وہ ان کے ایمان کو زیادہ کر دیں

وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۶﴾ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا

اور وہ اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں ○ جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیے ہوئے رزق

رِزْقِهِمْ يُنْفِقُونَ ﴿۷﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ﴿۸﴾ لَهُمْ

میں سے خرچ کرتے ہیں ○ یہی لوگ برحق مومن ہیں ان کے رب کے

دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ كَرِيمَةٌ ﴿۹﴾ كَمَا أَخْرَجَكَ

پاس ان کے لیے (بلند) درجات ہیں اور بخشش اور معزز روزی ہے ○ (مال غنیمت کی تقسیم میں ان کا اختلاف

رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ

کرنا اسی طرح ہے) جس طرح اس وقت ان کا اختلاف تھا جب آپ کے رب حق کے ساتھ آپ کو آپ کے گھر سے باہر لایا تھا اور بیشک مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو

لَكَرِهُونَ ﴿۱۰﴾ يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا

ناپسند کرنے والا تھا ○ وہ لوگ حق ظاہر ہونے کے باوجود آپ سے اس میں بحث کر رہے تھے ، گویا کہ وہ

يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ﴿۱۱﴾ وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ

آنکھوں دیکھتے موت کی طرف دھکیلے جا رہے تھے ○ اور (یاد کرو) جب اللہ نے دو گروہوں میں

إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ أَنَّهُمَا لَكُمْ وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ

ایک پر غلبہ) کا تم سے وعدہ فرمایا تھا کہ یہ تمہارے لیے ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ (قافلہ)

الشُّوْكَةِ تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَ

تمہارے ہاتھ لگے ، اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو ثابت کر دے اور

يَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۲﴾ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ

کافروں کی جڑ کاٹ دے ○ تاکہ وہ حق کو ثابت کر دے اور ناحق کو باطل کر دے

وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿۱۳﴾ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ

خواہ مجرموں کو ناگوار ہو ○ اور (یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری دعا

لَكُمْ أَنِّي مِيدٌ كُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرَدِّفِينَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ

قرآن فرمائی کہ میں ایک ہزار لگا تار آنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد فرماتے والا ہوں ۝ اور اللہ نے اس کو تمہارے

اللَّهُ إِلَّا بَشْرًا وَّلِتَطْبِئِرَ بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ

یہ صرف خوشخبری بنایا تاکہ اس کی وجہ سے تمہارے دل مطمئن ہوں اور نصرت صرف اللہ کی جانب سے ہوتی ہے

اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

بیشک اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے ۝

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اے رسول مکرم!) یہ آپ سے انفال (اموال غنیمت) کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہتے کہ انفال (کے حکم) کا اللہ اور اس کا رسول مالک ہے، سو تم اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو اور اگر تم مومن (کامل) ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو۔ (الانفال: ۱)

انفال کا معنی اور اس کے مصداق میں مفسرین کے نظریات

انفال کے معنی میں صحابہ کرام اور اخیار تابعین کا اختلاف ہے، 'عکرمہ'، 'مجاہد'، 'ضحاک'، 'قناده'، 'عطاء' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انفال کا معنی ہے: اموال غنیمت۔

عطاء، ابن جریج اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ انفرادی طور پر مشرکوں سے مسلمان جو چیز حاصل کر لیں مثلاً غلام یا سواری وغیرہ وہ انفال ہے، یا مشرکین سے جو چیز چھین لیں یا اس کے لباس سے اتار لیں مثلاً گھوڑا اور تلوار وغیرہ۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی روایت ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم سے جو چیزیں الگ کر لی جائیں وہ انفال ہیں۔ ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا: انفال کیا ہے؟ آپ نے فرمایا گھوڑا انفال میں سے ہے اور مشرکین سے چھینی ہوئی چیزیں انفال میں سے ہیں۔

نیز عطاء نے کہا جو چیز بغیر جنگ کے مسلمان انفرادی طور پر مشرکین سے حاصل کر لیں وہ انفال ہے۔

مجاہد سے یہ بھی روایت ہے کہ انفال کا معنی خمس ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے فرمایا ان اقوال میں اولیٰ یہ ہے کہ انفال مال غنیمت سے وہ زائد چیز ہے جس کو امیر لشکر، لشکر کے بعض یا کل افراد کو بہ طور ترغیب اور تحریص عطا کرتا ہے جس میں ان کی یا تمام مسلمانوں کی بہتری ہو، اور وہ چیز کفارت چھینے ہوئے سامان میں سے ہوتی ہے یا امیر لشکر تک وہ زائد پہنچتی ہے یا مشرکین کے اسباب میں سے ہوتی ہے، ہم نے اس قول کو اولیٰ اس لیے کہا ہے کہ کلام عرب میں نفل اصل سے زائد چیز کو کہتے ہیں۔ ہر وہ چیز جو لشکریوں کے حصہ مال غنیمت سے زائد ہو اور لشکری کو وہ چیز امیر لشکر نے عطا کی ہو جیسے کافر سے چھینا ہوا مال، وہ انفال ہے۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۲۲۸-۲۲۳، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں انفال کے ان تمام معانی کا احتمال ہے اور بعض کی بعض پر ترجیح کی کوئی دلیل نہیں ہے، اگر حدیث سے کسی ایک معنی کی تعین ثابت ہو جائے تو وہی معنی متعین ہو جائے گا۔ ان معانی میں تناقض نہیں ہے اس لیے ان تمام معانی کا ارادہ کرنا جائز ہے اور اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد خنس ہے جو نبی ﷺ کا مال ہے اور آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے یا تقسیم کے بعد اس میں سے جس کو چاہیں بطور ترغیب عطا فرمادیں، اور جس مجاہد کو یہ ملے گا وہ اس کے حصہ مال غنیمت سے زائد ہوگا۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۲۴۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ کا مختار یہ ہے کہ انفال سے مراد مال غنیمت ہے، ان کا استدلال اس حدیث سے ہے:

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نے عظیم غنیمت کو حاصل کیا، اس میں ایک تلوار بھی تھی، میں وہ تلوار لے کر نبی کریم ﷺ کے پاس گیا، اور عرض کیا مجھے یہ تلوار زیادہ دے دیں کیونکہ آپ کو میرا حال معلوم ہے۔ آپ نے فرمایا اس کو وہیں رکھ دو جہاں سے اس کو لیا ہے۔ میں اس کو وہاں رکھنے گیا، پھر میرے دل میں خیال آیا میں آپ کے پاس دوبارہ گیا اور کہا آپ مجھے یہ تلوار دے دیں! آپ نے بہ آواز بلند فرمایا اس کو وہیں رکھ دو جہاں سے اس کو لیا ہے اور تب یہ آیت نازل ہوئی: یسئلونک عن الانفال۔ (الانفال: ۱)

(صحیح مسلم فضائل صحابہ: ۲۳، (۲۳۱۲) ۶۱۲۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۷۴۰، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۹۰)

مال غنیمت کے استحقاق میں صحابہ کرام کا اختلاف

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ آپ سے انفال کے متعلق سوال کرتے ہیں، نیز فرمایا اور آپس میں صلح رکھو، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا مال غنیمت کے حکم میں اختلاف تھا، پھر انہوں نے اس کا حکم معلوم کرنے کے لیے نبی ﷺ سے سوال کیا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ انفال (مال غنیمت) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم کے تابع ہیں، وہ جس کو چاہیں اور جتنا چاہیں عطا کر دیں۔ مال غنیمت کے حکم میں مسلمانوں کے اختلاف کی تفصیل حسب ذیل روایت سے معلوم ہوتی ہے:

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے ایسا ایسا کام کیا اس کو فلاں فلاں چیز زائد ملے گی، پس نوجوان آگے بڑھے اور بڑے بوڑھے جھنڈوں کے پاس کھڑے رہے اور ان کے ساتھ نہیں گئے، جب اللہ نے ان کو فتح عطا فرمائی تو بوڑھوں نے کہا تم ہماری پناہ میں تھے، اگر تم شکست کھاتے تو ہماری طرف آتے، تو تم ہمارے بغیر مال غنیمت نہ لو، جوانوں نے اس کا انکار کیا اور کہا رسول اللہ ﷺ نے یہ مال غنیمت ہمارے لیے رکھا ہے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "یسئلونک عن الانفال" (الآیہ)

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۳۷، السنن الکبریٰ للنسائی ج ۶، رقم الحدیث: ۱۱۱۹۷، المستدرک ج ۲، ص ۳۲۶، حاکم نے کہا یہ حدیث صحیح ہے اور ذہبی نے ان کی موافقت کی، جامع البیان ج ۹، ص ۲۲۸، الدر المنثور ج ۴، ص ۶)

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ باہر نکلے، میں آپ کے ساتھ بدر میں حاضر تھا، مسلمانوں کا کفار سے مقابلہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دے دی، مسلمانوں کی ایک جماعت ان کا پیچھا کر رہی تھی اور ان کو قتل کر رہی تھی اور مسلمانوں کی دوسری جماعت ان کا مال جمع کر رہی تھی، اور تیسری جماعت رسول اللہ ﷺ کے گرد آپ کی حفاظت کر رہی تھی، مبادا آپ کو دشمن کی طرف سے کوئی ضرر پہنچے، حتیٰ کہ جب رات ہو گئی اور مسلمانوں کی آپس میں

ملاقات ہوئی تو جن مسلمانوں نے مال غنیمت جمع کیا تھا انہوں نے کہا کہ اس مال میں اور کسی کا حق نہیں ہے، اس مال غنیمت کو ہم نے اکٹھا کیا ہے، اور جن مسلمانوں نے دشمن کا پیچھا کیا تھا انہوں نے کہا تم ہم سے زیادہ اس مال غنیمت کے حقدار نہیں ہو، ہم نے دشمن کو بھگا دیا ہے اور ہم نے اس کو شکست دی ہے، اور جن مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی تھی انہوں نے کہا تم ہم سے زیادہ اس مال غنیمت کے حقدار نہیں ہو، ہم نے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی تھی، مبادا آپ کسی کافر کے حملہ کی زد میں آجائیں اور ہم آپ کی حفاظت میں مشغول رہے تب یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ آپ سے اموال غنیمت کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہتے کہ انفال (کے حکم) کے اللہ اور رسول ﷺ مالک ہیں، سو تم اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت کو ان میں ان کے حصوں کے اعتبار سے تقسیم فرمایا۔

(مسند احمد ج ۵، ص ۵۲۳، طبع قدیم، مسند احمد ج ۸، رقم الحدیث: ۲۲۸۲۶، طبع جدید، دار الفکر مسند احمد ج ۱۶، رقم الحدیث: ۲۲۶۶۱، طبع دار الحدیث قاہرہ، شیخ احمد شاکر نے کہا اس کی سند صحیح ہے۔ المستدرک، ج ۲، ص ۳۲۶، مجمع الزوائد، ج ۷، ص ۲۶، الدر المنثور، ج ۴، ص ۵)

تتفیل (کسی نمایاں کارنامہ پر مجاہدوں کو غنیمت سے زائد انعام دینے) میں فقہاء مالکیہ کا نظریہ علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ خمس (مال غنیمت کے پانچویں حصہ) میں سے امام اجتہاد سے جو انعامات عطا کرے وہ انفال ہیں، اور مال غنیمت کے باقی چار حصوں میں سے نفل (یہ انعام) نہیں دیا جائے گا۔ ان کے نزدیک اصل مال غنیمت سے نفل دینا اس لیے جائز نہیں کہ مال غنیمت کے مستحقین متعین ہیں اور وہ میدان جہاد میں گھوڑے دوڑانے والے مجاہدین ہیں، اور خمس میں سے عطا کرنا امام کی رائے پر موقوف ہے اور اس کے مستحقین غیر معین ہیں، امام مالک کا استدلال اس حدیث سے ہے: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے نجد کی طرف ایک لشکر بھیجا ان کو مال غنیمت میں بہت زیادہ اونٹ ملے اور مال غنیمت میں سے ان کا حصہ بارہ بارہ یا گیارہ گیارہ اونٹ تھے اور ان کو ایک ایک اونٹ زائد دیا گیا۔ الموطا رقم الحدیث: ۹۸۷ اور سنن ابوداؤد میں ہے کہ ان کا حصہ بارہ بارہ اونٹ تھے ان کو ایک ایک اونٹ زائد دیا گیا تو ہر ایک کو تیرہ تیرہ اونٹ مل گئے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۷۴۳)

نیز امام مالک نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے: عمرو بن شعیب بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ حنین سے لوٹے اور بحر انہ کی طرف جانے لگے اور آپ کی چادر درخت کی شاخوں سے الجھ کر گر گئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری چادر اٹھا دو، کیا تم کو یہ خطرہ ہے کہ اللہ نے جو کچھ مجھ کو عطا کیا ہے میں وہ تمہارے درمیان تقسیم نہیں کروں گا، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے اگر اللہ مجھے تمامہ کے درختوں کے برابر اونٹ بھی عطا کرے تو میں ان کو تمہارے درمیان تقسیم کر دوں گا، پھر تم مجھے بخیل پاؤ گے نہ بزدل نہ جھوٹا۔ پھر جب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں میں قیام کیا تو فرمایا کسی کے پاس سوئی یا دھاگہ بھی ہے تو دے دے کیونکہ مال غنیمت عار ہے اور نار کا سبب ہے۔ اس کے بعد آپ نے زمین کو کرید اور اونٹ کا ایک بال یا کوئی چیز اٹھا کر فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو مال عطا فرمایا ہے اس میں سے خمس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں ہے اور خمس بھی تم پر لوٹا دیا جاتا ہے۔ (محل استدلال یہ آخری جملہ ہے کہ خمس بھی تم پر لوٹا دیا جاتا ہے)۔ (الموطا رقم الحدیث: ۹۹۳، مسند احمد ج ۶، رقم الحدیث: ۱۷۱۵۳)

(الجامع لاحکام القرآن ج ۷، ص ۳۵۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

تفہیل میں فقہاء شافعیہ کا نظریہ

علامہ ابوالفتح ابراہیم بن علی الشیرازی الشافعی المتوفی ۴۵۵ھ لکھتے ہیں:

جو شخص ایسا کارنامہ انجام دے جس کی وجہ سے دشمن پر فتح حاصل ہو، مثلاً وہ دشمن کی جاسوسی کرے اور اس کے راستوں کو یا اس کے قلعہ کا کھوج لگائے یا وہ ابتداء دار الحرب میں داخل ہو، یا سب کے بعد دار الحرب سے لوٹے تو امام کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کو نفل دے (مال غنیمت کے حصہ سے زیادہ دے) کیونکہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ابتداء میں چوتھائی حصہ زائد عطا فرماتے تھے اور لوٹتے وقت تہائی حصہ اور زائد کی مقدار لشکر کے امیر کی رائے پر موقوف ہے کیونکہ وہ جنگی مصلحت کے لیے خرچ کرتا ہے اور بہ قدر عمل دیتا ہے، کیونکہ جو شخص ابتداء میں دار الحرب میں داخل ہوتا ہے اس وقت دشمن اس سے غیر محتاط ہوتا ہے۔ اور جو آخر میں دار الحرب سے لوٹتا ہے اس کو دشمن کے خوف کا زیادہ مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے نبی ﷺ ابتداء دار الحرب میں داخل ہونے والوں کی نسبت آخر میں لوٹنے والوں کو زیادہ حصہ دیتے تھے۔ زائد حصہ مسلمانوں کے بیت المال سے دینا بھی جائز ہے اور اس مال سے بھی دینا جائز ہے جو مشرکین سے لے کر جمع کیا جاتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے بیت المال سے دیا جائے تو یہ خمس کے پانچویں حصہ میں سے دیا جائے گا۔ کیونکہ سعید بن مسیب روایت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو نفل (مال غنیمت سے زائد حصہ) خمس میں سے دیا جاتا تھا اور اس لیے بھی کہ خمس وہ مال ہے جس کو کسی مصلحت میں خرچ کیا جاتا ہے اس لیے وہ خمس کے پانچویں حصہ میں سے دیا جائے گا اور نفل کی مقدار کا مجموعہ رکھنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ایک عقد کا عوض ہے اور اگر نفل کفار کے مال سے دیا جائے تو پھر اس کا مجموعہ رکھنا جائز ہے، کیونکہ نبی ﷺ نے ابتداء میں چوتھائی حصہ رکھا اور لوٹنے میں تہائی رکھا اور یہ مال غنیمت کا ایک مجموعہ حصہ ہے۔ (کیونکہ مال غنیمت کی مقدار غیر معلوم ہے تو اس کا تہائی یا چوتھائی حصہ بھی غیر معلوم ہو گا۔) (المہذب ج ۲ ص ۲۳۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

تفہیل میں فقہاء حنبلیہ کا نظریہ

علامہ موفق الدین عبد اللہ بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں:

نفل کا معنی ہے کسی شخص کو اس کے حصہ سے زیادہ دینا اور اس کی دو نوع ہیں:

نوع اول وہ ہے جس میں نفل کا استحقاق کسی شرط کی وجہ سے ہو اور اس کی پھر دو قسمیں ہیں: قسم اول یہ ہے کہ امیر جب دار الحرب میں جہاد کے لیے داخل ہو تو وہ اپنے سامنے ایک لشکر کو دشمن پر حملہ کرنے کے لیے بھیجے اور ان کو پانچویں حصہ کے بعد چوتھائی حصہ دینے کا اعلان کرے اور جب وہ واپس لوٹے تو پھر ایک لشکر کو حملہ کرنے کے لیے بھیجے اور ان کو پانچویں حصہ کے بعد تہائی حصہ دینے کا اعلان کرے اور جب مال غنیمت اکٹھا ہو تو دونوں لشکروں کو حسب اعلان دے پھر باقی مال غنیمت ان دونوں لشکروں سمیت پورے بڑے لشکر میں تقسیم کرے۔ نوع اول کی دوسری قسم یہ ہے کہ امیر اس شخص کے لیے کسی زائد حصہ کا اعلان کرے جو مسلمانوں کے لیے کوئی مفید کام انجام دے، مثلاً امیر یہ کہے کہ جو شخص اس قلعہ میں داخل ہو گا اس کو یہ انعام ملے گا، یا یہ کہے کہ جو شخص قلعہ میں نقب لگائے گا، یا جو شخص کسی کو گرفتار کر کے لائے گا اس کو یہ انعام ملے گا، کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا تھا جو شخص کسی قتل (کافر) کو قتل کرے گا، اس کا سب سامان اس کو ملے گا۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۴۷۱۸)

اور یہ انعام مسلمانوں کے مال سے دینا بھی جائز ہے اور مشرکین سے لیے ہوئے مال سے دینا بھی جائز ہے۔ اگر مسلمانوں کے مال سے انعام کا اعلان کیا جائے تو اس کی مقدار کا معلوم ہونا ضروری ہے اور اگر مشرکین کے مال سے انعام کا اعلان کیا جائے تو پھر اس کی مقدار کا مجموعہ رکھنا بھی جائز ہے جیسے نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ جس شخص نے کسی قتل کو قتل کیا تو اس سے چھینا ہوا

سامان اس کا ہے اور سامان کی مقدار مجہول ہے۔

نوع ثانی یہ ہے کہ کسی مسلمان کی کسی خاص کارکردگی کی وجہ سے امام اس کو خصوصی زائد حصہ دے مثلاً اس نے جنگ میں زیادہ مشقت برداشت کی ہو یا کسی اہم معاملہ میں جاسوسی کی ہو یا وہ مقدمتہ لہجش میں ہو یا اور کوئی نمایاں کام کیا ہو تو اس میں بغیر پیشگی شرط کے بھی زائد حصہ دینا جائز ہے، جیسا کہ امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے کہ عبدالرحمن بن عیینہ نے نبی ﷺ کے اونٹ لوٹ لیے، حضرت سلمہ بن الاکوع نے ان کا پیچھا کیا تو نبی ﷺ نے ان کو سوار کا حصہ بھی دیا اور پیادہ کا حصہ بھی دیا۔

(سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۶۹۷، الکافی، ج ۴، ص ۱۳۹-۱۳۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

تفصیل میں فقہاء احناف کا نظریہ

علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر المرغینانی المغنی المتوفی ۵۹۳ھ لکھتے ہیں:

اگر امام حالت جنگ میں کسی شخص کے لیے تفصیل (زائد حصہ دینے) کا اعلان کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً یہ کہے کہ جس شخص نے کسی قتل (کافر) کو قتل کیا تو اسے اس کا سلب (سامان) ملے گا، یا لشکر سے یہ کہے کہ خمس نکالے جانے کے بعد تمہیں اس کا چوتھائی حصہ ملے گا، کیونکہ جنگ پر ابھارنا مستحب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "يا ايها النبي حرض المومنين على القتال" (الانفال: ۶۵) اے نبی آپ مسلمانوں کو جہاد پر ابھاریں۔ اور یہ اعلان بھی ایک قسم کا جنگ پر ابھارنا ہے۔ تفصیل (زائد حصہ دینے کا اعلان کرنا) اس طرح بھی ہو سکتا ہے اور کسی اور طرح بھی ہو سکتا ہے، لیکن امام کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کافروں سے حاصل کیے ہوئے تمام مال کا اعلان کر دے کیونکہ اس سے تمام مجاہدوں کا حق ضائع ہو گا، ہاں اگر تمام لشکر کے لیے اعلان کر دے تو یہ جائز ہے، اور جب مال غنیمت جمع کر کے دارالاسلام میں پہنچا دیا جائے تو پھر کسی کے لیے اعلان نہ کرے، کیونکہ اب اس میں دوسروں کا حق موکد ہو چکا ہے، البتہ خمس میں سے اب بھی اعلان کیا جا سکتا ہے، کیونکہ خمس میں مال غنیمت لینے والوں کا بھی حق ہے اور جب کافر کا سلب (سامان) قاتل کو نہ دیا جائے تو وہ من جملہ مال غنیمت میں سے ہے اور قاتل اور غیر قاتل اس میں برابر ہیں، اور کافر کا سلب اس کے کپڑے، اس کے ہتھیار اور اس کی سواری ہے اور سواری پر جو زین اور دیگر آلات ہوں وہ بھی اس میں داخل ہیں، اسی طرح سواری کے اوپر جو کافر کا سامان ہو وہ بھی اس میں شامل ہے اور ان کے علاوہ اور کوئی چیز اس میں داخل نہیں ہے۔ پھر تفصیل (خصوصی حصہ دینے کا اعلان) کا حکم یہ ہے کہ اس سے دوسروں کا حق منقطع ہو جاتا ہے اور مجاہدین اس کے مالک اس وقت ہوتے ہیں جب مال غنیمت دارالاسلام میں پہنچ جاتا ہے حتیٰ کہ اگر امام نے یہ اعلان کیا کہ جس شخص کو کوئی باندی ملی وہ اس کی ہے اور کسی مجاہد کو ایک باندی مل گئی اور اس نے اس کا استبراء کر لیا (یعنی باندی کا حیض گزر گیا) تب بھی اس مجاہد کے لیے اس باندی سے مباشرت کرنا جائز ہے نہ اس کو فروخت کرنا۔ یہ امام حنیفہ اور امام ابو یوسف کا قول ہے، امام محمد کے نزدیک یہ دونوں امر جائز ہیں۔ (ہدایہ اولین ص ۵۸۰-۵۷۸، ملخصاً، مطبوعہ مکتبہ شرکتہ علیہ، ملتان)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وہی لوگ مومن کامل ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل خوف زدہ ہو جائیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو وہ ان کے ایمان کو زیادہ کر دیں اور وہ اپنے رب پر ہی توکل کرتے رہیں۔

(الانفال: ۲)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو بشرطیکہ تم کامل مومن ہو۔ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ کمال ایمان کمال طاعت کو مستلزم ہے اور کمال ایمان اس وقت حاصل ہو گا جب اللہ کے ذکر سے مسلمان کا دل خوف زدہ ہو اور اللہ کی آیات سن کر اس کا ایمان قوی ہو اور وہ صرف اپنے رب پر توکل کرے، نماز قائم کرے اور

تبیان القرآن

جلد چہارم

صدقہ و خیرات ادا کرے، سوائے لوگوں کا ہی ایمان کامل ہے اور وہ برحق مومن ہیں۔
وجل کا معنی

اس آیت میں فرمایا ہے: ”وجلّت قلوبہم“ علامہ راغب اصفہانی وجل کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: وجل کا معنی ہے خوف محسوس کرنا، قرآن مجید میں ہے:

إِنَّا مِنكُمْ وَجَلُّونَ ۝ قَالُوا لَا تَوْجَلْ

(الحجر: ۵۳-۵۴) (فرشتوں نے) کہا آپ مٹ ڈریے۔

(المفردات، ج ۲، ص ۶۶۵، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۸ھ)

اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف کے متعلق قرآن مجید کی آیات

قرآن مجید کی اور آیتوں میں بھی یہ فرمایا ہے کہ مسلمان اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں:

اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا، ایسی کتاب جس کی تمام باتیں ایک جیسی ہیں، بار بار دہرائی ہوئی، جو مسلمان اپنے رب سے ڈرتے ہیں اس سے ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔

اللَّهُ نَزَلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا
مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ
يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ
إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (الزمر: ۲۳)

بے شک ایمان والے کامیاب ہو گئے، وہ جو اپنی نماز میں اللہ سے ڈرتے ہیں۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي
صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ (المؤمنون: ۱-۲)

بے شک جو لوگ اللہ کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ
(المؤمنون: ۵۷)

یہ محض شیطان ہے جو (تمہیں) اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، سو تم ان سے نہ ڈرو اور (صرف) مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔

إِنَّمَا ذَاكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا
تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝
(آل عمران: ۱۷۵)

سو تم لوگوں سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَخْشَوْنِ
(المائدہ: ۴۴)

بے شک جو لوگ بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت ہے اور بہت بڑا اجر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُمْ
مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ (الملك: ۱۴)

اور رہا وہ شخص جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس (امارہ) کو اس کی خواہش سے روکا تو بے شک اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ
الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝
(النزعت: ۴۱-۴۰)

اور جو اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا، اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَيْنِ
(الرحمن: ۴۶)

اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خوف کے متعلق احادیث اور آثار

اللہ تعالیٰ کے خوف کی دو قسمیں ہیں ایک ہے عذاب کے خوف سے گناہوں کو ترک کرنا، یہ خوف عام مسلمانوں کو ہوتا ہے بلکہ عام مسلمانوں میں سے بھی پرہیزگاروں کو ہوتا ہے، اور دوسری قسم ہے اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظمت سے اور اس کی بے نیازی سے ڈرنا، یہ خوف انبیاء اور مرسلین، اولیاء کاملین اور ملائکہ مقربین کو ہوتا ہے اور جس کا اللہ تعالیٰ سے جتنا زیادہ قرب ہوتا ہے اس کو اتنا زیادہ خوف ہوتا ہے۔

امام بخاری نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۰)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی قسم مجھے امید ہے کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ تقویٰ کو جاننے والا ہوں۔

(صحیح مسلم صوم: ۷۹، (۱۱۱۰) ۲۵۵۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۳۸۹، سنن کبریٰ للنسائی ج ۵، رقم الحدیث: ۳۰۲۵)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے! (یا آپ کے بال سفید ہو گئے) آپ نے فرمایا مجھے سورہ ہود، سورہ الواقعة اور سورہ المرسلات نے بوڑھا کر دیا۔ (ان سورتوں میں قیامت کا ذکر ہے، یعنی قیامت کی ہولناکیوں کے خوف سے آپ کے بال سفید ہو گئے۔)

(شامل ترمذی رقم الحدیث: ۴۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۲۹۷، علیہ الاولیاء ج ۳، ص ۳۵، المستدرک ج ۲، ص ۳۳۳، المعجم الکبیر ج ۱، ص ۲۸۶، رقم الحدیث: ۷۹۰، کامل ابن عدی ج ۲، ص ۶۶۳)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جس کو تم نہیں دیکھتے، اور میں وہ آوازیں سنتا ہوں جن کو تم نہیں سنتے، بے شک آسمان چرچرا رہا ہے (خوف خدا سے ڈری ہوئی آوازیں نکال رہا ہے) اور اس پر حق ہے کہ وہ چرچرائے، اور اللہ کی قسم اگر تم ان چیزوں کو جان لو جن کو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو کم اور روؤ زیادہ، اور تم بستروں پر عورتوں سے لطف اندوز ہونا چھوڑ دو اور تم گھر سے باہر صحن میں نکل جاؤ اور بے آواز بلند اللہ سے فریاد کرو۔ حضرت ابوذر نے کہا اللہ کی قسم! میری خواہش ہے کہ میں ایک درخت ہوتا جس کو کاٹ دیا جاتا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۱۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۹۰)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے قرآن سناؤ، تو میں نے سورۃ النساء پڑھی۔ حتیٰ کہ جب میں اس آیت پر پہنچا:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فِئْتَانًا يَنْتَحِبُونَ
جَنَّتَابِكَ عَلَىٰ هُمْ لَكَ شِهَابًا ۗ (النساء: ۴۱)

اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور ہم آپ کو ان پر گواہ بنا کر لائیں گے۔

حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ میں نے حضور کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵۸۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۸۰۰، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۲۶۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۳۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۱۹۳، مسند احمد ج ۱، رقم الحدیث: ۳۵۵۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۷۰۶۵، المعجم الکبیر ج ۸، رقم الحدیث: ۸۲۶۰، مسند ابو-علی رقم الحدیث: ۵۲۲۸، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۱۰، ص ۲۳۱)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک جنازہ میں تھے، آپ ایک قبر کے

کنارے بیٹھ گئے اور آپ رونے لگے حتیٰ کہ قبر کی مٹی بھیگ گئی۔ پھر آپ نے فرمایا اے میرے بھائیو! اس کی مثل کے لیے تیاری کرو۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۹۵)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا روؤ، اگر تم رونہ سکو تو رونے جیسی شکل بنا لو۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۹۶)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس بندہ مومن کی آنکھ سے اللہ کے خوف سے آنسو نکلے خواہ وہ پچھر کے سر جتنا ہو، پھر وہ آنسو رخسار کے سامنے کے حصہ کو مس کرے اللہ اس پر دوزخ کی آگ کو حرام کر دیتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۱۹۷)

حسن بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے درخت پر ایک پرندے کو بیٹھا دیکھ کر کہا تیرے لیے کتنی خیر ہے اے پرندے تو پھل کھاتا اور درخت پر بیٹھا ہے، کاش میں ایک پھل ہوتا جس کو پرندے کھا لیتے!

(کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث: ۲۴۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

عبد اللہ بن عامر بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا حضرت عمر بن الخطاب نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کما کاش میں ایک تنکا ہوتا کاش میں کچھ بھی نہ ہوتا کاش میں پیدا نہ ہوتا کاش میں بھولا بسرا ہوتا۔ (کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث: ۲۴۴)

حمید بن ہلال بیان کرتے ہیں کہ حرم بن حیان اور عبد اللہ بن عامر اپنی سواریوں پر جا رہے تھے، راستہ میں خشک گھاس ملی تو ان کی اونٹنیاں اس گھاس کی طرف دوڑیں اور ان میں سے ایک نے وہ گھاس کھالی۔ حرم نے عبد اللہ سے کہا کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تم یہ گھاس ہوتے اور تم کو یہ اونٹنی کھا کر چلی جاتی، عبد اللہ نے کہا اللہ کی قسم میں اس کو پسند نہیں کروں گا، بے شک میں یہ امید رکھتا ہوں کہ اللہ مجھے جنت میں داخل کر دے گا، بے شک میں یہ امید رکھتا ہوں، بیشک میں یہ امید رکھتا ہوں۔ حرم نے کہا اللہ کی قسم اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے دل کی بات مانی جائے گی تو میں یہ پسند کرتا کہ میں خشک گھاس ہوتا اور مجھے یہ اونٹنی کھا کر چلی جاتی۔ (کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث: ۲۴۷)

زیاد بن محراق بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا میری خواہش ہے کہ میں اپنے گھر کا ایک مینڈھا ہوتا، گھر میں کوئی مہمان آتا اور مجھے ذبح کر دیا جاتا اور گھر والے مجھے کھا لیتے۔ (کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث: ۲۴۸)

قنادہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے کما کاش میں ایک مینڈھا ہوتا، مجھے گھر والے ذبح کر دیتے اور میرا گوشت کھا لیتے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے کہا میں چاہتا ہوں کہ میں گھاس ہوتا اور مجھے تیز ہوا کے دن آندھی اڑا کر لے جاتی۔ (کتاب الزہد لابن المبارک رقم الحدیث: ۲۴۱)

اسحاق بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کاش میں ایک درخت ہوتی جس کو کاٹ دیا جاتا کاش میں پیدا نہ کی جاتی۔ (کتاب الزہد لیلو کعب رقم الحدیث: ۱۶۱، الطبقات الکبریٰ ج ۷، ص ۷۵، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۲۵۲-۲۵۱)

ضحاک بن مزاحم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ نے کما کاش میں پرندہ ہوتا۔ (کتاب الزہد لیلو کعب رقم الحدیث: ۱۶۲)

قاسم بن عبد الرحمن بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ کے پاس ایک شخص نے کما کاش میں اصحاب الیمین سے ہوتا، حضرت عبد اللہ نے کما کاش مجھے مرنے کے بعد اٹھایا نہ جاتا۔ (کتاب الزہد لیلو کعب رقم الحدیث: ۱۶۳)

یعقوب بن زید بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے درخت پر ایک پرندے کو دیکھ کر کما کاش میں اس پرندہ کی جگہ ہوتا۔

(کتاب الزہد لیلو کعب رقم الحدیث: ۱۶۵)

حضرت عمرو بن ميمون اللادى بنى الله بيان کرتے ہیں کہ حضرت عمر بنى الله کی زندگی کے آخری ایام میں ایک انصاری نوجوان ان کی خدمت میں آئے اور کہا اے امیر المؤمنین! آپ اللہ کی بشارتوں سے خوش ہو جائیں، آپ قدیم الاسلام صحابی ہیں جس کا آپ کو علم ہے، اور پھر آپ خلیفہ بنے تو آپ نے عدل کیا، پھر ان تمام فضائل کے بعد آپ کو شہادت نصیب ہوئی، حضرت عمر نے کہا اے میرے بھتیجے! کاش یہ سب برابر سرابر ہو جائے، مجھ کو عذاب ہو نہ ثواب ملے۔ (الحدیث) (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۹۲)

حضرت عثمان بنى الله کے آزاد کردہ غلام ہانثی بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمان بنى الله جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ داڑھی آنسوؤں سے بھیگ جاتی، ان سے پوچھا گیا کہ آپ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو نہیں روتے اور قبر کو دیکھ کر رونے لگتے ہیں، حضرت عثمان بنى الله نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قبر آخرت کی منازل میں سے پہلی منزل ہے، اگر انسان کو اس سے نجات مل جائے تو بعد کی منزلیں زیادہ آسان ہوتی ہیں اور اگر اس سے نجات نہ ملے تو بعد کی منزلیں اور مشکل ہوں گی اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں نے جو بھی ہولناک منظر دیکھا قبر کا منظر اس سے زیادہ ہولناک تھا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۱۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۸۲۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۲۵۸، حلیۃ الاولیاء ج ۹ ص ۲۵۲، صحیح ابن حبان ج ۹، رقم الحدیث: ۲۹۹۲، مسند احمد ج ۹، رقم الحدیث: ۷۴۰)

حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ان صحابہ میں سے ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے زندگی میں جنت کی بشارت دے دی تھی، اس کے باوجود یہ صحابہ اللہ کی بے نیازی اور جلال ذات سے اس قدر خوف زدہ رہتے تھے کہ حضرت ابو بکر صدیق نے کہا کاش میں ایک پھل ہوتا جس کو پرندے کھا لیتے یا میں ایک پرندہ ہوتا۔ حضرت عمر بنى الله نے کہا کاش میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا اور حضرت عثمان بنى الله قبر کو دیکھ کر بے اختیار روتے تھے اور دیگر کبار صحابہ بھی اللہ تعالیٰ کے جلال ذات اور حساب و کتاب کی شدت سے گھبرا کر اور خوف کی زیادتی سے یہ کہتے تھے کہ کاش میں ایک درخت ہوتا جس کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا، یا میں خشک گھاس ہوتا جس کو جانور کھا لیتے، یا کوئی حلال جانور ہوتا جس کو مسلمان ذبح کر کے کھا لیتے اور مجھے حساب و کتاب کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب سے بچ جاتا۔

ایمان میں کمی اور زیادتی کی تحقیق

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو وہ ان کے ایمان کو زیادہ کر دیں۔ اس آیت سے ائمہ ثلاثہ اور محدثین یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایمان میں کمی اور زیادتی ہو سکتی ہے۔ محققین اور امام ابو حنیفہ کا نظریہ یہ ہے کہ ایمان بسیط ہے اور اس میں کمی زیادتی نہیں ہوتی، اس کی تحقیق یہ ہے کہ امام اعظم اور محققین کے نزدیک نفس ایمان میں اعمال داخل نہیں ہیں، اس لیے اس میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی اور نفس ایمان میں اعمال کے داخل ہونے کے ائمہ ثلاثہ اور محدثین بھی قائل نہیں ہیں اور ائمہ ثلاثہ اور محدثین ایمان کامل میں اعمال کے داخل ہونے کے قائل ہیں، اور ایمان کامل میں اعمال کے دخول کے امام اعظم اور محققین بھی قائل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ نفس ایمان میں ان سب کے نزدیک اعمال داخل نہیں ہیں اور اس میں کمی زیادتی نہیں ہوتی اور ایمان کامل میں ان سب کے نزدیک اعمال داخل ہیں اور اس میں کمی اور زیادتی ہوتی ہے، اور اس آیت میں جو فرمایا ہے اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں تلاوت کی جائیں تو وہ ان کے ایمان کو زیادہ کر دیں۔ اس سے ایمان کامل ہی مراد ہے۔

اصل میں یہ اختلاف ایک اور اختلاف پر مبنی ہے، امام شافعی وغیرہ کے نزدیک جب ایمان کا لفظ مطلقاً بولا جائے تو اس سے ایمان کامل مراد ہوتا ہے، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں اور ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے۔ اور امام اعظم کے

نزدیک جب ایمان کا لفظ مطلقاً بولا جائے تو اس سے نفس ایمان مراد ہوتا ہے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں اور اس میں کمی اور زیادتی نہیں ہوتی، اور دونوں جانب دلائل ہیں۔

اس کی پوری تفصیل اور تحقیق ہم نے البقرہ: ۳ میں کر دی ہے، اس لیے جو قارئین ایمان کے تمام مذاہب، دلائل اور ان میں محاکمہ جاننا چاہیں وہ اس کا مطالعہ کر لیں۔

اس کے بعد فرمایا ہے: اور وہ اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں، توکل کی تفصیل اور تحقیق ہم نے آل عمران: ۱۵۹ میں بیان کر دی ہے، اس کے لیے تبیان القرآن، ج ۲، ص ۱۳۹ کا مطالعہ فرمائیں، اس آیت میں حصر فرمایا ہے یعنی یہ صرف اللہ سے ڈرنے والوں کی صفت ہے کہ وہ صرف اللہ کے فضل اور اس کی نصرت اور اعانت پر اعتماد کرتے ہیں اور اللہ کے ماسوا سے بالکل مستغنی رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (الانفال: ۳)

مال حرام سے نجات کے طریقے

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی تین باطنی صفات بیان فرمائیں تھیں۔

۱- وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔

۲- اللہ کی آیات سن کر ان کا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

۳- اور وہ اپنے رب پر ہی توکل کرتے ہیں۔

اور ان کے باطن کی پاکیزگی پر ظاہری پاکیزگی مترتب ہوتی ہے اور قلب کی جلاء اور صفاء کا قالب پر اثر ہوتا ہے، اس لیے اس کے بعد ان کے ظاہر کی دو صفات بیان فرمائیں کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں، بدنی عبادات میں سب سے افضل نماز ہے، اس لیے اس کا ذکر فرمایا، اور اللہ کے دیے ہوئے میں سے خرچ کرنا مالی عبادت ہے اس میں زکوٰۃ، صدقات، نماز، اور جہاد کے لیے خرچ کرنا، مساجد پر خرچ کرنا، کنوئیں کھدوانا، لائبریریاں قائم کرنا، دینی مدارس کی امداد کرنا اور سماجی اور رفاہی امور پر خرچ کرنا داخل ہے۔ اور ان تمام نیک کاموں میں حلال مال سے خرچ کرنا چاہیے حرام مال سے نیکی کرنا اور سماجی اور رفاہی امور پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ جس مال حرام کی حرمت قطعی ہو، اس کو صدقہ کرنا کفر ہے اور اگر فقیر کو معلوم ہو کہ یہ مال حرام ہے اور پھر بھی وہ دینے والے کو دعادے تو وہ بھی کافر ہو جائے گا۔ حرام مال سے چھٹکارے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مال جس کا ہے اس کو واپس کر دے۔ اگر وہ شخص مرچکا ہو تو اس کے ورثاء کو واپس کر دے۔ اور اگر ان کا پتانہ چل سکے تو اس مال کے مالک کی طرف سے اس کو صدقہ کر کے اس کا ثواب اس کو پہنچادے، اور اگر اس نے حرام ذرائع سے روپیہ کمایا ہو تو اس مال کو اپنے پاس نہ رکھے اور اپنے ذمہ سے بری ہونے کی نیت سے کسی فقیر یا حاجت مند کو دے دے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: یہی لوگ برحق مومن ہیں، ان کے رب کے پاس ان کے لیے (بلند) درجات ہیں اور بخشش اور

معزز روزی ہے۔ (الانفال: ۴)

میں یقیناً مومن ہوں یا میں انشاء اللہ مومن ہوں کہنے میں فقہاء اور متکلمین کا اختلاف

آیات سابقہ میں تین باطنی اور دو ظاہری صفات ذکر کی گئی ہیں یعنی اللہ کا ذکر سن کر دل کا خوفزدہ ہونا، آیات سن کر ایمان زیادہ ہونا اور صرف اللہ کے فضل اور اس کی نصرت پر اعتماد اور توکل کرنا، اور نماز قائم کرنا اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، اور جو مسلمان ان پانچوں صفات کے ساتھ متصف ہوں ان کے متعلق فرمایا اولئک ہم المومنون حقاً۔ ”وہی برحق مومن

ہیں اور ظاہر ہے کوئی مسلمان جزم اور یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں ان صفات کے ساتھ متصف ہوں اور برحق مومن ہوں۔ کیونکہ جو مسلمان ان صفات کے ساتھ متصف ہوں، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ برحق مومن ہیں اور ان کے لیے ان کے رب کے پاس (جنت میں) بلند درجات ہیں اور بخشش اور عزت والی روزی ہے، سو یہ کہنا کہ میں برحق مومن ہوں، اس کہنے کو مستلزم ہے کہ میں جنتی ہوں اور کوئی شخص یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں جنتی ہوں تو وہ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میں برحق مومن ہوں، ورنہ اس کا اس آیت کے نصف اول پر ایمان ہوگا اور باقی نصف پر ایمان نہیں ہوگا۔ اس بناء پر ائمہ ثلاثہ کا یہ مذہب ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ ”انا مؤمن حقا“ (میں برحق مومن ہوں) بلکہ اس کو یہ کہنا چاہیے ”ان شاء اللہ“ (انشاء اللہ میں مومن ہوں)۔

ائمہ ثلاثہ نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے:

حضرت انس بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا رسول اللہ ﷺ کے پاس گزر ہوا، آپ نے ان سے پوچھا: اے حارث! تم نے کس حال میں صبح کی۔ انہوں نے کہا میں نے اس حال میں صبح کی در آنحالیکہ میں برحق مومن تھا، آپ نے فرمایا غور کرو تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے، سو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے کہا میں دنیا سے بے رغبت ہوں، میں رات بھر بیدار رہا اور دن بھر بے سار رہا (یعنی روزہ سے رہا) اور گویا کہ میں اہل جنت کو دیکھ رہا تھا وہ ایک دوسرے کی زیارت کر رہے تھے اور گویا کہ میں اہل دوزخ کو دیکھ رہا تھا وہ بھوک سے بلبلارہے تھے۔ آپ نے فرمایا اے حارث! تم نے معرفت حاصل کر لی ہے۔ تم ان (مذکورہ) تین اوصاف کو لازم رکھنا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۱۱، ص ۴۳، المعجم الکبیر ج ۳، رقم الحدیث: ۳۳۶۷، مسند البرہان رقم الحدیث: ۲۲، کتاب الزہد للیستی رقم الحدیث: ۹۷۱، مجمع الزوائد ج ۱، ص ۵۷، کنز العمال رقم الحدیث: ۳۶۹۸۸، الدر المشورج ج ۴، ص ۱۳)

امام رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ اور امام قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ نے درج ذیل اثر سے بھی ائمہ ثلاثہ کے موقف پر استدلال کیا ہے۔

حسن بصری سے کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ مومن ہیں؟ انہوں نے کہا ایمان کی دو قسمیں ہیں: اگر تم مجھ سے اللہ، فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور یوم آخرت کے ایمان کے متعلق سوال کرتے ہو تو میں مومن ہوں، اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ مومن صرف وہ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو وہ خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ (الانفال: ۲) تو اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں مومن ہوں یا نہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۴۵۳-۴۵۴، الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۳۲۹، بیروت)

بحث مذکور میں فریقین کے درمیان محالہ

اس بحث میں تحقیق یہ ہے کہ ایمان کی دو قسمیں ہیں:

۱- نفس ایمان یعنی دل سے ان تمام چیزوں کی تصدیق کرنا جس کو نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے پاس سے لے کر آئے۔

۲- ایمان کامل یعنی دل سے تصدیق کرنا، زبان سے اقرار کرنا اور تمام احکام شرعیہ پر عمل کرنا۔

نفس ایمان کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہے کہ میں برحق مومن ہوں، اور ایمان کامل کے اعتبار سے صحیح نہیں ہے کیونکہ ایمان کامل میں اعمال بھی داخل ہیں اور انسان کو تصدیق بالقلب پر ہرچند کہ یقین ہوتا ہے لیکن مستقبل میں احکام شرعیہ پر عمل کرنے کے متعلق وہ کچھ نہیں کہہ سکتا آیا مستقبل میں وہ نیک عمل کرے گا یا نہیں۔ اس لیے ایمان کامل کے اعتبار سے اس کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ میں برحق مومن ہوں بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ انشاء اللہ میں مومن ہوں۔ امام ابو حنیفہ جب مطلقاً لفظ ایمان بولا

جائے تو اس سے نفس ایمان مراد لیتے ہیں اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ میں برحق مومن ہوں یا میں یقیناً مومن ہوں۔ ائمہ ثلاثہ جب لفظ ایمان مطلقاً بولا جائے تو اس سے مومن کامل مراد لیتے ہیں اس لیے وہ کہتے ہیں کہ میں یقیناً مومن ہوں کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں۔

”میں یقیناً مومن ہوں“ کہنے کے دلائل

علامہ مسعود بن عمر سعد الدین تفتازانی متوفی ۷۹۳ھ لکھتے ہیں:

بہ شمول امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ کثیر سلف صالحین کا یہ موقف ہے کہ یہ کہنا صحیح ہے کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں اور امام ابو حنیفہ ان کے اصحاب اور اکثرین نے اس سے منع کیا ہے، کیونکہ انسان کو یہ معلوم ہے کہ اس کے دل میں اللہ اور فرشتوں کتابوں، رسولوں، تقدیر اور یوم آخرت کی تصدیق ہے اور اس تصدیق کے تحقق اور ثبوت میں کوئی شک اور تردد نہیں ہے اور جس شخص کو اس تصدیق کے تحقق میں شک اور تردد ہوگا وہ قطعی طور پر مومن نہیں ہوگا اور جب اس کو شک اور تردد نہیں ہے تو پھر انشاء اللہ میں مومن ہوں، کہنے کو ترک کرنا اولیٰ ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں ”حقاً“ اور یقیناً مومن ہوں اور تصدیق میں شک اور تردد کے وہم کو دور کیا جائے۔ اور جو ائمہ ”میں انشاء اللہ مومن ہوں“ کہنے کے قائلین ہیں ان کے دلائل اور ان دلائل کے جوابات حسب ذیل ہیں:

”میں انشاء اللہ مومن ہوں“ کہنے کے دلائل کا تجزیہ

۱۔ میں مومن ہوں کے ساتھ انشاء اللہ، اللہ کے ذکر کے ساتھ تبرک حاصل کرنے کے لیے ذکر کیا جاتا ہے اور ادب کے لیے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت کی طرف مفوض ہیں اور اپنے نفس سے تکبر کو دور کرنے کے لیے اور تردد مستقبل کے اعتبار سے ہے۔ اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اس دلیل سے صرف اس قول کی صحت معلوم ہوتی ہے نہ کہ ”میں انشاء اللہ مومن ہوں“ کی ترجیح ”میں یقیناً مومن ہوں“ کہنے پر۔ اور تردد کا وہم بہر حال باقی رہتا ہے اور تبرک اور ادب کی ایمان کے ساتھ کیا تخصیص ہے، یہ تو باقی نیک اعمال اور عبادات میں بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ تصدیق ایمانی، جس پر نجات کی مدار ہے وہ ایک مخفی امر قلبی ہے اور شیطان اور خواہش اس کے معارض ہوتے رہتے ہیں۔ ہر چند کہ انسان کو اس کے حصول کا یقین ہوتا ہے لیکن وہ اس خطرہ سے مامون نہیں ہے کہ اس کو کوئی ایسی چیز لاحق ہو جائے جو نجات کے منافی ہو، خاص طور پر جب وہ احکام شرعیہ اور ممنوعات شرعیہ کی تفصیلات کو دیکھتا ہے تو اس کو بعض احکام اور ممنوعات اپنی خواہشات کے خلاف دکھائی دیتے ہیں اور بہت سی چیزیں جو اس کے نزدیک لذیذ اور پسندیدہ ہیں اور شرعاً ممنوع ہیں اور کتنی مرتبہ وہ احکام شرعیہ کے مقابلہ میں اپنے نفس کے تقاضوں پر عمل کر لیتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ اپنے ایمان کو اللہ کی مشیت کے سپرد کر دے اور کہے کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تقریر ایمان کامل میں جاری ہوتی ہے نہ کہ نفس ایمان میں۔

۳۔ امام الحرمین نے یہ کہا ہے کہ ایمان فی الحال قطعاً ثابت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن جس ایمان پر کامیابی اور نجات کا مدار ہے یہ وہ ایمان ہے جو پوری زندگی میں موت تک قائم رہے اور کوئی شخص جزم اور یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ تاحیات مومن رہے گا اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا، اس وجہ سے سلف صالحین نے یہ کہا ”کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں“ کہنا چاہیے، اس لیے اب اشاعرہ پر یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ جب انسان ایمان کے ساتھ متصف ہے تو وہ یقیناً مومن ہے اور انشاء اللہ میں مومن ہوں کہنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ میں انشاء اللہ زندہ ہوں کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اعتبار خاتمہ کا ہوتا ہے، کئی لوگ زندگی

میں نیک اور صالح ہوتے ہیں اور ان کا خاتمہ بد کاری پر ہوتا ہے اور کئی لوگ پوری زندگی مومن ہوتے ہیں اور ان کا خاتمہ کفر پر ہوتا ہے اور انسان کچھ نہیں جانتا کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہو گا یا کفر پر اور وہ اللہ کے علم میں مومن ہے یا نہیں، وہ ہر چند کہ اس وقت قطعاً اور یقیناً مومن ہے اور اس میں کوئی شک اور تردد نہیں لیکن وہ کفر پر خاتمہ سے ڈرتا ہے اور ایمان اور اعمال صالحہ پر خاتمہ کی امید رکھتا ہے۔ اس لیے انجام بخیر کی امید سے وہ کہتا ہے کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں، یعنی جس طرح اب میں قطعاً اور یقیناً مومن ہوں تو اگر اللہ نے چاہا تو میں تادم مرگ مومن ہی رہوں گا اور ایمان پر آئندہ بھی برقرار رہوں گا اور یہ قول برحق ہے اور اس آیت کے موافق ہے:

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَلِكُمْ غَدًا ۚ إِلَّا
 أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ وَادْكُرْ رَبَّكَ إِذَا نَسِيتَ
 اور آپ کسی چیز کے متعلق ہرگز یہ نہ کہیں کہ میں اس کام
 کو کل کرنے والا ہوں، مگر یہ کہ اللہ چاہے اور جب آپ بھول
 جائیں تو آپ اللہ کو یاد کریں۔ (الکہف: ۲۳-۲۴)

یہ تقریر بالکل درست ہے لیکن اس تقدیر پر مطلقاً یہ کہنا درست نہیں ہے کہ میں یقیناً مومن ہوں، نہیں کہنا چاہیے بلکہ میں انشاء اللہ مومن ہوں کہنا چاہیے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ حال کے اعتبار سے میں یقیناً مومن ہوں کہنا چاہیے اور مال اور خاتمہ کے اعتبار سے میں انشاء اللہ مومن ہوں کہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ صحت اور عافیت کے ساتھ ایمان پر ہماری زندگی برقرار رکھے اور عزت اور کرامت کے ساتھ ایمان پر ہمارا خاتمہ کرے اور ہمیں دنیا اور آخرت کی ہر آفت اور بلا اور ہر فکر اور پریشانی سے محفوظ رکھے اور ہمیں دارین کی فوز و فلاح عطا فرمائے اور آخرت میں سیدنا محمد ﷺ اور آپ کی آل اور اصحاب کی رفاقت عطا فرمائے۔ (آمین)

(شرح المقاصد ج ۵، ص ۲۱۷-۲۱۵، 'ملخصاً' و 'موضحاً'، مطبوعہ منشورات الرضی ایران، ۱۳۰۹ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (مال غنیمت کی تقسیم میں ان کا اختلاف کرنا اسی طرح ہے) جس طرح اس وقت ان کا اختلاف تھا جب آپ کا رب حق کے ساتھ آپ کو آپ کے گھر سے باہر لایا تھا، اور بے شک مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو ناپسند کرنے والا تھا وہ لوگ حق ظاہر ہونے کے باوجود آپ سے اس میں بحث کر رہے تھے، گویا کہ وہ آنکھوں دیکھے موت کی طرف دھکیلے جا رہے تھے۔ (الانفال: ۵-۶)

بعض صحابہ کے نزدیک لشکر کفار سے مقابلہ کا ناگوار ہونا، اس کا پس منظر اور پیش منظر

امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ قریش کا قافلہ شام سے مکہ آرہا تھا، اور اس میں بہت زیادہ غلہ اور ساز و سامان تھا، اس قافلہ کے ساتھ چالیس سوار تھے۔ ان میں ابو سفیان، عمرو بن العاص، اور دوسرے کفار قریش تھے، حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کو اس قافلہ کی خبر دی، آپ نے مسلمانوں کو بتایا وہ اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے سوچا کہ وہ قافلہ پر حملہ کر کے اس کا مال و متاع چھین لیں گے، کیونکہ اس قافلہ میں مال بہت زیادہ تھا اور اس کے محافظ کم تھے، جب وہ قافلہ پر حملہ کے ارادہ سے نکلے تو اہل مکہ کو اس کی خبر ہو گئی، ابو جہل نے کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر ندا کی، اے اہل مکہ ہر مشکل اور رسوائی سے اپنے آپ کو بچاؤ اگر (سیدنا) محمد (ﷺ) نے قافلہ لوٹ لیا، تو تم ہرگز فلاح نہ پاسکو گے، ان ہی دنوں عباس بن عبد المطلب کی بہن نے ایک خواب دیکھا اور اپنے بھائی سے کہا میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے، میں نے دیکھا ہے کہ ایک شتر سوار آیا اور اس نے پکار کر کہا اے عمد شکن قوم تین دن کے اندر اپنی قتل گاہوں کی طرف دوڑو، اور اس نے پہاڑ سے ایک چٹان الگ کر لی اور مکہ کے ہر گھر میں اس چٹان سے ایک پتھر ٹوٹ کر پہنچ گیا، عباس نے یہ خواب ابو جہل کو سنایا تو ابو جہل نے کہا کہ تم

مردوں کی نبوت پر راضی نہ ہوئے تھے کہ تمہاری عورتوں نے دعویٰ نبوت کرنا شروع کر دیا، پھر ابو جہل تمام اہل مکہ کو لے کر نکلا اور یہ بہت بڑا لشکر تھا، ابو جہل کو بتایا گیا کہ ابوسفیان کے قافلہ نے ساحل کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور وہ محفوظ ہو چکا ہے، تم اب لوگوں کو واپس مکہ لے جاؤ۔ اس نے کہا نہیں! خدا کی قسم یہ کبھی نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ ہم اونٹوں کو ذبح کریں گے، شراب پیں گے اور ہماری باندیاں آلات موسیقی کے ساتھ گانا سنائیں گی اور تمام قبائل عرب ہمارے خروج کی خبر سن لیں گے، اور (سیدنا) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر چند کہ قافلہ کو نہیں لوٹا لیکن وہ اپنی قوم کو لے کر میدان بدر میں آچکے ہیں، اور میدان بدر میں تمام قبائل عرب سال میں ایک بار بازار لگاتے تھے، ادھر حضرت جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا اے محمد! (ﷺ) اللہ تعالیٰ نے آپ سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے، تجارتی قافلہ یا لشکر قریش! نبی ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا اور فرمایا قریش مکہ، ہر مشکل اور ہر مصیبت کا چیلنج قبول کر کے مکہ سے نکل کر یہاں آن پہنچے ہیں، تمہارے نزدیک تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا پسندیدہ ہے یا لشکر کفار پر حملہ کرنا، اصحاب نے کہا بلکہ دشمن کا مقابلہ کرنے کی بہ نسبت تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا ہمارے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا، آپ نے فرمایا تجارتی قافلہ تو ساحل سمندر کے راستے مکہ کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور اب وہ تمہاری دست برد سے محفوظ ہے، اور ادھر ابو جہل اپنے لشکر کے ساتھ تمہارے سر پر پہنچ چکا ہے۔ اصحاب نے پھر کہا یا رسول اللہ ﷺ! قافلہ کا پیچھا کیجئے اور دشمن کو چھوڑیے، جب نبی ﷺ غضب ناک ہوئے تو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اچھی باتیں کہیں، پھر حضرت سعد بن عبادہ کھڑے ہوئے، اور کہا آپ وہی کام کیجئے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور آپ جو بھی ارادہ کریں گے، ہم آپ کے ساتھ ہیں، اللہ کی قسم اگر آپ عدن کی طرف بھی روانہ ہوئے تو انصار میں سے کوئی شخص آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا، پھر حضرت مقداد بن عمرو نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو اللہ نے حکم دیا ہے، اور آپ جو بھی ارادہ کریں گے، ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہم اس طرح نہیں کہیں گے، جس طرح بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا آپ اور آپ کا رب جا کر جنگ کریں، ہم بیٹھنے والے ہیں۔ (المائدہ: ۲۴) بلکہ ہم آپ سے یہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا رب جنگ کریں، ہم آپ کے ساتھ اس وقت تک جنگ کرتے رہیں گے جب تک ہماری آنکھوں کی پلکیں جھپکتی رہیں گی، پھر رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور آپ نے فرمایا اللہ کی برکت سے روانہ ہو، بے شک میں قوم کفار کے گرنے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں۔ (الحدیث)

(دلائل النبوة، ج ۳، ص ۳۴-۲۸، ملخصاً، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۰ھ)

اس قصہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ لشکر قریش سے مقابلہ کرنا صرف بعض اصحاب کو ناگوار تھا تمام صحابہ کو ناگوار نہیں تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے بے شک مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو ناپسند کرنے والا تھا، اور یہ فرمایا ہے کہ ”وہ حق ظاہر ہونے کے باوجود آپ سے اس میں بحث کر رہے تھے“ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ لشکر کفار سے مقابلہ کرنے کی بجائے قافلہ کے مال و متاع کی وجہ سے اس پر حملہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے، حالانکہ رسول اللہ ﷺ ان کو یہ بتا چکے تھے کہ اس مقابلہ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگی اور ان کی بحث یہ تھی کہ ہم تو قافلہ پر حملہ کرنے کی نیت سے اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ اور آپ نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا تاکہ ہم اس لشکر سے مقابلہ کرنے کی اچھی طرح تیاری کر لیتے، پھر ان پر لشکر کفار کا جو رعب اور ہیبت طاری تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حال سے تشبیہ دی ہے جو آنکھوں دیکھے موت کی طرف دھکیلے جا رہے ہوں، ان کے خوف کی وجہ یہ تھی کہ لشکر کفار کے مقابلہ میں ان کی تعداد ایک تہائی تھی، اور ان کے پاس صرف دو گھوڑے تھے اور باقی پیادہ تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی بہت کم تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (یاد کرو) جب اللہ نے دو گروہوں میں سے ایک (پر غلبہ) کا تم سے وعدہ فرمایا تھا کہ یہ تمہارے لیے ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ (قافلہ تجارت) تمہارے ہاتھ لگے، اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو ثابت کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے O تاکہ وہ حق کو ثابت کر دے اور ناحق کو باطل کر دے خواہ مجرموں کو ناگوار ہو۔

(الانفال: ۸-۷)

ابو سفیان کے قافلہ تجارت پر حملہ کو بعض صحابہ کے ترجیح دینے کا بیان امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عروہ بیان کرتے ہیں کہ ابو سفیان قریش کے چند سواروں کے ساتھ شام سے آرہا تھا، وہ ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے، جب نبی ﷺ کو اس قافلہ کا علم ہوا تو آپ نے اپنے اصحاب کو بلایا اور ان کو بتایا کہ اس قافلہ میں بہت مال اور سامان ہے اور اس کے محافظوں کی تعداد بہت کم ہے تو صحابہ مدینہ سے باہر نکلے، ان کا ارادہ صرف ابو سفیان اور اس کے سواروں پر حملہ کرنے کا تھا اور وہ صرف مال غنیمت کے حصول کے لیے نکلے تھے اور ان کو یہ خیال نہیں تھا کہ کوئی بہت بڑی جنگ ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور تم یہ چاہتے تھے کہ غیر مسلح گروہ (تجارتی قافلہ) تمہارے ہاتھ لگے۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۲۲۰۹)

علی بن ابی طلحہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے واذ بعد کم اللہ احدی الطائفین کی تفسیر میں فرمایا ابو سفیان تجارتی قافلہ لے کر شام سے مکہ مکرمہ کی طرف جا رہا تھا، اہل مدینہ کہ یہ خبر پہنچی تو وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قافلہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے، اہل مکہ کو یہ خبر پہنچ گئی تو وہ بہت عجلت میں قافلہ کی طرف روانہ ہوئے تاکہ نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب اس قافلہ پر غالب نہ آجائیں۔ ادھر وہ قافلہ نبی ﷺ کی زد سے باہر نکل گیا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے دو گروہوں میں سے ایک کا وعدہ کیا تھا، صحابہ کے نزدیک قافلہ پر حملہ کرنا زیادہ آسان اور زیادہ پسندیدہ تھا اور اس میں مال غنیمت کے حصول کی زیادہ توقع تھی۔ جب وہ قافلہ مسلمانوں کے حملہ کی زد سے باہر نکل گیا تو رسول اللہ ﷺ نے لشکر کفار سے مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا جو ابو سفیان کے قافلہ کی حفاظت کے قصد سے مدینہ کی سرحد پر پہنچ چکا تھا، مسلمانوں کو ان کی عددی کثرت اور اسلحہ کی فراوانی کی وجہ سے ان سے مقابلہ کرنا ناگوار لگا۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (جامع البیان رقم الحدیث: ۱۲۲۱۳)

اس سے پہلے ہم نے دلائل النبوة کے حوالے سے جو ذکر کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ قافلہ پر حملہ کرنے کے ارادہ سے ناراض ہوئے۔ یہ بعد کی بات ہے جب واذ بعد کم اللہ احدی الطائفین نازل ہو چکی تھی اور یہاں جو ہم نے جامع البیان کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ صحابہ کے ساتھ قافلہ پر حملہ کرنے کے ارادہ سے نکلے، یہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔

ابن زید اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ قریش کے قافلہ پر حملہ کرنے کے قصد سے بدر کی طرف روانہ ہوئے، ادھر شیطان سراقہ بن جعشم کی شکل میں اہل مکہ کے پاس گیا اور انہیں گمراہ کرنے کے لیے کہا (سیدنا) محمد ﷺ اور ان کے اصحاب تمہارے قافلہ پر حملہ کرنے والے ہیں اور تمہاری شوکت اور قوت کے مقابلہ میں وہ لوگ ٹھہر نہیں سکتے، پھر وہ مسلح ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ نبی ﷺ نے مقام روماء پر جاسوس بھیجے ہوئے تھے انہوں نے آکر آپ کو لشکر کفار کی خبر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تم سے تجارتی قافلہ یا لشکر کفار میں سے کسی ایک کا وعدہ فرمایا ہے، مسلمانوں کے نزدیک قافلہ پر حملہ کرنا زیادہ پسندیدہ تھا کیونکہ اس میں کسی بڑی جنگ کا خطرہ نہیں تھا، اس موقع پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۲۲۱۶)

اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آیت: ۷ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو ثابت کر دے۔ پھر آیت: ۸ میں فرمایا تاکہ حق کو ثابت کر دے اور ناحق کو باطل کر دے اور بظاہر یہ تکرار ہے کیونکہ دونوں آیتوں میں حق کو ثابت کرنے کا ذکر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں حق کو ثابت کرنے سے مراد یہ ہے کہ کفار کے مقابلہ میں مسلمانوں کو فتح اور نصرت عطا فرمائے اور دوسری آیت میں حق کو ثابت کرنے سے مراد ہے دین اسلام اور قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کرنا اور کفار کے باطل عقائد کا بطلان واضح کرنا اور معرکہ بدر میں مسلمانوں کی فتح دین اسلام کے غلبہ اور سرفرازی کا سبب بنی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول فرمائی کہ میں ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمانے والا ہوں ○ اور اللہ نے اس کو صرف تمہارے لیے خوش خبری بنایا تاکہ اس کی وجہ سے تمہارے دل مطمئن ہوں اور نصرت صرف اللہ کی جانب سے ہوتی ہے، بے شک اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے ○ (الانفال: ۱۰-۹)

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ وہ حق کو ثابت کرے گا اور ناحق کو باطل فرمائے گا اور اس آیت میں یہ فرمایا کہ جو لوگ دین حق پر قائم ہیں جب وہ اللہ تعالیٰ سے کسی مصیبت اور امتحان کے موقع پر فریاد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرماتا ہے۔

غزوہ بدر کے دن نبی ﷺ کا گڑ گڑا کر دعا کرنا

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ بدر کے دن نبی ﷺ نے مشرکین کی تعداد کی طرف دیکھا اور اپنے اصحاب کی طرف دیکھا تو وہ تین سو اور کچھ تھے، پھر آپ نے قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا کی اے اللہ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا فرما۔ اے اللہ! اگر مسلمانوں کی یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو زمین پر تیری عبادت نہیں کی جائے گی، رسول اللہ ﷺ اسی طرح دعا فرما رہے تھے حتیٰ کہ آپ کی چادر کندھے سے ڈھلک گئی۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ کی چادر پکڑ کر آپ کے کندھے پر رکھی اور آپ سے لپٹ گئے۔ اور کہا اے اللہ کے نبی! آپ پر میرے ماں اور باپ فدا ہوں آپ نے اللہ عزوجل سے بہت فریاد کر لی ہے عنقریب آپ کا رب آپ سے کیا ہوا وعدہ پورا فرمائے گا، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اور یاد کرو جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول فرمائی کہ میں ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمانے والا ہوں۔

(صحیح مسلم الجہاد ۵۸، (۱۷۶۳) ۳۵۰۷، سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۰۹۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۹۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۷۹۳، مسند احمد ج ۱، ص ۲۰۸، مسند ابوزرار رقم الحدیث: ۱۹۶، سنن کبریٰ للسیقی، ج ۶، ص ۳۲۱، دلائل النبوة للسیقی، ج ۳، ص ۵۱-۵۳، مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۱۰، ص ۳۵۰، ج ۱۳، ص ۳۶۶-۳۶۵، جامع البیان رقم الحدیث: ۱۲۲۲۳، ج ۹، ص ۱۲۵)

احادیث میں یہی مذکور ہے کہ اس وقت نبی ﷺ دعا فرما رہے تھے، لیکن قرآن مجید میں جمع کا صیغہ ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ کرام دعا کر رہے تھے اور بظاہر یہی اقرب ہے کیونکہ صحابہ کرام کو دشمن کی کثرت اور اسلحہ کی فراوانی سے بہت خوف تھا۔ تاہم ان میں یوں تطبیق دی جاسکتی ہے کہ نبی ﷺ دعا فرما رہے تھے اور صحابہ اس پر آمین کہہ رہے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس نے تمہاری دعا قبول فرمائی کہ میں ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمانے والا ہوں۔ اور اللہ نے اس کو صرف تمہارے لیے خوش خبری بنایا تھا تاکہ تمہارے دل مطمئن ہوں

اور نصرت صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے۔ جنگ بدر میں فرشتوں نے قتال بھی کیا تھا یا نہیں۔ اس میں متقدمین اور متاخرین کا اختلاف ہے، ہم اس سلسلہ میں فرشتوں کے قتال کے متعلق پہلے احادیث اور آثار بیان کریں گے پھر اس مسئلہ میں علماء اسلام کے نظریات بیان کریں گے اور آخر میں اپنا موقف پیش کریں گے۔ فنقول وبالله التوفیق وبہ الاستعانة بلیق۔

جنگ بدر میں قتال ملائکہ کے متعلق احادیث اور آثار

قرآن مجید کی مذکورہ صدر آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں کا نزول مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے کے لیے ہوا تھا اور ان کو فتح اور نصرت کی بشارت دینے کے لیے، قرآن مجید میں یہ مذکور نہیں ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں نے قتال بھی کیا تھا، البتہ بعض احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتوں نے جنگ بدر میں قتال بھی کیا تھا، ہم پہلے وہ احادیث پیش کریں گے، پھر اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ فنقول وبالله التوفیق وبہ الاستعانة بلیق۔

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے جنگ بدر کے دن فرمایا یہ جبرئیل ہیں جنہوں نے گھوڑے کے سر کو پکڑا ہوا ہے اور ان پر جنگی ہتھیار ہیں۔

(صحیح بخاری ج ۳، ص ۵۷۰، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی، ۱۳۸۱ھ)

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ بدر کے دن ایک مسلمان ایک مشرک کے پیچھے دوڑ رہا تھا، جو اس سے آگے تھا، اتنے میں اس نے اپنے اوپر سے ایک گھوڑے کی آواز سنی اور ایک گھوڑے سوار کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا ”اے جیزوم آگے بڑھ“ (جیزوم اس فرشتے کے گھوڑے کا نام تھا) پھر اچانک اس نے دیکھا کہ وہ مشرک اس کے سامنے چپت گر پڑا۔ اس مسلمان نے اس مشرک کی طرف دیکھا تو اس کی ناک پر چوٹ تھی اور اس کا چہرہ پھٹ گیا تھا، جیسے کوڑا لگا ہو، اس کا پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا، اس انصاری نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا یہ تیسرے آسمان سے مدد آئی تھی۔ (صحیح مسلم ج ۲، ص ۹۳ مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت، کراچی، ۱۳۷۵ھ)

امام محمد بن عمر بن واقد اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

معاذ بن رفاع بن رافع اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ فرشتوں کی علامت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے عماموں کو اپنے کندھوں کے درمیان لٹکایا ہوا تھا، ان کے عماموں کا رنگ سبز، زرد اور سرخ تھا، اور ان کے گھوڑوں کی پیشانیوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

ابو رہم غفاری اپنے ابن عم سے روایت کرتے ہیں کہ میں اور میرا عم زاد بدر کے کنوئیں پر کھڑے ہوئے تھے، جب ہم نے دیکھا کہ (سیدنا) محمد ﷺ کے ساتھ لوگوں کی تعداد کم ہے اور قریش کی تعداد زیادہ ہے تو ہم نے کہا جب دونوں لشکروں کا مقابلہ ہو گا تو ہم (سیدنا) محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کے لشکر پر حملہ کریں گے، پھر ہم (سیدنا) محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کی بائیں جانب چلے گئے، اور ہم کہہ رہے تھے کہ یہ تو قریش کے لشکر کا چوتھائی ہیں، جس وقت ہم مسلمانوں کے لشکر کی بائیں جانب جا رہے تھے تو ایک بادل نے آکر ہم کو ڈھانپ لیا، ہم نے اس بادل کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو ہمیں مردوں اور ہتھیاروں کی آوازیں سنائی دیں، اور ہم نے سنا ایک شخص اپنے گھوڑے سے کہہ رہا تھا ”جیزوم آگے بڑھو“ اور ہم نے سنا کہ وہ کہہ رہے تھے

ٹھہرو، پیچھے سے آؤ، پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے دائیں جانب اترے، پھر ان کی طرح ایک اور جماعت آئی اور وہ نبی ﷺ کے ساتھ تھی، پھر جب ہم نے نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کی طرف دیکھا تو وہ قریش سے دگنے نظر آئے، میرا عم زاد فوت ہو گیا، اور میں نے اسلام قبول کر لیا۔

سائب بن ابی حیش اسدی، حضرت عمر بن الخطاب کے زمانہ میں بیان کر رہے تھے کہ بہ خدا مجھے کسی انسان نے گرفتار نہیں کیا تھا، ان سے پوچھا پھر کس نے گرفتار کیا تھا؟ انہوں نے کہا جب قریش نے شکست کھائی تو میں نے بھی ان کے ساتھ شکست کھائی، مجھے سفید رنگ کے ایک طویل القامت شخص نے گرفتار کیا جو آسمان اور زمین کے درمیان ایک چنگبرے گھوڑے پر سوار ہو کر آ رہا تھا، اس نے مجھے رسیوں سے باندھ دیا، حضرت عبدالرحمن بن عوف آئے تو انہوں نے مجھے بندھا ہوا پایا، حضرت عبدالرحمن لشکر میں اعلان کر رہے تھے کہ اس شخص کو کس نے گرفتار کیا ہے؟ تو کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے مجھے گرفتار کیا ہے، حتیٰ کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جایا گیا، رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے پوچھا اے ابن ابی حیش! تم کو کس نے گرفتار کیا ہے؟ میں نے کہا میں نہیں جانتا اور میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو بتلانا ناپسند کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کو فرشتوں میں سے ایک کریم فرشتے نے گرفتار کیا ہے، اے ابن عوف! اپنے قیدی کو لے جاؤ! تو حضرت عبدالرحمن مجھے لے گئے۔ سائب نے کہا میں نے ایک عرصہ تک اس بات کو مخفی رکھا اور اپنے اسلام قبول کرنے کو موخر کرتا رہا بالآخر میں مسلمان ہو گیا۔

حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں (یہ اس وقت اسلام نہیں لائے تھے) میں نے اس دن دیکھا آسمان ایک سیاہ چادر سے ڈھکا ہوا ہے، اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ آسمان سے کوئی چیز آ رہی ہے۔ جس سے (سیدنا محمد ﷺ) کی تائید کی گئی ہے، اور اسی وجہ سے شکست ہوئی اور یہ فرشتے تھے۔

امام واقدی بیان کرتے ہیں کہ جب جنگ ہو رہی تھی تو رسول اللہ ﷺ ہاتھ اٹھائے ہوئے اللہ تعالیٰ سے فتح کی دعائیں کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے: "اے اللہ! اپنا وعدہ پورا فرما۔" اور کہہ رہے تھے: اے اللہ! اگر آج یہ جماعت مغلوب ہو گئی تو پھر شرک غالب ہو جائے گا اور تیرا دین قائم نہیں ہو سکے گا" اور حضرت ابو بکر آپ سے کہہ رہے تھے کہ بہ خدا! اللہ آپ کی مدد فرمائے گا اور آپ کو سرخرو کرے گا، پھر اللہ عزوجل نے دشمن کی جانب ایک ہزار لگاتار فرشتے نازل کیے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے ابو بکر! خوشخبری ہو! یہ جبرائیل ہیں جو زرد عمامہ باندھے ہوئے ہیں، ان کے دانتوں پر غبار ہے وہ آسمان اور زمین کے درمیان اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے آ رہے ہیں، جب وہ زمین پر اترے تو ایک ساعت کے لیے مجھ سے غائب ہوئے، پھر ظاہر ہوئے اور کہہ رہے تھے کہ جب آپ نے مدد طلب کی تو اللہ کی مدد آگئی۔

امام واقدی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مٹھی میں کنکریاں لیں اور یہ کہہ کر کفار کی طرف پھینکیں کہ ان کے چہرے بگڑ جائیں، اے اللہ! ان کے دلوں پر رعب طاری کر اور ان کے قدم اکھاڑ دے، پھر اللہ کے دشمن شکست کھا گئے اور مسلمان کافروں کو قتل کر رہے تھے اور کفار کو قید کر رہے تھے۔ اور مشرکوں کے چہرے اور ان کی آنکھیں خاک میں اٹی ہوئی تھیں اور ان کو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ خاک کہاں سے آئی اور مومنین اور فرشتے ان کو قتل کر رہے تھے۔

(کتاب المغازی، ج ۱، ص ۷۵-۸۱، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، الطبعة الثالثة)

امام بیہقی اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت مالک بن ربیعہ رضی اللہ عنہ جنگ بدر کے دن حاضر تھے۔ انہوں نے اپنی بیٹائی چلے جانے کے بعد کہا اگر میں تمہارے

ساتھ اس وقت بدر میں ہوتا اور میں بیٹا بھی ہوتا تو میں تمہیں وہ گھائی دکھاتا جہاں سے فرشتے نکلے تھے۔

(دلائل النبوة ج ۳، ص ۸۱، جامع البیان ج ۳، ص ۵۰، سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۷۷۳)

امام ابن جوزی لکھتے ہیں:

حضرت ابو داؤد مازنی نے کہا میں جنگ بدر کے دن مشرکین میں سے ایک شخص کا پیچھا کر رہا تھا تاکہ میں اس کو قتل کروں۔ سو میرے تلوار مارنے سے پہلے ہی اس کا سرکٹ کر گیا تو میں نے جان لیا کہ میرے علاوہ کسی اور نے اس کو قتل کیا ہے۔

(زاد المسیر ج ۱، ص ۲۵۳-۲۵۲، سیرت ابن ہشام ج ۱، ص ۶۳۳، جامع البیان ج ۳، ص ۵۰)

امام ابن جریر طبری روایت کرتے ہیں:

عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جنگ بدر کے بعد ابو سفیان مکہ کے لوگوں میں جنگ کے احوال بیان کر رہا تھا۔ اس نے کہا ہم نے زمین اور آسمان کے درمیان سفید رنگ کے سوار دیکھے جو جنگبرے گھوڑوں پر سوار تھے، وہ ہم کو قتل کر رہے تھے اور ہم کو قید کر رہے تھے، ابو رافع نے کہا وہ فرشتے تھے۔

مقسم بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا جس شخص نے عباس کو گرفتار کیا وہ حضرت ابو ایسر تھے۔ حضرت ابو ایسر دبلے پتے آدمی تھے اور عباس بہت جسیم تھے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ایسر سے پوچھا تم نے عباس پر کیسے قابو پایا؟ انہوں نے لمایا رسول اللہ ﷺ ایک شخص نے میری مدد کی تھی میں نے اس کو اس سے پہلے نہ دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک معزز فرشتے نے تمہاری مدد کی تھی۔

مقسم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یوم بدر کے سوا ملائکہ نے کسی دن بھی قتال نہیں کیا، باقی ایام میں وہ عدوی قوت اور مدد کے لیے آتے تھے، قتال نہیں کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم جب تک اللہ نے چاہا قرینہ اور نضیر کا محاصرہ کرتے رہے، اور ہم کو فتح حاصل نہیں ہوئی، پھر ہم واپس آگئے، سو جس وقت رسول اللہ ﷺ اپنے گھر میں اپنا سردھورہے تھے، اچانک آپ کے پاس جبرائیل آئے اور کہا اے محمد ﷺ آپ نے اپنا اسلحہ اتار دیا اور فرشتوں نے ابھی اپنے ہتھیار نہیں اتارے، پھر رسول اللہ ﷺ نے ایک کپڑا منگایا اور اس کو سر پر لپیٹا اور سر نہیں دھویا، پھر آپ نے ہمیں بلایا ہم سب آپ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ حتیٰ کہ ہم قرینہ اور نضیر کے پاس پہنچے، اس دن اللہ تعالیٰ نے ہماری تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد فرمائی، اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں فتح عطا فرمائی اور ہم اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس آئے۔ (جامع البیان، ج ۳، ص ۵۲-۵۰)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب نبی ﷺ غزوہ خندق سے واپس آئے تو آپ نے ہتھیار اتار دیے اور غسل فرمایا، آپ کے پاس جبرائیل آئے اور کہا آپ نے ہتھیار اتار دیے، بخدا ہم نے ابھی ہتھیار نہیں اتارے، آپ ان کی طرف نکلے۔ آپ نے پوچھا کس طرف؟ جبرائیل نے کہا ادھر اور بنو قرینہ کی طرف اشارہ کیا سو نبی ﷺ ان کی طرف روانہ ہوئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں گویا کہ میں دیکھ رہا ہوں، جبرائیل کے چلنے سے بنو عنعم کی گلیوں میں غبار بلند ہو رہا تھا، جب رسول اللہ ﷺ بنو قرینہ کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۵۹۱-۵۹۰، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی)

فرشتوں کے قتال کے متعلق جس قدر اہم روایات ہم کو دستیاب ہوئیں، ہم نے ان سب کو یہاں ذکر کر دیا ہے، فرشتوں کی آمد کا معاملہ تو کئی غزوات میں فرشتے مسلمانوں کی مدد کے لیے نازل ہوئے، لیکن فرشتوں کا نزول ان کے جنگ کرنے کو مستلزم

نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی عددی قوت کو بڑھانے کے لیے، ان کی دمجی کے لیے، ان کو مطمئن کرنے کے لیے، جنگ میں ان کو ثابت قدم رکھنے کے لیے، دشمنوں پر رعب طاری کرنے کے لیے اور ان کو فتح اور نصرت کی بشارت دینے کے لیے فرشتوں کا نزول ہوا تھا، انہوں نے کفار کے خلاف جنگ میں عملاً حصہ نہیں لیا کیونکہ انسانوں کا فرشتوں سے مقابلہ کرنا اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کی حکمت کے خلاف ہے، مقابلہ ایک جنس کے افراد میں ہوا کرتا ہے، جن روایات میں یہ ذکر ہے کہ فرشتوں نے کفار سے قتال کیا تھا ان میں بعض سنداً ضعیف ہیں اور بعض میں تاویل اور توجیہ ہے۔

جنگ بدر میں قتال ملائکہ کے متعلق مفسرین اسلام کی آراء

امام ابو جعفر محمد ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں:

جنگ بدر میں فرشتوں کے نازل کرنے کی آیات ہیں۔ ان کی تفسیر میں صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سیدنا محمد ﷺ کی طرف سے یہ خبر دی کہ آپ نے مسلمانوں سے یہ فرمایا کہ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ تمہارا رب تمہاری تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کرے، سو اللہ تعالیٰ نے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کی مدد کا وعدہ فرمایا، پھر ان سے پانچ ہزار فرشتوں کی مدد کا وعدہ فرمایا، بشرطیکہ وہ دشمن کے مقابلہ میں صبر کریں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں اور ان آیتوں میں اس پر دلیل نہیں ہے کہ ان کی تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی اور نہ اس پر دلیل ہے کہ ان کی پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی اور نہ اس پر دلیل ہے کہ ان کی مدد نہیں کی گئی تھی، اس لیے فرشتوں کا مدد کرنا اور نہ کرنا دونوں امر جائز ہیں، اور ہمارے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی یا پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی، اور بغیر کسی صحیح حدیث کے ان میں سے کسی چیز کا قول کرنا جائز نہیں ہے، البتہ قرآن مجید میں یہ دلیل ضرور ہے کہ جنگ بدر میں مسلمانوں کی ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی گئی تھی اور وہ یہ آیت ہے:

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِالْفِئَةِ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُرَدِّفِينَ۔ (الانفال: ۹)

جب تم اپنے رب سے فریاد کرتے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سن لی کہ میں تمہاری ایک ہزار لگاتار آنے والے فرشتوں سے مدد کرنے والا ہوں۔

(جامع البیان ج ۳، ص ۵۳، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۳۰۹ھ)

امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اہل تفسیر اور اہل سیرت کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر کے دن فرشتوں کو نازل کیا اور انہوں نے کفار سے قتال کیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا فرشتوں نے جنگ بدر کے سوا اور کسی دن قتال نہیں کیا اور باقی غزوات میں فرشتے عددی قوت کے اظہار اور مدد کے لیے نازل کیے گئے تھے، لیکن انہوں نے عملی طور پر قتال میں کوئی حصہ نہیں لیا، اور یہی جمہور کا قول ہے۔ لیکن ابو بکر اصم نے اس کا بڑی شدت کے ساتھ انکار کیا ہے اور ان کے حسب ذیل دلائل ہیں:

۱- تمام روئے زمین کو تباہ کرنے کے لیے ایک فرشتہ کافی ہے، حضرت جبرائیل نے اپنے ایک پر سے قوم لوط کے چار شہروں کی زمین کو تحت الثریٰ سے لے کر آسمان تک اٹھایا پھر اس کو زمین پر پلٹ کر پھینک دیا اور قوم لوط تباہ ہو گئی تو پھر جنگ بدر کے دن ان کو کافروں سے لڑنے کی کیا حاجت تھی؟ پھر ان کے ہوتے ہوئے باقی فرشتوں کی کیا ضرورت تھی۔

۲- قتل کیے جانے والے تمام بڑے بڑے کافر مشہور تھے اور یہ معلوم تھا کہ فلاں کافر کو فلاں صحابی نے قتل کیا ہے تو پھر فرشتوں نے کس کو قتل کیا تھا۔

۳۔ اگر فرشتے کفار کو انسانی شکل میں نظر آ رہے تھے تو پھر مسلمانوں کے لشکر کی تعداد تیرہ سو یا تین ہزار یا اس سے زائد ہو جائے گی حالانکہ اس پر اجماع ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کافروں سے کم تھی اور اگر وہ غیر انسانی شکل میں تھے تو کفار پر سخت رعب طاری ہونا چاہیے تھا حالانکہ یہ منقول نہیں ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اس قسم کے شبہات وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو قرآن مجید اور نبوت پر ایمان نہ رکھتا ہو لیکن جو قرآن مجید اور احادیث پر ایمان رکھتا ہو اس سے اس قسم کے شبہات بہت بعید ہیں، سو ابو بکر اصم کے لائق نہیں ہے کہ وہ فرشتوں کے قتال کا انکار کرے جب کہ قرآن مجید میں فرشتوں کی مدد کرنے کا ذکر ہے اور فرشتوں کے قتال کرنے کے متعلق جو احادیث ہیں وہ تو اتر کے قریب ہیں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب قریش جنگ احد سے واپس ہوئے تو وہ آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے کہ اس مرتبہ ہم نے وہ چنگبرے گھوڑے اور سفید پوش انسان نہیں دیکھے جن کو ہم نے جنگ بدر میں دیکھا تھا، ابو بکر اصم کے شبہات کا جب ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے مقابلہ میں جائزہ لیتے ہیں تو وہ زائل ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے اور وہ اپنے کسی کام پر کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔

(تفسیر کبیر ج ۳، ص ۲۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ)

علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے جنگ بدر کے دن دیکھا کہ ہم کسی مشرک پر تلوار مارتے اور ہماری تلوار پہنچنے سے پہلے اس کا سر دھڑ سے الگ ہو جاتا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنْتَبِئُوا مَعَكُمْ
فَتَبَيَّنُوا الَّذِينَ أَمْنُوا سَأَلْتُمُوهُ فِي قُلُوبِ الَّذِينَ
كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ
وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ - (الانفال: ۱۲)

جب آپ کے رب نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو، غنقریب میں کافروں کے دلوں پر رعب طاری کروں گا، تم کافروں کی گردنوں کے اوپر وار کرو اور کافروں کے ہر جوڑے کے اوپر ضرب لگاؤ۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر کے دن فرشتوں کے ہاتھوں قتل کیے ہوئے کافر الگ پہچانے جاتے تھے، ان کی گردنوں کے اوپر تلوار کے وار تھے اور ان کے ہر جوڑے پر ضرب تھی، اور ہر ضرب ایسی تھی جیسے آگ سے جلی ہوئی ہو، امام بیہقی نے ان تمام کافروں کا ذکر کیا ہے، اور بعض علماء نے کہا کہ فرشتے قتل کرتے تھے اور کافروں میں ان کی ضرب کی علامت صاف ظاہر تھی، کیونکہ جس جگہ وہ ضرب لگاتے تھے وہ جگہ آگ سے جل جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ابو جہل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا تم نے مجھے قتل کیا ہے؟ مجھے اس شخص نے قتل کیا کہ باوجود میری پوری کوشش کے میرا نیزہ اس کے گھوڑے تک نہیں پہنچ سکا، اور اس قدر زیادہ فرشتے نازل کرنے کا سبب یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل پر سکون رہیں، اور اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لیے ان فرشتوں کو مجاہد بنا دیا، سو ہر وہ لشکر جو صبر و ضبط سے کام لے اور محض ثواب کی نیت سے لڑے فرشتے آکر اس کے ساتھ قتال کرتے ہیں، حضرت ابن عباس اور مجاہد نے کہا کہ جنگ بدر کے سوا اور کسی جنگ میں فرشتوں نے قتال نہیں کیا، اور باقی غزوات میں وہ صرف عددی قوت کے اظہار اور مدد کے لیے آتے تھے، اور بعض علماء نے کہا کہ بہ کثرت فرشتوں کو نازل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دعا کریں، تسبیح پڑھیں اور لڑنے والوں کی عددی قوت میں اضافہ کریں، اس قول کی بناء پر فرشتوں نے جنگ بدر میں بھی قتال نہیں کیا، وہ صرف دعا کرنے کے لیے اور مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ لیکن

پہلی رائے کے قائلین زیادہ ہیں۔

قادہ نے کہا پانچ ہزار فرشتوں کے ساتھ جنگ بدر میں مدد کی گئی تھی۔ حسن نے کہا یہ پانچ ہزار فرشتے قیامت تک مسلمانوں کے مددگار ہیں۔ شعبی نے کہا نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کو یہ خبر پہنچی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کی مدد کرنا چاہتا ہے، نبی ﷺ اور مسلمانوں پر یہ خبر شاق گزری تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب تین ہزار نازل کیے ہوئے فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے۔ ہاں کیوں نہیں! اگر تم ثابت قدم رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو جس آن دشمن تم پر چڑھائی کریں گے اسی آن اللہ (تین ہزار کی بجائے) پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں سے تمہاری مدد فرمائے گا۔ (آل عمران: ۱۲۴-۱۲۵) کرز کو جب مشرکوں کی شکست کی خبر پہنچی تو وہ ان کی مدد کے لیے نہیں آیا اور لوٹ گیا، اور اللہ تعالیٰ نے بھی مسلمانوں کی مدد کے لیے پانچ ہزار فرشتے نہیں بھیجے اور ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کی مدد کی گئی تھی، ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے جنگ بدر کے دن یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت پر ثابت قدم رہیں اور اس کی نافرمانی کرنے سے ڈریں اور بچیں تو اللہ تعالیٰ ان کی تمام جنگوں میں مدد فرمائے گا اور مسلمان جنگ خندق کے سوا اور کسی جنگ میں ثابت قدم نہیں رہے اور صرف اسی جنگ میں نافرمانی سے ڈرے تو جب انہوں نے قرینہ کا محاصرہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی (انزال) ملائکہ سے مدد فرمائی۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے متعلق ہے اگر وہ اس میں ثابت قدم رہتے اور نافرمانی نہ کرتے تو پانچ ہزار فرشتوں سے ان کی مدد کی جاتی۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث ثابت ہے کہ میں نے جنگ بدر کے دن دو سفید پوش آدمیوں کو رسول اللہ ﷺ کے دائیں اور بائیں بہت شدت سے قتل کرتے ہوئے دیکھا اور اس سے پہلے اور اس کے بعد ان آدمیوں کو نہیں دیکھا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ وعدہ نبی ﷺ کے ساتھ مخصوص ہو اور عام صحابہ کی فرشتوں کے قتل سے مدد نہ کی گئی ہو۔

(الجامع لاحکام القرآن، ج ۴، ص ۱۹۵-۱۹۴، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران)

مفتی محمد عبدہ لکھتے ہیں:

فرشتوں کی مدد معنوی تھی جس سے مسلمان ثابت قدم رہے اور ان کے ارادے پختہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور اللہ نے ان (فرشتوں کے نازل کرنے) کو محض تمہیں خوشخبری دینے کے لیے کیا ہے اور تاکہ اس سے تمہارے دل مطمئن رہیں اور (درحقیقت) مدد تو صرف اللہ کی طرف سے ہوتی ہے جو بہت غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔ (آل عمران: ۱۲۶) یعنی تاکہ کفار کے لشکر کی کثرت کو دیکھ کر تمہارے دلوں میں گھبراہٹ پیدا نہ ہو، سو تمہاری تسکین کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتے نازل کیے، اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو تم سے فرشتوں کی مدد کا وعدہ کیا ہے وہ محض تمہیں خوشخبری دینے اور تمہاری تسکین کے لیے ہے، کیونکہ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے فرشتے نازل کرنے کا وعدہ نہیں کیا بلکہ رسول اللہ ﷺ نے جو مسلمانوں سے وعدہ فرمایا ہے اس کو نقل فرمایا ہے، اور فرشتوں کی مدد کا محمل یہ ہے کہ اس سے دشمن کے دل میں رعب واقع ہو گا اور خوف پیدا ہو گا اور مسلمان جنگ میں ثابت قدم رہیں گے اور فرشتے ان کو جنگ کے متعلق عمدہ تدبیریں القاء کریں گے۔ چنانچہ نبی ﷺ وادی کے قریب ترین راستے میں اتر گئے تھے اور آپ نے اس راستہ کو دشمن سے مخفی رکھا اور آپ نے بہت مناسب جگہ لشکر کو ٹھہرایا اور لشکر کی پشت پہاڑ کی طرف رکھی اور تیر اندازوں کو پیچھے کھڑا کیا، اگر ان تدبیروں میں سے کوئی تدبیر بھی بروئے کار نہ لائی جاتی تو مشکل پیش آتی۔

بعض سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ فرشتوں نے جنگ احد میں لڑائی میں حصہ لیا، امام ابن حجر نے اس کی نفی کی ہے اور

حضرت ابن عباس نے یہ روایت نقل کی ہے کہ فرشتوں نے صرف جنگ بدر میں قتال کیا ہے اور کسی جنگ میں قتال نہیں کیا، ابو بکر اصم نے اس کا بہت شدت سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایک فرشتہ ہی تمام روئے زمین کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے، اتنے فرشتے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، نیز ہر کافر کے متعلق معلوم ہے کہ اس کو فلاں صحابی نے قتل کیا ہے پھر فرشتوں نے کس کو قتل کیا تھا، نیز اگر فرشتے انسانی شکلوں میں دکھائی دے رہے تھے تو مسلمانوں کی تعداد کافروں سے بہت زیادہ ہو گئی، حالانکہ قرآن مجید میں ہے:

وَيَقْلِلُكُمْ فِي آعْيُنِهِمْ (الانفال: ۳۴) اور اللہ تم کو ان کی نگاہوں میں کم دکھا رہا تھا۔

اور اگر فرشتے انسانی شکلوں میں نظر آ رہے تھے تو لازم آئے گا کہ بغیر کسی فاعل کے سرکٹ کٹ کر گر رہے ہوں، پیٹ چاک ہو رہے ہوں اور اعضاء کٹ کٹ کر گر رہے ہوں اور یہ بہت عظیم معجزہ تھا اور اس کو تو اتر سے نقل ہونا چاہیے تھا۔ امام رازی نے جو ابو بکر اصم کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابو بکر اصم کا یہ قول قرآن مجید کے خلاف ہے تو قرآن مجید میں کہیں یہ نص صریح نہیں ہے کہ فرشتوں نے بالفعل قتال کیا ہے، البتہ سورہ انفال میں غزوہ بدر کے سیاق میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کرے گا، اور اس مدد کا یہ معنی ہے کہ فرشتے مسلمانوں کو جنگ میں ثابت قدم رکھیں گے اور ان کی نیت درست رکھیں گے کیونکہ فرشتے انسانوں میں الہام وغیرہ کے ساتھ تاثیر کرتے ہیں، اور اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے کہ اور اللہ نے اس (نزل ملائکہ) کو محض تمہیں خوشخبری دینے کے لیے کیا ہے اور تاکہ اس سے تمہارے دل مطمئن رہیں۔ (آل عمران: ۱۲۶، الانفال: ۱۰)

باقی رہا یہ کہ اس میں کیا حکمت تھی کہ جنگ بدر کے دن فرشتوں کی مدد آئی اور جنگ احد کے دن نہیں آئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے احوال ان دنوں میں مختلف تھے، جنگ بدر کے دن مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی اور کسی پر نظر نہیں تھی اور انہوں نے اس جنگ میں رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت کی، اور جنگ احد میں سب مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت نہیں کی بلکہ بعض مسلمان آپ کی مقرر کی ہوئی جگہ سے ہٹ گئے تھے۔

(المنار ج ۳، ص ۱۱۵-۱۱۲، ملخصاً مطبوعہ دار المعرفہ، بیروت)

قاضی ابوالخیر عبد اللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ لکھتے ہیں:

فرشتوں کے قتال کرنے میں اختلاف ہے اور بعض احادیث فرشتوں کے قتال کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔

(انوار التنزیل ص ۲۳۵، مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع، مصر)

علامہ احمد شہاب الدین خفاجی حنفی متوفی ۱۰۶۹ھ لکھتے ہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ فرشتوں نے کفار کے خلاف قتال کیا تھا یا قتال نہیں کیا تھا، بلکہ فرشتوں کا نازل ہونا صرف مسلمانوں کی تقویت کے لیے تھا اور ان کے دشمنوں کو کمزور کرنے کے لیے تھا، اس کی تفصیل ”کشاف“ میں ہے۔

(عناہ القاضی، ج ۳، ص ۲۵۶، مطبوعہ دار صادر، بیروت، ۱۳۸۳ھ)

علامہ جبار اللہ محمود بن عمر معشری متوفی ۵۲۸ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کا غزوہ بدر میں فرشتوں کو بھیجا صرف تمہیں مدد کی بشارت دینے کے لیے تھا، جیسے بنی اسرائیل کے لیے سیکنہ کو نازل کیا گیا تھا۔ یعنی تم نے اپنی قلت تعداد اور ضعف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا اور فریاد کی تو تمہیں مدد کی بشارت دینے کے لیے فرشتوں کو نازل فرمایا تاکہ تمہیں سکون حاصل ہو اور تمہارے دل مطمئن ہوں اور (حقیقت میں) اللہ صرف اللہ

کی جانب سے ہے، اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتا ہے کہ تم یہ نہ گمان کرو کہ فرشتوں نے مدد کی ہے، کیونکہ تمہاری اور فرشتوں کی مدد کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اور فرشتوں کی مدد کرنا اللہ کی طرف سے بطور اسباب ہے اور جس کی اللہ مدد فرمائے وہی منصور ہے۔ (الکشاف ج ۲، ص ۲۰۲، مطبوعہ ایران، ۱۳۱۳ھ)

علامہ سید محمود آلوسی حنفی لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ عزوجل نے اس امداد کو محض بشارت اور مسلمانوں کے دلوں کے اطمینان کے لیے نازل کیا ہے، اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ فرشتوں نے قتال نہیں کیا اور یہ بعض علماء کا مذہب ہے، اور بعض احادیث میں اس کی دلیل ہے حضرت ابواسید نے نابینا ہونے کے بعد کہا اگر میں اس وقت بدر میں ہوتا اور نابینا ہوتا تو تم کو وہ گھائی دکھاتا جس سے فرشتے نکل رہے تھے۔ (روح المعانی ج ۹، ص ۱۷۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

قرآن مجید میں صراحت یہ مذکور نہیں ہے کہ فرشتوں نے جنگ بدر میں قتال کیا، البتہ سورہ انفال کی اس آیت سے اس پر استدلال کیا گیا ہے:

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنْتُمْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ - (الانفال: ۱۲)

جب آپ کے رب نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تو تم ایمان والوں کو ثابت قدم رکھو، غنقریب میں کافروں کے دلوں میں رعب طاری کروں گا، تم کافروں کی گردنوں کے اوپر وار کرو اور کافروں کے ہر جوڑ کے اوپر ضرب لگاؤ۔

علامہ پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

اس آیت سے بظاہر یہی ثابت ہوتا ہے کہ فرشتوں نے بالفعل لڑائی میں حصہ لیا، لیکن جن حضرات نے اسے مستبعد جانا ہے ان کا خیال ہے کہ فاضربوا میں خطاب مومنین سے ہے اور انہیں مارنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ لیکن اس آیت کے الفاظ اس کی تائید نہیں کرتے۔ (ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۱۳۴، مطبوعہ نداء القرآن، پبلی کیشنز لاہور)

علامہ ابو محمد ابن عطیہ اندلسی متوفی ۵۴۶ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں یا تو فرشتوں سے خطاب ہے کہ تم کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور یا مسلمانوں سے خطاب ہے کہ تم کافروں کو قتل کرو۔ (المحرر الوجیز ج ۸، ص ۲۷، مطبوعہ مکتبہ تجاریہ، مکہ مکرمہ)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں ان علماء کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ فرشتوں نے قتال کیا تھا، اور جو علماء یہ کہتے ہیں کہ فرشتوں نے قتال نہیں کیا تھا وہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرشتوں کے قول کی حکایت کی ہے کہ وہ مسلمانوں کو جنگ میں ثابت قدم رکھتے تھے، ان کا حوصلہ بڑھاتے تھے اور فرشتے مومنین سے یہ کہتے تھے کہ تم کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور کافروں کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔ (روح المعانی، ج ۹، ص ۱۸۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

علامہ ابو الیمان اندلسی متوفی ۵۷۴ھ لکھتے ہیں:

جو معنی واضح ہے وہ یہی ہے کہ اس آیت میں فرشتوں کے ثابت قدم رکھنے کی تفسیر ہے اور فرشتے مسلمانوں سے یہ کہتے تھے کہ کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔ (البحر المحیط، ج ۵، ص ۲۸۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۳ھ)

شیخ شبیر احمد عثمانی متوفی ۱۳۶۹ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

روایات میں ہے بدر میں ملائکہ کو لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے۔ (تفسیر بر حاشیہ قرآن، مطبوعہ سعودی عربیہ)

صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ اس آیت کی تفسیر لکھتے ہیں:

ابوداؤد مازنی جو بدر میں حاضر ہوئے تھے فرماتے ہیں کہ میں ایک مشرک کی گردن مارنے کے لیے اس کے درپے ہوا۔ اس کا سر میری تلوار کے پہنچنے سے پہلے ہی کٹ کر گر گیا تو میں نے جان لیا کہ اس کو کسی اور نے قتل کیا۔

(تفسیر بر حاشیہ قرآن، مطبوعہ تاج کمپنی لیٹڈ لاہور)

سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

جو اصولی باتیں ہم کو قرآن کے ذریعہ سے معلوم ہیں ان کی بناء پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فرشتوں سے قتال میں یہ کام نہیں لیا ہو گا کہ وہ خود حرب و ضرب کا کام کریں، بلکہ شاید اس کی صورت یہ ہوگی کہ کفار پر جو ضرب مسلمان لگائیں وہ فرشتوں کی مدد سے ٹھیک بیٹھے اور کاری لگے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۱۳۴، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن، لاہور)

مفتی محمد شفیع کا کلام اس مسئلہ میں واضح نہیں ہے، انہوں نے دو ٹوک طریقے سے نہ تو فرشتوں کے قتال کا قول کیا ہے اور نہ صراحت اس کی نفی کی ہے۔ سورہ آل عمران کی تفسیر میں قتال ملائکہ کی بعض روایات نقل کر کے لکھتے ہیں:

یہ سب مشاہدات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں کہ ملائکہ اللہ نے مسلمانوں کو اپنی نصرت کا یقین دلانے کے لیے کچھ کچھ کام ایسے بھی کیے ہیں کہ گویا وہ بھی قتال میں شریک ہیں اور دراصل ان کا کام مسلمانوں کی تسلی اور تقویت قلب تھا۔ فرشتوں کے ذریعہ میدان جنگ فتح کرانا مقصود نہیں تھا، اس کی واضح دلیل یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں جنگ و جہاد کے فرائض انسانوں پر عائد کیے گئے ہیں اور اسی وجہ سے ان کو فضائل و درجات حاصل ہوتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ فرشتوں کے لشکر سے ملک فتح کرائے جائیں تو دنیا میں کفر و کافر کا نام ہی نہ رہتا، حکومت و سلطنت کی تو کیا گنجائش تھی، مگر اس کارخانہ قدرت میں اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہی نہیں۔ (معارف القرآن، ج ۴، ص ۱۷۴، مطبوعہ ادارہ المعارف کراچی، ۱۳۹۷ھ)

اور سورہ انفال کی زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اس میں فرشتوں کو دو کام سپرد کیے گئے ہیں ایک یہ کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھائیں۔ یہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ فرشتے میدان میں آکر ان کی جماعت کو بڑھائیں اور ان کے ساتھ مل کر قتال میں حصہ لیں، اور اس طرح بھی کہ اپنے تصرف سے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کر دیں اور ان میں قوت پیدا کر دیں۔ دوسرا کام یہ بھی ان کے سپرد ہوا کہ فرشتے خود بھی قتال میں حصہ لیں اور کفار پر حملہ آور ہوں۔ اس آیت سے ظاہر یہی ہے کہ فرشتوں نے دونوں کام انجام دیے۔ مسلمانوں کے دلوں میں تصرف کر کے ہمت و قوت بڑھائی اور قتال میں بھی حصہ لیا، اور اس کی تائید چند روایات حدیث سے بھی ہوتی ہے جو تفسیر در مشور اور منظری میں تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور قتال ملائکہ کی یعنی شہادتیں صحابہ کرام سے نقل کی ہیں۔

(معارف القرآن، ج ۴، ص ۱۹۷، مطبوعہ ادارہ المعارف، کراچی، ۱۳۹۷ھ)

شیخ امین احسن اصلاحی متوفی ۱۳۱۷ھ لکھتے ہیں:

اس زمانہ کے بعض کم سوادوں نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا کہ فرشتوں کی فوج اتارنے کا وعدہ محض مسلمانوں کو ذرا بڑھاوا دینے کے لیے تھا تاکہ وہ ہمت کر کے کفار سے بھڑ جائیں۔ ان کے خیال میں قرآن نے جنگ کے بعد خود یہ راز کھول دیا کہ

یہ بات محض تمہاری تسلی کے لیے کہہ دی گئی تھی اس کی حقیقت کچھ نہیں تھی، گویا نعوذ باللہ پہلے تو اللہ میاں نے مسلمانوں کو چکمہ دیا اور خود ہی اپنا بھانڈا پھوڑ دیا کہ اب کے تو میں نے تمہیں چکمہ دے کر لڑا دیا آئندہ میرے بھرے میں نہ آنا، فرشتوں و رشتوں کی بات محض ایک بھڑی تھی، شاید یہ حضرات اللہ میاں کو اپنے برابر بھی عقلمند نہیں سمجھتے۔

(تذکر قرآن، ج ۳، ص ۲۲۵-۲۲۴، مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن، ۱۳۱۹ھ)

یہ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کو اللہ میاں کہنا جائز نہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کی انہوں نے جس غیر سنجیدہ انداز سے تعبیر کی ہے وہ قابل صد افسوس اور مذمت ہے۔

شیعہ مفسر شیخ فتح اللہ کاشانی لکھتے ہیں:

روایت ہے کہ جنگ بدر کے دن جبرائیل پانچ سو فرشتوں کے ساتھ اور میکائیل پانچ سو فرشتوں کے ساتھ نازل ہوئے، جبرائیل دائیں جانب تھے اور میکائیل بائیں جانب تھے، انہوں نے سفید لباس پہنا ہوا تھا اور عمامہ کا شملہ کندھوں کے درمیان ڈالا ہوا تھا، انہوں نے مشرکوں کے ساتھ جنگ کی اور ان کو مغلوب کیا، اور ماضی اور مستقبل میں سے جنگ بدر کے سوا اور کسی دن میں فرشتوں کو جہاد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ حضرت رسالت پناہ ﷺ کے بلند مرتبہ کی وجہ سے ان کو صرف جنگ بدر کے دن جہاد کا حکم دیا گیا تھا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب کوئی مسلمان کسی مشرک کے ساتھ جنگ کرتا تو اس مشرک کے سر کے اوپر سے تازیانہ کی آواز آتی اور جب مسلمان شخص نظر اوپر اٹھاتا تو وہ مشرک زمین پر پڑا ہوتا اور اس کے سر کے اوپر تازیانہ کا نشان ظاہر ہوتا اور وہ شخص کسی اور کو نہ دیکھتا، اور جب اس نے رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر سنائی تو آپ نے فرمایا یہ فرشتے تھے جن کو حق تعالیٰ نے تمہاری مدد کے لیے بھیجا تھا، اور حضرت امیر المومنین صلوات اللہ علیہ نے فرمایا ہمارے شہید اور قریش کے مقتولین میں یہ فرق تھا کہ ہمارے شہداء پر زخموں کے نشانات تھے اور قریش کے مقتولین پر زخموں کے نشانات نہیں تھے۔ (منہج الصادقین، ج ۳، ص ۱۶۸، مطبوعہ خیابان ناصر خسرو، ایران)

آیہ اللہ مکارم شیرازی لکھتے ہیں:

مفسرین کا اس میں اختلاف ہے، بعض اس کے معتقد ہیں کہ فرشتے اپنے مخصوص اسلحہ کے ساتھ نازل ہوئے تھے اور انہوں نے دشمنوں پر حملہ کیا اور ان کی ایک جماعت کو خاک پر گرا دیا، اور اس سلسلہ میں انہوں نے کچھ روایات کو بھی نقل کیا ہے، اور مفسرین کا دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ فرشتے صرف مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے، ان کے دلوں کو تقویت دینے اور ان کو فتح کی خوشخبری دینے کے لیے نازل ہوئے تھے۔ اور یہی قول حقیقت سے قریب تر ہے اور اس کی حسب ذیل وجوہ ہیں:

۱- آل عمران: ۱۲۶ اور الانفال: ۱۰ میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ فرشتوں کا نزول صرف مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے اور ان کو فتح کی بشارت دینے کے لیے ہوا تھا۔

۲- اگر کفار کو فرشتوں نے قتل کیا تھا تو مجاہدین بدر کی کیا فضیلت رہ جاتی ہے؟

۳- جنگ بدر میں ستر کافر قتل ہوئے تھے، جن میں سے کچھ کو حضرت علی علیہ السلام نے قتل کیا تھا اور باقی کو دوسرے مجاہدین نے، اور تاریخ میں یہ محفوظ ہے کہ کس کافر کو کس مسلمان نے قتل کیا تھا تو پھر فرشتوں نے کس کو قتل کیا تھا۔

(تفسیر نمونہ، ج ۷، ص ۱۰۵-۱۰۴، مطبوعہ دارالکتب الاسلامیہ، ایران، ۱۳۶۹ھ)

غزوہ بدر میں فرشتوں کے قتال کے متعلق امام رازی کا تبدیل شدہ نظریہ

آل عمران: ۱۲۵-۱۲۶ کی جو امام فخر الدین رازی نے تفسیر کی ہے اس کو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ الانفال: ۱۰ کی تفسیر میں امام

رازی نے اس سے مختلف تقریر کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں کا نزول صرف مسلمانوں کی تقویت اور ان کو فتح اور نصرت کی بشارت دینے کے لیے تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ آیا جنگ بدر میں فرشتوں نے قتال کیا تھا یا نہیں؟ علماء کی ایک جماعت نے کہا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام پانچ سو فرشتوں کے ساتھ لشکر اسلام کی دائیں جانب تھے۔ اور حضرت میکائیل پانچ سو فرشتوں کے ساتھ لشکر اسلام کی بائیں جانب تھے اور اس لشکر میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ اور وہ فرشتے مردوں کی صورت میں سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے اور انہوں نے کفار سے قتال کیا تھا، ایک قول یہ ہے کہ ان فرشتوں نے غزوہ بدر میں قتال کیا تھا اور غزوہ احزاب اور غزوہ حنین میں قتال نہیں کیا تھا۔ اور روایت ہے کہ ابو جہل نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا تھا وہ آواز کہاں سے آتی تھی جس کو ہم سنتے تھے اور بولنے والا نظر نہیں آتا تھا، حضرت ابن مسعود نے کہا وہ فرشتے تھے، تب ابو جہل نے کہا تو پھر انہوں نے ہم کو شکست دی ہے تم نے نہیں دی، اور روایت ہے کہ ایک مسلمان ایک مشرک کا پیچھا کر رہا تھا اچانک اس نے اپنے اوپر سے ایک کوڑا مارنے والے کی آواز سنی، اس نے اس مشرک کی طرف دیکھا تو وہ نیچے گرا پڑا تھا اور اس کا چہرہ شق ہو گیا تھا، اس انصاری نے اللہ کے رسول ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا یہ آسمان سے مدد آئی تھی۔ علماء کی دوسری جماعت نے یہ کہا کہ فرشتوں نے قتال بالکل نہیں کیا، وہ صرف مسلمانوں کے لشکر کی تعداد بڑھانے کے لیے آئے تھے اور مسلمانوں کو ثابت قدم رکھنے کے لیے، ورنہ پوری دنیا کو ہلاک کرنے کے لیے صرف ایک فرشتہ ہی کافی ہے، حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنے بازو کے ایک پر سے قوم لوط کے تمام شہروں کو تباہ اور برباد کر دیا تھا اور قوم ثمود کے شہروں کو اور حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کو صرف ایک چیخ سے ہلاک کر دیا تھا۔ غزوہ بدر میں فرشتوں کی امداد کی کیفیت سورہ آل عمران میں بہت تفصیل سے ذکر کی گئی ہے۔ غزوہ بدر میں فرشتے قتال کے لیے نازل نہیں ہوئے تھے اس قول کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَ لِنَطْمِئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ. (الانفال: ۱۰)

اور فرشتوں کو نازل فرمانا صرف تمہیں بشارت دینے کے لیے تھا اور اس لیے کہ تمہارے دل مطمئن رہیں۔

فرمانے یہ کہا کہ ”وما جعلہ“ کی ضمیر لگاتار فرشتوں کی طرف لوٹتی ہے، یعنی لگاتار فرشتوں کو بھیجنا صرف تمہیں بشارت دینے کے لیے تھا اور زجاج نے بھی یہی کہا ہے کہ لگاتار فرشتوں کو بھیجنا صرف بشارت دینے کے لیے تھا۔ اور یہ تفسیر اولیٰ ہے کیونکہ فرشتوں کی امداد بشارت سے حاصل ہو گئی تھی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ غزوہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ چہرے کے نیچے بیٹھے ہوئے دعا کر رہے تھے اور آپ کی دائیں جانب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان کوئی تیسرا نہیں تھا، پھر رسول اللہ ﷺ کو اونگھ آگئی، پھر آپ نے حضرت ابو بکر کے زانو پر ہاتھ مارا اور فرمایا اللہ کی مدد کی بشارت لو، میں نے خواب میں دیکھا کہ جبرائیل گھوڑے پر سوار آرہے ہیں۔ یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ فرشتوں کو نازل کرنے سے صرف خوشخبری دینا مقصود تھا۔ اور یہ اس بات کی نفی کرتی ہے کہ فرشتوں نے قتال کیا تھا، اس کے بعد اللہ نے فرمایا کہ ”مدد صرف اللہ کی طرف سے ہے۔“ (الانفال: ۱۰) اور اس سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ ہرچند کہ فرشتے مومنین کی موافقت میں نازل ہوئے تھے، لیکن مسلمانوں پر یہ واجب ہے کہ وہ اس پر اعتماد نہ کریں، بلکہ ان پر واجب ہے کہ وہ اللہ کی اعانت اور امداد، اس کی ہدایت اور اس کے کافی ہونے پر اعتماد کریں۔ کیونکہ اللہ ہی عزیز اور غالب ہے جس پر کوئی غلبہ نہیں پاسکتا اور وہی ایسا قاہر ہے جس پر کوئی قہر نہیں کرسکتا، اور وہی حکیم ہے اور وہ اپنی حکمت سے جانتا ہے کہ کس جگہ نصرت کرنی چاہیے سو وہ اس جگہ نصرت فرماتا ہے۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۶۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۱۵ھ)
غزوہ بدر میں فرشتوں کے قتال کے متعلق مصنف کی تحقیق

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی صریح آیات اور بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ بدر میں فرشتے صرف مسلمانوں کو بشارت دینے اور ان کو تقویت دینے کے لیے نازل ہوتے تھے، اور انہوں نے خود جنگ نہیں کی۔ اس کے برخلاف بعض دیگر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے خود جنگ کی تھی، لیکن یہ احادیث چونکہ قرآن مجید کی ان صریح آیات سے معارض ہیں اس لیے ان کو ترک کر دیا جائے گا، نیز اگر فرشتوں نے یہ لڑائی لڑی ہوتی تو پھر کوئی صحابی بھی اس جنگ میں زخمی یا شہید نہ ہوتا، حالانکہ چودہ صحابی شہید ہوئے، اور متعدد زخمی ہوئے، نیز اگر یہ فرشتوں کا کارنامہ تھا تو اصحاب بدر کا کوئی کمال نہ ہوا اور ان کی اس قدر فضیلت نہ ہوئی۔ اور پھر ہزاروں فرشتوں کی کیا ضرورت تھی؟ تمام کافروں کو قتل کرنے کے لیے تو ایک فرشتہ ہی کافی تھا۔ علاوہ ازیں یہ کہ مجاہدین صحابہ میں سے ہر ایک کے متعلق معلوم اور ثابت ہے کہ فلاں صحابی نے فلاں کافر کو قتل کیا اور فلاں صحابی نے فلاں کافر کو قتل کیا، پھر فرشتوں نے کس کو قتل کیا؟ نیز قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتُمْ إِذْ رَمَيْتُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ -
تو (اے مسلمانو!) تم نے ان کافروں کو (حقیقتاً) قتل نہیں کیا، لیکن ان کو اللہ نے (حقیقتاً) قتل کیا ہے، اور (اے محبوب) آپ نے (حقیقتاً) خاک (نہیں پھینکی، جس وقت (بظاہر) آپ نے (خاک) پھینکی تھی، وہ (خاک) اللہ نے پھینکی۔

بظاہر اصحاب بدر نے کافروں کو قتل کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم نے ان کو حقیقتاً قتل نہیں کیا، ان کو قتل کیا ہے، اگر فرشتوں نے بظاہر قتل کیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ یوں فرماتا: اے مسلمانو! تم نے کافروں کو حقیقتاً قتل نہیں کیا، ان کو تو درحقیقت فرشتوں نے قتل کیا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف قتل کی نسبت ظاہر کی نہ حقیقتاً تو معلوم ہوا کہ بدر کے کافروں کو قتل کرنے میں فرشتوں کا کوئی دخل نہیں ہے نہ ظاہراً نہ حقیقتاً، اور بدر میں فرشتوں کا نزول صرف مسلمانوں کے اطمینان اور ان کو بشارت دینے کے لیے تھا، جو فرشتے بدر میں اترے انہیں دوسرے فرشتوں پر فضیلت حاصل ہوئی، اس لیے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض فرشتوں کو عزت اور فضیلت دینے کے لیے بدر میں فرشتوں کو اتارا ہوا!

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت معاذ بن رفاع اپنے والد سے روایت کرتے ہیں (ان کے والد اہل بدر میں سے تھے) کہ حضرت جبرائیل نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ اہل بدر کو کون سا درجہ دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ مسلمانوں میں سب سے افضل ہیں یا اس طرح کوئی اور بات فرمائی۔ حضرت جبرائیل نے کہا ہم بھی اسی طرح فرشتوں میں بدری فرشتوں کو سب سے افضل قرار دیتے ہیں۔ (صحیح بخاری، ج ۲، ص ۵۲۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی ۱۳۸۱ھ)

اس حدیث میں یہ معلوم ہوا کہ فرشتوں کو نازل کرنے کی حکمت یہ تھی کہ اس جنگ میں ان کو مسلمانوں کی معیت کا شرف اور مرتبہ دیا جائے۔

میں نے اس مسئلہ میں بہت چھان بین کی ہے اور اہمات کتب حدیث میں مجھ کو فرشتوں کے قتال کے متعلق جس قدر احادیث ملیں میں نے ان سب کا ذکر کیا، لیکن میں نے دیکھا یہ احادیث باہم متعارض اور مضطرب ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے صرف جنگ بدر میں قتال کیا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے جنگ احزاب میں بھی

چتکبرے گھوڑوں پر آسمان اور زمین کے درمیان دیکھا وہ نشان زدہ تھے وہ کافروں کو گرفتار بھی کر رہے تھے اور قتل بھی کر رہے تھے۔

امام ابن عساکر نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے جنگ بدر میں دو آدمیوں کو دیکھا ایک آپ کے دائیں جانب تھا اور ایک آپ کے بائیں جانب تھا۔ وہ دونوں بہت شدت سے قتال کر رہے تھے پھر میں نے ایک تیسرے شخص کو دیکھا جو آپ کے پیچھے تھا پھر ایک چوتھے شخص کو دیکھا جو آپ کے آگے تھا۔

ابراہیم غفاری اپنے تم زادت روایت کرتے ہیں کہ میں اور میرا نم زاد بدر کے پانی پر کھڑے ہوئے تھے جب ہم نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لوگوں کی قلت کو دیکھا اور قریش کی کثرت کو دیکھا تو ہم نے کہا: یہ لوگ تو قریش کے چوتھائی ہیں اسی اثناء میں ہم نے دیکھا کہ ایک بادل آیا جس نے ہم کو ڈھانپ لیا پھر ہم نے آدمیوں کی اور تھیاریوں کی آوازیں سنیں اور ہم نے سنا ایک آدمی کہہ رہا تھا: اے حیزوم! آگے بڑھو۔ پھر وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں جانب اتر آئے پھر اسی طرف کی دوسری جماعت آپ کے بائیں جانب اتر آئی۔ (الحدیث)

(تفسیر مظہری ج ۲ ص ۲۵ مطبوعہ مکتبہ عثمانیہ کونینہ ۱۳۲۵ھ)

إِذْ يُغَشِّكُمُ النُّعَاسُ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنزِلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ

(یاد کرو) جب اللہ اپنی طرف سے تم پر غنودگی طاری کر رہا تھا جو تمہارے لیے بے خوفی کا باعث ہوئی اور تم پر آسمان سے

مَاءً لِّيَطَهِّرَ كُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُم رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ

بارش نازل فرما رہا تھا تاکہ اس سے تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کرے اور تمہارے دلوں کو

عَلَى قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ۝ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى

ڈھاریں بندھائے اور اس کے ذریعہ تمہارے قدم جما دے ۝ اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں

الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبَّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا سَأَلِقَىٰ فِي قُلُوبِ

کی طرف وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو، میں عنقریب ان کافروں کے دلوں

الَّذِينَ كَفَرُوا وَالرُّعْبَ قَاضِرِ يَوْفٍ الْأَعْتَابِ وَاصْرَبُوا

میں رعب ڈال دوں گا، سو تم ہفتوں کی گردنوں کے اوپر وار کرو اور ان کے سہر جوڑ پر

مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۝ وَمَنْ

ضرب لگاؤ ۝ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو

يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ ذَٰلِكُمْ

اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے تو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ۝ یہ ہے تمہاری

فَذَوْقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۳﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

نزا) سواں کو چکھو اور بیشک کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے ○ اے ایمان والو!

آمَنُوا إِذَاقِيَّتِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَارْحَفًا فَلَا تُولُوهُمْ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾

جب جنگ میں تمہارا کفار سے مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرو ○

وَمَنْ يُؤَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دَيْرَةً إِلَّا مَتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مَتَحَدِّثًا

اور جس شخص نے جنگ کی حکمت علی یا ایک جماعت کے لئے (کے قصد) کے بغیر میدان جنگ سے پیٹھ پھیری

إِلَى فِتْنَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَا وَهُ جَهَنَّمُ ط

تو بے شک وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ

بِئْسَ الْبَصِيرُ ﴿۱۶﴾ فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ

کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے ○ سو اے مسلمانوں تم نے ان کو قتل نہیں کیا، لیکن اللہ نے ان کو قتل کیا ہے اور اے رسول معظم! آپ نے وہ ٹھکانہ

إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَفَىٰ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً

نہیں پھینکی جس وقت آپ نے وہ ٹھکانہ پھینکی تھی، لیکن وہ ٹھکانہ اللہ نے پھینکی تھی تاکہ وہ مومنوں کو اچھی آزمائش کے ساتھ

حَسَنًا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۷﴾ ذَلِكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ مُوهِنٌ كِيدِ

گزارے، بیشک اللہ بہت سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ○ یہ تو تمہارے ساتھ معاملہ ہے اور اللہ کفار کی چالوں کو

الْكَافِرِينَ ﴿۱۸﴾ إِنْ تَسْتَفِيحُوا فَقَدْ جَاءَكُمْ الْفَتْحُ وَإِنْ تَنْتَهُوا

کمزور کرنے والا ہے ○ (آپ ان کافروں سے کہیے) اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو فیصلہ تمہارے سامنے آچکا ہے اور اگر تم (کفر اور شرک

فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِنْ تَعُودُوا نَعُدْ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ

سے) باز آ جاؤ تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے اور اگر تم نے پھر یہی حرکت کی تو ہم پھر تمہیں سزا دیں گے اور تمہارا گروہ خواہ کتنا زیادہ ہو

شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ وَأَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۹﴾

وہ تمہارے کسی کام نہ آسکے گا اور بے شک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (یاد کرو) جب اللہ اپنی طرف سے تم پر غنودگی طاری کر رہا تھا جو تمہارے لیے بے خونی کا باعث ہوئی اور تم پر آسمان سے بارش نازل فرما رہا تھا تاکہ اس سے تمہیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی نجاست کو دور کرے اور تمہارے دلوں کو ڈھارس بندھائے اور اس کے ذریعہ تمہارے قدم جمادے O اور (یاد کیجئے) جب آپ کے رب نے فرشتوں کی طرف وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو، میں عنقریب ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا سو تم کافروں کی گردنوں کے اوپر وار کرو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔

غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ کی امداد کی چھ انواع

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اجمالی طور پر فرمایا تھا کہ غزوہ بدر میں صرف اللہ کی طرف سے مدد تھی۔ اب اللہ تعالیٰ تفصیل سے اس امداد کو بیان فرما رہا ہے۔ الانفال کی آیت ۱۲ میں اللہ تعالیٰ نے اس امداد کی چھ انواع بیان فرمائی ہیں۔

۱- مسلمانوں پر غنودگی طاری کرنا۔

۲- آسمان سے بارش نازل فرمانا۔

۳- مسلمانوں کے دلوں کو ڈھارس بندھانا اور ان کے دلوں کو مضبوط کرنا۔

۴- مسلمانوں کے قدم جمانا۔

۵- فرشتوں کی طرف سے وحی نازل فرمانا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

۶- کافروں کے دلوں پر رعب طاری کرنا اور ان کے دلوں پر مسلمانوں کی ہیبت ڈالنا۔

اب ہم تفصیل کے ساتھ ہر امداد کی نعمتوں کو بیان کریں گے۔ فنقول وبالله التوفیق۔

جس دن کی صبح جنگ ہوئی تھی اس رات مسلمانوں پر نیند کا طاری ہونا

نعاس، غنودگی کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں انسان بالکل مطمئن ہوتا ہے اور اس کو کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا، مسلمانوں پر یہ غنودگی اس رات طاری ہوئی تھی جس کی صبح کو انہوں نے کفار کے خلاف جماد کرنا تھا، اور اس رات ان کو نیند آجانا نہایت عجیب تھا کیونکہ ان کی تعداد کم تھی اور صبح ان کو اپنے سے تین گنا لشکر کا سامنا کرنا تھا۔ بظاہر اس فکر اور پریشانی کی وجہ سے ان کو نیند نہیں آنی چاہیے تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مطمئن اور مضبوط کر دیا، مسلمانوں میں سے حضرت مقداد بن اسود کے پاس ایک چنگبرے رنگ کا گھوڑا تھا جس کا نام سبوح تھا۔ ایک گھوڑا حضرت زبیر بن العوام کے پاس تھا جس کا نام یحسوب تھا، اور ایک گھوڑا مرثد بن ابی مرثد کے پاس تھا جس کا نام سیل تھا، نبی ﷺ کے پاس ایک تلوار اور ایک زره تھی، اور مسلمانوں کے پاس کل ستر اونٹ تھے اور ایک اونٹ پر باری باری تین مسلمان سوار ہوتے تھے۔ حضرت ابولبابہ اور حضرت علی اور رسول اللہ ﷺ کے حصہ میں بھی ایک اونٹ تھا، ان صاحبوں نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ مستقل اونٹ پر سوار رہیں اور وہ پیدل چلتے رہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم مجھ سے زیادہ پیدل چلنے پر قادر نہیں ہو اور میں تمہاری بہ نسبت اجر سے مستغنی نہیں ہوں۔ اس کے برخلاف کفار قریش کے پاس ایک سو گھوڑے تھے اور ہر گھوڑے پر ایک زره پوش سوار تھا اور جو پیدل تھے ان کے پاس بھی زرهیں تھیں۔ وہ ہر روز نو دس اونٹ ذبح کرتے تھے اور ان کے ساتھ باندیاں تھیں جو گاجا کر اور مسلمانوں کی ہجو میں اشعار پڑھ کر ان کو جوش دلارہی تھیں اور ان کی آتش غضب کو اور بھڑکارہی تھیں، اندر میں حالات مسلمانوں کو زیادہ فکر مند اور پریشان ہونا چاہیے تھا اور اگر وہ اسی طرح بے چینی سے جاگ کر رات گزارتے تو صبح کو وہ لڑنے کے لیے تازہ دم نہ ہوتے، سو اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا اور ان کی یہ امداد کی کہ ان پر نیند طاری کر دی اور جمعہ کی صبح کو جس دن جنگ ہوئی تھی وہ بالکل تازہ دم اور

جنگ کے لیے تیار تھے۔ (الطبقات الکبریٰ دلائل النبوة، سبل الہدیٰ والرشاد ملتفظاً)

مسلمانوں پر اس رات غنودگی طاری کرنے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں

ہر نیند اور غنودگی اللہ کی طرف سے طاری ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس غنودگی کو طاری کرنے کی نسبت جو اپنی طرف کی ہے اور اس کو اہمیت سے بیان فرمایا تو ضرور اس میں اللہ تعالیٰ کی غیر معمولی نعمتیں ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

۱- جب کوئی شخص اپنے دشمن سے خوفزدہ ہو اور اس کو اپنے اہل و عیال کی جان کا خطرہ ہو تو عادتاً اس کو نیند نہیں آتی اور جب اس کیفیت میں نیند آجائے تو یہ ضرور ایک غیر معمولی بات ہے۔

۲- وہ ایسی گہری نیند نہیں سوتے تھے کہ گرد و پیش بے بالکل بے خبر ہو جاتے ورنہ دشمن ان پر اچانک ٹوٹ پڑتا اور ان سب کو ہلاک کر دیتا۔ بلکہ ان پر صرف غنودگی طاری کی جس سے ان کی تھکاوٹ دور ہو جائے اور صبح کو وہ تازہ دم انھیں اور اگر رات کو دشمن ان کی طرف آتا تو وہ فوراً بیدار ہو جاتے اور دشمن ان کو بے خبری میں ہلاک کرنے پر قادر نہ ہوتا۔

۳- ایک بڑی جماعت کے ہر شخص کو بیک وقت نیند کا آجانا یہ بھی غیر معمولی بات ہے۔

۴- نیند بے فکری اور سکون کے وقت آتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے دل و دماغ سے دشمن کے خوف اور اس کی فکر کو دور کر دیا تھا، اور تین سو تیرہ نفوس کے دل و دماغ میں بے یک وقت ایک ہی قسم کی کیفیات کا طاری ہونا یہ بھی ایک غیر معمولی بات ہے۔

ان مذکورہ وجوہ سے معلوم ہوا کہ اس رات مسلمانوں پر غنودگی طاری کرنے میں کئی وجوہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کا اظہار تھا اور رسول اللہ ﷺ کا معجزہ تھا۔

بدر میں رسول اللہ ﷺ کی قیام گاہ اور بارش کا نزول

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ اور مسلمان بدر کی طرف روانہ ہوئے، ادھر مشرکین پہلے پہنچ چکے تھے اور انہوں نے پانی پر قبضہ کر لیا تھا، ان کا پڑاؤ وادی کے اوپر کی جانب تھا اور نبی ﷺ وادی کی پگھلی جانب تھے۔ کئی مسلمان جنبی ہو چکے تھے اور ان کے غسل کے لیے پانی نہیں تھا، اور کئی پیاسے تھے اور جو مسلمان جنبی تھے وہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے جنابت کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے، شیطان نے ان کے دلوں میں دوسو ڈالا کہ تم کفار قریش پر غالب آنے کی کیسے توقع کر سکتے ہو حالانکہ تم میں کئی مسلمان بغیر وضو کے حالت جنابت میں نماز پڑھ رہے ہیں، تب اللہ تعالیٰ نے ان پر بارش نازل کی۔ انہوں نے غسل کیا، وضو کیا اور پانی پیا۔ وہ جگہ ریتلی تھی اور ریت کی وجہ سے ان کے پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے اب ان کے قدم ریت پر جمع گئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں سے شیطان کے ڈالے ہوئے دوسو کو زائل کر دیا۔ (جامع البیان، ج ۹، ص ۲۶۱، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام ابن ہشام متوفی ۲۱۸ھ لکھتے ہیں:

امام ابن اسحاق نے کہا کہ کفار قریش نے وادی بدر کے آخری کونے پر پڑاؤ ڈالا تھا اور ان کے پیچھے ریت کا ٹیلہ تھا، رسول اللہ ﷺ اور مسلمان اس ٹیلہ کے پیچھے تھے اور ریت کی زیادتی کی وجہ سے ان کے پاؤں زمین میں دھنس رہے تھے، اور پانی پر قریش کا قبضہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی، جس سے ریت بیٹھ گئی اور جہاں قریش تھے وہاں بارش کی وجہ سے کچھ ہو گئی۔

(سیرت ابن ہشام ج ۲، ص ۲۳۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام بیہقی نے زہری، محمد بن یحییٰ بن حبان، عاصم بن عمر بن قتادہ، اور عبد اللہ بن ابی بکر وغیرہم سے غزوہ بدر کے متعلق ایب

طویل حدیث روایت کی ہے اس میں بدر کے میدان میں رسول اللہ ﷺ کی قیام گاہ کے متعلق بیان کیا ہے:

قریش نے وادی بدر کے آخری کنارے میں پڑاؤ ڈالا اور بدر کے سارے کنوئیں مدینہ کی طرف سے ابتدائی کنارے کے ریتلے میدان کے وسط میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی جس سے ریت بیٹھ گئی اور اس جگہ چلنا آسان ہو گیا اور جس جانب کفار قریش تھے وہاں سخت کیچڑ ہو گئی اور وہاں چلنا دو بھر ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ سرعت سے روانہ ہوئے اور کفار قریش پر سبقت کر کے نزدیک ترین پانی کے کنوئیں پر پہنچ گئے۔ حضرت حباب بن منذر نے کہا یا رسول اللہ! کیا اللہ نے وحی کے ذریعہ آپ کو اس جگہ قیام کرنے کا حکم دیا ہے کہ ہم اس جگہ سے سرمو تجاوز نہ کر سکیں یا آپ نے جنگ کی حکمت عملی کی وجہ سے اس جگہ کو منتخب فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا یہ صرف جنگ کی حکمت عملی ہے۔ حضرت حباب نے کہا یا رسول اللہ! تب یہاں سے اٹھئے اور ایسی جگہ قیام کیجئے کہ بدر کے تمام کنوئیں ہماری پشت پر ہوں، پھر ایک کنوئیں کے سوا باقی تمام کنوئیں بند کر دیجئے۔ اور زمین کھود کر ایک حوض بنو دیجئے اور اس میں سارا پانی جمع کر لیں تاکہ اس حوض پر ہمارا قبضہ ہو، ہم جب چاہیں وہاں سے پانی حاصل کر لیں اور قریش کو ایک گھونٹ بھی پانی نہ مل سکے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس جنگ کا فیصلہ فرمادے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس رائے کو پسند فرمایا۔ (دلائل النبوة، ج ۳، ص ۳۵-۳۱، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

بدر کے دن بارش کے نزول میں اللہ کی نعمتیں

کفار قریش نے پہلے پہنچ کا پانی پر قبضہ کر لیا تھا، مسلمان خوف زدہ اور پیاسے تھے اور بعض جنبی تھے، انہیں پینے کے لیے پانی میسر تھا نہ غسل کے لیے، علاوہ ازیں ریت میں ان کے پاؤں دھنس رہے تھے اور ہوا سے ریت اڑ رہی تھی، اور شیطان ان کے دلوں میں وسوسے ڈال رہا تھا کہ اگر یہ دین سچا ہوتا تو تم اس مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے، پھر اللہ تعالیٰ نے بارش نازل فرمائی اور اس میں اللہ تعالیٰ کی بہت نعمتیں ہیں۔ ان میں سے بعض کی تفصیل یہ ہے:

۱- ان کی پیاس بجھ گئی اور انہوں نے غسل کر لیا کیونکہ روایت ہے کہ انہوں نے زمین کو کھود کر ایک حوض بنا لیا تھا جس میں انہوں نے بارش کا پانی اکٹھا کر لیا۔

۲- اللہ تعالیٰ تم سے شیطان کی نجاست دور کرے، اس سے یہ مراد ہے کہ اس بارش کے ذریعہ انہوں نے غسل کر لیا اور ان سے نجاست دور ہو گئی، نیز اس سے شیطان کا ڈالا ہوا یہ وسوسہ باطل ہو گیا کہ اگر تم دین حق پر ہوتے تو اس طرح پیاسے اور جنبی نہ رہتے۔

بقیہ چار نعمتوں کی تفصیل

اس کے بعد فرمایا تاکہ تمہارے دلوں کو ڈھارس بندھائے۔ یہ تیسری نعمت اور امداد کا بیان ہے، کیونکہ بارش نازل ہونے کی وجہ سے ان کے دل مضبوط ہو گئے اور گھبراہٹ اور خوف ان سے دور ہو گیا۔ لغت میں ربط کا معنی باندھنا ہے اور مراد یہ ہے کہ ان کے دلوں کو باندھ دیا تاکہ اس میں خوف و گھبراہٹ نہ داخل ہو سکے۔

پھر فرمایا اور تمہارے قدموں کو جمادے، یہ چوتھی نعمت اور امداد کا بیان ہے، کیونکہ ریت میں مسلمانوں کے پاؤں دھنس رہے تھے اور ان کو چلنے میں مشکل اور دشواری تھی، اور بارش ہونے کے بعد ریت بیٹھ گئی اور وہ قدم جما کر چلنے لگے، اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کے دل مضبوط کر دیے تو وہ جنگ میں ثابت قدم ہو گئے۔ کیونکہ اگر ان کے دل کمزور ہوتے تو یہ خدشہ رہتا کہ وہ جنگ کی شدت سے گھبرا کر بھاگ جائیں گے، اور اس نعمت اور امداد کی تیسری تفسیر یہ ہے کہ مسلمان وادی بدر کی جس جانب تھے وہاں ریتلی زمین تھی اور کفار قریش جس جانب تھے وہاں دھول اور مٹی تھی، اور بارش ہونے

سے ریت بیٹھ گئی اور مسلمانوں کے لیے آسانی ہو گئی اور جہاں دھول اور مٹی تھی وہاں بارش کی وجہ سے کچھڑ ہو گئی اور ان کا چلنا دو بھر ہو گیا تو اس بارش نے جہاں مسلمانوں کے لیے آسانی کی، وہاں کفار کے لیے مشکل اور دشواری کی اور دشمن کی مصیبت بھی انسان کے لیے نعمت ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرمایا جب آپ کا رب فرشتوں کی طرف وحی فرما رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، یہ نعمت اور امداد کی پانچویں قسم ہے۔ اس نعمت کی دو تفسیریں ہیں ایک یہ کہ جب فرشتے مسلمانوں کی مدد کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ وہ ان کے یعنی فرشتوں کے ساتھ ہے، اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی طرف وحی کی کہ مسلمانوں کی مدد کرو اور ان کو ثابت قدم رکھو۔ اور فرشتوں کے ثابت قدم رکھنے کا یہ معنی ہے کہ فرشتوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر دی کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی مدد فرمائے گا اور رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو یہ خبر دی اور اس سے مسلمانوں کے دل مطمئن ہو گئے اور وہ اس جنگ میں ثابت قدم رہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں عنقریب ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا، اور یہ نعمت اور امداد کی چھٹی قسم ہے، کیونکہ انسان کے جسم کا امیر اس کا دل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں کو قوی کر دیا اور ان کے دلوں سے کفار کے خوف کو زائل کر دیا اور پھر کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔

اس کے بعد فرمایا سو تم کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ اس آیت کی دو تفسیریں ہیں۔ ایک تفسیر یہ ہے کہ یہ حکم فرشتوں کو ہے اور اس جملہ سے متصل ہے کہ تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو، اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ حکم مومنوں کو ہے۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ یہی تفسیر زیادہ صحیح ہے کیونکہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فرشتوں کو قتال اور جہاد کے لیے نہیں نازل کیا گیا تھا۔ ان کے ہر جوڑ پر وار کرو یعنی ان کے ہاتھوں اور پیروں کو کاٹ ڈالو۔ اس کی بھی دو تفسیریں ہیں ایک تفسیر یہ ہے کہ جس طرح بھی چاہو ان کو مار ڈالو، کیونکہ گردن کے اوپر سر ہے اور سر اشرف الاعضاء ہے اور جوڑ اضعف الاعضاء ہیں پس یہاں اشرف اور اضعف کا ذکر کر کے متنبہ کیا ہے کہ ان کو جس طرح چاہو قتل کر دو۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یا تو ان کو قتل کر دو یا پھر ان کی انگلیوں اور ان کے ہاتھوں کو کاٹ ڈالو تاکہ یہ تم پر حملہ کرنے کے قابل نہ رہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے تو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے O یہ ہے (تمہاری سزا) سو اس کو چکھو اور بے شک کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔ (الانفال: ۱۳-۱۴)

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ان نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا جو براہ راست اور بلا واسطہ نعمتیں ہیں اور ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر کی ہوئی ان نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے جو بالواسطہ نعمتیں ہیں، کیونکہ کسی جماعت کے مخالفین پر عذاب بھی اس جماعت کے حق میں نعمت ہوتا ہے۔

اس آیت میں فرمایا ہے: انہوں نے اللہ سے شقاق کیا۔ شقاق کا معنی ہے ایک شخص ایک شق (جانب) پر ہو اور دوسرا شخص دوسری شق پر ہو اور اللہ تعالیٰ کے لیے یہ متصور نہیں ہے کہ وہ کسی ایک شق پر ہو یا کسی ایک جانب ہو، اس لیے اس آیت کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اولیاء سے شقاق کیا کہ وہ ایک جانب دین اسلام پر تھے اور وہ دوسری جانب کفر پر تھے۔

پہلی آیت میں فرمایا تھا جو اللہ اور اس کے رسول سے شقاق (تنازع) کرے تو بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے اور اس

دوسری آیت میں اس عذاب کی صفت بیان کی ہے کہ وہ عذاب معجل (فوری) بھی ہے اور موجل (اخروی) بھی ہے۔ معجل عذاب کو ذالکم سے بیان فرمایا یعنی: یہ ہے (تمہاری سزا) یہ اشارہ دنیاوی سزا کی طرف ہے، اس میں سزا کا فرما رہے گئے تھے اور سزا کا فروع کو قید کر لیا گیا تھا۔

اور فرمایا ہے چکھو، اس میں اس عذاب کو کھانے پینے کی اشیاء سے تشبیہ دی گئی ہے، یعنی جس طرح کھانے پینے کی چیزیں لذیذ اور نفس کو مرغوب ہوتی ہیں تو یہ عذاب بھی حکماً تمہارے لیے مرغوب ہے، کیونکہ تمہیں بارہا بتایا گیا کہ تم جو کفر اور شرک کر رہے ہو یہ عذاب کا باعث ہے اس کے باوجود تم کفر اور شرک سے چٹنے رہے سو تمہیں کفر اور شرک مرغوب تھا اور وہ عذاب کو مستلزم ہے تو عذاب بھی تمہیں حکماً مرغوب ہو گا، سواب تم اپنی مرغوب چیز کو چکھو۔

رسول اللہ ﷺ کا مقتولین بدر سے خطاب فرمانا اور سماع موتی کی بحث

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مقتولین بدر کو تین دن تک پڑے رہنے دیا، پھر آپ ان کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور ان کو پکار کر فرمایا اے ابو جہل بن ہشام! اے امیہ بن خلف! اے عتبہ بن ربیعہ! اے شیبہ بن ربیعہ! کیا تم نے اپنے رب کے کیے ہوئے وعدہ کو سچا پایا، بے شک میرے رب نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا میں نے اس کو سچا پایا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو سن کر عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ کیسے سنیں گے اور کس طرح جواب دیں گے حالانکہ یہ مردہ اجسام ہیں، آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے! میں جو کچھ ان سے کہہ رہا ہوں اس کو تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، لیکن یہ جواب دینے پر قادر نہیں ہیں، پھر آپ کے حکم سے ان کی لاشوں کو گھسیٹ کر بدر کے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ (صحیح مسلم مفتہ الجنتہ ۷۷ (۲۸۷۳) ۷۰۹۰)

علامہ ابو العباس احمد بن عمر القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

چونکہ عادتاً مردوں سے کلام نہیں کیا جاتا تھا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مردوں سے کلام کرنے کو مستبعد جانا اور نبی ﷺ نے اس کا یہ جواب دیا کہ وہ زندوں کی طرح آپ کے کلام کو سن رہے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے سننے کی یہ صفت دائمی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی یہ صفت بعض اوقات میں ہو۔ (المعجم ج ۷، ص ۱۵۱، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابی مالکی متوفی ۸۲۸ھ نے قاضی عیاض مالکی سے اس حدیث کی یہ شرح نقل کی ہے:

جس طرح عذاب قبر اور قبر کے سوال و جواب کی احادیث سے مردوں کا سننا ثابت ہے اس طرح ان کا سننا بھی ثابت ہے، اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے ان کے جسم یا جسم کے کسی جز کی طرف روح کو لوٹا دیا جائے، علامہ ابی مالکی فرماتے ہیں جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ بغیر روح کے لوٹائے ہوئے جسم سن لیتا ہے، اس کا یہ دعویٰ بد اہت کے خلاف ہے۔ اور شاید جو لوگ سماع موتی کے منکر ہیں ان کی یہی مراد ہو کہ روح کو لوٹائے بغیر جسم نہیں سن سکتا اور جو اس کے قائل ہیں وہ اعادہ روح کے ساتھ سماع کے قائل ہیں اور اس صورت میں یہ اختلاف اٹھ جاتا ہے۔

(اکمال اکمال المعلم ج ۷، ص ۳۲۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ محمد بن محمد بن یوسف السنوسی الحسینی المتوفی ۸۹۵ھ لکھتے ہیں:

اگر علامہ ابی کی روح سے مراد حیات ہے تو پھر تو واضح ہے کہ بغیر حیات کے جسم کے سننے کا دعویٰ کرنا بد اہت کے خلاف ہے اور اگر روح سے وہ متعارف معنی مراد ہے جس کا جسم میں حلول ہوتا ہے اور جس کے نکلنے سے جسم مردہ ہو جاتا ہے اور جسم میں اس کے حلول کی وجہ سے جسم عادتاً زندہ ہوتا ہے تو پھر یہ لازم نہیں ہے کہ اگر روح کو جسم میں نہ لوٹایا جائے، تو جسم نہ سن

سکے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم میں روح کو لوٹائے بغیر اس میں حیات پیدا کر دے اور سماعت کا اور اک پیدا کر دے۔

(اکمال اکمال المعلم ج ۷، ص ۳۲۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

علامہ مازری نے کہا اس حدیث سے بعض لوگوں نے سماع موتی (مردوں کے سننے) پر استدلال کیا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ اس حدیث سے عام حکم ثابت نہیں ہوتا یہ صرف مقتولین بدر کے ساتھ خاص ہے، قاضی عیاض مالکی نے ان کا رد کرتے ہوئے لکھا جن احادیث سے عذاب قبر اور قبر میں سوالات اور جوابات ثابت ہیں اور ان سے سماع موتی ثابت ہوتا ہے اور ان کی کوئی تاویل نہیں ہو سکتی، اسی طرح اس حدیث سے بھی سماع موتی ثابت ہے دونوں کا ایک محمل ہے، اور یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا ہو یا ان کے جسم کے کسی ایک عضو میں حیات پیدا کر دی ہو اور جس وقت اللہ ان میں سماعت پیدا کرنا چاہے وہ سن لیتے ہوں، یہ قاضی عیاض کا کلام ہے اور یہی مختار ہے اور جن احادیث میں اصحاب قبور کو سلام کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان کا بھی یہی تقاضا ہے۔ (صحیح مسلم بشرح النووی ج ۱۱، ص ۷۰۹، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ موت عدم محض اور فناء صرف نہیں ہے بلکہ موت روح کے بدن سے منقطع ہونے اور اس کی بدن سے مفارقت کا نام ہے اور وہ ایک حال سے دوسرے حال میں اور ایک دار سے دوسرے دار میں منتقل ہوتا ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ مردہ اپنے اصحاب کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے۔

(الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۳۳۸، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابو عبد اللہ قرطبی نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ کو جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے اصحاب پیٹھ موڑ کر چلے جاتے ہیں تو مردہ ان کی جوتیوں کے چلنے کی آواز سنتا ہے، پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اس کے بعد قبر میں سوال و جواب کا ذکر ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۳۸، ۱۳۷۴، صحیح مسلم کتاب الجنۃ: ۷۱، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۲۰۴۸)

سماع موتی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے انکار کی توجیہ

عروہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے ذکر کیا گیا کہ حضرت ابن عمر بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے: مردہ کے گھروالوں کے رونے سے مردہ کو عذاب ہوتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا تھا کہ مردہ کو اس کے گناہوں کی وجہ سے عذاب ہو رہا ہے اور اس کے گھروالے اس پر رو رہے ہیں، اور یہ ایسا ہی ہے کہ جب جنگ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ بدر کے کنویں پر کھڑے ہوئے اور اس میں مشرکین میں سے مقتولین بدر پڑے ہوئے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا جو فرمانا تھا، حضرت عمر نے روایت کیا یہ میرا کلام سن رہے ہیں اور وہ بھول گئے۔ آپ نے فرمایا تھا ان کو علم ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ برحق ہے۔ پھر حضرت عائشہ نے یہ آیت پڑھی:

إِنَّكَ لَا تَسْمِعُ الْمَوْتَى (النمل: ۸۰)

بے شک آپ مردوں کو نہیں سنا تے۔

اور آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں۔ (صحیح مسلم الجنازہ ۲۶۶ (۹۳۲) ۲۱۲۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۱۲۹، سنن النسائی، رقم الحدیث: ۲۰۷۶)

علامہ ابو العباس احمد بن عمر القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جن آیتوں سے استدلال کیا ہے ان سے مراد کفار ہیں گویا کہ وہ اپنی قبروں میں مردہ ہیں اور ان آیتوں میں سنانے سے مراد ان کا نبی ﷺ کے ارشاد کو سمجھنا اور آپ کے پیغام کو قبول کرنا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ وَلَوْ
أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُعْرِضُونَ
(الانفال: ۲۳) دیتا تب بھی وہ اعراض کرتے ہوئے ضرور پیٹھ پھیرتے۔
اور اگر (بالفرض) اللہ ان میں کوئی بھلائی جانتا تو انہیں
(آپ کا پیغام) ضرور سنا دیتا اور اگر (بالفرض) اللہ انہیں سنا بھی

اور یہ اس طرح ہے جیسے ان کے حواس خمسہ سلامت ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرا، گونا گونا گونا اور اندھا فرمایا، کیونکہ سننے، بولنے اور دیکھنے کی جو غرض و غایت اور اس کے تقاضے ہیں وہ ان کو پورا نہیں کرتے تھے، اور ان آیتوں کا معنی یہ ہے کہ آپ ان کو اپنا پیغام نہیں سنا تے جو اس پیغام کو فہم و تدبر سے نہیں سنتے اور نہ اس پیغام کو قبول کرتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر ہم مان بھی لیں کہ ان آیتوں میں حقیقتاً مردے مراد ہیں تب بھی ان آیات کا ان احادیث سے کوئی تعارض نہیں ہے جن سے مردوں کا سنا ثابت ہے، کیونکہ اگر ان آیتوں سے بالعموم مردوں کے سننے کی نفی مراد ہو تب بھی عام میں تخصیص جائز ہے اور مخصوص وہ احادیث ہیں جن سے مردوں کا سنا ثابت ہے اور ان سے یہ ثابت ہو گیا کہ کسی وقت اور کسی حال میں مردے سن لیتے ہیں۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے میں نے جو کچھ ان (مقتولین بدر) سے کہا اس کو تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۷۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸۷۵) اور اس کی مثل وہ حدیث ہے جس میں آپ نے فرمایا مردہ جوتیوں کی آواز سنتا ہے۔ (مسند احمد ج ۲، ص ۳۳۷) اور آپ نے حضرت عمر سے فرمایا تم میرے کلام کو ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۷۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۹۳۲، المغنم ج ۲، ص ۵۸۶، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۷ھ) حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مردوں کے سننے کا انکار کرتی ہیں اور ان کے علم اور جاننے کا اعتراف اور اقرار کرتی ہیں، امام بیہقی نے فرمایا علم سماعت کے منافی نہیں ہے اور آیت کریمہ: آپ مردوں کو نہیں سنا تے (النمل، ۴۰) کا جواب یہ ہے کہ آپ مردوں کو بہ حیثیت مردہ نہیں سنا تے لیکن اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور وہ سن لیتے ہیں، جیسا کہ قتادہ نے بیان کیا ہے، اور مقتولین بدر کے سننے کی حدیث صرف حضرت عمر نے روایت نہیں کی اور نہ اس روایت میں حضرت ابن عمر منفرد ہیں بلکہ اس حدیث کو حضرت ابو طلحہ نے بھی روایت کیا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۷۶، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۸۷۵) اور اس کی مثل حدیث کو امام طبرانی نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا یہ سنتے ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ اسی طرح سنتے ہیں جس طرح تم سنتے ہو لیکن وہ جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔ حافظ عسقلانی نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بدر کے کنویں پر کھڑے ہوئے اور فرمایا اے کنویں والو! کیا تم نے اس وعدہ کو سچا پایا جو تم سے تمہارے رب نے کیا تھا، کیونکہ میں نے اس وعدہ کو سچا پایا جو مجھ سے میرے رب نے کیا تھا۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا یہ سن رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ اسی طرح سن رہے ہیں جس طرح تم سن رہے ہو لیکن یہ آج جواب نہیں دے سکتے!

(المعجم الكبير ج ۱۰، رقم الحديث: ۱۰۳۲۰، کتاب السنہ، رقم الحديث: ۸۸۴، نیز امام ابن اسحاق نے اس حدیث کو حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ السیرة النبویہ، ج ۲، ص ۲۵۰)

اور نہایت عجیب بات یہ ہے کہ امام ابن اسحاق نے مغازی میں یونس بن بکر کی سند جید کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی حضرت ابو طلحہ کی حدیث کی مثل کو روایت کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کو تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔ (السیرة النبویہ، ج ۲، ص ۲۵۰)

اس حدیث کو امام احمد نے بھی سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے: امام احمد عروہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمایا رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ مقتولین بدر کو کنویں میں پھینک دیا جائے۔ امیہ بن خلف کے علاوہ سب کو پھینک دیا گیا کیونکہ وہ اپنی زرہ میں پھول چکا تھا۔ جب ان کو کنویں میں ڈال دیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا اے کنویں والو! کیا تم نے اپنے رب کے اس وعدہ کو سچا پایا جو اس نے تم سے کیا تھا؟ کیونکہ میں نے اس وعدہ کو سچا پایا جو مجھ سے میرے رب نے کیا تھا، آپ کے اصحاب نے کہا یا رسول اللہ! کیا آپ مردوں سے باتیں کر رہے ہیں؟ آپ نے ان سے فرمایا انہوں نے جان لیا ہے کہ میں نے ان سے جو وعدہ کیا تھا وہ برحق ہے، اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے سن لیا۔ میں نے ان سے جو کہا تھا وہ برحق تھا اور رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا انہوں نے جان لیا۔ (مسند احمد ج ۱۸، رقم الحديث: ۴۶۳۹، طبع قاہرہ، مسند احمد ج ۶، ص ۲۷۶، طبع قدیم، دار الفکر) حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے کہ حضرت عائشہ نے یہ روایت کیا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، ہم کو مسند احمد میں یہ الفاظ نہیں ملے۔ البتہ امام ابن اسحاق کی روایت میں یہ الفاظ ہیں، بہر حال حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: اگر امام احمد کی یہ روایت (یا امام ابن اسحاق کی یہ روایت) محفوظ ہو تو اس کا معنی یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے اپنے سابق انکار سے رجوع فرمایا، کیونکہ ان کے نزدیک دیگر صحابہ کی روایت سے یہ امر ثابت ہو گیا تھا جو اس موقع پر حاضر تھے اور حضرت عائشہ اس موقع پر حاضر نہیں تھیں۔ امام اسماعیلی نے یہ کہا ہے کہ ہر چند کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فہم اور ذکاوت اور کثرت روایت اور بحر علم میں غواص ہونے کے لحاظ سے تمام صحابہ پر فائق ہیں لیکن ثقہ اور معتمد صحابہ کی روایت کو اسی وقت مسترد کیا جاسکتا ہے جبکہ اس کا مثل ثقہ روایت میں اس کے منسوخ یا مخصوص یا محال ہونے کی تصریح ہو۔ اور یہ کیوں کر ہو سکتا ہے جبکہ جس چیز کا حضرت عائشہ نے انکار کیا ہے اور جس چیز کو دوسرے صحابہ نے ثابت کیا ہے ان کو جمع کرنا ممکن ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے: "انک لا تسمع الموتی" (النمل: ۸۰) "آپ مردوں کو نہیں سنا تے" یہ اس کے منافی نہیں ہے کہ وہ اس وقت سن رہے تھے۔ کیونکہ اسماع کا معنی ہے سنانے والے کی آواز کو سامع تک پہنچانا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کو سنایا تھا بایں طور کہ اپنے نبی ﷺ کی آواز ان تک پہنچائی۔ رہا حضرت عائشہ کا یہ فرمانا کہ نبی ﷺ نے فرمایا تھا وہ اب جان رہے ہیں یا ان کو اب علم ہو رہا ہے، تو اگر حضرت عائشہ نے نبی ﷺ سے خود یہ الفاظ سنے تھے تو یہ دیگر صحابہ کی اس روایت کے منافی نہیں ہے کہ وہ اب سن رہے ہیں بلکہ اس کی موید ہے، علامہ سیبلی نے جو اس مقام پر بحث کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث خرق عادت (معجزہ) پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ صحابہ نے کہا کیا آپ مردوں سے کلام کر رہے ہیں تو آپ نے جواب دیا جو صحابہ کی روایت کے مطابق وہ اب سن رہے ہیں اور حضرت عائشہ کی روایت کے مطابق ان کو اب علم ہو رہا ہے، اور جب مردہ ہونے کی حالت میں ان کا عالم ہونا جائز ہے تو اس حال میں ان کا سامع ہونا بھی جائز ہے۔ اور یہ سماعت یا ان کے سر کے کانوں سے تھی یا ان کے دل کے کانوں سے تھی۔ اور دیگر صحابہ کی روایت کو حضرت عائشہ کی روایت پر اس لیے ترجیح ہے کہ وہ اس موقع پر حاضر تھے اور حضرت عائشہ اس موقع پر

موجود نہ تھیں، حضرت عائشہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے ”ما انت بمسمع من فی القبور“ (فاطر: ۲۲) ”آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں۔“ اور یہ آیت اس آیت کی مثل ہے افانت تسمع الصم او تہدی العمی (الزخرف: ۴) ”تو کیا آپ بہروں کو سنائیں گے اور اندھوں کو ہدایت دیں گے۔“ یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیتا ہے اور وہی توفیق دیتا ہے اور وہی دلوں کے کانوں تک نصیحت پہنچاتا ہے نہ کہ آپ اور مردوں اور بہروں کے ساتھ تشبیہ دینے کے لیے کفار کو مردہ اور بہرہ فرمایا، پس حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی سنانا ہے جب وہ چاہتا ہے اور حقیقت میں نہ اس کا نبی سنا سکتا ہے نہ کوئی اور، پس اس آیت سے حضرت عائشہ کے استدلال کا دو وجوہ سے کوئی تعلق نہ رہا۔ اول یہ کہ یہ آیت کفار کو اہل ایمان کی دعوت دینے کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے اور ثانی یہ کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے اس چیز کی نفی کی ہے کہ حقیقت میں وہ سنانے والے نہیں ہیں بلکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی سنانے والا ہے۔ اور اللہ نے صحیح فرمایا ہے وہی جب چاہتا ہے ان کو سنانا ہے اور وہ جو چاہے کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

(الروضۃ الانف، ج ۲، ص ۷۴، مطبوعہ ملتان، فتح الباری، ج ۷، ص ۳۰۳-۳۰۴، مطبوعہ لاہور، ۱۳۰۱ھ)

حافظ بدر الدین محمود بن احمد یعنی حنفی متونی ۸۵۵ھ اس سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت عائشہ نے یہ آیات اپنے موقف میں تلاوت کیں، ان آیات کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ان آیات میں سماع کے پیدا کرنے کی نفی کی گئی اور سماع کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے رسول اللہ ﷺ پیدا نہیں کرتے، بدر کے کنوئیں میں اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر کے رسول اللہ ﷺ کا کلام سنا دیا، یہ تفسیر قارہ نے بیان کی ہے اور علامہ سہیلی نے یہ کہا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس موقع پر حاضر نہیں تھیں، رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ ”تم میری بات کو ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو۔“ تو اس موقع پر انہی کی روایت معتبر ہے جنہوں نے یہ الفاظ سنے تھے، اور جب اس حالت میں ان کا جاننا ممکن ہے تو ان کا سنا بھی ممکن ہے، یا تو ان کفار نے حضور ﷺ کے ارشاد کو اپنے سر کے کانوں سے سنا تھا اور یہ اس وقت ہے جب فرشتوں کے سوال کے وقت ان کی روحیں ان کے جسموں میں لوٹادی گئی تھیں جیسا کہ اکثر اہل سنت کا قول ہے۔ یا انہوں نے دل اور روح کے کانوں سے سنا جیسا کہ ان لوگوں کا مذہب ہے کہ سوال صرف روح کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور روح کو جسم میں لوٹایا نہیں جاتا۔

(عمدة القاری ج ۱، ص ۹۳، مطبوعہ ادارۃ البعۃ المینریہ، مصر، ۱۳۳۸ھ)

ملا علی سلطان بن القاری متونی ۱۰۴۱ھ اس بحث میں لکھتے ہیں:

علامہ ابن ہمام نے شرح الہدایہ میں یہ تصریح کی ہے کہ اکثر مشائخ حنفیہ کا یہ موقف ہے کہ مردہ سنتا نہیں ہے کیونکہ انہوں نے کتاب الایمان میں یہ تصریح کی ہے کہ اگر کسی شخص نے یہ قسم کھائی کہ وہ کسی سے کلام نہیں کرے گا، پھر اس نے کسی مردہ سے کلام کیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی کیونکہ اس کی قسم اس شخص کے متعلق تھی جو سوچ سمجھ کر اس کی بات کا جواب دے اور مردہ اس طرح نہیں ہے۔ (ملا علی قاری فرماتے ہیں) یہ جزیہ اس قاعدہ پر متفرع ہے کہ قسم کی بنا عرف پر ہوتی ہے اور مردہ سے بات کرنے کو عرف میں کلام نہیں کہتے اور اس سے حقیقت میں مردہ کے سننے کی نفی نہیں ہوتی، جس طرح فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ وہ گوشت نہیں کھائے گا تو مچھلی کھانے سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو گوشت فرمایا ہے:

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لَنَا كُلَّوَامِنَهُ لِحِمًّا
طَرِيًّا (النحل: ۱۴)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ۔

حضرت عمر کی اس حدیث کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ نبی ﷺ یہ کس طرح فرما سکتے ہیں کہ تم میرے کلام کو ان (مقتولین بدر) سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، جبکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: آپ مردوں کو نہیں سنا تے۔ (النمل: ۸۰) اور فرمایا ہے: آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں۔ (فاطر: ۲۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے، اس کو مسترد کرنا صحیح نہیں ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ اس حدیث اور قرآن مجید کی آیتوں میں کوئی تعارض بھی نہیں ہے کیونکہ مردوں سے مراد قرآن مجید میں کفار ہیں، اور نفی کا حاصل یہ ہے کہ آپ ان کفار کو میرا پیغام سنا کر کوئی نفع نہیں پہنچا سکتے، اور اس آیت میں مطلقاً سنانے کی نفی نہیں کی گئی ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

صَمٌّ بَكْمٌ عُمَىٰ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ

وہ بہرے گونگے اندھے ہیں پس وہ عقل سے کام نہیں لیں

(البقرہ: ۱۷۱) گے۔

ان کو بہرا، گونگا اور اندھا اس لیے فرمایا کہ وہ کان، زبان اور آنکھوں سے نفع نہیں اٹھاتے تھے۔ اور دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ ان کافروں کو ایسا پیغام نہیں سنا سکتے جس سے وہ آپ کے پیغام کو تسلیم اور قبول کر لیں، علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ یہ آیت اور اس کی مثل دوسری آیتوں کا محمل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے حواس کو حق بات سننے اور حق کو دیکھنے سے روک لیا تھا، بیشک اللہ جس کو چاہے سنا ہے اور اس میں ہدایت پیدا کرتا ہے تاکہ وہ اللہ کی آیات میں فہم سے کام لے اور نصیحت حاصل کرے۔ دوسری آیت: آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں۔ (فاطر: ۲۲) سو اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ کفر پر اصرار کرتے تھے۔ ان کو اس آیت میں مردوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور ان کے ایمان لانے سے مایوس کرنے میں مبالغہ کیا گیا ہے۔ اور اس آیت کی نظیر یہ آیت ہے:

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ (القصص: ۵۶)

بے شک آپ اس کو ہدایت یافتہ نہیں بناتے جس کا ہدایت

یافتہ ہونا آپ کو پسند ہو لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت یافتہ بنا

دیتا ہے۔

پھر انہوں نے یہ جواب دیا کہ مقتولین بدر کو اپنا کلام سنانا، رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت اور آپ کا معجزہ تھی۔ اور کفار کو زیادہ حسرت زدہ کرنا تھا، میں کہتا ہوں کہ یہ قنادہ کا قول ہے اور یہ جواب اور یہ قول مردود ہے کیونکہ خصوصیت بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتی اور وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ بلکہ صحابہ کا سوال کرنا اور آپ کا جواب دینا خصوصیت کے منافی ہے اور منکرین سماع موتی پر اس حدیث سے اشکال ہو گا کہ جب لوگ مردہ کو دفن کر کے واپس چلے جاتے ہیں تو وہ ان کی جوتیوں سے چلنے کی آواز سنتا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۳۷۴، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۹۳۲)

اور اگر اس کا یہ جواب دیا جائے کہ یہ حدیث دفن کے بعد اول وقت تک کے ساتھ مخصوص ہے تاکہ مردہ منکر نکیر کے سوال کا جواب دے سکے تو یہ جواب اس حدیث سے مردود ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قبرستان میں گئے اور فرمایا السلام علیکم دار قوم مؤمنین۔

(صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۴۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۳۰۴، مرقاة المفاتیح، ج ۸، ص ۱۱، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں جو یہ حدیث ہے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تم اس کو ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو ہر چند کہ اس حدیث کی سند صحیح ہے لیکن یہ معنی کے اعتبار سے معلول ہے اور اس میں ایک ایسی علت ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ نبی

میں سے ثابت نہ ہو اور وہ علت یہ ہے کہ یہ حدیث قرآن مجید کے مخالف ہے۔

(رد المحتار، ج ۳، ص ۱۳۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۰۷ھ)

علامہ شامی کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ حدیث قرآن مجید کے مخالف ہے۔ ہم علامہ قرطبی، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ سیبلی، علامہ محمود بن احمد عینی اور ملا قاری کی وہ توجیہات نقل کر چکے ہیں جن میں انہوں نے اس حدیث اور قرآن مجید کی آیات میں تطبیق دی ہے، اور ہم قبر والے پر سلام پڑھنے کی حدیث بھی باحوالہ بیان کر چکے ہیں اور انشاء اللہ اس حدیث کو مزید حوالہ جات اور دیگر احادیث کو بھی بحث کے آخر میں بیان کریں گے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۳۰ھ اس بحث میں فرماتے ہیں:

عرض: ام المؤمنین صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا انکار سماع موتی سے رجوع ثابت ہے یا نہیں؟

ارشاد: نہیں، وہ جو فرما رہی ہیں حق فرما رہی ہیں۔ وہ مردوں کے سننے کا انکار فرماتی ہیں، مردے کون ہیں، جسم، روح مردہ نہیں، اور بے شک جسم نہیں سنتا، سنتی روح ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جب ام المؤمنین کے حضور میں سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کی گئی کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا "ما انتم باسمع منہم" تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں۔ ام المؤمنین نے فرمایا اللہ رحم فرمائے امیر المؤمنین پر حضور ﷺ نے یہ نہیں ارشاد فرمایا بلکہ فرمایا "انہم ليعلمون" بے شک وہ جانتے ہیں، امیر المؤمنین کو سہوا، انہوں نے فرمایا "ما انتم باسمع منہم" تو خود ام المؤمنین رضی اللہ عنہا مردوں کے علم کا اقرار فرماتی ہیں: سماع سے بے شک انکار فرماتی ہیں، اور وہ بھی اس کے ان معنوں سے جو عرف میں شائع ہیں، سماع کے عرفی معنی ان آلات کے ذریعہ سے سنتا، یہ یقیناً بعد مرنے کے روح کے لیے نہیں، روح کو جسم مثالی دیا جاتا ہے اس جسم کے کانوں سے سنتی ہے۔ پھر ام المؤمنین کا ان آیتوں سے استدلال اور بھی اس کو ظاہر کر رہا ہے۔ "انک لا تسمع الموتی" اور "وما انت بسمع من فی القبور" موتی کون ہیں؟ اجسام، قبور میں کون ہیں؟ وہی اجسام، تو پھر اجسام ہی کے سننے سے انکار ہوا۔ اور وہ یقیناً حق ہے۔ (پھر فرمایا) خود ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کا طرز عمل سماع موتی کو ثابت کر رہا ہے۔ فرماتی ہیں کہ: جب حضور اقدس ﷺ میرے حجرہ میں دفن ہوئے میں بغیر چادر اوڑھے بے حجابانہ حاضر ہوتی اور کہتی "انما ہوروحی" میرے شوہر ہی تو ہیں، پھر میرے باپ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دفن ہوئے، جب بھی میں بغیر احتیاط کے چلی جاتی اور کہتی "انما ہوروحی" اسی "میرے شوہر اور میرے باپ ہی تو ہیں، پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ دفن ہوئے تو میں نہایت احتیاط کے ساتھ چادر سے لپٹی ہوئی حاضر ہوتی، اس طرح کہ کوئی عضو کھلا نہ رہے، "حیاء من عمر" عمر رضی اللہ عنہ کی شرم سے۔ تو اگر ارواح کا سماع بھرنے مانتیں تو پھر "حیاء من عمر" کے کیا معنی؟ (پھر فرمایا) تین باتوں میں ام المؤمنین کا خلاف مشہور ہے اور ان تینوں میں غلط فہمی، ایک تو یہی سماع موتی کہ وہ سماع عرفی کا جسموں کے واسطے انکار فرماتی ہیں، اور اس کو غلط فہمی سے ارواح کے سماع حقیقی پر محمول کیا جاتا ہے۔ دوسرے معراج کے جسدی کے بارہ میں انکار مشہور ہے کہ ام المؤمنین فرماتی ہیں "ما فتت جسد رسول اللہ" جسد اقدس میرے پاس سے کہیں نہ گیا۔ حالانکہ آپ معراج منامی کے بارہ میں فرما رہی ہیں جو مدینہ منورہ میں ہوئی اور وہ معراج تو مکہ معظمہ میں ہوئی۔ اس وقت ام المؤمنین خدمت اقدس میں حاضر بھی نہ ہوئی تھیں بلکہ نکاح سے بھی مشرف نہ ہوئی تھیں اسے اس پر محمول کرنا سراسر غلطی ہے۔ تیسرے علم مانی اللہ کے بارہ میں ام المؤمنین کا قول ہے کہ جو یہ کہے کہ حضور کو علم مانی اللہ (یعنی آنے والی کل کا علم) تھا وہ جھوٹا ہے۔ اس سے مطلق علم کا انکار نکالنا محض جہالت ہے، علم بجا مطلق بولا جائے خصوصاً جبکہ غیب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مراد علم ذاتی ہوتا ہے۔ اس کی تشریح حاشیہ

کشاف پر میرید شریف رحمۃ اللہ علیہ نے کردی ہے اور یہ یقیناً حق ہے۔ کوئی شخص کسی مخلوق کے لیے ایک ذرہ کا بھی علم ذاتی مانے یقیناً کافر ہے۔ (الملفوظ ج ۳ ص ۲۸۲-۲۸۱۔ حامد اینڈ کمپنی لاہور) دیوبند کے مشہور محدث انور شاہ کشمیری متوفی ۱۳۵۲ھ لکھتے ہیں:

سمع موتی کا مسئلہ گزر چکا ہے اور رہا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: آپ ان کو سنانے والے نہیں ہیں جو قبروں میں ہیں۔ (فاطر: ۲۲) سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ قبر والوں کو ایسا پیغام نہیں سنا تے جس پر ان کا قبول کرنا مترتب ہو یا اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ان قبر والوں کو ہمارے اس جہان میں نہیں سنا تے اور ان قبر والوں کا سنا عالم برزخ میں ہے۔ اور وہ ہمارے جہان کے اعتبار سے معدوم ہے اور یا یہ آیت اس طرح ہے جس طرح فرمایا ہے وہ بہرے 'گوئگے' اندھے ہیں۔ (البقرہ: ۱۷۱) یعنی ان کو سننے کے باوجود بہرہ فرمایا۔ اسی طرح یہاں فرمایا کہ آپ ان بہروں کو نہیں سنا تے۔ علامہ سیوطی نے کہا وہ آپ کے پیغام کو کان لگا کر نہیں سنتے، اس کو قبول نہیں کرتے اور اس سے ہدایت حاصل نہیں کرتے اس لیے فرمایا آپ ان کو نہیں سنا تے گویا اس آیت میں کفار کو قبر والوں سے تشبیہ دی ہے۔ (فیض الباری ج ۳ ص ۹۰، مطبوعہ مجلس علمی ہند، ۱۳۵۷ھ)

شیخ انور شاہ کشمیری نے جس عبارت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے:

میں یہ کہتا ہوں کہ مردوں کے سننے کے متعلق احادیث حد تو اترا کو پہنچی ہوئی ہیں۔ امام ابو عمر (ابن عبد البر) نے سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب کوئی شخص مردہ کو سلام کرے تو وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے اور اگر دنیا میں اس کو پہچانتا تھا تو اس کو پہچان لیتا ہے، (یہ روایت بالمعنی ہے) حافظ ابن کثیر نے بھی اس حدیث کو سند کے ساتھ روایت کیا ہے، پس اس کے انکار کی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ ہمارے ائمہ رحمہم اللہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا، البتہ علامہ ابن الہمام نے یہ کہا ہے کہ سماع موتی میں اصل نفی ہے اور جن مواضع میں سماع ثابت ہے ان کا استثناء کیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ پھر اصل میں نفی کا عنوان قائم کرنے کا کیا فائدہ اور جب فی الجملہ سماع ثابت ہے تو پھر تخصیص کے ادعا کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں قرآن مجید میں فرمایا ہے۔ "انک لا تسمع الموتی" اور "ما انت بمسمع من فی القبور" اور ان آیتوں سے بظاہر مردوں کے مطلقاً سننے کی نفی ہوتی ہے، اس کا ایک جواب یہ ہے کہ قرآن مجید نے سنانے کی نفی کی ہے، سننے کی نفی نہیں کی اور ہماری بحث مردوں کے سننے میں ہے، اور علامہ سیوطی نے یہ جواب دیا ہے کہ وہ آپ کے پیغام کو کان لگا کر نہیں سنتے اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کا نفع نہیں حاصل کرتے، کیونکہ مردوں کا سماع سے فائدہ حاصل کرنا دنیاوی زندگی میں متصور ہے اور اب اس کا وقت گزر چکا ہے، اسی طرح یہ کفار ہر چند کہ زندہ ہیں لیکن آپ کا ان کو ہدایت دینا غیر مفید ہے کیونکہ یہ نفع نہ اٹھانے میں مردوں میں مثل ہیں۔ پس ان آیتوں سے مردوں کے سننے کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ سننے سے ان کے فائدہ اٹھانے کی نفی مقصود ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نفی سماع سے ماننے اور عمل کرنے کی نفی بھی مراد ہو سکتی ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ میں نے فلاں شخص کو کتنی مرتبہ نماز پڑھنے کے لیے کہا مگر وہ سنتا ہی نہیں۔ یعنی ماننا نہیں اور عمل نہیں کرتا، سو قبر میں مردے بھی سنتے نہیں اور عمل نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے زندہ کافروں کو مردوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ آپ کی بات مانیں گے نہیں اور اس پر عمل نہیں کریں گے، اگر تم یہ اعتراض کرو کہ جب مردوں کے لیے سنا ثابت ہے تو کیا وہ نفع بھی اٹھا سکتے ہیں تو میں کہوں گا کہ جو لوگ نیکی پر فوت ہوئے وہ سننے سے نفع بھی حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ العیاذ باللہ کفر پر فوت ہوئے تو ان کے لیے نفع کہاں؟ وہ لوگ صرف آواز سنتے ہیں، دوسرا جواب یہ ہے کہ ہم قبر میں جس سماع کے ثبوت کے درپے ہیں وہ عالم برزخ میں سماع ہے۔ اور قرآن مجید نے

مردوں کے جس سننے کی نفی کی ہے وہ ہمارے اس عالم کے اعتبار سے ہے۔

(فیض الباری، ج ۲، ص ۲۶۸-۲۶۷، ملخصاً، مطبوعہ ہند، ۱۳۵۷ھ)

سماع موٹی کے ثبوت میں بعض دیگر احادیث اور آثار

اس سے پہلے ہم صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے حوالوں سے یہ حدیث بیان کر چکے ہیں کہ نبی ﷺ نے مقتولین بدر کے متعلق صحابہ سے فرمایا (۱) تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، اور اس پر مفصل بحث و نظر کا بھی ذکر کیا اور صحیح بخاری، صحیح مسلم اور سنن نسائی کے حوالہ سے یہ حدیث بیان کی (۲) کہ دفن کے بعد قبر میں مردہ جوتیوں سے چلنے کی آواز سنتا ہے اور اس پر وارد ہونے والے اعتراض کا جواب دیا اور اس کی تائید میں صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ کے حوالوں سے یہ حدیث بیان کی (۳) کہ نبی ﷺ قبرستان گئے اور فرمایا السلام علیکم دار قوم مؤمنین اور ظاہر ہے کہ یہ سلام کرنا اسی وجہ سے تھا کہ قبر میں مردے سنتے ہیں۔ اب اس کی تائید میں ہم مزید احادیث پیش کر رہے ہیں:

(۴) امام ابو عمرو یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر مالکی اندلسی متوفی ۳۶۳ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھی اپنے کسی ایسے مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا تو وہ اس کو پہچان لیتا ہے، اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

(الاستذکار، ج ۲، ص ۱۶۵، رقم الحدیث: ۱۸۵۸، مطبوعہ موصیٰ الرساتہ، بیروت)

علامہ قرطبی اور علامہ مناوی وغیرہ نے لکھا ہے کہ امام ابن عبد البر نے اس حدیث کو التعمید میں بھی روایت کیا ہے لیکن ہم نے التعمید کے دو نسخوں اور فتح المالک میں اس حدیث کو تلاش کیا اس میں یہ حدیث نہیں ہے، امام عبد البر نے اس حدیث کو صرف الاستذکار میں روایت کیا ہے۔

امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے (احیاء العلوم، ج ۶، ص ۱۲۷) اور اس کے حاشیہ پر حافظ عراقی نے لکھا ہے کہ عبد الحق الاشیلی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، علامہ سید مرتضیٰ زبیدی متوفی ۱۲۰۵ھ نے اس حدیث کے متعلق لکھا ہے امام ابن ابی الدنیا نے اس حدیث کو کتاب القبور میں روایت کیا ہے، اور امام بیہقی نے شعب الایمان میں اس کو حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے (اتحاف السادة المتقين، ج ۱۰، ص ۳۶۶) علامہ زین الدین بن رجب حنبلی متوفی ۷۹۵ھ نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے۔ (احوال القبور، ص ۱۳۲، مطبوعہ دار الکتب العربی، ۱۳۱۳ھ) محمد ناصر الجبلی نے اس کا دار البرزخ میں ذکر کیا ہے۔

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

امام ابن عبد البر نے اس حدیث کو الاستذکار اور التعمید میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو ابو محمد عبد الحق نے صحیح قرار دیا ہے۔

حافظ شمس الدین ابو عبد اللہ بن قیم جوزیہ حنبلی متوفی ۷۵۱ھ لکھتے ہیں:

حافظ ابو محمد عبد الحق الاشیلی نے یہ عنوان قائم کیا کہ مردے زندوں کے متعلق سوال کرتے ہیں اور ان کے اقوال اور اعمال کو پہچانتے ہیں پھر کہا کہ امام ابن عبد البر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص بھی اپنے ایسے مسلمان بھائی کی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ پہچانتا ہو پس اس کو سلام کرے تو وہ اس کو پہچان لیتا ہے، اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر وہ اس کو نہ پہچانتا ہو اور سلام کرے، تب بھی وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ عنقریب ہم اس حدیث کو باحوالہ ذکر کریں گے۔ (الروح، ص ۱۰-۱۱، مطبوعہ دار الحدیث، قاہرہ، ۱۳۱۰ھ)

علامہ عبدالرؤف مناوی شافعی متوفی ۱۰۰۳ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن القیم نے کہا ہے کہ اس قسم کی احادیث اور آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص قبر والے کی زیارت کرتا ہے اور اس کو سلام کرتا ہے تو وہ اس کے سلام کو سنتا ہے اور اس سے مانوس ہوتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے اور یہ حکم شہداء اور غیر شہداء دونوں کے لیے عام ہے اور اس میں وقت کی کوئی قید نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے یہ مشروع کیا ہے کہ وہ اہل قبور کو سلام کریں جس طرح سننے والے اور عقل والے شخص کو سلام کیا جاتا ہے۔ حافظ عراقی نے کہا ہے کہ امام عبدالبر نے اس حدیث کو التعمید اور الاستذکار میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس حدیث کو حافظ عبدالحق نے صحیح قرار دیا ہے۔ (فیض القدر ج ۱۰، ص ۵۴۳۸، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ھ)

حافظ ابو بکر احمد بن علی الخطیب المتوفی ۴۶۳ھ نے اس حدیث کو ایک اور سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

(۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جو بندہ بھی کسی ایسے شخص کی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا تھا پس اس کو سلام کرے تو وہ اس کو پہچان لیتا ہے اور وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

(تاریخ بغداد ج ۶، ص ۱۳۷، مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ، الجامع الصغیر، ج ۲، رقم الحدیث: ۸۰۶۲، شرح الصدور ص ۲۰۴، دار الکتب العلمیہ

بیروت، ۱۴۰۳ھ، کنز العمال ج ۱۵، رقم الحدیث: ۳۲۵۵۶، مطبوعہ بیروت)

امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ روایت کرتے ہیں:

(۶) سالم بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جس قبر کے پاس سے گزرتے اس کو سلام کرتے تھے۔

(المصنف ج ۳، رقم الحدیث: ۶۷۲۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے پوچھا: ہم قبروں پر سلام کرنے کے لیے کیا کہیں؟ آپ

نے فرمایا کہو السلام علی اهل الدیار من المؤمنین والمسلمین، یرحم اللہ المستقدمین

منا والمستأخرین، انا انشاء اللہ بکم لاحقون۔ (المصنف ج ۳، رقم الحدیث: ۶۷۲۲)

(۸) زید بن اسلم بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ اور ان کے ایک شاگرد ایک قبر کے پاس سے گزرے، حضرت ابو ہریرہ

نے کہا سلام کرو، اس شخص نے پوچھا کیا قبر کو سلام کروں، حضرت ابو ہریرہ نے کہا، اگر اس نے کسی دن دنیا میں تمہیں دیکھ لیا تھا تو

وہ اب تمہیں پہچان لے گا۔ (المصنف ج ۳، رقم الحدیث: ۶۷۲۳)

امام ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ روایت کرتے ہیں:

(۹) زازان بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب قبرستان میں داخل ہوتے تو فرماتے اس دیار میں رہنے والے مومنین

اور مسلموں پر میرا سلام ہو، تم ہم پر مقدم ہو اور ہم تمہارے تابع ہیں اور ہم تمہارے ساتھ ضرور ملیں گے، اور ہم اللہ کے لیے

ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

(۱۰) جناب ازدی بیان کرتے ہیں کہ ہم سلمان کے ساتھ حمہ کی طرف گئے۔ حتیٰ کہ جب ہم قبروں کے پاس پہنچے تو انہوں نے

دائیں طرف متوجہ ہو کر کہا، السلام علیکم یا اهل الدیار من المؤمنین والمؤمنات۔ الحدیث۔

(۱۱) مجاہد سے روایت ہے کہ وہ قبروں پر سلام عرض کرتے تھے۔

(۱۲) موسیٰ بن عقبہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے دیکھا سالم بن عبداللہ رات ہو یا دن، جس وقت بھی قبر کے پاس سے

گزرتے تو اس کو سلام کرتے تھے اور وہ یہ کہتے تھے السلام علیکم امیں نے ان سے اس کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا ان کے والد

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی اسی طرح کرتے تھے۔

(۱۳) حضرت بریدہ بنی اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو ان میں سے کوئی شخص یہ کہے السلام علیکم یا اهل الدیار من المؤمنین والمسلمین وانا انشاء اللہ بکم للاحقون انتم لنا فرط ونحن لکم تبع ونسال اللہ لنا ولکم العافیۃ۔
(۱۴) عامر بن سعد اپنے والد بنی اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ اپنی زمین سے لوٹے اور شہداء کی قبروں کے پاس سے گزرتے تو کہتے السلام علیکم وانا بکم للاحقون پھر اپنے اصحاب سے کہتے کہ تم شہداء کو سلام نہیں کرتے مگر وہ تمہارے سلام کا جواب دیں۔

(۱۵) عبداللہ بن سعد الجاری بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا جب تم ان قبروں کے پاس سے گزرو جن کو تم پہچانتے تھے تو کہو 'السلام علیکم اصحاب القبور اور جب تم ان قبروں کے پاس سے گزرو جن کو تم نہیں پہچانتے تھے تو کہو السلام علی المسلمین۔

(۱۶) ابو موسیٰ ب بیان کرتے ہیں کہ ان کو رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ وہ البقیع کی طرف جائیں ان کے لیے دعا کریں اور ان کو سلام کریں۔ (المصنف ج ۳، ص ۳۳۹-۳۴۱، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۴۰۶ھ)
امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

(۱۷) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ احد سے لوٹے ہوئے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے آپ نے فرمایا میں گواہی دیتا ہوں کہ تم اللہ کے نزدیک زندہ ہو۔ (پھر صحابہ سے فرمایا) تم ان کی زیارت کرو اور ان کو سلام کرو۔ (المعجم الاوسط ج ۴، ص ۳۲۶، رقم الحدیث: ۳۷۱۴، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض، ۱۴۱۵ھ)

(۱۸) عبداللہ الاودی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اس وقت وہ حالت نزع میں تھے۔ انہوں نے کہا جب میں مر جاؤں تو میرے ساتھ اسی طرح کرنا جس طرح حضور ﷺ نے ہمیں مردوں کے ساتھ کرنے کا حکم دیا ہے، آپ نے فرمایا جب تمہارے بھائیوں میں سے کوئی شخص فوت ہو جائے تو تم اس کی قبر پر مٹی ہموار کر دینا، پھر تم میں سے کوئی شخص اس کی قبر کے سر ہانے کھڑا ہو جائے، پھر اس کو چاہیے کہ یہ کہے یا فلاں بن فلانہ، وہ اس کلام کو سنے گا اور جواب نہیں دے گا، پھر کہے کہ یا فلاں بن فلانہ، تو وہ اٹھ کر سیدھا بیٹھ جائے گا پھر کہے یا فلاں بن فلانہ، تب وہ مردہ کہے گا اللہ تم پر رحم کرے ہماری رہنمائی کرو۔ لیکن تم کو (ان کے کلام کا) شعور نہیں ہوتا، پس اس شخص کو کہنا چاہیے: یاد کرو جب تم دنیا سے گئے تھے تو یہ شہادت دیتے تھے کہ ان لا الہ الا اللہ وان محمد عبده ورسوله اور تم اللہ کو رب مان کر راضی تھے اور اسلام کو دین مان کر اور (سیدنا) محمد (ﷺ) کو نبی مان کر اور قرآن کو امام مان کر، پھر منکر اور نکیر میں سے ایک اپنے صاحب کا ہاتھ پکڑ کر کہے گا اب یہاں سے چلو ہم اس شخص کے پاس نہیں بیٹھتے جس کو حجت کی تلقین کر دی گئی ہے، پھر ان کے سامنے اللہ حجت کرنے والا ہو گا، ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اگر ہمیں اس کی ماں کا نام معلوم نہ ہو تو آپ نے فرمایا تو پھر اس کو حواء کی طرف منسوب کرے اور کہے یا فلاں بن حواء۔

(المعجم الکبیر ج ۸، رقم الحدیث: ۷۹۷۹، مجمع الزوائد ج ۲، ص ۲۰۲، تذکرہ ج ۱، ص ۱۱۹، تہذیب تاریخ دمشق ج ۶، ص ۳۲۳، کنز العمال، رقم الحدیث: ۳۲۳۰۶، ۳۲۹۳۳)

علامہ ابو عبداللہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں کہ حافظ ابو محمد عبدالحق اور شیبہ بن الی شیبہ نے اس حدیث سے استدلال کیا

ہے۔ یہ حدیث احياء العلوم میں بھی ہے اور بہت علماء نے اس سے استدلال کیا ہے، اور شیخ فقیہ امام مفتی الانام ابو الحسن علی بن حبیب اللہ شافعی نے اس حدیث کو ایک اور سند کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ہمارے شیخ علامہ ابو العباس احمد بن عمر قرطبی فرماتے ہیں اس حدیث پر عمل کر کے میت کو تلقین کرنی چاہیے۔ (التذکرہ ج ۱، ص ۱۲۰، ۱۱۹، ملخصاً، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

واضح رہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کے آباء کی طرف منسوب کر کے پکارا جائے گا۔ اور اس حدیث میں جو اموات کی طرف نسبت کا ذکر ہے یہ قیامت کا واقعہ نہیں ہے بلکہ دفن کے بعد قبر کا واقعہ ہے۔ اس حدیث میں مردہ کے سننے کی صاف تصریح ہے۔ اور چونکہ اس حدیث پر اہل علم کا عمل ہے اور یہ اس حدیث کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

ملا علی قاری نے علامہ نووی سے یہ نقل کیا ہے کہ امام ترمذی کے نزدیک ضعیف حدیث اہل علم کے عمل سے قوی ہو جاتی ہے۔ (مرقات، ج ۲، ص ۹۸، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۱۳۹۰ھ)

امام ابو بکر حسین بن احمد بیہقی متوفی ۴۵۸ھ روایت کرتے ہیں:

(۱۹) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص ایسی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ دنیا میں پہچانتا ہو اور اس کو سلام کرے تو وہ اس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے اور جب وہ ایسی قبر کے پاس سے گزرے جس کو وہ نہ پہچانتا ہو اور اس کو سلام کرے تو وہ اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔

(شعب الایمان ج ۷، رقم الحدیث: ۹۲۹۶، شرح الصدور ص ۲۰۲)

(۲۰) نیشاپور کے قاضی ابو ابراہیم بیان کرتے ہیں کہ ان کے پاس ایک شخص آیا، اور اس نے کہا میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا، قاضی کے پوچھنے پر بتایا کہ میں کفن چور تھا اور قبروں سے کفن چراتا تھا۔ ایک عورت فوت ہو گئی میں نے اس کی نماز جنازہ پڑھی تاکہ میں اس کی قبر دیکھ لوں۔ رات کو میں نے قبر کھودی اور اس کا کفن اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس عورت نے کہا سبحان اللہ! ایک جنتی مرد جنتی عورت کا کفن اتار رہا ہے، پھر اس عورت نے کہا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تم نے میری نماز جنازہ پڑھی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان تمام لوگوں کو بخش دیا، جنہوں نے میری نماز جنازہ پڑھی تھی۔

(شعب الایمان، ج ۷، رقم: ۹۲۶۱، شرح الصدور، ص ۲۰۸)

امام ابو القاسم علی بن الحسن بن عساکر متوفی ۵۷۱ھ روایت کرتے ہیں:

(۲۱) یحییٰ بن ایوب الخراعی بیان کرتے ہیں کہ میں نے سنا کہ حضرت عمر بن الخطاب کے زمانہ میں ایک عبادت گزار نوجوان تھا جس نے مسجد کو لازم کر لیا تھا، حضرت عمر اس سے بہت خوش تھے، اس کا باپ بوڑھا آدمی تھا، وہ عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے باپ کی طرف لوٹ آتا تھا، اس کے راستہ میں ایک عورت کا دروازہ تھا وہ اس پر فریفتہ ہو گئی تھی، وہ اس کے راستہ میں کھڑی ہو جاتی تھی، ایک رات وہ اس کے پاس سے گزرا تو وہ اس کو مسلسل بہکتی رہی حتیٰ کہ وہ اس کے ساتھ چلا گیا، جب وہ اس کے گھر کے دروازہ پر پہنچا تو وہ بھی اندر آگئی۔ اس نوجوان نے اللہ کو یاد کرنا شروع کر دیا اور اس کی زبان پر یہ آیت جاری ہو گئی:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ
بے شک جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں انہیں اُتر شیطان کی طرف سے کوئی خیال چھو بھی جاتا ہے تو وہ خبردار ہو جاتے ہیں۔
(الاعراف: ۲۰۱) اور اسی وقت ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

پھر وہ نوجوان بے ہوش ہو کر گر گیا، اس عورت نے اپنی باندی کو بلایا اور دونوں نے مل کر اس نوجوان کو اٹھایا اور اس کے گھر کے دروازہ پر چھوڑ آئیں۔ اس کے گھر والے اسے اٹھا کر گھر میں لے گئے، کافی رات گزرنے کے بعد وہ نوجوان ہوش میں

آیا اس کے باپ نے پوچھا اے بیٹے! تمہیں کیا ہوا تھا؟ اس نے کہا خیر ہے، باپ نے پھر پوچھا تو اس نے پورا واقعہ سنایا، باپ نے پوچھا: اے بیٹے! تم نے کونسی آیت پڑھی تھی؟ تو اس نے آیت کو دہرایا جو اس نے پڑھی تھی اور پھر بے ہوش ہو کر گر گیا۔ گھر والوں نے اسے ہلایا جلا یا، لیکن وہ مرچکا تھا، انہوں نے اس کو غسل دیا اور اسے جا کر دفن کر دیا۔ صبح ہوئی تو اس بات کی خبر حضرت عمر رضی اللہ عنہم تک پہنچی، صبح کو حضرت عمر اس کے والد کے پاس تعزیت کے لیے آئے اور فرمایا تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی۔ اس کے باپ نے کہارات کا وقت تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا، میں اس کی قبر کی طرف لے چلو، پھر حضرت عمر اور ان کے اصحاب اس کی قبر پر گئے، حضرت عمر نے کہا اے نوجوان! جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اس کے لیے دو جنتیں ہیں؟ تو اس نوجوان نے قبر کے اندر سے جواب دیا: اے عمر! مجھے میرے رب عزوجل نے جنت میں دو بار دو جنتیں عطا فرمائی ہیں۔

(مختصر تاریخ دمشق ترجمہ عمر دین جامع رقم: ۱۱۳، ج ۱۹، ص ۱۹۱-۱۹۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

حافظ ابن عساکر کے حوالہ سے اس حدیث کو حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۳ھ، حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ اور امام علی متقی ہندی متوفی ۹۷۵ھ نے بھی ذکر کیا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر الاعراف ۲۰۱، ج ۳، ص ۲۶۹، طبع دارالاندلس بیروت، شرح الصدور ص ۲۱۳، طبع دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۰۳ھ، کنز العمال ج ۲، ص ۵۱۶-۵۱۷، رقم الحدیث: ۴۶۳۴)

امام ابو عمر یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبرمالکی قرطبی متوفی ۴۶۳ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

(۲۲) عطاء بن یسار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ رات کو قبرستان میں جاتے اور فرماتے "السلام علیکم دار قوم مؤمنین" ہمارے پاس اور تمہارے پاس وہ چیز آچکی ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اور ہم انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں، اے اللہ! بقیع الغرقہ والوں کی مغفرت فرما۔

جن علماء کا یہ مذہب ہے کہ مردوں کی روحیں قبروں کے صحنوں پر ہوتی ہیں وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں: اور بے شک نبی ﷺ نے بدر کے کنوئیں میں پڑے ہوئے مردوں کو خطاب فرمایا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ تم ان سے زیادہ سننے والے نہیں ہو، مگر یہ جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ (الی قولہ) قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ مردہ کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو وہ لوگوں کی جوتیوں سے چلنے کی آواز سنتا ہے، اور ان امور کی کیفیت نہیں بیان کی جاسکتی ان کو صرف تسلیم کیا جائے گا اور ان کی اتباع کی جائے گی۔ امام عبدالبر فرماتے ہیں جو شخص قبرستان میں جائے وہ ان کو سلام کرے اور وہ الفاظ کہے جو نبی ﷺ سے منقول ہیں۔ (التہمید ج ۲۰، ص ۲۴۰، مطبوعہ المکتبۃ التجاریہ، مکہ المکرمہ، ۱۳۱۲ھ)

(۲۳) عامر بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے ایک دن نبی ﷺ کو موجود نہ پایا میں آپ کے پیچھے گئی، آپ بقیع کے قبرستان میں گئے تو آپ نے فرمایا السلام علیکم دار قوم مؤمنین! تم ہمارے پیش رو ہو، اور بیشک ہم تم سے ملنے والے ہیں، اے اللہ! ہم کو ان کے اجر سے محروم نہ کر اور ہم کو ان کے بعد آزمائش میں نہ ڈال۔ (التہمید ج ۲۰، ص ۲۴۱، مطبوعہ المکتبۃ التجاریہ، مکہ المکرمہ، ۱۳۱۲ھ)

(۲۴) روایت ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم قبرستان میں گئے اور قبروں کی طرف متوجہ ہو کر بلند آواز سے ندا کی اے اہل قبور! آیا تم ہمیں اپنی خبریں دو گے یا ہم تمہیں خبریں سنائیں؟ ہمارے پاس یہ خبر ہے کہ تمہارے مال تقسیم کر دیے گئے اور عورتوں نے دوسری شادیاں کر لیں، اور تمہارے گھروں میں اب تمہارے سوا اور لوگ رہتے ہیں، یہ ہماری خبریں ہیں، اب تم ہمیں اپنی خبریں سناؤ، پھر آپ نے اپنے اصحاب کی طرف متوجہ ہو کر کہا سنو، اللہ کی قسم! اگر یہ جواب دینے کی طاقت رکھتے تو یہ

کہتے کہ ہم نے تقویٰ سے بہتر کوئی زاد راہ نہیں پایا۔

(۲۵) ابو عثمان النہدی بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص سخت گرم دن میں نکلا اور قبرستان میں گیا وہاں دو رکعت نماز پڑھی پھر ایک قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک آواز سنی ”میرے پاس سے ہٹ جا“ اور مجھے ایذا نہ پہنچا“ تم جو کہتے ہو تمہیں اس کا علم نہیں ہے اور ہمیں علم ہے اور ہم کہتے نہیں ہیں تمہاری یہ دو رکعت نماز مجھے فلاں فلاں چیز سے زیادہ محبوب ہے۔

(۲۶) ثابت بنانی بیان کرتے ہیں کہ میں قبرستان میں جا رہا تھا اچانک میں نے غیب سے ایک آواز سنی: اے ثابت ہماری خاموشی سے دھوکا نہ کھانا یہاں پر کتنے ہی لوگ مغموم ہیں۔

(۲۷) امام ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما بقیع الغرقہ کے پاس سے گزرے تو فرمایا السلام علیکم اهل القبور! ہمارے پاس یہ خبریں ہیں کہ تمہاری بیویوں نے شادیاں کر لیں اور تمہارے گھروں میں اب اور لوگ رہتے ہیں اور تمہارے مال تقسیم کر دیے گئے تو غیب سے آواز آئی: اے عمر بن الخطاب! ہماری خبریں یہ ہیں کہ ہم نے جو نیک اعمال بھیجے تھے وہ مل گئے اور ہم نے جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا تھا اس کا نفع پالیا اور ہم نے جو اپنے پیچھے مال چھوڑا وہ گھانا تھا۔ (التعمیر ج ۲۰، ص ۲۳۲ مطبوعہ المکتبۃ التجاریہ مکہ المکرمۃ ۱۴۱۲ھ)

ہمارے زمانہ میں بعض لوگ سماع موتی کا شدت سے انکار کرتے ہیں اس لیے میں نے احادیث صحیحہ و مقبولہ کی روشنی میں اس مسئلہ کو واضح کیا ہے اور مذاہب اربعہ کے مستند علماء کی تصریحات بھی پیش کی ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ علامہ قرطبی مالکی، علامہ نووی شافعی، علامہ ابن قیم حنبلی اور علامہ بدر الدین عینی حنفی قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں امام احمد رضا بریلوی اور مکتب فکر دیوبند کے محدث شیخ انور شاہ کشمیری کی تصریحات بھی پیش کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو اثر آفرین بنا دے (آمین) انشاء اللہ النمل: ۸۰ اور فاطر: ۲۲ میں اس پر مزید بحث کی جائے گی۔ و آخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین والصلوة والسلام علی سیدنا محمد خاتم النبیین قائد المرسلین شفیع المذنبین وعلی آلہ واصحابہ الراشدین وعلماء ملتہ اجمعین۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو جب جنگ میں تمہارا کفار سے مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھيرو اور جس شخص نے جنگ کی حکمت عملی یا ایک جماعت سے ملنے (کے قصد) کے بغیر میدان جنگ سے پیٹھ پھیری تو بیشک وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ (الانفال: ۱۶-۱۵)

زحف کا معنی

الانفال کی آیت: ۱۵ میں ”زحفا“ کا لفظ ہے، زحف کا لغوی معنی ہے: بچہ کا سرین یا گھٹنے کے بل آہستہ آہستہ گھسنا اور ”زحف العسکر الی العدو“ کا معنی ہے: لشکر کا کثرت کے سبب سے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا، زحف البعیر کا معنی ہے اونٹ کا تھک کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنا، اس آیت میں زحف سے مراد ہے دشمن کا بہت بڑا لشکر کیونکہ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کے لشکر کی تعداد تین گنا زیادہ تھی۔ (المفردات ج ۱، ص ۲۸۰، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ھ)

میدان جنگ سے پسپائی کی دو جائز صورتیں

اس آیت کا منشا یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی فوج کی پسپائی جنگ کی کسی حکمت عملی کی بنا پر ہو، مثلاً پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا زیادہ موثر ہو تو اس صورت میں مسلمان فوج کا پسپا ہونا جائز ہے۔ اور جواز کی دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمان سپاہیوں کی ایک جماعت مرکزی فوج سے پھڑکنی ہے اب وہ اپنے بچاؤ کے لیے پسپا ہو کر مرکزی فوج سے ملنا چاہتی ہے تو اس قسم کی پسپائی بھی جائز

ہے، مسلمان فوج کا میدان جنگ سے پیٹھ پھیرنا صرف اس صورت میں ناجائز اور حرام ہے جبکہ وہ بزدلی سے محض جنگ سے بچنے کی خاطر میدان جنگ سے پیٹھ موڑ کر بھاگے۔

میدان جنگ سے پیٹھ موڑ کر بھاگنا بہت سخت گناہ اور اکبرا لکبائز میں سے ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے اجتناب کرو، پوچھا گیا یا رسول اللہ! وہ کون کون سی چیزیں ہیں، آپ نے فرمایا:

۱- اللہ کا شریک بنانا۔

۲- جادو کرنا۔

۳- جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو ناحق قتل کرنا۔

۴- یتیم کا مال کھانا۔

۵- سود کھانا۔

۶- جنگ کے دن دشمن سے پیٹھ پھیرنا۔

۷- بھولی بھالی پاک دامن مسلمان عورتوں کو بدکاری کی تہمت لگانا۔

(صحیح مسلم الایمان: ۱۳۵ (۱۸۹) ۲۵۶، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۷۶۶، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۸۷۴، سنن الترمذی رقم الحدیث:

۳۶۷۱، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۳۶۱)

اگر دشمن کی تعداد مسلمانوں سے دگنی یا اس سے کم ہو تو پھر مسلمانوں کا میدان سے بھاگنا جائز نہیں

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں اللہ عزوجل نے یہ حکم دیا کہ میدان جنگ میں مسلمان کافروں کو پیٹھ نہ دکھائیں اور یہ حکم اس قید کے ساتھ مقید ہے کہ کفار مسلمانوں سے تعداد میں دگنے سے زیادہ نہ ہوں، اگر کفار مسلمانوں سے دگنے ہوں تو پھر مسلمانوں کا ان سے بھاگنا جائز نہیں ہے۔ اور اگر دو تین گنے زیادہ ہوں اور پھر مسلمان ان سے پیٹھ موڑ کر بھاگیں تو پھر یہ حرام اور ناجائز نہیں ہے، ابن ماجہون نے یہ کہا ہے کہ فوج کے ضعف، قوت اور عدد کی رعایت کی جائے گی، اگر کافر فوج کی تعداد ایک سو ہو اور مسلمان بھی ایک سو ہوں، لیکن وہ بہت ہٹے کٹے اور قوی اور توانا ہوں اور مسلمان دبلے پتلے اور کمزور ہوں تو عدد میں برابر ہونے کے باوجود مسلمانوں کا ایسے کافروں کے مقابلہ سے بھاگنا جائز ہے اور جمہور کے نزدیک ایک سو مسلمانوں کا دو سو کافروں سے کسی حال میں بھاگنا جائز نہیں ہے اور اگر کافر دو سو سے زیادہ ہوں تو ان سے بھاگنا اگرچہ جائز ہے لیکن صبر و استقامت سے ان کے مقابلہ پر جتنے رہنا اور ڈٹے رہنا احسن اور افضل ہے، غزوہ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کافروں کے مقابلہ پر تھے ان میں ایک لاکھ رومی اور ایک لاکھ مستعرب تھے۔

فتح اندلس کی تاریخ میں مذکور ہے کہ جب ۹۳ھ میں موسیٰ بن نصیر کے آزاد کردہ غلام طارق سترہ سو مسلمانوں کو ساتھ لے کر اندلس پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے، ان کے مقابلہ میں عیسائی حکمران ذریق ستر ہزار سواروں کے ساتھ آیا۔ طارق صبر و استقامت کے ساتھ ذریق سے جنگ کرنے رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے طارق کو فتح یاب کیا اور ذریق شکست کھا گیا۔

(الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۳۳۱-۳۳۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

مسلمانوں پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنے سے دگنی تعداد میں کافروں کے مقابلہ سے نہ بھاگیں یہ حکم اس آیت سے ماخوذ ہے:

فَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا
مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ
يَا ذُرِّيَّةَ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ - (الانفال: ۶۶)

پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوئے تو وہ اللہ کے اذن سے دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوئے تو وہ اللہ کے اذن سے دو ہزار پر غالب آجائیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

میدان جنگ سے بھاگنے کی ممانعت قیامت تک کے لیے عام ہے یا یوم بدر کے ساتھ مخصوص ہے اس میں بھی علماء کا اختلاف ہے کہ میدان جنگ سے بھاگنے کی ممانعت یوم بدر کے ساتھ مخصوص ہے یا یہ ممانعت قیامت تک کے لیے ہے۔

ابونضرہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا یہ ممانعت یوم بدر کے ساتھ مخصوص تھی اور مسلمانوں کے لیے اس دن بھاگنا جائز نہ تھا اور اگر وہ بھاگتے تو مشرکین ہی کی سمت بھاگتے، کیونکہ روئے زمین پر اس وقت ان کے سوا اور کوئی مسلمان نہ تھا۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۲۶۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

حضرت ابو سعید بن ابی سعید بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت یوم بدر کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۳۸، السنن الکبریٰ للنسائی ج ۶، رقم الحدیث: ۱۱۲۰۳، المستدرک ج ۲، ص ۳۲۷، جامع البیان رقم

الحدیث: ۱۲۳۷۷، جز ۹، ص ۲۶۶، الدر المنثور ج ۴، ص ۳۶)

حضرت ابو سعید نے کہا یہ آیت خصوصیت سے اہل بدر کے متعلق ہے، حضرت عمر بن الخطاب، حضرت ابن عمر، نافع،

عکرمہ، الحسن، ضحاک، قتادہ، ربیع بن انس، ابو نضرہ، یزید بن ابی حبیب اور سعید بن جبیر کا بھی یہ قول ہے۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۶۷۰، رقم الحدیث: ۸۸۹۲، ۸۸۹۱، مطبوعہ مکہ مکرمہ)

حضرت ابو سعید خدری بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ یہ حکم بدر کے دن تھا اس دن رسول اللہ ﷺ کے سوا مسلمانوں کی اور

کوئی جماعت نہیں تھی، لیکن اب بعض مسلمان بعض دوسرے مسلمانوں کی جماعت ہیں۔

ضحاک بیان کرتے ہیں کہ فرار صرف بدر کے دن تھا کیونکہ اس دن مسلمانوں کی کوئی جائے پناہ نہیں تھی جہاں پناہ حاصل

کرتے اور آج کل فرار نہیں ہے۔

یزید بن ابی حبیب بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن بھاگنے والوں کے لیے دوزخ کو واجب کیا ہے اور احد کے

دن بھاگنے والوں کے متعلق فرمایا:

إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا
كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ

شیطان ہی نے ان کے بعض کاموں کی وجہ سے ان کے قدم پھلادے تھے اور بے شک اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔

(آل عمران: ۱۵۵)

اور اس کے سات سال بعد جنگ حنین میں بھاگنے والوں کے متعلق فرمایا:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبْتَكُمْ كَثَرَتُمْ فَلَمْ
تُعْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمْ الْأَرْضُ
بِمَا رَحَبْتُمْ وَلَكُمْ مُذَبِّبِينَ - (التوبة: ۲۵)

اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت نے تمہیں گھنڈ میں

ڈال دیا تو اس (کثرت) نے کسی چیز کو تم سے دور نہ کیا اور زمین اپنی

وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور پھر تم پیٹھ پھیر کر لوٹے۔

نَمَّ يَتُوبُ اللَّهُ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَلَى مَنْ
يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (التوبہ: ۲۷)

پھر اس کے بعد اللہ جس کی چاہے توبہ قبول فرماتا ہے اور
اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۲۶۸-۲۶۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر تمام علماء کا مذہب یہ ہے کہ اس آیت کا حکم عام ہے اور قیامت تک
مسلمانوں پر مذکورہ دو صورتوں کے سوا میدان جنگ سے اس وقت تک بھاگنا جائز نہیں ہے جب تک کہ دشمن کی
تعداد گنے سے متجاوز نہ ہو اور یہ آیت محکم ہے اور اس کا کوئی ناخ نہیں ہے اور یہ کہنا صحیح نہیں کہ مسلمان اگر
بھاگتے تو مشرکین ہی کی طرف بھاگتے کیونکہ مدینہ میں انصار مسلمین موجود تھے اور جنگ احد اور جنگ خنین میں بھاگنے
والوں کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا اور اللہ تعالیٰ کا معافی کا اعلان کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہو
گیا تھا، لیکن انہوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ جس کی چاہے توبہ قبول فرماتا ہے۔ اس آیت کے محکم ہونے اور قیامت
تک واجب العمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ آیت جنگ بدر میں قتال اور جنگ ختم ہونے کے بعد نازل ہوئی ہے، امام
مالک، امام شافعی، امام ابو حنیفہ اور اکثر علماء کا یہی مذہب ہے۔

اگر دشمن کی تعداد گنی ہو یا دگنی سے کم ہو اور پھر کوئی مسلمان جنگ سے بچنے کی کوشش کے لیے دشمن سے پیٹھ موڑ کر
بھاگے تو اس کا یہ فعل ناجائز اور حرام ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ سے توبہ کرے، اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، اس کو معاف کر
دے گا۔ حضرت زید بنی اشجہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے یہ کہا
”استغفر اللہ الذی لا الہ الا هو الحی القیوم واتوب علیہ“ تو اس کی مغفرت کر دی جائے گی خواہ وہ میدان
جنگ سے پیٹھ موڑ کر بھاگا ہو۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۵۱۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۷۷)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: سو (اے مسلمانو!) تم نے ان کو قتل نہیں کیا لیکن اللہ نے ان کو قتل کیا ہے اور (اے رسول
معظم!) آپ نے وہ خاک نہیں پھینکی جس وقت آپ نے وہ خاک پھینکی تھی لیکن وہ خاک اللہ نے پھینکی تھی تاکہ وہ مومنوں کو
اچھی آزمائش کے ساتھ گزارے، بے شک اللہ بہت سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے، یہ تو تمہارے ساتھ معاملہ ہے اور
اللہ کفار کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے۔ (الانفال: ۱۸-۱۹)

مسلمانوں سے کفار بدر کے قتل کی نفی کے محامل

امام عبدالرحمن بن محمد بن ادریس بن ابی حاتم رازی متوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ مجاہد سے روایت کرتے ہیں:
جنگ بدر کے دن صحابہ آپس میں بحث کرنے لگے، ایک نے کہا میں نے فلاں کو قتل کیا ہے۔ دوسرے نے کہا میں نے فلاں
کو قتل کیا ہے، تب اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: سو (اے مسلمانو!) تم نے ان کو قتل نہیں کیا، لیکن اللہ نے ان کو قتل کیا ہے۔

(تفسیر امام ابن حاتم ج ۵، ص ۱۶۷۲، جامع البیان ج ۹، ص ۲۷۰، الدر المنثور، ج ۳، ص ۳۹)

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ تم ان کو قتل کرنے پر فخر نہ کرو، اگر اللہ تمہاری مدد نہ فرماتا اور تمہیں حوصلہ اور قوت نہ عطا
فرماتا تو تم ان کو قتل نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے بظاہر تم نے ان کو قتل کیا ہے لیکن حقیقت میں ان کو اللہ نے قتل کیا ہے، یا تم نے
ان کو کبسا قتل کیا ہے اور اللہ نے ان کو خلقتاً قتل کیا ہے۔ یا تم نے ان کو صورتاً قتل کیا ہے اور اللہ نے ان کو معاً قتل کیا ہے۔
اس آیت سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ ہر اچھے اور نیک کام کی نسبت اللہ کی طرف کرنی چاہیے اور جب انسان اللہ کی توفیق سے
کوئی اچھا اور نیک کام کرے تو اس پر فخر نہیں کرنا چاہیے۔

ومارمیت اذرمیت کے شان نزول میں مختلف اقوال

اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے:

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ زہری سے روایت کرتے ہیں:

ابی بن خلف نبی ﷺ کے پاس ایک ہڈی لے کر آیا اور کہنے لگا اے محمد! (ﷺ) جب یہ ہڈی بوسیدہ ہو جائے گی تو اس کو کون زندہ کرے گا؟ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ اس کو زندہ کرے گا، پھر تجھ پر موت واقع کرے گا، پھر تجھ کو دوزخ میں ڈال دے گا۔ جنگ احد کے دن ابی بن خلف نے کہا اللہ کی قسم! میں (سیدنا) محمد (ﷺ) کو دیکھتے ہی قتل کر دوں گا، جب نبی ﷺ کو خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا بلکہ انشاء اللہ میں اس کو قتل کروں گا۔ (جامع البیان جزء ۹، ص ۲۷۲، مطبوعہ دار الفکر ۱۴۱۵ھ)

امام ابن ابی حاتم رازی متوفی ۳۲۷ھ اپنی سند کے ساتھ ابن المسیب سے روایت کرتے ہیں:

جنگ احد کے دن ابی بن خلف اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا آیا حتیٰ کہ نبی ﷺ کے قریب پہنچ گیا، مسلمان اس کو قتل کرنے کے درپے ہوئے۔ نبی ﷺ نے ان سے فرمایا ٹھہرو ٹھہرو نبی ﷺ نے اپنے دست مبارک میں نیزہ پکڑا اور ابی بن خلف کی طرف ٹاک کر مارا اور اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی توڑ دی، ابی بن خلف زخمی ہو کر اپنے اصحاب کی طرف پلٹا، اس کے اصحاب اس کو اٹھا کر لے گئے اور کہا خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ یہ سن کر ابی بن خلف نے کہا خدا کی قسم! اگر میں لوگوں کے درمیان ہوتا تو وہ پھر بھی مجھے قتل کر دیتے، کیا انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ انشاء اللہ میں تجھ کو قتل کر دوں گا۔ اس کے اصحاب اس کو بے ہوشی کی کیفیت میں لے گئے وہ راستہ ہی میں مر گیا اور انہوں نے اس کو وہیں دفن کر دیا، ابن المسیب نے کہا اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی تھی ”ومارمیت اذرمیت“ یعنی آپ نے وہ نیزہ نہیں مارا، جب آپ نے نیزہ مارا تھا، لیکن اللہ نے وہ نیزہ مارا تھا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۶۷۳، الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۳۳۳، الدر المنثور ج ۳، ص ۴۱، المستدرک ج ۲، ص

۳۲۷، اسباب النزول رقم الحدیث: ۴۷۱)

اس سلسلہ میں دوسرا قول یہ ہے:

امام ابن ابی حاتم رازی متوفی ۳۲۷ھ اور امام علی بن احمد واحدی متوفی ۴۶۸ھ روایت کرتے ہیں:

عبدالرحمن بن جیر بیان کرتے ہیں کہ غزوہ خیبر کے دن رسول اللہ ﷺ نے ایک کمان منگوائی، تو ایک بہت لمبی کمان لائی گئی، آپ نے فرمایا کوئی اور کمان لاؤ، تو ایک درمیانی کمان لائی گئی رسول اللہ ﷺ نے اس کمان سے یہودیوں کے قلعہ کا نشانہ لگا کر تیر مارا جو کنانہ بن ابی الحقیق کو جا کر لگا جو اس وقت بستر پر لیٹا ہوا تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، ”ومارمیت اذرمیت ولکن اللہ رمی“ یعنی آپ نے تیر نہیں مارا، جس وقت آپ نے تیر مارا تھا لیکن اللہ نے وہ تیر مارا تھا۔

(تفسیر امام ابن حاتم ج ۵، ص ۱۶۷۳-۱۶۷۴، اسباب نزول القرآن، رقم الحدیث: ۴۷۲، الدر المنثور ج ۳، ص ۴۱)

اس سلسلہ میں تیسرا قول یہ ہے: اور یہی جمہور مفسرین کا مختار ہے:

جب مسلمانوں اور کافروں کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے خاک کی ایک مٹھی کافروں کے چہرے پر ماری اور فرمایا یہ لوگ رو سیاہ ہو جائیں تو وہ خاک سب کافروں کی آنکھوں میں پڑ گئی اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب بڑھ کر ان کو قتل کرنے لگے اور گرفتار کرنے لگے اور ان کی شکست کا اصل سبب خاک کی وہ مٹھی تھی جو رسول اللہ ﷺ نے پھینکی تھی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ”ومارمیت اذرمیت ولکن اللہ رمی“ اور (اے رسول معظم!) آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی جس وقت آپ نے پھینکی تھی لیکن وہ خاک اللہ نے پھینکی تھی۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۲۷۲-۲۷۰، تفسیر امام بن ابی حاتم، ج ۵، ص ۱۶۷۳، اسباب نزول القرآن، رقم الحدیث: ۱۴۷۳، المعجم الکبیر ج ۳، رقم الحدیث: ۳۱۲۸، حافظ البیہقی نے کہا اس کی سند حسن ہے۔ مجمع الزوائد ج ۶، ص ۸۳، الدر المنثور، ج ۴، ص ۴۰)

نبی ﷺ سے خاک کی مٹھی پھینکنے کی نفی اور اثبات کے محامل

اس آیت سے پہلے نبی ﷺ سے خاک کی مٹھی پھینکنے کی نفی کی ہے اور پھر اس کو ثابت کیا ہے اور بظاہر یہ تعارض ہے۔ اس کا بھی یہی جواب ہے کہ نفی اور اثبات کے محمل الگ الگ ہیں اور معنی اس طرح ہے: آپ نے خاک کی مٹھی حقیقتاً نہیں پھینکی جب آپ نے خاک کی مٹھی بظاہر پھینکی تھی یا آپ نے خاک کی مٹھی خلقتاً نہیں پھینکی جب آپ نے خاک کی مٹھی کسباً پھینکی تھی، یا آپ نے خاک کی مٹھی معناتاً نہیں پھینکی جب آپ نے خاک کی مٹھی صورتاً پھینکی تھی، یا آپ نے خاک کی مٹھی عادتاً نہیں پھینکی جب آپ نے خاک کی مٹھی خلاف عادت پھینکی تھی۔

قاضی عبداللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

اے محمد! (ﷺ) آپ نے خاک کی مٹھی اس طرح نہیں پھینکی کہ آپ تمام کافروں کی آنکھوں میں وہ خاک پہنچادیں، جب کہ آپ نے صورتاً خاک کی مٹھی پھینکی تھی، لیکن یہ مقصود اللہ نے پورا کیا اور وہ خاک تمام کافروں کی آنکھوں میں پہنچادی حتیٰ کہ وہ سب شکست کھا گئے اور آپ کافروں کی جڑ کاٹنے پر قادر ہو گئے۔ اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ آپ نے خاک کی مٹھی پھینک کر ان کو مرعوب نہیں کیا جب آپ نے خاک پھینکی تھی لیکن اللہ نے ان کے دلوں میں رعب پیدا کر دیا۔

(انوار التنزیل مع الکازرونی ج ۳، ص ۹۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۶ھ)

علامہ منصور بن الحسن القرشی المتوفی ۸۶۰ھ اس کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

زیادہ مناسب یہ معنی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خاک کی مٹھی حقیقتاً پھینکی تھی، لیکن اس خاک کو تمام کافروں کی آنکھوں میں پہنچانا یہ اللہ تعالیٰ کا فعل تھا۔ (حاشیہ الکازرونی ج ۳، ص ۹۵-۹۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

اکثر علماء نے اس آیت کا یہ معنی کیا ہے کہ آپ نے خلقتاً اور حقیقتاً خاک کی مٹھی نہیں پھینکی جبکہ آپ نے کسباً اور صورتاً خاک کی مٹھی پھینکی تھی، لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ تمام بندوں کے افعال اسی طرح ہیں، ظاہراً اور کسباً بندے فعل کرتے ہیں اور حقیقتاً اور خلقتاً اللہ تعالیٰ فعل کرتا ہے۔ یعنی فعل کا کسب بندہ کرتا ہے اور فعل کا خلق اور اس کو پیدا اللہ تعالیٰ کرتا ہے، تو پھر نبی ﷺ کے خاک کی مٹھی پھینکنے کی کیا خصوصیت تھی جو یہ فرمایا کہ آپ نے حقیقتاً خاک نہیں پھینکی جب آپ نے بظاہر خاک پھینکی تھی، جب کہ تمام بندوں کے افعال اسی طرح ہیں۔ اس کے جواب میں، میں یہ کہتا ہوں کہ بندہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک قدرت پیدا کی ہے جو اللہ کے اذن سے موثر ہوتی ہے پس جب اللہ سبحانہ چاہتا ہے تو وہ قدرت موثر ہوتی ہے اور جب وہ نہیں چاہتا تو وہ قدرت موثر نہیں ہوتی، یہ بات نہیں ہے کہ بندہ میں بالکل قدرت نہ ہو جیسا کہ جبریہ کہتے ہیں اور نہ یہ بات ہے کہ بندہ کی ایسی قدرت موثر ہے کہ اللہ جس فعل کو کرنا چاہے بندہ اس فعل کو بھی کرے، اور جب یہ معاملہ اس طرح ہے تو میں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ نبی ﷺ نے جو خاک پھینکی تھی یہ وہی پھینکنا ہو، جس پر وہ عظیم اثر مرتب ہو اور نبی ﷺ نے حقیقتاً یہ فعل کیا اور یہ فعل اس قدرت سے کیا جو آپ کو عطا کی گئی تھی اور جو اللہ کے اذن سے موثر تھی۔ لیکن چونکہ یہ فعل خلاف عادت اور خلاف معمول تھا کیونکہ معروف اور معمول یہ ہے کہ بندہ کو جو قدرت دی جاتی ہے اس سے اس قسم کے عظیم آثار پیدا نہیں ہوتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی نبی ﷺ سے نفی کی اور اس فعل کو اپنا فعل قرار دیا۔ گویا کہ یوں

کہا گیا کہ خاک کی اس مٹی کا پھینکنا ہر چند کہ حقیقتاً آپ سے صادر ہوا ہے، اس قدرت کے ساتھ جو اللہ سبحانہ کے اذن سے موثر ہوئی ہے لیکن چونکہ یہ بہت عظیم الشان کام ہے اور عادتاً افعال بشر کے خلاف ہے تو گویا کہ یہ فعل آپ سے صادر نہیں ہوا، بلکہ اللہ جل شانہ سے بلا واسطہ صادر ہوا ہے، اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ آپ نے خاک پھینک کر ان کو مرعوب نہیں کیا جب آپ نے خاک کی مٹی پھینکی تھی لیکن اللہ نے خاک پھینک کر ان کو مرعوب کیا اور اس طرح دونوں آیتوں کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں سے اللہ نے قتل کی نفی کی اور اپنی طرف قتل کرنے کی نسبت کی اور فرمایا سو تم نے ان کو قتل نہیں کیا لیکن ان کو اللہ نے قتل کیا ہے اور مسلمانوں کے لیے اس فعل کو ثابت نہیں کیا اور نبی ﷺ کے متعلق فرمایا آپ نے خاک نہیں پھینکی جب آپ نے خاک پھینکی تھی، پہلے آپ سے اس فعل کی نفی کی پھر آپ کے لیے اس فعل کو ثابت کیا، اور وجہ فرق یہ ہے کہ قتل کرنا کوئی اس قدر مستبعد اور محیر العقول کام نہیں تھا اس لیے عام اصول کے مطابق فرمایا کہ تم نے حقیقتاً ان کو قتل نہیں کیا جب تم نے ان کو ظاہراً قتل کیا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو خاک پھینکی وہ تمام کافروں کی آنکھوں میں پڑ گئی اور وہ مرعوب ہو کر شکست کھا گئے اور چونکہ یہ فعل عام افعال بشر کے منافی تھا اس لیے پہلے اس کی آپ سے ممانعت نفی کی اور پھر اس کو حقیقتاً آپ کے لیے ثابت کیا اور چونکہ آپ نے حقیقتاً یہ فعل اللہ سبحانہ کی دی ہوئی قدرت سے کیا تھا اس لیے فرمایا اللہ نے یہ خاک پھینکی تھی۔ (روح المعانی، ج ۹، ص ۱۸۷-۱۸۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

معجزات کا مقدور ہونا

نبی ﷺ کا خاک کی اس مٹی کو پھینکنا معجزہ تھا اور علامہ آلوسی کی تحقیق اور تقریر کے مطابق آپ نے یہ خاک اللہ سبحانہ کی دی ہوئی قدرت سے پھینکی تھی جو اس کے اذن سے موثر تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات ان کی قدرت اور ان کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ البتہ یہ قدرت اللہ تعالیٰ کے اذن کے تابع ہے۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جزی فعل کے صدور کے وقت تازہ اذن لیا جائے بلکہ اس کے لیے اذن کلی کافی ہے۔ جیسے شفاعت بھی اللہ کے اذن کے بغیر نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے لیے بھی اذن مطلق کافی ہے اور ہر جزی شفاعت کے لیے تازہ اذن لینا ضروری نہیں۔ چنانچہ بکثرت احادیث میں ہے کہ صحابہ آپ سے استغفار کی درخواست کرتے اور آپ ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے اور کہیں یہ وارد نہیں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے استغفار کے لیے اذن لیتے پھر استغفار کرتے، سو یہی حال معجزات کا ہے۔

اچھی آزمائش کا معنی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا تاکہ وہ مومنوں کو اچھی آزمائش کے ساتھ گزارے مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں آزمائش کا معنی انعام ہے، یعنی نبی ﷺ کے اس خاک پھینکنے کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو عظیم نعمت عطا فرمائے گا اور وہ نعمت معرکہ بدر میں مسلمانوں کی فتح ہے اور مال غنیمت اور اجر و ثواب ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معرکہ بدر کی فتح کے بعد اللہ عزوجل مسلمانوں کو آزمائش میں ڈالے گا کہ اس کے بعد کی جنگوں میں وہ بدر کی فتح کے گھمنڈ میں چور ہو جاتے ہیں یا حسب سابق عجز و نیاز کے پیکر بنے رہتے ہیں یا آئندہ وہ اپنی قوت اور عددی برتری پر اترتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر نگاہ رکھتے ہیں۔ پھر فرمایا "اللہ کفار کی چالوں کو کمزور کرنے والا ہے" یعنی اللہ سبحانہ کفار کے دلوں میں رعب ڈال دے گا، حتیٰ کہ وہ بکھر کر کمزور ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (آپ ان کافروں سے کہئے کہ:) اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو لو فیصلہ تمہارے سامنے آچکا ہے اور اگر تم (کفر اور شرک سے) باز آ جاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے پھر یہی حرکت کی تو ہم پھر تمہیں سزا دیں گے،

اور تمہارا گروہ خواہ کتنا زیادہ ہو وہ تمہارے کسی کام نہ آسکے گا اور بیشک اللہ مومنوں کے ساتھ ہے۔ (الانفال: ۱۹)

اللہ نیک مسلمانوں کی نصرت اور حمایت فرماتا ہے، بدکاروں کی نہیں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر تم فیصلہ چاہتے تھے تو تمہارے سامنے فیصلہ آچکا ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ خطاب کفار کی طرف متوجہ ہے۔ امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

زہری نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ابو جہل بن ہشام نے دعا کی ہم میں سے جو جھوٹا ہو اور رشتہ کو منقطع کرنے والا ہو، اس کو آج کے دن ہلاک کر دے، اس کی مراد تھی سیدنا محمد ﷺ اور اس کی اپنی ذات میں سے جو جھوٹا ہو۔

سدی نے بیان کیا ہے کہ جب مشرکین مکہ سے نبی ﷺ کی طرف روانہ ہوئے تو انہوں نے غلاف کعبہ کو پکڑ کر دعا کی۔ اے اللہ! ان دو لشکروں میں سے جو زیادہ عزیز ہو، اور ان دو جماعتوں میں سے جو زیادہ مکرم ہو، اور ان دو قبیلوں میں سے جو زیادہ بہتر ہو اس کو فتح عطا فرما۔

ضحاک نے اس آیت کی تفسیر میں کہا جب مشرکین روانہ ہوئے تو وہ اپنے قافلہ کو دیکھ رہے تھے اور قافلے والوں ابو سفیان اور اس کے اصحاب نے مشرکین کی طرف مدد مانگنے کا پیغام بھیجا تھا۔ تب ابو جہل نے دعا کی: اے اللہ! ہم دونوں میں سے جو تیرے نزدیک بہتر ہو اس کی مدد فرما۔ (جامع البیان جز ۹، ص ۲۷۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

اس کے بعد فرمایا اگر تم باز آ جاؤ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم نے پھر یہی حرکت کی تو ہم پھر تمہیں سزا دیں گے۔ اس میں بھی کفار کو خطاب ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ اگر تم ہمارے رسول سے عداوت رکھنے، ان کی تکذیب کرنے اور ان کے خلاف جنگ کرنے سے باز آ گئے تو یہ دنیا میں بھی تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم قتل کیے جانے، قیدی بنائے جانے اور بہ طور غنیمت تمہارے اموال کے لیے جانے سے بچ جاؤ گے اور آخرت میں بھی تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ تم دائمی عذاب سے بچ جاؤ گے اور ثواب سے مالا مال کیے جاؤ گے، اور اگر تم نے دوبارہ مسلمانوں سے جنگ کی تو ہم دوبارہ مسلمانوں کو تم پر مسلط کر دیں گے اور تم غزوہ بدر میں مشاہدہ کر چکے ہو کہ اللہ کی تائید اور نصرت مسلمانوں کے ساتھ ہے اور تم کتنی ہی بھاری جمعیت کو لے کر کیوں نہ آؤ، وہ تم کو شکست سے نہیں بچا سکتی۔ اور اگر ان آیات کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ ہو جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے، تو معنی اس طرح ہوگا:

جب نبی ﷺ اور مسلمانوں نے کفار کے بہت بڑے لشکر کو دیکھا تو نبی ﷺ اور صحابہ نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر فتح اور نصرت کی دعا کی اور کہا اے اللہ تو نے کفار کی دو جماعتوں میں سے ایک جماعت کا ہم سے وعدہ کیا ہے سو وہ ہمیں عطا فرما، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم نے ہم سے فتح طلب کی تھی سو لو اب فتح آچکی ہے۔ اور اگر تم انفال (اموال غنیمت) میں جھگڑا کرنے سے باز آ گئے اور قیدیوں کا فدیہ لینے سے رک گئے تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے اور اگر تم ان جھگڑوں کی طرف دوبارہ پلٹ گئے تو ہم تمہاری مدد کرنے سے رک جائیں گے کیونکہ ہم نے تم سے جو فتح اور نصرت کا وعدہ کیا ہے، وہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ تم دانا ہماری اطاعت کرو گے اور ہماری نافرمانی نہیں کرو گے، اور اگر تم اسی روش پر برقرار رہے تو تمہاری تعداد کی کثرت بھی تمہیں کچھ نفع نہیں دے سکے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ انہی مسلمانوں کی نصرت اور حمایت کرتا ہے جو گناہوں کا ارتکاب نہیں کرتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنَّهُ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور اس سے اعراض نہ کرو

طبیان القرآن

جلد چہارم

وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ ۚ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ قَالُوا سَمِعْنَا وَهُمْ

جب کہ تم سن رہے ہو ○ اور ان لوگوں کی مثل نہ ہو جانا جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا حالانکہ وہ

لَا يَسْمَعُونَ ۚ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الضُّمُّهُ الْبُكْمُ

نہیں سنتے تھے ○ بے شک اللہ کے نزدیک بدترین جاندار وہ لوگ ہیں جو بہرے گونگے ہیں

الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ۚ وَلَوْ عَلِمَ اللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَأَسْمَعَهُمْ

جو عقل سے کام نہیں لیتے ○ اور اگر اللہ کے علم میں ان میں کوئی بھلائی ہوتی تو وہ ان کو ضرور سنا دیتا،

وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا

اور اگر (بالفرض) وہ ان کو سنا دیتا تو وہ ضرور اعراض کرتے ہونے پشت پھیر لیتے ○ اے ایمان والو!

اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ وَاعْلَمُوا

اللہ اور اس کے رسول کے بلائے پر (فورا) حاضر ہو، جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہارے لیے حیات آفرین ہو

أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَدَىٰ وَقَلْبِهِ ۚ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۚ

اور یقین رکھو کہ انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ حائل ہے اور بیشک تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے ○

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبُ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا

اور اس عذاب سے ڈرتے رہو جو صرف ان ہی لوگوں کو نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں اور یقین رکھو کہ

أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۚ وَذُكِّرُوا إِذْ أَنْتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَعْفِنُونَ

اللہ سخت عذاب دینے والا ہے ○ اور یاد کرو جب تم کم تعداد میں تھے، زمین میں کمزور تھے

فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَنْ يَخَطَّفَكُمْ النَّاسُ فَأُولَٰئِكَ وَآئِدًاكُمْ

جاتے تھے، تم ڈرتے رہتے تھے کہ لوگ تمہیں لٹا کر لیں گے تو اللہ نے تمہیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے

بِنَصْرِهِ دَرَسًا لِّكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۚ يَا أَيُّهَا

تمہیں قوت عطا کی اور پاک چیزوں سے تمہیں روزی دی تاکہ تم شکر ادا کرو ○ اے ایمان والو!

الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَخَوْنُوا أَمْنِيَّتَكُمْ وَ

اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تمہیں

أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۸﴾ وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا مَوَالِكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فَتَنَّا وَ

علم ہو ○ اور یقین رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد محض آزمائش ہیں اور

أَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۲۹﴾

بے شک اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے اعراض نہ کرو جب کہ تم

سن رہے ہو ○ (الانفال: ۲۸)

رسول اللہ ﷺ کے حکم پر عمل کا واجب ہونا

اس آیت میں مسلمانوں سے یہ فرمایا ہے کہ جب تم کسی چیز کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا حکم سن رہے ہو تو اس حکم کی اطاعت کرو اور اس حکم سے اعراض نہ کرو۔ اس جگہ یہ نہیں بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کا وہ کون سا حکم سن رہے تھے جس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہے اور اس سے اعراض کرنا حرام ہے۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس حکم کا ذکر نہ کر کے اس کے عموم پر متنبہ کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم کی اطاعت واجب ہے اور جب رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو کوئی حکم دیں تو ان کے لیے اس حکم پر عمل کرنے یا عمل نہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ اس آیت میں فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلًّا مُبِينًا (الاحزاب: ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی کام کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اپنے (اس) کام میں کوئی اختیار ہو اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی تو بے شک وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اس سے پہلی آیتوں میں چونکہ غزوہ بدر اور جہاد کا ذکر آ رہا تھا تو اس قرینہ سے یہاں بھی جہاد کا حکم دینا مراد ہے اور جہاد میں اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا پڑتا ہے اور اپنے مال کو خرچ کرنا پڑتا ہے اور یہ دونوں چیزیں انسان پر بہت دشوار ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اہمیت کی وجہ سے خصوصاً جہاد کے حکم میں آپ کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہر چند کہ آپ کے ہر حکم کی اطاعت واجب ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا واحد ہونا

اس آیت میں دوسری بحث یہ ہے کہ پہلے فرمایا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو پھر فرمایا "اور اس سے اعراض نہ کرو" چونکہ پہلے دو کی اطاعت ذکر ہے اس لیے یہ ظاہر شدیہ کی ضمیر ذکر کرنی چاہیے تھی یعنی ان سے اعراض نہ کرو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے واحد کی ضمیر ذکر کی ہے۔ امام رازی نے اس کا یہ جواب دیا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اس سے اعراض کرتے ہوئے پیٹھ

نہ پھیرو۔ اور پیٹھ پھیرنا اور اعراض کرنا رسول اللہ ﷺ کے حق میں متصور ہو سکتا ہے اس لیے واحد کی ضمیر ذکر کی اور مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اعراض نہ کرو۔ (تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۲۶۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

اس کا دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت واحد ہے الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ
جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کر لی۔ (النساء: ۸۰) ل۔

اس پر متنبہ کرنے کے لیے واحد کی ضمیر ذکر کی ہے کہ اس کی اطاعت سے اعراض نہ کرو۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے:

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ
بے شک تمہارے پاس آگیا اللہ کی طرف سے نور اور کتاب مبین
اللہ اس کے ذریعہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہ پر لاتا ہے جو اس کی رضا کے طالب ہیں۔ (المائدہ: ۱۶-۱۵)

اس آیت میں پہلے دو چیزوں کا ذکر ہے نور اور کتاب مبین (یعنی رسول ﷺ اور قرآن مجید) اس لیے یہاں بھی بہ ظاہر شیعہ کی ضمیر ذکر کرنی چاہیے تھی۔ یعنی اللہ ان کے ذریعہ..... لیکن چونکہ رسول اللہ ﷺ اور قرآن مجید کی ہدایت واحد ہے اس پر متنبہ کرنے کے لیے واحد کی ضمیر لائی گئی ہے۔

اس کی ایک اور نظیر یہ آیت ہے:

وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُرْضَوْهُ
اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق دار ہے کہ اس کو راضی کیا جائے۔ (التوبہ: ۶۲) جائے۔

یہاں بھی پہلے اللہ اور رسول کا ذکر ہے تو بہ ظاہر شیعہ کی ضمیر لانی تھی لیکن واحد کی ضمیر لائی گئی ہے تاکہ اس پر متنبہ کیا جائے کہ اللہ اور اس کے رسول کی رضا واحد ہے، الگ الگ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان لوگوں کی مثل نہ ہو جانا جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا حالانکہ وہ نہیں سنتے تھے ○

(الانفال: ۲۱)

یہ آیت اس سے پہلی آیت کی تاکید ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ انسان کے لیے کسی حکم کو قبول کرنا اس حکم کو سننے کے بعد ہی ممکن ہے، اس لیے کسی حکم کو سننا اس کو قبول کرنے سے کنا یہ ہے۔ سمع اللہ لمن حمدہ کا معنی ہے جس نے اللہ کی حمد کی اللہ نے اس کو قبول کر لیا۔ پس اس آیت میں یہ فرمایا ہے تم ان لوگوں کی مثل نہ ہو جانا جو زبان سے کہتے ہیں ہم نے اللہ کے احکام کو قبول کر لیا اور وہ اپنے دلوں سے قبول نہیں کرتے کیونکہ یہ منافقین کی صفت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک اللہ کے نزدیک بدترین جاندار وہ لوگ ہیں جو بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں

لیتے ○ (الانفال: ۲۲)

عربی میں دابہ چوپایہ کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں کفار کو جانوروں اور چوپایوں سے تشبیہ دی ہے کیونکہ جس طرح جانور کسی نصیحت سے نفع حاصل نہیں کرتے اسی طرح یہ کفار بھی کسی نصیحت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اسی وجہ سے ان کے متعلق فرمایا یہ بہرے اور گونگے ہیں، کیونکہ یہ کسی حکم کو سن کر اس کو قبول نہیں کرتے اور کسی وعظ اور نصیحت کو سن کر اس سے نفع نہیں اٹھاتے اور اپنی زبان سے کبھی سچ بولتے ہیں نہ سچائی کا اعتراف کرتے ہیں، سو یہ اپنے کانوں اور اپنی زبانوں سے کام نہیں لیتے

اور نہ عقل سے کام لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر اللہ کے علم میں ان میں کوئی بھلائی ہوتی تو وہ ان کو ضرور سنا دیتا اور اگر (بالفرض) وہ ان کو سنا دیتا تو وہ ضرور اعراض کرتے ہوئے پشت پھیر لیتے ○ (الانفال: ۲۳)

اللہ تعالیٰ کی معلومات واقعہ اور اس کی معلومات فرضیہ

اس آیت کا لفظی معنی اس طرح ہے اگر اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم ہو تا تو وہ ان کو ضرور سنا دیتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم نہیں ہے اور اللہ کو جس چیز کے ہونے کا علم نہ ہو اس کا ہونا محال ہے، یعنی اللہ کو اس چیز کے متعلق یہ علم ہو گا کہ وہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر کوئی چیز فی نفسہ نہ ہو اور اللہ کو یہ علم ہو کہ وہ ہے تو یہ علم خلاف واقع ہو گا اور جو علم خلاف واقع ہو وہ جمل ہوتا ہے، اور اللہ کا علم واقع کے مطابق ہے، لہذا جو چیز ہے اس کے متعلق اللہ کو علم ہو گا کہ وہ ہے اور جو چیز نہیں ہے اس کے متعلق اللہ کو علم ہو گا کہ وہ نہیں ہے، اور چونکہ ان میں کوئی خیر نہیں تھی اس لیے اللہ کو علم تھا کہ ان میں کوئی خیر نہیں ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے یوں تعبیر فرمایا کہ اگر اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم ہوتا یعنی اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم نہیں ہے۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ کو ان میں کسی خیر کا علم ہو تا تو وہ ان کو دین حق کے دلائل اور آخرت کے متعلق نصیحتیں سنا تا اور ان کے ذہنوں اور دماغوں میں اس کی فہم پیدا کرتا، اور اگر وہ یہ جاننے کے باوجود کہ ان میں کوئی خیر نہیں ہے اور وہ دلائل اور نصائح سے کوئی نفع حاصل نہیں کریں گے، پھر بھی ان کو دلائل اور نصائح سنا دیتا تو وہ ضرور اعراض کرتے ہوئے پیٹھ پھیر لیتے۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی معلومات کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) تمام موجودات (۲) تمام معدومات (۳) اگر ہر موجود نہ ہو تا تو اس کا کیا حال ہوتا (۴) اگر ہر معدوم موجود ہو تا تو اس کا کیا حال ہوتا۔ پہلی دو قسموں کا علم واقع کا علم ہے اور بعد کی دو قسموں کا علم مفروضات کا علم ہے اور یہ واقعات کا علم نہیں ہے۔ اس کی نظیر قرآن مجید میں منافقین کے متعلق یہ آیت ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِن أُخْرِجْتُمْ
لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا
وَإِن قُوتِلْتُمْ لَنَنصُرَنَّكُمْ وَاللَّهُ يَشْهَدُ أَنَّهُمْ
كَذِبُونَ ○ لَئِن أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ
وَإِن قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ وَلَئِن نَصَرُوهُمْ
لَيَكُونَنَّ الْأَظْهَارُ لَهُمْ لَأَيُّنَصُرُونَ ○

(الحشر: ۱۱-۱۲)

کیا آپ نے ان منافقوں کو نہ دیکھا جو اپنے اہل کتاب کافر بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر تم کو نکالا گیا تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائیں گے اور تمہارے متعلق ہم کسی کی اطاعت نہیں کریں گے اور اگر تم سے قال کیا گیا تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ (منافق) یقیناً جھوٹے ہیں ○ اگر وہ (اہل کتاب) نکالے گئے تو منافق ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے قال کیا گیا تو وہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر (بالفرض) ان کی مدد کی تو وہ ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے پھر ان کی کہیں سے مدد نہیں کی جائے گی ○

اس آیت میں یہ جو فرمایا ہے کہ اگر منافقوں نے اہل کتاب کی مدد کی تو وہ ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے یہ مفروضات کا علم ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ منافقین کا یہ کہنا جھوٹ ہے کہ وہ اہل کتاب کی مدد کریں گے تو ان کا اہل کتاب کی مدد کرنا محال ہے۔ اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بر سبیل فرض فرمایا ہے کہ اگر انہوں نے ان کی مدد کی تو وہ ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

اور مفروضات کے علم کی دوسری مثال یہ آیت ہے:

وَلَوْ رَدُّوْا الْعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ
اور اگر (بالفرض) یہ کافر دنیا میں دوبارہ بھیج دیے گئے تو پھر
(الانعام: ۲۸) یہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو منع کیا گیا تھا۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اگر معدوم چیز موجود ہو جائے تو اس کا کیا حال ہو گا اور یہ ایک فرضی چیز کی مثال ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۷۱-۷۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں اس کی اور بھی مثالیں ہیں:

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَانَا اَوَّلُ
الْعٰبِدِيْنَ O (الزخرف: ۸۱)
آپ کہئے اگر (بالفرض) رحمان کا بیٹا ہوتا تو سب سے پہلے
میں اس کی عبادت کرنے والا ہوتا۔

اس آیت میں بھی معدوم چیز کا حال بیان فرمایا ہے اور یہ بھی فرضی چیز کا علم ہے۔

لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اِلٰهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا
(الانبیاء: ۲۲)
اگر زمین و آسمان میں (بالفرض) اللہ کے سوا اور بھی خدا
ہوتے تو آسمان اور زمین کا نظام الٹ پلٹ ہو جاتا۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ
فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَفْقَرُوْنَ اَلْكِتٰبِ مِنْ قَبْلِكَ
(یونس: ۹۴)
پس اگر (بالفرض) آپ کو اس چیز کے متعلق شک ہو جو ہم
نے آپ کی طرف نازل کی ہے تو آپ ان لوگوں سے پوچھ لیجئے
جو آپ سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں۔

آپ کا قرآن مجید میں شک کرنا معدوم ہے لیکن بالفرض اگر اس کا وقوع ہو تو اس کا حال بیان فرمایا ہے۔

لَئِنْ اَشْرَكَتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ
(الزمر: ۶۵)
اگر (بالفرض) آپ نے (بھی) شرک کیا تو آپ کے عمل
ضائع ہو جائیں گے۔

آپ کا شرک کرنا محال ہے لیکن یہ فرض وقوع اس کا حال بیان فرمایا ہے۔

قرآن مجید میں اس طرح کی اور بھی بہت مثالیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اللہ اور رسول کے بلائے پر (فورا) حاضر ہو، جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہارے لیے حیات آفرین ہو اور یقین رکھو کہ انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ حائل ہے اور بے شک تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے O (الانفال: ۲۴)

فرض نماز میں بھی رسول اللہ ﷺ کے بلائے پر حاضر ہونا واجب ہے، اور نفل نماز میں
ماں کے بلائے پر

جب کوئی شخص نفل نماز پڑھ رہا ہو اور اس کی ماں اس کو نماز میں بلائے تو اس پر واجب ہے کہ نماز توڑ کر ماں کے بلائے پر
حاضر ہو جائے البتہ باپ کے بلائے پر نفل نماز نہ توڑے۔

امام بیہقی نے کھول سے روایت کیا ہے کہ جب تمہاری ماں تمہیں اس حال میں بلائے کہ تم نماز پڑھ رہے ہو تو اس کے
پاس حاضر ہو، اور جب تمہیں تمہارا باپ بلائے تو حاضر نہ ہو حتیٰ کہ تم نماز سے فارغ ہو جاؤ۔

(شعب الایمان، رقم الحدیث: ۷۸۸۳، الدر المنثور، ج ۳، ص ۱۷۳، طبع قدیم، مطبعہ المینہ، مصر، ۱۳۱۴ھ)

امام ابن ابی شیبہ نے محمد بن المنکدر سے روایت کیا ہے کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہاری ماں تم کو نماز میں بلائے تو

اس کی خدمت میں حاضر ہو اور جب تمہارا باپ بلائے تو حاضر نہ ہو۔

(الکتاب المصنف ج ۲، ص ۱۹۳، رقم الحدیث: ۸۰۱۳، امام ابن ابی شیبہ نے اس حدیث کو کھول سے بھی روایت کیا ہے، رقم الحدیث: ۸۰۱۳، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۶ھ)

اور فرض نماز میں سوائے رسول اللہ ﷺ کے اور کسی کے بلائے پر جانا جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بلائے پر حاضر ہونے کی دلیل مذکور الصدر قرآن مجید کی آیت ہے اور درج ذیل احادیث ہیں:

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو سعید بن معلی بنی شیبہ بیان کرتے ہیں میں نماز پڑھ رہا تھا رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا پس میں حاضر نہیں ہوا۔ (جب میں نے نماز پڑھ لی) تو میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ میں نماز پڑھ رہا تھا، آپ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا اللہ اور رسول کے بلائے پر (فوراً) حاضر ہو (الانفال: ۲۳) امام ابو داؤد اور امام نسائی نے اس طرح روایت کیا ہے: میں نماز پڑھ کر حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا: میرے بلائے پر تم کیوں نہیں آئے تھے؟ میں نے عرض کیا میں نماز پڑھ رہا تھا، آپ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا اللہ اور رسول کے بلائے پر (فوراً) حاضر ہو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۰۰۶، ۴۷۰۳، ۴۶۷۳، ۳۳۷۳، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱۳۳۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۹۱۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۷۸۵، سنن دارمی رقم الحدیث: ۳۳۳۷، سنن کبریٰ للسیحی ج ۲، ص ۳۶۸، مسند احمد ج ۳، ص ۲۱۱، المعجم الکبیر ج ۲۲، ص ۲۰۳)

اور امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابی بن کعب کے پاس تشریف لے گئے وہ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے آپ نے فرمایا یا ابی! حضرت ابی نے مڑ کر دیکھا اور حاضر نہیں ہوئے اور حضرت ابی نے جلدی جلدی نماز پڑھی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گئے اور عرض کیا السلام علیک یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا وعلیک السلام! اے ابی جب میں نے تمہیں بلایا تو کس چیز نے تمہیں حاضر ہونے سے روکا تھا؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا! آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر جو وحی نازل کی ہے کیا تم نے اس میں یہ آیت نہیں پڑھی: اللہ اور رسول کے بلائے پر (فوراً) حاضر ہو میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! اور میں انشاء اللہ دوبارہ اس طرح نہیں کروں گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۸۸۳، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۰۱۰)

علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

اس آیت سے اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ جب کسی شخص کو نماز میں بھی بلائیں تو اس پر حاضر ہونا واجب ہے۔ امام شافعی نے کہا اس سے نماز باطل نہیں ہوگی کیونکہ یہ بھی اللہ کے حکم پر عمل کرنا ہے۔ امام رویانی نے یہ کہا ہے کہ نماز میں آپ کے بلائے پر جانا واجب نہیں ہے اور اس سے نماز باطل ہو جائے گی۔ ایک قول یہ ہے کہ جب نمازی یہ دیکھے کہ تاخیر سے کوئی حادثہ ہو جائے گا تو وہ نماز توڑ دے، مثلاً وہ دیکھے کہ ایک نابینا شخص کنوئیں کی سیدھ میں جا رہا ہے اور اگر اس نے اس کو متنبہ نہ کیا تو وہ کنوئیں میں گر جائے گا تو وہ نماز توڑ دے۔ (روح المعانی، جز ۹، ص ۱۹۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

مسلمانوں کے حق میں کیا چیز حیات آفریں ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: جب رسول تمہیں اس چیز کی طرف بلائیں جو تمہارے لیے حیات آفریں ہو، مفسرین کا اس میں

اختلاف ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو مسلمانوں کے لیے حیات آفریں ہے۔

مجاہد نے کہا اس سے مراد حق ہے۔ قتادہ نے کہا اس سے مراد قرآن ہے اس میں حیات اور عفت ہے اور اس میں دنیا اور آخرت کے فتنوں سے حفاظت ہے۔ ابن اسحاق نے کہا اس سے مراد جہاد ہے۔ کیونکہ جہاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ذلت کے بعد عزت اور ضعف کے بعد قوت عطا کی اور جہاد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مسلمانوں کے خلاف جارحیت سے روکا۔ امام ابن جریر کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں حق کو مراد لینا اولیٰ ہے، کیونکہ دشمن کے خلاف جہاد کرنے کے حکم کو ماننا بھی حق میں داخل ہے، اور قرآن کے حکم پر عمل کرنا بھی حق میں داخل ہے اور حق کو قبول کرنے میں ہی قبول کرنے والے کی حیات ہے، کیونکہ دنیا میں اس کا ذکر جمیل باقی رہے گا اور اس میں بھی اس کی حیات ہے اور آخرت میں اس کو جنتوں میں دائمی حیات حاصل ہوگی۔

رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو ان کے اسلام لانے کے بعد قبول حق پر برقرار رہنے کی تلقین فرماتے تھے کیونکہ آپ کے تمام احکام حق تھے اور حضرت ابو سعید بن معلیٰ اور حضرت ابی بن کعب جن کو آپ نے بلا کر یہ آیت سنائی تھی وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ (جامع البیان جزء ۹، ص ۲۸۳-۲۸۲، ملخصاً، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۵ھ)

انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ کے حائل ہونے کے محامل

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: انسان اور اس کے دل کے درمیان اللہ حائل ہے۔ اس کی تفسیر میں بھی متعدد اقوال ہیں:

سعید بن جبیر نے کہا اللہ کافر اور اس کے ایمان لانے کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور مومن اور اس کے کفر کرنے کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس نے کہا کافر اور اس کے ایمان اور اللہ کی اطاعت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ ضحاک نے کہا کافر اور اس کی اطاعت اور مومن اور اس کی معصیت کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔ امام ابن جریر کی رائے یہ ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ اس آیت میں اللہ عزوجل نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ بندوں سے زیادہ ان کے دلوں کا مالک ہے اور جب بندے کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو وہ ان کے ارادوں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کوئی شخص ایمان لا سکتا ہے نہ کفر کر سکتا ہے، نیک کام کر سکتا ہے نہ گناہ کر سکتا ہے۔ (جامع البیان جزء ۹، ص ۲۸۷-۲۸۳، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۲۶۸ھ لکھتے ہیں:

انسان اور اس کی موت کے درمیان اللہ حائل ہو جاتا ہے اور انسان سے جو کام رہ گئے ہوں وہ ان کی تلافی نہیں کر پاتا۔ کہا گیا ہے کہ جنگ بدر کے دن مسلمان کفار کی کثرت سے خوف زدہ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ اللہ انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے وہ ان کے دل کو خوف کے بعد بے خوفی سے بدل دے گا۔ امام ابن جریر کا یہی مختار ہے کہ انسان کے دلوں کا اللہ زیادہ مالک ہے اور وہ اس کی مشیت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے، ایمان نہ کفر، نیکی نہ گناہ۔

(الجامع لاحکام القرآن، جزء ۷، ص ۲۴۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

اس پر یہ اعتراض ہو گا کہ جب سب کچھ اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے تو نیک کاموں پر انسان مدح اور ثواب کا اور برے کاموں پر مذمت اور سزا کا کیوں مستحق ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مشیت کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل میں علم تھا کہ بندے اپنے اختیار اور ارادہ سے کیا کریں گے اور اللہ کے اسی علم کا نام تقدیر ہے۔ اللہ اپنے اس علم ازل کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

بنو آدم کے دلوں کو الٹ پلٹ کرنے کا معنی

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ اکثر یوں قسم اٹھاتے تھے لاومقلب القلوب دلوں کو الٹنے پلٹنے والے کی قسم۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۳۹۱، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۳۰، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۷۷۱، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث:

۲۰۹۲، مسند احمد ج ۲، ص ۲۵، طبع قدیم، رقم الحدیث: ۷۸۸، طبع جدید، سنن داری، رقم الحدیث: ۲۳۵۵)

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

شہر بن حوشب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا یا ام المؤمنین! جب رسول اللہ ﷺ آپ کے پاس ہوتے ہیں تو وہ زیادہ تر کس چیز کی دعا کرتے ہیں۔ حضرت ام المؤمنین نے فرمایا رسول اللہ ﷺ زیادہ تر یہ دعا فرماتے ہیں یا مقلب القلوب! میرے قلب کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کس قدر زیادہ یہ دعا کرتے ہیں یا مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک! آپ نے فرمایا اے ام سلمہ! ہر آدمی کا دل اللہ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہوتا ہے وہ جس دل کو چاہتا ہے سیدھا رکھتا ہے اور جس دل کو چاہتا ہے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ پھر حدیث کے راوی نے یہ آیت تلاوت کی ربنا لاتنغقلوبنا بعد اذ هدیتنا (آل عمران: ۸) اے ہمارے رب ہمیں ہدایت یافتہ کرنے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کرنا۔ امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۲۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۳۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۹۲۳، مسند احمد ج ۲، ص ۱۸۲،

مصنف ابن ابی شیبہ، رقم الحدیث: ۲۹۱۸۸، مطبوعہ بیروت، الشریعہ للاجر، ص ۳۸۶-۳۸۷، المعجم الکبیر للبرہانی، ج ۱، رقم الحدیث: ۷۵۹،

ج ۷، رقم الحدیث: ۷۲۳۲، ج ۲۳، رقم الحدیث: ۷۷۲، ج ۲۳، رقم الحدیث: ۷۸۵، ج ۲۳، رقم الحدیث: ۸۶۵، مجمع الزوائد ج ۷، ص ۲۱۰،

ج ۱۰، ص ۱۷۶، المطالب العالیہ، رقم الحدیث: ۳۶۲، ۳۹۳۰، کنز العمال، رقم الحدیث: ۱۶۸۲، ۱۶۸۳، ۱۶۸۷، ۱۶۹۳، موارد الطمان، رقم الحدیث:

۲۳۱۹، المستدرک، ج ۲، ص ۲۸۹، ۲۸۸)

حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی متوفی ۸۵۲ھ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

دلوں کو الٹ پلٹ کرنے سے مراد ہے دل کے اعراض اور احوال کو الٹ پلٹ کرنا، دلوں کی ذوات کو الٹ پلٹ کرنا مراد نہیں ہے، اور اس حدیث میں یہ دلیل ہے کہ کسی فعل کا داعی، محرک اور باعث اور کسی فعل کا ارادہ اس کو بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ (فتح الباری ج ۱۱، ص ۵۲، مطبوعہ لاہور، ۱۳۰۱ھ)

نیز حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: قرآن مجید میں ہے:

وَنَقَلِبُ أَفْقِدْتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ (الانعام: ۱۱۰)

ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیتے ہیں۔

یعنی ہم جس طرح چاہتے ہیں ان کے دلوں میں تصرف کرتے ہیں۔ معزلہ نے کہا اس کا معنی یہ ہے کہ ہم کافروں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پس وہ ایمان نہیں لائیں گے اور مہر لگانے کا ان کے نزدیک یہ معنی ہے کہ ہم ان کے دلوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں تاکہ وہ جو چاہیں اپنے لیے اختیار کریں۔ اور لغت عرب کے اعتبار سے تغلیب کا یہ معنی صحیح نہیں ہے اور طبع (مہر لگانے) کا معنی ترک کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ اہل سنت کے نزدیک طبع (مہر لگانے) کا معنی ہے کافر کے دل میں کفر پیدا کرنا اور موت تک اس کو اسی حال پر برقرار رکھنا۔ اور حدیث میں ہے اللہ جس طرح چاہتا ہے اپنے بندوں کے دلوں پر تصرف فرماتا ہے۔ حافظ

عسقلانی نے یہ روایت بالمعنی کی ہے۔ اصل حدیث اس طرح ہے: حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تمام بنو آدم کے قلوب رحمن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ایک قلب کی طرح ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے اس میں تصرف فرماتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے مصرف القلوب! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔

(صحیح مسلم القدر، ۱۷، ۶۶۲۶ (۲۶۵۳) السنن الکبریٰ للنسائی ج ۳، رقم الحدیث: ۷۸۶۱)

قاضی بیضاوی نے کہا دلوں کو الٹ پلٹ کرنے کی اللہ کی طرف نسبت کرنے میں یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں پر تصرف فرماتا ہے اور اس نے یہ تصرف اپنی مخلوق میں سے کسی کے سپرد نہیں کیا، اور نبی ﷺ جو یہ دعا فرماتے تھے یا مقلب القلوب! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ اس دعا میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں کے دلوں پر تصرف فرماتا ہے یہ تصرف اس کے تمام بندوں کو شامل ہے حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی شامل ہے اور کسی وہم کرنے والے کے اس وہم کو دفع کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اس تصرف سے مستثنیٰ ہیں اور نبی ﷺ نے خصوصاً اپنے دل کو دین پر ثابت رکھنے کی دعا فرمائی اس میں یہ اشارہ ہے کہ جب نبی ﷺ کا پاکیزہ ترین دل بھی اللہ سبحانہ کی پناہ لینے کا محتاج ہے تو دوسرے لوگ جو آپ سے کیسے کم رتبہ کے ہیں وہ اس دعا کرنے کے کس قدر زیادہ محتاج ہوں گے۔ (فتح الباری، ج ۱۳، ص ۷۷، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۱ھ)

رحمان کی دو انگلیوں سے کیا مراد ہے

علامہ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

انگلی کے ظاہر معنی کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق کرنا محال ہے۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کے اعضاء ہوں تو اس کا ہر جزو دوسرے جزو کی طرف محتاج ہو گا اور وہ مجموعہ مفترق اور حادث ہو گا اور یہ الوہیت کے منافی ہے، اور بعض ائمہ نے اس حدیث کی تاویل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ مجاز بالاستعارہ ہے جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو میری ہتھیلی میں ہے اور فلاں شخص تو میری مٹھی میں ہے اور اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ فلاں شخص پر میں قادر ہوں اور متصرف ہوں اور میں جس طرح چاہوں اس پر تصرف کر سکتا ہوں اور جب اس سے بھی زیادہ مبالغہ کرنا ہو تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص تو میری دو انگلیوں میں ہے یعنی میں بہت آسانی سے اس پر تصرف کر سکتا ہوں، اور بعض علماء نے کہا اس انگلی سے مراد نعمت کو بھی لیا جاسکتا ہے جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی میرے نزدیک اچھی انگلی ہے، یعنی اس کی مجھ پر ایک نعمت ہے جیسا کہ ہاتھ سے نعمت مراد لیتے ہیں۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو بے شمار ہیں تو یہاں صرف دو انگلیوں کا ذکر کیوں فرمایا ہے جس سے دو نعمتیں متبادر ہوتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں لیکن وہ سب نعمتیں دو قسم کی ہیں ایک قسم ہے نفع پہنچانا اور دوسری قسم ہے ضرر دور کرنا۔ گویا کہ یوں کہا گیا کہ تمام بنو آدم کے قلوب اللہ تعالیٰ کے تحت تصرف ہیں وہ جس سے چاہے ضرر دور فرمائے اور جس کو چاہے نفع پہنچائے۔ میں کہتا ہوں اس طور پر یہ جواب اس وقت درست ہو گا جب بنو آدم سے مراد صالحین ہوں، جن کے دلوں کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ متکفل ہے۔ باقی رہے کفار اور فساق تو اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے، ان میں تصرف فرماتا ہے۔ ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے یا زنگ لگا دیتا ہے۔ اور اس صورت میں یہ حدیث مقصود سے خارج ہوگی۔ اس لیے پہلی تاویل زیادہ مناسب ہے۔ اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ حدیث کو تسلیم کرنے میں سلامتی ہے۔ (یعنی انگلی کی کوئی تاویل نہ کی جائے)

رسول اللہ ﷺ نے جو یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! مصرف القلوب! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔ اس سے پہلی تاویل کی تائید ہوتی ہے یعنی تمام بنو آدم کے دلوں کا رحمن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہونا اس معنی میں

ہے کہ وہ تمام بنو آدم کے دلوں پر بہت آسانی سے تصرف کرتا ہے۔

(المفہم ج ۶، ص ۶۷۳-۶۷۴، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت، اکمال اکمال المعلم ج ۹، ص ۲۸-۲۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

علامہ نووی شافعی متوفی ۶۷۶ھ نے اس حدیث کے دو جواب دیے ہیں ایک تو یہی جواب دیا کہ دو انگلیوں سے مراد قدرت اور تصرف ہے اور دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ اس حدیث پر بغیر کسی تاویل اور توجیہ کے ایمان لانا چاہیے اور یہ ایمان رکھنا چاہیے کہ یہ حق ہے اور اس کا ظاہر معنی مراد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (الشوری: ۱۱)

اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔

(صحیح مسلم مع شرح للنوادی، ج ۱۰، ص ۶۷۱۰، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ)

میں کہتا ہوں کہ یہی جواب صحیح ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں کہ رحمان کی انگلیاں ہیں اور وہ انگلیاں مخلوق کی انگلیوں کی مثل نہیں ہیں۔ ان سے کیا مراد ہے یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ ہم اس میں اپنی طرف سے کوئی تاویل اور توجیہ نہیں کرتے، نہ ان کا معنی بیان کرتے ہیں نہ ان کی کیفیت کو ہم جانتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ متوفی ۱۵۰ھ فرماتے ہیں:

اللہ کا ہاتھ ہے اور اس کا چہرہ ہے اور اس کا نفس ہے اور قرآن مجید میں اللہ کے چہرے، اس کے ہاتھ اور اس کے نفس کا جو ذکر ہے، وہ اس کی بلا کیف صفات ہیں اور یہ تاویل نہ کی جائے کہ ہاتھ سے اس کی قدرت ہے یا اس کی نعمت ہے، کیونکہ اس طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی صفت کو باطل کرنا ہے اور یہ قدریہ اور معتزلہ کا قول ہے، لیکن اس کا ہاتھ اس کی بلا کیف صفت ہے اور اس کا غضب اور اس کی رضا بھی اس کی بلا کیف صفات ہیں۔

(الفقہ الاکبر مع شرح الفقہ الاکبر ص ۳۶۰-۳۷۰، مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبي واولاده، مصر)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس عذاب سے ڈرتے رہو جو صرف ان ہی لوگوں کو نہیں پہنچے گا جو تم میں سے ظالم ہیں

اور یقین رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے (الانفال: ۲۵)

ظالموں پر عذاب کے نزول میں صالحین کا شمول

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس بات سے ڈرایا تھا کہ بنو آدم اور ان کے دلوں کے درمیان اللہ حائل ہے، اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتنوں، آزمائشوں اور عذاب سے ڈرایا ہے کہ اگر ظالموں پر عذاب نازل ہو تو وہ صرف ظالموں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ تم سب پر نازل ہو گا اور نیک لوگوں اور بدکاروں سب پر یہ عذاب نازل ہو گا۔

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے درمیان بدکاروں کو نہ رہنے دیں ورنہ اللہ تعالیٰ سب پر عذاب نازل فرمائے گا۔ (جامع البیان جز ۷، ص ۲۸۸، رقم الحدیث: ۱۲۳۴۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

نبی ﷺ کی زوجہ حضرت زینب بنت محسن رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ گھبرائے ہوئے باہر نکلے آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو رہا تھا۔ آپ فرما رہے تھے عرب والوں کے لیے اس شر سے ہلاکت ہو جو قریب آپ پہنچا ہے، آج کا دن یا جوج ماجوج کے سوراخ کی وجہ سے فتح کر لیا گیا ہے، پھر آپ نے انگوٹھے اور انگشت شہادت کو ملا کر حلقہ بنایا اور فرمایا اس کی مثل۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا ہم ہلاک کر دیے جائیں گے حالانکہ ہم میں نیک لوگ بھی ہوں گے؟ آپ نے فرمایا ہاں جب بدکاری بہت زیادہ ہو جائے گی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۳۶، صحیح مسلم الفتن ۲، (۲۸۸۰) ۷۱۰۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۱۸۷)

۳۹۵۳ السن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: (۱۱۳۱۱)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ کی حدود قائم کرنے والے اور اللہ کی حدود کی خلاف ورزی کرنے والے (ترمذی کی روایت میں ہے اللہ کی حدود نافذ کرنے میں سستی اور نرمی کرنے والے) کی مثال اس طرح ہے کہ ایک قوم نے کشتی میں بیٹھنے کے لیے قرعہ اندازی کی، بعض لوگوں کے نام اوپر کی منزل کا قرعہ نکلا اور بعض لوگوں کے نام نچلی منزل کا۔ نچلی منزل والے پانی لینے کے لیے اوپر کی منزل پر گئے پھر انہوں نے کہا کہ اگر ہم کشتی کے پیندے میں سوراخ کر کے سمندر سے پانی لے لیں تو اوپر کی منزل والوں کو زحمت نہیں ہوگی۔ اگر اوپر کی منزل والوں نے ان کو اپنا ارادہ پورا کرنے کے لیے چھوڑ دیا تو سب ڈوب کر ہلاک ہو جائیں گے اور اگر انہوں نے ان کے ہاتھوں کو سوراخ کرنے سے روک دیا تو وہ بھی نجات پالیں گے اور نچلی منزل والے بھی۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۶۸۶، ۲۳۹۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۰، صحیح ابن حبان ج ۱، رقم الحدیث: ۲۹۷، مسند احمد ج ۶، رقم الحدیث: ۱۸۳۸۹، طبع جدید، مسند احمد ج ۳، ص ۲۷۳-۲۷۴-۲۷۸، طبع قدیم، سنن کبریٰ للیستی ج ۱۰، ص ۲۸۸، ۹۱)

حضرت جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس قوم میں گناہوں کے کام کیے جا رہے ہوں اور وہ ان گناہوں کو مٹانے کی قدرت رکھتے ہوں اور پھر نہ مٹائیں تو اللہ ان کو مرنے سے پہلے عذاب میں مبتلا کر دے گا۔

اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اس کی سند حسن ہے۔

(صحیح ابن حبان ج ۱، رقم الحدیث: ۳۰۰، سنن ابوداؤد ج ۳، رقم الحدیث: ۳۳۳۹، سنن ابن ماجہ ج ۲، رقم الحدیث: ۳۰۰۹، مسند احمد ج ۳، ص ۳۶۶، ۳۶۳، طبع قدیم، المعجم الکبیر للبرانی، ج ۲، رقم الحدیث: ۲۳۸۳، ۲۳۸۲، ایک روایت میں ہے کہ جس قوم میں گناہ کیے جائیں، وہ قوم زیادہ اور غالب ہو پھر بھی مدہانت کرے اور خاموش رہے اور برائی کو بدلنے کی کوشش نہ کرے تو پھر ان سب پر عذاب آئے گا، المعجم الکبیر ج ۲، رقم الحدیث: ۲۳۸۵، ۲۳۸۱، ۲۳۸۰، مسند احمد ج ۳، ص ۳۶۳، ۳۶۱، طبع قدیم، سنن کبریٰ للیستی، ج ۱۰، ص ۹۱)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات بیان کی جائے۔ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

(سنن ترمذی، ج ۳، رقم الحدیث: ۲۱۸۱، سنن ابوداؤد ج ۳، رقم الحدیث: ۳۳۳۳، سنن ابن ماجہ ج ۲، رقم الحدیث: ۳۰۱۱، مسند البرزازی، رقم الحدیث: ۳۳۱۳، مجمع الزوائد ج ۷، ص ۲۷۲)

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بنو اسرائیل میں سب سے پہلی خرابی یہ واقع ہوئی کہ ایک شخص دوسرے شخص سے ملاقات کر کے یہ کہتا ہے شخص اللہ سے ڈر، اور جو کام تو کر رہا ہے اس کو چھوڑ دے، کیونکہ یہ کام تیرے لیے جائز نہیں ہے۔ پھر جب دوسرے دن اس سے ملاقات کرتا، تو اس کا وہ کام اس کو اس کے ساتھ کھانے پینے اور اٹھنے بیٹھنے سے منع نہ کرتا۔ جب انہوں نے اس طرح کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل ایک جیسے کر دیے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا بنو اسرائیل میں سے جنہوں نے کفر کیا، ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے تجاوز کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو ان برے کاموں سے نہیں روکتے تھے جو وہ کرتے تھے اور جو کچھ وہ کرتے تھے وہ بہت برا کام تھا۔ (المائدہ: ۷۹-۷۸) پھر آپ نے فرمایا ہرگز نہیں اب خدا تم ضرور نیکی کا حکم دیتے رہنا اور برائی سے روکتے رہنا اور تم

ضرور ظلم کرنے والے کے ہاتھوں کو پکڑ لینا اور تم اس کو ضرور حق پر عمل کے لیے مجبور کرنا، ورنہ اللہ تمہارے دل بھی ایک جیسے کر دے گا پھر تم پر بھی اسی طرح لعنت کرے گا جس طرح ان پر لعنت کی تھی۔

(سنن ابوداؤد ج ۳، رقم الحدیث: ۴۳۳۶، ۴۳۳۷، امام ترمذی نے کہا یہ حدیث حسن غریب ہے، سنن ترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۰۵۸، ۳۰۵۹، سنن ابن ماجہ ج ۲، رقم الحدیث: ۴۰۰۶، مسند احمد ج ۱، ص ۳۹۱، طبع قدیم، امام احمد کی سند میں انقطاع ہے اس لیے یہ سند ضعیف ہے، مسند احمد، تحقیق احمد شاکر، ج ۴، رقم الحدیث: ۳۷۱۳، طبع دار الحدیث قاہرہ، المعجم الاوسط ج ۱، رقم الحدیث: ۵۲۳، حافظ البیہقی نے کہا ہے کہ امام طبرانی کی سند کے تمام راوی صحیح ہیں، مجمع الزوائد ج ۷، ص ۲۶۹)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یہود نے کہا اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، خود ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں، ان کے اسی قول کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی، بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔ (الایہ) (المائدہ: ۶۴)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو جو لوگ بھی اس قوم میں ہوں، ان سب کو عذاب پہنچتا ہے پھر ان کو ان کے اعمال کے مطابق اٹھایا جاتا ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۷۱۰۹، صحیح مسلم مفتہ الجذ ۸۳، (۲۸۷۹) (۷۱۰۱))

بدکاروں کے گناہوں کی وجہ سے نیکو کاروں کو عذاب کیوں ہوگا

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (الانعام: ۱۶۴)

اور کوئی بوجھ اٹھانے والے کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (المدثر: ۳۸)

ہر نفس اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ (البقرہ: ۲۸۶)

اس نے جو نیک کام کیا اس کا فائدہ صرف اسی کو ہے اور اس نے جو برا کام کیا اس کا ضرر صرف اسی کو ہے۔

ان آیات کا تقاضا یہ ہے کہ کسی شخص سے دوسرے کے گناہوں پر گرفت نہیں کی جائے گی اور دوسرے کے گناہوں کا کسی شخص کو عذاب نہیں ہوگا اور مذکور الصدر احادیث میں یہ بیان فرمایا ہے کہ جب عذاب آئے گا تو وہ بدکاروں کے ساتھ نیک لوگوں کو بھی ہوگا اور زیر تفسیر آیت کا بھی یہی منشاء ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب لوگ کسی برائی کو دیکھیں تو ہر دیکھنے والے پر فرض ہے کہ وہ اس برائی کو مٹائے یا اس برائی پر ٹوکے اور ملامت کرے ورنہ کم از کم اس کو دل سے برا جانے اور وہ ان لوگوں سے ناراض ہو اور ان سے محبت کا تعلق نہ رکھے اور جب نیک لوگ ایسا نہیں کریں گے تو وہ گنہ گار ہوں گے اور عذاب الہی کے مستحق ہوں گے۔

امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت جابر بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ایک فرشتہ کی طرف وحی کی کہ فلاں فلاں بستی والوں پر ان کی بستی کو الٹ دو، اس نے کہا اس بستی میں ایک بندہ ہے جس نے ایک پل بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ نے فرمایا اس بستی کو اس شخص پر اور بستی والوں پر الٹ دو کیونکہ میری وجہ سے اس شخص کا چہرہ ایک دن بھی غصہ سے متغیر نہیں ہوا۔ اس حدیث کے دو راویوں کی تضعیف کی گئی ہے، لیکن ابن المبارک اور ابو حاتم نے ان کی توثیق کی ہے۔

(مجمع الزوائد ج ۷، ص ۲۷۰، المعجم الاوسط ج ۸، رقم الحدیث: ۷۱۵۷، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض، ۱۳۱۵ھ)

المائدہ: ۶۲ اور المائدہ: ۷۸ میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے۔ اس موضوع پر سیر حاصل بحث کے لیے ان آیتوں کی تفسیر بھی دیکھی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یاد کرو جب تم تعداد میں کم تھے زمین میں کمزور سمجھے جاتے تھے، تم ڈرتے تھے کہ لوگ تمہیں ملیامیٹ کر دیں گے تو اللہ نے تمہیں پناہ دی اور اپنی نصرت سے تمہیں قوت عطا کی اور پاک چیزوں سے تمہیں روزی دی تاکہ تم شکر ادا کرو (الانفال: ۲۶)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اس کی اطاعت اور شکر گزاری کرے اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔ پھر ان کو یہ حکم دیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی سے اجتناب کریں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو مزید موکد فرمایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے یہ لوگ تعداد اور قوت میں بہت کم تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ظہور کے بعد ان کو بہت قوت اور غلبہ حاصل ہوا اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اور اس کی نافرمانی سے گریز کریں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ تم تعداد میں کم تھے اور تم کو زمین میں کمزور سمجھا جاتا تھا اور تم دوسرے شہروں میں سفر کرنے سے ڈرتے تھے کہ لوگ تم کو لوٹ لیں گے۔ اللہ نے تمہیں پناہ دی بایں طور کہ تمہیں مکہ سے مدینہ منتقل کیا اور تم کفار کے شر سے محفوظ ہو گئے اور اپنی نصرت سے تمہیں قوت عطا کی یعنی جنگ بدر کے دن کفار پر تمہاری ہیبت طاری کر دی جس کے نتیجے میں وہ تم سے تین گنا زیادہ ہونے کے باوجود شکست کھا گئے اور پاک چیزوں سے تمہیں روزی دی یعنی تمہارے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا۔ جبکہ تم سے پہلی امتوں پر وہ حرام تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں سختی سے آسانی کی طرف اور مصیبتوں سے نعمتوں کی طرف منتقل کیا تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو تو انفال (مال غنیمت) کی تقسیم میں تمہارا جھگڑنا مناسب نہیں ہے۔

اسی طرح ہر دور میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اجتماعی اور انفرادی طور پر نعمتوں سے نوازتا ہے اور مصیبتوں سے نجات دے کر راحتوں کی طرف منتقل کرتا ہے لیکن مسلمان ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کے شکر ادا کرنے کو اپنا شعار نہیں بناتے۔ یاد خدا سے غافل رہتے ہیں اور اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل میں لگے رہتے ہیں حتیٰ کہ جب وہ اپنے اعمال سے خود کو اللہ کی نعمتوں کا نااہل ثابت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے اپنی نعمتیں واپس لے لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ
أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ (الشوری: ۳۰)

اور تم کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی کرتوتوں کے سبب پہنچتی ہے اور تمہاری بہت سی خطاؤں کو وہ معاف کر

دیتا ہے۔

انڈس میں آٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد وہاں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے حکومت جاتی رہی بلکہ وہاں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اور صرف عیسائی بننے والوں کو زندہ رہنے دیا گیا اور اب وہاں پر صرف برائے نام مسلمان ہیں اور سلطنت بغداد کو چنگیز اور ہلاکو نے تاراج کیا۔ برصغیر میں کئی صد سالوں پر محیط مسلمانوں کی حکومت انگریزوں نے ختم کی اور ڈیڑھ سو سال تک مسلمانوں کو غلام بنائے رکھا اور ماوراء النہر کی مسلم ریاستیں ایک بڑے عرصہ تک روس کی کالونی بنی رہیں اور وہاں اسلامی اقدار اور آثار کو بڑی بے دردی سے مٹایا گیا اور ماضی قریب میں پاکستان کو دو لخت کیا گیا اور بھارت نے مشرقی پاکستان کو متحدہ پاکستان سے کاٹ کر رکھ دیا۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو چھوڑ دیا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کیا۔ اسی طرح جو لوگ انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتے اور اس کی نعمتوں کی نہ صرف ناشکری

کرتے ہیں بلکہ کفرانِ نعمت کرتے ہیں وہ جلد یا بدیر اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اطاعت پر قائم رکھے اور گناہوں سے بچائے اور اپنا شکر گزار بندہ بنائے رکھے۔ (آمین)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔ حالانکہ تمہیں علم ہو (الانفال: ۲۷)

اللہ اور رسول سے خیانت کی ممانعت کے شان نزول میں متعدد روایات اس آیت کے متعدد شان نزول ہیں:

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

۱۔ عطاء بن ابی رباح روایت کرتے ہیں کہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے مجھے یہ حدیث بیان کی کہ ابو سفیان مکہ سے روانہ ہوا تو حضرت جبرئیل نبی ﷺ کے پاس آئے اور بتایا کہ ابو سفیان فلاں فلاں جگہ میں ہے۔ نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کو بتایا کہ ابو سفیان فلاں فلاں جگہ میں ہے تم اس کی طرف روانہ ہو اور اس خبر کو چھپا کر رکھنا۔ ایک شخص نے ابو سفیان کو یہ پیغام بھیج دیا کہ (سیدنا) محمد ﷺ تم پر حملہ کرنے کے لیے آرہے ہیں سو تم اپنے دفاع اور اپنی حفاظت کا بندوبست کر لو، تب اللہ عزوجل نے آیت نازل فرمائی: اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۲۳۵۸، جز ۷، ص ۲۹۳، الدر المنثور، ج ۴، ص ۴۸)

امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ روایت کرتے ہیں:

۲۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے، ابو مرثد کو اور حضرت زبیر بن ابی العاص کو بھیجا۔ ہم سب گھوڑوں پر سوار تھے، آپ نے فرمایا یہاں سے روانہ ہو اور روضہِ خاخ پر پہنچ جاؤ۔ وہاں مشرکین کی ایک عورت ملے گی جس کے پاس حاطب بن ابن بلتعہ کا مشرکین کی طرف لکھا ہوا ایک خط ہوگا۔ ہم نے اس عورت کا پیچھا کیا جس جگہ کی رسول اللہ ﷺ نے نشاندہی کی تھی وہاں وہ ایک اونٹ پر سوار ہو کر جا رہی تھی۔ ہم نے اس سے کہا وہ خط لاؤ اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ ہم نے اس کے اونٹ کو بٹھالیا اور اس کی تلاشی لی، ہمیں اس کے پاس سے خط نہیں ملا۔ ہم نے کہا رسول اللہ ﷺ نے غلط نہیں فرمایا تھا تم وہ خط نکالو ورنہ ہم تمہارے کپڑے اتار دیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ ہم اس معاملہ میں بالکل سنجیدہ ہیں تو اس نے اپنے بالوں کے جوڑے میں سے وہ خط نکال کر ہمیں دیا۔ ہم وہ خط لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! اس شخص نے اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے، آپ مجھے اجازت دیں تاکہ میں اس کی گردن مار دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حاطب سے پوچھا تم نے کس وجہ سے یہ کام کیا؟ حضرت حاطب نے کہا اللہ کی قسم! میرے دل میں یہ نہیں تھا کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والا نہ رہوں، میرا ارادہ صرف یہ تھا کہ میرا ان مشرکین پر کوئی احسان ہو جائے اس احسان کی وجہ سے اللہ میرے اہل اور مال سے ان کے شر کو دور رکھے اور آپ کے اصحاب میں سے ہر شخص کا وہاں کوئی قبیلہ ہے جس کی وجہ سے اللہ ان کے اہل اور ان کے مال سے کافروں کے شر کو دور رکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا ہے اور اس کے حق میں سوائے خیر کے اور کوئی کلمہ نہ کہنا۔ حضرت عمر نے کہا اس شخص نے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے، آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔ آپ نے فرمایا کیا یہ اہل بدر سے نہیں ہے اور بے شک اللہ اہل بدر کی طرف متوجہ ہو اور فرمایا تم جو چاہو عمل کرو میں نے تمہارے لیے جنت کو واجب کر دیا ہے۔ یا فرمایا میں نے تمہاری مغفرت کر دی ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی

آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۸۳، مسند احمد ج ۱، ص ۱۰۵)

حضرت ابولبابہ انصاری کی توبہ

امام عبد الملک بن ہشام متوفی ۲۱۸ھ روایت کرتے ہیں:

۳- بنو قریظہ نے رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس ابولبابہ بن عبد المنذر کو بھیجیں، ان کا تعلق بنو عمرو بن عوف سے تھا اور یہ اوس کے حلیف تھے۔ (ان کے نام میں اختلاف ہے، رفاعہ، مبشر اور بشر تین قول ہیں۔ آپ حضرت علی کی خلافت تک زندہ رہے۔ الاستیعاب رقم الحدیث: ۳۱۸۰) تاکہ ہم اپنے معاملہ میں ان سے مشورہ کریں۔ پس رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابولبابہ کو بنو قریظہ کی طرف بھیجا، جب بنو قریظہ نے ان کو دیکھا تو ان کے مردان کے پاس کھڑے ہو گئے اور ان کی عورتیں فریاد کرنے لگیں، اور بچے ان کے سامنے رونے لگے۔ یہ دیکھ کر ان کے لیے حضرت ابولبابہ کا دل نرم ہو گیا۔ بنو قریظہ نے ان سے کہا اے ابولبابہ! آپ کا کیا مشورہ ہے کیا ہم (سیدنا) محمد ﷺ کے حکم پر قلعہ سے نکل آئیں؟ انہوں نے کہا ہاں! اور ہاتھ سے اپنے گلے کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ تم کو ذبح کر دیں گے۔ حضرت ابولبابہ نے کہا اللہ کی قسم ابھی میں نے وہاں سے قدم نہیں اٹھائے تھے کہ میں نے یہ جان لیا کہ میں نے اللہ اور اس کے رسول سے خیانت کی ہے۔ پھر حضرت ابولبابہ سیدھے واپس گئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوئے حتیٰ کہ انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا اور کہا میں اس وقت تک بندھا رہوں گا جب تک کہ میری اس خیانت پر اللہ تعالیٰ توبہ قبول نہیں فرمالتا۔ اور اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا کہ میں آئندہ کبھی بنو قریظہ کے پاس نہیں جاؤں گا اور نہ کبھی اس شہر میں جاؤں گا جس میں میں نے اللہ اور اس کے رسول کی خیانت کی تھی۔

عبد اللہ بن ابی قتادہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابولبابہ کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی اے ایمان والو! اللہ در رسول سے خیانت نہ کرو (الانفال: ۲۷) امام ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ نے فرمایا اگر وہ میرے پاس آجاتے تو میں ان کے لیے استغفار کرتا، اور جب انہوں نے اپنے آپ کو باندھ لیا ہے تو میں ان کو اس وقت تک نہیں کھولوں گا جب تک کہ اللہ ان کی توبہ قبول نہیں فرمالتا۔

امام ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ جس دن رسول اللہ ﷺ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تھے، اس دن سحری کے وقت رسول اللہ ﷺ پر حضرت ابولبابہ کی توبہ کی قبولیت نازل ہوئی۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے سحری کے وقت دیکھا رسول اللہ ﷺ ہنس رہے تھے، میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! اللہ آپ کو ہمیشہ ہنستا ہوا رکھے آپ کس وجہ سے ہنس رہے تھے؟ آپ نے فرمایا ابولبابہ کی توبہ قبول کر لی گئی۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کیا میں ان کو یہ خوش خبری نہ دوں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں اگر تم چاہو تو، حضرت ام سلمہ حجرہ کے دروازے پر کھڑی ہو گئیں۔ یہ پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ حضرت ام سلمہ نے فرمایا اے ابولبابہ تمہیں مبارک ہو اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ حضرت ام سلمہ نے فرمایا مسلمان انہیں کھولنے کے لیے جھپٹے۔ حضرت ابولبابہ نے کہا اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ ہی آکر اپنے ہاتھوں سے مجھے کھولیں گے اور جب رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے تو آپ نے انہیں کھول دیا۔

امام ابن ہشام فرماتے ہیں کہ حضرت ابولبابہ ستون کے ساتھ چھ راتیں بندھے رہے، ان کی بیوی ہر نماز کے وقت آکر انہیں کھول دیتی تھیں وہ نماز پڑھتے اور پھر ستون کے ساتھ بندھ جاتے۔ حضرت ابولبابہ کی توبہ کے متعلق جو آیت نازل ہوئی، وہ یہ ہے:

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (التوبة: ۱۰۲)

اور دوسرے مسلمان جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا، انہوں نے کچھ نیک کاموں کو کچھ برے کاموں کے ساتھ ملا لیا، عنقریب اللہ ان کی توبہ قبول فرمائے گا، بے شک اللہ بہت بخشنے والا بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

(السيرة النبوية لابن هشام ج ۳، ص ۲۶۲-۲۶۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۱۵ھ، جامع البیان جز ۷، رقم الحدیث: ۱۲۳۵۹، اسد الغابہ ج ۶، ص ۲۶۰، رقم الحدیث: ۶۳۰۵، اسباب النزول للواحدی رقم الحدیث: ۳۷۷)

امام عبدالرزاق نے اپنی سند کے ساتھ زہری سے روایت کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابولبابہ کی توبہ قبول فرمائی تو انہوں نے کہا یا نبی اللہ! میری توبہ یہ ہے کہ میں اس قوم کے اس علاقہ کو چھوڑ دوں جس میں میں نے گناہ کیا تھا اور میں آپ کے پڑوس میں رہوں اور اپنا تمام مال اللہ اور اس کے رسول کی طرف صدقہ کر دوں، نبی ﷺ نے فرمایا تمہارے لیے صرف تمہاری مال کاہ رزق کرنا کافی ہے۔ (مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث: ۱۶۳۹۷، المستدرک، ج ۳، ص ۶۳۲، کنز العمال، رقم الحدیث: ۱۷۰۳۴)

حافظ ابو عمرو یوسف بن محمد بن عبدالبر القرطبی المتوفی ۴۶۳ھ نے حضرت ابولبابہ کی توبہ کا ایک اور سبب بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے

ہیں:

حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ نے لوہے کی وزنی زنجیروں سے اپنے آپ کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ کئی راتیں باندھے رکھا۔ (علامہ ابن اثیر نے سات سے نو راتیں لکھی ہیں) حتیٰ کہ ان کی سماعت بہت کم ہو گئی اور بینائی بھی بہت کم ہو گئی۔ جب نماز کا وقت آتا یا انہوں نے قضاء حاجت کے لیے جانا ہوتا تو ان کی بیٹی ان کو کھول دیتی اور فارغ ہونے کے بعد پھر ان کو باندھ دیتیں۔

حضرت ابولبابہ نے جو اپنے آپ کو باندھا تھا حافظ ابن عبدالبر نے اس کی کئی وجوہات بیان کی ہیں اور سب سے عمدہ وجہ وہ ہے جو زہری سے مروی ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت ابولبابہ بھی غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے اور نبی ﷺ کے ساتھ نہیں گئے تھے، انہوں نے اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا اور کہا اللہ کی قسم! میں اپنے آپ کو نہیں کھولوں گا اور کوئی چیز کھاؤں گا اور نہ پیوں گا حتیٰ کہ اللہ عزوجل میری توبہ قبول فرمائے یا میں مرجاؤں۔ وہ سات دن بندھے رہے کچھ کھایا نہ پیا حتیٰ کہ بے ہوش ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ ان سے کہا گیا کہ اے ابولبابہ! اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی ہے، انہوں نے کہا یہ خدا میں اپنے آپ کو نہیں کھولوں گا حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ آکر مجھے کھولیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ نے اپنے ہاتھ سے ان کو کھولا۔ التوبہ، ۱۰۳ کی تشریح میں حضرت ابن عباس نے بھی یہی فرمایا ہے کہ یہ آیت حضرت ابولبابہ اور ان کے علاوہ سات، آٹھ یا نو افراد کے متعلق نازل ہوئی ہے جو غزوہ تبوک میں نہیں گئے تھے، پھر وہ نادام ہوئے اور انہوں نے توبہ کی اور انہوں نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا تھا ان کا نیک عمل توبہ تھا اور ان کا برا عمل غزوہ تبوک سے رہ جانا تھا۔

حافظ ابو عمرو فرماتے ہیں کہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابولبابہ کا گناہ یہ تھا کہ وہ بنو قریظہ کے حلیفوں میں سے تھے اور انہوں نے بنو قریظہ کو یہ اشارہ کیا تھا کہ اگر تم سعد بن معاذ کے حکم پر قلعہ سے نکل آئے تو تم کو ذبح کر دیا جائے گا اور انہوں نے اپنے حلقوم کی طرف اشارہ کیا تب یہ آیت نازل ہوئی: اے ایمان والو! اللہ اور رسول سے خیانت نہ کرو۔ (الانفال: ۲۷)

(الاستیعاب ج ۴، ص ۳۰۴-۳۰۵، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۵ھ)

اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت کے محامل

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ وہ مال غنیمت میں خیانت نہ کریں اور اس کو اس لیے خیانت فرمایا

تبیان القرآن

جلد چہارم

کہ یہ اللہ کے عطیہ میں خیانت کرنا ہے اور رسول کی اس لیے خیانت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مال غنیمت کی تقسیم کا والی رسول اللہ ﷺ کو بنایا ہے۔ سو جس شخص نے اس مال غنیمت میں خیانت کی اس نے اللہ اور رسول کی خیانت کی۔ اللہ اور رسول کی امانت میں خیانت کے اور بھی محال ہیں: اللہ کی خیانت فرائض کو ترک کرنا ہے اور رسول کی خیانت آپ کی سنت کو ترک کرنا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ کی خیانت فرائض کو ترک کرنا یا ان کی ادائیگی میں کمی کرنا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ تمام احکام شرعیہ کو مکمل ادا کرنا امانت ہے اور کسی بھی حکم شرعی میں کمی کرنا یا اس کو ترک کرنا خیانت ہے اور مال غنیمت میں خیانت کرنا بھی اس میں داخل ہے ہرچند کہ ان آیات کا نزول مال غنیمت میں خیانت کے متعلق ہے لیکن اعتبار عموم الفاظ کا ہوتا ہے خصوصیت مورد اور سبب کا نہیں ہوتا۔

ابن زید نے کہا اس قسم کی خیانت منافقین کرتے تھے ان کو معلوم تھا کہ وہ کافر ہیں اور وہ پھر بھی ایمان کو ظاہر کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتا ہے:

وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَى
يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ۝
(النساء: ۱۱۴) کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔
اور وہ (منافقین) جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی سے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کو دکھا دیتے ہیں اور اللہ

یہ منافقین تھے جن کو اللہ اور اس کے رسول نے دین کی وجہ سے امن دیا اور وہ خیانت کرتے تھے ایمان ظاہر کرتے تھے اور ان کے باطن میں کفر تھا۔ (جامع البیان ج ۹، ص ۲۹۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

امانت ادا کرنے اور خیانت نہ کرنے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

اس آیت میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی امانتوں میں خیانت نہ کریں۔ امانت ادا کرنے کی تاکید اور خیانت کرنے پر وعید کے متعلق اس آیت کے علاوہ قرآن مجید میں اور یہ آیات ہیں:

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي
أُؤْتِيَ مِنْ أَمَانَتِهِ وَلِيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ (البقرہ: ۲۸۳)
پس اگر تم میں سے ایک کو دوسرے پر اعتبار ہو تو جس پر اعتبار کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ وہ اس کی امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔

بے شک اللہ تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ تم امانت والوں کو ان کی امانت ادا کرو۔
(النساء: ۵۸)

ہم نے آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں پر اپنی امانت کو پیش کیا انہوں نے اس امانت میں خیانت کرنے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اس میں خیانت کی بے شک وہ ظالم اور جاہل ہے۔
(الاحزاب: ۷۲)

اور جو لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں۔
(المؤمنون: ۸)

امانت ادا کرنے اور خیانت نہ کرنے کے متعلق احادیث اور آثار

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ

بولے، جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جاتی تو اس میں خیانت کرے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۵، صحیح مسلم الایمان، ۱۰۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۶۳۸، سنن النسائی رقم الحدیث: ۵۰۲۰، السنن الکبریٰ للنسائی، رقم الحدیث: ۱۱۳۷، مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۷۶، سنن کبریٰ، ج ۶، ص ۲۸۸)

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو تمہارے پاس امانت رکھے اس کی امانت ادا کرو اور جو تم سے خیانت کرے اس کے ساتھ خیانت مت کرو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۱۲۳۳، ۱۲۳۵، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۲۷۱، المستدرک، ج ۲، ص ۲۶، مسند احمد ج ۳، ص ۴، مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۶۰، سنن دارمی، رقم الحدیث: ۲۶۰۰)

۳۔ حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہت بڑی خیانت یہ ہے کہ تمہارا بھائی تم سے کوئی بات کہے اور وہ اس میں سچا ہو اور تم اس کو جھوٹا کہو۔

(مسند احمد ج ۳، ص ۱۸۳، مجمع الزوائد ج ۸، ص ۹۸، اتحاف السادة المهرة ج ۸، ص ۲۶۳، رقم الحدیث: ۶۰۲۳)

۴۔ حضرت عباده بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میرے لیے چھ چیزوں کے ضامن ہو جاؤ تو میں تمہارے لیے جنت کا ضامن ہوں، جب تمہارے پاس امانت رکھی جائے تو تم اس کو ادا کرو، جب تم عہد کرو تو اس کو پورا کرو، جب تم بات کرو تو سچ بولو، تم اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو، اپنی نظروں کو نیچا رکھو اور اپنے ہاتھوں کو کسی کے آگے نہ پھیلاؤ۔ (شعب الایمان ج ۳، رقم الحدیث: ۵۲۵۵، مکارم الاخلاق رقم الحدیث: ۱۷۵، سنن کبریٰ، ج ۶، ص ۲۸۸)

۵۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو جانے سے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے ماسوا امانت کے۔ قیامت کے دن ایک بندہ کو لایا جائے گا خواہ وہ اللہ کی راہ میں شہید ہو چکا ہو۔ اس سے کہا جائے گا کہ اپنی امانت کو ادا کر۔ وہ کہے گا اے رب میں اب کیسے امانت کو ادا کروں اب تو دنیا ختم ہو چکی ہے، پھر کہا جائے گا اس کو دوزخ کی طرف لے جاؤ، اس کو دوزخ کی طرف لے جایا جائے گا پھر اس کے سامنے اس امانت کی مثل پیش کی جائے گی جس شکل و صورت میں اس کو وہ امانت دنیا میں پیش کی گئی تھی۔ وہ اس کو پہچان لے گا وہ اس امانت کے پیچھے دوزخ کے ایک گڑھے میں اترے گا حتیٰ کہ اس کو اٹھا کر اپنے کندھوں پر رکھے گا اور جب وہ گمان کر لے گا کہ وہ اس گڑھے سے باہر نکل رہا ہے تو وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے اس گڑھے میں نیچے گرتا چلا جائے گا۔ پھر حضرت ابن مسعود نے کہا نماز امانت ہے اور وضو امانت ہے اور وزن امانت ہے اور پیمائش امانت ہے اور انہوں نے کئی چیزیں گنیں اور ان سب سے بڑی امانت وہ ہے جو لوگ کسی کے پاس کوئی چیز رکھتے ہیں۔ زازان کہتے ہیں کہ پھر میں حضرت براء بن عازب کے پاس گیا انہوں نے بھی اسی طرح بیان کیا جس طرح حضرت ابن مسعود نے بیان کیا تھا۔ اور قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانت رکھوانے والوں کو ان کی امانتیں ادا کرو۔

(مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۳۵، شعب الایمان، ج ۳، رقم الحدیث: ۵۲۶۶، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۰ھ)

۶۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سب سے پہلے لوگوں سے جو چیز اٹھالی جائے گی وہ امانت ہے، اور آخر میں جو چیز باقی رہ جائے گی وہ نماز ہے اور بہت سے نمازی ایسے ہیں کہ ان کی نماز میں کوئی خیر نہیں ہے۔

(شعب الایمان ج ۳، رقم الحدیث: ۵۲۷۳، السنن الکبریٰ للبیہقی ج ۶، ص ۲۸۹، مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۶۰)

۷۔ حسن بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم کسی شخص کی نماز اور اس کے روزے سے دھوکانہ کھانا، جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے نماز پڑھے لیکن جو امانت دار نہیں وہ دین دار نہیں۔

(مصنف عبدالرزاق ج ۱۱، رقم الحدیث: ۲۰۱۹۲، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۶، رقم الحدیث: ۳۰۳۱۷، شعب الایمان ج ۴، رقم الحدیث: ۵۲۷۹، کنز العمال رقم الحدیث: ۸۴۳۶، مکارم الاخلاق رقم الحدیث: ۱۱۳۶) ۸۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کسی شخص کی نماز کو دیکھو نہ اس کے روزے کو، یہ دیکھو وہ اپنی بات میں کس قدر سچا ہے، اور جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ کس قدر امانت دار ہے اور جب اس پر دنیا پیش کی جائے تو وہ کس قدر متقی ہے۔ (شعب الایمان ج ۴، رقم الحدیث: ۵۲۷۹، کنز العمال رقم الحدیث: ۸۴۳۵)

۹۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے دو حدیثیں بیان کی تھیں، ایک تو پوری ہو چکی ہے اور دوسری کا میں انتظار کر رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں اتری، پھر قرآن نازل ہوا اور لوگوں نے قرآن اور حدیث کا علم حاصل کیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے امانت اٹھ جانے کی پیش گوئی بیان کی اور فرمایا ایک شخص تھوڑی دیر سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکل جائے گی، اور چھالے کی طرح اس کا اثر رہ جائے گا جس طرح پیر کے نیچے انگارہ آنے سے آبلہ پڑ جاتا ہے اور اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا۔ پھر آپ نے ایک کنکری لے کر اس کو اپنے پیر پر لڑھکا دیا اور فرمایا پھر لوگ خرید و فروخت کریں گے اور ان میں سے کوئی بھی امانت داری اور دیانت داری سے کام نہیں لے گا حتیٰ کہ لوگ کہیں گے کہ فلاں قبیلہ میں ایک دیانت دار شخص ہوا کرتا تھا اور یہ کہ فلاں شخص کس قدر بیدار مغز، خوش مزاج اور زیرک ہے، لیکن اس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے۔ اس کے بعد حضرت حذیفہ نے فرمایا ایک وہ وقت تھا جب میں ہر شخص سے بغیر کسی خدشہ اور کھٹکے کے خرید و فروخت کر لیتا تھا اور سوچتا تھا کہ یہ شخص اگر مسلمان ہے تو اس کا دین اس کو خیانت سے روکے گا، اور اگر وہ یہودی یا نصرانی ہے تو حاکم کے خوف سے خیانت نہیں کرے گا لیکن اس زمانے میں، میں فلاں فلاں شخص کے علاوہ خرید و فروخت میں اور کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۳۹۷، صحیح مسلم ایمان: ۲۳۰ (۱۳۳) ۳۲۶۰، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۸۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۰۵۳، مصنف عبدالرزاق ج ۱۱، رقم الحدیث: ۲۰۱۹۲)

۱۰۔ عطا خراسانی بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے فرمایا جو شخص اللہ عزوجل سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس نے کسی شخص کی امانت ادا نہیں کی ہوگی، اللہ عزوجل اس کی نیکیوں کو لے لے گا جب کہ وہاں دینار ہو گا نہ درہم۔ (مکارم الاخلاق للخرائطی، رقم الحدیث: ۱۱۳۸)

۱۱۔ حضرت انس بن مالک نے فرمایا جب کسی گھر میں خیانت ہو تو اس سے برکت چلی جاتی ہے۔

(مکارم الاخلاق للخرائطی، رقم الحدیث: ۱۵۱، مطبوعہ مطبعہ المدنی قاہرہ ۱۳۱۱ھ)

۱۲۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے دین میں سے جو چیز سب سے پہلے گم ہوگی وہ امانت ہے اور آخر میں نماز گم ہوگی۔ ثابت بنانی نے کہا ایک شخص روزے رکھتا ہے، نماز پڑھتا ہے لیکن جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ امانت ادا نہیں کرتا۔

(مکارم الاخلاق للخرائطی رقم الحدیث: ۱۵۵، المعجم الکبیر ج ۹، رقم الحدیث: ۸۶۹۹، حافظ الحدیثی نے کہا اس حدیث کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد ج ۷، ص ۳۲۹)

۱۳۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مومن وہ ہے جس کو لوگ اپنی جان اور مال میں امین سمجھیں۔ (مکارم الاخلاق رقم الحدیث: ۱۵۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۳۳)

۱۴- حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جنت میں جبار داخل ہو گا نہ بخیل، نہ خائن اور نہ بد خلق۔ (مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۵۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۹۵۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۶۹۱)

۱۵- مجاہد نے کہا مکر، دھوکا اور خیانت دوزخ میں ہیں اور مکر اور خیانت مومن کے اخلاق میں سے نہیں ہیں۔

(مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۵۸، المستدرک، ج ۳، ص ۶۰۷)

۱۶- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عنقریب لوگوں کے اوپر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں سچے کو جھوٹا کہا جائے گا اور جھوٹے کو سچا کہا جائے گا اور خائن کو امانت دار کہا جائے گا اور امانت دار کو خائن کہا جائے گا۔

(مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۶۷، مسند احمد ج ۲، ص ۲۹۱)

۱۷- حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جب بھی خطبہ دیا تو اس میں فرمایا سنو جو امانت ادا نہ کرے وہ ایمان دار نہیں اور جو عہد پورا نہ کرے وہ دین دار نہیں۔

(مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۳۷، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۶، ص ۲۸۸، مسند احمد ج ۳، ص ۲۵۱، ۲۱۰، ۱۵۳، ۱۳۵، موارد الظمان رقم الحدیث: ۱۰۰، مجمع الزوائد ج ۱، ص ۹۶، اس کی سند ضعیف ہے)

۱۸- میمون بن مهران نے کہا تین چیزیں ہر نیک اور بد کو ادا کی جائیں گی، صلہ رحمی کرو خواہ نیک ہو یا بد، عہد جس سے بھی کیا ہے پورا کرو خواہ نیک ہو یا بد، ہر ایک کی امانت ادا کرو خواہ نیک ہو یا بد۔ (مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۵۹)

۱۹- حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں اور سچ بولنے کی اور عہد پورا کرنے کی، اور امانت ادا کرنے کی اور خیانت ترک کرنے کی، اور پڑوسی کی حفاظت کرنے کی اور یتیم پر رحم کرنے کی اور ملائمت سے بات کرنے کی اور (ہر مسلمان کو) سلام کرنے کی اور تواضع اور عاجزی کی۔

(حلیۃ الاولیاء ج ۱، ص ۲۳۱-۲۳۰)

۲۰- حضرت ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کو صدقات وصول کرنے کا عامل بنایا جب وہ آیا تو اس نے کہا یہ چیزیں تمہارے لیے ہیں اور یہ چیزیں مجھے ہدیہ کی گئی ہیں۔ نبی ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور آپ نے اللہ کی حمد کے بعد فرمایا ان لوگوں کا کیا حال ہے جن کو ہم اپنے بعض مناصب پر عامل بناتے ہیں پھر وہ ہمارے پاس آ کر یہ کہتا ہے کہ یہ چیز تمہارے لیے ہے اور یہ چیز مجھے ہدیہ کی گئی ہے، وہ اپنی ماں کے گھر میں یا اپنے باپ کے گھر میں کیوں نہ بیٹھ گیا پھر یہ دیکھا جاتا کہ اس کو کوئی چیز ہدیہ کی گئی ہے یا نہیں۔ اور اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے، تم میں سے جو شخص بھی کوئی چیز لے گا، وہ قیامت کے دن اس کی گردن پر سوار ہوگی۔ اگر وہ اونٹ ہے تو وہ بڑبڑا رہا ہوگا، اگر وہ گائے ہے تو وہ ڈکار رہی ہوگی اور اگر وہ بکری ہے تو وہ میا رہی ہوگی! پھر آپ نے ہاتھ بلند کر کے تین دفعہ فرمایا اے اللہ کیا میں نے تبلیغ کر دی ہے!

(مکارم الاخلاق، رقم الحدیث: ۱۳۹، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۵۹۷، ۷۱۷۳، صحیح مسلم الامارہ: ۲۶، (۱۸۳۲) ۳۶۵۶، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۹۳۶، سنن دارمی رقم الحدیث: ۱۶۶۹، مسند احمد ج ۵، ص ۲۲۳-۲۸۵، ۲۷۷)

النساء: ۵۸ میں بھی ہم نے امانت اور خیانت پر کئی لحاظ سے بحث کی ہے۔ سیر حاصل بحث کے لیے اس تفسیر کو بھی دیکھنا چاہیے۔ البتہ امانت اور خیانت کے موضوع پر یہاں زیادہ احادیث بیان کی ہیں اور بعض ان احادیث کا یہاں ذکر نہیں کیا جو وہاں بیان کر دی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یقین رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد محض آزمائش ہیں اور بے شک اللہ ہی کے

پاس اجر عظیم ہے۔ (الانفال: ۲۸)

مال اور اولاد کے فتنہ ہونے کا معنی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال و دولت کی جن نعمتوں سے نوازا ہے اور جو اولاد تمہیں عطا کی ہے وہ تمہارے لیے امتحان اور آزمائش ہیں تاکہ اس آزمائش کے ذریعہ اللہ تعالیٰ یہ ظاہر فرمائے کہ تم مال اور اولاد میں اللہ کے حقوق کس طرح ادا کرتے ہو اور مال اور اولاد کی محبت تمہیں اللہ کے احکام پر عمل کرنے سے مانع ہوتی ہے یا نہیں اور تم یہ یقین رکھو کہ اپنے مال اور اولاد میں تم اللہ کے احکام کے مطابق جو عمل کرتے ہو اس کا اجر و ثواب اللہ ہی کے پاس ہے سو تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو تاکہ آخرت میں تمہیں اجر جزیل مل جائے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا تم میں سے ہر شخص فتنہ میں مبتلا ہے پس تم گمراہ کرنے والے فتنوں سے اللہ کی پناہ طلب کیا کرو۔ (جامع البیان ج ۹، رقم الحدیث: ۷۰۱۲۳، ص ۲۹۵، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

مال اور اولاد کے فتنہ ہونے کے متعلق قرآن مجید کی آیات

اولاد، رشتہ داروں اور مال و متاع کی محبت اگر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت سے مانع ہو تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا:

آپ کہئے کہ اگر تمہارے باپ دادا، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارے رشتہ دار اور تمہارے کمائے ہوئے مال اور تمہاری وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں خطرہ ہے اور تمہارے پسندیدہ مکان، تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہوں تو انتظار کرو حتیٰ کہ اللہ اپنا حکم نافذ کر دے اور اللہ فاسق لوگوں کو منزل مقصود پر نہیں پہنچاتا۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِينُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (التوبة: ۲۴)

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جس نے ایسا کیا تو وہی درحقیقت نقصان اٹھانے والے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (المنافقون: ۹)

مال اور اولاد کے فتنہ ہونے کے متعلق احادیث

رسول اللہ ﷺ نے مال کے فتنہ کے متعلق فرمایا:

حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو بحرین جزیہ لینے کے لیے بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل بحرین سے صلح کر لی تھی اور حضرت علاء بن حضرمی کو ان کا عامل مقرر کر دیا تھا۔ پھر حضرت ابو عبیدہ بحرین سے مال لے کر آئے، انصار کو جب ان کے آنے کی خبر پہنچی تو وہ سب فجر کی نماز میں رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے، رسول اللہ ﷺ نماز پڑھانے کے بعد ان کی طرف مڑ کر بیٹھ گئے وہ سب آپ کے سامنے پیش ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں دیکھا تو آپ مسکرائے، پھر آپ نے فرمایا میرا گمان یہ ہے کہ تم سب کو یہ خبر پہنچ گئی ہے کہ ابو عبیدہ بحرین سے کچھ

مال لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا تمہیں مبارک ہو اور اس چیز کی امید رکھو جس سے تم خوش ہو گے، پس اللہ کی قسم! مجھے تم پر فقر کا خوف نہیں ہے لیکن مجھے یہ خوف ہے کہ دنیا تم پر اس طرح وسیع کر دی جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر دنیا وسیع کر دی گئی تھی، پھر تم دنیا میں اس طرح رغبت کرو گے جس طرح انہوں نے دنیا میں رغبت کی تھی، جس طرح وہ ہلاک ہو گئے تھے، تم بھی اسی طرح ہلاک ہو جاؤ گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۱۵۸، صحیح مسلم الزحد ۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۳۶۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۳۹۹۷، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۷۶۶، مسند احمد ج ۳، ص ۲۲۷-۱۱۳) اور اولاد کے فتنہ ہونے کے متعلق نبی ﷺ کا یہ ارشاد ہے:

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں خطبہ دے رہے تھے۔ اچانک حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما آگئے انہوں نے سرخ قمیصیں پہنی ہوئی تھی وہ چلتے ہوئے لڑکھڑا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ منبر سے اترے، ان کو اٹھایا اور اپنے سامنے بٹھادیا اور پھر آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے سچ ارشاد فرمایا ہے تمہارے اموال اور تمہاری اولاد محض آزمائش ہیں۔ (الانفال: ۲۸) میں نے ان دونوں بچوں کو چلتے ہوئے لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو پھر میں صبر نہ کر سکا حتیٰ کہ میں نے اپنے خطاب کو منقطع کیا اور ان بچوں کو اٹھایا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۷۸۱، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱۱۰۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۳۱۲، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۶۱۶۸) اولاد کی محبت میں انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جائے یا کسی عبادت کو ترک کر دے یا ان کی محبت میں کوئی ناجائز کام کرے تو یہ ممنوع ہے۔ نبی ﷺ نے رحمت اور رقت کے غلبہ سے اپنے ان نواسوں کو جو دوران خطبہ، خطبہ منقطع کر کے اٹھایا تو یہ کسی قسم کا ممنوع کام نہیں تھا بلکہ آپ کا ہر کام وحی الہی کی اتباع میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت حسین کریمین کا جو مرتبہ اور مقام ہے، اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو ان کا بلند درجہ ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے آپ نے ان کو دوران خطبہ اٹھ کر اپنے پاس بٹھایا اور اپنے اس عمل سے آپ نے یہ مسئلہ بتلایا کہ کم سن بچوں پر شفقت کرنی چاہیے اور اگر دوران وعظ کسی داعظ اور خطیب کو ایسی صورت حال سے سابقہ پڑ جائے تو اس کا اپنے بچوں کو دوران وعظ اٹھالینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ آپ کی سنت بھی ہے اور آپ کا بچوں کے اٹھانے پر یہ آیت پڑھنا کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد محض آزمائش ہیں یہ آپ کی تواضع اور آپ کا انکسار ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَشَقُّوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا

اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں کفار سے الگ اور ممتاز کر دے گا

وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝۲۹

اور تمہارے (صغیرہ) گناہوں کو مٹا دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے ۝

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يَخْرُجُوكَ

اور یاد کیجیے جب کافر آپ کے خلاف سازش کر رہے تھے تاکہ آپ کو قید کریں یا قتل کریں یا جلا وطن کر دیں،

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِيْنَ ۝۳۰ وَإِذْ أَنْتَلَىٰ عَلَيْهِمْ

وہ اپنی سازش میں لگے ہوئے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب بہتر خفیہ تدبیر کرنے والا ہے اور جب ان پر ہماری

أَيُّنَّا قَالُوا أَقَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا إِنْ هَذَا إِلَّا

آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں (بس بسنے دو) ہم سن چکے ہیں، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی اس (کلام) کی مثل بنا لیتے، یہ نصرت

أَسَاطِيرِ الْأَوَّلِينَ ۝۳۱ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ

پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ○ اور (یاد کیجیے) جب انہوں نے کہا اے اللہ: اگر یہ (قرآن) تیری جانب سے

مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَابًا مِنَ السَّمَاءِ وَإِنَّنَا بَعْدَ ذَلِكَ

حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر (کوئی دوسرا) دروناک عذاب

أِلَيْهِ ۝۳۲ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ

لے آ ○ اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ انہیں عذاب دے جب کہ آپ ان میں موجود ہوں، اور نہ اللہ اس وقت

اللَّهُ مَعَهُمْ يَنْدُبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝۳۳ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ

انہیں عذاب دینے والا ہے جب کہ یہ استغفار کر رہے ہوں ○ اور اللہ انہیں کیوں عذاب نہیں دے گا

اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا

حالات کہ وہ لوگوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں اور وہ اس (مسجد حرام)

أَوْلِيَاءَ ۚ إِنْ أَوْلِيَاءُ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا

کے متولی نہیں ہیں اس کے متولی تو صرف متقی مسلمان ہی ہوتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں

يَعْلَمُونَ ۝۳۴ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَ

جانتے ○ اور بیت اللہ کے نزدیک ان کی نماز اس کے سوا کیا تھی کہ یہ سینیاں اور تائیاں

تَصْدِيَةً ۚ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝۳۵ إِنْ

بجاتے تھے، سو اب عذاب کو چھو کیوں کہ تم کفر کرتے تھے ○ بے شک

الَّذِينَ كَفَرُوا وَيُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدَّوْا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ

جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے اموال کو اس لیے خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں،

فَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلِبُونَ الَّذِينَ

وہ منقریب اور بھی خرچ کریں گے، پھر ان کے لیے باعثِ پشیمانی ہوگا پھر یہ مغلوب ہو جائیں گے، اور جن لوگوں نے

كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْسِرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَبْذِرَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ

کفر کیا وہ دوزخ کی طرف جمع کیے جائیں گے ○ تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے الگ کر دے،

وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضًا عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمُ جَمِيعًا فَيَجْعَلُهُ

اور سب خبیثوں کو اوپر تلے رکھے، پھر ان سب کا ڈھیر بنا دے، پھر اس (ڈھیر) کو دوزخ میں

فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ﴿٣٧﴾

ڈال دے، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہیں کفار سے الگ اور ممتاز کر دے گا اور

تمہارے (صغیرہ) گناہوں کو مٹا دے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے ○ (الانفال: ۲۹)

کبیرہ گناہوں کے اجتناب سے صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں

اللہ سے ڈرتے رہنے کا معنی ہے تقویٰ اختیار کیے رہنا۔ اور تقویٰ کا معنی ہے ایمان لانے کے بعد تمام فرائض اور واجبات

کو ادا کرنا اور تمام محرمات اور مکروہات سے اجتناب کرنا۔ تقویٰ کا پہلا مرتبہ ہے کبیرہ گناہوں سے بچنا اور دوسرا مرتبہ ہے صغیرہ

گناہوں سے بچنا اور تیسرا مرتبہ ہے خلاف سنت اور خلاف اولیٰ کاموں سے بچنا اور اس آیت میں پہلا مرتبہ مراد ہے یعنی کبیرہ

گناہ سے بچنا۔ کیونکہ اس پر جو دوسری جزاء مرتب کی ہے وہ ہے تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔ اور شرط اور جزاء میں تغایر ہوتا

ہے اس لیے اس آیت کا معنی ہے کہ اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچو گے تو اللہ تمہارے صغیرہ گناہوں کو مٹا دے گا۔

مومنوں اور کافروں کا دنیا اور آخرت میں فرق

اللہ سے ڈرتے رہنے اور تقویٰ اختیار کرنے پر جو پہلی جزا مرتب کی ہے وہ ہے تمہیں کفار سے الگ اور ممتاز کر دے گا۔

اس سے مراد یا دنیا میں الگ اور ممتاز کرنا ہے یا آخرت میں۔ اگر دنیا میں مسلمانوں کو کافروں سے الگ اور ممتاز کرنا مراد ہو تو اس کا

معنی یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں اپنے احوال باطن اور احوال ظاہرہ کے لحاظ سے کافر سے ممتاز ہوتا ہے۔ احوال باطن سے اس لیے کہ

کافر کے دل میں اللہ کا انکار ہوتا ہے اور مسلمان کے دل میں اللہ پر ایمان ہوتا ہے اور کافر کا دل کینہ، بغض، حسد اور مکروہ فریب

سے پر ہوتا ہے اور مومن کا دل ان تمام اوصاف رذیلہ سے پاک اور صاف ہوتا ہے۔ اور مسلمان جس قدر اللہ کی اطاعت کرتا

ہے اس کے دل میں اللہ کی معرفت کا نور بڑھتا جاتا ہے۔ اور جب اس کے دل میں یہ انوار اور تجلیات ہوں تو پھر ان اوصاف

رزیلہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اور احوال ظاہر میں مومن کافر سے اس طرح ممتاز ہوتا ہے کہ مومن کو اللہ کی تائید اور نصرت حاصل ہوتی ہے جبکہ کافر اللہ کی تائید اور نصرت سے محروم ہوتا ہے۔ اور اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مومن آخرت میں کافر سے ممتاز ہو گا تو یہ بالکل ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ مومنوں پر آخرت میں لطف و کرم فرمائے گا ان کو اجر و ثواب عطا فرمائے گا اور جنت میں داخل فرمائے گا اور کافروں کو ذلیل و رسوا کر کے دوزخ میں داخل کر دے گا۔

پھر فرمایا: اور تم کو بخش دے گا۔ اگر دوسرے جز میں گناہوں کے مٹانے سے مراد صغیرہ گناہوں کا معاف کرنا ہو تو بخشنے کا معنی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کی شفاعت سے مسلمانوں کے کبیرہ گناہ بھی بخش دے گا یا اپنے فضل محض سے کبیرہ گناہوں کو بخش دے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گناہوں کو مٹانے سے مراد دنیا میں گناہوں پر پردہ رکھنا ہو اور بخشنے سے مراد آخرت میں گناہوں کو بالکل زائل کرنا ہو۔

جب نبی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے دنیا میں گنہ گاروں کے لیے شفاعت کر دی ہے تو
آخرت میں شفاعت کیوں ہوگی؟

ایک دفعہ مجھ سے ایک عالم نے سوال کیا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہر جمعرات کو مجھ پر تمہارے اعمال پیش کیے جاتے ہیں جو نیک عمل ہوں میں ان پر اللہ کی حمد کرتا ہوں اور جو گناہ ہوں تو میں تمہارے گناہوں پر استغفار کرتا ہوں۔

(الوفابا حوال المصطفیٰ ص ۸۰۱)

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث کے آخر میں ہے ان لوگوں کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہو یا جن کے دل میں ایک جو کے برابر بھی نیکی ہو۔ ان کو جنت کے صحن میں ڈال دیا جائے گا۔ اہل جنت ان کے اوپر پانی چھڑکیں گے۔ پھر ان سے جلن کے آثار دور ہوں گے اور زندگی اور تروتازگی کے آثار نمودار ہوں گے۔

(صحیح مسلم الایمان ۳۱۶، (۱۹۱) ۳۶۱)

تو جب نبی ﷺ نے دنیا میں گنہ گاروں کے لیے استغفار کر لیا تو پھر حشر میں شفاعت کیوں ہوگی! اور جب دنیا اور قبر میں شفاعت ہو چکی تو پھر بعض گنہ گاروں کو دوزخ میں عذاب کیوں ہوگا؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ ان ہی کے لیے شفاعت فرمائیں گے جن کی شفاعت کی اللہ آپ کو اجازت دے گا۔ اور یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت سے بعض گنہ گاروں کی شفاعت کی اجازت آپ کو دنیا میں دے اور بعض کی شفاعت کی اجازت آپ کو حشر میں دے اور جن کو دوزخ میں ڈالا جائے گا ان کی شفاعت کی اجازت آپ کو نہ دے بلکہ محض اپنا فضل ظاہر فرمانے کے لیے کسی کی شفاعت کے بغیر اپنے مجرد کرم سے ان کو بخش دے اور دوزخ سے نکال لے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کی شفاعت کی وجہ سے ان کو صرف صورت عذاب ہو اور حقیقتاً عذاب نہ ہو کیونکہ عذاب تو درد کے ادراک اور احساس کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ جب ان کو دوزخ میں ڈالے تو ان کا ادراک اور احساس زائل کر دے اور اس کو عذاب کا بالکل پتہ نہ چلے جیسے بیہوش کر کے سرجری اور جراحی کا عمل کرتے ہیں تو مریض کو چیر پھاڑ کا بالکل پتہ نہیں چلتا۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے فضل محض سے ان کو دوزخ سے نکال لے اور ان سے جلنے اور عذاب کے آثار کو دور کر دے۔ دوسرا جواب میں نے یہ دیا کہ ہو سکتا ہے دنیا میں آپ ان کی پردہ پوشی یا تخفیف عذاب کے لیے یا قبر کے عذاب سے نجات کے لیے استغفار کریں اور حشر میں بالکل عذاب سے نجات کے لیے استغفار کریں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل

اس کے بعد فرمایا: اللہ بڑے فضل والا ہے۔ اور یہ اس کا کتنا بڑا فضل ہے کہ نیکی کرنے کا جذبہ بھی دل میں وہ پیدا کرتا ہے

پھر اس نیک کام کو کرنے کے لیے بدن میں طاقت اور منہ میں زبان بھی وہ پیدا کرتا ہے۔ اس نیک کام کے لیے جن دیگر اسباب اور ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے ان کو بھی وہ پیدا کرتا ہے، اس نیکی کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہیں ان کو بھی وہ دور کرتا ہے۔ پھر ہم سے کہتا ہے کہ لو یہ تمہارے نیک کاموں کا اجر ہے! بعض اوقات ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ نیکی کرنا چاہتا ہے لیکن وہ شخص اس نیکی سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ مثلاً وہ ایک بھوکے کو کھانا کھلانا چاہتا ہے لیکن اس کے منہ میں کینسر ہے وہ کھا نہیں سکتا۔ ایک شخص کسی مریض کو صحت یاب کرنے کے لیے بے دریغ پیسہ خرچ کرتا ہے لیکن اس کو کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا، اور بعض اوقات کوئی مانع اور رکاوٹ نہ ہو لیکن جس کے ساتھ ہم نیکی کرنا چاہتے ہیں وہ ہماری نیکی قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے تو جس کو ہم نے کھانا کھلا دیا، تو یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اس نے کھانے والے میں کھانے کی صلاحیت پیدا کی۔ ہم نے جس کا علاج کیا تو یہ بھی اس کا کرم ہے کہ اس نے دواؤں میں شفا کی تاثیر رکھی، اور ہم نے جس کے ساتھ نیکی کی تو یہ بھی اس کا فضل ہے کہ اس نے اس شخص میں ہماری نیکی قبول کرنے پر آمادگی پیدا کی سب کچھ تو اس نے کیا ہے پھر اس کا کتنا فضل ہے کہ ہم سے کہتا ہے کہ لو یہ اپنی نیکیوں کا انعام اور اجر و ثواب لے لو!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور یاد کیجئے جب کافر آپ کے خلاف سازش کر رہے تھے تاکہ آپ کو قید کریں یا قتل کریں یا جلاوطن کریں وہ اپنی سازش میں لگے ہوئے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کرنے والا ہے ○

(الانفال: ۳۰)

کفار قریش کا نبی ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کرنا

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ قریش کے ہر قبیلہ کے سردار دار الندوہ میں جمع ہوئے، وہاں ابلیس شیخ جلیل (بوڑھے شخص) کی صورت میں آیا، قریش کے سرداروں نے اس کو دیکھ کر پوچھا تم کون ہو؟ اس نے کہا میں شیخ نجد ہوں، میں نے سنا کہ تم یہاں کسی امر میں مشورہ کے لیے جمع ہو، میں نے چاہا کہ میرا مشورہ بھی اس معاملہ میں شامل ہو جائے۔ انہوں نے کہا ٹھیک ہے تم بھی آ جاؤ۔ شیخ نجد نے کہا تم اس شخص کا کوئی موثر بندوبست کرو ورنہ یہ تمہارے تمام معاملات پر قابض ہو جائے گا۔ کسی نے کہا اس شخص کو زنجیروں میں جکڑ دو پھر حوادث روزگار کا انتظار کرو حتیٰ کہ یہ ہلاک ہو جائے۔ جیسا کہ اس سے پہلے اور شعراء مثلاً زہیر اور ثابتہ ہلاک ہو چکے ہیں۔ شیخ نجد نے چلا کر کہا نہیں نہیں یہ رائے بالکل ناپختہ ہے اگر تم نے اس کو قید کر لیا تو اس کا رب اس کو قید سے نکال لائے گا اور اس کے اصحاب اس کو تمہارے ہاتھوں سے چھڑالیں گے۔ پھر انہوں نے کوئی اور تجویز سوچی، کسی نے کہا ان کو اس شہر سے نکال دو حتیٰ کہ تم سب کو اس سے نجات مل جائے۔ شیخ نجد نے کہا یہ رائے بھی ٹھیک نہیں ہے کیا تم کو اس کی زبان دانی، طلاق لسانی اور دلوں میں اترنے والی شیریں بیانی کا علم نہیں ہے۔ یہ جہاں بھی ہو گا اپنا ایک جتھا بنا لے گا پھر تم پر حملہ کر کے تم سب کو ملیا میٹ کر دے گا۔ سو کوئی اور اسکیم بناؤ۔ تب ابو جہل نے کہا میں تمہیں ایک ایسا مشورہ دیتا ہوں کہ تم نے اس سے بہتر مشورہ پہلے نہیں سنا ہو گا۔ سب نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ ابو جہل نے کہا ہم ہر قبیلہ سے ایک نوخیز نوجوان اور ایک پختہ جوان کو لے لیں اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک برہنہ تلوار ہو اور سب مل کر یکبارگی ان پر نوٹ پڑیں۔ اور جب سب مل کر ان کو قتل کر دیں گے تو ان کا خون ہر قبیلہ کے ذمہ ہو گا اور میں نہیں گمان کرتا کہ بنو ہاشم کا قبیلہ قریش کے تمام قبائل سے جنگ کر سکے گا اور جب وہ قصاص لینے کو مشکل پائیں گے تو دیت لینے پر راضی ہو جائیں گے اور ہم کو ان کی ایذا رسانی سے نجات مل جائے گی۔ شیخ نجد نے بے ساختہ کہا: خدا یہی وہ صحیح اور صائب رائے ہے جو اس شخص نے پیش کی ہے اس کے علاوہ اور کوئی راہ صحیح نہیں ہے۔

پھر وہ نبی ﷺ کو قتل کرنے کا عزم لے کر اٹھے اور اس مجلس سے منتشر ہو گئے اور حضرت جبرئیل نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کا یہ حکم پہنچایا کہ آپ آج رات اپنے بستر پر نہ گزاریں اور آپ کو مدینہ منورہ ہجرت کی اجازت دی اور جب آپ مدینہ منورہ پہنچ گئے تو آپ پر سورہ الانفال نازل کی اور اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں آپ پر اپنی نعمتوں کو یاد دلایا اور یہ آیت نازل فرمائی ”اور یاد کیجئے جب کافر آپ کے خلاف سازش کر رہے تھے تاکہ آپ کو قید کریں یا قتل کریں یا جلا وطن کر دیں وہ اپنی سازش میں لگے ہوئے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کرنے والا ہے۔“

(جامع البیان جز ۹، ص ۳۰۱-۳۰۰، تفسیر ابن کثیر ج ۳، ص ۳۰۷، الدر المنثور ج ۳، ص ۵۱-۵۲، السیرۃ النبویہ لابن ہشام ج ۲،

ص ۹۶-۹۳، سل الہدی والرشاد ج ۳، ص ۲۳۳-۲۳۱، الروض الانف ج ۱، ص ۲۹۱)

اللہ تعالیٰ کا کفار کی سازش کو ناکام کر کے آپ کو ان کے نرغہ سے نکال لانا

علامہ محمد بن یوسف شامی صالحی متوفی ۹۴۲ھ لکھتے ہیں:

جب کفار نبی ﷺ کو قتل کرنے کا عزم کر کے مجلس سے منتشر ہو گئے تو حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا آج رات آپ اپنے اس بستر پر نہ سوئیں جس پر آپ پہلے سویا کرتے تھے اور آپ کی قوم کی سازش کے متعلق خبر دی اور بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکہ سے نکلنے کی اجازت دے دی ہے۔ جب رات کا اندھیرا چھا گیا تو کفار آپ کے دروازہ کے باہر گھات لگا کر بیٹھ گئے کہ کب آپ سوئیں تو وہ اچانک آپ پر ٹوٹ پریں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو دیکھا تو آپ نے حضرت علی بن ابی طالب سے فرمایا تم میری یہ سبز حضری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جاؤ اور ہرگز تمہیں کوئی ناگوار بات نہیں چھوئے گی۔ رسول اللہ ﷺ اسی چادر کو اوڑھ کر سویا کرتے تھے۔

کفار باہر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ابو جہل بن ہشام نے کہا بے شک (حضرت سیدنا) محمد (ﷺ) یہ زعم کرتے ہیں کہ اگر تم نے ان کی پیروی کر لی تو تم عرب اور عجم کے بادشاہ بن جاؤ گے۔ پھر تم جب موت کے بعد اٹھو گے تو تمہارے لیے ایسے باغات ہوں گے جیسے اردن کے باغات ہیں اور اگر تم نے ان کی پیروی نہ کی تو تم قتل ہو گے اور جب مرنے کے بعد تمہیں اٹھایا جائے گا تو تم کو دوزخ کی آگ میں جلایا جائے گا۔ پس رسول اللہ ﷺ باہر آئے اور آپ کی مٹھی میں خاک تھی آپ نے فرمایا ہاں میں یہ کہتا ہوں اور تم ان میں سے ایک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور ان کو کچھ نظر نہ آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہ خاک ان کے سروں پر ڈال دی ان کو کچھ دکھائی نہ دیا اور آپ سورہ یٰسین کی ان آیتوں کی تلاوت کرتے ہوئے باہر نکل آئے:

يٰسٓ ۝ وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ تَنْزِيلَ الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا اُنذِرَ اٰبَاءَهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰی اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلَاقًا فَيَهٰى اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّمَسِّحُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاغْشٰىنَهُمْ فَهُمْ لَا يَبْصُرُوْنَ ۝ (یس: ۱۰۹)

یس ۰ حکمت والے قرآن کی قسم ۰ بے شک آپ ضرور رسولوں میں سے ہیں ۰ صراطِ مستقیم پر (ہیں) ۰ یہ قرآن العزیز الرحیم کا نازل کردہ ہے ۰ تاکہ آپ ان کو ڈرائیں جن کے باپ دادا نہیں ڈرائے گئے سو وہ غافل ہیں ۰ بے شک ان کے اکثر لوگوں پر ہمارا قول ثابت ہو چکا ہے تو وہ ایمان نہیں لائیں گے ۰ بے شک ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں سو وہ اپنے منہ اوپر اٹھائے ہوئے ہیں ۰ ہم نے ایک آڑان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور

ایک آذان کے پیچھے پھر ہم نے ان کو ڈھانپ دیا تو وہ کچھ نہیں دیکھتے ○

پھر رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے ہر شخص کے سر پر مٹی ڈال دی اور پھر آپ نے جہاں چاہا وہاں تشریف لے گئے۔ پھر ان کافروں کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا تم یہاں پر کس کا انتظار کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا (سیدنا) محمد (ﷺ) کا۔ اس نے کہا اللہ نے تمہیں نامراد کر دیا۔ اللہ کی قسم (سیدنا) محمد (ﷺ) یہاں سے چلے گئے ہیں اور وہ تم میں سے ہر شخص کے سر پر مٹی ڈال کر گئے ہیں تم ذرا اپنا جائزہ تو لو۔ پھر ہر شخص نے اپنے سر پر ہاتھ لگا کر دیکھا تو اس کے سر پر مٹی تھی۔ پھر وہ آپ کے گھر گئے تو دیکھا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی چادر اوڑھ کر لیٹے ہوئے ہیں۔ وہ کہنے لگے خدا کی قسم یہ تو (سیدنا) محمد (ﷺ) سوئے ہوئے ہیں اور ان پر ان کی چادر ہے۔ وہ اسی طرح کھڑے رہے حتیٰ کہ صبح ہو گئی اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بستر سے اٹھے۔ تو پھر وہ کہنے لگے خدا کی قسم اس شخص نے ہم سے سچ کہا تھا۔ اور رسول اللہ ﷺ غار ثور کی طرف جا چکے تھے۔

حاکم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی نے اپنی جان کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کی چادر اوڑھ کر آپ کی جگہ سو گئے اور مشرکین کو رسول اللہ ﷺ کی توقع تھی۔ وہ حضرت علی کی گھات لگا کر بیٹھے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس وقت وضو کر رہے تھے جب انہوں نے دیکھا تو کہا افسوس یہ تم ہو یہ تم ہی کرو نہیں بدل رہے تھے تمہارے صاحب تو کرو نہیں نہیں بدلتے تھے۔ اور حاکم نے علی بن حسین رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے اللہ کی رضا کے عوض اپنی جان کو فروخت کیا وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔ اس روز کے واقعہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور یاد کیجئے! جب کافر آپ کے خلاف سازش کر رہے تھے تاکہ آپ کو قید کریں یا قتل کریں یا جلا وطن کریں، وہ اپنی سازش میں لگے ہوئے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرما رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر فرمانے والا ہے۔ (الانفال: ۳۰) اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ سیدنا محمد ﷺ کو قتل کرنے کی سازش کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی سازش کو ناکام کر دیا وہ نامراد ہو گئے اور اللہ عزوجل نے سیدنا محمد ﷺ کو کامیابی اور سرخروئی سے نوازا۔

(سبل الہدیٰ والرشاد، ج ۳، ص ۲۳۳-۲۳۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۳ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جب ان پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں (بس رہنے دو) ہم سن چکے ہیں، اگر ہم چاہتے تو ہم بھی اس کلام کی مثل بنا لیتے، یہ تو صرف پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں (الانفال: ۳۱) نضر بن الحارث کے جھوٹے دعوے

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ ابن جریج سے اس آیت کے شان نزول کے متعلق روایت کیا ہے کہ نضر بن الحارث ایک تاجر تھا اور وہ تجارت کے لیے فارس اور دیگر ممالک کا سفر کرتا تھا۔ اس نے وہاں دیکھا لوگ انجیل پڑھتے تھے اور رکوع اور سجود کرتے تھے۔ جب وہ مکہ میں آیا تو اس نے دیکھا کہ سیدنا محمد ﷺ پر قرآن نازل ہوا ہے اور آپ بھی رکوع اور سجود کرتے ہیں تو نضر نے کہا ہم اس قسم کا کلام سن چکے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ہم بھی ایسا کلام بنا سکتے ہیں۔

(جامع البیان رقم الحدیث: ۱۲۴۰۲، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

علامہ قرطبی متونی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں یہ آیت نضر بن الحارث کے متعلق نازل ہوئی ہے وہ تجارت کے لیے الحیرہ گیا۔ وہاں اس نے کلیلہ اور دمنہ کے قصہ کہانیوں کی کتابیں خریدیں اور کسریٰ اور قیصر کی کتابیں خریدیں اور جب رسول اللہ ﷺ نے گزشتہ امتوں کی خبریں بیان فرمائیں تو نضر نے کہا اگر میں چاہوں تو میں اس طرح کی خبریں سنا سکتا ہوں۔ اور یہ محض اس کے بلند

بانگِ دعوے اور ڈیلیں تھیں اور ایک قول یہ ہے کہ ان کا یہ زعم تھا کہ وہ قرآن کی مثل بنا سکتے ہیں جیسا کہ ابتدا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادوگروں نے یہ زعم کیا تھا لیکن جب انہوں نے اس کی مثل بنانے کی کوشش کی تو وہ عاجز ہو گئے لیکن انہوں نے عناداً کہا کہ یہ تو پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن، جزء ۷، ص ۳۵۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (یاد کیجئے) جب انہوں نے کہا اے اللہ! اگر یہ (قرآن) تیری جانب سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایا، ہم پر کوئی (دوسرا) دردناک عذاب لے آ۔ (الانفال: ۳۲)

اس آیت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے کفار کا یہ کلام نقل کیا ہے: اللہم ان کان هذا هو الحق من عندک فامطر علينا حجارة من السماء او ائتنا بعداب الیم اسی طرح سورہ اسراء میں بھی ان کا کلام نقل کیا ہے:

وَقَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْأَرْضِ يَنْبُوءًا ۖ أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ تَحْتِهَا عِوَابٌ ۖ فَتَفْجُرَ الْأَنْهَارَ حِجَالًا لَهَا تَفْجِيرًا ۖ أَوْ تُسْفِطَ السَّمَاءُ كَمَا زَعَمَتَ عَلَيْنَا كَيْسَفًا ۖ أَوْ تَأْتِيَنَا بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۖ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرٍ أَوْ تَرْفَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَنْ نُؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نُّقْرَهُ ۗ (الاسراء: ۹۳-۹۰)

اور انہوں نے کہا ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے حتیٰ کہ آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں ۚ یا آپ کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو پھر آپ ان کے درمیان بستے ہوئے دریا جاری کر دیں ۚ یا آپ اپنے کہنے کے مطابق ہم پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دیں یا آپ ہمارے سامنے اللہ کو اور فرشتوں کو (بے حجاب) لے آئیں ۚ یا آپ کا سونے کا گھر ہو، یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور ہم ہرگز آپ کے (آسمان پر) چڑھنے پر (بھی) ایمان نہیں لائیں گے،

حتیٰ کہ آپ ہم پر ایک کتاب نازل کریں جس کو ہم پڑھیں۔

یہ کفار کا کلام ہے اور یہ کلام نظم قرآن کی جنس سے ہے تو اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ کفار نے قرآن کی مثل کلام بنا لیا تھا۔ امام رازی نے اس اشکال کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ کلام مقدار میں بہت کم ہے اور اتنی کم مقدار کا کلام قرآن مجید سے معارضہ کے لیے کافی نہیں ہے کیونکہ اتنی کم مقدار کے کلام میں فصاحت اور بلاغت کی وجوہ ظاہر نہیں ہو سکتیں اور یہ جواب اسی وقت چل سکے گا جب ہم یہ دعویٰ کریں کہ قرآن مجید نے تمام سورتوں کی مثل لانے کا چیلنج نہیں کیا بلکہ سورت طویلہ کی مثل لانے کا چیلنج کیا ہے جس میں کلام کی قوت ظاہر ہو سکے۔ (تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۴۷۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۵ھ)

لیکن میرے نزدیک یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید کی تمام سورتیں معجزہ ہیں اور کوئی سورت بڑی ہو یا چھوٹی اس کی کوئی شخص نظیر نہیں لاسکتا۔ بلکہ قرآن مجید کی ہر آیت معجزہ ہے اور کوئی شخص کسی آیت کی بھی نظیر نہیں لاسکتا، اور اللہ تعالیٰ ان آیتوں میں کفار کا جو کلام نقل کیا ہے یہ بعینہ ان کا کلام نہیں ہے وہ اتنا فصیح و بلیغ کلام نہیں کہہ سکتے تھے۔ انہوں نے جو کچھ بھی کہا تھا اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے فصیح و بلیغ کلام میں منتقل کر کے بیان فرمایا ہے۔ اور یہ درحقیقت اللہ کا کلام ہے کفار کا کلام نہیں ہے۔ البتہ کفار کے کلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں ڈھال کر بیان فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ انہیں عذاب دے جب کہ آپ ان میں موجود ہوں اور نہ اللہ (اس وقت) انہیں عذاب دینے والا ہے جب کہ یہ استغفار کر رہے ہوں ۚ اور اللہ انہیں کیوں عذاب نہیں دے گا حالانکہ وہ

لوگوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں اور وہ اس (مسجد حرام) کے متولی نہیں ہیں اس کے متولی تو صرف متعقی مسلمان ہی ہوتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے O (الانفال: ۳۳-۳۴)

کسی قوم میں جب اس کا نبی موجود ہو تو اس قوم پر عذاب نہیں آتا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ اگر قرآن حق ہے اور وہ اس کے منکر ہیں تو ان پر آسمان سے پتھر کیوں نہیں برستے اور کوئی عذاب کیوں نہیں آتا۔ اس کا اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا ہے کہ جب تک (سیدنا) محمد ﷺ ان کے درمیان موجود ہیں ان پر عذاب نہیں آئے گا اور یہ آپ کی تعظیم کی وجہ سے ہے اور تمام انبیاء سابقین علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یہی عادت جاری رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی بستی والوں پر اس وقت تک عذاب نہیں بھیجا جب تک کہ اپنے نبی کو وہاں سے نکال نہیں لیا۔ جیسا کہ حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوط علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے ان کی بستیوں سے باہر بھیج دیا اس کے بعد ان کی بستیوں پر عذاب نازل فرمایا۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جب انبیاء علیہم السلام کا ان کے درمیان موجود ہونا نزول عذاب سے مانع ہے تو پھر انبیاء علیہم السلام کے ہوتے ہوئے ان کے خلاف جہاد اور قتال کیوں مشروع کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مسلسل کفر اور رسول اللہ ﷺ کی اہانت کی بناء پر آسمان سے عذاب کا نزول اور چیز ہے جس سے کافروں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے اور ایمان کی دعوت کو مسترد کرنے کے نتیجہ میں ان سے قتال اور جہاد کرنا اور چیز ہے۔ کفار کے استغفار کی متعدد تفاسیر

کفار پر عذاب نازل نہ کرنے کی دوسری وجہ یہ بیان فرمائی کہ وہ استغفار کر رہے ہوں۔ امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ اس آیت کی تفسیر میں ابو مالک سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان اہل مکہ میں عذاب نازل نہیں فرمائے گا جب کہ ان اہل مکہ میں مسلمان بھی موجود ہیں جو استغفار کرتے ہیں۔ ابن ابزی نے کہا جب تک مکہ میں مسلمان ہیں جو استغفار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا اور جب مسلمان مکہ سے چلے گئے تو فرمایا اللہ ان پر عذاب کیوں نہ نازل کرے حالانکہ یہ مشرکین مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکتے ہیں۔ ابو موسیٰ نے کہا تمہارے لیے دو امانیں تھیں۔ ایک نبی ﷺ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ ان پر عذاب نازل کرے حالانکہ آپ ان میں موجود ہیں اور نبی ﷺ کے رفیق اعلیٰ سے ملنے کے بعد یہ امان تو اب نہیں رہی اور دوسری امان قیامت تک کے لیے ہے اور وہ اللہ سے استغفار کرنا ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۹۳) اور اس کی دوسری تفسیر یہ ہے:

قائد نے بیان کیا ہے کہ اہل مکہ استغفار نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ استغفار کرتے تو ان کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ عکرمہ نے اس کی تفسیر میں کہا انہوں نے عذاب کا سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ آپ کے ہوتے ہوئے ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا اور نہ اس وقت ان پر عذاب نازل کرے گا جبکہ وہ اسلام میں داخل ہو رہے ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر میں فرمایا اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت عذاب نہیں دیتا جب اس کے نبی اس قوم میں موجود ہوں، وہ اپنے نبیوں کو ان کے درمیان سے نکال لاتا ہے پھر ان پر عذاب نازل فرماتا ہے اور جو ان میں سے پہلے ایمان لا چکے ہوں ان پر بھی عذاب نازل نہیں فرماتا اور مجاہد نے کہا جب وہ نماز پڑھ رہے ہوں تو ان پر عذاب نازل نہیں فرماتا۔

امام ابن جریر نے کہا ان اقوال میں اولیٰ یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیک وسلم اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ ان کو عذاب دے جب کہ آپ ان میں موجود ہیں، حتیٰ کہ اللہ آپ کو ان کے درمیان سے باہر لے آئے کیونکہ وہ کسی بستی کو اس وقت ہلاک نہیں کرتا جب ان میں ان کا نبی موجود ہو۔ اور نہ اللہ اس وقت ان پر عذاب نازل فرماتا ہے جب وہ اپنے کفر اور گناہوں پر استغفار کر

رہے ہوں۔ لیکن وہ اپنے کفر سے توبہ نہیں کرتے بلکہ وہ اس پر اصرار کرتے ہیں پھر فرمایا اور اللہ انہیں کیوں عذاب نہیں دے گا حالانکہ وہ لوگوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں اور وہ اس (مسجد حرام) کے متولی نہیں ہیں اور اس کے متولی تو متقی مسلمان ہی ہوتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے اور اللہ تعالیٰ نے مکہ سے نبی ﷺ کی ہجرت کے بعد ان کو میدان بدر میں تلوار کے عذاب سے دوچار کیا۔ بعض علماء نے کہا یہ دوسری آیت پہلی آیت کے لیے ناخ ہے، لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے کیونکہ ان دونوں آیتوں میں خبر دی گئی ہے اور نسخ خبر میں نہیں امر اور نہی میں واقع ہوتا ہے۔

اس آیت میں جو فرمایا ہے مسجد حرام کے ولی تو صرف متقی مسلمان ہیں یعنی جو مسلمان اللہ کے فرائض کو ادا کرتے ہیں اور گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کے اصحاب ہیں۔

(جامع البیان ج ۹، ص ۳۱۶-۳۰۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور بیت اللہ کے نزدیک ان کی نماز اس کے سوا کیا تھی کہ یہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے سو

اب عذاب کو چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے (الانفال: ۳۵)

مشکل اور اہم الفاظ کے معانی

علامہ راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں پرندہ جو سیٹی بجانے کی آواز نکالتا ہے اس کو مکاء کہتے ہیں۔ اس میں اس پر متنبہ کرنا ہے کہ ان کا سیٹی بجانا قلت غناء میں پرندوں کی سیٹیوں کے قائم مقام ہے۔ (المفردات، ج ۲، ص ۶۱۰، مطبوعہ مکہ مکرمہ) صدی کا معنی ہے گونج دار آواز جو مثلاً کسی پہاڑ یا گنبد سے ٹکرا کر آتی ہے۔ (المفردات، ج ۲، ص ۳۶۶، مطبوعہ مکہ مکرمہ)

علامہ محمود بن عمر زمشوری متوفی ۵۲۸ھ لکھتے ہیں:

المکاء ایک پرندہ ہے جو بہ کثرت سیٹیاں بجاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو مکاء کہتے ہیں اور تصدیہ کا معنی ہے تالی بجانا۔

(الکشاف، ج ۲، ص ۲۱۸، مطبوعہ ایران)

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا قریش بیت اللہ میں برہنہ طواف کرتے تھے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔ مجاہد نے کہا وہ نبی ﷺ کے طواف کرتے وقت معارضہ کرتے تھے، آپ کے طواف اور آپ کی نماز میں خلل ڈالنے کے لیے سیٹیاں بجاتے تھے۔ مقاتل نے کہا جب نبی ﷺ مسجد حرام میں نماز پڑھتے تو وہ آپ کے دائیں اور بائیں کھڑے ہو کر سیٹیاں بجاتے تاکہ آپ کی نماز میں التباس اور اشتباہ پیدا کریں۔ پس حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول پر ان کا سیٹیاں اور تالیاں بجانا ان کی عبادت تھی۔ اور مجاہد اور مقاتل کے قول پر وہ نبی ﷺ کو ایذا پہنچانے کے لیے ایسا کرتے تھے اور حضرت ابن عباس کا قول زیادہ قریب بہ صحت ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان افعال کو ان کی نماز قرار دیا ہے۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۸۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۱۵ھ)

جاہل صوفیاء کے رقص و سرود پر علامہ قرطبی کا تبصرہ

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

قرآن مجید نے سیٹیاں بجانے اور تالیاں پٹنے کی جو مذمت کی ہے اس میں ان جاہل صوفیاء کا رد ہے جو رقص کرتے ہیں، تالیاں

پٹتے ہیں اور بے ہوش ہونے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ (الجامع لاحکام القرآن، جزء ۷، ص ۳۵۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

سواب عذاب کو چکھو کیونکہ تم کفر کرتے تھے۔ اس عذاب سے مراد تلوار کا عذاب ہے جو ان کو جنگ بدر کے دن پہنچا اور

یا ان سے یہ قول آخرت میں کہا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے اموال کو اس لیے خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں، وہ عنقریب اور بھی خرچ کریں گے پھر یہ ان کے لیے باعثِ پشیمانی ہوگا، پھر یہ مغلوب ہو جائیں گے اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ دوزخ کی طرف جمع کیے جائیں گے ○ تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے الگ کر دے اور سب خبیثوں کو اوپر تلے رکھے، پھر ان سب کا ڈھیر بنا دے پھر اس (ڈھیر) کو دوزخ میں ڈال دے، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں ○

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی بدنی عبادت کا حال بیان فرمایا کہ ان کی بدنی عبادت سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا ہے۔ اور اب ان آیتوں میں ان کی مالی عبادت کا حال بیان فرما رہا ہے کہ لوگوں کو اللہ کے دین سے روکنے کے لیے یہ مال خرچ کرتے ہیں اور یہی ان کے نزدیک ان کی مالی عبادت ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ کفار اپنا مال مشرکین کو دیتے ہیں تاکہ وہ اس مال کے ذریعے قوت حاصل کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان کا یہ مال خرچ کرنا عنقریب ان کے لیے ندامت کا سبب ہوگا۔ کیونکہ ان کے اموال خرچ ہو جائیں گے اور ان کی تمنا پوری نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اللہ کے نور کو بھجھادیں اور کلمتہ الکفر کو کلمتہ اللہ پر غالب کر دیں اور اللہ تعالیٰ اپنے کلمہ کو بلند کرتا ہے اور کلمتہ الکفر کو پست کرتا ہے۔ پھر مسلمانوں کو غلبہ عطا فرماتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر کرنے والوں کو قیامت کے دن جمع کرے گا اور ان کو عذاب دے گا۔ پھر ان کو اپنے ساتھ زندہ رہنے والوں اور مرنے والوں کے انجام پر اور اپنے انجام پر حسرت اور ندامت ہوگی۔ کیونکہ جو کافران کے ساتھ زندہ رہے ان کا مال اس جنگ میں ضائع ہو گیا اور وہ غمزدہ اور شکست خوردہ لوٹے اور جو ہلاک ہو گئے وہ قتل کیے گئے اور ان کے ہتھیار، سواری اور لباس اتار کر مجاہدین کو دیے گئے اور ان کو بہ عجلت دائی عذاب اور آگ میں ڈال دیا گیا اور جس شخص نے اس مہم میں مال خرچ کرنے کا انتظام کیا تھا وہ حسب ذیل روایات کے مطابق ابو سفیان ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

الحکم بن عتیبہ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت ابو سفیان کے متعلق نازل ہوئی ہے جس نے جنگ احد میں مشرکین کے اوپر چالیس اوقیہ سونا خرچ کیا تھا اور ایک اوقیہ اس وقت ۲۲ مثقال کا تھا۔

محمد بن یحییٰ، عاصم بن عمر اور الحصین بن عبدالرحمن بیان کرتے ہیں کہ جب جنگ بدر میں مسلمانوں نے کفار پر غلبہ حاصل کر لیا اور کفار شکست خوردہ ہو کر مکہ لوٹے، ادھر ابو سفیان بھی اپنے قافلہ کو لے کر مکہ پہنچ گیا۔ تو عبد اللہ بن ربیعہ، عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان بن امیہ چند قریش کے ساتھ لے کر ان لوگوں کے پاس تعزیت کے لیے گئے جن کے باپ، بھائی اور بیٹے اس جنگ میں مارے گئے تھے۔ انہوں نے ابو سفیان بن حرب اور قافلہ کے دیگر تاجروں سے کہا کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) نے تمہیں شکست سے دو چار کیا اور تمہارے بہترین جنگ جوؤں کو قتل کر دیا اب تم ان کے خلاف جنگ میں اس مال سے ہماری مدد کرو۔ ہو سکتا ہے کہ دوسری بار جنگ میں ہم اس شکست کی تلافی کر لیں، تو تمام کفار تاجر اس تجویز پر راضی ہو گئے۔ امام ابن جریر نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ مشرکین مسلمانوں پر حملہ کرنے اور لوگوں کو اللہ کے دین سے روکنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں اور یہ نہیں بتایا کہ وہ ابو سفیان ہے یا کوئی اور، بلکہ بالعموم کفار کے مال خرچ کرنے کی خبر دی ہے۔ اور یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کس جنگ میں مال خرچ کر رہے تھے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس آیت سے معرکہ بدر میں مال خرچ کرنے والے کافر مراد

تبیان القرآن

جلد چہارم

ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد جنگ احد میں مال خرچ کرنے والے کافر مراد ہوں۔

(جامع البیان ۷: ۹، ص ۳۲۳-۳۲۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

اس کے بعد فرمایا تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے الگ کر دے اور سب خبیثوں کو اوپر تلے رکھے، پھر ان سب کا ڈھیر بنا دے پھر اس (ڈھیر) کو دوزخ میں ڈال دے، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ (الانفال: ۳۷)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار اور مومنین کے درمیان فرق کا ذکر فرمایا ہے اور کفار کو خبیث فرمایا ہے۔ اور مسلمانوں کو طیب فرمایا ہے۔ یہ ان کے درمیان دنیا میں فرق ہے اور آخرت میں فرق یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنت میں داخل فرمائے گا اور کفار کو دوزخ میں داخل فرمائے گا۔

قُلْ لِلدِّينِ كَفْرًا وَإِنْ يَسْتَهُوا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ

آپ کافروں سے کہہ دیجیے کہ اگر وہ (کفر سے) باز آجائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور

إِنْ يَعُودُوا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْأَوَّلِينَ ۚ وَقَاتِلُوهُمْ ۚ

اگر انہوں نے پھر وہی کام کیے تو (اس معاملہ میں) پہلوں کی سنت گزر چکی ہے ○ اور ان کے خلاف جنگ کرتے

حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً ۚ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ

رہو حتیٰ کہ کفر (کا غلبہ) نہ رہے اور پورا دین (صرف) اللہ کے لیے ہو جائے پس اگر وہ

أَنْتُمْ أَفْوَاقًا ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۚ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَعَلِمُوا

باز آجائیں تو بے شک اللہ ان کے کاموں کو دیکھنے والا ہے ○ اور اگر وہ روگردانی کریں تو یقین رکھو کہ

أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ ۚ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ۚ

بیشک اللہ تمہارا کارساز ہے، وہ کیا اچھا کارساز اور کیا اچھا مددگار ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ کفر سے باز آجائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور اگر انہوں نے پھر وہی کام کیے تو اس معاملہ میں پہلوں کی سنت گزر چکی ہے ○ (الانفال: ۳۸)

سابقہ آیات سے ارتباط اور شان نزول

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی مالی عبادتیں اور بدنی عبادتیں بیان فرمائی تھیں اور اس آیت میں ان کو اسلام لانے کی دعوت دی ہے۔

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اے نبی مکرم! آپ ان مشرکوں سے کہہ دیجئے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کرنے اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے سے باز آجائیں اور ایمان لے آئیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے گناہ معاف کر دے گا اور اگر ان مشرکوں نے پھر آپ کے خلاف جنگ کی اور مسلمانوں پر حملہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے جس طرح جنگ بدر میں مسلمانوں کی مدد کی

تھی اور مشرکین کو شکست اور رسوائی سے دوچار کیا تھا وہ پھر ایسا ہی کرے گا۔ کیونکہ اس معاملہ میں اللہ کی سنت پہلوں میں جنگ بدر میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح پچھلی امتوں کے کافروں نے جب اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی اور سرکشی کی اور ان رسولوں کی نصیحت کو قبول نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو عبرت ناک عذاب سے دوچار کر دیا۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي

اللہ نے لکھ دیا ہے کہ یقیناً ضرور بہ ضرور غلبہ مجھے ہو گا اور میرے رسولوں کو ہو گا۔

(المجادلہ: ۲۱)

اور بے شک ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ

الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (الانبیاء: ۱۰۵)

ایمان لانے سے سابقہ گناہوں کے معاف ہونے کے متعلق قرآن اور سنت سے دلائل

اس آیت میں فرمایا ہے کہ اگر کافر کفر سے باز آجائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ قرآن مجید میں ہے:

اور جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی پرستش

وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَلَا

نہیں کرتے اور اس شخص کو قتل نہیں کرتے جس کے قتل

يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا

کرنے کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو

يَزْنُونَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ۝ يُضَعَفُ

ایسا کرے گا وہ سزا پائے گا ۝ قیامت کے دن اس کو دگنا عذاب

لَهُ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدُ فِيهِ مُهَانًا ۝

دیا جائے گا اور وہ اس عذاب میں ہمیشہ ذلت سے رہے گا ۝

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

البتہ جس نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کیے تو اللہ

فَأُولَئِكَ يَبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَ

ان کے گناہوں کو بھی نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ بہت بخشنے

كَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ (الفرقان: ۷۰-۶۸)

والا بے حد رحم فرمانے والا ہے ۝

اور کفر کے ترک کرنے اور ایمان لانے سے گناہوں کے مٹ جانے کے متعلق امام مسلم نے ایک طویل حدیث روایت کی ہے:

ابن شماس مہری بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت عمرو بن العاص کے پاس گئے وہ اس وقت قریب المرگ تھے۔ وہ بہت دیر تک روتے رہے پھر انہوں نے دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ ان کے بیٹے نے کہا اے اباجان! کیا آپ کو رسول اللہ ﷺ نے فلاں چیز کی بشارت نہیں دی، کیا آپ کو رسول اللہ ﷺ نے فلاں چیز کی بشارت نہیں دی، حضرت عمرو بن العاص نے ان کی طرف منہ کر کے فرمایا ہمارے نزدیک سب سے افضل عبادت لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دینا ہے۔ اور میری زندگی میں تین دور گزرے ہیں ایک وہ دور تھا کہ میرے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی مبغوض نہیں تھا اور میرے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ بات یہ تھی کہ میں آپ پر قدرت پاتا اور آپ کو قتل کر دیتا۔ اگر میں اس دور میں مریجاتا تو میں بلاشبہ اہل دوزخ میں سے ہوتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام ڈال دیا میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے عرض کیا: اپنے ہاتھ پھیلائیے تاکہ میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کروں، آپ نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ نے پوچھا اے عمرو! کیا ہوا؟ میں نے کہا میں ایک شرط لگانا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا تم کیا شرط لگانا چاہتے ہو؟ میں نے کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ میری مغفرت کر دی جائے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام پہلے کے کیے ہوئے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور ہجرت پہلے کے کیے

ہوئے گناہوں کو مٹا دیتی ہے اور حج پہلے کے کیے ہوئے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔ اس وقت مجھے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں تھا اور نہ میری آنکھوں میں آپ سے زیادہ کوئی بزرگ تھا۔ اور آپ کے جلال کی وجہ سے میں یہ طاقت نہیں رکھتا تھا کہ میں آپ کو نظر بھر کر دیکھ سکوں اور اگر کوئی مجھ سے یہ سوال کرنا کہ میں آپ کا حلیہ بیان کروں تو میں اس پر قادر نہ تھا کیونکہ میں نے آپ کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ اور اگر میں اس دور میں مرجاتا تو مجھے امید ہے کہ میں اہل جنت میں سے ہوتا۔ پھر ہمیں چند مناصب پر فائز کیا گیا اور میں نہیں جانتا کہ ان میں میرا کیا حال ہے۔ پس اگر میں مرجاؤں تو میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی نہ ہو، نہ آگ ہو، اور جب تم مجھے دفن کر چکو تو میری قبر پر مٹی چھڑک دینا اور پھر میری قبر پر اتنی دیر ٹھہرنا جتنی دیر میں اونٹ کو ذبح کر کے اس کے گوشت کو تقسیم کیا جاتا ہے حتیٰ کہ میں تم سے مانوس ہو جاؤں اور میں دیکھوں کہ میں اپنے رب کے بھیجے ہوئے فرشتوں کو کیا جواب دیتا ہوں۔ (صحیح مسلم الایمان: ۱۹۲، (۱۲۱) ۳۱۳، مطبوعہ مکتبہ نزار المصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ)

علامہ ابو العباس احمد بن عمر بن ابراہیم القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

اس حدیث سے مقصود یہ ہے کہ اسلام، ہجرت اور حج بچھلے تمام گناہوں کو مٹا دیتے ہیں خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔ اور حدیث کے الفاظ کے عموم سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ ان اعمال سے حقوق شرعیہ اور حقوق آدمیہ دونوں معاف ہو جاتے ہیں۔ لہذا کافر حربی جب مسلمان ہو جائے تو اس سے کسی حق کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا خواہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا کسی کا مال غصب کیا ہو۔

(المفہم ج ۱، ص ۳۲۹، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت ۱۴۱۷ھ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: یا رسول اللہ کیا زمانہ جاہلیت کے اعمال کا ہم سے مواخذہ کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا تم میں سے جس نے اسلام میں نیک عمل کیے اس سے مواخذہ نہیں کیا جائے گا اور جس نے برے عمل کیے اس سے جاہلیت اور اسلام کے اعمال کا مواخذہ کیا جائے گا۔ دوسری روایت میں ہے اس سے اول اور آخر کا مواخذہ کیا جائے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۲۱، صحیح مسلم الایمان: ۱۸۹، (۱۲۰) ۳۱۱، مسند احمد ج ۱، ص ۳۶۲، ۳۷۹)

علامہ ابو العباس القرطبی المالکی المتوفی ۶۵۶ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو یہ ارشاد ہے کہ جس نے اسلام میں نیک عمل کیے اس سے مراد یہ ہے کہ اس کا دین اسلام میں دخول صحیح ہو۔ وہ اسلام میں اخلاص سے داخل ہو اور تاحیات اسلام پر قائم رہے۔ مرتد نہ ہو اور اس حدیث میں اساءت، کفر اور نفاق کے مقابلہ میں ہے۔ اور اس حدیث میں اساءت سے گناہ کبیرہ اور صغیرہ کا ارادہ کرنا صحیح نہیں ہے، ورنہ اس سے یہ لازم آئے گا اسلام اسی شخص کے سابقہ گناہوں کو مٹائے گا جس نے اسلام لانے کے بعد تاحیات کوئی گناہ نہ کیا ہو اور یہ قطعاً باطل ہے۔ قرآن مجید، حدیث صحیح اور اجماع کے خلاف ہے۔ اور مواخذہ سے مراد یہ ہے کہ اس نے زمانہ جاہلیت اور اسلام میں جو گناہ کیے ہیں ان پر سزا ہوگی اور یہ مواخذہ اس شخص سے ہوگا جو نفاق سے اسلام میں داخل ہوا ہو یا اسلام کے بعد مرتد ہو گیا ہو۔ (المفہم ج ۱، ص ۳۲۷، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت ۱۴۱۷ھ)

علامہ یحییٰ بن شرف نووی متوفی ۶۷۶ھ لکھتے ہیں:

اس حدیث میں احسان اور نیک عمل سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے اسلام میں داخل ہوا ہو اور یہ کہ وہ حقیقی مسلمان ہو تو اس کے سابقہ گناہ قرآن مجید کے نصوص صریحہ، حدیث صحیح اور اجماع سے معاف کر دیے جائیں گے اور برے عمل اور اساءت سے مراد یہ ہے کہ وہ دل سے اسلام میں داخل نہ ہو بلکہ وہ صرف بہ ظاہر کلمہ شہادت پڑھے اور

دل سے اسلام کا معتقد نہ ہو۔ پس ایسا شخص منافق ہے اور وہ اپنے کفر پر باقی ہے۔ لہذا اس سے صورتہ اسلام کے اظہار سے پہلے اور اس کے بعد کے تمام گناہوں پر مواخذہ ہو گا اور اس کو سزا ملے گی کیونکہ وہ اپنے کفر پر دوام اور استمرار کے ساتھ قائم ہے۔

(شرح النوادی مع المسلم، ج ۱، ص ۸۱۰، مطبوعہ مکتبہ نزار المصطفیٰ مکہ مکرمہ، ۱۳۱۷ھ)

کافر کے سابقہ گناہوں کے بخشنے میں اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم

اللہ تعالیٰ کافر کے جو پچھلے تمام گناہ بخش دیتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا مخلوق پر بہت بڑا لطف و کرم ہے۔ کیونکہ کفار انواع و اقسام کے کفر اور جرائم، فواحش و منکرات اور معاصی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر ان کے سابقہ گناہوں پر مواخذہ کیا جاتا تو وہ توبہ سے ان گناہوں کی تلافی کبھی بھی نہیں کر سکتے تھے اور ان کو مغفرت کبھی بھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر قبول توبہ کو آسان کر دیا اور اسلام کے بعد ان کے پچھلے گناہوں کی مغفرت کا اعلان کر دیا تاکہ ان کا دین اسلام میں داخل ہونا آسان ہو جائے اور اگر ان کو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے پچھلے گناہوں پر ضرور مواخذہ ہو گا تو وہ توبہ کرتے نہ اسلام لاتے۔ کیونکہ انسان کو جب معلوم ہو کہ اس کو اس کے جرائم کی معافی نہیں مل سکتی تو پھر وہ بغاوت پر اتر آتا ہے اور کھل کر جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کی نظیر یہ حدیث ہے:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا تم سے پہلی امتوں میں ایک شخص نے ننانوے قتل کیے۔ اس نے پوچھا روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے تو ایک راہب (عیسائیوں کا پیر) کی طرف اس کی رہنمائی کی گئی وہ گیا اور اس سے پوچھا کہ اس نے ننانوے قتل کیے ہیں کیا اس کی توبہ ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ اس شخص نے اس راہب کو بھی قتل کر دیا اور ایک سینکڑہ پورا کر دیا۔ اس نے پھر پوچھا کہ روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے تو ایک عالم کی طرف اس کی رہنمائی کی گئی۔ اس نے اس سے پوچھا کہ اس نے سو قتل کیے ہیں کیا اس کی توبہ ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ توبہ اور اس کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے۔ تم فلاں فلاں جگہ چلے جاؤ وہاں کچھ لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا اور اپنے علاقہ کی طرف لوٹ کر نہ جانا وہ بری جگہ ہے۔ وہ وہاں سے چل پڑا۔ ابھی آدھے راستے پر پہنچا تھا کہ اس کو موت نے آیا۔ پھر اس کے متعلق رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں کے درمیان مباحثہ ہوا۔ رحمت کے فرشتوں نے کہا یہ شخص توبہ کرتا ہوا اور اپنے دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوا آیا تھا۔ عذاب کے فرشتوں نے کہا اس نے کوئی نیک عمل بالکل نہیں کیا۔ تب ان کے پاس ایک اور فرشتہ آدمی کی صورت میں آیا انہوں نے اس کو اپنے درمیان حکم (منصف) بنا لیا۔ اس نے کہا ان دونوں زمینوں کے درمیان پیمائش کرو جس زمین کے وہ زیادہ قریب ہو اس کو اسی کے ساتھ لاحق کر دو۔ انہوں نے پیمائش کی تو وہ اس زمین کے زیادہ قریب تھا جس کا اس نے ارادہ کیا تھا۔ تب اس کو رحمت کے فرشتوں نے لے لیا۔

امام مسلم کی دوسری سند کے ساتھ جو روایت ہے (۶۸۷۷) اس میں ہے اللہ تعالیٰ نے اس زمین کو حکم دیا کہ تو دور ہو جا (یعنی اس کے علاقہ کی زمین) اور اس زمین (جہاں نیک لوگ رہتے تھے) کو حکم دیا کہ تو قریب ہو جا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۳۷۰، صحیح مسلم التوبہ: ۳۶ (۲۷۶۶) ۶۸۷۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۶۲۲)

زندیق کی توبہ مقبول ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق

زیر تفسیر آیت میں فرمایا ہے کہ اگر کافر کفر سے باز آجائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور زندیق بھی کافر ہے سو اگر وہ اپنی زندیقی سے باز آجائے تو اس کے پچھلے گناہ بھی معاف ہو جائیں۔ لیکن اس مسئلہ میں اختلاف ہے بعض فقہاء کہتے ہیں کہ زندیق کی توبہ مقبول ہے جیسا کہ اس ظاہر آیت کا تقاضا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی توبہ مقبول نہیں

ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی کو مخفی رکھتا ہے اور اس کی توبہ پر اطمینان نہیں ہے۔ ہم اس بحث میں پہلے زندیق کا معنی بیان کریں گے پھر زندیق اور دہری وغیرہ کا فرق بیان کریں گے، پھر فقہاء کا اختلاف ذکر کریں گے اور آخر میں یہ بتائیں گی کہ اس کی توبہ قبول نہ ہونے کا کیا محمل ہے۔

زندیق کا معنی اور مفہوم

علامہ محمد طاہر ہندی متوفی ۱۰۷۸ھ علامہ لیبی متوفی ۷۷۳ھ سے نقل کر کے لکھتے ہیں:

زندیقہ مجوس کی ایک قوم ہے جس کو ثنویہ بھی کہتے ہیں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نور مبداء خیرات ہے اور ظلمت مبداء شرور ہے۔ پھر اس لفظ کو ہر ملحد فی الدین کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اور یہاں اس سے مراد وہ قوم ہے جو اسلام سے مرتد ہو گئی۔ ایک قول یہ ہے کہ زندیقہ سبائیہ کو کہتے ہیں جو عبد اللہ بن سبا کے اصحاب ہیں، ان لوگوں نے طلب فتنہ اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے اسلام کا اظہار کیا۔ پہلے انہوں نے حضرت عثمان بن عفان کے خلاف فتنہ پھیلایا، پھر شیعوں سے مل کر ان کی جہالتوں میں گمراہ کیا، حتیٰ کہ شیعوں نے حضرت علی بن ابی طالب کے معبود ہونے کا اعتقاد کیا، حضرت علی نے ان سے توبہ طلب کی انہوں نے توبہ نہیں کی۔ پھر حضرت علی بن ابی طالب نے ان کو عبرت ناک سزا دینے کے لیے ان کو جلادیا۔ اور علامہ ابن الاثیر متوفی ۶۳۰ھ نے جامع الاصول کی شرح میں لکھا ہے کہ زندیق وہ شخص ہے جو کفر کو چھپاتا ہو اور اسلام کو ظاہر کرتا ہو، جس طرح منافق ہیں، یا یہ ثنویہ کی ایک قوم ہے۔ (مجوس کی ایک قسم) یا وہ شخص ہے جس کا کوئی دین نہ ہو یا یہ وہ لوگ ہیں جن کو حضرت علی نے جلادیا تھا جو بتوں کی پرستش کرتے تھے یا رافضی ہیں۔ (مجمع بحار الانوار، ج ۲، ص ۲۲۲-۲۲۱، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان، المدینہ المنورہ، ۱۳۱۵ھ)

زندیق، منافق، دہری اور ملحد کی تعریفوں کا باہمی فرق

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

علامہ ابن کمال پاشا نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے عربی زبان میں زندیق کا اطلاق اس شخص پر کیا جاتا ہے جو باری تعالیٰ کی نفی کرتا ہو، اور جو شریک کو ثابت کرتا ہو، اور جو اللہ کی حکمت کا انکار کرتا ہو، اور مرتد اور زندیق کے درمیان عموم و خصوص من وجہ کی نسبت ہے۔ کیونکہ کبھی زندیق مرتد نہیں ہوتا جیسا کہ اصلی زندیق جو دین اسلام سے منحرف نہ ہوا ہو۔ اور کبھی مرتد زندیق نہیں ہوتا جیسے کوئی مسلمان مثلاً یہودی یا عیسائی ہو جائے (العیاذ باللہ) اور کبھی زندیق مرتد بھی ہوتا ہے مثلاً کوئی مسلمان زندیق ہو جائے، العیاذ باللہ۔ اور اصطلاح شرع میں فرق زیادہ ظاہر ہے کیونکہ شریعت میں زندیق اس کو کہتے ہیں جو کفر کو چھپائے اور ہمارے نبی ﷺ کی نبوت کا اعتراف کرے لیکن یہ دوسری قید مسلمان زندیق کے اعتبار سے ہے اور زندیق، منافق، دہری اور ملحد میں فرق یہ ہے کہ کفر کو چھپانا تو ان سب میں مشترک ہے لیکن منافق ہمارے نبی ﷺ کی نبوت کا اعتراف نہیں کرتا، اور دہری اس کے ساتھ ساتھ حواشی کی اللہ سبحانہ کی طرف نسبت کا بھی انکار کرتا ہے۔ (یعنی خدا کو نہیں مانتا) اور ملحد وہ شخص ہے جو شریعت مستقیمہ سے انحراف کر کے جہات کفر میں سے کسی جہت کی طرف مائل ہو اور جو شخص ملحد ہو اور دین سے انحراف کرے اس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ ہمارے نبی ﷺ کی نبوت کا اعتراف کرے اور نہ اس کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے فاعل مختار ہونے کا اعتراف کرے۔ اس قید کے اعتبار سے ملحد، دہری سے مفارق ہو گیا اور اس میں کفر کو چھپانے کی قید بھی نہیں ہے اس اعتبار سے وہ منافق سے مفارق اور الگ ہو گیا۔ اور نہ اس میں یہ شرط ہے کہ وہ پہلے مسلمان ہو اور اس اعتبار سے وہ مرتد سے ممتاز ہو گیا لہذا ملحد کی تعریف کفر کے تمام فرقوں کو شامل ہے اور اس کا مفہوم سب سے عام اور وسیع ہے۔ یہاں تک ابن کمال پاشا کے کلام کا خلاصہ مکمل ہوا۔

(علامہ شامی فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں لیکن زندیق اس اعتبار سے کہ وہ کبھی کافر اصلی ہوتا ہے اور کبھی مسلمان زندیق ہو جاتا ہے۔ اس کی تعریف میں نبوت کے اعتراف کی شرط نہیں ہے اور فتح القدر میں مذکور ہے کہ زندیق کسی دین کا پابند نہیں ہوتا۔ (رد المحتار ج ۳، ص ۲۹۶، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۰۷ھ)

زندیق کی توبہ اور اس کو قتل کرنے کے شرعی احکام

علامہ عبدالواحد کمال ابن ہمام متوفی ۸۶۲ھ فرماتے ہیں:

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ظاہر مذہب کے مطابق ساحر اور زندیق کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور زندیق وہ شخص ہے جو کسی دین کا پابند نہ ہو اور رہا وہ شخص جس کے باطن میں کفر ہو اور وہ اسلام کو ظاہر کرتا ہو وہ منافق ہے اور توبہ قبول نہ کرنے میں اس کا حکم بھی زندیق کی طرح ہے۔ زندیق کی توبہ اس لیے قبول نہیں کی جائے گی کہ وہ کسی دین کو بھی نہیں مانتا اور اپنے اس کفر کو مخفی رکھتا ہے اور اس کی زندیقی کا علم اس طرح ہو گا کہ بعض لوگ اس پر مطلع ہو جائیں یا وہ خود اپنے کسی معتمد علیہ کو بتائے۔ اس لیے اس کی توبہ پر اطمینان نہیں ہے۔ اور منافق بھی اپنے کفر کو مخفی رکھتا ہے اس لیے اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوگی اور حق یہ ہے کہ جس کو قتل کیا جائے گا اور جس کی توبہ قبول نہیں ہوگی وہ منافق ہے اور زندیق اگر عربی ہو اور وہ کسی دین کے نہ ماننے کو منافق کی طرح مخفی رکھتا ہو تو اس کو بھی قتل کیا جائے گا اور اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اور اگر بالفرض وہ اپنی زندیقی کا اظہار کرتا ہو اور پھر تائب ہو جائے تو پھر واجب ہے کہ اس کو قتل نہ کیا جائے اور اس کی توبہ قبول کر لی جائے جیسا کہ باقی دیگر ان کفار کا حکم ہے جو اپنے کفر کو ظاہر کرتے ہیں اور پھر توبہ کر لیتے ہیں تو ان کی توبہ قبول کی جاتی ہے۔ اسی طرح اس شخص کا حکم ہے جو اپنے باطن میں بعض ضروریات دین مثلاً حرمت خمر (انگوری شراب) کی حرمت کا انکار کرتا ہو اور بہ ظاہر اس کی حرمت کا اعتراف کرتا ہو۔ (فتح القدر، ج ۶، ص ۹۱، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۳۱۵ھ)

علامہ محمد بن علی بن محمد الحکفی المتوفی ۱۰۸۱ھ لکھتے ہیں:

فتح القدر میں مذکور ہے کہ زندیق کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اس کو ظاہر المذہب قرار دیا ہے، لیکن خانہ کی بحث خطر و اباحت میں مذکور ہے کہ فتویٰ اس پر ہے کہ اگر ساحر یا اس زندیق کو توبہ سے پہلے گرفتار کر لیا جائے جو مشہور ہو اور اپنے مذہب کا داعی ہو پھر گرفتاری کے بعد وہ توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اور اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اگر توبہ کرنے کے بعد اس کو گرفتار کیا جائے تو پھر اس کی توبہ قبول کی جائے گی (میں کہتا ہوں کہ علامہ ابن ہمام نے اس زندیق کی توبہ قبول نہ کرنے کے متعلق لکھا ہے جو اپنی زندیقی کو مخفی رکھے لیکن جو اپنی زندیقی کا اعلان کرے اور اس کی دعوت دے اس کا انہوں نے عام کافروں کی طرح حکم بیان کیا ہے۔ سعیدی غفرلہ)

(رد مختار علی رد المحتار، ج ۳، ص ۲۹۶، مطبوعہ بیروت)

زندیق کی توبہ مقبول ہونے یا نہ ہونے کے الگ الگ محمل

علامہ سید محمد امین ابن عبدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

صاحب ہدایہ نے نجیس میں لکھا ہے اگر زندیق اپنی زندیقی میں معروف نہ ہو اور نہ اپنی زندیقی کی دعوت دیتا ہو تو اگر وہ زندیق مشرکین عرب سے ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا اور اگر وہ عجمی ہو تو اس کو اس کے شرک پر چھوڑ دیا جائے گا اور اگر وہ مسلمان ہو اور پھر زندیق بنا ہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا کیونکہ وہ مرتد ہے اور اگر وہ ذمی ہو اور پھر زندیق بنا ہو تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ کفر ملت واحدہ ہے اور اگر زندیق اپنی زندیقی میں معروف ہو اور اپنی زندیقی کی دعوت دیتا ہو تو اگر

وہ گرفتار ہونے سے پہلے اپنے اختیار سے توبہ کرے اور اپنی زندیقہ سے رجوع کرے تو اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی اور اگر وہ گرفتار ہونے کے بعد توبہ کرے تو اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ واضح رہے کہ فقہاء نے جو کہا ہے کہ ساحریا زندیقہ کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اس کا معنی یہ ہے کہ اس کو قتل نہ کرنے کے معاملہ میں اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی جیسا کہ نبی ﷺ کو سب و شتم کرنے والے کے متعلق جو کہا گیا ہے اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی اس کا بھی یہی محمل ہے کہ سب و شتم کرنے والے کو قتل نہ کرنے کے معاملہ میں اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ زندیقہ کی توبہ قبول کرنے یا نہ کرنے میں جو اختلاف ہے وہ دنیا کے اعتبار سے ہے باقی آخرت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی توبہ بالاتفاق قبول کر لی جائے گی۔

(رد المحتار ج ۳، ص ۲۹۶، مطبوعہ بیروت)

زندیقہ کی توبہ کے قبول ہونے پر امام رازی کے دلائل اور تحقیق مقام

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

فقہاء کا اس میں اختلاف ہے کہ زندیقہ کی توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟ اور صحیح یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور اس کی دو دلیلیں ہیں، پہلی دلیل سورۃ الانفال کی یہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ کفر سے باز آجائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ (الانفال: ۳۸) یہ آیت کفر کی تمام انواع کو شامل ہے اور اس میں زندیقہ بھی داخل ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ زندیقہ کے حال سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے واقعی زندیقہ سے توبہ کر لی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت کے احکام ظاہر پر مبنی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”ہم ظاہر پر حکم کرتے ہیں“ اور جب اس نے زندیقہ سے توبہ کر لی تو اس کی توبہ کو قبول کرنا واجب ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ زندیقہ زندیقہ سے رجوع کرنے کا مکلف ہے اور اس کا صرف یہی طریقہ ہے کہ وہ توبہ کرے اور اگر اس کی توبہ قبول نہ کی جائے تو لازم آئے گا کہ اس کو ایسی چیز کا مکلف کیا جائے جو اس کی طاقت میں نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ (الشوری: ۲۵)

وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۸۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام رازی نے زندیقہ کی جس توبہ کے قبول کرنے پر دلائل دیے ہیں، یہ اللہ کے نزدیک توبہ ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے۔ اور اس توبہ کے متعلق فقہاء کا اتفاق ہے کہ یہ توبہ قبول ہوگی۔ فقہاء کا اختلاف اس میں ہے کہ زندیقہ توبہ کر لے تو آیا اس کو قتل کرنے کا حکم ساقط ہو گیا نہیں اور دنیا میں اس کی یہ توبہ مفید ہوگی یا نہیں، اور زندیقہ کی توبہ کے قبول کرنے یا نہ کرنے سے ان کی یہی مراد ہے اور آخرت میں اس کی توبہ کے مقبول ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے جیسا کہ ہم علامہ شامی کے حوالے سے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان کے خلاف جنگ کرتے رہو حتیٰ کہ کفر (کاغلبہ) نہ رہے اور پورا دین (صرف) اللہ کے لیے ہو جائے۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو بے شک اللہ ان کے کاموں کو دیکھنے والا ہے۔ اور اگر وہ روگردانی کریں تو یقین رکھو کہ بے شک اللہ تمہارا کار ساز ہے وہ کیسا اچھا کار ساز اور کیسا اچھا مددگار ہے۔ (الانفال: ۳۹-۴۰)

فتنہ کا معنی

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ اگر یہ کفار اپنے کفر سے باز آگئے تو ان کی بخشش کر دی جائے گی اور اگر انہوں نے دوبارہ وہی روش اختیار کی تو جس طرح پچھلی امتوں کو سزا دی گئی تھی ان کو بھی سزا دی جائے گی۔ اس کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا کہ اگر کفار باز نہیں آتے تو وہ ان سے قتال کریں حتیٰ کہ کفر کا غلبہ نہ رہے۔ اس آیت میں فرمایا ہے کفار سے قتال کرو حتیٰ کہ فتنہ نہ رہے۔ فتنہ کی حسب ذیل تفسیریں کی گئی ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن، قتادہ اور سدی سے مروی ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ اور پورا دین اللہ کے لیے ہو جائے اس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کو دین اسلام کی وجہ سے تنگ نہ کیا جائے اور شرک اور بت پرستی کی بیخ کنی کر دی جائے۔

عروہ بن زبیر نے بیان کیا ہے کہ دعوت اسلام کی ابتداء میں مسلمانوں کو فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا، تب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد دو سرافتنہ یہ تھا کہ جب مکہ کی گھاٹیوں میں انصار نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت عقبہ کی تو قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں ایذا دینی شروع کی اور یہ دو سرافتنہ تھا۔ پھر ہجرت کے بعد مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ کفار کے خلاف قتال کریں تاکہ کفر کا زور ٹوٹ جائے اور وہ اسلام لانے کی بناء پر مسلمانوں کو تنگ نہ کر سکیں۔ (جامع البیان جز ۹، ص ۳۲۹-۳۳۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

صرف جزیرہ عرب سے کفر کا غلبہ ختم کرنا مقصود ہے یا پوری دنیا سے

”اور پورا دین اللہ کے لیے ہو جائے“ امام رازی نے لکھا ہے کہ مکہ اور اس کے گرد و نواح میں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہوں گے۔ اور اس آیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ کافروں سے جنگ کرتے رہو حتیٰ کہ تمام دنیا میں شرک نہ رہے اور تمام شہروں میں اسلام قائم ہو جائے۔ ہماری رائے میں اس آیت کا صحیح معنی یہ ہے کہ جب تک دنیا میں کفر کا زور اور شرک کا غلبہ ہے کافروں سے جنگ کرتے رہو۔ اور مسلمان اپنے آپ کو ہر وقت حالت جہاد میں سمجھیں اور ایسے اسباب اور وسائل کے حصول میں کوشاں رہیں جس سے وہ پوری دنیا سے شرک کا قلع قمع کر سکیں اور کافروں کے جن جن علاقوں کو فتح کریں وہاں تبلیغ کر کے کافروں کو مسلمان بنائیں تاکہ ان کی عددی قوت میں اضافہ ہو، اور ہر دور میں جنگی ہتھیاروں کی جو تازہ ایجادات ہوں ان کو حاصل کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سائنسی علوم میں ترقی کریں۔ اس دور میں مسلمانوں کی پس ماندگی کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے تبلیغ اسلام نہیں کی۔ مغلوں نے ہندوستان پر کئی صدیوں تک حکومت کی لیکن وہ اپنی حکومت کے استحکام میں لگے رہے اور اسلام کی تبلیغ سے غافل رہے۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے لیکن مفتوحہ علاقوں میں تبلیغ اسلام کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے جدید سائنسی علوم کے حصول میں کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ پوری دنیا سے کفر اور شرک کا غلبہ ختم کیا جائے اور توحید اور اسلام کا پوری دنیا میں غلبہ ہو اور جب مسلمانوں نے اس حکم پر عمل کرنا چھوڑ دیا تو وہ دنیا میں مغلوب اور محکوم ہو گئے، بعض علاقے انہوں نے جہاد کے ذریعے فتح ضرور کیے لیکن ویکون الدین کلمہ للہ پر عمل نہیں کیا اور کافروں کو مسلمان کرنے کی کوئی موثر کوشش نہیں کی چنانچہ وہ علاقے بھی ان کے ہاتھ سے جاتے رہے۔

اس کے بعد فرمایا پس اگر وہ باز آجائیں تو بے شک اللہ ان کے کاموں کو دیکھنے والا ہے اور اگر وہ روگردانی کریں تو یقین رکھو کہ بے شک اللہ تمہارا کار ساز ہے۔ یعنی اگر کفار توبہ نہ کریں اور ایمان نہ لائیں تو تم ان کی پرواہ نہ کرو، اللہ تمہارا مولیٰ ہے وہ تمہاری حفاظت کرے گا اور تم سے مصیبتوں کو دور کرے گا۔ وہ کیسا اچھا کار ساز اور کیسا اچھا مددگار ہے۔

وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَ

اور (اے مسلمانو!) یاد رکھو! تم جتنا بھی مال غنیمت حاصل کرو تو بیسک اس مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے

لِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ

اور رسول کے لیے ہے اور (رسول کے) قرابت داروں کے لیے ہے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں

السَّبِيلِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللَّهِ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا

کے لیے ہے اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس (چیز) پر جو اللہ نے اپنے (مکرم) بندے پر

يَوْمَ الْقُرْآنِ يُومَرُ التَّقَىٰ الْجَمْعُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

فیصلہ کے دن نازل کی جس دن دوشکر مقابل ہوئے اور اللہ ہر چیز پر

قَدِيرٌ ۝ إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدُوَّةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدُوَّةِ الْقُصْوَىٰ

قادر ہے ۰ جب تم (وادی بدر کے) قریبی کناے پر تھے اور وہ دور والے کناے پر تھے

وَالرَّكِبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَا خْتَلَفْتُمْ فِي

اور (تجارتی) قافلہ تم سے نیچلی جانب تھا، اور اگر تم مقابلہ کا وقت مقرر کرتے تو پہنچنے کے وقت میں

الْبَيْعِ لَا وَلَكِنْ لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِّيَهْلِكَ

ضرور مختلف ہو جاتے، لیکن یہ اس لیے ہوا کہ اللہ اس کام کو پورا کرے جو (اللہ کے نزدیک) کیا ہوا تھا، تاکہ جو ہلاک

مَنْ هَلَكَ عَن بَيْنَتِهِ وَيُحْيِي مَنْ حَيَّ عَن بَيْنَتِهِ وَإِنَّ

ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ ہے وہ دلیل سے زندہ رہے، اور بے شک

اللَّهُ لَسَبِيحٌ عَلَيْهِ ۝ إِذْ يَرِيكُهُمُ اللَّهُ فِي مَتَابِكِ قَلِيلًا وَ

اللہ بہت سننے والا ہے مد جاننے والا ہے (اور یاد رکھیے) جب اللہ آپ کو خواب میں کافروں کو کم تعداد میں دکھا رہا تھا اور

لَوْ أَرَاكُمْ كَثِيرًا لَّفِشَلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَكِنَّ اللَّهَ

اگر اللہ آپ کو ان کی زیادہ تعداد دکھاتا تو (اے مسلمانو!) تم ضرور ہمت ہار جاتے اور آپس میں اختلاف کرتے لیکن اللہ نے (تم کو

سَلَّمَ إِنَّهُ عَلَيْهِمُ بِنَاتِ الصُّدُورِ ۝۳۳ وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذْ

اس سے) سلامت رکھا، بے شک وہ درون سینہ امور کو بہ خوبی جاننے والا ہے ۝ اور (یاد کرو) جب تم سے مقابلہ کے وقت تمہیں

التَّقِيَّتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّبُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضَىٰ

کفار کی تعداد کم دکھائی اور تمہاری تعداد (بھی) ان کر کم دکھائی تاکہ اللہ اس کام کو پورا کرے

اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۝ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝۳۴

جو اس کے نزدیک کیا ہوا ہے ، اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹانے جاتے ہیں ۝

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے مسلمانو!) یاد رکھو! تم جتنا بھی مال غنیمت حاصل کرو تو بے شک اس مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے ہے اور (رسول کے) قرابت داروں کے لیے ہے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس (چیز) پر جو اللہ نے اپنے (مکرم) بندے پر فیصلہ کے دن نازل کی جس دن دو لشکر مقابل ہوئے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۝ (الانفال: ۳۱)

ربط مضمون

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے کفار سے جہاد کرنے کا حکم دیا تھا اور جہاد میں جب مسلمان فتح یاب ہو جائیں تو میدان جنگ میں کفار کا جو مال، اسباب اور ہتھیار وغیرہ ہاتھ آئیں وہ مال غنیمت ہے۔ سواب جہاد کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ مال غنیمت کے احکام بیان فرما رہا ہے۔ مال غنیمت کے ساتھ نفل اور فتنے کا حکم بھی متصل ہے۔ ہم مال غنیمت سے نفل اور فتنے کا حکم بیان کریں گے تاکہ شرح صدر کے ساتھ مال غنیمت کی تعریف اور اس کے احکام اور ان میں مذاہب معلوم ہو سکیں۔ نفل کی تفصیل اگرچہ پہلے گزر چکی ہے لیکن ہم ربط مضمون کی خاطر اس کا دوبارہ اعادہ کر رہے ہیں۔

نفل، تسفیل اور سلب کی مختصر تشریح

نفل کا لغوی معنی ہے زیادتی اور اصطلاح شرع میں اس کا معنی ہے امام بعض مجاہدین کو جہاد پر براہِ گنجتہ کرنے کے لیے ان کے حصہ سے زائد کوئی چیز عطا کرے۔

تسفیل کا معنی یہ ہے کہ امام بعض مجاہدین کی کسی زائد چیز کے ساتھ تخصیص کر دے۔ مثلاً امام کہے کہ جس نے فلاں چیز حاصل کر لی تو اس کا چوتھائی یا تہائی حصہ اس کو ملے گا۔ یا کہے کہ جس نے فلاں چیز پر قبضہ کر لیا وہ چیز اس کی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا جس نے کسی قاتل (کافر) کو قتل کیا اس کا سلب (اس کا سامان) اسی کا ہے۔

(صحیح بخاری رقم الحدیث: ۳۱۴۲، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۷۵۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۷۱۷)

اور سلب میں مقتول کے کپڑے، اس کے ہتھیار، اس کی سواری اور سواری کے آلات داخل ہیں۔

فتنے کا معنی

فتنے کا لغوی معنی ہے لوٹنا اور اصطلاح شرح میں فتنے اس چیز کا نام ہے جس کے حصول کے لیے مسلمانوں نے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو نہ دوڑایا ہو۔ مثلاً وہ اموال جو امام المسلمین کی خدمت میں ارسال کیے جاتے ہوں یا وہ اموال جو اہل حرب سے

معاهدہ کی بناء پر لیے گئے ہوں۔ اموال فتنے میں خنس نہیں ہوتا کیونکہ فتنے غنیمت نہیں ہے۔ اور غنیمت وہ مال ہے جو کفار سے بہ طور قہر اور غلبہ لیا جائے۔ اور مال فتنے بالخصوص رسول اللہ ﷺ کے لیے تھا۔ اس میں آپ اپنی مرضی سے تصرف فرماتے تھے خواہ اس مال کو آپ اپنے اوپر خرچ فرمائیں یا اپنے اہل و عیال پر یا جن پر آپ چاہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رَسُولَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ (الحشر: ۶)

اور جو مال اللہ نے ان سے (نکال کر) اپنے رسول پر لوٹا دیا تو تم نے ان پر نہ گھوڑے دوڑائے تھے اور نہ اونٹ، لیکن اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہے مسلط فرمادیتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بنو نضیر کے اموال اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو از قبیل فتنے عطا فرمائے تھے۔ ان کے حصول کے لیے مسلمانوں نے گھوڑے دوڑائے تھے نہ اونٹ۔ وہ خاص رسول اللہ ﷺ کے لیے تھے، آپ ان اموال سے اپنے اہل کو ایک سال کا خرچ دیا کرتے تھے اور باقی اموال کو گھوڑوں اور ہتھیاروں کے لیے فی سبیل اللہ وقف کر دیا کرتے تھے۔

(صحیح بخاری رقم الحدیث: ۲۹۰۴، صحیح مسلم الجہاد ۳۸ (۱۷۵۷) ۳۴۹۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۹۵۶، سنن الترمذی رقم الحدیث:

۱۷۲۶، السنن الکبریٰ للنسائی، رقم الحدیث: ۱۱۵۷۶)

رسول اللہ ﷺ اور بعد کے ائمہ مسلمین میں فرق یہ ہے کہ اہل حرب کی طرف سے جو مال ائمہ مسلمین کو بھیجا جائے گا، وہ عامتہ المسلمین پر خرچ کیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت کی وجہ یہ تھی کہ آپ کی کفار پر ہیبت تھی۔ جیسا کہ آپ نے فرمایا دو ماہ کی مسافت سے میرا رعب طاری کر دیا گیا ہے اور ائمہ کی ہیبت مسلمانوں کی وجہ سے ہے لہذا اس مال میں ائمہ کے ساتھ عام مسلمان بھی شریک ہیں۔

مال غنیمت کی تعریف

مال غنیمت اس مال کا نام ہے جو اہل حرب سے قہر اور غلبہ سے حاصل کیا جائے اور یہ قہر اور غلبہ فوج کے ذریعہ حاصل ہوگا۔ اور فوج یا حقیقتاً ہوگی یا حکماً اور حکماً فوج کا معنی ہے امام کا اذن۔ اور امام شافعی کے نزدیک اہل حرب سے غلبہ کے ساتھ جو مال جس طرح بھی حاصل کیا جائے وہ غنیمت ہے اور وہ فوج یا امام کے اذن کی شرط نہیں لگاتے۔ مال غنیمت کے چار حصے امیر لشکر، لشکر اسلام میں تقسیم کرے گا سوار کے دو حصے اور پیادہ کا ایک حصہ اور پانچواں حصہ رسول اللہ ﷺ کا ہے۔

(بدائع الصنائع ج ۹، ص ۲۷۴-۲۵۸، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۸ھ)

خمس کی تقسیم میں فقہاء شافعیہ کا موقف

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متونی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ مال غنیمت میں سے خمس (پانچواں حصہ) لیا جائے گا اور اس خمس کی تقسیم کی کیفیت میں مشہور قول یہ ہے کہ اس خمس کے پھر پانچ حصص کیے جائیں گے، ان میں سے ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کا ہے اور ایک حصہ آپ کے قرابت داروں کا ہے جو بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب سے ہیں نہ کہ بنو عبد شمس اور بنو نوفل سے۔ کیونکہ حضرت عثمان اور حضرت جیر بن مطعم رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یہ آپ کے بھائی بنو ہاشم ہیں ان کی فضیلت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ آپ ان کی نسل سے ہیں، آپ یہ بتائیے کہ آپ نے ہمارے بھائیوں میں سے بنو عبد المطلب کو عطا فرمایا اور ہم کو محروم کر دیا حالانکہ ہم اور وہ بہ منزلہ واحد ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ جاہلیت اور اسلام میں مجھ

سے بالکل الگ نہیں ہوئے اور صرف بنو ہاشم اور بنو المطلب ایک چیز ہیں، یہ فرما کر آپ نے اپنی انگلیاں انگلیوں میں ڈالیں۔
(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۹۸۰)

اور بقیہ تین حصے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بھی امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے نزدیک خمس کے پانچ حصے کیے جائیں گے، ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے لیے ہوگا اور اس کو مصالح المسلمین میں صرف کیا جائے گا جہاں اس حصہ کو رسول اللہ ﷺ خرچ کرتے تھے، مثلاً مجاہدوں کے لیے گھوڑوں اور ہتھیاروں کی خریداری کے لیے، اور ایک حصہ آپ کے قرابت داروں کے لیے خواہ وہ غنی ہوں یا فقیر، اس کی تقسیم ان میں اس طرح ہوگی کہ مردوں کو دو حصے ملیں گے اور عورتوں کو ایک حصہ ملے گا۔ اور خمس کے باقی تین حصے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں تقسیم کیے جائیں گے۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۲۸۵، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۱۵ھ)

خمس کی تقسیم میں فقہاء حنبلیہ کا موقف

علامہ موفق الدین عبداللہ بن قدامہ مقدسی حنبلی متونی ۶۲۰ھ لکھتے ہیں:

خمس کے پانچ حصے کیے جائیں گے، ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کا ہے اور ایک حصہ آپ کے قرابت داروں کا ہے، ایک حصہ یتیموں کا ہے، ایک حصہ مسکینوں کا اور ایک حصہ مسافروں کا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے: تم جتنا بھی مال غنیمت حاصل کرو تو بے شک اس مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے ہے اور رسول کے قرابت داروں کے لیے ہے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ (الانفال: ۴۱) اور رسول اللہ ﷺ کا حصہ مصالح المسلمین میں صرف کیا جائے گا۔ کیونکہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگ حنین کے دن رسول اللہ ﷺ نے اونٹ کے پہلو سے ایک بال پکڑ کر فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو مال تم پر لوٹایا ہے اس میں سے اس بال کے برابر بھی میرے لیے جائز نہیں ہے سوائے خمس کے اور وہ بھی تم پر لوٹا دیا جائے گا۔ (سنن النسائی رقم الحدیث: ۴۱۳۹، ۴۱۵۰) نبی ﷺ نے خمس کو تمام مسلمانوں کے لیے قرار دیا اور تمام مسلمانوں کے لیے خمس کو صرف کرنے کا یہی معنی ہے کہ اس کو ان کے مصالح میں صرف کیا جائے، ان کی سرحدوں کی حفاظت پر اور گھوڑوں اور ہتھیاروں کی خریداری پر اس مال کو خرچ کیا جائے۔ امام احمد سے ایک روایت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حصہ انتظامیہ کے ساتھ مختص ہے اور دوسری روایت ہے کہ گھوڑوں اور ہتھیاروں پر اس رقم کو خرچ کیا جائے۔

خمس کا دوسرا حصہ رسول اللہ ﷺ کے قرابت داروں پر خرچ کیا جائے اور آپ کے قرابت دار بنو ہاشم اور بنو المطلب ہیں کیونکہ حضرت جیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے جبکہ آپ نے خمس کو بنو ہاشم اور بنو المطلب میں تقسیم فرمایا۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے ہمارے بھائیوں میں سے بنو المطلب میں خمس کو تقسیم فرمایا اور ہمیں کچھ بھی نہیں دیا حالانکہ آپ سے ان کی قرابت اور ہماری قرابت واحد ہے۔ پس نبی ﷺ نے فرمایا صرف بنو ہاشم اور بنو المطلب ایک چیز ہیں، حضرت جیر نے کہا نبی ﷺ نے اس خمس میں سے بنو عبد شمس اور بنو نوفل کو بالکل عطا نہیں فرمایا، جیسا کہ آپ نے بنو ہاشم اور بنو المطلب کے درمیان خمس کو تقسیم فرمایا تھا، اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ ﷺ کی تقسیم کے مطابق خمس کو تقسیم فرماتے تھے۔ البتہ رسول اللہ ﷺ اپنے قرابت داروں کو جو عطا فرماتے تھے حضرت ابو بکر ان کو وہ عطا نہیں کرتے تھے لیکن ان کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نبی ﷺ کے قرابت داروں کو خمس میں سے عطا کرتے تھے۔ امام ابوداؤد کے علاوہ کسی نے یہ جملہ روایت نہیں کیا کہ حضرت ابو بکر حضور کے قرابت داروں کو نہیں دیتے تھے۔ الخ۔ حافظ ابن حجر نے کہا یہ اضافہ زہری نے اپنی طرف سے کیا ہے۔ (فتح الباری ج ۶)

ص ۲۳۵ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۹۷۸) اور ان کے درمیان بر طریق عموم تقسیم کرنا واجب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عمومی طور پر فرمایا ہے: اور (آپ کے) قرابت داروں کے لیے (الانفال: ۳۱) اور اس لیے کہ اس حق کا استحقاق قرابت کی وجہ سے ہے لہذا اس میں عموم ہوگا جس طرح میراث میں عموم ہوتا ہے۔ پس اس میں سے غنی اور فقیر اور مرد اور عورت سب کو دیا جائے گا۔ نبی ﷺ نے خمس میں سے حضرت عباس کو عطا فرمایا تھا اور وہ غنی تھے اور آپ نے اپنی پھوپھی صفیہ کو عطا فرمایا تھا اور مردوں کو دو حصے اور عورتوں کو ایک حصہ دیا جائے گا۔

جہاں تک یتیموں کے حصہ کا تعلق ہے تو یتیم اس کم سن بچہ کو کہتے ہیں جس کا باپ نہ ہو۔ آپ نے فرمایا احتلام (بلوغت) کے بعد کوئی یتیم نہیں ہوتا اور اس میں اس کے فقیر ہونے کا بھی اعتبار کیا جائے گا۔ کیونکہ غنی بالمال غنی بالاب سے بڑھ کر ہوتا ہے اور مسکینوں کے حصہ میں مسکین سے وہ مراد ہیں جو زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں۔ اسی طرح مسافروں کے حصہ میں بھی وہی مسافر مراد ہیں جو زکوٰۃ کے مستحق ہوتے ہیں۔ (الکافی ج ۳، ص ۱۵۳، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۳ھ)

خمس کی تقسیم میں فقہاء مالکیہ کا موقف

علامہ ابوبکر محمد بن عبد اللہ المالکی المعروف بابن العربی المتونی ۵۲۳ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مال غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے ہے۔ اللہ کے حصہ کے متعلق دو قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ اللہ کا حصہ اور رسول کا حصہ واحد ہے اور اللہ کے لیے ہے فرمانا کلام کے استفتاح (تمہید) کے لیے ہے، دنیا اور آخرت اور ساری مخلوق اللہ ہی کے لیے ہے۔ اور دوسرا قول ابو العالیہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس غنیمت کو لایا جاتا اس غنیمت کے چار حصے آپ لشکر اسلام میں تقسیم فرماتے پھر آپ بقیہ خمس میں سے ایک مٹھی بھر کر اٹھا لیتے اور اس کو کعبہ کے لیے وقف کر دیتے، پھر بقیہ خمس کو پانچ حصوں میں تقسیم فرماتے، اس میں سے ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے لیے ہوتا، ایک حصہ آپ کے قرابت داروں کا، ایک حصہ یتیموں کا، ایک حصہ مسکینوں کا اور ایک حصہ مسافروں کا۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۶، ص ۵۰۳، رقم الحدیث: ۳۳۲۸، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۶ھ)

اور رسول کے حصہ کے متعلق بھی دو قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ رسول کے حصہ کا ذکر استفتاح کلام کے لیے ہے جس طرح اللہ کے حصہ کا ذکر ہے۔ اور خمس میں سے کوئی چیز اللہ کے لیے ہے نہ رسول کے لیے ہے، اور خمس کے چار حصے کیے جائیں گے ایک حصہ بنو ہاشم اور بنو المطلب کے لیے اور ایک حصہ یتیموں کے لیے، ایک حصہ مسکینوں کے لیے اور ایک حصہ مسافروں کے لیے، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور دوسرا قول یہ ہے کہ خمس میں سے ایک حصہ رسول کے لیے ہے اور اس کی کیفیت میں چار قول ہیں ایک قول یہ ہے کہ یہ آپ کے قرابت داروں کو بہ طور وراثت ملے گا، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آپ کے بعد آپ کے خلیفہ کو ملے گا، تیسرا قول یہ ہے کہ اس کو گھوڑوں اور ہتھیاروں میں صرف کیا جائے گا، چوتھا قول یہ ہے کہ اس کو عامتہ المسلمین کے مصالح میں صرف کیا جائے گا۔

(احکام القرآن، ج ۲، ص ۲۰۱، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۰۸ھ)

خمس کی تقسیم میں فقہاء احناف کا موقف

علامہ علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی حنفی متونی ۵۸۷ھ لکھتے ہیں:

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ نبی ﷺ کی حیات میں خمس کے پانچ حصے کیے جاتے تھے۔ ایک حصہ نبی ﷺ کے لیے، ایک حصہ آپ کے قرابت داروں کے لیے، ایک حصہ یتیموں کے لیے، ایک حصہ مسکینوں کے لیے اور ایک حصہ مسافروں کے لیے۔

کے لیے ہے۔ جیسا کہ الانفال: ۴۱ میں تفصیل سے ہے۔ اس آیت کے شروع میں مذکور ہے: خمس اللہ کے لیے ہے۔ اس میں یہ تشبیہ ہے کہ خمس عبادت ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مساجد اللہ کے لیے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خمس کی تعظیم کے لیے ہو جیسے بیت اللہ اور ناکہ اللہ میں اضافت تعظیم کے لیے ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے حصہ میں اور زوی القربیٰ کے حصہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے علماء احناف رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا حصہ ساقط ہو گیا۔ اور امام شافعی نے یہ کہا ہے کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کا حصہ خلفاء راشدین کی طرف منتقل ہو گیا کیونکہ اب وہ مصالح المسلمین میں مشغول رہتے ہیں۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ یہ خمس رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی جیسا کہ آپ کی زندگی میں صفی (مال غنیمت میں سے رسول اللہ ﷺ جو چاہتے اپنے لیے چن لیتے مثلاً تلوار، زرہ یا باندی) اور صفی آپ کی خصوصیت تھی، پھر آپ کے بعد صفی اور صفی میں کسی کی خصوصیت نہ تھی۔ اس لیے واجب ہے کہ خمس میں بھی کسی کی خصوصیت نہ ہو، اس لیے آپ کے بعد آپ کا حصہ خلفاء راشدین کے لیے نہیں ہو گا۔

اور آپ کے قرابت داروں کے حصہ کے متعلق امام شافعی نے کہا ہے کہ وہ اب بھی باقی ہے اور وہ اولاد بنو ہاشم کو ملے گا، اس میں فقیر اور غنی برابر ہیں، اور ہمارے نزدیک بنو ہاشم کے اغنیاء کو خمس میں سے نہیں دیا جائے گا، البتہ بنو ہاشم کے فقراء کو خمس میں سے دیا جائے گا اور ان کے لیے علیحدہ حصہ وضع کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ فقراء کے حصے میں داخل ہیں بلکہ دوسرے فقراء پر مقدم ہیں۔ ہمارے نزدیک خمس کے تین حصے کیے جائیں گے ایک حصہ یتیموں کے لیے، ایک حصہ فقراء کے لیے اور ایک حصہ مسافروں کے لیے۔ (بدائع الصنائع، ج ۹، ص ۵۰۰-۴۹۹، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۸ھ)

علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر الرغینانی الحنفی المتوفی ۵۹۳ھ لکھتے ہیں:

ہماری دلیل یہ ہے کہ خلفاء اربعہ راشدین نے خمس کے اسی طرح تین حصے کیے تھے جس طرح ہم نے بیان کیا ہے۔ اور ان کی اقتداء کرنا کافی ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے بنو ہاشم کی جماعت! اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لوگوں کے دھوون اور میل کچیل کو ناپسند کیا ہے اور اس کے عوض میں تم کو خمس کا پانچواں حصہ عطا کیا ہے اور عوض یعنی زکوٰۃ اغنیاء کے لیے جائز نہیں ہے تو چاہیے کہ اس کا عوض یعنی خمس بھی بنو ہاشم کے اغنیاء کے لیے جائز نہ ہو۔

(ہدایہ اولین، ص ۵۷۷-۵۷۶، مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان)

علامہ کمال الدین عبدالواحد بن ہمام حنفی متوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:

امام ابو یوسف نے از کلبی از ابو صالح از ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں خمس کے پانچ حصے کیے جاتے تھے، اللہ اور اس کے رسول کا ایک حصہ تھا اور رسول کے قرابت داروں کا ایک حصہ تھا، اور یتیموں کا ایک حصہ تھا، اور مسکینوں کا ایک حصہ تھا، اور مسافروں کا ایک حصہ تھا۔ پھر حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے خمس کے تین حصے کیے ایک حصہ یتیموں کے لیے، ایک حصہ مسکینوں کے لیے اور ایک حصہ مسافروں کے لیے۔ علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں خلفاء راشدین کے اس فعل میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور اسی بناء پر امام ابو یوسف کی کلبی سے یہ روایت صحیح ہے۔ کیونکہ کلبی ائمہ حدیث کے نزدیک ضعیف ہے ماسوا اس کے کہ وہ دوسرے راویوں کی موافقت کرے۔ (فتح القدیر ج ۵، ص ۴۹۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام ابو یوسف نے جو خلفاء راشدین کا فعل نقل کیا ہے کہ وہ خمس کے تین حصے کرتے تھے اس کی تائید حسب ذیل

روایات سے ہوتی ہے۔

امام عبدالرزاق صنعانی متوفی ۲۱۱ھ روایت کرتے ہیں:

حسن بن محمد بن علی ابن الحنفیہ نے واعلموا انما غنمتم من شیء فان لله خمسہ (الانفال: ۴۱) کی تفسیر میں کہا اللہ کا ذکر بطور تمہید ہے دنیا اور آخرت اللہ ہی کے لیے ہے۔ اور خمس رسول کے لیے ہے اور ان کے قرابت داروں کے لیے۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ان دو حصوں میں اختلاف ہوا، کسی نے کہا قرابت داروں کا حصہ رسول اللہ ﷺ کی قرابت کی وجہ سے ہے۔ اور کسی نے کہا قرابت داروں کا حصہ خلیفہ کی قرابت کی وجہ سے ہے، اور اصحاب محمد ﷺ کی رائے اس پر متفق ہو گئی کہ ان دو حصوں کو گھوڑوں میں اور فی سبیل اللہ جہاد میں خرچ کیا جائے اور یہ حضرت ابو بکر اور عمر کی خلافت میں تھا۔ (المصنف ج ۵، ص ۲۳۸، رقم الحدیث: ۹۳۸۲، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ)

اس حدیث کو امام ابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے۔ (المصنف ج ۶، ص ۵۲۱، رقم الحدیث: ۳۳۴۴۰، مطبوعہ بیروت) ابو جعفر بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہما کے طریقہ پر عمل کیا۔ (المصنف ج ۵، ص ۲۳۷، رقم الحدیث: ۹۳۷۹، مطبوعہ بیروت)

اور امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ روایت کرتے ہیں:

حسن نے اس آیت (الانفال: ۴۱) کی تفسیر میں کہا رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اہل بیت کو کسی نے نہیں دیا، حضرت عمر نے نہ کسی اور نے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ یہ معاملہ امام المسلمین کی طرف مفوض ہے وہ اس کو فی سبیل اللہ اور فقراء میں جہاں اللہ کا ارادہ ہو وہاں خرچ کرے۔ (المصنف ج ۶، ص ۵۲۱، رقم الحدیث: ۳۳۴۴۴، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ) اس کے بعد فرمایا اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس (کتاب) پر جو اللہ نے فیصلہ کے دن نازل کی، یعنی مال غنیمت کا پانچواں حصہ اس تفصیل کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا لہذا اے مسلمان اہل لشکر تم اس خمس میں طمع نہ رکھو اور مال غنیمت کے باقی جو چار حصے ہیں ان پر قناعت کرو۔

یوم الفرقان سے یوم بدر مراد ہے جس دن اللہ تعالیٰ نے حق اور باطل میں امتیاز کر دیا تھا، اور جمعان سے مراد مسلمانوں اور کافروں کے دو گروہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کے دن اپنے معزز بندے یعنی نبی ﷺ پر جو چیز نازل کی اس سے مراد اس دن نازل ہونے والی آیات ہیں۔ اور وہ فرشتے جو مسلمانوں کے قدم جمانے کے لیے نازل ہوئے تھے اور دیگر نشانیاں مثلاً خاک کی مٹھی کا ہر کافر کی آنکھ میں پہنچ جانا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے کہ تم کم تعداد میں تھے اور تم کو بڑی تعداد والوں پر غالب کر دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جب تم (وادی بدر کے) قریبی کنارے پر تھے اور وہ دور والے کنارے پر تھے اور (تجارتی) قافلہ تم سے نچلی جانب تھا، اور اگر تم مقابلہ کا وقت مقرر کرتے تو پہنچنے کے وقت میں ضرور مختلف ہو جاتے، لیکن یہ اس لیے ہوا کہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو (اللہ کے نزدیک) کیا ہوا تھا، تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ دلیل سے زندہ رہے، اور بے شک اللہ بہت سننے والا، بے حد جاننے والا ہے۔ (الانفال: ۴۲)

مشکل اور اہم الفاظ کے معانی

العدوة الدنیا کا معنی ہے وادی کا ایک کنارہ جو مدینہ کے قریب تھا۔ العدوۃ القصوی کا معنی ہے وادی کی دوسری جانب جو مدینہ سے دور تھی۔ الרכب اسفل منکم کا معنی ہے تجارتی قافلہ وادی بدر کے نیچے ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ تھا۔ ولكن ليقضى الله امرا كان مفعولا یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پہلے سے وقت مقرر کیے بغیر کفار کے

بالتقابل لاکھڑا کیا تاکہ جو کام اللہ کے علم میں ہو چکا ہے وہ واقع اور خارج میں بھی ہو جائے اور وہ کام اسلام کی سر بلندی اور کفر کی پستی ہے۔ لیہلک من ہلک عن بینة یعنی اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غالب اور کفر کو مغلوب کر دکھایا تاکہ اب جو کفر کرے تو اللہ کی حجت پوری ہونے کے بعد کفر کرے اور روز قیامت کے لیے اس کا کوئی عذر باقی نہ رہے، اور اللہ کی حجت یہ تھی کہ مسلمان کم تعداد میں ہونے کے باوجود اللہ کی تائید و نصرت سے اپنے سے تین گنے زائد کافروں پر غالب آگئے۔ ویحی من حی عن بینة یعنی جو شخص ایمان لائے وہ شرح صدر کے ساتھ حجت ظاہرہ کو دیکھ کر ایمان لائے۔ ہلاکت اور حیات سے مراد کفر اور ایمان ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے موت اور زندگی مراد ہو یعنی مرے تو دلیل دیکھ کر مرے اور زندہ رہے تو دلیل دیکھ کر زندہ رہے۔

فتح بدر میں سیدنا محمد ﷺ کی دلیل نبوت

مسلمانوں کا لشکر ابتداء میں کمی اور تیاری نہ ہونے کی وجہ سے بہت خوف اور گھبراہٹ میں مبتلا تھا، جس جگہ ان کا قیام تھا وہ جگہ پانی سے دور تھی اور وہ زمین ریتلی تھی جس میں ان کے پیردھنس جاتے تھے۔ اور کفار کی تعداد بہت زیادہ تھی ان کے پاس ہتھیار بھی وافر مقدار میں تھے، سامان خورد و نوش بھی بہت تھا اور وہ پانی کے قریب ٹھہرے ہوئے تھے اور ان کی زمین ریتلی نہیں تھی ان کے لیے چلنا آسان تھا، اور ان کے پیچھے ان کا قافلہ تھا جس سے ضرورت کے وقت ان کو مدد حاصل ہونے کی امید تھی۔ یہ ظاہریہ حالات کافروں کے موافق اور مسلمانوں کے مخالف تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے معاملہ الٹ دیا اور جنگ کے وقت نقشہ بدل گیا۔ مسلمانوں کو بہت بڑی فتح حاصل ہوئی اور کفار کو بدترین شکست ہوئی۔ اور یہ سیدنا محمد ﷺ کا عظیم معجزہ تھا، اور آپ کے دعویٰ نبوت پر بہت قوی دلیل تھی، کیونکہ آپ نے جنگ شروع ہونے سے پہلے مسلمانوں کو فتح کی بشارت دے دی تھی اور فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فتح اور نصرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور آپ نے اس وقت مسلمانوں کی فتح کی پیش گوئی کی تھی جب ظاہری اور مادی طور پر مسلمانوں کی فتح کے کوئی آثار نہیں تھے۔ پس بدر کی فتح سے سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کا صدق ظاہر ہو گیا اور اسلام کی صداقت پر قوی دلیل قائم ہو گئی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب اگر کوئی کفر میں ہلاک ہو گا تو دلیل قائم ہونے اور حجت پوری ہونے کے بعد کفر میں ہلاک ہو گا اور جو اسلام کی حیات حاصل کرے گا تو وہ دلیل قائم ہونے کے بعد شرح صدر سے اسلام کو قبول کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (اور یاد کیجئے) جب اللہ آپ کو خواب میں کافروں کی تعداد کم دکھا رہا تھا اور اگر اللہ آپ کو ان کی زیادہ تعداد دکھاتا تو (اے مسلمانو!) تم ضرور ہمت ہار جاتے اور آپس میں اختلاف کرتے، لیکن اللہ نے (تم کو اس سے) سلامت رکھا، یہ شک وہ درون سینہ امور کو بہ خوبی جاننے والا ہے (الانفال: ۲۳)

کفار کی تعداد کم دکھانے کی حکمت

امام ابن جریر اپنی سند کے ساتھ مجاہد سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو نیند میں کفار کی تعداد کم دکھائی، آپ نے مسلمانوں کو خبر دی کہ کافر تھوڑے ہیں تو ان کے دل مطمئن ہو گئے۔ (جامع البیان جز ۱۰، ص ۱۸)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ واقعہ میں کفار زیادہ تعداد میں تھے تو ان کو کم تعداد میں دیکھنا یا دکھانا واقع کے خلاف ہے تو اللہ سے یہ کیسے متصور ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ کو تمام کفار نہیں دکھائے تھے بلکہ ان کی قلیل تعداد دکھائی تھی اور آپ کو ان ہی کی خبر دی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واقع میں اگرچہ زیادہ تھے لیکن انجام اور مال کے اعتبار سے تھوڑے تھے۔ پھر فرمایا اگر اللہ آپ کو ان کی زیادہ تعداد دکھاتا تو (اے مسلمانو!) تم ضرور ہمت ہار جاتے لیکن اللہ نے تم کو سلامت رکھا۔ امام ابن جریر نے اس کی تفسیر میں حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے امر کو سلامت رکھا حتیٰ کہ

ان کو ان کے دشمنوں پر غلبہ عطا فرمایا۔

اس کا معنی یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو ابتداء میں یہ علم ہو جاتا کہ دشمن کی تعداد ان سے تین گنے سے بھی زیادہ ہے تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے اور وہ آپس میں جنگ کے متعلق اختلاف کرتے۔ سو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو آپس کے اختلاف سے محفوظ رکھا یا ان کو جنگ بدر میں شکست اور ہزیمت سے سلامت رکھا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (یاد کرو) جب تم سے مقابلہ کے وقت تمہیں کفار کی تعداد کم دکھائی اور تمہاری تعداد (بھی) ان کو کم دکھائی تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو اس کے نزدیک کیا ہوا ہے، اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جاتے ہیں (الانفال: ۴۳)

مسلمانوں کی تعداد کم دکھانے کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار کی تعداد کم دکھائی اور مشرکوں کو بھی مسلمانوں کی تعداد کم دکھائی۔ پہلی صورت میں مشرکین کی تعداد کم دکھانے کی حکمت یہ تھی کہ مسلمان ان کی اصل تعداد دیکھ کر گھبرانہ جائیں اور دوسری صورت میں مشرکوں کو مسلمانوں کی تعداد کم دکھانے میں یہ حکمت تھی تاکہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں زیادہ تیاری اور احتیاط نہ کریں تاکہ وہ آسانی سے شکست کھا جائیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ زیادہ کم دکھانا اللہ کی شان کے کس طرح لائق ہو گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان اور کافر دونوں ایک دوسرے سے اتنے فاصلہ پر ہوں کہ ہر فریق دوسرے کی اصل تعداد کا ادراک نہ کر سکا ہو اور ہر فریق کو دوسرے کی تعداد اصل سے کم دکھائی دی، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کفار اپنے تکبر اور بلند بانگ دعویٰ کی وجہ سے مسلمانوں کو جو پہلے ہی کم تھے، ان کو اور بھی کم سمجھ رہے ہوں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا

اے ایمان والو! جب تمہارا مخالفت فرج سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا بہ کثرت

اللَّهُ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۲۵﴾ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ

ذکر کرو تاکہ تم کامیاب ہو ○ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ

اور آپس میں مخالفت نہ کرو، ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو، بیٹے شک

اللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۲۶﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ

اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ○ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اترتے ہوئے

دِيَارِهِمْ بَطْرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ

اور لوگوں کو (اپنا زور اور قوت) دکھاتے ہوئے نکلے وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکتے تھے

اللَّهُ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۳۵﴾ وَإِذْ زَيْنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ

اور اللہ ان کے تمام کاموں کا احاطہ کرنے والا ہے ○ اور (یاد کرو) جب شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے

أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَأَغْلِبَنَّ لَكُمْ يَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي

یہے خوش نما بنا دیا اور کہا آج لوگوں میں سے کوئی بھی تم پر غالب نہیں آسکتا اور بیشک میں تمہارا

جَارِكُمْ فَلَمَّا تَرَأَتْ الْفِتْنَيْنِ نَكَصَ عَلَى عَقْبَيْهِ وَقَالَ

رفیق ہوں، اور جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ ایڑیوں کے بل بھاگا اور کہنے لگا

إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ

میں تم سے بری الذمہ ہوں بیشک میں ان کو دیکھ رہا ہوں جن کو تم نہیں دیکھتے، بیشک میں اللہ سے ڈرتا ہوں

وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۳۶﴾

اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! جب تمہارا مخالف فوج سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا بہ کثرت ذکر کرو تاکہ تم کامیاب ہو ○ (الانفال: ۳۵)

آیات سابقہ سے ارتباط

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا جو اس نے جنگ بدر میں رسول اللہ ﷺ کو اور مسلمانوں کو عطا فرمائی تھیں، چونکہ جنگ بدر میں مسلمانوں کو ایک جنگ سے سابقہ پیش آچکا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کو جنگ کے آداب تعلیم فرمائے۔ جس میں پہلی چیز ہے جنگ میں ثابت قدم رہنا۔ نبی ﷺ نے ایک اور چیز بھی بتلائی ہے کہ ابتداءً مسلمانوں کو جنگ یا کسی بھی آزمائش اور بلا کی تمنا نہیں کرنی چاہیے لیکن جب ان پر جنگ مسلط کر دی جائے تو پھر ان کو اس جنگ میں ثابت قدم رہنا لازم ہے اور اس سے پیٹھ موڑنا جائز نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ہم پہلے ایسی احادیث بیان کریں گے جن میں رسول اللہ ﷺ نے دشمن سے مقابلہ کی تمنا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر جنگ میں ثابت قدم رہنے کے متعلق احادیث بیان کریں گے اور اس کے بعد دوران جنگ ذکر کرنے کے متعلق احادیث بیان کریں گے۔

دشمن سے مقابلہ کی تمنا کی ممانعت کے متعلق احادیث

امام ابو بکر عبد الرزاق بن ہمام صنعانی متوفی ۲۱۱ھ روایت کرتے ہیں:

یحییٰ بن ابی کثیر بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو۔ کیونکہ تم نہیں جانتے ہو سکتا ہے کہ تم ان کی وجہ سے کسی مصیبت میں مبتلا کیے جاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرو اور جب وہ اشتعال انگیز گیت گاتے ہوئے اور چلاتے ہوئے آئیں تو تم زمین کو لازم پکڑ لینا، زمین پر بیٹھ جانا اور یہ دعا کرنا: اے اللہ ہمارے اور ان کے رب ہماری پیشانیاں اور

تبیان القرآن

جلد چہارم

ان کی پیشانیاں تیرے ہاتھ میں ہیں اور تو ہی ان کو قتل کرے گا۔ اور جب وہ تمہارے قریب پہنچیں تو تم ان پر حملہ کر دینا اور یہ یاد رکھنا کہ جنت تلواروں کے نیچے ہے۔ (المصنف ج ۵، ص ۲۳۸، رقم الحدیث: ۹۵۱۳، مطبوعہ مکتب اسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو اور اللہ سے عافیت کا سوال کرو اور جب تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا ذکر کرو اور اگر وہ چلائیں تو تم خاموش رہنا۔ (المصنف ج ۵، ص ۲۵۰، رقم الحدیث: ۹۵۱۸، مطبوعہ بیروت، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، رقم الحدیث: ۱۷۱۱)

امام ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو کیونکہ تم نہیں جانتے کہ اس میں کیا ہوگا۔ (المعجم الاوسط ج ۹، ص ۲۷، رقم الحدیث: ۸۰۵۲، مطبوعہ مکتبہ العارف ریاض، ۱۴۱۵ھ)

دشمن اسلام کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنے کی فضیلت اور اجر و ثواب امام طبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ایوب خالد بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص دشمن سے مقابلہ میں صابر رہا حتیٰ کہ وہ شہید کر دیا گیا یا اس نے کسی دشمن کو قتل کیا تو وہ قبر کے فتنہ میں مبتلا نہیں ہوگا۔

(المعجم الاوسط ج ۵، ص ۷۳، رقم الحدیث: ۴۱۳۱، مطبوعہ ریاض)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے دشمن سے مقابلہ میں صبر کیا حتیٰ کہ وہ قتل کر دیا گیا یا اس نے دشمنوں کو قتل کیا تو وہ قبر کے فتنہ میں مبتلا نہیں ہوگا۔

(المعجم الاوسط ج ۹، ص ۱۱۶-۱۱۵، رقم الحدیث: ۸۲۳۹، مطبوعہ ریاض)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بہترین دوست چار ہیں۔ اور چار سو پر مشتمل بہترین فوج ہے اور چار ہزار پر مشتمل بہترین لشکر ہے اور جو لشکر بارہ ہزار پر مشتمل ہو وہ تعداد میں کمی کی وجہ سے شکست نہیں کھائے گا بشرطیکہ وہ سچ بولیں اور ثابت قدم رہیں۔ (اس حدیث کی سند صحیح ہے)

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۱۱، مسند ابو یعلیٰ، رقم الحدیث: ۲۷۱۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۷۲۱، مصنف عبدالرزاق رقم

الحدیث: ۹۶۹۹، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۴۷۱۷، موارد النعمان رقم الحدیث: ۱۶۶۳، مسند احمد ج ۱، ص ۲۹۳، سنن بیہقی ج ۹، ص ۱۱۵۶)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا جو شخص دو آدمیوں سے بھاگا وہ بھاگنے والا ہے اور جو تین کے مقابلہ سے بھاگا وہ بھاگنے والا نہیں ہے۔

(المعجم الکبیر ج ۱۱، ص ۷۶، رقم الحدیث: ۱۱۱۵۱، حافظ البیہقی نے کہا اس حدیث کے راوی ثقہ ہیں، مجمع الزوائد ج ۵، ص ۳۲۸)

دوران قتال اللہ تعالیٰ کے ذکر کے متعلق احادیث

امام ابو بکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ متوفی ۲۳۵ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو مجلز رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب نبی ﷺ دشمن سے مقابلہ کرتے تو یہ دعا کرتے: اے اللہ تو میرا بازو ہے اور میرا مددگار ہے، میں تیری مدد سے پھرتا ہوں اور تیری مدد سے حملہ کرتا ہوں اور تیری مدد سے قتال کرتا ہوں۔

(المصنف ج ۶، ص ۵۱۸، رقم الحدیث: ۳۳۳۱۳، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۶ھ)

حضرت ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کفار کی حملہ آور جماعتوں کے خلاف دعا ضرر کی: اے

اللہ! کتاب کے نازل کرنے والے، جلد حساب لینے والے کفار کی جماعتوں کو شکست دینے والے، ان کو شکست دے اور ان کے قدم ڈگمگادے۔ (المصنف ج ۶، ص ۵۱۸، رقم الحدیث: ۳۳۳۱۳، مطبوعہ بیروت)

قیس بن عباد بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب تین موقعوں پر آواز بلند کرنے کو ناپسند کرتے تھے، قتال کے وقت، جنازہ کے وقت اور ذکر کے وقت۔

(المصنف ج ۶، ص ۵۱۷، رقم الحدیث: ۳۳۳۰۹، طبع بیروت، سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۱۶۵۶)

سعید بن جبیر قتال کے وقت آواز بلند کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور قرآن پڑھتے وقت اور جنازہ کے وقت۔

(المصنف ج ۶، ص ۵۱۷، رقم الحدیث: ۳۳۳۱۰، طبع بیروت)

کعب احبار بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو قرآن کی تلاوت کرنے اور ذکر کرنے سے زیادہ کوئی چیز پسند نہیں ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو نماز پڑھنے اور قتال کرنے کا حکم نہ دیتا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے قتال کے وقت بھی ذکر کرنے کا حکم دیا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ (الانفال: ۱۵) (تفسیر امام ابن ابی حاتم، رقم الحدیث: ۹۱۳۲)

جن آثار میں قتال کے وقت بلند آواز سے ذکر سے منع کیا ہے، ان کا انشاء یہ ہے کہ بہت چلا کر ذکر نہ کیا جائے جس سے دشمن کو مسلمانوں کی پوزیشن کا پتا چل جائے اور متوسط اور معتدل جہر کے ساتھ اللہ کا ذکر کرنا چاہیے۔

عطاء نے کہا جنگ کے وقت خاموش رہنا اور ذکر کرنا واجب ہے۔ پھر انہوں نے الانفال: ۲۵ کی تلاوت کی۔ میں نے پوچھا وہ بلند آواز سے ذکر کریں، کہا ہاں!

(تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۵، رقم الحدیث: ۹۱۳۳، مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۶، ص ۵۱۷، رقم الحدیث: ۳۳۳۰۸)

دوران قتال ذکر کے متعلق علماء کے اقوال

امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ نے لکھا ہے کہ دوران جنگ دل سے اللہ کو یاد کرنا چاہیے اور زبان سے اللہ کا ذکر کرنا چاہیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو انتہائی شدید حالت میں بھی ذکر کرنے کا حکم دیا ہے اور اس میں یہ تنبیہ ہے کہ انسان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی وقت بھی اس کا دل اور اس کی زبان اللہ کے ذکر سے خالی رہے۔ اگر ایک شخص مغرب سے مشرق تک اپنے اموال کی سخاوت کرے اور دوسرا شخص مشرق سے مغرب تک تلوار سے جہاد کرتا جائے، تب بھی اللہ کا ذکر کرنے والے کا درجہ اور اجر ان سے زیادہ ہوگا۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۸۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

علامہ ابو عبد اللہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں اس ذکر کے متعلق علماء کے تین اقوال ہیں:

- ۱- جب مصائب اور مشکلات میں تمہیں گھبراہٹ ہو تو اللہ کا ذکر کرو، کیونکہ اللہ کے ذکر سے طمانیت اور تقویت حاصل ہوگی۔
- ۲- اپنے دلوں کے ساتھ ثابت قدم رہو اور اپنی زبانوں سے اللہ کا ذکر کرو، کیونکہ دشمن سے مقابلہ کے وقت دل پر سکون نہیں ہوتا اور زبان مضطرب رہتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ذکر کا حکم دیا تاکہ دل پر سکون ہو اور زبان سے ذکر جاری رہے اور اس طرح ذکر کرے جس طرح اصحاب طالوت نے ذکر کیا تھا:

رَبَّنَا آفِرْغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَ
انصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (البقرہ: ۲۵۰)

اے اللہ! ہم پر صبرانڈیل دے اور ہمارے قدموں کو جما
دے اور ہمیں قوم کافرن پر فتح عطا فرما۔

تبیان القرآن

جلد چہارم

اور یہ حالت اسی وقت حاصل ہوگی جب انسان کی معرفت قوی ہو اور اس کی بصیرت روشن ہو۔

۳۔ اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے اس وعدہ کو یاد کرو کہ تم اپنی جانوں کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکے ہو اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری جانوں اور مالوں کے بدلہ جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس میں کافی بحث کی گئی ہے کہ دورانِ قتال جس ذکر کا حکم دیا ہے اس سے مراد ذکر بالقلب ہے یا ذکر باللسان۔ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد زبان سے ذکر کرنا ہے اور دل اس ذکر کے موافق ہو یعنی اس کا ذہن اس ذکر کے معانی کی طرف متوجہ ہو، ایسا نہ ہو کہ زبان سے اللہ کا ذکر ہو اور دل و دماغ کہیں اور ہو۔ محمد بن کعب القرظی نے کہا اگر کسی شخص کو ذکر ترک کرنے کی رخصت دی جاتی تو حضرت زکریا علیہ السلام کو رخصت دی جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

أَلَا تُكَلِّمُ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمَزًا وَآوَاذٌ كُرْرًا
رَبِّكَ كَثِيرًا (آل عمران: ۴۱)

گے اور اپنے رب کا بکثرت ذکر کریں۔

اور کسی شخص کو دورانِ قتال ترک ذکر کی رخصت دی جاتی، مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِذَا لَقَيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا
اللہ کا بہ کثرت ذکر کرنا۔ (الانفال: ۴۵)

قادہ نے کہا جس وقت بندہ تلوار سے جہاد کی شدت میں ہو اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے اس پر ذکر فرض کیا ہے۔ اور اس ذکر کا حکم یہ ہے کہ یہ خفی ہو کیونکہ مواضعِ قتال میں آواز بلند کرنا مکروہ ہے جبکہ ذکر کرنے والا تنہا ہو لیکن مجاہدین کی جماعت کے ساتھ حملہ کرتے وقت بلند آواز سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا مستحسن اور مستحب ہے تاکہ دشمن اسلام پر رعب اور ہیبت طاری ہو۔

(الجامع لاحکام القرآن: جزء ۷، ص ۳۸۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں مخالفت نہ کرو، ورنہ تم بزدل ہو جاؤ

گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر کرو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (الانفال: ۴۶)

اختلاف رائے کی بناء پر مخالفت نہ کی جائے

اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو یہ حکم دائمی ہے۔ اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ہر معاملہ میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں، خصوصاً جہاد کے معاملہ میں اور آپس میں مخالفت نہ کرو جیسا کہ بدر اور احد میں بعض مسلمانوں نے بعض کی مخالفت کی۔

غیر منصوص معاملات میں اختلاف رائے ممنوع نہیں ہے اور دلائل کے ساتھ اختلاف کرنا جائز ہے۔ ممنوع یہ ہے کہ حق واضح ہونے کے بعد بھی انسان اپنے موقف پر ڈٹتا رہے اور اپنی رائے سے رجوع نہ کرے، اور یہ ممنوع ہے کہ کسی غیر منصوص معاملہ میں اپنی رائے سے اختلاف کی بنا پر فریق ثانی کی مخالفت شروع کر دے اس کو سب و شتم کرے اور لعن و طعن کرے اور اس کی تکفیر کرنے سے بھی گریز نہ کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بعض فروعی معاملات میں ایک دوسرے سے اختلاف رہا لیکن انہوں نے اس اختلاف رائے کو ایک دوسرے کی مخالفت کرنے کا رنگ نہیں دیا اور باہم احترام کو قائم رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم عذر کی حالت میں جنسی کے لیے تیمم جائز نہیں قرار دیتے تھے اور باقی صحابہ اس کو جائز کہتے تھے۔ معراج کی شب اللہ عزوجل کا دیدار کرنے اور سماع موتی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جمہور صحابہ سے اختلاف تھا۔ حج تمتع میں حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا جمہور صحابہ سے اختلاف تھا۔ جنسی کی تلاوت قرآن میں حضرت ابن عباس رضی

اللہ عنہما کا جمہور صحابہ سے اختلاف تھا۔ رکوع میں تطبیق (رکوع میں دونوں ہاتھ جوڑ کر رانوں کے درمیان رکھنا) کرنے کے متعلق حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا جمہور صحابہ سے اختلاف تھا۔ ضرورت سے زائد مال کے صدقہ کرنے کے وجوب میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہما کا جمہور صحابہ سے اختلاف تھا۔ اس کے علاوہ اور کئی مسائل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراء میں اختلاف تھا لیکن انہوں نے ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کی۔ ائمہ مجتہدین کا مسائل فرعیہ میں ایک دوسرے سے اختلاف تھا لیکن وہ ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

سو عصری اور اجتہادی مسائل میں اگر ایک عالم کی رائے دوسرے عالم سے مختلف ہو تو اس میں شدت نہیں کرنی چاہیے اور ہر ایک کو چاہیے کہ وہ دلائل کے ساتھ اپنا نقطہ نظر پیش کرے، اور عام آدمی جس عالم کے دلائل سے متفق ہو اس پر عمل کرے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے یعنی قرآن اور سنت کے منصوص اور واضح احکام پر عمل کرو۔ اس کے بعد فرمایا ولا تنازعوا یعنی ایک دوسرے سے تنازع اور جھگڑا نہ کرو اور ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرو۔ اس کا محمل یہ ہے کہ اجتہادی اور فرعی مسائل میں ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرو۔

امام رازی نے یہ اشکال قائم کیا ہے کہ اس آیت میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور تنازع سے منع کیا ہے۔ اس سے لازم آیا کہ صرف قرآن اور حدیث کے احکام پر عمل کیا جائے اور قیاس کے احکام پر عمل نہ کیا جائے کیونکہ قیاس تنازع کو واجب کرتا ہے پھر اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ہر قیاس تنازع کو واجب نہیں کرتا۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۹۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام رازی کا یہ جواب صحیح نہیں ہے، اولاً اس لیے کہ امام رازی نے فرمایا ہر قیاس تنازع کو واجب نہیں کرتا۔ اس کا معنی یہ ہے کہ بعض قیاس تنازع کو واجب کرتے ہیں تو ان پر عمل کرنا جائز نہ ہو۔ ثانیاً یہ کہ تنازع سے کیا مراد ہے اختلاف یا مخالفت اور جھگڑا، اگر اس سے مراد اختلاف ہے تو اختلاف معیوب چیز نہیں ہے قرآن اور سنت میں اس کی بہت مثالیں ہیں روایات میں ہے کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے، اور اگر اس سے مراد ایک دوسرے کی مخالفت کرنا ہے تو وہ برحق ہے اور وہ قیاس کے منافی نہیں ہے۔ عموماً ایک مجتہد کا قیاس دوسرے مجتہد کے قیاس سے مختلف ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایک دوسرے کی مخالفت کو واجب نہیں کرتا، بلکہ ہر مجتہد اور اس کے متبعین کو چاہیے کہ وہ دلائل کے ساتھ اپنے قیاس پر عمل کریں اور ایک دوسرے کی مذمت نہ کریں اور نہ اس کی مخالفت کریں۔

مسلمانوں کے زوال کا سبب وحدت ملی کو پارہ پارہ کرنا ہے

اس آیت کا ایک اور محمل یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہوئے تمام مسلمان ایک نظام حکومت قائم کریں اور مسلمانوں کے تمام علاقے باہم متحد ہو کر ایک خلیفہ کے ماتحت ہوں، اور ولا تنازعوا کا معنی یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی مملکتیں اور حکومتیں قائم کر کے وحدت ملی کو پارہ پارہ نہ کریں۔ کیونکہ اگر مسلمان ایک نظام خلافت کو توڑ کر چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں بٹ گئے تو ان کے رعب اور طاقت کی ہوا اکھڑ جائے گی اور وہ کم ہمت اور کم حوصلہ ہو جائیں گے، اور تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مسلمانوں کی ایک سلطنت تھی اور مسلم ریاستیں باہم متحد تھیں تو دشمنان اسلام کو مسلمان ملکوں پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا اور جب یہ اتحاد ٹوٹ گیا اور خلافت اسلامیہ چھوٹی چھوٹی مملکتوں میں تبدیل ہو گئی تو دشمنان اسلام نے مسلم ریاستوں کو تاراج کرنا شروع کر دیا۔ جب تک اندلس میں ایک نظام حکومت قائم رہا وہاں مسلمانوں کی حکومت رہی اور جب طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا اور آپس کی مخالفت کی وجہ سے سرزمین اندلس مختلف حکومتوں میں بٹ گئی تو عیسائی حکمرانوں نے ایک ایک کر کے

پورے اندلس پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے مسلمانوں کو یہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔ متحدہ پاکستان بنگالی اور غیر بنگالی کے تعصب کی وجہ سے ٹوٹ گیا اور آپس کی مخالفت کی وجہ سے مسلمانوں کی قوت کی ہوا اکھڑ گئی اور تاریخ میں پہلی مرتبہ نوے ہزار مسلم افواج نے ایک ہندو جرنیل کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے گھروں سے اترتے ہوئے اور لوگوں کو (اپنا زور اور طاقت) دکھاتے ہوئے نکلے وہ (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکتے تھے اور اللہ ان کے تمام کاموں کا احاطہ کرنے والا ہے ○

(الانفال: ۷۷)

مشکل الفاظ کے معنی

البطرس: زجاج نے کہا نعمت میں سرکشی کو بطرس کہتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ جب کسی شخص کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ نعمتیں عطا فرمائے تو اگر وہ ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے اور اس کی رضا جوئی میں خرچ کرے اور یہ یقین رکھے کہ یہ نعمتیں اللہ کی جانب سے ہیں تو یہ ان نعمتوں کا شکر ہے اور اگر وہ ان نعمتوں کو اپنے احباب، اقرباء اور معاصرین پر فخر کرنے اور اپنی برتری ظاہر کرنے کا ذریعہ بنائے تو یہ بطرس (اترانا) ہے۔

رشاء الناس: کسی شخص کے باطن میں خرابی ہو اور وہ لوگوں کے سامنے اچھائی دکھانے کا قصد کرے تو یہ ریا ہے۔ ریا اور نفاق میں یہ فرق ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان کا اظہار کرے اور اس کے باطن میں کفر ہو تو یہ نفاق ہے، اور اگر کوئی شخص عبادت کا اظہار کرے اور اس کے باطن میں معصیت ہو تو یہ ریا ہے۔ امام ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قنادہ سے روایت کیا ہے جن مشرکین قریش نے نبی ﷺ سے وادی بدر میں قتال کیا تھا وہ اپنے گھروں سے اترتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے نکلے تھے، ان سے کہا گیا کہ تمہارا قافلہ پہنچ گیا ہے اور تمہارا مقصد پورا ہو گیا اب لوٹ آؤ، انہوں نے کہا نہیں خدا کی قسم! ہم اس وقت تک واپس نہیں جائیں گے جب تک عرب والے ہماری شان و شوکت کے قصے بہ طور مثال بیان نہیں کریں گے۔ اور روایت ہے کہ اس دن نبی ﷺ نے فرمایا اے اللہ آج یہ قریش اترتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے تیرے رسول سے لڑنے کے لیے آئے ہیں۔

(در مشورج ۳، ص ۷۷، تفسیر ابن جریر ج ۱۰، ص ۲۳)

فخر اور ریا کی مذمت

اس آیت میں فرمایا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے اترتے ہوئے اور لوگوں کو (اپنی طاقت) دکھاتے ہوئے نکلے۔ امام ابن اسحاق نے کہا اس سے مراد ابو جہل اور اس کے ساتھی ہیں انہوں نے کہا تھا کہ ہم اس وقت تک واپس نہیں لوٹیں گے، جب تک ہم وادی بدر نہ پہنچ جائیں۔ وہاں پر ہم اونٹ ذبح کریں گے اور شراب پییں گے اور ہماری باندیاں ہمیں جوش دلانے والے نغمے سنائیں گی اور جب بھی عرب ہمارا ذکر سنیں گے تو ہم سے خوف زدہ ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تمہارا معاملہ ان لوگوں کی طرح اپنا زور دکھانے اور سنانے کے لیے نہیں ہونا چاہیے اور نہ لوگوں میں اپنی شہرت کے لیے ہونا چاہیے، تمہاری نیت خالص اللہ کی رضا جوئی اور اللہ کے دین کی نصرت کے لیے ہونی چاہیے۔

(جامع البیان جز ۱۰، ص ۲۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ دشمن سے مقابلہ کے وقت ثابت قدم رہیں اور دوران قتال اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہیں۔ اور ان کو اس بات سے منع کیا کہ دشمن سے ان کے قتال کا محرک اور باعث اپنے زور اور طاقت کو دکھانا اور سنانا ہو بلکہ ان سے قتال کا باعث صرف اللہ کے احکام پر عمل اور اس کی رضا جوئی اور خوشنودی ہونی چاہیے۔ اسلام

کے تمام احکام کا حاصل یہ ہے کہ انسان مخلوق میں مشغول رہ کر اللہ کے احکام پر عمل کرتا رہے اور فخر اور تکبر سے بچے۔ انسان گنہ کرے اور اخلاص اور انکسار کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع اور توبہ کرے یہ اس سے بہتر ہے کہ انسان عبادت کر کے اس پر فخر اور غرور کرے۔ اس کے بعد فرمایا ”اور اللہ ان کے تمام کاموں کا احاطہ کرنے والا ہے“ اس میں یہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ با اوقات انسان یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس کام کو محض اللہ کی رضا کے لیے اخلاص سے کر رہا ہے اور حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا کہ وہ تمہارے دلوں کے حال کو جاننے والا ہے۔ اسے علم ہے کہ تم کون سا کام حقیقت میں اللہ کے لیے کرتے ہو اور کون سا کام حقیقت میں دکھاوے کے لیے کرتے ہو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (یاد کرو) جب شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے لیے خوش نما بنا دیا اور کہا آج لوگوں میں سے کوئی بھی تم پر غالب نہیں آسکتا اور بے شک میں تمہارا رفیق ہوں اور جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ ایڑیوں کے بل بھاگا اور کہنے لگا میں تم سے بری الذمہ ہوں بے شک میں ان کو دیکھ رہا ہوں جن کو تم نہیں دیکھتے۔ بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے (الانفال: ۴۸)

ابلیس کا سراقہ کی شکل میں آکر کفار کو بہرکانا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جنگ بدر کے دن ابلیس کفار کے لشکر میں سراقہ بن مالک بن جشم کی صورت میں متشکل ہو کر آیا اور کہنے لگا: آج لوگوں میں سے کوئی بھی تم پر غالب نہیں آسکتا اور میں تمہارا محافظ ہوں۔ جنگ شروع ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خاک کی ایک مٹھی اٹھا کر مشرکین کے چہرے پر ماری، پس وہ پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اور حضرت جبرئیل ابلیس کی طرف بڑھے اس وقت اس کا ایک ہاتھ مشرک کے ہاتھ میں تھا۔ ابلیس نے اس شخص سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور وہ اور اس کا ساتھی پیٹھ موڑ کر بھاگے۔ اس شخص نے کہا اے سراقہ تم تو ہمارے رفیق تھے اب کہاں جا رہے ہو؟ ابلیس نے کہا بے شک میں ان کو دیکھ رہا ہوں جن کو تم نہیں دیکھتے بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اس نے اس وقت کہا تھا جب اس نے فرشتوں کو دیکھا تھا۔ (جامع البیان جز ۱۰، ص ۲۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت)

طلحہ بن عبید اللہ بن کریم بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان کو کسی دن بھی اس قدر چھوٹا اس قدر رحمت سے دور اس قدر حقیر اور اس قدر غضبناک نہیں دیکھا گیا جتنا وہ عرفہ کے دن ہوتا ہے، کیونکہ اس دن وہ اللہ کی رحمت نازل ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور بڑے بڑے گناہوں کی اللہ کی طرف سے معافی دیکھتا ہے۔ اور جس قدر ذلیل وہ جنگ بدر کے دن تھا پوچھا گیا کہ اس نے جنگ بدر کے دن کیا دیکھا تھا؟ یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا اس نے دیکھا کہ جبرئیل فرشتوں کی صفیں ترتیب دے رہے ہیں۔

(الموطا الحج ۲۳۵، مصنف عبدالرزاق ج ۵، ص ۱۸-۱۷، رقم الحدیث: ۸۸۳۲، الاستذکار ج ۱۳، رقم الحدیث: ۹۱۸، جامع البیان جز ۱۰، ص ۲۷)

ص ۲۷، التعمیر ج ۱، ص ۱۱۵، مطبوعہ مکتبہ تجاریہ مکہ مکرمہ)

ابلیس کو سراقہ کی شکل میں متشکل ہونے کی قدرت دینے کی حکمت

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ابلیس کے سراقہ بن مالک کی شکل میں متشکل ہونے سے کیا فائدہ ہوا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا معجزہ ہے۔ کیونکہ جب کفار قریش مکہ واپس لوٹے تو انہوں نے کہا سراقہ نے ہم کو شکست سے دو چار کیا۔ جب سراقہ کو یہ خبر پہنچی تو اس نے کہا بہ خدا مجھے تو تمہارے بدر جانے کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی کہ مجھ تک تمہاری شکست کی خبر پہنچی اس وقت کفار قریش نے جان لیا کہ وہ شخص سراقہ نہیں بلکہ شیطان تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب شیطان کفار کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑنے آیا تھا اور یہ سب کو معلوم ہے کہ وہ غیر معمولی طاقت والا ہے تو اس نے مسلمانوں کے لشکر کو شکست کیوں نہیں دی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے لشکر میں حضرت جبرئیل کو فرشتوں کے ساتھ دیکھا اس لیے وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب شیطان کو یہ قدرت ہے کہ وہ بشری شکل میں متشکل ہو کر کفار کی مدد کر سکتا ہے تو پھر چاہیے تھا کہ وہ ہر جنگ میں ایسا ہی کرتا اور اس کے نتیجے میں کسی جنگ میں بھی مسلمانوں کو فتح یاب ہونے نہ دیتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صرف جنگ بدر میں ہی یہ قدرت دی تھی اور اس کی حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں فرشتے بھی نازل کیے تھے جو شیطان کا توڑ کر سکتے تھے اور باقی مہمات اور غزوات میں نہ فرشتوں کو نازل کیا اور نہ شیطان کو یہ قدرت دی اور جنگ بدر میں اس کو یہ قدرت دینے کا فائدہ رسول اللہ ﷺ کا عظیم معجزہ ظاہر کرنا تھا۔ نیز اس میں یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ ابلیس لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور جب لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں تو وہ ان سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

إِذْ يَقُولُ الْمَتَفِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ عَزَّ

اور (یاد کرو) جب منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں (کفر کی) بیماری تھی، یہ کہہ رہے تھے ان لوگوں

هَؤُلَاءِ دِينُهُمْ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ

کو ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر دیا ہے، اور جس نے اللہ پر توکل کر لیا تو بیشک اللہ بہت غالب

حَكِيمٌ ﴿٥٩﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا الْمَلَائِكَةُ

بڑی حکمت والا ہے اور کاش تم (وہ منظر) دیکھتے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں،

يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ وَذُقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾

ان کے چہروں اور ان کے کولہوں پر ضرب لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو اب جلنے کا عذاب چکھو

ذَلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٥١﴾

یہ ان کاموں کی سزا ہے جو تم نے پہلے کیے تھے اور بیشک اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے

كذَابٍ أَلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَفَرُوا وَإِيَّا تِ

ان کی عادت فرعون کے متبعین اور ان سے پہلے لوگوں کی مثل ہے جنہوں نے اللہ کی آیتوں کے

اللَّهُ فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ شَدِيدٌ

ساتھ کفر کیا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا، بیشک اللہ بڑی قوت والا سخت عذاب

الْعُقَابِ ﴿۵۶﴾ ذَلِكِ بِأَنَّ اللَّهَ لَمَّا يَكُ مُغَيِّرًا نِعْمَةً أَنْعَمَهَا

پینے والا ہے ○ یہ اس لیے ہے کہ اللہ جس قوم کو کوئی نعمت عطا فرمائے تو اس وقت تک وہ اس نعمت کو تبدیل کرنے

عَلَى قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرَ أَمْرًا بِأَنْفُسِهِمْ وَلَا إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ

والا نہیں ہے جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلیں اور بے شک اللہ بہت سننے والا

عَلَيْهِمْ ﴿۵۷﴾ كَذَّابٍ إِذْ فِرْعَوْنُ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا

بے حد جاننے والا ہے ○ (ان کا معاملہ) فرعون کے متبعین اور ان سے پہلے لوگوں کی طرح ہے جنہوں نے ان سے پہلے

بِآيَاتِ رَبِّهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ

اپنے رب کی آیات کی تکذیب کی تو ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے فرعون کے متبعین کو غرق کر

وَكُلٌّ كَانُوا ظَالِمِينَ ﴿۵۸﴾ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الَّذِينَ

دیا اور وہ سب ظالم تھے ○ بیشک زمین پر چلنے والوں میں اللہ کے نزدیک سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں

كَفَرُوا وَآفَرَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۹﴾ الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ

نے کفر کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے ○ ان میں سے بعض لوگوں سے آپ نے معاہدہ کیا اور وہ ہر بار

يُنْقِضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿۶۰﴾ فَمَا

اپنے عہد کو توڑ دیتے ہیں اور وہ نہیں ڈرتے ○ پس اگر آپ

تَتَّقِيَهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ

ان کو میدان جنگ میں پائیں تو ان کو دھتکار دیں تاکہ جو ان کے پیچھے ہیں وہ

يَذْكَرُونَ ﴿۶۱﴾ وَإِنَّمَا اتَّخَفْتُمْ مِنَ قَوْمٍ خِيَانَةٌ فَانظِرُوا

عبرت حاصل کریں ○ اور آپ کو جس قوم سے ہمدشکنی کا خدشہ ہو تو ان کا عہد برابر برابر

إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿۶۲﴾

ان کی طرف پھینک دیں ، بے شک اللہ عہد شکنوں کو پسند نہیں کرتا ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (یاد کرو) جب منافقین اور جن لوگوں کے دلوں میں (کفر کی) بیماری تھی یہ کہہ رہے تھے ان لوگوں کو ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر دیا ہے، اور جس نے اللہ پر توکل کر لیا تو بے شک اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے (الانفال: ۳۹)۔

ان آیات میں غزوہ بدر پر تبصرہ اور اس کا تجزیہ کیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں غزوہ بدر کے متعلق شیطان کی کارروائی بیان فرما کر اس پر تبصرہ فرمایا تھا۔ اس آیت میں غزوہ بدر کے متعلق منافقین اور دوسرے بعض کافروں کے خیالات بیان فرما کر ان پر تبصرہ فرمایا ہے۔

منافقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو بغیر کسی عذر کے غزوہ بدر میں حاضر نہیں ہوئے تھے اور بعض نے کہا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مکہ میں بہ ظاہر اسلام کا اقرار کیا تھا۔ وہ مشرکین کے ساتھ جنگ بدر میں آئے جب انہوں نے مسلمانوں کی کم تعداد دیکھی تو کہا ان لوگوں کو ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام کے متعلق شکوک و شبہات میں مبتلا تھے اور اسلام کے متعلق ان کو شرح صدر نہیں تھا یہ مشرکین قریش کے ساتھ تھے انہوں نے بہ ظاہر کلمہ پڑھ لیا تھا لیکن ان کے دلوں میں اسلام مستحکم نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اصحاب محمد کو ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر دیا ہے جو وہ اتنی کم تعداد کے باوجود اپنے سے تین گنے زائد لشکر سے لڑنے کے لیے جمع ہو گئے ہیں۔

(جامع البیان جز ۱۰، ص ۲۸-۲۹، محصلہ "مطبوعہ دار الفکر بیروت")

اور جس نے اللہ پر توکل کیا تو بے شک اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ جس نے اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دیے اور اسی پر اعتماد کیا اور اللہ کی قضاء پر راضی ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اس کا حافظ و ناصر ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ غالب ہے اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ تو جو شخص اس کی پناہ میں ہو وہ محفوظ رہے گا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کی تعریف کی ہے کہ انہوں نے اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیے اور اس کی قضاء پر راضی ہو گئے مگر اللہ ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی حمایت فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور کاش تم (وہ منظر) دیکھتے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، ان کے چہروں اور ان کے کولہوں پر ضرب لگاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لو اب جلنے کا مزہ چکھو، یہ ان کاموں کی سزا ہے جو تم نے پہلے کیے تھے اور بے شک اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے (الانفال: ۵۱-۵۰)۔

مقتولین بدر کی بوقت موت کیفیت

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بدر میں آنے والے کفار کی زندگی کے احوال بیان فرمائے تھے اور اس آیت میں ان کی موت کے وقت کے احوال بیان فرمائے ہیں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس آیت میں خصوصیت سے بدر میں قتل ہونے والے کفار کی موت کے احوال مراد نہ ہوں بلکہ عمومی طور پر کفار کی موت کے وقت ان کا یہی حال ہوتا ہو۔

فرشتے کہیں گے کہ لو اب حریق (جلنے) کا عذاب چکھو علامہ بیضاوی نے کہا ہے کہ فرشتے ان سے کہیں گے کہ لو اب آخرت کا عذاب چکھو، ایک قول یہ ہے کہ فرشتوں کے ساتھ لوہے کے گرز ہوں گے اور جب وہ ان گرزوں سے کفار پر ضرب لگائیں گے تو اس سے آگ بھڑکے گی۔ شیخ زاہد نے کہا ایک قول یہ ہے کہ الحریق آگ کا اسم ہے۔ فرشتے کافروں کی روح نکالتے وقت ان کو گرز ماریں گے جس سے ان کے زخموں میں آگ بھڑکے گی اور فرشتے ان سے استہزاء کہیں گے لو اب اس آگ کا مزہ چکھو۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یہ ان کاموں کی سزا ہے جو تم نے پہلے کیے تھے" یعنی تم نے کفر اور دیگر گناہ جو کیے یہ ان

کی سزا ہے۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ یوں ہے ”یہ اس وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا“ ہاتھوں سے مراد خود ان کے نفوس ہیں اور نفوس کو ہاتھوں سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ اکثر کام انسان اپنے ہاتھوں سے کرتا ہے۔ عذاب کے مستحق کو عذاب نہ دینا بھی جائز ہے

علامہ زمخشوری نے یہ کہا ہے کہ کفار کو یہ عذاب دو سیوں سے ہو گا ایک سبب ان کا کفر اور ان کے گناہ ہیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے، کیونکہ کفار کو عذاب دینا اللہ تعالیٰ کا عدل ہے جس طرح مومنین کو ثواب عطا کرنا اللہ تعالیٰ کا عدل ہے۔ (الکشاف ج ۲، ص ۲۲۹، مطبوعہ ایران)

اس تفسیر کو یہ لازم ہے کہ ظلم کی نفی بھی عذاب دینے کا سبب ہے، کیونکہ اگر اللہ ظالم ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب نہ دیتا۔ اور اس قول میں یہ تصریح ہے کہ جو شخص عذاب کا مستحق ہو اس کو عذاب نہ دینا بھی ظلم ہے اور یہ بدعت باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بعض گنہگار مسلمانوں کو عذاب نہیں دے گا اور ان کو بخش دے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (النساء: ۴۸)

بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشنے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور شرک سے کم گناہوں کو جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔

اس لیے علامہ زمخشوری کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کفار کے عذاب کے دو سبب ہیں ایک سبب ان کا کفر اور ان کے گناہ ہیں اور دوسرا سبب یہ ہے کہ اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ کفار کے عذاب کا صرف ایک سبب ہے اور وہ ان کا کفر اور گناہ ہیں اور بعد میں جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اللہ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے وہ اس سبب کی قید ہے۔ کیونکہ اگر یہ قید نہ لگائی جائے تو یہ ممکن ہو گا کہ اللہ کفار کو بغیر گناہوں کے بھی عذاب دے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ قید لگا کر یوں فرمایا یہ ان کاموں کی سزا ہے جو تم نے پہلے کیے تھے در آنحالیکہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ یعنی ان کو بغیر گناہوں کے عذاب نہیں دے گا اور یہ ان کو عذاب دینے کا دوسرا سبب نہیں ہے ورنہ بہ طور مفہوم مخالف یہ معنی ہو گا کہ اگر اللہ ظالم ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ وہ بندوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب نہ دیتا حالانکہ جو شخص عذاب کا مستحق ہو اس کو عذاب نہ دینا شرعاً ظلم ہے نہ عقلاً۔

علامہ زمخشوری کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ مومنین کو ثواب عطا کرنا اللہ تعالیٰ کا عدل ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ مومنین کو ثواب عطا کرنا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا۔ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو بھی نہیں؟ فرمایا مجھ کو بھی نہیں۔ سو اس کے کہ اللہ مجھے اپنے فضل اور اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۶۷۳، صحیح مسلم مناقبین ۵۵ (۲۸۱۶) ۶۹۸۲، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۲۰۱، سنن دارمی رقم الحدیث:

۲۷۳۳، مسند احمد ج ۲، ص ۲۵۶، ۲۳۵، ج ۳، ص ۲۲۷، ۵۲)

اللہ کسی بندہ پر کوئی ظلم نہیں کرتا

اس آیت کا لفظی ترجمہ اس طرح ہے اللہ تعالیٰ بندوں پر بہت زیادہ ظلم کرنے والا نہیں ہے کیونکہ ظلام مبالغہ کا صیغہ ہے

اس کا معنی ہے بہت زیادہ ظلم کرنے والا اور یہ قاعدہ ہے کہ جب مقید کی نفی کی جائے تو وہ نفی قید کی طرف راجع ہوتی ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ وہ بندوں پر ظلم تو کرتا ہے مگر بہت زیادہ ظلم نہیں کرتا اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے محال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ظلام مبالغہ کا صیغہ ہے اور وہ کثرت ظلم پر دلالت کرتا ہے اور بندے بھی کثیر ہیں اور ظلم کی کثرت بندوں کی کثرت کے مقابلہ میں ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب جمع کا مقابلہ جمع سے ہو تو احاد کی تقسیم احاد کی طرف ہوتی ہے اس لیے اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ کسی ایک بندہ پر ایک ظلم بھی نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان کی عادت فرعون کے متبعین اور ان سے پہلے لوگوں کی مثل ہے جنہوں نے اللہ کی آیتوں کے ساتھ کفر کیا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کو پکڑ لیا، بے شک اللہ بڑی قوت والا سخت عذاب دینے والا ہے O یہ اس لیے ہے کہ اللہ جس قوم کو کوئی نعمت عطا فرمائے تو اس وقت تک وہ اس نعمت کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بد لیں اور بے شک اللہ بہت سننے والا بہت جاننے والا ہے O (الانفال: ۵۳-۵۴)

کفار بدر کا متبعین فرعون کے مماثل ہونا

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے وادی بدر پر حملہ کرنے والے کافروں کو دنیا میں شکست کی ذلت سے دو چار کیا اور آخرت میں ان کے لیے سخت عذاب تیار کیا ہوا ہے۔ اب ان آیتوں میں یہ بتلادیا ہے کہ ان کافروں کو جو دنیا اور آخرت میں عذاب دیا ہے وہ صرف ان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے کہ وہ تمام کافروں کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتا ہے اور سب مکروں کے ساتھ اس کا یہی طریقہ ہے۔ اور اس آیت کا معنی یہ ہے ان لوگوں کا اپنے کفر میں وہ طریقہ ہے جو فرعون کے متبعین کا اپنے کفر میں طریقہ تھا۔ تو ان لوگوں کو قتل کر کے اور قید کر کے ایسی سزا دی گئی ہے جیسی سزا فرعون اور ان کے متبعین کو سمندر میں غرق کر کے دی گئی تھی۔ پھر فرمایا اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ اس میں یہ تشبیہ کی ہے کہ اس دنیاوی عذاب کے علاوہ ان کو آخرت میں بھی عذاب دیا جائے گا جیسا کہ قوم فرعون کو بھی غرق کرنے کے بعد آخرت میں عذاب دیا گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح قوم فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کثیر معجزات دیکھنے کے باوجود ان پر ایمان نہیں لائی اور اپنے کفر کر ڈٹی رہی اور حضرت موسیٰ کی مخالفت کرتی رہی تو ان کو دنیا اور آخرت کا عذاب دیا گیا اسی طرح یہ کفار بدر بھی سیدنا محمد ﷺ کے کثیر معجزات دیکھنے کے باوجود آپ پر ایمان نہیں لائے بلکہ آپ کی مخالفت میں مدینہ پر حملہ آور ہوئے اس لیے ان کو بھی دنیا اور آخرت کا عذاب دیا گیا۔

اہل مکہ پر اللہ کی ان نعمتوں کا بیان جن کی انہوں نے ناشکری کی

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس قوم کو کوئی نعمت عطا فرماتا ہے تو وہ اس وقت تک اس نعمت کو عذاب سے تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنی حالت کو بدل کر اپنے آپ کو اس نعمت کا نااہل ثابت نہیں کرتی۔ یعنی چاہیے یہ تھا کہ وہ اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرتی اور خود کو اس نعمت کا اہل قرار دیتی لیکن جب وہ شکر کرنے کے بجائے کفران نعمت کرے اور یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ اس نعمت کی اہل نہیں ہے تو پھر اللہ اس نعمت کو عذاب سے تبدیل کر دیتا ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کفار مکہ کو اس عذاب سے پہلے کون سی نعمت ملی تھی؟ وہ مکہ میں عیش و عشرت اور بہت زیادہ آسودگی اور خوش حالی کی زندگی نہیں گزار رہے تھے اور وہ اس وقت کی متمدن دنیا میں رزق کی فراوانی کے ذرائع اور وسائل کے لحاظ سے اور علم و حکمت اور مال و دولت کے لحاظ سے کسی نمایاں حیثیت کے حامل نہیں تھے تو ان کو ایسی کون سی نعمت حاصل تھی جو ان کے کفر کی وجہ سے جاتی رہی؟ اس سوال کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں عقل عطا فرمائی اور صحیح و سالم اعضاء کے ساتھ پیدا کیا، اور نیک کام کرنے اور برے کاموں سے رکنے کی قدرت عطا فرمائی۔ چاہیے تھا کہ وہ خود اپنی عقل سے غور و فکر کر کے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی وحدانیت کو پہچانتے اور خود اپنے ہاتھوں سے بت تراش کر ان کی عبادت نہ کرتے اور فسق و فجور اور قتل و غارت گری سے اجتناب کرتے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مزید انعام یہ کیا کہ عقل سلیم کی رہنمائی کرنے کے لیے ان میں ایک نبی ان ہی میں سے بھیجا جس کی سابقہ زندگی آئینہ کی طرح شفاف تھی، اس کی صداقت، دیانت، امانت اور عفت ان سب کے نزدیک مسلم تھی اور جب انہوں نے دعویٰ نبوت کیا اور اللہ کی توحید کا اعلان کیا تو اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے قریش مکہ کو چاہیے تھا کہ وہ ان کا دعویٰ مان لیتے۔ پھر تیسری نعمت ان کو یہ عطا کی کہ اس نبی کو ایسے قاطع معجزات عطا کیے کہ ان معجزات کو دیکھنے کے بعد عقل کے نزدیک ان کی نبوت کو مان لینا واجب تھا، لیکن انہوں نے اس نعمت کی بھی ناشکری کی، وہ اپنے آباء و اجداد کی اندھی تقلید میں بت پرستی پر ڈٹے رہے اور ضد اور عناد سے نبی ﷺ کی مخالفت کرتے رہے حتیٰ کہ یہ مخالفت یہاں تک بڑھی کہ انہوں نے آپ کو مکہ سے ہجرت پر مجبور کر دیا۔ پھر اسی پر بس نہیں کی بلکہ مدینہ میں نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب پر حملہ کرنے کے لیے پہنچ گئے۔ سو انہوں نے اللہ کی پے در پے نعمتوں کے مقابلہ میں مسلسل کفر کیا اور جب ان کے اعمال سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کی ان نعمتوں کے اہل نہیں ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کو عذاب سے بدل دیا۔ دنیا میں ان کو شکست کی ذلت اور رسوائی میں مبتلا کیا اور آخرت میں ان کے لیے دائمی دردناک عذاب تیار کیا۔

اس سوال کا دوسرا جواب وہ ہے جو قاضی بیضاوی نے دیا ہے کہ مان لیا کہ قریش مکہ، بہت خوش حالی، فراخی اور وسعت کی حالت میں نہ تھے لیکن وہ جس حال میں بھی تھے وہ بدر کی شکست کی ذلت، جس میں ان کے ستر افراد مارے گئے اور ستر قید ہوئے اور اس ذلت کے مقابلہ میں ان کی پہلی زندگی جس پر شکست کا داغ نہ تھا بہر حال بعد کی زندگی سے بہتر تھی، اور اس زندگی کے مقابلہ میں نعمت تھی لیکن جب انہوں نے اس نعمت کی ناندیری کی اور ناشکری کی تو اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کو دنیا میں شکست کی ذلت کے عذاب اور آخرت میں دائمی عذاب سے بدل دیا، اور ان کا اس دنیا اور آخرت کے عذاب میں مبتلا ہونا ان کے اپنے کفر اور معصیت کی وجہ سے تھا، اللہ تعالیٰ کا ان پر کسی وجہ سے ظلم نہیں تھا۔

جو قوم خود کو کسی نعمت کا نااہل ثابت کرتی ہے اللہ اس نعمت کو عذاب سے بدل دیتا ہے

اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ کسی قوم کو نعمت دے کر اس وقت تک اس نعمت کو عذاب سے تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ وہ قوم خود اپنی بد اعمالیوں سے اپنے آپ کو اس نعمت کا نااہل ثابت نہیں کرتی۔ یہ قاعدہ جس طرح پچھلی امتوں میں اور کفار مکہ میں جاری ہوا، اسی طرح یہ قاعدہ بعد میں اقوام مسلم میں بھی جاری ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو وسیع سلطنت کی نعمت عطا کی لیکن جب انہوں نے خلافت کو ملوکیت سے تبدیل کر لیا اور اپنے آپ کو اس نعمت کا نااہل ثابت کیا تو وہ اسلامی سلطنت جو تین براعظموں، افریقہ، یورپ اور ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی، چھوٹے چھوٹے ملکوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ اسپین میں طوائف الملوک کے علاوہ وہاں کے حکمران شراب اور رقص و موسیقی کی رنگینیوں میں ڈوب گئے اور وہاں نہ صرف اسلامی مملکت کا خاتمہ ہوا بلکہ مسلمانوں کو = تیغ کیا گیا یا جبراً عیسائی بنا لیا گیا، یا جلا وطن کر دیا گیا۔ برصغیر میں مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی لیکن وہ اپنی حکومتوں کے استحکام میں ہندوؤں سے گٹھ جوڑ کرتے رہے اور اسلام کی تبلیغ سے غافل رہے تو مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت جاتی رہی اور وہ ڈیڑھ سو سال تک انگریز کی غلامی میں رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں آزادی کی نعمت عطا فرمائی لیکن اسلام کے نام پر حاصل کیے جانے والے ملک میں مسلمانوں نے چوبیس سال تک اسلامی نظام نافذ نہیں کیا علی الاعلان سو دی نظام جاری کیا اور

مغربی انداز فکر، مغربی جمہوریت اور مغربی اقدار کو سینہ سے لگائے رکھا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے آدھی نعمت چھین لی اور مشرقی پاکستان، پاکستان سے علیحدہ ہو گیا۔ اب بھی باقی ماندہ پاکستان کے وہی طور طریقے ہیں اور ہمیں اس دن سے ڈرنا چاہیے کہ یہ باقی ماندہ نعمت بھی ہمارے ہاتھ سے جاتی نہ رہے۔ کیونکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ افراد کے انفرادی گناہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن کسی قوم کی اجتماعی تقصیر سے فطرت درگزر نہیں کرتی اور یہ اللہ تعالیٰ کی دائمی سنت ہے کہ جو قوم اپنے آپ کو کسی نعمت کا اہل ثابت نہیں کرتی تو اللہ تعالیٰ اس نعمت کو عذاب سے بدل دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ان کا معاملہ) فرعون کے متبعین اور ان سے پہلے لوگوں کی طرح ہے جنہوں نے اپنے رب کی آیات کی تکذیب کی، تو ہم نے ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے فرعون کے متبعین کو غرق کر دیا اور وہ سب ظالم تھے ○ (الانفال: ۵۴)

اس آیت کا پہلی آیت کی تفصیل ہونا

اس آیت میں وہی مضمون بیان کیا گیا ہے جو اس سے پہلی آیت میں بیان کیا گیا تھا اور یہ آیت پہلی آیت کی تاکید ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ دوسری آیت پہلی آیت کی تفصیل ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں یہ فرمایا تھا کہ قوم فرعون کو عذاب دیا گیا اور اس آیت میں اس عذاب کی تفصیل ہے کہ قوم فرعون کو سمندر میں غرق کر دیا گیا تھا اور پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ انہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا تھا اور اس میں اس کی تفصیل فرمائی ہے کہ انہوں نے اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب کی اور پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ انہوں نے خود کو نعمت کا نااہل ثابت کیا اور اس آیت میں اس کی تفصیل کی ہے کہ انہوں نے اپنے رب کی آیات کی تکذیب کی اور دیگر گناہ کیے اور یہ بتایا کہ ان کی نعمتوں کو جو عذاب سے تبدیل کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک زمین پر چلنے والوں میں اللہ کے نزدیک سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے ○ (الانفال: ۵۵)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ قریش کی ایک جماعت ہے جس کا تعلق بنو عبد الدار سے تھا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۵، ص ۱۷۹، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ)

یہ لوگ اپنے کفر پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی تھی اور اللہ کے علم میں وہ ایمان لانے والے نہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ سے فرمایا یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں آپ ان کی خاطر اپنے آپ کو مشقت میں نہ ڈالیں اور ان کے ایمان نہ لانے سے پریشان نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ان میں سے بعض لوگوں نے آپ سے معاہدہ کیا اور وہ ہر بار اپنے عہد کو توڑ دیتے ہیں اور وہ نہیں ڈرتے ○ (الانفال: ۵۶)

بنو قریظہ کی عہد شکنی

اس کا ربط بھی پہلی آیت سے ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق کفار ہیں جو اے محمد ﷺ آپ سے بار بار عہد کر کے توڑ دیتے ہیں انہوں نے آپ سے عہد کیا تھا کہ وہ آپ کے خلاف جنگ نہیں کریں گے اور نہ آپ کے خلاف کسی کی مدد کریں گے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ یہ آیت بنو قریظہ کے متعلق نازل ہوئی ہے ان میں سے بعض لوگوں نے اس لیے فرمایا کہ یہ معاہدہ بنو قریظہ کے ہر فرد سے نہیں ہوا تھا بلکہ بنو قریظہ کے اکابر سے ہوا تھا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ بنو قریظہ تھے جنہوں نے جنگ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ سے کیے ہوئے معاہدہ کو توڑا مشرکین کو ہتھیار فراہم کیے۔ پھر انہوں نے کہا ہم سے غلطی ہو گئی، آپ نے ان سے دوبارہ معاہدہ کیا انہوں نے اس معاہدہ کو پھر جنگ خندق میں توڑ دیا۔ (جامع البیان ج ۱۰، ص ۳۳، تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۹۷)

اس کے بعد فرمایا ”اور وہ نہیں ڈرتے“ یعنی وہ اللہ سے اس عہد شکنی میں نہیں ڈرتے یا اس سے نہیں ڈرتے کہ اس طرح لوگ ان کی مذمت کریں گے کہ ان لوگوں کے عہد کا اعتبار نہیں ہے یہ بار بار عہد کر کے اس کو توڑ دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: پس اگر آپ ان کو میدان جنگ میں پائیں تو ان کو دھتکار دیں تاکہ جو ان کے پیچھے ہیں وہ عبرت حاصل کریں ○ (الانفال: ۵۷)

مشکل الفاظ کے معانی

فاما تشقظنہم: تعجب کا معنی ہے کسی چیز کے حصول میں مہارت حاصل کرنا۔ تشقظت کذا اس وقت کہتے ہیں جب تم کسی چیز کو اپنی غیر معمولی بصارت اور مہارت سے دیکھ لو۔ پھر مجازاً اس کو صرف کسی چیز کے ادراک، حصول اور پانے کے معنی میں استعمال کیا گیا، یعنی جب تم ان کو میدان جنگ میں پاؤ یا پکڑ لو۔ (المفردات: ج ۱، ص ۳۳۰)

فشرذبہم: تشرید کا معنی ہے کسی چیز کو مضطرب اور متفرق کر دینا، تترتیر کر دینا، اور کسی شخص کے ساتھ ایسا کام کیا جائے جس سے دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ یعنی آپ جب بنو قریظہ کو میدان جنگ میں نہ پائیں تو ان کو اس طرح تترتیر کر دیں جس سے دوسرے عہد شکنوں کو عبرت حاصل ہو اور وہ عہد شکنی سے باز رہیں۔ (المفردات: ج ۱، ص ۳۳۰)

نبی ﷺ کو یہ حکم اس لیے دیا کہ جن لوگوں نے آپ کے ساتھ عہد شکنی کی، آپ ان کو ایسی سزا دیں کہ دوبارہ کوئی شخص آپ سے عہد شکنی کی جرات نہ کر سکے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور آپ کو جس قوم سے عہد شکنی کا خدشہ ہو تو ان کا عہد برابر برابر ان کی طرف پھینک دیں، بے شک اللہ عہد شکنوں کو پسند نہیں کرتا ○ (الانفال: ۵۸)

فریق ثانی کی عہد شکنی کی وجہ سے معاہدہ ختم کرنے کی صورتیں

اس آیت کا معنی یہ ہے کہ جب کسی قوم سے عہد شکنی کے آثار ظاہر ہوں اور اس کے دلائل ثابت ہوں تو پھر ان سے معاہدہ توڑ دینا واجب ہے۔ کیونکہ بنو قریظہ نے نبی ﷺ سے معاہدہ کیا، پھر انہوں نے ابوسفیان اور اس کے حامی مشرکوں کی نبی ﷺ کے خلاف مدد کی، تب رسول اللہ ﷺ کو یہ قوی گمان ہوا کہ یہ آپ کے اور آپ کے اصحاب کے ساتھ بد عہدی کریں گے۔ ایسی صورت میں امام المسلمین پر واجب ہے کہ وہ ان سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دے اور ان سے اعلان جنگ کر دے۔ اور جب دوسرے فریق کی جانب سے علانیہ عہد کی خلاف ورزی ہو اور ان کی عہد شکنی پر قطعی یقین حاصل ہو جائے تو پھر عہد توڑنے کے اعلان کی بھی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ کے ساتھ کیا کیونکہ خزاعہ نبی ﷺ کی حفاظت میں تھے اور اہل مکہ نے ان کو قتل کر دیا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے معاہدہ حدیبیہ ختم کر دیا اور رسول اللہ ﷺ کا لشکر مرالہران تک پہنچ گیا اور وہ مکہ سے چار فرسخ پر تھا۔ علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ معاہدہ ختم کرنے کا اعلان اس وقت ضروری ہے جب معاہدہ کی مدت ختم نہ ہوئی ہو یا فریق ثانی کی عہد شکنی مشہور نہ ہوئی ہو یا ان کی عہد شکنی یقینی اور قطعی نہ ہو، اور اگر معاہدہ کی مدت ختم ہو گئی یا فریق ثانی کی عہد شکنی مشہور اور یقینی ہو تو پھر معاہدہ ختم کرنے کے اعلان کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے اہل مکہ سے کیے ہوئے معاہدہ کو ختم کرنے کے اعلان کے بغیر ان پر حملہ کیا کیونکہ انہوں نے علی الاعلان معاہدہ کو توڑ دیا تھا۔

خزائن نبی ﷺ کے حلیف تھے اور انہوں نے بنو کنانہ کی مدد کرتے ہوئے خزائن کو قتل کیا۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۳۹۸-۳۹۷، الجامع لاحکام القرآن، جز ۷، ص ۳۸۹-۳۹۰، روح المعانی، جز ۱۰، ص ۲۳)

مسلمانوں کے سربراہ کی عہد شکنی زیادہ مذموم اور زیادہ بڑا گناہ ہے

اس کے بعد فرمایا بے شک اللہ عہد شکنوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس میں یہ دلیل ہے اگر فریق ثانی نے عہد شکنی نہ کی ہو، نہ عہد شکنی کرنے کی کوئی علامت ہو تو پھر بغیر اعلان کے ان سے معاہدہ ختم کرنا یا توڑنا جائز نہیں ہے اور معاہدہ کی مدت کو پورا کرنا ضروری ہے۔

امام ابو داؤد اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ اور رومیوں کے درمیان معاہدہ تھا۔ حضرت معاویہ ان کے شہروں کی طرف روانہ ہوئے حتیٰ کہ معاہدہ توڑ کر ان پر حملہ کیا، تب ایک شخص گھوڑے یا خچر پر سوار آیا اور وہ کہہ رہا تھا اللہ اکبر، اللہ اکبر معاہدہ پورا کرو، عہد شکنی نہ کرو۔ لوگوں نے دیکھا تو وہ حضرت عتبہ بنی شیبہ تھے۔ حضرت معاویہ بنی شیبہ نے انہیں بلا کر دریافت کیا تو انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جس شخص اور کسی قوم کے درمیان کوئی عہد ہو تو نہ وہ کوئی گرہ باندھے اور نہ کوئی گرہ کھولے حتیٰ کہ معاہدہ کی آخری مدت گزر جائے، یا ان کی طرف ان کا عہد برابر برابر پھینک دے۔ (سنن ابو داؤد رقم الحدیث: ۲۷۵۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۸۷)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن جب اللہ اولین اور آخرین کو جمع کرے گا تو ہر عہد شکن کے لیے ایک جھنڈا بلند کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی عہد شکنی ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۶۱۷۷، صحیح مسلم الجہاد ۹ (۱۷۳۵) ۳۳۳۸، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۸۷۳۷)

حضرت ابو سعید خدری بنی شیبہ بیان کرتے ہیں کہ ہر عہد شکن کے لیے قیامت کے دن اس کی عہد شکنی کے برابر جھنڈا نصب کیا جائے گا اور سنو! امیر المسلمین کی عہد شکنی سب سے بڑی ہے۔

(صحیح مسلم الجہاد ۱۶ (۱۷۳۸) ۳۳۵۷، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ)

ان احادیث میں عہد شکنی پر سخت وعید ہے، خاص طور پر مسلمانوں کی حکومت کے سربراہ اور امیر المسلمین کے لیے۔ کیونکہ اس کی عہد شکنی کا ضرر بہ کثرت تعلق کی طرف پہنچتا ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ سربراہ مملکت اپنے عہد کو پورا کرنے پر ہر طرح قادر ہوتا ہے اور اس کو عہد شکنی کی کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ قاضی عیاض نے کہا ہے کہ امیر المسلمین کی خیانت اور عہد شکنی یہ ہے کہ وہ اپنی رعیت سے کیے ہوئے وعدوں اور کفار سے کیے ہوئے عہد کو پورا نہ کرے اور ان کی خلاف ورزی کرے یا وہ اس امانت میں خیانت کرے جو مسلمانوں نے اس کو سربراہی سونپ کر اس کے پاس رکھی ہے۔ وہ اپنے فرائض منصبی ادا نہ کرے اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت نہ کرے اور بیت المال میں خیانت کرے اور قومی خزانہ کو قومی مفاد میں خرچ کرنے کے بجائے اپنے ذاتی مفاد میں استعمال کرے۔ اسی طرح حکومت کے دیگر وسائل کو اپنے ذاتی فوائد کے لیے استعمال کرے تو وہ خائن اور عہد شکن ہے اور ان حدیثوں کی وعید کا مصداق ہے۔ اس حدیث سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ مسلمانوں کو بھی اپنے امیر سے عہد شکنی نہیں کرنی چاہیے اور اس کی بیعت کرنے اور اس کی حکومت کو تسلیم کرنے کے بعد اس کے خلاف فتنے پیدا نہیں کرنے چاہئیں اور اس کے خلاف بغاوت نہیں کرنی چاہیے اور اتحادات میں رخنہ نہیں ڈالنا چاہیے۔

ہمارے علماء رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ دوسروں کی عہد شکنی کی بہ نسبت سربراہ مملکت کی عہد شکنی بہت بڑا جرم اور عظیم گناہ ہے، اس میں بہت خرابیاں ہیں۔ کیونکہ جب وہ معاہدہ ختم کرنے کے اعلان کے بغیر دوسرے ملکوں سے معاہدہ توڑیں گے تو

دشمنان اسلام ان کے کسی وعدہ پر اعتبار کریں گے نہ ان کی صلح پر۔ اس سے دنیا میں مسلمانوں کا بھرم جاتا رہے گا اور اس کا بہت نقصان ہوگا اور اس سے غیر مسلم مسلمانوں کی دعوت اسلام پر دین اسلام میں داخل ہونے سے متفرق ہوں گے اور تمام دنیا میں ائمہ مسلمین کی مذمت ہوگی۔ (الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۳۹۱)

وَلَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا إِنَّهُمْ لَا يَعْجِزُونَ ﴿۵۹﴾ وَأَعْدَاؤُا

اور کافر اس گھنڈ میں نہ رہیں کہ وہ نکل گئے، بے شک وہ (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے ○ اور (اے مسلمان)

لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِم

تم بہ قدر استطاعت، ان (سے مقابلہ) کے لیے ہتھیار تیار رکھو اور بندے ہوئے گھوڑے اور ان سے تم

عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَأَخْرِبُونَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُم

اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو مرعوب کر دو اور ان کے سوا دوسرے دشمنوں کو جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ

اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ

انہیں جانتا ہے اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے اس کا تمہیں پورا پورا اجر دیا

إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تظَلَمُونَ ﴿۶۰﴾ وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا

جائے گا، اور تم پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا ○ اور اگر (دشمن) صلح کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہوں

وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۶۱﴾ وَإِنْ يُرِيدُوا

اور اللہ پر توکل کریں، بے شک وہ بہت سننے والا، بے حد جاننے والا ہے ○ اگر وہ آپ کو دھوکہ دینے کا

أَنْ يَخْدَعُواكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِنَصْرِهِ

ارادہ کریں تو بے شک اللہ آپ کو کافی ہے وہی ہے جس نے اپنی مدد اور مسلمانوں کی جماعت

وَبِالْمُؤْمِنِينَ ﴿۶۲﴾ وَالْفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَوْ أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ

سے آپ کی تائید فرمائی ○ اور اس نے مسلمانوں کے درمیان الفت پیدا کی، اگر آپ تمام زمین کی چیزوں کو بھی

جَمِيعًا مَا آفَتْ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ آفَ يَنْتَهُمْ

خرچ کر دیتے تو (از خود) ان کے درمیان الفت پیدا نہ کر سکتے، لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت پیدا کی،

إِنَّكَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۶۳﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ

بے شک وہ بہت غلبہ والا بڑی حکمت والا ہے۔ لے نبی! آپ کو اللہ کافی ہے اور آپ کی اتباع کرنے

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۶۴﴾

دالے مؤمنین ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور کافر اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ وہ نکل گئے، بے شک وہ (اللہ کو) عاجز نہیں کر سکتے ○

(الانفال: ۵۹)

ربط آیات اور شان نزول

اس سے پہلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا تھا کہ جو کافر مسلمان سے لڑنے کے لیے وادی بدر میں آئے ہیں، ان سے کس طرح مقابلہ کیا جائے اور ان پر غالب ہونے کے بعد ان کے ساتھ کیا کیا جائے، نیز یہ بھی بتایا تھا کہ جو کافر آپ سے معاہدہ کرنے کے بعد اس معاہدہ کی خلاف ورزی کریں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ اب وہ کافر باقی رہ گئے تھے جو مکہ میں تھے اور بدر میں مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نہیں آئے تھے، لیکن یہ وہ لوگ تھے جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بہت زیادہ اذیت پہنچائی تھی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت میں بتا رہا ہے کہ یہ کافر جو بدر میں نہ آنے کی وجہ سے قتل یا گرفتار ہونے سے بچ گئے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ اللہ کی گرفت سے بچ گئے وہ دنیا میں کسی اور موقع پر اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئیں گے ورنہ آخرت میں تو بہر حال دائمی عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور (اے مسلمانو) تم بہ قدر استطاعت ان (سے مقابلہ) کے لیے ہتھیار تیار رکھو اور بندھے ہوئے گھوڑے، اور ان سے تم اللہ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو مرعوب کرو اور ان کے سوا دوسرے دشمنوں کو جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے، اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے اس کا تمہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا اور تم پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا ○ (الانفال: ۶۰)

ربط آیات

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے (الانفال: ۵۸) میں یہ فرمایا تھا جو کافر آپ سے عمد شکنی کریں آپ بھی ان کا عمد ان پر پھینک دیں۔ اور اس آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ آپ کافروں سے مقابلہ کرنے کے لیے ہتھیار مہیا کریں، ایک قول یہ ہے کہ معرکہ بدر میں مسلمانوں نے پہلے سے مقابلہ کی تیاری نہیں کی تھی، ہتھیار جمع کیے تھے نہ گھوڑوں اور دیگر سواروں کا بندوبست کیا تھا، ہنگامی طور پر اچانک ان پر جنگ مسلط کر دی گئی تھی اور انہوں نے بغیر کسی تیاری کے مقابلہ کیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ دوبارہ ایسا نہ کریں اور کفار سے جنگ کرنے کے لیے جس قدر ہتھیار، سواریاں اور افرادی قوت مہیا کر سکتے ہیں وہ کر لیں۔ اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ کسی مطلوب کو حاصل کرنے کے لیے اس کے اسباب کو جمع کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ توکل کا معنی ہی یہ ہے کہ اسباب کے حصول کے بعد نتیجہ کو اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔

تیر اندازی کے فضائل

زیر تفسیر آیت کا لفظی ترجمہ اس طرح ہے: ”تم بہ قدر استطاعت ان (سے مقابلہ) کے لیے قوت کو مہیا کرو“ اس آیت میں

قوت سے مراد اسلحہ کی تمام انواع اور اقسام ہیں اور اس آیت کے دو محمل ہیں ایک یہ کہ جن دشمنان اسلام سے تمہارا مقابلہ ہو ان کے خلاف جو اسلحہ سب سے زیادہ زیادہ موثر ہو، اس اسلحہ کو مہیا کرو۔ اور دوسرا محمل یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو ہتھیار سب سے زیادہ ملکہ ہو اس ہتھیار کو حاصل کر لو۔ عمد رسالت میں سب سے زیادہ ملکہ ہتھیار تیر تھا اس لیے نبی ﷺ نے تیر اندازی سیکھنے اور تیر و کمان کے حصول کی بہت زیادہ ترغیب دی ہے۔ جیسا کہ حسب ذیل احادیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ کی تفسیر میں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ 'سنو یقیناً قوت تیر اندازی ہے۔ سنو یقیناً قوت تیر اندازی ہے۔' (صحیح مسلم الامارہ ۱۶۷ (۱۹۱۷) ۳۸۶۳ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۵۱۳ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۱۳)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: عنقریب تمہارے لیے زمینیں فتح کی جائیں گی اور اللہ تمہیں کافی ہوگا۔ اور تم میں سے کوئی شخص اپنے تیروں کے ساتھ کھینے سے عاجز نہ ہو۔

(صحیح مسلم الامارہ ۱۶۸ (۱۹۱۸) ۳۸۶۳)

حضرت عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے تیر اندازی کو سیکھ کر پھر اس کو ترک کر دیا، وہ ہم میں سے نہیں ہے، یا فرمایا اس نے نافرمانی کی۔ (صحیح مسلم الامارہ ۱۶۹ (۱۹۱۹) ۳۸۶۶)

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے بے شک اللہ عزوجل ایک تیر کے سبب سے تین آدمیوں کو جنت میں داخل فرمائے گا تیر کا بنانے والا جو تیر بنانے میں ثواب کی نیت کرتا ہو، اور تیر کو حاصل کرنے والا اور تیر اندازی کرنے والا، تم تیر اندازی کرو اور شہہ سواری کرو، اگر تم تیر اندازی کرو تو وہ میرے نزدیک گھڑ سواری سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ کھیل میں صرف تین چیزیں پسندیدہ ہیں، کسی شخص کا اپنے گھوڑے کو سدھانا، کسی شخص کا اپنی زوجہ سے دل لگی کرنا اور کمان سے تیر مارنا اور پکڑنا اور جس شخص نے تیر اندازی کو سیکھ کر اس کو ناپسند کر کے اس کو چھوڑ دیا تو یہ ایک نعمت ہے جس کو اس نے ترک کر دیا یا اس نے کفران نعمت کیا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۵۱۳ سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۹۷۹ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۱۱ سنن دارمی رقم الحدیث:

۲۳۰۵ سنن احمد ج ۶ رقم الحدیث: ۱۷۳۰۲)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک جماعت کے پاس سے گزرے وہ آپس میں تیر اندازی کا مقابلہ کر رہے تھے (کہ کس کا تیر نشانے پر پہنچتا ہے) نبی ﷺ نے فرمایا اے بنو اسماعیل تیر اندازی کرو! کیونکہ تمہارے باپ تیر انداز تھے۔ تم تیر مارو اور میں بنو فلاں کے ساتھ ہوں تو ان میں سے ایک فریق نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کیا ہوا تم کیوں نہیں تیر مارتے، انہوں نے کہا ہم کیسے تیر ماریں حالانکہ آپ ان کے ساتھ ہیں! نبی ﷺ نے فرمایا تم تیر مارو میں تم سب کے ساتھ ہوں! (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۹۹ سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۱۵)

اسلحہ کے استعمال کی تربیت حاصل کرنا فرض کفایہ ہے اور کبھی یہ فرض عین ہو جاتا ہے۔

اس دور میں تیر اندازی کے مصداق ایٹمی میزائل ہیں

نبی ﷺ نے تیر اندازی سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کرنے کی بہت تاکید فرمائی ہے کیونکہ اس زمانہ میں یہ دشمن کے خلاف بہت بڑا اور بہت موثر ہتھیار تھا۔ اس زمانہ میں تیر اندازی کی جدید شکل میزائل ہے۔ جس طرح تیر کو کمان میں رکھ کر ہدف پر مارتے ہیں اس طرح میزائل کے وارہیڈ میں ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، اور نیوٹران بم رکھے جاتے ہیں اور لانچنگ پیڈ سے

میزائل کو ہدف پر داغا جاتا ہے۔ سو جس طرح اس زمانہ میں تیر اندازی کا علم حاصل کرنا اور اس کی مشق کرنا ضروری تھا اسی طرح اس زمانہ میں ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی تیاری کا علم حاصل کرنا اور میزائل بنانے کا علم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس دور میں ایٹمی صلاحیت کو حاصل کرنا بہت ضروری ہے اور جب تک کسی ملک کو ایٹمی صلاحیت حاصل نہ ہو اس کی بقا کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ نے جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے تھے۔ جس سے وہ شہرتاباہ ہو گئے اور جاپان وہ جنگ ہار گیا۔ اگر اس وقت جاپان کے پاس بھی ایٹم بم ہوتے تو امریکہ کبھی بھی جاپان پر ایٹم بم نہیں گرا سکتا تھا۔ امریکہ اور روس کے درمیان سرد جنگ کے زمانہ میں شدید مخالفت کے باوجود امریکہ نے روس یا چین پر ایٹمی حملہ کی جسارت نہیں کی کیونکہ اس کو معلوم تھا کہ ان ملکوں کے پاس بھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ہیں اور امریکہ ان کے دور مار براعظمی ایٹمی میزائلوں کی زد میں ہے۔

اس لیے آج مسلمانوں کو اپنی بقا کے لیے اور دنیا میں عزت اور آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا علم حاصل کرنا ضروری بلکہ سب سے اہم اور سب سے مقدم فرض ہے۔
ایٹمی ہتھیار بنانے کیلئے تفکر کرنا اور اس کیلئے سائنسی علوم حاصل کرنا افضل ترین عبادت ہے
اللہ تعالیٰ نے حقائق کائنات میں غورو فکر کرنے اور تدبر اور تفکر کرنے کی ترغیب دی ہے:

ان فی خلق السموات والأرض واختلاف الليل والنهار آیت لاولی الالباب الذین یدکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموات والأرض ربنا ما خلقت هذا باطلاً سبحانک فقینا عذاب النار

بے شک آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اختلاف میں صاحبان عقل کے لیے ضرور نشانیاں ہیں جو لوگ کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور کروٹ کے بل لیٹے ہوئے اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق میں غورو فکر کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے یہ سب کچھ محض بے فائدہ پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے سو تو ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی حقائق کائنات میں غورو فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔
حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے پاس تشریف لائے تو وہ غورو فکر کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تم کس چیز میں غورو فکر کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ میں، آپ نے فرمایا اللہ میں تفکر نہ کرو اللہ کی مخلوق میں تفکر کرو۔

(حلیۃ الاولیاء ج ۶، ص ۶۷-۶۸، رقم الحدیث: ۷۸۱۱، کنز العمال رقم الحدیث: ۵۷۱۳، اتحاف السادة المتقین ج ۶، ص ۵۳۶)
حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی نعمتوں میں تفکر کرو، اور اللہ کی ذات میں تفکر نہ کرو۔

(المعجم الاوسط ج ۷، ص ۱۷۲، رقم الحدیث: ۶۳۱۵، شعب الایمان ج ۱، ص ۱۳۶، رقم الحدیث: ۱۲۰، کتاب العظمہ، ص ۱۷)
حسن بیان کرتے ہیں کہ ایک ساعت میں غورو فکر کرنا ایک رات کے قیام سے افضل ہے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۷، ص ۱۹۷، رقم الحدیث: ۳۵۲۱۳، بیروت، شعب الایمان ج ۱، ص ۱۳۶، رقم الحدیث: ۱۱۸)
علامہ سخاوی نے کہا ہے کہ ان احادیث کی اسانید اگرچہ ضعیف ہیں لیکن ان کے اجتماع سے اس حدیث میں قوت حاصل

ہو گئی اور ان کا معنی صحیح ہے۔ (المقاصد الحسنہ ص ۱۷۳، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۷ھ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک ساعت میں تفکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ (کتاب العظمت ج ۱ ص ۳۳، رقم الحدیث: ۲۳، الجامع الصغیر ج ۲، رقم الحدیث: ۵۸۹۷)

حافظ سیوطی نے الجامع الصغیر میں اس حدیث کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علامہ ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے (الموضوعات، رقم الحدیث: ۳۳۰۲) لیکن حافظ سیوطی نے علامہ ابن جوزی کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ علامہ عراقی نے احیاء العلوم کی تخریج میں اس حدیث کو ضعیف کہنے پر اقتصار کیا ہے اور اس کا شاہد بھی ہے۔

(فیض القدر ج ۸ ص ۲۲۱، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ھ)

اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ بندہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں اپنی تقصیرات اور کوتاہیوں پر غور کرے اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ اور وعید میں تفکر کرے۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے اور اس کے حساب لینے کے متعلق تدبیر کرے اور اپنے اعمال کے میزان میں وزن اور کمی کے متعلق اور پل صراط کی باریکی اور تیزی کے باوجود اس پر سے گزرنے کے متعلق سوچے اور قیامت کی ہولناکیوں کا تصور کرے، جس دن بچے خوف سے بوڑھے ہو جائیں گے، جس دن ہر حاملہ عورت کا حمل ساقط ہو جائے گا اور ہر دودھ پلانے والی اپنے بچہ سے غافل ہوگی، جس دن بھائی، بھائی سے بھاگے گا، اور ہر شخص اپنی بیوی اور بچوں سے اور ماں اور باپ سے بھاگے گا۔ جس دن اللہ تعالیٰ نیکو کاروں اور بدکاروں کو الگ الگ صفوں میں کھڑا کر دے گا اور اللہ جانے وہ نیکوں کی صف میں ہو گا یا بدوں کی صف میں ہو گا اور جب وہ ان امور میں غور و فکر کرے گا تو اس کے دل میں خوف خدا بہت قوی ہو گا اور اس کا مطمح نظر اور نصب العین صرف آخرت ہوگی، وہ دنیا کی رنگینیوں اور مرغوبات نفس سے اعراض کر کے خلوص قلب کے ساتھ اللہ کی عبادت کرے گا اور انتہائی رغبت کے ساتھ تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرے گا، اور جس کا ان امور میں تفکر کم ہو گا وہ مرغوبات نفس کا اسیر ہو جائے گا، اس کا دل سخت ہو جائے گا، اس پر غفلت غالب ہوگی وہ اگر عبادت کے لیے کھڑا بھی ہو گا تب بھی اس کا دل دنیا داری میں مشغول ہو گا، وعظ و نصیحت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا اور آخرت کے بجائے دنیا اس کا مطمح نظر ہوگی۔

بعض علماء نے کہا ہے کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور باطنی۔ ظاہری عبادت اعضاء ظاہرہ سے ہوتی ہے اور باطنی عبادت دل سے ہوتی ہے اور باطنی عبادت ظاہری عبادت سے افضل ہے، اور کمال تفکر یہ ہے کہ انسان کا دل عالم شہادت اور عالم حواس سے نکل کر عالم الغیب میں تفکر کرے، اور جس چیز میں غور و فکر کرے گا وہ جس قدر عظیم ہوگی اس کا تفکر بھی اسی قدر عظیم ہوگا۔ پس بعض علماء مخلوقات اور مصنوعات میں تفکر کر کے اس کے خالق اور صانع کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور بعض احوال آخرت میں تفکر کر کے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں اور نیکیوں پر مداومت کرتے ہیں، اور بعض اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جبروت اور اس کی دیگر صفات میں تفکر کرتے ہیں اور کائنات کے ہر حادثہ سے اس صفت کی معرفت حاصل کرتے ہیں جو اس حادثہ کی محدث ہے۔ (فیض القدر ج ۸ ص ۲۲۱، موضوعاً، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ، مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ھ)

میں کہتا ہوں کہ حقائق کائنات کا سراغ لگانا اور اس پر آشوب دور میں انسان کی ضرورتیں پوری کرنے کے اسباب اور عمل کو جدید سائنس سے معلوم کرنا، انسان کی فلاح کے لیے مملکت اور لاعلاج امراض کا جدید میڈیکل سائنس سے علاج دریافت کرنا، اور ملک اور قوم کے دفاع کے لیے عصری تقاضوں کے مطابق غور و فکر کر کے ایٹمی ہتھیار اور میزائل بنانا تاکہ مسلمانوں کا ملک دشمنان اسلام کے حملوں سے محفوظ رہے اور اقوام عالم میں عزت اور آزادی کے ساتھ کھڑا رہ سکے، اور زراعت کے شعبوں میں

سائنسی تکنیک سے ایسے طریقے معلوم کرنا جن سے فصل زیادہ پیدا ہو اور قدرتی آفات سے محفوظ رہ سکے تاکہ ملک خوشحال ہو اور دوسروں کا دست نگر نہ ہو تو کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے علوم حاصل کرنا اور ایسے امور میں ایک لمحہ کا غور و فکر بھی ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے، اور اس حدیث کا مصداق ہے کیونکہ اگر ملک سلامت اور آزاد ہو گا تو اس کے باشندے اللہ کی عبادت کر سکیں گے اور ملک غذا اور دوا میں خود کفیل ہو گا تو وہ دوسروں کے سہارے کے بغیر خوشحالی سے رہ سکیں گے۔ سو ملک کے تمام باشندوں کی عبادتوں اور ریاستوں اور نیک اعمال کا وجود ملک کی بقاء اور اس کی آزادی پر موقوف ہے اور اس کی بقاء اور آزادی عصری تقاضوں کے مطابق ایسی ہتھیار بنانے پر موقوف ہے۔ تو جن مسلمان سائنسی ماہرین نے یہ ہتھیار بم اور میزائل بنائے اور اس کے بنانے میں جو تفکر کیا تو یہ تفکر بہت عظیم عبادت ہے اور ملک کے تمام عبادت گزاروں کی عبادتوں کے اجر و ثواب سے ان کو بھی حصہ ملے گا۔ تاہم ہم ان سائنسی ایجادات کے خلاف ہیں جو عیاشی اور فحاشی کو فروغ دیتی ہیں خواہ وہ دوائیں ہوں یا آلات ہوں۔

جماد کے لیے بندھے ہوئے گھوڑوں کی فضیلت اور اس دور میں ان کا مصداق

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اور تم بہ قدر استطاعت ان (سے مقابلہ) کے لیے بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو۔“

جماد کے لیے بندھے ہوئے گھوڑوں کی بہت فضیلت ہے۔ علامہ قرطبی متوفی ۶۸۸ھ نے لکھا ہے کہ عروہ بارتی کے پاس ستر گھوڑے تھے جن کو انہوں نے جماد کے لیے تیار رکھا ہوا تھا۔ گھوڑوں کی فضیلت میں حسب ذیل احادیث ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا گھوڑوں کی تین قسمیں ہیں ایک گھوڑا آدمی کے لیے اجر کا باعث ہے، ایک گھوڑا آدمی کے لیے اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کا سبب ہے اور ایک گھوڑا آدمی کے لیے گناہ کا سبب ہے۔ جو گھوڑا آدمی کے لیے اجر و ثواب کا باعث ہے یہ وہ گھوڑا ہے جس کو آدمی نے اللہ کی راہ میں باندھ رکھا ہو اور چراگاہ یا باغ میں اس کی رسی دراز کر دی ہو۔ وہ اس چراگاہ یا باغ میں جہاں تک جا کر چرے گا، وہ سب اس کی نیکیاں شمار ہوں گی اور اگر وہ اس کی رسی کو کاٹ دے اور وہ کسی ایک یا دو جگہوں کے چکر لگائے تو جتنے قدم وہ چلے گا یا جتنی لید کرے گا وہ سب اس کی نیکیاں شمار ہوں گی اور اگر وہ گھوڑا دریا کے پاس سے گزرے اور اس کا پانی پیئے، خواہ اس کا مالک اس کو پانی پلانا نہ چاہتا ہو، پھر بھی وہ اس کی نیکیاں شمار ہوں گی، اور جو شخص سوال سے بچنے کے لیے گھوڑا باندھے اور اس کی سواری میں اللہ اور بندوں کے حقوق فراموش نہ کرے وہ اس کے لیے ستر کا باعث ہے۔ اور جو گھوڑا آدمی کے لیے گناہ ہے یہ وہ گھوڑا ہے جس کو آدمی نے فخر اور دکھاوے اور مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے رکھا ہو وہ اس کے لیے باعث گناہ ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۶۰، صحیح مسلم زکوٰۃ ۲۳ (۹۸۷) ۲۲۵۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۶۳۲، سنن النسائی رقم الحدیث:

۳۵۶۳، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۴۶۷۱)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جماد کرنا۔ میں نے پوچھا: کون سا غلام سب سے افضل ہے؟ آپ نے فرمایا جو اس کے مالک کے نزدیک سب سے نفیس اور سب سے منگاہو۔

(صحیح مسلم الایمان ۳۶ (۸۳) ۲۳۳، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۵۱۸، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۲۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۵۲۳)

اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ کی راہ میں وہ گھوڑا رکھنا چاہیے جس کی قیمت سب سے زیادہ ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عورتوں کے بعد گھوڑوں سے زیادہ کسی

چیز سے محبت نہیں تھی۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۶۶)

حضرت ابو وہب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انبیاء علیہم السلام کے ناموں کے موافق نام رکھو۔ اور اللہ عزوجل کو تمام ناموں میں سب سے زیادہ محبوب نام عبد اللہ اور عبد الرحمن ہیں۔ اور گھوڑوں کو باندھ کر رکھو اور ان کی پیشانیوں کو اور ان کی رانوں کو ملو، اور دین کی سر بلندی اور مسلمانوں کے دفاع کے لیے ان کو رکھو نہ کہ زمانہ جاہلیت کے بدلے لینے کے لیے، اور ایسے گھوڑے رکھو جن کا ماتھا اور ہاتھ پیر سرخ اور سفید ہوں یا جن کا ماتھا اور ہاتھ پیر سفید ہوں یا ان کا ماتھا اور ہاتھ پیر کالے اور سیاہ ہوں۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۵۳۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۵۶۷)

عمد رسالت اور بعد کے ادوار میں مجاہدین گھوڑوں پر بیٹھ کر جہاد کرتے تھے اور دشمن ممالک کا سفر کرتے تھے۔ اس دور میں ٹینک اور بکتر بند گاڑیوں کو گھوڑوں کے بدلہ میں استعمال کیا جاتا ہے بلکہ دشمن ممالک پر حملہ کرنے کے لیے جنگی طیاروں کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ٹینک، بکتر بند گاڑیاں، فوجی ٹرک اور لڑاکا طیارے ان سب کے حصول میں وہی اجر و ثواب ہوگا جو پہلے گھوڑوں میں ہوتا تھا۔

نامعلوم دشمنوں کا مصداق

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ان کے سوا دوسرے دشمن جنہیں تم نہیں جانتے، اللہ انہیں جانتا ہے۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں ان کے سوا دوسرے دشمنوں کے مصداق میں اختلاف ہے۔

مجاہد سے روایت ہے کہ وہ بنو قرینہ ہیں۔ سدی نے کہا اس سے مراد اہل فارس ہیں۔ ابن زید نے کہا اس سے مراد منافقین ہیں تم انہیں نہیں جانتے کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں اور لا الہ الا اللہ پڑھتے ہیں اور تمہارے ساتھ جہاد کرتے ہیں اور بعض نے کہا اس سے مراد جنات ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اللہ کے اور مسلمانوں کے تمام دشمنوں کے لیے ہتھیار مہیا کرنے اور باندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھنے کا حکم دیا اور مسلمان ان دشمنوں کو جانتے تھے، کیونکہ مسلمانوں کو بنو قرینہ اور اہل فارس کی عداوت کا علم تھا کیونکہ ان کو علم تھا کہ وہ مشرک ہیں اور وہ ان کے مخالف اور جنگجو لوگ ہیں، اور دشمنوں کی دوسری قسم وہ تھی جن کو مسلمان نہیں جانتے تھے جو بنو آدم کے غیر ہیں۔ وہ ان کے ٹھکانوں اور ان کے احوال کو نہیں جانتے، ان کو صرف اللہ جانتا ہے۔ تم نہیں جانتے کیونکہ بنو آدم جنات کو دیکھ نہیں سکتے۔ ایک قول یہ ہے کہ گھوڑوں کی آواز سے جن خوف زدہ ہوتے ہیں اور جس گھر میں گھوڑا ہو جنات اس گھر کے قریب نہیں جاتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان منافقین کو بھی نہیں جانتے تھے تو اس آیت سے ان کو کیوں مراد نہیں لیا جاسکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ منافقین مسلمانوں کے ہتھیاروں اور گھوڑوں سے نہیں ڈرتے تھے وہ صرف اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کا راز فاش نہ ہو جائے اور مسلمانوں کو ان کے نفاق کا پتہ نہ چل جائے۔

(جامع البیان ج ۱۰، ص ۳۳-۳۴، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

علامہ ابو عبد اللہ قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اس آیت میں مسلمانوں کے نامعلوم دشمنوں کے مصداق کا تعین کرنا درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اور ان کے سوا دوسرے دشمن جن کو تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے، بس کوئی شخص کیسے دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کو ان دشمنوں کا علم ہے، الایہ کہ ان دشمنوں کی تعین کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی کوئی صحیح حدیث ہو اور آپ کا یہ ارشاد ہے کہ وہ جن ہیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شیطان کسی ایسے شخص کی عقل کو فاسد نہیں کرتا جس کے گھر میں گھوڑا ہو۔ اس حدیث کو حارث بن ابی اسامہ نے اپنے والد سے اور انہوں نے اپنے دادا سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے اور یہ بھی

روایت ہے کہ جنات اس گھر کے قریب نہیں جاتے ہیں جس میں گھوڑا ہو اور جنات گھوڑوں کی آواز سن کر بھاگ جاتے ہیں۔

(الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۳۹۶، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

امام طبرانی متوفی ۳۶۰ھ نے یزید بن عبد اللہ بن عرب الملکی سے اس آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ جن ہیں۔ اور آپ نے فرمایا جن کسی ایسے گھر کو خراب نہیں کرتے جس میں عمدہ گھوڑا ہو۔

(المعجم الکبیر ج ۱۷، ص ۱۸۹، تفسیر امام ابن ابی حاتم ج ۵، ص ۱۷۰۹)

حافظ البیہقی نے لکھا ہے اس حدیث کی سند میں مجہول راوی ہیں۔ (مجمع الزوائد ج ۷، ص ۴۷)

حافظ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ لکھتے ہیں: امام ابو الشیخ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث ذکر کی ہے کہ وہ جن ہیں اور جو شخص اپنے گھر میں گھوڑوں کو باندھے جن اس کے گھر کو خراب نہیں کرتے، اور امام ابو الشیخ اور امام ابن مردویہ نے اس آیت کی تفسیر میں یہ حدیث روایت کی ہے یعنی شیطان کسی گھوڑے پر قدرت نہیں رکھتا۔ کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا گھوڑوں کی پیشانیوں میں خیر کی گرہ ہے لہذا شیطان کبھی اس پر قدرت نہیں پائے گا۔ (الدر المنثور ج ۴، ص ۹۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۳ھ)

امام رازی نے فرمایا اس آیت کے مصداق میں تین قول ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں کیونکہ جب وہ مسلمانوں کی قوت کا مشاہدہ کریں گے تو وہ خوف زدہ ہو کر اپنے نفاق کو ترک کر دیں گے اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں سے باز آجائیں گے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد جنات ہیں لیکن اس پر یہ اشکال ہے کہ آلات جہاد کی کثرت سے جنات کا خوف زدہ ہونا غیر معقول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد مسلمانوں کے وہ دشمن ہیں جو مسلمان ہیں، کیونکہ مسلمان آپس میں بھی دشمنی رکھتے ہیں۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۵۰۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۱۵ھ)

میری رائے یہ ہے کہ جن احادیث سے اس آیت کا مصداق جنات کو بتایا گیا ہے وہ سب ضعیف ہیں۔ اس لیے ہمیں خلاف عقل روایات پر اصرار نہیں کرنا چاہیے اور جب اللہ اور اس کے رسول نے ان دشمنوں کی تعین نہیں کی تو ہمیں اس کے درپے نہیں ہونا چاہیے اور اس کو اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔

دشمنان اسلام کو ڈرانے اور مرعوب کرنے کی حکمت

کفار کو جب یہ علم ہو گا کہ مسلمانوں کے جہاد کی مکمل تیاری کر لی ہے اور جہاد کے تمام آلات اور اسلحہ کو حاصل کر لیا ہے تو وہ مسلمانوں سے خوف زدہ رہیں گے اور اس خوف کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے ملکوں پر حملہ کرنے سے باز رہیں گے، اور اس خوف کی وجہ سے وہ جزیہ کی ادائیگی کے لیے تیار ہو جائیں گے اور بسا اوقات یہ خوف ان کے ایمان لانے کا سبب بن جائے گا، اور اس خوف کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے خلاف دوسرے کافروں کی مدد نہیں کریں گے اور مسلمانوں کے اس رعب اور دبدبہ کی وجہ سے اقوام عالم میں مسلمانوں کی عزت اور وقار میں اضافہ ہو گا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور تم اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے، اس کا تمہیں پورا پورا اجر دیا جائے گا اور تم پر بالکل ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یعنی اے مسلمانو! تم آلات حرب اور جنگ کے لیے سواریوں کے حصول میں جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ تم کو دنیا میں بھی اس کا اجر عطا فرمائے گا اور آخرت میں بھی اس نے تمہارے لیے ثواب کا ذخیرہ کر لیا ہے جو تم کو قیامت کے دن پورا پورا دیا جائے گا۔

سورۃ الانفال کی ان آیات میں کفار کے خلاف جہاد کرنے اور مال غنیمت کی تقسیم کے احکام بیان کیے ہیں۔ اس لیے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جہاد کی فضیلت کے متعلق قرآن مجید کی آیات اور احادیث بیان کریں اور جہاد کے فقہی احکام بیان کریں اور اس کے بعد مال غنیمت کی تقسیم، گرفتار شدہ قیدیوں کے احکام اور فدیہ کی تفصیل بیان کریں۔ فنقول و باللہ التوفیق۔

جہاد کی فضیلت کے متعلق قرآن مجید کی آیات

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ۝ تُوْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسْكِنٍ طَيِّبَةٍ فِي جَنَّاتٍ عَدْنٍ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝

(الصف: ۱۰-۱۲)

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَبِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَعَدَّ اللَّهُ الْحَسَنَىٰ وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُسْجِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ دَرَجَاتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةٌ وَرَحْمَةٌ ۝ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ (النساء: ۹۶-۹۵)

الَّذِينَ آمَنُوا وَهَلَا جَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّبِينٌ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۝ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ (التوبة: ۲۲-۲۰)

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعَدَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ حَقًّا فِي

اے ایمان والو! کیا میں ایسی تجارت کی طرف تمہاری راہنمائی کروں جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دے ۝ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو ۝ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں ان جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے سے دریا بہ رہے ہیں اور پاکیزہ مکانوں میں اور ہمیشہ کی جنتوں میں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔

بلا عذر (جہاد سے) بیٹھ رہنے والے مسلمان اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں، اللہ نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر کئی درجہ فضیلت دی ہے اور سب سے اللہ نے اچھے اجر کا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر بہت بڑے ثواب کی فضیلت دی ہے ۝ اللہ کی طرف سے درجات ہیں اور بخشش اور رحمت ہے اور اللہ بہت بخشنے والا ہے، بے حد رحم فرمانے والا ہے ۝

جو لوگ ایمان لائے اور جن لوگوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑے درجے والے ہیں، اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں ۝ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور رضا کی اور جنتوں کی خوشخبری سناتا ہے، جن میں ان کے لیے دائمی نعمت ہے ۝ وہ اس میں ابد تک ہمیشہ رہیں گے بے شک اللہ ہی کے پاس بہت بڑا اجر ہے ۝

بے شک اللہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو ان کے لیے جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں قتال (جہاد) کرتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے

التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ وَالْقُرْآنَ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ
مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ
بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبة: ۱۱۱)

ہیں اس پر تورات اور انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے اور
اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟ پس تم اپنی
اس بیع سے خوش ہو جاؤ جو تم نے بیع کی ہے اور یہی بہت بڑی
کامیابی ہے ○

حسن بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نبی ﷺ کے پاس سے گزرا اس وقت آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے اس نے پوچھا یہ
کس کا کلام ہے؟ آپ نے فرمایا یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس نے کہا اللہ کی قسم یہ نفع والی بیع ہے، ہم اس بیع کو ہرگز واپس نہیں کریں
گے نہ اس کو رد کرنے کا مطالبہ کریں گے، وہ جہاد کے لیے نکلا اور جاتے ہی شہید ہو گیا۔ (جامع البیان جز ۱۱، ص ۴۹)

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ
صَفَا كَاتِهِمْ بِنِيَانٍ مَّرْصُورٍ (الصف: ۴)

بے شک اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اللہ کی راہ میں
اس طرح صف باندھ کر قتال (جہاد) کرتے ہیں گویا کہ وہ سیہ
پلائی ہوئی دیوار ہیں ○

جہاد افضل اعمال ہے کیونکہ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے اپنی حیات کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان
کو اس کی جزا میں اس حیات سے افضل حیات عطا فرماتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ○ فَرِحِينَ
بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَ يَسْتَبْشِرُونَ
بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○
(آل عمران: ۱۶۹-۱۷۰)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ہیں ان کو ہرگز مردہ
گمان نہ کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں انہیں رزق دیا
جاتا ہے ○ اللہ نے ان کو جو اپنے فضل سے دیا وہ اس پر خوش
ہیں اور بعد والے لوگوں کے متعلق جو ابھی اس سے نہیں ملے
یہ بشارت پا کر خوش ہوتے ہیں کہ ان پر کوئی خوف ہو گا نہ وہ
غمگین ہوں گے۔

جہاد کی فضیلت کے متعلق احادیث

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا
اور اللہ پر ایمان لانا افضل اعمال ہیں۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا: یا رسول اللہ! یہ بتائیے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا
جاؤں تو کیا یہ میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے جاؤ در آنحالیکہ تم (جنگ کی
شدت میں) صابر ہو اور ثواب کی نیت کرنے والے ہو، آگے بڑھ کر حملہ کرنے والے ہو اور پیٹھ پھیر کر بھاگنے والے نہ ہو۔ پھر
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم نے کیا پوچھا تھا؟ اس نے کہا یہ بتائیے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا اس سے میرے
گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں قرض کے ماسوا۔ بشرطیکہ تم صابر ہو ثواب کی نیت کرنے والے ہو،
آگے بڑھ کر حملہ کرنے والے ہو پیٹھ پھیر کر بھاگنے والے نہ ہو۔ بے شک جبرئیل نے یہ (قرض کے ماسوا کی قید) مجھے ابھی بتائی
ہے۔ (صحیح مسلم الامارہ ۱۱۷۷ (۱۸۸۵) ۴۷۹۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۷۱۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۵۵)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: ایک شخص مال غنیمت کے
لیے قتال کرتا ہے اور ایک شخص اس لیے قتال کرتا ہے تاکہ اس کی بہادری کا ذکر کیا جائے اور ایک شخص اپنے خاندان کی غیرت
کی وجہ سے قتال کرتا ہے۔ ان میں سے اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو شخص اس لیے قتال کرتا ہے کہ

اللہ کا دین سر بلند ہو وہ اللہ کی راہ میں قتال کرنے والا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۱۰، صحیح مسلم الامارہ ۱۵۱-۱۳۹، (۱۹۰۳) ۳۹-۳۹۳۶، سنن ابوداؤد، رقم الحدیث: ۲۵۱۸، ۲۵۱۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۶۵۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۳۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۸۳)

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا اللہ کی راہ میں صبح کرنا یا شام کرنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۷۹۳، صحیح مسلم الامارہ ۱۱۲، (۱۸۸۱) ۳۷۹۲، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۱۸)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اس حال میں مرا کہ اس نے جماد کیا نہ اس کے دل میں جماد کی خواہش ہوئی وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرا۔

(صحیح مسلم الامارہ ۱۵۸، (۱۹۱۰) ۳۸۳۸، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۵۰۲، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۰۹۷)

امام مالک بن انس اصبحی متوفی ۱۷۹ھ نے اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے، مجھے یہ پسند ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتال کروں پھر مجھے قتل کر دیا جائے، پھر میں زندہ کیا جاؤں پھر مجھے قتل کیا جائے، پھر میں زندہ کیا جاؤں پھر مجھے قتل کیا جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے تین مرتبہ اس کو قسم کھا کر بیان کیا۔

(صحیح مسلم الجہاد ۱۰۹، (۱۸۷۶) ۳۷۸۱، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۷۹۷، الموطا رقم الحدیث: ۹۹۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ و قدرت میں میری جان ہے، تم میں سے جو شخص بھی اللہ کی راہ میں زخمی ہوگا اور اللہ کو خوب علم ہے کہ کون اس کی راہ میں زخمی ہوا ہے، تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہ رہا ہوگا، رنگ خون کا ہوگا اور خوشبو مشک کی ہوگی۔

(الموطا رقم الحدیث: ۱۰۰۱، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۰۳، صحیح مسلم الجہاد ۱۰۵، (۱۸۷۶) ۳۷۷۹)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شہید کو قتل کیے جانے کا فقط اتنا درد ہوتا ہے جتنا تم میں سے کسی ایک شخص کو چوٹی کاٹنے کا درد ہوتا ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۶۷۵، سنن النسائی رقم الحدیث: ۳۱۶۱، سنن الدارمی رقم الحدیث: ۲۳۰۸)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھی فوت ہو اور اس کے لیے اللہ کے پاس اجر ہو وہ دنیا میں واپس جانے سے خوش نہیں ہوگا، خواہ اس کو دنیا اور مافیہا مل جائیں، ماسوا شہید کے، کیونکہ وہ یہ تمنا کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس جائے اور پھر قتل کیا جائے کیونکہ وہ شہادت کی فضیلت دیکھ لے گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۱۷، صحیح مسلم الامارہ ۱۰۸، (۱۸۷۷) ۳۷۸۳، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۶۶۸)

سروق بیان کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے متعلق پوچھا جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ان کو مردہ گمان مت کرو بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے (آل عمران: ۱۶۹) حضرت ابن مسعود نے فرمایا ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے متعلق پوچھا تھا، آپ نے فرمایا شہداء کی رو میں سبز بندوں کے پیٹ میں ہیں، ان کے لیے عرش میں قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں وہ جہاں چاہتی ہیں چرتی ہیں، اور پھر ان قندیلوں کی طرف لوٹ آتی ہیں۔ پھر ان کا رب ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور فرماتا ہے تم کسی چیز کو چاہتے ہو؟ وہ کہتے ہیں ہم کس چیز کی خواہش کریں کہ ہم جنت میں جہاں چاہتے ہیں چرتے ہیں۔ یہ مکالمہ تین مرتبہ ہوگا۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ان کو بغیر پوچھے نہیں چھوڑا جا رہا تو وہ کہیں گے

کہ ہمارے رب ہماری خواہش یہ ہے کہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں دوبارہ لوٹا دیا جائے حتیٰ کہ ہم تیری راہ میں دوبارہ قتل کیے جائیں، جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھے گا کہ ان کو اور کوئی خواہش نہیں ہے تو ان کو چھوڑ دیا جائے گا۔

(صحیح مسلم الامارۃ (۱۸۸۷) ۲۸۰۲، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۱۸، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۰۱)

جہاد کی حکمت اور اس سوال کا جواب کہ کافروں کو قتل کرنا اللہ اور رسول کی رحمت کے منافی ہے جہاد کی مشروعیت اور اس کی فضیلت اور اس کی ترغیب، تحریص اور تحریک میں آیات اور احادیث بہت زیادہ ہیں، جہاد کی مشروعیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ سیدنا محمد ﷺ کے اوصاف حمیدہ میں سب سے خاص وصف آپ کی رحمت ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جہاد سے انسان مارے جاتے ہیں اور ان کا خون بہتا ہے، عورتیں بیوہ ہوتی ہیں اور بچے یتیم ہوتے ہیں، اموال تلف ہوتے ہیں، آبادیاں ویران ہوتی ہیں، شہرتباہ ہو جاتے ہیں اور بہت سی علمی اور تحقیقی متاع ضائع ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جہاد فتنہ اور فساد کا سبب ہے اور تباہی اور بربادی کا موجب ہے تو جس ذات کو اللہ تعالیٰ نے رحمتہ للعالمین بنا کر بھیجا ہے اس کو جہاد کی شریعت کے ساتھ مبعوث کرنا کس طرح حکمت کے مطابق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب انسان مل جل کر تمدنی زندگی گزارتے ہیں تو انسان اپنی ضرورت اور اپنے عیش و آرام کی چیزوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی پسند اور اپنے مزاج کے خلاف چیزوں کو دور کرنا چاہتے ہیں اور بسا اوقات وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے زور آزمائی کرتے ہیں اور ہر زبردست ہر زبردست کو مغلوب کرتا ہے۔ اور بسا اوقات اس میں قتل اور خون ریزی کی نوبت آ جاتی ہے، کیونکہ جب کسی شخص کو اپنا مطلوب حاصل نہ ہو تو وہ غیظ و غضب میں آ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ جب ہاتل کی قربانی قبول ہو گئی اور قابیل کی قربانی قبول نہیں ہوئی تو قابیل نے ہاتل کو قتل کر دیا اور یہ اس دنیا میں قتل کا پہلا واقعہ تھا۔

اور آپ انہیں آدم کے دو بیٹوں کی خیر حق کے ساتھ سنائیں جب دونوں نے قربانی پیش کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی تو دوسرے نے کہا میں تم کو ضرور قتل کروں گا، پہلے نے کہا اللہ صرف متقین کی قربانی قبول فرماتا ہے ○

وَآتِلْ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ قَالَ لَأَقْتُلَنَّكَ قَالَ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ ○ (المائدہ: ۲۷)

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قتل اور خون ریزی انسان کی فطرت میں ہے اور اسلام دین فطرت ہے اور شریعت اسلامیہ میں باقی بچھلی تمام شریعتوں کے مقابلہ میں انسانوں پر زیادہ رحمت اور شفقت ہے، اس لیے اسلام نے یہ چاہا کہ انسان اپنے سفلی جذبہ، حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے اور زور اور سلطنت حاصل کرنے کے لیے جو قتل اور خون ریزی کرتا ہے اس کا رخ موڑ دیا جائے اور بجائے اس کے کہ انسان اپنی شہوت اور غضب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے انسانوں کا خون بہائے، وہ عدل و انصاف کو فروغ دینے، اعلیٰ ملکوتی اقدار کے حصول اور اللہ کی زمین پر اللہ کے احکام نافذ کرنے کے لیے مجرموں اور اللہ کے باغیوں کا خون بہائے تاکہ دنیا سے کفر اور شرک، ظلم اور سرکشی اور فحاشی اور بے حیائی کی جڑیں کاٹ دی جائیں اور دنیا سے شر اور فساد دور ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اور اگر اللہ بعض (ظالم) لوگوں کو بعض (عادل) لوگوں سے

وَلَوْ لَا دَفَعُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَيَّ

دور نہ فرماتا تو ضرور زمین تباہ ہو جاتی لیکن اللہ تمام جہانوں پر

الْعَلَمِينَ ○ (البقرہ: ۲۵۱)

فضل فرمانے والا ہے ○

وَلَوْلَا دَفَعُ اللَّهُ النَّاسَ تَعْضُثَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهَدَمَتِ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدٌ يُذَكِّرُ فِيهَا اسْمَ اللَّهِ كَثِيرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ○ (الحج: ۴۰)

اور اگر اللہ بعض (ظالم) لوگوں کو بعض (عادل) لوگوں سے دور نہ فرماتا تو راہبوں کی عبادت گاہیں، اور گرجے اور کلیسیے اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے ضرور منہدم کر دی جاتیں اور اللہ اس کی مدد فرماتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ ضرور قوت والا بہت غالب ہے ○

بہت غالب ہے ○

اس حکمت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے جہاد کو مشروع کیا اور جہاد اور قتال کی مشروعیت سے صرف یہ مقصد تھا کہ لوگوں کو زمین پر اللہ کی عبادت پر قدرت مہیا کی جائے اور شر اور فساد کا قلع قمع کیا جائے یا اس کو کم کر دیا جائے اور تمام آسمانی مذاہب اور شریعتوں کا یہی مقصد رہا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اللہ عزوجل نے کافروں، ظالموں، باغیوں اور مجرموں سے قتال کو مشروع کیا۔ ہرچند کہ قتال اور جہاد سے انسانوں کا خون بہتا ہے، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہوتے ہیں لیکن اس سے دنیا میں توحید، عدل و انصاف اور خیر کثیر کا حصول ہوتا ہے اور خیر کثیر کے حصول کے لیے شر قلیل کو برداشت کرنا ناگزیر ہوتا ہے بلکہ اس شر قلیل کو برداشت کرنا خیر کثیر ہے اور شر قلیل کی وجہ سے خیر کثیر کو ترک کر دینا بجائے خود شر کثیر ہے۔

جہاد کے فرض عین ہونے کی صورتیں

جہاد کی دو قسمیں ہیں۔ فرض عین اور فرض کفایہ۔ اور علماء کا اس پر اجماع ہے کہ تین حالتوں میں جہاد فرض عین ہے۔

۱۔ امام المسلمین اور سربراہ مملکت اسلامیہ کسی شخص یا کسی جماعت کو جہاد اور قتال کے لیے طلب کرے تو ان لوگوں کے لیے جہاد کے لیے نکلنا فرض عین ہے اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَالَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمْ أَنْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّا قُلْنَا إِلَى الْأَرْضِ أَرْضَيْتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ○ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبَدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ (التوبہ: ۳۸-۳۹)

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوا! جب تم سے کہا جاتا ہے کہ جہاد کے لیے نکلو تو تم بوجھل ہو کر زمین کی طرف جھک جاتے ہو؟ کیا تم نے آخرت کے بدلہ دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا ہے حالانکہ دنیا کی زندگی کا فائدہ تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہے ○ اگر تم جہاد کے لیے نہ نکلے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہارے بدلہ میں دوسری قوم لے آئے گا اور تم اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ○

اور اس آیت کی دلالت اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امام المسلمین کے طلب کرنے کے بعد جہاد کے لیے نکلنے میں سستی کرنے والوں کی مذمت کی ہے اور جہاد کے لیے نہ نکلنے والوں کو عذاب کی وعید سنائی ہے۔

امام المسلمین کے طلب کرنے پر جہاد کے فرض عین ہونے پر یہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا اب (مکہ سے مدینہ کی طرف) ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت ہے اور جب تم کو جہاد کے لیے طلب کیا جائے تو تم جہاد کے لیے نکلو۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۲۵، ۳۰۷۷، صحیح مسلم الامارہ: ۸۵، (۱۳۵۳) ۴۷۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۳۸۰، سنن الترمذی

رقم الحدیث: ۱۵۹۷، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۳۹۶، جامع الاصول، ج ۶، رقم الحدیث: ۶۹۰۰

اور اس حدیث کی دلالت اس طرح ہے کہ نبی ﷺ نے امام کے طلب کرنے کے بعد جہاد کے لیے نکلنے کا امر فرمایا ہے اور امر و جواب کے لیے ہوتا ہے۔

۲- جہاد کے فرض عین ہونے کی دوسری صورت یہ ہے کہ دشمن مسلمانوں کے کسی شہر پر حملہ کر کے اس میں داخل ہو جائے یا ان کی مملکت کے کسی حصہ پر قبضہ کر لے تو اس وقت دشمن سے قتل کرنا فرض عین ہے اور اس کی فرضیت اجماع سے ثابت ہے۔

۳- جہاد کے فرض عین ہونے کی تیسری صورت یہ ہے کہ جب دشمن سے صف بہ صف مقابلہ ہو رہا ہو تو اس وقت دشمن سے پیٹھ پھیر کر بھاگنا حرام ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تَوَلَّوْهُمُ الْآدْبَارَ (الانفال: ۱۵)

اے ایمان والو! جب میدان جنگ میں تمہارا کفار سے مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرو۔

اس آیت کی وجہ دلالت اور اس کی تفسیر الانفال: ۱۶ میں گزر چکی ہے۔

جہاد کے فرض کفایہ ہونے کی صورتیں

جب دشمن مسلمانوں کے ملک پر حملہ کرے نہ اس کے کسی حصہ پر قبضہ کرے، نہ امام مسلمانوں کو جہاد کے لیے طلب کرے تو تبلیغ اسلام کے لیے کفار پر حملہ کرنا فرض کفایہ ہے اور اس کی دلیل یہ آیت ہے:

لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَعَدَّ اللَّهُ الْحُسْنَى وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا (النساء: ۹۵)

بلاعذر جہاد سے بیٹھ رہنے والے مسلمان اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں، اللہ نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر کئی درجہ فضیلت دی ہے اور سب سے اللہ نے اچھے اجر کا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھے والوں پر بہت بڑے ثواب کی فضیلت دی ہے۔

اس آیت کی جہاد کے فرض کفایہ ہونے پر اس طرح دلالت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں اور بلاعذر جہاد نہ کرنے والوں دونوں سے اچھے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ البتہ جہاد کرنے والوں کو زیادہ اجر و ثواب کی بشارت دی ہے، اگر ہر جہاد فرض عین ہوتا تو جہاد نہ کرنے والے گنہ گار ہوتے اور ان سے اچھے اجر کا وعدہ نہ فرماتا، کیونکہ مقصود تو اللہ کے دین کی سر بلندی اور تبلیغ اسلام ہے سو جن مسلمانوں نے اس فریضہ کو ادا کر لیا تو باقی مسلمانوں سے اس کی فرضیت ساقط ہو گئی جیسا کہ تمام فروض کفایہ میں ہوتا ہے۔

تبلیغ اسلام کے لیے جہاد کے فرض کفایہ ہونے کی وضاحت اس حدیث سے ہوتی ہے:

سليمان بن بريدہ اپنے والد بنی شہزادہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی شخص کو کسی بڑے لشکر یا چھوٹے لشکر کا امیر بناتے تو اس کو خاص طور پر اللہ سے ڈرنے کی وصیت فرماتے، اور اس امیر کے ساتھ جو مسلمان ہوتے ان کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت کرتے۔ پھر فرماتے اللہ کا نام لے کر اللہ کی راہ میں جنگ کرو، جو لوگ اللہ کے ساتھ کفر کریں ان کے

خلاف قتال کرو، خیانت نہ کرو، عہد شکنی نہ کرو، مثلہ نہ کرو (کسی شخص کے اعضاء کاٹ کر اس کی شکل نہ بگاڑو) کسی بچہ کو قتل نہ کرو اور جب تمہارا مشرکین میں سے اپنے دشمنوں سے مقابلہ ہو تو ان کو تین چیزوں کی دعوت دو، وہ ان میں سے جس چیز کو بھی مان لیں تم اس کو ان سے قبول کر لو اور پھر ان پر حملہ کرنے سے رک جاؤ۔ ان کو یہ دعوت دو کہ وہ اپنے شہر سے دارمہاجرین کی طرف منتقل ہو جائیں اور ان کو یہ بتاؤ کہ اگر انہوں نے ایسا کر لیا تو ان کے وہ حقوق ہوں گے جو مہاجرین کے حقوق ہیں اور ان پر وہ چیزیں فرض ہوں گی جو مہاجرین پر فرض ہیں۔ اور اگر وہ اپنے شہر سے منتقل ہونے سے انکار کریں تو وہ مسلمان اعرابیوں کی طرح ہوں گے اور ان پر اللہ کا وہ حکم جاری ہو گا جو مومنین پر جاری ہے، اور مال غنیمت اور فتنے میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو گا، البتہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد کریں تو پھر ان کا حصہ ہو گا۔ اور اگر وہ اس کا بھی انکار کریں تو پھر ان سے جزیہ کا سوال کرو اور اگر وہ اس کو مان لیں تو پھر ان سے جزیہ قبول کر لو اور ان پر حملہ کرنے سے رک جاؤ، اور اگر وہ اس کا بھی انکار کریں تو اللہ سے مدد حاصل کر کے ان سے قتال کرو، اور جب تم قلعہ میں بند لوگوں کا محاصرہ کرو اور وہ یہ ارادہ کریں کہ تم ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو ضامن بناؤ تو تم اللہ اور اس کے رسول کو ضامن نہ بناؤ۔ لیکن تم اپنی اور اپنے اصحاب کی ضمانت دو، کیونکہ اگر تم نے اپنی اور اپنے اصحاب کی ذمہ داری کو ادا نہ کیا تو یہ اس سے آسان ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف ضمانت توڑنے کی نسبت کرو، اور جب تم قلعہ والوں کا محاصرہ کرو اور وہ یہ ارادہ کریں کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے قلعہ سے باہر لاؤ تو تم اللہ کے حکم سے ان کو باہر نہ لانا لیکن تم ان کو اپنے حکم سے قلعہ سے نکالنا، کیونکہ تم نہیں جانتے کہ تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے یا نہیں۔

(صحیح مسلم الجہاد ۳، (۱۷۳۱) ۴۴۴۱، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۶۲۱۴، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۳۱۵، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۵۸)

جب کافر اپنے اپنے ملکوں میں ہوں تو جو مسلمان ان سے جہاد کرنے پر قادر ہوں ان پر تبلیغ دین اور اسلام کی سر بلندی کے لیے کافروں سے جہاد کرنا فرض کفایہ ہے اور اگر کسی ملک کے مسلمان بھی کافروں سے جہاد نہ کریں تو پھر دنیا کے تمام مسلمان گنہ گار ہوں گے۔

جب تک دنیا میں مسلم اقوام تبلیغ دین اور اعلاء کلمتہ الحق کے لیے کفر اور باطل قوتوں سے جہاد کرتی رہیں وہ دنیا میں عزت اور سر بلندی کے ساتھ زندہ رہیں۔ اور جب انہوں نے جہاد چھوڑ دیا اور عیش و طرب کی زندگی اختیار کر لی، مسلمان مشقت، جانفشانی اور سخت کوشی کی جگہ سہولت، آرام اور تن آسانی کی زندگی بسر کرنے لگے تو ذلت اور محکومی ان کا مقدر ہو گئی۔ اسپین میں مسلمانوں کا عروج اور زوال، ہندوستان میں مسلمان-سلاطین کی سر بلندی اور پستی اور عربوں کی اسرائیلیوں سے فتح اور شکست کار از اسی ایک نکتہ میں مضمر ہے۔

آج پاکستان کی قوم بھی تہذیب اور کلچر کے نام پر سینما، وی سی آر اور ڈش پر پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کے دیکھنے کے وفور شوق میں مبتلا ہے اور میوزک کے شور میں ڈوبی ہوئی ہے اور فلموں میں جو فحاشی اور نیم عریاں تہذیب دکھائی جاتی ہے اس کو علمی زندگی میں آرٹ اور فیشن کے نام پر فروغ دے رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ سقوط مشرقی پاکستان کے موقع پر نوے ہزار فوجیوں نے ہتھیار ڈال کر مسلمانوں کی عسکری تاریخ کی بدترین مثال قائم کی۔

جہاد کے مباح ہونے کی شرائط

جہاد کے مباح ہونے کی دو شرطیں ہیں:

نبیان القرآن

۱- دشمن دین اسلام کو قبول کرنے سے انکار کر دے اور مسلمانوں اور دشمنوں کے درمیان جنگ نہ کرنے کا معاہدہ نہ ہو۔
 ۲- مسلمانوں کو یہ توقع اور امید ہو کہ جنگ میں مسلمانوں کو کفار پر غلبہ حاصل ہوگا۔ اگر مسلمانوں کو یہ توقع اور امید نہ ہو تو پھر ان کے لیے کفار سے جنگ کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ جب مسلمانوں کو جنگ کی قوت اور سامان حرب میں برتری حاصل نہ ہو تو پھر ان کا کفار سے جنگ کرنا خود کشی کے مترادف ہے۔ (عالمگیری ج ۲، ص ۱۸۸)

جہاد کے وجوب کی شرائط

جہاد کے واجب ہونے کی سات شرطیں ہیں: (۱) اسلام (۲) بلوغ (۳) عقل (۴) آزاد ہونا (۵) مرد ہونا (۶) معذور نہ ہونا (۷) ضروریات کا خرچ موجود ہونا۔

اسلام کی شرط اس لیے ہے کہ کافر پر جنگ میں اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ عقل کی شرط اس لیے ہے کہ مجنون جہاد نہیں کر سکتا اور بلوغ کی شرط اس لیے ہے کہ بچہ کمزور ہوتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب میری عمر چودہ سال تھی تو میں نے اپنے آپ کو جنگ احد کے لیے پیش کیا لیکن رسول اللہ ﷺ نے مجھے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اور آزاد ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ نبی ﷺ آزاد شخص سے اسلام اور جہاد کی بیعت لیتے تھے اور غلام سے صرف اسلام کی بیعت لیتے تھے جہاد کی بیعت نہیں لیتے تھے۔ اور مرد ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا عورتوں پر جہاد فرض ہے؟ آپ نے فرمایا ان پر ایسا جہاد فرض ہے جس میں جنگ نہیں ہے اور وہ حج اور عمرہ ہے۔ غیر معذور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اندھا، لنگڑا اور بیمار نہ ہو اور یہ اس لیے شرط ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرْجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرْجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرْجٌ (التوبة: ۱۷) (جہاد نہ کرنے کی وجہ سے) اندھے پر کوئی گناہ نہیں اور نہ لنگڑے پر کوئی گناہ ہے اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے اور خرچ موجود ہونے کی شرط اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَيْسَ عَلَى الضَّعْفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يَنْفِقُونَ حَرْجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ (التوبة: ۹۱)

(جہاد نہ کرنے کی وجہ سے) ضعیفوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر کوئی گناہ ہے اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ ہے جو زادراہ (خرچ) نہیں پاتے جب انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی خیر خواہی کر لی ہو۔

اگر جہاد مسافت قصر سے کم پر ہو تو مدت جہاد میں اہل و عیال کا خرچ ضروری ہے اور ہتھیاروں کا ہونا بھی ضروری ہے اور اگر جہاد مسافت قصر پر ہو تو اس کے ساتھ ساتھ سواری بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَا عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا اتَّوَكَّكَ لِيَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا أُحِمْكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَاعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلَّا يَجِدُوا مَا يُنْفِقُونَ (التوبة: ۹۲)

اور نہ ان لوگوں پر کوئی گناہ ہے جو آپ کے پاس اس لیے حاضر ہوئے کہ آپ انہیں (جہاد کے لیے) سواری دیں تو آپ نے ان سے فرمایا میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے تو وہ اس حال میں واپس چلے گئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کیونکہ ان کو یہ رنج تھا کہ ان کے پاس خرچ کے لیے کچھ نہیں ہے۔ (المغنی ج ۱۰، ص ۱۶۳، مطبوعہ بیروت ۱۳۰۵ھ)

مال غنیمت کی تقسیم کی تفصیل اور جنگی قیدیوں کو فدیہ کے بدلہ میں آزاد کرنے کے متعلق مذاہب فقہاء

علامہ محمد بن علی بن محمد حنفی حنفی متونی ۱۰۸۸ھ لکھتے ہیں:

جب امام کسی شہر کو صلح سے فتح کرے تو اس شہر کی زمین اپنے حال پر رہے گی (عشری ہو تو عشری اور خراجی ہو تو خراجی) اور زمین ان کی ملکیت میں باقی رہے گی اور اگر وہ کسی شہر کو جنگ سے فتح کرے تو اگر امام چاہے تو وہاں کی زمین اور اموال سے خمس نکالنے کے بعد اس کو لشکر کے درمیان تقسیم کر دے اور وہاں کے رہنے والوں کو غلام بنالے اور اگر چاہے تو وہاں کے رہنے والوں کو اس زمین پر برقرار رکھے اور ان کے افراد پر جزیہ مقرر کرے اور ان کی زمین سے خراج وصول کرے۔ پہلی صورت اولیٰ ہے جبکہ مال غنیمت کی ضرورت ہو۔ اور اگر چاہے تو وہاں کے رہنے والوں کو وہاں سے نکال دے اور وہاں کسی اور قوم کو آباد کرے اور ان سے جزیہ اور خراج وصول کرے (علامہ شامی لکھتے ہیں کہ امام کے اس اختیار پر یہ اعتراض ہے کہ یہ اجماع صحابہ کے خلاف ہے کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کے مضافات کی زمین لشکر میں تقسیم نہیں کی تھی اور نہ اس سے خمس نکالا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر نے جو کچھ کیا تھا اس موقع پر وہی مناسب تھا۔ اور یہ لازمی امر نہیں تھا کیونکہ نبی ﷺ نے خیبر کی زمین کو لشکر کے درمیان تقسیم کر دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کو اختیار ہے کہ وہ جو طریقہ مناسب سمجھے اس پر عمل کرے) یہ حکم اس وقت ہے جب اس شہر کے رہنے والے کافر ہوں اور اگر وہ مسلمان ہوں تو وہ زمین صرف عشری ہوگی۔ اگر قیدی مسلمان نہ ہوں تو امام چاہے تو ان کو قتل کر دے اور اگر چاہے تو ان کو غلام بنالے اور اگر چاہے تو ان کو ذمی بنالے اور خواہ وہ مسلمان ہو گئے ہوں ان کو بلا عوض چھوڑ دینا حرام ہے کیونکہ ان کے ساتھ غنائم (اہل لشکر) کا حق متعلق ہے۔ امام شافعی نے اس کو جائز کہا ہے کیونکہ قرآن مجید میں ہے:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ
حَتَّىٰ إِذَا أَنزَلْتُمُوهُمْ فَسُدُّوا أَلْوَابَكُمْ
فَمَا تَمَّا بَعْدُ وَإِن مَّا فِدَاءٌ حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ
أُوزَارَهَا (محمد: ۴)

جب تمہارا کافروں سے مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں مارو
یہاں تک کہ جب تم ان کا اچھی طرح خون بہا چکو تو ان قیدیوں
کو مضبوطی سے باندھ لو، پھر خواہ احسان کر کے ان کو چھوڑ دو یا
ان سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دو، حتیٰ کہ جنگ اپنے ہتھیار
رکھ دے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس آیت کا حکم سورہ توبہ کی اس آیت سے منسوخ ہے:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ
(التوبہ: ۵)

سو تم مشرکین کو جہاں پاؤ ان کو قتل کر دو۔

اور جنگ ختم ہونے کے بعد ان سے فدیہ لینا حرام ہے اور جنگ ختم ہونے سے پہلے مالی فدیہ لینا جائز ہے (یعنی مال لے کر کافر قیدی کو چھوڑ دینا اور مسلم قیدی کے بدلہ میں کافر قیدی کو چھوڑنا جائز نہیں ہے) (درر) اور امام ابو یوسف اور امام محمد نے کہا یہ جائز ہے اور امام ابو حنیفہ کی بھی زیادہ ظاہر روایت یہی ہے۔

(الدر المختار مع رد المحتار ج ۳، ص ۲۲۹-۲۲۸، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی حنفی متونی ۱۲۵۲ھ لکھتے ہیں:

مشہور یہ ہے کہ ضرورت کے وقت مال لے کر کافر قیدی کو چھوڑنا جائز ہے اور مسلمان قیدی کے بدلہ میں کافر قیدی کو

چھوڑنا جائز نہیں ہے اسی طرح سیر الکبیر میں مذکور ہے۔ امام محمد نے کہا اس میں کوئی حرج نہیں ہے اگر کافر بہت بوڑھا ہو اور اس کی نسل کا بڑھنا متوقع نہ ہو، اسی طرح الاختیار میں مذکور ہے۔ اور مسلمان قیدی کے بدلہ میں کافر قیدی کو چھوڑنا امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز نہیں ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک جائز ہے۔ المحیط میں مذکور ہے کہ ظاہر الروایہ کے مطابق یہ بھی جائز ہے۔ السیر الکبیر میں مذکور ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس کا جائز ہونا زیادہ ظاہر روایت ہے۔ فتح القدر میں مذکور ہے کہ یہی امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول ہے اور یہی ائمہ ثلاثہ کا قول ہے۔ اور صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث سے یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرک کے بدلہ میں دو مسلمان چھڑائے جو کہ مکہ میں قید تھے۔ (فتح القدر، ج ۵، ص ۳۶۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ) میں کہتا ہوں کہ ہم اسی بناء پر یہ کہتے ہیں کہ فقہ کے متون میں جو یہ لکھا ہے کہ مالی فدیہ کے بدلہ میں مشرکین کو چھوڑنا حرام ہے اس سے مراد یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو مال کی ضرورت نہ ہو لیکن جب ان کو مال کی ضرورت ہو تو مشرکین کو مالی فدیہ کے بدلہ میں چھوڑنا جائز ہے۔ (جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر میں مالی فدیہ کے بدلہ میں کافر قیدیوں کو چھوڑ دیا تھا) اسی طرح مسلمان قیدیوں کے بدلہ میں کافر قیدیوں کو چھوڑنا بھی جائز ہے۔

(رد المحتار ج ۳، ص ۲۲۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ)

علامہ شامی نے السیر الکبیر کا جو حوالہ دیا ہے اس کی شرح میں شمس الائمہ الرخصی الحنفی متوفی ۷۸۳ھ لکھتے ہیں: امام محمد شیبانی متوفی ۱۸۹ھ نے فرمایا مشرکین قیدیوں کے بدلہ میں ان مسلمان قیدیوں کو چھڑانا جائز ہے جو کفار کی قید میں ہیں خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ اس کی شرح میں علامہ سرخسی فرماتے ہیں:

یہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کا قول ہے اور یہی امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ ظاہر روایت ہے۔ اور ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ قیدی کے بدلہ میں قیدی کو چھڑانا جائز نہیں ہے۔ ظاہر الروایہ کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان قیدیوں کو مشرکین کی قید سے چھڑانا واجب ہے اور یہ مطلوب صرف ان کے قیدی چھوڑنے سے حاصل ہو گا اور یہ مشرکین کے قتل کو ترک کرنے سے زیادہ برا نہیں ہے اور مسلمانوں کی منفعت کے لیے یہ جائز ہے۔ کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ امام کے لیے مشرک قیدیوں کو غلام بنانا جائز ہے اور مسلمان قیدیوں کو کافروں کی قید سے چھڑانے کا نفع ان کے قیدیوں کو غلام بنانے سے زیادہ ہے اور ہمارے اس قول کی تائید حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو عقیل کے ایک مشرک قیدی کے بدلہ میں دو مسلمان قیدیوں کو چھڑایا۔

(شرح السیر الکبیر ج ۲، ص ۱۵۸، مطبوعہ المکتب للتحریک الثوری الاسلامیہ افغانستان)

جنگی قیدیوں کو فدیہ کے بدلہ میں آزاد کرنے کے متعلق احادیث

علامہ ابن ہمام اور علامہ سرخسی نے مشرک قیدی کے بدلہ میں مسلمان قیدی کے چھڑانے کی جن حدیثوں کا ذکر کیا ہے وہ یہ

ہیں:

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قبیلہ بنو تھیف بنو عقیل کا حلیف تھا۔ تھیف نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے دو شخصوں کو قید کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نے بنو عقیل کے ایک شخص کو گرفتار کر لیا اور اس کے ساتھ عنباء اونٹنی کو بھی پکڑ لیا۔ رسول اللہ ﷺ اس شخص کے پاس گئے در آنحالیکہ وہ شخص بندھا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا اے محمد! (ﷺ) آپ نے اس سے فرمایا کیا بات ہے؟ اس نے کہا حاج کی اونٹنیوں پر سبقت کرنے والی اونٹنی کیوں پکڑی گئی؟ (یعنی عنباء) اور آپ نے مجھے کس جرم میں پکڑا ہے؟ آپ نے اس کی بات کو عظیم گردانتے ہوئے فرمایا میں نے تم کو تمہارے حلیف تھیف

کے بدلہ میں پکڑا ہے۔ پھر آپ چلے گئے، اس نے پکار کر کہا یا محمد (ﷺ) رسول اللہ ﷺ مہربان اور رقیق القلب تھے آپ اس کے پاس لوٹ آئے اور پوچھا کیا بات ہے؟ اس نے کہا میں مسلمان ہوں۔ آپ نے فرمایا اگر تو یہ اس وقت کہتا جب تجھے اپنے معاملہ کا اختیار تھا (یعنی گرفتار ہونے سے پہلے) تو تو مکمل طور پر کامیاب ہوتا۔ آپ پھر چل دیے اس نے پھر آواز دی اور کہا یا محمد (ﷺ) آپ نے فرمایا کیا بات ہے؟ اس نے کہا میں بھوکا ہوں مجھے کچھ کھلائیے اور میں پیاسا ہوں مجھے کچھ پلائیے۔ (آپ نے اس کو کوئی چیز دے کر فرمایا) یہ لو اپنی حاجت پوری کرو۔ پھر اس کو ان دو شخصوں کے عوض چھوڑ دیا گیا۔ (جن کو تھیفت نے گرفتار کیا تھا)

(صحیح مسلم انذرا ۸، (۱۶۴۱) ۳۱۶۷ سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۳۳۱۶، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۷۵، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۳۱۶۷، مسند حمیدی رقم الحدیث: ۸۲۹، مسند احمد ج ۳، ص ۲۳۰، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۸۵۹، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۹۳۹۵، المستقی رقم الحدیث: ۹۳۳، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹، ص ۷۲، دلائل النبوة ج ۳، ص ۱۸۸، المعجم الکبیر ج ۱۸، ص ۱۹۰، رقم الحدیث: ۴۵۳)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے قبیلہ فزارہ کے ساتھ جہاد کیا۔ اس جہاد میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہمارا امیر بنایا تھا۔ جب ہمارے اور پانی کے درمیان کچھ دیر کی مسافت رہ گئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ہمیں حکم دیا ہم رات کے آخری حصہ میں اترے۔ پھر ہر طرف سے حملہ کا حکم دیا اور (ان کے) پانی پر پہنچے اور اس جگہ جس کو قتل کرنا تھا اس کو قتل کیا اور قید کیا۔ میں کفار کے ایک گروہ کو دیکھ رہا تھا جس میں کفار کے بچے اور عورتیں تھیں۔ مجھے یہ خطرہ ہوا کہ وہ کہیں مجھ سے پہلے پہاڑ تک نہ پہنچ جائیں۔ میں نے ان کے اور پہاڑ کے درمیان ایک تیر مارا جب انہوں نے تیر کو دیکھا تو وہ سب نھر گئے۔ میں ان سب کو گھیر کر لے آیا۔ ان میں بنو فزارہ کی ایک عورت تھی جس نے چمڑے کی کھال کو منڈھ رکھا تھا اور اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی جو عرب کی حسین ترین دوشیزہ تھی۔ میں ان سب کو پکڑ کر حضرت ابوبکر کے پاس لے آیا، حضرت ابوبکر نے وہ لڑکی مجھ کو انعام میں دے دی۔ ہم مدینہ میں پہنچے۔ ابھی میں نے اس لڑکی کے کپڑے اتارے بھی نہ تھے کہ میری رسول اللہ ﷺ سے بازار میں ملاقات ہوئی۔ آپ نے فرمایا اے سلمہ! یہ لڑکی مجھے بہہ کر دو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! خدا کی قسم یہ لڑکی مجھے بہت پسند ہے اور میں نے ابھی تک اس کا لباس نہیں اتارا ہے، اگلے دن پھر میری رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی آپ نے مجھ سے فرمایا اے سلمہ! یہ لڑکی مجھے بہہ کر دو تمہارا باپ بہت اچھا تھا۔ میں نے کہا یا رسول اللہ! یہ آپ کی ہے۔ خدا کی قسم! میں نے اس کا لباس تک نہیں اتارا۔ رسول اللہ ﷺ نے وہ لڑکی اہل مکہ کو بھیج دی اور اس کے بدلہ میں مکہ کے کئی مسلمان قیدیوں کو چھڑا لیا۔

(صحیح مسلم الجہاد ۳۶، (۱۷۵۵) ۳۳۹۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۹۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۸۳۶، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۸۶۰، مسند احمد ج ۳، ص ۲۳۶، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۶۲۳، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹، ص ۱۲۹)

نبی ﷺ نے مشرک قیدی کو بلا معاوضہ احساناً بھی آزاد فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ سواروں کو نجد کی طرف بھیجا۔ وہ لوگ بنو حنیفہ کے ایک شخص کو گرفتار کر کے لائے۔ اس کا نام ثمامہ بن اثال تھا اور وہ اہل یمامہ کا سردار تھا۔ انہوں نے اس کو مسجد کے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا اے ثمامہ! تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اس نے کہا اے محمد (ﷺ) خیر ہے۔ اگر آپ قتل کریں گے تو ایک طاقتور شخص کو قتل کریں گے اور اگر آپ احسان کریں

گے تو ایک شکر گزار شخص پر احسان کریں گے اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو آپ سوال کیجئے آپ جو مال چاہیں گے آپ کو مل جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن پھر آپ نے فرمایا اے ثمامہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اس نے کہا وہی جو میں آپ سے کہہ چکا ہوں، اگر آپ احسان کریں گے تو ایک شکر گزار پر احسان کریں گے اور اگر آپ قتل کریں گے تو ایک طاقتور شخص کو قتل کریں گے اور اگر آپ مال چاہتے ہیں تو آپ سوال کیجئے آپ جو مال چاہیں گے وہ آپ کو مل جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ پھر اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ حتیٰ کہ اگلے روز پھر آپ نے فرمایا اے ثمامہ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اس نے کہا میری وہی رائے ہے جو میں آپ سے کہہ چکا ہوں، اگر آپ احسان کریں گے تو ایک شکر گزار شخص پر احسان کریں گے اور اگر آپ قتل کریں گے تو ایک طاقتور شخص کو قتل کریں گے اور اگر آپ مال کا ارادہ کرتے ہیں تو آپ سوال کریں آپ جو مال چاہیں گے وہ آپ کو دیا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ثمامہ کو کھول دو۔ وہ مسجد کے قریب ایک کھجور کے درخت کے پاس گیا اور غسل کر کے مسجد میں داخل ہو گیا اور کہنے لگا اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبده ورسوله۔

اے محمد (ﷺ) بخدا پہلے میرے نزدیک روئے زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ ناپسندیدہ کوئی چہرہ نہیں تھا اور اب آپ کا چہرہ انور مجھے تمام چہروں سے زیادہ محبوب ہے۔ بخدا پہلے میرے نزدیک آپ کے دین سے زیادہ کوئی دین ناپسندیدہ نہ تھا اور اب مجھے آپ کا دین تمام دینوں سے زیادہ محبوب ہے۔ بخدا پہلے میرے نزدیک آپ کے شہر سے زیادہ کوئی شہر ناپسندیدہ نہ تھا اور اب آپ کا شہر مجھے تمام شہروں سے زیادہ محبوب ہے۔ آپ کے سواروں نے مجھے گرفتار کر لیا اور آنحضرت ﷺ میرا ارادہ عمرہ کرنے کا تھا، اب آپ کا کیا حکم ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بشارت دی اور عمرہ کرنے کا حکم دیا۔ جب وہ مکہ پہنچے تو کسی شخص نے ان سے کہا کیا تم نے دین بدل لیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، لیکن میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آیا ہوں اور سن لو، خدا کی قسم! اب تمہارے پاس اس وقت تک یمامہ سے گندم کا کوئی دانہ نہیں پہنچے گا جب تک رسول اللہ ﷺ اس کی اجازت نہ دیں۔

(صحیح مسلم الجہاد، ۵۹، (۱۷۶۳) صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۳۷۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۷۹، سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۷۹۱)

نیز رسول اللہ ﷺ نے جنگ بدر کے کئی قیدیوں کو احساناً چھوڑ دیا۔ ان میں سے ایک قیدی ابو العاص بن ابی الریح تھے۔ چنانچہ امام ابن اسحاق اور امام ابوداؤد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ جب اہل مکہ نے اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے فدیہ بھیجا تو رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے ابو العاص کو چھڑانے کے لیے فدیہ بھیجا اور اس فدیہ میں وہ ہار بھی تھا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے حضرت سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو جینز میں رخصتی کے وقت دیا تھا۔ جب نبی ﷺ نے اس ہار کو دیکھا تو آپ پر رقت طاری ہو گئی اور آپ نے صحابہ سے فرمایا اگر تم مناسب خیال کرو تو اپنے قیدی کو زینب کی خاطر چھوڑ دو اور زینب کا دیا ہوا فدیہ واپس کر دو۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ اور اس میں یہ بھی ہے کہ آپ نے ابو العاص سے وعدہ لیا کہ وہ حضرت زینب کو آپ کے پاس روانہ کر دیں سو انہوں نے حضرت زینب کو آپ کے پاس روانہ کر دیا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۹۲، المستدرک ج ۳، ص ۲۳، مسند احمد ج ۶، ص ۷۶، السیرۃ النبویہ لابن ہشام ج ۲، ص ۲۶۳، مطبوعہ

دار احیاء التراث العربی بیروت)

امام ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے کہ نبی ﷺ نے مطلب بن حنطب کو بھی بلا عوض احسان کر کے چھوڑ دیا۔ مطلب بن حنطب کو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے گرفتار کیا تھا آپ نے اس کو رہا کر دیا۔ اسی طرح ایک شخص کی کئی بیٹیاں تھیں اور

وہ محتاج تھا آپ نے اس کو بھی بلا عوض چھوڑ دیا۔ اس کا نام ابو عزہ الجحلی تھا۔ آپ نے اس سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ آپ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کرے گا اس نے رسول اللہ ﷺ کی مدح میں کئی اشعار کہے۔ پھر وہ جنگ احد میں مشرکین کے ساتھ گرفتار ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو قتل کرنے کا حکم دیا۔

(السیرۃ النبویہ لابن ہشام ج ۲، ص ۲۷۱-۲۷۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت)

اور سب سے قوی دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت جیسر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے متعلق فرمایا:

اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور مجھ سے ان بدبو زدہ (بدر کے قیدیوں) کے متعلق سفارش کرتا تو میں ان سب کو چھوڑ دیتا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۰۲۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۸۹، مسند احمد ج ۲، ص ۸۰، مسند ابو یعلیٰ رقم الحدیث:

۷۴۱۶، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹، ص ۱۷، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۵۰۸، ۱۵۰۷، ۱۵۰۶)

جنگی قیدیوں کو فدیہ کے بدلہ میں آزاد کرنے پر صاحب ہدایہ کے اعتراض کا جواب

علامہ کمال الدین ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:

مصنف (صاحب ہدایہ) نے یہ کہا ہے کہ ان تمام واقعات کا حکم سورہ توبہ کی آیت اقتلوا المشرکین "مشرکین کو

قتل کر دو" سے منسوخ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بدر کے یہ واقعات سورہ توبہ نازل ہونے سے پہلے کے ہیں لیکن مصنف کا یہ جواب

اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اقتلوا المشرکین کو قتل کر دو کا یہ حکم جنگی قیدیوں کے ماسوا کے لیے ہے اور اس کی

دلیل یہ ہے کہ جنگی قیدیوں کو غلام بنانا بالاجماع جائز ہے۔ اگر ان کو قتل کرنا ضروری ہوتا تو ان کو غلام بنانا جائز نہ ہوتا۔ اس سے

واضح ہو گیا کہ مشرکین کو قتل کرنے کا حکم جنگی قیدیوں کے ماسوا میں ہے اور یہ کہ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر اور بلا معاوضہ احساناً

چھوڑنے کے تمام واقعات غیر منسوخ ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی آیت فاما من بعد واما فداء، جنگی قیدیوں کو بلا معاوضہ

چھوڑ دیا نہ لے کر چھوڑ دیا بھی غیر منسوخ اور محکم ہے۔ (فتح القدر ج ۵، ص ۳۶۳، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

کیا موجودہ دور میں بھی جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانا جائز ہے؟

اس بحث سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانا لازمی اور حتمی حکم نہیں ہے۔ بلکہ یہ امیر کی رائے

اور صواب دید پر موقوف ہے اور اس کی اجازت اس لیے دی گئی تھی کہ پہلے دنیا میں عام جنگی چلن یہی تھا کہ فاتح قوم مفتوح قوم

کے جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنا لیتی تھی۔ اس لیے اسلام نے بھی یہ اجازت دی کہ اگر کوئی قوم مسلمانوں کے جنگی قیدیوں کو

لونڈی اور غلام بناتی ہے تو مسلمان بھی اس قوم کے جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنالیں۔ کیونکہ:

وَجَزَاءٌ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (الشوری: ۴۰) اور برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی ہے۔

لیکن اب جبکہ دنیا سے غلامی کی لعنت ختم ہو چکی ہے اور کوئی قوم دوسری قوم کے جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام نہیں بناتی

تو اب کسی مفتوح قوم کے جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لیے اب جنگی قیدیوں کو فاما منسا

بعد واما فداء کے حکم پر عمل کرتے ہوئے فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ کے احساناً اور امتناناً چھوڑ دینا چاہیے اور چونکہ اسلام

انسانیت کی اعلیٰ اقدار کا داعی ہے اور عدل و احسان کا نقیب ہے اور حسن عمل اور کار خیر میں کافروں سے آگے ہے اس لیے یہ کہنا

بعید نہیں ہے کہ جب فریق مخالف جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانا روا نہیں رکھتا تو مسلمانوں کے لیے بدرجہ اولیٰ ان کے جنگی

قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانا جائز نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں پہلے سے بنائے لونڈیوں اور غلاموں کے متعلق احکام تو

بیان کیے گئے ہیں لیکن جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کی کہیں ہدایت نہیں دی۔ اس کے برخلاف ان کو فدیہ لے کر یا بلا فدیہ رہا کرنے کی ہدایت دی ہے اور ہر چند کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت کے جنگی چلن کے مطابق جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بھی بنایا تھا لیکن آپ نے بدر کے تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر کے حسن عمل کی مثال قائم کی بعض کو فدیہ لے کر رہا کیا اور بعض کو بلا فدیہ رہا کیا اور ”فاما من بعد واما فداء“ پر پورا پورا عمل کیا۔ بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کا جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانا رخصت پر عمل ہے اور ان کو فدیہ لے کر یا بلا فدیہ رہا کر دینا عزیمت پر عمل ہے۔ جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے:

وَجَزَاءٌ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةً مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا
وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (الشوری: ۴۰)

اور برائی کا بدلہ اس کی مثل برائی ہے پھر جو شخص معاف کر دے اور (برائی کی) اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ (کرم پر) ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنا کر جزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا پر عمل کیا اور آزاد کر کے فمّن عفا واصلح پر عمل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابتداً جنگی قیدیوں کو رہا کرنے سے انکار کیا تھا اور بدر کے قیدیوں کو قتل کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن بالآخر نور رسالت ان پر غالب آ گیا اور سواد عراق کے جنگی قیدیوں کو انہوں نے قتل کیا نہ لونڈی اور غلام بنایا بلکہ ان سے جزیہ لے کر ان کو اہل ذمہ قرار دیا اور اس واقعہ سے فقہاء اسلام نے یہ استدلال کیا ہے کہ جنگی قیدیوں سے جزیہ لے کر ان کو اہل ذمہ بنانا جائز ہے۔

علامہ کمال الدین ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:

اور اگر مسلمانوں کا امیر چاہے تو جنگی قیدیوں کو آزاد چھوڑ دے اور انہیں ذمی بنا دے جیسا کہ حضرت عمر نے سواد عراق کے جنگی قیدیوں کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔ (فتح القدر ج ۵، ص ۲۶۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

علامہ جلال الدین خوارزمی حنفی لکھتے ہیں:

اس میں حضرت عمر کے اس فعل کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے سواد عراق والوں سے کیا تھا۔ اگر اس پر یہ اعتراض ہو کہ قتل کو ترک کرنے کا اختیار ثابت نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ اختیار اس آیت کے خلاف ہے فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم ”تم مشرکین کو جہاں بھی پاؤ قتل کر دو“ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت کے عموم سے بعض افراد مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ متامن، اہل ذمہ اور عورتوں وغیرہ کو قتل نہیں کیا جاتا۔ لہذا امتناع فیہ (یعنی جنگی قیدی) بھی حضرت عمر کے اس فعل کے سبب اس آیت کے اس عموم سے خاص کیے جائیں گے۔

(۱) کلفایہ مع فتح القدر ج ۵، ص ۲۱۹، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر)

ان دلائل سے یہ ثابت ہو گیا کہ ابتداء اسلام میں جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانا اس زمانہ کے مخصوص حالات کی بناء پر معمول تھا اور بعد میں اس کو ترک کر دیا گیا اور اب جبکہ تمام دنیا میں جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کا طریقہ متروک ہو چکا ہے بلکہ سرے سے غلامی کی لعنت ختم ہو چکی ہے اور انسان کو انسان کا غلام بنانا اب معیوب سمجھا جاتا ہے، تو اب جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کے جواز کو اسلام کے ساتھ نتھی کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اسلام نے جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کا کہیں حکم نہیں دیا۔ اس کے جواز کو فقہاء نے بعض جزوی واقعات سے مستنبط کیا ہے اور یہ واقعات اخبار احاد سے ثابت ہیں جو زیادہ سے زیادہ ظہیرت کا فائدہ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر یا بلا فدیہ رہا کرنا قرآن مجید کا حکم قطعی

ہے، اور بعض جزوی اور ظنی واقعات کی بناء پر قرآن مجید کی نص قطعی کو ترک کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا عقل اور اصول کے خلاف ہے۔ جبکہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگی قیدیوں کو نندیہ لے کر یا بلاندیہ رہا کیا ہے تو انہی احادیث پر عمل کرنا چاہیے جو قرآن مجید کے صریح حکم کے مطابق ہیں، اور جو احادیث اس حکم کے خلاف ہیں ان کی توجیہ ہم بیان کر چکے ہیں اور اب جبکہ جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کی وجہ باقی نہیں رہی اس لیے اب اس کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔ قرآن مجید میں جنگی قیدیوں کے بارے میں صرف ایک ہی حکم ہے اور وہ ہے:

فَاِذَا لَقِيْتُمْ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبِ الرِّقَابِ
حَتّٰى اِذَا اَنْخَنْتُمُْوْهُمْ فَشَدُّوا الوَثَاقَ فَاِمَّا
مَنْبَعِدُوْا وَمَنْبَعِدَاۗءُ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا
ذٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللّٰهُ لَانتَصَرْنَا مِنْهُمْ وَلٰكِنْ
لِّيَبْلُوَ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ (محمد: ۴)

سوجب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو تو (تمہارا پہلا کام) ان کی گردنیں مارنا ہے، حتیٰ کہ جب تم ان کا خون بہا چکو تو پھر ان کو مضبوطی سے باندھ لو، (اس کے بعد تمہیں اختیار ہے) خواہ محض ان پر احسان کر کے انہیں رہا کر دیا ان سے نندیہ لے کر ان کو آزاد کر دو، تا آنکہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے، یہی (اللہ کا حکم) ہے اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی کافروں سے بدلہ لے لیتا لیکن (اس طریقہ کی وجہ یہ ہے کہ) وہ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے آزمائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر (دشمن) صلح کی طرف مائل ہو تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہوں اور اللہ پر توکل کریں، بے شک وہ بہت سنے والا ہے حد جاننے والا ہے (الانفال: ۶۱)

اس سے پہلی آیت میں دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے اسلحہ مہیا کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو تو صلح قبول کر لو۔

دشمن سے صلح کرنے کا حکم آیا منسوخ ہے یا نہیں

اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے یا نہیں۔ امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

قداہ نے کہا یہ آیت ان آیتوں سے منسوخ ہے:

اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وُجِدُوْا تَمُوْهُمُ

تم مشرکین کو قتل کر دو انہیں جہاں بھی پاؤ۔

(التوبہ: ۵)

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ
الْآخِرِ (التوبہ: ۲۹)

جو لوگ اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان سے قتال کرو۔

اور بعض علماء نے یہ کہا کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے لیکن یہ آیت صلح کے حکم کو مستغن ہے جبکہ صلح میں مسلمانوں کی بہتری ہو۔ اور جب مسلمانوں کے امیر کی رائے یہ ہو کہ ان سے صلح کی جائے تو پورے ایک سال صلح نہیں کرنی چاہیے۔ اور اگر مشرکین کی قوت زیادہ ہو تو دس سال تک بھی ان سے صلح کرنا جائز ہے۔ اور اس مدت سے زیادہ تک صلح کرنی جائز نہیں ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کی اقتداء ہے کیونکہ آپ نے ان سے دس سال کی مدت تک کے لیے صلح کی تھی، پھر انہوں نے مدت پوری ہونے سے پہلے عہد شکنی کی۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۵۰۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

دشمن سے صلح کرنے یا صلح نہ کرنے کے الگ الگ محمل

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ کیا ہے کہ اہل جزیہ سے جزیہ قبول کر لیا جائے۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں اصحاب رسول اللہ ﷺ نے کفار سے صلح کی اور ان کے بعد بہت سے ائمہ نے بلاد عجم کے کفار سے صلح کی۔ ان سے جزیہ قبول کیا اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ حالانکہ وہ ان کو جڑ سے اکھاڑنے پر قادر تھے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بہت سے کافر شہروں سے کچھ مال کی ادائیگی پر صلح کی۔ ان میں سے خیبر بھی ہے۔ آپ نے خیبر کو فتح کرنے کے بعد وہ زمین ان لوگوں کے حوالہ اس شرط پر کر دی کہ وہ اس زمین کی پیداوار کا نصف آپ کو ادا کریں گے۔ مجاہد نے کہا اس آیت سے بنو قریظہ مراد ہیں۔ کیونکہ ان سے جزیہ قبول کیا جاتا تھا اور مشرکین سے کچھ قبول نہیں کیا جاتا (جزیہ صرف اہل کتاب سے قبول کیا جاتا ہے) ابن زید نے کہا اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اگر دشمن آپ کو صلح کی دعوت دے تو آپ اس کو قبول کر لیں اور یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ اگر صلح کرنے میں مسلمانوں کی مصلحت ہو اور منفعت ہو یا وہ صلح کے ذریعہ کسی ضرر کو دور کر سکتے ہوں یا وہ صلح کرنے کے محتاج ہوں تو اگر وہ خود ابتداء صلح کر لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر سے چند شرائط پر صلح کی اور بعد میں خود انہوں نے ان شرائط کی خلاف ورزی کی اور نبی ﷺ نے انصری، اکیدر، دومہ اور اہل نجران سے صلح کی اور دس سال کی مدت کے لیے قریش سے صلح کی پھر قریش نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی اور آپ کے بعد خلفاء راشدین اور صحابہ صلح کرتے رہے۔

اور اگر مسلمانوں کے پاس قوت اور بہت بڑا لشکر ہو اور وہ غالب ہوں تو پھر ان کو صلح نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلَامِ وَأَنْتُمْ
الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَبْرِكُمْ أَعْمَالَكُمْ
(محمد: ۳۵)

درخواست نہ کرو اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ ہرگز تمہارے اعمال کو ضائع نہیں کرے گا۔

جنگ احزاب کے دن عینہ بن حن فزاری اور حارث بن عوف المری آپ کے پاس آئے اور آپ نے فرمایا تم اپنے ساتھ غطفان کو لے کر چلے جاؤ اور قریش کو ان کے منصوبہ میں رسوا کر دو ہم تم کو مدینہ کی تمہاری کھجوریں دیں گے اور تم اپنی قوم کے ساتھ یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ صرف بات چیت تھی ابھی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ یہ اس پر راضی ہیں تو پھر آپ نے حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سعد بن عبادہ سے اس معاملہ میں مشورہ کیا، ان دونوں نے کہا یا رسول اللہ! اگر آپ کو یہ معاہدہ پسند ہو تو ہم اس کو قبول کر لیتے ہیں یا اگر آپ کو اللہ نے اس کا حکم دیا ہے تو ہم اس کو قبول کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں یا آپ یہ معاہدہ صرف ہماری خاطر کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا بلکہ میں یہ معاہدہ تمہاری خاطر کر رہا ہوں کیونکہ تمام عرب جمع ہو کر تم پر حملہ آور ہو رہے ہیں، تب حضرت سعد بن معاذ نے کہا یا رسول اللہ! خدا کی قسم! ہم اور یہ لوگ پہلے مشرک تھے اور بت پرستی کرتے تھے۔ ہم اللہ کی عبادت کرتے تھے نہ اس کو پہچانتے تھے اس وقت بھی ان لوگوں نے ہم سے یہ توقع نہیں رکھی کہ وہ ہم سے مدینہ کی کوئی کھجور حاصل کر لیں گے وہ ہم سے کھجوریں خریدتے تھے یا ہم ان کو بہ طور مہمانی کھلا دیتے تھے اور اب جبکہ اللہ نے ہم کو اسلام سے عزت دی ہے اور ہم کو ہدایت دی ہے تو کیا اب ہم ان کو اپنے اموال دے دیں گے۔ خدا کی قسم! ہم ان کو تلوار کے سوا اور کچھ نہیں دیں گے حتیٰ کہ اللہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے اس فیصلہ سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم نے بہت صحیح فیصلہ کیا ہے اور عینہ اور حارث سے فرمایا تم دونوں واپس

جاؤ ہمارے پاس صرف تلوار ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جزء ۷، ص ۳۹۹-۳۹۷، ملخصاً، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمان کمزور ہوں اور دشمن غالب ہو تو وہ دشمن کو مال دے کر بھی صلح کر سکتے ہیں اور اگر صلح میں مسلمانوں کی مصلحت ہو تو وہ مال لے کر بھی صلح کر سکتے ہیں جیسا کہ سورۃ الانفال کی اس آیت کا تقاضا ہے، اور اگر مسلمان طاقتور ہوں اور ان کے پاس بہت اسلحہ اور بہت زیادہ افرادی قوت ہو تو پھر دشمن سے صلح کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ سورہ محمد کی آیت ۳۵ کا تقاضا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر وہ آپ کو دھوکا دینے کا ارادہ کریں تو بے شک آپ کو اللہ کافی ہے، وہی ہے جس نے اپنی مدد اور مسلمانوں کی جماعت سے آپ کی تائید فرمائی (الانفال: ۶۴)

دشمن کی نیت فاسد ہونے کے باوجود صلح کا جواز

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دشمن کی صلح کی پیشکش کو قبول کرنے کا حکم دیا تھا۔ (الانفال: ۶۱) اور اس آیت میں صلح کے احکام میں سے یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر وہ آپ کو دھوکا دینے کے لیے صلح کی پیشکش کریں تب بھی آپ بہ وقت ضرورت ان کی اس پیشکش کو قبول کر لیں۔ کیونکہ احکام کا مدار ظاہر پر ہوتا ہے اور صلح ایمان سے بڑی چیز تو نہیں ہے اور جب کوئی ایمان کا اظہار کرے خواہ دل میں کفر ہو تو اس کو قبول کر لیا جاتا ہے تو پھر صلح کو بھی قبول کر لینا چاہیے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کیا اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اگر آپ کو دشمن سے خیانت کا خطرہ ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ آیت اس پر محمول ہے جب آپ کو قوی قرآن اور علامات سے یہ معلوم اور ظاہر ہو جائے کہ وہ عہد کی خلاف ورزی کر رہے ہیں تو ان کا عہد ان کے منہ پر مار دیں، اور یہ آیت اس پر محمول ہے کہ ان کی خیانت صرف ان کے دل میں ہے اور ان کے عمل سے کوئی خیانت کی علامت ظاہر نہیں ہوئی اور یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ شر اور فساد کا ارادہ رکھتے ہیں اور فتنہ کو بھڑکانا چاہتے ہیں، بلکہ ان کے احوال سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ وہ صلح کی درخواست پر ثابت قدم ہیں اور لڑائی کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو ایسی صورت میں آپ اللہ پر توکل کر کے ان سے صلح کر لیں اور اللہ کی مدد آپ کے لیے کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اس نے مسلمانوں کے درمیان الفت پیدا کی، اگر آپ تمام روئے زمین کی چیزوں کو بھی خرچ کر دیتے تو (از خود) ان کے درمیان الفت پیدا نہ کر سکتے، لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت پیدا کی، بے شک وہ بہت غلبہ والا بڑی حکمت والا ہے (الانفال: ۶۳)

اسلام کی نعمت سے عرب کے مخالف دھڑوں کا باہم شیر و شکر ہو جانا

اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اس قوم کی طرف بھیجا جس میں تعصب، حسیت اور جوش انتقام بہت زیادہ تھا۔ حتیٰ کہ اگر ایک قبیلہ کا شخص دوسرے قبیلہ کے شخص کو تھپڑ بھی مار دیتا تو جب تک وہ اس شخص سے بدلہ نہیں لے لیتا تھا، اس کو چین نہیں آتا تھا۔ پھر اسلام لانے کے بعد ان کی کلیا اس طرح پلٹ گئی کہ اسلام کی خاطر ایک شخص اپنے باپ، بیٹے اور بھائی کو قتل کر دیتا تھا حتیٰ کہ جنگ بدر میں جب عتبہ بن ربیعہ نے جنگ کے لیے لکارا تو اس کے بیٹے ابو حذیفہ بن عتبہ اپنے باپ کے خلاف تلوار نکال کر مقابلہ کے لیے بڑھے لیکن نبی ﷺ نے ان کو بٹھادیا (المغازی للواتدی، ج ۱، ص ۷۰) جنگ بدر میں حضرت ابو حذیفہ کا باپ عتبہ اور چچا شیبہ اور بھائی ولید بن عتبہ تینوں جنگ کے آغاز میں ہی مارے گئے لیکن حضرت ابو حذیفہ کے صبر اور استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ اسی طرح جذبہ جہاد سے سرشار کفار کے خلاف لڑتے رہے۔ عبدالرحمن بن ابی بکر جنگ بدر میں کافروں کی طرف سے

لڑنے کے لیے آئے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کو مقابلہ کے لیے لاکار اور کہا میں عبدالرحمن بن عتیق ہوں مجھ سے کون مقابلہ کرے گا تو حضرت ابو بکر تلوار میان سے نکال کر آگے بڑھے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر سے فرمایا اپنی تلوار کو میان میں رکھو اور اپنی جان سے ہمیں نفع پہنچاؤ۔ (المغازی للواتدی، ج ۱، ص ۲۵، الاستیعاب، ج ۲، ص ۳۶۸، رقم ۱۳۰۲) اور یہ سب لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر متفق ہو گئے اور سب آپ کے اعوان اور انصار بن گئے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد اوس اور خزرج ہیں ان کے درمیان شدید خصومت تھی اور ہمیشہ لڑائی رہتی تھی۔ اسلام لانے کے بعد ان کے دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف کینہ اور بغض جاتا رہا اور اس کی جگہ الفت اور محبت نے لے لی۔ اور اس شدید عداوت کو قومی محبت سے بدل دینا اور پرانی دشمنیوں کو دوستیوں سے بدل دینا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قدرت میں نہ تھا اور یہ سیدنا محمد ﷺ کی نبوت پر ایک مستحکم دلیل اور آپ کے صدق پر ایک ظاہر معجزہ تھا۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اسلام قبول کرنے سے قبل اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع سے پہلے عرب قوم میں دائمی عداوت اور جنگ تھی وہ ایک دوسرے کو قتل کرتے تھے اور ایک دوسرے کا مال لوٹ لیتے تھے۔ لیکن جب سے وہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے ان کی باہمی عداوت اور دشمنی جاتی رہی اور دلوں کی سختی اور قساوت زائل ہو گئی اور اس کی جگہ ایک دوسرے سے شدید محبت اور الفت ہو گئی اور وہ ایک دوسرے کے معاون اور ہمدرد بن گئے۔

عارضی اور فانی محبت اور دائمی اور باقی محبت کے مبادی اور اسباب

تحقیق یہ ہے کہ محبت خیر اور کمال سے ہوتی ہے اور نفرت شر اور نقصان سے ہوتی ہے۔ پھر خیر اور کمال مادی اور جسمانی چیزوں میں بھی ہوتا ہے اور چونکہ مادی اور جسمانی چیزیں حادث اور تغیر پذیر ہوتی ہیں اس لیے مادی اور جسمانی چیزوں کے کمال اور ان کے حسن و جمال اور ان کی منفعت اور فائدہ کی وجہ سے جو محبت ہو تو جب ان چیزوں کا حسن اور کمال جاتا رہے گا اور ان کی افادیت زائل ہو جائے گی تو ان کی محبت بھی زائل ہو جائے گی۔ جو شخص کسی شخص سے اس کے حسن و جمال یا مال و دولت کی وجہ سے محبت کرتا ہے تو جب اس کا حسن و جمال زائل ہو جائے گا یا اس کا مال ختم ہو جائے گا تو اس سے محبت بھی زائل ہو جائے گی۔

اس طرح خیر اور کمال مجرد اور روحانی چیزوں میں بھی ہوتا ہے جیسے روحانیت، سعادت، علم و حکمت، عبادت و ریاضت، تقویٰ اور پرہیزگاری، رسول اللہ ﷺ کی صفات مبارکہ، اللہ عزوجل کی صفات قدسیہ، اس کا قرب اور اس کی توجہ، یہ دائمی اور سرمدی کمالات ہیں تو جو شخص ان کمالات کی وجہ سے محبت کرتا ہے تو یہ کمال دائمی ہے اس لیے یہ محبت بھی دائمی ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مادی کمال کی وجہ سے محبت عارضی اور فانی ہوتی ہے اور روحانی کمال کی وجہ سے محبت باقی اور دائمی ہوتی ہے، لوگ دنیا داروں سے جو محبت کرتے ہیں وہ ان کی دنیا زائل ہونے یا ان کے مرجانے کے بعد زائل ہو جاتی ہے اور جو لوگ اولیاء اللہ سے ان کے روحانی کمال کی وجہ سے محبت کرتے ہیں وہ محبت ان کے وصال کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ لاہور میں بہت وسیع اور عریض جہانگیر کا مقبرہ بھی ہے اور حضرت علی ہجویری رحمہ اللہ کا مزار پر انوار بھی ہے۔ جہانگیر کا مقبرہ ویران پڑا رہتا ہے اور حضرت ہجویری کے مزار پر دن رات زائرین اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے والوں کا جوم رہتا ہے۔ قرآن مجید نے اس طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے:

الْأَخِلَاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا سَوَاءٌ أَلَمُوا أَمْ لَمْ يَلَمُوا ۚ سَوَاءٌ لَّهُمْ فِي عِندِ رَبِّكَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (الزحرف: ۶۷)

قیامت کے دن گھرے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے ماسوا مستقین کے۔

صحابہ کرام کی باہمی محبت کا سبب

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب دنیاوی کمال اور خیر کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے سو یہ محبت جلد زائل ہو گئی اور جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت دی اور ان کو اللہ کی عبادت کا حکم دیا اور ان کو دنیا کے بجائے آخرت کی طرف متوجہ کیا اور جب ان کا مطلوب اخروی سعادت ہو گئی تو ان کے دلوں کی سختی جاتی رہی اور وہ سب ایک دوسرے کے محب اور معاون ہو گئے اور یہ محبت دائمی ہے اور یہ اللہ ہی ہے جس نے ان کے دلوں سے مادی چیزوں کی محبت کو نکال کر اس کی جگہ اخروی سعادت کی محبت پیدا کر دی اور عارضی محبت کو دائمی محبت سے بدل دیا، بے شک وہ بہت غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے نبی آپ کو اللہ کافی ہے اور آپ کی اتباع کرنے والے مومنین (الانفال: ۶۳)

حضرت عمر جب اسلام لائے تو مسلمانوں کی کتنی تعداد تھی؟

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جب کفار آپ کو دھوکا دینے کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد فرمائے گا اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مطلقاً آپ کی مدد کا وعدہ فرمایا ہے یعنی وہ ہر حال میں آپ کی مدد فرمائے گا اور آپ کو اللہ کافی ہے۔ آپ دین اور دنیا کی ہر ضرورت میں صرف اس پر نظر رکھیں اور آپ کے لیے وہ مومنین کافی ہیں جنہوں نے آپ کی اتباع کی ہے۔ یہ آیت غزوہ بدر میں جنگ سے پہلے نازل ہوئی ہے اور مومنین سے مراد انصار ہیں۔ لیکن درج ذیل روایت اس کے خلاف ہے، تاہم یہ روایت شدید ضعیف ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے ساتھ انا لیس مرد اور عورتیں اسلام لا چکے تھے جب حضرت عمر اسلام لائے تو چالیس کا عدد پورا ہو گیا اور یہ آیت نازل ہوئی اے نبی! آپ کو اللہ کافی ہے اور آپ کی اتباع کرنے والے مومنین۔ (الانفال: ۶۳)

(المعجم الکبیر ج ۱۲، ص ۳۷، رقم الحدیث: ۱۲۳۷۰، حافظ البیہقی نے کہا اس کی سند میں ایک راوی اسحاق بن بشر الکلبی ہے اور وہ کذاب راوی ہے۔ مجمع الزوائد ج ۷، ص ۲۸)

حافظ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی متوفی ۷۴۸ھ اسحاق بن بشر کلبی کے متعلق لکھتے ہیں:

ائمہ حدیث نے اس کو ترک کر دیا ہے۔ علی بن مدینی نے لکھا ہے کہ یہ کاذب ہے۔ امام ابن حبان نے کہا اظہار تعجب کے سوا اس کی احادیث کو لکھنا جائز نہیں ہے۔ امام الدار قطنی نے کہا یہ کذاب متروک ہے۔

(میزان الاعتدال، ج ۱، ص ۳۳۵، رقم ۱۱۱۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۶ھ)

اس حدیث میں دوسری علت یہ ہے کہ بعثت کے پانچویں سال میں جب مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اس کے بعد حضرت عمر نے اسلام قبول کیا تھا اور اس وقت مسلمانوں کی تعداد تراسی تھی جبکہ اس روایت میں ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد انا لیس تھی۔

امام ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ عمر بن الخطاب نے اسلام قبول کیا اور وہ بہت طاقتور اور دلیر شخص تھے ان کی وجہ سے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی وجہ سے مسلمان قریش پر غالب آ گئے۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہم کعبہ کے پاس نماز پڑھنے پر قادر نہ تھے حتیٰ کہ عمر بن الخطاب نے اسلام قبول کر لیا اور جب وہ مسلمان ہو گئے تو انہوں نے قریش سے جنگ کی حتیٰ کہ کعبہ کے پاس نماز پڑھی اور ہم نے بھی ان کے ساتھ نماز پڑھی اور حضرت عمر اس وقت اسلام لائے تھے جب رسول اللہ

نبیان القرآن

جلد چہارم

صحابہ کے اصحاب حبشہ کی طرف ہجرت کر چکے تھے۔

(السيرة النبوية لابن هشام ج ۱، ص ۳۸۰-۳۷۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۵ھ)

نیز امام ابن اسحاق نے کہا ہے کہ جن مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی، ان کے کم عمر بچوں کے سوا ان کی تعداد تراسی تھی۔ اور اس میں ان کو شک ہے کہ حضرت عمار بن یاسر ان میں تھے یا نہیں۔

(السيرة النبوية لابن هشام ج ۱، ص ۳۶۸-۳۶۷، مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵ھ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعثت کے کون سے سال میں اسلام لائے تھے اور اس وقت مسلمانوں کی کتنی تعداد تھی اس میں کافی اختلاف ہے۔ علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشافعی المتوفی ۹۳۲ھ لکھتے ہیں:

امام ابن اسحاق نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر حبشہ کی طرف ہجرت کے بعد اسلام لائے تھے۔ امام محمد بن سعد نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر بعثت نبوی کے چھٹے سال اسلام لائے تھے اور وہ ذوالحجہ کا مہینہ تھا اس وقت ان کی عمر ۲۶ سال تھی۔ امام ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ وہ بعثت کے پانچویں سال اسلام لائے تھے۔ امام ابو نعیم نے کہا انہوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کے تین دن بعد اسلام قبول کیا۔ امام ابن سعد نے ابن المسیب سے روایت کیا ہے کہ اس وقت چالیس مرد اور عورتیں مسلمان ہو چکے تھے۔ اسحاق بن بشر نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے اس وقت ترانوے مرد اور تیس عورتیں مسلمان ہو چکے تھے پھر حضرت عمر اسلام لائے۔ (یہ نقل صحیح نہیں ہے اسحاق بن بشر نے انتالیس مردوں اور عورتوں کی روایت کی ہے سعیدی غفرلہ) شاید یہی روایت صحیح ہو کیونکہ حبشہ میں تراسی مردوں اور عورتوں نے ہجرت کی تھی جیسا کہ امام ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ امام ابن اسحاق نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر دو ہجرتوں کے درمیان میں مسلمان ہوئے۔ پس حضرت عمر کے اسلام لانے کے بعد چالیس مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور اسحاق کذاب ہے۔ حدیث وضع کرتا ہے اور اس کی روایت ثقہ راویوں کی روایت سے متصادم ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

(سبل الہدی والرشاد ج ۲، ص ۳۷۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۳ھ)

میں کہتا ہوں کہ علامہ شامی کو یہاں مغالطہ ہوا ہے۔ یہ درست ہے کہ اسحاق بن بشر کا بلی کذاب ہے لیکن اس کی روایت وہ نہیں ہے جو انہوں نے نقل کی ہے۔ بلکہ انتالیس مسلمانوں کی تعداد کو اسی نے روایت کیا ہے جیسا کہ ہم نے المعجم الکبیر اور مجمع الزوائد کے حوالہ سے لکھا ہے۔ علامہ ابو عبد اللہ قرطبی متوفی ۶۶۸ھ نے بھی حضرت ابن عباس سے انتالیس کی روایت ذکر کر کے اس کو رد کیا ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن، جزء ۷، ص ۴۰۰) امام ابوالحسن الواحدی متوفی ۴۶۸ھ نے بھی اسحاق بن بشر سے انتالیس کی روایت ذکر کی ہے۔ (اسباب النزول، ص ۲۳۱، رقم الحدیث: ۴۸۳) خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے کہ حضرت عمر کے اسلام لانے کے بعد چالیس کا عدد پورا ہوا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ

اے نبی (کرم) مؤمنین کو قتال پر براغیختہ کیجیے، اگر تم میں سے ہیں صبر کرنے والے

مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا إِمَّا تَتَيْنَ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ

ہوں تو وہ دو سو پر غالب آ جائیں گے، اور اگر تم میں سے ایک سو صبر

مَائًا يَغْلِبُوا الْفَاقِمِينَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَإِنَّمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾

کرنے والے ہوں تو وہ ایک ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے، کیوں کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے ○

إِن خَفَّفَ اللَّهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِن يَكُنْ

اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی ہے اور اسے معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے

مِنكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا إِمَانَتَيْنِ وَإِن يَكُنْ مِنْكُمْ أَلْفٌ

ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو (کافروں) پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار (صبر کرنے

يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ

والے) ہوں تو وہ اللہ کے اذن سے دو ہزار (کافروں) پر غالب آجائیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ○ کسی نبی کے لیے

لِنَبِيِّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أُسْرَى حَتَّى يُنْجِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ

یہ لائق نہیں کہ اس کے لیے قیدی ہوں، حتیٰ کہ زمین میں (کافروں کا) اچھی طرح خون بہائے، تم اپنے لیے

عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٦٧﴾ كَوَّ

دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ (نہا سے لیے) آخرت کا ارادہ فرماتا ہے، اور اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے ○ اگر

لَا كُتِبَ مِنَ اللَّهِ سَبَقٌ لِّمَسْئَلِكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ فَكُلُوا

پہلے سے (مال غنیمت کو حلال کرنے کا) حکم لکھا ہوا نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کی وجہ سے بڑا عذاب ہوتا ○ پس تم نے

مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٦٨﴾ ع

جو مال غنیمت حاصل کیا ہے اس میں کھاؤ وہ حلال اور طیب ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا ہے حد مہربان ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے نبی (مکرم!) مومنین کو قتال پر براگینتہ کیجئے، اگر تم میں سے بیس صبر کرنے

والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو (صبر کرنے والے) ہوں تو وہ ایک ہزار کافروں

پر غالب آجائیں گے، کیونکہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے ○ اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی ہے، اور اسے معلوم ہے کہ

تم میں کمزوری ہے، پس اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو (کافروں) پر غالب آجائیں گے اور اگر تم

میں سے ایک ہزار (صبر کرنے والے) ہوں تو وہ اللہ کے اذن سے دو ہزار (کافروں) پر غالب آجائیں گے اور اللہ صبر

کرنے والوں کے ساتھ ہے ○ (الانفال: ۶۵-۶۸)

مسلمانوں پر تخفیف کر کے مشکل حکم کو منسوخ کرنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اگر تم میں سے بیس (صبر کرنے والے) ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے تو ان پر یہ فرض کر دیا گیا کہ ایک مسلمان دس کافروں کے مقابلہ سے نہ بھاگے اور بیس مسلمان دو سو کافروں کے مقابلہ سے نہ بھاگیں پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ”اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی ہے“ تو یہ فرض کر دیا گیا کہ سو مسلمان دو سو کافروں کے مقابلہ سے نہ بھاگیں۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۵۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اگر تم میں سے بیس (صبر کرنے والے) ہوں تو وہ دو سو پر غالب آجائیں گے تو یہ بات مسلمانوں پر شاق گزری۔ کیونکہ ان پر یہ فرض کر دیا گیا کہ ایک دس کے مقابلہ سے نہ بھاگے تو پھر تخفیف کا حکم آگیا کہ اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی ہے اور اسے معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سے ایک سو صبر کرنے والے ہوں تو وہ دو سو کافروں پر غالب آجائیں گے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۶۵۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت)

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ خوش دلی، ثابت قدمی، بہادری اور صبر و استقامت کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ حتیٰ کہ شروع میں مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ایک مسلمان دس اسلام کے دشمنوں سے مقابلہ کرے۔ پھر اللہ نے اس حکم میں تخفیف فرمادی اور ایک مسلمان کو دو کافروں سے لڑنے کا مکلف کیا اور دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ فرار نہ ہوں۔ اور جب ان کا دشمن ان سے دگنا ہو تو اس کے مقابلہ میں ان کا بھاگنا حرام ہے۔ یہ آیت اگرچہ صورۃً خبر ہے لیکن اس سے مراد امر ہے اور امر و جوب کا تقاضا کرتا ہے، اس آیت سے امر مراد ہونے پر یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں بعد میں تخفیف فرمادی اور تخفیف اس کام میں ہوتی ہے جس کا حکم دیا گیا ہو خبر میں تخفیف نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کو جس کام کا پہلے حکم دیا گیا تھا تخفیف کر کے اس حکم کو منسوخ کر دیا گیا۔

ابو مسلم نسخ کا قائل نہیں ہے اس نے اس آیت کی یہ تاویل کی ہے کہ اگر ان مسلمانوں میں اعلیٰ درجہ کا صبر ہو تو بیس دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر اس درجہ کا صبر نہ ہو تو پھر ایک سو مسلمان دو سو پر غالب ہوں گے، لیکن یہ تاویل درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خبر کی صورت میں ایک حکم دیا پھر بعد میں اس کے اندر تخفیف کر دی اور اگر پہلا حکم بدستور باقی رہے تو پھر تخفیف کا کوئی معنی نہیں ہوگا۔

کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کامیابی کی وجوہات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا پس اگر تم میں سے ایک ہزار صبر کرنے والے ہوں تو وہ اللہ کے اذن سے دو ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اس کا معنی یہ ہے کہ غلبہ صرف اللہ کے اذن اور ارادہ سے ہوتا ہے اور اللہ کی تائید اور نصرت اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کیونکہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے اس سے معلوم ہوا کہ کافروں اور مسلمانوں میں جنگ کے اعتبار سے فرق ہے۔ یہ فرق جنگ کے ہدف اور نصب العین کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے اور جنگ میں اعتماد اور بھروسے کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے اور جنگ کے محرک، داعی اور باعث کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے۔

نصب العین اور ہدف کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ کافر اللہ کو مانتے ہیں نہ آخرت کو اور نہ جزا اور سزا کو، ان کا جنگ سے مقصود صرف اس فانی دنیا کی لذتوں اور رنگینوں سے زیادہ سے زیادہ بہرہ مند ہونا ہوتا ہے۔ وہ چونکہ حیات بعد الموت کے قائل

نہیں ہیں، اس لیے وہ موت سے ڈرتے ہیں اور اس سے متنفر ہوتے ہیں اور زندگی پر زیادہ سے زیادہ حرص ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف مومن اللہ کو اور روز آخرت کو مانتا ہے، حیات بعد الموت اور جزا اور سزا پر اس کا ایمان ہوتا ہے، وہ موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے اگر اس کو موت آجائے تو وہ شہید ہوگا اور اس کو پھر زندگی ملے گی اور رزق دیا جائے گا، اس کو دنیا کے ساتھ لگاؤ نہیں ہوتا وہ عزم راسخ، اخلاص اور صحیح جذبہ کے ساتھ میدان جنگ میں آتا ہے اس لیے وہ کم تعداد میں ہونے کے باوجود بڑی تعداد میں کافروں کے خلاف لڑنے سے نہیں گھبراتا۔

کافر جنگ میں افرادی قوت، اسلحہ اور مادی چیزوں پر اعتماد کرتا ہے۔ اور مومن کا اعتماد صرف اللہ عزوجل کی اعانت اور نصرت پر ہوتا ہے۔ اس لیے جب کافر اور مومن میدان جنگ میں اترتے ہیں تو مومن کی فتح، کامیابی اور کامرانی کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔

کافر کا دل چونکہ اللہ کے نور، اس کی معرفت اور اس پر ایمان سے خالی ہوتا ہے اس لیے وہ لڑائی کے وقت کمزور اور بزدل ہوتا ہے اور مسلمان کا دل اللہ کے نور اور اس کی معرفت سے معمور ہوتا ہے اور وہ اللہ کے دین کی سر بلندی کے باعث جماد میں شریک ہوتا ہے اس لیے وہ خوش دلی اور شرح صدر کے ساتھ جنگ کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کسی نبی کے یہ لائق نہیں کہ اس کے لیے قیدی ہوں حتیٰ کہ وہ زمین میں (کافروں کا) اچھی طرح خون بہا۔ تم اپنے لیے دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ (تمہارے لیے) آخرت کا ارادہ فرماتا ہے، اور اللہ بہت غالب بڑی حکمت والا ہے۔ اگر پہلے سے (مال غنیمت کو حلال کرنے کا) حکم لکھا ہوا نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کی وجہ سے تمہیں بڑا عذاب پہنچتا۔ (الانفال: ۶۸-۶۷)

مشکل الفاظ کے معانی

اسری: یہ اسیر کی جمع ہے جیسے قتل کی جمع قتل ہے اور جرح کی جمع جرح ہے۔ اسیر کی جمع اساری بھی آتی ہے۔ عرب قیدی کو اسار (تسمہ) سے باندھ دیتے تھے اس لیے قیدی کو اسیر کہتے تھے۔ بعد میں ہر گرفتار شدہ کو اسیر کہا جانے لگا خواہ اس کو باندھا گیا ہو یا نہیں۔ (التہامیہ، ج ۱، ص ۵۰)

یشخن: اشخان کے معنی کسی چیز میں زیادتی اور مبالغہ کرنا ہے۔ حضرت زینب نے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سختی اور تیز مزاجی سے کلام کیا تو حضرت عائشہ نے فرمایا لم انشبهها حتیٰ انشخت علیہا پھر میں نے ان کو مہلت نہ دی حتیٰ کہ میں نے ان کو بہت زیادہ مبالغہ سے جواب دیے۔

(صحیح مسلم فضائل الصحابہ ۸۳، (۲۳۲۲) ۶۱۷۳، صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۸۵۱) اور اس آیت میں اس کا معنی ہے کفار کو قتل کرنے اور ان کا خون بہانے میں، مبالغہ کرنا۔ (التہامیہ، ج ۱، ص ۲۰۳) بدر کے قیدیوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا صحابہ کرام سے مشورہ کرنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک طویل حدیث کے آخر میں فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں مشورہ کیا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! آپ اپنی قوم کا خیال فرمائیں، ان سے فدیہ لے لیں۔ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ان کو قتل کر دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم دونوں متفق ہو جاتے تو میں تم سے اختلاف نہ کرتا۔ اور آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے قول پر عمل کیا۔ تب اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی کسی نبی کے یہ لائق نہیں کہ وہ قیدی بنائے حتیٰ کہ وہ زمین میں (کافروں کا) اچھی طرح خون بہائے۔ (الانفال: ۶۷)

تبیان القرآن

جلد چہارم

(المعجم الکبیر ج ۱۱، ص ۳۳۸-۳۳۷، رقم الحدیث: ۱۲۲۴۴، المستدرک، ج ۲، ص ۳۲۹، مصنف ابن ابی شیبہ، ج ۶، رقم

الحدیث: ۳۳۲۵۰)

امام مسلم نے بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث روایت کی ہے اس کے آخر میں ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جنگ بدر میں مسلمانوں نے ستر کافروں کو قتل کیا اور ستر کافروں کو گرفتار کیا، جب انہوں نے ان کو قید کر لیا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے ان قیدیوں کے متعلق مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکر نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی! یہ آپ کے عم زاد ہیں اور آپ کے قبیلہ کے لوگ ہیں میری رائے یہ ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیں اس سے ہمیں کفار کے خلاف قوت حاصل ہوگی، امید ہے ان کو اللہ اسلام کی ہدایت دے دے گا۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری کیا رائے ہے اے ابن الخطاب! انہوں نے کہا نہیں، خدا کی قسم! یا رسول اللہ! میری وہ رائے نہیں ہے جو ابو بکر کی رائے ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ہم ان پر قدرت پا کر ان کی گردنیں اڑادیں۔ علی، عقیل کی گردن اڑادیں، اور میں فلاں کی گردن اڑا دوں، کیونکہ یہ کفار کے ائمہ اور ضائد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر کی طرف میلان فرمایا اور میری رائے کی طرف میلان نہیں فرمایا۔ دوسرے دن جب میں آیا تو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر بیٹھے رو رہے تھے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے بتائیے کہ آپ اور آپ کے صاحب کس وجہ سے رو رہے ہیں، اگر مجھے از خود رونا آگیا تو میں روؤں گا ورنہ میں کوشش کر کے روؤں گا۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے اصحاب نے فدیہ کی رائے دی تھی، اس کے سبب اس درخت تک ان کا عذاب آچکا تھا میں اس وجہ سے رو رہا ہوں، تب یہ آیت نازل ہوئی کسی نبی کے یہ لائق نہیں کہ وہ قیدی بنائے حتیٰ کہ وہ زمین میں کافروں کا اچھی طرح خون بہائے..... (الایہ: ۶۹-۶۷)

(صحیح مسلم الجہاد، ۵۸، (۱۷۶۳) ۳۵۰۷، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۹۰، مسند احمد رقم الحدیث: ۲۲۱۰-۲۰۸)

مال دنیا کی طمع کی وجہ سے بعض صحابہ پر عتاب نازل ہوا نہ کہ رسول اللہ ﷺ پر فدیہ کو ترجیح دینے کی وجہ سے

بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ نبی ﷺ نے فدیہ لینے کی رائے کو جو ترجیح دی تھی، اس پر یہ عتاب متوجہ ہوا ہے، لیکن یہ تفسیر قطعاً باطل ہے۔ یہ عتاب ان بعض صحابہ کی طرف متوجہ ہے جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، جنہوں نے مال دنیا کی طمع میں فدیہ لینے کی رائے دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان ہی کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے تم اپنے لیے دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ (تمہارے لیے) آخرت کا ارادہ فرماتا ہے۔ اور قدیم الاسلام صحابہ اور ابو بکر نے جو فدیہ لینے کی رائے دی تھی وہ آخرت کی وجہ سے دی تھی کہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں گے تو ان کی آخرت سنور جائے گی اور ان کی وجہ سے مسلمانوں کو مادی اور افرادی قوت حاصل ہوگی۔ اور حدیث میں جس عذاب کا ذکر ہے وہ بھی اگر نازل ہوتا تو ان ہی پر نازل ہوتا۔ اور رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر کا رونا بھی ان ہی اصحاب پر نزول عذاب کے خوف کی وجہ سے تھا۔

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب سے فرماتا ہے: اے مومنو! تم مشرکین سے دنیا کی متاع اور اس کی لذت کی وجہ سے فدیہ لیتے ہو، اور اللہ تمہارے لیے آخرت کا ارادہ فرماتا ہے۔ (جامع البیان ج ۱۰، ص ۵۵، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

امام ابو بکر احمد بن علی رازی الجصاص الحنفی المتوفی ۳۷۰ھ لکھتے ہیں:

یہ محال ہے کہ عذاب نازل ہونے کی وعید کا رسول اللہ ﷺ سے تعلق ہو یا اس کا تعلق فدیہ کے متعلق حضرت ابو بکر کی

رائے کو پسند کرنے سے ہو، کیونکہ نبی ﷺ اپنی خواہش سے کلام نہیں کرتے، آپ کا ہر قول اور فعل اتباع وحی سے ہوتا ہے۔
(احکام القرآن ج ۳، ص ۷۲، مطبوعہ سہیل اکیڈمی، لاہور)

علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی مالکی متوفی ۶۶۸ھ لکھتے ہیں:

یہ آیت جنگ بدر کے دن نبی ﷺ کے اصحاب پر عتاب کے لیے نازل ہوئی کہ تمہارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ تم ایسا فعل کرو جس سے یہ لازم آئے کہ نبی ﷺ نے کافروں کا زیادہ خون بہانے سے پہلے ان کو قیدی بنا لیا۔ تم دنیا کے مال کا ارادہ کرتے ہو، حالانکہ نبی ﷺ نے یہ ارادہ نہیں کیا تھا کہ جنگ کے وقت کافروں کو باقی رکھا جائے اور نہ آپ نے ہرگز دنیا کا ارادہ کیا تھا۔ یہ ارادہ لڑنے والوں میں سے بعض صحابہ نے کیا تھا پس یہ ملامت اور عتاب ان کی طرف متوجہ ہے جنہوں نے متاع دنیا کی وجہ سے نبی ﷺ کو فدیہ لینے کی رائے دی تھی۔ یہ اکثر مفسرین کا قول ہے اور اس کے علاوہ دوسرے معنی کا ارادہ کرنا جائز نہیں ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۷، ص ۴۰۳-۴۰۲، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۵ھ)

اس تفصیل سے یہ واضح ہو گیا کہ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کرنا کوئی پسندیدہ امر نہ تھا اور نہ اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا ماکان لنسی ان یکون له اسری حتی یشحن فی الارض کسی نبی کے شایان شان اس وقت تک قیدی بنانا جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ زمین پر اچھی طرح کافروں کا خون نہ بہا لے میرے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز نے فرمایا جنگ بدر میں ستر کافروں کا خون بہا دیا گیا تھا اور ستر کافروں کا خون بہانے کے بعد ستر کو قید کر لیا گیا تھا نبی ﷺ نے ستر کافروں کا خون بہانے کے بعد ستر کو گرفتار کیا تھا۔ رؤسائے قریش میں سے جو نامور قریش کے سپہ سالار تھے ایک ایک کر کے مارے گئے، ان میں شبیبہ، عتبہ، ابو جہل، ابو بختری، زمعہ بن الاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف اور منبہ بن الحجاج کفار قریش جو جنگی طاقت میں ریڑھ کی ہڈی تھے مارے گئے ان لوگوں کے مارے جانے سے کفار قریش کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ لہذا کفار قریش کے صنادید سمیت ستر کافروں کا خون بہانے کے بعد ستر کافروں کو قیدی بنانا قرآن مجید کی اس آیت کے عین مطابق تھا۔ یہ عمل اس وقت ناپسندیدہ اور اس آیت کے خلاف ہوتا جب جنگ میں کسی کافر کا خون بہائے بغیر کافروں کو گرفتار کر لیا جاتا اور جب ستر کافروں کا خون بہانے کے بعد ستر کافروں کو گرفتار کیا گیا تو پھر آپ کا یہ عمل ناپسندیدہ کیسے ہو سکتا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ

(اے مسلمانو!) تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ (تمہارے

(الانفال: ۶۷) لیے) آخرت کا ارادہ فرماتا ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ان صحابہ کو ملامت کی گئی ہے جنہوں نے فدیہ لے کر قیدیوں کو آزاد کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن حقیقتاً یہ خطاب ان تمام صحابہ کرام کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ اس آیت کا روئے سخن ان بعض مسلمانوں کی طرف ہے جنہوں نے نیا نیا اسلام قبول کیا تھا اور مال دنیا کی طمع میں فدیہ لینے کی خواہش کی تھی۔ ورنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مال دنیا کی طمع سے بری ہیں ان کا مشورہ اس وجہ سے تھا کہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ اسلام لے آئیں اور اسلام کی نشر و اشاعت میں اضافہ ہو اور مسلمانوں کو شوکت اور غلبہ حاصل ہو۔ سو حضرت ابو بکر نے جو فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کرنے کا مشورہ دیا تھا وہ آخرت کی بنا پر ہی تھا اور اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اس مشورہ کو قبول فرمایا تھا۔ لہذا یہ آیت قیدیوں کو رہا کرنے کے خلاف نہیں ہے۔

عتاب کی دوسری وجہ بلا اجازت مال غنیمت لینا ہے

ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اگر قیدیوں کو رہا کرنا جائز اور صحیح تھا تو پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا:

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِیْمَا
 اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (الانفال: ۶۸)

اگر پہلے سے (معافی کا حکم) اللہ کی طرف سے لکھا ہوا نہ ہوتا
 تو تم نے جو مال لیا تھا اس کی وجہ سے تم کو ضرور بڑا عذاب
 پہنچتا۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فدیہ لینے کی وجہ سے تم عذاب کے مستحق تھے کیونکہ اس سے پہلے فدیہ لینے سے
 ممانعت نہیں کی گئی تھی پھر فدیہ لینا عذاب کا سبب کیسے ہو سکتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلی شریعتوں میں مال غنیمت لینا حرام
 تھا اور ابھی اس کے حلال ہونے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا اور جب مسلمانوں نے بلا اجازت کافروں کا مال غنیمت لوٹ لیا تو یہ آیت
 نازل ہوئی۔ امام ترمذی روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے بنی آدم میں سے کسی کے لیے بھی مال غنیمت
 حلال نہیں کیا گیا۔ آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی اور مال غنیمت کو کھا جاتی۔ سلیمان امش نے کہا اس بات کو اب ابو ہریرہ کے
 سوا کون بیان کر سکتا ہے اور جب جنگ بدر ہوئی تو مال غنیمت کی حلت کے حکم نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں نے مال غنیمت لوٹنا
 شروع کر دیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اگر پہلے سے (معافی کا حکم) اللہ کی طرف سے لکھا ہوا نہ ہوتا (کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا
 ہے جب تک آپ ان میں ہیں ان پر عذاب نازل نہیں ہوگا) تو تم نے جو مال لیا تھا اس کی وجہ سے تم کو ضرور بڑا عذاب پہنچتا۔ یہ
 حدیث حسن صحیح ہے۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۳۰۹۶، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۴، ص ۳۸۸، ۳۸۷، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۳۰۹، المستقی رقم
 الحدیث: ۱۰۷۱، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۸۰۶، مسند احمد ج ۳، رقم الحدیث: ۷۴۳۷، التمشید لابن عبد البر ج ۶، ص ۴۵۷، السنن الکبریٰ
 للبیہقی ج ۶، ص ۲۹۱-۲۹۰)

اس صحیح حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ اس آیت کا تعلق فدیہ لینے سے نہیں ہے بلکہ بلا اجازت مال غنیمت لوٹنے سے ہے
 اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس سے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے مال غنیمت لینے کی عام اجازت دے دی۔ چنانچہ
 ارشاد ہے:

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا
 (الانفال: ۶۹) در آنحالیکہ وہ حلال طیب ہے۔

سو اب اس مال غنیمت کو کھاؤ جو تم نے حاصل کیا ہے

اس بحث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ سورہ انفال کی ان آیات میں قیدیوں سے فدیہ لے کر انہیں رہا کرنے کی مذمت نہیں
 کی گئی بلکہ بلا اجازت مال غنیمت لینے پر ملامت کی گئی ہے اور اگر بالفرض ان آیات کا ربط قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کرنے سے
 ہی جوڑا جائے تو اس ملامت کی وجہ یہ ہے کہ ابتداء اسلام میں کفار کی بیخ کنی ہی مطلوب تھی۔ اس وجہ سے کفار کو قتل نہ کرنے
 اور گرفتار کرنے کو ناپسندیدہ قرار دیا لیکن بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت اور غلبہ عطا فرمایا اور مسلمانوں کی کثرت ہو گئی
 تو پھر ہی حکم نازل ہوا کہ میدان جنگ میں کافروں کی گردنیں اڑا دو پھر ان کو گرفتار کر لو اور گرفتار کرنے کے بعد ان کو فدیہ لے کر
 چھوڑ دو یا بلا فدیہ رہا کر دو۔ چنانچہ علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

جب اسلام ایک کمزور شاخ کی مانند تھا اور دشمنان اسلام بہت قوی تھے تو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے خون بہانے کا حکم دیا اور
 فدیہ لینے سے منع کیا (فی الواقع اللہ تعالیٰ نے فدیہ لینے سے منع نہیں کیا۔ سعیدی) اور جب مسلمانوں کی حالت سنبھل گئی اور شجر
 اسلام اپنے تنے پر مضبوطی سے قائم ہو گیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دیں

اور اگر چاہیں تو بغیر فدیہ کے امتناناً اور احساناً قیدیوں کو رہا کر دیں اور فرمایا فاما منابعد واما فداء۔

(روح المعانی ج ۱۰، ص ۳۳، مطبوعہ بیروت)

بدر کے قیدیوں کو آزاد کرنے کے جوابات

سورۃ انفال کی ان آیات سے جو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ نے اچھی طرح خون بہائے بغیر کفار کو قید کر لیا، اور فدیہ نے کر قیدیوں کو آزاد کیا اور ان افعال پر اللہ تعالیٰ نے عتاب نازل فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے یہ حکم نازل فرما چکا تھا کہ:

فَاَضْرِبُوا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاَضْرِبُوا مِنْهُمْ كَلًّا
بَنَانِ (الانفال: ۱۲)

سو کافروں کی گردنوں کے اوپر وار کرو اور کافروں کے ہر
جوڑ پر ضرب لگاؤ۔

امام رازی نے ان نکات پر بڑی نفیس بحث کی ہے، لکھتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ ماکان لنبی ان یکون لہ اسری (کافروں کا اچھی طرح خون بہائے بغیر ان کو قید کرنا کسی نبی کی شان کے لائق نہیں ہے) اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اچھی طرح خون بہانے کے بعد کافروں کو قید کرنا جائز ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یوم بدر کو صحابہ کرام نے کافروں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قتل کیا تھا اور زمین میں اچھی طرح خون بہانے کی یہ شرط نہیں ہے کہ تمام لوگوں کو قتل کر دیا جائے، اور قتل کرنے اور خون بہانے کے بعد صحابہ نے کافروں کو قید کیا تھا اور اس آیت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اچھی طرح خون بہانے کے بعد کافروں کو قید کرنا جائز ہے اور جب صحابہ کرام نے ایک جائز کام کیا تھا تو اس آیت سے یہ استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کہ انہوں نے یا معاذ اللہ سرکار دو عالم ﷺ نے کوئی گناہ یا معصیت کی تھی۔ خاص طور پر جب کہ اللہ تعالیٰ نے بعد میں خود اس فعل کا حکم دے کر اس کے جواز کو موکد کر دیا۔ چنانچہ فرمایا:

فَاِذَا لَقِيتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبِ الرِّقَابِ
حَتّٰى اِذَا اَنْخَسْتُمُْوْهُمْ فَمَسَدُوْا الْوَتَاقَ
فَاِمَامًا تَبَعْدُوْا مَّا فِدَاءً (محمد: ۴)

سو جب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو تو (تمہارا پہلا کام) ان کی
گردنیں مارنا ہے حتیٰ کہ جب تم ان کا اچھی طرح خون بہا چکو تو
پھر ان کو مضبوطی سے باندھ لو (اس کے بعد تمہیں اختیار ہے)
خواہ محض ان پر احسان کر کے انہیں رہا کر دیا ان سے فدیہ لے
کر انہیں چھوڑ دو۔

باقی رہا یہ کہ جب یہ ایک جائز کام تھا تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت سے عتاب کیوں نازل فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زمین پر اچھی طرح خون بہانے کی کوئی حد اور مقدار نہیں ہے اور اس کا تعین اور انضباط نہیں ہے بلکہ اس سے یہ مقصود ہے کہ اس قدر کثرت سے کافروں کو قتل کیا جائے کہ کفار کے دلوں پر رعب پڑے اور ہمت چھا جائے تاکہ وہ دوبارہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کی جرأت نہ کریں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حد تک کافروں کو قتل کرنا اجتہاد پر موقوف ہے۔ اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ گمان فرمایا ہو کہ جس قدر کافروں کو قتل کیا جا چکا ہے ان سے یہ مقدار حاصل ہو گئی ہے اور فی الواقع وہ مقدار حاصل نہ ہوئی ہو تو یہ آپ کی اجتہادی خطا ہے کیونکہ اس حد کے سلسلہ میں کوئی نص نازل نہیں ہوئی تھی اور ہر چند کہ اجتہادی خطا بھی موجب اجر و ثواب ہوتی ہے اور اس پر مواخذہ یا ملامت نہیں ہوتی، لیکن مقربین قرب الہی کے اس درجہ پر فائز ہوتے ہیں کہ نیکو کاروں کی نیکیاں بھی ان کے ہاں برائی کے حکم میں ہوتی ہیں۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے ازراہ لطف و محبت بطور تعریض فرمایا: کسی نبی کی شان کے لائق نہیں کہ وہ اچھی طرح خون بہائے بغیر کفار کو قیدی بنا لے۔ صراحتاً یہ نہیں فرمایا کہ

ثبیان انقدر ان

جلد چہارم

تمہیں ان کو قیدی بنانا نہیں چاہیے تھا یا تمہارا یہ اقدام غلط تھا، بلکہ تعریض اور کنایہ سے کام لے کر نبی ﷺ کی شان کی عظمت اور مرتبہ کی رفعت کو ظاہر فرمایا کیونکہ ایسے مواقع پر صراحت کو چھوڑ کر انہیں کے لیے تعریض اور کنایہ سے کام لیا جاتا ہے جن کا مرتبہ بلند اور پایہ اونچا ہوا

ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں معرکہ بدر کے متعلق ہے فاضربوا فوق الاعناق واضربوا منہم کل بنان (الانفال: ۱۲) سو کافروں کی گردنوں کے اوپر وار کرو اور کافروں کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ اور جب نبی ﷺ نے تمام کافروں کو قتل نہیں کیا اور ستر کافروں کو قید کر لیا تو اس حکم کی مخالفت ہوئی۔ اس کا امام رازی نے یہ جواب دیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ نبی ﷺ کو بنفسہ کفار کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا، یہ خطاب صحابہ کو تھا اور جب انہوں نے سب کافروں کو قتل کرنے کی بجائے بعض کافروں کو گرفتار کر لیا تو یہ حکم عدولی ان صحابہ سے ہوئی، نبی ﷺ نے ان کو گرفتار کیا تھا نہ گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا نہ آپ کو شروع میں اس کا علم ہوا۔ جب صحابہ نے ان کو گرفتار کر لیا تب آپ کو علم ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب آپ کو علم ہو گیا تھا تو پھر آپ کو چاہیے تھا کہ آپ کافروں کے قتل کا حکم دیتے تاکہ اس آیت پر عمل ہو جاتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم حالت جنگ کا ہے یعنی حالت جنگ میں کفار کی گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ، یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہ سے ان قیدیوں کے بارے میں مشورہ لیا کہ ان کو قتل کیا جائے یا رہا کیا جائے۔ اگر حالت جنگ کے بعد بھی ان کو قتل کرنے کا حکم ہوتا تو آپ اس معاملہ میں صحابہ سے مشورہ نہ لیتے۔ (تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۵۱۰-۵۰۹، مطبوعہ بیروت)

اس سوال کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ ستم کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور ان کے ہر جوڑ پر ضرب لگاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ تمام کافروں کی گردنوں پر وار کرو اور کسی کو زندہ نہ چھوڑو۔ لہذا جب صحابہ کرام نے ستر کافروں کو قتل کر دیا تو اس آیت کے حکم پر عمل ہو گیا اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے سب کافروں کو قتل کرنے کا حکم نہیں دیا تھا اور گرفتار کرنے سے منع نہیں کیا تھا اس لیے اگر صحابہ نے بعض کافروں کو گرفتار کر کے قید کر لیا تو اس میں انہوں نے کوئی حکم عدولی اور گناہ نہیں کیا اور جب کہ بعد میں وہ کافر اسلام لے آئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورہ محمد میں خود جنگ کے بعد کافروں کو گرفتار کرنے کا حکم دیا تو اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کا یہ اقدام عین فشاء الہی کے مطابق تھا۔ واللہ الحمد علیٰ ذلک۔

مشرکین کو قتل کرنے کے عمومی حکم سے جنگی قیدیوں کو مستثنیٰ کرنے پر دلائل

جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانے کے سلسلے میں ہم نے بدر کے جنگی قیدیوں کو آزاد کرنے کی تفصیل اور اس پر اعتراضات اور جوابات کو بیان کیا۔ اس سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ اسلام میں جنگی قیدیوں کو لونڈی اور غلام بنانا حتماً اور لازماً نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر یا بلا فدیہ آزاد کر دینا ہے اور قرآن مجید کی بھی یہی ہدایت ہے جیسا کہ سورہ محمد کی آیت فاما منابعد واما فداء سے واضح ہے اور بعض فقہاء کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ آیت فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموہم (توبہ: ۵) سو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو سے منسوخ ہے۔ کیونکہ مشرکین کو قتل کرنے کا حکم حالت جنگ پر محمول ہے یعنی حالت جنگ میں مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو، اگر یہ حکم عام ہوتا یعنی جنگ ہو یا امن ہر حال میں مشرکین کو قتل کر دو تو مستامن اور اہل ذمہ کو بھی قتل کرنا واجب اور ضروری ہوتا۔ حالانکہ تمام فقہاء نے مستامن اور ذمیوں کو اس آیت کے حکم سے مستثنیٰ کیا ہے۔ مستامنوں کے استثناء پر یہ آیت دلیل ہے:

وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ

اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص آپ سے پناہ مانگے تو

فَاجْرُهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ ثُمَّ ابْلِغْهُ مَا مَنَّهَ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْلَمُونَ (التوبه: ۶)

اس کو پناہ دیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے، پھر آپ اسے اس کی امن کی جگہ پہنچا دیجئے یہ حکم اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے۔

اس آیت سے مشرکین کو قتل کرنے کے حکم سے ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو پناہ اور امن حاصل کر کے دارالاسلام میں داخل ہوں۔ اور اہل ذمہ کے استثناء پر یہ آیت دلیل ہے:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ
الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا
يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ
حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ O
(التوبه: ۲۹)

اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اس کے رسول نے جو حرام کیا ہے اس کو حرام نہیں قرار دیتے اور دین حق کو نہیں اپناتے (ان سے اس وقت تک جنگ کرو) جب تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر (یعنی مسلمانوں کے تابع بن کر) رہیں۔

اس آیت سے مشرکین کو قتل کرنے کے حکم سے ان لوگوں کو مستثنیٰ کر لیا گیا ہے جو جزیہ ادا کریں اور مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر کے مسلمانوں کی حکمرانی کے تحت زندگی گزاریں۔

جس طرح مشرکین کو قتل کرنے کے حکم سے قرآن مجید نے مستانوں اور زمیوں کو مستثنیٰ کیا ہے اسی طرح اس حکم سے جنگی قیدیوں کو بھی مستثنیٰ کیا ہے اور اس استثناء پر یہ آیت دلیل ہے:

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ
حَتَّى إِذَا أَتَّخَمْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَتَاقَ فَإِمَّا
مَنْبَعِدُوا مِنْكُمْ فَإِذَا هِيَ تَضَعُ الْحَرْبُ أَوْ زَارَهَا
(محمد: ۴)

سوجب تمہارا کفار سے مقابلہ ہو تو (تمہارا اپلا کام) ان کی گردنیں مارنا ہے حتیٰ کہ جب تم ان کا خون بہا چکو تو پھر ان کو مضبوطی سے باندھ لو (اس کے بعد تمہیں اختیار ہے) خواہ محض ان پر احسان کر کے ان کو رہا کرو یا ان سے نڈیہ لے کر انہیں آزاد کر دو، تا آنکہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔

اور اس آیت کی رو سے جنگی قیدی، مشرکین کو قتل کرنے کے عام حکم سے مستثنیٰ ہیں لہذا فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموہم (التوبہ: ۵) ”سو تم مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو“ اور واقتلوہم حیث ثقتموہم (النساء: ۹۱) ”تم ان کو جہاں پاؤ قتل کر دو“ حرب اور جنگ کی حالت پر محمول ہیں۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں: امام مسلم، امام ابو داؤد، امام ترمذی اور امام ابن جریر نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مشرک کے بدلے میں دو مسلمانوں کا نڈیہ لیا۔ (صحیح مسلم ج ۲، ص ۸۹، مطبوعہ کراچی) نیز امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق کی قیادت میں ایک لشکر جنگ کے لیے گیا۔ حضرت ابو بکر نے حضرت سلمہ کو ایک مشرک عورت بطور باندی انعام میں دی رسول اللہ ﷺ نے وہ عورت حضرت سلمہ سے واپس لے لی اور اس کو نڈیہ میں دے کر ان مسلمانوں کو چھڑایا جو مکہ میں کفار کی قید میں تھے۔

(صحیح مسلم ج ۲، ص ۸۹، مطبوعہ نور محمد کراچی) ان حدیثوں میں جنگی قیدیوں کے تبادلہ کی دلیل ہے، سعیدی (علامہ آلوسی لکھتے ہیں: علامہ ابن ہمام نے کہا ہے کہ مشرکین کو بالعموم قتل کرنے کا حکم جنگی قیدیوں کے ماسوا میں ہے، کیونکہ

ان کو غلام بنانا بھی جائز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگی قیدی قتل کرنے کے حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

(روح المعانی، ج ۲۶، ص ۴۱، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اگر پہلے سے مال غنیمت کو حلال کرنے کا حکم اللہ کی طرف سے لکھا ہوا نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کی وجہ سے بڑا عذاب ہوتا۔ پس تم نے جو مال غنیمت حاصل کیا ہے اس میں سے کھاؤ وہ حلال اور طیب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے (الانفال: ۶۸-۶۹)

بدر میں بلا اذن مال غنیمت لینے کے باوجود عذاب نہ آنے کا سبب کیا تھا؟
اس کا سبب مذکور ذیل حدیث سے ظاہر ہوتا ہے:

امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا تم سے پہلے بنو آدم میں سے کسی کے لیے مال غنیمت حلال نہیں کیا گیا آسمان سے ایک آگ نازل ہو کر مال غنیمت کو کھا جاتی تھی اور جب جنگ بدر کا دن تھا تو مسلمان مال غنیمت کے حلال ہونے کے حکم کے نزول سے پہلے مال غنیمت اٹھانے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اگر پہلے سے (یہ حکم) لکھا ہوا نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کی وجہ سے بڑا عذاب ہوتا۔ (الانفال: ۶۸)

امام ابو عیسیٰ نے کہا یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

(مسند احمد ج ۳، رقم الحدیث: ۷۳۳۷، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۳، ص ۳۸۸-۳۸۷، طبع کراچی، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۳۰۹)

المستقی رقم الحدیث: ۱۰۷۱، صحیح ابن حبان رقم الحدیث: ۳۸۰۶، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۶، ص ۲۹۱-۲۹۰، التمهید لابن عبد البر ج ۶، ص ۳۵۷)

امام رازی نے اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ صحابہ کو مال غنیمت لینے سے پہلے منع کیا گیا تھا یا نہیں۔ اگر منع نہیں کیا گیا تھا تو پھر نزول عذاب کی کوئی وجہ نہیں ہے، اگر ان کو اس سے پہلے مال غنیمت لینے سے منع کیا گیا تھا تو پھر ان کا مال غنیمت لینا فعل حرام قرار پایا اور اگر یہ کہیں کہ چونکہ عنقریب مال غنیمت حلال ہونے والا تھا، اس وجہ سے ان کا یہ کام تخفیف عتاب کا موجب ہے تو ہم کہیں گے پھر انہیں نزول عذاب کا مستحق نہیں ہونا چاہیے تھا۔

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۵۱۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۳۱۵ھ)

مصنف کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چند کہ ان کو مال غنیمت لینے سے پہلے منع نہیں کیا گیا تھا لیکن ان کے بلند مرتبہ کی وجہ سے ان کا بلا اجازت مال غنیمت لینا ان کے حق میں نزول عذاب کا باعث تھا، کیونکہ جس کا مرتبہ جس قدر بلند ہو اس پر گرفت اتنی سخت ہوتی ہے اور چونکہ لوح محفوظ میں پہلے سے یہ لکھا ہوا تھا کہ اس امت پر مال غنیمت حلال ہے اس وجہ سے ان پر عذاب نازل نہیں ہوا اور ان کو صرف ملامت کرنے پر اکتفا کی گئی۔

عذاب نہ آنے کا دوسرا سبب اور اس آیت کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ لوح محفوظ میں پہلے سے اہل بدر کی معافی کا حکم لکھا ہوا ہے اگر یہ حکم لکھا ہوا نہ ہوتا تو تم پر عذاب عظیم نازل ہوتا۔ اہل بدر کی معافی پر دلیل یہ حدیث ہے:

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ نے خفیہ طور پر نبی ﷺ کے بعض جنگی اقدامات کی کفار مکہ کو خبر دینا چاہی جب نبی ﷺ نے ان کا وہ خط پکڑ لیا اور ان سے یہ خط لکھنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میں اہل مکہ کا حلیف تھا میں چاہتا تھا کہ ان پر کوئی احسان کر کے وہاں اپنے قرابت داروں کی حفاظت کروں۔ میں نے یہ کام کفر ارتداد یا نفاق کی وجہ سے نہیں کیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا اس نے سچ کہا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیں میں اس منافق کی گردن اڑا دوں، آپ نے فرمایا

یہ بدر میں حاضر ہوا ہے اور تمہیں کیا پتا اللہ تعالیٰ اہل بدر پر متوجہ ہوا اور فرمایا تم جو چاہو کرو میں نے تم کو بخش دیا ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۰۰۷، صحیح مسلم فضائل الصحابہ ۱۶۱ (۲۳۹۳) ۶۲۸۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۶۵۰، سنن الترمذی رقم

الحدیث: ۳۳۱۶، السنن الکبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۱۱۵۸۵))

امام فخرالدین رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں: اس حدیث کا تقاضا یہ ہے کہ بدری صحابہ کو کفر کرنے، زنا کرنے اور شراب پینے سے نہیں منع کیا گیا اور ان برے کاموں کے ارتکاب پر ان کو عذاب سے نہیں ڈرایا گیا، نیز اگر اس حدیث کو مان لیا جائے کہ بدری صحابہ جو چاہیں کریں تو یہ اس کو مستلزم ہو گا کہ ان سے احکام شرعیہ کا مکلف ہونا ساقط ہو گیا اور اس کا کوئی عاقل قول نہیں کر سکتا۔ نیز اگر ان کو ہر کام کرنے کی اجازت اور رخصت ہے تو پھر بلا اذن مال غنیمت لینے کی وجہ سے ان پر عتاب کیوں آیا اور ملامت کیوں کی گئی اور ان کے لیے اس درخت تک عذاب کیوں آپہنچا تھا؟

(تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۵۱۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

امام رازی کی بہت بڑی علمی شخصیت ہے اور میں ان کی گرد راہ کے بھی برابر نہیں ہوں تاہم امام رازی کے اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ بدری صحابہ کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ اپنی مغفرت کے متعلق تشویش میں مبتلا نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان سے کفر صادر ہونے نہیں دے گا، اور گناہ کبیرہ سے بھی ان کو محفوظ رکھے گا اور اگر ان سے کوئی گناہ صادر ہو گیا تو مرتے سے پہلے ان کو توبہ کی توفیق دے دے گا۔ اور ان کا بلا اجازت مال غنیمت لینا اور پھر اس کے باوجود ان پر عذاب نہ آنا تو اس حدیث کے موید اور موافق ہے کیونکہ درخت تک عذاب آنے کے باوجود ان پر اسی لیے عذاب نہیں آیا کہ وہ بدری صحابہ تھے اور لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا تھا کہ بدری صحابہ مغفور ہیں۔ رہا یہ کہ پھر ان کو ملامت کیوں کی گئی اور عتاب کیوں ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں عتاب ہونا، آخرت میں مغفرت کے منافی نہیں ہے۔

امام رازی نے خود اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ازل میں یہ حکم نہ کیا ہوتا کہ وہ اس واقعہ کو معاف کر دے گا تو ان کو بڑا عذاب پہنچتا، اور یہ حکم اگرچہ تمام مسلمانوں کے لیے ثابت ہے لیکن اہل بدر کی عبادات بہت عظیم تھیں۔ انہوں نے اسلام کو قبول کیا اور سیدنا محمد ﷺ کی اطاعت کی، بغیر ہتھیاروں اور تیاری کے کفار کے اپنے سے تین گنا لشکر سے مقابلہ کیا تو یہ کمنا بعید نہیں کہ وہ بلا اجازت مال غنیمت لینے کے جس گناہ کے مرتکب ہوئے اور اس گناہ کی وجہ سے وہ جس عذاب کے مستحق ہوئے وہ ان کی عبادات کے ثواب کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور ان کا ثواب اس عذاب سے بہت زیادہ ہے تو اس گناہ کے معاف ہونے کی زیادہ توقع ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۵، ص ۵۱۲، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ پہلے دو جواب جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہیں ان پر امام رازی نے اعتراضات کیے اور ان کو مسترد کر دیا اور جو جواب اور جو تفسیر ان کی رائے پر مبنی ہے اس کو انہوں نے معتمد قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ امام رازی کے درجات بلند فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ہمارے علم کی ان کے علم کے ساتھ وہی نسبت ہو سکتی ہے جو ذرہ کو آفتاب کے ساتھ اور قطرہ کو سمندر کے ساتھ ہے، اس کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ ہمارے نزدیک اس باب میں وہی تفسیر معتمد ہے جو رسول اللہ ﷺ کی احادیث پر مبنی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِمَنْ فِي أَيْدِيكُمْ مِنَ الْأَسْرَىٰ إِنَّ يَعْلَمَ

لے نبی: ان قیدیوں سے کیجئے جو آپ کے قبضہ میں ہیں، اگر اللہ تمہارے دلوں کی کسی نیکی کو ظاہر

اللَّهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّا أُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرَ لَكُمْ

فرمائے گا تو وہ تم کو اس سے بہت زیادہ دے گا جو (بہ طور فدیہ) تم سے لیا گیا ہے اور اللہ تم کو بخش دے گا

وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝۴۵ وَإِنْ يُرِيدُوا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللَّهَ

اور اللہ بہت بخشنے والا ہے حد درجہ فرمانے والا ہے ۝ اور اگر یہ آپ کے خیانت کا ارادہ کریں تو وہ اس سے پہلے اللہ سے

مِنْ قَبْلُ فَأَمْكَنَ مِنْهُمْ ۝ وَاللَّهُ عَلَيْهِ حَكِيمٌ ۝۴۶ إِنَّ الَّذِينَ

خیانت کر چکے ہیں تو اللہ نے ان میں سے بعض لوگوں پر آپ کو قادر (غالب) کر دیا، اور اللہ بہت جاننے والا ہے حد حکمت والا ہے ۝ بیشک

آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا

اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَانصَرَوْا أَوْلِيَّكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٌ وَ

اور جن لوگوں نے (ہماجرین کو) جگہ فراہم کی اور ان کی نصرت کی یہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں ، اور

الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا أَمْوَالِكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی ، وہ اس وقت تک تمہاری ولایت میں بالکل نہیں ہوں گے

حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنْ اسْتَضَرُّوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمْ

جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں ، اور اگر وہ تم سے دین میں مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم

النَّصْرُ الْأَعْلَىٰ قَوْمِ بَيْنِكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ

ہے ماسوا اس قوم کے جس کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور تم جو کام بھی کرتے ہو

بَصِيرٌ ۝۴۷ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أِبْعَضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٌ إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ

اللہ اس کو خوب دیکھنے والا ہے ۝ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان میں سے بعض ، بعض کے ولی ہیں ، اگر تم ان احکام پر عمل نہیں

فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ۝۴۸ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا

کردگے تو زمین میں فتنہ اور بہت بڑا فساد ہو گا ۝ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور

جَهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ

اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور ان کی نصرت کی یہی لوگ برحق

الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿۴۵﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا

مومن ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے ○ اور جو لوگ بعد میں

مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَهَادُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنْكُمْ وَأُولُوا

ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ جہاد کیا سو وہ بھی تم میں سے ہیں اور اللہ کی کتاب

الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ

میں قرابت دار (بہ طور وراثت) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، بے شک اللہ ہر چیز کو

شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۴۶﴾

خوب جاننے والا ہے ○

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے نبی ان قیدیوں سے کہئے جو آپ کے قبضہ میں ہیں اگر اللہ تمہارے دلوں کی کسی نیکی کو ظاہر فرمائے گا تو وہ تم کو اس سے بہت زیادہ دے گا جو (بہ طور فدیہ) تم سے لیا گیا ہے اور اللہ تم کو بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا ہے حد رحم فرمانے والا ہے ○ (الانفال: ۴۰)

بدر میں رسول اللہ ﷺ کے غیب کی خبر دینے سے متاثر ہو کر حضرت عباس کا مسلمان ہونا امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

امام محمد بن اسحاق نے بیان کیا کہ جس شخص نے عکرمہ سے سنا اس نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی کہ عکرمہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جس شخص نے (جنگ بدر میں) عباس بن عبد المطلب کو گرفتار کیا وہ ابو الیسر کعب بن عمرو تھے۔ ان کا تعلق بنو سلمہ سے تھا۔ ان سے رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: اے ابو الیسر تم نے اس کو کیسے گرفتار کیا تھا؟ انہوں نے کہا اس معاملہ میں ایک ایسے شخص نے میری مدد کی تھی جس کو میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا نہ اس کے بعد اس کی ایسی ایسی ہیئت تھی۔ تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری مدد ایک مکرم فرشتہ نے کی تھی۔ اور عباس سے فرمایا اے عباس تم اپنا فدیہ بھی دو اور اپنے بھتیجے عقیل بن ابی طالب اور نوفل بن الحارث کاندیہ بھی دو اور اپنے حلیف عتبہ بن جدم کاندیہ بھی دو جن کا تعلق بنو الحارث بن نمر سے ہے۔ عباس نے ان کاندیہ دینے سے انکار کیا اور کہا میں اس غزوہ سے پہلے اسلام قبول کر چکا تھا یہ لوگ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لائے ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تمہارے معاملہ کو خوب جاننے والا ہے اگر تمہارا دعویٰ برحق ہے تو اللہ تم کو اس کی جزا دے گا۔ لیکن تمہارا ظاہر حال یہ ہے کہ تم ہم پر حملہ آور ہوئے ہو سو تم اپنا فدیہ ادا کرو۔ اور رسول اللہ ﷺ اس سے بیس اوقیہ سونا (بہ طور مال غنیمت) وصول کر چکے تھے۔ عباس نے کہا یا رسول اللہ! اس میں اوقیہ سونے کو میرے

فدیہ میں کاٹ لیجئے۔ آپ نے فرمایا نہیں ایہ وہ مال ہے جو اللہ نے ہمیں تم سے لے کر دیا ہے۔ عباس نے کہا میرے پاس اور مال تو نہیں ہے، آپ نے فرمایا وہ مال کہاں ہے جو تم نے مکہ سے روانگی کے وقت ام الفضل کے پاس رکھا تھا اس وقت تم دونوں کے پاس اور کوئی نہیں تھا۔ اور تم نے یہ کہا تھا کہ اگر میں اس مہم میں کام آگیا تو اس مال میں سے اتنا فضل کو دینا، اتنا تقم کو دینا اور اتنا عبد اللہ کو دینا۔ تب عباس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے میرے اور ام الفضل کے سوا اس کو اور کوئی نہیں جانتا اور اب مجھے یقین ہو گیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

(مسند احمد ج ۱، ص ۳۵۳، طبع قدیم، دار الفکر مسند احمد ج ۱، رقم الحدیث: ۳۳۱۰، طبع جدید، دار الفکر شیخ احمد شاکر نے کہا اس حدیث کی سند ضعیف ہے کیونکہ امام محمد بن اسحاق اور عکرمہ کے درمیان راوی مجہول ہے، مسند احمد ج ۱، رقم الحدیث: ۳۳۱۰، مطبوعہ دار الحدیث قاہرہ ۱۳۱۶ھ، حافظ البیہقی نے کہا اس کی سند میں ایک راوی کا نام مذکور نہیں ہے اور اس کے باقی تمام رجال ثقہ ہیں، مجمع الزوائد ج ۶، ص ۸۶، امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ نے اس حدیث کو دو مختلف سندوں کے ساتھ روایت کیا ہے اور یہ دونوں سندیں متصل ہیں۔ طبقات کبریٰ ج ۲، ص ۱۰-۹-۱۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۸ھ، طبقات کبریٰ ج ۱، ص ۱۳-۱۲، مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۳۸۸ھ، امام ابو عبد اللہ حاکم نیشاپوری متوفی ۴۰۵ھ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیث امام مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے لیکن انہوں نے اس کو روایت نہیں کیا، حافظ ذہبی نے اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس پر کوئی جرح نہیں کی۔ المستدرک ج ۳، ص ۳۲۲، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ، امام ابو نعیم الاصبہانی المتوفی ۴۳۰ھ نے بھی اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ روایت کیا ہے، دلائل النبوة ج ۲، ص ۷۶، رقم الحدیث: ۴۰۹، مطبوعہ دار النفا، بیروت، حافظ ابو القاسم علی بن الحسن المعروف بابن العساکر، المتوفی ۵۷۱ھ نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ تہذیب تاریخ دمشق، ج ۷، ص ۲۳۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، مختصر تاریخ دمشق، ج ۱۱، ص ۳۲۹-۳۳۰، علامہ ابو القاسم عبدالرحمن بن عبد اللہ السبیلی المتوفی ۵۷۱ھ نے اس کا ذکر کیا ہے، الروض الانف، ج ۲، ص ۹۲، مطبوعہ مکتان، امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی نے اس حدیث کو زہری اور ایک جماعت سے روایت کیا ہے، دلائل النبوة، ج ۳، ص ۱۳۳-۱۳۲، حافظ ابن کثیر، متوفی ۷۷۴ھ نے بھی اس کا از محمد بن اسحاق از ابی یحییٰ از عطاء ابن عباس ذکر کیا ہے اور یہ بھی سند متصل ہے السیرۃ النبویہ، ج ۲، ص ۴۰۶، مطبوعہ دار الکتب العربی، بیروت، ۱۳۱۷ھ۔ البدایہ و النہایہ، ج ۳، ص ۲۹۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۹۳ھ، تفسیر ابن کثیر، ج ۳، ص ۳۲۹، مطبوعہ ادارہ الاندلس بیروت، ۱۳۸۵ھ، علامہ محمد بن یوسف شامی متوفی ۹۴۲ھ نے بھی اس کا اپنی سیرت میں ذکر کیا ہے، سبل الہدی والرشاد، ج ۴، ص ۶۹، مفسرین نے بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے، علامہ ابو الحسن بن محمد ماوردی، متوفی ۴۵۰ھ نے اس کا ذکر کیا ہے، النکت و العیون، ج ۲، ص ۳۳۳-۳۳۲، موسسہ الکتب الشافیہ، بیروت، امام الحسین بن مسعود الفراء البغوی، متوفی ۵۱۶ھ نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے، اس کے آخر میں ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ سچے ہیں لا الہ الا اللہ، بے شک آپ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اس بات پر اللہ کے سوا اور کوئی مطلع نہیں تھا، معالم التنزیل، ج ۲، ص ۲۲۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۳ھ، نام حاکم اور امام بیہقی کی روایت میں بھی یہی الفاظ ہیں، علامہ جار اللہ محمود بن عمر زعفری متوفی ۵۲۸ھ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، الکشاف، ج ۲، ص ۲۳۸، مطبوعہ ایران، امام ابو الحسن علی بن احمد الواحدی المتوفی ۴۶۸ھ نے کلبی کی روایت سے اس کا ذکر کیا ہے، اسباب النزول، ص ۲۳۵، رقم الحدیث: ۴۸۹، امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ نے اس کا ذکر کیا ہے، تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۵۱۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ، علامہ ابو الفرج محمد بن علی جوزی متوفی ۵۹۷ھ نے اس کا ذکر کیا ہے، زاد المسیر، ج ۳، ص ۳۸۳، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۰۷ھ، علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی، ۶۶۸ھ نے اس کا ذکر کیا ہے، الجامع لاحکام القرآن جز ۸، ص ۴۰۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ، علامہ عبد اللہ بن عمر بیضاوی متوفی ۶۸۵ھ نے اس کا ذکر کیا ہے، انوار التنزیل مع الکازرونی، ج ۳، ص ۱۲۳، مطبوعہ دار الفکر

بیروت ۱۳۱۶ھ 'علامہ احمد خفاجی متوفی ۱۰۶۹ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'عنایۃ القاضی' ج ۲، ص ۲۹۳، مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۲۸۳ھ 'علامہ محی الدین مصطفیٰ قوجوی متوفی ۹۵۱ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'حاشیہ شیخ زاہد علی السیفادی' ج ۲، ص ۳۱۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے اس کا ذکر کیا ہے 'الدر المشور' ج ۳، ص ۱۱۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت 'علامہ علی بن محمد خازن متوفی ۷۲۵ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'لباب التاویل' ج ۲، ص ۲۱۱، مطبوعہ پشاور 'علامہ نظام الدین حسین بن محمد قتی متوفی ۷۲۸ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'غراب القرآن' ج ۳، ص ۳۲۱، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۳۱۶ھ 'علامہ ابوالیمان محمد بن یوسف اندلسی متوفی ۷۵۳ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'البحر المحیط' ج ۵، ص ۳۵۵، مطبوعہ ۱۳۱۲ھ 'شیخ محمد بن علی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'فتح القدر' ج ۳، ص ۳۲۱، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت 'شیخ سلیمان بن عمر المعروف بالمحمل متوفی ۱۲۹۳ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'الفتوحات الالہیہ' ج ۲، ص ۲۵۸، مطبوعہ قدیمی کتب خانہ کراچی 'علامہ سید محمود آلوسی نے اس کا ذکر کیا ہے 'روح المعانی' ج ۱۰، ص ۳۶۰-۳۷۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت 'مفتی محمد شفیع دیوبندی متوفی ۱۳۹۶ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'معارف القرآن' ج ۴، ص ۲۹۰، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی ۱۳۹۷ھ 'شیخہ مفسرین میں سے سید محمد حسین طباطبائی نے اس کا ذکر کیا ہے 'المیزان' ج ۹، ص ۱۳۲، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ 'طهران' 'شیخ فضل بن حسن طبرسی متوفی ۵۳۸ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'مجمع البیان' ج ۴، ص ۸۶۰، مطبوعہ طهران 'شیخ فخر اللہ کاشانی متوفی ۹۷۷ھ نے اس کا ذکر کیا ہے 'منہج الصادقین' ج ۴، ص ۲۱۵، مطبوعہ ایران 'غیر مقلدین میں سے نواب صدیق حسن خان بھوپالی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے 'فتح البیان' ج ۵، ص ۲۱۸-۲۱۷، مطبوعہ المکتبہ العصریہ، بیروت ۱۳۱۲ھ)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے علم غیب کا ثبوت ہے اور یہ علم غیب آپ کو اللہ عزوجل کی عطا سے حاصل ہوا تھا۔ ہم نے اس کے ثبوت میں اس قدر حوالہ جات اس لیے ذکر کیے ہیں تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ہر کتب فکر کے قدیم اور جدید علماء اسلام کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا علم غیب مسلم اور غیر زاعی ہے۔

بدر کے قیدیوں سے جو مال غنیمت لیا گیا تھا مسلمان ہونے کے بعد ان کو اس سے زیادہ مال مل جانا امام محمد بن اسحاق المطلبی متوفی ۱۵۱ھ لکھتے ہیں:

حضرت عباس بن عبدالمطلب کہتے تھے کہ یہ آیت مبارکہ یا ایہا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسری (الانفال: ۷۰) اللہ کی قسم میرے متعلق نازل ہوئی ہے میں نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا تھا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں اور میں نے کہا تھا کہ میرے بیس اوقیہ (آٹھ سو درہم) جو مجھ سے لیے گئے ہیں وہ مجھے واپس کر دیے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کا انکار کیا پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان بیس اوقیہ کے بدلہ میں بیس غلام عطا کیے جن میں سے ہر ایک میرے مال کی تجارت کرتا تھا۔

(سیرۃ امام ابن اسحاق، مطبوعہ ۱۳۶۸ھ، مطبوعہ معارف اسلامی ایران)

امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی متوفی ۳۶۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عباس بن عبدالمطلب نے فرمایا کہ خدا یہ آیت میرے متعلق نازل ہوئی ہے جب میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ ذکر کیا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں اور یہ سوال کیا کہ مجھ سے جو بیس اوقیہ لیے گئے ہیں ان کو فدیہ کی رقم میں کاٹ لیا جائے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا انکار کیا۔ پھر اللہ نے مجھے ان بیس اوقیہ کے بدلہ میں بیس غلام عطا کیے جن میں سے ہر ایک میرے مال کی تجارت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں میں اللہ عزوجل سے مغفرت کی امید بھی رکھتا ہوں۔

(المعجم الاوسط، ج ۹، ص ۳۹، رقم الحدیث: ۸۱۰۳، مطبوعہ ریاض، المعجم الکبیر ج ۱، ص ۱۳۷، رقم الحدیث: ۱۱۳۹۸)

امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت عباس نے فرمایا مجھ سے جو میں اوقیہ لیے گئے تھے اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بیس غلام عطا کیے جن میں سے ہر ایک میرے مال کی تجارت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے زمزم عطا فرمایا اور اگر مجھے زمزم کے بدلہ میں تمام اہل مکہ کا مال دیا جاتا تو وہ میں پسند نہ کرتا اور اس کے علاوہ میں اپنے رب سے مغفرت کی امید رکھتا ہوں۔

(الطبقات الکبریٰ، ج ۳، ص ۱۵، مطبوعہ دار صادر، بیروت، ج ۱، ص ۱۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۸ھ)

ہرچند کہ اس آیت کے نزول کا سبب حضرت عباس رضی اللہ عنہما کو زیادہ مال مل جاتا ہے لیکن اس آیت کا حکم تمام بدر کے قیدیوں کو شامل ہے کیونکہ اس آیت کے الفاظ میں عموم ہے۔ مثلاً آپ ان لوگوں سے کہئے جو آپ کے قبضہ یا آپ کی قید میں ہیں اور فرمایا جو قیدی ہیں اور فرمایا تمہارے دلوں میں اور فرمایا اللہ تمہیں اس سے زیادہ دے گا اور فرمایا جو تم سے لیا گیا تھا اور فرمایا تم کو بخش دے گا یہ سب عام الفاظ ہیں۔ اور جب خصوصیت مورد اور عموم الفاظ میں تعارض ہو تو ان الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے خصوصیت مورد کا اعتبار نہیں ہوتا۔

اس آیت میں فرمایا ہے جو کچھ تم سے لیا گیا ہے وہ تم کو اس سے خیر (زیادہ اچھی چیز) دے گا اس خیر سے زیادہ مال بھی مراد ہو سکتا ہے۔ لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس سے ایمان اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کو مراد لیا جائے اور یہ کہ وہ کفر اور تمام بری باتوں سے توبہ کریں گے اور مسلمانوں کے خلاف لڑنے سے توبہ کریں گے اور رسول اللہ ﷺ کی نصرت کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کا علم ماضی، حال اور مستقبل، تمام زمانوں پر محیط ہے

اس آیت کا لفظی ترجمہ اس طرح ہے: اگر اللہ تمہارے دلوں میں کسی خیر کو جان لے گا تو تم کو اس سے زیادہ بہتر چیز عطا فرمائے گا جو تم سے بہ طور مال غنیمت لیا گیا ہے۔

بعض لوگوں کا یہ مسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کا اس وقت علم ہوتا ہے جب وہ چیز حادث ہوتی ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بدر کے قیدیوں کے دلوں میں خیر کے جاننے کو شرط اور ان کو اس سے بہتر چیز عطا کرنے کو جزا بنایا ہے اور شرط اور جزاء کا تحقق مستقبل میں ہوتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کو علم نہیں تھا جب ان کے دلوں میں خیر ہوگی تو اللہ اس کو جان لے گا۔ امام رازی متوفی ۶۰۶ھ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس آیت کا ظاہر تو اسی طرح ہے جس طرح ان لوگوں نے تقریر کی ہے لیکن جب دلائل سے یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا حادث ہونا محال ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی صفات حادث ہوں تو وہ محل حوادث ہوگا اور محل حوادث حادث ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ قدیم اور واجب الوجود ہے اس لیے اس آیت میں علم سے مراد معلوم ہے۔ یعنی جب یہ معلوم (ان کے دلوں کی خیر) حادث ہوگا تو اللہ ان کو اس سے بہتر چیز عطا فرمائے گا جو ان سے لی گئی تھی۔ (تفسیر کبیر، ج ۵، ص ۵۱۳، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

ہمارے شیخ علامہ سید احمد سعید کاظمی متوفی ۱۳۰۶ھ قدس سرہ العزیز نے اس آیت میں علم کا معنی علم ظہور کیا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے علم کا حادث ہونا لازم نہیں آتا۔ وہ لکھتے ہیں:

اگر اللہ نے تمہارے دلوں میں کسی بھلائی کو ظاہر کر دیا تو تمہیں اس سے بہتر دے گا جو تم سے (فدیہ) لیا گیا ہے۔

اب ہم اس آیت کے چند مزید تراجم پیش کر رہے ہیں:

شیخ سعدی شیرازی متوفی ۶۹۱ھ اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اگر داند خدا در دل ہائے ثنائی بدھد شمارا بہتر از آنچه گرفتند از شما۔

شاہ ولی اللہ دہلوی متوفی ۱۱۷۶ھ اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اگر داند خدا در دل شامیکی البتہ بدحد شمارا بہتر از آنچه گرفتہ از شام۔

شاہ رفیع الدین متوفی ۱۲۳۳ھ اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اگر جانے گا اللہ بیخ دلوں تمہارے کے بھلائی دیوے گا تم کو بھلائی اس چیز سے کہ لیا گیا ہے تم سے۔

شاہ عبد القادر متوفی ۱۲۳۰ھ اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اگر جانے اللہ تمہارے دلوں میں کچھ نیکی تو دے گا تم کو بہتر اس سے جو تم سے چھن گیا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی متوفی ۱۳۳۰ھ قدس سرہ اس آیت کے ترجمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اگر اللہ نے تمہارے دل میں بھلائی جانی تو جو تم سے لیا گیا اس سے بہتر تمہیں عطا فرمائے گا۔

شیخ محمود الحسن متوفی ۱۳۳۹ھ اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں:

اگر جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ نیکی تو دے گا تم کو بہتر اس سے جو تم سے چھن گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور اگر یہ آپ سے خیانت کا ارادہ کریں تو وہ اس سے پہلے اللہ سے خیانت کر چکے ہیں تو اللہ

نے ان میں سے بعض لوگوں پر آپ کو قادر (غالب) کر دیا اور اللہ بہت جاننے والا ہے حد حکمت والا ہے۔ (الانفال: ۷۱)

اللہ تعالیٰ سے اور رسول اللہ ﷺ سے کفار کی خیانت کا بیان

امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ عباس اور ان کے اصحاب نے نبی ﷺ سے کہا تھا کہ آپ جو کچھ اللہ

کے پاس سے لے کر آئے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں اور ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور ہم آپ کے

متعلق اپنی قوم کو نصیحت کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر انہوں نے اس عہد کو پورا نہیں کیا، آپ سے خیانت کی اور اس

قول کے مطابق عمل نہیں کیا تو آپ افسوس نہ کریں یہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ سے بھی خیانت کر چکے ہیں۔ انہوں نے کفر کیا،

آپ سے قتال کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان پر غلبہ عطا فرمایا۔ (جامع البیان ج ۱۰، ص ۶۶، مطبوعہ دار الفکر، بیروت، ۱۳۱۵ھ)

نبی ﷺ سے خیانت کرنے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ جس کو ہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے ذکر کیا

ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اگر انہوں نے آپ کی نبوت کا انکار کیا تو یہ آپ سے خیانت کی اور اس سے پہلے یہ اللہ کی وحدانیت

کا انکار کر کے اللہ کے ساتھ کفر کر چکے ہیں۔ تیسری خیانت یہ ہے کہ جب نبی ﷺ نے فدیہ لے کر ان کو آزاد کیا تو ان سے یہ

عہد لیا تھا کہ دوبارہ آپ کے خلاف جنگ نہیں کریں گے اور مشرکین سے معاہدہ نہیں کریں گے۔ اگر انہوں نے اس عہد کی

خلاف ورزی کی اور آپ سے خیانت کی تو آپ افسوس نہ کریں یہ پہلے اللہ سے بھی عہد کر کے توڑ چکے ہیں اور اللہ سے عہد کر

کے اس کو توڑنے کی مثال ان آیتوں میں ہے:

قُلْ مَنْ يَنْجِيكُمْ مِمَّنْ ظَلَمْتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

تَدْعُوهُ تَضُرُّعًا وَخُفْيَةً لَّئِنْ أَنْجَيْنَا مِنْ هَذِهِ

لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ قُلِ اللَّهُ يَنْجِيكُمْ

مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ مُشْكِرُونَ ۝

(الانعام: ۶۴-۶۳)

آپ کہنے کہ تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے کون

نجات دیتا ہے، جس کو تم گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارتے ہو کہ اگر

اس نے ہمیں اس (مصیبت) سے نجات دے دی تو ہم ضرور

شکر ادا کرنے والوں میں سے ہوں گے ۝ آپ کہنے کہ اس

(مصیبت) سے اور ہر سختی سے تمہیں اللہ ہی نجات دیتا ہے پھر

بھی تم شرک کرتے ہو۔

اور جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہوا اسی کو پکارتا ہے پھر جب اللہ سے اپنی طرف سے کوئی نعمت عطا فرمادیتا ہے تو وہ اس (مصیبت) کو بھول جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ کو پکارتا تھا اور اللہ کے شریک بنا لیتا ہے تاکہ (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے بہکائے آپ کہتے کہ تم اپنے کفر سے تھوڑا سا فائدہ اٹھا لو، بے شک تم دوزخ والوں میں سے ہو۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِن قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَنْدَادًا لِّبُخْلِ عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ (الزمر: ۸)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو) جگہ فراہم کی اور ان کی نصرت کی یہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی وہ اس وقت تمہاری ولایت میں بالکل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کر لیں اور اگر وہ تم سے دین میں مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے ماسوا اس قوم کے جس کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ ہو اور تم جو کام بھی کرتے ہو اللہ اس کو خوب دیکھنے والا ہے (الانفال: ۷۲)

عہد رسالت میں مومنین کی چار قسمیں

اس آیت (الانفال: ۷۲) میں اور اس سورت کی آخری آیت (الانفال: ۷۵) میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ایمان لانے والوں کی چار قسمیں بیان فرمائی ہیں (۱) مہاجرین اولین، ان کا ذکر آیت ۷۲ کے اس حصہ میں ہے ان الذین امنوا وهاجروا وجاهدوا باموالہم وانفسہم فی سبیل اللہ (۲) انصار، ان کا ذکر آیت مذکورہ کے اس حصہ میں ہے والذین اووا وناصروا (۳) جن مومنین نے صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کی ان کا ذکر الانفال: ۷۵ کے اس حصہ میں ہے والذین امنوا من بعد وهاجروا وجاهدوا معکم (۴) وہ مومنین جنہوں نے فتح مکہ تک ہجرت نہیں کی ان کا ذکر (الانفال: ۷۲) کے اس حصہ میں ہے والذین امنوا ولم یہاجروا۔

مہاجرین اولین کی دیگر مہاجرین اور انصار پر فضیلت

مہاجرین اولین نے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے جہاد کیا۔ کیونکہ جب وہ اپنے وطن کو چھوڑ آئے تو ان کے تمام مال و دولت اور ان کے مکانوں اور تجارت پر کفار مکہ نے قبضہ کر لیا۔ پھر انہوں نے مکہ سے مدینہ آنے کے لیے اور غزوات میں شرکت کرنے کے لیے اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اور انہوں نے اپنی جانوں کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ کیونکہ انہوں نے بغیر ہتھیاروں اور بغیر عددی قوت اور بغیر تیاری کے غزوہ بدر میں کفار کے خلاف جہاد کیا۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اللہ کے حکم پر عمل کرنے اور اس کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے مقابلہ میں ان کو اپنا مال عزیز تھانہ جانے اور چونکہ وہ ہجرت کرنے میں اور اللہ کی راہ میں مال اور جان خرچ کرنے میں بعد کے مسلمانوں پر سابق اور اول تھے اس لیے ہجرت اور جہاد میں وہ بعد کے مسلمانوں کے لیے امام، پیشوا اور مقتدا بن گئے اس لیے ان کا مرتبہ اور اجر و ثواب بعد میں ہجرت کرنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَ
الْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ
اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ (التوبه: ۱۰۰)

مہاجرین اور انصار میں سے سبقت کرنے والے، سب
سے پہلے ایمان لانے والے، اور جن لوگوں نے نیک کاموں
میں ان کی پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے
راضی ہو گئے۔

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ
قَاتَلَ أُولَئِكَ أَكْثَرُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا
مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكَلَّا وَعَدَّ اللَّهُ الْحَسَنِي

جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا
اور جہاد کیا ان کے برابر وہ لوگ نہیں ہو سکتے جنہوں نے (فتح مکہ
کے) بعد خرچ کیا اور جہاد کیا، ان لوگوں کا بہت بڑا درجہ ہے اور
اللہ نے ان سب سے اچھے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔

(الحديد: ۱۰)

السَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۝ أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ

سبقت کرنے والے، سبقت کرنے والے ہیں وہی (اللہ
کے) مقرب ہیں۔

(الواقعه: ۱۰-۱۱)

مہاجرین اولین سابقین نے سب مسلمانوں سے پہلے ہجرت کر کے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اور اس کی راہ میں جہاد کر کے
بعد میں آنے والے مسلمانوں کے لیے اس نیک عمل کی راہ دکھائی اس لیے قیامت تک کے مسلمانوں کی ان نیکیوں کا اجر ان کے
نامہ اعمال کی زینت ہو گا، حدیث شریف میں ہے:

حضرت جریر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے اسلام میں کسی نیک کام کی ابتداء کی اس کو
اپنا اجر بھی ملے گا اور بعد میں اس پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی ملے گا، اور بعد والوں کے اپنے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور
جس شخص نے اسلام میں کسی برے کام کی ابتداء کی اس کو اپنے کام کا گناہ بھی ہو گا اور بعد میں عمل کرنے والوں کے اعمال کا گناہ
بھی ہو گا اور ان کے اپنے کاموں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

(صحیح مسلم الزکوٰۃ ۶۹ (۱۰۱۷) ۲۳۱۳، سنن النسائی رقم الحدیث: ۲۵۵۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۰۳، مسند احمد ج ۳،
ص ۳۵۹، ۳۵۷، المعجم الکبیر ج ۲، رقم الحدیث: ۲۳۳۵، مصنف عبد الرزاق، رقم الحدیث: ۲۱۰۲۵، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۳، ص ۱۷۵، کنز
العمال رقم الحدیث: ۴۳۰۷۸)

لوگوں کی عادت ہے کہ جب وہ اپنی نوع کے لوگوں کو کوئی نیک کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کے دلوں میں بھی اس نیک
کام کرنے کا جذبہ اور داعیہ پیدا ہوتا ہے خواہ وہ کام کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ اور لوگوں پر کوئی مشکل کام اس وقت آسان ہو جاتا
ہے جب وہ اور لوگوں کو بھی وہ کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ سو اس اعتبار سے مہاجرین اولین کو بعد کے مسلمانوں پر بہت بڑی
فضیلت حاصل ہے۔

مومنین انصار کو بھی بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کے ساتھ ان کی طرف
ہجرت کی تھی تو اگر وہ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو مدینہ میں جگہ نہ دیتے اور آپ کی مدد نہ کرتے اور رسول اللہ ﷺ کی
خدمت میں اپنی جان اور اپنے مال کے نذرانے پیش نہ کرتے اور مشکل مہمات میں اصحاب رسول کا ساتھ نہ دیتے تو ہجرت کے
مقاصد پورے نہ ہوتے۔ اس کے باوجود مہاجرین اولین کا مرتبہ انصار مدینہ سے کئی درجہ سے افضل ہے۔

۱- مہاجرین سابقین اولین ایمان لانے میں انصار اور باقی سب مسلمانوں سے افضل ہیں۔ اور ایمان لانا ہی تمام فضیلتوں کا
مبداء اور منشاء ہے۔

۲- مہاجرین اولین مسلسل تیرہ سال کفار قریش کی زیادتیوں اور ظلم و ستم کا شکار ہوتے رہے اور تمام سختیوں پر صبر کرتے رہے۔

۳- انہوں نے اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی خاطر اپنا وطن چھوڑا، عزیز واقارب کو چھوڑا، گھر، تجارت اور باغات کو چھوڑا اور اسلام کی خاطر یہ تمام مصائب مہاجرین نے برداشت کیے۔

۴- رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور آپ کے دین اور آپ کی شریعت کو قبول کرنے کا دروازہ مہاجرین اولین نے کھولا۔ انصار نے ان کی اقتداء کی اور ان کی مشابہت اختیار کی اور مقتدی مقتدی سے افضل ہوتا ہے۔

مہاجرین اور انصار کے درمیان پہلے وراثت کا مشروع پھر منسوخ ہونا

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا یہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں اس جگہ مفسرین کا اختلاف ہے کہ ولایت سے مراد وراثت ہے یا ولایت سے مراد ایک دوسرے کی نصرت اور معاونت ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا اس ولایت سے مراد وراثت ہے اور اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کو ایک دوسرے کا وارث کر دیا تھا اور جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی، وہ اس وقت تک تمہاری ولایت میں نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کر لیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تک وہ ہجرت نہ کر لیں ان کو وراثت نہیں ملے گی اور جب اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے آخر میں فرمایا اور اللہ کی کتاب میں قرابت دار (بہ طور وراثت) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں "تو اس آیت نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا۔ اور اب قرابت وراثت کا سبب ہے اور ہجرت وراثت کا سبب نہیں ہے۔ مجاہد، ابن جریج، قتادہ، عکرمہ، حسن بصری، سدی اور زہری سے بھی اسی قسم کے اقوال مروی ہیں۔

(جامع البیان جز ۱۰، ص ۶۹-۶۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ)

دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں پر نسخ نہیں ہے اور ولایت کا معنی نصرت اور امانت ہے، اور یہی تفسیر راجح ہے۔

ولایت کا معنی بیان کرتے ہوئے علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی متوفی ۵۰۲ھ لکھتے ہیں:

ولایت کا معنی

ولاء اور توالی کا معنی یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایسا حصول ہو جو پہلے حاصل نہ تھا۔

اور اس کا قرب کے لیے استعارہ کیا جاتا ہے۔ خواہ قرب بہ حیثیت مکان ہو یا قرب بہ حیثیت نسب ہو یا قرب بہ حیثیت

دین ہو یا بہ حیثیت دوستی قرب ہو یا بہ حیثیت نصرت اور اعتقاد قرب ہو۔

اور ولایت (واؤ کی زیر کے ساتھ) کا معنی نصرت ہے اور ولایت (واؤ کی زیر کے ساتھ) کا معنی ہے کسی امر کا والی ہونا اور

اس میں تصرف کرنا۔ اور ولی اور مولیٰ ان میں سے ہر معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسم فاعل کے معنی میں یعنی ناصر، اور کار ساز اور

اسم مفعول کے معنی میں یعنی منصور، واللہ ولی المؤمنین (آل عمران: ۶۸) اس کا معنی ہے اللہ مومنین کا ناصر اور کار ساز

ہے اور مومنین اللہ کے ولی ہیں یعنی اللہ کے منصور ہیں اللہ ان کی نصرت اور مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کے

درمیان ولایت کی نفی کر دی ہے یا ایہا الذین امنوا لاتتخذوا الیہود والنصری اولیاء (المائدہ: ۵۱) یعنی یہود

اور نصاریٰ کو اپنا ناصر اور مددگار نہ بناؤ۔ اسی طرح فرمایا مالکم من ولايتہم من شیء (الانفال: ۷۲) یعنی تم ان کی مطلقاً

نصرت نہ کرو۔ (المفردات، ج ۲، ص ۶۹۳-۶۹۴، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ، ۱۳۱۸ھ)

علامہ مجد الدین ابو العادات المبارک بن محمد ابن الاثیر جززی المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے اسماء میں ولی ہے اس کا معنی ہے ناصر اور ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی ہے تمام عالم اور مخلوقات کا مربی اور منتظم، اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے والی ہے اس کا معنی ہے تمام اشیاء کا مالک اور ان میں تصرف کرنے والا اور ولایت کا لفظ تدبیر، قدرت اور فعل کی خبر دیتا ہے اور جب تک کسی چیز میں یہ معانی جمع نہ ہوں اس پر والی کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔ حدیث میں لفظ مولیٰ بہ کثرت استعمال ہوا ہے اور یہ ان معانی میں ہے: رب، مالک، سید، منعم، معتنق (آزاد کرنے والا)، ناصر، محب، تابع، پڑوسی، عم زاد، حلیف، عقید (جس سے معاہدہ کیا ہو) سسرالی رشتہ دار، غلام، آزاد کردہ، ان میں سے اکثر معنی میں مولیٰ کا لفظ حدیث میں وارد ہے اور حدیث کا سیاق و سباق جس معنی کا مقتضی ہو مولیٰ کا لفظ اسی معنی پر محمول کیا جاتا ہے اور ہر وہ شخص جو کسی چیز کا مالک ہو یا اس کا انتظام کرے وہ اس کا مولیٰ اور ولی ہے اور کبھی ان اسماء کے مصادر مختلف المعنی ہوتے ہیں۔ پس ولایت (زیر کے ساتھ) کا معنی نسب میں قریب اور نصرت اور آزاد کرنے والا ہے اور ولایت (زیر کے ساتھ) کا معنی امارت ہے اور ولاء کا معنی آزاد شدہ ہے۔

(التمایہ ج ۵، ص ۱۹۸-۱۹۷، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۸ھ)

چونکہ ولایت کا معنی نسبی قرابت بھی ہے اس لیے اس آیت میں وراثت کے معنی کی بھی گنجائش ہے۔ لیکن قرآن مجید میں کم سے کم نسخ کو ماننے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو نصرت کے معنی پر محمول کیا جائے اور سیاق و سباق سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ کفار سے معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے دار الحرب کے مسلمانوں کی مدد نہ کرنا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا اگر وہ تم سے دین میں مدد طلب کریں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے۔ ماسوا اس قوم کے جس کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ ہو۔

یعنی جن مسلمانوں نے دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی، پھر انہوں نے دار الحرب سے رہائی حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں سے ان کی فوجی قوت یا مال سے مدد طلب کی تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کو ناامید اور نامراد نہ کریں۔ ہاں اگر وہ کسی ایسی کافر قوم کے خلاف تم سے مدد طلب کریں جس قوم کے ساتھ ایک مدت معین تک کا تمہارا معاہدہ ہو تو پھر تم اس معاہدہ کو نہ توڑو، جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے حدیبیہ کے دن مشرکین سے تین شرائط پر صلح کی۔ مشرکین میں سے جو شخص مسلمانوں کی طرف آئے گا وہ اس کو انہیں واپس کر دیں گے، اور مسلمانوں کی طرف سے جو مشرکین کے پاس جائے گا وہ اس کو واپس نہیں کریں گے، اور یہ کہ اگلے سال مسلمان عمرہ کے لیے آئیں گے اور صرف تین دن مکہ مکرمہ میں ٹھہریں گے اور اپنے ہتھیاروں کو میان میں رکھ کر آئیں گے مثلاً تلوار اور تیر کمان وغیرہ۔ پھر حضرت ابو جندل بیزویوں میں چلتے ہوئے مسلمانوں کی طرف آئے تو نبی ﷺ نے انہیں مشرکین کی طرف واپس کر دیا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۲۷۰۰، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۱۲ھ)

امام ابن ہشام متوفی ۲۱۸ھ لکھتے ہیں:

جس وقت رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو صلح نامہ لکھ رہے تھے اس وقت سہیل کے بیٹے حضرت ابو جندل بن سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ اپنی بیویوں میں گھسٹتے ہوئے آئے اور اچانک رسول اللہ ﷺ کے سامنے آگئے اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو اپنی فتح کے متعلق کوئی شک نہیں تھا اور اس کا سبب رسول اللہ ﷺ کا خواب تھا۔ اور جب انہوں نے صلح اور رجوع کا معاملہ دیکھا اور یہ دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی شرائط مان لی ہیں تو ان کو اتنا زیادہ رنج اور قلق ہوا کہ لگتا تھا وہ شدت غم سے ہلاک ہو جائیں گے۔ جب سہیل نے اپنے بیٹے ابو جندل کو دیکھا تو ان کے پاس گیا اور ان کے منہ پر تھپڑ مارے اور ان کو گریبان

تبیان القرآن

جلد چہارم

سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹنے لگا اور اس نے کہا یا محمد (ﷺ) ہمارے اور آپ کے درمیان اس کے آنے سے پہلے معاہدہ مکمل ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا تم نے سچ کہا۔ پھر وہ حضرت ابو جندل کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا تاکہ ان کو قریش کی طرف لے جائے اور حضرت ابو جندل بلند آواز سے فریاد کرنے لگے اے مسلمانو! کیا میں مشرکین کی طرف لوٹا دیا جاؤں گا؟ یہ مجھے میرے دین کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کریں گے۔ مسلمانوں کو ان کی فریاد کی وجہ سے اور زیادہ قلق ہوا تب رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا اے ابو جندل! صبر کرو اور اجر و ثواب کی نیت کرو، تمہیں اور دوسرے کمزور مسلمانوں کو اللہ نجات دینے والا ہے اور ان کے لیے کشارگی کرنے والا ہے، اور میں ان لوگوں سے صلح کا معاہدہ کر چکا ہوں اور میں ان سے عہد شکنی نہیں کروں گا۔ پھر حضرت ابو جندل دل شکستہ ہو کر اپنے باپ کے ساتھ چلے گئے اور معاہدہ پورا ہو گیا۔

(سیرت ابن ہشام ج ۳، ص ۳۳۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۵ھ)

نیز امام ابن ہشام لکھتے ہیں:

جب رسول اللہ (ﷺ) مدینہ پہنچے تو آپ کے پیچھے ابو بصیر عقبہ بن اسید بھی مدینہ پہنچ گئے یہ ان مسلمانوں میں سے تھے جن کو مکہ میں قید کر کے رکھا گیا تھا۔ جب رسول اللہ (ﷺ) مدینہ پہنچے تو ان کی بازیابی کے لیے ازہر بن عبد عوف اور انخس بن شریق نے آپ کو خط لکھا اور بنو عامر بن لوی کے ایک شخص اور ان کے آزاد کردہ غلام کو انہیں لینے کے لیے مدینہ منورہ بھیجا۔ وہ دونوں ازہر اور انخس کا خط لے کر رسول اللہ (ﷺ) کے پاس آئے۔ رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا اے ابو بصیر! ہم نے ان لوگوں سے جو معاہدہ کیا ہے وہ تم کو معلوم ہے اور ہمارے دین میں عہد شکنی کی گنجائش نہیں ہے اور اللہ تمہارے لیے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لیے نجات اور کشارگی کی صورت پیدا کرنے والا ہے، تم اپنی قوم کے پاس واپس چلے جاؤ۔ حضرت ابو بصیر نے کہا یا رسول اللہ! آپ مجھے مشرکین کی طرف لوٹا رہے ہیں وہ مجھے میرے دین کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کر دیں گے! آپ نے فرمایا اے ابو بصیر! تم واپس جاؤ عنقریب اللہ تمہاری رہائی کی صورت پیدا کر دے گا۔

(سیرت ابن ہشام ج ۳، ص ۳۵۲، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۵ھ)

امام محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ لکھتے ہیں:

ابو جندل بن سہیل بن عمرو مکہ میں بہت پہلے اسلام لا چکے تھے ان کے باپ سہیل نے ان کو زنجیروں سے باندھ کر مکہ میں قید کیا ہوا تھا اور ان کو ہجرت کرنے سے روک دیا تھا۔ حدیبیہ کی صلح کے بعد یہ رہا ہو کر مقام العیص میں پہنچ گئے اور حضرت ابو بصیر سے مل گئے۔ (حضرت ابو بصیر کو جو دو آدمی لینے آئے تھے انہوں نے ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا مکہ بھاگ گیا تھا۔ وہ پھر مدینہ گئے لیکن رسول اللہ (ﷺ) نے معاہدہ کی پاس داری کی وجہ سے ان کو قبول نہیں کیا۔ پھر یہ مدینہ سے نکل کر مقام العیص پہنچ گئے حضرت ابو جندل بھی ان سے آئے۔ اس طرح وہاں تقریباً ستر مسلمان مکہ سے بھاگ کر ان کے پاس آ گئے ان کو مکہ سے آنے والا جو کافر ملتا یہ اس کو قتل کر دیتے اور کفار کے جو قافلے وہاں سے گزرتے ان کو لوٹ لیتے۔ حتیٰ کہ قریش نے رسول اللہ (ﷺ) کو خط لکھا کہ وہ مکہ سے آنے والے مسلمانوں کو واپس کرنے کی شرط سے دست بردار ہوتے ہیں تب رسول اللہ (ﷺ) نے ان کو مدینہ آنے کی اجازت دے دی اور یہ لوگ مدینہ آ گئے۔ (سیرت ابن ہشام ج ۳، ص ۳۵۲-۳۵۳) پھر حضرت ابو جندل، حضرت ابو بصیر کے پاس رہے حتیٰ کہ حضرت ابو بصیر وہاں وفات پا گئے اور حضرت ابو جندل دیگر مسلمانوں کے ساتھ رسول اللہ (ﷺ) کے پاس مدینہ پہنچ گئے۔ اور رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے اور رسول اللہ (ﷺ) کے وصال کے بعد بھی مسلمانوں کے ساتھ جہاد کرتے رہے اور حضرت عمر بن الخطاب کے دور خلافت میں ۱۸ھ کو شام میں فوت

ہو گئے۔ (الطبقات الکبریٰ ج ۷، ص ۲۸۳، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۸ھ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے، ان میں سے بعض، بعض کے ولی ہیں، اگر تم ان احکام پر عمل نہیں کرو گے تو زمین میں بہت بڑا فتنہ اور فساد ہو گا۔ (الانفال: ۷۳)

دو مختلف ملتوں کے ماننے والوں کے مابین دوستی اور وراثت جائز نہیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں کے درمیان ولایت (نصرت اور وراثت) کو منقطع کر دیا ہے۔ اور مومنوں کو مومنوں کا ولی بنایا اور کافروں کو کافروں کا ولی بنایا۔ کفار اپنے دین اور معتقدات کے اعتبار سے ایک دوسرے کی نصرت کرتے ہیں اگر کسی کافر عورت کا مسلمان بھائی ہو تو وہ اس کا ولی نہیں ہے اور وہ اس کا نکاح نہیں کر سکتا، کیونکہ ان کے درمیان ولایت نہیں ہے۔ اس کا نکاح اس کا ہم مذہب ولی کرے گا۔ جس طرح مسلمان عورت کا نکاح صرف مسلمان ولی ہی کر سکتا ہے، اگر اس کا باپ یا دادا کافر ہو تو وہ اس کا نکاح نہیں کر سکتا اسی طرح کافر مسلمان کا اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا نہ مسلمان کافر کا وارث ہو گا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہو گا۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۴۲۸۳، ۴۲۸۲، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۹۰۹، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۱۳، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۴۷۲۹)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو مختلف ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے۔ (سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۹۰۱، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۳ھ)

حضرت ابو حاتم مزنی بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تمہارے پاس ایسے رشتہ کا پیغام آئے جس کے دین اور خلق پر تم راضی ہو تو اس کے ساتھ نکاح کر دو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بہت فتنہ اور فساد ہو گا۔

(سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۰۸۶، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۹۶۷)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو) جگہ دی اور ان کی نصرت کی وہی لوگ برحق مومن ہیں ان کے لیے بخشش ہے اور عزت والی روزی ہے۔ (الانفال: ۷۳)

اس آیت پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اس آیت میں تکرار ہے کیونکہ آیت ۷۲ میں بھی یہی مضمون بیان فرمایا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت ۷۲ سے مقصود یہ تھا کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان ولایت کو بیان کیا جائے اور اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ مہاجرین اور انصار کی تعریف و توصیف کی جائے کیونکہ ان کا ایمان کامل ہے اور یہ برحق مومن ہیں۔ مہاجرین اولین نے ایمان کے تقاضوں پر عمل کیا، انہوں نے اسلام کی خاطر اپنے وطن کو چھوڑا، عزیز و اقارب کو چھوڑا، مال و دولت اور مکانوں اور باغات کو چھوڑا۔ اسی طرح انصار نے بھی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کے لیے اپنے دیدہ و دل کو فرش راہ کیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ جہاد کیا سو وہ بھی تم میں سے ہیں اور اللہ کی کتاب میں قرابت دار (بہ طور وراثت) ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ (الانفال: ۷۵)

ہجرت کی تعریف اور ہجرت کے متعلق مختلف النوع احادیث

اس آیت سے وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے صلح حدیبیہ اور بیعت رضوان کے بعد ہجرت کی۔ اور اس ہجرت کا مرتبہ پہلی ہجرت

سے کم ہے۔ حدیبیہ کے بعد دو سال تک صلح کا زمانہ رہا پھر مکہ فتح ہو گیا اور ہجرت بھی ختم ہو گئی۔ ہجرت کی تعریف یہ ہے دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف نکلنا یا دارالخوف سے دارالامن کی طرف نکلنا۔ جیسے مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ یا حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ ایک قول یہ ہے کہ شہوات، منکرات، اخلاق ذمہ اور معاصی کو ترک کرنا ہجرت ہے۔ (المفردات، ج ۲، ص ۶۹۸)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا اب ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور نیت ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۸۳۳، صحیح مسلم الحج ۳۴۵ (۱۳۵۳) ۳۲۳۳، سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۰۱۸، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۵۹۶، سنن التسائی رقم الحدیث: ۲۸۷۳، سنن کبریٰ للنسائی رقم الحدیث: ۳۸۵۷، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۷۳)

حضرت مجاشع بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنے بھائی حضرت مجاہد کو لے کر نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ یہ مجاہد ہیں جو آپ سے ہجرت پر بیعت کریں گے، آپ نے فرمایا فتح (مکہ) کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن میں اس کو اسلام پر بیعت کروں گا۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۰۷۹، ۳۰۷۸، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت)

عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبید بن عمریشی کے ہمراہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زیارت کی۔ ہم نے آپ سے ہجرت کے متعلق سوال کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اب ہجرت نہیں ہے، پہلے مسلمان اپنے دین کے سبب سے اللہ اور رسول کی طرف بھاگتے تھے، کیونکہ ان کو یہ خوف تھا کہ وہ اپنے دین کی وجہ سے کسی آزمائش میں مبتلا نہ ہو جائیں، لیکن اب اللہ تعالیٰ اسلام کو غلبہ عطا فرما چکا ہے، اب مسلمان جہاں چاہیں اپنے رب کی عبادت کریں البتہ جہاد اور نیت باقی ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۹۰۰، مطبوعہ بیروت)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ آپ کی طرف ہجرت کرنے کی کون سی جگہ ہے؟ آپ جہاں کہیں ہوں یا کسی خاص جگہ پر؟ آیا کسی خاص قوم پر ہجرت فرض ہے؟ یا جب آپ رحلت فرما جائیں گے تو ہجرت منقطع ہو جائے گی؟ رسول اللہ ﷺ ایک ساعت خاموش رہے، پھر آپ نے فرمایا وہ سائل کہاں ہے؟ اس نے کہا میں حاضر ہوں یا رسول اللہ آپ نے فرمایا جب تم نماز پڑھو، اور زکوٰۃ ادا کرو تو تم مہاجر ہو خواہ تم ارض یمامہ میں فوت ہو، اور ایک روایت میں ہے کہ ہجرت یہ ہے کہ تم ظاہر اور باطن میں بے حیائی کے کام ترک کر دو اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ ادا کرو تو پھر تم مہاجر ہو۔ (مسند البرزازی رقم الحدیث: ۱۷۵۰)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہجرت اس وقت تک منقطع نہیں ہوگی جب تک کہ توبہ منقطع نہ ہو، اور توبہ اس وقت تک منقطع نہیں ہوگی جب تک کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۴۷۹، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۳ھ)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مہاجر وہ ہے جو اللہ کے منع کیے ہوئے کاموں کو ترک کر دے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۰)

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے ساتھ رہے، ان کے (چولھوں میں) ایک ساتھ آگ جلتی ہوئی نہ دیکھی جائے۔

(المعجم الکبیر ج ۳، رقم الحدیث: ۳۸۳۶، حافظ البیہقی نے لکھا ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں، مجمع الزوائد ج ۵، ص ۲۵۳)

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے یہ زمین اللہ کی زمین ہے

اور یہ لوگ اللہ کے بندے ہیں، جس جگہ تم کو خیر ملے وہاں رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

(المعجم الکبیر ج ۱، رقم الحدیث: ۲۵۰، حافظ البیہقی نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں بعض راویوں کو میں نہیں پہچانتا، مجمع الزوائد ج ۵، ص ۲۵۵)

ہجرت کے مختلف معانی

علامہ مجد الدین المبارک بن محمد بن اشیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں

حدیث میں ہجرت کا بہت زیادہ ذکر ہے، ایک حدیث میں ہے فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔

(صحیح البخاری رقم الحدیث: ۳۰۷۹، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۱۳۵۳، مسند احمد ج ۱، ص ۲۲۶)

اور ایک حدیث میں ہے: ہجرت اس وقت تک منقطع نہیں ہوگی جب تک کہ توبہ منقطع نہ ہو۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۲۶، مسند احمد ج ۱، ص ۱۹۲)

ہجر کا لغوی معنی وصل کی ضد ہے یعنی فراق، پھر اس کا غالب اطلاق ایک زمین سے دوسری زمین کی طرف نکلنے اور دوسری

زمین کی خاطر پہلی زمین کو ترک کرنے پر کیا جانے لگا۔

ہجرت کی دو قسمیں ہیں ایک ہجرت وہ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے:

بے شک اللہ نے مسلمانوں کی جانوں اور ان کے مالوں کو

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَ

جنت کے بدلہ خرید لیا۔

أَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ: ۱۱۱)

ایک شخص نبی ﷺ کے پاس اپنے اہل و عیال اور مال چھوڑ کر آجاتا اور ان میں سے کسی چیز کی طرف رجوع نہ کرتا اور

جس جگہ ہجرت کی تاحیات وہیں رہتا۔ اور نبی ﷺ اس بات کو ناپسند کرتے تھے کہ کوئی شخص اس جگہ مرجائے جہاں سے اس

نے ہجرت کی تھی۔ اسی بنا پر آپ نے حضرت سعد بن خولہ کی مکہ میں موت پر افسوس کیا وہ حج کے لیے مدینہ سے مکہ آئے اور

وہیں فوت ہو گئے تھے۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۱۲۹۵)

اور جب آپ مکہ میں آئے تو آپ نے دعا کی اے اللہ! ہمیں مکہ میں موت نہ دینا۔ (مسند احمد ج ۲، ص ۲۵) اور جب مکہ

دارالاسلام بن گیا تو وہ مدینہ کی طرح ہو گیا اور ہجرت منقطع ہو گئی۔

ہجرت کی دوسری قسم وہ ہے جو دہائیوں نے ہجرت کی اور مسلمانوں کے ساتھ غزوات میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے

اس طرح کے افعال نہیں کیے جس طرح پہلی ہجرت کرنے والوں نے کیے تھے، پس وہ مہاجر تو ہیں لیکن مہاجرین اولین کی فضیلت

میں داخل نہیں ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے جو فرمایا ہے ہجرت اس وقت تک منقطع نہیں ہوگی جب تک کہ توبہ منقطع نہ ہو

اس سے یہی ہجرت مراد ہے۔

ان ہی احادیث میں سے ایک یہ حدیث ہے ہجرت کرو اور تکلف اور تصنع سے مہاجر نہ بنو۔ یعنی اللہ کے لیے اخلاص سے

ہجرت کرو اور بغیر صحیح ہجرت کے مہاجرین کے ساتھ مشابہت نہ کرو۔ ان احادیث میں سے یہ حدیث بھی ہے کہ کسی مسلمان کے

لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ہجرت (ترک تعلق و ترک سلام و کلام) کرے۔

(صحیح مسلم البرواہلہ، ۲۵، ۲۵۶، ۶۳۱۲، مسند احمد ج ۲، ص ۳۷۸)

اس ہجرت سے وصل کی ضد مراد ہے۔ یعنی ایک مسلمان دوسرے کسی مسلمان کی کسی دنیاوی کوتاہی کی بناء پر اس سے

ترک تعلق نہ کرے البتہ دین میں کسی بد عقیدگی کی بناء پر یا کسی غیر شرعی کام کی بناء پر ترک تعلق جائز ہے، کیونکہ اہل اہواء اور

اہل بدعت سے دائمی ہجرت (ترک تعلق) رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص علانیہ معصیت سے توبہ نہ کرے اس

سے ہجرت ضروری ہے، کیونکہ جب حضرت کعب بن مالک اور ان کے دیگر اصحاب نے بلاعذر غزوہ تبوک میں شرکت نہیں کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ ان سے ہجرت کر لیں یعنی ترک تعلق کریں حتیٰ کہ ان کی ازواج کو بھی ان سے ترک تعلق کا حکم دیا، مسلمانوں نے پچاس دن تک ان سے ترک تعلق رکھا اور ان کی ازواج نے ان سے ایک ماہ تک، اور حضرت عائشہ نے ایک ماہ تک حضرت ابن الزبیر سے ترک تعلق رکھا۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے بعض لوگ اللہ کا ذکر صرف اس حال میں کرتے ہیں کہ وہ مہاجر ہوتے ہیں یعنی ان کے قلب نے زبان سے ہجرت کی ہوئی ہوتی ہے زبان ذکر کرتی ہے اور دل غافل ہوتا ہے، یعنی وہ اخلاص سے اللہ کا ذکر نہیں کرتے۔

(النہایہ، ج ۵، ص ۲۱۳-۲۱۱، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۸ھ)

ہجرت کی مختلف النوع احادیث میں تطبیق

ہجرت سے متعلق جن احادیث کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض احادیث میں یہ صراحت ہے کہ ہجرت کبھی منقطع نہیں ہوگی اور بعض میں یہ وضاحت ہے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت منقطع ہو جائے گی، بعض احادیث میں ہے کہ مسلمان زمین پر کہیں بھی قیام کر سکتا ہے اور بعض میں مشرکین کے ساتھ قیام کی ممانعت ہے۔ اور بعض احادیث میں یہ تصریح ہے کہ ہجرت تو صرف گناہوں کو ترک کرنا ہے۔

علامہ بدر الدین عینی نے ان متعارض احادیث کے حسب ذیل جوابات ذکر کیے ہیں:

- ۱- جن احادیث میں فتح مکہ کے بعد ہجرت منقطع ہونے کا بیان ہے وہ صحاح کی احادیث ہیں اور جن احادیث میں قیامت تک ہجرت باقی رہنے کا ذکر ہے وہ سنن کی روایات ہیں اور صحاح کی احادیث کو سنن کی روایات پر ترجیح ہے۔
- ۲- علامہ خطابی نے کہا ہے کہ ابتداء اسلام میں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرض تھی، اب یہ فرضیت منسوخ ہو گئی اور جو ہجرت قیامت تک باقی رہے گی وہ مستحب ہے۔
- ۳- علامہ ابن اثیر نے کہا ہے کہ ہجرت کی دو قسمیں ہیں ایک قسم یہ ہے کہ ایک شخص اپنے وطن، اہل و عیال اور مال سے ہجرت کر کے مدینہ چلا جاتا اور پھر کبھی ان چیزوں کی طرف واپس نہ لوٹتا اس ہجرت پر اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ فرمایا ہے۔ فتح مکہ کے بعد یہ ہجرت منسوخ ہو گئی۔ ہجرت کی دوسری قسم یہ ہے کہ کفار کے علاقہ سے ہجرت کر کے مسلمانوں کے علاقہ میں آجائے اور اس میں ہجرت کی پہلی قسم کی طرح شدت نہیں ہے۔
- ۴- کفار کے علاقہ سے مسلمانوں کے علاقہ کی طرف ہجرت منسوخ ہو گئی اور جو ہجرت باقی ہے وہ گناہوں سے ہجرت کرنا اور ان کو ترک کرنا ہے۔

- ۵- جس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے مشرکین کے ساتھ رہنے سے بیزاری کا اظہار فرمایا ہے اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں رہنے سے مسلمانوں کو اپنے دین، جان، مال اور عزت و آبرو کی بربادی کا خطرہ ہو۔ جہاں اسلامی شعائر، فرائض اور واجبات کی ادائیگی سے ممانعت ہو یا جہاں کی تہذیب، کلچر اور سوسائٹی کے پرے اثرات سے مسلمانوں کے عقائد اور معمولات محفوظ نہ رہیں اور زمین کے جس حصہ میں مسلمانوں کے عقائد کو خطرہ نہ ہو اور وہ آزادی کے ساتھ وہاں اپنی عبادات کو انجام دے سکیں وہاں مسلمانوں کے رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (عمدة القاری ج ۱، ص ۳۵، مطبوعہ ادارة الطباعة المنيرية مصر، ۱۳۳۸ھ)

فتح مکہ کے بعد ہجرت کے منسوخ ہونے کی وجوہات

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: علامہ خطابی وغیرہ نے کہا ہے کہ ابتداء اسلام میں مدینہ کی طرف ہجرت کرنا فرض تھا کیونکہ

مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی تعداد کم تھی اور انہیں جمعیت کی ضرورت تھی۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے مکہ کو فتح کر دیا اور لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے تو مدینہ کی طرف ہجرت منسوخ ہو گئی اور تبلیغ اسلام اور دشمن سے مدافعت کے لیے جہاد کی فرضیت باقی رہی۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابتداء میں مدینہ منورہ ہجرت کرنا اس لیے بھی فرض تھا کہ جو شخص اسلام قبول کرتا تھا اس کو کفار ایذا دیتے تھے اور اس وقت تک اس پر ظلم کرتے رہتے تھے جب تک کہ وہ (العیاذ باللہ) دین اسلام کو چھوڑ نہیں دیتا اور انہی لوگوں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی:

بے شک جن لوگوں کی جانیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے تو فرشتے ان سے کہتے ہیں تم کیا کرتے رہے؟ وہ کہتے ہیں ہم زمین میں بے بس تھے! فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! البتہ مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے جو (واقعی) بے بس (اور مجبور) ہیں، جو کسی تدبیر کی استطاعت رکھتے ہیں اور نہ کہیں کاراستہ جانتے ہیں، تو قریب ہے کہ اللہ ان لوگوں سے درگزر فرمائے اور اللہ بہت معاف فرمانے والا اور بے حد بخشنے والا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَقَّعْتُمُ الْمَلَائِكَةَ ظَالِمِي
أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ لَقَالُوا كُنَّا
مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضَ
اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَا لَهُمْ
جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۝ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ
مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ
حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ۝ فَأُولَئِكَ عَسَى
اللَّهُ أَنْ يَعْفُو عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفُورًا
(النساء: ۹۹-۹۷)

جو شخص دارا کفر میں اسلام لائے اور اس سے نکلنے پر قادر ہو اس کے حق میں ہجرت اب بھی باقی ہے کیونکہ سنن نسائی میں حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ مشرک کے اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے کسی عمل کو اس وقت تک قبول نہیں کرتا جب تک کہ وہ مشرکین سے علیحدہ نہ ہو جائے اور سنن ابوداؤد میں حضرت سمرہ بنی اشجہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ہر اس مسلمان سے بیزار ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہے یہ حدیث ان لوگوں پر محمول ہے جن کو یہ خدشہ ہو کہ اگر وہ دارا کفر میں رہے تو ان کا دین خطرہ میں پڑ جائے گا۔

(فتح الباری، ج ۶، ص ۱۹۰، مطبوعہ لاہور، ۱۳۰۱ھ)

دارا کفر میں مسلمانوں کی سکونت کا حکم

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں لاہجرۃ بعد الفتح فتح کے بعد ہجرت نہیں ہے کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ مطلقاً فتح کے بعد ہجرت نہیں ہے خواہ مکہ مکرمہ فتح ہو یا کوئی اور شہر، لہذا اب اگر مسلمان کسی شہر کو فتح کر لیں تو ان پر ہجرت واجب نہیں ہے، لیکن اگر کسی شہر کو مسلمانوں نے فتح نہیں کیا تو وہاں کے رہنے والوں کے متعلق تین قول ہیں:

۱- پہلا قول: جو شخص دارا کفر میں دین کا اظہار نہ کر سکتا ہو اور فرائض اور واجبات کو ادا نہ کر سکتا ہو اور وہ دارا کفر سے نکلنے کی استطاعت رکھتا ہو اس پر ہجرت کرنا واجب ہے۔

۲- دوسرا قول: مسلمان دارا کفر میں فرائض اور واجبات کو آزادی سے ادا کر سکتے ہوں اور ہجرت کرنے کی بھی استطاعت رکھتے ہوں پھر بھی ان کے لیے دارا کفر سے ہجرت کرنا مستحب ہے تاکہ دارالاسلام میں مسلمانوں کی کثرت اور جمعیت ہو اور وہ

بوقت ضرورت مسلمانوں کے ساتھ جماد میں شامل ہو سکیں اور دارا لکفر میں کفار کی بد عمدی اور فتنہ سے محفوظ رہیں اور کافروں کی تہذیب اور ثقافت اور ان کے معاشرے کی بے راہ روی، بد چلنی اور فحاشی کے برے اثرات سے مامون رہیں اور کفار اپنے دین کی اشاعت اور مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کرنے کی جو کوششیں کرتے ہیں ان کے خطرات سے مسلمان محفوظ رہیں۔

۳- تیسرا قول: جو مسلمان قید، مرض یا کسی اور عذر کی بنا پر دارا لکفر سے ہجرت نہ کر سکتا ہو اس کے لیے دارا لکفر میں رہنا جائز ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ تکلیف اور مشقت اٹھا کر ہجرت کرے تو ماجور ہوگا۔

(فتح الباری، ج ۶، ص ۳۸، مطبوعہ لاہور ۱۳۰۱ھ)

ہجرت کی اقسام

علامہ بدر الدین عینی حنفی نے ہجرت کی حسب ذیل اقسام ذکر کی ہیں:

۱- دارالخوف سے دارالامن کی طرف ہجرت، جیسا کہ مسلمانوں نے مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کی، یا اب ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے مظالم سے تنگ آ کر انگلینڈ، امریکہ یا مغربی جرمنی کی طرف ہجرت کر جائیں۔

۲- دارا لکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا، جیسا کہ فتح مکہ سے پہلے مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی، یا اب بھارت سے پاکستان کی طرف ہجرت کرنا۔ اسی طرح جو شخص دارا لکفر میں اظہار دین پر قادر نہ ہو اس کا دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنا۔

۳- قرب قیامت میں فتنوں کے ظہور کے وقت مسلمانوں کا شام کی طرف ہجرت کرنا۔ چنانچہ سنن ابوداؤد میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا عنقریب ایک ہجرت کے بعد دوسری ہجرت ہوگی، سو روئے زمین کے اچھے لوگ حضرت ابراہیم کی ہجرت کی جگہ (شام) میں چلے جائیں گے اور باقی زمین پر بدترین لوگ رہ جائیں گے۔

۴- برائیوں اور گناہوں سے ہجرت کرنا۔ (عمدة القاری ج ۱، ص ۳۵، مطبوعہ ادارة الطباعة المنيرية، مصر ۱۳۲۸ھ)

ایک اور قسم کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ ہے:

۵- ماسوا اللہ کو ترک کر کے اللہ کی طرف ہجرت کرنا (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہی ہے۔ بخاری)

ہجرت الی اللہ کی توضیح

اللہ کی طرف ہجرت کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو رضائے الہی میں اس طرح ڈھال لے کہ اس کے دل میں ہر کام کا محرک اور داعی اللہ کا حکم ہو، اور طبعی تقاضے شرعی تقاضوں کے مظہر ہو جائیں حتیٰ کہ وہ اس منزل پر آجائے کہ اس کا کھانا پینا بھی اس نیت سے ہو کہ چونکہ اللہ نے کھانے پینے کا حکم دیا ہے اس لیے وہ کھاتا پیتا ہے ورنہ اس کو لاکھ بھوک اور پیاس لگتی، وہ کھانے پینے کی طرف التفات نہ کرتا۔ اس مقام کا خلاصہ یہ ہے کہ بندے کے ہر کام کی نیت اور جذبہ یہ ہو کہ چونکہ اللہ کا حکم ہے اس لیے وہ اس کام کو کر رہا ہے اور اگر اللہ کا حکم نہ ہوتا تو خواہ کچھ ہوتا وہ اس کام کو نہ کرتا۔ اسی مرتبہ کو اللہ تعالیٰ نے صبغہ اللہ سے تعبیر فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اسی مقام کی طرف اس حدیث میں ہدایت دی ہے۔

اللہ کی صفات سے متصف ہو جاؤ اقبال نے اسی منزل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

در دشت جنون من جبریل زیوں صیدے

یزداں بکمند اور اے ہمت مردانہ!

یعنی انسان کے لیے ملکوتی صفات اپنانا حتیٰ کہ مظہر جبرئیل ہونا بھی کمال نہیں ہے۔ اس کا مقام تو یہ ہے وہ الوہی صفات اپنا کر اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے اور مظہر رب جبرئیل ہو جائے۔ چنانچہ بندہ اگر کسی پر رحم کرے تو اس لیے کہ اس کا رب رحیم ہے اور اگر کسی پر غضب ناک ہو تو اس لیے کہ اس کا رب قہار ہے، اور انہیں پر رحم کرے جن پر اس کا رب رحم کرنا چاہتا ہے اور انہیں پر غضب ناک ہو جن پر اس کا رب اس سے غضب ناک ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ اسی طرح ہجرت الی الرسول کا مطلب بھی یہ ہے کہ اپنی سیرت کو رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے تابع کرے اور چونکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی اور حکم الگ الگ اور مغائر نہیں ہیں اس لیے رسول اللہ ﷺ کے احکام پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو راضی کرنا اللہ کو راضی کرنا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی طرف ہجرت کرنا ہی اللہ کی طرف ہجرت کرنا ہے۔

ذوالارحام کی تعریف، ان کے مصادیق اور ان کی وراثت کے ثبوت میں احادیث

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور اللہ کی کتاب میں قرابت دار (بہ طور وراثت) ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔

علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی ۸۱۶ھ لکھتے ہیں:

ذوالرحم کا معنی لغت میں مطلقاً ذوالقرابت ہے اور اصطلاح شرع میں ذوالرحم ہر وہ رشتہ دار ہے جس کا حصہ کتاب اللہ میں مقرر ہو نہ رسول اللہ ﷺ کی سنت میں اور نہ اجماع امت میں اور نہ وہ عصبہ ہو (یعنی میت کے باپ کی طرف سے رشتہ دار، جیسے دادا، چچا، بیٹا، بھائی وغیرہ) اور جب صرف یہی ہو اور اس کے ساتھ ذوی الفروض، عصبہ نسبی اور عصبہ سببی نہ ہو تو میت کا کل مال اس کو مل جاتا ہے۔ (شرح السراجیہ ص ۱۳۵، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۳۱۷ھ)

ذوالارحام کی مثالیں یہ ہیں: جیسے بیٹی کی اولاد (نواسے، نواسی) پوتی کی اولاد، نانا، نانا کی ماں، بہن کی اولاد (بھانجے، بھانجیاں) بھائی کی بیٹیاں (بھتیجیاں) پھوپھیوں خواہ باپ کی سگی بہن ہو یا علاقائی یا اخیانی، ماموں، خالہ، اخیانی چچا کی اولاد، ماموں کی اولاد، سگے چچا یا علاقائی چچا کی اولاد۔

مقدم بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اہل و عیال چھوڑ کر مرا اس کی پرورش میرے ذمہ ہے اور جس نے مال چھوڑا وہ اس کے وارثوں کا ہے، اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا میں (احق) وارث ہوں، میں اس کی دیت ادا کروں گا اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا ماموں اس کا وارث ہے وہ اس کی طرف سے دیت ادا کرے گا۔

(سنن ابوداؤد رقم الحدیث: ۲۸۹۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۳۸)

ابو امامہ سہل بن حنیف بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص کو ایک تیر آکر لگا جس سے وہ جاں بحق ہو گیا اور اس کے ماموں کے سوا اور کوئی وارث نہیں تھا۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے اس کے متعلق حضرت عمر کو خط لکھا، حضرت عمر نے ان کے جواب میں لکھا کہ نبی ﷺ نے فرمایا ہے جس کا کوئی مولانا ہو اس کا اللہ اور اس کا رسول مولا ہے اور جس کا اور کوئی وارث نہ ہو اس کا ماموں اس کا وارث ہے۔

(سنن دارقطنی رقم الحدیث: ۴۰۶۸، ۴۰۶۷، سنن الترمذی رقم الحدیث: ۲۱۱۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۳۷، سنن کبریٰ للبیہقی، ج ۶، ص ۲۱۳، المستقی رقم الحدیث: ۲۶۳، مسند احمد، ج ۱، ص ۲۸)

اختتامی کلمات اور دعا

آج ۲۲ ذوالقعدہ ۱۴۱۹ھ / ۱۱ مارچ ۱۹۹۹ء کو بروز جمعرات بعد از نماز عشاء سورۃ الانفال کی تفسیر مکمل ہو گئی۔ فالحمد لله رب العلمین۔ اللہ العالمین جس طرح آپ نے اس سورت کی تفسیر کو مکمل کرنے کی توفیق دی ہے، قرآن مجید کی باقی

سورتوں کی تفسیر کو بھی مکمل کرنے کی توفیق عطا فرماتا۔ مجھے اس تفسیر میں خطا اور زلل سے محفوظ رکھنا۔ اس تفسیر کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرماتا اور اس کو منکرین اور مخالفین کے شر سے محفوظ رکھنا اور اس کو تاقیامت فیض آفریں رکھنا اور اس کو عقائد اور اعمال میں موثر بنانا۔ اس تفسیر کو میرے لیے صدقہ جاریہ بنا دینا، اور تمام مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں کو اس کی طرف متوجہ اور راغب کر دینا، اور محض اپنے فضل سے میرے تمام گناہوں کو معاف کر دینا، دنیا اور آخرت میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت اور آپ کی شفاعت سے شاد کام کرنا، مجھے، میرے والدین اور میرے اساتذہ اور میرے تلامذہ، اس تفسیر کے ناشر، اس کے کمپوزر، اس کے صحیح، اس کے معاونین اور اس کے قارئین کو دنیا اور آخرت کے ہر شر، ہر بلا اور ہر عذاب سے محفوظ رکھنا اور دنیا اور آخرت کی ہر نعمت اور ہر سعادت عطا فرمانا خصوصاً صحت اور سلامتی کے ساتھ ایمان پر خاتمہ کرنا۔

واخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمین والصلوة والسلام علی سیدنا محمد
خاتم النبیین قائد المرسلین شفیع المذنبین و علی الہ الطاہرین واصحابہ
الکاملین و علی ازواجہ امہات المؤمنین و علی علماء ملتہ و اولیاء امتہ و سائر
المؤمنین اجمعین۔



ماخذ و مراجع

کتب الہیہ

- ۱- قرآن مجید
- ۲- تورات
- ۳- انجیل

کتب احادیث

- ۴- امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت متوفی ۱۵۰ھ، مسند امام اعظم، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی
- ۵- امام مالک بن انس اصبحی، متوفی ۱۷۹ھ، موطا امام مالک، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۰۹ھ
- ۶- امام عبد اللہ بن مبارک، متوفی ۱۸۱ھ، کتاب الزہد، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۷- امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، متوفی ۱۸۲ھ، کتاب الآثار، مطبوعہ مکتبہ اثریہ، سانگلہ ہل
- ۸- امام محمد بن حسن شیبانی، متوفی ۱۸۹ھ، موطا امام محمد، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی
- ۹- امام محمد بن حسن شیبانی، متوفی ۱۸۹ھ، کتاب الآثار، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۳۰۷ھ
- ۱۰- امام وکیع بن جراح متوفی ۱۹۷ھ، کتاب الزہد، مکتبۃ المدینہ منورہ، ۱۳۰۴ھ
- ۱۱- امام سلیمان بن داؤد بن جارود طیلسی حنفی، متوفی ۲۰۳ھ، مسند طیلسی، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۳۹۱ھ
- ۱۲- امام محمد بن ادریس شافعی، متوفی ۲۰۴ھ، المسند، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۰۰ھ
- ۱۳- امام محمد بن عمرو بن واقد متوفی ۲۰۷ھ، کتاب المغازی، مطبوعہ عالم الکتب بیروت، ۱۳۰۴ھ
- ۱۴- امام عبد الرزاق بن ہمام صنعانی، متوفی ۲۱۱ھ، المصنف مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۰ھ
- ۱۵- امام عبد اللہ بن الزبیر حمیدی، متوفی ۲۱۹ھ، المسند، مطبوعہ عالم الکتب بیروت
- ۱۶- امام سعید بن منصور خراسانی مکی، متوفی ۲۲۷ھ، سنن سعید بن منصور، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۱۷- امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ، متوفی ۲۳۵ھ، المصنف، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۳۰۶ھ، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۶ھ
- ۱۸- امام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہ، متوفی ۲۳۵ھ، مسند ابن ابی شیبہ، مطبوعہ دار الوطن بیروت، ۱۳۱۸ھ
- ۱۹- امام احمد بن حنبل، متوفی ۲۴۱ھ، المسند، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ، دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ، دار الحدیث قاہرہ، ۱۳۱۶ھ
- ۲۰- امام احمد بن حنبل، متوفی ۲۴۱ھ، کتاب الزہد، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۳ھ
- ۲۱- امام ابو عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمی، متوفی ۲۵۵ھ، سنن دارمی، مطبوعہ دار الکتب العربی، ۱۳۰۷ھ

- ۲۲- امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۲ھ
- ۲۳- امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ، خلق افعال العباد، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت ۱۳۱۱ھ
- ۲۴- امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفی ۲۵۶ھ، الادب المفرد، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۳۱۲ھ
- ۲۵- امام ابو الحسن مسلم بن حجاج قشیری، متوفی ۲۶۱ھ، صحیح مسلم، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۷ھ
- ۲۶- امام ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، متوفی ۲۷۳ھ، سنن ابن ماجہ، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ
- ۲۷- امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث بجمستانی، متوفی ۲۷۵ھ، سنن ابو داؤد، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۳ھ
- ۲۸- امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث بجمستانی، متوفی ۲۷۵ھ، مراسیل ابو داؤد، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی
- ۲۹- امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفی ۲۷۹ھ، سنن ترمذی، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۳ھ
- ۳۰- امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفی ۲۷۹ھ، شمائل محمدیہ، مطبوعہ المکتبۃ التجاریہ مکہ مکرمہ ۱۳۱۵ھ
- ۳۱- امام علی بن عمردار قطنی، متوفی ۲۸۵ھ، سنن دار قطنی، مطبوعہ نشر السنہ ملتان
- ۳۲- امام ابن ابی عاصم، متوفی ۲۸۷ھ، الاحاد والثنائی، مطبوعہ دار الرایہ ریاض ۱۳۱۱ھ
- ۳۳- امام احمد عمرو بن عبد الخالق بزار، متوفی ۲۹۲ھ، البحر الزخار المعروف بہ مسند البرار، مطبوعہ مؤسسۃ القرآن بیروت
- ۳۴- امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب نسائی، متوفی ۳۰۳ھ، سنن نسائی، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۳۱۲ھ
- ۳۵- امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب نسائی، متوفی ۳۰۳ھ، عمل الیوم واللیلہ، مطبوعہ مؤسسۃ الکتب الثقافیہ بیروت ۱۳۰۸ھ
- ۳۶- امام ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب نسائی، متوفی ۳۰۳ھ، سنن کبریٰ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۱ھ
- ۳۷- امام ابو بکر محمد بن ہارون الرویانی، متوفی ۳۰۷ھ، مسند الصحابہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۷ھ
- ۳۸- امام احمد بن علی المشنی التمیمی، المتوفی ۳۰۷ھ، مسند ابو یعلیٰ موصلی، مطبوعہ دار المأمون تراث بیروت ۱۳۰۳ھ
- ۳۹- امام عبد اللہ بن علی بن جارود نیشاپوری، متوفی ۳۰۷ھ، المستقی، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۷ھ
- ۴۰- امام محمد بن اسحاق بن خزیمہ، متوفی ۳۱۱ھ، صحیح ابن خزیمہ، مطبوعہ کتب اسلامی بیروت ۱۳۹۵ھ
- ۴۱- امام ابو بکر محمد بن محمد بن سلیمان باغندی، متوفی ۳۱۲ھ، مسند عمر بن عبد العزیز
- ۴۲- امام ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق، متوفی ۳۱۶ھ، مسند ابو عوانہ، مطبوعہ دار الباز مکہ مکرمہ
- ۴۳- امام ابو عبد اللہ محمد الحکیم الترمذی، المتوفی ۳۲۰ھ، نوادر الاصول، مطبوعہ دار الریان التراث القاہرہ ۱۳۰۸ھ
- ۴۴- امام ابو جعفر احمد بن محمد اللخادی، متوفی ۳۲۱ھ، شرح مشکل الآثار، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت ۱۳۱۵ھ
- ۴۵- امام ابو جعفر احمد بن محمد اللخادی، متوفی ۳۲۱ھ، شرح معانی الآثار، مطبوعہ مطبع مجتہبی پاکستان لاہور ۱۳۰۳ھ
- ۴۶- امام محمد بن جعفر بن حسین خرائلی، متوفی ۳۲۷ھ، مکارم الاخلاق، مطبوعہ مطبعہ المدنی مصر ۱۳۱۱ھ
- ۴۷- امام ابو حاتم محمد بن حبان البستی، متوفی ۳۵۳ھ، الاحسان بہ ترتیب صحیح ابن حبان، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت
- ۴۸- امام ابو بکر احمد بن حسین آجری، متوفی ۳۶۰ھ، الشریعہ، مطبوعہ مکتبہ دار السلام ریاض ۱۳۱۳ھ
- ۴۹- امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، المتوفی ۳۶۰ھ، معجم صغیر، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ ۱۳۸۸ھ، کتب اسلامی بیروت ۱۳۰۵ھ
- ۵۰- امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، المتوفی ۳۶۰ھ، معجم اوسط، مطبوعہ مکتبہ العارف ریاض ۱۳۰۵ھ
- ۵۱- امام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، المتوفی ۳۶۰ھ، معجم کبیر، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

- ۵۲- امام ابو القاسم سليمان بن احمد الطبراني المتوفى ۳۶۰ھ 'مسند الشافعي' مطبوعه مؤسسة الرساله بيروت ۱۳۰۹ھ
- ۵۳- امام ابو القاسم سليمان بن احمد الطبراني المتوفى ۳۶۰ھ 'كتاب الدعاء' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت ۱۳۱۳ھ
- ۵۴- امام ابو بكر احمد بن اسحاق ونبوي المعروف بابن السني المتوفى ۳۶۳ھ 'عمل اليوم والليله' مطبوعه مؤسسة الكتب الثقافية بيروت ۱۳۰۸ھ
- ۵۵- امام عبد الله بن عدى الجرجاني المتوفى ۳۶۵ھ 'الكامل في ضعفاء الرجال' مطبوعه دار الفكر بيروت
- ۵۶- امام ابو حفص عمرو بن احمد المعروف بابن شاهين المتوفى ۳۸۵ھ 'الناخ والمنسوخ من الحديث' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت ۱۳۱۳ھ
- ۵۷- امام عبد الله بن محمد بن جعفر المعروف بابي الشيخ المتوفى ۳۹۶ھ 'كتاب العظمة' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت
- ۵۸- امام ابو عبد الله محمد بن عبد الله حاكم نيشاپوري متوفى ۴۰۵ھ 'المستدرک' مطبوعه دار الباز مکه مكرمه
- ۵۹- امام ابو نعيم احمد بن عبد الله اصبهاني متوفى ۴۳۰ھ 'حليته الاولياء' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت ۱۳۱۸ھ
- ۶۰- امام ابو نعيم احمد بن عبد الله اصبهاني متوفى ۴۳۰ھ 'دلائل النبوة' مطبوعه دار النفائس بيروت
- ۶۱- امام ابو بكر احمد بن حسين بيهقي متوفى ۴۵۸ھ 'سنن كبرى' مطبوعه نشر السنه ملتان-
- ۶۲- امام ابو بكر احمد بن حسين بيهقي متوفى ۴۵۸ھ 'كتاب الاسماء والصفات' مطبوعه دار احياء التراث العربي بيروت
- ۶۳- امام ابو بكر احمد بن حسين بيهقي متوفى ۴۵۸ھ 'معرفه السنن والآثار' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت
- ۶۴- امام ابو بكر احمد بن حسين بيهقي متوفى ۴۵۸ھ 'دلائل النبوة' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت
- ۶۵- امام ابو بكر احمد بن حسين بيهقي متوفى ۴۵۸ھ 'كتاب الآداب' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت ۱۳۰۶ھ
- ۶۶- امام ابو بكر احمد بن حسين بيهقي متوفى ۴۵۸ھ 'كتاب فضائل الاوقات' مطبوعه مكتبة المنارة مکه مكرمه ۱۳۱۰ھ
- ۶۷- امام ابو بكر احمد بن حسين بيهقي متوفى ۴۵۸ھ 'شعب الایمان' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت ۱۳۰۱ھ
- ۶۸- امام ابو بكر احمد بن حسين بيهقي متوفى ۴۵۸ھ 'البعث والشور' مطبوعه دار الفكر بيروت ۱۳۱۳ھ
- ۶۹- امام ابو عمرو يوسف ابن عبد البر قرطبي متوفى ۴۶۳ھ 'جامع بيان العلم وفضله' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت
- ۷۰- امام ابو شجاع شيرويه بن شردار بن شيرويه الديلمي المتوفى ۵۰۹ھ 'الفردوس بماثور الخطاب' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت ۱۳۰۶ھ
- ۷۱- امام حسين بن مسعود بغوي متوفى ۵۱۶ھ 'شرح السنه' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت ۱۳۱۳ھ
- ۷۲- امام ابو القاسم علي بن الحسن ابن عساكر متوفى ۵۷۱ھ 'مختصر تاريخ دمشق' مطبوعه دار الفكر بيروت ۱۳۰۳ھ
- ۷۳- امام ابو القاسم علي بن الحسن ابن عساكر متوفى ۵۷۱ھ 'تمذيب تاريخ دمشق' مطبوعه دار احياء التراث العربي بيروت ۱۳۰۷ھ
- ۷۴- امام مجد الدين المبارك بن محمد الشيباني المعروف بابن الاثير الجزري المتوفى ۶۰۶ھ 'جامع الاصول' مطبوعه دار الكتب العلمية بيروت
- ۱۳۱۸ھ
- ۷۵- امام ضياء الدين محمد بن عبد الواحد مقدسي حنبلي متوفى ۶۲۳ھ 'الاحداث الحثارة' مطبوعه مكتبة النهضة الحديثه مکه مكرمه ۱۳۱۰ھ
- ۷۶- امام زكي الدين عبد العظيم بن عبد القوي المنذري المتوفى ۶۵۶ھ 'الترغيب والترهيب' مطبوعه دار الحديث قاہرہ ۱۳۰۷ھ 'دار ابن كثير بيروت ۱۳۱۳ھ
- ۷۷- امام ابو عبد الله محمد بن احمد مالكي قرطبي متوفى ۶۶۸ھ 'اتذکره في امور الآخرة' مطبوعه دار البخاري مدينه منوره
- ۷۸- امام ولي الدين ترميزي متوفى ۷۴۲ھ 'مشکوٰۃ' مطبوعه اصح المطابع دہلي دار ارقم بيروت
- ۷۹- حافظ جمال الدين عبد الله بن يوسف زيلعي متوفى ۷۶۲ھ 'نصب الراية' مطبوعه مجلس علمي سورت ہند ۱۳۵۷ھ

- ۸۰- امام محمد بن عبد اللہ زکشی، متوفی ۷۹۳ھ، اللآلی المشورۃ، مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۱۷ھ
- ۸۱- حافظ نور الدین علی بن ابی بکر البیہقی، متوفی ۸۰۷ھ، مجمع الزوائد، مطبوعہ دار الکتب العربیہ بیروت، ۱۳۰۲ھ
- ۸۲- حافظ نور الدین علی بن ابی بکر البیہقی، المتوفی ۸۰۷ھ، کشف الاستار، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت، ۱۳۰۲ھ
- ۸۳- حافظ نور الدین علی بن ابی بکر البیہقی، المتوفی ۸۰۷ھ، موردالظمان، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۸۴- امام محمد بن محمد جزری، متوفی ۸۳۳ھ، حصن حصین، مطبوعہ مصطفیٰ البابی واولادہ مصر، ۱۳۵۰ھ
- ۸۵- امام ابو العباس احمد بن ابو بکر میری، شافعی، متوفی ۸۳۰ھ، ذوائد ابن ماجہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۸۶- حافظ علاء الدین بن علی بن عثمان مارذینی ترکمانی، متوفی ۸۳۵ھ، الجوہر النقی، مطبوعہ نشر السنہ ملتان
- ۸۷- حافظ شمس الدین محمد بن احمد زہبی، متوفی ۸۴۸ھ، تلخیص المستدرک، مطبوعہ مکتبہ دار الباز مکہ مکرمہ
- ۸۸- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، المطالب العالیہ، مطبوعہ مکتبہ دار الباز مکہ مکرمہ
- ۸۹- امام عبد الرؤف بن علی المناوی، المتوفی ۱۰۳۱ھ، کنوز الحقائق، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۷ھ
- ۹۰- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، الجامع الصغیر، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۱ھ
- ۹۱- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، مسند فاطمہ الزہراء
- ۹۲- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، جامع الاحادیث الکبیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۳ھ
- ۹۳- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، البدور السافرة، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۶ھ، دار ابن حزم بیروت، ۱۳۱۳ھ
- ۹۴- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، المحصائص الکبریٰ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۰۵ھ
- ۹۵- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، الدر المستشرہ، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ
- ۹۶- علامہ عبد الوہاب شعرانی، متوفی ۹۷۳ھ، کشف الغم، مطبوعہ مطبعہ عامرہ عثمانیہ مصر، ۱۳۰۳ھ
- ۹۷- علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری، متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال، مطبوعہ مؤسسۃ الرسالہ بیروت

کتب تفاسیر

- ۹۸- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، متوفی ۶۸ھ، تنویر المقباس، مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمیٰ ایران
- ۹۹- امام حسن بن عبد اللہ البصری، المتوفی ۱۱۰ھ، تفسیر الحسن البصری، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ مکہ مکرمہ، ۱۳۱۳ھ
- ۱۰۰- امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس شافعی، متوفی ۲۰۳ھ، احکام القرآن، مطبوعہ دار احیاء العلوم بیروت، ۱۳۱۰ھ
- ۱۰۱- امام ابو زکریا یحییٰ بن زیاد فراء، متوفی ۲۰۷ھ، معانی القرآن، مطبوعہ بیروت
- ۱۰۲- امام عبد الرزاق بن ہمام صنعانی، متوفی ۲۱۱ھ، تفسیر القرآن العزیز، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت
- ۱۰۳- شیخ ابو الحسن علی بن ابراہیم قمی، متوفی ۳۰۷ھ، تفسیر قمی، مطبوعہ دار الکتب ایران، ۱۳۰۶ھ
- ۱۰۴- امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری، متوفی ۳۱۱ھ، جامع البیان، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۰۹ھ، دار الفکر بیروت
- ۱۰۵- امام ابو اسحاق ابراہیم بن محمد الزجاج، متوفی ۳۱۱ھ، اعراب القرآن، مطبوعہ مطبعہ سلمان فارسی ایران، ۱۳۰۶ھ
- ۱۰۶- امام عبد الرحمن بن محمد بن ادریس بن ابی حاتم رازی، متوفی ۳۲۷ھ، تفسیر القرآن العزیز، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۳۱۷ھ
- ۱۰۷- امام ابو بکر احمد بن علی رازی، جصاص حنفی، متوفی ۳۷۰ھ، احکام القرآن، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۳۰۰ھ

- ۱۰۸- علامہ ابو الیث نصیر محمد سمرقندی، متوفی ۷۳۷ھ، تفسیر سمرقندی، مطبوعہ مکتبہ دار الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۳ھ
- ۱۰۹- شیخ ابو جعفر محمد بن حسن طوسی، متوفی ۳۸۵ھ، التیسان فی تفسیر القرآن، مطبوعہ عالم الکتب بیروت
- ۱۱۰- علامہ مکی بن ابی طالب متوفی ۴۳۷ھ، مشکل اعراب القرآن، مطبوعہ انتشارات نور ایران ۱۳۶۳ھ
- ۱۱۱- علامہ ابو الحسن علی بن محمد بن حبیب ماوردی شافعی، متوفی ۳۵۰ھ، النکت والعیون، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۱۱۲- علامہ جلال اللہ محمود بن عمر زعزعی، متوفی ۳۶۷ھ، کشاف، مطبوعہ نشر البلاغہ قم ایران ۱۳۱۳ھ
- ۱۱۳- علامہ ابو الحسن علی بن احمد واحدی نیشاپوری، متوفی ۳۶۸ھ، الویسط، مطبوعہ دار الکتب العربیہ بیروت ۱۳۱۵ھ
- ۱۱۴- امام ابو الحسن علی بن احمد الواحدی، المتوفی ۳۶۸ھ، اسباب نزول القرآن، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۱۱۵- امام ابو الحسن علی بن احمد الواحدی، المتوفی ۳۶۸ھ، الویسط، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۵ھ
- ۱۱۶- امام ابو محمد الحسین بن مسعود القراء البغوی، المتوفی ۵۱۶ھ، معالم التنزیل، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۳ھ
- ۱۱۷- علامہ ابو بکر محمد بن عبد اللہ المعروف بابن العربی، مالکی، متوفی ۵۴۳ھ، احکام القرآن، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت
- ۱۱۸- علامہ ابو بکر قاضی عبد الحق بن غالب بن عطیہ اندلسی، متوفی ۵۳۶ھ، المحرر الوجیز، مطبوعہ مکتبہ تجاریہ مکہ مکرمہ
- ۱۱۹- شیخ ابو علی فضل بن حسن طبری، متوفی ۵۲۸ھ، مجمع البیان، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۰۶ھ
- ۱۲۰- علامہ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن محمد جوزی، حنبلی، متوفی ۵۹۷ھ، زاد المسیر، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت
- ۱۲۱- خواجہ عبد اللہ انصاری من علماء القرن السادس، کشف الاسرار و عده الابرار، مطبوعہ انتشارات امیر کبیر تهرآن
- ۱۲۲- امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی، متوفی ۶۰۶ھ، تفسیر کبیر، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۱۵ھ
- ۱۲۳- علامہ محی الدین ابن عربی، متوفی ۶۳۸ھ، تفسیر القرآن الکریم، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۹۷۸ء
- ۱۲۴- علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی، متوفی ۶۲۸ھ، الجامع لاحکام القرآن، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۵ھ
- ۱۲۵- قاضی ابو الخیر عبد اللہ بن عمر بیضاوی شیرازی شافعی، متوفی ۶۸۵ھ، انوار التنزیل، مطبوعہ دار فراس للنشر والتوزیع مصر
- ۱۲۶- علامہ ابو البرکات احمد بن محمد نسفی، متوفی ۷۱۰ھ، مدارک التنزیل، مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور
- ۱۲۷- علامہ علی بن محمد خازن شافعی، متوفی ۷۲۵ھ، لباب التاویل، مطبوعہ دار الکتب العربیہ پشاور
- ۱۲۸- علامہ نظام الدین حسین بن محمد قمی، متوفی ۷۲۸ھ، تفسیر نیشاپوری، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۶ھ
- ۱۲۹- علامہ تقی الدین ابن تیمیہ، متوفی ۷۲۸ھ، التفسیر الکبیر، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۰۹ھ
- ۱۳۰- علامہ شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن القیم الجوزیہ، متوفی ۷۵۱ھ، بدائع التفسیر، مطبوعہ دار ابن الجوزیہ مکہ مکرمہ
- ۱۳۱- علامہ ابو الیمان محمد بن یوسف اندلسی، متوفی ۷۵۳ھ، البحر المحیط، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۲ھ
- ۱۳۲- علامہ ابو العباس بن یوسف السمین الشافعی، متوفی ۷۵۶ھ، الدر المصنوع، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۳ھ
- ۱۳۳- حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی متوفی ۷۷۴ھ، تفسیر القرآن، مطبوعہ ادارہ اندلس بیروت ۱۳۸۵ھ
- ۱۳۴- علامہ عماد الدین منصور بن الحسن الکاظمی الشافعی، متوفی ۸۶۰ھ، حاشیہ الکاظمی علی البیضاوی، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۶ھ
- ۱۳۵- علامہ عبد الرحمن بن محمد بن مخلوف شافعی، متوفی ۸۷۵ھ، تفسیر الثعالبی، مطبوعہ مؤسسة الاعلمی للمطبوعات بیروت
- ۱۳۶- علامہ ابو الحسن ابراہیم بن عمر البقاعی المتوفی ۸۸۵ھ، نظم الدرر، مطبوعہ دار الکتب الاسلامی قاہرہ ۱۳۱۳ھ
- ۱۳۷- حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، الدر المنثور، مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمی ایران

- ۱۳۸- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، جلالین، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۱۳۹- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، باب النقول فی اسباب النزول، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۱۴۰- علامہ محی الدین محمد بن مصطفیٰ توجوی، متوفی ۹۵۱ھ، حاشیہ شیخ زارہ علی السیفاوی، مطبوعہ مکتبہ یوسفی دیوبند
- ۱۴۱- شیخ فتح اللہ کاشانی، متوفی ۹۷۷ھ، منبع الصادقین، مطبوعہ خیابان ناصر خسرو ایران
- ۱۴۲- علامہ ابو السعود محمد بن محمد عمادی، حنفی متوفی ۹۸۲ھ، تفسیر ابو السعود، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ
- ۱۴۳- علامہ احمد شہاب الدین خفاجی مصری حنفی، متوفی ۱۰۶۹ھ، عنایۃ القاضی، مطبوعہ دار صادر بیروت ۱۲۸۳ھ
- ۱۴۴- علامہ احمد جیون جوہوری، متوفی ۱۱۳۰ھ، التفسیرات الاحمدیہ، مطبع کریمی بمبئی
- ۱۴۵- علامہ اسماعیل حقی حنفی، متوفی ۱۱۳۷ھ، روح البیان، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ
- ۱۴۶- شیخ سلیمان بن عمر المعروف بالجمال، متوفی ۱۲۰۳ھ، الفتوحات الالہیہ، مطبوعہ المطبعۃ البیتہ مصر ۱۳۰۳ھ
- ۱۴۷- علامہ احمد بن محمد صادی مالکی متوفی ۱۲۲۳ھ، تفسیر صادی، مطبوعہ دار احیاء الکتب العربیہ مصر
- ۱۴۸- قاضی ثناء اللہ پانی پتی، متوفی ۱۲۲۵ھ، تفسیر مظہری، مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو کوئٹہ
- ۱۴۹- شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، متوفی ۱۲۳۹ھ، تفسیر عزیز، مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی
- ۱۵۰- شیخ محمد بن علی شوکانی، متوفی ۱۲۵۰ھ، فتح القدر، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت
- ۱۵۱- علامہ ابو الفضل سید محمود آلوسی حنفی، متوفی ۱۲۷۰ھ، روح المعانی، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
- ۱۵۲- نواب صدیق حسن خان بھوپالی، متوفی ۱۳۰۷ھ، فتح البیان، مطبوعہ مطبع امیر کبری بولاق مصر ۱۳۰۱ھ، مکتبہ العصریہ بیروت ۱۳۱۲ھ
- ۱۵۳- علامہ محمد جمال الدین قاسمی، متوفی ۱۳۳۲ھ، تفسیر القاسمی، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ
- ۱۵۴- علامہ محمد رشید رضا، متوفی ۱۳۵۳ھ، تفسیر المنار، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت
- ۱۵۵- علامہ حکیم شیخ منشاوی جوہری مصری، متوفی ۱۳۵۹ھ، الجواهر فی تفسیر القرآن، مکتبہ الاسلامیہ ریاض
- ۱۵۶- شیخ اشرف علی تھانوی، متوفی ۱۳۶۳ھ، بیان القرآن، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور
- ۱۵۷- سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، متوفی ۱۳۶۷ھ، خزائن العرفان، مطبوعہ تاج کمپنی لیٹڈ لاہور
- ۱۵۸- شیخ محمود الحسن دیوبندی، متوفی ۱۳۳۹ھ، شیخ شبیر احمد عثمانی، متوفی ۱۳۶۹ھ، حاشیہ القرآن، مطبوعہ تاج کمپنی لیٹڈ لاہور
- ۱۵۹- علامہ محمد طاہر بن عاشور، متوفی ۱۳۸۰ھ، التحریر والتنوير، مطبوعہ تونس
- ۱۶۰- سید محمد قطب شہید، متوفی ۱۳۸۵ھ، فی ظلال القرآن، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۳۸۶ھ
- ۱۶۱- مفتی احمد یار خان نعیمی، متوفی ۱۳۹۱ھ، نور العرفان، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ گجرات
- ۱۶۲- مفتی محمد شفیع دیوبندی، متوفی ۱۳۹۶ھ، معارف القرآن، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی ۱۳۹۷ھ
- ۱۶۳- سید ابوالاعلیٰ مودودی، متوفی ۱۳۹۹ھ، تفسیر القرآن، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور
- ۱۶۴- علامہ سید احمد سعید کاظمی، متوفی ۱۴۰۶ھ، التبیان، مطبوعہ کاظمی پبلی کیشنز ملتان
- ۱۶۵- علامہ محمد امین بن محمد مختار بکنی شقیلی، اضواء البیان، مطبوعہ عالم الکتب بیروت
- ۱۶۶- استاذ احمد مصطفیٰ المراغی، تفسیر المراغی، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
- ۱۶۷- آیت اللہ مکارم شیرازی، تفسیر نمونہ، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ ایران ۱۳۶۹ھ

- ۱۶۸- جسٹس پیر کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور
 ۱۶۹- شیخ امین احسن اصلاحی، تدریج قرآن، مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن لاہور
 ۱۷۰- علامہ محمود صافی، اعراب القرآن و صرفہ و بیانہ، مطبوعہ انتشارات زرین ایران
 ۱۷۱- استاذ محی الدین درویش، اعراب القرآن و بیانہ، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت
 ۱۷۲- ڈاکٹر وجہ زحلی، تفسیر منیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۳ھ
 ۱۷۳- سعیدی حوی، الاساس فی التفسیر، مطبوعہ دار السلام

کتاب علوم قرآن

- ۱۷۴- علامہ بدر الدین محمد بن عبد اللہ زرکشی متوفی ۷۹۳ھ، البرہان فی علوم القرآن، مطبوعہ دار الفکر بیروت
 ۱۷۵- علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، الاتقان فی علوم القرآن، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور
 ۱۷۶- علامہ محمد عبد العظیم زرکانی، منزل العرفان، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

کتاب شروح حدیث

- ۱۷۷- حافظ ابو عمرو ابن عبد البر مالکی، متوفی ۴۶۳ھ، الاستذکار، مطبوعہ مؤسسة الرسالہ بیروت ۱۳۱۳ھ
 ۱۷۸- حافظ ابو عمرو ابن عبد البر مالکی، متوفی ۴۶۳ھ، تمہید، مطبوعہ مکتبہ القدوسیہ لاہور ۱۳۰۳ھ، المکتبہ التجاریہ مکہ مکرمہ ۱۳۸۷ھ
 ۱۷۹- علامہ ابو الولید سلیمان بن خلف باجی مالکی اندلسی، متوفی ۴۶۳ھ، المستقی، مطبوعہ مطبع السعادة، مصر ۱۳۳۲ھ
 ۲۸۰- علامہ ابو بکر محمد بن عبد اللہ ابن العربی مالکی، متوفی ۵۴۳ھ، عارضۃ الاحوذی، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
 ۱۸۱- امام عبد العظیم بن عبد القوی منذری، متوفی ۶۵۶ھ، مختصر سنن ابو داؤد، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت
 ۱۸۲- علامہ ابو العباس احمد بن عمر ابراہیم القرطبی المالکی، المتوفی ۶۵۶ھ، المعجم، مطبوعہ دار ابن کثیر بیروت ۱۳۱۷ھ
 ۱۸۳- علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متوفی ۶۷۶ھ، شرح مسلم، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی ۱۳۷۵ھ
 ۱۸۴- علامہ شرف الدین حسین بن محمد الطیبی، متوفی ۷۴۳ھ، شرح الطیبی، مطبوعہ ادارة القرآن ۱۳۱۳ھ
 ۱۸۵- علامہ ابو عبد اللہ محمد بن خلفہ وشتانی ابی مالکی، متوفی ۸۲۸ھ، اکمال اکمال المعلم، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
 ۱۸۶- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، فتح الباری، مطبوعہ دار نشر الکتب الاسلامیہ لاہور
 ۱۸۷- حافظ بدر الدین محمود بن احمد یحییٰ حنفی، متوفی ۸۵۵ھ، عمدۃ القاری، مطبوعہ ادارة الطباعة المنیریہ مصر ۱۳۲۸ھ
 ۱۸۸- علامہ محمد بن محمد سنوسی مالکی متوفی ۸۹۵ھ، مکمل اکمال المعلم، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
 ۱۸۹- علامہ احمد قسطلانی، متوفی ۹۱۱ھ، ارشاد الساری، مطبوعہ مطبعہ مہمنہ مصر ۱۳۰۶ھ
 ۱۹۰- علامہ عبد الرؤف مناوی شافعی، متوفی ۱۰۰۳ھ، فیض القدر، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۳۹۱ھ، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۸ھ
 ۱۹۱- علامہ عبد الرؤف مناوی شافعی، متوفی ۱۰۰۳ھ، شرح الشماکل، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی
 ۱۹۲- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۳ھ، جمع الوسائل، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی
 ۱۹۳- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۳ھ، شرح مسند ابی حنیفہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۰۵ھ

- ۱۹۴- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۳ھ، 'مرقات'، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان، ۱۳۹۰ھ
- ۱۹۵- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۳ھ، 'الحرز الثمین'، مطبوعہ مطبعہ امیریہ مکہ مکرمہ، ۱۳۰۳ھ
- ۱۹۶- شیخ محمد بن علی بن محمد شوکانی، متوفی ۱۲۵۰ھ، 'تحفہ الذاکرین'، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی و اولادہ مصر، ۱۳۵۰ھ
- ۱۹۷- شیخ عبدالحق محدث دہلوی، متوفی ۱۰۵۲ھ، 'اشعۃ اللمعات'، مطبوعہ مطبع تیج کار لکھنؤ
- ۱۹۸- شیخ عبد الرحمن مبارک پوری، متوفی ۱۳۲۵ھ، 'تحفہ الاحوذی'، مطبوعہ نشر السنہ ملتان
- ۱۹۹- شیخ انور شاہ کشمیری، متوفی ۱۳۵۲ھ، 'فیض الباری'، مطبوعہ مطبع تجازی مصر، ۱۳۷۵ھ
- ۲۰۰- شیخ شبیر احمد عثمانی، متوفی ۱۳۶۹ھ، 'فتح الملکم'، مطبوعہ مکتبہ الحجاز کراچی
- ۲۰۱- شیخ محمد ادریس کاندھلوی، متوفی ۱۳۹۲ھ، 'التعلیق الصغیر'، مطبوعہ مکتبہ عثمانیہ لاہور

کتاب اسماء الرجال

- ۲۰۲- علامہ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی جوزی متوفی ۵۹۷ھ، 'العلل المتماہیہ'، مطبوعہ مکتبہ اثریہ فیصل آباد، ۱۳۰۱ھ
- ۲۰۳- حافظ جمال الدین ابو الحجاج یوسف مزنی، ۷۷۲ھ، 'تمہذیب الکمال'، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۳ھ
- ۲۰۴- علامہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی، متوفی ۷۴۸ھ، 'میزان الاعتدال'، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۶ھ
- ۲۰۵- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، 'تمہذیب التہذیب'، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۲۰۶- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، 'تقریب التہذیب'، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۲۰۷- علامہ شمس الدین محمد بن عبد الرحمن السخاوی، متوفی ۹۰۲ھ، 'القاصد الحث'، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۲۰۸- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، 'اللآلی المصنوعہ'، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۷ھ
- ۲۰۹- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، المتوفی ۱۰۱۳ھ، 'موضوعات کبیر'، مطبوعہ مطبع مجتہائی دہلی
- ۲۱۰- علامہ اسماعیل بن محمد الجملونی، متوفی ۱۱۶۳ھ، 'کشف الخفاء و منزل الالباس'، مطبوعہ مکتبہ الغزالی دمشق

کتاب لغت

- ۲۱۱- امام اللغۃ خلیل احمد فراہیدی، متوفی ۷۷۵ھ، 'کتاب العین'، مطبوعہ انتشارات اسوہ ایران، ۱۳۱۳ھ
- ۲۱۲- علامہ اسماعیل بن حماد الجوهری، متوفی ۳۹۸ھ، 'الصحاح'، مطبوعہ دار العلم بیروت، ۱۳۰۳ھ
- ۲۱۳- علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی، متوفی ۵۰۲ھ، 'المفردات'، مطبوعہ مکتبہ زار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۳۱۸ھ
- ۲۱۴- علامہ محمود بن عمرو بن مغشوشی، متوفی ۵۸۳ھ، 'الفائق'، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۷ھ
- ۲۱۵- علامہ محمد بن اثیر الجزری، متوفی ۶۰۶ھ، 'نہایہ'، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۸ھ
- ۲۱۶- علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متوفی ۶۷۶ھ، 'تمہذیب الاسماء واللغات'، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
- ۲۱۷- علامہ جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی، متوفی ۷۱۱ھ، 'لسان العرب'، مطبوعہ نشر ادب الحوزة، قم، ایران
- ۲۱۸- علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی، متوفی ۸۱۷ھ، 'القاموس المحیط'، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
- ۲۱۹- علامہ محمد طاہر ثنی، متوفی ۹۸۶ھ، 'مجمع بحار الانوار'، مطبوعہ مکتبہ دار الایمان المدینہ المنورہ، ۱۳۱۵ھ

- ۲۲۰- علامہ سید محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی، متوفی ۱۲۰۵ھ، 'تاج العروس'، مطبوعہ المطبعہ الخیریہ مصر
 ۲۲۱- لوئیس معلوف الیسوعی، المنجد، مطبوعہ المطبعہ الغاثولیکہ، بیروت، ۱۹۲۷ء
 ۲۲۲- شیخ غلام احمد پرویز، متوفی ۱۳۰۵ھ، 'لغات القرآن'، مطبوعہ ادارہ طلوع اسلام لاہور
 ۲۲۳- ابو نعیم عبد الحکیم خان نثر جان دھری، قائد اللغات، مطبوعہ حامد اینڈ کمپنی لاہور

کتب تاریخ، سیرت و فضائل

- ۲۲۴- امام محمد بن اسحاق، متوفی ۱۵۱ھ، کتاب السیر والمغازی، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۹۸ھ
 ۲۲۵- امام عبد الملک بن ہشام، متوفی ۲۱۳ھ، السیرۃ النبویہ، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۵ھ
 ۲۲۶- امام محمد بن سعد، متوفی ۲۳۰ھ، الطبقات الکبریٰ، مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۳۸۸ھ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۸ھ
 ۲۲۷- علامہ ابو الحسن علی بن محمد المعاوردی، المتوفی ۴۵۰ھ، اعلام النبوت، مطبوعہ دار احیاء العلوم بیروت، ۱۳۰۸ھ
 ۲۲۸- امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری، متوفی ۳۱۰ھ، تاریخ الامم والملوک، مطبوعہ دار القلم بیروت
 ۲۲۹- حافظ ابو عمرو یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر، متوفی ۴۶۳ھ، الاستیعاب، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
 ۲۳۰- قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی، متوفی ۵۴۴ھ، الشفاء، مطبوعہ عبد التواب اکیڈمی ملتان، دار الفکر بیروت، ۱۳۱۵ھ
 ۲۳۱- علامہ ابو القاسم عبد الرحمن بن عبد اللہ سیملی، متوفی ۵۷۱ھ، الروض الانف، مکتبہ فاروقیہ ملتان
 ۲۳۲- علامہ عبد الرحمن بن علی جوزی، متوفی ۵۹۷ھ، الوفا، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر
 ۲۳۳- علامہ ابو الحسن علی بن ابی الکریم الشیبانی المعروف بابن الاثیر، متوفی ۶۳۰ھ، اسد الغابہ، مطبوعہ دار الفکر بیروت، دار الکتب العلمیہ بیروت
 ۲۳۴- علامہ ابو الحسن علی بن ابی الکریم الشیبانی المعروف بابن الاثیر، متوفی ۶۳۰ھ، الکامل فی التاریخ، مطبوعہ دار الکتب العربیہ بیروت
 ۲۳۵- علامہ شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان، متوفی ۶۸۱ھ، ذویات الاعیان، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی ایران
 ۲۳۶- علامہ علی بن عبد الکانی تقی الدین سبکی، متوفی ۷۴۶ھ، شفاء السقام فی زیارة خیر الانام، مطبوعہ کراچی
 ۲۳۷- حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمرو بن کثیر شافعی، متوفی ۷۷۴ھ، البدایہ والنہایہ، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۹۳ھ
 ۲۳۸- حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی شافعی، متوفی ۸۵۲ھ، الاصابہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت
 ۲۳۹- علامہ نور الدین علی بن احمد سمودی، متوفی ۹۱۱ھ، وفاء الوفاء، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۰۱ھ
 ۲۴۰- علامہ احمد قسطلانی، متوفی ۹۱۱ھ، المواہب اللدنیہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۶ھ
 ۲۴۱- علامہ محمد بن یوسف الصالحی الشافعی، متوفی ۹۴۲ھ، سبل الہدیٰ والرشاد، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۳ھ
 ۲۴۲- علامہ احمد بن حجر مکی شافعی، متوفی ۹۷۴ھ، الصواعق المحرقة، مطبوعہ مکتبہ القاہرہ، ۱۳۸۵ھ
 ۲۴۳- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۳ھ، شرح الشفاء، مطبوعہ دار الفکر بیروت
 ۲۴۴- شیخ عبد الحق محدث دہلوی، متوفی ۱۰۵۲ھ، مدارج النبوت، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر
 ۲۴۵- علامہ احمد شہاب الدین خفاجی، متوفی ۱۰۶۹ھ، نسیم الریاض، مطبوعہ دار الفکر بیروت
 ۲۴۶- علامہ محمد عبد الباقی زر قانی، متوفی ۱۱۲۳ھ، شرح المواہب اللدنیہ، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۹۳ھ
 ۲۴۷- شیخ اشرف علی تھانوی، متوفی ۱۳۶۲ھ، نشر الیب، مطبوعہ تاج کمپنی لیڈنگ کراچی

کتاب فقہ حنفی

- ۲۴۸- علامہ حسین بن منصور اوزجندی، متوفی ۲۹۵ھ، فتاویٰ قاضی خاں، مطبوعہ مطبعہ کبریٰ امیریه بولاق مصر، ۱۳۱۰ھ
- ۲۴۹- شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی، متوفی ۴۸۳ھ، المبسوط، مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت، ۱۳۹۸ھ
- ۲۵۰- شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی، متوفی ۴۸۳ھ، شرح سیر کبیر، مطبوعہ المکتبۃ الثورۃ الاسلامیہ افغانستان، ۱۳۰۵ھ
- ۲۵۱- علامہ طاہر بن عبد الرشید بخاری، متوفی ۵۴۲ھ، خلاصۃ الفتاویٰ مطبوعہ امجد اکیڈمی لاہور، ۱۳۹۷ھ
- ۲۵۲- علامہ ابو بکر بن مسعود کاسانی، متوفی ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع، مطبوعہ ایچ۔ ایم۔ سعید اینڈ کمپنی، ۱۳۰۰ھ، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۸ھ
- ۲۵۳- علامہ ابو الحسن علی بن ابی بکر مرغینانی، متوفی ۵۹۳ھ، ہدایہ اولین و آخرین، مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان
- ۲۵۴- علامہ محمد بن محمود بایرقی، متوفی ۷۸۶ھ، عنایہ، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۵ھ
- ۲۵۵- علامہ عالم بن العلاء انصاری دہلوی، متوفی ۷۸۶ھ، فتاویٰ تاتار خانیہ، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۳۱۱ھ
- ۲۵۶- علامہ ابو بکر بن علی حداد، متوفی ۸۰۰ھ، الجوهرة المنيرة، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان
- ۲۵۷- علامہ محمد شہاب الدین بن بزاز کردی، متوفی ۸۲۷ھ، فتاویٰ بزازیہ، مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریه بولاق مصر، ۱۳۱۰ھ
- ۲۵۸- علامہ بدر الدین محمود بن احمد عینی، متوفی ۸۵۵ھ، بنایہ، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۱۱ھ
- ۲۵۹- علامہ کمال الدین بن ہمام، متوفی ۸۶۱ھ، فتح القدر، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۳۱۵ھ
- ۲۶۰- علامہ جلال الدین خوارزمی، کفایہ، مکتبہ نوریہ رضویہ سکھر
- ۲۶۱- علامہ معین الدین الہرودی المعروف بہ محمد ملا مسکین، متوفی ۹۵۳ھ، شرح الکنز، مطبوعہ جمعیتہ المعارف المصریہ مصر
- ۲۶۲- علامہ ابراہیم بن محمد حلبی، متوفی ۹۵۶ھ، غنیۃ المستملی، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۳۱۳ھ
- ۲۶۳- علامہ محمد خراسانی، متوفی ۹۶۲ھ، جامع الرموز، مطبوعہ مطبع فشی نوا کشور، ۱۳۹۱ھ
- ۲۶۴- علامہ زین الدین بن نجم، متوفی ۹۷۰ھ، البحر الرائق، مطبوعہ مطبعہ علمیہ مصر، ۱۳۱۱ھ
- ۲۶۵- علامہ حامد بن علی قونوی رومی، متوفی ۹۸۵ھ، فتاویٰ حامدیہ، مطبوعہ مطبعہ مینہ مصر، ۱۳۱۰ھ
- ۲۶۶- علامہ ابو السعود محمد بن محمد عمادی، متوفی ۹۸۲ھ، حاشیہ ابو سعود علی ملا مسکین، مطبوعہ جمعیتہ المعارف المصریہ مصر، ۱۳۸۷ھ
- ۲۶۷- علامہ خیر الدین رطلی، متوفی ۱۰۸۱ھ، فتاویٰ خیریہ، مطبوعہ مطبعہ مینہ مصر، ۱۳۱۰ھ
- ۲۶۸- علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی، متوفی ۱۰۸۸ھ، الدر المختار، مطبوعہ دار احیاء التراث العربیہ بیروت
- ۲۶۹- علامہ سید احمد بن محمد حموی، متوفی ۱۰۹۸ھ، غزعیون البصائر، مطبوعہ دار الکتب العربیہ بیروت، ۱۳۰۷ھ
- ۲۷۰- ملا نظام الدین متوفی ۱۱۶۱ھ، فتاویٰ عالمگیری، مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریه بولاق مصر، ۱۳۱۰ھ
- ۲۷۱- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی، متوفی ۱۲۵۲ھ، منہج الخالق، مطبوعہ مطبعہ علمیہ مصر، ۱۳۱۱ھ
- ۲۷۲- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی، متوفی ۱۲۵۲ھ، تنقیح الفتاویٰ الحامدیہ، مطبوعہ دار الاشاعۃ العربیہ کونست
- ۲۷۳- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی، متوفی ۱۲۵۲ھ، رسائل ابن عابدین، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۳۹۶ھ
- ۲۷۴- علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی، متوفی ۱۲۵۲ھ، رد المختار، مطبوعہ دار احیاء التراث العربیہ بیروت، ۱۳۰۷ھ
- ۲۷۵- امام احمد رضا قادری، متوفی ۱۳۳۰ھ، جد المختار، مطبوعہ ادارہ تحقیقات احمد رضا کراچی
- ۲۷۶- امام احمد رضا قادری، متوفی ۱۳۳۰ھ، فتاویٰ رضویہ، مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی

- ۲۷۷- امام احمد رضا قادری، متون ۱۳۳۰ھ، فتاویٰ افریقیہ، مطبوعہ مدینہ، بلیٹنگ کمپنی کراچی
- ۲۷۸- علامہ امجد علی، متون ۱۳۷۶ھ، بہار شریعت، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز کراچی
- ۲۷۹- علامہ نور اللہ نعیمی، متون ۱۳۰۳ھ، فتاویٰ نوریہ، مطبوعہ کبائن پرنٹرز لاہور، ۱۹۸۳ء

کتب فقہ شافعی

- ۲۸۰- امام محمد بن ادریس شافعی، متون ۲۰۰۳ھ، الام، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۳ھ
- ۲۸۱- علامہ ابوالحسن علی بن محمد حبیب ماوردی شافعی، متون ۳۵۰ھ، الحاوی الکبیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۱۳ھ
- ۲۸۲- علامہ ابوالسحاق شیرازی، متون ۳۵۵ھ، المہذب، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت، ۱۳۹۳ھ
- ۲۸۳- امام محمد بن محمد غزالی، متون ۵۰۵ھ، احیاء علوم الدین، مطبوعہ دار الخیر بیروت، ۱۴۱۳ھ
- ۲۸۴- علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متون ۶۷۶ھ، شرح المہذب، مطبوعہ دار الفکر بیروت
- ۲۸۵- علامہ یحییٰ بن شرف نووی، متون ۶۷۶ھ، روضۃ الطالبین، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۰۵ھ
- ۲۸۶- علامہ جلال الدین سیوطی، متون ۹۱۱ھ، الحاوی للفتاویٰ، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ فیصل آباد
- ۲۸۷- علامہ شمس الدین محمد بن ابی العباس ربلی، متون ۱۰۰۴ھ، نہایت المحتاج، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ
- ۲۸۸- علامہ ابو الفیاء علی بن علی شبراہلی، متون ۱۰۸۷ھ، حاشیہ ابو الفیاء علی نہایت المحتاج، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت

کتب فقہ مالکی

- ۲۸۹- امام یحییٰ بن سعید ثوننی مالکی، متون ۲۵۶ھ، البدوت الکبریٰ، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت
- ۲۹۰- قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن رشد مالکی اندلسی، متون ۵۹۵ھ، بدایت المجتہد، مطبوعہ دار الفکر بیروت
- ۲۹۱- علامہ خلیل بن اسحاق مالکی، متون ۷۷۷ھ، مختصر خلیل، مطبوعہ دار صادر بیروت
- ۲۹۲- علامہ ابو عبد اللہ محمد بن محمد الخطاب المغربي، المتون ۹۵۳ھ، مواہب الجلیل، مطبوعہ مکتبۃ التجار لیبیا
- ۲۹۳- علامہ علی بن عبد اللہ علی الخرشی المتون ۱۱۰۱ھ، الخرشی علی مختصر خلیل، مطبوعہ دار صادر بیروت
- ۲۹۴- علامہ ابو البرکات احمد درر مالکی، متون ۱۱۹۷ھ، الشرح الکبیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت
- ۲۹۵- علامہ شمس الدین محمد بن عرفہ دسوقی، متون ۱۲۱۹ھ، حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر، مطبوعہ دار الفکر بیروت

کتب فقہ حنبلی

- ۲۹۶- علامہ موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن قدامہ، متون ۶۲۰ھ، المغنی، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ
- ۲۹۷- علامہ موفق الدین عبد اللہ بن احمد بن قدامہ، متون ۶۲۰ھ، الکافی، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۳ھ
- ۲۹۸- شیخ ابوالعباس تقی الدین بن تیمیہ، متون ۷۲۸ھ، مجموعہ الفتاویٰ، مطبوعہ ریاض
- ۲۹۹- علامہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن قحطانی، متون ۷۶۳ھ، کتاب الفروع، مطبوعہ عالم الکتب بیروت
- ۳۰۰- علامہ ابوالحسن علی بن سلیمان مرداوی، متون ۸۸۵ھ، الانصاف، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت

کتاب شیعہ

- ۳۰۱- نبج البلاغہ (خطبات حضرت علیؑ) مطبوعہ ایران و مطبوعہ کراچی
- ۳۰۲- شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی، متون ۳۲۹ھ، الاصول من الکافی، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ تہران
- ۳۰۳- شیخ ابو جعفر محمد بن یعقوب کلینی، متون ۳۲۹ھ، الفروع من الکافی، مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ تہران
- ۳۰۴- شیخ ابو منصور احمد بن علی الطبرسی من القرن السادس، الاحتجاج، موسسہ الاعلیٰ للطبوعات بیروت، ۱۴۰۳ھ
- ۳۰۵- شیخ کمال الدین یشتم بن علی بن یشتم، البحرانی، المتون ۶۷۹ھ، شرح نبج البلاغہ، مطبوعہ مؤسسہ النصر ایران
- ۳۰۶- ملا باقر بن محمد تقی مجلسی، متون ۱۱۱۰ھ، مطبوعہ خیابان ناصر خسرو ایران، ۱۳۳۷ھ
- ۳۰۷- ملا باقر بن محمد تقی مجلسی، متون ۱۱۱۰ھ، حیات القلوب، مطبوعہ کتاب فروشی اسلامیہ تہران
- ۳۰۸- ملا باقر بن محمد تقی مجلسی، متون ۱۱۱۰ھ، جلاء العیون، مطبوعہ کتاب فروشی اسلامیہ تہران

کتاب عقائد و کلام

- ۳۰۹- امام محمد بن محمد غزالی، متون ۵۰۵ھ، المنقذ من الضلال، مطبوعہ لاہور، ۱۴۰۵ھ
- ۳۱۰- علاء ابو البرکات عبد الرحمن بن محمد الانباری، المتون ۵۷۷ھ، الداعی الی الاسلام، مطبوعہ دار البشارۃ الاسلامیہ بیروت، ۱۴۰۹ھ
- ۳۱۱- شیخ احمد بن عبد الحلیم بن تمیم، متون ۷۲۸ھ، العقیدۃ الواسطیہ، مطبوعہ دار السلام ریاض، ۱۴۱۳ھ
- ۳۱۲- علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی، متون ۷۹۱ھ، شرح عقائد نسفی، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی
- ۳۱۳- علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی، متون ۷۹۱ھ، شرح القاصد، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی ایران
- ۳۱۴- علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی، متون ۸۱۶ھ، شرح الموائق، مطبوعہ منشورات الشریف الرضی ایران
- ۳۱۵- علامہ کمال الدین بن ہمام، متون ۸۶۱ھ، مسارہ، مطبوعہ مطبعہ السعاده مصر
- ۳۱۶- علامہ کمال الدین محمد بن محمد المعروف بابن ابی الشریف الشافعی، المتون ۹۰۶ھ، مسارہ، مطبوعہ مطبعہ السعاده مصر
- ۳۱۷- علامہ علی بن سلطان محمد القاری، المتون ۱۰۱۳ھ، شرح فقہ اکبر، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی و اولادہ مصر، ۱۳۷۵ھ
- ۳۱۸- علامہ محمد بن احمد السفارینی، المتون ۱۱۸۸ھ، لوامع الانوار البھیہ، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۴۱۱ھ
- ۳۱۹- علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، متون ۱۳۶۷ھ، کتاب العقائد، مطبوعہ تاجدار حرم، بلیٹنگ کمپنی کراچی

کتاب اصول فقہ

- ۳۲۰- امام فخر الدین محمد بن عمر رازی شافعی، متون ۶۰۶ھ، الحصول، مطبوعہ مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ، ۱۴۱۷ھ
- ۳۲۱- علامہ علاء الدین عبد العزیز بن احمد البخاری، المتون ۷۳۰ھ، کشف الاسرار، مطبوعہ دار الکتب العربی، ۱۴۱۱ھ
- ۳۲۲- علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی، متون ۷۹۱ھ، توضیح و تلویح، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی
- ۳۲۳- علامہ کمال الدین محمد بن عبد الواحد الشیرباین ہمام، متون ۸۶۱ھ، التحریر مع التیسیر، مطبوعہ مکتبہ المعارف ریاض
- ۳۲۴- علامہ محب اللہ بہاری، متون ۱۱۱۹ھ، مسلم الثبوت، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ
- ۳۲۵- علامہ احمد جونپوری، متون ۱۱۳۰ھ، نور الانوار، مطبوعہ ایچ۔ ایم۔ سعید اینڈ کمپنی کراچی

۳۲۶- علامہ عبدالحق خیر آبادی، متوفی ۱۳۱۸ھ، شرح مسلم الثبوت، مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ

کتب متفرقہ

- ۳۲۷- شیخ ابوطالب محمد بن الحسن المکی المتوفی ۳۸۶ھ، قوت القلوب، مطبوعہ مطبعہ مہمنہ مصر ۱۳۰۶ھ
- ۳۲۸- امام محمد بن محمد غزالی، متوفی ۵۰۵ھ، احیاء علوم الدین، مطبوعہ دار الخیر بیروت ۱۳۱۳ھ
- ۳۲۹- علامہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی، متوفی ۶۶۸ھ، التذکرہ، مطبوعہ دار البخاریہ مدینہ منورہ ۱۳۱۷ھ
- ۳۳۰- شیخ تقی الدین احمد بن تیمیہ حنبلی، متوفی ۷۲۸ھ، قاعدہ جلیلیہ، مطبوعہ مکتبہ قاہرہ مصر ۱۲۷۳ھ
- ۳۳۱- علامہ شمس الدین محمد بن احمد ذہبی، متوفی ۷۴۸ھ، الکبائر مطبوعہ دار الفکر العربی قاہرہ مصر
- ۳۳۲- علامہ عبد اللہ بن اسد یافعی، متوفی ۷۶۸ھ، روض الیاسین، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی و اولادہ مصر ۱۳۷۴ھ
- ۳۳۳- علامہ میر سید شریف علی بن محمد جرجانی، متوفی ۸۱۶ھ، کتاب التعریفات، مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر ۱۳۰۶ھ، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز مکہ مکرمہ ۱۳۱۸ھ
- ۳۳۴- حافظ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، شرح الصدور، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۰۴ھ
- ۳۳۵- علامہ ابن حجر مکی، متوفی ۹۲۷ھ، فتاویٰ حدیثیہ، مطبوعہ مطبع مصطفیٰ البابی و اولادہ مصر ۱۳۵۶ھ
- ۳۳۶- علامہ احمد بن حجر ہیتمی کاتب، متوفی ۹۷۳ھ، الصواعق المحرقة، مطبوعہ مکتبہ القاہرہ ۱۳۸۵ھ
- ۳۳۷- علامہ احمد بن حجر ہیتمی مکی، متوفی ۹۷۴ھ، الزواجر، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۳۱۳ھ
- ۳۳۸- امام احمد سرہندی مجدد الف ثانی، متوفی ۱۰۳۴ھ، مکتوبات امام ربانی، مطبوعہ مدینہ بہشتنگ کمپنی کراچی ۱۳۷۰ھ
- ۳۳۹- علامہ سید محمد بن محمد مرتضیٰ حسینی زبیدی حنفی، متوفی ۱۲۰۵ھ، اتحاف سادۃ المستعین، مطبوعہ مطبعہ مہمنہ مصر ۱۳۱۱ھ
- ۳۴۰- شیخ رشید احمد گنگوہی، متوفی ۱۳۲۳ھ، فتاویٰ رشیدیہ کامل، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی
- ۳۴۱- علامہ مصطفیٰ بن عبد اللہ الشیر بحاجی خلیفہ، کشف الظنون، مطبوعہ مطبعہ اسلامیہ طہران ۱۳۷۸ھ
- ۳۴۲- امام احمد رضا قادری، متوفی ۱۳۴۰ھ، الملقوظ مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور
- ۳۴۳- شیخ وحید الزمان، متوفی ۱۳۴۸ھ، ہدیۃ الہدی، مطبوعہ میور پریس دہلی ۱۳۲۵ھ
- ۳۴۴- علامہ یوسف بن اسماعیل التہانی، متوفی ۱۳۵۰ھ، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۱۷ھ
- ۳۴۵- شیخ اشرف علی تھانوی، متوفی ۱۳۶۲ھ، بہشتی زیور، مطبوعہ ناشران قرآن لیٹڈ لاہور
- ۳۴۶- شیخ اشرف علی تھانوی، متوفی ۱۳۶۲ھ، حفظ الایمان، مطبوعہ مکتبہ تھانوی کراچی
- ۳۴۷- علامہ عبد الحکیم شرف قادری نقشبندی، ندایا رسول اللہ، مطبوعہ مرکزی مجلس رضالاہور ۱۳۰۵ھ



سرٹیفکیٹ

میں نے تبیان القرآن جلد چہارم تصنیف شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی، مطبوعہ فرید بک سٹال اردو بازار لاہور کے پروف بغور پڑھے ہیں۔ میری دانست کے مطابق اس تفسیر کے متن اور تفسیر میں درج آیات قرآنی کے الفاظ اور اعراب میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں نے اطمینان کے بعد یہ سرٹیفکیٹ جاری کیا ہے۔

محمد ابراہیم فیضی

تفسیر تبیان القرآن کی بارہ جلدوں میں تکمیل کے بعد فریدنگ سٹال کی جانب سے باذوق قارئین کی سہولت کیلئے
مفسر قرآن علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہ العالی کی مبسوط و مفصل تفسیر اور ترجمہ و نشان کی ایک جلد میں جامع تلخیص

بہ نام

اوار تبیان القرآن

ترجمہ قرآن بہ نام

نور الفکر

تلخیص و مرتب: مولانا حافظ محمد عبدالرشید قادری نورانی زید علمہ

چند خصوصیات

- ☆ متن قرآن مجید کا سلیس رواں زبان میں مکمل ترجمہ،
 - ☆ قرآنی آیات سے مستنبط فقہی مسائل کا مختصر اور جامع تذکرہ،
 - ☆ عقائد اہل سنت و جماعت کی تائید اور ترجیح پر جامع دلائل،
 - ☆ مفسر قرآن علامہ غلام رسول سعیدی (مدظلہ العالی) کے علمی تحقیقات کا بہترین نچوڑ،
 - ☆ آیات قرآنیہ کی تفسیر میں احادیث و آثار کا مستند تذکرہ،
 - ☆ کتب تفسیر و احادیث کے باضابطہ حوالہ جات،
 - ☆ قرآن مجید کے سمجھنے اور سمجھانے میں بہترین معاون اور مددگار،
 - ☆ مدرسین، مقررین، طلبہ اور عوام الناس کی ضرورت کے عین مطابق،
 - ☆ مسرت اور خوشی کے مواقع پر علمی تعاون اور محبت کے اظہار کے لیے خوب صورت تحفہ،
- یہ ایک ایسی تفسیر ہوگی جس کی ضرورت اہمیت اور افادیت صدیوں تک باقی رہے گی۔ انشاء اللہ العزیز

فون: 092-42-7312173

فیکس: 092-42-7224899

پیش کش: فریدنگ سٹال ۳۸- اردو بازار لاہور

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِحْسَانًا

مُحَمَّدًا

عَقَبًا

فَسْمًا

مُحَمَّدًا

حَامِدًا

مَشْهُورًا

تَشِيْرًا

أَشْيَا

تَهْكَأ

وَاتَّعَبًا

شَا

لَا أَع

تَلِيْرًا

لِبَشِيْرًا

تَهَامِيًّا

مِنْجِيًّا

مَالِكًا

هَبْلًا

أُمِّيًّا

شَيْخًا

لِنَاة

نَبِيًّا

إِطْعَمِيًّا

تَسْوِيًّا

إِحْسَانًا

رُؤْفًا

خَرِيْرًا

عَزِيْرًا

مُنْضِيًّا

طَيِّبًا

مُحْتَبًا

طَائِفًا

مِنْ مَكَ

أَوْ إِلَى

لِيْسًا

مُضْطَفًا

إِسْمًا

مُصَدِّقًا

مُتَيَّنًا

مَكَتْرًا

وَلِيًّا

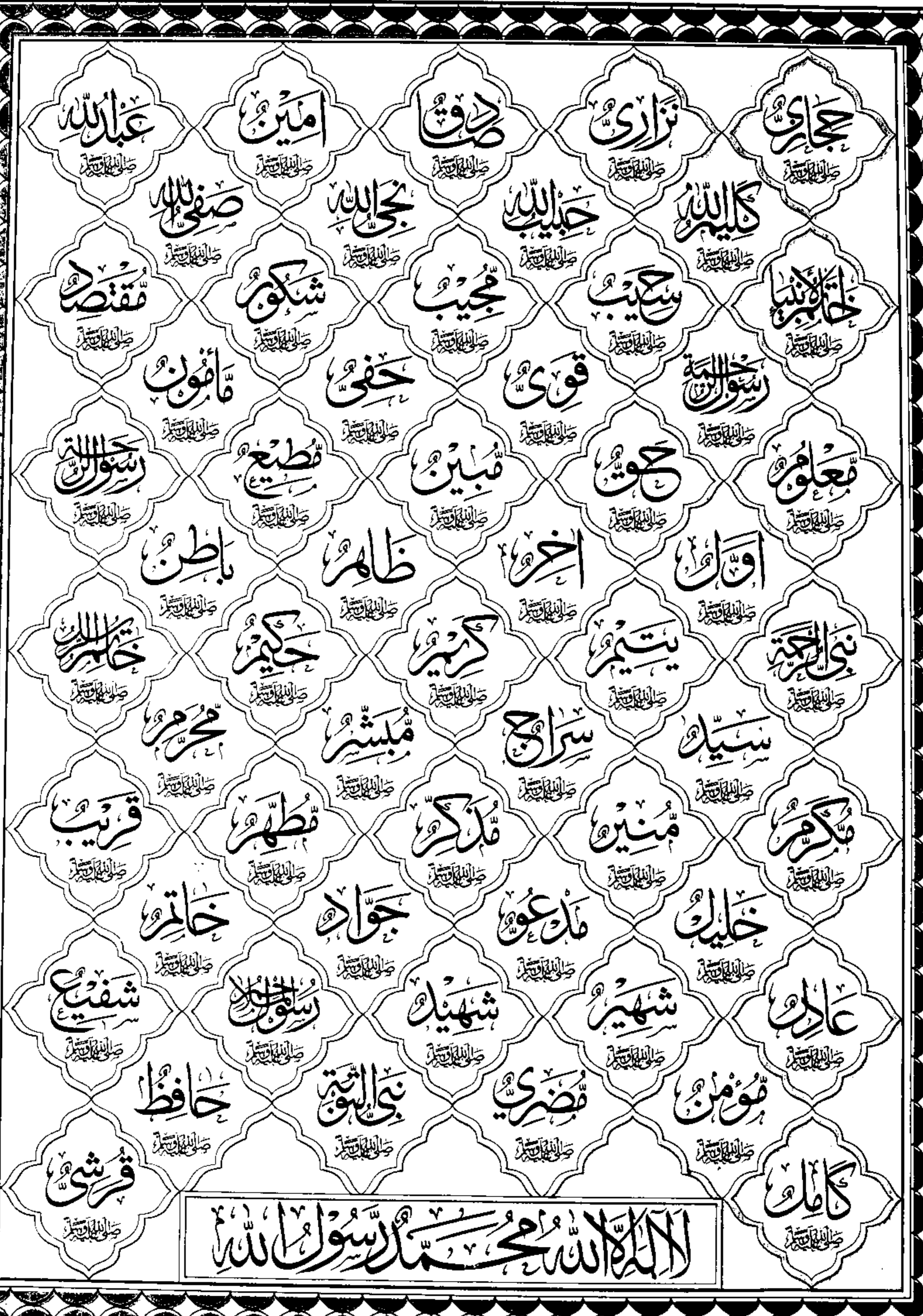
أَسْرًا

مُصْبِحًا

مُنْصُوْرًا

نَظَرًا

طَيِّبًا



عَبْدُ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

أَمِينٌ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

لَقِيقٌ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

نَزَارِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

عَجَائِرُ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

صَفِيٍّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بِحَبْلِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حَدِيدِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

كَالِيَدِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَقْصَدِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

شَكْوِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَجِيبِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

سَكِينِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خَالِيَتِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

قَائِمِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حَفِيٍّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

قَوِيٍّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

رَسُوْلِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

رَسُوْلِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مُطَمِّنِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مُبِينِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

لَحِيٍّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مُبْعَثِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بَاطِنِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ظَالِمِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

أَخْرَجِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

أَوَّلِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

تَكْلِيْمِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حَكِيْمِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

كَرِيْمِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

يَتِيْمِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

نَبِيِّ الْحَقِيْقَةِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مُحَرَّمِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مُبَشِّرِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

سِرَاجِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

نَسِيْبِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

قَرِيْبِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

طَهَّرِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَلَكِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَنْبِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَكْرَمِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خَالِيَتِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جَوَادِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مَدْعُوِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

خَلِيْقِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

شَفِيْعِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

رَسُوْلِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

شَهِيْدِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

شَهِيْرِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

عَالِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

حَافِظِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

نَبِيِّ الْوَعْدِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مُقْضِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

مُؤْمِنِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

قُرْشِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

كَامِلِي
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



